صدرِ جمہوریہ ڈھاکے میں وسط جون میں صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری بنگلہ دیش کے سرکاری دورے پر ڈھاکہ تشریف لے گئے (تصویر میں) ۱۶ رجون ۱۹۷۴ء کو شری گری بنگلہ دیش کے وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن سے گفت و شنید کر رہے ہیں۔

عرب مہمان ہند میں گزشتہ دنوں متحدہ عرب امارت کے نائب صدر شیخ رشید ہند کے سرکاری دورے پر تشریف لائے اور انہوں نے ہندستان کے کچھ اہم اور تاریخی مقامات کی سیر کی (تصویر میں) ۲۷ رجون ۱۹۷۴ء کو وہ آگرہ کا تاریخی لال قلعہ دیکھ رہے ہیں۔

ترتیب

...اریہ		۲
...رجہاں دراز ہے (مسلسل)	قرۃ العین حیدر	۳
...باعیات	اختر انصاری	۸
...نہ بیتی۔ کچھ سُنی کچھ دیکھی	محمد رضا انصاری	۹
...عت (نظم)	حیات لکھنوی	۱۳
...ہد نجمی	کرامت علی کرامت	۱۴
...نجام کار (افسانہ)	سلام بن رزاق	۱۹
...زل	نجیب رامش	۲۶
...لی کی برسات	آغا رشید مرزا دہلوی	۲۷
...ـزلیں	پریم وار برٹنی، حفیظ بنارسی ...حسین ...، اقبال طاہر	۳۲
...نظوں کی صلیب (افسانہ)	موہن لعل	۳۳
...نبا آل ـــ چند یادیں	کرشن نغرا	۳۶
...ب خیالی سچائی کا لمس (مراٹھی افسانہ)	اروند تھتے (مترجم: شاہ حسین)	۳۸
...ی کتابیں (تبصرہ)	شارب ردولوی	۴۴

اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر

مہدی عباس حسینی

ٹیلیفون نمبر :- ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد ۳۳ شمارہ ۱

اگست ۱۹۷۴ء

شراون بھادو شک ۱۸۹۶

شرحِ چندہ

سالانہ	۶ روپیہ	۳ ڈالر	۱ پاؤنڈ
دو سالہ	۱۰ روپیہ	۵ ڈالر	۱.۵۰ پاؤنڈ
سہ سالہ	۱۴ روپیہ	۷ ڈالر	۲.۵۰ پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سنٹ	۱۰ پنی

سرورق : عمل، آر، سارنگن

شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر آجکل، معرفت پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

صدر جمہوریہ ڈھاکے میں وسط جون میں صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری بنگلہ دیش کے سرکاری دورے پر ڈھاکہ تشریف لے گئے (تصویر میں) ۱۶ رجون ۱۹۷۴ء کو شری گری بنگلہ دیش کے وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن سے گفت و شنید کر رہے ہیں۔

عرب مہمان ہند میں گزشتہ دنوں متحدہ عرب امارت کے نائب صدر شیخ رشید ہند کے سرکاری دورے پر تشریف لائے اور انہوں نے ہندستان کے کچھ اہم اور تاریخی مقامات کی سیر کی (تصویر میں) ۲۱ رجون ۱۹۷۴ء کو وہ آگرہ کا تاریخی لال قلعہ دیکھ رہے ہیں۔

اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
مہدی عباس حسینی
ٹیلیفون نمبر :- ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۳ — شمارہ ۱
اگست ۱۹۷۴ء
شراون بھادر شک ۱۸۹۶

شرحِ چندہ

سالانہ	۱۰ روپیہ	۳ ڈالر	۱ پاؤنڈ
دوسالہ	۱۷ روپیہ	۵ ڈالر	۱٫۷۰ پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر	۲٫۴۰ پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سنٹ	۱۰ پنی

ترتیب

واریہ ۲
ارجہاں دراز ہے (مسلسل) — قرۃ العین حیدر ۳
رباعیات — اختر انصاری ۸
کانہ بیتی۔ کچھ سنی کچھ دیکھی — محمد رضا انصاری ۹
اعت (نظم) — حیات لکھنوی ۱۳
مجد نجمی — کرامت علی کرامت ۱۴
نجام کار (افسانہ) — سلام بن رزاق ۱۹
غزل — نجیب رامش ۲۶
دلی کی برسات — آغا رشید مرزا دہلوی ۲۷
غزلیں — پریم وار برٹنی، حفیظ بنارسی، نظیر حسین نظیر، اقبال طاہر ۳۲
لفظوں کی صلیب (افسانہ) — موہن لعل ۳۳
اقبال —— چند یادیں — کرشن شرما ۳۶
ایک خیالی سچائی کا لمس (مراٹھی افسانہ) — اروند تھٹے (مترجم: شاہ حسین) ۳۸
نئی کتابیں (تبصرہ) — شارب ردولوی ۴۴

سرورق : عمل ‏: آر۔ سارنگن

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

رفتارِ زمانہ

جاپان کی شکست

چھ سال کی طویل جنگ جس کی ہولناکی اور تباہ کاری کی مثال تاریخ عالم میں ملنی دشوار ہے جاپان کے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے ہی مکمل فتح کی صورت میں ختم ہوگئی۔ ایک بار پھر فتنۂ نسطائیت کا استیصال اور ظلم وستم کا بازار سرد ہوگیا۔ دنیا میں آزادی اور امن وعافیت کی فضا چھا گئی۔ جاپان نے اس خاص موقع پر جو ہتھیار ڈال دئے اس کے کئی سبب ہیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جاپان کی ہمت بالکل جواب دے گئی تھی۔ عسکری نظام بگڑ گیا تھا۔ فوج میں مقابلے کی تاب نہ تھی، مدافعت کی قوت بھی باقی نہیں تھی۔ انھوں نے محسوس کر لیا کہ اگر اب بھی ہم ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے لڑائی کے میدان میں اڑے رہے تو سر زمین وطن کی خیر نہیں ہے۔ اس کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائیگا اس کے برعکس اتحادیوں کی حکمت عملی کو بھی جاپان کی شکست میں بڑا دخل ہے۔ ان کا نصب العین بہر صورت جاپان کو شکست دینا تھا لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک سعی لاحاصل کے ذریعے اس عرصۂ تباہی کو خواہ مخواہ طول دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے حکومت جاپان کے سامنے صرف دو صورتیں پیش کردیں یعنی پوٹسڈم کانفرنس کے فیصلے کے مطابق یا تو وہ ہتھیار ڈالدیں یا ملک کی بربادی دیکھنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ دشمن کو بری طرح کچل ڈالنے کی زبردست قوتیں موجود ہونے کے باوجود اتحادیوں نے جاپان کو پورا موقع دیا کہ وہ معقول اور انسانیت پرور طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے ہتھیار ڈالیں اور اپنی قوم کو برقرار رکھنے کی صورت پیدا کردیں۔

ایٹم بموں کے ذریعہ شدید تباہکاریوں کا مظاہرہ کر کے بھی اتحادی عزم وارادہ کا نقش جاپانیوں کے دل ودماغ پر بٹھا دیا تاکہ وہ ان زبردست قوتوں کا لوہا مانیں اور خود ہی اپنے تاریک مستقبل کا اندازہ کرلیں جو لڑائی جاری رکھنے کی صورت میں یقینی تھا۔ گویا نفسیاتی طور پر جاپانی قوم کو اس ہولناک نتیجہ سے باخبر کر دیا جو لڑائی نہ روکنے کی صورت میں ان کے ہٹ دھرم لیڈروں کی بدولت ظہور پذیر ہونے والا تھا۔ جاپان کے خلاف روس کے اعلان جنگ سے ان قوموں کے کردار اطوار پر روشنی پڑتی ہے جو متحد الخیال ہوکر جاپان کی عسکری قوت کو نیچا دکھانے پر تلے ہوئے تھے۔ اس اعلان سے جاپان کی رہی سہی امیدوں کا خاتمہ ہوگیا۔

جاپان کی شکست ایک خاص لحاظ سے ہندوستان کی فتح کے مترادف ہے۔ ابھی ۱۹۴۴ء کے موسم گرما میں جاپان نے ہندوستان کو دھمکی دی اور مارچ ۱۹۴۴ء میں آسام کی حدود طے کر کے حقیقتاً ہندوستان پر حملہ کر دیا لیکن ہمارے فوجی دستوں کی ہمت وشجاعت کا بھلا ہو کہ دشمن کو منہ کی کھانی پڑی اور وہ بہت جلد بھاگتا نظر آیا۔ جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کا مطلب یہ ہے کہ ظلم وستم، غارت گری اور لوٹ مار کے سلسلے میں جاپان کے تمام منصوبے ریت پر بنی ہوئی عمارت کی طرح ڈھے کر رہ گئے۔ اس قوم نے کوریا میں، منچوریا میں، ہتھیائے ہوئے چین میں اور پرل ہاربر کے بعد لئے ہوئے تمام علاقوں میں عوام الناس کے ساتھ اسقدر بے دردی اور سفاکی کا سلوک روا رکھا، ملک کے قدرتی ذرائع پر اسدرجہ لوٹ مار کی اور اسیران جنگ کے ساتھ ان انسانیت سوز طریقوں کو عملی جامہ پہنایا کہ ان کی بہیمانہ خصلتوں پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی۔

امن وعافیت کی فضا قائم ہونے کے ساتھ متحدہ اقوام کے کندھوں پر نئے کاموں اور ذمہ داریوں کا بوجھ آ پڑا ہے۔ چنانچہ ملک معظم کے الفاظ میں "اب ہمیں محنت وجانفشانی سے کام کرنا ہے تاکہ جو کچھ ہم کھو چکے ہیں، اسے دوبارہ پالیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم قصر عافیت کو مستحکم بنیادوں پر تعمیر کریں اور وہ تعمیر صرف مادی قوتوں ہی کی نہ ہو بلکہ اس کا تعلق اخلاقی اعتبار سے بھی بلند ہو"

ہندوستانی فوجوں کی خدمات

جاپان کا حملہ شروع ہونے سے پہلے ہی ہندوستانی اپنی خدمات پیش کرنے لگے تھے۔ میدان جنگ ہی میں نہیں کارخانوں اور فیکٹریوں میں بھی ان کا حصہ قابل ذکر رہا۔ ہانگ کانگ کی لڑائی میں انھوں نے بڑی دلیری سے مدافعت کی اور جب جاپانیوں نے اپنی فضائی طاقت کے بل بوتے پر ملایا کو تختۂ مشق بنایا تو اس وقت بھی ہندوستانی ہی سینہ سپر ہوکر سامنے آئے ۱۹۴۲ء کے شروع میں ہندوستان کے شاہی بحری بیڑے کے جہاز تقریباً چالیس ہزار ہندوستانیوں کو برما کی بندرگاہوں سے اٹھا کر ہندوستان لائے۔ پھر اس وقت جب جاپان نئے نئے ہتھیائے ہوئے علاقوں میں اپنے پر پرزے درست کر کے پروان چڑھتا چلا جاتا تو ہندوستان نے

جانی اور مالی ذرائع سے پہلو تہی کرکے گویا اس نازک موقع پر اتحادیوں کی بڑی مدد کی۔

مشرقِ بعید کی تمام جنگی جدوجہد کے دوران میں ہندوستانی دستوں کی بہادری اور صبر و استقلال کی داستان تعریف سے مستغنی رہی اور یقیناً ان کے کارناموں کو تاریخ ہند کے صفحات پر زرین حروف میں لکھا جائیگا۔ اراکان کے اولین محاربے میں جو دسمبر ۱۹۴۲ء میں شروع ہوا، ہندوستانی دستے حملے میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۴۳ء کے موسم گرما میں اگرچہ اتحادی فوجوں نے کنارہ کشی کرلی لیکن وہ اپنا مقصد حاصل کر چکے تھے یعنی انھوں نے اکیاب کو اسطرح بیکار کر دیا کہ دشمن ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے وہاں کوئی مورچہ قائم نہ کرسکا۔ اراکان کا دوسرا محاربہ ۱۹۴۳ء کے اواخر میں ہوا۔ اسوقت بھی ہندوستانی فوج نے ناخوشگوار حالات کے باوجود اپنی بہادری کا ثبوت دیا۔ ۱ر جنوری ۱۹۴۴ء میں مونگ ڈاؤ پر قبضہ کرکے گویا دشمن کیخلاف فتح کا پہلا جھنڈا گاڑ دیا گیا۔ اسکے بعد دشمن کے جوابی حملے شروع ہوئے لیکن گھمسان کی لڑائی کے بعد ہندوستانیوں نے اسکے چھکے چھڑا دئے۔ اور اسے میدان چھوڑنا پڑا۔

مارچ ۱۹۴۴ء میں دشمن نے ہندوستان پر حملے کی دھمکی دی اور تین جاپانی دستے کاباؤ اور منی پور وادیوں کی راہ آگے بڑھ آئے، آسام کی حدود پر سومرا کے پہاڑی علاقے لے لئے حتی کہ کوہیما۔ امپھال۔ ڈیلم روڈ تک رسائی حاصل کرلی۔ لیکن جنوب مشرقی ایشیا کمان نے جس کی تشکیل ۲۴ر اگست ۱۹۴۳ء سے ہوئی تھی جوابی کارروائیاں عمل میں لانی شروع کردیں جس نے نہ صرف جاپان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا بلکہ چند ماہ میں اسے واپس برما میں پھینک دیا۔ چودھویں فوج کو شاندار فتح نصیب ہوئی اور دشمن کے ساٹھ ہزار سپاہی مارے گئے۔ چنانچہ ہندوستان فتح کرنے کے سلسلے میں دشمن کے تمام منصوبوں پر اس پسپائی کے بعد اوس پڑ گئی۔ اس کے برعکس اتحادیوں کے حوصلے بڑھے اور انھوں نے شمالی برما میں پیش قدمی شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً تمام برما کو دشمن کے چنگل سے چھڑانے کے سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ذکر امر یہ ہے کہ اس محاذ پر ۸۰ فی صدی دستے ہندوستانی اور گورکھے تھے۔ اس موقع پر دشمن کے تقریباً ایک لاکھ سپاہی مارے گئے اور اس سے دوچند ہمیشہ کے لئے مفلوج و بیکار ہوگئے۔

اس دوسری جنگ عظیم میں ہندوستانی سپاہیوں کو ۳۱ وکٹوریہ کراس ملے جن میں سے تقریباً نصف صرف جاپان کے خلاف لڑنے والوں کو عطا کئے گئے۔ ان نوازشات سے بھی ہندی سپوتوں کی شجاعت اور دلیری کا پتہ چلتا ہے۔ ان اعلیٰ اعزازات کے علاوہ برما محاذ پر حصہ لینے والے ہندوستانی سپاہیوں کو ۱۹۴۲ء سے اب تک ۵۴۹ انعامات دئے گئے۔ ہندوستان کے بحری اور فضائی بیڑوں نے بھی کارہائے نمایاں سے اپنی اہمیت اسی درجہ قائم کی۔

فوجی سرگرمیوں میں صنعتی سرگرمیاں بھی شامل حال رہیں۔ لاکھوں آدمی اسلحہ ساز کمپنیوں اور کارخانوں میں رات دن مصروف رہ کر ہر قسم کا سامان تیار کرتے رہے۔ معمولی توپ بندوق اور کارتوس ہی نہیں بنائے گئے بلکہ آہنی بستہ گاڑیاں اور ٹینک بھی تیار کئے گئے۔ سینکڑوں جہاز سمندر کے سینے پر تیرا دئے۔ ہندوستانی ریلوں نے بھی حمل و نقل کے ذریعہ بڑی مدد کی۔ لڑائی کے دور شباب میں گیارہ لاکھ باسٹھ ہزار ٹن کے قریب اشد ضروری سامان اور ساڑھے پانچ لاکھ سے زیادہ سپاہی ہر مہینے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کئے گئے۔

مشرقِ بعید کی لڑائی کا سرسری جائزہ

۷ر دسمبر ۱۹۴۱ء کی صبح کو جاپان کے ایک بحری بیڑے اور چند طیارہ بردار جہازوں نے پرل ہاربر اور بحرالکاہل کے دوسرے برطانوی امریکی ٹھکانوں پر حملہ کر دیا۔ تمام دنیا میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ مارچ ۱۹۴۲ء تک اس نے ملایا، جاوا، جزائر فلپائن، سماٹرا، بورنیو، برما، انڈمان اور بحرالکاہل کے دوسرے اہم جزیروں پر قبضہ کرلیا۔ اسکی فوجیں جنوب میں نیوگنی تک اور شمال میں ایلوشین تک جا پہنچیں۔ اس طرح جاپان کی عظمت قائم ہوئی۔ لیکن اتحادیوں کے جوابی حملے شروع ہوئے۔ بڑھتا ہوا سیلاب رک گیا۔ اور پھر ۱۹۴۳ء میں اس سرکشی کے مقابلے میں اتحادیوں نے ربلاد باجوست ہونے کے باوجود پائے استقامت جمانا چلا گیا۔ مارچ کے مہینے میں جاپان کے بحری بیڑے کو بحیرۂ بسمارک میں شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ ۱۹۴۴ء شروع ہونے تک جاپان اپنے وطن کی جانب کافی "مستعدی" کے ساتھ ہٹتے چلے گئے۔ ۱۵ جون کو امریکیوں نے سیپان پر قدم رکھا اور اسی روز ہوائی قلعوں کے ذریعہ ٹوکیو پر بمباری شروع کردی۔ ۲۱ جولائی کو گوام اور اسکے بعد جزیرہ ٹنیان لے لیا۔ اکتوبر میں جزائر فلپائن جنرل میک آرتھر کے زیر کمان آگئے۔

۱۹۴۵ء جاپان کے زبردست زوال کے ساتھ نمودار ہوا۔ ۹ جنوری کو امریکی دستے لیوزن پر اترے۔ ۴ فروری کو اتحادی منیلا میں گھس گئے۔ ۱۹ فروری کو خاص جاپان کے قریب لڑائی کا بازار گرم ہوا۔ ۱۶ مارچ کو ایووجیما، یکم اپریل کو اوکیناوا اور ایک ماہ بعد تیل کا اہم مرکز تراکان لے لیا گیا۔ جون کے آخر میں لیوزن مکمل طور پر آزاد کرا دیا اور پھر بورنیو کی طرف پیش قدمی شروع ہوئی۔ جولائی کے پہلے ہفتہ میں فلپائن کا محاربہ عظیم ختم ہوا۔ ۱۴ جولائی کو امریکی دستے ساحل جاپان کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ وہاں کے صنعتی اداروں پر حملہ آسان ہوگیا۔ ۴ اگست کو جنرل میک آرتھر نے سرزمین جاپان پر جلدی ہی قدم رکھنے کا اعلان کیا۔ دو دن بعد ایٹم بم ہیروشیما پر گرا۔ ۹ اگست کو روسی فوج منچوریا میں گھس گئی۔ اور اسی روز ناگاساکی پر ایٹم بموں کا دوسرا حملہ ہوا۔ ۱۰ اگست کو جاپان کی طرف سے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینے کی کارروائی عمل میں آئی اور اسطرح وہ نام نہاد عظمت جو حرص و آز کی آگ بھڑکا کر حاصل کرنی چاہی تھی سرحد ادراک سے بھی دور پہنچ کر ایشیا کے خود ساختہ رکھوالوں کے لئے عنقا بن گئی۔

اب چین کے لئے بھی آٹھ سال کی جدوجہد کے بعد آزادی اور سکون کی فضا میں سانس لینا ممکن ہو جائے گا۔

واقعات عالم کا روزنامچہ

یکم اگست سے ۱۵ اگست تک

۱- فیلڈ مارشل الیگزنڈر کو کینیڈا کا گورنر جنرل بنا دیا گیا پرزور لفظوں میں اعلان کیا کہ یوگوسلاویہ میں جمہوریت کا قیام ضروری ہے۔ لندن میں ایمپائر ایئر کانفرنس شروع ہو گئی۔ اتحادیوں کے آٹھ سو بڑے ہوائی جہازوں نے چھ ہزار ٹن وزن کے بم جاپان کے چار بڑے شہروں پر گرائے۔

۳- بادشاہ سلامت اور صدر ٹرومین نے اپنی تاریخی ملاقات کے موقع پر برطانیہ کے مشہور جنگی جہاز "رینا ؤن" پر دوپہر کا کھانا کھایا۔ نئے اکابر ثلاثہ نے فیصلہ کیا کہ مسٹر چرچل کو ان کارہائے نمایاں کے صلے میں جو پوٹسڈم کانفرنس کے ابتدائی جلسوں میں انہوں نے انجام دئیے ہدیۂ تبریک پیش کیا جائے۔ چینیوں نے نانچنگ سے ستر میل دور لافنگ لے لیا۔ مسٹر جوزف لیور بھوپال کے نئے وزیر اعظم بنا دئیے گئے۔

۳- سات ہزار الفاظ کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے پوٹسڈم کانفرنس ختم ہو گئی۔ دوسری باتوں کے علاوہ یہ طے پایا کہ جرمنی کی طاقت کو اس درجہ گھٹا دیا جائے کہ آئندہ اس کے ہاتھوں امن عالم تباہ نہ ہو سکے۔ مسٹر اٹلی نے اراکین وزارت کی باقی فہرست پیش کی۔ مسٹر پیتھک لارنس وزیر ہند ہوں گے۔ نئے اعلان کے مطابق پیکویوماس میں مرنے والے جاپانیوں کی تعداد آٹھ ہزار چھ سو تک پہنچ گئی۔

۴- بڑ ائیر ریو کوس سے اڑ کر پانچ ہزار جہازوں کی معیت میں جاپان پر آخری فیصلہ کن حملے کیلئے جنرل میک آرتھر نے مکمل تیاری کر لی۔ مسٹر رتھرسنڈرسن ہندوستان کا انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ مقرر کیا گیا۔ اکابر ثلاثہ کا آئندہ اجلاس واشنگٹن میں ہوگا۔

۵- پوٹسڈم کانفرنس کے اعلان پر اسپین کی سیاسی حالت تشویش ناک ہوتی جا رہی ہے۔ سر اسٹیفورڈ کرپس نے ایک ملاقات کے دوران میں فرمایا کہ ویول پلان کی ساکھ قائم رکھنے کیلئے برطانیہ کی لیبر گورنمنٹ بہت جلد کوئی مستقل سمجھوتا ضرور کرے گی۔

۶- جاپان کے شہروں کو زیادہ تیزی کے ساتھ برباد کرنے کیلئے "اٹیم بم" پہلی بار ہیروشیما پر استعمال کئے گئے۔ ان کی قوت ابتک استعمال ہونے والے خطرناک بموں سے دو ہزار گنی ہے۔ برطانیہ میں چھ سال کے بعد سب لوگوں نے صحیح معنوں میں چھٹی منائی۔ حکومت مصر نے دو مسجدیں لندن اور واشنگٹن میں تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ پوٹسڈم کانفرنس کا فیصلہ سننے کے بعد بہت سے جرمنوں نے خودکشی کر لی۔

۷- امریکی ہوائی جہازوں کے ذریعہ بے شمار پرچیاں گرا کر اہل جاپان کو آگاہ کیا گیا کہ اٹیم بموں کی تباہ کاریوں سے بچنے کا واحد علاج صلح ناموں کی پیشکش ہے۔ سائنٹسٹ سٹوئے

۸- روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ٹوکیو ریڈیو نے تسلیم کیا کہ دو دن میں اٹیم بموں کی تباہکاری سے تمام ہیروشیما کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔ یوآتا کے صنعتی مرکزوں پر سوا سو جہازوں نے ڈیڑھ ہزار ٹن وزن کے بم گرائے۔ برطانوی اور روسی ذی تہران سے ہٹا لئے جائیں گے۔ پہلی بار برما میں ۳۶۱ ہندوستانی سپاہی دشمن کی قید سے چھڑا لئے گئے۔

۹- روسی فوجیں منچوریا میں گھس گئیں اور دو بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ جاپان پر اٹیم بموں کا دوسرا حملہ ہوا۔ حکومت پنجاب نے صوبے کی کانگریس کمیٹیوں پر عائد کی ہوئی پابندی دور کر دی۔

۱۰- اٹیم بموں کی تباہکاریوں سے تنگ آ کر جاپان نے پوٹسڈم کانفرنس کا فیصلہ قبول کرتے ہوئے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا۔ تاہم یہ استدعا کی کہ جاپان میں شہنشاہیت کا وقار قائم رکھا جائے۔ روسی کوریا میں گھس گئے۔ شمالی جاپان پر حملہ ہوا۔

۱۱- اتحادیوں نے جاپان کی پیشکش کو اس شرط کے ساتھ قبول کر لیا ہے کہ جاپان کا شہنشاہ اتحادیوں کے فوجی افسر اعلیٰ کے زیر فرمان رہیگا۔ صرف ایک دن میں روسی فوجیں جاپانی منچوریا میں ۱۰۶ میل بڑھ گئیں۔ جنرل یزن ہوور حکومت روس کی دعوت پر ماسکو پہنچ گئے۔

۱۲- جاپان نے تمام جنگی کارروائیوں کو منسوخ کر دیا۔ جاپانی کابینہ صلح کے سلسلے میں ابھی تک آخری فیصلہ نہیں کر سکی۔ روسی فوجیں منچوریا میں آگے بڑھیں اور کوان تنگ نامی فوج کو تتر بتر کر دیا۔ حکومت ہند کے سابق وزیر قانون سر این این سرکار کا انتقال ہو گیا۔

۱۳- آدھی رات آنے سے قبل امیر البحر نمٹز اور حکومت جاپان کے مابین مصالحت کی گفتگو شروع ہو گئی۔ جزیرہ بوگین ویلے کی جاپانی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ چار دن میں روسی دستے منچوریا میں دو سو میل بڑھ گئے۔

۱۴- سوئٹسانی وزارت خانے سے اطلاع آئی ہے کہ صلح کے سلسلے میں حکومت جاپان کا جواب وہ نہیں ہے جس کی توقع ساری دنیا کو تھی۔ مشرق بعید میں بہت سے حصوں میں ابھی تک لڑائی کا بازار گرم ہے۔

۱۵- شہنشاہ جاپان کے اعلان کے مطابق بحرالکاہل کی لڑائی ختم ہو گئی۔ جاپان نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالدیئے۔ سوزوکی کی وزارت نے استعفیٰ دیدیا۔ جاپان کے وزیر جنگ نے خودکشی کر لی۔ جنرل میک آرتھر نے جاپانی نمائندے کو صلحنامے پر دستخط کرنے کیلئے منیلا آنے کی دعوت دی۔ بادشاہ سلامت نے تقریر کے دوران میں فرمایا کہ پچھلے وعدوں کے مطابق بہت جلد ہندوستان کو آزادی دیدی جائیگی۔ مارشل پیتاں کیلئے سزائے موت کا حکم سنایا گیا لیکن ساتھ ہی رحم کی درخواست بھی کی گئی ہے۔

دو غزلیں —— تاثیر

۱

ہم ترا اعتبار کرتے رہے — عمر بھر انتظار کرتے رہے
ہنستے ہنستے خزاں کے دن کاٹے — ذکرِ فصلِ بہار کرتے رہے
اُن کے ناپائدار وعدوں سے — عمر کو پائدار کرتے رہے
تم مٹاتے رہے امیدوں کو — اور ہم استوار کرتے رہے
آپ کا ذکر حضرتِ تاثیر — آج وہ بار بار کرتے رہے

۲

ہمیں وہ خود بلاتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
بُلا کر بھول جاتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
وہ روٹھیں تو انھیں دنیا مناتی ہے — جو ہم روٹھیں
تو وہ ہمکو مناتے ہیں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے بلانے پر نہیں آتے
وہ اپنے آپ آتے ہیں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
ہم ان کی بات اکثر مان جاتے ہیں، مگر وہ بھی
ہماری مان جاتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
ستم کوشی جفا ورزی حسینوں کا تو شیوہ ہے
انھیں ہم بھی ستاتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
بسا اوقات ظلم ان کا برائے ظلم ہوتا ہے
ہمیں وہ آزماتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

ریڈیم کا انکشاف

مجتبیٰ یوسف زئی

دنیا میں خالص ریڈیم ناپید ہے اس دھات کو دوسری دھاتوں سے جدا کیا جا سکتا ہے لیکن وہ فوراً ہی مرکب بن جاتا ہے۔ کیونکہ ریڈیم اور سوڈیم دونوں میں آکسیجن کو جلدی سے جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لہذا جونہی وہ دوسری دھاتوں سے جدا کیا جاتا ہے وہ ہوا سے آکسیجن کا مرکب بن جاتا ہے۔ عام طور پر جو ریڈیم کہلاتا ہے۔ حقیقت میں وہ ریڈیم کا کلورائیڈ ہوتا ہے۔ یہ روزمرہ استعمال کے نمک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مشابہ ہوتا ہے جو آسانی سے پیسکر باریک کئے جا سکتے ہیں لیکن یہ اسقدر طاقتور اور تباہ کن مادہ ہوتا ہے کہ اس کو ایک کانچ کی نلکی میں رکھا جاتا ہے جس کے چاروں طرف سیسے کی پتلی پتیاں لپٹی ہوتی ہیں۔ ریڈیم سے جو شعاعیں نکلتی ہیں سیسہ ان کے لئے غیر نفوذ پذیر ہوتا ہے۔

بیکرائل کے جھلک جانے کی کہانی سے ریڈیم کی ہولناک طاقت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کچھ عرصہ بعد جب میڈم کیوری تھوڑی مقدار میں ریڈیم کے نمک کو معدنی پچ بلینڈ سے جدا کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو ایم۔ بیکرائل جو گرم تابی کا اصل موجد ہے لندن پہنچا۔ اس کی واسکوٹ کی جیب میں ایک شیشہ کی نلکی تھی جس میں معمولی پن کے سرے سے ذرا بڑا ریڈیم کا ایک ذرہ تھا وہ ذرہ اسقدر قیمتی تھا کہ وہ ہمیشہ اس کو اپنی جان کے ساتھ رکھتا۔ تقریباً دس روز کے بعد اسے ایک کافی بڑے چھالے کا احساس ہوا جو ٹھیک اس مقام پر تھا جہاں نلکی اس کے جسم سے مس کرتی تھی۔ شعاعوں نے اس کے گوشت کے چند خلیے بالکل ختم کر دیئے تھے طبی دیکھ بھال کے باوجود وہ تکلیف دہ چھالا کئی ہفتے میں اچھا ہوا۔

یہ چیز آزمائی گئی ہے کہ اگر ریڈیم کی ایک نلکی چھوٹے چھوٹے چوہوں کے سروں سے چند انچ اونچی لٹکا دی جائے تو وہ فوراً ان کو مار ڈالتی ہے اور تتلی کے پہلے روپ (LARVAE) پر اسکا اثر اور بھی حیرتناک ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بہت جلد سمجھ گئے کہ ایسی تباہ کن شعاعوں میں شفا بخش اثر ہونا بھی ضروری ہے لہذا ریڈیم سے جو پہلا فائدہ اٹھایا گیا وہ مسوں WARTS کا علاج ہے۔ عام مساجس کی بہت سے لوگ پرواہ نہیں کرتے بہت بڑی تکلیف اور مصیبت کا باعث ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ پیر کے تلوے میں پیدا ہو سکتا ہے اور مریض کو قطعی لنگڑا بنا سکتا ہے۔ یا پلک پر ہو کر انسان کو بالکل اندھا بنا سکتا ہے۔ اکثر مسّے تو زبان پر اور انگلی کے ناخن کے نیچے تک ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایک جراح مسّے کو تراش سکتا ہے لیکن وہ پھر پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایبی نے میڈم کیوری کے دیئے ہوئے ڈھائی گرین ریڈیم سے تجربہ کرنا شروع کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ صرف ۳۰ منٹ تک ریڈیم کے استعمال سے مسّا ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتا ہے لیکن سب سے زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ ریڈیم کے استعمال کے بعد مسّے کا نشان باقی نہیں رہتا جیسا کہ جراح کے آپریشن کے بعد۔ ڈاکٹر ایبی کے پاس ایک خوش گلو دوشیزہ بطور مریضہ تھی۔ اتفاق سے ایک مسّا اس کے صوتی تاروں پر اٹھا اس کو پہلے کاٹ دیا گیا لیکن وہ پھر ابھر آیا اور دوسری مرتبہ پھر وہی چیز وقوع پذیر ہوئی۔ بیچاری لڑکی کی جان نواز آواز ضائع ہونی شروع ہوئی اور غضب تو یہ ہوا کہ وہ مسّا اسقدر تیزی سے بڑھنے لگا کہ اسکا گلا گھٹنے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ ریڈیم استعمال کیا گیا ــــــ صرف آدھ گھنٹے تک اسکی شعاعیں اس پر ڈالی گئیں تھوڑے ہی عرصہ بعد مسّا غائب ہونا شروع ہوا۔ دوشیزہ آرام سے سانس لینے لگی اسکی رسیلی آواز پھر عود کر آئی اور وہ بہت جلد تندرست ہو گئی جب ڈاکٹروں کو علم ہوا کہ ریڈیم کے ذریعہ مسّوں کا بھی علاج ہو سکتا ہے تو انہوں نے اب زیادہ خطرناک فاسد پھوڑوں پر اس کے اثر کا تجربہ کرنا شروع کیا اور آج ریڈیم وہ خاص ہتھیار ہے جس سے ڈاکٹر انتہائی موذی مرض راج پھوڑے یا سرطان سے لڑ سکتے ہیں۔

اب تک ریڈیم کی کافی چھان بین ہو چکی ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ریڈیم تین قسم کی مختلف شعاعیں پھینکتا ہے جنھیں الفا، بیٹا اور گاما شعاعیں کہتے ہیں۔ الفا شعاعیں جزو تلیل (ATOM) کو اس کے اجزا میں توڑ دیتی ہیں اور ان الفا شعاعوں ہی نے بیکرائل کی کھال کو جھلس دیا تھا۔ بیٹا شعاعیں مختلف کام کرتی ہیں اور نشو و نما کی ترقی میں بہت مفید ثابت ہوئی ہیں حال ہی میں یہ پتہ چلا ہے کہ پودوں کو بیٹا شعاعوں کی مدد سے انتہائی حیرت انگیز طریقہ پر بڑھایا جا سکتا ہے۔ ریڈیم کی سو شعاعوں میں سے نوے الفا، نو بیٹا اور صرف ایک گاما شعاع ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ گاما شعاعیں تینوں میں سے انتہائی تعجب خیز ہوتی ہیں۔ یہ معلوم کیا گیا ہے کہ وہ روشنی کی رفتار سے سفر کرتی ہیں ــــــ یعنی ۱۸۰ ہزار میل فی سیکنڈ ــــــ اور ان کے نفوذ کی طاقت بھی بہت زیادہ ہے کاغذ کا ایک پرزہ الفا شعاعوں کو روک لے گا۔ ٹین کا ایک پترا بیٹا شعاعوں کو اپنے اندر سے نہ گذرنے دیگا لیکن گاما شعاعیں ہی شدید طور پر فاسد پھوڑوں پر حیرت کن طور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز یہ ہے کہ ان میں انتخابی خصوصیت ہوتی ہے۔ وہ تندرست نشو میں سے گذر کر آ سکتی طرح نقصان پہنچائے بغیر مختل نشو پر حملہ کرتی ہیں۔ ہمیں سرطان ہونے کا باعث تو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کوئی جرم یا طفیلی (PARASITE) یا زہر ہوتا ہے لیکن اسکا باعث کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ریڈیم کی گاما شعاعیں اس پر حملہ کرتی ہیں اور مریض کو اچھا کر دیتی ہیں۔

سرطان جیسے موذی مرض کے لئے ریڈیم کی شعاعیں واحد علاج ہے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ریڈیم
سلورائیڈ اتنی مقدار میں موجود نہیں ہے کہ اس سے سرطان کا علاج کیا جائے۔

ریڈیم کو دریافت کرنے والی خاتون میری اسکلوڈوسکا وارسا میں ۱۸۶۷ء میں پیدا
ہوئی۔ اسکا باپ سائنس پڑھاتا تھا لیکن جس دار التجربہ میں وہ کام کرتا تھا اس میں زیادہ
سامان نہ تھا اور اس زمانہ میں کالج کے ارباب بست و کشاد سائنس کو زیادہ اہمیت نہ
دیتے تھے۔ لہذا میری کے باپ کو بہت کچھ اپنی جیب سے دینا پڑتا تھا اور پھر اس کے پاس اتنا
پیسہ بھی نہ رہتا تھا کہ وہ کسی مددگار کو ملازم رکھتا۔ وہ اپنی نو عمر بیٹی کا مرہون منت تھا جو برابر
تجربہ کی نلکیاں دھوتی اور دوسری چیزوں کی جھاڑ پونچھ کرتی تھی۔ لڑکی بہت جلد بڑی ہوئی
تو اپنے باپ کے کام میں دلچسپی لینے لگی اور جب وہ دن کو اسکول پڑھنے جاتی تو شام کے
وقت اکثر دار التجربہ میں کام کرتی۔ اتفاق سے ان دنوں پولینڈ میں روسیوں کی حکومت کا
تختہ الٹ دینے کی کوشش ہوئی۔ ہر محب وطن پولستانی کوشش کرنے لگا۔ میری بھی
باغیوں میں شریک تھی لیکن جب یہ تحریک ناکام ہوئی تو میری کو پولینڈ سے نکال دیا گیا
بیچاری بے یار و مددگار، مفلس اور بھوکی پیرس میں آپڑی اور معلمہ بن گئی۔

کچھ عرصہ بعد اسے سوربون میں کیمیائی تجربوں کے لئے بوتلیں صاف کرنے اور
بھٹی تیار کرنے کا کام مل گیا۔ وہ اپنی خداداد قابلیت اور جفاکشی کی بدولت بہت جلد محکمہ کے
افسر اعلیٰ گیبریل لپ مین کی منظور نظر بن گئی۔ گیبریل کو جب میری کے حسب نسب کا پتہ
چلا تو تھوڑے ہی عرصہ بعد اسے قابل اور عقلمند پیری کیوری کا شاگرد بنا دیا۔

نیلگوں آنکھوں اور بھوری بالوں والی میری ایک حسین دوشیزہ تھی۔ اسکی
آواز میں غضب کی موسیقی تھی پیری کیوری ایک بلند قامت خوبرو جوان تھا تبسم اسکے
چہرے پر ہر وقت رقص کرتا رہتا۔ دونوں غریب تھے لیکن جفاکش اور اپنے کام میں مشاق۔
دونوں آپس میں محبت کرنے لگے اور جب پیری کی عمر ۳۶ سال اور میری کی عمر ۲۸ سال
تھی تو ۱۸۹۵ء میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ وہ نوکر نہ رکھ سکتے تھے۔ میری
صحن دھوتی اور جھاڑو دیتی اور کھانا پکاتی اور پیری گھر کی دیکھ بھال کرتا۔

۱۸۹۵ء میں رونٹجن کی ایجاد ایکس رے نے دنیا کو متحیر کر دیا تھا۔ جو گوشت
اور دوسری چیزوں میں سے گذر سکتی تھی۔ ایک سال بعد بیکرال نے جو کیوریز کا دوست
اور ہم منصب تھا، بہت بھاری دھات یورینیم کے مرکبات سے دوسری شعاعوں کا
پتہ چلایا جو ایکس رے کی طرح جامد اور ٹھوس چیزوں میں سے گذر سکتی تھیں۔

میدام کیوری نے تمام دھاتوں پر تجربہ کرنا شروع کیا کہ ممکن ہے کہ یورینیم کے
علاوہ کسی اور دوسری دھات میں سے یہ غیر معمولی شعاعیں نکلتی ہوں۔ اس نے ایک
چھوٹا سا آلہ استعمال کیا جسکو برق نما (Electroscope) کہتے ہیں جسمیں
سونے کی پتیاں لگی ہوتی ہیں۔ ان پتیوں میں بجلی دوڑائی جاتی ہے۔ اور ہر گرم تاب
(Radio active) شے انہیں گرا دیتی ہے لیکن یہ پتیاں دفعتاً نہیں گر جاتیں بلکہ
جس رفتار سے وہ گرتی ہیں اس سے اس شے کی گرم تابی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پچ بلینڈ جو
ایک معدنی دھات ہے اور جس سے یورینیم نکالا جاتا ہے اسکا امتحان لیتے ہوئے
میدام کیوری حیران رہ گئی کیونکہ اس میں امید سے چارگنا زیادہ گرم تابی تھی۔ کیوریز کو
یقین کامل تھا کہ اس مادہ میں ضرور کوئی ایسی چیز تھی جسکا ابھی تک پتہ نہیں چلا اور جو یورینیم
سے کہیں زیادہ طاقتور چیز ہوگی۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ دونوں مل کر اس جزو بسیط
(Element) کا پتہ چلائیں گے۔

اب ٹیڑھا مسئلہ یہ تھا کہ پچ بلینڈ کی کافی مقدار کہاں سے آتے۔ ان کے پاس اتنا
پیسہ تو تھا نہیں کہ وہ اسے خریدتے۔ حکومت آسٹریا نے از راہ مہربانی اپنی بوہیمیا کی کانوں
میں سے انھیں ایک ٹن پچ بلینڈ بھیج دیا۔ اب اس انتہائی سخت چٹان کو تحلیل
کرنے اور اس جزو بسیط کی اس میں تلاش کا مشکل کام شروع ہوا۔ جزوی قلم پذیری
(Fractional cristallization) سے استفادہ کیا۔ ہاں یہ عمل بار بار کرنا
پڑتا۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے لیکن دونوں لگاتار پچ بلینڈ پر
تجربہ کرتے رہے دھات کو بار بار ابالنا، چھاننا، نتھارنا پڑتا اور بعد میں قلمیں بنائی
جاتیں۔ بالآخر ایک گرم تاب شے مل ہی گئی۔ میدام کیوری نے اس کو اپنے ملک کے
نام پر پولونیم کا نام دیا۔ تلاش ابھی ختم نہیں ہوئی کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ بیریم کی تلچھٹ میں
کوئی اور زیادہ طاقتور چیز تھی۔

میدام کیوری محنت سے کام کرتی رہیں یہاں تک کہ ۱۹۰۲ء میں وہ ریڈیم
سالٹ نکالنے میں کامیاب ہوگئیں۔ ریڈیم سالٹ کی مقدار ایک چھوٹے چمچے بھر ہوگی۔
اس کام میں تقریباً چار سال لگے۔ یہ کام صرف مشکل ہی نہ تھا بلکہ خطرناک بھی کیونکہ ریڈیم کی
نلکیوں کو متواتر اٹھانے بٹھانے کی وجہ سے میدام کیوری کے ہاتھوں کی حالت خراب
ہوگئی تھی اور اس وقت تک کسی کو ریڈیم کی انتہائی طاقتور شعاعوں کا پتہ بھی نہ تھا۔

۱۹۰۳ء میں میدام کیوری پیرس فیکلٹی آف سائنس کے سامنے اپنی علمی تحقیقات پر
مقالہ پڑھا اور جب وہ دوسرے دن صبح اٹھی تو اپنے آپ کو تمام دنیا میں مشہور پایا۔ اب
کیا تھا انہیں ڈاکٹر کی ڈگری عطا کی گئی نامہ نگاروں اور عکاسوں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔
لیکن کیونکہ وہ ذاتی نمائش سے بالاتر تھیں لہذا عکاسوں کو خوب چکمے دیئے۔

چند مہینوں بعد لارڈ کیلون کے دعوت نامے پر کیوریز لندن پہنچے۔ شاہی
مجلس کا ڈیوی تمغہ ان کو عطا کیا گیا اور اس سال انہیں دوسرا انعام بکرائل کے ساتھ
نوبل پرائز ملا جسکی رقم کوئی چھ ہزار پونڈ تھی۔

جب وہ لندن میں مقیم تھے تو پیری کیوری نے شاہی مجلس کے سامنے ریڈیم پر
تقریر کی اس کے ہاتھ اسقدر سوجے اور جلے ہوئے تھے کہ وہ ٹھیک سے کپڑے بھی نہیں
پہن سکتا تھا لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس نے اپنے آلات سے کام لے ہی لیا۔ اسکی
تقریر نے لوگوں میں جوش پیدا کر دیا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ریڈیم مسلسل طور پر گرمی دیتا
ہے اس نے دو کانچ کے برتن لئے جس میں سے ایک میں ایک ریڈیم کی نلکی اور
تپش پیما اور دوسرے میں صرف ایک تپش پیما تھا۔ اول الذکر تپش پیما آخرالذکر

دھرم راج یدھشٹھر کی سوگ جاترا

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

(ڈرامہ)

(مہابھارت کی جنگ کو ختم ہوئے بہت بڑا زمانہ بیت چکا ہے۔ بہت دنوں تک راج سنگھاسن پر دھرم راج یدھشٹھر بیٹھ چکے۔ مہابھارت کی یاد اب دنیا کے لئے ایک سپنا ہو چکی۔ شری کرشن جی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ارجن کو یہ پرتھوی اب سونی نظر آ رہی ہے)

ارجن:۔ کرشن اب اس سنسار میں نہیں ہیں۔ اب یہاں کیا دھرا ہے؟ اب میں اپنی کمان چڑھا نہیں سکتا۔ اب میرے دِویا استر دھرے، جو مجھے دیوتاؤں سے ملے تھے، پر میرے کام نہیں آ سکتے کیونکہ اب میرا دھیان ان پر نہیں جم سکتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا وقت آ گیا ہے۔ میں اور میرے بھائیوں نے جیون کا یہاں کام پورا کر دیا۔ اب اس دنیا سے ہمارے رخصت ہونے کا سمے آ گیا ہے۔ کال ہی ہمیں سب کچھ دیتا ہے اور کال ہی ہم سے سب کچھ واپس لیتا ہے۔

یدھشٹھر:۔ مجھے بھی ٹھیک ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے۔ دیکھو ارجن ستاروں کی گردش ہی ہمیں زنجیروں میں جکڑتی ہے اور یہی گردش کڑیوں کو ڈھیلا کر دیتی ہے۔

بھیم، نکل، سہدیو۔ (سب مل کر) بھائی ہم لوگ تمہارا اشارہ سمجھ گئے۔ ہاں سمے آ گیا ہے۔

دروپدی:۔ ہم سب لوگوں کا جی اب اس سنسار سے اچاٹ ہو چکا ہے۔ اب ہم سب کے لئے راج پاٹ کا سمے بیت چکا۔

سب ملکر۔ ہم کو جلدی سے جلدی اپنی جگہ پر راج سنگھاسن پر بیٹھنے والے اور راج مکٹ کا معاملہ طے کر دینا چاہئے۔ پرجا جسے راجا بناتی ہے ہم اسے راج کاج سونپ دیں۔

(راج محل کے سامنے پھیلا ہوا میدان۔ بے چین پرجا کی بھیڑ۔ اداسی۔ بے بسی، پریشانی کال)

پرجا کے سرپنچ۔ دھرم راج ہم لوگ یہ کیا سن رہے ہیں۔ نگر بھر میں کسی کے گھر چولہا نہیں جلا۔ جب سے یہ بات پھیلی ہے کہ دھرم راج اور ان کے بھائی اور مہارانی دروپدی راج پاٹ تیاگ رہے ہیں۔ پرجا کے دکھ اور اداسی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ دھرم راج آپ پرجا کو چھوڑ کر نہ جائیں۔

یدھشٹھر۔ ہم دنیا میں اپنا کام کر چکے۔ اپنے سمے کے بعد کسی راج سنگھاسن پر رہنے کا حق نہیں ہے۔ راج پاٹ چھوڑنے کا ہم اٹل فیصلہ کر چکے ہیں۔ کوئی دھرم کا اوتار بھی راج سنگھاسن پر سدا تک نہیں بیٹھ سکتا۔ ہم سامراجیہ کے بڑے بڑے ٹکڑوں کے لئے آدھیش مقرر کر رہے ہیں۔ اور اب ہم تم سے اور راج محل سے بدا مانگتے ہیں۔

یدھشٹھر اور ان کے بھائی الگ الگ جلتی ہوئی اس آگ کو اشٹ دھاتوں کے برتنوں میں اٹھا لیتے ہیں جو ہر ایک کے بیاہ کے وقت روشن کی گئی تھی جس آگ کو ہر ایک نے اپنی گھریلو اور سماجی زندگی کا گواہ بنایا تھا اور اسے جمنا کی پاک لہروں میں پھینک دیتے ہیں۔ پانی میں پڑ کر شعلوں کے بجھنے کی آواز۔

یدھشٹھر:۔ اور ان کے بھائی ملکر۔ اب اس سنسار میں ہم نے اپنی زندگی کا آخری کام پورا کر دیا۔

(پانچوں بھائی اور دروپدی ندی سے پورب کی طرف کہیں چل پڑتے ہیں۔ راج محل کی رانیوں، راج کماریوں اور دوسرے گھر والوں کے رونے کی آواز۔

اگر یدھشٹھر اور ان کے بھائیوں اور دروپدی کے چہروں پر ایک غیر معمولی اور روحانی خوشی کی جھلک نظر نہ آتی تو اس الوداع کو دیکھ کر یہی خیال گذرتا کہ پانڈو ایک بار پھر جوے میں سب کچھ ہار کر ہتھنا پور کو غربت اور افلاس کی حالت میں چھوڑ کر بن باس کے لئے جا رہے ہیں۔ کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ مہاراج یدھشٹھر کو مخاطب کرے یا پانڈوں سے پلٹ آنے کی درخواست کرے۔ نئے تخت نشین پر اب سب کی نگاہیں پڑنے لگتی ہیں۔ اس طرح سب سے اشیرواد لیکر اور سب سے رخصت ہو کر یدھشٹھر، بھیم، ارجن اور دونوں جڑواں بھائی نکل اور سہدیو اور سب کے پیچھے دروپدی نے جانی پہچانی ہوئی دنیا پر آخری نگاہ ڈالی۔ اور اب وہ آگے بڑھتے جا رہے ہیں لیکن یدھشٹھر جس گروہ کی پیشوائی کر رہے ہیں اس کی تعداد چھ نہیں بلکہ سات ہے کیونکہ ان سب کے پیچھے اس گروہ کے قدم بہ قدم ایک کتا بھی چل رہا ہے۔ کتے کا پریم اور اس کی وفاداری اسے پانڈوں سے جدا نہیں ہونے دیتی۔

بڑا لمبا سفر ہے اور بڑی کڑی منزل ہے۔ پانڈو ننگے پاؤں چلے جا رہے ہیں کل تک جو پانڈو دھرتی کی تمام دولت اپنی مٹھی میں رکھتے تھے آج وہ صرف پیڑوں کی چھال پہن کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اوروں کے پاس تو کچھ نہیں ہے لیکن۔ ارجن نے اپنی محبوب کمان گانڈیو دھنش اور تیروں سے بھرے ہوئے دو ترکش کا مدتے لٹکا تی ہیں۔ پانڈو سمندر کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں وہ ٹھٹھک جاتے ہیں کیونکہ ان کے سامنے اگنی دیوتا راستہ روکے کھڑے ہیں شعلوں کی آواز۔ دھڑ دھڑ جلتی ہوئی آگ کی آواز)

اگنی:۔ ارجن میں نے سمندر سے تمہارا گانڈیو دھنش نکالا تھا۔ آج پھر اپنے استر دے، سمندر کو سونپ دو۔ کرشن کے سدرشن چکر کے ساتھ اپنے ہتھیاروں کو بھی دنیا سے غائب ہو جانے دو۔ لیکن یاد رکھو کہ جب پھر سمے آئے گا تو گانڈیو پھر تمہارے ہاتھوں میں آ جائے گا۔

ارجن کے بھائی اور دروپدی:۔ ہاں۔ اے ارجن آگے بڑھو اور

سمندر کے کنارے پر آجاؤ۔ اگنی دیوتا سچ کہتے ہیں۔ اپنا دھنش اور ترکش سمندر میں ڈال دو۔

(ارجن اپنا انمول دھنش اور کبھی نہ خالی ہونے والے ترکش خود اپنے ہاتھ سے سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ ان کے پانی میں گرنے کی آواز۔ اگنی دیوتا اس آخری اور انتہائی قربانی سے آسودہ ہو کر پانڈوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

دور بہت دور پانڈو بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ دھرتی کی پریکرما کرتے ہوئے سمندر کے کنارے سے وہ دکھن اور پچھم کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ اب وہ اتر کو بڑھے جب راستہ میں دوارکا آتا ہے تو کرشن کی یاد دوبارہ تازہ ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ٹھنڈی سانسیں لیتے ہوئے وہ اور آگے بڑھتے ہیں۔ اب اسی سنسار میں ان کا کوئی سہارا، کوئی ٹھکانا نہیں۔ چلتے چلتے وہ ہمالیہ کے دامن میں پہونچ جاتے ہیں۔ نیچے نرجن بن اوپر برف سے ڈھکی ہوئی ہمالیہ کی چوٹیاں۔ اور چوٹیوں کے بہت پیچھے اتر کے دھندلکے دیوتاؤں کے پہاڑ مرد کی چوٹیاں جھلک رہی ہیں۔

اب پانڈو بہت کٹھن منزل سے گذر رہے ہیں۔ سنسار میں ان کی زندگی بہت پاکیزہ تھی۔ لیکن یہاں پہونچ کر ان کے جیون کی معمولی بھول چوک رنگ لائی۔ پانڈوؤں کے گناہ بہت معمولی تھے کبھی ذرا سا غرور کبھی ایسے وچن جنہیں وہ پورا نہیں کر سکے۔ ایک ایک کر کے یہ بہادر مسافر چیت ہو کر گر پڑتے ہیں۔ اور ہزاروں فٹ کی بلندی پر برف میں گل جاتے ہیں صرف دھرم راج یدھشٹھر کے روشن ضمیر میں جس میں انسانی اخلاق کا اچھا تلا احساس تھا ان حادثات کے کارن کا گیان پیدا ہوتا گیا۔ خود یدھشٹھر بھی اس مقام سے بے داغ نہیں گذر سکے جس جگہ زمین کو ان کا پاؤں چھو رہا تھا وہاں سے ایک جان لیوا درد زہریلی لہر کی طرح ان کی رگوں میں دوڑ گیا اور چونکہ انہوں نے جگمگاتے ہوئے سچ پر ایک بار ہلکا سا پردہ ڈال دیا تھا ان کی ایک انگلی گل کر گر جاتی ہے۔ دھرم راج یدھشٹھر اپنے بھائیوں اور دروپدی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد بھی ہمت ہارتے ہیں، نہ بغاوت کا بھاؤ ان کے اندر اٹھتا ہے۔ اب ان کا صرف ایک ساتھی رہ گیا ہے یعنی کتا۔ دونوں بغیر پیچھے کی طرف دیکھے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ بجلی کی ایسی آواز جس سے کانوں کے پردے اڑ جائیں اور دور دور تک فضا کانپ اٹھے یدھشٹھر اور کتا دونوں پہاڑ کی چوٹیوں پر ایک جانب چپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب یدھشٹھر دیکھتے ہیں کہ ایک سنہرے جگمگاتے ہوئے بادل کے ٹکڑے کی طرح بجلی کی کڑک نمودار ہو کر یہ اندر دیوتا اپنے ومان پر کھڑے ہیں۔)

اندر:۔ یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ بھرت کی نسل کے سردار یدھشٹھر کو انسانی پیکر میں جاتا ہوگا۔ اس لئے اے یدھشٹھر اب اس ومان پر آجاؤ۔

یدھشٹھر:۔ اے دیوتاؤں کے سرتاج، میں ایسا کیونکر کر سکتا ہوں۔ میرے سب بھائی میری آنکھوں کے سامنے میرے ساتھ چلتے چلتے گر کر مر گئے۔ جب وہ میرے ساتھ نہیں ہیں تو میں ان کے بنا سوارگ میں جانے کی اچھا نہیں رکھتا۔ جب مہارانی سکومل اور سکماری دروپدی گل کر برف ہو چکی تو میں اور اگر وہ جیتے رہتے تو میرے بھائی بھی سورگ میں جانا ہرگز پسند نہ کرتے اس لئے آپ میرے ساتھ ان سب کو سورگ لے چلئے۔

اندر:۔ لیکن جب تم سورگ میں داخل ہو گئے تو وہاں یہ سب تمہیں ملیں گے۔ یہ لوگ تو تم سے پہلے وہاں پہونچ چکے ہیں۔ اے بھرت کی نسل کے سردار تم دکھ نہ کرو۔ میرے ساتھ اسی انسانی پیکر میں اڑو۔

(مہاراجہ یدھشٹھر اپنا سر جھکا کر اندر دیوتا کی بات مان لیتے ہیں۔ وہ ایک کنارے کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ کتا پہلے ومان میں چڑھ جائے تو روکتے ہیں)

اندر:۔ دھرم راج آج تم امر ہو گئے۔ آج تم نے موت پر وجے پائی۔ کبھی نہ مٹنے والا سچا آنند، کبھی نہ مٹنے والی وجے اور میرے راج سنگھاسن کی طرح جگمگاتا ہوا راج سنگھاسن تمہیں ملنے والے ہیں۔ لیکن اس کتے کو الگ بھگا دو۔ جو کچھ مل رہا ہے اس کا آنند اٹھاؤ۔

یدھشٹھر:۔ ایک آریہ کے لئے یہ کتنا مشکل کام ہے۔ میں سورگ کے اس سکھ کا آنند کیسے اٹھا سکتا ہوں جو ایک وفادار کتے کو ٹھکرا کر حاصل ہوا ہو؟

اندر:۔ سورگ میں ایسے آدمیوں کے لئے جگہ نہیں ہے جن کے ساتھ کتے ہوں۔ تم دھرم راج ہو تم میں انصاف ہے۔ اس کتے کا ساتھ چھوڑ دو۔ ایسا کرنا ظلم نہیں ہے۔

یدھشٹھر:۔ (گہرے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز سے ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہوئے) نہیں۔ اندر دیو۔ جس نے ہمارے ساتھ پریم کیا اسے چھوڑ دینا بڑا پاپ ہے۔ جب تک میرے دم میں دم ہے بے زبانوں، بے بسوں اور بیکسوں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا، نہ ان کا ساتھ چھوڑ سکتا ہوں جنہوں نے پریم اور وفاداری کا ثبوت دیا ہے۔ یا جنہوں نے میری شرن لی ہے جو مجھ سے دیا کے امیدوار ہیں اور جو اتنے نربل ہیں کہ اپنے آپ کو بچا نہ سکیں۔ میں نے اب تک ایسا نہیں کیا۔ میں اپنے آپ کو اتنا نیچے نہیں گرا سکتا۔ میں اپنے سکھ اور اپنی بھلائی کے لئے اس کتے کو نہیں چھوڑ سکتا۔

اندر:۔ کتے کے جانے سے سورگ گندا ہو جائے گا۔ تم جانتے ہو کہ کتے نے بخس نگاہوں سے اگر سورگ والوں کی طرف دیکھ لیا تو ان کا سب آنند مٹ جائے گا۔ ان کی سب پوتر نامٹی میں مل جائے گی۔ تم بڑی بھول کر رہے ہو۔ تم اپنے بھائیوں کو چھوڑ چکے ہو۔ دروپدی کو تیاگ چکے ہو۔ ایک کتے میں کیا رکھا ہے؟

یدھشٹھر:- دیوراج اندر- یہ تم سب کو معلوم ہے کہ مرے ہوؤں کو تیاگنے پر ہم مجبور ہیں۔ مرے ہوؤں کا نہ کوئی دوست ہوتا ہے نہ دشمن- جب تک میرے بھائی اور دروپدی جیتے تھے میں نے انہیں نہیں چھوڑا- میں نے انہیں اسی سمے چھوڑ دیا جب وہ برف میں گل گئے اور میں انہیں جلا نہیں سکتا تھا- جو سہما ہوا ہے اسکے حال پر چھوڑ دینا، وفادار کو تیاگ دینا، جس نے ہماری پناہ لی ہو اسے ڈرانا، استری کی ہتیا، برہمن کا مال چرانا دوست کو دغا دینا یہ پاپ اس کتے کو ٹھکرانے کے پاپ سے کم ہوں گے۔

(اسی وقت کتا غائب ہو جاتا ہے، اور اس کی جگہ جگمگاتے ہوئے روپ میں دھرم کا دیوتا نظر آتا ہے)

دھرم کا دیوتا:- مہاراج یدھشٹھر کی جے- یدھشٹھر تم نے ایک کتے کی خاطر سورگ کا دان تیاگ دیا- سورگ میں تمہاری برابری کرنے والا کوئی نہیں- کبھی نہ مٹنے والے آنند کے لوگ تمہارے ہیں -

(دیوتاؤں کے وِمانوں کے جھرمٹ میں دھرم راج یدھشٹھر اپنے چمکتے ہوئے رتھ پر اسی سنسار کے جسم میں سورگ لوک پہونچ جاتے ہیں- انکے آتے ہی دیوتا منگلا چرن کے گاتے ہوئے ان کا سواگت کرتے ہیں- لیکن یدھشٹھر ادھر اُدھر نظر ڈالتے ہیں اور کہیں اپنے بھائیوں اور دروپدی کو نہ دیکھ کر کہ اٹھتے ہیں -)

یدھشٹھر:- وہ استھان چاہے دکھ کی جگہ ہو یا سکھ کا لوک ہو جہاں میرے بھائی ہیں میں وہاں کے سوا کہیں اور نہیں جانا چاہتا-

اندر:- لیکن اب یہاں آکر تم سنسار کے سمبندھوں کو اپنے دل میں کیوں جگہ دیتے ہو- تمہارے بھائی جہاں ہیں خوش ہیں- میں تو دیکھ رہا ہوں کہ تم ابھی تک مٹ جانے والی دنیا کے ہی آدمی ہو- انسانی پریم کے بندھن تم ابھی نہیں توڑ سکے - دیکھو یہ سورگ ہے - چاروں طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو تم ان لوگوں سے گھرے ہوئے ہو جنہوں نے دیوتاؤں کا درجہ پالیا ہے -

یدھشٹھر:- اے اسروں (شیطانوں) کے جیتنے والے، نہیں- میں ان سے جدا ہو کر نہیں رہ سکتا کہیں اور نہیں بلکہ جہاں وہ گئے ہیں وہیں میں بھی جاؤنگا-

(ٹھیک اسی وقت مہاراجہ یدھشٹھر کی آنکھیں اپنے محبوب بھائیوں اور دروپدی کو ڈھونڈتی ہوئی پھر سورگ لوک پر پڑیں- یکایک ان کی نظر پہلے دریودھن پر پڑی، پھر اپنے دشمن دریودھن کے بھائیوں پر اور آخیر میں انہوں نے دھرت راشٹر کے ایک سو ایک بیٹوں کو سورگ میں سورج کی طرح جگمگاتے ہوئے دیکھا- ہر ایک میں سورماؤں اور ویروں کی شان و شوکت نظر آ رہی تھی- ہر ایک دیوتاؤں کی طرح راج سنگھاسن بیٹھا ہوا تھا یدھشٹھر غصے سے بھر گئے-)

یدھشٹھر (کڑک کر تھرتھراتی ہوئی آواز میں) سورگ میں بھی گھمنڈی اور ظالم دریودھن کے ساتھ نہیں رہ سکتا - اسی کے چلتے ہمارے دوستوں اور رشتے داروں کا خون ہوا- اسی کے ہاتھوں ہماری رانی کا اپمان ہوا- اے دیوتاؤ میری بات سنو مجھے ان کی صورت تک دیکھنا گوارا نہیں- مجھے وہیں جانے دو جہاں میرے بھائی گئے ہیں - (ایک دیوتا یدھشٹھر کے غصے پر مسکراتے ہوئے) لیکن دھرم راج ایسا تو نہیں ہونا چاہئے - سورگ میں تو ہر طرح کی دشمنی اور مان بن مٹ جاتی ہے- مہابھارت کی لڑائی کی آگ میں اپنی آہوتی دیکر بھیانک اسروں پر نڈر اور اٹل رہکر دریودھن نے سورگ کے سکھ پر اپنے کئے ہیں- اپنے دکھوں کو بھول جاؤ دھرم راج یہ سورگ ہے، دنیا نہیں ہے- یہاں دشمنی کی جگہ نہیں-

یدھشٹھر- (بغیر کچھ اثر لئے ہوئے، اسی بپھری ہوئی آواز میں)

اگر یہ انصاف یہی ہے کہ دریودھن ایسوں کو سورگ ملے تو میرے ساتھیوں اور رشتہ داروں کو کیا کچھ نہیں ملنا چاہئے؟ مجھے نیک اور دھرماتما لوگوں کی صحبت میں جانے دو- میرے لئے سورگ کے لوگ کیا ہیں جب میرے بھائی ہی یہاں نہیں ہیں- جہاں وہ ہیں وہی سورگ ہے- میں اس جگہ کو سورگ مانتا ہی نہیں -

(مہاراجہ کو اٹل دیکھ کر دیوتا سورگ کے پیامبر کی طرف مڑے اور حکم دیا کہ یدھشٹھر کو ان کے ساتھیوں اور رشتہ داروں کا درشن کراؤ- سورگ کا دوت (پیامبر) دیوتاؤں کا حکم پورا کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے- یدھشٹھر اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں - بھیانک استھانوں اور کٹھن منزلوں سے اب وہ گزر رہے ہیں- چاروں طرف اندھیرا گھپ ہے- ڈراونی آوازیں آرہی ہے - زہر میں ڈوبی ہوئی بدبو سے دم گھٹا جاتا ہے- ڈنک مارنے والے کیڑے مکوڑے کے جھنڈ کے جھنڈ ہر طرف سے ٹوٹے پڑتے ہیں خونخوار درندے ادھر ادھر پھر رہے ہیں - اس راستہ کے دونوں طرف آگ دوڑ رہی ہے اور اس اجنبی دھندلکے میں ایک بے نام ڈر کی پرچھائیاں نظر آرہی ہیں- ادھر اُدھر مردوں کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں - بھوتوں پریتوں سے یہ مقام بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے اور جہاں کسی کی پہونچ نہ ہوا یسے ٹیلے اور گھاٹیاں اور بھول بھلیاں کی طرح بے شمار پیچ در پیچ راستہ کثرت سے نظر آرہے ہیں -

دیوتاؤں کا دوت بڑھتا چلا جا رہا ہے - مہاراجہ یدھشٹھر اس کے پیچھے چل رہے ہیں- مہاراجہ کا من پیڑا پیدا کرنے والے وچاروں میں ہر پل ڈوبتا جا رہا ہے- یہاں تک کہ چلتے چلتے وہ دونوں ایک ایسے اندھکار منڈل میں آگئے جہاں ایک ایسی ندی بہہ رہی تھی

جس کا پانی ابل ابل کر بھاپ کے بادل اوپر پھینک رہا تھا۔ یہاں ریگستان بھی دور دور تک جھلک رہے تھے اور دیکھا جو تردد پیدا کرنے والے انگارو کی طرح تپ رہے تھے۔ یہاں ٹیلے، چٹان اور پتھر کے ٹکڑے بھی لوہے کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لوہے اور پتھر کا کلیجہ بھی چیر جانے والے کانٹے بھی نظر آرہے تھے اور کھولتے ہوئے تیل کے بے شمار کڑاہ جل رہے تھے۔

ایسی تھیں وہ شکلیں اور تھے ایسے وہ استھان جہاں پاپیوں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ (اس بھیانک شبستان میں یدھشٹر نے اپنے رہبر سے کہا)

یدھشٹر:۔ ابھی اور کتنا چلنا ہے۔ یہ کیسی آسمانی دنیا ہے؟ میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ مجھے جلد بتاؤ میرے بھائی کہاں ہیں۔

دوت:۔ مہاراجہ یہاں رک جائیے۔ دیولوک کے باسیوں کا حکم تھا کہ اس جگہ تک آپ کو لا کر میں پلٹ جاؤں۔ جہاں تک آپ کا معاملہ ہے، انصاف کے اوتار مہاراج یدھشٹر اگر آپ تھک گئے ہوں تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ دیولوک کو واپس چلیں۔

(زہریلے اور ناخوش گوار بھاپوں سے اچیت سے ہوکر مہاراجہ پلٹ پڑے اور دو چار قدم پیچھے کو ہٹے۔ جیسے ہی وہ مڑے درد بھری آوازوں اور سسکیوں سے وہاں کی اندھیری فضا گونجنے لگی)

آوازیں:۔ ٹھہرے رہو، ٹھہرے رہو۔ ہماری بپتا یدھشٹر کے یہاں آجانے سے کم ہو چلی ہے۔ تمہارے ساتھ اے یدھشٹر ٹھنڈی ہوا اور ایک نرم روشنی آرہی ہے۔ نرک کے شعلے ٹھنڈے پڑ چلے ہیں۔ مہاراجہ ہمیں چھوڑ کر نہ جائیے۔

یدھشٹر:۔ ہائے، ہائے، سنو تو یہ کس کی آوازیں ہیں۔ اور یہ کچھ پہچانی ہوئی سی آوازیں معلوم ہو رہی ہیں۔ تم کون ہو؟ تم کون ہو؟ [illegible] آوازیں سنکر، وہ آوازیں جو کسی جاندار کے پھیپھڑوں اور گلے سے آتی ہوئی نہیں معلوم ہوتیں میرا ماتھا پسینے میں ڈوبا جا رہا ہے۔

آوازیں:۔ ارجن! درو پدی! کرن[1]! بھیم! نکل! سہدیو! اور مہابھارت میں تمہاری طرف سے لڑ کر مارے جانے والے بے شمار تمہارے پیارے ساتھی۔

یدھشٹر:۔ (انتہائی حیرت سے) درپودھن دیولوک میں! اور میرے یہ ساتھی اور رشتہ دار نرک میں! میں جاگ رہا ہوں کہ کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں، یا میں پاگل ہو چلا ہوں۔ برہمانڈ (کائنات) میں نیائے (انصاف) کہاں ہے۔ یہ اتنا بڑا انیائے (بے انصافی) ہے کہ میں دیوتاؤں کو بھی چھوڑ دوں گا۔ دھرم کو توڑنے والے ظالم دیوتاؤں کے دوت میرے سامنے سے ہٹ جا۔ چکے

تم دوت ہو انہیں کے پاس پلٹ جاؤ۔ اور ان کو جتا دو کہ میں ان کے بیچ میں واپس نہ آؤں گا۔ یہیں جہاں میرے بھائی دکھ جھیل رہے ہیں، جہاں میری موجودگی ان کے لئے ایک سہارا ہے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھہروں گا۔ یہ جگہ میرے لئے سورگ سے زیادہ پاک ہے۔

(دیوتاؤں کا دوت سر جھکا دیتا ہے اور جلد ہی آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ وہ اڑتا اڑتا سورگ کی آخری بلندیوں تک پہونچتا ہے اور یدھشٹر کا سرکشانہ جواب اندر دیوتا کو سناتا ہے۔ یدھشٹر نرک میں تنہا کھڑے نرک والوں کی بیان سے باہر بپتا اور مصیبت پر چپ چاپ گہرا وچار کر رہے ہیں۔ کچھ لمحے گذر جاتے ہیں یکایک ٹھنڈی مہکتی ہوئی ہوا چلنا شروع ہوتی ہے۔ روشنی کی ایک کرن پھوٹتی ہے۔ ایک سہانا اجالا پھیلنے لگتا ہے۔ تمام بھیانک اور کریہہ مناظر غائب ہو جاتے ہیں۔ دہکتے ہوئے انگارے، جلتی ہوئی لوہے کی چٹانیں، کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہیں، زہریلے خار زار سب کے سب آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ یدھشٹر جب آنکھ اٹھاتے ہیں تو اپنے آپ کو دیوتاؤں سے گھرا ہوا پاتے ہیں۔)

سورگ کے دیوتا:۔ یہ دھوکے اور بھرم ختم ہوئے۔ یدھشٹر اب تم اپنے اصلی استھان کی طرف آؤ۔ ہر راجہ کو ایک بار نرک کا درشن کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دھنیہ (مبارک) ہیں وہ لوگ جنھوں نے اتنے زیادہ نیک کام کئے ہیں کہ انہیں نرک دیکھ کر چلا جانا پڑتا ہے۔ یہ ہوا در سورگ کے آنند کے بعد کو یدھشٹر تمہیں اور تمہارے بھائیوں اور ساتھیوں کو ایک جلتے خواب یا بھرم کے روپ میں نرک کا تجربہ کرایا گیا ہے۔ وہ آگ [illegible] ایک قسم کا الٹا تخیل تھا۔ مہاراج اب آئیے اور آکاش گنگا (کہکشاں) [illegible] اس کی لہروں میں نہا کر اپنے مارکے شریر کو تج دیجئے اور اس شریر کے ساتھ [illegible] دشمنی اور دکھ کو بھی تیاگ دیجئے۔ تب اپنی کبھی نہ مٹنے والی شان اور چمک [illegible] کے ساتھ ان اپنے بھائیوں رشتہ داروں ساتھیوں اور درو پدی سے سورگ میں جا ملئے جو وہاں پہلے سے موجود ہیں اور جن کا مرتبہ دیوتاؤں [illegible]۔

[1] پانچوں پانڈوں کا ایک چھوٹا بھائی کرن بھی تھا جو بچپن ہی میں ان سے جدا کر دیا گیا تھا لیکن جو مہابھارت میں غیر معمولی شجاعت سے لڑ کر کام آیا تھا۔

میر کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ

خواجہ احمد فاروقی

شاہانِ مغلیہ کا عہد، ہندو مسلم تعلقات کی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن اور درخشاں باب ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں اس اتحاد و اختلاط کا پرتو نظر نہ آتا ہو۔ اس سلسلہ میں سلاطین دہلی کی کوششیں بھی نہایت وقیع ہیں۔ انکی رواداری کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ تیمور کے ہندستان پر حملہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سلاطین دہلی نے ہندوؤں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ بابر نے ہندوستان میں آکر ہندوؤں اور مسلمانوں کو صلح و آشتی کے ساتھ رہتے ہوئے پایا۔ اس زمانہ میں تمام عامل، مستاجر اور کارگزار ہندو تھے (بابرنامہ ص ۲۰۴) شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بابر سے درخواست کی کہ ان ملازمتوں میں سے کچھ حصہ مسلمانوں کو بھی ملنا چاہیئے (مکتوبات شیخ عبدالقدوس گنگوہی) سلاطین دہلی کی تمام عمارات ہندو اور مسلم خصوصیات کی آئینہ دار اور اختلاطِ باہمی کی مظہر ہیں۔ دکن کی اسلامی عمارتوں میں بھی ہندوانی خصوصیات نمایاں ہیں۔ اس زمانہ کی مصوری میں بھی دونوں قوموں کے مخصوص طرز کی آمیزش پائی جاتی ہے۔

اتحاد و اتفاق نے مذہبی تحریکات پر بھی اثر ڈالا۔ بھگتی کے بعض عناصر کو اسلام سے تقویت پہنچی اور بعض تو پیدا ہی اسلام کی بدولت ہوئے۔ راجپوتی عہد کے بعد سے ہندوؤں کے مذہبی اور سیاسی خیالات کی تبدیلی میں مسلمانوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔

یہی حال رسم و رواج کا بھی تھا۔ ڈاکٹر تاراچند نے اپنی مشہور کتاب "ہندوستانی کلچر پر اسلامی اثرات" میں لکھا ہے کہ ہندو مسلمان بزرگوں کے مزاروں پر نذریں چڑھاتے تھے۔ فال کے لئے قرآن شریف دیکھتے تھے اور بھوت پریت کے اثر سے بچنے کے لئے قرآن کو گھروں میں رکھتے تھے، اور اسلامی تہواروں اور رسموں میں شرکت کرتے تھے (ص ۲۱۰) این۔ سی۔ مہتا نے لکھا ہے کہ یہی حال مسلمانوں کا بھی تھا۔ حد یہ ہے کہ کرشن مت کے ماننے والے ہندوؤں کے علاوہ بہت سے مسلمان بھی تھے۔ ("ہندوستانی کلچر کی تشکیل میں اسلام کا حصہ" ص ۱۹)

یہ اتحاد عہدِ مغلیہ میں اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں یہ اثرات سرایت نہ کر گئے ہوں۔ لٹریچر زندگی کا آئینہ ہے۔ اس اختلاط اور اتحاد کا عکس یہاں بھی نظر آتا ہے۔ ہندو مصنفین جب کبھی فارسی میں لکھتے ہیں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرتے ہیں اور تمہید کے طور پر حمد و نعت و منقبت لکھتے ہیں۔ وہ شنکر، کپیلا، تلسی داس اور رامانج کے بجائے سعدی، حافظ، خیام اور رومی کے حوالے دیتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ اپنے لئے "بر لبِ گور" اور اپنے ہم مذہبوں کے لئے "واصل جہنم" لکھتے ہیں۔ اگر مصنف کا نام نہ معلوم ہو تو کتاب سے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کا لکھنے والا ہندو ہے یا مسلمان۔ ایسے ہی جب مسلمان ہندی میں لکھتے ہیں تو ابتدا میں شری گنیش جی یا سرسوتی جی کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ رحیم نے "مدن اشٹک" کا آغاز شری گنیش نام سے کیا ہے۔ یہی حال احمد معاصر جہانگیر کا ہے۔ یعقوب خاں نے گنیش جی، سرسوتی جی، شری رادھا کرشن جی اور شری گوری شنکر جی کی تعریف کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کیا ہے۔

شاہانِ مغلیہ نے ہندی و سنسکرت کی جو سرپرستی کی ہے اس کے بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اندک بود لائق و بسیار نہ گنجد۔ بھاشا پر مسلمانوں کے کیا احسانات ہیں اس کے لئے ملاحظہ ہوں الندوہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۶ء و فروری ۱۹۱۱ء اور ڈاکٹر چودھری کی کتاب :-

MUSLIM PATRONAGE TO SANSKRITIC LEARNING

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی سرپرستی ملکی اور سیاسی مصلحتوں سے بالاتر تھی۔ وہ ان زبانوں کی خوبیوں سے آگاہ تھے اور ایک دوسرے کے خیالات سے باخبر ہونا چاہتے تھے۔ اکبر کے زمانہ میں مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ ابوالفضل اسکے مقدمہ میں لکھتا ہے:-

"خاطر نکتہ داں برآں قرار یافت کہ کتب معتبر طائفتین بزبان مخالف ترجمہ کردہ آید تا ہر دو فریق...... جویائے حق شوند و بر محاسن و عیوب یک دیگر اطلاع یافتہ در اصلاحِ حال خود مساعیٔ جمیلہ نمایند۔"

میر غلام علی آزاد ہندی کی تعریف میں لکھتے ہیں:-

معنی آفرینانِ عربی و فارسی خوں از رگِ اندیشہ چکانیدہ اند و شیوۂ نازک خیالی را بہ عالی مراتب رسانیدہ لیکن افسوں خوانانِ ہند ہم دریں وادی پائے کمی نہ دارند۔

دورِ مغلیہ کی مصوری، موسیقی، طرزِ تعمیر، ادبی اور علمی تصانیف، ہندو مسلم اتحاد کی گواہ ہیں۔ جو معاشرتی یک رنگی اس زمانہ میں پیدا ہوئی اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہولی کا تہوار بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ بسنت کے موقع پر بسنتی کپڑے پہنتے تھے اور ایک بڑا دربار منعقد ہوتا تھا۔ جہانگیر دیوالی کا دربار کرتا تھا اور سلونو کے موقع پر راکھی باندھتا تھا۔ (تزک جہانگیری سرسید ایڈیشن ص ۱۱۹) پھول والوں کا میلہ (سیرگل فروشاں) ہندو مسلمانوں کا مشترک تہوار تھا۔ اکبر شاہ ثانی کو اس میں شرکت اتنی عزیز تھی کہ ایک مرتبہ بیماری کے عالم میں مسہری پر لیٹے لیٹے اس میلے کو دیکھا اور انعامات تقسیم کئے۔ یہ تمام رسمیں بہادر شاہ ثانی کے زمانہ تک اہتمام کے ساتھ ہوتی رہیں (اسلامک کلچر جولائی ۱۹۳۸ء : "دہلی ۱۸۳۵ء" ص ۲۸۶)

یہ اتحاد اگر مصنوعی ہوتا یا محض ملکی مصلحتوں کے سہارے قائم ہوتا تو انحلالِ سلطنت کے بعد اسکا فنا ہو جانا یقینی تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اتحاد و درخت کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور اسکی سرسبزی شادابی برسوں کی آبیاری اور دونوں قوموں کی متحدہ کوشش کا نتیجہ تھی۔ اسی لئے اس دورِ خونیں منظر" میں بھی ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات نہایت شگفتہ رہے۔

میر تقی میر (۱۱۳۵-۱۲۲۵ھ) کی تصانیف دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ سیاسی ابتری انتہا کو پہنچ چکی تھی، ہر طرف لوٹ مار کے ہنگامے برپا تھے، تیموری جاہ و جلال ختم ہو چکا تھا، اور سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، ہماری معاشرت اتنی مضبوط تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات میں فرق نہیں آیا تھا اور انکی ہمدردی و یکدلی بدستور قائم تھی۔

میر کے والد کا انتقال غالباً ۱۱۴۶-۱۱۵۰ھ میں ہوا باپ کے مرتے ہی ان کے اوپر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ خود لکھتے ہیں :- "دریا دریا گریستم۔ لنگر از کف دادم" (ذکر میر ص ۶۰) اس کم عمری میں انہیں تلاشِ معاش میں گھر چھوڑنا پڑا۔ کچھ دنوں اطرافِ اکبرآباد میں پھرتے رہے پھر دلی گئے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھتے ہیں :-

"بہ شاہ جہاں آباد دہلی رسیدم۔ بسیار گردیدم، شفیقے نہ بردم" (ص ۶۲)

کچھ دنوں کے بعد امیر الامراء نے روزینہ مقرر کر دیا۔ اس سے نان و نمک میسر آگیا۔ نادر شاہ کے ہنگامہ و آشوب (۱۱۵۱ھ) تک اسی طرح گزر اوقات ہوتی رہی لیکن امیر الامرا کے قتل ہو جانے کے بعد یہ سہارا بھی جاتا رہا۔ میر پھر اکبرآباد آ گئے۔ یہاں بھی لوگوں نے بے رخی برتی۔ ناچار دوبارہ دلی گئے (۱۱۵۲ھ) یہ زمانہ بڑا پُر آشوب تھا تاراج و غارت گری، ملبندی و نگوں ساری، ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ عزت سنبھالنا مشکل تھی۔ شاعروں کا تو کیا ذکر، بڑے بڑے امرا پریشان اور مضمحل تھے۔ روزی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ دلی چاروں طرف سے آفات کا ہدف بنی ہوئی تھی۔ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں نے دلی کو لوٹ کھسوٹ کے ویران کر دیا تھا۔ مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کی دست برد نے رہا سہا امن و سکون بھی غارت کر دیا تھا۔ ہر طرف دنیا کی بے اعتباری اور یاس کی تاریکی ہی نظر آتی تھی۔ اس سیلاب بلا میں میر جیسے آشفتہ مزاج اور نازک دماغ کی دستگیری اور نازبرداری چند ہندو رئیسوں نے کی جنکی فہرست کافی طویل ہے۔

(۱) مہا نرائن دیوان۔ میر ان کے متعلق لکھتے ہیں :- "مہا نرائن دیوان وزیر بدستِ داروغۂ دیوان خانۂ خود ...... چیزے فرستاد و بہ اشتیاق بسیار مرا طلبید۔ دست در دامن سپلو دار او زدم۔ و چند ماہ بہ فراغت گذرانیدم" (ذکر میر ص ۷۲)

(۲) راجہ جگل کشور۔ میر ان کے متعلق لکھتے ہیں :-

"راجہ جگل کشور کہ در وقت محمد شاہ وکیل بنگالہ بود و بہ ثروت تمام می گزرانید مرا از خانہ بر داشتہ برد۔ و تکلیف اصلاح شعر خود کرد۔ قابلیت اصلاح ندیدم بر اکثر تصنیفات او خط کشیدم" (ذکر میر ص ۷۵)

لیکن اس پر بھی راجہ جگل کشور نے محبت اور مروت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان ہی کی سفارش سے میر کی راجہ ناگرمل کے یہاں رسائی ہوئی خود لکھتے ہیں :-

"روزے سوار شدہ بہ خانۂ راجہ ناگرمل رفت و لقریب من کردہ طلب داشت" ص ۷۸۔

(۳) راجہ ناگرمل کے میر کے اوپر بڑے احسانات ہیں۔ راجہ بھی اس زمانہ کی شرافت اور وضعداری کا نمونہ تھے۔ جب وہ جاٹوں کی چیرہ دستی سے تنگ آکر دلیرانہ قلعہ چھوڑتے ہیں تو اپنے ساتھ بیس ہزار آدمیوں کو جن میں ہندو مسلمان سب ہی تھے اور جو انکی وجہ سے وہاں آباد تھے، ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ یہ وقت خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ میر لکھتے ہیں :- "چناں ہمت بہ امداد غربا گماشت کہ ناموس نفرے ہم آں جا نہ گزاشت"

راجہ ناگرمل کی رفاقت میں میر صاحب عرصہ تک رہے اور اکثر جگہ ان کے ساتھ گئے۔ یہ اس زمانہ میں نائب وزیر، عمدۃ الملک اور مہاراجہ کے خطاب سے ممتاز تھے اور میر کی بڑی عزت کرتے تھے۔

(۴) بہادر سنگھ کے متعلق میر لکھتے ہیں :- "بہادر سنگھ پسر لالہ رادھا کشن کہ بشیتر خزانچی گری صفدر جنگ داشت ...... شام آمد و سر دستی بہ من گرفتہ و میانہ سرکرد احسان نہادہ ام کہ غیر از دوست روئے دستے برنداشتم۔ چندے بہ فراغت ماندم و روز و شب گزراندم" ص ۹۱۔ اسی طرح رائے بشن سنگھ کے متعلق لکھتے ہیں :-

(۵) "پسر خورد راجہ (رائے بشن سنگھ) مرا طلبید۔ بہ شگفتگیٔ خاطر ما یحتاج ما می رسانید" ص ۹۳

یہ زمانہ انتہائی سیاسی ابتری اور بدحالی کا تھا۔ ہر طرف خود غرضی، جاہ طلبی، بدمعاملگی، غداری اور بے وفائی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن مذہبی تعصب اس زمانہ میں بھی نظر نہیں آتا۔ ہندو اور مسلمانوں میں اسقدر یکجہتی تھی کہ دونوں کا اندازِ فکر اور طرزِ خیال بھی ایک ہی تھا۔ ایک زمانہ میں میر بڑے تنگدست اور پریشان روزگار تھے۔ راجہ ناگرمل کے یہاں سے کچھ مقرر نہیں ہوا تھا۔ اسی پریشانی اور اضطراب میں ایک روز صبح کی نماز کے بعد ان کے مکان پر پہنچ گئے۔ آگے کے واقعات میر صاحب کی زبانی سنئے :-

"جے سنگھ نام میرزدہ چو بداران پیش آمد و گفت کہ ایں کدام وقت دربار است گفتم کہ حالت اضطرار است گفت شمارا مردانِ درویش می گویند مگر گوش زد نہ شدہ کہ لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ ...... صابر و شاکر باید بود ہمہ چیز

سلہ :- کلیاتِ میر۔ مقدمہ آسی ص ۸۔ سلہ : کلیاتِ میر آسی ص ۱۷

درگرو وقت است" (ص ۸۷)

جے سنگھ کے بجائے کوئی مسلمان ہوتا تو وہ بھی یہی کہتا۔

میر کا تذکرہ نکات الشعراء دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی مشاطگی میں ہندو اور مسلمان دونوں مصروف تھے۔ اکبر اعظم نے مشترکہ تعلیم کو ہندو مسلمانوں میں رواج دیا تھا۔ اسکا سلسلہ برابر قائم رہا۔ اٹھارویں صدی کے مشہور معلم لالہ چنی لال ذرہ تھے جن سے ہندو اور مسلمان دونوں کسب فیض کرتے تھے۔ مفتی لطف اللہ مرحوم کے استاد فارسی، منشی سوہن لال تھے۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ جعفر علی حسرت کے استاد تھے (حسرت، جرأت کے استاد تھے) مرزا عبدالقادر بیدل کے بیسیوں ہندو شاگرد تھے۔ امام المتاخرین خان آرزو نے مجمع النفائس میں بالمکند بشوق، جے کشن عشرت، آنندرام مخلص، بندرابن داس خوشگو، ٹیک چند بہار کو اپنے عزیز شاگردوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ آرزو اور مخلص میں بڑی محبت تھی آزاد بلگرامی اور شفیق اورنگ آبادی میں بڑا اتحاد تھا۔ غالب اور "کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ" مرزا تفتہ میں جو تعلق خاطر تھا اسکا اندازہ غالب کے خطوں سے کیا جا سکتا ہے۔

میر نے نکات الشعراء میں حسب ذیل ہندو شاعروں کا ذکر کیا ہے:-

(۱) رائے رایاں آنندرام مخلص :- میر ان کے متعلق لکھتے ہیں:-

"شاعرے مقررے فارسی، در عنفوان جوانی مشق سخن بخدمت مرزا بیدل می کرد۔ دریں ایام اشعار خود را از نظر خان صاحب سراج الدین علی خاں آرزو می گزرانید" (ص ۸-۹) آرزو اور مخلص میں خصوصی تعلقات تھے آنندرام ہی کی بدولت خان آرزو کو بادشاہ سے جاگیر، منصب اور خطاب خانی حاصل ہوا۔ والہ داغستانی نے لکھا ہے کہ

"برابر فکر او در ہنود کسے نیست"

مخلص کی متعدد تصانیف ہیں۔

(۲) رسوا :- ان کے متعلق میر لکھتے ہیں:-

"شخصے بود ہندو۔ حالا قید مذہب نہ داشت۔ پیش ازیں در توپ خانہ نوکری کرد۔ از چندے ترک روزگار گرفتہ آوارۂ دشت گمراہی شدہ ...... عریانی را لباس خود مقرر کردہ می گشت۔ آخر در ہاں برہنگی جامہ گذاشت" ص ۱۲۹

(۳) لالہ ٹیک چند بہار (صاحب بہار عجم)

"از یاران سراج الدین علی خاں صاحب، تصانیف بسیار..... از لفظ لفظش ہزار ہزار رنگ معنی گل می کند۔ بافقیر ہم آشنا است" ص ۱۴۲

تذکرۂ کریم الدین (ص ۶۵) میں لکھا ہے کہ بہار ہندی اردو اور فارسی میں بہت سی کتابیں چھوڑ کر مرا۔ تذکرہ گلزار ابراہیم کی روایت ہے کہ بہار نے ایران کی بھی سیاحت کی تھی۔

(۴) مہندرابن راقم :- میر لکھتے ہیں: "از شاہ جہاں آباد است۔ مشق شعر از مرزا رفیع می کند۔ قبل ازیں بافقیر نیز مشورت شعری کرد"

راقم نو مشق تھے اور میر کو چھوڑ کر سودا سے اصلاح لینے لگے تھے لیکن اسکے باوجود میر نے راقم کا ذکر محبت سے کیا ہے اور انکے بہت سے شعر نقل کئے ہیں (ص ۱۵۳ تا ۱۵۶)

میر خود بھی نہایت پاک مشرب اور وسیع النظر واقع ہوئے تھے انکا مسلک ظواہر و رسوم سے بالاتر تھا:-

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

میر عرفی کے ہم خیال ہیں ع پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

میر کا یہ شعر آج بھی یاد رکھنے کے قابل ہے ●

غزل

کیا جانے انھیں ہم کیا سمجھے، جو اپنے بھروسا کر بیٹھے
امید کے جھوٹے وعدے پر، دل نذر تمنا کر بیٹھے

سب کھو کے بھی ہم کچھ پا نہ سکے، وہ ہم سے الگ ہم ان سے الگ
دنیا جسے دیکھے اور ہنسے، ہم ایسا تماشا کر بیٹھے

وہ درد نہیں، وہ ہوک نہیں، وہ اشک نہیں، وہ آہ نہیں
گل کر کے محبت کے شعلے، ہم گھر میں اندھیرا کر بیٹھے

شایان محبت تو ہے یہی، انجام سفر گو ظاہر ہے
اب جان پہ بنتی ہے تو بنے، منزل کا ارادہ کر بیٹھے

اک برق سی جیسے کوند گئی، چٹکی جو کلی گلشن میں کہیں
جب اتنی بھی دل میں تاب نہیں، کیوں ضبط کا دعویٰ کر بیٹھے

ساون کی جھڑی گھنگھور گھٹا، شاداب چمن، شاداب فضا
ان سب کا کریں ہم کیا آخر، جب تم ہی کنارا کر بیٹھے

انجام کی لذت یاد رہی، آغاز کی شدت بھول گئے
ساحل کے چھلاوے میں آکر، موجوں پہ بھروسا کر بیٹھے

جس آس سے دھڑکن تھی دل میں، جس آس سے نبضیں چلتی تھیں
وہ آس بھی قسمت چھین چکی، ہم وہ بھی گوارا کر بیٹھے

پہلو میں لئے بیٹھے ہیں وہ دل اقبالؔ کہ موسیٰ رشک کرے
جو طور کو بھی راس آنہ سکی اس برق کو اپنا کر بیٹھے

اقبال عظیم

پھسلن

ایرانی افسانہ

مصنفہ
سید محمد حجازی

مترجمہ
مشیر احمد

کمالی گھر میں داخل ہوا جس وقت اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی، آنکھوں میں مسرت ناچ رہی تھی، چہرہ پر خوشی کا نور چھایا ہوا تھا اور ہونٹ وفورِ انبساط سے کانپ رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر پہلے جو کیفیت میرے دل پر طاری ہو جایا کرتی تھی وہ آج نہیں ہوئی۔ آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ اس پر نظر پڑنے کے بعد میں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ میرے سامنے ایک خشک مزاج، قنوطی اور بد بین شخص کھڑا ہے۔ اگر میں نقاش ہوتا تو اپنے موقلم کی ایک ذرا سی جنبش سے بخوبی ظاہر کر دیتا کہ آج کمالی کے چہرہ پر ایک انقلاب عظیم برپا تھا۔ لیکن اس بدلی ہوئی کیفیت کا اظہار الفاظ کی قوت سے باہر ہے۔ اس کے چہرہ کی شکلیں صاف طور پر غمازی کر رہی تھیں کہ وہ ایک نئی دنیا میں تھا، اس کی روح کسی نئے تجربہ کی بھٹی سے تپ کر نکلی تھی اور اسی وجہ سے اس کے چہرہ پر خشونت کے بجائے ملائمت، بردباری اور نرمی تھی۔

"الفاظ" واقعیت کے چہرہ کو اس قدر مسخ کر دیتے ہیں کہ لوگ اس سے کراہت کرنے لگتے ہیں۔ کاش کوئی چابکدست مصورِ حقیقت کے چہرہ کی تصویر اس کے اصلی سُندر رُوپ میں کھینچ کر دنیا کو بتا دیتا کہ "سچائی" دراصل کریہ المنظر ہونے کے بجائے بہت ہی حسین اور جاذبِ نظر ہے۔ پھر لوگ اس سے اتنے گریزاں نہ رہتے جس قدر اب ہیں۔ لیکن بصورت موجودہ "الفاظ" ہی کا سہارا لینے کے سوائے میرے لئے کوئی اور چارہ نہیں ہے۔

کمالی کے چہرہ پر خود بینی اور زعم باطل کا جو شعلہ پہلے بھڑکتا رہتا تھا جس سے ہر دیکھنے والے کی روح جل کر خاک ہو جاتی اور طعن و تشنیع اور کراہت و نفرت کے جو تیر زہر خند میں بجھے ہوئے اس کے ہونٹوں سے اڑا کرتے تھے آج مفقود تھے۔ وہ کوئی بدکلام یا گندہ ذہن آدمی نہ تھا لیکن کسی محفل میں جب بھی وہ اپنے اشہبِ زبان کو مہمیز دیتا تو اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ تیر و نشتر کا کام کرتا تھا۔

ہم سب اس کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ کہنے لگا دو گذشتہ دو راتوں میں مجھ کو وہ تجربہ ہوا ہے جو شاید تمام عمر بھی نہ ہوتا اور جس نے اب زندگی بھر کے واسطے میری کایا پلٹ کر دی ہے۔ آپ کو معلوم ہے میں اپنے احباب پر اس قدر طعنہ زنی کیوں کرتا رہتا تھا؟ اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ بچوں کی طرح ان کو کھلونوں کی ضرورت ہے اور یہ انہی کے لئے وہ روتے اور بسورتے رہتے ہیں۔ بچوں کیساتھ مذاق بھی تو کرنا چاہیئے؟ میں سوچا کرتا تھا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں اور یہ کہ اگر مجھے بھی ان کی طرح کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھکو اس چیز کی ضرورت اس غیرت کے ساتھ محسوس کرنا چاہیئے کہ بچوں کی طرح بلبلا اٹھوں۔ میں نے اپنے جذبات کی باگ ڈور اپنے دماغ کے ہاتھ میں دے دی تھی دماغ سے مجھ کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ اگر عقل مجھ کو ان مسرتوں کی آرزو کرنے سے روکتی جن کی تمنا میں دوسرے ہر وقت تڑپتے رہتے ہیں تو میں بھی خاموش ہو جاتا غرض میرا سینہ مایوسی و محرومی کی تپش سے محفوظ و مصون تھا۔ دوسروں کے معاملات میں عبرت گیری کے واسطے بھی دخل اندازی نہ کرتا تھا۔ میں نے اپنی دنیا الگ بنالی تھی اور اسی میں اطمینان اور آسودگی کے سانس لیتا تھا۔ اپنی عقل کے ایما پر میں نے ایک ایسا جہانِ نو تعمیر کیا جس میں نہ جذبانیت کا دخل تھا نہ غم واندوہ کا۔ میں ہر وقت اپنے دارالمطالعہ میں رہتا تھا اور یہیں مجھ کو تسکین قلب حاصل ہوتی تھی۔ ایک روز میں اسی کتب خانہ میں اس طرح بیٹھا تھا جیسے کوئی محبوس پرندہ کسی پنجرے میں ہو۔ میری نظریں کتابوں پر جم گئیں میرا مرغِ تخیل مائلِ پرواز ہوا اور میری روح پر ایک نور سا چھا گیا۔ عالمِ تخیل میں بہت سے بڑے بڑے ادیب اور فلسفی میرے گرد جمع ہوگئے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ میں نے کسی نہ کسی مسئلہ پر بحث کی۔ ایکدم میرے تمام بدن میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خوشی کے مارے میں تیکیا اٹھا اور کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بارش ہو رہی ہے، چھتیں، دیواریں اور دہلیزیں بارش کے پانی سے بھیگ رہی ہیں سڑک پر میں نے دیکھا کہ کالی چھتری لگائے کوئی شخص چلا جا رہا ہے میرا دل نہ معلوم کیوں بیٹھ سا گیا، میں نے ایسا محسوس کیا گویا کوئی عورت رو رہی ہے۔ میرے ذہن پر قنوط کے بادل چھا گئے۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ درخت ماتم میں اپنے سر کے بال خود اپنے ہاتھوں سے نوچ رہے ہیں، ان کے کپڑے آنسوؤں میں تربتر ہیں اور اس کی پتیاں جو کبھی موجب فرحت تھیں اس وقت خود آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھیں۔ ایک خوانچہ والا ادھر سے گذرا اور اس نے جب آواز لگائی تو مجھ کو ایسا معلوم ہوا گویا وہ رو رہا ہے۔ دہاڑیں مار مار کر۔ میری روح غم واندوہ کے دریا میں غرق تھی، فرشتے روتے نظر آرہے تھے اور پھر میں بھی بے اختیار رو پڑا۔

جس غم کا کوئی نام ہو جس کا کچھ موجب اور سبب ہو اس کا درمان سہل ہے اس کی مثال اس دشمن کی سی ہے جو آپ کے روبرو موجود ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے حریف سے سلٹ لینا آسان ہے لیکن اس بے نام و جانگزا غم کا علاج محال ہے جو گوشۂ دل میں چھپا ہو اور اندر ہی اندر جان کو گھلائے جاتے ہیں

کہ غم ایک بوجھ ہے جو ہم کو اپنے اجداد سے وراثتاً ملتا ہے۔ ہماری اندرونی امید و بیم ہمارے چہروں پر منقش رہتی ہے۔ ہمارا باطن، ہمارا تحت الشعور، ہمارا ضمیر ایک علیحدہ ہستی رکھتا ہے لیکن ہمارا کوئی زور اس پر نہیں چلتا بلکہ وہی ہم پر حکومت کرتا ہے۔ ہمارا چہرہ اس محکومی کا زندہ ثبوت ہے اور اپنی بے بسی کا آئینہ دار ہماری تمنائیں ہماری پچھلی یادیں، ہمارے اندیشے اور ہمارے غم آج کے نہیں بلکہ صدہا سال سے چلے آتے ہیں۔ انسانی خواہشات، غم و اندوہ اور خطرات روزِ اول سے ہمارے تحت الشعور میں موجود رہتے ہیں لیکن خوابیدہ، ایک ذرا سی ٹھیس، ایک چھوٹا سا واقعہ یا معمولی سا سانحہ ان کو جگا دیتا ہے پھر ہمارے اوپر قنوط اور حزن و ملال کے بادل گھر آتے ہیں۔ وہ انسان کی زندگی کا موسم خزاں ہوتا ہے جب تحت الشعور کی تہ سے پچھلی یادیں اٹھ کر امنڈنے لگتی ہیں اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک غار کے دہانے پر کھڑا ہے اس کا جسم غلیظ ہے اور زکان خوردہ۔ وہ سخت پریشان حال ہے اور اس کے جسم کے بال بری طرح بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ سنتا ہے کہ اس کی بیوی اور اس کے بچے بھوک کے مارے بُری طرح چیخ رہے ہیں وہ اپنے دانت پیستا ہے، آنکھیں بھینچتا ہے اور اس کے بازو فولاد کی طرح سخت ہو جاتے ہیں۔ جنگلی درندوں کے ڈر سے وہ تنہا غار سے باہر نہیں نکل سکتا قحط سر پہ کھڑا ہے اور ایک ایسے شکار کا انتظار کرنے لگتا ہے جو نہ کبھی آیا نہ آئیگا۔ کبھی وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ ایک بیوپاری ہے اس کے ہر طرف کامگاری محو رقص ہوتی ہے اور سامان تجارت سے لدا ہوا اس کا قافلہ ایک بڑے ریگستان سے گذرا چلا جا رہا ہے۔ عالم تخیل میں وہ دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی خالص ریشم کا پُر تکلف لباس پہنے ہوئے ہے، ایک فرحت بخش شام کو وہ اپنے مجمع احباب میں بیٹھا ہے اور عود و عنبر کی خوشبو اس کے مشام جاں کو فرحت ناک کر رہی ہے۔ پھر ایک طوفان اٹھتا ہے، راستہ تغ بستہ ہو جاتا ہے اور وہ ڈرنے لگتا ہے کہ کہیں راستہ نہ بھول جائے۔ بھیڑیوں اور لکڑبگھوں کے ڈر سے وہ کانپنے لگتا ہے اس کو یہ خوف بھی گھیر لیتا ہے کہ کہیں کوئی قزاق اس کا قافلہ نہ لوٹ لے اور خود اس کو قتل نہ کر ڈالے۔ ڈر بڑھنے لگتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ تو مر بھی چکا۔ زیر زمین دفن ہے اور اس کے بچے غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

کبھی وہ اپنے عالم تخیل میں دیکھتا ہے کہ ایک نوجوان اپنی ایک ہم مدرسہ دوشیزۂ نوخیز پر عاشق ہو جاتا ہے۔ ان کا عشق بڑھتے بڑھتے عالم مجاز سے گذر کر عشق حقیقی میں مبدل ہو جاتا ہے وہ اپنے لئے ایک عالم دیگر خود ایجاد کرتے ہیں۔ آخر میں طبل جنگ بج جاتا ہے ملک کے نوجوان اپنی مادرِ وطن کے تحفظ کی خاطر دعوت جنگ کو قبول کرتے ہیں یہ نوجوان طالب علم بھی قومی آواز پر لبیک کہتا اور اپنی محبوبہ سے جدا ہو جاتا ہے کچھ عرصہ بعد وہ لڑکی ایک شفاخانے میں جہاں زخمی سپاہی زیر علاج ہیں ایک بیمار سپاہی کے چہرے سے خون دھوتے وقت پہچانتی ہے کہ وہ سپاہی تو خود اسکا

کا محبوب ہے۔ لیکن آہ! سر کی شدید ضرب کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لئے بینائی کھو چکا ہے اور مالیخولیا کا مریض ہے۔ عورت بقیہ عمر اپنے نابینا اور پاگل محبوب کی تیمارداری میں گزار دیتی ہے۔

لیکن ان تمام یادوں سے زیادہ تلخ اور جانگزا یاد اس حُسنِ آسمانی کی ہے۔ جس کو ہم نے کبھی آسمانوں پر دیکھا تھا۔ لیکن یاد مدت العمر ہمارے تحت الشعور میں جاگزیں رہتی ہے۔ اس کا نقشہ کبھی بھی ہمارے ذہن و دماغ سے محو نہیں ہوتا ہماری آنکھیں غیر محسوس طور پر اسی حُسنِ ازل کے دیدار کی متلاشی رہتی ہیں۔ اس معشوقِ ازلی کا عشق ہمارے غموں کو دوبالا کر دیتا ہے اور ہماری زندگی سوگوار تر ہو جاتی ہے خاص طور پر اس وقت تو ہماری بے چینی اور ہمارے کرب کی کوئی انتہا ہی نہیں رہتی جب کبھی ہم کو اس معشوقِ حقیقی کا پرتوِ جمال کسی مخلوقِ ارضی میں نظر آ جاتا ہے پھر ہم مجسم شعلہ بن جاتے ہیں اور ہماری زندگی یکسر آتش زارِ سوزِ عشق بن جاتی ہے۔

قصہ کوتاہ، میں اپنے کتب خانہ کی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ دل پر ایک عجیب قسم کی مایوسی اور مردنی سی چھا رہی تھی۔ اور میری جان شمع کی طرح گھُلی جا رہی تھی۔ ایکدم میں نے محسوس کیا کہ میں اسی حسنِ ازل کا بہت دیر سے دیدار کر رہا ہوں میرے مکان کے سامنے والے مکان کے بالاخانے کی کھڑکی کے پیچھے سے ایک حسین چہرہ جھانک رہا تھا میں نے محسوس کیا کہ یہ تو وہی مجسمۂ حسن ہے جس کی میری روح اتنے عرصہ سے متلاشی تھی۔

بےفکری، آزاد خیالی، سکونِ قلب اور آسودگیٔ دماغ کا جو گھروندا میں نے عمر بھر کی محنت اور کوشش سے بنایا تھا یکبارگی منہدم ہو گیا۔ میرے انتشار کی کوئی حد نہ تھی میں نے مجبوراً اپنی کتابوں کی آغوش میں پناہ ڈھونڈی اور دنیا کے بڑے بڑے مفکرین کے رشحاتِ دماغ سے استفادہ کرنا چاہا۔ میں نے بہت کچھ پڑھا لیکن بالکل خالی الذہن رہ کر یعنی میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں جو چہرہ میں نے کھڑکی میں دیکھا تھا وہ میرے قلب و دماغ پر اس قدر چھا گیا کہ مجھ کو سوائے اس کے اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ مجھ کو اپنی اس پسپائی اور ہزیمت خوردگی پر سخت افسوس اور ندامت تھی لیکن میرے حواس سلب ہو چکے تھے۔ ہر چند میں نے اپنے تئیں سمجھایا بالکل اسی طرح جیسے کسی بچے کو بہلایا کرتے ہیں۔ شدتِ جذبات میں میری آواز بلند ہو گئی یہاں تک کہ میری بیوی نے سمجھا مجھ کو مالیخولیا ہو گیا ہے اور میں ہذیان بک رہا ہوں۔ وہ میرے کمرے میں گھس آئی اور گڑگڑا کر میری اس غیر حالت کا سبب پوچھنے لگی۔ میں نے کہا "میں ایک افسانہ پڑھ رہا تھا اور محبت کرنے والوں کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ واقعی تم بھی تو سوچو آخر یہ حماقت کیا ہے جس میں لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اور خواہ مخواہ اپنے تئیں اس آتشِ ملتہب میں جلاتے جھلساتے ہیں"۔ میری بیوی نے اپنے جواب سے مجھ کو چونکا دیا،

اس نے کہا "محبت ہماری اختیاری چیز نہیں ہے۔ تم تو کتاب کے کیڑے ہو۔ تمہیں تو اس بات کا علم مجھ سے زیادہ ہونا چاہیئے۔" میں نے تنک کر کہا "اس مہمل بات کے چکر سے نکلو محبت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ عاشق مزاج لوگوں نے اپنی عیب پوشی کے لئے یہ حربہ ایجاد کیا ہے کہ محبت بے اختیاری ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر محبت فی الحقیقت کوئی ایسی ہی حسین و جمیل چیز ہے جیسی ہمارے شاعر اس کو باندھتے ہیں تو واقعی یہ سخت مضحکہ خیز اور قابلِ احتراز شے ہونی چاہیئے۔ کوئی ذی فہم انسان یہ پسند نہ کریگا کہ خود کو بھی ہلاکت میں ڈالے اور کسی دوسرے کو بھی خواہ مخواہ تنگ اور پریشان کرے۔" میری بیوی کی آنکھوں میں بیچارگی اور بے بسی کے آنسو امنڈ آئے اور اس نے ایک آہ بھر کر کہا "میرا دل ہمیشہ ایک عاشق صادق کے لئے تڑپا کیا ہے کیونکہ دنیا کہتی ہے کہ محبت انسان کی رگ رگ میں گرمی کی رَو دوڑا دیتی ہے۔ واقعی اس گرمجوشی اور اس آسمانی مسرت کے بغیر زندگی کس قدر وبال ہے۔ کاش تم ——"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا لیکن وہ بیچاری عورت یہ نہ جانتی تھی کہ اس کے یہ بے ہنگام گلے شکوے خود اسی کے حق میں کس قدر مضر تھے۔ میں نے گفتگو کا رُخ بدل دیا اور ہم خانہ داری کی غیر متعلق باتیں کرنے لگے اور تمام دن اسی طرح گذر گیا اگلی صبح کو میں اس طرح بستر سے اٹھا جیسے میں نے کوئی پریشان خواب دیکھا ہو۔ پھر وہی کھڑکی والی شکل میرے دل و دماغ پر مسلط تھی۔ کبھی میں اپنے اوپر ہنسنے لگتا اور کبھی مجھ کو اپنی فوقیت پر ناز ہونے لگتا کہ میں ظاہری نمود کے سراب میں نہیں پھنستا۔ جب مجھ کو اپنی قوتِ ضبط اور استقلالِ مزاج پر پورا بھروسہ ہو گیا اور مجھ کو یقین ہو چلا کہ میں اس جال میں پھنسنے والا نہیں ہوں تو میں نے اس میں کوئی ہرج نہ دیکھا کہ وہ کھڑکی والی شکل میرے ذہن کے پردے پر بدستور جمی رہے۔ بعض دفعہ ہمارا مرغِ تخیل مصروفِ پرواز ہو جاتا ہے، اور ہم فضائے بسیط میں محوِ طیران ہو جاتے ہیں۔ ہم ایک ایک ستارے کو گھورتے ہیں بقا کی تلاش میں۔ ہم تڑپنے لگتے ہیں اس گوشۂ عافیت کی تمنا میں جہاں مسرت ہی مسرت ہو اور رنج و غم کا گذر نہ ہو، ہماری آنکھیں اس شاہدِ معصوم کو دیکھنے کے واسطے بیتاب ہوتی ہیں جس کا دامن ہر قسم کی برائی سے پاک ہو۔ عالمِ تصور میں میں اکثر دیکھتا تھا کہ اپنے سامنے والے مکان کے بالائی کمرے میں اسی خوبصورت چہرے والی لڑکی کے قدموں میں پڑا اس کی منت سماجت کر رہا ہوں (لڑکی نے بھی کھڑکی میں سے مجھے دیکھ لیا تھا اور مجھ پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئی تھی) محبت کی دنیا میں ہم چین کی زندگی گزار رہے ہیں محبت کے لئے ہمیں نہ کسی قول و قرار کی ضرورت تھی نہ عہد و پیمان کی۔ قصرِ محبت کی تعمیر قربانی کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ شرائط اور دیگر قیود کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا میری دنیا بدل چکی تھی۔ مجھ کو اپنے اہل و عیال کی طرف سے بالکل لاپروائی ہو گئی تھی۔ میرے دل و دماغ پر میری محبوبہ اس درجہ رچ گئی تھی کہ مجھ کو سوائے

اس کے کچھ اور نظر ہی نہ آتا تھا اور نہ میں کسی کو درخورِ اعتنا سمجھتا تھا۔ مجھ کو اپنی اس بدلی ہوئی حالت پر افسوس ہونے کے بجائے فخر تھا اور دنیا والوں کے طعن و تشنیع کی میں بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ پذیرائی کرتا تھا گویا یہ بھی ایک اعزاز تھا۔ جس فہم و دانش اور عقل و ہوش کو میں نے اپنا رہبرِ خصوصی بنا رکھا تھا وہ اب میرے دل میں نوکِ خار کی طرح کھٹکتے تھے اور میں ان کا اس طرح مذاق اڑاتا تھا کہ اے عقل و بصیرت باوجود تمام عمر کی کوشش کے تو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی لیکن میں نے بغیر کسی کی مدد کے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ میرا عشق مجاز کی حدود سے بالاتر ہو کر علوی درجہ حاصل کر چکا تھا دنیوی بیم و رجا، خوف و ہراس، غمِ ماضی اور اندیشۂ مستقبل کا مسکن ہوتا ہے اس میں محبت اور دیگر لطیف جذبات کا گزر ناممکن ہے۔

پہلے میں سمجھتا تھا کہ میرا دل کبھی بے قابو نہیں ہو سکتا لیکن اب میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا دماغ میرے دل کا تابع فرمان ہو چکا تھا۔ میرے دل اور دماغ کے درمیان ایک شدید کشمکش جاری تھی اور میں بالکل بے بس تھا محض خیالات کی بنا پر کسی کو موردِ الزام نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تک میرے دامنِ اخلاق پر کسی گناہ کا داغ نہ تھا۔ اگلے روز جب کہ میں اپنے مکان کو واپس آ رہا تھا راستہ میں اپنے ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ مختصراً یہ کہ اس نے مجھ سے کہا کہ میرے مکان کے سامنے والے مکان میں جو نوجوان لڑکی رہتی ہے اس سے وہ محبت کرتا تھا اور ان کی آپس میں شادی بھی طے ہو گئی تھی لیکن میرے دوست کی کسی لغزش کی وجہ سے یا لڑکی کے انتہا سے زیادہ ناز و انداز کی بنا پر ان دونوں ان دونوں میں کچھ ناچاقی ہو گئی تھی اور لڑکی نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ اپنا حال بیان کر دینے کے بعد میرے دوست نے میری مدد چاہی اور مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کے معاملہ کو سلجھا دوں اور لڑکی کو شادی کے لئے پھر رضامند کرا دوں۔

اول تو میں نے ان کے معاملہ میں دخل اندازی سے انکار کیا مگر جب میرے دل میں اس لڑکی سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی تو میں نے اقرار کر لیا کہ میں تا بمقدور اس کی مدد کروں گا۔ اس روز شام کو میں طرح طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی سے کیا کہوں اور کس طرح کہوں۔ اوّل میں نے سوچا کہ مجھے اپنے دوست کی تعریفوں کے پُل باندھ دینے چاہئیں۔ لیکن جو تعریفی فقرے میں نے سوچے ان میں رفتہ رفتہ مجھ کو ہیچ میچ کا رنگ نظر آنے لگا یعنی کہ فی الواقع میں یہ محسوس کرنے لگا کہ میرے دوست میں صدہا عیب اور کوتاہیاں تھیں اور وہ ہرگز اس پری وش لڑکی کے قابل نہ تھا۔ دوستانہ ارتباط اور محبانہ انفعال کوئی بے حقیقت چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ ایک قسم کی آرزوئیں ہیں جن کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ ایک ضرورت پوری ہوئی اور اس کی جگہ بیسیوں اور پیدا ہو گئیں

جب میں اس لڑکی کے بالمشافہ بیٹھا تو میرے دل میں متضاد خیالات و محسوسات موجزن ہونے لگے۔ لیکن میں نے اپنے ناروا ارادوں کو ایک طرح

کی بے نیازی اور استغنا کے پردے میں چھپائے رکھا۔

میرا اصل مقصد وہاں جانے سے اپنے دوست کی سفارش کرنا تھا لیکن جب میں نے سنا کہ لڑکی کی شکایات بجا تھیں۔ تو میں نے نہ صرف اس کی ہاں میں ہاں ملائی بلکہ میں نے بھی اپنے دوست کے عیبوں کا دفتر کھول کر رکھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے اس کے کہ وہ میرے دوست کو درگزر کرتی اس کو ایسے ایسے عیوب اور کوتاہیاں معلوم ہوگئیں جن کا علم اس کو پہلے تھا بھی نہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے گفتگو کا رُخ بدل دیا اور ہم دونوں بے تکلف ہو گئے اثنائے گفتگو میں میں نے بھانپ لیا کہ اس لڑکی کی پسند ونا پسند کی کیا کیا چیزیں ہیں۔ اس علم کی بنا پر اس لڑکی کو خوش کر لینا کوئی مشکل کام نہ رہ گیا۔ دوسرے یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک دلِ گرم کو خوش کر لینا بہت آسان ہوتا ہے

محبّت در دلِ غم دیدہ الفت بیشتر گیرد ؎
چراغے را کہ دودے ہست در سر زود در گیرد

جن کو نا امیدی سے کبھی واسطہ نہیں پڑا صرف وہی لوگ عجز وانکسار پر قہقہہ زن ہوتے ہیں ممکن ہے کہ جو کچھ میں نے اس سے کہا اور اس نے مجھ سے وہ میں الفاظ میں بیان کر دوں لیکن جو نظروں نظروں میں طے ہو گیا اس کے بیان پر الفاظ کو قدرت کہاں؟ اگرچہ اس پہلی ملاقات میں شادی کا ذکر الفاظ میں نہیں ہوا لیکن ہماری نظروں نے جو قول وقرار کر لیے وہ تحریری عہد وپیمان سے مستحکم تر تھے۔ اس ملاقات میں طے ہوا کہ میں اگلے روز رات کو ذرا سویرے آؤں۔ جب میں اس فردوسِ ارضی سے واپس ہوا تو میں بھول چکا تھا کہ میں کس دنیا میں ہوں۔ جب میں کچھ دُور عالمِ بے خیالی میں گھوم چکا تو مجھ کو احساس ہوا کہ میں سڑک پر چل رہا ہوں اور مجھے گھر جانا ہے۔ گھر کا خیال کرتے ہی مجھ پر بے طرح خوف طاری ہو گیا۔ میرے قدم خود بخود پیچھے ہٹنے لگے۔ آخر کار دو تین گھنٹے تک اِدھر اُدھر ٹہلتے رہنے کے بعد مجھ میں اتنی ہمت پیدا ہو سکی کہ میں اپنے گھر پہونچنے کا ارادہ کرکے اس ڈر سے کہ کوئی جاگ نہ اُٹھے نہایت ہوشیاری اور احتیاط کیساتھ دبے پاؤں اپنے سونے کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

میں نے ایک سخت دہشتناک خواب دیکھا۔ جب میں جاگا تو میرا تمام جسم بُری طرح کانپ رہا تھا۔ رات کی اندھیاری اور اپنے دل کی سیاہی میں میں نے دیکھا کہ میری بیوی بستر پر مُردہ پڑی ہے۔ میں زور سے چیخا "میں نے اس کو قتل کیا ہے"! "ہاں میں نے تجھ کو قتل کیا ہے۔ اور ٹھیک کیا جو تجھ کو مار ڈالا۔ تجھ میں اس لڑکی کی سی خوبصورتی کیوں نہیں تھی؟ تو نے اس لڑکی کو اس محبت میں کیوں خیانت کرنے دی جو تیرا حق تھی؟ میرے اس ارتکابِ جرم کی ذمہ دار تو ہی تو میرے ان الفاظ کو کیوں قرینِ عقل سمجھتی رہی؟ کیا تو نہیں جانتی تھی کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں رنت العمر بچوں کی طرح ایک عشق میں مبتلا رہوں گا۔ تو میری تفریح اور دلبستگی کے سامان کیوں مہیا نہ کرتی رہی؟ تو سمجھتی رہی کہ صرف بیوی ہونا ہی کافی ہے۔ تجھ کو چاہیئے تھا کہ تو مجھے احمق جان کر مجھ پر اور میری باتوں پر خندہ زن رہتی۔ تو نے میری بیوی بن کر لیکن میرے دل کو سوئے بغیر قلعہ تو فتح کر لیا لیکن اس کے دروازے کو غنیم کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ تو نے جس دل کو پایا تھا اس کو اپنے قبضہ اور قابو میں رکھنا تیرے لئے دشوار تھا۔ اب اپنی اس فروگذاشت کی سزا بھگت"!

جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنے پلنگ پر بیٹھا تھا اور میری بیوی اپنے پلنگ پر بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے چیخنا چاہا لیکن میری آواز گلوگیر ہو گئی۔ میں کانپنے لگا اور میرا سینہ گھٹی ہوئی آوازوں کی وجہ سے پھٹنے لگا۔ "آ۔ میری مدد کو آ۔ کیا تجھ کو نظر نہیں آرہا ہے کہ میرا دماغ بہکا جا رہا ہے۔ اُٹھ، تجھ کو میری محبت کا واسطہ۔ آ۔ اور اپنے ناز وانداز کے حربے بروئے کار لا۔ اس لڑکی سے زیادہ دلکش اور دلربا بن کر مجھ کو پھر جیت لے۔ جاگ اور دیکھ کہ میں کس بلائے عظیم میں مبتلا ہوں۔ اُٹھ۔ مجھ سے باتیں کر۔ مجھ میں کھوئی ہوئی ہمت واپس لا۔ مجھ کو سمجھا۔ میرے اور اپنے حال پر رو اور میرے دل کو گرما دے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ۔۔۔ بہتر ہو کہ تو نہ اُٹھے اور میری آواز نہ سُنے۔ گو اس وقت میرا جسم ایک شعلہ زار بنا ہوا ہے لیکن میں اسی حال میں خوش ہوں۔ تیرے قتل اور خود اپنے قتل ہی میں مجھ کو لذت مل رہی ہے وہ کون سی لذت ہے جس نے قتل کو میرے لئے لذت بخش بنا دیا ہے؟ اپنے جان ودل کا میں کیسا سودا کر رہا ہوں؟ میں اپنے افعال پر کیوں نادم نہیں ہوں اور اپنی زبوں حالی پر کیوں خوش ہوں؟ رحم وکرم، عفو ودرگزر کا وہ مادہ کیا ہوا؟ کیا میری وہ مستقل مزاجی محض ہوائی اور بے بنیاد تھی؟

یا اللہ! تو نے مجھ کو حسین بنایا ہی کیوں؟ نہیں اصل وجہ یہ نہیں ہے۔ میں دیدہ ودانستہ گناہ کر رہا ہوں میں جانتا ہوں وہ دغا ناآشنا مجھ کو دل سے نہیں چاہتی۔ وہ میری ثروت پر فریفتہ ہے۔ تو پھر آخر کیوں میں علم کے ہوتے ہوئے اپنے تئیں اس دامِ فریب سے نہیں نکال لیتا؟ کیا ہر شخص میری ہی طرح فریب کے جال میں پھنس جاتا ہے یا میں ہی اس قدر سادہ لوح واقع ہوا ہوں؟ لیکن آہ۔ یہ فریب بھی کس قدر شیریں ہے! اور یہ دھوکہ بھی کتنا پیارا اور حسین! اگلا تمام دن اسی پیچ وتاب اور اُدھیڑ بن میں گذرا۔ شام کو کچھ تحائف لیکر میں اس بہشتِ ارضی کی طرف چل دیا۔ ابھی میں نے دروازے پر دستک نہ دی تھی کہ اپنے پیچھے میں نے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنی پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا وہی دوست تھا جس کی اس لڑکی سے ناچاقی ہو گئی تھی حُسنِ اتفاق سے اس وقت وہ اس قدر سرشارِ مسرت تھا کہ اس نے میری حالتِ زار کا اندازہ نہ لگایا بلکہ منکر بولا "میں آپ کا بیحد ممنون واحسانمند ہوں کہ آپ نے میری سفارش اس قدر پُر زور الفاظ میں کی کہ میری محبوبہ مجھ سے پھر خوش ہو گئی۔ آج صبح جب میں اس کے پاس گیا تو ہماری صلح ہو گئی اور اب جلد ہماری شادی ہونے والی ہے۔" میں نے کہا "خدا کا شکر ہے"۔ اور یہ کہکر میں الٹے پاؤں وہاں سے لوٹا۔ ہر چند اپنے مجبور وکام گر میں اس کی گرفت سے نکل آیا بعجلت تمام گھر پہونچا، اور جو تحائف میں اس لڑکی کو پیش کرنے کیلئے لے گیا تھا ان کو میں نے اپنی بیوی کے قدموں میں ڈال دیا اور اس کے سینے سے چمٹ کر نہ معلوم کبتک روتا رہا۔" کمال نے قصہ بیان ختم کیا اور کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہنے لگا "اب میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کی راہ کس قدر پھسلواں ہے!

ازور طۂ ما خبر ندارد ؎ آسودہ کہ بر کنارِ دریاست

نغمۂ ساز

نگاہِ لطف مت اٹھ خوگرِ آلام رہنے دے
ہمیں ناکام رہنا ہے ہمیں ناکام رہنے دے

کسی معصوم پہ بیداد کا الزام کیا معنی
یہ وحشت خیز باتیں عشقِ بدانجام رہنے دے

ابھی رہنے دے دل میں شوقِ شوریدہ کے ہنگامے
ابھی سر میں محبت کا جنونِ خام رہنے دے

ابھی رہنے دے کچھ دن لطفِ نغمہ مستیٔ صہبا
ابھی یہ ساز رہنے دے ابھی یہ جام رہنے دے

کہاں تک حسن بھی آخر کرے پاسِ رواداری
اگر یہ عشق خود ہی فرقِ خاص و عام رہنے دے

خدا کے "صنم خانوں" سے یہ پیغام آیا ہے
ابھی خود کو اسیرِ گیسوئے اسلام رہنے دے

یہ اپنی رندی مجازؔ اک شاعرِ مزدور و دہقاں ہے
اگر شہروں میں وہ بدنام ہے بدنام رہنے دے

— اسرار الحق مجازؔ

دھنک

شفیق بانو شفق

بے خبر

میں کچھ کہنا چاہتی تھی ——
وقت گذرتا چلا گیا لیکن کہہ نہ سکی ——
میرا صیاد پنجرہ میں رکھ کر بے خبر ہو گیا ——
دل کی بات دل ہی میں رہی ——
نہ جانے میں کیا کہتی ؟ دل میں دھواں اٹھ اٹھ کے رہ گیا ——!!

سپاہی ——!!

تم جا رہے ہو؟ میرا دل دھک دھک ہو رہا ہے۔
ایک ہی بھائی جس کے ہو وہ پھر کیا کرے ؟
سپاہی ایک شان لیے مسکرایا۔ بہت پگلی تو صرف بہن ہے تیرا دل صرف ایک بہن کا ہے۔ ہاں میں جا رہا ہوں —— قوم کا سپاہی پہلے ہوں —— تیرا بھائی وہاں سے واپس آ کر ہوں گا ——

بہن

ایک بہن دوسری کے ہاں شادی کے بعد گئی —— ملنے والیوں نے کہا "آپ کی تعریف ؟" مغرور دولت مند بہن نے جواب میں کہا "کچھ نہیں صرف میری انا کی کچھ رشتہ کی ہوتی ہیں ——"
غریب بہن سنتے ہی چشم نم اٹھی اور عالی شان ایوان سے باہر نکل گئی ——!!

ادیب

عوام نے رائے پاس کی —— ادیب کی زندگی کس قدر رنجیدہ گذرتی ہے ؟
پاس ہی شاعر کھڑا تھا —— مسکرایا ——
کاش ادیب کے دل کو کوئی سمجھ سکتا ——!!

ڈاک کے کرشمے

"سینٹ مارٹنس لاگرانڈ" (لندن) جو دشمن کی بمباری سے بہت کچھ تباہ ہو چکا ہے، دنیا کے بہترین ڈاک کے محکمہ کا صدر مقام ہے۔ لڑائی سے پہلے برطانوی محکمۂ ڈاک کے ماتحت محض لندن میں پچیس ہزار ڈاکخانے تھے، تین لاکھ آدمی ان میں ملازم تھے، پچاس کروڑ پونڈ اس کے بنک میں جمع تھے، آٹھ ارب خط اور پارسلیں سالانہ آتی جاتی تھیں اور کروڑوں ٹیلیفون اور تار آتے جاتے تھے۔ اس کی سال بھر کی کاروباری رقم کی مقدار ایک ارب پونڈ تک پہونچی تھی لیکن لڑائی نے اس محکمہ میں ہزاروں گنی مشکلات اور ذمہ داریوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس کے ساڑھے تہتر ہزار سے بھی زیادہ تجربہ کار مرد ملازموں کو فوجی خدمات اختیار کرنا پڑیں جس کی وجہ سے ایک لاکھ سے زیادہ عورتیں ملازم رکھی گئیں۔ ان میں سے سولہ سو عورتیں انجنیئر ہیں۔ چھوٹے ڈاکخانوں میں سے تقریباً ایک تہائی عورت افسروں کے ماتحت ہیں۔ ان سترہ ہزار گاڑیوں لاریوں، ٹھیلوں اور موٹر سائکلوں میں سے جو ڈاک کے حمل و نقل کے سلسلہ میں کام آتی ہیں اور سال بھر میں تقریباً بیس کروڑ میل کی مسافت طے کرتی ہیں، بہت سی ایسی ہیں جنکو لڑکیاں ہی چلاتی ہیں۔

لندن کا صدر ڈاکخانہ دنیا کے سب سے بڑے بنکوں میں سے ہے۔ اسی سال پہلے جب اس ڈاکخانہ نے اپنے ہاں روپیہ جمع کرنیکا سلسلہ شروع کیا تو انگریز قوم کو اس بات کا فخر حاصل ہوا کہ ان کا ملک دنیا میں پہلا ملک تھا جہاں روپیہ جمع کرنیکا ایسا بنک تھا جسکو حکومت کی پشت گرمی حاصل تھی۔ آج اس ڈاکخانہ میں ایک کروڑ ستر لاکھ سے زیادہ لوگوں کے حساب کھلے ہوئے ہیں۔ اسکی شاخیں تمام حدودِ سلطنت میں قائم ہیں اور ہیشیار سویلین، فوجی، ہوا باز اور ملاح اسکی شاخوں میں روپیہ جمع کرا کر جنگی امداد بہم پہنچاتے ہیں۔

چوہتر سال ہوئے جب جرمنوں نے پیرس کا محاصرہ کر رکھا تھا تو چھوٹے چھوٹے قلموں پر لکھی ہوئی فوجی اطلاعات کبوتروں کی دُموں میں باندھکر اِدھر اُدھر بھیجی جاتی تھیں۔ گزشتہ چار سال میں ایئرگراف خطوں نے بہت کچھ ترقی کر لی ہے۔ اب وہ کبوتروں کی جگہ ہوائی جہازوں سے بھیجے جاتے ہیں اور سمندر پار گئی ہوئی برطانوی فوجوں، گھروں پر مقیم سپاہیوں کے کنبوں اور دوستوں کے لئے ایک بڑی نعمت بنے ہوئے ہیں۔ اس قسم کے خطوط کا جدید ترین طریقہ انگلستان کے صدر ڈاکخانہ نے مئی سنہ ۱۹۴۱ء میں بہم پہنچایا۔ اسوقت سے آجتک تقریباً تیس کروڑ ایئرگراف خطوں کی ترسیل ہو چکی ہے۔ سب سے پہلے پیغام رسانی کا یہ طریقہ مشرق وسطیٰ کی فوجوں کے لئے استعمال کیا گیا تھا لیکن اب چوبیس ملکوں میں فوجوں کے لئے اور تیس علاقوں کے شہریوں کے واسطے اسکا استعمال ہو رہا ہے۔ فوجوں میں دن دونے اضافہ کی وجہ سے ڈاک کے محکمہ کی سرگرمیاں بھی بڑھتی رہیں۔ فوجی تربیت گاہوں میں کام سیکھنے والے سپاہیوں اور مختلف جنگی محاذوں پر لڑنے والی فوجوں کے واسطے سینکڑوں عارضی ڈاکخانے کھولدیئے گئے ہیں۔ سپاہی کہیں بھی ہو جنگل بیابان میں، کسی پہاڑی علاقہ یا چٹیل میدان میں وہ ہر وقت اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ خط و کتابت رکھ سکتا ہے اور اپنے روپیہ پیسہ کو ڈاکخانہ کے بنکوں میں محفوظ کرا سکتا ہے۔

ڈاک خانہ کی بڑھی ہوئی سرگرمیوں کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ تین کروڑ ڈاک کے ٹکٹ روزانہ چھپتے ہیں۔ ایک خاص قسم کا کاغذ استعمال کیا جاتا ہے اور بہت ہی صاف اور خالص گوند لگایا جاتا ہے تاکہ زبان کو بُرا نہ لگے۔ ڈیڑھ سو ٹن گوند اس کام کے واسطے برطانوی سوڈان سے لایا جاتا ہے۔ سوڈان کا علاقہ دس لاکھ مربع میل ہے اور یہاں بھی برطانوی ڈاک کا طریقہ رائج ہے۔ وادی حلفہ اور ملاکال کے درمیان تو ہوائی راستہ ہے لیکن جو دور دراز مقامات اس ہوائی راستے کے مشرق یا مغرب میں واقع ہیں وہاں خط موٹر لاریوں کے ذریعہ پہنچائے جاتے ہیں بشرطیکہ موسم اجازت دے ورنہ بیل گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں۔ سوڈان کے ٹکٹوں پر ڈاک سے لدے ہوئے اونٹ کی تصویر بنی رہتی ہے۔ حقیقت میں اونٹ ہی اس لق و دق صحرا میں کام آسکتا ہے۔

شمالی ڈاکخانے

برطانوی حدودِ سلطنت میں ایسے بھی مقامات ہیں جہاں ڈاک سال بھر میں صرف ایک دفعہ پہنچ سکتی ہے وہ بھی اس صورت میں کہ موسم موافق ہو۔ کچھ عرصہ ہوا کنیڈا کی سرکاری سوار پولس نے پونڈس انلٹ بیفن لینڈ اور ایلزمیر لینڈ میں ڈاک خانے قائم کئے تھے۔ یہ ڈاک خانے دنیا میں سب سے زیادہ فاصلہ پر ہیں۔ یہاں سے قطب شمالی صرف آٹھ سو میل رہ جاتا ہے۔ جب برف پگھلنے لگتی ہے تو ایک افسر کو پوسٹ ماسٹر بنا کر اسطرف بھیجدیا جاتا ہے یہ افسر جہاز کے ذریعہ جاکر وہاں کے رہنے والے جلاوطنوں کو سال بھر کی خبریں پہنچاتا ہے۔

انگلستان کے محکمۂ ڈاک نے بہت سی عجیب غریب باتیں بھی کی ہیں۔ عرصہ ہوا کُتے اور گائیں ڈاک کے ذریعہ بھیجی گئی تھیں۔ لیکن اب تو اور بھی حیرت انگیز کام کئے جارہے ہیں یعنی بم، شیل، بارود کے چھلّے اور بہت سے آتش گیر مادے ڈاک میں بھیجے جارہے ہیں۔ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے ہی برطانیہ کیلئے سمندر پار ملکوں کے ساتھ رسل و رسائل کا معاملہ بہت اہم ہو چکا تھا کوئی سو سال ہوئے کہ نوا سکوشیا کے ایک نوجوان کو اس کام کا ٹھیکہ ملا کہ وہ ہر پندرہ روز سے اٹلانٹک پار ڈاک پہنچانے کا انتظام کرے۔ اس نوجوان کا نام کنارڈ تھا۔ آج اگر ہم کو سر سیموئل کنارڈ کی ابتدائی مساعی کے نتیجہ کا اندازہ لگانا ہے تو ہم کوئن میری اور کوئن الیزبتھ نامی جہازوں کا تصور باندھ لیں۔ موخرالذکر دنیا کا سب سے بڑا جہاز ہے۔

مارٹن تھورن ہل

جرمنوں کے پیاپے شدید ہوائی حملوں کے باوجود انگلستان میں ڈاک کا سلسلہ

کس طرح قائم رہ سکا؟ سنہ ۱۹۴۰ء میں بہت سے ڈاکخانے اور ٹیلیفون گھر برباد ہوئے۔ اور جرمن بموں کی بارش نے تاروں اور ٹیلیفون کے پورے تار و پود کو منتشر کر دیا تھا لیکن یہ نقصانات عارضی ثابت ہوئے اور بموں کی یہ تباہ کُن زیادہ شدید ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ تحفظ کے جو طریقے اختیار کئے گئے وہ خود محکمۂ ڈاک کے کارکنوں کی ذاتی کوششوں اور ذکاوت کا نتیجہ تھے اور اسی وجہ سے لاکھوں روپیہ کی بچت بھی ہوئی اور ڈاک کے حسنِ انتظام میں بھی زیادہ فرق نہیں آیا۔ رسل و رسائل کے ذرائع میں کفایت در کے ساتھ عمدگی برقرار رکھنے کے لئے ڈاک خانہ کے عملہ سے طرح طرح کی تجاویز دریافت کی گئیں اور ایک سے لے کر بیس پونڈ تک فی کس انعام دیا گیا۔

معمولی اور مقررہ کاروبار کے علاوہ انگلستان کے ڈاک خانہ نے بہت سی سماجی خدمات بھی انجام دیں۔ لاکھوں کتابیں، رسالے اور اخبار جمع کئے گئے جو سپاہیوں کو تقسیم ہوئے۔ بڑے دن کے موقع پر ہر سال لاکھوں بچوں کے خط بڑے دن کے تحفوں کے واسطے "سنٹا کلاس۔ جی۔ پی۔ او۔ لندن" کے پتہ پر آئے اور لاکھوں خوبصورت پارسل ہر سال خاص بڑے دن پر ان بچوں کے گھر بھیجے گئے۔ پارسلوں کے ساتھ سنٹا کلاس کا اپنا خط بھی ہوتا تھا۔ یہ تحفے اس رقم میں سے خریدے گئے جو ڈاک خانے کے ملازموں نے ان غریب بچوں کیلئے آپس میں چندہ کر کے جمع کی تھی۔ لڑائی کے زمانہ میں اور اس سے پہلے بھی صرف لندن ہی کے لوگ بڑے دن کے موقع پر دس کروڑ خط اور نو لاکھ پارسلیں روزانہ ڈاک سے بھیجتے ہیں۔

زبان کا مسئلہ چونکہ یورپ کے ہر ملک کے پناہ گزین انگلستان میں آکر مقیم ہو گئے تھے اس لئے زبان کا مسئلہ زیر غور ہوا اور اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ایک علیحدہ محکمہ کھولا گیا۔ اس محکمہ میں دنیا کی ہر زبان کو جاننے اور سمجھنے والے موجود ہیں خواہ وہ چینی ہو، روسی ہو، یونانی ہو غرض دنیا کے کسی حصہ کی ہو۔

انگلستان میں پہلا پوسٹ ماسٹر جنرل سنہ ۱۵۴۰ء میں مقرر ہوا۔ اسکی تنخواہ ستر پونڈ سالانہ تھی۔ لیکن یہ اس زمانہ کی بات ہے جب نہ ہوائی ڈاک کا قاعدہ تھا، نہ سفری ڈاک خانے تھے۔ ایسے ڈاک خانوں کی تعداد اب ستر سے اوپر ہے۔ یہ سفری ڈاک خانے بہت تیز چلنے والی ریلوں میں ہیں اور رات کے وقت جبکہ ریل اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہوتی ہے تو ڈاک خود بخود اسمیں لے لی اور دیدی جاتی ہے۔

پہلے بھلا کس کو خیال ہو سکتا تھا کہ زمین دوز ریلیں بھی کبھی ہونگی اور یہ ڈاک کے لانے اور پہنچانے کا کام انجام دیں گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ لندن کے نیچے ایک ایسی ریل بھی ہے جسکو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن وہ ہر سال ڈاک کے ایک کروڑ بنڈل خاص خاص سارٹنگ آفسوں میں لاتی اور لے جاتی ہے۔ ان ریلوں میں نہ کوئی ڈرائیور ہوتا ہے، نہ کنڈکٹر نہ مسافر۔ عجیب ریلیں ہیں یہ بھی، بھوتوں کی ریلیں کہنا چاہیئے ان کو۔

اس ڈاک کے سسٹم کی ایک اور خاص چیز بولتا چالتا گھنٹہ (SPEAKING CLOCK) ہے۔ یہ بالکل نئی چیز ہے۔ دنیا بھر میں یہ "ٹم" (TIM) کے نام سے مشہور ہے ٹیلیفون کے ذریعہ ساڑھے بارہ کروڑ لندن کے رہنے والے اس کی شیریں آواز میں وقت معلوم کر چکے ہیں۔ انگلستان میں ریڈیو ٹیلیفون بھی ڈاک خانے ہی کے ماتحت ہے۔ سب سے پہلے اس کی ترویج انگلستان اور امریکہ میں ہوئی۔

ظاہر ہے کہ اتنے بڑے محکمہ کا 'اسٹورس ڈپارٹمنٹ' بھی اپنا ذاتی ہی ہوگا۔ یہ محکمہ تمام عملہ کی ضروریات کو پورا کرتا ہے پنوں سے لیکر تار کے کھمبوں تک، ڈاک کے ٹکٹوں اور لفافوں سے لے کر پوسٹ بکسوں اور وردیوں تک۔ اس پورے محکمہ پر خاص قسم کے ماہرین کی کڑی نگرانی رہتی ہے۔

اس وقت انگلستان کا پوسٹ ماسٹر جنرل حکومت برطانیہ کے بہت ہی اہم عہدہ داروں میں سے ہے۔ اس کی تنخواہ تین ہزار پونڈ سالانہ ہے۔ اسکا محکمہ دنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ لیکن تین سو سال ہوئے یہ صرف چند ایسے آدمیوں پر مشتمل تھا جو ٹھگوں اور لٹیروں کی وجہ سے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ڈاک ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کرتے تھے۔

ملایا

ملایا کا رقبہ باون ہزار مربع میل یا دوسرے الفاظ میں کم و بیش آسام کے برابر ہے۔ لڑائی شروع ہونے سے قبل اس کی آبادی تقریباً پینتیس لاکھ تھی۔ اس میں سے اس سرزمین کے سپوت یعنی ملایائی نصف سے کچھ ہی زیادہ تھے چینی تینتیس فیصدی یا تقریباً بارہ لاکھ۔ ہندوستانی اٹھارہ فیصدی یا تقریباً چار لاکھ ستر ہزار اور اہل یورپ صرف پندرہ ہزار تھے۔ موخرالذکر زیادہ تر سنگاپور میں آباد تھے اور سب کے سب صحیح معنوں میں کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ ان کے خاص مشغلے ربڑ کی کاشت، ٹین کی کانوں کی کھدائی نیز قانونی اور طبی پیشوں سے متعلق تھے۔ ہندوستانی زیادہ تر جنوبی ہند کے باشندے تھے۔ ملایا کے زیادہ لوگ شافعی مذہب سے تعلق رکھنے والے سنی مسلمان تھے۔

جزیرہ نما میں تین مختلف قسم کے نظام حکومت رائج تھے تین ساحلی علاقے سنگاپور، پینانگ، اور ملاکا اسٹریٹس سیٹلمنٹ کہلاتے تھے جو براہ راست برطانوی نظام کے ماتحت تھے۔ چار وفاقی ریاستیں پیراک، سیلانگور، نیگری سیمبلان اور پہانگ اور حدود وفاق سے باہر کی پانچ ریاستیں جوہور، کدہ، کلنتان، ٹرنگانو اور پرلس اپنے ذاتی حکمران رکھتی ہیں جو برطانیہ سے معاہدہ کر لینے کے باعث برطانوی حفاظت میں ہیں۔ ملایا سے برطانیہ کے اولین تعلق کی ابتدا سنہ ۱۶۰۰ء سے ہوتی ہے جب برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک چارٹر کے ذریعہ اجازت دی گئی کہ وہ جزائر شرق الہند میں تجارتی سلسلہ پیدا کرے۔ گویا تجارتی مقاصد کے ماتحت اہل برطانیہ ملایا میں پہنچے۔ بہت عرصے بعد پہلے اہل ڈنمارک نے اور پھر اہل برطانیہ نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ تجارت کرنے کی صورت میں بھی ذاتی محافظت ضروری ہے۔ چنانچہ اس غرض نے برطانیہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے لئے محفوظ علاقے حاصل کرے۔ سنہ ۱۷۸۶ء میں کدہ کے راجہ نے پینانگ کا علاقہ برطانیہ کے سپرد کر دیا سنہ ۱۸۲۴ء میں اہل ڈنمارک نے ملاکا لے لیا سنہ ۱۸۱۹ء میں سلطان جوہور نے برطانیہ کو اجازت دیدی کہ جزیرہ سنگاپور پر قبضہ کر کے وہاں ایک بندرگاہ بنائی جائے۔ اس وقت سنگاپور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں رہنے والے ملایائی مچھلیاں پکڑ پکڑ کر گذارہ کرتے تھے۔ ایک سو سال سے بھی کم مدت میں برطانوی تسلط کی بدولت وہ مختصر سا گاؤں مشرق بعید میں ایک اہم بحری مرکز بن گیا۔ اس جزیرہ نما پر آباد ہونے کے باعث قدرتی طور پر انگریزوں اور اندرونی ریاستوں کے حکمرانوں کے مابین رابطہ ضبط بڑھنے لگا۔ تمام ریاستیں برطانوی اثر میں آ گئیں کیونکہ بحری ڈاکوؤں سے محفوظ رہنے اور مختلف سرداروں کے باہمی جھگڑوں کو چکانے کے لئے ایک اچھے اقتدار کی ضرورت تھی۔ حکومت برطانیہ نے اس تمام عرصہ میں ملایا کے ساتھ تعلقات استوار رکھنے میں اس پالیسی کو مدنظر رکھا کہ باشندگان ملک کے حقوق کا حتیٰ الامکان زیادہ سے زیادہ خیال رکھا جائے۔

اس صدی کے شروع سے جزیرہ نما نے ہر قسم کے میدان عمل میں نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کی۔ سنہ ۱۹۲۲ء تک معیار زندگی بہت بلند ہو گیا تھا، اتنا بلند کہ سنگاپور کے دسطی علاقے میں کافی رقم خرچ کرنے پر زمین خریدی جا سکتی تھی۔ حتیٰ کہ ملایا کی وفاقی ریاستوں میں وہ جنگلات جہاں تک انسان کی رسائی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی پانچ پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے بک گئے۔ پچھلے تقریباً پچاس سال میں اس ملک نے جو پردۂ گمنامی میں تھا اسقدر ترقی کی کہ محض ربڑ اور ٹین کی دو بڑی صنعتوں سے بے قیاس دولت پیدا کر لی گئی۔

ملایا میں ربڑ کا کاروبار شروع ہونے سے پہلے ٹین کی تجارت ہوا کرتی تھی۔ ملک پر برطانوی تسلط قائم ہونے سے قبل ملایا کے حکمرانوں کی روک تھام یا اس وقت کے حالات کے ماتحت چینیوں کو اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ ان قدرتی ذرائع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے لیکن سہولتیں میسر آ جانے کے بعد چینی سرمائے اور مزدور نے مل کر اس صنعت کو زبردست ترقی دینی شروع کر دی۔ سنہ ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ دو یورپین کمپنیاں قائم ہوئیں لیکن بمشکل اس صدی کے ختم ہونے کے قریبی زمانے میں یورپ کے سرمایہ دار ملایا کے ٹین کے کاروبار میں رقم لگانے پر آمادہ ہو سکے۔

اس صنعت کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ رسل و رسائل کے ذرائع نہ ہونے کے باعث ہوئی۔ کیونکہ پہاڑوں کے دامنوں اور دریائی وادیوں سے ٹین کا ذخیرہ لانا لے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ انگریزوں کو جب یہ موقع ملا تو فوراً اپنی تمام تر توجہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے مبذول کر دی۔ دریاؤں کو صاف کروایا گیا اور کانوں سے جہاز رانی کے لائق قریب ترین دریاؤں تک سڑکیں تعمیر ہوئیں۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں سب سے پہلی ریلوے لائن بنی جس نے طائی پنگ کو دریائے لاروٹ کے کنارے بندرگاہ دو پورٹ ویلڈ سے ملا دیا۔ ان صورتوں سے ترقی صنعت کو زبردست تقویت ملی اور سنہ ۱۹۳۹ء میں ملایا سے اتنا ٹین نکالا گیا جو تمام دنیا کی کل پیداوار کے نصف سے زیادہ تھا۔

ٹین کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی زیادہ تعداد چینیوں کی تھی اور ہندوستانی خاص خاص کاموں کے لئے ملازم رکھے گئے تھے۔ چینی زیادہ تر جنوبی چین کے تھے جہاں وہ غلام مزدوروں کی طرح کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ملایا کی صنعتی کانوں میں انہیں اچھی اجرت ملتی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں چینی مزدوروں نے اپنی آمدنی سے جو رقم بچا کر اپنے ملک بھیجی وہ تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ پونڈ تھی۔ بہت سے چینی معمولی مزدوروں سے ترقی کر کے چھوٹی موٹی کانوں کے مالک بن بیٹھے۔

ملایا کی ترقی میں ٹین سے بھی زیادہ ربڑ کی صنعت کو اہمیت حاصل رہی۔ اس جزیرہ نما میں ربڑ کی ترویج پہلے پہل سنہ ۱۸۷۷ء میں ہوئی جبکہ سرکاری حکم سے اس کے بیج برازیل سے لائے۔ بیجوں کے لئے ملایا کی سرزمین بہت ہی راس

سروج کماری

آئی۔ تاہم موٹر گاڑیاں میسر آجانے کے بعد ربڑ کی کاشت وسیع پیمانے پر کی جا سکی۔ ۱۹۰۵ء میں پچاس ہزار ایکڑ زمین زیر کاشت تھی جس سے ہر سال صرف دو سو ٹن ربڑ حاصل ہوتا تھا۔ مگر پیداوار بڑھتی رہی حتیٰ کہ ۱۹۲۰ء میں وہ ایک لاکھ چھیانوے ہزار ٹن یا دوسرے الفاظ میں دنیا کی کل پیداوار کا ۵۳ فیصدی حصہ ہو گئی۔ ۳۹-۱۹۲۰ء کے دوران میں اس صنعت کو بہت سے نشیب و فراز سے گذرنا پڑا۔ ایک بار پیداوار اسقدر ہوئی کہ ربڑ کی قیمت گرتے گرتے دو پیسہ فی پونڈ ہو گئی۔ ۱۹۳۴ء میں ربڑ پیدا کرنے والے ملکوں کی حکومتوں نے ایک معاہدہ کرتے ہوئے پیداوار کی مقدار محدود کردی اور ایک بین الاقوامی ربڑ کمیٹی مرتب کی جس میں تاجر اور خریدار دونوں کی نمائندگی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں اس کمیٹی نے یہی نہیں کہ تمام دنیا کے ذخیرے پر احتساب کیا بلکہ تمام دنیا میں ربڑ کا نرخ بھی یکساں کردیا۔

اس صنعت کے طفیل ملک کے بہت سے اضلاع کارآمد ہو گئے۔ اور ایسے ہزاروں مزدوروں کو روزگار مل گیا جو اس سے قبل نہایت اندوہناک زندگی بسر کر رہے تھے۔ ربڑ کی کاشت کے سلسلے میں زیادہ تر جنوبی ہند یعنی تامل اضلاع کے مزدور ملازم تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ہندوستانی مزدوروں نے جو رقم بچا کر ہندوستان بھیجی وہ ۱۲۷٫۰۸۰ پونڈ تھی۔ اس کے علاوہ مزدوروں نے فالتو رقم سے جو مویشی وغیرہ خریدے، ان کا کوئی حساب نہیں۔ لیکن ان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ان دو بڑی صنعتوں میں برطانیہ کے ارباب حل و عقد نے ...۸۹٫۳۰۰٫۰۰۰ پونڈ کا سرمایہ لگایا۔ ان صنعتوں کے علاوہ برطانوی نظام نے ملایا میں تقریباً ستر سال کے عرصہ میں اعلیٰ قسم کی سات ہزار آٹھ سو میل لمبی تارکول کی سڑکیں تیار کیں، ایک ہزار اڑسٹھ میل کے طول میں ریلوے لائن ڈالی جس پر دو سو چودہ مستقل اسٹیشن قائم کئے اور انچاس ہزار ایک سو یاسی موٹر گاڑیاں بھی بنائیں۔ نیز مفاد عامہ کے بہت سے کاموں پر کثیر رقمیں صرف کیں۔ یہ واضح رہے کہ اس سلسلے میں حفظان صحت کا کام ہرگز ممکن نہ ہوتا اگر ملایا کا طبی محکمہ اپنی کارکردگی نہ دکھاتا۔

اس صدی کے ابتدائی حصہ میں اس جزیرہ نما کی حالت دنیا بھر کے ملکوں میں سب سے زیادہ مضر صحت تھی۔ شروع میں ربڑ کے کھیتوں کو موت کا جال کہا جاتا تھا کیونکہ مزدوروں کے تقریباً پچیس فیصدی افراد ہر سال مر جاتے تھے۔ چنانچہ اس کاشت کے ٹھیکیداروں کی دوکانوں میں سینکڑوں کفن یا تابوت ہر وقت تیار رہتے تھے تاکہ وقت ضرورت کام آسکیں۔ بعض علاقوں میں مزدور حاصل کرنے میں دقت ہوتی اور مجبوراً کاشت کا کام بند کرنا پڑتا۔ ابھی پچیس سال بھی گذرنے نہیں پائے کہ ملیریا پر قابو پا لیا گیا اور چیچک کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ حال ہی میں انسانی مصائب کو کم کرنے کے ان مفید کاموں میں

حال و قال

نفس و روح و خفی و اخفیٰ کیا ہے؟
اس علم تصوّف کا نتیجہ کیا ہے؟
بکواس سے کیا فائدہ امجدؔ صاحب
جب حال نہ ہو، قال میں رکھا کیا ہے؟

امجد حیدرآبادی

ملک پر جاپانی تسلط سے رخنہ پیدا ہوا تاہم برطانوی نظام کے دوبارہ قائم ہوتے ہی حالت بدستور ہو جائیگی۔

دوسرے ایشیائی ملکوں کے مقابلے میں ملایا میں معیار زندگی کسی قدر بلند تھا اور جہاں تک مسرت اور ضروریات زندگی سے مستغنی ہونے کا تعلق ہے اس کی حالت یورپ کے بہت سے ملکوں سے بہتر تھی۔ ملایا کے بیشتر باشندے دیہاتی تھے اور بڑے شہروں میں شاذونادر ہی نظر آتے تھے۔ ہمیشہ ان کی آرزو رہی کہ وہ مالکان اراضی بن بیٹھیں اور اپنی اس مختصر سی دنیا میں چینی یا تامل مزدور ملازم رکھ لیں۔ سرکاری ٹیکس کی برائے نام رقم ادا کرنے کے علاوہ انہیں روپے پیسے کی بہت کم ضرورت ہوتی تھی اور اسی لئے وہ سودخوار مہاجنوں کے چنگل سے دور رہتے تھے۔ وہ اپنے رہنے کے مکان دوست احباب کی مدد سے خود ہی بنا لیتے تھے۔ تعمیر کے سلسلے میں وہ اپنے ہی جنگلوں کی لکڑی اور چھپر کے لئے ایک قسم کے پام کے پتے استعمال کرتے تھے۔ حد سے زیادہ نامساعد حالات میں بھی وہ عام پریشانیوں کی مطلق پروا نہیں کرتے کیونکہ وہ غربت جس کا معیار مغربی نقطہ نظر سے قائم کیا جاتا ہے، بالکل نہیں تھی۔ دن بھر میں کسی جانور کو شکار کرکے یا مچھلیاں پکڑ کے وہ اپنا وقت گذار لیتے تھے اور اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہوتی تو ناریل کے درخت سہل الحصول ہوتے تھے جن سے ان کی بھوک پیاس آسانی سے بجھ سکتی تھی۔ چنانچہ جہاں تک وقتی ضروریات کا تعلق ہے وہ خوشحال نظر آتے تھے۔ محنت شاقہ کے سلسلے میں وہ کسی قدر بے تعلقی کا اظہار کرتے اور چاول کے کھیتوں میں ہل چلانے کے سوا کوئی اور ایسا کام خود نہ کرتے۔ قدرت اہل ملایا پر مہربان تھی اور پھر برطانوی نظام میں ان پر عدل و انصاف اور امن و عافیت کی فضا اسقدر چھائی رہی کہ اطمینان و سکون اور مسرت و شادمانی کی زندگی بسر کرنا ان کے لئے بے حد آسان ہو جاتا تھا۔

جنرلسیمو اسٹالن، صدر ٹرومین اور مسٹر چرچل پوٹسڈم کانفرنس میں

حال ہی میں پوٹسڈم میں تین بڑوں کی کانفرنس ہوئی۔ یہ ریڈیائی تصویر اسی کانفرنس کی ایک نشست کی ہے

...پر «سلطانہ» ثانی اپنے کم سن بچے کے ساتھ۔ یہ بہت جلد مچھلیاں کھانی سیکھ گیا۔

سفید ریچھ

ماں نے بچے کا کان پکڑ کر اٹھالیا۔ اب چونھے مہینے ہیں اسکا وزن تقریباً پانچ سیر ہے۔ پیدائش کے وقت

تالاب کے کنارے پانی پینے کی مشق کرائی جارہی ہے۔ ڈبکار
دے دے کر اسے تیرانا بھی جا چکا ہے۔

میلواکی کے سفید ریچھ واشنگٹن کے چڑیاگھر میں پوری آزاد کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہاں ۳۳ سال کی ایک ریچھنی کا نام «سلطانہ» ہے اسنے چڑیاگھر میں کئی بچے جنے یہانتک کہ اب نانی بن گئی ہے۔ اسکی پہلوٹھی کی بیٹی کا نام «سلطانہ ثانی» ہے۔ جب وہ اپنے بچے کو ساتھ لیکر بڑے فخر و ناز کے ساتھ غار سے باہر آئی تو کٹہرے کے پاس چڑیاگھر کے زائرین کا ٹھٹ لگ گیا۔

فرمانبردار بچہ سر جھکائے ماں کی ہدایات سن رہا ہے۔
زندگی کے یہ لمحے بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔

آج کا چین

صوبہ کوانگسی کے صدر مقام کی ایک سڑک۔ اس شہر نے جنگ کے زمانہ میں بہت ترقی کر لی ہے۔

جہاز بنانے کے ایک زمیں دوز کارخانہ کے دروازہ پر کارخانہ کا مہتمم کاریگروں سے بات چیت کر رہا ہے۔

صوبۂ زیچوان میں ایک نمک کا کنواں۔ اسوقت نمک کو صاف کیا جا رہا ہے۔

دریائے یانگتسی کے کنارے ایک اینجنئری کے کارخانے میں ایک اوزار پر دھار رکھی جا رہی ہے
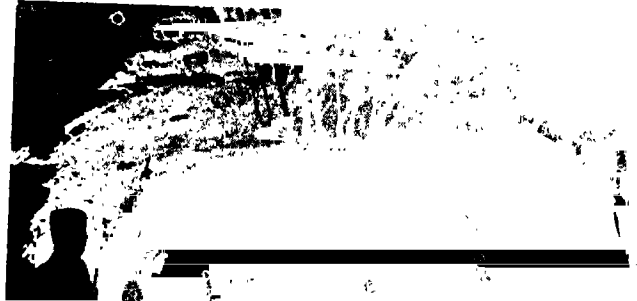
ں میں پنسلین کی تیاری

افکین انسٹی ٹیوٹ کے ہندوستانی مانوں نے ثابت کردیا ہے کہ یہ عجیب یب دوا ہندوستان میں بھی بڑی کثرت بنائی جاسکتی ہے۔

ستان میں ایسے طبی اداروںکی
، روز بروز بڑھتی جارہی ہے
ں آئے دن نئے نئے تجربات اور
تیں ہوتی رہتی ہیں۔ انہی کی
شوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان
بہت سی ایسی اہم دوائیں بننے
، ہیں جو ان دواؤں کی جگہ
مال ہوسکتی ہیں جنکے لئے
ستان لڑائی سے پہلے دوسرے
ںوں کا محتاج تھا۔ یہ معلوم ہوتے
ہ پنسلین جیسی ضروری دوا صرف
ستان یا امریکہ سے بہت تھوڑی
ار میں منگائی جاسکتی ہے
افکین انسٹی ٹیوٹ کے سائنسدانوں
تہیہ کیا کہ وہ یہ دوا خود
وستان ہی میں بڑی کثیر مقدار
ں تیار کرکے رہیں گے۔ انکی
ششیں بارآور ہوئیں۔ چنانچہ اب
حکومت ہند اسکا انتظام کر رہی ہے کہ یہ قیمتی دوا اتنی زیادہ مقدار میں یہاں تیار ہونے لگے کہ اسکی تجارت کی جاسکے۔

ہافکین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کرنل سوکھی (کھڑے ہوئے) اور انکے ایک مددگار

ں دن تک مصنوعی طور پر گرمی پہونچاکر چھوٹی بوتلوں میں سے پنسلین کا رقیق مادہ نکالا جارہا ہے۔

ان بوتلوں میں وہ مادہ بند ہے جس میں پنسلین کی پھپھوند لگے گی۔

س رفیق مادہ سے یہ دوا تیار ہوتی ہے اسکو
مک پیچیدہ مشین میں خوب دوھا جاتا ہے ۔

وا کو خاص طور پر چھانا اور صاف کیا جا رہا
ہے تاکہ یہ جلد نہ سڑنے لگے
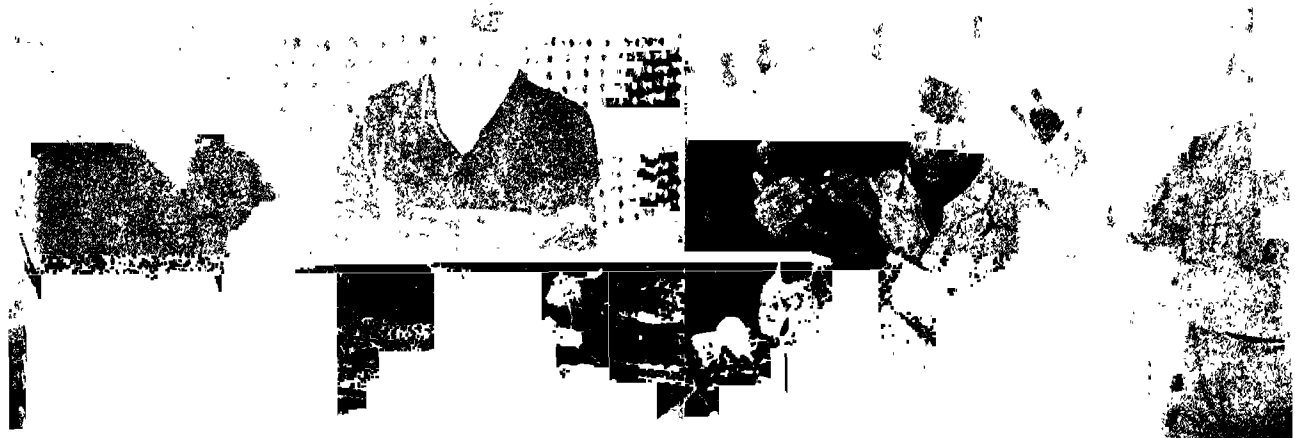
راکر ان لیبو ر مس سے ملنے کیدارا جا رہا ہے اکہ اسکی ھصول رصوب
دور ہوجائے ۔

پسلین دار ہے اب اسکو نلکیوں میں بند کیا جارہا ہے ۔ نخداں میں یہ
بہت عرصہ تک اپنی اصل حالت پر قائم رہ سکتی ہے ۔

— پلیٹ پر جراثیم‌دار جیلی لگاکر پنسلین کی آزمائش کی جارہی ہے ۔

عرب کے مشہور شہر

عدن یہ ایک پررونق شہر ہے۔ اسکی بندرگاہ اور کھاڑی کے پانی کی گہرائی اڑتیس فٹ ہے۔ اس بندرگاہ میں تجارتی جہازوں کی ہروقت آمد و رفت رہتی ہے۔ تجارت کے لحاظ سے عدن ایک اہم بندرگاہ ہے۔

مکلاّ – یہ حضرموت کی سب سے اہم بندرگاہ ہے۔ مکلاّ بندرگاہ عدن سے جہاز کی ایک رات کی مسافت پر واقع ہے۔ ہندوستان اور دوسرے ملکوں سے آنے والے تجارتی جہاز یہاں آکر ٹھہرتے اور بڑی چہل پہل رکھتے ہیں۔

کویت – خلیج فارس کی یہ ایک بہت اہم بندرگاہ ہے۔ کویت ایک عرب ریاست ہے اور اسکے موجودہ فرمانروا ہزہائی نس شیخ احمد الجابر الصباح ہیں۔ یہاں جہاز سازی کا ایک کارخانہ بھی ہے۔

مسقط – خلیج فارس کی عرب ریاستوں میں یہ ایک اہم اور قدیم ریاست ہے۔ اسکے موجودہ حاکم ہزہائی نس سلطان سید سعید بن تیمور ہیں۔ ہندوستان اور مسقط کے درمیان کثرت سے تجارت ہوتی ہے۔

دمدار تارے

ںمام اجرام فلکی میں یقیناً سب سے زیادہ دلچسپ دمدار
ے ہیں۔ ان دھندلے دمدار تاروں سے قطع نظر جو صرف
بینوں ہی سے نظر آسکتے ہیں بہت سے ایسے چمکدار بھی
، جو بغیر دوربین کے بھی دکھائی دے جاتے ہیں۔ پرانے
ہ میں جبکہ سائنس نے ترقی نہیں کی تھی یہ تارے لوگوں
ئے بڑی حیرت اور خوف کا موجب تھے۔

ایک روشن دمدار تارے کی جسامت ایک معمولی چمکدار
ے کے ہی برابر ہوتی ہے لیکن اسکی دم اتنی لمبی ہوتی
کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کے لمبے بال ہوا میں
رہے ہوں۔ یہ دم جو بعض صورتوں میں لاکھوں میل

ہیلے کا دمدار تارہ۔ ہیلے کا دعوے تھا کہ جو تارے ۱۵۳۱ء ۱۶۰۷ء اور ۱۶۸۳ء میں نظر آئے وہ سب ایک ہی تھے یہ تارہ آخری دفعہ ۱۹۱۰ء میں نظر آیا تھا۔

لمبی ہوتی ہے ایک چوتھائی آسمان پر پھیلی رہتی ہے

سترھویں صدی کے سائنسدانوں نے سب سے پہلے
دریافت کیا کہ دمدار تارے ادھر ادھر گھومنے والے تاروں
میں سے ہیں اور اسی گردش کیوجہ سے ہی یہ کبھی ہماری
نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور کبھی پھر نظر آنے
لگتے ہیں۔ یہ بھی اسی زمانہ میں معلوم ہوا کہ جن بڑے
دمدار تاروںکا ذکر پرانی تاریخوں میں درج ہے وہ ایسے ہی
ہونگے جیسے بعد کے زمانہ میں نظر آئے۔ سب سے پہلا
شخص جس نے ثابت کیا کہ دمدار تارے ایک دفعہ غائب
ہو جانے کے بعد پھر ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں
مشہور نجومی ہیلے تھا اور اسی کے نام پر سب سے بڑے
تارے کا نام رکھا گیا۔ ایک دمدار تارہ کی جسامت کر
زمین کی جسامت کے مقابلہ میں صرف ایک کسر کی حیثیت
رکھتی ہے اور بادل اسکے سامنے بہت بڑے معلوم ہوتے
ہیں اندازہ کیا جاتا ہے کہ دمدار تارونکی کل تعداد ایک
لاکھ بیس ہزار ہے۔

اس خیالی تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ اب سے قرنوں پہلے میں اور کسی دمدار تارہ کی ٹکر کسطرح ہوئی ہوگی یا کوئی دمدار تارہ زمین کی کشش سے کسطرح ٹوٹا ہوگا

آل انڈیا ریڈیو بمبئی کی مشہور آرٹسٹ — منورما کانجو۔

غزل

دیکھا نہیں وہ جلوۂ منور کئی دن سے
جاگا نہیں آنکھوں کا مقدر کئی دن سے

بل کھاتی نہیں زلف جو رخ پر کئی دن سے
شاید ہوئے دن رات برابر کئی دن سے

پھیکی سی نظر آتی ہے [illegible]
بے لوث ہے ہم مہ و اختر کئی دن سے

اب وجہ تسلی نہیں ہوتی ہے کوئی بات
کہتے ہیں کچھ اس طرح وہ ہنس کر کئی دن سے

دھوکے پہ وہ کیا آئینگے جب نام بھی ان کا
آتا ہے تو کچھ رک کے زباں پر کئی دن سے

میخانے پہ رکتے نہیں جاتے ہوئے بادل
بیٹھا ہوں لئے ہاتھ میں ساغر کئی دن سے

پھر اک نگہ ہوش ربا حسن جہاں تاب
برہم سے ہیں پھر عشق کے تیور کئی دن سے

کھلنے کو کوئی اور نیا گل تو نہیں ہے
مائل بہ سکوں ہے دل مضطر کئی دن سے

محفوظ ہے ہر شوخ ادا حسن کی انکے
نظروں میں نہاں ہیں کئی محشر کئی دن سے

لو آگئے عمامہ لئے حضرت واعظ
بے کیف سی تھی بزم مے و ساغر کئی دن سے

اس عشق کا انجام اثر دیکھئے کیا ہو
میں سوچتا رہتا ہوں یہ اکثر کئی دن سے

[illegible]

غزل

جی چاہے اور زباں سے ادا بھی نہ ہو سکے
جب روبرو ہوں وہ تو گلہ بھی نہ ہو سکے!

رہنے کو دور دور، نگاہوں سے تم رہے
اور لمحہ بھر کو دل سے جدا بھی نہ ہو سکے!

افسانۂ حیات مکمل نہ ہو سکا
ہم تیری آرزو میں فنا بھی نہ ہو سکے!

یوں زندگی گزار دے دنیا میں آدمی
اچھا نہ بن سکے تو برا بھی نہ ہو سکے

بیمارِ غم بھی ان کا سنبھل جائے چارہ گر!
اور دردِ عشق، دل سے جدا بھی نہ ہو سکے

ناراض ہو کے آپ ہی پھر مسکرا دئے
ہونے کی طرح مجھ سے خفا بھی نہ ہو سکے!

ساحل اسیر کر کے مجھے باغباں نے آہ!
لب سی دئے کہ نالہ سرا بھی نہ ہو سکے!

ساحل [illegible]

غزل

سعی و محنت ہے کہیں خوار لئے پھرتی ہے
کہیں انساں کو جفا ندبا لئے پھرتی ہے

کار آمد تھا جہاں میں کبھی مرنا جن کا
زندگی اب انھیں بیکار لئے پھرتی ہے

بانکپن ہے کوئی اس آنکھ کا اللہ اللہ
جو ترا عکس طرحدار لئے پھرتی ہے

جس میں ایک اشک ندامت ہے نہاں شبنم
سینکڑوں مطلعِ انوار لئے پھرتی ہے

کہاں اربابِ عقیدت حرم و دیر کہاں!
گردشِ چرخِ ستمگار لئے پھرتی ہے

حسرتِ دل کبھی مرنے سے سکھاتی ہے گریز
کبھی انساں کو سوئے دار لئے پھرتی ہے

بزم میں آپ نہ بے کیفیٔ دیدار کی پوچھ
ہر نظر ایک یہی آزار لئے پھرتی ہے

[illegible]

غزل

رو رہے ہیں ہنسی نہیں آتی
ہم کو یہ دل لگی نہیں آتی

لیکے دل، رخ نہیں ملاتے ہو
کہتے ہو بے رخی نہیں آتی

کیا وہ آئیں گے؟ ان کے دل میں بھی
اب مری یاد بھی نہیں آتی!

دل اڑا لے ہو اور کہتے ہو
ہم کو جادوگری نہیں آتی

چھیڑتا ہوں یہ کہہ کے زاہد کو!
خواب میں بھی پری نہیں آتی

دیکھ کر در پہ مجھکو کہتے ہیں!
ایسوں کو موت بھی نہیں آتی

میں وہ غم ناک ہوں مرے گھر تک
بھول کر بھی خوشی نہیں آتی

روز جاتا ہوں قتل گاہ مگر!
میری باری کبھی نہیں آتی

شاخِ دل شاخِ خشک ہے گویا
پھول پھل کیا کلی نہیں آتی

وہ بھی آتے نہیں خبر لینے
شبِ غم موت بھی نہیں آتی

ان کو شیون منا لے باتوں میں
کیا تجھے شاعری نہیں آتی!

شیون [illegible] آبادی

برما کا ساگون

ڈی۔ ای۔ کانڈن

برما کا ساگون انسانی تاریخ کے بہت ہی ابتدائی زمانے سے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں حضرت ابراہیم نے بابل میں اسکی لکڑی استعمال کی تھی۔ سنہ ۸۰۰ء میں عربوں نے اس کے جہاز بنائے اور یہ ایک صحیح تاریخی واقعہ ہے کہ انگریزی جہاز "سکسس" (SUCCESS) جو سنہ ۱۸۰۹ء میں بنا اور سنہ ۱۹۱۷ء تک چلتا رہا برما کے ساگون ہی کا تھا۔ برطانوی فوج کے چھتیسویں دستے کے پاہی جو آج برما میں پیشقدمی کر رہے ہیں جب اپنے گھر لوٹیں گے تو وہ بھی اسکا ذکر ضرور کرینگے۔

دریائے چنڈون پر چھتیسویں برطانوی دستے کے انجینئروں نے حال ہی میں جو پل بنا کر تیار کیا ہے۔ ساگون ہی کی لکڑی کا ہے۔ اس پل میں صرف چند ہزار پونڈ وزن کی لکڑی لگی ہے لیکن اس کی قیمت لاکھوں روپیہ ہے کیونکہ یہ پل برطانوی سپاہیوں نے اپنا خون اور پسینہ بہا کر بنایا ہے۔

ساگون تمام برما میں پیدا ہوتا ہے۔ پہلے یہ درخت شاہی ملکیت سمجھے جاتے تھے اور ان کی فروخت کا حق صرف بادشاہ ہی کو تھا۔ سنہ ۱۸۸۵ء کی جنگ برما کی فوری وجہ یہی تھی کہ بادشاہ تھیبا کہتا تھا کہ "بمبئی برما ٹریڈنگ کارپوریشن" نے ساگون کی جو لکڑی برما کے جنگلات سے لی تھی اس کی پوری پوری قیمت بادشاہ کو ادا نہیں کی تھی اگرچہ واقعہ یہ تھا کہ بادشاہ نے اچانک لکڑی کی قیمت بڑھا دی تھی۔ بادشاہ نے کمپنی پر بڑا بھاری جرمانہ کر دیا اور چونکہ وہ ثالثی کے ساتھ معاملہ کے تصفیہ کے واسطے تیار نہیں ہوا اس لئے لڑائی چھڑ گئی۔ اسی لڑائی میں انگریزوں کے ہاتھ برما آیا تھا۔

ساگون کی لکڑی آخر اسقدر قیمتی کیوں سمجھی جاتی ہے؟ اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ دنیا کی سب سے زیادہ مضبوط اور پائیدار لکڑیوں میں سے ہے اور کبھی نہیں گھنتی۔ شاہ بلوط کی لکڑی سے زیادہ سخت لیکن ہلکی ہوتی ہے۔ دوسری تمام لکڑیوں کی بہ نسبت یہ لکڑی سب کم سکڑتی ہے۔ پانی کے اندر رہتے ہوئے بھی اس کی پائیداری میں زیادہ فرق نہیں آتا۔ یہ بڑی آسانی سے تراشی جا سکتی ہے اور اس کے پتلے انچ انچ کے ٹکڑے کاٹے جا سکتے ہیں۔ یہ لکڑی خوبصورت بھی ہوتی ہے۔ برطانوی جہاز "کوئین میری" میں تقریباً ایکہزار ٹن یہ لکڑی لگی ہوگی۔ جہاز سازی کے علاوہ ساگون کی لکڑی اور بھی بیسیوں کاموں میں آتی ہے۔ مثلاً ریل کے مسافر گاڑیوں کی کرسیاں، لیبوریٹری کا چوبی سامان اور ناچ گھروں کا فرش وغیرہ۔ یمور تیروں میں یہ لکڑی اس لئے استعمال ہوتی ہے کہ اس پر تیزاب کا اثر نہیں ہوتا۔ انہی چند وجوہ کی بنا پر لکڑی کے کاریگر اس لکڑی کے بڑے مداح ہیں۔

ساگون کی لکڑی میں سے جلتے وقت ایک خاص قسم کی بھینی بھینی خوشبو نکلتی ہے جو عرصہ تک دماغ میں محفوظ رہتی ہے لیکن برمی لوگ اسکی آگ میں کھانا نہیں پکاتے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اس سے کھانا بگڑ جاتا ہے۔ اس لکڑی کو سلگانا مشکل ہے لیکن جب ایک دفعہ یہ آگ پکڑ لیتی ہے تو گھنٹوں جلتی رہتی ہے اور زیادہ دھواں بھی نہیں دیتی۔

چونکہ اس کی تجارت بہت نفع بخش ہے اسوجہ سے برما کی حکومت نے اسکی تجارت پر ہمیشہ مکمل قبضہ رکھا ہے۔ حکومت کی پالیسی اس سلسلہ میں یہ رہی ہے کہ ساگون کے درخت اس کثرت سے نہ کاٹے جائیں کہ ان کی قدرتی پیداوار اسکا مقابلہ نہ کر سکے۔ ساگون کے درختوں کو آگ اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کی بھی پوری کوشش کی جاتی رہی ہے اور نئے درخت بھی لگائے جاتے رہے ہیں۔ درختوں کی کٹائی محکمہ جنگلات کے ماتحت ہوتی رہی ہے۔ ساگون کے درخت کو کاٹنے کی ترکیب یہ ہے:۔ درخت کے تنے میں ایک گول سوراخ کر دیا جاتا ہے جس سے تنے کے اندر کا مغز نکل جاتا ہے۔ اسطرح درخت کو خوراک نہیں پہنچتی اور رفتہ رفتہ یہ سوکھنے لگتا ہے۔ ساگون کی لکڑی گیلی حالت میں اتنی بھاری ہوتی ہے کہ یہ پانی میں نہیں تیر سکتی۔

کاٹنے کے قابل درخت کا سائز مختلف مقامات کی حالت پیداوار پر منحصر تھا۔ جنگلات کے باقاعدہ نقشے اور یادداشتیں رکھی جاتی تھیں اور اس سلسلہ میں ہر کام سائنس کے اصولوں پر کیا جاتا تھا۔ آئندہ کی پیداوار کا اندازہ لگا کر کٹائی کا کام شروع ہوتا تھا۔

ساگون کی تجارت برما کے لئے کسقدر اہم تھی، اسکا اندازہ مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے:۔

سنہ ۱۹۳۵ء اور سنہ ۱۹۴۰ء کے درمیان برما کی کل برآمد جو برطانیہ کو ہوئی اسکا ۸۰½ فیصدی حصہ ساگون تھا۔ اسی زمانہ میں جتنی لکڑی برما سے ہندوستان کو برآمد ہوئی اسکا ۸۰ فیصدی حصہ ساگون تھا۔ اس کل لکڑی کی قیمت تین کروڑ روپیہ تھی۔ اگر حکومت نے ساگون کی پیداوار اور تجارت پر اپنا قبضہ رکھا تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ساگون کے درخت کے تنے کا قطر ایک سو سال میں سات فٹ ہوتا ہے۔ جنگلات کے کام میں پچاس ہزار سے زیادہ آدمی نوکر تھے اور ہزاروں ہاتھیوں سے کام لیا جاتا تھا جن پر شاہی ۴ لاکھ روپیہ سالانہ ہوتا تھا۔ برما میں جہاں کہیں ساگون کے درخت ہیں وہاں ہاتھی بھی لازمی طور پر موجود ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہاں ہاتھی نہ ہوتے تو ساگون کی لکڑی کی تجارت ہی نہ ہو سکتی۔ کیونکہ جنگلات کا گھنا پن، کھردری چٹانیں اور دلدل وغیرہ لکڑی کے حمل و نقل کو بہت مشکل کام بنائے ہوئے ہیں۔ یہ صرف ہاتھی ہی کر سکتا ہے کہ بیس فٹ لمبے اور چھ یا سات فٹ موٹے شہتیر کو جنگل سے لیجا کر دریا میں پھینک دے (باقی صفحہ ۴۴ پر)

نیاز فتحپوری

فضل حق قریشی

آج سے تقریباً بیس سال پہلے جبکہ دنیا میری نگاہ میں صرف لقدر سترہ سال جوان تھی اور ادبی نزاکتوں کی سمجھ بوجھ کا اتنا زیادہ مادّہ بھی مجھ میں پیدا نہیں ہوا تھا، میں ہارڈنگ لائبریری کے ایک پُرسکون گوشے میں خاموش و مبہوت بیٹھا علامہ نیازؔ کے قلم کا لکھا ہوا رنگین فسانہ "کیوپڈ اور سائکی" پڑھ رہا تھا۔ میں اس افسانے کی رومانی فضاؤں اور حسنِ بیان کی رنگین لطافتوں میں اس درجہ غرقِ تحیّر تھا کہ مجھے اپنے اردگرد کا مطلق احساس باقی نہ رہا اور جب وقت کے تعیّنات ختم ہوجانے کے باعث ناظمِ دارالمطالعہ نے اس محویت سے بیدار کردینا چاہا تو مجھے خواہ مخواہ اس پر غصہ آنے لگا۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اعلیٰ قسم کی کتابوں کو شروع سے آخر تک پڑھے بغیر ہاتھ سے رکھ دینا طبیعت پر ہمیشہ گراں گذرتا ہے پھر جب میں لائبریری سے نکل کر باغ میں پہنچا تو میرے قدم ڈگمگا رہے تھے اور تمام جسم پر وہ لطیف سی کیفیت طاری تھی جو اعلیٰ شراب پینے یا اچھی صورت دیکھنے کے بعد ہی ممکن ہوسکتی ہے۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جبکہ مبلغ علم زیادہ وسیع نہ ہونے کے باعث میں اس رنگین عبارت میں استعمال ہونے والے بہت سے لفظوں کے معنی اور بعض جملوں کا صحیح مفہوم بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اور اب جبکہ اس کا عمیق اثر تمام جزئیات کو پوری طرح سمجھ لینے کے بعد میرے دل و دماغ پر حد درجہ حاوی ہے، تو میں اکثر تنہائی کے لمحات میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر نیازؔ "کیوپڈ اور سائکی" کے علاوہ کوئی اور چیز قلمبند نہ کرتے تب بھی ان کو دنیائے ادب میں ایک ممتاز مرتبہ حاصل ہوتا —— بھلا کون ہے جو ذوقِ سلیم رکھتے ہوئے اس افسانے کا مطالعہ کرے اور ایک خود فراموشی کے عالم میں یکسر محو نہ ہو جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ نیازؔ کی افسانہ نگاری نے اسوقت اپنا رنگ جمایا جبکہ دنیا گذشتہ جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں اور بعد جنگ نازل ہونے والے قحط کی اندوہناکیوں کے باعث ایک جہنم زار بنی ہوئی تھی اور اسوقت ضرورت تھی کہ اگر جسم کے لئے پوری خوراک ممکن نہیں تو کم سے کم دماغ کے لئے صحیح غذا ہی میسر آجائے، تاکہ روحانی سکون و طمانیت حاصل کرنے کے بعد دماغ کی قدرتی صلاحیتیں ان مسائل کی عقدہ کشائی کرسکیں جن پر ایک قوم کی فلاح و بہبود منحصر ہوتی ہے۔ پھر یہی نہیں کہ نیازؔ نے لطیف قصوں کی رنگین فضا دکھا کر خاموشی اختیار کرلی ہو، بلکہ انھوں نے قوم کو خوابِ گراں سے بیدار کرکے اس حقیقت و واقعیت سے دوچار کیا جس کے بغیر اصلاح و ترقی ممکن نہیں ہوسکتی۔ یہ رنگ انکی افسانہ نگاری کے دوسرے باب میں نمایاں طور پر اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

"کیوپڈ اور سائکی" اور اسی نوع کے دوسرے افسانے رفعتِ خیال و حسنِ بیان کے اعتبار سے نہایت بلند ہیں۔ ان میں بیک وقت شاعری، مصوری اور موسیقی کا امتزاج بدرجۂ اتم محسوس ہوتا ہے۔ بسبیلِ تذکرہ ایک نادر ادبی شہ پارہ ملاحظہ ہو جس میں اس دعوے کا ثبوت بیّن طور پر موجود ہے:۔

"اپنی آنکھوں کی وہ شراب جو ابھی ابھی تیری لانبی سیاہ پلکوں کی آغوش میں سو رہی تھی، رات صبح کے وقت تیری بادہ خوار آنکھوں کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سرمہ کی صورت میں پڑی چھلک رہی ہے، مجھے نہ پلا۔ ہر چند میری روح تیری لگاہوں کے ان ہلکے ہلکے جرعوں کے لئے تشنہ ہے، مگر تشنہ ہی رہیگی۔ کیونکہ انھیں ہر شخص چکھ سکتا ہے اور میں اس لذت کو صرف اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی جوانی کا وہ نشہ جو تیرے بستر کی شکنوں پر ہر شخص کو میسر آسکتا ہے، مجھ پر نہ ڈال۔ یہ کہرا کے وقت شکستگئ خواب کی وجہ سے تیرے خونِ صلح کی اور زیادہ پھوٹ نکلنے والی سرخی، وہ تیرے گالوں میں بھرا ہوا رنگ شہاب، جس کو میں بلورِ شعلہ رنگ یا شعلۂ بلوریں کہہ سکتا ہوں —— اور پھر وہ تیرے سینے پر ڈھلکے ہوئے آنچل کے پلّو کا چہرے تک پہنچ جانا اور وہاں اس کی زردیِ باریک جھالر کا دمکتے ہوئے چہرے پر بہتی روشنی میں جھل مل ہونا، اس میں ایک روشن تھرتھری پیدا ہونا، آہ! کیا قیامت ہے کہ تو ان چیزوں کے سامنے بھی مجھ سے میرے ایمان، میرے صبر و تقوے، میری متانت و سنجیدگی کی قیمت پوچھتی ہے۔ تجھے کیا خبر کہ اسوقت میں انھیں کسقدر ارزاں لے لینے کیلئے بیتاب ہوجاتا ہوں۔"

چشمِ محبوب کی مخمور کیفیات کا اثر تو یہی ہونا چاہئیے تھا کہ سوداؔ کے انداز بیان میں ساغرِ شراب اپنے ہاتھوں میں سنبھل نہ سکنے کے باعث کسی کو تھما دینے کی کوشش کی جاتی لیکن کہا یہ گیا کہ میری روح تیری نگاہوں کے ان جرعوں سے تشنہ ہی رہے گی محض اس لئے کہ انھیں ہر شخص چکھ سکتا ہے اور میں اس لذت کو صرف اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ارتفاعِ نظر کی ایسی نادر مثال ہے کہ دوسری جگہ شاید ہی مل سکے۔ ان سطور میں تشبیہ و استعارے کی پختگی، تاثراتِ جذبات کی فراوانی، مشاہدہ کی گہرائی اور حسنِ بیان کی روانی، غرض انشائے لطیف کے جملہ لوازمات کو کچھ اس خوبی کے ساتھ ہموار و ہم آہنگ کیا گیا ہے کہ تعریف نہیں کی جاسکتی۔ اس "کلامِ موزوں" کو پڑھنے کے بعد طبیعت یہ تسلیم کرنے کے لئے زور دیتی ہے کہ اسے نثر کا ٹکڑا نہیں بلکہ پوری غزل سمجھا جائے۔

اگر بعض مفکرین کے قول کے مطابق یہ تسلیم کرلیا جائے کہ شعر کے لئے وزن اور ردیف و قافیہ کی ضرورت نہیں بلکہ ہر شاعرانہ اندازِ بیان ایک مکمل شعر کہلا سکتا ہے تو لامحالہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نیازؔ کا ہر افسانہ بلحاظ رنگینئ بیان ایک نظم ہے —— ایک ایسی نظم جس پر بہت سے مستند شعراء کا کلامِ موزوں نثار کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ تسلیم کرلینے کے بعد صنفِ سخن کے جملہ لوازمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نیازؔ کے افسانوں کا جائزہ لینا پڑے گا، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ اس کسوٹی پر کس حد تک کھرے ثابت ہوئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شاعری میں تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے —— محاکات تخیّل

اور حسنِ بیان ——— اور ان کا بیک وقت اجتماع کلامِ شاعر کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ نیاز کے رشحاتِ قلم میں یہ تینوں لوازمات موجود ہیں اور اس وقت انہی پہلوؤں پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنی مقصود ہے۔

شاعری میں محاکات دراصل اس لفظی مصوری کا نام ہے جس کے ذریعہ کسی واقعہ یا موقع کی صحیح تصویر نگاہوں کے سامنے غیر مرئی رنگوں سے بنا کر اس طرح پیش کر دی جائے کہ سننے یا پڑھنے والے کا ذہن واضح طور پر اسکا ادراک کر سکے۔ نیاز کے افسانوں پر سرسری نظر ڈالنے سے ایسی صدہا مثالیں مل سکتی ہیں۔ ایک لطیف نمونہ ملاحظہ ہو۔ ایک خاص مقام پر صنفِ نازک کا زبردست اجتماع ہے۔ تمام عورتیں "دشمنِ ایمان و آگہی" کی مجسم تفسیر ہو کر خوب بن سنور کر آئی ہیں :-

" وہ ہلکی ہلکی ریشم کی ساریاں اور ان ساریوں کے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے زرنگار پلّو، وہ صدف آسا کانوں میں رنگین رخساروں سے چھو کر کانپ کانپ اٹھنے والے آویزے اور ان آویزوں کے وہ درخشاں و تابندہ الماس، وہ پیشانیوں کی محدود و مختصر فضا میں ناقابلِ شمار اداؤں سے گیسو کی آرائشیں، اور ان آرائشوں کی وہ مبہوت و دیوانہ بنا دینے والی نکہت باریاں ——— یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج یہ قطعۂ زمین پر لگا کر اڑ جائے گا۔"

لطف یہ ہے کہ اس ادبی شہ پارے میں عورت کا ذکر صاف لفظوں میں بالکل نہیں کیا گیا۔ بلکہ محض ساریوں، ان کے پلوؤں، صدف آسا کانوں، رخساروں، پیشانیوں اور گیسوؤں وغیرہ کی دلکش زینتوں اور ان کی جمالیاتی کیفیتوں سے اسکا تعین کیا گیا ہے، جو حد درجہ لطیف اور نادر پیرایۂ بیان ہے۔

ایک محفلِ رقص و غنا کی تصویر پیش کرتے ہوئے نرت کی کیفیت اور گانے کے انداز کو پوری جزئیات کے ساتھ اس درجہ مکمل حالت میں بیان کیا ہے کہ ناظر و سامع دونوں قوتیں اس کیفِ عمیق میں ڈوب کر پورا لطف اٹھانے لگتی ہیں۔ ملاحظہ ہو :-

"یہ رقت وہ تھا جب وہ رقص کے لئے آمادہ ہو کر دونوں ہاتھوں کو ملائے ہوئے صرف گھونگروؤں میں ساز کے ساتھ جنبش پیدا کر رہی تھی۔ یہ جنبش ہلکی نازک کمر اور حسین گردن میں ہلکی سی موج پیدا کرتی ہوئی تقلیش کی اس جھالر میں جا کر قرار لیتی تھی جو سفاکانہ بانکپن کے ساتھ اس کے گوشۂ ابرو پر پڑی ہوئی مچل رہی تھی۔ وہ اسی طرح اپنے پاؤں کو جنبش دیتی رہی، وہ اسی طرح ارتعاشِ خفی کا افسون اپنے جسم کے ہر ہر حصے سے پیدا کرتی رہی، یہاں تک کہ تھیٹر کی ساری فضا اس کیکپی سے معمور ہو گئی، اور ہر دیکھنے والے کی روح اس لرزش سے بیتاب۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ شانے کی سطح تک لا کر کئی جگہ نشیب و فراز پیدا کرتے ہوئے ایک طرف سیدھا کر دیا اور نرم و نازک کلائی میں ایک ہلکا سا بل نمایاں کرتے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں کو ان کی پوری درازی تک تان کر پنجہ کو اس طرح ڈھیلا چھوڑ دیا جیسے اس کو کسی نے دکھا دیا ہو۔ وہ آگے بڑھی لیکن چاندنی کی طرح غیر محسوس طور پر، وہ پیچھے ہٹی لیکن سائے کی طرح غیر معلوم طریقے سے۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور اپنی لانبی گردن میں خفیف سا متکبرانہ خم، سر میں ہلکی سی مغرورانہ کشش، ابروؤں میں ایک سفاکانہ بانکپن اور آنکھوں میں شاہانہ استغناء ظاہر کر دینے والی نیم خوابانہ کیفیت پیدا کر کے دیر تک اہلِ محفل کے صبر و ضبط کا امتحان لیتی رہی۔ اور پھر ایک فاتحانہ تبسم کے ساتھ اس نے ایسے نغمے کی ابتدا کی جو یکسر تصویرِ شباب و مستی تھا۔ ہلکی آواز جس میں علاوہ کشش نسائی کے تکمیلِ فن کی بھی پوری جاذبیت موجود تھی، ملند ہوئی اور موسیقی کی وہ لذتیں جو ایک پُرشباب حسن ہی کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہیں، اس کے ایک ایک بول سے فضا میں منتشر ہونے لگیں۔ جس وقت وہ اپنی آواز میں، اس آواز میں جو سننے والوں کی ایک ایک رگ میں جھنکار پیدا کر رہی تھی، نشیب پیدا کرتے کرتے آہستہ آہستہ سرگوشی کی حد تک کھینچ لاتی تو معلوم ہوتا تھا کہ روح اس گم ہو جانے والے نغمے کی جستجو میں باہر نکل جانے کو ہے اور جب اس کی بلندی کو گونج کی حد تک کھینچ لاتی تو ہر شخص محسوس کرتا کہ شاید اب سازوں کے تار ٹوٹ جائیں گے اور تھیٹر کی دیواریں شق ہو جائیں گی۔"

اس طویل شہ پارے کے بہت سے پہلوؤں پر فاضل ادیب نے ہمہ گیر و جزو رس اندازِ بیان سے خود بخود روشنی پڑتی چلی گئی ہے اور اس لئے مزید حاشیہ آرائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم بعض باتوں پر داد دینے کے انداز میں اظہارِ خیال ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ سکوتِ سخن شناس کا الزام عائد نہ ہونے لگے۔ ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس ٹکڑے میں ناچ اور گانے کی دلپذیر اداؤں کو پیش کرنے کے علاوہ نیاز نے رقاصہ کے ذہنی تاثرات کا نفسیاتی تجزیہ بھی کر دکھایا ہے۔ یہ عام بات ہے کہ کمالِ فن کے ساتھ ساتھ ہر فنکار میں غرور و نخوت اور ایک قسم کی بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے اور محفل میں مظاہرۂ فن کرنے کے وقت تمام حاضرین کو اپنے مقابلے میں حقیر و ذلیل جان کر قدرتی طور پر ایک شانِ استغناء ظاہر کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس سامعین پر جو کیفیت گذرتی ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس رنگِ تضاد کی توقع نیاز جیسے باریک بین اور دقیق نظر ہی سے ممکن ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں سروں کے زیر و بم کے ساتھ ایک بار روح کا اس سرگوشی کی حد تک گم ہو جانے والے نغمے کی جستجو میں نکلنے لگنا اور پھر بلند ہو جانے کے بعد لوگوں کا یہ محسوس کرنا کہ شاید اب سازوں کے تار ٹوٹ جائیں گے۔ اس قدر مبنی فطرت ہے کہ اسے ہرگز فریبِ احساس سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ نیاز چونکہ پاکیزہ ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی ایک اچھے ماہرِ موسیقی ہیں اس لئے ان بار یکیوں کو کما حقہٗ سمجھ سکتے تھے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ راز بھی خود بخود کھل جاتا ہے کہ نیاز کی تحریر میں اسقدر شگفتگی اور دلآویزی کس سبب سے موجود ہے۔

محاکات کے ضمن میں کسی شخص کے حلیے یا کسی خاص مقام کے قدرتی منظر کو بھی کافی اہمیت دی جا سکتی ہے۔ اگر حلیہ لکھتے وقت تمام جزئیات کو ملحوظ رکھا گیا ہے تو اس شخص کی ذہنی تصویر ہی نگاہوں کے سامنے نہیں آتی بلکہ ہم اس کے ذوق و شوق،

عادات واطوار، چال چلن بلکہ مشاغلِ حیات تک کی بابت آسانی سے رائے قائم کرسکتے ہیں۔ نیاز کی قلم کے نکلے ہوئے جملے زیادہ تر شگفتہ یا طنزیہ ہوتے ہیں۔ اور حقیقتاً معمولی خدو خال یا عام وضع قطع کی ترجمانی ادب میں کوئی لطف خاص پیدا نہیں کرتی۔ نیاز کو اس ضمن میں یہ کمال حاصل ہے کہ چند لفظوں میں پوری شخصیت کو اس طرح واضح کردیتے ہیں کہ کسی تعارف کے بغیر یہ اندازہ لگالینا آسان ہوجاتا ہے کہ یہ ذکر خیر کس ہستی یا جماعت کے کس رکن کا ہورہا ہے۔ مثال کے طور پر یہ الفاظ ملاحظہ ہوں :-

"اُس کی ہیئتِ وضعی جس میں اسکا بے تکا عمامہ، الجھی ہوئی زلف (گاہے تاگوش وگاہے تانیم گوش) لانبی پریشان ڈاڑھی، زمین دوز بردت، سیاہ داغدار پیشانی، شیروانی نما کرتا، نیم ساقی پاجامہ اور غیر دباغت شدہ متعفن چمڑے کا جوتا مع تسبیح وجریب درومال اور نا سدانی کے سب کچھ شامل ہے، ایک واضح صریح اختراع مستجل ہے۔"

اس کے بعد اسی قبیل کی ایک اور برگزیدہ ہستی سے ملئے۔ اس نوع کے لفظی خاکے کہیں کہیں "مکتوبات" میں اور "نقاب اٹھ جانے کے بعد" والے افسانوں میں بکثرت موجود ہیں پڑھئے اور لطف اٹھایئے :-

"سچ کہتا ہوں۔ میں نے ایسے مجرمانہ قیافہ کا انسان آج تک نہیں دیکھا۔ حیرت ہے کہ ان میں آخر وہ کونسی بات ہے جس نے آپ کو اتنا گرویدہ کرلیا۔ صورت دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کا شاید اولین نقش ناکام کچھ ایسا ہی رہا ہوگا۔ وہ چھوٹی چھوٹی اندر دھنسی ہوئی گول گول آنکھیں کہ کیا کوئی پرکار سے ایسا صحیح دائرہ کھینچ سکتا ہے۔ وہ "تنگیٔ چشمِ حسود" رکھنے والی پیشانی، وہ رخسار وابرو کی ہڈیوں کا اُفقی ابھار، وہ ٹیبل لینڈ قسم کی چوڑی چکلی ناک، وہ کچی کلیجی کی طرح کالے کالے سطبر ہونٹ اور اسپردہ دیمک خوردہ مونچھ اور ڈاڑھی۔"

موسم کی دلکش لطافتوں کے لکھنے تقریباً ہر صاحبِ قلم نے اپنی اپنی تحریر میں پیش کئے ہیں لیکن نیاز نے اس ضمن میں بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ انھوں نے عام سطح سے کسی قدر بلند ہوکر اور بالکل ہی مختلف زاویوں سے نظر ڈال کر مطالعۂ قدرت کیا اور تاثرات کو ایسے حسین پیرائے میں بیان کیا کہ اسکی مثال کسی دوسری جگہ ملنی مشکل ہے۔ ایک مختصر سا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔ بظاہر اس میں کوئی خوبی نظر نہیں آئے گی۔ کیفیات صبح کو شاید اس سے بھی بہتر طریقہ پر دوسرے لوگوں نے پیش کردیا ہو لیکن غائر نظر ڈالنے کے بعد نیاز کی اس معجز بیانی کا لوہا ماننا پڑے گا کہ انھوں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں انسان کے ایک نہیں پورے چار حواس کو بیک وقت متاثر کردیا۔ لامسہ نے بہار کی خنکی محسوس کی تو شامہ نے صحرا کی عطریت۔ باصرہ کو آفتاب کی شعاعوں سے شبنم کے قطروں میں جگمگاہٹ پیدا ہوجانیکا احساس ہوا تو سامعہ کو چڑیوں کے نغموں سے فضا کے سکوت میں موسیقی کی غیر مرئی امواج کا۔ اصل تحریر کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

"صبح کا وقت تھا۔ بہار کی خنک ہوا عطریاتِ صحرا سے لبریز آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ آفتاب کی گرم نرم شعاعیں شبنم کے قطروں میں جگمگاہٹ پیدا کرکے درختوں کو بادلے کا زریں لباس پہنا رہی تھیں اور چڑیاں اپنے نغمہ ہائے رنگا رنگ سے فضا کے سکوت میں موسیقی کی غیر مرئی امواج پیدا کررہی تھیں۔"

محاکات کا ذکر کرتے ہوئے تشبیہ واستعارے کی نزاکتوں پر بھی نظر ڈال لینی چاہیئے، کیونکہ ان سے واقعہ نگاری میں رومانیت کی شان پیدا ہوتی ہے، اور انشائے لطیف کا صحیح کیف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب پھول کی اس خوشبو کی طرح جو پھول کو مرکز بنانے کے باوجود چمن کے ہر گوشے میں پھیلی رہتی ہے، ذہنِ انسانی بھی ایک شئے کے حسن و قبح پر غور کرتے وقت اس سے مشابہ اور ملتی جلتی چیزوں کو جو اس سے خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں، نظر انداز نہ کرے۔ تشبیہ اگر مکمل اور جامع ہے تو حقیقتاً تصور دو آتشہ کی کیفیت پیدا کردیتا ہے۔ نیاز فرماتے ہیں :-

"اس کی خاموش زندگی اس طرح گذر رہی تھی جیسے ایک سایۂ متحرک یا ایک غیر محسوس آوازِ بازگشت۔"

غور کیجئے۔ ایک شخص کی بے کیف و بے رنگ زندگی کو ایک سائے سے تشبیہ دینا جس کے گھٹنے اور بڑھنے کی کیفیت کا احساس بمشکل ہوا کرتا ہے یا اسے آوازِ بازگشت کہنا جو اصل آواز سے کہیں زیادہ مدھم، مبہم اور ایک حد تک بے سُری ہوتی ہے، ایسا نادر خیال ہے کہ اسپر غور کرتے ہی زندگی کی وہ خاموشی جسے بیان کرنا مقصود ہے، متشکل ہوکر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ پھر اس خاص قسم کی خاموشی کو ایک آوازِ بازگشت سے مشابہت دینا ایک لحاظ سے حسنِ تضاد بھی پیدا کرتا ہے جو بجائے خود نہایت لطیف ہے۔

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو جس میں تصورِ بلیغ کے ساتھ ساتھ احساسِ عمیق کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے :-

"نوجوان کنیز کا زرکار سینہ بند آبِ رواں کی ہلکی چادر کے نیچے ایسا نظر آتا ہے جیسے شفاف موجوں کے نیچے سورج کی تڑپتی ہوئی کرنیں۔"

موجوں کی تڑپ کا اشارہ ذہنِ انسانی کو اس حقیقت کی طرف منتقل کرتا ہے کہ کنیز نوجوان ہے اور جوشِ شباب سے اس کے سینے میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری کنیز کے جمالِ دلنشیں کا نظارہ کیجئے :-

"دوسری کنیز جس کے عریاں شانہ و دوش پر بکھرے ہوئے سنہرے بال ایسے معلوم ہوتے ہیں، جیسے آئینہ میں دور سے کسی آبشارِ زریں کا انعکاس۔"

نگارشاتِ نیاز میں بعض تشبیہات ایسی بھی ہیں جو مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اچھوتی ہیں اور شاید انہیں نیاز نے ایک ایسی فضا میں رہ کر تراشا ہے جہاں دوسروں کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں ہوتی۔ مثلاً آرزوؤں کی پامالی کے بعد بھی محبت کی ایک رمق کا باقی رہ جانا عین فطرت ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ملتہب تمناؤں کی کیفیت کا

اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ "جیسے پگھلے ہوئے سونے پر پانی ڈال دیا جائے اور وہ ٹھنڈا ہونے کے بعد بھی دیر تک گرم رہے"۔ یہ بات وسیع مشاہدات اور عمیق غور و فکر کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ وہ "سمندر میں چاند کے انعکاس" کو ایک ڈبڈبائی ہوئی آنکھ کی کیفیت "سے تشبیہ دیتے ہیں۔ سمندر میں چاند کا عکس موجوں کے تموّج کے باعث بالکل صاف نظر نہیں آتا بلکہ جھلملاتی ہوئی سی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح ڈبڈبائی ہوئی آنکھ میں آنسوؤں کے پس منظر میں پتلی کچھ چھپی چھپی سی نظر آتی ہے کسی اضطراری کیفیت کے ماتحت سارے جسم کے کپکپا اٹھنے کو وہ "کسی شاخ" بیدسے تشبیہ دیتے ہیں جو کسی طائر کے اڑ جانے کے بعد کچھ دیر تک تھرتھراتی رہ جائے۔ "رقص" کو وہ ایک "نغمۂ خراماں یا خرام نغمہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور "پیشانی کی شکن" انھیں ایک "موجِ بوریں" بن کر نظر آتی ہے۔ اکثر شعراء نے جمالِ محبوب کو بجلی کی چمک سے تشبیہ دی ہے لیکن فضا اور ماحول کی پوری کیفیات کے بغیر اسے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ "کیوپڈ اور سائکی" میں نیاز نے اس رعنائیِ خیال کی تکمیل کی ہے یعنی سائکی جب چپکے چپکے رات کے وقت باغ میں آکر اپنا نقاب الٹ الٹ کر پھول توڑتی ہے تو بہت دور سے دیکھنے والوں کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کنجوں میں بجلیاں سی کوند رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جھک کر پھول توڑنے کی حالت میں نقاب بار بار چہرے پر آپڑتا ہوگا جسے مسلسل الٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی اور یہ بھی معلوم ہے کہ حسینوں کے نقاب عموماً سیاہ ہوتے ہیں جو ظلمتِ شب کے ساتھ مل کر ان بادلوں کے ہم رنگ ہو جاتے ہیں جنکے خنگانوں میں بجلی چمکا کرتی ہے۔ پھر جس طرح بجلی چمکنے کے وقت بادلوں کا تھوڑا بہت وجود محسوس ہوتا ہے اسی طرح چہرے کے بار بار نظر آجانے پر نقاب کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے۔ ایسی تشبیہات اپنی اعتبار سے مکمل ہونے کے علاوہ نہایت لطیف بھی ہوتی ہیں اور جب ان پر غور کیا جائے تو روح کو ایک قسم کی تازگی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

معاملات میں اگر تخیل سے کام نہ لیا جائے تو بیان میں جان نہیں پڑ سکتی۔ اس سلسلے میں خاص ترتیب و تناسب اور توافق سے کام لینا پڑتا ہے۔ نیاز کی قوتِ تخیل کی کارفرمائی بعض وقت اس درجہ عمیق ہوتی ہے کہ وہ علم معروضات اور مسلّمہ اصولوں سے الگ ہٹ کر بعض حقائق کو ایسے برعکس بلکہ ایک حد تک متضاد رنگ میں بیان کرتے ہیں کہ اگر منطقی استدلال سے کام لیا جائے تو ثبوت پیش کرنا محال بلکہ غیر ممکن ہو جائے لیکن ایسے موقعوں پر چونکہ ان کا اسلوبِ بیان نہایت لطیف اور دلآویز ہوتا ہے اس سے قارئین کا دماغ اس کی صحت و غلطی پر غور کرنے کی بجائے صرف اسکی جادو اثری سے مسحور ہو جاتا ہے اور تنقید کرنے کی بجائے سر دھننے لگتا ہے۔

تشبیہ و استعارے سے کام لیکر شعراء نے جب کبھی ملند پروازی کی اور قوتِ بیان کا اظہار چاہا، ان سے تخیل کی رفعت نپی تلی حد سے آگے نہ بڑھ سکی نتیجہ یہ کہ اکثر تشبیہات اسقدر عام ہو گئیں کہ انھوں نے ایک لحاظ سے کلیہ کی صورت اختیار کر لی مثلاً عارض کو برگِ گل سے، زلف کو شبِ دیجور سے، ابرو کو خنجر سے، آنکھ کو نرگسِ شہلا سے، قامت کو سروِ چمن سے، چال کو رفتارِ نسیم سے یا اسی اسلوب کے مطابق ملتی جلتی دوسری چیزوں سے مشابہت دینے کا دستور بالکل عام اور اس لئے ایک حد تک فرسودہ ہو چکا ہے۔ نیاز جو ہمیشہ عام روش سے الگ ہٹ کر اپنی راہ اختیار کرتے ہیں، تشبیہات کی دنیا میں بھی ندرت کا لحاظ رکھتے ہیں۔ وہ خیال کی معنوی نزاکتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حسنِ تضاد پیدا کرنے کے لئے مشبہ بہ کو مشبہ کے تابع قرار دیتے ہیں۔ گویا ان کی نگاہِ دوررس حسنِ وقیع کا مرکز مشبہ بہ کی بجائے مشبہ میں قائم کرتی ہے۔ یعنی وہ عارض کو برگِ گل سے تشبیہ دینے کی بجائے یہ کہتے ہیں کہ خود برگِ گل نے تمام رعنائیاں عارضِ محبوب سے مستعار لی ہیں اور نرگسِ شہلا نے چشمِ محبوب کو دیکھکر ہر وقت نیم وا رہنے کی کیفیت اپنے اندر پیدا کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ منطقی استدلال سے ان معروضات کو تسلیم نہ کیا جائے لیکن تخیلات کی نگری میں، جہاں سرحدِ ادراک سے دور ہزاروں بستیاں آباد کی جاتی ہیں، یہ اندازِ بیان نہ صرف جائز بلکہ لائقِ تحسین ہے۔ چنانچہ نیاز فرماتے ہیں:-

"...... وہ اس کے نازک لب جن کو دیکھنے کے بعد ہی گلاب کی ملفوف نکھڑی کا مفہوم ذہن میں آسکتا ہے، ایسا سرچشمۂ حیات ہیں جس سے سیراب ہونے کے لئے جان کی قربانی صدقۂ ناقص تعبیرِ شوق ہے۔ وہ اسکا صبیح رنگ جس سے آفتاب طلوعِ صباح کا استعارہ کرتا ہے، وہ اس کے سیاہ بال جن سے برسات اپنی بھیگی ہوئی خنک رات طلب کرتی ہے۔ وہ خوبصورت دانت جن سے الماس اپنے سرمایۂ ضیاء کا آرزو مند ہے۔ وہ رخسار جن سے شمعِ محفل کسبِ نور کرتی ہے......"

ان الفاظ کو پڑھنے کے بعد انسان کا ذہن پامال راستوں پر نہیں بھٹکتا بلکہ ایک نئی فضا میں اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے، درانحالیکہ فضا کے عناصر اور ماحول کے تقاضے وہی پرانے ہیں صرف ترتیب اچھوتی اور نادر ہے۔ سیاہ بال کو برسات کی رات سے تشبیہ دیکر ظلمتِ شب کو مبہم طریقے پر قائم رکھا ہے کیونکہ برسات کی راتیں قدرتی طور پر کالی ہوتی ہیں۔

ایسی نازک خیالیاں نیاز کے افسانوں میں اکثر و بیشتر موجود ہیں۔ ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:-

"جسم کی انتہائی تعریف یہی جاتی ہے کہ وہ سانچے میں ڈھلا ہو لیکن شیریں کے قد و قامت کو دیکھکر اسلم ایسا محسوس کرتا کہ شاید سانچے کا مفہوم اس کو دیکھنے کے بعد سمجھ میں آسکتا ہے اور اسکا معیار یہی ہے کہ وہ شیریں کے قد و قامت پر ٹھیک آترے۔"

تخیل کی کارفرمائی امکان ناممکنات کی تخلیق کرتی ہے۔ حواس سے ایسے ایسے کام لئے جاتے ہیں جو انکی قوتوں سے بعید ہوں۔ نیاز کا اسپِ خیال اس ضمن میں بھی عجیب جولانیاں دکھا گیا ہے۔ وہ ذی حیات کو بے جان اور نظرنہ آنے والی چیزوں کو مرئی بنا کر پیش کرتے ہیں تاکہ انسان کی ایک حس کی بجائے کئی حسیں بیک وقت متاثر ہوں اور عمیق کیفیات سے پوری طرح لطف اندوز ہونیکا موقع مل جائے دیکھئے

عورت کی تعریف کیسے انوکھے اور نازک انداز میں کرتے ہیں کہ اسکی موجودگی کے بغیر ہی اسکے صحیح وجود کا ادراک آسان ہوجاتا ہے :-

عورت ایک روحانیت ہے قابلِ لمس، نورانیت ہے صاحبِ نطق، ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں، ایک نکہت ہے جس سے ہم گفت گو کر سکتے ہیں۔ ایک حلاوت ہے جو ہاتھوں سے چکھی جاتی ہے۔ ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سنی جاتی ہے"۔

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

"عورت ایک لذت ہے مجسّم، ایک تسکین ہے متشکل، ایک سحر ہے مرئی، ایک نور ہے مادّی"۔

ان شاعرانہ نزاکتوں کے مقابلے میں بہت سے شاعروں کا کلام موزوں بے آب و رنگ ہوکر رہ جاتا ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ واقعی شعر کہنے کے لئے مجرد عروض اور ردیف و قافیہ کی پابندی زیادہ ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ شعر کا مقصد اگر دوسروں پر صحیح کیفیات طاری کرنا ہے تو وہ نیاز کی بے مثل نثر سے بھی ممکن ہے۔

اس اندازِ بیان سے ذرا مختلف لیکن لطف و نزاکت کے لحاظ سے یکساں ایک اور ادبی شہ پارہ ملاحظہ ہو جسمیں خاموشی ایک کلیم بلیغ بن کر آپ سے ہمکلام ہوتی محسوس ہوگی :-

"میں بعض اوقات محسوس کرتا ہوں کہ تیری خاموشی مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی ہے۔ تیری لانبی سیاہ پلکوں کو کھول کر تیری نگاہ میرے قلب تک پہنچنے ہی والی ہے اور میں سراپا انتظار، ہمہ تن حیرت ہوکر رہ جاتا ہوں"۔

یہ فریب تخیل نہیں بلکہ فراوانیٔ جذبات کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے جسے پوری طرح سمجھنے کے لئے عام سطح سے کسی قدر بلند ہوجانا پڑتا ہے۔

نیاز کا حُسنِ بیان مذکورہ بالا نمونوں میں اکثر جگہ اپنی جھلک دکھا چکا ہے، اسلئے اس پہلو پر علیحدہ اظہارِ خیال کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تاہم ایک خصوصیت جو نیاز کے رشحاتِ قلم میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اور جس کی مثال اب تک کسی زاویۂ نظر سے پیش نہیں ہوئی ہے، وہ کیفیتِ ابہام ہے۔ جو تحریر میں قوت و زور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ حسن و نزاکت تخلیق کرتی ہے۔

عام لوگ جن باتوں کو پوری وضاحت کے ساتھ نمایاں کر دینے کے عادی ہیں نیاز اسی کو مبہم پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ایسے ابہام کی مثالیں شاعری میں تو بہت مل سکتی ہیں لیکن نثر میں شاید نیاز کے سوا کہیں نظر نہ آئیں۔ "دنیا کا اولین بُت ساز" علم الاصنام کے رنگ میں لکھا ہوا ایک افسانہ ہے جسکا ہیرو ــــ زرتل ــــ ایک بُت ساز ہے۔ وہ سنگ مرمر کی ایک چٹان سے عورت تراش کر چاہتا ہے کہ اسے جیتے جاگتے ایک پیکرِ نسائیت میں تبدیل کردے۔ چنانچہ جب شام کی سیاہی طاری ہو جاتی ہے اور ارغوانی سایہ کا دامن تمام کوہ و دشت پر پھیل جاتا ہے تو وہ آسمان و زمین کے بادشاہ کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔ کہ "تیرے دامن سے میں صرف تھوڑا سا رنگ چاہتا ہوں اور ذرا سی گرمی اور اگر تو عنایت کرے تو کچھ وہ چیز بھی جس سے تو جنگلوں میں پھولوں کو پختہ کرتا ہے اور سنہرا"۔

پھلوں کو پختہ اور سنہرا کرنیوالی تابشوں کا نام ظاہر کرنا اور صرف قارئین کی فہم رسا پر چھوڑ دینا وہ طلسمِ بیان ہے جسکی شعریت تعریف سے مستغنی ہے۔ اسی طرح "کیوپڈ اور سائکی" میں حسن کی بے پناہ جاذبیتوں کو مبہم طریقے پر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اسے کیا خبر تھی کہ جب حسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے اور جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہوجاتے ہیں تو عورت کیا قیامت ہوجاتی ہے"۔

سطحی نظر رکھنے والے حسن و جمال کی ظاہری زینتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اسکا معیار قائم کرتے ہیں لیکن جو باریک بین اور عمیق النظر ہیں وہ اس سادہ حسن پر جان دیتے ہیں جو تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور ہو۔ لیکن اسکا کیا علاج کہ خود صنفِ نازک تکلفات کی دلدادہ اور عوائدِ رسمیہ کی پابند رہنا چاہتی ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ منظرِ عام پر آنے سے قبل اچھی طرح نوک پلک کو درست کرلے۔ البتہ سوتے وقت وہ قدرتی طور پر ان ظاہر داریوں سے خالی الذہن رہتی ہے اور سوکر اٹھنے پر بھی اسے اپنے منتشر بالوں کی اصل کیفیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں نظر آنے والے حُسن کی کیفیات کو نیاز نے اس طرح بیان کیا ہے کہ پوری طرح واضح نہ ہونے پر بھی وہ حُسن کی ایک شرح بسیط سے کم نہیں ہے۔

کبھی کبھی نیاز اپنے لطیف خیالات کو ان پہیلیوں کی طرح پیش کرتے ہیں جنکی توجیہ معنی کے اصل الفاظ میں کہیں مضمر ہوتی ہے اور جس کو سمجھ لینا زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔ اس قسم کی ایک مثال ملاحظہ ہو :-

"تم، کہ تمہاری نگاہ سطح کے اندر سوئی کی نوک کے برابر بھی نفوذ نہیں کرسکتی، تم، کہ تمہاری دنیا لذتِ کام و دہن سے آگے نہیں بڑھتی، تم کہ تمہارے نزدیک حُسن کا مفہوم سطحِ رنگین سے زیادہ نہیں، تم کہ تمہارے پندار میں محبت کا مقصود صرف اتصالِ جسم کا نام ہے، کیا سمجھ سکتے ہو کہ میں اسے کس نگاہ سے دیکھتا ہوں؟"

کیا اس سوال کا جواب انہی الفاظ میں پوشیدہ نہیں ہے اور اس سے کہنے والے کے معیارِ حُسن و عشق کا پتہ نہیں چلتا؟ دوسرے کے جذبات و خیالات پر حرف زنی کرکے درحقیقت اپنے جمالیاتی ذوق کی ترجمانی کی گئی ہے اور یہ اندازِ بیان اتنا لطیف ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نیاز کے کل سرمایۂ ادب پر ــــ اس سرمایۂ ادب جسکا مقابلہ ہفت اقلیم کی دولت سے بھی نہیں ہوسکتا ــــ عمیق و بسیط نظر ڈالنے کے لئے وقت اور صلاحیت کی ضرورت ہے اور میں بلا مبالغہ اپنے آپ کو اس لحاظ سے تہی دامن پاتا ہوں۔ لہذا ان صفحات میں جو کچھ لکھا، اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ آئندہ کسی اور زاویے سے نیاز کے رشحاتِ قلم پر نظر ڈالوں۔

خبطی

تسنیم سلیم

ایک ذراسی غلطی نے زندگی کی ساری بنیادیں ہلادیں۔ شکست آسمان سے آئی یا زمین سے پھیلی، بہرحال مجھے اس طرح پسپا کردیا کہ شاید اب زندگی بھر سر نہ اٹھا سکوں۔ تم کو شکوہ ہے کہ میں نے تمہارے تین چار خطوط کی رسید بھی نہ دی اور بلکہ بیٹھے بٹھائے تم سے ایسی قیاس آرائی کی ہے کہ اب ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالوں۔ تب بھی سارا مقصد تمہارے سامنے بکھر گیا ہے!!! ہاں طوفان دور ایسا شدید طوفان جس نے زندگی کی ساری مسرتوں کو پامال کردیا۔ ساری خوشیاں بہہ گئیں میں نے جان بوجھ کر اپنا سرمایہ حیات ان شوریدہ سر لہروں کی نذر کیا۔ میں کس سے شکوہ کروں۔ کس کی شکایت کروں۔ تم جانتی ہو کسی سے اپنی مظلومیت کی داستان دہراؤں بھی تو الٹا مجھ پر الزام آئے گا۔ ذمہ دار بھی ایسا بنا یا تھا۔ اگر تم نے یہ نہ لکھا ہوتا کہ میرے گذشتہ خطوط میری ذہنی تبدیلی کے آئینہ دار رہے تو شاید یہ موضوع نہ چھڑتا۔ طبیعت کی عجیب کیفیت ہوگئی ہے۔ سارے رنگ پھیکے اور دنیا کی ہر شے میں ایک شدید سی ...... شاید اس سکون کی ہو ایک درد کے بدلے ہم نے بڑے فخر سے بیچ ڈالا!!

اب سے ڈیڑھ دو مہینے قبل جو تم کو خط لکھا تھا اس میں نفوں تمہاری بینائی مستور سے عریاں ہوئی جاتی تھی۔ آج میں نے وہ آبگینہ ہی توڑ ڈالا جو نکاہ ہو کے اضطراب کو ابلتی ہوئی شراب تک پہنچانے میں حائل ہونے کی ناکام سی کوشش کرتا تھا۔ اب یہ زمین پر بکھر گئی .... انگارے ہوں یا پانی کے چند قطرے آنسوؤں کا بھاؤ گر گیا ہے مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے۔ دل پر جبر کرکے ہنس لیتی ہوں۔ ورنہ یہ تو بیتی باتیں ہو چکیں۔ صبر کی نہ پوچھو میرے منہ کے نکلے ہوئے الفاظ، میرے جسم کی حرکت، میرے لبوں کی مسکراہٹ، میری زندگی کا ہر قدم ایک صبر ہے، اور خود میرے ہاتھوں میرے ہی دل پر! یہ جذبہ شاید ابھی بیدار ہوا ہے ورنہ اسوقت بھی تو صبر کیا ہوتا جب خود بھی دل بیتاب تھا کہ اس مضبوط کشتی میں چھید کردوں۔ پتوار پھینک دوں، اور اس اتھاہ سمندر کی گہرائیوں میں غرق ہوجاؤں ـــــ!! تم مجھے دیکھو گی تو حیران رہ جاؤگی کہ یہ کمبخت کیا سے کیا ہوگئی ہے۔ ہوا چلتی ہے تو میرا دماغ میرے ہوش وحواس سب اس کے ساتھ اڑنے لگتے ہیں۔ اور پانی برستا ہے تو دل کا ہر آبلہ چھوٹ کر بہہ نکلتا ہے۔ کبھی وہ مجھ سے اتنا دور محسوس ہوتا ہے کہ میں اس کے تعاقب میں کامیاب نہیں ہوسکتی اور میرے اعضا شل ہوجاتے ہیں، سانس چڑھ جاتی ہے، بازو بے جان ہوجاتے ہیں، اور کبھی جب میں ہر چیز سے خالی الذہن ہوکر اپنی آنکھیں میچ لیتی ہوں تو وہ دفعتاً میرے قریب آجاتا ہے اور مجھ سے اتنا نزدیک ہوجاتا ہے کہ میں اس قرب کو برداشت نہیں کرسکتی۔ میں اپنا چہرہ بچانے کی کوشش کرتی ہوں تو وہ برسات کے بادل کی طرح گرد وپیش کی ہر چیز پر چھا جاتا ہے جیسے میرے کانوں میں اسکی آواز آرہی ہے۔ اور آنکھوں میں اس کی شکل ... مسکراتی ہوئی آنکھیں اور پیشانی پر بکھرے ہوئے بال!! ـــ یہاں دماغ مختل ہوا میری روح بے بس پرندے کی طرح پنجرے میں پھڑپھڑائی ـــ چند ثانیہ کے لئے میری موت اور زندگی کے مابین کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ پھر وہی طلائی زنجیریں جو سانس کی آمد ورفت کا ثبوت ہیں۔ نہ جانے یہ سب کیوں ہوگیا!!

مجھے آج سال بھر کی یادداشت کو کاغذ کے صفحوں پر لانا ہے۔ وہ پہلا دن جب میں نے اسکو دیکھا۔ اور وہ آخری لمحہ جب وہ چپ چاپ مجھ سے جدا ہوگیا شاید ہمیشہ کے لئے!! کاغذ پر لکھنا کیا دشوار معلوم ہوتا ہے اور دل و دماغ پر اس طرح کندہ ہوگیا کہ کانوں کان خبر نہ ہوسکی! تم بڑی محبت سے مدعو کررہی ہو مگر مجھے یہ لکھتے ہوئے ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا کہ اب مجھے تم سے مل کر خوشی نہ ہوگی۔ تمہاری باتوں میں سکون نہ ملے گا۔ یہ سب تو مجھے مل بھی چکا اور مجھ سے چھن بھی گیا۔ چچا جان مصر ہیں کہ میں ہمیشہ ان کے پاس چلی جاؤں۔ رشیدہ کے بھی انتہائی اصرار کے خط آرہے ہیں۔ اختر علیحدہ اس کے کوشاں ہیں مگر میں نے طے کرلیا ہے کہ میں کہیں بھی نہیں جاؤنگی!! خصوصاً اسلئے کہ اب مجھے اختر کے نام سے اور اس کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ اس نے کچھ بھی کہا تو اس دفعہ عجب نہیں میں سرپھری بڑی بات کہہ جاؤں جو چچا جان اور چچی جان سب کے لئے افسوس کا باعث ہو۔ اور پھر اختر اچھا خاصہ انسان ہے اسے تکلیف پہنچا کر مجھے بھی خوشی نہ ہوگی!!

یہاں پہنچی تو اس حماقت کے ساتھ کہ آپا جان محض آدھے گھنٹے پہلے ماگیرہ چلی جاچکی تھیں۔ غالباً یہ بات میں نے تم کو کسی خط میں لکھی بھی تھی کہ بمبئی سے چلتے وقت ہماری ٹرین چھوٹ گئی تھی اور میں الہ آباد پہنچی تو معلوم ہوا کہ آپا جان رخصت بھی ہوگئیں۔ اسوقت بہت افسوس ہوا کہ سال بھر سے ملی نہیں تھی اور اب سال بھر اور لگ جائے گا تب کہیں وہ پھر آئینگی۔ اختر میرے ساتھ آئے تھے۔ اماں جان نے بہت روکا کہ میاں اتنا لمبا سفر کرکے آئے ہو کم از کم ہفتہ، دو ہفتہ تو رکو"۔ مگر وہ عجیب عجیب سے بہانے کرکے تیسرے ہی دن لوٹ گئے۔ کچھ میری خصلت سے عاجز تھے۔ پھر دیکھا کہ مجھے بمبئی چھوڑنے کا ذرا بھی غم نہیں، ان سے جدائی کا صدمہ نہیں تو اور بھی بددل ہوگئے اور کسی طرح بھی یہاں ٹھہرنے پر رضامند نہ ہوئے۔ کہنے لگے "جب ملنے کو دل چاہے مجھے بلا لینا یا بمبئی چلی آنا" میں نے کہا" یعنی اس کا تو امکان نہیں کہ میں آپکی از خود رفتہ ہوجاؤں جو بمبئی چلدوں یا آپ کی طلبی کے خطوط لکھنا شروع کردوں؟" تمہارے بھر وہ کیا کہتے۔

اختر چلے گئے تو مجھے تنہائی کا پورا احساس ہوا۔ لاکھ میں اختر سے کبھی سیدھے منہ بات نہ کرتی تھی مگر اتنا تو تھا کہ کسی موضوع پر بحث چھڑ گئی۔ یا اس نے کہا کہ ہماری طرف سے سینما کی دعوت ہے اور ہم سب مل کر چلے گئے۔ اس کے علاوہ رشیدہ سے انتہائی دوستی۔ حمیدہ کی شرارتیں، چچی جان کی نصیحتیں اور چچا جان کا لاڈ سب سے بڑھ کر بمبئی جیسا مقام، کبھی دل پر بار نہ ہوتا اور یہاں کی سمجھو کہ اول تو اماں جان ہمیشہ سے چپ چاپ، پھر آپا جان کے چلے جانے سے بیحد افسردہ۔ الہ آباد میں کبھی کوئی سہیلی نہ جڑی کس سے بات کروں۔ کہاں جاؤں۔ پہلے دن ہی مجھکو الجھن سی ہونے لگی۔ میں نے اماں جان سے کہا "بھئی اس طرح تو مجھے دق ہو جائے گی یہاں کوئی بات کرنے کو نہیں کیسے کام چلے گا؟" اماں جان کا فوراً ایک جواب کہدیا کہ بیکار رہنے کی کیا ضرورت ہے پھر کالج میں داخلہ لے لو۔ میری یہ کیفیت کہ جب سے سینئر کیمبرج میں فیل ہوئی کچھ پڑھائی کے نام سے نفرت سی ہو گئی تھی، اس لئے نتیجہ نکلتے ہی ناکامی کا غم اٹھائے میں چچا جان کے ساتھ بمبئی چلی گئی تھی۔ اب سال بھر کے بعد پھر کالج جاؤں یہ انتہائی مہمل لگتا تھا۔ آپا جان کی کون حرص کرے ان کو پڑھنے کا خبط ہے۔ خوب شاندار طریقے سے یہاں بی۔ اے کا امتحان دیا اور اس کے بعد کسی نے رائے دی کہ علیگڑھ سے بی۔ ٹی کرو۔ تو خوشی خوشی، فرسٹ ڈویژن کی سند لے کر علیگڑھ چلی گئیں۔ مجھے بچپن سے یہ سب بیہودہ لگتا ہے کیسی مصیبت سے سینئر کیمبرج کا امتحان دیا تھا تو وہ سب کا سب الٹا ہو گیا۔ لہذا صاف صاف کہدیا کہ بندی ایک لفظ نہ پڑھے گی خواہ کچھ ہو جائے اماں جان نے کہا "اور کیا مشغلہ بتاؤں؟" میں نے کہا "بات کرنے کو کسی کا نام بتائیے" تو کہنے لگیں "ناصر کو آ جانے دو وہ خود بھی بہت باتیں کرتا ہے"۔ میں بھول ہی گئی تھی کہ یہاں ناصر صاحب کا بھی وجود ہے۔ دراصل ان کے متعلق کچھ ٹھیک سی اطلاع ہی نہ ملی تھی۔ آپا جان نے دو چار مرتبہ لکھا تھا وہ بھی کچھ ایسے کہ میں نے توجہ ہی نہ دی۔ کبھی یہ کہ ایسے ہی ہیں مغرور سے پھر یہ کہ باتیں اچھی کرتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ بھی کہ گاتے عمدہ ہیں۔ میں نے سوچا کہ ہونگے دق خواہ مخواہ سے لہذا بھول ہی گئی۔ اب جو اندھیرے میں اجالے کی کرن چمکی تو جلدی سے پوچھا کہ آخر ہیں کہاں وہ حضرت؟ اماں جان نے فرمایا "اعجاز کو چھوڑنے گئے ہیں کل یا پرسوں تک آ جائیں گے"۔

ناصر صاحب پورے ایک ہفتہ بعد تشریف لائے۔ کہنے لگے "کانپور کے اسٹیشن پر کوئی دوست مل گئے تھے۔ انہوں نے روک لیا۔ میں نے اپنے کمرے میں سے موٹر کی آواز سنی اور لپک کر چلی کہ دیکھوں ناصر صاحب کس وضع قطع کے ہیں۔ پتہ چلا کہ وہ اماں جان کے پاس ہیں۔ ادھر میں نے اماں جان کے کمرے میں قدم رکھا ادھر وہ باہر نکلے۔ بدحواس اور سراسیمہ سے! مجھے دیکھا مگر نظر انداز کر کے جلدی جلدی نہ جانے کہاں غائب! میں نے اماں جان سے کہا "یہی ہیں وہ ناصر صاحب!" کہنے لگیں "ہاں یہی ہیں تم نے سلام بھی کیا؟" "پہلے میں سلام کرتی وہ تو معلوم ہوتا تھا کسی کو قتل کر کے آئے ہیں گھبرائی صورت!" "تھک گیا ہے بیچارہ سفر بھی کیا کم ہے" "لاکھ سفر لمبا ہو ایسی وحشت کس کے منہ پر برستی ہے یہ تو کچھ حواس باختہ لگتے ہیں آپ بتائیے کیسے ہیں؟ کچھ خوش مذاق؟" اماں جان نے چڑ کر کہا "بی بی! میرے تو وہ بچوں کے برابر ہے مجھ سے تو کیا خوش مذاقی کا اظہار کرتا اب گھر میں رہتا ہے تم دیکھ ہی لو گی"۔ ایک گھنٹے بعد کھانے کی میز پر ان کی طلبی ہوئی۔ فوراً معذرت کر دی۔ میں نے سوچا کہ ان کا تو آنا اور نہ آنا سب یکساں ہی رہا پندرہ بیس دن تک ناصر کی یہی کیفیت رہی۔ جیسے کہ مجھ سے خدا مارے کا بیر ہو۔ کھانے کی میز پر بیٹھے گا تو بہت دور اور بالکل چپ چاپ صبح شام کی چائے پر یہ بدتمیزی کرتا کہ میرے آنے سے پہلے ہی الم غلم کھایا اور اٹھ کر چلا گیا۔ ایک دفعہ تو میں جھنا گئی کہ آخر یہ ڈھنگ کیا ہے میں اچھوتی چائے پینے کو دیتی ہوں۔ اس سے دس منٹ انتظار بھی نہیں ہوتا۔ گانے کا انتہائی شوق تھا جب نہ تب گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا ہوگا۔ ادھر میں ڈرائنگ روم میں پہنچی اور اس نے شیلف سے کتاب نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ گفتگو اتنی محدود کہ آداب، تسلیم زیادہ سے زیادہ یہ کہ موسم اچھا ہے۔ ورنہ اس کے خیال میں تو میرا عدم اور وجود برابر تھا۔

میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے میرے ساتھ ایسا عجیب و غریب برتاؤ کیا ہو اور اس کا سلوک میرے لئے بلا وجہ الجھن کا باعث ہو گیا۔ رہ رہ کر سوچتی تھی کہ اگر وہ مغرور ہے تو مجھ سے کیا واسطہ، بدتمیز ہے تو میرا کیا لگتا ہے۔ مگر سکون نہ ہوتا۔ ایک دفعہ یہ بھی خیال آیا کہ اللہ نے میرے تکبر کا بدلہ دیا ہے کبھی کسی کی بات کا سلیقہ سے جواب نہ دیا۔ کسی کی پرواہ نہ کی۔ اختر نے رو رو کر جان کا خون کیا اور وہ دوسرے اصغری صاحب تو خودکشی پر آمادہ تھے۔ شاہد سے تم بھی مل چکی ہو انہوں نے انتہا کی کہ آنا ہی چھوڑ دیا۔ اور یہی ساری باتیں دراصل مجھے متنفر کرتی تھیں۔ جہاں کسی نے بہت خاکساری کا اظہار کیا مجھکو چڑ سی ہونے لگی، کسی نے محبت کا نام لیا اور مجھے لذت کا احساس ہوا، جب کوئی قریب آنے کا کوشاں ہوا مجھ سے دور ہوتا چلا گیا۔ بمبئی جا کر ہی تنخدیم کو بھی لکھا تھا کہ ایک صاحب کی اختر سے جل گئی اختر کو یہ بھی برداشت نہ تھا کہ کوئی میری طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔ انہوں نے گھر آئے مہمان کی توہین کی اور اسے خوب الٹی سیدھی باتیں سنائیں۔ نہ جانے اس غریب کو مجھ سے کیا بدگمانی تھی کہنے لگا "وہ خود فیصلہ کریں گی" میں نے رشیدہ کی موجودگی میں دعلو کے منہ پر کہدیا کہ تم میں سے ایک بھی مجھے ذرا نہیں بھاتا پسند اور ناپسند کا سوال ہی نہیں! اور خدا جانتا ہے کہ مجھے دونوں ہی برے لگے۔ بس اسلئے کہ وہ میرے قدموں پہ جھکے رہتے تھے۔ زندگی سینکڑوں واقعات سے

ٹھبری پڑی ہے مگر یہ واقعہ نیا تھا اور عجیب .... مجھے اس کی چبھن تھی کہ اس نے مجھے ناقابل اعتنا سمجھا آخر کیوں!!

ایک دن تو بات انتہا سے بھی بڑھ گئی .... وہ پہلے کھانے پر وہ کچھ چڑچڑا سا ہو گیا۔ اماں جان سے کہنے لگا کہ کھانا اچھا نہیں پکتا" اماں جان نے بھی خواہ مخواہ کہنا شروع کیا کہ "حقیقتاً کھانا بدمزہ پک رہا ہے۔ ہمیشہ اتنا زخیال رکھتی تھی۔ اور ممتاز جب سے آئی ہے اس نے بھول کر بھی کسی چیز کی طرف توجہ نہیں دی۔" میں نے کہہ دیا کہ "بس اب یہ نوکری تو مجھ سے نہ ہوگی کہ کھانا پکایا کروں"۔ اماں جان کہنے لگیں کہ "تم سے کھانا پکانے کو تو نہیں کہتی مگر کبھی حکم دیکر ناصر کی پسند سے کچھ پکوا دیا کرو۔ اس پر مجھے اور بھی غصہ آیا کہ وہ تو اتنا بیہودہ ہے اور میں اب اس کے کھانے کا خیال رکھوں۔ یہ کیا اصول ہے جلدی جلدی کھانا ختم کر کے وہ اٹھ گیا۔ میں نے اماں جان سے کہا "آپ نے اسکو اتنی لفٹ کیوں دے رکھی ہے" وہ خفگی کے لہجے میں کہنے لگیں کہ "بی بی تم کسی بات کو سمجھتی نہیں۔ برادری کا معاملہ ہے یہ نام ہوگا کہ پڑھنے کو غریب گیا تھا ڈھنگ سے کھانا بھی نہ ملا۔ اس سے تو بورڈنگ اچھا۔" میں نے کہا "اسکو کہاں تک بھگتنا جائے ابھی تو سال بھر رہے گا اور خدا معلوم ایم۔ اے کر کے بھی جائے گا یا نہیں" اماں جان کو ناگواری ہو گئی۔ انہوں نے کہا "تم پر کیا بار ہے تم سے واسطہ؟" میں نے بھی سوچا کہ ہاں بھلا مجھ سے کیا واسطہ! مگر واسطے تو خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ میرا موڈ خراب ہو گیا اور جا کر میں کمرے میں پڑ گئی۔ شام کو نوکر نے آکر کہا "ناصر میاں چائے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں" خوشا نصیب جی میں آئی کہ منع کر دوں مگر اٹھی اور خاموشی سے چلی گئی۔ وہ جھک کر کہا "بڑی دیر سے آپ کا منتظر ہوں" "جی فرمایئے کوئی کام؟" "کام کیا ہونا بس یونہی! دل گھبراتا ہے کھیلنے کو دل چاہتا ہے" "کیا کھیلنے کو؟" میں نے پوچھا! "کوئی بھی کھیل ہو۔ آپ کو کیا پسند ہے؟" میں نے کہا "بیڈمنٹن۔ ڈیک ٹینس" کہنے لگا "لو یہ لیجئے۔ لڑکیوں کے کھیل میں کہاں کھیلنے لگا!" "پھر آپ کو کیا آتا ہے؟" "ٹینس، فٹ بال، ہاکی، کرکٹ" بہت شان سے کہا "ہم کو ان میں سے کچھ بھی نہیں آتا ہے"! میں نے شرمندگی سے کہا "رہنے دیجئے آپ کے ساتھ کیا گڑیاں کھیلوں گا" میرے آگ لگ گئی تو میں نے آپ سے کیا کہا کہ آپ میرے ساتھ کھیلئے" اور چائے چھوڑ کر سیدھی اپنے کمرے میں گئی رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر میری انسلٹ کی ہے یا تو بالکل خاموش رہتا تھا اس دن سے زبان چل گئی بس میں آکر بیٹھی اور اس نے شیخی بگھارنی شروع کی۔ کیا مجال جو اماں جان کی بھی شرم کرتا ہو۔ بس ہر وقت اپنی تعریف! "میں کرکٹ ٹیم کے ساتھ کلکتہ گیا تو نہ پوچھئے کہ دیکھنے والوں کی کیا کیفیت ہوئی اٹھارہ ہزار کے مجمع میں کھیلا۔ لوگ دنگ تھے کہ یہ کس قیامت کی پھرتی سے کھیلتا ہے۔ بس کھیل ختم ہوا اور ہم تالیوں کے شور میں باہر نکلے۔ ایک لڑکی نے گلاب کا پھول پیش کیا میں نے توجہ نہ دی۔ دوسری نے گلے میں ہار ڈال دیا میں نے اتارا اور ایک دوسرے صاحب میرے ساتھ تھے ان کو تھما دیا۔ ایک لڑکی نے تو انتہا کی۔ بڑھ کر جھٹ سے میرے کوٹ کے کالر میں ننھا سا گلدستہ لگا دیا اور میں دیکھتا رہ گیا۔ پھر وہ بمبئی کا سفر جہاں کم سے کم میری ڈھائی سو تصاویر کھینچی ہونگی۔ بس لڑکیاں آتی تھیں کیمرہ لیکر اور خوشامد کرتی تھیں کہ خدارا ایک منٹ ٹھہر جایئے، جب لاہور گیا تو نہ پوچھئے کہ کیا کیفیت تھی۔ دعوتیں رد کرتے کرتے برا حال ہو گیا سڑک پر سے گذرتا تھا تو ہزاروں آوازیں آتی تھیں "ناصر! تم بہت اچھے کھیلتے ہو، ناصر! تم قیامت کے کھلاڑی ہو" اماں جان بیٹھی اس کی باتیں سنا کرتیں اور میں جلتی رہتی کہ ہم کو کیوں سناتا ہے۔ مانا کہ بھئی تیری شکل دیکھ کر ہی لگتا ہے کہ بہت اچھا اسپورٹس مین ہے۔ لمبا قد بڑے بڑے ہاتھ .... اور نہ جانے کیا کیا حسن کی بھرمار ـــــ مگر ہم کو کیا!! بیکار بنتا اور اتراتا بھی عیب ہے۔ مجھے انتہائی کوفت ہوتی کئی مرتبہ تو کچھ کہتے کہتے ہی رہ گئی۔

ایک دن شام کی چائے کے بعد اپنا البم اٹھا لایا۔ مجھ سے کہا "تصاویر دیکھئے گا؟" میں نے البم لے کر دیکھنا شروع کیا۔ یہاں سے وہاں تک لڑکیوں کے فوٹو اپنے پتہ نہیں کیا کیا لکھا ہوا اور عجیب عجیب سے چہرے کچھ بڑی بڑی سی آنکھیں اور کچھ لمبی لمبی ناکیں .... میں نے کہا "اچھا ذخیرہ جمع کیا ہے"! لاپرواہی سے بولا "میں نے جمع نہیں کیا خود ہی جمع ہو گیا ہے"

"خود کیسے؟"

"بس اسطرح کہ آپ اپنی کسی تصویر پر کچھ عشقیہ شعر لکھکر اس پر چپکا دیں تو میری جستجو کو اس میں کیا دخل" مجھے اس کا یہ کہنا بہت برا لگا پہلی مرتبہ کان اس فقرے سے آشنا ہو رہے تھے۔ دل دکھ گیا۔ تاؤ علیحدہ آیا۔ "آپ ہر بات میں میرا نام کیوں لگا دیتے ہیں"۔

"میں نے کب کہا کہ ممتاز" اور شرارت سے ہنسا "میرا ذکر ہی کیا؟"

جی ہاں سچ پوچھئے تو آپ کا ذکر ہی کیا آپ نے کب مجھ سے کہا کہ ناصر صاحب ناگوار نہ ہو تو یادگار کے طور پر اپنی ایک تصویر پیش کر دوں،، ! مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں واحد میرا قبضہ تھا۔

آدھا گھنٹہ بھی نہ گذرا ہوگا جو برامدے میں ناصر کی آواز سنائی دی ممتاز "ممتاز" ارے بھئی ممتاز صاحبہ!" فرمایئے کیا ہے؟

"باہر آیئے کیا سہانا وقت ہو رہا ہے۔ ایسے میں اندر بیٹھنا بد مذاقی سمجھا جائے گا" "آپ باہر گھومئے"

"تنہا کیا گھوموں کوئی تو ساتھ ہو! آیئے بھئی چمن میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ باتیں کریں گے"

انکار کی ہمت نہ ہوئی۔ جانتی تھی کہ اگر میں نے منع کر دیا تو وہ خوشامد
کرنے سے رہا بلکہ اور طنزیہ باتیں کرکے دل دکھائے گا۔ جب گھر میں اسکو رہنا
ہے تو کیوں بگاڑوں ...... طوعاً وکرہاً باہر نکل آئی۔ کوئی الٹا سیدھا سا
گیت گاتے ہوئے وہ میرے ساتھ چمن میں پہنچ گیا۔ میں ایک پیڑ کے تنے کا سہارا
لیکر بیٹھ گئی۔ اور وہ تاصرتے ادھر ادھر چکر لگانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک
بڑا سا پھول لیکر میرے قریب آیا اور پھول کو مجھ سے دو گز کے فاصلہ پر رکھ کر
واپس چلا گیا۔ کچھ دیر میں سوچتی رہی کہ اس پھول کو یہاں رکھنے سے اس کا
مقصد کیا ہے۔ پھر یونہی بلا سوچے سمجھے پھول اٹھا کر اپنے بالوں میں لگا لیا۔
نظر اٹھا کر دیکھا تو دور ایک "رات کی رانی" کی جھاڑی کے نیچے کھڑا ہوا مسکرا رہا
تھا۔ میں جھینپ گئی کہ وہ کیا سوچتا ہوگا۔ اس نے مجھے پھول نہیں دیا تھا بلکہ
زمین پر ڈالدیا تھا مجھے کیا سوجھی کہ اٹھا کر بالوں میں لگا لیا پھر اس کی فاتحانہ ہنسی!
دوسرے لمحہ پھول چھ سات ٹکڑے ہو کر گھاس پر جا پڑا۔ پھر اس کی طرف دیکھا
تو دفعتہً بیحد اداس پایا۔ چپ چاپ آکر سامنے بیٹھ گیا میں نے ستانے کی غرض
سے کہا "خاموش سے کیوں ہیں آپ؟" "آپ سے خفا ہوں" بے تکلفی سے کہا
"مجھ سے؟ کیوں؟" "میں نے ایسی محبت سے پھول پیش کیا تھا" "کس کو پیش
کیا تھا؟" "آپ کو اور کسے!" "واہ آپ تو زمین پر ڈال گئے تھے" "ظاہر ہے کہ
آپ کے علاوہ اور کون یہاں موجود تھا جس کے لئے پھول لاکر رکھتا" "آپ کو
چاہیئے تھا کہ میرے ہاتھ میں دیتے"۔ اس نے لاپرواہی سے کہا "خیر وہ تو جو ہوا
سو ہوا مگر آپ نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی" نہ جانے کس کا حکم تھا اور کیوں
میں مجبور ہو گئی بہر حال اڑتی ہوئی پتیاں جمع کرکے میں نے رومال میں لپیٹ
لیں۔ اس نے ہنسکر سلوٹ کیا اور کہا "اعجاز تھیں تو کچھ نہ کچھ پروگرام
رہتا تھا آپ تو بہت ہی نک چڑھی ہیں۔ چلو کیرم کھیلیں" میں اس کے ساتھ کیرم
کھیلنے کو تیار ہو گئی۔ سچ پوچھو تو ہر کھیل میں شرکت کے لئے خوشی سے راضی تھی
اس نے بھی مطمئن ہو کر اچھی طرح ماتیں دیں ...... میری قسمت!!
اس نے کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے مگر کیا
اس کے کہنے کی ضرورت تھی ...... مجھے ہوش نہیں کہ کتنی مرتبہ اس کے
سامنے جھجکی ہوں۔ وہ موجود نہیں تو دل نہیں لگتا وہ کالج چلا جاتا ہے تو
بے تابی سے منتظر رہتی ہوں۔ وہ خاموش ہو جاتا ہے تو میرا دل بیٹھ جاتا ہے۔
وہ اداس ہوتا ہے تو میری روح مضمحل ہو جاتی ہے۔ کیا اسکو ان ساری
باتوں کا احساس نہ تھا ...... مجھے خود بھی اپنے اوپر ہنسی آتی تھی۔ اس کے
تحکمانہ انداز مجھے کیوں بھلے لگتے ہیں!! اگر اس بات کو اختر یا اور
کوئی بھی سنے تو!!
ایک رات اس کی طبیعت خراب تھی۔ خلاف معمول اٹھ کر اپنے
کمرے میں چلا گیا ...... میں مضطرب ہو گئی کہ خدا جانے کیا قصہ ہے ایک
دل کہتا تھا کہ جا کر اس کی طبیعت کا حال پوچھوں پھر سوچتی کہ یہ اچھا نہیں وہ کیا
سوچے گا — وہ کچھ بھی سوچے میں نے زیادہ دیر سوچنے کی طاقت نہ پا کر بہت ہی
لرزتے قدموں سے اس کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ چپ چاپ پلنگ پر لیٹا تھا مجھے
دیکھ کر مسکرانے لگا۔ میں نے کہا "کیسی ہے آپ کی طبیعت؟" "اچھا ہوں" "تو پھر چلیئے نا"
"ابھی آتا ہوں"! میں لوٹ آئی دل میں عجیب وغریب خیال آرہے تھے کہ آخر میرے قدم
کیوں اسطرف اٹھ رہے ہیں۔ یہ راستہ غلط تو نہیں۔ بہت دیر تک سارے گھر میں
گھومتی رہی پھر دوبارہ اس کے کمرے کے سامنے سے گذری۔ رک کر پوچھا "سچ بتائیے
آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں ہے" "نہیں" اور وہ بستر سے اٹھ کر میرے قریب
آگیا۔ "کیا بہت پریشان ہو؟" میں نے کہا "ہاں" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے
میری آنکھوں کو چھوا اور ہنسکر کہا "جاؤ"! میں اس سے پہلے کمرے سے نکل آئی
آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ جیسے اس نے اپنی انگلیوں کے بجائے
بہت سی نیند اٹھا کر میری آنکھوں پر رکھ دی ہو۔ باہر نکلی تو ہوا کا سرد جھونکا
چہرے سے ٹکرایا اور میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں جل رہی ہیں؟ اور دل
بہت زور سے دھڑک رہا ہے ...... وہ بھی تین چار منٹ بعد نکل آیا مجھ میں
بات کرنے کی ہمت نہ تھی۔ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اس نے ادھر ادھر کے سوال کرنا
شروع کئے۔ مجھے خاموش پا کر کہنے لگا "انتقام لے رہی ہو؟" "کیا انتقام؟"
"کیا پتہ ...... لڑکیاں کون کون سی باتوں کا انتقام لینے کو آمادہ ہو جاتی
ہیں"۔ "آپ تجربہ کار ٹھہرے" میں نے یونہی کہدیا۔ "تجربہ! تم ایسی ہی باتوں سے
میرا جی جلایا کرتی ہو لاکھ مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میں نے کبھی کسی لڑکی طرف آنکھ
اٹھا کر دیکھا بھی پسند نہیں کیا تم پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے متاثر کیا ہے —
سچ کہتا ہوں اسی دن سے یہ تصویریں ...... یہ حسن و عشق! سب سے میرا
دل اکتا گیا ہے ...... پھر باآواز بلند گانا شروع کیا ؂

"اب تیرے سوا کوئی آنکھوں میں نہیں جچتا"

میں نے کہا "شور مت مچائیے" کہنے لگا "بننے کی کوشش مت کیجئے" "میں کیا
بنتی ہوں؟" "یہی کہ آپ مجھے پسند نہیں کرتیں" "جی میں کچھ سمجھی ہی نہیں"
کہنے لگا "یہ جو بتانا چاہتی ہو کہ میں تم کو اچھا نہیں لگتا تو سن لو کہ میں
ان باتوں میں نہیں آؤنگا" "کیا مطلب ہے آپ کا؟" "آپ کو سمجھنے میں کتنا
وقت لگے گا؟"
"کوئی ڈھنگ کی بات بھی ہو" میں نے ٹالنے کو کہا۔ "یہ بھی تجاہل عارفانہ
ہے — میں ایسا تو نہیں کہ آپ کی لاپرواہی سے کچھ ایسا ویسا مطلب نکال کر
بیٹھ جاؤں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جس طرح آپ مجھے اچھی لگتی ہیں اسیطرح
میں آپ کو اچھا لگتا ہوں ...... سنا آپ نے!" "واہ یہ بھی کوئی بات ہے"۔

میں اٹھ کر چلی "ٹھہرو بات سنو ـــــ اب کہدو کہ میں جھوٹ بولتا ہوں" "ظاہر ہے .... اور کیا" "ـــ اندھا تو نہیں ...... آپ کی آنکھیں مجھ سے سب کچھ کہدیتی ہیں" "ـــ کیا کہا میری آنکھوں نے ؟" "ـــ بس جو کچھ ہے ..... بہرحال وہ بیان تو نہیں ہو سکتا ـ آپ کے دل کی حالت ...... جب آپ میری طرف دیکھتی ہیں نا ـــ تو سب کھل جاتی ہے ـــــ اور میں تمہاری آنکھوں میں اپنے سارے مقصد پالیتا ہوں !!" میں نے کہا "میری آنکھوں نے آپ کو دھوکہ دیا ہے ـ اب میں آپ کے سامنے آنکھیں بند رکھا کروں گی" اور میں نے آنکھیں بند کرلیں ـ وہ کچھ مضطرب سا ہوگیا "خدارا آنکھیں کھولو ..... تم کو پتہ نہیں مجھے کیا ہونے لگتا ہے ...... تمہاری بند آنکھیں دیکھ کر ...... دیکھنا میرا دل کس بری طرح دھڑک رہا ہے" اس نے اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ـ "آپ کا دل کہاں آگیا گردن کے نزدیک ! بھلا سچ میں کس کا دل ہوتا ہے" "ہاں بس یہیں کہیں ہے ...... بہرحال ہے تو !" اور عجیب طرح سے آنکھیں بند کرکے ناک چڑھا کر سر کو جھٹکا دینے لگا ..... یونہی بیوقوفوں کی طرح !
مجھے اس کا یہ انداز بہت پسند تھا ..... نہ جانے اس کی حماقتوں میں کہاں سے دلکشی آتی تھی .... وہ اتنا حسین نہ ہوتا جب بھی اتنا ہی اچھا لگتا ـ

وقت کی رفتار نہ کبھی رکی اور نہ کبھی رک سکے گی جب بھی دن گذرتے تھے اور اب بھی گذر رہے ہیں مگر میری زندگی میں ایسا انقلاب آچکا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت میرا کھویا ہوا سکون مجھکو واپس نہیں دے سکتی ـ یہ وہی گھر ہے اور اس گھر کے وہی انسان ! وہی کرسی ہے جس پر وہ ہمیشہ بیٹھا کرتا تھا ـ وہی کتابیں ہیں جن کو وہ بلا مقصد الٹ پلٹ کرتا تھا وہی پھول ہیں جن کو اس نے لاکھوں مرتبہ پھوہڑ پنے سے میرے بالوں میں اٹکانے کی کوشش کی تھی ....
وہ یہاں نہیں ہے اور میں بھی وہ نہیں ہوں جس کے لئے زندگی نغموں بھرا رباب تھی .... اب تو ہر سانس آزار ہے اور دل کی ہر دھڑکن ایسا ہتھوڑا جو دماغ کے تاروں سے ٹکراتا ہے ـ اس کی خود اعتمادی نے مجھے لاچار کردیا ـ جب وہ بھی جانتا ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں تو کس سے چھپاؤں کیا چھپاؤں ...... اسی خود فراموشی میں ہاتھ سے پتوار چھوٹ گئی ! اس کے ساتھ جو دن گذارے اس گذشتہ رات سے کہیں زیادہ مختصر تھے جو میں نے یاس کی اندوہناک گھاٹیوں میں اس کو آوازیں دے دیکر گذاری ہے !!
اور پھر صبح ہوگئی ـــــ !!

آپا جان کے خط سے پتہ چلا کہ ان کے امتحان شروع ہیں اور پرچے ختم ہوتے ہی وہ الہ آباد آجائینگی ـ ناصر ان دنوں امتحان کی تیاری میں مشغول تھا ـ اس نے آپا جان کی واپسی کے مسئلے پر زیادہ توجہ نہ دی ـــ اماں جان نے ایک نوکر بھیجدیا تاکہ آپا جان کو ساتھ لے آئے مجھے بھی ان سے ملنے کی انتہائی بیتابی تھی ـ آپا جان رات کی ٹرین سے آنے والی تھیں ـ اماں جان ان کا کمرہ صاف کرنے میں مشغول ہوگئیں ـ ناصر اپنے کمرے میں کچھ پڑھ رہا تھا ـ مجھ سے وقت گذارنا دشوار ہوگیا ـ ذرا آپا جان کو ستانے کی غرض سے سوئی دھاگہ لیکر باغ میں بیٹھی کہ ہار بنا کر رکھوں گی وہ دیکھینگی اور جلینگی .... اتنے میں ناصر بھی باغ میں نکل آیا ـ "کیا ہو رہا ہے ؟" "یہ دیکھو کیسا عمدہ ہار بنا رہی ہوں آپا جان کیلئے" "ہاں ! آج اعجاز آرہی ہیں !" "آپ کو خوشی نہیں ؟" میں نے یونہی پوچھا ! "خوشی ؟ بہت خوشی کی بات ہے ـــــ ظاہر ہے پھر تم مجھ سے بات بھی نہ کروگی" "واہ ! آپ سے بات کیوں نہ کروں گی" "کیا پتہ تمہارا دل چاہے یا نہ چاہے .... میرے امتحان کل سے شروع ہیں ...... بس پھر چلا جاؤں گا ..... دور بہت دور" میں نے گھبرا کر کہا "آپ چلے جائینگے" "یہی تو مصیبت ہے" "اچھا !" میں نے پیڑ کے تنے کا سہارا لیا "تو آپ چلے جائینگے" وہ میرے قریب آگیا "ہاں اور کیا" میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا ـ "خدارا افسردہ نہ ہو مجھ سے تمہاری اداسی برداشت نہیں ہوتی .... تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھنا میرے اختیار سے باہر ہے" پھر مجھے اپنے ہاتھ پر انگاروں کی تپش محسوس ہوتی "یہ آپ کیا کر رہے ہیں !" مقابلے کی قوت نہ پاتے ہوئے بھی میں نے ہتھیار ڈالنا گوارا نہ کیا ـ اس نے میرے الفاظ نہیں سنے یا سننا ہی نہ چاہتا تھا بہرحال میری پیشانی دہک رہی تھی اور ہونٹ اس طرح جل رہے تھے جیسے کسی جان لیوا زہر کا پیالہ پی لیا ہو ..... وہ خود بھی اداس ہوکر چپ چاپ بیٹھ گیا ـ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا کہوں ـ "تم کو غصہ تو نہیں آگیا ..... بھئی معاف کرنا اگر ناگوار ہوتی ہو" میں نے کوئی جواب نہ دیا ..... اس نے پھر کہا "یہ تو انسانی فطرت ہے کہ جو چیز بہت اچھی لگے ..... اب دیکھو یہ پھول ہے ..." اس نے ایک پھول توڑ کر اسکو چوما "تمہارا دل نہیں چاہتا کہ اسکو پیار کرو میرے جلد کا انتظار کرو تو" اس نے پھول کو توڑ کر پیر سے مسل دیا "پھر یہ حشر ؟" میں نے بے ساختہ کہا ـ
"نہیں یہی تو فرق ہے ـــ تم اس سے مختلف ہو تم کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا ـــ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو زندگی میں کسی لمحہ بھی نہ بھولوں گا .... تمہاری یاد میری زندگی کا سرمایہ ہے اور بہت گہرا راز ! مجھ پر بھروسہ کرو !" میرے الفاظ کا انتظار کئے بغیر وہ کمرے کی طرف لوٹ گیا ـ میں مبہوت عالم میں وہیں بیٹھی رہی ـ اس کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آیا تھا ..... اس نے کیا کہا ... . اور کیا کیا !!

جب آپا جان آگئیں تو میں گود میں سے منتشر پھول اور آدھا پرویا ہوا ہار وہیں زمین پر ڈال کر اندر آئی ـ وہ بے اختیار لپٹ گئیں اور لاکھوں سوال کر ڈالے سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی "ناصر کہاں ہیں ؟ وہ اسٹیشن بھی نہیں آئے ـــ کیا گھر پر موجود نہیں ہیں" "ہیں تو" میں نے کہا "کل سے ایم ـ اے کا امتحان شروع ہے بس اس کی تیاری ہے" "پھر بھی کیا ان کو میرے آنے کی خبر نہیں ....

اچھا ممتاز تم میرے سامان کی خبر لو میں ناصر سے ان کے کمرے میں مل کر آتی ہوں"۔ آپا جان جلدی جلدی زینہ طے کر کے ناصر کے کمرے میں چلی گئیں۔ اور دس پندرہ منٹ کے بعد واپس آئیں تو لگتا تھا پانی سے دھو کر کسی نے چہرے کی سرخی اتار دی ہے۔ منہ سفید ہو رہا تھا۔ کہنے لگیں "یہ ناصر! کچھ عجیب سے ہو گئے ہیں میں گئی تھی تو بہت سرد مہری سے کہنے لگے کہ بیٹھو...... نہ جانے کیا بات ہے"۔ مجھے بھی حیرت ہوئی کہ وہ آپا جان کے ساتھ ایسے تکلف سے کیوں پیش آ رہا ہے کچھ پہلی ملاقات تو تھی نہیں اور اتنے دن بعد آپا جان ملیں اور یہ آتے ہی اس طرح دلگرفتہ ہو گئیں مجھے یہ اچھا نہ لگا!

"کچھ ایسے ہی ہیں...... پھر ان دنوں پڑھائی وغیرہ بہت ہے"۔

"لاکھ پڑھائی بہت ہو مگر...... ایسے تو وہ کبھی نہ تھے"

"چھوڑئیے بھی کچھ عجیب عادت ہے ان کی تو" میں نے کہا "اتنے دن بعد ملے مگر......" آپا جان مغموم سی ہو کر وہاں سے اٹھ گئیں اور اماں جان سے باتیں کرنے لگیں۔ مجھے موقع ملا تو سیدھی ناصر کے کمرے میں پہنچی کھڑکی کے پاس کھڑا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپا جان سے ملے"؟ "ہاں وہ ادھر آئی تو تھیں — زیادہ بات چیت نہ ہو سکی"! "کیوں؟" "میں ذرا کتاب دیکھ رہا تھا...... پھر وہ اٹھ کر چلی گئیں" "شاکی ہیں وہ آپ سے"! "مجھ سے؟ کیوں؟ میں نے کیا کیا"؟ "وہ کہتی تھیں کہ آپ نے ان سے اچھی طرح بات نہیں کی" "میں نے؟ ہاں ٹھیک ہے! میں نے ان سے اچھی طرح بات نہیں کی...... دراصل میری طبیعت خراب ہے" "کیا ہوا آپ کی طبیعت کو"؟ "بس میری طبیعت کا ایسا ہی ڈھنگ ہے دل ڈوبنے لگتا ہے کسی سے بولنے کو دل نہیں چاہتا...... پھر یہ امتحان......!"

میں نے غور کیا کہ آپا جان کی واپسی نے ناصر کو یکسر تبدیل کر دیا تھا وہ بہت ہی جان بچا رہا تھا اور اپنے کمرے سے نکلتے گھبراتا تھا۔ امتحان کا اچھا بہانہ مل گیا تھا۔ کھانے کی میز پر آتا تھا تو یہ آیا اور وہ گیا — میں بھی حیران تھی اور آپا جان کی یہ کیفیت کہ وہ میز پر سے اٹھا اور آپا جان کے ہاتھ کا نوالہ پلیٹ میں رہ گیا۔ متحیر نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہ جاتیں!!

امتحان شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ وہ آخری پرچہ کر کے لوٹا تو آپا جان نے اسکو راستے میں روک لیا "ناصر کیسا پرچہ ہوا"! "معمولی سا کوئی خاص نہیں"

"نہیں بھئی ٹھیک بتائیے" "میں نے کہا" "اب رزلٹ آؤٹ ہو گا تو دیکھ لینا" اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آپا جان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے بہت ہی مناسب لہجے میں کہا "ناصر کی طبیعت ہی بدل گئی — پہلے کتنی اچھی طرح سے باتیں کرتا تھا...... اب تو کوشش کرتا ہے کہ سامنے ہی نہ پڑے" میں نے آپا جان کی تسلی کے لئے کہا "وہ کسی سے بھی بات نہیں کرتے" "ہاں یہی تو ہے — مجھ سے انتہائی بے تکلف تھا پہلے! اب تو جیسے بالکل انجان بن گیا...... نہ جانے کیا ہو گیا"؟

میں اس ڈرامہ کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکی تھی کہ ناصر کو کیا ہو گیا۔ آپا جان ہی کیا وہ تو مجھ سے بھی اچھی طرح نہ بولتا تھا! تنہائی اگر ملتی تو دھیمی سی مسکراہٹ سے دیکھتا رہتا۔ میں نے پچاس مرتبہ پوچھنا چاہا کہ آخر تم کو ہوا کیا ہے۔ مگر جیسے اسپر مرگی کا دورہ سا پڑ جاتا ہو۔ "بیمار ہوں، مصروف ہوں" اور ٹیپ کا بند یہ ہے کہ "تم خبطی ہو" جہاں اس نے مجھے خبطی کہا میرا الجھا ہوا دل کھل گیا۔ اس کے یہ الفاظ مجھے نئی زندگی بخشتے تھے۔ گریبان کھلا ہوا۔ بال بکھرے ہوئے آنکھیں بند ناک چڑھی ہوئی اور بہت ہی دلکش انداز سے "خبطی" مجھے اس الفاظ سے کیسی انسیت ہو گئی تھی۔ اب بھی جبکہ اس نے پوری طرح سے سینہ گرہ کر رکھی تھی مجھے اس کے منہ سے یہ لفظ اتنا اچھا لگتا تھا کہ ساری شکایت بھول جاتی تھی۔

اسکو امتحان سے فارغ ہوئے ہفتہ سے زیادہ گذر گیا۔ پڑھائی کا سوال ختم ہو چکا تھا۔ اب ہر وقت سوتا تھا۔ جب معلوم کرو تو پتہ چلے گا "صاحب سوئے ہیں"! شام کے وقت میں اور آپا جان اماں جان کے پاس گئے تو وہ کچھ ناشتہ وغیرہ بنوانے کا حکم دے رہی تھیں ہم کو دیکھتے ہی کہا "پتہ ہے ناصر جا رہے ہیں" ہم دونوں نے حیرت سے کہا "کہاں"؟ "اپنے گھر اور کہاں"! میں خاموش کھڑی سنتی کی سنتی رہ گئی آپا جان نے کہا "آخر یہ دفعتہً کیوں جانے لگے" "امتحان تو نبٹ چکے ان کو گھر سے آئے قریب سال بھر ہو چلا ہے — بس اب واپس جا رہے ہیں۔ وہاں گھر کی زمینداری وغیرہ سنبھالیں گے...... شاید ان کی والدہ کا خط بھی آیا ہے" "کب جا رہے ہیں" آپا جان نے سوال کیا "آج ہی تو — رات کی بارہ بجے والی گاڑی سے" میری نظر گھڑی پر گئی۔ سات بجے تھے اب صرف پانچ گھنٹہ باقی ہیں پھر ناصر چلا جائے گا...... ہمیشہ کے لئے —! آپا جان اور میں دونوں کمرے سے نکل آئے۔ اور برامدے میں آکر ستون کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔

"ناصر جا رہا ہے۔ اور اس نے مجھ سے کہا تک نہیں" رہ رہ کر یہی سوال دماغ کی گہرائیوں سے اٹھتا تھا۔ اسوقت میرے ذہن سے یہ خیال نکل چکا تھا کہ اس کے جانے سے میرا کیا حشر ہو گا میری زندگی کس طرح گذرے گی بس یہی ایک نقرہ دل و دماغ پر مسلط تھا کہ اس نے مجھے کیوں نہ بتایا کہ مجھے کیوں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس نے یہ سب کیوں کیا میں اسے بے وفائی سمجھوں یا وفا اس کی محبت کہوں یا نفرت......!! آپا جان علیحدہ کھڑی کچھ سوچ رہی تھیں بڑی دیر بعد انہوں نے کہا "ممتاز!! تم نے ناصر کو سمجھایا نہیں؟"

میں نے کہا "آپا جان! ناصر کو سمجھانا آسان نہیں...... اپنے کو بھول کر بھی اسکو نہیں سمجھا جا سکتا" "میں چاہتی ہوں کہ جانے سے پہلے اس سے پوچھوں" آپا جان اس کے کمرے کی طرف گئیں۔ مگر چند ہی منٹ بعد آ کر کہا "وہ موجود نہیں البتہ

سامان بند ھ چکا ہے "۔

ناصر صاحب دس بجے کے قریب لوٹے۔ ہم لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ وہ سر جھکائے ہوئے آکر اماں جان کے قریب بیٹھ گیا۔ اماجان الوداعی گفتگو کرتی رہیں اور وہ "جی" "جی" کہتا رہا۔ گیارہ بجے تک باتیں ہوتی رہیں جس میں آپا جان نے کوئی حصہ نہیں لیا اور میرے الفاظ تو میرے حلق میں گھٹ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں سامان نکلوانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آپا جان بھی کمرے میں سے چلی گئیں۔ میں نے اٹھنا چاہا تو محسوس کیا کہ ہاتھ بجیں اور پیر ساکت ہیں۔ بہت دیر بعد اٹھنے میں کامیاب ہوئی۔ بلا ارادہ ناصر کے کمرے کا رخ کیا۔ کھڑکی کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ وہ کہہ رہا تھا "وہ تو خبطی ہے خبطی!"

میں نہ سمجھ سکی کہ اس نے کسے خبطی کہا ہے" مجھے! یا خود کو؟ آپا جان کی ڈوبتی ہوئی آواز سنائی دی "ناصر! میں تم سے کسی چیز کی طالب بھی نہیں تھی... ... میں نے پہلے ہی دن سمجھ لیا تھا کہ اب تم مجھ سے بہت دور ہو چکے ہو۔ مگر تم نے بخواہ مخواہ اپنا رویہ ایسا بنا لیا کہ ہر شخص نے اسکو محسوس کر لیا...... کیا محض اس لئے کہ تم مجھ سے نفرت کرنے لگے ہو...... ممتاز کہتی تھی کہ تم اس سے بھی بات نہیں کرتے اس لئے بھی حیرت ہے کہ......" میں نے کہا کہ وہ تو خبطی ہے خبطی!! ———" ناصر کی آواز سے اس کا دلی انتشار نمایاں تھا ——— میرا سر چکرا گیا۔ میں خبطی ہوں؟ پاگل ہوں؟ اس نے مجھے اب بھی ناقابلِ اعتنا سمجھا؟ کیا وہ محض میرا غرور توڑنا چاہتا تھا؟ محض میرے سکون کا طالب تھا؟...... اور یہ کھیل......... دور سے کچھ آوازیں سنائی دیتی رہیں چند ہچکیاں، چند اٹوٹتے ہوئے فقرے...... پھر موٹر کا ہارن... ...... اسٹارٹ کی آواز ——— ٹوٹتا ہوا دل ———!!

مجھے کچھ خبط سا ہو گیا ہے دل چاہتا ہے کہ رات کے سناٹے میں چیخیں مار مار کر ہنسوں، دیواروں سے سر پھوڑ دوں اور زمین و آسمان کو ایک کردوں بس اسے بالکل نہ سمجھ سکی مگر اس نے مجھے خبطی سمجھا...... اس کے خواب کیوں نامکمل رہجاتیں ———!!

فتنۂ بیدار

یادِ جاناں جو فسوں کار ہوئی جاتی ہے
کچھ فزوں حسرتِ دیدار ہوئی جاتی ہے

مرکزِ اندک دبیا ہوئی جاتی ہے
روح پھر عالمِ انوار ہوئی جاتی ہے

زندگی کتنی سُبکسار ہوئی جاتی ہے

ہمنشیں نقشِ محبت کے تسلسل کی قسم
پاسِ الفت کی قسم، صبر و تحمل کی قسم

اپنے فردوس سے پاکیزہ تخیل کی قسم
عشقِ آوارہ و خود بیں کے تحمل کی قسم

زندگی دولتِ بیدار ہوئی جاتی ہے

یہ فلک، چاند ستارے، یہ بہاریں کی ہیں
مہ جبینوں کا یہ جمگھٹ، یہ نوائے رنگیں

یہ شفق، بادۂ گلنار، یہ افکار حسیں
بیخود و مست غزلخواں ہے کوئی زہرہ جبیں

اور طبیعت ہے کہ سرشار ہوئی جاتی ہے

وضعِ الفت کا تقاضہ ہے بیاں کچھ بھی نہ ہو
قصۂ درد و حدیثِ دگراں کچھ بھی نہ ہو

حال اس جانِ تمنا پہ عیاں کچھ بھی نہ ہو
جی میں آتا ہے بجز عرضِ بیاں کچھ بھی نہ ہو

آہ پھر لغزشِ پندار ہوئی جاتی ہے

میرے ایوانِ تخیل میں نہیں غم کا گزر
کھیلتی پھرتی ہے اب آیۂ شبستانِ سحر

میری آہوں میں اثر ہے، مرے نالوں میں اثر
ہو سکے کاش یہاں جانِ تمنا کو خبر

زندگی فتنۂ بیدار ہوئی جاتی ہے

علی اشرف حیدرآباد دکن

برما کا ساگون ——— بقیہ صفحہ ۳۶

برسات کے موسم میں یہ تختے دریاؤں میں تیرنے لگتے ہیں۔

برسوں کی مہارت کے بعد ہاتھی اپنے کام میں اسقدر ہوشیار ہو جاتے ہیں جیسے انسان ایک ہاتھی کے متعلق یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ شہتیروں کا ڈھیر لگانے کے بعد گھٹنے کے بل جھک کر اور ایک آنکھ بند کرکے دیکھا کرتا تھا کہ تمام شہتیر ٹھیک اور ایک سیدھ میں ہیں یا نہیں۔ آپ چاہے اسکا یقین کریں یا نہیں۔ ہاتھی بکری کی طرح پہاڑ پر چڑھ سکتا ہے اور ناقابلِ یقین حد تک وزن اٹھا اور کھینچ سکتا ہے لیکن آجکل کے ہاتھیوں سے تختے کھنچوانے کا کام زیادہ نہیں لیا جا رہا ہے اب تو وہ ایک تلخ تر کام یعنی جنگ میں منہمک ہے۔ ہاتھی فوج میں بھرتی کر لئے گئے ہیں اور مشرق بعید میں دونوں فریق ہاتھیوں سے جنگی کام لے رہے ہیں۔ تاہم وہ وقت دور نہیں ہے جبکہ برمی لوگ پھر ساگون کے جنگلات میں کام شروع کردیں گے اور ہاتھی بھی اپنا پرانا کام سنبھال لیں گے۔ بہت جلد برما کے ساگون کی لکڑی کٹنے اور چھلنے کے لئے کارخانوں میں پہونچنے لگے گی اور ہمارے آپ کیلئے رقص کے فرش کا کام دے گی۔

فورٹ ولیم کالج اور اردو ادب

اطہر دہلوی

جب ہندستان میں انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا تو انھوں نے یہاں کے رسم و رواج اور طور طریق سے واقف ہونا ضروری سمجھا کیونکہ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور یہاں کے لینے والوں کے احساسات اور حالات جانے بغیر حکومت کرنا دشوار تھا۔ چنانچہ لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہو کر جب ہندوستان آئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی اصل زبان فارسی نہیں بلکہ ہندستانی ہے۔ اور یہ زبان ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اسی نظریہ کے ماتحت انھوں نے اردو زبان کو فروغ دینا مناسب سمجھا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے سامنے ایک ایسے کالج کے قیام کی اسکیم پیش کی جہاں اردو یا ہندوستانی کے ساتھ ہی ساتھ فارسی، عربی، سنسکرت اور دیگر یورپین زبانوں کی تعلیم دی جائے۔ کمپنی تو خود یہ ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اس لئے لارڈ ویلزلی کی اس اسکیم میں کچھ ردّ و بدل کر کے اسے منظور کر لیا اور صرف اردو کی تعلیم کے لئے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اور ان نووارد انگریزوں کو جو ہندوستان میں کسی عہدہ پر معمور ہو کر آتے تھے اردو زبان کی تعلیم دی جانے لگی اور اس کالج کے سب سے پہلے پرنسپل ڈاکٹر جان گلکرائسٹ مقرر ہوئے جو اردو کے اچھے خاصے عالم تھے اور فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے اپنے طور پر نووارد انگریزوں کو اردو پڑھاتے تھے۔

اردو زبان کی بنیاد پڑے ہوئے تو زمانہ گذر گیا تھا لیکن اس میں علم و ادب کی کتابیں بالکل نہ تھیں اور اب تک وہ صرف تقریری زبان تھی۔ مسلمانوں کی حکومت ہند کے زوال کے زمانہ میں شاعری شروع ہو گئی تھی۔ اور اردو ادب کا اکثر حصہ صنف نظم پر مشتمل تھا۔ مگر اردو نثر کا دامن نہایت محدود تھا۔ اگر کہیں نثر کی کتابیں متی بھی تھیں تو انھیں زبان اور طرز بیان کی حیثیت سے کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ کیونکہ ان کتابوں کی بنیاد زیادہ تر فارسی کی پر تکلف عبارت پر رکھی گئی تھی۔ اور مقفیٰ عبارتوں کو مغلق الفاظ، بے جوڑ ترکیبوں۔ دور از کار تشبیہات و استعارات سے مزین کر کے پیش کر دینا ہی نثر کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ سیدھی سادی باتوں کو رنگین اور پر تکلف طریقہ سے پیش کرنا۔ یہ تھی اس زمانہ میں قابلیت کی نشانی اور معیار ادب، — گویا اردو نثر ابھی ایک نونہال بچہ کی طرح اپنے چھوٹے سے گہوارہ میں ان تمام عظمتوں سے بے پرواہ تھی جو بہت جلد اس کے گلے کا ہار بننے والی تھیں۔

ان تمام خامیوں کو محسوس کر کے ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے اردو زبان کی ترقی کے لئے اطراف و جوانب سے بڑے بڑے زباندان اور اہل قلم حضرات کو جمع کر کے فارسی۔ عربی۔ اور سنسکرت کی بلند پایہ تصانیف کے تراجم کرنے پر مامور کیا۔ گویا اب دہلی کی ساری شان و شوکت کلکتہ میں نظر آنے لگی۔ اور اردو زبان کے بڑے بڑے اہل قلم حضرات مثلاً میر امن دہلوی، میر شیر علی افسوس، سید حیدر بخش حیدری، میرزا علی لطف، مولوی امانت شیدا، مظہر علی خاں ولا، نہال چند لاہوری، منشی بینی نرائن جہاں، میرزا جان طپش، للو لال جی، وغیرہ سے فورٹ ولیم کالج کی رونق دوبالا ہو گئی۔ یہ لوگ رات دن اردو کی ترقی میں مصروف ہو گئے۔ اور جان گلکرائسٹ نے انہیں سیدھی سادی، صاف ستھری، اور سلیس زبان استعمال کرنے کی تاکید کی تاکہ اسے ہر شخص بآسانی سمجھ سکے۔

کئی سالوں کی مسلسل اور انتھک کوششوں کے بعد مجموعی حیثیت سے کالج کی طرف سے چالیس کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں سے باغ و بہار، آرائش محفل، ترجمہ شکنتلا ناٹک، طوطا کہانی، نفس مضمون، زبان کی بلندی اور پختگی، طرز نگارش کے لحاظ سے بہت مشہور ہیں اور آج بھی جبکہ اردو زبان نیا رنگ روپ بدل چکی ہے یہ کتابیں آسمان اردو ادب پر آفتاب بن کر چمک رہی ہیں۔ ان کی لطیف تشبیہات و کنایات اور مزاح کے چٹخارے اب بھی ہر شخص کی زبان پر ہیں۔ میر امن کی باغ و بہار کا ترجمہ نہ صرف ہندی میں بلکہ انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی اور لاطینی زبانوں میں بھی کیا جا چکا ہے۔ میر شیر علی افسوس کی آرائش محفل بھی ابتک ہماری ادبی محفلوں کی آرائش بنی ہوئی ہے۔

بظاہر فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں کوئی اعلیٰ علمی تصنیف و تالیف نظر نہیں آتی۔ تمام کتابیں قصص و حکایات پر منحصر ہیں لیکن اگر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ فارسی اور ہندی کی ایسی مقبول عام اور ٹھیٹ کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنا ہی مناسب تھا جن سے خود اہل ہند کو دلچسپی ہو اور دوسری طرف انگریزوں کو اہل ہند کے مذاق و خیالات کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکے۔ یہی کتابیں اردو کے قدیم اسلوب بیان میں عظیم الشان انقلاب کا باعث ہوئیں۔ اور انھوں نے صفائی و سادگی کے ساتھ ساتھ آئندہ مصنفین کے سامنے مختلف اسالیب کے دروازے کھول دئے۔ اور ایسی نئی نئی راہیں نکالیں جن پر اردو کی بنیاد ہے۔

جس طرح اہل زبان نے فورٹ ولیم کالج سے پہلے نثر نویسی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، اسی طرح قواعد کی کتابوں سے بھی بالکل بے اعتنائی برتی تھی۔ ظاہر ہے کسی زبان کی اہمیہ اور ترقی کے لئے قواعد کی کتابوں کی کس قدر ضرورت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو بھی سب سے پہلے اہل یورپ نے محسوس کیا اور خود جان گلکرائسٹ نے سب سے پہلے اردو زبان کی قواعد کی کتابیں، مثلاً

رہنمائے اردو، علم اللسان، عملی نمونے۔ اردو کی صرف ونحو وغیرہ لکھیں جن کا اصل مقصد اردو کی نشر و اشاعت اور غیر ملکیوں کو اردو کی تعلیم دینا تھا۔ یہ کتابیں کافی عرصہ تک اردو سیکھنے والوں کی رہنمائی کرتی رہیں۔

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کا اسلوب نگارش بھی سادہ اور سہل ہے حالانکہ انکی کتابوں میں جگہ جگہ انگریزی الفاظ کی شمولیت بھی ملتی ہے مگر اس زمانہ کا پس منظر دیکھتے ہوئے ان کی اردو بہت غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے اردو کے انشا پردازوں کی صحیح رہنمائی کی اور ان کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جو منزل مقصود تک جاتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب کو ہندوستانی معاشرت، تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کے عقائد کے رسم و رواج سے بھی کافی دلچسپی تھی وہ نہ صرف اردو کے دلدادہ تھے بلکہ اس کو عام کرنے اور اپنے ہموطنوں کو سکھانے کے خواہاں تھے۔ انکو ہندوستان کے ہر علم و فن میں دلچسپی نظر آتی اور انگریزوں کو ان سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ مذہبی تعصب، اجنبیت سے بے نیاز اہل یورپ کو ان سے واقف کرنا چاہتے تھے۔

جان گلکرائسٹ زیادہ عرصہ تک کالج کی سرپرستی نہ کر سکے اور صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے انگلستان چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد کپتان جیمس جونٹ وکے برو قلیمہ مقرر ہوئے۔ مگر انھوں نے اس سلسلے میں کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی۔

فورٹ ولیم کالج نے اردو شاعری کی براہ راست کوئی خدمت نہیں کی بلکہ اس کا واحد شاندار کارنامہ نثر اردو کی خدمت ہے۔ مگر اس سے اردو شاعری کو بھی مستفیض ہونے کا موقع ملا یعنی کالج کی نگرانی میں مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ زکی۔ میر۔ سوز۔ سودا کے دواوین کا انتخاب بھی اس کالج کی طرف سے شائع ہوئے۔

فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ خواہ اردو نثر کو فروغ ہوا ہو یا اردو نظم کو اس سے فائدہ پہونچا ہو، یہ ماننا پڑے گا کہ آج اردو کی دنیا میں جو اہل قلم نظر آ رہے ہیں وہ سب اسی کالج کے خوشہ چیں ہیں اور اردو زبان کی موجودہ مقبولیت اور ترقی کا سہرا بھی اسی کالج کے سر ہے۔ اس لحاظ سے اس کالج کو اولیت کا تو نہیں اساسی حیثیت کا فخر ضرور حاصل ہے۔ کالج کی اس عظیم الشان اردو نوازی کا اقتضا تو یہ تھا کہ اس پر بسیط تذکرے لکھے جاتے۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے مورخین نے اس پر بہت ہی کم توجہ دی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کب تک اردو کی خدمت کرتا رہا؟ اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ بہ صورت انگریزوں کی بروقت امداد نے ایک ایسی زبان کو فنا ہونے سے بچا لیا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو مشترکہ طور پر ورثہ میں ملی تھی۔ انگریزوں کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا —— ۱۱

برما پر جاپانیوں کا قبضہ

ذیل میں ایک ایسا تعلیم یافتہ برمی چشم دید واقعات بیان کرتا ہے جو جاپانیوں کے قبضہ کے زمانہ میں برما ہی میں رہا۔ اس کے بیوی بچے ابھی برما میں ہونے کی وجہ سے وہ اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔

جاپانیوں کے برما پر حملہ اور انگریزوں کی پسپائی کے وقت برمی انگریزوں کے خلاف نہیں تھے۔ وہ ایسے حیران و پریشان تھے کہ انکے احساسات کوئی خاص شکل اختیار نہیں کرسکتے تھے۔ ان کی پُر سکون زندگی میں انتشار پیدا ہوجانے کی وجہ سے وہ سکتے کے عالم میں تھے۔ مگر زیادہ تعلیم یافتہ اور سوچنے سمجھنے والے برمی، جنہوں نے اپنے ملک کا برمی اور انگریزی انتظام دیکھا تھا اور جن میں سے کچھ نے تیسری برمی جنگ دیکھی تھی، یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ملک پر جاپانیوں کا قبضہ ہونے کے کیا معنے ہیں اور ایسی صورت میں اہل برما پر کیسی کیسی مصیبتیں نازل ہوں گی۔ انھیں انگریزوں سے کوئی عداوت نہیں تھی مگر جب انگریزوں کو برما سے واپس آنا پڑا اور وہاں جاپانی قابض ہوگئے تو ملک میں نا امیدی کی لہر دوڑ گئی۔

جاپانی قبضہ ہو جانے پر سب سے پہلے نوجوان طبقہ جاپانیوں کے بہکاوے کے پھندے میں آیا جو جاپانی نیک نیتی اور باہمی بہبودی کا یقین دلا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ برما کو ایشیائے اعظم میں مناسب مرتبہ حاصل ہوگا۔ جاپانی چاہتے تھے کہ یہ غلط خیالات عوام کے دلوں میں گھر کریں اور لوگوں میں تحفظ کا احساس پیدا ہو۔ اس لئے نوجوانوں نے خیال کیا کہ ہماری زندگی کا یہ انتشار دیرپا نہیں ہے اور وہ موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنے کے لئے تیار رہے۔

جاپان کے جھوٹے وعدے

کچھ دن بعد بزرگ اور دوراندیش برمیوں کی طرح برما کا نوجوان طبقہ بھی جاپان کے جھوٹے وعدوں اور بدنیتی کو سمجھنے لگا۔

اس میں شک نہیں کہ برما میں جاپانی پروپگنڈا بڑا لطیف تھا۔ اس پروپگنڈے کی شروع شروع میں کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ برما کی زیادہ تر آبادی دنیا کے واقعی حالات نہیں جان سکتی تھی۔ اس لئے جب جاپانیوں نے دہلی پر قبضہ کرلینے وغیرہ کی خبریں پھیلائیں تو برمیوں کے لئے انھیں درست سمجھنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔

جاپانی اخباری پروپگنڈے میں بھی بہت ہوشیار تھے۔ جب وہ امپھال کے ارد گرد لڑ رہے تھے تو سرخیوں میں یہ لفظ تو بہت بڑے چھپے "امپھال پر قبضہ" اور "ہوا ہی چاہتا ہے" دوسری سطر میں بہت چھوٹے چھوٹے لفظوں میں چھپا۔ اس لئے عام آدمی کی نظر اخبار کی صرف بڑی سرخی پر پڑتی تھی۔

جاپانی ہمیشہ کسی نہ کسی فتح کا اعلان کرتے رہتے تھے اور ہر موقع پر جشن مناتے تھے۔ برمی عمدہ پوشاک پہننا اور جلوس نکالنا بہت پسند کرتے ہیں۔ پہلے انھیں اس بات سے بھی ہوک انھیں دوبارہ جشن منانے کے لئے کیوں کہا جا رہا ہے مگر وہ انہیں دیکھنے ضرور جاتے تھے۔ جاپانیوں نے اس سے بڑا فائدہ اٹھایا۔

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا برمیوں کا شبہ بڑھتا گیا اور جاپانی پروپگنڈے کی قلعی کھلتی گئی۔ رائل ایر فورس نے اشتہارات گرائے حالانکہ انہیں اٹھانے میں خطرہ تھا مگر پھر بھی برمیوں نے انہیں اٹھایا اور اس طرح پہلی مرتبہ برما اور جاپانیوں کے متعلق صحیح حالات معلوم کئے۔

جاپانیوں سے تعاون کرنیوالوں کی قلیت

کچھ برمی ایسے بھی تھے جو جاپانیوں سے مل گئے لیکن ان کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ وہ عام طور پر برما کی کٹ پتلی حکومت میں شامل تھے۔ نام نہاد آمر با ما سے ہر شخص نفرت کرتا تھا کبھی کبھی تو لوگ اس کے احکامات کی پروا تک نہیں کرتے تھے۔ چونکہ اسے عمدہ کپڑے پہننے اور بے وجہ جشن منانے کا بچوں جیسا شوق تھا اس لئے اسے لوگ تھیئٹر کے اداکار جیسا سمجھتے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ اس کے ہاتھ اختیار تو کچھ ہے نہیں مگر پھر بھی اس مفروضہ "آزادی" کا نشان بنا بیٹھا ہے جو جاپانیوں نے اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے اہل برما کو دلوائی ہے۔

اخلاقی اعتبار سے اس کٹ پتلی حکومت کا برا حال تھا اور اس کے لئے کچھ بننا بھی نہ تھا۔ کہنے کو تو سب محکمے کام کرتے تھے لیکن درحقیقت سارے ملازمین ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے تھے اور تنخواہ ملنے کا انتظار کیا کرتے تھے۔

ہر چیز بہت مہنگی ہوگئی تھی۔ ایک انڈے کی قیمت پانچ روپیہ تک ہوگئی تھی اور ذرا ذرا سی بات پر جاپانی پیادوں کی بدیوں کی بدیوں پر قبضہ کرلیتے تھے۔

ہر جگہ بیماری پھیلی ہوئی تھی چیچک اور ہیضہ وغیرہ کا بہت زور تھا اور لاتعداد لوگ مر رہے تھے۔ یوں دکھانے کے لئے جاپانی ٹیکے وغیرہ تو لگاتے تھے لیکن دوائیں جاپانیوں کی نیت ہی تھیں جو مرض کی طرح خطرناک تھیں۔ بڑے شہروں میں بازاروں اور سڑکوں کے سروں پر ٹیکہ لگانے کے مرکز تھے۔ جو شخص گذرتا تھا اسے زبردستی پکڑ کر اسکے بازو میں سوئی بھونک دیتے تھے۔ دواؤں میں سڑکوں کی گرد اڑ اڑ کر گرتی تھی اور جس سوئی سے ملیریا کے تیز بخار والے مریض کے ٹیکہ لگاتے تھے ایک سیکنڈ بعد اسی سے چھوٹے بچے کے لگا دیتے تھے۔

انگریز ہمارے بھائی ہیں

آپس میں باتیں کرتے وقت برمی انگریزوں کو اپنا بھائی کہتے تھے۔ پچھلے دنوں برمیوں کو انگریزوں کی بمباری برداشت کرنی پڑی۔ مگر وہ اسکے مقصد اور ضرورت کو ضرور سمجھتے تھے۔

شاید جاپانی قبضہ کا سب سے برا اثر بچوں کی تعلیم پر پڑا ہے۔ یہ بے اثرات ابھی تک ہیں۔ یہی بچے آئندہ برما کے شہری بنیں گے اس لئے انھیں زندگی کا سیدھا سچا طریقہ سکھانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

یادگار

افسانہ

سید محمد شاہ

ڈاکٹر چاؤ لنگ نے بروز اتوار شام کے ساڑھے چھ بجے اپنے بنگلہ پر مجھے چائے پر مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر چاؤ لنگ مشہور دانت کے ڈاکٹر تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات تین سال قبل سفر کے دوران میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر لنگ کی عمر تقریباً ساٹھ سال کی ہوگی۔ امریکہ میں کئی سال تک مطب کر چکے تھے بہت ہی خلیق، سنجیدہ، قابل اور ملنسار بزرگ تھے۔ انھیں سیاسیات اور تاریخ سے بہت لگاؤ تھا۔ چینی ادب اور کلچر کے متعلق بھی ان کی معلومات کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ ہندوستانی تاریخ سے بہت دلچسپی لیتے تھے۔ چونکہ مجھے بھی بعینہٖ انہیں مضامین سے دلچسپی تھی۔ ہم دونوں ممکنہ موقعوں سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرے کی صحبت سے استفادہ حاصل کیا کرتے تھے۔ ہم اکثر تفریح اور سنیما کو ساتھ جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اردو بہت کم جانتے تھے اور مجھ سے ہمیشہ انگریزی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

میں وقت کی پابندی کے ساتھ ٹھیک ساڑھے چھ بجے ڈاکٹر صاحب کے بنگلہ پر پہونچا اور اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ ان کی ہندوستانی نرس نے دروازہ کھولا اور مجھے پہلی منزل پر ملاقاتی کمرے میں بٹھا کر فوراً غائب ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب کا یک منزلہ بنگلہ وارڈن روڈ پر واقع تھا۔ زمینی منزل پر مطب تھا جو مشورتی کمرہ۔ دواخانہ اور آپریشن روم پر مشتمل تھا۔ پہلی منزل پر ڈاکٹر لنگ کی مستقل رہائش تھی جو باورچی خانہ سونے کے کمرہ، اور ایک بہت بڑے ملاقاتی کمرہ پر مشتمل تھا۔

آج ملاقاتی کمرہ کچھ عجیب طریقہ سے سجایا گیا تھا۔ کھڑکیوں میں اور چھت سے نہایت ہی خوبصورت اور مختلف الوضع، بیضوی، چوکور، مدور اور صراحی نما رنگ برنگ کی کاغذی قندیلیں آویزاں تھیں جن میں بجلی کے بلب اور بعض میں موم بتیاں روشن تھیں اور تمام کمرہ کو قوس قزح کی مانند رنگ برنگ کی روشنیوں سے منور کر رہی تھیں۔ ان کاغذی قندیلوں کی ساخت میں جو کاغذ استعمال کیا گیا تھا وہ نہایت ہی چکنا، نفیس اور مختلف رنگوں والا تھا جن میں ہلکا جامنی، سبز، زعفرانی، گہرا سرخ اور زرد بہت ہی نمایاں تھے۔ دیواروں پر نصف دائروں کی طرح کھلے ہوئے اسی قسم کے کاغذ سے بنے ہوئے پنکھے لگے ہوئے تھے۔ جن پر پھول بوٹے اور سنہری اور نقرئی رنگ کی تتلیاں بنی ہوئی تھیں۔ کونے میں ایک عود دان رکھا ہوا تھا جس میں سے سفید دھواں نکل کر تمام کمرہ کو معطر کر رہا تھا۔ کچھ پھول فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ شاید کوئی قومی رسم منائی گئی تھی۔

ڈاکٹر لنگ چینی لباس پہنے جو اکثر تہواروں کو پہنتے تھے، مسکراتے ہوئے دوسرے دروازہ سے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے ملازمہ چائے دان مع لوازمات کے لئے ہوئے داخل ہوئی۔ رسمی سلام مصافحہ اور مزاج پرسی کے بعد جب ہم چائے پینے بیٹھے تو میں نے کاغذی قندیلوں اور پنکھوں کیطرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "ڈاکٹر صاحب! آج یہ اتنے اہتمام سے کیوں آراستہ کئے گئے ہیں۔ کیا آپ لوگ کوئی دیوالی کی قسم کا تہوار منا رہے ہیں؟" ڈاکٹر لنگ نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا "صاحب یہ یادگاریں ہیں یادگاریں!" "کیسی یادگاریں" میں نے تعجب سے پوچھا "محبت کی"، ڈاکٹر نے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ میں بہت متعجب ہوا اور کہا "ان کاغذی کھلونوں کو محبت سے کیا تعلق؟" ڈاکٹر صاحب نے کہا "یہی تو آج آپ کو بتلانا ہے" ڈاکٹر صاحب کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی تھی پہلے تو چائے ختم کی اور سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہنے لگے۔

"سنئے صاحب صدیوں قبل جب کہ دنیا میں کاغذ ایک بالکل نئی ایجاد تھی اس کا استعمال بھی بہت محدود تھا۔ اور کاغذ بجائے مشینوں کے جیسا کہ آجکل آپ دیکھتے ہیں صرف ملک چین میں ہاتھوں سے بنایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں چین کے ایک بڑے شہر میں ایک غریب نوجوان کاغذ ساز رہتا تھا۔ جو اپنے فن میں بہت ہی ہوشیار تھا۔ اسی شہر میں ایک رئیس بھی رہتا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی لڑکی تھی جس کا نام تھا یوسنگ۔ یوسنگ بہت حسین تھی اور کاغذ سازی کی صنعت اور فن مصوری سے انتہائی دلچسپی لیتی تھی۔ اسی رئیس کے محل میں نوجوان کاغذ ساز اعلیٰ قسم کے رنگین کاغذ کے دستے فروخت کرنے کے سلسلہ میں اکثر آیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کاغذ ساز خلاف معمول شام کے وقت چینی رئیس کے محل میں آیا لیکن حسب معمول رئیس تفریح کو گیا ہوا تھا۔ صرف اس کی لڑکی یوسنگ محل میں تھی یوسنگ کو جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کاغذ سازی اور مصوری سے انتہائی دلچسپی تھی وہ کاغذ ساز سے ملنے کے لئے فوراً چلی آئی۔ کاغذ ساز گٹھیا بدن سیاہی مائل سانولی رنگت والا چپٹی اور چوڑی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا شکیل نوجوان تھا نیلا سوتی پائجامہ اور چینی طرز کا قمیص پہنا ہوا تھا۔ گٹھے ہوئے سر پر چھوٹی سی سیاہ مخملی مدور ٹوپی پہنا ہوا تھا۔ یوسنگ دبلی پتلی پستہ قد زرد رنگت والی بالکل چپٹی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ اس کا لباس سیاہ ریشمی پاجامہ نیلی ریشمی صدری اور گلابی اور زرد ریشمی چینی فراک پر مشتمل تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بال پیشانی پر سے ابھرے ہوئے چینی طرز پر سنوارے گئے تھے۔

کاغذ ساز اور یوسنگ کاغذ سازی اور مصوری پر دیر تک گفتگو کرتے رہے، لیکن نگاہ اولین نے ایسا اثر کیا کہ دونوں ایک دوسرے پر ہزار جان سے فدا ہوگئے۔ ان کی خفیہ ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ یہ آجکل کے عاشقوں کیطرح تو تھے نہیں کہ آنکھ لڑی اور گئے بھاگ، نہ شادی نہ بیاہ نہ مذہب نہ دیوتا اور لگے ناجائز زندگی بسر کرنے۔ اس زمانہ کے چینی قوانین کے مطابق ایسے بھگوڑوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس لئے یوسنگ نے ایک دن موقع پا کر اس کا تذکرہ اپنے والد سے کر دیا اور یہ بھی کہدیا کہ ابا جان میں شادی کروں گی تو صرف اسی کے ساتھ۔

یہ سنتے ہی رئیس کو فوراً اپنی معاشرتی اور سماجی برتری کا خیال آیا وہ غصے سے کانپنے لگا اور چیخ کر کہا "کیا تو اس حقیر کاغذساز کے ساتھ شادی کرے گی تو محل میں رہنے والی کاغذساز کی اندھیری کوٹھری میں رہے گی۔ رنگ برنگ کے ریشمی کپڑوں کے بجائے کاغذساز کی بیوی بنکر سخت کھردرے نیلے سوتی کپڑے پہنے گی"، یوسنگ نے کہا یہ سب مجھے منظور ہے۔ رئیس نے ناک پھلا کر کہا "کیا کہا یہ سب منظور ہے" اور پھر ناصحانہ انداز میں "یوسنگ تو رئیس کی بیٹی ۔ ۔ ۔ ۔" یوسنگ کا باپ جملہ ختم بھی نہ کرسکا تھا کہ جھٹ سے وہ بولی "وہ کاغذساز تم جیسے سینکڑوں رئیسوں سے زیادہ عقلمند ہے!" رئیس نے طنزاً کہا "اگر وہ آگ کو کاغذ میں قید کردے اور کاغذ سے ہوا پر قبضہ کرے تب ہم جانیں گے کہ وہ کچھ ۔ ۔ ۔ ہے۔ یوسنگ سن لے یہی شرائط ہیں جنہیں کاغذساز کو پورا کرنا ہوگا۔ اگر تو اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ ورنہ قطعی نہیں؟" —— شرطیں سخت تھیں۔ یوسنگ نے جب ان کا تذکرہ اپنے چہیتے سے کیا تو وہ بہت متفکر ہوا۔ کچھ دیر سوچ کر کہا۔ کاغذ سے ہوا پر قبضہ کرنا تو ممکن ہے لیکن آگ کو کاغذ میں کیسے مقید کیا جائے آگ تو کاغذ کو جلا ڈالتی ہے! بہرحال ان شرطوں کو پورا کرنا تھا۔

چند مہینوں بعد یوسنگ نے اپنے والد کو محل کے عقبی باغ میں شام کے وقت دعوت دی۔ رئیس جب شام کے وقت باغ میں گیا وہاں کچھ عجیب سماں تھا ایسا ہی جیسا کہ آپ یہاں دیکھ رہے ہیں۔ باغ کے درختوں سے ایسی ہی روشن کاغذی قندیلیں (ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) لٹک رہی تھیں اور انکی رنگین روشنی کو باغ کی نہر کا پانی منعکس کر رہا تھا۔ رئیس ان کاغذی قندیلوں کو پہلی مرتبہ دیکھکر بہت متعجب ہوا سامنے مرمریں نشست گاہ پر یوسنگ بیٹھی مسکرا رہی تھی اسکے ہاتھ میں تہ شدہ پتلی کاغذ میں لپٹی ہوئی لکڑیاں تھیں۔ کاغذی پنکھا رئیس نے تعجب سے پوچھا "یوسنگ یہ سب کیا ہیں" کاغذساز جو باغ میں درخت کی آڑ میں چھپا ہوا تھا فوراً نکل آیا اور بولا "جناب عالی آگ آج کاغذ میں قید ہوگئی" "ابا جان" یوسنگ نے کاغذی پنکھے کو نصف دائرہ میں کھولتے ہوئے خوشی سے کہا "اور کاغذ نے بھی ہوا پر قبضہ کرلیا" اور آہستہ آہستہ جھلنے لگی۔ رئیس سب کچھ سمجھ گیا۔ شرطیں پوری ہوگئی تھیں کاغذساز کے ساتھ یوسنگ کی شادی ہوگئی۔ اسی زمانہ سے اہل چین ہر سال ان محبت کی یادگاروں کا ایک جشن مناتے ہیں اور اپنے گھروں کو کاغذی قندیلوں اور پنکھوں سے سجاتے ہیں صندل کی لکڑی جلاتے اور دعوتیں کرتے ہیں۔ اس سال ہم نے بھی یہ جشن منایا ہے چینی احباب کو دعوت دی تھی جو ختم ہوگئی اور آپکو چائے کی دعوت دی تھی چونکہ چینی کھانے آپ کو پسند نہیں" اتنا کہہ کر ڈاکٹر صاحب خاموشی سے اپنا سگار سلگانے لگے میں نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور انکی تاریخی معلومات کی تعریف کی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "کہئے یہ بقول آپ کے "کاغذی کھلونے" محبت کی یادگاریں ہیں یا نہیں" میں نے کہا "یقیناً" ——

افراطِ اعتقاد

شاھد عشقی

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کلامِ غالب کو جس قدر مقبولیت اس دَور میں حاصل ہوئی ہے اسقدر شاید ہی کسی ہندی شاعر کو حاصل ہوئی ہو یا آئندہ حاصل ہو۔ اس ترویج و تشہیر کی ذمہ داری تین اربابِ ذوق پر عاید کیجا سکتی ہے (۱) مولانا حالی (۲) مصور چغتائی (۳) ڈاکٹر بجنوری۔ حالی شاگرد تھے مگر پھر بھی اُنھوں نے تنقید کو تنقید کی حد تک پرکھا۔ چغتائی مصور تھے اور مصور کی نظروں سے انھوں نے موشگافیاں و باریکیاں پیدا کیں۔ مگر بجنوری متاثر ہوئے اور ہرطرح متاثر ہوئے۔ دیوانِ غالب ان کے لئے ایک الہامی کتاب تھی اور مذہبی تحریرات بغیر تعصب کی عینک لگائے کبھی تنقید کی روشنی میں نہیں لائی جا سکتی۔ "محاسنِ کلامِ غالب" کا پہلا فقرہ کہ "ہندوستان میں دو الہامی کتابیں ہیں۔ پہلی وید مقدس، دوسری دیوانِ غالبؒ"۔ دلی ارادت اور افراطِ اعتقاد کا شاہد ہے۔ بقول حضرت جوشؔ: "پیراں نمے پرند و مریداں می پرانند"۔ غالب پرستوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی نظم و نثر سے قطع نظر اس کی زندگی کے فعل کو سراہنے لگے۔ قاعدہ ہے کہ جب ہم کسی چیز سے پوری طرح متاثر ہوتے ہیں تو تاثر کے جوش میں اکثر ہم فروعی معائب کو بھی محاسن کا روپ دے دیتے ہیں۔ بائرن کے متعلق مشہور ہے کہ جب اس کی شہرت ایک شاعر و قومی لیڈر کی حیثیت سے عام تھی اسوقت یورپ کے منچلے نوجوان آئینے کے سامنے گھنٹوں بیٹھ بیٹھکر "تقلیداً" ہونٹوں میں سکا سا خم پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور یہ دیوانگی جنون کی حدتک تجاوز کر گئی تھی۔ مولانا شبلی کا فقرہ کہ "افسوس خیام کو حافظ کے سے ذرائع میسر نہ آسکے، ورنہ اس کی شراب بھی شرابِ معرفت بن جاتی"۔ حقیقت میں ہماری "بزرگ پرستی" اور مذہبی تعصب پر ایک چھوٹا طنز ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ادبی کاوشوں سے قطع نظر غالب کی زندگی کسطرح ہمارے لئے شمعِ ہدایت بن سکتی ہے اور غالب کو محبِ وطن، قوم پرست اور عارفِ کامل ثابت کرکے ہم کونسی ادبی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

قاعدہ ہے کہ ہر عمل کے ساتھ ردِ عمل وابستہ ہے۔ چنانچہ جیسے جیسے غالب پرستی فیشن قرار پاگیا ہے، غالب شکن بھی پیدا ہونے لگے۔ یگانہ، ڈاکٹر لطیف وغیرہ (اگر وہ طور کو اعتدال پسند تحریر فرماتے ہیں) دوسری صنف کی پیداوار ہیں جنھوں نے بجائے میانہ روی اختیار کرنے کے تضحیک و تمسخر کو مشعلِ راہ سمجھا نہ سمجھائے والہانہ غالب پرستی کی انسداد کرنے کے غالبؔ شکنی شعار بنایا۔ مجھے مسرت ہے کہ حضرت جوشؔ نے پھر بھی مقابلتاً میانہ روی برقرار رکھی ہے۔ مگر مجھے ان سے پھر بھی کہیں کہیں اختلاف ہے جسکا میں معذرت خواہ ہوں۔

کسی شاعر یا ادیب کے پرکھنے کی یہ ترکیب ہونی چاہئے کہ پہلے اس کے محاسن تحریر کئے جائیں اور پھر چند معائب اور دونوں کے توازن سے حقیقی نتائج اخذ کئے جائیں گے۔ مگر یہاں محترم مبصر نے محاسن پر تو پردہ ڈالدیا یا اگر بیان بھی کئے تو سرسری ہے اور افتتاحِ غالب کے ان چند عُریاں اشعار سے کی ہے جن کی تعداد اسقدر قلیل ہے کہ سرسری نظر تو غالباً ان کی گرفت سے بھی قاصر رہے یہی نہیں بلکہ جوشِ تقابل میں دو تین ایسے اشعار بھی حجم بڑھانے کے لئے تحریر فرما دیئے ہیں جن پر غالباً عُریانی کا اطلاق بھی نہیں ہوسکتا۔

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے	کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے
غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے	گر حیا بھی اسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

پہلے شعر میں تو عُریانیت کا پہلو سے بھی گزر نہیں۔ دوسرے شعر کو ہم زیادہ سے زیادہ شوخ و رنگین کہہ سکتے ہیں۔ مگر عُریاں نہیں۔ اس ضمن میں میں مزید کچھ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ فحاشی و عُریانی اگلوں کا شعار تھا اور سعدی، حافظ جیسی برگزیدہ ہستیاں بھی اپنے دامن کو پاک نہ رکھ سکیں۔ اور اگر میر، سودا، ناسخ، آتش، ذوق وغیرہ کے مقابلے میں غالب کو پیش کیا جائے تو وہ معصوم محض ثابت ہوگا۔

اپنے معاصروں میں غالب کے کلام کی نامقبولیت کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ اس کے الفاظ ادق اور تراکیب غیر مانوس تھیں بلکہ یہ بھی تھی کہ اس کے مضامین طرفہ، ادق اور فلسفیانہ طرز کے حامل ہوا کرتے تھے۔ مشاعروں میں جہاں ذوق کی شستہ و رفتہ زبان اور سلیس مضامین وقتی طور پر عوام کو متاثر کرتے تھے غالب کو نہ کرسکتے تھے۔ علاوہ بریں استادِ شاہ کی حیثیت سے عمائدین ان کی عزت و حرمت کرتے تھے اور جسطرح بائرن کی شاعری کو اس کی مذہبی لیڈری اور شرکتِ جنگِ صلیبی کی وجہ سے چار چاند لگ گئے تھے۔ ذوق کی شاعری کو بھی وقتی طور پر خوب سراہا گیا۔ رات کو مشاعرے میں غزل پڑھی جاتی اور دوسرے دن دلی کی گلیاں صدائے بازگشت سے گونج اٹھتیں۔ کچھ مدت بعد جبکہ غدر سے فضا مکدر ہوئی اور یہ طلسمِ سامری ٹوٹا اسوقت لوگوں نے حقیقت کی عینک سے دونوں کا موازنہ کیا اور اس تقابل کا نتیجہ غالب کی مقبولیت کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ حضرت جوشؔ کا یہ فرمانا کہ "مختلف شعرا کے کلام کی خصوصیتیں اپنے اپنے میلانِ طبع کی وجہ سے ہمیشہ مختلف ہوتی ہیں اور سب کو ایک ہی عینک سے دیکھنا، ایک ہی ترازو میں تولنا اور ایک ہی پہلو سے سب کا موازنہ یا محاکمہ کرنا درست نہیں ہوسکتا" درست ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ جب ہم کسی کا بیان کرتے ہیں، خواہ مصور کا برش ہو یا ادیب کا قلم، اسوقت پس منظر کی عکاسی ایک مزدو لاینفک سمجھی جاتی ہے اور بغیر دوسروں کے تقابل کئے ہم اپنے بیان کو مکمل نہیں سمجھ سکتے۔ دور کیوں جایئے ہمارے محترم آقا خود اپنے بیان کی تردید و تکذیب پر مجبور ہوئے ہیں کیونکہ انھوں نے جہاں جہاں ذوق کی مدح سرائی کی ہے غالب کو بھی موازنہ میں شریک کیا ہے اور اس کی شخصیت کو واضح کرنے کے لئے غالب کے مقابلہ میں ذوق کو ہر مرتبہ ابھارا ہے یہ چیز میرے لئے ہرگز قابلِ گرفت نہیں ہوتی۔ اگر حضرت جوشؔ صرف

ذوق کی مدح سرائی کرتے یا غالب کے والہانہ پرستاروں کی تکذیب فرماتے۔ مگر انھوں نے جوشِ تحریر میں کہیں کہیں غالب پر بے محل اعتراضات اور ذوق کی بے محل مدح سرائی بھی فرمائی ہے اور مجھے مجبور کیا ہے کہ میں "خطائے بزرگاں" کی گرفت کرکے خطا کا مستوجب قرار پاؤں۔

غالب اور اقبال دو ہستیاں ہمارے ادب نے ایسی پیدا کی ہیں جنھوں نے عام شاہراہ سے علیحدہ اپنا مسلک قائم کیا۔ دونوں کے یہاں مجازسے زیادہ حقیقت کا رنگ نمایاں ہے۔ دونوں کے یہاں فلسفہ و حکمت کے رموز شعر کی زبان میں سمجھائے گئے ہیں۔ دونوں کے یہاں محبوبِ حقیقی سے شکوہ و شکایت و طنز وغیرہ کے تیکھے مضامین ہیں اور اس فلسفہ و حکمت کے لئے گل و بلبل کی "سطحی زبان" کافی نہیں۔ دونوں شعرا نے دیگر شعرا کے برخلاف تخیل کو زبان پر ترجیح دی اور اردو کے "تنگنائے" کو جو ہنوز ایامِ طفولیت میں تھا "بقدرِ شوق" نہ پاکر فارسی زبان اختیار کی۔ دونوں میں سے کسی کی زبان فارسی نہ تھی اس لئے فارسی سے زیادہ ان کی مقبولیت اردو کے میدان میں رہی۔ مگر اس امتزاج باہمی نے ان کے پروازِ تخیل کے لئے ایک وسیع زبان پیدا کردی۔ اقبال کے ہمعصر ارتقا کی کئی منزلیں طے کرچکے تھے اس لئے انہوں نے اس کی مخالفت نہ کی مگر غالب کے ہمعصر اس کے تخیل و زبان کو برداشت نہ کرسکے اور وہ خود باوجودیکہ اپنے اشعار سے متاثر ہوکر کہتا تھا کہ ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

کبھی کبھی سامعین و قارئین کے جمود و سکوت کو دیکھکر گھبرا اٹھتا تھا کہ ع

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آج تک ہزاروں مشاہیر شعرا و باحکما گزرے ہیں۔ ہر ایک نے انسانی معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ کیا اور شہرت دوام کے حقدار قرار پائے کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے مکمل علم اپنی طرف سے پیش کیا ہو یا اس میں تصحیح و ترمیم کی گنجائش نہ ہو۔ ہر حکیم نے ایک اینٹ بنائی اور اس کی پائداری میں عمر گزار دی نہ کسی کو عمرِ خضر عطا ہوئی نہ کوئی ادراکِ لایزال کا حامل قرار پایا کہ خود تمام منازل طے کرلیتا۔ ایسی صورت میں غالب کے فلسفہ کے متعلق یہ عذر پیش کرنا کہ چند فلسفیانہ اشعار رقم کرنے سے وہ فلسفی کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا، ایک عذرِ لنگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اسی موضوع کے تحت ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز

ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

مرقوم بالا پانچ اشعار صرف ایک غزل میں سے نقل کئے گئے ہیں۔ کون ہے جو ان فلسفیانہ نکتہ سنجیوں سے متاثر ہوکر غالب کے فلسفیانہ دماغ سے انکار کردے۔ قطع نظر اس ایک غزل کے دیوانِ غالب کا ہر ہر صفحہ اس قسم کے اشعار سے مزین ہے۔ یوں ڈاکٹر لطیف کی طرح اگر کوئی غالب کے حکیمانہ شعر

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کو آنکھ بند کرکے لفظی گورکھ دھندا کہدے تو وہ دوسری بات ہے۔ اس معیار پر تو غالباً سوائے سائنس کی چند ایجادات کے جو منظرِ شہود پر آچکی ہیں۔ ریاضی، حکمت فلسفہ، ادب سب کا سب الفاظ کا ایک گورکھ دھندا ہے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
کثرت آرائیٔ وحدت ہے پرستاریٔ وہم کردیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

دوسرا اور پانچواں شعر لطیف شکایت و طنز کے امتزاج کا حامل ہے باقی اشعار فلسفہ کا کوئی نہ کوئی نکتہ بیان کررہے ہیں مگر کچھ لوگ شاید ان کو بھی گورکھ دھندا کہہ کر علیحدہ ہوجائیں تو ان کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔

ذوق مرحوم کے سب مداح ہیں اور ہمیشہ ذوق السانُ بندشِ محاورات اور سلاستِ زبان و تخیل، پر جھنجھلاتے رہے گا۔ اور اس حد تک کوئی کافر ان کے شاعرانہ کمال سے انکار نہیں کرسکتا۔ رہا 'جذباتی اشعار' کا مباحثہ تو کہیں کہیں اتفاق سے ہم ایسے اشعار دیوان میں سے نکال سکتے ہیں جن پر 'جذباتی' ہونے کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ ورنہ ان کے بیشتر اشعار میں جذبات کا فقدان ہے مولانا عبدالحق نے غالباً شوق قدوائی مرحوم پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا ہے کہ "محاورات کی بندش میں طاق مزدور ہیں۔ مگر ان کے یہ اشعار لغت میں محاوروں کے لئے تمثیلاً پیش کئے جانے کیلئے زیادہ موزوں ہیں۔ بعینہٖ یہی قول ذوق مرحوم پر بھی صادق آتا ہے۔ محاورات و زبان کا وہ اس حد تک التزام رکھتے ہیں کہ تخیل کو بھی اکثر نظر انداز کرجاتے ہیں۔ دلی کے عوام ان کے 'روزمرہ' پر جھنجھلا رہے لیتے تھے اور محاورات کی چست بندش پر پھڑک پھڑک اٹھتے تھے ؎

ذبح کرنے کو مرے پوچھتے کیا ہو تکبیر تم چھری پھیر بھی دو نام خدا کا لیکر

حضرتِ جوشؔ نے اس شعر کی از حد تعریف فرمائی ہے حتیٰ کہ وہ اس کے محاسن کو "ناقابلِ بیان" کہہ کر ختم کرتے ہیں۔ مگر ایک سطحی سی نگاہ بتا سکتی ہے کہ صرف ایک محاورے "نام خدا کا لے کر" کی خاطر شعر کہ

پامال کیا گیا ہے اور لقہ نظروں کو قصاب کی دکان کا یہ منظر کسقدر مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ چند اور اشعار سنیئے جن کے محاسن گنانے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔

ہمارا پی کے لہو تیرے تیر کا سوفار   یہ چُپ ہوا ہے کہ گویا نہیں زباں منہ میں
کہا پتنگ نے یہ دارِ شمع پہ چڑھ کر   عجب مزہ ہے جو مر جیئے کسی کے سر چڑھ کر
ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں   دیگا تمام عقل کے بخیئے اُدھیڑ تو
اس نے جب ال بہت ردوبدل میں مارا   ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا
سگِ دنیا پس از دنیا بھی دامنگیر دنیا ہو   کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو

میرے خیال میں ان اشعار میں "بندش محاورات" کے سوا (اگر وہ کوئی خوبی ہوسکتی ہے تو) کوئی خوبی ہی نہیں۔ پہلے شعر میں لفظ "سوفار" شتر گربگی کی ایک مثال ہے جو نظروں میں بری طرح کھٹکتی ہے۔ چوتھے شعر کو پڑھکر محترم ناقد پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے مگر اور کوئی بھی اس سطحی محاورے اور بازاری تخیل سے شاید لطف اندوز نہ ہوسکیگا۔ آخری شعر کو انھوں نے ابہام گوئی کے ضمن میں کیوں نہ سراہا مجھے حیرت ہے۔ صنائع و بدائع کے اس طومار کو ہم کبھی بھی خوشگوار نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ اگر ہمیں اس قسم کے لفظی حُسن کو سراہنا ہی مقصود ہے تو یکرنگ۔ شاکر ناجی اور مضمون کی صنعت گری کو کیوں ترک کریں۔

قدما کے دو اشعار ملاحظہ فرمایئے :-

اسکے رخسار دیکھ جیتا ہوں   عارضی میری زندگانی ہے
چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے   کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے
نے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا   دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا
پردہ درِ کعبہ سے اٹھا دینا ہے آسان   پر پردۂ رُخسارِ صنم اٹھ نہیں سکتا

پہلے شعر میں "بے مقدور" کی ترکیب کو بہت سراہا ہے مگر میرے خیال میں "اٹکائے" اور "بے مقدور" کی تراکیب اسقدر اجنبی ہیں کہ پہلی نظر میں کھٹک جاتی ہیں۔ دوسرے شعر کو گو آزاد نے دیوانگی کے ایام میں کسقدر ہی کیوں نہ سراہا ہو مگر "پردۂ رخسارِ صنم" کی ترکیب بہت انوکھی معلوم ہوتی ہے، ایک "تو رخ" کے لئے "نقاب" ہونا چاہیئے نہ کہ "پردہ"۔ دوسرے "رخسار" کا مختلف "رُخ" کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ پہلا شعر بقول حضرت جوش حسرت و یاس کا مرقع ہے اور مجبوری و معذوری کا صحیح مرقع مگر غالب سے "بیچارگی" کے مضمون کو کسطرح باندھ گیا ہے۔ موازنہ فرمایئے :-

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اُسنے شدت کی   ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

"اٹھ نہیں سکتا" کی ردیف میں ذوق کے چار اشعار پیش کئے گئے ہیں جنکو جذبات کا ترجمان کہا گیا ہے۔ ملتی جلتی ردیف میں غالب کے تین اشعار سنیئے اور زبان و تخیل کا اندازہ لگایئے ؎

ہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت   میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے   بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھکو ستمگر ورنہ   کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

محاوروں کی بندش اور جدت تخیل دونوں کو اسطرح نبھایا گیا ہے کہ شعر سراپا حُسن بنگیا ہے۔

اگر جذبات کے لغوی معنی لئے جائیں تو ہر شاعر کا ہر شعر کسی نہ کسی جذبہ کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے اور ذوق کے اشعار کو جذباتی ہونے میں کوئی تفخر حاصل نہیں تعلی۔ انکساری، طنز، رنج، مسرت، حسرت، خوف، بہادری و صبر وغیرہ ہزاروں جذبات کی اقسام ہیں۔ لیکن اصطلاحی معنوں میں اور مروجہ زبان میں جذباتی شعر اسکو کہتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح فوراً ہمارے قلب کو متأثر کردے۔ لفظ جذبات "سمجھائے جانے" سے زیادہ "خود سمجھ جانے" کی چیز ہے۔ مثلاً کون ہے جو غالب کے ان اشعار کو پڑھکر یاس و حسرت کا مرقع نہ بن جائے ؎

کوئی امید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی   موت آتی ہے پر نہیں آتی

اس کے برعکس ذوق کے ان چند اشعار کو بھی ملاحظہ فرمایئے جنکو پنڈت جی نے جذباتی اشعار کے تحت پیش کیا ہے ؎

احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے   نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا   کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ   ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

غالب جہاں جذباتی تخیلات باندھتا ہے، ثقل گوئی اور مغلق الفاظ کو ترک کردیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکے حزنیہ اشعار میں جو اکثر جذبات سے پُر ہوتے ہیں "روانی بدرجہ اتم" ہوتی ہے۔ ذوق اسکے برعکس ایسے نازک موقع پر بھی تمثیلات و محاورات کے بندھنوں سے آزاد نہیں ہوتا اور اس حنیا طِ غیر ضروری میں اکثر "روانی" کا حُسن کھو بیٹھا ہے۔

فراق خلد سے گندم ہے سینہ چاک اب تک   الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

شعر یوں تو کافی حسین ہے مگر دوسرا مصرعہ بیساختہ کہا گیا ہے اور روانی کے حُسن سے مالا مال ہے۔ مگر پہلے میں صنعت برقرار رکھ کے تصنع پیدا کردیا ہے جب تک "تمام آدم و حوا" کی کہانی نہ دہرائے دوسرے مصرعے سے لطف اندوز ہی نہیں ہوسکتا۔

رہا یہ کہنا کہ ذوق کے فلاں شعر کی غالب نے تعریف کی ہے فلاں بہرے پر اس نے شکست تسلیم کرلی ہے۔ یا آخر عمر میں انھوں نے غلطی محسوس کرکے ذوق کی سی آسان گوئی اختیار کرلی تھی۔ ایک مضحکہ خیز چیز ہے۔ ہر وسیع الخیال انسان تعصب سے بالاتر ہوتا ہے اور دوسروں کے محاسن اور اپنے معائب کا کھلے دھڑے اظہار کرتے ہوئے بھی مطلق نہیں جھجکتا۔ ساتھ یہ کہنا بھی اسقدر بے معنی چیز ہے کہ ذوق کے فلاں شعر کا مد مقابل دیوانِ غالب تو کیا اردو میں کہیں نہیں۔ غالب کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مسلمہ ہستی رکھتا ہے اور بعض تو ادب العالیہ کے وہ درخشاں گوہر ہیں جن سے زبان اردو کبھی سبکدوش نہ ہوسکے گی۔

نقد و نظر

A STUDY IN IQBAL'S PHILOSOPHY

مصنفہ بشیر احمد ڈار، ناشر شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور قیمت آٹھ روپے۔ اقبال پر ہندوستان کے مختلف ناشروں نے بیسیوں کتابیں شائع کی ہیں اور اب تک نئی نئی کتابوں کی تصنیف، تالیف اور اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ شیخ محمد اشرف نے اقبال کے متعلق تنقیدی تشریحی ادب شائع کرنے میں اپنے لئے ایک نیا راستہ نکالا ہے۔ وہ بہت عرصہ سے اقبال کے کلام اور ان کے فکر کے مختلف پہلوؤں پر انگریزی میں کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی انگریزی کی ان کی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے مصنف بشیر احمد صاحب نے اس کتاب میں اقبال کے فلسفیانہ تخیل کے ان پہلوؤں پر تنقیدی اور تشریحی نظر ڈالی ہے جنہیں فکر اقبال کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ کتاب میں چار باب ہیں پہلے باب میں اقبال کے آرٹ کے تصور سے بحث کی گئی ہے۔ اقبال کے کلام کا سمجھ کر مطالعہ کرنے والے کے لئے اس موضوع پر خود اقبال کے کلام میں اتنا صاف اور صریح مواد موجود ہے کہ اس مسئلہ پر صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ گو اس باب میں مصنف نے اقبال اور آرٹ کے تعلق کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس میں شگفتگی کی کمی ہے، تاہم اس سے اقبال کے نقطۂ نظر کی وضاحت ضرور ہو جاتی ہے۔ دوسرے باب میں اقبال کے پیش روؤں کا تذکرہ ہے۔ رومی، نطشے اور برگساں کے فلسفیانہ فکر اور اقبال کے تخیل میں کیا مماثلت ہے اور کیا اختلاف، اقبال نے ان فلسفیوں سے کس حد تک خوشہ چینی کی ہے اور کس حد تک انہیں اپنے فکر میں سمویا ہے، یہ بحث دلچسپ ضرور ہے لیکن اس میں طرح طرح کی الجھنیں بھی ہیں اور اس لئے جب تک کوئی رومی، نطشے، برگساں اور اقبال میں سے ہر ایک کو اچھی طرح نہ سمجھے، اس بحث کی تاویلوں میں کہیں نہ کہیں الجھن ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ الجھن اس باب میں بھی ہے تیسرا باب اقبال کے نظریۂ خودی کے متعلق ہے۔ اس باب کے لکھنے میں مصنف نے کاوش سے کام لیا ہے اور اس لئے اس میں جو مباحث آئے ہیں ان سے اقبال کے فلسفہ کی وضاحت میں مدد ملتی ہے۔ آخری باب اقبال کے فلسفۂ تمدن کے متعلق ہے۔

مصنف کے بیان میں جا بجا جو الجھنیں ہیں وہ میرے نزدیک اس لئے بھی ہیں کہ انہیں اکثر جگہ اپنے خیال کی وضاحت کے لئے بات کو بہت زیادہ طول دیکر کہنا پڑا ہے لیکن یہ بات اس لئے ہے کہ انگریزی مصنف کی مادری زبان نہیں اور اس کے بیان پر اسے اپنی مادری زبان کی سی قدرت حاصل نہیں۔

انقلابیں زمانے کے

محمود خاں محمود بنگلوری، ناشران ملک بکڈپو، گنپت روڈ / گنگا رام سٹریٹ، لاہور۔ قیمت ۱۲؍

محمود خاں صاحب بنگلوری کے نام سے اردو پڑھنے والے اچھی طرح واقف ہیں محمود صاحب نے چند ہی برس کے اندر ایک مؤرخ کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر لی ہے۔ اب زمانے کے مذاق کو دیکھتے ہوئے آپ نے افسانوں کا یہ مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اس مجموعے کے سارے افسانوں کی بنیاد تاریخ کے ایسے مستند واقعات پر ہے جن میں افسانوی رنگ اور ڈرامائی عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان تاریخی کہانیوں میں سچ پوچھئے تو باقی ہر طرح کے افسانوں سے زیادہ لذت ہے۔ اس لئے کہ پڑھنے والے کو برابر یہ معلوم ہے کہ یہ افسانے نہیں تاریخ کے اوراق ہیں۔

محمود صاحب نے موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے اپنے طرز بیان میں رنگینی پیدا کر کے ان تاریخی کہانیوں کو اور بھی دلکش بنا دیا ہے۔ ان کہانیوں میں ہندوستان کی تاریخ کے مختلف دوروں کے واقعات ہیں اور ان کے انتخاب میں کسی محدود نقطۂ نظر سے کام نہیں لیا گیا، اس لئے کتاب بے حد دلچسپ ہے۔

تذکرۂ بابِ حکومت

مرتبہ محمد مظہر صاحب، ملنے کا پتہ:۔ حیدری گشتی کتب خانہ، شارع نظام شاہی سلطان عبداللہ، حیدرآباد دکن۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات، قیمت ۲ روپے۔

حیدرآباد کی شاہانہ فیاضیوں نے علم و ہنر کو جس جس طرح نوازا ہے اس کے چرچے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہیں حیدرآباد کے رہنے والے دنیا کے دوزخ میں رہ کر بھی کس طرح جنت کے مزے لے رہے ہیں، اس کا علم بھی بہت سے لوگوں کو ہے لیکن یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس ریاست کے انتظام کی باگ ڈور کونسل کے ہاتھ میں ہے اور ملکی انتظام کے سارے شعبے اسی کونسل کے صادر کئے ہوئے احکام کی پیروی کرتے ہیں۔ محمد مظہر صاحب نے اس تقریباً ۳۰۰ صفحے کی کتاب میں اسی کونسل کے حالات لکھے ہیں۔ کونسل کے قیام سے پہلے ملکی انتظام کے جو جو طریقے رائج تھے ان کا بھی مختصر سا حال کتاب میں درج ہے۔ اس کے بعد کونسل کے طریقۂ کار، اس کی تاریخ، اس کے ارتقا کے متعلق ساری باتیں تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ کونسل کے متعلق کسی قسم کی بات بھی دریافت طلب ہو اس کتاب میں مل جائے گی۔ یہاں تک کہ مختلف زمانوں میں کونسل کی باگ ڈور جن اعلیٰ عہدہ داروں کے ہاتھ میں رہی ہے ان کی تفصیلی فہرست بھی اس میں موجود ہے اور اس لحاظ سے یہ کتاب کونسل کے سلسلہ میں ہر قسم کی معلومات کا انسائیکلوپیڈیا کہی جا سکتی ہے۔

بظاہر کتاب خشک سی ہے لیکن ایسی کتابیں ناولوں یا افسانوں کی طرح پڑھنے کے لئے ہوتی بھی نہیں۔

و۔ع

بچوں کا باغ، دہلی

سالانہ نمبر۔ ضخامت ۸۰ صفحے۔ قیمت ۸؍ رضیہ سلطانہ چمن دہلوی کی ادارت میں دہلی سے بچوں کا یہ رسالہ پابندیٔ وقت کے ساتھ نکلتا ہے۔ جون کا پرچہ اس کا سالگرہ نمبر ہے رسالہ میں دلچسپ اور سبق آموز کہانیوں اور بہت سی نظموں کے علاوہ مفید اخلاقی اور تعلیمی مضامین بھی شامل ہیں۔ رسالہ کا ٹائٹل رنگین اور دیدہ زیب ہے۔ آٹھ آنے میں بچوں اور بچیوں کے لئے یہ بہت اچھا تحفہ ہے۔

اپنے گھر بچاؤ
تاکہ پچھتانا نہ پڑے۔ اندھا دھند علاج سے آپ راضی ہو سکتے ہیں تو بھلا پیٹنٹ ادویات سے
کیوں راضی نہ ہو جاتے اور نیم حکیموں کے علاج سے تو بچنا ہی پڑتا ہے۔ لاکھ روپیہ خرچ کرو۔ ان امراض
یعنی کمزوری وغیرہ کا مکمل علاج محال ہے۔ جب تک صحیح رائے اور بہترین دوائیوں سے مکمل
علاج نہ ہو، یہ خاص خاص راز کئی یونانی اور آیورویدک کتابوں میں بھی نہیں لکھے ہوتے۔
میں نے بے شمار دوائیاں کیں مگر جو تعریف آپ کی دوا میں دیکھی وہ کبھی نہیں دیکھی
فائدہ نہیں ہوتا یا پھر
زیادہ حالت خراب ہو جاتی ہے
آپ نے جو تعریف کی یہ دوائی کہیں اس سے زیادہ تعریف کی مستحق ہے ہم آپ کی قدر کرتے ہیں
تو جھوٹی اشتہار بازی سے بچ کر آپ قیمت مکمل آرام کے بعد ادا کیجئے
بیشمار حکیم ڈاکٹر وید بھی ہم سے ادویات منگوا کر خوب نفع کماتے ہیں
وی پی منگوانے والوں کے بھی تعریفی خطوط آتے رہتے ہیں
قیمت حسب حیثیت اور مطابق حالات
مینیجر دی ہیرو فارمیسی (رجسٹرڈ) وزیر آباد (پنجاب)

نسیم بھرتپوری

محمد لب شبیر

اردو شاعروں میں تین نسیم مشہور ہوئے۔ دیاشنکر نسیم، نسیم دہلوی اور نسیم بھرتپوری۔ ان میں نسبتاً نسیم بھرتپوری کم مشہور ہیں کیونکہ دہلی یا لکھنؤ میں نہیں پیدا ہوئے اور یہی سبب ہے کہ ہماری مستند ادبی تاریخوں نے ان کے حالات و کلام کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ نسیم بھرتپوری کا شمار داغ کے ارشد تلامذہ میں ہے[1]۔ ایسی بڑی ہستی کی ادبی خدمات کا فراموش کرنا سراسر نا انصافی ہے اور پھر ؎

ہیں زادہ تھا بادشاہ صاحب غنا | ہنیں نسیم سے کچھ تو کلام کرنا ہے

نسیم بھرتپوری کا نام سید شبیر حسین جعفری تھا۔ ان کے والد کا نام میر التماس حسین تھا۔ نسیم ۱۸۶۲ء میں مقام پہرسر پیدا ہوئے اور تاریخی نام نظیر حسن رکھا گیا۔ ریاست بھرتپور (راجپوتانہ) میں پہرسر ایک گاؤں ہے جو نسیم کے آباواجداد کی جاگیر ہے۔ یہ ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ نسیم کی ابتدائی تعلیم و تربیت پہرسر اور بھرتپور میں ہوئی۔ بھرتپور میں ایک بزرگ مولوی سید محمد صاحب ہونی تی نائب تحصیلدار تھے۔ مولوی صاحب موصوف مومن خاں مومن اور صہبائی کے شاگرد تھے۔ ان سے نسیم نے عربی، فارسی کا درس لیا۔ نسیم نے بڑی ملا کی طبیعت پائی تھی۔ بہت جلد عربی و فارسی عروض و طب پر عبور حاصل کر لیا۔ قدرت نے ان کو شعر گوئی کا مادہ ودیعت کیا تھا اور جب ان کی شاعرانہ طبیعت اپنے جوہر دکھانے لگی تو مولوی صاحب کی اصلاح نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

نواب مرزا خاں داغ دہلوی جب رامپور میں ملازم تھے نسیم نے ۱۸۸۲ء میں ان کو اپنی غزل اصلاح کے لئے بھیجی۔ یہیں سے سلسلۂ شاگردی شروع ہوا۔ ہونہار شاگرد کی سادگیٔ زبان، ذوق سخن اور جودت طبع نے استاد پر ایسا جادو کیا کہ انھوں نے نسیم کو رامپور بلا یا۔ وہاں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا ایک دن خواجہ قلق نے نسیم سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی نسیم سنگلاخ زمینوں کے عاشق تھے انھوں نے اپنی تازہ غزل "منقار چلی میں" سنائی ؎

نہیں کرتے انہیں کچھ دیر لگتی ہے نہاں کرتے
ابھی انکار چلی میں ابھی اقرار چلی میں

قلق کو شک ہوا کہ یہ غزل نسیم کی نہیں ہے۔ داغ نے شاگرد کا دل بڑھانے کے لئے کہدی یہ نسیم سے دو چار شعر اور اسی زمین میں کہنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے فی البدیہہ ایک دو غزل چلی میں وہیں کہہ کر پڑھی ؎

حقیقت کبک و طاؤس گلستاں کی بھلا کیا ہے
قیامت کو اڑاتی ہے تری رفتار چلی میں

[1] رسالہ "آفتاب" میں آغا شاعر نے بھی نسیم کا شمار ارشد تلامذہ میں کیا ہے۔

لیا تھا اس زمیں میں امتحان سخن یاروں نے
کئے موزوں یہ ہم نے بھی نسیم اشعار چلی میں

امیر مینائی، منیر شکوہ آبادی اور قلق نے بے حد تعریف کی۔ جوہر شناس استاد نے بڑی قدر کی نظر سے شاگرد کو دیکھا اور اس کی ہمت بڑھائی۔ استاد کے دل پر اس کی ذہانت و فطانت کا سکہ بیٹھ گیا۔ داغ نے جب "جواب داغ" شائع کرنا چاہا تو نسیم کو حیدرآباد بلایا اور ترتیب کا کام ان کے سپرد کیا۔ داغ پر جب اعتراضات کی بوچھار ہوئی تو عقیدتمند شاگرد نے سینہ سپر ہو کر بڑے دنداں شکن جواب دئے اور اعتراضوں کے جواب میں ایک رسالہ "تازیانہ" لکھا۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی نے کہا "امیر مینائی کے شاگردوں میں ریاض خیرآبادی گورکھپوری کا جواب نہیں ہے۔" داغ نے مسکرا کر نسیم کی طرف دیکھا اور کہا "میرا ریاض نسیم ہے۔" حیدرآباد میں ایک بڑا معرکۃ آرا مشاعرہ ہوا مصرعہ طرح تھا ؎

یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

مرزا داغ ایک خط میں لکھتے ہیں "تمام شہر نے اس میں غزل کہی ہے لکھنؤ تک سے غزلیں چلی آ رہی ہیں۔ نسیم نے بھی غزل کہی۔" سنتے ہیں کہ یہ غزل داغ نے اپنی غزل کے ساتھ امیر کو بھیجی تھی ؎

وہ آئیں ان کو ایسی کیا پڑی ہے | یہ تو نے دل کہاں قاصد گھڑی ہے
برا ہے عشق میں یہ جانتا ہوں | مگر ناصح سے ضد سی آ پڑی ہے

مرثیہ گوئی میں نسیم میر خورشید علی صاحب نفیس کے شاگرد تھے۔ اس صنف شاعری میں بھی انہوں نے اپنی تیغ زبان کے جوہر دکھائے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ ان کے مراثی اب تک شائع نہیں ہوئے اب تک انکی غزلوں کا صرف ایک دیوان شائع ہو سکا۔

نسیم نہایت خلیق، منکسر المزاج اور باوضع آدمی تھے۔ ریاست بھرتپور میں سب انسپکٹر پولیس تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا۔

حسن اتفاق تھا کہ نسیم کے طبعی رجحان، ذوق سخن کی صحیح رہبری کے لئے قدرت نے داغ سخن سنج سا استاد عطا کیا۔ ان کے رنگ سخن میں جان آگئی۔ خود فرماتے ہیں ؎

آگیا اور ہی کچھ رنگ طبیعت میں نسیم | ہاتھ جب داغ سخن سنج سا استاد آیا

غالباً یہی وہ اعتراف ہے جس کی جانب داغ کے سب سے مشہور شاگرد سر محمد اقبال نے اشارہ کیا ہے ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں | مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں پر

[2] انشائے داغ۔ ص ۶۲

نسیم کی غزلوں کی امتیازی شان ان کی صفائی زبان، سادگیٔ بیان، صحیح روزمرہ صدق محاورہ ہے ؎

غیر کے گھر میں وہ مہمان بڑی مشکل ہے — جان جانے کے ہیں سامان بڑی مشکل ہے
رازِ دل اس بُتِ کمسن سے کہوں یا نہ کہوں — بات نازک ہے، وہ نادان بڑی مشکل ہے

صبح چلئے کوئے جاناں میں نسیم — اب یہ کیا موقع ہے آدھی رات ہے

ان کے کلام کی دلکشی و دلآویزی کا راز بہت کچھ ان کے طرزِ بیان کی شوخیوں میں مضمر ہے۔ وہ طنز جو خاص داغ کے لئے اترا تھا نسیم کے حصے میں بھی آیا تھا ؎

دفا، جفا تم سے کیا کرینگے — جو یہ ہوگی تو کچھ ہوگی ہمیں سے
خط میں اسنے غیر کا لکھا سلام — یہ بھی لکھا تھا مری تقدیر میں

وہ تیور، ادا، تیکھاپن جو شوخیٔ بیان میں سحر آفرینی کرتے ہیں ان کے کلام کی روح رواں ہیں۔ محبت اور شکایت کی باتیں اسطرح ادا کرتے ہیں جیسے ان کے سامنے کوئی بیٹھا ہو۔ کوئی ان سے کچھ کہہ رہا ہو کسی سے وہ کچھ کہہ رہے ہوں ؎

آپ نا رنج نہ ہوں آپکا کچھ ذکر نہیں — اپنے دل سے ہے گلہ آپکا قصہ کیا ہے
تمکو دعوے تو بڑے ہیں تیر اندازی کے — ہاں بھلا دیکھیں اڑاؤ تو نشانہ دل کا
تم سنوگے اسے تم سُن کے تسلی دوگے — واہ کیا خوب کہوں تم سے فسانہ دل کا

وہ معاملہ بندی میں بعض الفاظ کے تقابل اور الٹ پھیر سے لطافتِ بیان و زبان پیدا کر لیتے ہیں ؎

کبھی تم نے عنایت کیا نہیں کی ہے نہیں کی ہے
کبھی میری تمنا کیا نہیں نکلی نہیں نکلی

ان کے کلام میں ایک خاص شوخی اور چلبلاپن ہے۔ اسی سبب سے غالباً داغ نے کہا تھا "میرا رنگ نسیم نے پایا ہے" ؎

کل دام بھیک مانگ کے بھی دینگے ساقیا — پلوائے بھر ساقی کو تر دامن یار آج
قیامت بھی کل آئی جاتی ہے اے محتسب — تمہیں اللہ جو بخشیگا ہم بھی دیکھینگے
خدا خدا کر دو میں کب گیا تھا مسجد میں — مجھے لگا دو گے الزام پارسائی کا
نسیم مئے سے عذر اس قدر جوانی میں — ڈرو خدا سے یہ ہے عہد پارسائی کا

نسیم زبان اور اسلوب بیان پر کامل قدرت رکھتے تھے "وہ کیا کہا" کے قائل تھے۔ بلکہ "کیونکر کہا" پر ایمان لا چکے تھے۔ ان کے یہاں فلسفہ و تصوف کی تلاش سعی لاحاصل ہے۔ دیکھنا ہو تو حُسن و جمال کی رونق، بازارِ عشق کی گرمیاں، زندگی کی لذتیں اور تلخیاں ان کے یہاں دیکھئے۔ ان کی بول چال میں جادو ہے۔ یہ ندرتِ بیان و جدتِ ادا کی کرشمہ سازی ہے کہ ایک پامال مضمون میں بھی کشش پیدا کر لیتے ہیں ؎

لذتِ جور خدا کی قسم احساں میں نہیں — جو مزا تیری نہیں میں ہے تری ہاں میں نہیں
نہ مٹوں کیا ہے کھٹکا نہ جگر کا دھڑکا — یہ شبِ وصل کے جھگڑے شبِ ہجراں میں نہیں

خوابِ جوانی کی تعبیریں بہت ہوئیں لیکن نسیم نے شباب کا مفہوم یہ سمجھا ؎

کیا بتاؤں کہ خدا جانے جوانی کیا تھی
جاگتے جاگتے اک خواب مگر دیکھا تھا

حسرت موہانی فرماتے ہیں "حقیقی شاعری کے لئے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ واقعاتِ محبت کے بیان میں تصنع سے کام نہ لیا گیا ہو اور جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہو"۔ نسیم نے نہایت شستہ و شگفتہ انداز میں حقائقِ محبت بے نقاب کئے ہیں اور جذبات کی تصویر کشی میں اصلیت نے رنگ بھرا ہے۔ ان کا یہ شعر لاجواب ہے ؎

ترکِ اُلفت کا غم اُدھر بھی ہے — کل سے چُپ چُپ وہ فتنہ گر بھی ہے

اس صاحبِ طرز نے اپنی نازک بیانی، طبیعت کی رنگارنگی اور گوناگوں اسالیب سے اردو شاعری میں ایک بلند مرتبہ حاصل کیا۔ اہلِ نظر اس کے دامِ سخن کے اسیر ہوئے لیکن کیا غضب ہے کہ اسکا کلام اب تک سکوتِ سخن شناس کا شکوہ سنج ہے۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱ - غزل ——— ناخدائے سخن تاج الشعراء حضرت نوح ناروی
۲ - علامہ سید سلیمان ندوی (تعارف) — داکٹر بانکے ندوی ———
۳ - برطانیہ کے نئے وزیر اعظم ——— جناب آغا محمد اشرف ایم۔ اے (کولمبو)
۴ - اقبال کے نظریۂ خودی کا ارتقاء — جناب اثر لکھنوی ———
۵ - کرشمہ سازی (ڈرامہ) ——— جناب نادان قریشی پیلیالوی ———
۶ - بویتو ——— جناب وشنو کمار ———
۷ - دوزخ (افسانہ) ——— محترمہ شفیق بانو شفق ———
۸ - "آگرہ اسکول کا ایک سبق میری نظر میں" - جناب انور بھوپالی ———
۹ - ہندوستان اور برما کے ثقافتی تعلقات - جناب پی۔ گنگولی ———
۱۰ - مرزا مسعود ——— جناب سید خورشید الاسلام ———
۱۱ - خلا (افسانہ) ——— جناب میرزا ادیب ———
۱۲ - جوہری بم ——— جناب ڈی راگھون ———
۱۳ - نوکری (افسانہ) ——— جناب صفوۃ اللہ بیگ صوفی (حیدرآباد)
۱۴ - انتقام (منظوم افسانہ) — محترمہ مظفر رضویہ ———
۱۵ - باکو ——— جناب کرشن چینفیہ ———

ـ کی مشہور عمارتیں

ک پایۂ تخت بہت پررونق اور صنعت
احاط سے بہت اہم ہے۔ علاوہ قدیم
یہاں نئی وضع کی بہت سی عمارتیں
ـ گذشتہ چند سالوں میں یہاں بہت
اے کھل گئے ہیں جہاں بہت نفیس
شمی کپڑے بنے جاتے ہیں۔ ایرانی
اے زمانے سے مشہور ہیں۔

باغ شاہ، کا میدان۔ یہاں کی خاص عمارتیں صدر ڈاکخانہ اور تارگھر ہیں۔

ایران کی پارلیمنٹ کی عمارت۔

ایک فوجی کلب۔

ایران کا قومی بنک۔

Cover Printed at Calcutta art Press Delhi for "UNITED PUBLICATIONS" Delhi. Regd. No. L. 4780

شہنشاہ اکبر زخمی!

آج

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ دس روپے ششماہی چھ روپے | سال ۴ نمبر ۸ | فہرست | ۱۵ ستمبر ۱۹۵۱ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	رفتار زمانہ	ادارہ	۴
۲	واقعات عالم کا روزنامچہ	ادارہ	۶
۳	غزل	حضرت نوح ناروی	۷
۴	کرشمہ سازی (ڈرامہ)	جناب شیخ محمد صدیق قریشی۔ناداں	۸
۵	علامہ سید سلیمان ندوی	جناب فکر ندوی	۱۳
۶	نوکری (افسانہ)	جناب صفوۃ اللہ بیگ صوفی۔بی اے	۱۷
۷	غزل	جناب شعری بھوپالی	۲۲
۸	اقبال کے نظریۂ خودی کا ارتقاء	نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی	۲۳
۹	کیسا روپ انوپ (گیت)	جناب منصور معجز بی اے	۲۵
۱۰	گلبانگ جنوں	جناب سید انور علی شاہ کرمانی	۲۵
۱۱	برطانیہ کے نئے وزیر اعظم	جناب آغا محمد اشرف ایم اے (کولمبو)	۲۶
۱۲	انتقام (منظوم افسانہ)	محترمہ خدیجہ بانو مظہر رضویہ	۳۵
۱۳	ہندوستان اور برما کے ثقافتی تعلقات	جناب پی گنگولی	۳۷
۱۴	دوزخ (افسانہ)	محترمہ شفیق بانو شفق	۳۹
۱۵	سر راس مسعود	جناب سید خورشید الاسلام ایم اے	۴۱
۱۶	آخری حسرت (نظم)	جناب کمین احسن کلیم ایم اے	۴۲
۱۷	بورنیو	جناب وشنو کمار	۴۳
۱۸	خلاء (افسانہ)	جناب میرزا ادیب بی اے آنرز	۴۴
۱۹	آگرہ اسکول کا ایک سابق۔ میری نظر میں	جناب انور بھوپالی	۴۹
۲۰	دی ڈے (نظم)	جناب غلام ربانی تاباں بی اے ایل ایل بی	۵۲
۲۱	مشرق وسطیٰ کی خبریں	ادارہ	۵۳
۲۲	نقد و نظر	و ع	۵۴
۲۳	جوہری بم	جناب ...ی لاگھون	۵۵
۲۴	تدفین سرجان مور (نظم)	جناب محمد صدیق خاں ہما	۵۶
۲۵	ہندوستان میں روئی کپڑے کی صنعت	سردار من موہن سنگھ	۵۷
۲۶	واپسی (نظم)	جناب ضیا فیض آبادی	۵۸
۲۷	باکو	جناب کرشن چیتنیہ	۵۹

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے (علیگ) ایل ایل بی

نائب مدیران
راجیندر ناتھ شیدا
ایم۔ اے
فضل حق قریشی
دہلوی
مشیر احمد
ایم۔ اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۹۶ دہلی

جاپان پر قبضہ

جاپان نے ہتھیار ڈال دینے کے بعد صلحنامہ کی کارروائی کے سلسلے میں کسی قدر تساہل برتنا چاہا مگر جنرل میک آرتھر کی ایک ہی دھمکی میں ان کے ہوش و حواس ٹھکانے آگئے۔ جاپانی نمائندوں کو منیلا آکر میک آرتھر کے عملے سے گفتگو کرنی پڑی اور یہ طے پایا کہ اصل کارروائی سرزمین ٹوکیو پہنچکر عمل میں لائی جائے چنانچہ ۲۸ اگست کو اتحادیوں کا امپیریل جنرل اسٹاف ٹوکیو کے قریب آتسوگی کے فضائی اڈے پر پہنچا اور جنرل میک آرتھر اور دوسرے فوجی افسروں کے خیر مقدم کی تیاری شروع کردی اور ۳۰ اگست کو جبکہ صبح کا ذب کی سفیدی سورج کی زرنگار کرنوں سے ہمکنار ہونے بھی نہیں پائی تھی، اتحادیوں کے سپریم کمانڈر ہوائی جہاز کے ذریعہ آتسوگی جا پہنچے۔ ان کا خیر مقدم نہایت پرسکون طریقہ پر کیا گیا سلامی کی ایک توپ بھی نہیں داغی گئی۔ کچھ دیر بعد دو تین اور ہوائی جہاز پہونچے اور پھر اتحادی بحری بیڑے نے خلیج ٹوکیو میں پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ نمائی کی اور چند گھنٹوں میں چھ ہزار سپاہی جن میں ہوائی جہازوں سے آنے والے بھی شامل ہیں سرزمین جاپان پر اتار دئے۔ پہلے سے لئے ہوئے دستے کو حکم دیا گیا تھا کہ آتسوگی میں قدم رکھنے کے بعد چاروں طرف تین میل کا رقبہ جاپانیوں سے خالی کرا کے شہنشاہ جاپان کا موسم گرما والا محل قبضے میں لے لیا جائے کیونکہ میک آرتھر اپنے اور عملے کے لئے اسی مقام کو اپنا صدر مقام بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کے پہنچنے سے قبل یہ سب کارروائی بخیر و خوبی پوری ہو چکی تھی۔ تمام ٹوکیو میں امن و عافیت کی فضا قائم رہی اور جب اتحادی سپاہیوں اور اخبار کے نمائندوں نے شہر کا گشت لگایا تو کوئی ناگوار صورت پیدا نہیں ہوئی۔ باشندگان شہر کے چہروں پر نظر ڈالنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی قوم کی شکست کو بری طرح محسوس کر لینے کے باعث شدید رنج و غم اور کسی قدر غیظ و غضب کے باوجود خاموشی کے ساتھ اسے برداشت کر رہے ہیں۔ ٹوکیو کے بازار اور باقی مکانات تباہی اور بربادی کا عجیب و غریب نمونہ پیش کر رہے تھے جسے دیکھکر معلوم ہوتا تھا کہ محض فوجی افسروں کی ہٹ دھرمی اور کج فہمی کے باعث بے قصور شہریوں کو یہ روز بد دیکھنا پڑا۔ یہ سب جاپان پر قبضہ کرنے کی کارروائی بڑی تیزی کے ساتھ عمل میں آرہی ہے۔ پہلے سے یہ طے ہو گیا تھا کہ آٹھویں فوج ہونشو پر جو ٹوکیو کے شمال میں ہے، اور چھٹی فوج باقی جاپان پر نیز چوبیسواں دستہ کوریا پر اپنا قبضہ جمالے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس سلسلے میں چھ ماہ کے اندر اندر اتحادیوں کے تقریباً پانچ لاکھ سپاہی جاپان پہنچ جائیں گے۔ ابھی تک جاپان کے افسران اعلیٰ کا رویہ بھی عجز و انکسار کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اور اب ان کے لئے اس کے سوا چارہ کار بھی کیا ہے۔ انکی یاس و ناامیدی کا تصور کر کے کہنا پڑتا ہے۔ ؎

چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

مصر اور صنعتِ فلم سازی

آج سے دس سال پہلے "مصر فلم کمپنی" نے پہلا بولتا ہوا فلم تیار کیا جس سے سارے ملک میں اس کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگا۔ اس میں تمام اداکار ــ مرد اور عورت ــ مصری النسل تھے۔ اس میں اٹھارھویں صدی کے ابتدائی زمانے کے حالات پیش کئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ فنی اعتبار سے اس میں بعض خامیاں تھیں لیکن اس کے حسین منظروں اور عرب موسیقی کے دلدوز گانوں نے جلد تماش بینوں کے دل موہ لئے۔ اس وقت شاید پہلی مرتبہ اس فلمی ادارے کو یہ بھی محسوس ہوا کہ فلم سازی ایک نفع بخش کاروبار ہے۔ مصر کی آب و ہوا گرم ہونے کے باعث اداکاروں کے چہروں سے جلد جلد رنگ و روغن پسینے کے ساتھ بہہ جاتے ہیں اور اس کا اثر فلم کے ذخیروں پر بھی پڑتا ہے، اسلئے کافی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ اس سے قطع نظر یہ ملک مختلف النوع قدرتی منظروں، عہد عتیق کی یادگار عمارتوں اور تاریخ کے دلچسپ موضوعوں وغیرہ کے لحاظ سے فلمی صنعت کے لئے ایک نعمت ہے۔ "مصر فلم کمپنی" نے حال ہی میں ایک تازہ ترین تصویر "لاشین" بناتے وقت ان تمام قدرتی نعمتوں سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ چونکہ اس فلم میں بارھویں صدی کا زمانہ پیش کیا گیا ہے، اس لئے اس وقت کے لباس ہتھیار اور عمارتیں خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھی گئیں۔ سات سو سال پہلے کا مصری عہد پردۂ فلم پر دکھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لہذا ناخواندہ کارکنوں اور ناتجربہ کار اداکاروں کا پوری طرح تربیت دینے میں بہت سی دشواریوں کا

سامنا کرنا پڑا لیکن جب فلم دکھایا گیا تو ہدایت کاروں کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔ کیونکہ عوام نے بہت جوش وخروش کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ مصر کی لائق ایکٹرز اور ایکٹرسیں موجود ہیں۔ مثلاً نادیہ ناجی، فواد الرشیدی، حسن ریاض، حسن عزت اور احمد علی خاص طور پر مشہور ہیں۔ اب وہاں سماجی فلموں کی تیاری بھی عمل میں آرہی ہے۔ انکو قابل قدر ذریعۂ تعلیم بھی بنایا جائیگا۔ قیاس ہے کہ آنے والے فلم مصر کی قومی زندگی کے صحیح آئینہ دار رہوں گے۔

ایٹم بم عہد عتیق میں

تاریخ عالم کے بعض گم شدہ اوراق جب کبھی حسن اتفاق سے ہاتھ لگ جاتے ہیں تو یہ معلوم کرکے تعجب ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی بہت سی ایجادیں جن کو صرف عصر حاضرہ کی تحقیقات سمجھا جاتا رہا، قدیم زمانے میں بھی رائج تھیں۔ سو وقتاً فوقتاً اہرام مصر کی کھدائی نے ایسے بہت سے راز منکشف کئے ہیں۔ اب ایٹم بم ہی کو لیجئے۔ اس بظاہر تازہ ترین ایجاد نے نہ صرف جاپان کو تباہ و برباد کیا بلکہ تمام دنیا کو اپنی ہولناک غارتگری سے محو حیرت کردیا۔ حال کے وہ سائنسدان جن کی مسلسل دماغ سوزی اس انکشاف کا باعث ہوئی۔ یقیناً لائق تحسین ہیں۔ لیکن اطالوی ڈاکٹر لوئی بلباریتی نے جو گذشتہ بیس سال سے اس بم کے اجزائے ترکیبی کا گہرا مطالعہ کرتے رہے ہیں بیان دیا ہے کہ اسی قسم کا بم مشہور فرعون مصر توت انخ آمن کے مقبرے میں موجود تھا جو غالباً آج سے ساڑھے تین ہزار سال پہلے کے مصری کاہنوں نے بنایا ہوگا۔ اس کی تیاری میں یورینیم نمک اور گرم تاب عناصر شامل تھے۔ اسے مقبرے کے اندر اس طرح رکھا گیا تھا کہ اگر ایکہزار سال کے اندر اندر اسے کھول لیا جاتا تو کافی بڑے رقبے میں اس کے دھماکے سے تباہی پھیل جاتی۔ چونکہ یہ کھدائی ۱۹۲۲ء میں یعنی تقریباً ساڑھے تین ہزار سال بعد عمل میں آئی تھی، اس لئے مشہور ماہر اثریات لارڈ کرنارون، چند انجنیر اور کچھ مزدور مرگئے۔

لاہور کا نیا روپ

لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے توسیع شہر کے سلسلے میں ایک تازہ ترین خاکہ پیش کیا ہے جس کی رو سے نئی آبادیاں بقدر ۱۱۵ مربع میل کے رقبے میں پھیل جائیں گی۔ اب تک لاہور کو "ایشیا کا غلیظ ترین شہر" سمجھا جاتا رہا ہے۔ امید ہے کہ اس تجویز کے دائرۂ عمل میں آجانے کے بعد یہ کلنگ کا ٹیکہ اس کی پیشانی سے مٹ جائیگا۔ قدیم شہر کی آبادی اسوقت اتنی گنجان ہے کہ تقریباً چارسو نفوس فی ایکڑ کی اوسط پہنچتی ہے۔ اطراف واکناف میں حدود کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ پرانے علاقوں کی تعمیر نو حفظان صحت کے معیاری اصولوں پر شروع کی جائیگی۔ اس سلسلے میں تین بڑے بڑے طبقے صنعتی رہائشی اور زراعتی مقاصد کے لئے مخصوص ہوں گے۔ رہائشی طبقے میں کوٹھیاں، خاص وضع کے مکان، دوکانیں اور بالاخانے بنائے جائیں گے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے قرب وجوار میں تعمیر ہونے والے بنگلوں کے لئے چار سے ستر کنال تک کے قطعے تجویز کئے گئے ہیں۔ ان حصوں میں نئے پارک اور کھیل کود کے میدانوں کے علاوہ گھاس کے قطعوں کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ تاکہ باشندگان شہر کے لئے سہولت ودلچسپی کے علاوہ تازہ ہوا بھی میسر آسکے۔ ان نئے حصوں میں کم وبیش ایک لاکھ نفوس رہ سکیں گے۔ اور ان کے لئے ہر لحاظ سے ایسی آسانیاں فراہم کردی جائیں گی کہ حتی الوسع ان کو پرانے شہر کی حدود میں جانے کی ضرورت لاحق نہ ہو۔ اس علاقے میں تقریباً دو ہزار ایکڑ کا رقبہ موڈل ٹاؤن اور اچھرا کے درمیان یونیورسٹی کے لئے مخصوص ہوگا۔ فیصلہ کیا گیا ہے کہ تمام مقامی کالج، میڈیکل اور میکلیگن انجنیرنگ کالج سمیت، اس حصے میں منتقل ہوجائینگے۔ رہائشی طبقے کی آخری حدود کے بعد سبزی کے کھیتوں اور پھلوں کے باغوں کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اس تمام اسکیم کو حکومت پنجاب نے منظور کرلیا ہے۔

آسمانی آرامگاہیں

لڑائی کے بادل چھٹتے ہی تمام اتحادی دنیا اور خصوصاً امریکہ والوں نے جو یوں بھی جنگی محاذوں سے بہت دور تھے، کسی قدر اطمینان کا سانس لینا شروع کردیا ہے۔ اور جس طرح ہندوستانی شاعروں کو پیٹ بھر جانے کے بعد دور کی سوجھتی ہے، اسی طرح سائنسدانوں اور انجنیروں نے بظاہر خواب وخیال کی دنیا میں رہ کر ایسے ہوائی جہازوں کے خاکے مرتب کئے ہیں جو وسعت وطول، اور رفتار کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہوں گے۔ اب تک ہنڈن برگ نامی جہاز کو جو مئی ۱۹۳۷ء میں جل کر تمام ہوگیا دنیا کا سب سے بڑا طیارہ سمجھا جاتا رہا ہے مگر وہ بھی ان مجوزہ جہازوں کے مقابلے میں سورج کے سامنے معمولی چراغ ہوکر رہ جائیگا۔ ان جہازوں کی لمبائی کم وبیش ۳۶۰ گز یعنی میل کے پانچویں حصے سے زیادہ ہوگی۔ ان میں بیک وقت ۳۰۰ مسافر الگ الگ کمروں میں پوری آسائشوں کے ساتھ سفر کرسکیں گے۔ ہر کمرے کے غسلخانے اور پاخانے علیحدہ ہونگے جن میں گرم اور ٹھنڈے پانی کا انتظام ہوگا۔ یہ جہاز کسی جگہ رکے بغیر سات ہزار میل تک یکدم اڑ سکیں گے۔ رفتار کا تعین ابھی نہیں ہوا۔ تاہم وہ سینکڑوں میل فی گھنٹہ ہوگی۔ ہر شخص تین وقت روزانہ اور ہر دفعہ میں چار سے پانچ قسم کے کھانے کھا سکیگا۔ کھانے، شراب پینے، ناچنے گانے اور مختلف کھیلوں کے دسیع ہال سب کے لئے مشترک ہوں گے۔ ناچ گھر کے لئے المونیم کے خاص پیانو بنائے جائینگے۔ کھلی فضا میں ٹانگیں پھیلا کر دھوپ کھانے یا سبز قطعات پر چہل قدمی کرنے کا بھی انتظام ہوگا۔ انکی لاگت کا بھی ابھی تک اندازہ نہیں لگایا گیا۔ البتہ پہلے چھ جہازوں میں سے ہر ایک پر تقریباً تین کروڑ روپے صرف ہونگے۔ اتنی شان وشوکت اور آسائشوں کے لحاظ سے ان کو "آسمانی آرامگاہیں" بلکہ "آسمانی محلات" کہنا کسی طرح بھی غیر موزوں نہیں ہوگا۔ اگر یہ منصوبے واقعی کامیاب ہوگئے تو شاعر مشرق علامہ اقبال کی روح پاک کو جنت الفردوس میں غرق تحیر ہوکر یہ مصرع دہرانا پڑے گا۔ ؎

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائیگی ؏

واقعاتِ عالم کا روزنامچہ

۱۶ اگست سے ۳۱ اگست تک

۱۶:۔ جاپان میں شہزادہ ہیگاشی کونی نے نئے وزیراعظم کی حیثیت سے اپنی کابینہ مرتب کرلی۔ جاپان کی سپرانداز ی کی کارروائی کے سلسلے میں سپریم کمانڈر کی حیثیت سے نامزد ہو جانے پر جنرل میک آرتھر نے صدر ٹرومین کا شکریہ ادا کیا۔ مسٹر چرچل نے جوہری بم کے استعمال کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ دوسری صورت میں جنگ کرتے رہنے سے جانی نقصان کہیں زیادہ ہوتا۔

۱۷:۔ گفتگوئے مصالحت کے سلسلے میں جاپانیوں کی طرف سے تاخیر ہونے پر میک آرتھر نے سخت تنبیہ کی۔ پتیاں کی سزائے موت حبسِ دوام کی صورت میں بدل دی گئی۔ چین کے اشتراکیوں اور مرکزی حکومت کے مابین تعلقات مدریجاً کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔

۱۸:۔ سپراندازی کے سلسلے میں جاپانی مندوبین ٹوکیو سے منیلا روانہ ہوگئے۔ اطلاع آئی ہے کہ امریکہ میں ابھی تک جوہری بم بنائے جا رہے ہیں۔ جاپانیوں نے ہر جگہ ہتھیار ڈالنے شروع کر دئے البتہ روس کے خلاف جنگ کا سلسلہ جاری ہے۔

۱۹:۔ جاپانی مندوبین منیلا پہنچ گئے۔ منچوریا میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔

۲۰:۔ جاپانی وفد جنرل میک آرتھر کے نمائندگان سے گفتگو کرنے کے بعد ٹوکیو روانہ ہوگیا۔ اس کانفرنس میں میک آرتھر نے خود شرکت نہیں کی۔ منچوریا کا شہنشاہ روسیوں نے لے لیا۔ ناروے کے سابق وزیراعظم کوئزلنگ پر اوسلو میں مقدمہ شروع ہوگیا۔

۲۱:۔ ہندوستان کے سلسلے میں مزید غور و خوض کرنے کی خاطر جلد از جلد لندن پہنچنے کیلئے وائسرائے ہند نے بادشاہ سلامت کی دعوت قبول کرلی۔ مسٹر ارنسٹ بیون نے پولینڈ، اسپین اور دوسرے یورپی ممالک کے بارے میں برطانوی پالیسی کی روشنی میں تیار کیا ہوا خاکہ دارالعوام میں پیش کیا۔ روس نے متحدہ اقوام کے چارٹر پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

۲۲:۔ اعلان کیا گیا ہے کہ آئندہ منگل کے دن اتحادی فوجیں ٹوکیو کے قریب آتسوگی کی سرزمین پر قدم رکھینگی۔ خبر آئی ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی میں صرف دو جوہری بموں سے دو لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اترے یا زخمی ہوگئے۔ سب سے زیادہ پرانی اسلامی درسگاہ جامعہ ازہر کے امیر شیخ مصطفےٰ المراغی کا انتقال ہوگیا۔

۲۳:۔ جاپانی خبر رساں ایجنسی نے اطلاع دی ہے کہ ایک خطائی حادثے کے ذریعہ سبھاش چندر بوس ٹوکیو میں مرگئے۔ برما کے جاپانی کمانڈر نے اپنے دستوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔

۲۴:۔ لارڈ ویول لندن روانہ ہوگئے۔ منچوریا کا نام نہاد بادشاہ ہنری پی یی روسیوں کے ہاتھ لگ گیا۔ جاپان پر اتحادیوں کی بمباری نے چھ لاکھ بہتر ہزار نفوس کو نقصان پہنچایا۔ اشتراکیوں نے اپنے نمائندے چنگ کنگ بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ چین کے اندرونی معاملہ کے سلسلہ میں کوئی سمجھوتہ کرلیا جائے۔

۲۵:۔ جاپان کے قریب شدید طوفان برپا ہونے کے باعث اتحادیوں کا داخلہ ملتوی کردیا گیا۔ ادھار پٹے کے یکایک بند ہو جانے سے تمام برطانیہ میں ہیجان ہے۔ جنرل میک آرتھر نے جاپانیوں کو حکم دیا کہ ہانگ کانگ برطانوی افواج کے حوالے کردو۔

۲۶:۔ لارڈ ویول لندن پہنچ گئے۔ روس نے چین سے معاہدہ کیا ہے کہ جاپانی ظلم و تشدد ختم ہونے کے تین ماہ بعد روسی فوجیں منچوریا سے ہٹالی جائینگی۔ اور منچوریا چین کو دیدیا جائیگا۔

۲۷:۔ حکومتِ ہند نے فیصلہ کیا کہ ان سپاہیوں کے ساتھ جو ناجائز دباؤ کے ذریعہ دشمن کی فوج میں بھرتی کرلئے گئے تھے نرمی اور رواداری کا سلوک پیش نظر رکھا جائیگا۔ پانچ روز کی کشمکش کے بعد شام میں تیسری نئی وزارت قائم ہوگئی۔ عراق کے وزیر خارجہ سید ارشد العمری نے جو سان فرانسسکو کانفرنس میں عراقی نمائندگان کے صدر بھی تھے اپنے عہدے سے استعفےٰ دیدیا۔ وجہ ابھی تک معلوم نہیں ہوئی۔

۲۸:۔ جاپان پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں پہلا امریکی دستہ جاپان پہنچ گیا۔ اس میں انجینیئر اور دوسرے ماہرِ فن بھی شامل ہیں۔ شہنشاہِ جاپان کا موسم گرما والا محل جنرل میک آرتھر کا صدر مقام بنایا جائیگا۔

۲۹:۔ جاپان جانے کیلئے جنرل میک آرتھر منیلا سے اوکیناوا روانہ ہوگئے۔ جنوبی سخالین پر روسیوں کا قبضہ ہوگیا۔ میکسیکو کی حکومت نے اسپین کی نئی جمہوری حکومت کو تسلیم کرلیا ہے۔ پیرا ڈیسی کے جزیرہ میں فاتح وزنگا رخانہ میں شعلہ تخریب کے باعث تکلیف کا نقصان پہنچا۔

۳۰:۔ صبح کاذب کے وقت ٹوکیو سے کچھ دور آتسوگی کے فضائی اڈہ پر جنرل میک آرتھر ہوائی جہاز سے اترے۔ ادھار پٹے کے سلسلے میں جون ۱۹۴۵ء کے آخر تک چھ ارب روپے کا جنگی سامان ہندوستان آیا۔ سر فیروز خاں نون نے ملکی سیاست میں حصہ لینے کی غرض سے وائسرائے کی مجلس مشاورت سے استعفےٰ دیا جو گورنر جنرل نے منظور کرلیا۔

۳۱:۔ اتحادی ایشیائی امیر البحر ماؤنٹ بیٹن بذات خود ستمبر تک سنگاپور پہنچ جائینگے۔ مسٹر ہوربلیشا قدامت پسند جماعت کے شریک کار ہوگئے۔

غزل

نوح ناروی

فیصلہ دو ٹوک کرنے دیجئے / جی چکا میں مجھ کو مرنے دیجئے

دل مجھے قربان کرنے دیجئے / حسن کا صدقہ اترنے دیجئے

قتل گہ میں آہ کرنے دیجئے / تیغ کا دم مجھ کو بھرنے دیجئے

لوگ کہتے ہیں کہ مرتا ہے کوئی / کوئی کہتا ہے کہ مرنے دیجئے

کہہ چکے سب اپنی اپنی اہل عشق / اب مجھے کچھ عرض کرنے دیجئے

حُسن میں پریوں سے وہ بڑھ جائیگا / اک ذرا بننے سنورنے دیجئے

عشق میں جینا ہے توہین حیات / مر رہا ہوں مجھ کو مرنے دیجئے

ہم سے کہتی ہے ہوائے آرزو / دل کا شیرازہ بکھرنے دیجئے

شاید اس سے کچھ مجھے تسکین ہو / تھام کر دل آہ کرنے دیجئے

عشق میں یہ روک تھام اچھی نہیں / کوئی مرتا ہو تو مرنے دیجئے

تھاہ بحرِ عشق کی مِل جائے گی / ڈوب کر مجھ کو ابھرنے دیجئے

آپ کا گھر آپ کی محفل نہیں / حشر میں فریاد کرنے دیجئے

جو گذرنی تھی وہ گذری جان پر / اب مجھے جی سے گذرنے دیجئے

کیجئے گا پھر مجھے مجروحِ غم / دل کے پہلے زخم بھرنے دیجئے

کیا تصور میں بھی آئیں گے نہ آپ / مجھ کو آنکھیں بند کرنے دیجئے

بڑھتے جائیں گے کہاں تک اہل عشق / جو مریں اب ان کو مرنے دیجئے

ترک الفت ہے کبھی ممکن یا نہیں / مجھ کو اس پر غور کرنے دیجئے

پھر محبت میں اٹھا طوفانِ نوح / غم کا بھرنا دل کو بھرنے دیجئے

تعارف

نظم اس وقت کی جہالت کا نقشہ اتارتی ہے۔ جس وقت عرب کی ظالمانہ مراسم معماروں سے معصوم جانوں کا خون محض اسلئے بہا دیتی تھی کہ "بیٹی" ہے بیٹا نہیں اور امیر قبیلہ کو ہر اشارہ ان کے لئے پتھر پر لکیر ہوتا تھا اور یہ ہی ان کا قانون تھا۔

افراد تمثیل

سہاس ——— حاصرہ کے ایک قبیلہ بنی اوہان کا امیر
سفاہان ——— سہاس کا بیٹا
منزل گیر ——— سہاس کا قاصد
فزانش ——— ایک مشہور وقت شاعر جسکا زمانہ لوہا مانتا تھا
نجمہ ——— مراقش کی حکمران سلطانہ

وزیر۔ غلام۔ قبیلے۔ لوگ اور درباری وغیرہ .....

مقام ——— مراقش

پہلا منظر:۔ مکان امیر سہاس۔ پتھروں کی ٹیڑھی بانکی دیواروں کی ایک مربع چاردیواری ہے۔ کئی پتھروں کے جناؤ کے بعد ایک ایک کھجور کے درخت کا تنا کھڑا ہے۔ کھجور کے سالم پتوں کی چھت اور کھجور ہی کی تہی نہی شاخوں سے بنی ہوئی طولاً، عرضاً تنہاں مکان کے کمروں اور خانوں میں تمیز کراتی ہیں۔ ایک کمرے میں سفاہان کسی کے عشق میں گا رہا ہے۔ اور تصور کی تصویر آنکھوں میں لئے ہے۔ آنکھیں نیم وا چھت کی طرف کئے ہوئے اپنی نشست کے گاؤ پر داہنی کہنی ٹکائے ہوئے ہے۔

سفاہان:۔

مجھے زخم اپنے کا ڈر نہیں
مجھے درد سے بھی خطر نہیں
مجھے مٹیں سے بھی مفر نہیں

جو ہے شوق قاتل بے خبر
تو اٹھا کے خنجر بڑھ ادھر
جو کمی ہے ظالم زخم میں تو اٹھا نشتر چھیڑ دے

(برابر کے کمرے میں سہاس اس گانے پر کان دھرتا ہے اور دل ہی دل میں جذب و کیف سے متاثر ہوتا ہے ....)

(گانا جاری ہے) تجھے میرے غم سے ہے کیا پڑی
رہوں روتا نالاں میں ہر گھڑی
رہے اشک خوں کی لگی جھڑی

تجھے میری آہ سے کام کیا
میرے دل پہ جوروں کو آزما
جو میں درد سے کبھی اف کروں تو اٹھا کے خنجر چھیڑ دے

[سہاس سفاہان کے کمرے میں داخل ہو کر اسکے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ جس کا سفاہان کو مطلقاً علم نہیں ہوتا]

(گانا جاری ہے) جو نمک زدہ سلسلے کہیں
تو اسے بھی لا کے یوں بھر رہیں
یہ مجال کیا کہ کہوں نہیں

مجھے آس ہے کہ بڑھے مزا
لب زخم بھی یہی دے صدا
یہی کیف ہے یہی لطف ہے، ذرا رفتہ رفتہ بکھیر دے

سفاہان:۔ (گانا بند کر کے خود ہی شکار کرنے آئے تھے دشمن ہی سالس لیکن شکار ہو گئے۔ شیرانہ خیال بکھور رہا ہے۔ اعضاء میں کمزوری کی لہر دوڑ رہی ہے .... دل متزلزل ہے۔

سہاس:۔ (سامنے ہوتے ہوئے) کیا یہ اسی دل گداز نغمے کی تعریف ہے جس نے ابھی ابھی اپنی جادو بھری تاثیر سے سننے والوں کو مضطر اور بیقرار کر دیا؟

{سفاہان دفعتاً باپ کو اس طرح دیکھکر کف دست ملتے ہوئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور متحیر و پریشان ہے۔}

سفاہان:۔ (اسی حالت میں) کیا آپ ..... نے ..... سُن لیا؟

سہاس:۔ گو خود تو نہیں سنا۔ ہاں خواہ مخواہ ہوشیاری اور تیزی سے اپنی کیفیتوں میں محو کر گیا۔ اگر سچ پوچھتے ہو تو اس سحر آفریں مضمون نے بیتاب بھی کر دیا۔

سفاہان:۔ (ڈر کر عاجزی سے) ابا۔ ابا... مجھ سے غلطی ہوئی .....

سہاس:۔ غلطی؟ (ہنس کر) ہوا ہی کرتی ہے۔

سفاہان:۔ کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے۔

سہاس:۔ معافی؟ معافی کیسی؟

سفاہان:۔ اسی تقصیر..... اس گناہ کی کہ میں نے....

سہاس:۔ (بات میں) ایک عشقیہ نغمہ گایا۔

سفاہان:۔ اور خصوصاً یہ کہ اپنے باپ کے سامنے .....

سہاس :- نہیں تمہارا اس میں کیا قصور ہے۔ تم نے بہت کوشش کی کہ اس موسیقی کا دریا کسی محفوظ ترین جگہ میں بہایا جائے جس کے در و دیوار میں کوئی سوراخ فضا کی چوری کے لئے نہ ہو۔ تم مجبور تھے یہ چیز ہی ایسی تھی جو خود بخود پھیل گئی۔

سفاہان :- (پاؤں پکڑ کر) نہیں نہیں ابا مجھے بخشئے مجھ سے قصور ہوا اور میں جانتا ہوں ہمارے قبیلے میں اس گستاخی کی کیا سزا ہے اور پھر یہ کہ قبیلے کے سردار آپ ہیں۔

سہاس :- (پیچھے ہٹ کر) تو تم نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ باپ کا بیٹے کے سامنے عشق خیز نغمہ سرائیاں کرنا خطا کار ہے، مدہوش ہو کر گانا بھی شروع کر دیا۔ اگر تمہیں ایسا خیال تھا کہ اس کام کا انجام برا ہوگا تو کیوں اس سے منہ نہ پھیرا؟

سفاہان :- لیکن میرا دل دماغ - میں خود اس وقت اپنے قابو میں نہ تھا -

سہاس :- (متحیر) یہ کیا نئی بات ہے؟

سفاہان :- ہاں میں بے قرار تھا اس وقت میری نظروں میں کوئی اور دنیا تھی ...... اور ...... اس وقت بھی۔

سہاس :- (متعجب) اور اس وقت بھی؟ نہیں جب تک اس کی تشریح نہ ہوگی فیصلہ نا ممکن ہے۔

سفاہان :- لیکن ایک شرط ہے میں دوسری جگہ بدنام نہ ہو جاؤں۔

سہاس :- قول ہے (ہاتھ بڑھاتا ہے)

سفاہان :- (بوسہ دیتے ہوئے) دوسرے یہ کہ یہاں سے اگر کوئی مطالبہ آپ پر کرے تو اس کے پورا کرنے کے ذمہ دار آپ ہوں گے . . . .

سہاس :- (ہاتھ بڑھا کر) یہ بھی منظور رہے سہاس کو لیکن اگر امیر قبیلہ کی اس میں ہتک اور آبرو ریزی ہوئی ...... تو . . . .

سفاہان :- تو بہادر سفاہان کا سر اس خمیازے کی تعمیل حاضر ہے۔

سہاس :- (خود سے) یہ پہلا موقعہ ہے کہ میرا بہادر بیٹا کہیں غیر معمولی الجھنوں میں قید ہے۔

سفاہان :- آہ . . . . سر کی بازی تو لگ ہی گئی۔ ہار اور جیت میرا مقصد۔ آپ کو یاد ہے آج سے پہلے میں مراقش کے گنجان نخلستان کی طرف شکار کو نکل گیا تھا۔ اسی اثناء میں اپنی جائے قیام سے ایک وقت دور چلا گیا اور راہ گم کر بیٹھا میں تھکان سے چور تھا چند درختوں کے سائے تلے جن کے درمیان ایک شفاف پانی کا چھوٹا سا چشمہ تھا۔ بیٹھ کر اطمینان کا سانس لینے لگا۔ لمحہ ہی گذرا تھا کہ چار مراقشی سواروں کی حفاظت میں ایک پریوش حور شمائل مراقشی دوشیزہ جس کے حسن زیبا کی جھلک میں نہ لا سکا۔ وہاں سیر کرتی آ نکلی اور لیں میرے سکون کی پونجی اس نے ایک ہی اشارے سے لوٹ لی۔ اس کی کمان ابرو سے تیر نگاہ میری طرف بڑھا اور مجھے گھائل کر گیا۔ جب ہوش آیا خود کو نیم جاں پایا۔ ابا میرے تصور کی زینت وہی مراقشی شہزادی ہے۔ جس کی سادگی اور شوخی نے میرے دل پر ستم ڈھایا۔ اور اگر سچ پوچھئے ہیں تو آئندہ اسی کے لئے مرنا جینا حلال سمجھ رہا ہوں۔

سہاس :- تمہارے دلی جذبات کا یہ جوش ہم نے بہت خوب سمجھ لیا۔ اور اپنے فرض کے مطابق اگر ہم سے ہو سکا تو کر کے رہیں گے . . . . لیکن جو شرط طے پائی وہ بال برابر بھی ادھر ادھر نہ ہوگی۔ اگر کوشش کامیاب ہوئی تو مسرت ورنہ .... (دجاتا ہے)

سفاہان :- (دل پر ہاتھ رکھ کر خود سے) ورنہ؟ ورنہ کیا سر حاضر ہے۔

دوسرا منظر

مراقشی سلطانہ کا دربار شاہی :- درباری ایوان اپنی نوعیت کی واحد مثال آپ ہے۔ مراقش کی حکمراں تخت سلطانہ پر سریر آرا ہے درباری مؤدب حاضر ہیں۔ چوبدار داخل ہو کر آداب بجا لا کر۔

چوبدار :- ملکہ عالیہ! ایک قاصد سرزمین حاصرہ سے حاضر ہوا ہے اور شرف باریابی کا خواہاں ہے۔

ملکہ :- شوق سے آئے۔

(دربان جاتا ہے پھاٹک کھولتا ہے۔ قاصد ایوان میں داخل ہو کر آداب بجا لاتا ہے)

ملکہ :- تعریف؟

قاصد :- حاصرہ کے امیر سہاس کا قاصد منزل گیر ہوں، اپنے آقا کے ارشاد کے مطابق یہ سربمہر نامہ پیش کرنے کی غرض رکھتا ہوں۔

(خط دینا وزیر کا لیکر پیش کرنا)

ملکہ :- (پڑھ کر توقف کے بعد) ہوں۔

(مسکرا کر خط پھینکا رکھ دیتی ہے)

ملکہ :- عزیز قاصد ہم اس پیغام کو دیکھ کر لب بہ مسکراہٹ ہوئے۔ تم ہمارے مہمان ہو جتنے دن کافی ہوں ہمارے ہاں فرحت و سرور سے بسر کرو اس کے بعد جواب سربمہر بخوشی حوالے کیا جائیگا۔

قاصد :- مکرمہ دل کی خواہش تو تھی کہ اس جنت نظیر وادی کی کوئی دن سیر کروں اور تازہ دم ہو جاؤں لیکن امیر کا حکم میرے لئے ہر قسم کی راحت حرام کرتا ہے۔

ملکہ :- جو خوشی (محل کو جاتے ہوئے) جواب کا انتظار کرو وزیر صاحب ہمارے مہمان کی خاطر رہے۔ (جاتی ہے)

تیسرا منظر

مراقشی دربار شاہی :- دربار آراستہ ہے درباری مؤدب ہیں سلطانہ نہیں ہے۔ وزیر داخل ہوتا ہے۔ خدام آداب بجا لاتے ہیں۔

وزیر :- (قاصد سے) معزز قاصد یہ جواب (خط دیکر) اور زبانی معلوم ہو۔ بلکہ عالیہ کو شادی قبول ہے۔ لیکن اس کے لئے رواجاً ایک رسم امیر سہاس سے پوری کرانی ہے۔ وہ ہے۔ امیر کی عقل کا امتحان۔

(قاصد آداب بجا لاکر روانہ ہوتا)

چوتھا منظر

مسندِ امیر سہاس :- (امیر سہاس بعد چند اصحاب کے رونق پذیر ہے۔ اور گفتگو جاری ہے ....)

ایک دوست :- شاید انہوں نے غور سے کام نہیں لیا۔

سہاس :- ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر سہاس کا امتحان بجائے سفاہان کیا معنی۔

قاصد :- جی آقا یہی زبانی عرض کیا ہے۔

پانچواں منظر

حویلی امیر سہاس :- (یہی پرانی گھاس پھوس اور کھجور کے تنوں پر تعمیر ہوئی چاند علاوہ لدی ہے۔ سہاس اس کے ایک وسیع حصے میں اپنے ہتھیار شمشیر، نیزہ، کٹار، خنجر، ڈھال، ترکش، تیر وغیرہ سامانِ حرب کو صاف کر رہا ہے۔ مکان کا صدر دروازہ کھلا ہے قبیلے کے چند فرد پاس کھڑے ہیں۔ اور اشیاء سنبھال کر پیش کر رہے ہیں۔ ایک نوجوان عورت جو نہایت خوبصورت خد و خال کی ایک مجسم تصویر ہے۔ گرد و غبار میں آلودہ، سر کے بال پریشان آنکھوں کے پیمانے اشکوں سے لبریز، آہ و فغاں کرتی متلاشی حواس باختہ اس مجلس میں آگھستی ہے۔ اور جس تلوار کو ابھی ابھی امیر سہاس صاف کرکے دیوار پر آویزاں کر رہا ہے اس کے دستے پر ہاتھ ڈال میان سے آدھی کھینچ لیتی ہے۔ اس کی دیوانگی دیکھ کر اور قریہ کے دیگر لوگ بھی اسکے پیچھے پیچھے سہاس کے گھر تک آپہونچتے ہیں۔ میر سہاس اس پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور جنونی عورت کو اس طرح تلوار کھینچے دیکھ کر اس کا ہاتھ روک لیتا ہے۔

سہاس :- (ہاتھ جھٹک کر) مت ہاتھ دھرو اس پہ یہ ان نازک کلائیوں سے کھیلنے کی شے نہیں دیکھنے میں تیری بانکی تتی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی لیکن آزمانے میں قیامت خیز ہے تم ہم سے کہو۔ یہ پریشانی کیوں ہے؟

عورت :- امیر میری دنیا لٹ رہی ہے۔ میری عرصے کی محنت برباد کی جا رہی ہے۔ مجھ سے میرے کلیجے کی بوٹی کو جدا کیا جا رہا ہے۔ بچاؤ ....

امیر :- (حیرانی سے) ہیں! ہم نہیں سمجھے کیا کہا ہے۔

عورت :- امیر میری نو عمر بچی۔ جو ابھی چار پانچ دن کی ننھی جان ہے مجھ سے چھین کر زندہ دبائی جا رہی ہے۔ وہ معصوم میرے پیٹ کی انتڑیوں سے جدا کی گئی ہے۔ میرے کلیجے سے توڑی ہوئی بوٹی ہے۔ امیر تم میری مدد کرو... .....وہ مجھ بیوہ کا ایک سہارا ہے۔

سہاس :- جب تم بیوہ ہو تو اس کو کون در گور کر رہا ہے۔

عورت :- اسکا چچا۔ ہاں امیر.......

سہاس :- تم اطمینان رکھو (اپنی نشست کی طرف جاتے ہوئے) کتنا ٹیڑھا سوال ہے

عورت :- اطمینان؟ ..... نہیں نہیں یہ رکاوٹ مجھے برباد کر دیگی۔ امیر اب اطمینان کا وقت نہیں۔

سہاس :- تو اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔

عورت :- تو تم مجھے نہ روکو حفاظت کرنے دو اگر میں کر سکوں... اگر تم سے کچھ بن نہیں آتا تو مجھے جانے دو۔ اور قسمت آزمانے دو۔

(عورت تلوار کھینچ کر باہر کی طرف بھاگتی ہے۔ سفاہان دروازے پر کھڑا ہے لوگوں کا مجمع نہایت متعجب ہے۔ امیر اسے پھر تلوار لیجاتے دیکھ کر سفاہان سے کہتا ہے)

امیر سہاس :- سفاہان .... روکو.... اسے....

سفاہان :- (روک کر) ٹھیرو.......

عورت :- میں مجنوں ہوں۔ اپنی ضرورت کی دیوانی تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ اور مجھے کسی بے گناہ کی حفاظت کرنے دو۔

(جانے کی کوشش کرتی ہے سفاہان سینہ تان لیتا ہے)

سفاہان :- تم سمجھتی ہو دروازے میں کمزور پھاٹک ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ تختہ تم جیسی سو طاقتوں سے بھی نہیں ہل سکتا۔

عورت :- مجھے ڈر ہے کہیں تختے کی کوئی کیل میرے کمزور بازو کے وار سے اکھڑ نہ جائے۔

سفاہان :- کوشش کر دیکھو۔

{عورت تلوار اٹھا کر وار کرتی ہے۔ سہاس پیشتر اسکے کہ وار سفاہان پر گرے دوڑ کر پیچھے سے تلوار آ پکڑتا ہے۔}

سہاس :- او خبط الحواس دیوانی یہ جرأت؟

عورت :- امیر امیر مجھے میرے دکھ میری چاہت نے اندھا کر دیا ہے۔ رحم کرو اور مجھے جانے دے۔ میری بیکسی اور مظلومیت کو دیکھ آج میرا دنیا میں کوئی نہیں میرا خاوند چار مہینے ہوئے مر گیا اور میرا گھر چوروں نے لوٹ لیا۔ اب میری زندگی کو بھی بے نور کیا جا رہا ہے۔

سہاس :- ہمارے کان ایسی بلبلاہٹ پر دل کو جنبش نہیں دے سکتے تم نے گناہ پہ گناہ کیا ہے۔ جس کا کفارہ تمہیں ابھی ادا کرنا ہوگا۔

عورت :- گناہ؟

سہاس :- ہاں تم نے امیر حاضرہ کے بیٹے کو قتل کرنے کی غرض سے ہاتھ اٹھایا جسکی سزا میں تمہیں ہم جلتی ہوئی ریت پر ننگی کمر گھسیٹنے کا حکم دیتے ہیں۔ (غلاموں سے) صطیان اور مردک لیجاؤ اسے اپنے کئے کا مزہ چکھاؤ۔

(دونوں غلام مجمع سے نکل کر اسکے بازو پکڑ لیتے ہیں)

عورت :- لیکن میرا سوال۔

سہاس :- (غصے میں) تیرا سوال؟ وہ کبھی کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا۔ آفتاب

مشرق کی بجائے مغرب سے نکلے دریائے نیل الٹا بہے آسمان ارض خاکی پہ آ بچھے تو بچھے لیکن سہاس اس رسم کو توڑکر اپنی ناک کٹوانا نہیں چاہتا۔ قدیم بزرگوں کی راہ چھوڑکر اپنے قبیلے سے جنگ کرنا نہیں چاہتا۔

عورت :۔ لیکن میری مصیبت اور نادار بچوں کو تو دیکھو۔

سہاس :۔ دیکھ چکا۔

عورت :۔ رحم کر۔

سہاس :۔ نہیں ہو سکتا۔

عورت :۔ رحم کر۔ امیر رحم کر۔

سہاس :۔ ہرگز نہیں۔

عورت :۔ میں التجا کرتی ہوں۔۔

سہاس :۔ (کانوں میں انگلی دیکر) میں کانوں کو بند کرتا ہوں۔

عورت :۔ (پلا پھیلاکر) میں دامن پھیلاتی ہوں۔

سہاس :۔ (اس میں تھوک کر) میں اس میں تھوکتا ہوں۔

عورت :۔ (دامن پکڑکر) میں تیرا دامن پکڑتی ہوں۔

سہاس :۔ (جھٹک کر) میں جھٹکتا ہوں۔

عورت :۔ (ہاتھ جوڑکر) میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔

سہاس :۔ (منہ پھیرکر) میں منہ پھیرتا ہوں۔

عورت :۔ (پاؤں پکڑکر) میں پاؤں پکڑتی ہوں۔

سہاس :۔ (ٹھوکر مارکر) میں ٹھوکر مارتا ہوں۔

عورت :۔ امیر بخشدے میری بدحالی پر ترس کھاکر میری زندگی بخشدے۔

سہاس :۔ بخشی جائیگی لیکن دو چار جرمانے کے داغ دیکر۔

{عورت ایک دم صورت حالات کو پلٹتی ہوئی خلاف توقع کھلکھلاکر ہنس پڑتی اور قہقہہ پر قہقہہ مارکر عوام کو عجیب حیرت میں ڈالتی ہے}

عورت :۔ خوب۔ سہاس۔ سفاہان۔ صفیان۔ مردک اہل قبیلہ سب فریب کے دام میں گرفتار ہوگئے۔ دیکھا امیر کیسا جال بچھایا؟

(سب حاضرین تعجب سے آنکھیں مل مل کر دیکھتے ہیں)

سہاس :۔ جال؟ دھوکہ؟ آخر تم ہو کون؟

عورت :۔ میں خزانشن کی محبوبہ زہرہ۔

سہاس :۔ (آنکھیں مل کر دیکھتے ہوئے) ہیں۔ زہرہ؟ غلط کوئی ثبوت۔

{عورت لوگوں کو جو فوراً حیرت سے اسکے گرد جمع ہوگئے تھے پیچھے ہٹاکر ایک خنجر اپنی کمر سے نکال کر سہاس کے سامنے پھینک مارتی ہے}

عورت :۔ یہ دیکھو۔

(سب لوگ اس راز کو جاننے کے لئے خنجر کی طرف دوڑ لیتے ہیں میدان صاف ہو جاتا ہے اور وہ فرار ہو جاتی ہے۔ سہاس اور سب حاضرین اس خنجر کو دیکھتے ہیں مگر کوئی خاص ثبوت نہ پاکر استفسارانہ نگاہوں کے ساتھ پلٹتے ہیں لیکن عورت وہاں سے غائب تھی۔ امیر خوفناک ہوکر تعاقب میں دوڑتے ہیں مگر اس پراسرار عورت کا کہیں پتہ نہیں چلتا......

چھٹا منظر

دربار رنجیہ سلطانہ۔ آراستہ ہے خدام مؤدب حاضر ہیں۔

وزیر :۔ کیا سلطانہ۔

سلطانہ :۔ ہاں بزرگ آج ہم اسی دلچسپ کارروائی کو سننے بیٹھے ہیں۔

بڈھا وزیر :۔ کیا نتیجہ نکلا۔

سلطانہ :۔ نتیجہ؟ جیسکی امید تھی سہاس اپنی جہالت کو نہ چھوڑ سکا اور امتحان میں ناکام رہا حالانکہ وہ سوال وہی تھا جس کا سوال اس نے ہم پہ ڈال رکھا ہے۔ اگر وہ اس بات کو سمجھ لیتا آفریں تھا لیکن اب تو وائے ہے اور صد وائے۔

وزیر :۔ (مسکراکر) حالانکہ وہ امیر قبیلہ ہے۔

ملکہ :۔ وزیر صاحب ایک قاصد کے ہاتھ لکھ بھیجو کہ وہ جلدی آکر مانگے ہوئے ناطے کا فیصلہ کریں۔

وزیر :۔ جو حکم۔

ساتواں منظر

مکان سہاس :۔ (سہاس دروازے میں ایک طرف چوکھٹ سے پیٹھ لگائے سوچ رہا ہے سفاہان کئی سواروں سمیت آکر رکتا ہے اور باپ کے پاس آتا ہے۔

سفاہان :۔ ابا..... ابا.... اسکا کوئی سراغ نہیں ملا۔

سہاس :۔ (تنگ کر) کوئی پتہ نہیں مت میرے کلیجے میں خنجر گھونپ کر میرے بھرے دربار میں مجھے ہی گالیاں دیکر کوئی چھین اور آرام کی نیند سوئے اور اپنی کامیابی پر خوش ہو...... تف ہے ایسے جینے پر لعنت ایسی زندگی پر۔ جاؤ سارے قبیلے کو اس فریبی عورت کی تلاش کے لئے نکالدو۔ ریگستان کے اونچے اونچے ٹیلوں پہ دھواں کردو تاکہ دوسری بستیاں بھی اس خطرے سے خبردار رہیں اور اس بازپرس کے لئے ہمارے حاضر آئیں۔ اور ہم ان سے اس گستاخی اور سرکشی کا ذکر کرکے اس دھوکہ باز کی گرفت میں مدد لیں۔ (جانے لگتے ہیں)

سہاس :۔ سفاہان تم ٹھیرو۔ باقی جاؤ۔ (عمل)

{سہاس بیٹے کے شانوں پر اپنی آستین مجانہ پھینک کر قدم بقدم اندر کو چلتا ہے اور سمجھاتا ہے۔}

سہاس :۔ سفاہان۔ آج پھر تجربہ کا قاصد آچکا ہے۔ اس سلسلے میں میرا دل دھڑکتا ہے

قسم ہے مجھے اپنے باپ کی جس نے میری پرورش کی اور بہادر بنایا۔ اس عشق کی ترنگ ساتھ نیاں خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہیں تمہاری یہ ننھی سی جان برباد نہ ہو۔ تم اپنی ضد سے باز آؤ۔ معلوم ہے کس رواج اور رسم پر پابند ہے تم جانتے ہو ہمارا قبیلہ اپنی مراسم قدیم پر کاربستہ ہے اور اسی لئے تمام قبیلے والے کسی کو ترک رسم کی سزا اتنی کڑی دیتے ہیں جتنی کہ تم جانتے ہو اور دیکھ چکے ہو ...... دیکھو سفاہان تم میرے ضعیفی کا سہارا ہو تم میرے بڑھاپے کی لاٹھی ہو۔ جیسے ٹیک ٹیک کر میں چلتا ہوں تم مجھ ماندے کی آنکھوں کا نور ہو اگر تم نے جو ایک اجنبی آزاد کردہ سے میری البیت اور مراسم قبیلہ کے خلاف کوئی لفظ کہدیا۔ تو غیرت برداشت نہ کرسکیگی اور خواہ مخواہ تمہاری عزیز جان کو باپ حسرت بھری نگاہوں سے خاک و خون میں تڑپتا دیکھیگا۔

سفاہان :- ابا سے

پھرتی نہیں ہے بات جو منہ سے نکل گئی تقدیر کی چھری تھی جو چلنی تھی چل گئی

سہاس :- بیٹا میں نے تمہیں ہزاروں دعاؤں سے پایا ہے لاکھوں منتوں سے حاصل کیا ہے۔ کروڑوں التجائیں ایک تمہاری ہستی کے لئے کرنی پڑیں۔

سفاہان :- تمہاری آرزوئیں پوری ہو چکیں لیکن میں بھی تو آرزو لیکر پیدا ہوا ہوں۔ میری امیدیں پوری کرنا تمہارا فرض ہے۔

آٹھواں منظر

دربار نجمہ سلطانہ :- دربار آراستہ ہے خدام حاضر ہیں اور وزیر اور سہاس داخل ہوتے ہیں۔ اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھتے ہیں۔

نقیب :- دگھڑیال پر گھنٹہ لگا کر) ملکہ عالیہ! (سب دبا دیکھکر مودب ہو جاتے ہیں اور ملکہ آکر سریر آرا ہوتی ہے)

ملکہ :- سپیو۔ کچھ دیر توقف کے بعد) آج ہم اپنے مہمان سہاس امیر طاہرہ کی آمد پر بہت خوش ہیں۔

سہاس :- سلطانہ میری آمد بہت پر اسرار ہے۔ ملکہ :- یعنی

سہاس :- آجکل ہمارا قبیلہ پریشان حال ہے ایک سرکش و گستاخ عورت کی گرفتاری میں لگا ہوا ہے۔

ملکہ :- اس سے کیا قصور سرزد ہوا ؟

سہاس :- اس نے امیر قبیلہ کو دھوکہ دیتے ہوئے اسکو بلا وجہ فریب کے جال میں پھنسا کر اسکی ہتک کی اور قبیلے کی آبرو ملیامیٹ کر رکھدی۔

ملکہ :- اگر اس بارے میں نجمہ کوئی مدد کر سکتی ہو۔ سہاس :- تو سارا عاصرہ اسکے آگے سر جھکادے۔

ملکہ :- کسی زنجیر کا انتظام کرو ہم مجرمہ کو پیش کرتے ہیں۔

(سہاس شمشیر کھینچ کر آگے بڑھتا ہے ملکہ تخت سے نیچے قدم قدم آتی ہے ......)

ملکہ :- شمشیر کھینچ لی کیا اسکو قتل کرو گے ؟

سہاس :- جس نے سہاس کی کھلم کھلا بے عزتی کی ہو اسکا زندہ رہنا دشوار ہے۔

ملکہ :- اگر وہ تم سے زیادہ طاقتور ہو۔

سہاس :- یہ جب میدان میں اترآئیگی دیکھ لیگی کہ شمشیر عرب کی کاٹ کتنی پھرتیلی ہے۔

(ملکہ عین امیر کے پاس آ کھڑی ہوتی ہے)

ملکہ :- مجرم حاضر ہے اگر حکم ہو تو سر جھکادے۔ سہاس :- ہیں ! نجمہ ! (حیرت سے دیکھتا ہے)

ملکہ :- شاید یہی تمہاری بے عزتی کرائی ہے۔ سہاس :- اے سلطانہ ہمیں یاد آگیا تھا ہم نے ایک شیخ ...... نجمہ :- واپس تخت پر جاتی ہے۔ ملکہ :- کیا کیا نجمہ نے ؟

سہاس :- شاید اپنا وعدہ پورا کیا اور سہاس کا امتحان لیا۔ نجمہ :- لیکن تم ناکام رہے نا ؟

سہاس :- (منہ کی) اس بیجا امتحان اور آزمائش میں میری ہار اور ناکامی ظاہر ہے ہمارا امتحان نہیں رسم قدیم کا سوال تھا۔

نجمہ :- بھولے امیر اگر دنیا میں لڑکیاں پیدا ہوتے ہی اسی طرح دبا دی جائیں۔ تو پھر تمہاری نسلیں کہاں سے بڑھیں کس سے تم عیش کرو اور کیسے دیوتا تمہاری دعائیں قبول کریں بیٹی دینے کے لئے ہمیں بیٹوں کے بچانے کی ضرورت ہے تمہارے قدموں میں گرنے کی نہیں۔

(سہاس سوچ و فکر اور پشیمانی میں سر بہ خم ہے)

ملکہ :- آج کے بعد سفاہان کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ اسکا باپ ایک لکیر کا فقیر ہے اسکے دماغ میں کچھ سوچنے سمجھنے کا گودا نہیں۔ اور وہ خود سنگدل ہونے کی وجہ سے ایک نازک زمین کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے قابل نہیں۔ اسلئے وہ نجمہ سلطانہ کی لخت جگر سلیمیا سے عشق کرنا چھوڑ دے۔ سہاس کو بیٹے کی تجویز کا تصور آتا ہے

سہاس :- ملکہ وہ میرا بیٹا ہے۔ وہ میری تمام عمر کی کمائی ہے نجمہ :- تو میں کیا ہوں ؟ سہاس :- اسکی جان بخشی کیجئے۔

نجمہ :- اس ننھی سی بیچاری دنیا کی زندگیوں کے منہ لئے ہیں تم ان معصوموں پر رحم نہیں کرتے جو اپنی لخت جگر پیدا ہوتی ہیں۔

سہاس :- (عجز سے) ہمیں نہیں سلطانہ رحم کر۔ نجمہ :- ہرگز نہیں۔ سہاس :- میری ضعیفی کو دیکھ لے۔

نجمہ :- دیکھ چکی۔ سہاس :- رحم کر رحم کر۔ نجمہ :- نہیں ہو سکتا (ملکہ جوش میں تخت سے نیچے آجاتی ہے)

سہاس :- میں التجا کرتا ہوں۔ نجمہ :- (کان بند کرکے) میں کانوں کو بند کرتی ہوں۔

سہاس :- (دامن پکڑ کر) میں دامن پکڑتا ہوں۔ نجمہ :- (جھٹک کر) میں جھٹکتی ہوں۔

سہاس :- (ہاتھ جوڑ کر) میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ نجمہ :- (منہ پھیر کر) میں منہ پھیرتی ہوں۔

سہاس :- (پاؤں پکڑ کر) میں پاؤں پکڑتا ہوں۔ نجمہ :- (ٹھوکر مار کر) میں ٹھوکر مارتی ہوں۔

سہاس :- سلطانہ بخشدے میرے بڑھاپے کی پونجی بخشدے۔

نجمہ :- تم اس سے کوئی سلوک کرو لیکن ہم اپنی بیٹی کو جان بوجھ کر کی باتیں دکھانا نہیں چاہتے۔

(ملکہ اٹھ کر محل سرا میں داخل ہو جاتی ہے سہاس مایوس لوٹتا ہے)

نواں منظر

مکان امیر سہاس :- (سفاہان ایک کمرے میں۔ تصورات کی دنیا میں گم ہے سہاس بدحال اور شکستہ داخل ہوتا ہے)

سفاہان :- ابا کیا خبر لائے (بڑھتا ہے)۔ سہاس :- ہاں آگیا۔ تیرے لئے موت کا پیغام اپنے ہاتھوں کر آگیا۔

(سفاہان ایک دم سہم جاتا ہے۔ باپ بیٹے پر آخری نظر ڈال کر رخصت ہوتا ہے)

دسواں منظر :- میت رکھی ہوتی ہے عوام کا مجمع ہوتا ہے قبیلے کے سردار مقررہ نشستوں پر بیٹھے ہیں نجمہ کو نہدی خانے سے لانے کے لئے غلام جاتے ہیں۔ اور چند منٹ کے بعد ایک لاش سہاس کے قدموں میں لا کر ڈال دیتے ہیں۔ لاش نوجوان سفاہان کا بے جان تابوت تھا جس کے سینے میں ننھا سا خنجر گڑا ہوا تھا اور ایک لہو کی دھار سینے کی پسلیوں پر سے بہتی ہوئی بستر تا بغل پر سرخ نشان بناتی جارہی تھی۔

(سہاس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپک رہے تھے اور آنکھیں بے نور تھیں)

علامہ سید سلیمان ندوی

کچھ قصے یوں کو یاد ہیں کچھ بلبلوں کو حفظ ✦ عالم میں ٹکڑے ٹکڑے تری داستاں کے ہیں

مختصر حالات و خدمات

علامہ سید سلیمان ندوی کی ولادت ۱۸۸۵ء میں دیسنہ ضلع پٹنہ میں ہوئی جو صوبہ بہار میں سادات کا ایک مردم خیز خطہ ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مولانا دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ ابتدائی صرف نحو کی تعلیم اپنے وطن دیسنہ پھلواری شریف اور دربھنگہ میں حاصل کی ــــ دار العلوم ندوہ میں ان کی اصل تعلیم شروع ہوئی، مولانا فاروق چڑیا کوٹی، مولانا حفیظ اللہ (تلمیذ خاص مولانا عبدالحی فرنگی محلی)، اور مولانا عبداللطیف صاحب صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ وغیرہ مشاہیر اساتذہ کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم سے خاص طور پر مستفیض ہوئے۔ اور علوم مشرقی میں نمایاں استعداد پیدا کی۔

سید صاحب کی تیز فہمی، تبحر علمی اور وسعت نظر کی بے پناہی نے پہلے ہی سے علامہ شبلی، مولانا حالی، نواب محسن الملک جیسے سربرآوردہ لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا ــــ

تعلیم کے بعد ہی مولانا دار العلوم ندوۃ العلماء میں، علم کلام، اور جدید عربی ادب کے استاد مقرر کر دیئے گئے، اسی زمانہ میں آپ نے عربی ریڈریں (دروس الادب) مرتب کیں ــــ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد "ندوۃ العلماء" نے "اغلاط تاریخیہ" کی تصحیح کا شعبہ قائم کیا ــــ یہ شعبہ بھی سید صاحب ہی کے سپرد ہوا۔ موصوف نے اس شعبہ کے نگراں کی حیثیت سے بہت قابل قدر خدمات انجام دیں ــــ

تصنیف و تالیف کا ذوق طالب علمی سے پیدا ہو چکا تھا چنانچہ تعلیم کے دوران ہی میں آپ نے لکھنا شروع کر دیا تھا ــــ سب سے پہلا مضمون "وقت" کے عنوان سے مخزن لاہور میں شائع ہوا اور دوسری تقریر "علم اور اسلام" کے عنوان سے علیگڑھ کے منتھلی میگزین میں ایڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپی۔ یہ تقریر علمی طبقہ میں بہت زیادہ پسند کی گئی۔ اس کے بعد آپ کی شہرت آہستہ آہستہ بڑھنے لگی ــــ

۱۹۰۶ء میں الندوہ کے نائب مدیر مقرر کر دیئے گئے اور متعدد قابل تعریف مضامین مثلاً امام بخاری کے حالات، وغیرہ لکھے جن کی مولانا شبلی اور مولانا حالی نے بہت زیادہ داد دی ــــ الندوہ کا سب ایڈیٹر ہونا ہی مولانا کی غیر معمولی قابلیت کی کافی ضمانت ہے اس لئے کہ الندوہ اس وقت ہندوستان میں اپنے طرز کا پہلا پرچہ تھا جو اپنی ترتیب اور مواد کے لحاظ سے اس وقت کے بلند پایہ انگریزی رسائل سے ٹکر لیتا تھا مولانا کی وسعت مطالعہ کا اندازہ اس عہد کے مضامین سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت بھی کتنے باخبر تھے، اور جوبات کہتے تھے کتنے علمی اذعان کیساتھ کہتے تھے ــــ حیات مالک اور سیرت عائشہ اسی عہد کی یادگار ہیں گو ان کی اشاعت بعد کو عمل میں آئی ہے ــــ

۱۹۱۰ء میں الہلال کلکتہ کے ایڈیٹوریل بورڈ میں بلکر شریک ہو گئے اور متعدد قابل تعریف مضامین مثلاً مشہد اقدس، وغیرہ لکھے بلکہ ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی نعمانی کے خلاف قدامت پسند ارکان ندوہ کی کامیابی اور اس سلسلے میں مولانا کی علیحدگی پر طلباء اور ہمدردان اصلاح ندوہ نے جو زبردست جدوجہد کی دار العلوم میں اسٹرائک اور سارے ملک میں جو زبردست احتجاجی جلسے منعقد ہوئے اس میں آپ نے نمایاں حصہ لیا ــــ اور بے شمار ہنگامی مقالے لکھے ــــ بالآخر ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ کے مقام پر فریقین کے درمیان سمجھوتہ ہوا ــــ اور دار العلوم کے نئے دور کا آغاز ہوا، اور مولانا موصوف اس وقت مجلس ندوہ کے رکن منتخب ہوئے جس کا سلسلہ برابر قائم ہے۔ ۱۹۱۵ء میں "انجمن ترقی اردو" کے سالانہ اجلاس منعقدہ پونہ کی صدارت کی اور اس میں وہ خطبۂ صدارت پڑھا جو آگے چل کر اردو کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوا۔

۱۹۲۳ء کے قریب دار العلوم مذکور کے معتمد تعلیمات مقرر ہوئے، اور اب تک اس عہدہ پر فائز ہیں بلکہ ۱۹۲۹ء سے تو دار العلوم کے آمر مطلق ہیں۔ مجلس ندوۃ العلماء نے ایک تجویز کے ذریعہ دار العلوم کے تمام تعلیمی اور تنظیمی اختیارات سپرد کر دیئے ہیں اب آپ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق دار العلوم کو چلا رہے ہیں۔

دار العلوم مذکورہ کے علاوہ ۱۹۱۳ء میں مولانا بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت "دکن کالج پونہ" میں السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر رہے۔ علامہ شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد موصوف وہاں سے اعظم گڈھ تشریف لائے اور دوسرے رفقا کے ساتھ دار المصنفین قائم کیا۔ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت میں مولانا محمد علی مرحوم کے ساتھ یورپ تشریف لے گئے، اور انگلستان، اٹلی، فرانس وغیرہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی وکالت کی ــــ ۱۹۲۶ء میں مولانا محمد علی کے ساتھ وفد حجاز میں تشریف لے گئے اس مرتبہ وفد کے صدر آپ ہی تھے۔ اس سے پہلے ۱۹۲۵ء میں مولانا

فکر ندوی

عبد الماجد بدایونی اور مولانا عبد القادر قصوری کے ساتھ رئیس وفد کی حیثیت سے حجاز گئے تھے تاکہ حکومت حجاز کے سامنے مسلمانانِ ہند کا نقطۂ نظر پیش کریں، اسی زمانہ میں شریف حسین اور سلطان ابن سعود کے درمیان جنگ کا سلسلہ جاری تھا، شریف حسین حجاز سے روانہ ہو چکے تھے ——— عربوں کی ایک جمہوری حکومت کے قیام کے مسئلہ پر ناکامی کے بعد آپ مصر پہنچے، اور وہاں کے علماء اور اکابر سے حجاز کے مسئلہ پر بات چیت کی۔ اس گفتگو کا نتیجہ ہوا کہ "شیخ ازہر" نے ان تجاویز پر اپنی رضامندی ظاہر کی ———

۱۹۲۶ء کی "موتمر عالم اسلامی" کے نائب صدر منتخب ہوئے اور بڑی جرأت سے صحیح خیالات پیش کئے اور "خلافت و امامت" کے دشوار مسائل پر بے لاگ خیالات پیش کئے ——— ۱۹۲۰ء سے خلافت کی تحریک میں شریک رہے۔ دہلی کی اسپیشل خلافت کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ وہ خطبۂ صدارت آجتک ضرب المثل ہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کے صدر منتخب ہوئے اور معرکۃ الآرا مسائل پر اپنی رائے ظاہر کی اور متعدد تعمیری اور اصلاحی قابل قدر تجویزیں پیش کیں ——— ۱۹۳۳ء میں شاہ افغانستان کی دعوت پر ڈاکٹر اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ کابل تشریف لے گئے تاکہ اہم تعلیمی مسائل پر بادشاہ اور ان کی حکومت کو صحیح مشورہ دیں۔

"دار المصنفین" و "معارف"

سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ "دار المصنفین" ہے۔ دار المصنفین اور اس کے ترجمان رسالہ "معارف" کے ذریعہ ملک و قوم کی جو دماغی خدمات آپ نے انجام دی ہیں وہ تذکرہ سے بے نیاز ہیں۔ اور آپ کی نظامت میں دار المصنفین نے علوم اسلامیہ کی تبلیغ اور اشاعت میں جو ہمت صرف کی ہے کوئی ادارہ اسکی ہمسری نہیں کرسکتا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ادارہ نے اسلامی ثقافت کا ایک گرانقدر سلسلہ جاری کیا ہے، جو اردو داں نسلوں کے لئے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے ——— سیرۃ النبی اور مشاہیر اسلام کی سوانح عمریاں و تمام مسلمانوں کی ہدایت کے لئے لکھی گئی ہیں وہ اس ادارہ کے لئے سرمایۂ ناز ہیں ——— اس ادارہ کی علمی تصانیف کی تعداد اور اہمیت دوسرے اداروں کے مقابلہ میں بہت بڑھی ہوئی ہے ——— مختصر یہ کہ آج جتنی بولنے والی زبانیں اور سوچنے والے دماغ اور اسلامیات پر لکھنے والے قلم ہیں اُن سب کی تعمیر اور تربیت میں "دار المصنفین" اور "معارف" نے بڑا حصہ لیا ہے۔ ——— ان سب کو گویائی اور اندازِ فکر "معارف" نے بخشا ہے۔ "معارف" ہی کے مقالوں نے نفسیاتی طور پر اس قسم کی فضا پیدا کی کہ لوگوں نے پھر سے اسلامی تاریخ اور علوم معارف کو عزت اور توقیر کی نگاہ سے دیکھنا شروع کردیا۔

ذاتی خصوصیات

پست قد، دہرا بدن، گورا رنگ، بڑی آنکھیں سفید ڈاڑھی، آواز سریلی اور دلکش، مزاج میں تمکنت اور وقار، فہم و دانش کی معانی بیان کی دلکشی اور شیرینی ایسی خصوصیات ہیں جو بیک وقت بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہیں۔ مولانا کی فیروز بختی کا سب سے تابندہ پہلو یہ ہے کہ فطرت نے انھیں جس فیاضی سے مختلف النوع صلاحیتیں بخشی ہیں، اس کی مثال دوسروں میں نہیں ملتی، فکر و نظر کا بہترین امتزاج اور جامعیت آپ کی نہادی خصوصیات ہیں ——— بحیثیت انسان آپ کے اندر بہت سی قابل قدر صفات ہیں، کوئی شخص آپ سے مل کر کبھی ناراض اور ناخوش نہیں ہوسکتا ——— گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑی شخصیت سے ہم مصروف گفتگو ہیں۔ مگر تصنع اور بناوٹ نام کو نہیں، موصوف کی سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ کبھی کوئی لطیفہ کہتے ہیں تو اس میں بھی ایک گونہ سنجیدگی پائی جاتی ہے اور ہنستے ہیں تو اس میں بھی ایک وقار۔ قوت حافظہ کا یہ حال ہے کہ آج بھی عربی فارسی کے لاکھوں اشعار اور قلمی کتابوں کے صفحے کے صفحے حفظ ہیں، سید صاحب کے اس غیر معمولی حافظہ کو دیکھکر امام بخاری اور امیر ابن عبد العزیز اندلسی کا دھوکا ہوتا ہے، مولانا کی یکتائے روزگار خصوصیت ان کی شخصیت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ بلاد اسلامیہ کے علماء میں بھی اسی طرح مقبول ہیں جس طرح کہ ہندوستان کے علماء فضلاء میں فکر و تدبر وسعت نظر اور تبحر علمی ایسی خصوصیات ہیں جو آپ کو دوسرے معاصرین سے ممتاز کرتی ہیں۔ موصوف کی گفتگو بہت مدلل باضابطہ اور ایسی سلجھی ہوئی ہوتی ہے کہ فوراً ذہن نشین ہوجاتی ہے۔ جن لوگوں کو موصوف سے گفتگو اور بات چیت کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی گفتگو علمی مسائل پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی آپ "روس"، "امریکہ"، "مشرق بعید" اور "مشرق وسطیٰ" کے متعلق عالمانہ انداز میں پر از حقائق تبصرہ فرمایا کرتے ہیں۔ مولانا کی شخصیت میں اتنا جذبہ ہے کہ آپ کی ہر جگہ تعظیم کی جاتی ہے، تبحر علمی اور مطالعہ کی کثرت نے آپ کی طبیعت کا رجحان سوچ بچار کی طرف کردیا۔

تصانیف

مولانا کی تصانیف بہت ہیں، اس وقت تک جو شائع ہوچکی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

دروس الادب (عربی ریڈریں) لغات جدیدہ (جدید عربی لغات) ارض القرآن سیرۃ عائشہؓ، حیاتِ شبلی، خیام، حیاتِ مالک، خطباتِ مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہازرانی۔ خلافت اور تعلیم کے اہم موضوع پر چند رسالے بے شمار علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی اور فلسفیانہ مضامین لکھے۔ "جو مخزن" علیگڑھ کے "منتھلی میگزین" "الندوہ" "الہلال" اور "معارف" میں شائع ہوچکے ہیں۔ اور عربی مضامین بلاد اسلامیہ کے جرائد اور مجلات میں۔ ابھی حال ہی میں آپکے ادبی مضامین کا مجموعہ "نقوش سلیمانی" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ سید صاحب کو اپنی زندگی ہی میں اپنی کاوشوں کا صلہ مل گیا۔ موصوف کی بیشتر تصانیف ایسی ہیں

کرجن کے صلے میں علمی، ادبی اداروں، اور والیان ریاست کی جانب سے گرانقدر انعامات پیش کئے گئے ہیں "خیام" کے چھپتے ہی علمی ادبی حلقوں میں ایک ہلچل مچ گئی ہر طرف سے مبارک باد کے پیغام موصول ہونے شروع ہو گئے، چنانچہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے "خیام" کو سال کی بہترین تصنیف قرار دیتے ہوئے سید صاحب کو پانچسو روپے انعام دیئے اور ایرانی، کابلی، اور یورپین اہل علم نے بھی اس کی بہت داد دی، اور شاندار تعریفی نوٹ اور تبصرے لکھے ——— اور خطبات مدراس کے معاوضے میں "اسلامی جنوبی ہند کانفرنس" نے ایک ہزار روپے کی گرانقدر رقم پیش کی، اور دوسرا مجموعہ "عرب و ہند کے تعلقات" ہندوستانی اکیڈمی کی فرمائش پر مرتب کیا گیا تھا اس کے ہندی اور انگریزی میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ اکیڈمی نے اس مجموعہ کا معاوضہ ایک ہزار ادا کیا۔ اور تیسرا مجموعہ "عربوں کی جہازرانی" کے معاوضہ میں بمبئی گورنمنٹ نے پانچسو روپے پیش کئے، اور سیرۃ عائشہؓ کے صلے میں علیا حضرت سرکار عالیہ بیگم صاحبہ بھوپال نے پانچسو روپے مرحمت فرمائے، حضرت مولانا کی تصانیف میں "سیرۃ النبیؐ" "ارض القرآن" "خطبات مدراس" اور "خیام" بہت اہم ہیں، لیکن ان میں بھی موصوف کی زندگی کی بہترین کاوش "سیرۃ النبی" ہے، صحت، جامعیت اور ادبیت کے لحاظ سے اردو زبان میں اس سے بڑھ کر کوئی اور کتاب نہیں ہے بحیثیت مجموعی سیرۃ النبی اپنے دور کی بہترین تصنیف ہے۔ اس کا انداز بیان بہت صاف اور موثر ہے۔ مولانا نے سلامت روی اور اعتدال پسندی کے رشتہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور جو کچھ لکھا ہے بہت سوچ سمجھ کر تحقیق اور تنقید کے ساتھ لکھا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر سبقت قلم سے کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں، بہت ممکن ہے کہ مولانا کو سہو ہو گیا ہو ——— لیکن یہ فروگذاشتیں بہت معمولی ہیں جن سے شاید کسی مصنف کی کتاب بھی خالی نہیں ہو سکتی۔ اس سے اصل کتاب کی اہمیت اور واقعیت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔

اسلوب نگارش کی خصوصیات

مولانائے موصوف مذہبی عالم، مورخ، اور سیرت نگار کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں لیکن سید صاحب کی ان حیثیتوں کے علاوہ ایک اور خصوصیت بھی ہے، جس کا ابھی کافی طور پر اظہار نہیں ہوا، اور اگر ہوا ہے تو نہ ہونے کے برابر، اور اس میں مولانا کے حقیقی رتبہ کا بھی اعتراف نہیں کیا گیا، میرا مطلب مولانا کے انداز نگارش کی خصوصیات سے ہے۔ موصوف کا اسلوب بیان اردو کے اسالیب بیان میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ موصوف ہندوستان کے صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ شروع میں انھوں نے اردو کے عناصر خمسہ میں "عنصر اعظم" علامہ شبلی کا تتبع کیا اور انہی کے طرز تصنیف و تالیف پر کام شروع کیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ خود ان کا اپنا ایک علیحدہ طرز قائم ہو گیا۔ جو بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔ طرز تحریر نمایاں طور پر دلکش ہوتا ہے،

مفہوم کی ادائگی کے لئے مختلف انداز بیان، ہم معنی الفاظ کے لیے بہت بھلی معلوم ہوتی ہے اور عبارت بہت مربوط ہوتی ہے۔ ان کے طرز تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تراکیب اور بندشیں، تشبیہات و استعارات عربی اور عجمی انداز کے ہونے کے باوجود دماغ پر گراں نہیں گذرتے۔ ان خصوصیات کے باوجود حضرت مولانا کی تصانیف اور زندگی پر جا بجا نظر کرنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف نے اپنی زندگی میں اپنے آپ کو کبھی "ادیب"، اور "انشاپرداز" کی حیثیت سے پیش نہیں کیا ہے۔ وہ درحقیقت "خیالات و افکار" کے شہنشاہ ہیں۔ عبارت آرائی انکی لونڈی ہے، اور اسلوب نگارش ان کا غلام ———

مولانا کی تحریروں میں عربی، فارسی، اور اردو کے اشعار کا استعمال بھی بکثرت نظر آتا ہے۔ اور آیات قرآنی اور احادیث کا استعمال موصوف کی خاص خصوصیت ہے۔ موصوف کی تحریروں میں تصنع و بناوٹ نام کو نہیں بلکہ پورا پورا خلوص نمایاں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جوش و تاثرات خصوصیت بن گئے ہیں۔ نثر اسقدر مترنم اور شگفتہ ہوتی ہے کہ ہر شخص اس سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی مصنف خیالات کے ہجوم سے پریشان ہو جاتا ہے تو اس کی تحریروں میں ربط اور تسلسل نہیں رہتا، مگر موصوف پیچیدہ پیچیدہ مسائل کو اپنے مخصوص انداز میں کمال صحت اور روانی کے ساتھ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی تسلسل میں فرق نہیں آتا۔ مولانا کی تحریروں میں موضوع کی اہمیت اور نفسیاتی عظمت کے اعتبار سے خوبصورت سے خوبصورت الفاظ لائیں گے موصوف خشک سے خشک موضوع پر بھی شوکت بیان اور رنگینی تحریر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ خلاصہ یہ ہے جس علمی نثر نگاری کی ابتدا ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی نے کی تھی اور سرسید، علامہ شبلی اور مولانا حالی جس کو سادگی، تجزیہ اور تحقیق و تحلیل کی وادیوں سے لے کر گذرے تھے آج اس کو مولانا نے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا ———

اس مختصر سے مقالہ میں حضرت مولانا کی تصانیف اور مقالات علمیہ اور ادبیہ پر سیر حاصل بحث کرنا، اور ان کی ضخیم تصانیف کے شاہکار اقتباسات پیش کرنا ناممکن اگر نہیں تو دشوار ضرور ہے اور مسائل کی تنگ دامانی کے پیش نظر تو قطعی ناممکن ہے۔ البتہ تھوڑی دیر کے لئے ہم آپ کی توجہ موصوف کے اس خطبہ کی جانب مبذول کرائیں گے جو افغانستان کی "انجمن ادبی" کے ایڈریس کے جواب میں دیا گیا تھا اور جس میں سرراس مسعود اور ڈاکٹر اقبال جیسی نامور ہستیاں شریک تھیں جو اجتماعی اور انفرادی دونوں حیثیتوں سے موثر ثابت ہوا تھا اور جس سے ملت اسلامیہ میں اس "ہندی ادیب" کی تہذیب و ثقافت کے علم کا اندازہ ہے۔ ہندوستان اور افغانستان کے ڈیڑھ سو سالہ قدیم اتحاد، اور انکی اہمیت

اور ضرورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا :-

" برادران علم و فن ! ہندوستان اور افغانستان دو جداگانہ سلطنتیں نہ تھیں ، بلکہ ایک تھیں ، شاید ڈیڑھ سو سال کا عرصہ ہوا ہوگا جبکہ ان دونوں ملکوں میں تفرقہ پیدا ہوا۔ یہ دونوں ملک قدیم دورِ حکومت میں ایک رشتہ میں منسلک تھے جیسا کہ آپ کے ملک میں اس اتحاد کی سنگی یادگاریں آپکے میوزیم میں موجود ہیں۔ آغاز عہد اسلام سے تنہا آپ ہی تھے جن کے ذریعہ نہ صرف مذہب بلکہ علم و فن بھی ہندوستان کے قلب میں داخل ہوئے۔ سلاطین غزنی اور شاہان غور یہاں رہتے تھے لیکن انکی حکومت کا دائرہ ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا اسی طرح بابر کا خاندان ہندوستان میں مقیم تھا لیکن اس کا دائرہ افغانستان تک تھا۔ اور یہ دونوں حکومتیں ایک شہنشاہی کے لئے ایسی تھیں جیسے ایک جسم کے لئے دو ہاتھ ہوتے ہیں۔ آج ڈیڑھ سو سال کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ دونوں بالخصوص اتحاد علمی و ادبی باہمی محبت اور استحکام کیلئے پھر مخلصانہ بڑھ رہے ہیں۔ افغانی بھائیو! آپکے بزرگوں نے ہندوستان میں صرف جسمانی اور مادی حکمرانی نہیں کی ہے۔ بلکہ معنوی اور ذہنی حکومت بھی قائم کی ہے۔ فارسی زبان مدت تک ہندوستان کی ادبی اور علمی زبان رہی ہے۔ اور اب بھی ہے یہ زبان صرف آپکے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہے۔ آپ کے علما میں میرزا ہد جو آپکے ہرات کے رہنے والے تھے انکے رسائل و تصانیف تین سو سال سے ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں فلسفہ کے اسباق کا انتہائی معیار ہیں۔ فارسی زبان کے مشہور اور بڑے شعرا جو اس ملک میں پیدا ہوئے جس طرح جائے پیدائش کے لحاظ سے افغانستان کے کسی شہر کی طرف منسوب ہیں اسی طرح سکونت یا مدفن کے لحاظ سے ہندوستان کے کسی شہر سے نسبت رکھتے ہیں اور کتنے شاعر ہیں جو غزنی، بلخ، بدخشاں یا آپکے دوسرے شہروں اور علاقوں سے تھے اور لاہوری اور دہلوی مشہور ہوئے جس نے محمد عوفی کی لباب الالباب کا مطالعہ کیا ہے اس کو معلوم ہے یہ شعرا ایک رشتۂ وحدت میں اس طرح منسلک تھے کہ تاریخ بھی ان میں سے بعض کے لاہوری اور غزنوی ہونیکا فیصلہ مشکل سے کر سکتی ہے۔ مسعود سعد سلمان جو شعراء کے دوسرے طبقہ میں ہے اس کو ہندی یا افغانی لکھنا اور تمیز کرنا سخت مشکل ہے۔

سلیمان نژادو! میں نے جلال آباد اور کابل کے باغات دیکھے پہاڑی چشموں ، نہروں ، فواروں ، آبشاروں کا نظارہ کیا جو اس ملک کے ہر قطعہ سے نمایاں ہیں۔ تو مجھے یقین ہو گیا کہ خاندان بابر نے کشمیر اور ہندوستان میں جو کثرت سے باغ لگائے یا جگہ جگہ مصنوعی چشمے بنائے وہ سب افغانستان کے قدرتی مناظر کی نقل ہے۔

جلال آباد میں امیر شہید کے باغات کابل میں بابر کا باغ پغمان کے باغات نیز افغانستان کے دوسرے باغات لاہور کے شالامار سے کیسی قدرتی مشابہت رکھتے ہیں۔ مناظر فطرت کا یہ ذوق آل تیمور میں قدرتی طور پر ایسا موجود تھا کہ اس کو انہوں نے ہندوستان میں علانیہ ظاہر کیا۔ یہاں تک کہ دیوان عام اور خاص میں بھی گنگا اور جمنا گلکاری کے ذریعہ سے دکھائی گئی ہے۔

برادران علم و ادب ! جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اب نہیں ہو سکتا ، سیاسی حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور ہمیشہ ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں لیکن علمی اور ادبی تعلقات دائم اور برقرار رہتے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کی تلوار عرصہ ہوا ٹوٹ چکی ہے اس کی فتوحات کے اوراق صدیاں ہوئیں کہ بکھر گئے لیکن حکیم سنائی غزنوی کا قلم اب تک باقی اور موجود ہے اور انکی ادبی فتوحات کے اوراق کا شیرازہ اب تک منتشر نہیں ہوا ہے۔

آؤ سلطان محمود غزنوی ، شہاب الدین غوری اور آل بابر نہیں بلکہ سنائی غزنوی ، مسعود سعد سلمان لاہوری ، خسرو دہلوی ، حسن دہلوی ، بیدل عظیم آبادی کے نام سے ہم ایک دوسرے کی طرف مودت اور محبت کا ہاتھ بڑھائیں ، علم و فن کے نام پیمان محبت و دوستی کو تازہ اور عہد رفاقت کو مستحکم کریں اور ہم دونوں اپنے اپنے وطن کے اندر رہ کر علم و ادب کے ایک جدید مشرق کی تعمیر میں دوش بدوش کام کریں ——— ہم دونوں کا اتحاد جس طرح بھی ہو بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر دیگا "

یہ باتیں اس سے بہتر انداز میں نہیں کہی جا سکتی تھیں۔ ایک ایک لفظ سے پورا پورا خلوص اور صداقت نمایاں ہے۔

نوکری

صفوۃ اللہ بیگ گوئی

میرا نام پاشو ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہوں دونوں مل کر کماتے ہیں۔ مگر باوجود محنت کے پوری نہیں پڑتی۔ دن بھر کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ زندگی کیا ہے ایک چکر ہے بوجھل اور کٹھن! کولہو کے بیل کی طرح صبح سے شام اور شام سے صبح تک پیتے رہو۔ حاصل؟ آدھا پیٹ روٹی اور پھٹے پرانے کپڑے!

غریبوں میں بھی محبت ہوتی ہے۔ اور غریبوں کی محبت بلا واسطہ ہوتی ہے۔ چنانچہ میری ماں اور میرا باپ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ اسلئے نہیں کہ میری ماں کو میرا باپ اس کی خدمت اور محبت کے صلے میں ایک نئی ساڑھی لا دیتا ہے۔ بلکہ میری ماں میرے باپ سے اس لئے محبت کرتی ہے کہ اس کے پاس سوائے محبت کے اور کچھ دینے کو نہیں۔ اور میرا باپ میری ماں سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ اس کی محبت کسی چیز کی طلبگار نہیں اس ہی محبت، بے لوث اور غیر متزلزل محبت، کی میں یادگار ہوں۔ مجھ کو اپنا بچپن یاد ہے۔ اس کو کچھ ایسا عرصہ بھی تو نہیں گذرا۔ میری ماں ہر وقت مجھکو اٹھائے اٹھائے پھرتی اور اس ہی طرح اپنا سارا کام انجام دیتی۔ ایک سکنڈ کو بھی جدا نہ کرتی گویا اس کو دنیا کے اور بوجھ کچھ کم تھے جو میرا اضافہ کیا۔ مگر وہ جہاں دنیا کے اور بوجھ مسکرا کر سہتی وہاں میرے وزن سے بھی اس کے دل کا بوجھ ہلکا رہتا۔

لڑکپن کا یہ سہانا دور بہت جلد ختم ہو گیا۔ بڑی آرزوؤں سے میرے والدین نے مجھ کو اسکول میں داخل کیا۔ نہ معلوم یہ دونوں میرے متعلق کیا کیا خواب دیکھتے ہوں گے۔ ان کے دل میں کیا کیا تمنائیں ہوں گی مگر غریب کی تمنائیں کب پوری ہوتی ہیں جو ان کی ہوتیں۔ تعلیم اجارہ ہے — نہیں میں نے غلط کہا۔ مشغلہ ہے پیسے والوں کا۔ جس میں وہ اپنا وقت اور روپیہ ضائع کرتے ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق نے آنکھوں پر سے بہت جلد پردہ ہٹا دیا۔ اور امیدوں اور آرزوؤں کا یہ سنہری محل آخر منہدم ہو ہی گیا۔ اسکول چھوڑ کر میں بھی ملازمت کے اس زمرے میں داخل ہو گیا جس میں نہ صرف میرے ماں اور باپ تھے بلکہ شاید ابتدائے آفرینش سے اب تک سارے آبا و اجداد ہوں۔

پڑوسیوں، ہمسایوں نے مبارکباد دی کہ پاشو نوکر ہو گیا۔ ماں اور باپ کو سہارا مل گیا۔ جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ پوت کے پاؤں پالنے میں۔ غرض ہر شخص خوش تھا۔ سوائے میرے میں بھی کچھ زیادہ غمگین نہ تھا۔ لطف یہ ہے کہ ان خوش ہونے والوں میں سے کوئی بھی آسودہ حال نہ تھا۔ سب کے سب نوکر تھے۔ جو اس زندگی کی کڑواہٹ سے خوب واقف تھے۔

چاندی کے چند ٹکڑوں کی چمک چوند جلدی جاتی رہی۔ اور آقاؤں کے سامنے کے بچے ہوئے پراٹھوں کے ٹکڑوں اور جھوٹے سالن کا مزہ بھی جلد ختم ہو گیا۔ اب اس میں منہ کے گندے لعاب کے آمیزہ کا تعفن صاف ظاہر ہوتا۔ زندگی کی تلخیاں نمایاں ہونی شروع ہو گئیں۔

زندگی کیا تھی۔ ایک مسلسل گردش۔ نہ تنوع نہ تبدل۔ ویسے تو میرے ذمہ کوئی خاص کام نہیں۔ مگر صبح آنکھ کسی کی آواز پر کھلتی اور رات کو جب تک مگرا بن کر دو چار آوازوں کو ان سنا نہ کر دوں سونا نصیب نہیں ہوتا۔ ننھے میاں سے لیکر بڑی بیگم صاحبہ تک سب کا زور مجھ پر چلتا۔ جدھر سے آواز آئی میں چلا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ میں ایک گنبد ہوں اور تمام میدان میں ٹھوکروں کے ساتھ ناچتا پھرتا ہوں۔

اس زندگی میں نہ دلچسپی ہے اور نہ امید۔ جیوں تو کیوں جیوں۔ آئندہ کیا ہوگا کیا کرنا چاہیئے۔ نہ سوچنے کو جی چاہتا ہے اور نہ فرصت ملتی ہے۔

— ۲ —

مجھکو شیدا کہہ کر پکارتے ہیں۔ میرا اصلی نام کیا ہے مجھکو نہیں معلوم — شاید کسی کو بھی نہیں معلوم۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے لوگ مجھے اس ہی نام سے پکارتے ہیں۔ سب کہتے ہیں مجھ میں بڑی حلاوت اور بڑی شیرینی ہے شاید یہی وجہ تسمیہ میرے نام کی ہو۔

شیریں سے بگڑتے بگڑتے شیدا رہ گیا ہو۔

میں اپنی ابتدا سے بے خبر ہوں۔ میں دراصل کون ہوں؟ کس گھر میں پیدا ہوئی۔ مجھکو پتہ نہیں۔ جس طرح میں اپنی ابتداء سے بے خبر ہوں اس ہی طرح اپنی انتہا سے لاعلم۔ میرا انجام کیا ہوگا میں کیا کروں گی۔ یہ زندگی کیسے بیتے گی۔ میں نے کبھی سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بے کار باتوں میں الجھنا مجھکو پسند نہیں۔ میری زندگی صرف آج تک محدود ہے۔ روز کی فکر روز۔ جو دن بھی گزر جائے۔ جیسا بھی گذر جائے غنیمت ہے۔ میرے نزدیک ماضی و مستقبل دونوں تاریک ہیں۔ ایک بیکار شئے! ماضی کو یاد نہیں کرتی مستقبل کا فکر نہیں کرتی۔

میں ملازمہ ہوں۔ میرا کام دلچسپ ہے۔ مالکن کی دیکھ بھال صبح سے شام تک میں ان کے ساتھ رہتی ہوں۔ اور رات میں جب وہ سونے کے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ اور میرے لئے دروازے کے سوراخ میں سے جھانکنے کے لئے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہتی تو میں بھی سو جاتی ہوں۔

غرض ہر وقت سائے کی طرح ساتھ رہتی ہوں۔ باوجود اس چوبیس گھنٹے کے ساتھ کے مجھ کو نہ تو ان سے اُنس ہے اور نہ ہمدردی۔ باوجود قربت کے میں ان سے دور رہوں۔

میرا اصل کام مالکن کو نہانا اور سنوارنا ہے۔ میں ان کو کپڑے پہناتی ہوں۔ بال بناتی ہوں۔ ٹہلاتی ہوں۔ تزئین و آرائش میں مدد دیتی ہوں۔ میری مالکن اگرچہ جوان ہیں مگر سوائے عمر کے ان میں اور کوئی چیز جوانی کی نہیں ان کی جوانی میرے سنگھار کے بل پر قائم ہے۔ میں نہ ہوں تو ان کو کوئی جوان نہ کہے۔ ان کا حسن ان کی جوانی ان کی کامیابی میرے مرہون منت ہے، ان کے بے جان جسم میں میری مالش سے زندگی کی ہلکی سی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ان کے جسم کی کالونس کو میں غازے کی تہ میں چھپاتی ہوں۔ ان کے رخساروں کی زردی کو میں سرخی سے مٹاتی ہوں۔ ان کے خفیف و بے ڈول جسم کو زرنگار کپڑوں سے چھپاتی ہوں۔ ان کے بھنچے ہوئے بے جان ہونٹوں پر استرکاری کرتی ہوں۔ اور یہ سب اس استادی سے کرتی ہوں کہ مالکن خود آئینے میں دھوکا کھا جاتی ہیں۔ اگر میں نہ ہوں تو ان کے لئے یہ انکشاف جان لیوا ثابت ہو۔

مالکن کی شادی کو دو سال ہو چکے ہیں۔ شادی کے چھ مہینے کے بعد سے میں نوکر ہوں۔ سنتی ہوں شادی سے پہلے میرے مالک اور مالکن میں بڑی محبت تھی۔ ایک دوسرے کے پروانے تھے۔ اگر یہ شادی نہ ہوتی تو شاید یہ دونوں اب تک زہر کھا کر مر چکے ہوتے۔ یا کسی دوسرے دیس میں ہوتے۔ مگر مجھکو تو محبت کی یہ کہانی اور دوسری کہانیوں کی طرح ایک رومان معلوم ہوتی ہے۔ محبت کا دم دونوں اب بھی بھرتے ہیں۔ مگر ان کی یہ محبت اب محض ایک "وضعداری" بن کر رہ گئی ہے۔

میری دنیا بھی عجیب ہے۔ ہر وقت مالکن کی عطر سے بسی ہوئی دنیا میں معطر رہتی ہوں مگر خود ایک پھویا بھی نہیں لے سکتی۔ دن میں کئی مرتبہ ریشمی و قیمتی لباس تبدیل کراتی ہوں۔ مگر خود ان ہی پرانے کپڑوں میں ملبوس رہتی ہوں۔ ہزاروں کے زیورات روز لادتی ہوں مگر میرے پاس ایک تار بھی نہیں۔ دن بھر پھولوں کے ہار گوندھتی ہوں مگر مجھکو مرجھائے ہوئے پھول بھی نصیب نہیں ہوتے۔ میری حالت بالکل اس خزانچی کی سی ہے جو دن بھر دولت میں رہتا ہے اور شام کو فاقہ کرتا ہے۔

ہمارے گھر میں بہت سارے نوکر ہیں —— اتنے سارے کہ سب کے نام جب گنتی ہوں تو چار کو لازمی بھول جاتی ہوں۔ سب مجھ سے اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ سب میری قدر کرتے ہیں اور مجھ سے باتیں کرنے کا موقع ڈھونڈتے ہیں۔ باورچی کا چھوکرا جب میرا نام لیتا ہے تو اس کا چہرا فق ہو جاتا ہے اس کی آواز کا ارتعاش اس کے دل کی دھڑکن کا پتہ دیتا ہے۔ میرا جب میری طرف دیکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر میں ڈس لے گا۔ مجھکو اس کی شکل سے نفرت ہے۔ اب تک کئی بیویاں کر چکا ہے۔ نہ معلوم کم بخت میں کیا بات ہے جو میں اس سے گھبراتی ہوں۔ ہر وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب حملہ آور ہوگا۔ ویسے باتیں اس کی سب سے میٹھی اور مجھے دلار ہوتی ہیں۔ جن ہو تو شیشے میں اتارے۔ ڈرائیور کی بیوی خواہ مخواہ مجھ سے جلتی ہے۔ ایک دن ڈرائیور مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے دیکھ لیا۔ خوب آپس میں لڑائی ہوئی۔ نوبت مارکٹائی تک پہونچی۔ اس دن سے ان دونوں میں صفائی نہیں —— غرض سب میرا خیال کرتے ہیں اور میری خوب خاطر کرتے ہیں۔

ہمارے مالک بھی نہایت اچھے آدمی ہیں، مجھکو بہت پسند ہیں۔ ان کی آواز میں خاص رس ہے۔ یا یہ کہ مجھکو معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ میرا نام لیکر پکارتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل پگھل کر زبان کے راستے بہ جائیگا۔ کتنی جاذب ہے ان کی پکار —— انہوں نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ کہہ بھی کیسے سکتے ہیں۔ مگر میں جانتی ہوں۔ ان کی خامشی ہزار گویائی سے بہتر ہے۔ خود ڈالی ہوئی زنجیروں کو توڑنے کی شکتی نہیں۔

میں ان کے اس خاموش پیغام کو سمجھتی ہوں۔ لجا جاتی ہوں۔ بوکھلاہٹ میں کچھ نہیں سوجھتا۔ چاہتی ہوں کہ جواب دوں۔ کہہ دوں کہ میں سمجھ گئی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں پر کہہ نہیں سکتے آپ کے پیغام کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں۔ اس سوانگ کو توڑ دیجئے۔ گھلنے اور گھلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اپنے آپ کو فریب مت دیجئے۔ میں بھی جل رہی ہوں۔ تمتماہٹ ناقابل برداشت ہے۔ میں چیخ اٹھوں گی۔ بغاوت کر دوں گی۔ مگر ڈرتی ہوں۔ مالکن سے نہیں۔ اس بھیانک تصور سے جب چور معلوم ہو مگر پکڑا نہ جا سکے۔

اب مجھ میں ضبط نہیں۔ میں بھی جوان ہوں۔ مالکن کی قربت اس آگ پر تیل چھڑک رہی ہے۔ میرے پہلو میں بھی دل ہے اور دل میں تمنائیں۔ میں بھی یہ جانتی ہوں کہ یہ دنیا کیوں پیدا ہوئی —— تمنا ہے کہ من کی کھیتی ہری ہو۔ اس کا کوئی رکھوالا ہو۔ امید کی بارش اس پر بھی برسے۔ مگر ڈرتی ہوں —— بادل برسیں گے ضرور۔ مگر موسلا دھار! پھر چھٹ جائیں گے۔ ہمیشہ کیلئے۔ پھر میری یہ کھیتی سوکھ جائے گی۔ کبھی نہ ہری ہوگی۔

میرے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک نامرادی اور ناکامی کی طویل و ہموار زندگی۔ ایسی پھیکی اور ایسی بوجھل جیسی اب تک رہی اور ہمیشہ رہیگی۔ دوسری شادمانی و کامرانی کی ایک پل آئی اور گئی —— میں سوچ رہی ہوں!

—— ۳ ——

مجھ کو میرے والد نے نوکر رکھوایا اور میرے والد کو ان کے والد نے

اس ہی طرح یہ سلسلہ پیڑیوں سے چلا آرہا ہے۔ اور شاید بستی دنیا تک رہے گا۔

جب میں نوکر ہوا میری عمر نوکری کی نہ تھی۔ میرے والد کی آمدنی گھر کی روز افزوں آبادی کا بار نہ اٹھا سکی۔ میری عمر زیادہ لکھا دی گئی۔ یہ ہی چال اب میرا ہے۔ میں بھی دن گن رہا ہوں کہ کچھ لڑکا بڑا ہو اور کچھ میں اسے پڑھاؤں۔

ہم لوگ جوان بھی جلد ہوتے ہیں اور بڈھے بھی۔ جوان جلدی روزی کی خاطر اور بڈھے جلدی کام کی وجہ سے!

ہمارے سارے خاندان کا پیشہ ملازمت ہے۔ باپ، بھائی، چچا، خالو، ماموں، پھوپھا، سبکے سب ملازم ہیں۔ جس طرح غالب کا سو پشت سے پیشۂ آبا سپاہ گری تھا۔ اس ہی طرح دو سو پشت سے ہمارا پیشۂ آبا ملازمت ہے۔ اور پھر خوبی یہ کہ ساری عمر اس ہی جگہ پر قائم رہتے ہیں جس پر ابتدا کی تھی۔ ہمارے خاندان میں کسی نے آج تک ترقی نہیں کی۔ جہاں سے شروع ہوئے اس ہی منزل پر ختم ہوئے۔ اللہ رے قناعت!

آپ یہ نہ سمجھئے کہ ہمارا وجود بے کار ہے۔ سرکار کا اقبال ہمارے دم سے قائم ہے۔ ہم ہاتھ ہیں کام کرنے والے۔ آنکھیں ہیں دیکھنے والی۔ کان ہیں سننے والے بڑی بڑی سلطنتیں ہمارے بل بوتے پر قائم ہیں۔ ہم محنت کرنے میں دن اور رات۔ صبح سے شام و رات تک۔ اور پھر بھی کام ختم نہیں ہوتا۔ ہماری محنت کا صلہ سب کو ملتا ہے سوائے ہمارے۔ گھٹے کے گھٹے کام گھرلاتے ہیں۔ راتوں کو آنکھوں کا تیل نکالتے ہیں۔ کچھ ختم کرتے ہیں۔ باقی ساتھ لے جاتے ہیں۔ ہم راستہ صاف کرتے ہیں۔ الجھی ہوئی کارروائیوں کو سلجھاتے ہیں۔ ضخیم مسلوں کا ست نکالتے ہیں۔ کارروائیوں کو جس طرح چاہتے ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں۔ ہم لدّو انسان ہیں! بے زبان! دوسروں کے بوجھ سے ہمارے بوجھ میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر شخص اپنا بوجھ ہمارے کندھوں پر لاد دیتا ہے۔ ہمارے کندھے اس بوجھ سے چھلنے لگتے ہیں۔ ٹانگیں کمان بن جاتی ہیں۔ کمر دوہری ہو جاتی ہے۔ مگر اف نہیں کرتے۔ نہیں کر سکتے!

ہم دنیا کے گرم و سرد سے خوب واقف ہیں جتنے گرم و سرد ہم دیکھتے ہیں کوئی دوسرا نہیں دیکھتا۔ چپے چپے پر خدشہ۔ قدم قدم پر خوف۔ ہر افسر نئی ڈگڈگی لے کر آتا ہے۔ اور نئی طرح نچاتا ہے۔ ہم نہ افسر کی مہربانی پر زیادہ پھولتے ہیں اور نہ خفگی پر زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔

ہماری زندگی نہ بے کیف ہے اور نہ پر لطف۔ بے کیف اسلئے نہیں کہ اب مشکل مشکل نہیں معلوم ہوتی۔ اور پر لطف اس لئے نہیں کہ دنیا کے لطف سے آشنا ہونے کا موقع نہیں!

—— ۴ ——

نوکر ہونے کی خبر ملتے ہی پہلا کام جو میں نے کیا وہ شکر تھا۔ خدا کی مہربانی اگر شامل حال نہیں ہوتی تو مجھ جیسا بے وسیلہ شخص ملک کی اس سب سے بہتر ملازمت کو کیسے پا سکتا تھا۔

میری زندگی بھی کچھ عجیب ہے۔ بچپن میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس وقت میری عمر بہت کم تھی۔ اچھے برے کو تو کیا، دنیا کی کسی چیز کو نہیں سمجھتا تھا۔ والد کے بعد والدہ کے سر پر میری تعلیم و تربیت کا بوجھ پڑا۔ یہ نیک بی بی کی محنت اور دعاؤں کا نتیجہ ہے جو آج میں ترقی کے اس زینے پر ہوں۔ میرے لئے انہوں نے کیسی قربانیاں کیں۔ بہت کم لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میری زندگی ایک مسلسل کوشش تھی۔ ایک طویل دوڑ! دن رات مجھ کو محنت کرنی پڑی۔ میری ماں مجھ کو کبھی کچھ نہ کہتیں۔ بڑے پیار سے رکھتیں۔ مگر پھر بھی میرے دل میں ان کا ڈر تھا۔ میں ان کو دکھ میں دیکھتا تو کانپ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ہر وقت محنت کرتا۔ کھیل کود بھی دنیا میں کوئی چیز ہے۔ میں واقف نہ تھا۔ مجھکو اتنی فرصت ہی نہ تھی —— میں خاندان کا سب سے بڑا فرد تھا۔ میرے کندھوں پر ایک بوجھ تھا۔ میں ہزار اسکو بھولنے کی کوشش کرتا مگر یہ تلخ حقیقت ہر وقت سامنے رہتی۔ والد کے گاڑھے پسینے کی کمائی کی بچی ہوئی پونجی ایک ایک کر کے ختم ہو رہی تھی۔ مجھکو اپنے خاندان کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانا تھا۔ میرے والد کا بڑا نام تھا۔ اب تک لوگ ان کے نام کی عزت کرتے ہیں۔ میں اس عزت اور نیک نامی کا امین تھا۔ میرا فرض تھا کہ اسکو مٹنے سے بچاؤں اور اس پر دھبہ نہ آنے دوں۔ کچھ دنوں تک تو عزیز اقربا، دوست احباب، ہمسائے پڑوسی ہمدردی کرتے، مشورہ دیتے اور ہر کام میں ہاتھ بٹاتے رہے مگر کب تک؟ رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی یہ گرم جوشی بھی سرد پڑتی گئی۔ اب میں تھا اکیلا، تن تنہا، اور یہ سارا بوجھ!

ماں کی رہبری و ہدایت، میری محنت اور دوڑ دھوپ۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک ضعیف بڑھیا اور ایک ناتوان کم سن بچے کی محنت پھل لائی، اور ہمارا وہ حشر نہ ہوا جو ان حادثوں کے بعد ہمارے دیس میں عام ہے۔

اب اگر گزرے ہوئے زمانے پر کبھی میں نظر ڈالتا ہوں تو مجھ کو ایک خاص لطف آتا ہے۔ وہ لطف جو ہر کام کرنے والے کو کام کر چکنے کے بعد آتا ہے۔ سال بھر کی لگاتار محنت کے بعد امتحان میں امتیاز۔ کیا خوشی ہوتی۔ جیسے بڑا پالا مار لیا۔ دو دن خوش رہتی، پھر اگلی منزل کے تصور اور آئندہ کامیابی کی دھن میں آگے بڑھ جاتا۔

باپ کا سایہ اٹھ جانے کے بعد جس کمی کو میں نے سب سے زیادہ محسوس کیا وہ عاقبت کا احساس تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ دنیا میں میں اکیلا ہوں۔ جسطرف نظر اٹھا کر دیکھتا کوئی مشفق و مربی نہیں دکھائی دیتا۔ کسی کو میں اپنا کہہ کر نہ پکار سکا۔ اس ڈھنڈار شہر میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو میرا ہمدرد ہو۔

نہ ہو۔ ہوس ہے ہیں ایسا درد کہہ سکوں، جو میرا درد اپنے دل میں درد لے کر سنے۔ میرا جی چاہتا کہ کوئی مجھے سینے سے لگائے، شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرے۔ تاکہ میں یہ سمجھوں کہ دنیا میں میرا بھی کوئی سہارا ہے۔ کوئی آسرا ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ مگر کسی نے مجھے آج تک ڈھارس نہیں بندھائی۔ شاباش نہیں کہا۔ اور نہ بیٹا کہا۔

میں لوگوں سے ملتے ہوئے کتراتا۔ ان لوگوں سے بھی جو والد صاحب کے گہرے دوست تھے۔ اس لئے کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ میں غرض مند ہوں۔ کسی غرض سے آیا ہوں۔ میں سب کچھ سہہ سکتا تھا مگر یہ ناقابل برداشت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت کے وقت بھی میں کسی کے در پر نہیں گیا۔ محنت، استقلال اور تائید غیبی سے میں اس منزل تک پہونچا۔

میرا خیال تھا کہ اب زندگی کی اس کشمکش کا خاتمہ ہوگیا۔ اب زندگی میں چین و آرام کے سوا کچھ اور نہیں۔ میرا ہی نہیں اور لوگوں کا بھی یہ ہی خیال تھا۔ میں خوش تھا کہ زندگی کے خوابوں کی تعبیر آگئی۔ میں کیا کیا سوچتا تھا کیا کیا سکیمیں بناتا تھا۔ اپنی زندگی اور دوسروں کی زندگی کی۔ اب وقت آیا تھا کہ ان کو پورا کروں۔ انسانی زندگیوں کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں تھی۔ سمجھتا تھا جس طرف چاہوں گا انسانی سمتوں کو پھیر دوں گا۔ دنیا کی تعمیر جدید شاید قدرت نے میرے لئے ہی اٹھا رکھی تھی —— اپنے اثر و اقتدار سے ان کھنڈرات سے ایسی عمارت بناؤں گا جو بلند ہوگی اور حسین! خیال کی دنیا میں برسوں کے بسنے والے خواب اب عملی جامہ پہن کر سامنے آئیں گے۔ ہمیشہ سے دل میں تڑپنے والی آرزوئیں اب پوری ہوں گی۔

مگر حقیقت اس سے مختلف تھی —— یہاں ہی جست میں میری پرواز ختم ہوگئی۔ مجھ کو پرقینچ کر دیا گیا۔ پشتوں سے پگڈنڈی پر چلنے والوں کو شاہراہ پر دھکیلنا آسان کام نہ تھا۔ میں یہ سب کچھ جانتا تھا۔ مگر میرا عزم ہمیشہ ہر دشواری پر غالب آیا۔ یہاں صورت مختلف تھی پہلا ردِ عمل یہ ہوا کہ میری آزادی سلب ہوگئی۔ مجھ میں احساس کمتری پیدا ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بلند مقام اور بھی ہیں۔

اب میری زندگی کچھ عجیب سی ہے باوجود کامیابی کے ناکام ہوں۔ مجبور و بے بس ہمیشہ سے تھا مگر اب طاقت و اقتدار کے ہوتے ہوئے بے بس ہوں۔ چاہتا ہوں کہ کام کروں۔ نہیں کر سکتا۔ چاہتا ہوں پل بھر میں دنیا کو بدل دوں۔ زندگیاں سنوار دوں۔ نہیں سدھار سکتا۔ سمجھتا ہوں کہ صدیوں کی بگڑی ہوئی عادتیں ہوتے ہوتے درست ہوں گی۔ مجھ میں صبر ہے، تحمل ہے، ہمت ہے، مگر ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں۔ ڈگر سے ہٹنا سب سے بڑا جرم ہے۔ زندگیاں بگاڑ سکتا ہوں۔ بنا نہیں سکتا۔ زندگی کی پہلی ناکامی یہ کامیابی ہے۔

یہ دور بڑا دشوار ہے۔ ہزاروں آنکھیں مجھ پر جاسوسی کرتی ہیں۔ ہزاروں انسان میرے ہر فعل کا محاسبہ کرتے ہیں۔ جہاں جاتا ہوں لوگ مجھکو گھورتے ہیں —— جیسے میں کوئی نئی قسم کا جانور ہوں —— میری ہر بات پر تنقید ہوتی ہے۔ اور ہر فعل پر کاناپھوسی!

حیران ہوں کس کس کو خوش کروں اور کیسے خوش کروں۔ اس فن کی تعلیم مدرسوں میں نہیں دیجاتی۔ کتابیں اس موضوع پر خاموش ہیں۔ آپ سب کو خوش رکھ سکتے ہیں نہیں رکھ سکتے تو اپنے آقاؤں کو۔ اپنے ماتحتین کو۔ اور اہلِ غرض کو ——

پہلے محاسب آقا ہیں۔ ان مجازی خداؤں کو خوش کرنا بڑا مشکل ہے۔ یہ کس بات پر روٹھتے ہیں اور کس بات پر منتے ہیں مجھکو معلوم نہ ہوسکا۔ ابتدا میں میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ میرے فرائض سے باہر ہے۔ مگر تجربہ یہ بتا رہا ہے کہ نوکری میں پھلنے اور پھولنے کی اولین شرط یہی ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ہر چیز کی تعریف کی جائے۔ ان کی ہاں میں ہاں ملائی جائے۔ ان کی برائیوں کو اچھائی کا رنگ دے کر پیش کیا جائے۔ ان کی کمزوریوں پر زبان نہ ہلائی جائے۔ ان کے اغراض میں ان کی طرف سے پیروی کی جائے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں یہ کیسے کرسکتا ہوں۔

دوسرے نمبر پر ماتحتین ہیں —— یہ بھی آقاؤں سے کچھ کم نہیں۔ بڑے نکتہ رس اور بال کی کھال نکالنے والے۔ بات کو جس رنگ میں چاہیں رنگ دیں۔ واقعہ کو جس طور پر چاہیں موڑ دیں۔ رائی کا پہاڑ بنا دیں۔ ان کی عادتیں راسخ ہو چکی ہیں۔ فطرت بن چکی ہے۔ اب یہ اس اسٹیج پر پہنچ گئے ہیں جہاں برائیاں بھلائیاں بن کر دکھائی دیتی ہیں۔

پبلک —— اس کا تیسرا نمبر ہے۔ ہر شخص اپنی ایک رائے رکھتا ہے اور جدا مسلک۔ ہر ایک کی غرض جداگانہ ہے۔ اہل غرض سے کسی نہ کسی کا ناطہ رہنا لابدی ہے۔ رہے عوام۔ ان کی رائے کو کون پوچھتا ہے۔ عقلمند آدمی ان کی فکر ہی نہیں کرتے۔

میں نے نوکری کیا کی اچھی خاصی مصیبت مول لے لی۔ پہلے باوجود کچھ نہ ہونے کے آزاد تھا۔ جو چاہتا کرتا۔ جب چاہتا کرتا۔ نہ کسی کی فکر نہ کسی کا ڈر۔ اب چند سو روپلی ٹکڑوں کی خاطر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوں۔ ڈر ڈر کر کام کرتا ہوں۔ ایک سے جھک کر ملتا ہوں۔ آقاؤں کی نگاہیں بھانپتا ہوں اور ماتحتین کے تیور۔ ضمیر ابھی تک محفوظ ہے۔ اس ہی کو اپنی جیت سمجھتا ہوں۔ اپنی فتح عظیم۔

اور وہ چند سو روپلیاں —— تیس دن کے اس سوہان کا معاوضہ کتنی جلد ختم ہو جاتی ہیں۔ تنخواہ کی شکل پہلی کو ضرور دیکھتا ہوں اور یہ احساس پیدا کرنے کے لئے کہ میں بڑا آدمی ہوں ایک دفعہ گن بھی لیتا ہوں۔

دوست کہتے ہیں تو بیوقوف ہے۔ میں بھی بعض وقت سوچتا ہوں کہ یہ بیوقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔ اپنے اوپر اور اپنے نیچے جب نظر ڈالتا ہوں تو اس بیوقوفی کا احساس زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ مگر کیا کروں مجھ کو اپنی بیوقوفی پیاری ہے۔

مجھ کو جب اپنی وضع بدلنی منظور نہیں تو زمانہ اپنا رنگ کیوں بدلے۔ سوچتا ہوں کب تک نباہ ہوگا۔ اور اگر نہ ہوا تو؟ جانتا ہوں کیا نتیجہ ہوگا مجھے منظور ہے۔ میں تیار ہوں!

——— ۵ ———

میرا نام محمد فاضل ہے۔ اردو کی ایک مشہور مثل میرے ہی سے متعلق ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں۔ جن کو قدرت نے اچھے گھرانے میں پیدا کیا ——— گھر میں ہر چیز میسر تھی ——— اگرچہ ظاہرہ آمدنی محدود تھی مگر خدا کے فضل سے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ نوکر، چاکر، دھن، دولت غرض خرابی کے جملہ سامان بافراط تھے۔ ان لوازمات کا مجھ پر خاطر خواہ اثر ہوا۔

بچپن ہی میں ضدی تھا۔ ہر وقت گودوں میں لدا رہتا۔ بہلتا تو بہلائے نہ بہلتا۔ میری ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش پلک جھپکنے میں پوری کی جاتی۔ کس کی مجال تھی جو مجھ کو چھیڑے اور اپنے حق میں کانٹے بوئے؟ ——— جوں جوں عمر بڑھتی گئی، میری عادتیں گہری ہوتی گئیں۔ مجھکو اپنے حریفوں سے بدلہ لینے کے ہتھکنڈے بہت جلد آ گئے۔ اگر کوئی میری ضد پوری نہ کرتا تو میں اس کی جھوٹی شکایت کر دیتا۔ بیچارے کی کمبختی آ جاتی۔ نوکری کے لالے پڑ جاتے۔

بڑی اللہ آمین سے مجھکو اسکول میں داخل کیا گیا۔ اسکول کے انتخاب میں بڑے سوچ بچار اور ردّ و قدح سے کام لیا گیا۔ پرائیویٹ ماسٹر بڑی تلاش اور بڑی بڑی تنخواہوں پر مقرر کئے گئے۔ مگر بہت جلد یہ ثابت ہو گیا کہ اسکول ماسٹر سب ناکارہ ہیں۔ تعلیم و تعلّم سے بے بہرہ ہیں۔ ان کو اگر پڑھانا نہ آئے تو بچہ پڑھے کہاں سے۔ کئی اسکول بدلے گئے اور کئی ماسٹر۔ مگر میں جہاں تھا وہیں رہا۔

دن بیتتے گئے اور کوششیں ناکام ہوتی گئیں۔ جب اس طرف سے اطمینان ہو گیا کہ میں کچھ نہ کروں گا تو والد مرحوم نے ارادہ کیا کہ کم از کم مجھ کو کسی سلسلے سے لگا دیں۔ فضا سازگار تھی اور ہوا موافق۔ والد صاحب کا بڑا رسوخ تھا۔ کوشش شروع ہو گئی۔ مگر خلاف توقع ناکامی ہوئی۔ ایک ناکامی ہوتی کوئی حرج نہیں۔ مگر یہاں تو سلسلہ لگ گیا۔ جدھر ہاتھ پیر مارے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دنیا بدل چکی تھی۔ سڑیوں کے لڑکے بلا سعی و کوشش دو کتابیں رٹ کر آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں شرفا نوازی ختم ہو گئی۔ نہ کوئی خاندان دیکھتا اور نہ کوئی تربیت۔ معیار تھا تو کتابیں۔ شریفوں کے بچے دربدر ٹھوکریں کھاتے، فاقے کرتے، تباہ و برباد پھرتے اور جن کے گھر میں کبھی رات بھر چراغ نہیں جلتا تھا ان کے بچے عیش و آرام کرتے۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو ———

دل تو میرا بھی چاہتا تھا کہ نوکر ہو جاؤں۔ میں نے اس کے ٹھاٹ دیکھے تھے۔ مگر مجھکو نوکری کی ایسی زیادہ پرواہ بھی نہ تھی۔ فکر تو اس کو ہو جس کو کچھ لگی ہو۔ مجھکو دنیا میں کس چیز کی فکر تھی جو اس کی ہوتی۔ مگر والد صاحب ایسے کوشاں تھے جیسے خود ان کی نوکری ہو۔ دھن کے بڑے پکّے تھے۔ باوجود ان تمام مصائب کے انہوں نے ہار نہ مانی جب کچھ نہ چلی تو بالآخر میری شادی کر دی ——— اور آخر نوکری دلوا کر ہی رہے۔

اس دن کی خوشی کا کیا ذکر کروں۔ کتنی منتوں اور مرادوں سے یہ دن نصیب ہوا تھا۔ ہر شخص کے منہ پر چھوٹے میاں کا ذکر تھا۔ میری ہونہاری۔ سعادت مندی اور قابلیت کی نئی نئی کہانیاں بیان کی جاتیں۔ میری تنخواہ اگرچہ کافی تھی مگر نہ معلوم اس میں وہ برکت کیوں نہ تھی۔

والد صاحب کا ارادہ تھا کہ خود مجھکو کام سکھائیں۔ مگر وہ اس انتظار میں تھے کہ مجھکو ذرا شعور آ جائے۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور کامیابی کے وہ راز سینہ بسینہ مجھ تک نہ پہونچ سکے۔

ان کا سایہ سر سے کیا اٹھا معلوم ہوا کہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہمارا خود کا بڑھا ہوا وسیع کنبہ میرے بس کا نہ تھا تنخواہ کا یہ عالم تھا کہ خود مجھکو کفیل نہیں ہوتی تھی۔ غرض عجیب پریشانی کا زمانہ تھا۔

خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ کچھ تو ضرورتوں نے سکھایا اور کچھ ایک صاحب کی رہبری نے۔ چند دنوں میں طاق ہو گیا ——— اب میری آمدنی محدود بھی تھی اور لا محدود بھی۔ اس طرح میرا خرچ بھی۔ مگر اس کے باوجود زندگی اتنی آسان نہ تھی۔ اس منجدھار سے بلا تردامنی کے گزر جانا بڑے دل گردے کا کام تھا میرے لئے تو زیست و موت کی کشمکش تھی۔ جس طرح گرداب میں پھنسے ہوئے آدمی کا سہارا ایک تنکا ہوتا ہے اس ہی طرح میری زندگی کا آخری سہارا یہ نوکری تھی۔

ان باتوں کو عرصہ بیت گیا ہے۔ زمانے نے مجھکو وہ کچھ سکھایا جو استاد، اسکول، کتابیں۔ باوجود کوشش اور صرفے کے نہ سکھا سکیں اس طویل عرصے میں میں نے کیا کچھ نہ دیکھا۔ سینکڑوں کی ماتحتی کی اور ہزاروں پر حکومت۔ کچھ خوش رہے کچھ ناراض۔ کہیں نیک نام ہوا اور کہیں بدنام۔ خوش کم رہے اور زیادہ ناراض۔ مگر اس کی مجھکو پرواہ نہیں۔ یہ لوگ پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ ان پر سختی کی جائے۔ یہ ہماری خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ ان کی محنت ان کی آمدنی، ان کی کمائی سب ہمارے آسائش و آرام کے لئے ہے ——— ان لوگوں کو گلہ کیوں ہو۔ کیا ہم نے اس کے بدلے میں ان کے کام نہیں نکالے۔ وہ کام جو کسی قیمت پر بھی وہ کہیں [illegible] نہیں کرا سکتے تھے۔ مجھ کو پرواہ ہے تو ان کی نہیں ——— اپنے سے اوپر والوں کی ہے

یہ ناراض نہ ہوں ــ اگر یہ ناراض ہو گئے تو دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ــ مگر اس طرف سے اطمینان ہے - وہ مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتے - میری ساری کوشش اس ہی میں تو صرف ہوتی ہے کہ وہ خوش رہیں - ان کی، انکے خاندان کی، انکے دوستوں کی، ان کے دوستوں کے دوستوں کی میں کس انکساری سے خدمت کرتا ہوں - اور تو اور انکے نوکروں تک کو ناراض نہیں کرتا - نہ معلوم کس وقت کیا لگا دیں ــ مگر آپ اس سے یہ مت سمجھئے کہ مجھ میں خودداری نہیں - میں اس تذلیل کو محسوس نہیں کرتا - میں جانتا ہوں کہ یہ میری نہیں انسانیت کی تذلیل ہے - مگر عقلمند آدمی وہی ہے جو اپنا کام وقت پر نکال لے - میری مہربانی میں غرض ہے اور ہر چیز میں ایک چال - انسان بندہ ہی غرض کا ہے - ماں، باپ، بھائی بہن، بیوی بچے سب غرض کے ہیں - جب تک میری غرض نہ نکلے میں بندہ بے دام ہوں - جب غرض نکل گئی، وقت ٹل گیا تو میرا کیا واسطہ کسی کا بھی واسطہ نہیں - اس وقت میں بدلہ لیتا ہوں آنکھیں پھیر لیتا ہوں - ان صاحب سے بھی جن کے لئے میرا منہ خشک ہوتا تھا اور جن کے آگے پیچھے دوڑتے دوڑتے میرے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے تھے ان کو محسوس کرا دیتا ہوں کہ بیوقوف میں نہیں وہ ہیں - میں در اصل ان کے آگے پیچھے نہیں ناچتا تھا - وہ میرے اشاروں پر ناچتے تھے - وہ ہزار دانت پیسیں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں - میں ان کی بے بسی پر ہنستا ہوں -

میں دور اندیش ہوں - لوگ کل کی فکر آج کرتے ہیں میں برسوں آگے کی سوچ لیتا ہوں - میرا شکار مجھ سے نہیں بچ سکتا - میرے حربے لامحدود ہیں - اور میرے پینترے ان گنت - میں زمانہ شناس ہوں - وقت کیسا ہی بدلے میں بھی بدلتا ہوں - زمانے کی آنکھوں کے ساتھ میں بھی آنکھیں پھیر لیتا ہوں میں ہوشیار ہوں - باخبر رہتا ہوں - دور سے بھی اگر پتہ کھڑکے میں چوکنا ہو جاتا ہوں - کون ہے جو مجھ سے بچ سکتا ہے میرے زہر کا تریاق نہیں - میرے کاٹے کا منتر نہیں - میرا شکار جب تک پیٹ میں نہیں اتر جاتا نہیں جانتا کہ شکار ہو رہا ہوں - کس کی مجال ہے جو سر اٹھائے - کس کی ہستی ہے جو سرکشی کرے! میرا علم کتابوں میں نہیں - یہ تجربہ ہے - بیوقوف لوگ تجربہ کو انسانی شکست کا دوسرا نام بتاتے ہیں - مگر میری کونسی شکست ہے جس میں کامیابی پوشیدہ نہیں - جب ہارنے لگتا ہوں تو اس خوبی سے ہتیار ڈالتا ہوں کہ فاتح رحم کھا جاتا ہے - خود مجھے بچا لیتا ہے - میری شکست بھی ایک حسین فتح ہے! - اس زندگی میں میں نے زندہ رہنے کا فن سیکھا ہے - میں اب اس مقام پر ہوں جسے شاید دوسرا نہ پا سکے - میں آخری نشانی ہوں -

میں جوں ملازم ——— اس کو کہتے ہیں نوکری!!

غزل

شعری بھوپالی

ہوتا ہے یہیں سے مرا آغاز تباہی
معصوم نگاہی تری معصوم نگاہی

ہمرنگ تصور ہوئی وہ مست نگاہی
آنے لگی پھر مجھکو جماہی پہ جماہی

داماں تخیل ترے جلووں سے تھا لبریز
جنت میں نہ ٹھہری مری آسودہ نگاہی

اتنا ہی کرم کر تری بیداد کے صدقے
ہو جائیں مکمل مرے جذبات تباہی

کچھ اور نہیں تیرے سوا میری نظر میں
ہاں میری غریبی سے بہت پست ہے شاہی

تو اپنی زباں سے نہ کہے گا مگر اے دوست
جینے کا سہارا ہے تری نیم نگاہی

میں اور تری وسعت رحمت سے گریزاں
توبہ ہے الٰہی مری توبہ ہے الٰہی

اقبال کے نظریۂ خودی کا ارتقا

نوٹ:- اس مقالے میں اقبال کے صرف اردو کلام سے مدد لی گئی ہے۔

اقبال اپنے نظریۂ خودی کے باعث خاص شہرت کے مالک ہیں، آیئے دیکھیں کہ اس نظریہ کا نشو و نما کیونکر ہوا اور کیا کیا مدارج ارتقا طے کئے۔ ابتدائً خودی کا مفہوم ان کے ذہن میں کیا تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا۔ اس تجسس میں پہلے ان کی اوّلین تصنیف "بانگ درا" پر نظر ڈالنا چاہئے۔ اس نظریہ کا دھندلا نقش "گل رنگیں" اور "عہد طفلی" دو ابتدائی نظموں میں ملتا ہے ؎

مطمئن ہے تو پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں ۔۔۔ زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں
یہ تلاشِ متصل شمع جہاں افروز ہے ۔۔۔ توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

انسان ذی شعور ہے اور ذوقِ جستجو اسکی فطرت میں شامل ہے۔ اسی کا دوسرا نام جذبۂ حیرت ہے، بچوں کا ہر چیز کو دیکھکر حیران ہونا اور اسکی ماہیت دریافت کرنیکی خواہش اسی ذوقِ استفسار کی بنا پر ہے ؎

آنکھ وقفِ دید تھی، لب مائلِ گفتار تھا ۔۔۔ دل نہ تھا میرا، سراپا ذوقِ استفسار تھا

اسدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ ذوقِ استفسار ذوقِ آگہی میں مبتدل ہوتا ہے لیکن فطرت سے ہمکلام اور ہمکیف ہونے کے باوصف انسان ایک کمی سی محسوس کرتا ہے ؎

مدعا کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس ۔۔۔ ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

شعور کی رہنمائی میں انسان بزمِ قدرت یا خارجی اشیا کا نظارہ کرنیکے بعد خود اپنے مشاہدہ و مطالعہ پر مائل ہوتا ہے ؎

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں ۔۔۔ پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجکو ۔۔۔ دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے
ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر ۔۔۔ تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

جب نگارِ حقیقت کو خانۂ دل میں مکیں پایا، جب شعور کو وجدان کا ہمدم مل گیا تو یہ امر واضح ہوا کہ حیات نام ہے سعیٔ پیہم کا اور اس راز کی امین کوشش ناتمام ہے کیونکہ کوشش کے مشکور ہونے کا وہم آگے بڑھنے کے امکانات میں سدِّ راہ ہوتا ہے ؎

راز حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے ۔۔۔ زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

جہاں تک میرا مطالعہ ہے اقبال نے بانگ درا میں فقط جستجو، ذوقِ استفسار و ذوقِ آگہی اور اسی قبیل کے دوسرے فقرے استعمال کئے ہیں، لفظ خودی صرف "طلوعِ اسلام" میں آیا ہے جو بانگ درا کی سب سے آخری نظم ہے ؎

قدر ازکن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

ممکن ہے کہ یہیں غلطی پر محمول ہو مگر بانگ درا میں خودی کے مفہوم کو بھی واضح نہیں کیا گیا ہے صرف خودی کا رازداں ہونے کی ترغیب دلائی ہے تاکہ انسان اپنے راز آفرینش سے باخبر ہو جائے۔ اس عظیم المرتبت ارشاد اور حکیمانہ نکتے کی طرف اجتناباً اشارہ ہے کہ من عرف نفسهٗ فقد عرف ربهٗ، البتہ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں متعدد اشعار ہیں جو اس قول کی شرح ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ معرفتِ نفس یا معرفتِ خودی کسے کہتے ہیں اور اس کے حصول کے وسائل و ذرائع کیا کیا ہیں کہیں اسے توحید سے تعبیر کیا ہے ؎

خودی ہے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں ۔۔۔ یہی توحید ہے جسکو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

یعنی خودی کی بنیاد مسئلہ وحدت الوجود پر رکھی ہے کیونکہ دوسرا ہی شعر یہ ہے ؎

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے ۔۔۔ کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

پھر کہتے ہیں ؎

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی ۔۔۔ خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

جس کا یہ مطلب ہوا کہ توحید یا خودی مرکزِ خیال و نظر بن جائے اور اس پر مضبوط عقیدہ ہو ورنہ خودی فنا ہو جائے گی۔ نیز اس خودی میں جارحانہ شان باقی رہنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ اپنی ہی لذتوں میں گم ہو کر معطل ہو جائے ؎

عجب مزہ ہے مجھے لذتِ خودی دیکر ۔۔۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

تکمیلِ خودی معراجِ آدمیت ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے ۔۔۔ کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال کو اعتراف ہے کہ انکا مفہومِ خودی عارفِ رومؒ کا عطیہ ہے ؎

اسی کے فیض سے میری نگاہ روشن ہے ۔۔۔ اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

خودنگری اسی خودی کا ایک رخ ہے ؎

نکتۂ خاک سے بصر میں کف خاک خود نگر ۔۔۔ کشتۂ جود کے لئے آتشِ بیتاں ہو گئیں

تاکہ خودی سے اس کا وہ مفہوم جو ناپسندیدہ ہے دور ہو جائے کہتے ہیں ؎

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں

اسی کا دوسرا پہلو ہے ؎

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری ۔۔۔ کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

مزید تشریح یوں کرتے ہیں ؎

خودی وہ بحر ہے جسکا کوئی کنارہ نہیں ۔۔۔ تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

اثر لکھنوی

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں　　مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں
ہر گہر نے صدف کو توڑ دیا　　تو ہی آمادۂ ظہور نہیں
یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی　　کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام بادشاہی
تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے　　جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

مسلمانوں کا ادبار بھی زوالِ خودی کا نتیجہ ہے ؎

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک　　خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے　　کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر

حفظ خودی کی اس طرح تعلیم دیتے ہیں ؎

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ　　گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

کبھی خودی کو فقر سے تعبیر کیا ہے ؎

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے　　خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن　　خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

کہیں اسی کو "ذوقِ نمود" کہا ہے ؎

بے ذوقِ نمود زندگی موت　　تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت　　پربت ضعفِ خودی سے رائی

یہی عشق ہے ؎

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو　　یہی خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

خودی تقدیر کو بھی مغلوب کر سکتی ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اسی پوچھنے میں سب کچھ ہے ورنہ ظاہر ہے کہ بندہ اپنے خدا کو اسکے سوا کیا جواب دے گا کہ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

شاید بعض حضرات کو تسلیم نہ ہو مگر امر واقع یہ ہے کہ اقبال کا نظریۂ خودی توحید اور اسلام سے وابستہ ہے، دوسرے الفاظ میں سوائے مسلمانوں کے کسی میں تکمیلِ خودی کی صلاحیت نہیں ؎

خدا کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ　　خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ

یا ؎

روحِ اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی　　زندگانی کے لئے نارِ خودی نور و حضور

یعنی بغیر اسلام کے نور یا نارِ خودی کا وجود ممکن نہیں۔ اگر اسلام ہے تو نارِ خودی جس سے مراد زندگی کے مصائب و آلام، اضطراب و التہاب ہیں وہ بھی نور و حضور میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ ؎

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر　　دوسرا نام اسی دین کا ہے "فقرِ غیور"

اقبال نے صرف اس مسلمان کو مومن کا خطاب دیا ہے جس نے خودی کے تمام صفاتِ حسنہ بدرجۂ اتم اپنی ذات میں مجتمع کر لئے ہوں ؎

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری　　مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا　　مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں　　مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

مومن کیسا ہونا چاہئے اور کیسا نہ ہونا چاہئے اقبال نے ابلیس کو اس کا شارح بنایا ہے ؎

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں　　ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں　　بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر　　حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب　　یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات　　ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!
ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے　　ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے　　یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم　　امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کیلئے کافی نہیں اس دور میں　　یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے　　تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام　　چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر　　جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اقبال کے پیغامِ خودی کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان اس روح سے بے خبر ہو گئے ہیں جس کا نام جہدِ پیہم اور حسنِ عمل ہے۔ دین کے ملحقات کو اس کی روحِ رواں سمجھ لیا ہے اور بیہودہ مباحث میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ وہ دین جو سراسر عمل تھا جس نے سرمایہ داری کو مردود قرار دیا اور منعم کو دولت کا امین اور اس کی منصفانہ تقسیم کا آلۂ کار بنایا، وہ دین جو ناموس کا محافظ تھا جس میں حیا اور ایمان مرادف تھے وہ دین جس نے زمین کو انسان یا بادشاہ کی ملک نہیں بلکہ ملکِ خدا ہونے کا اعلان کیا تھا، دور از کار باتوں میں وقت گنوایا جاتا ہے، گویا قبل بعثت کی جہالت واپس آگئی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ لات و منات کی

جگر الہیات کے تراشے ہوئے بت پوجے جاتے ہیں سے
نگارخانۂ عرفاں تھا دین جسکی جگہ کئے ہیں وضع صنمخانۂ ہوا لعجبی

ایک لحاظ سے اقبال کا فلسفۂ خودی محدود ہے کیونکہ اسکے مخاطب صحیح مسلمان اور صرف مسلمان ہیں۔ ایک اعتبار سے اس کا دائرہ وسیع ہے کیونکہ قومیت کا تصور ملک یا وطن سے گزر کر ملت سے وابستہ ہوگیا ہے اور اس راستۂ کامل کا انکشاف ہے جس کے فیض سے دنیا ایک منجمد قطب سے دوسرے منجمد قطب تک سرسبز باغ بن جائے، صحرا گلزار اور ویرانے آباد ہوجائیں، سطح بحر پر متحرک محل نگینوں کی طرح چمکتے ہوں جہاز انواع واقسام کے مالِ تجارت سے پٹے پڑے ہوں، تبادلۂ اجناس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے حقوق کی نگہداشت ہو، تہذیب ملک ملک میں پھیلے اور محبت بھرے دل دور دراز مقامات سے آپس میں بغلگیر ہونے کو بیتاب ہوں، ہر بلندی پر ایک شہر آباد ہو اور میدان کے رہنے والوں کو نویدِ امن وبرکت دے۔ ہر مرد اپنی زندگی آسودگی سے بسر کرے، عورت کام میں ہاتھ بٹائے، دنیا ایک راحتکدہ کل دنیا ایک وسیع مکان بنجائے جسکے مکینوں میں اتفاق واتحاد ہو۔ سب خوش دلی کے ساتھ محنت کریں اور تخلیقی فنون کے موجد ہوں۔ سچ ہے کہ اختیار کے ساتھ یہ شانِ سپردگی ایک خواب ہے مگر بہرحال خواب محبت ہے اور اس کھردری درشت خودی سے بہتر ہے جس سے انانیت کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور جب تک انانیت ہے کوئی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اقبال کی شاعری جہاں خودی کو سراہتی ہے انانیت کو ٹھکرا دیتی ہو۔ اور یہی اس میں اور مارکسزم یا نیٹشے کے مافوق الانسان میں جدا امتیاز ہے
ملت کو جو فرعون کی میراث بنادے ارباب نظر میں وہ خودی ننگ خودی ہے

خاتمہ پر سید علی عباس جلالپوری کا قول نقل کرتا ہوں جسکے حرف حرف سے مجکو اتفاق ہے۔

جیسے مسلمانوں کے ہاتھوں اقبال کی فنی عظمت خطرے میں پڑ گئی ہے۔
وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اقبال محض امتِ مرحومہ کے احیاء کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کی تکمیل در تعبیر کے لئے بعض خصائص کے پیش نظر اپنے ہم مذہبوں کو ہی منتخب کیا مگر اسکی صحیح عظمت ان اشعار میں نمایاں ہوتی ہے جہاں وہ ملت و قوم کے احساس سے بالاتر ہوکر عالمگیر جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو شاعر اسلام یا مسلمان نہیں سمجھتا بلکہ انسان سمجھتا ہے۔ عمل کا ہنگامہ سرد ہوجانے کے بعد جیسا کسی عظیم المرتبت فنکار کے دل میں انسانی فطرت کی کمزوری اور حیاتِ مستعار کی بے ثباتی کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ اسکے کلام میں زمان ومکان کی لامتناہی وسعت اور ابدیت کے مقابلے میں انسان کا نالۂ کرب ویاس بلند ہو رہا ہے جسین اور دلکش فطری مناظر کے خاکے میں جب وہ لطیف احساسات کے رنگ بھرتا ہے یا ترنم اور ہم آہنگ ترکیبوں میں لطیف تشبیہ کو سمو کر شاعری اور موسیقی کے ڈانڈے ملا دیتا ہے تو ہم پر آرٹ کی عظمت واضح ہوجاتی ہے ❖

"کیسا روپ انوپ ہے!"

دیکھو کیسا روپ انوپ نکھارا — کیسا روپ انوپ!

میٹھا جل سے سینچی کیاری — جھوم رہی ہے ڈاری ڈاری
کومل کومل کلیاں پھوٹیں — رنگ بھری پچکاری!!

دیکھو کیسا روپ انوپ نکھارا — کیسا روپ انوپ!

ہرا بھرا سبزہ متوالا — باگ کا جوبن ہوا دوبالا
پھول کی سندرتا کا اک اک — کانٹا بنا رکھوالا!!

دیکھو کیسا روپ انوپ نکھارا — کیسا روپ انوپ!

منچل منچل پھول کھلائے — بھونروں کے ہیں دل للچائے
جھولا جھولے کونپل کونپل — کلی کلی مسکائے!!

دیکھو کیسا روپ انوپ نکھارا — کیسا روپ انوپ۔

منصور معجز

گلبانگِ جنوں!

سرشکِ خوں ہو غمِ آرزو کا افسانہ — کہ رنگِ بادہ سے ظاہر ہے رازِ میخانہ
نہ اپنا ہوش۔ نہ دل کی خبر۔ نہ تابِ نظر — عجیب چیز ہے ساقی کی چشمِ مستانہ
حقیقت ایک فقط لاالہ الا اللہ — یہ ہست و بود کا عالم تمام افسانہ
بلند بام رہا ہے جہاں میں فقرِ غیور — ازل سے دار پہ درویش کا ہی کاشانہ
خرد سراغِ حقیقت سے آشنا نہ ہوئی — خرد کا راز ہے ذوقِ نظر سے بیگانہ
سما سکا نہ جنوں جز دلِ خراب کہیں — کو میرے کام نہ آیا یہ تیرا ویرانہ
فقیری ایک زمانے کی ہو خداوندی — سکندری کے ہیں انداز سب گدایانہ
کمالِ علم و ہنر ایک مستیٔ احوال — ہزار صاحبِ ادراک ایک دیوانہ
یقیں نگاہ۔ یقیں معرفت یقینِ فاں! — یقیں خودی ہے یقیں ضربِ کلیمانہ
وہ بے حجاب بھی ہو کر حجاب ہی میں رہا — تمام ہو نہ سکا آرزو کا افسانہ
ہر ایک اپنی غرض کا یہاں پجاری ہے — کسے خبر کہ یہ مسجد ہے یا صنم خانہ
مرے حضور سے غافل ہوئی نہ میری نظر
جنوں میں بھی نہ رہا میں خودی سے بیگانہ

[illegible]

برطانیہ کے نئے وزیر اعظم

آغا محمد اشرف

۲۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو تمام دنیا نے یہ خبر نہایت حیرت سے سنی کہ برطانی الیکشن کا نتیجہ لیبر پارٹی کے حق میں نکلا۔ اور بادشاہ سلامت نے لیبر پارٹی کے لیڈر مسٹر کلیمنٹ ایٹلی کو نئی وزارت بنانے کی دعوت دی جسے انھوں نے اپنی پارٹی کی طرف سے قبول کر لیا گویا تقریباً پانچ سال تک مسٹر چرچل برطانی حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔ اور اب برطانیہ کے ووٹ دینے والوں نے ان کی جگہ اپنا نیا وزیر اعظم چن لیا۔ چنانچہ آج تمام دنیا میں ہر طرف پوچھا جا رہا ہے کہ مسٹر ایٹلی کون ہیں؟ پچھلے دس گیارہ سال سے مسٹر ایٹلی کا نام لیبر پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے اکثر سننے میں آتا ہے۔ لیکن ان کی شخصیت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ کیونکہ نہ یہ مسٹر چرچل کی طرح شیوا بیان مقرر ہیں۔ اور نہ مرحوم لائڈ جارج کی طرح ان کے چہرے میں کوئی ایسی خاص کشش ہے کہ سب کی آنکھیں خود بخود اُن کی طرف اٹھ جائیں۔ اخباروں میں ان کی تصویریں اب تک بہت کم چھپی ہیں۔ اور ریڈیو پر ان کی آواز بھی بہت کم سننے میں آتی ہے۔ اس لئے عام طور سے لوگ مسٹر ایٹلی سے واقف نہیں۔

مئی ۱۹۴۰ء میں مسٹر چرچل نے جب قومی گورنمنٹ بنائی تو اس میں نائب وزیر اعظم کا عہدہ مسٹر ایٹلی کو دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت مسٹر چرچل کے سامنے ایسی ماند نظر آتی تھی کہ انہیں چمکنے کا کبھی موقعہ نہ ملا۔ سب سے پہلی دفعہ میں نے مسٹر ایٹلی کو جولائی ۱۹۴۲ء میں برطانی دارالعوام میں دیکھا تھا۔ اس ہفتے مارشل رومل کی فوجیں لیبیا میں آگے بڑھتے بڑھتے اسکندریہ سے صرف چند میل کے فاصلہ پر پہنچ چکی تھیں۔ توبرق کا زبردست قلعہ جرمن فتح کر چکے تھے۔ سنگاپور کی بندرگاہ پر جاپان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اور روسی مورچے پر جرمن لشکر کوہ قاف کے دامن میں کھڑا بحیرہ خضر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے اس وقت تمام برطانیہ میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔

برطانی پارلیمنٹ میں صدر کے دائیں ہاتھ پہلی قطار میں گورنمنٹ کے وزیر بیٹھتے ہیں۔ اور جب تمام وزیر جمع ہو جائیں تو ایک بنچ پر بھی بیٹھنے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ وزیروں کے درمیان بپھرے ہوئے شیر کی طرح مسٹر چرچل بیٹھے مخالف ممبروں کی زہر میں بجھی ہوئی تقریریں سن رہے تھے۔ ان کے برابر تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ اور اس کے بعد برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر انتھنی ایڈن بیٹھے تھے۔ جن لوگوں نے مسٹر ایڈن کو دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ تمام برطانیہ میں ان کے لباس کی خوبصورت تراش مشہور ہے۔ اور جس مجمع میں مسٹر ایڈن پہنچ جاتے ہیں سب کی نظریں ان کے پروقار اور سنجیدہ چہرے کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک دبلا پتلا۔ لمبے قد کا شخص کالا سوٹ پہنے ہوئے آیا۔ اور مسٹر چرچل اور مسٹر ایڈن کے درمیان جو ذرا سی خالی جگہ نظر آ رہی تھی وہاں آ کر بیٹھ گیا۔ سر پر ایک بال نہیں سیاہ کتری ہوئی مونچھیں تھا اور ہاتھ میں عینک۔ ایک صاحب نے بتایا کہ یہ مسٹر ایٹلی ہیں۔ مسٹر ایٹلی اس وقت برطانیہ کی دو بڑی شخصیتوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ اور وہ بھی اس طرح جیسے مسٹر چرچل کی آڑ لے کر بیٹھے ہوں۔ وزیروں کی بنچ پر سر جیمز گرگ۔ مسٹر ایمرے۔ مسٹر بیون۔ سر جان اینڈرسن۔ اور مسٹر موریسن بھی بیٹھے تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہر وزیر میں کوئی نہ کوئی جاذبیت ضرور تھی صرف مسٹر ایٹلی ایک ایسے وزیر تھے کہ جن کے چہرے مہرے میں مجھے کوئی کشش نظر نہ آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دارالعوام میں مسٹر چرچل کی آڑ لے کر بیٹھنا چاہتے تھے۔

یہی حجاب۔ جھجک۔ اور انکسار مسٹر ایٹلی کی شخصیت کے سب سے بڑے جوہر ہیں۔ مسٹر ایٹلی کی عمر اس وقت باسٹھ سال کی ہے۔ انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ اور بیرسٹری کا پیشہ اپنے لئے چنا۔ مگر ابھی ان کی عمر ۲۴ سال کی تھی کہ انھیں لندن کے غریبوں اور مفلسوں کے حالات پر غور و فکر کرنے کا شوق ہوا۔ اور یہ لندن کے ایسٹ اینڈ والے علاقے میں رہنے لگے۔ ایک مدت تک وہاں انھوں نے غریبوں کی فلاح اور بہبود کا کام کیا۔ اور ایسٹ اینڈ میں رہنے کی وجہ سے غربت اور مفلسی کا ایسا اثر ان کے دل پر بیٹھا کہ یہ اشتراکیت کے حامی بن گئے۔ اسی زمانہ میں جب کہ یہ ایسٹ اینڈ میں رہا کرتے تھے انھیں خالی وقت میں بڑھئی کے کام کا چسکا لگا۔ جو آج تک باقی ہے۔ اور اب بھی جب کبھی انہیں فرصت ملتی ہے اپنے ہاتھ سے کرسیاں۔ اسٹول اور میزیں بنایا کرتے ہیں۔ اشتراکیت سے دلچسپی مسٹر ایٹلی کو لیبر پارٹی میں لے گئی۔ اور اسی پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے ۱۹۲۲ء میں یہ پارلیمنٹ میں داخل ہوئے۔ ان دنوں لیبر پارٹی کے لیڈر مسٹر رامزے میکڈانلڈ تھے۔ اور مسٹر ایٹلی ایک مدت تک پارلیمنٹ میں مسٹر میکڈانلڈ کے سکرٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے ساتھ ہندوستان آئے۔ ۱۹۳۵ء کے جنرل الیکشن میں جب لیبر پارٹی کے لیڈر مسٹر لینسبری کو شکست ہوئی تو پارلیمنٹ کی لیبر پارٹی کا لیڈر مسٹر ایٹلی کو مقرر کیا گیا۔ اور آج اسی حیثیت سے برطانیہ کے وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔

مسٹر ایٹلی فطرتاً نہایت خاموش ہیں۔ مگر جب یہ ایک دفعہ کسی کام پر لگ جاتے ہیں تو اسے ختم کر کے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ ان کی زندگی خاموشی سے

باقی صفحہ [illegible]

رائٹ آنریبل سر اسٹیفورڈ کرپس

رائٹ آنریبل مسٹر کلیمنٹ ایٹلی۔

ایٹلی، کرپس اور بیون

برطانوی پارلیمنٹ کے نئے انتخابات میں لیبر جماعت پہلی مرتبہ مکمل اکثریت سے برسر اقتدار آئی اور اس جماعت کے صدر مسٹر ایٹلی وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ نئی کابینہ میں مسٹر ارنسٹ بیون اور سر اسٹیفورڈ کرپس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسٹر بیون وزیر خارجہ اور سر اسٹیفورڈ کرپس بورڈ آف ٹریڈ کے صدر ہیں۔

← رائٹ آنریبل مسٹر ارنسٹ بیون۔

...ایم افغان آرٹ

...استان میں فنون لطیفہ کی تاریخ اس
...ت سے شروع ہوتی ہے جب یہاں
...انیوں کی حکومت تھی۔ اس زمانہ
... فنکار روم اور یونان کے فنکاروں
... تقلید کرتے تھے اور زیادہ تر روم
... یونان ہی کے مشہور پہلوانوں
...ہیوں فلسفیوں اور حسین عورتوں کے
...سمے بناتے تھے۔ ابھی یونانی اثر زائل
... ہونے پایا تھا کہ بدھ مت نے اس ملک
...گہرا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ یہاں کے
...ندوں کے بدھ مذہب اختیار کر لینے پر
...ں کے فنون پر بھی اس کا اثر پڑنے لگا۔
...دوستانی اور یونانی فنون کی ملاوٹ
... جو نیا طرز ظہور میں آیا اسکو
...ندھارآرٹ ، کہتے ہیں۔ اس آرٹ نے
...ب سے زیادہ ترقی کشان خاندان کے
...شاہوں کے زمانہ میں کی۔ رفتہ رفتہ
...انی اثر کم ہوتا گیا یہانتک کہ آخر میں
...اص ہندوستانی آرٹ رہ گیا۔ اس زمانہ
... سنگتراشی کے نمونے پتھر کے مجسموں
...ر مٹھوں کی صورت میں ابتک ملتے
...ں۔ مہاتما بدھ کے دو بڑے مجسمے
خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مہاتما بدھ کا ایک بڑا خوبصورت مجسمہ جو ۷۰۰ ق۔ م۔ میں بنایا گیا تھا۔
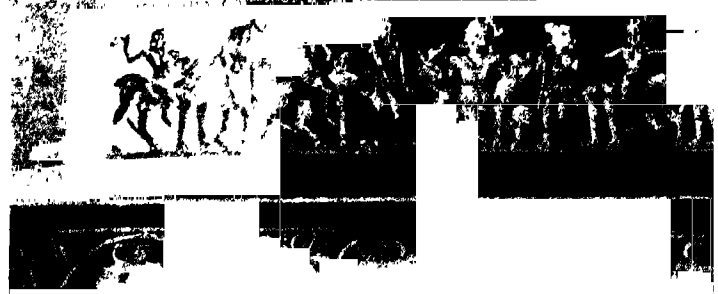
ہاتھی دانت کی تصویریں اور جالیاں۔ یہ کام غالباً پہلی یا دوسری صدی عیسوی کا ہے۔

قفقاز د ییل

چرچا بڑھنے سے یہاں بہت سے سائنسداں پیدا ہونے لگے ہیں۔

قفقاز کے سائنسدان پٹرول کی جانچ کر رہے ہیں۔

طرف) قفقاز کے پہاڑی علاقہ میں بجلی کی ریل۔ اس سے انجنری کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔

) باکو کے تیل کے میدانوں میں تیل کچی حالت میں لہریں مار رہا ہے۔

ے کے دانے توڑنے کا کام زیادہ تر عورتیں کرتی ہیں۔
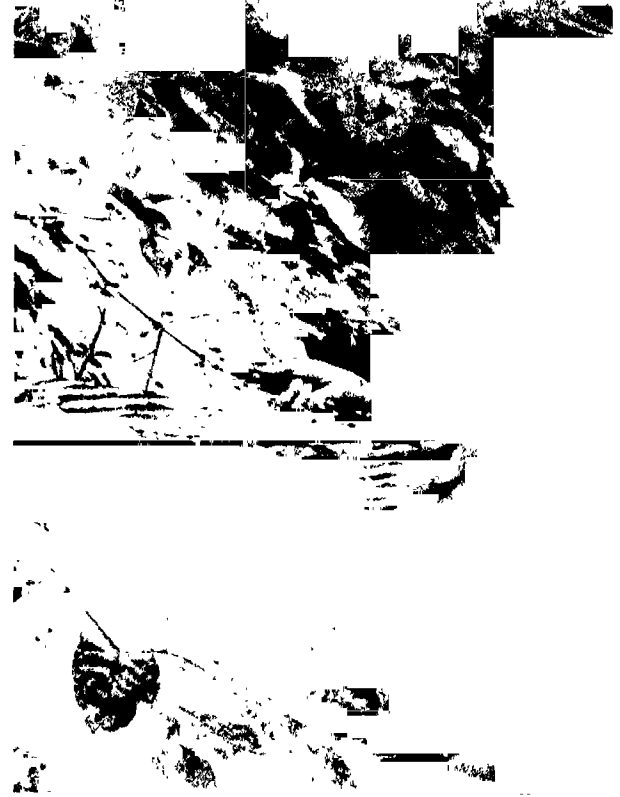
جنوبی ہند کا ایک مالی اپنی مخصوص وضع میں۔

ہندوستان کا قہوہ

قہوہ کے متعلق ایک دلچسپ کہانی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان درویش جسکا نام بابا بودن تھا تقریباً ۱۶۰۰ع میں مکہ سے ہندوستان آیا اور جنوبی ہندوستان میں رہنے لگا وہ اپنے ساتھ قہوہ کے سات دانے لایا تھا۔ انکو اسنے اپنی مسجد کے پاس بو دیا۔ ہندوستان کے کل قہوہ کے پہلے بیج یہی سات دانے تھے۔

قہوہ کی پیداوار کیلئے جنوبی ہندوستان کے پہاڑ جسقدر موزوں ہیں اسقدر دنیا میں اور خطے بہت کم ہونگے بارش کی بہتات' تیز دھوپ' زرخیز صحرائی زمین اور پہاڑوں کا ڈھلان یہ سب باتیں قہوہ کیلئے بہت ہی مفید ہیں۔

پہلے قہوہ کی کاشت بہت ہی تھوڑی سی جگہ میں کی جاتی تھی لیکن یہ دیکھکر کہ اسکی تجارت بہت نفع بخش ہوسکتی ہے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۹۹ میں مغربی ساحل پر تجربہ کے بطور اسکی کاشت شروع کی۔ پہلے جو زمین گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھی اس میں قہوہ کی کاشت ہونے لگی۔ برسوں کے تجربہ کے بعد ہندوستان کو قہوہ بونے اور تیار کرنے میں بڑی مہارت حاصل ہوگئی ہے۔ قہوہ کی پھلیوں میں سے دانے نکالنے کے خاص طریقے سے یہاں کے قہوہ میں ایک خاص مزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس مزہ نے ہندوستان کے قہوہ کو تمام دنیا میں مشہور کردیا ہے۔

ہندوستان میں تقریباً اٹھارہ ہزار ٹن قہوہ پیدا ہوتا ہے۔ اسکا نصف ہندوستان میں کھپ جاتا ہے باقی دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ دوسرے ملکوں کی پیداوار کے مقابلہ میں یہ مقدار کچھ بھی نہیں لیکن اس میں اضافہ کی بہت گنجائش ہے۔ اس لئے ۱۹۳۵ء میں حکومت نے ایک خاص کمیٹی بنائی تھی جسکا کام یہ تھا کہ ملک کے اندر قہوہ کی کھپت زیادہ سے زیادہ ہونے لگے۔ یہ تجویز بہت کامیاب ہوئی۔ ہر بڑے شہر میں قہوہ خانے کھولے گئے جو خوب چلے۔ باہر بھیجنے کا سلسلہ جنگ کی وجہ سے منقطع ہوگیا تھا اب پھر شروع ہوجائے گا۔

قہوے کے کھیتوں میں
چاروں طرف سبزہ اور
خوشگوار خنکی چھائی
رہتی ہے اسلئے کھیت
میں کام کرنے والوں کو
کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

قہوہ کے دانوں کو رولا جا رہا ہے

ہ کے ایک کارخانہ کے میدان میں قہوہ کے دانوں
سوکھنےکیلئے پھیلایا جارہا ہے۔

مختلف قسم کے دانوں کو
ین کر الگ کیا جا رہا ہے۔

منچوریا

مکدن میں شاہی قبرستان کے
پاس ایک باغ میں ہرنوں کے
رہنے کا احاطہ ۔ →

شاہی قبرستان چینی فن تعمیر کا
ایک عمدہ نمونہ ہے ۔ ←

ہربن کا ایک پر رونق بازار
(نیچے بائیں طرف)

منچوریا میں نئی وضع کی سڑکیں
بن رہی ہیں۔ ↓

کالا ناگ

یہ کالا ناگ جو ایشیا کے دلدلی جنگلوں میں پایا جاتا ہے بہت زہریلا ہوتا ہے۔ اپنے سے چھوٹے سانپوں کا شکار کرکے اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ اگر یہ کسی آدمی کو کاٹ کھائے اور زہر دور کرنے کی کوئی دوا نہ لگائی جاسکے تو وہ آدمی آدھ گھنٹہ میں مر جاتا ہے۔ اس خاص قسم کے ناگ کو انگریزی میں "کنگ کوبرا" کہتے ہیں۔
(تصویریں انگریزی رسالہ "پکچر پوسٹ" سے لی گئیں)

سانپ تھوڑی دیر تک شکاری ناگ کے منہ میں بل کھاتا ہے، پھر آخر مر ہی جاتا ہے۔

ناگ سب سے پہلے سانپ کا سر چباتا ہے۔

سانپ کوڑی مار لیتا ہے پھر بھی ناگ اسکو سٹک جاتا ہے۔
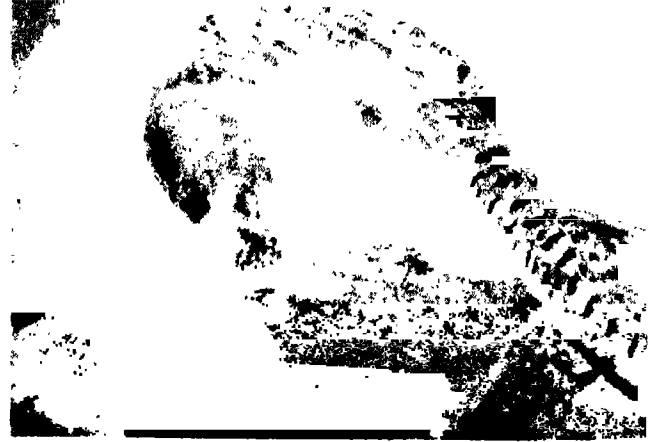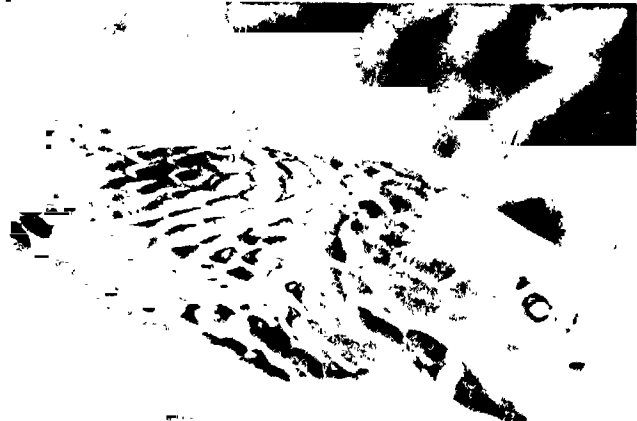
ناگ کا آخری لقمہ۔

کھانا ختم ہوچکا ہے اب ناگ نے سونے کی ٹھان لی ہے

'مظہر آرٹ پروڈکشن' کی ایک نئی اداکار۔

پھر گیا آنکھوں میں اپنی اک جمالِ جانفزا
وہ مری پیاری صبوحی! وہ نگارِ دلربا
وہ فروغِ رنگ و نگہت وہ بہارِ زندگی
تاجدارِ شعر و نغمہ شاہکارِ زندگی
وہ کہ تھی جو عندلیب خوش بیانِ شاعری
خندہ زن تھا جس کے دم سے بوستانِ شاعری
وہ کہ سرتاسر جو تھی تفسیر آیات جمال!
جس کا پیکر خالقِ حسن و محبت کا کمال!
اُس کی ناکام محبت زندگی یاد آگئی
حسن کی وہ والہانہ بندگی یاد آگئی

اک جوانِ افکار شاعر سے محبت تھی اُسے
تاجدارِ شعر و نغمہ سے محبت تھی اُسے
اُف وہ معبودِ سخن وہ شاعرِ عہدِ شباب
وہ کہ زیب تھا "خدائے شعر" کا جس کو خطاب
ہائے وہ شاہِ تغزل! شاعرِ جادو بیاں!
جو کہ کہتا تھا صبوحی کو مری نورِ جہاں
دونوں جانب سے لکھے جانے لگے مکتوبِ شوق
دلربا طرزِ نگارش، دلنشیں اسلوبِ شوق
کچھ خطوں میں نامکمل داستانِ آرزو
کچھ تعمد ہی تصور میں بیانِ آرزو
رفتہ رفتہ یہ جنونِ آرزو اتنا بڑھا
ذوقِ دیدارِ جمالِ رنگ و بو اتنا بڑھا
التجائیں حسن نے کیں اضطرابِ شوق میں
آرزوئے دیدنی کی التہابِ شوق میں

(۲)

موسمِ برسات کی اک مست و رنگیں شام کو
آرزوؤں سے مہکتی شوخ و شیریں شام کو
کس قدر پر لطف تھا وہ ارتباطِ حسن و عشق
کاش کوئی دیکھتا وہ اختلاطِ حسن و عشق
حسن نے شاعر کی جانب کی اچٹتی سی نگاہ
قلب نازک ہل گیا یہ کیا ہے یارب آہ آہ!
ایک مردِ پستہ قد، یک چشم و کم رو کم ادا
روبرو آیا بجائے شاعرِ نور و ضیا
چھا گئی ظلمت امیدوں کی سنہری رات پہ
گر پڑی برقِ ستم ناز آفریں جذبات پہ
ایک بجلی تھی جو قلبِ روح کو گرما گئی
حیف یارب یوں امیدوں کی کلی مرجھا گئی
ہو گیا خاموش و غمگیں وہ شباب تازہ تر
جھک گئی چشمِ فسوں زا ہل گئے قلب و جگر
یا الٰہی! کیا یہی ہے شاعرِ جادو بیاں!
رازدارِ دو جہاں تھی جس کی کلکِ گل فشاں
یا الٰہی! کیا یہی ہے شاعرِ نور و جمال!!!
مطربِ سازِ محبت ساقیِ بزمِ خیال
بڑھ گئی کیفیتِ دردِ جگر حد سے فزوں
انتہائے یاس سے بہنے لگے قطراتِ خوں
اُف وہ مجروحِ تخیل پیکرِ درد و الم!
وہ مری پیاری صبوحی! زخمیِ تیرِ ستم

(۳)

ہو گئے یہ واقعہ گزرے ہوئے تو بیس سال
تھا مگر باقی صبوحی کا وہی رنج و ملال
اب وہ تھی بدر منیر آسمانِ شاعری
منکشف اس نے کئے سربستہ نہانِ شاعری
شعر کہتی تھی غزالہ کے وہ شیریں نام سے
آشنا وہ ہو چکی تھی تلخیِ ایام سے
تھی کمر بستہ کہ لوں جنسِ قوی سے انتقام
تا کہ اطمینان سے ہو زندگی کا اختتام
تھا نسیم ہاشمی اک شاعرِ رنگیں بیاں!
وہ چمن زادِ ادب کی طوطیِ شکر فشاں
آہ وہ شاعر کہ تھا جو نغمہ سنجِ آرزو!
نغمہ سنجِ آرزو تھا شکوہ سنجِ آرزو

وہ کہ منظومات جس کی پیکرِ انوار تھیں
اور غزلیں جس کی نازِ شوخیِ گفتار تھیں
جس کی تھی فکرِ تخیل ماورا ادراک سے
داد دیتے تھے جسے ماہ و نجم افلاک سے
تھی غزالہ کی جواں نظموں سے انسیت اسے
ہو گئی تھی شاعرہ سے دل میں کچھ الفت اسے
سوچتا تھا آہ یہ دوشیزۂ نغمات و نور
یہ بہارِ حسنِ جنت داستانِ برقِ طور

کاش یہ تفسیرِ گلشن ہو مرے پہلو نشیں
اس کے آگے روز و شب جھکتی رہے میری جبیں

اس نے لکھا شاعرہ کو اے مری حورِ جمیل
اے کہ نازاں تجھ پہ باغِ خلد کا حسنِ شکیل
تجھ سے اتنی التجا ہے جانِ جانِ آرزو
خلوتوں میں کاش تو ہو مجھ سے محوِ گفتگو
آہ اے حسنِ ازل، اے جلوۂ مجسم شہاب
تیری بزمِ نازنیں، میں بھی کبھی ہوں باریاب
اے بہشتی یاسمن زاروں کی خوابِ دلنشیں
اپنے آگے سر جھکانے کی اجازت دے کہیں!
ملکۂ رقص و ترنم! اے مری زیب النسا
سن رہی ہے کیا تو اک ناکام شاعر کی صدا
پہنچا دستِ شاعرہ میں جب پیامِ آرزو
بولی! مدت سے اسی دن کی تھی مجھکو جستجو

ہاں ملوں گی میں یقیناً اور اسے تڑپاؤں گی
رو ئیگا وہ اور گانے میں خوشی کے گاؤں گی

(۴)

ایک رنگیں صبح جو پرکیف و نکہت بیز تھی
آفتاب لالہ رو سے جو تجلی ریز تھی
تھے وہ سرشارِ محبت جب ملے اک باغ میں
ہو گیا وصلِ مہ و خور کا گماں اس باغ میں
وہ خدائے شعر و نغمہ کس قدر مسرور تھا
دیدنی سے حسن کی دل کیف سے معمور تھا
انتہائے شوق سے کی حسن کی جانب نظر
رہ گیا دل تھام کر وہ شاعرِ فطرت مگر

چشم سرمہ بار کے آگے اندھیرا آ گیا
تیر یہ کیسا لگا جو قلب کو تڑپا گیا

موت یا رب موت تاب ضبط اب باقی نہیں
کیا یہی ہے وہ مری دوشیزۂ ناز آفریں
رازداں ہے کیا یہی میرے دلِ ناکام کی
داد کیا دی ہے اسی نے عشق کے پیغام کی
شاعرہ نے نوجواں کی دیکھی جب حالت زبوں
زور سے ہنس کر ہوئی گویا بانداز جنوں
سن ذرا نوخیز شاعر میرے غم کی داستاں
میری فکرِ شاعری کا جب تھا عہدِ گلفشاں
کیا کہوں اے نوجواں تجھ سے کہ اک مردِ ضعیف
قابلِ لعنت یقیناً جس کی تھی ذات کثیف
ہجو دو سرشار کر کے اپنے الہامات سے
مدتوں کھیلا کیا ظالم مرے جذبات سے
پہلے تو مجھکو کیا رازِ محبت کا امیں
بن گیا پھر رفتہ رفتہ قلبِ محزوں کا مکیں
کیا کہوں کس درجہ تھیں پرنور میری خلوتیں
اور لبا ئی تھیں تصور کی سنہری جنتیں
لیکن اس کو دیکھ کر جاتے رہے ہوش و حواس
آج تک اے نوجواں ہوں میں یونہی مجروحِ یاس
اور اسی دن سے کیا تھا میں نے عزمِ انتقام
آج ہے سیراب میری آرزوئے تشنہ کام!
سن لیا شاعر نے جب سارا خروشِ دل گداز
منکشف جب ہو گیا سب قصۂ راز و نیاز

ایک آہِ سرد کی خاموش ہو کر رہ گیا
دردِ ناکامی سے وہ بیہوش ہو کر رہ گیا

تصحیح ۱۵ اگست کے آجکل میں علامہ نیاز فتحپوری کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں علامہ موصوف کا سنِ پیدائش سہواً ۱۸۹۹ء لکھ دیا گیا۔ قارئین کرام اسے ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء کر لیں۔ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ علامہ موصوف کی نظم "بہار کی دیوی" جو اسی اشاعت کے صفحہ ۳ پر درج ہے آج سے ۵۴ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ یہ صراحت بھی سہواً رہ گئی تھی۔

ہندوستان اور برما کے ثقافتی تعلقات

پی۔ گنگولی

یہ بات ظاہر ہے کہ ایک اوسط برمی منگولوں کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر برمیوں کی صورت شکل ہی سے اندازہ لگایا جائے تو یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ برما والوں کا منگولوں کی تہذیب کے مرکز یعنی چین سے نسلی تعلق ہونے کی وجہ سے ان کی تہذیب کا ماخذ بھی چین ہی ہوگا لیکن غور کرنے سے پتہ چلے گا کہ برما کی تہذیب پر زیادہ اثر چین کا نہیں بلکہ ہندوستان کا پڑا ہے۔ برما کے فن تعمیر، ڈراما، رسم الخط، زبان، ادب، اور حکایات کسی نہ کسی طرح سے یہی ثابت کرتی ہیں کہ برما کی تہذیب زیادہ تر ہندوستانی تہذیب ہی سے متاثر ہے مگر اس پر مقامی حالات کا اثر ضرور پڑا ہے۔ اس طرح گویا برما کی تہذیب کی بنیاد ہندوستانی تہذیب ہے مگر ایک بات یاد رکھنی چاہیئے کہ برما کی تہذیب "برمی" ہے۔ اسے ہندوستانی تہذیب نہیں کہا جا سکتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان اور برما کے تعلقات نے ہندوستان کے بہت سے خیالات عقائد اور طور طریقے برما میں داخل کر دیئے جنہوں نے وہاں کے مقامی حالات اور آبادی کی ضروریات کے مطابق ہو کر برمی تہذیب کی صورت اختیار کر لی۔

یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ برما کی روایاتی تاریخ کے مطابق شروع شروع میں "ابھیر زاجہ" اپنے ساکیہ قبیلہ والوں کے ساتھ ہندوستان (کپل وستو) سے یہاں آکر ۸۵۰ء قبل مسیح میں "تاگوانگ" اور اراکان میں ۸۲۵ء قبل مسیح میں کیوکپا وانگ نامی شہر بسائے۔ برما، جاوا، سماترا، بورنیو اور توکنین کے آثار قدیمہ کے متعلق تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ان ملکوں اور ہندوستان کے درمیان قدیم زمانہ سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ جو لوگ ہندوستان سے ان ملکوں میں گئے ان کے ساتھ ان کی عادتیں، رسم و رواج اور مذہب بھی پہنچا۔ ان تاجروں میں سے کچھ یہیں آباد ہو گئے۔ اثریات کے ماہرین نے ان خطوں کو "ہند بعید" کہا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان پر ہندوستان کا بہت اثر پڑا تھا۔ برما کا شمار بھی انہیں ملکوں میں ہے جو ہندوستان کی تہذیب سے بہت متاثر ہوئے۔

جی۔ اے۔ ہاروِٹ اپنی کتاب "تاریخ برما" میں لکھتا ہے۔

"برمی منگولوں کی نسل سے ہیں لیکن ان کی روایات اور رسم و رواج چین کے بجائے ہندوستان سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کی قدیم تاریخیں پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گوتم بدھ کے معتقدوں کی اولاد ہیں جو کسی زمانہ میں شمالی ہندوستان میں رہتے تھے۔ ان لوگوں کے دیہاتی گیت بہت کچھ ہندوؤں کے ایسے ہیں۔ ان کے اکثر شہروں کے دو دو نام ہیں، ایک تو دیسی زبان کا اور ایک قدیم ہندوستانی زبان کا۔ ان قدیم ناموں سے کچھ کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے انہی ناموں کی جگہوں سے لوگ آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ اس طرح پیگو کا پرانا نام اوسا دراصل اڑیسا ہی ہے اور اس سے یہ رفتہ رفتہ پیگو ہو گیا۔ برمیوں کی موجودہ رسم و رواج کے ہندوستانی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قدیم منگول روایات فنا ہو گئیں۔ ہندوستانی نو واردوں کا حاکم طبقہ ہی لکھ پڑھ سکتا تھا اور وہی روایات کو زندہ رکھ سکتا تھا۔"

شروع شروع میں ہندوستان سے برما جانے کے لئے آسام کے ذریعہ خشکی کے راستے اور مدراس اور برما کی بندرگاہوں کے درمیان سمندری راستے استعمال کئے گئے۔ جو خشکی سے آئے وہ شمالی برما میں رہنے لگے۔ اور جو مدراس سے آئے انہوں نے جنوبی برما میں بود و باش اختیار کر لی۔ تھاٹن، پروم، پیگو اور رنگون وغیرہ شہروں میں بہت سے ہندوستانی آباد تھے۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے وہ اپنے ساتھ زندگی کا طریقہ اور تہذیبی نمونے لائے تھے جو اپنی مختلف صلاحیتوں کی وجہ سے برما کے طول و عرض میں پھیل گئے اور یہاں کی تہذیب پر اثر ڈالا۔

آیئے اب کچھ برمی تعمیرات کا ذکر کریں کیونکہ برما کے حکمرانوں نے بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ برما کی تعمیرات کی سب سے اہم صنف پیگوڈا ہیں جن پر ہندوستانی اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ہاروے پیگوڈاؤں کی شروعات کا اس طرح ذکر کرتا ہے۔ "دوسرے اچھے ہندوؤں کی طرح ہندوستان سے آنے والے ان قدیم تاجروں نے بھی یہاں مندر بنوائے۔ شاید انہی مندروں کی بنیاد پر پیگو میں "شو ہموڈو" رنگون میں "شوڈیگن" اور تھاٹن میں "شو یزایان" نامی پیگوڈے تعمیر ہوئے۔ یہ سب حضرت عیسیٰ کے زمانے سے پہلے کے ہیں۔

پاگن میں جہاں ابتک پانچ ہزار پیگوڈاؤں کے آثار موجود ہیں، برہمنوں اور بدھوں دونوں کے اثرات کام کر رہے تھے۔ پیگوڈے زیادہ تر اینٹوں کی بنی ہوئی عمارتیں ہیں جن کے اندر عمدہ سنگ تراشی دیواری مصوری، چمکدار پکی ہوئی اینٹیں اور "جاتک" (گوتم بدھ کی پیدائش سے متعلق روایات) کی تصویریں ہیں۔ یہ پیگوڈے کئی طرح کے ہیں لیکن ان میں سے اکثر ہندوستانی انداز کے ہیں۔ گول اور لمبے سارناتھ کے دھامک استوپوں جیسے ہیں اور راسپاڈا اور پیوین گیا جم کے مندر سنگھالی قسم کے ہیں۔ ان کے علاوہ برما کی عمارتوں میں دو اور قسموں کا ہندوستانی فن تعمیر نظر آتا ہے۔ برما کا مہا بودھی مندر ہندوستان میں گیا کے بودھ مندر جیسا ہے۔ برما میں بہت سی عمارتیں سندھ کے شہر میرپور خاص کے

اسٹوپ کے قسم کی ہیں۔ برما میں مجسمہ سازی کے بہت زیادہ نمونے نہیں ملتے۔ آجکل جو تھوڑے بہت موجود ہیں ان میں گپتا عہد کا کاٹے ہوئے مجسمہ مشہور دس اوتار نامی مورتیاں اور نان پایا کے منبت کاری کے نمونے شامل ہیں۔ آنند کے مجسمے خالص بودھی قسم اور امراوتی و سنالا کے طرز کے ہیں۔ برما میں مصوری کی بھی ایسی ہی کمی ہے۔ وہاں عام طور پر دیواروں پر تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ پگین کے مندروں کی دیواری تصویروں میں کئی عناصر شامل ہیں۔ ان کی بنیاد ہندو اور بودھ خیالات اور مقامی عقائد پر ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے ان کا تعلق بنگال، نیپال اور ایک حد تک ایلورا سے ہے۔

برما کے ادب اور ڈرامے کا ذکر کرنے سے پہلے برمائی زبان کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ برمائی زبان ایک رکنی ہے اور اس کے لفظ آپس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی زبانوں کے مقابلہ میں چینی زبان سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ طرز ادا اور زور بیان کے لحاظ سے ایک ہی رکن کے چھ یا اس سے بھی زیادہ معانی ہو سکتے ہیں[۱]۔

یہ عموماً صحیح ہے مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں تک برمی زبان پر غیر ملکی اثرات کا تعلق ہے اس میں پالی کا خاص حصہ ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے اسی مضمون کے مطابق برمائی زبان میں بہت سے ہندوستانی لفظ بھی شامل ہیں۔ سنسکرت اور پالی کے لفظوں کا برمی زبان میں شامل ہونا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ برمیوں کا رسم الخط براہ راست پالی سے لیا گیا ہے۔ ہارو کا بیان ہے کہ یہ رسم الخط پہلے پہل سنہ ۳۰۰ء کے قریب ہندوؤں کے مندر ملکوں میں پھیلاؤ کے سلسلہ میں جنوبی ہندوستان سے جزائر پیو میں آیا۔ پیو کے سب قدیم حروف کادمبا کے رسم الخط میں لکھے ہوئے ہیں جو اس زمانہ میں بمبئی کے ساحل پر گوا کے قریب رائج تھا۔

دوسری قوموں کی طرح برما کا سارا ابتدائی ادب نظم میں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نظم میں آہنگ ہوتا ہے اور اسے نثر کے مقابلہ میں زیادہ آسانی سے یاد رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے برمائی قدیم حکایتیں نسل در نسل رائج ہوتی چلی گئیں۔ جب برما میں لکھنے کا علم آیا اور لوگ نظم لکھنے کے لئے قواعد تلاش کرنے لگے تو قدرتی طور پر سنسکرت عروض کو نمونہ کے طور پر اختیار کیا گیا۔ شاعری کے لئے برمی لفظ لانگا پالی کے لفظ المکارا سے لیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ان دونوں میں مشابہت پائی جاتی ہے بدھ گھوسا (پانچویں صدی عیسوی) کی "مانو دھما اٹھت لانگا" جیسی اخلاقی نظموں کی تقطیع سنسکرت عروض کے قواعد کے مطابق کی جا سکتی ہے۔ غنائی شاعری کے لئے برمی لفظ کی بنیاد بھی پالی زبان

کے لفظ پر ہے۔ یہ لفظ "رتو ہے" جو بلاشبہ پالی کے لفظ "اُتو" سے بگڑ کر بنا ہے اور پالی لفظ "اُتو" کا ماخذ سنسکرت لفظ "رتیو" ہے۔ تینوں حالتوں میں اس لفظ کے معنے "موسم" ہیں یہ اشارہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برما کی ابتدائی غنائی شاعری موسم کے بدلنے سے تعلق رکھتی تھی۔ البتہ اس کے بعد "رتو" کا لفظ غنائی شاعری کے معنوں میں استعمال ہونے لگا خواہ ایسی شاعری کا موضوع کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

دنیا بھر میں ڈرامے کے آغاز کی طرح برما کا ڈراما بھی مذہبی اور دنیاوی ضروریات کے سبب وجود میں آیا۔ جاتکوں کی حکایات اور روایات بھی ڈراموں ہی کے ذریعہ اس طرح پیش کی جا سکتی تھیں کہ بہت دن تک یاد رہیں اکثر رام لیلائیں ہوتی تھیں، رنگ، حرکت اور واقعات کو ڈرامے کے طور پر پیش ہوتے ہوئے دیکھنے کی قدیم خواہش نے دنیاوی موضوعات کے متعلق ڈراموں کو ترقی دی۔ ان ڈراموں میں دیہاتی گیت اور قدیم رومانی اور افسانوی نظمیں استعمال ہوتی تھیں۔ یہ ڈرامے اب بھی مندروں کے میلوں کے موقعوں پر کھیلے جاتے ہیں لیکن ان میں موجودہ ڈراموں کی نفاستیں نہیں ہیں۔

برمی رنگ اور چہل پہل پسند کرتے ہیں، اس لئے ان کے یہاں بہت سے تہوار ہوتے ہیں برمیوں کو بدھ مت اختیار کرنے کے بعد بھی خوبصورت چیزوں کا شوق بدستور رہا۔ بدھ مت کے سخت اصول ہنسی دل لگی کی بہت کم اجازت دیتے تھے مگر برمیوں کا یہ جذبہ فنا نہ ہو سکا۔ ان کے تہواروں میں سے کچھ بدھ مت اختیار کرنے سے پیشتر کے ہیں۔ پانی کا تہوار جو اپریل میں ہوتا ہے ہمارے لئے خاص دلچسپی کی چیز ہے۔ اس موقع پر کھیل کود عام ہوتا ہے۔ ہر جگہ گانا بجانا ہوتا ہے۔ پانی میں ملا کر رنگ ڈالتے ہیں۔ یہ دراصل تہوار ہے جو بہار کی آمد پر منایا جاتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ وقت اور منانے کے طریقے کے لحاظ سے ہندوستان کے ہولی کے تہوار سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اسی طرح جیسے ہندوستان میں دیوالی کے موقع پر دئے جلائے جاتے ہیں ایسے ہی برما میں بھی ایک موقع پر ہر طرف چراغاں کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں تہوار اکتوبر ہی میں منائے جاتے ہیں۔

اس مختصر سے مقالہ میں برمائی زندگی کے ان دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں جو ہندوستانی زندگی سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ شاید سب سے زیادہ اختلاف ہندوستانیوں اور برمیوں کی مذہبی زندگی میں ہے۔ اس موضوع کیلئے ایک طویل مضمون کی ضرورت ہے لیکن یہ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو مذاہب ہندوستان میں پیدا ہو کر مشرقی ملکوں میں پھیلے اور جنہیں برمیوں نے اختیار کیا انہوں نے برمیوں اور ہندوستانیوں کی تہذیب میں یکسانیت پیدا کرنے میں بہت مدد دی۔ ان میں سب سے پہلا برہمنوں کا مذہب ہے۔ اسکے بعد بدھ مت آیا جو وہاں کا عام مذہب بن گیا۔ ان دونوں نے برمی زندگی پر بہت اثر ڈالا۔ اس میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے کہ ہندوستان نے برما کی تہذیب پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ برما کے مذہب، فنون لطیفہ، فن تعمیرات، ڈراما، ادب اور دیہاتی رسوم پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ برما ہندوستان کی تہذیب اور تمدن کا کس قدر ممنون ہے۔

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا جلد ۴ صفحہ ۴۲۷

دوزخ

افسانہ

شفیق بانو شفق

دوزخ — دوزخ — !! جہنم !!! دہکتے ہوئے خوفناک انگارے !!! کتابوں میں ۔ قرآن شریف کے ترجمہ میں نیکی بدی کے عمل میں پڑھ کر ہی جسم تھر تھر کانپنے لگتا ہے — اف خدایا رحم کرنا قیامت میں اپنی بے یار و مددگار مخلوق پر۔

جہنم کے سات طبقے ہیں جنکا بیان ہر مسلمان بہن بھائی نے مذہبی کتابوں میں لازمی پڑھا ہوگا — ؟

کیا دنیا میں بھی کوئی دوزخ ہے ؟ جو عام انسان زندگی سے بیزار چیخ اٹھتے ہیں — الٰہی یہ جینے جی کا جہنم ختم کر — کتنا مختصر فقرہ ! لیکن کس درجہ صبر آزما — ؟

مسرت بیچاری کبھی کبھی اپنے واقعات سناتی ہے تو سب سہیلیوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دنیا میں بیٹھے دوزخ کے تمام منظر دیکھ رہے ہیں ۔ ایک زندہ دل نے تو مسرت کا نام لینا چھوڑ دیا بلکہ ادر ملنے والیوں کو بھی یہی تلقین ہے کہ مسرت کو حسرت پکارو — صرف حسرت —

واقعہ یہ ہے کہ مسرت کے بدلے حسرت نام زیادہ موزوں ہے اسلئے کہ ہر سانحہ حسرت کا صحیح مرقع ہے — ایک دن جھولا جھولنے ساون میں سب اکٹھی ہوئیں — مسرت پر لیکن حسرت ہی برستی رہی ۔ گیت بھی ایک آدھ گایا تو سہگل کا — درد میں گویا ڈوبا ہوا — سب کا دل شور مچانے کو چاہ رہا تھا خصوصاً لنبی کا جو سب کی سردار ہے ۔ دنیا کی ساری شرارتوں کی ایجاد اس سے شروع ہوتی ہے — لنبی بہت ہی گہری سانس لیکر بولی ۔ "میری دوستو ! کیا تم نے وہ چار دوستوں والی کہانی سنی ہے ؟ دہی ۔ خرگوش — ایک تھا چوہا — کتا — ہرن — وہ کس مزے سے رہتے سہتے تھے اور ایک دوسرے کے کام آتے تھے بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہماری دوست مسرت ہمیشہ ننی مصیبتیں سہتی ہے اور ہم میں سے کوئی اللہ کی نیک بندی کچھ کام نہیں آتی نہ کچھ تجویز سوچتی ہے ؟"

سب نے ایک زبان ہو کر کہا " مسرت سے ہی تو شکوہ ہے کہ وہ کچھ حال ہی نہیں بتاتی ہیں — کبھی کبھی اپنی زندگی کی کوئی کوئی بات ۔ اگر پوری حالت بیان کریں شروع سے تو کچھ شاید مدد کر سکیں ۔ ڈاکٹر حکیم بھی مرض کی تشخیص ہی کر کے نسخہ لکھ سکتا ہے ۔

مسرت غریب کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آگیا — ایسا تبسم جس پر افسردگی غالب تھی ۔

"تمھی دیکھو میں نے پہلے ہی منع کیا تھا کہ میں تم لوگوں کے جھولے کا ساتھ نہیں دے سکتی — مجھ سے ہنسنا نہیں آتا" — راشدہ بول اٹھی — "واہ ابھی سے گھبرا گئیں ۔ ابھی تو تمام دن کا ہم سب کا پروگرام ہے ۔ جھولا ۔ پھر پکنک ۔ پھر تاریخی عمارتیں — شام کی چائے سبز پسلی کے ہاں — پھر درگا کی طرف سے سینما دیکھنے کی دعوت ۔ پھر سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں ؟

زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں ؟

سب ہنس پڑیں لیکن مسرت کھوئی سی کہیں دور تکتی رہی پھر سہما کر بولی" کاش میرے دل کے کسی کونے میں خوشی کی ایک کرن — ہلکی سی کرن بھی باقی ہوتی تو اس وقت میں بھی مسکرا سکتی !! "

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسرت سے قریب قریب سب کو بے انتہا محبت تھی — بہنا ستارہ — سب جھولے کے جھونوں کو بھول کر مسرت کے گرد بیٹھ گئیں — "اچھی بہن — میری مسرت سچ سچ بتاؤ ؟ تم ہر وقت کیوں اتنی رنجیدہ رہتی ہو ؟ آخر ہم لوگ تمہارے لئے کیا کریں ؟ کیونکر کام آئیں ؟"

مسرت نے ایک طویل آہ بھری اور کہنے لگی" سچ سچ سے کچھ حال تو تم سب کو معلوم ہے بچپن میرا کیسا گذرا یہ بتانے کی ضرورت نہیں ۔ جو بچی اللہ آمین سے بیس برس بعد ہوئی ہو اس کی چاہت کا کیا کہنا ؟ لیکن اس چاہت میں کانٹا بھی تھا ۔ میرے باپ کا انتہائی بدمزاج ہونا ۔ خدا جانے کیوں بچپن سے مجھے تندخوئی سے گھبراہٹ ہے ذرا کوئی چیخ کر بولا اور میرا برا حال ہوا — نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے باپ کی صورت سے نفرت ہو گئی ۔ ہفتوں سامنے نہ پڑتی ۔ ماں غریب تو ہر وقت ان کا تختۂ مشق بنی رہتی — آہ بچپن کی تمام خوشیاں باپ کی بدمزاجیوں کی وجہ سے نیست و نابود ہو گئیں ۔ شاید ہی کوئی دن گذرتا ہوگا جو میں پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہونگی ۔ محلے کی عورتیں میری ماں سے پوچھا کرتی تھیں" بہن کیا تمہارے میاں کے دماغ میں کچھ فتور ہے ؟" معمولی معمولی بھول چوک پر والد کا غصہ کنجروں سے بدتر ہوتا تھا —

والدہ بھی بہت حساس تھیں ۔ کڑھتے کڑھتے وہ جلد ہی پلنگ سے لگ گئیں ۔ اپنی عمر سے دوگنی ضعیف دکھائی دیتیں ۔ علاج کرنا یہ وہ نہ جانتے تھے ۔ انہیں صرف بدمزاجی دکھانی آتی تھی ۔ جب ہی گھر میں قدم رکھتے ، ماں کا چہرہ زرد پڑ جاتا — خیر قصہ مختصر اماں ختم ہوگئیں — اب میری زندگی کا سوال پیدا ہوا — کچھ دن چچی کے پاس رکھی گئی ۔ کچھ دن پھوپی کے ہاں — کچھ دن خالازاد بھاوج کے پاس ۔ ان میں سے ہر ایک ابا سے کم نہیں کچھ زیادہ ہی میرے حق میں بدمزاج ثابت ہوا رہی سہی امنگ بھی فنا ہوگئی — خدا خدا کر کے زندگی نے کروٹ لی ۔ شادی ہوئی — آہ ! لیکن میری قسمت ساتھ ساتھ رہی — شوہر سب کے سردار نکلے — پہلے ہی روز سے جھک جھک شروع — زندگی کے ہر لمحہ میں وہ بگڑ کر بات کرتے ہیں جیسے کردیوانے کتے نے کاٹ کھایا ہو —

کیا پسند ہے اور کیا ناپسند؟ یہ فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ کسی صورت زندگی کامیاب بناؤں لیکن نہ بنا سکی۔ اگر بہترین لباس پہنتی ہوں تو کہتے ہیں "کیا کہیں ناچنے جاؤ گی؟" اگر میلے کپڑے ہوتے ہیں تو طنز یہ کہا جاتا ہے "کون مر گیا یہ کس کا سوگ ہے؟" اگر کہیں جاؤں تو واپسی پر ہزاروں سوالات ——— نہ جاؤں تو بد اخلاق کا خطاب ——— کوئی آ جائے تو میری شامت ——— نہ آئے تو یہ طعنہ "تمہاری بد مزاجی کی وجہ سے کوئی تمہیں پوچھتا ہی نہیں" صحت کا یہ عالم ہے کہ بارہ مہینے کے بیمار ——— کوئی کمبخت آخر کہاں تک مزاج پرسی کرے یا تیمار داری کے تمام اصول پورے کرے؟ روزانہ نمک پاشی ہوتی ہے "لوگوں کی بیویاں اس قدر خدمت گذار باوفا ہوتی ہیں کہ شوہروں کی تمام تمام رات خدمت کرتی ہیں، تم تو خود غرض صرف مطلب پرست ہو ——— اپنی ضروریات سے واسطہ۔ خواہ شوہر جائے چولہے بھاڑ میں" شادی کے بعد خدا جانے کتنی عیدیں آئیں۔ بقر عیدیں گذر گئیں۔ ہر تہوار جو بھی آتا ہے میرے لئے محرم بنکر ——— عین تہوار سے ایک دن قبل نادر شاہی عتاب قہر و غضب لیکر نازل ہوتا ہے۔ خواہ کوئی بات ہو یا نہ ہو اور کچھ نہ سہی تو صرف اتنی سی بات پر "پلنگ ٹیڑھا کیوں ہے؟ صابن دانی خالی کیوں؟ ——— تولیہ میلی کیوں پڑی رہ گئی؟ کمرے میں دودھ کیسے گر گیا؟ ——— باورچی خانہ میں دھواں کیوں ہو رہا ہے؟ خانساماں نے سالن کیسے خراب کیا؟ ترکاری میں ٹماٹر کیوں پکوائے؟ تمہیں پسند ہیں مجھے تو نہیں؟ چہرے پر محرمی کیوں برس رہی ہے؟ تمہارے رشتہ دار تمہارے نام سے بیزار ہیں۔ فلاں کپڑا ابھی تک کیوں نہیں سلا؟" وغیرہ وغیرہ۔

ایسی ایسی بے تکی باتوں پر جناب اودھم مچا کر محلہ میں ہنگامہ بپا کر دیتے ہیں۔ پڑوس میں ہمارے ڈپٹی ماجد رہتے ہیں ان کی بیوی اکثر کہا کرتی ہیں "اے بہن یہ جیسے تمہارے میاں کہتے ہیں ویسے ہی تمام کام تہوار سے پہلے ٹھیک کر کے رکھ دیا کرو" آہ! انہیں کیسے سمجھاؤں کہ تہوار ہی کا دن میرے نصیب میں نہیں ہے۔ آجتک کپڑے بدلنے تو کیا معنے خوش ہو کر بھی نہیں گذار سکتی۔ دس سال کا عرصہ گذر چکا لیکن ہنوز بد مزاجی کا عالم گویا "روز اوّل" بلا سے میں بے غیرت ہوتی انہیں جلا کر خود خوش رہا کرتی لیکن میرے برباد دل کی یہ کیفیت ہے کہ کہیں کسی دور کا تخیل بھی رنجیدہ آ جائے تو مضمحل ہو جاتی ہوں۔ یہ کبھی کبھی تم سب عزائیں بنکر جو پہونچ جاتی ہو تو تھوڑا وقت مل جاتا ہے۔ لیکن گھر پہونچکر نشتروں سے دل کیا خوب زخم گہرے کئے جاتے ہیں" ہاں صاحب کیوں نہیں ——— ایسی ایسی تمام زمانہ کی خوار ملنے والیاں بنا رکھی ہیں جنہیں نہ غیرت ہے نہ شرم نہ پردہ کی پابندی ——— نہ رسم و رواج کا پاس۔ لاحول ولاقوۃ بنائے نہ بتیاہوں آج گئیں تو گئیں آئندہ ایسی عورتیں میرے مکان پر قدم بھی رکھینگی تو اچھا نہ ہوگا" وغیرہ وغیرہ۔

غرض کھانے پر ——— پکانے پر ——— افسردہ رہنے پر ——— آنے جانے پر ——— پڑھنے پر ——— سینے پرونے پر ——— ہر بات پر طنز ——— غصہ ——— جلال ——— عتاب ——— میں اپنے دل کی حالت کیا بیان کروں شاید اصلی دوزخ میں بھی مجھے اتنی تکلیف نہ پہنچا جتنی اس دنیا وی جیتے جی کے جہنم نما گھر میں ہے" ——— یہ کہا اور مسرت کے آنسو ٹپ ٹپ بارش کے قطروں کی طرح لڑیوں کے مانند گرتے چلے گئے ——— بیچاری ملنے والیاں بھی ساتھ میں رونے لگیں ——— لبنیٰ بولی "ایسا عجیب شوہر تو زندگی میں کہیں نہیں سنا نہ دیکھا۔ خدا غارت کرے اس کی بد مزاجی کو۔ اے ہے مسرت بہن تم آخر کیسے زندہ ہو ——— ؟ پھٹکار ایسے مردوے کی صورت پر۔ اے ہے کچھ صورت بھی تو ڈھنگ کی نہیں۔ کھتری ——— ماتھا ایسا جیسے بندر کا ——— چندیا گنجی کمبخت کے ہونٹ ایسے جیسے ڈبل روٹی ——— رنگ سبحان اللہ ——— جلا بھنا کوئلا ——— موٹاپے سے گردن کی کھال لٹکی ہوئی۔ شکل پر ذرا شرافت نہیں ——— جیسے موئے تانگے والے۔ یکہ والے۔ موٹر والوں کی صورت پر کمینہ لفنگا پن برستا ہے بالکل مجھے تو ایسے ہی دکھائی دیتے ہیں خدا کی قسم میں تو مسرت کے طفیل اس بدتمیز کو "بھائی صاحب" پکار لیتی ہوں ورنہ چمار ڈھنگی بھی نہ کہوں ——— بس چلے تو کسی کمینی عورت سے شادی کرا دوں ہاں ٹھیک بقر عیدی دھوبن سے نکاح پڑھوا دوں جو ذرا مزا چکھا دے اپنے نیک مردوے کو تو وہ منہ سے دھن ڈالتی ہے یہ تو بھلا کس گنتی میں" ——— لبنیٰ کی بے تکی باتوں پر سب کھل کھلا کر ہنس پڑیں کمبخت کبھی تمیز سے بات ہی نہیں کرتی بے ڈھنگی" ——— درگا نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا "ہاں ہاں لبنیٰ بہن کی باتیں خواہ اول جلول ہوں لیکن ہیں مناسب ——— بھلا ایک عورت کی قسمت کا جیون کیسے نہ دوزخ بن جائے جبکہ شوہر ہی اس درجہ بُرا وحشی جیسا برتاؤ سلوک رکھے ——— رام رام میرا تو ایسا ہوتا تو چاہے بھوکوں مر جاتی پھر ایسی ذلت بھری زندگی کبھی نہ کاٹ سکتی ——— جیل خانہ ایسے گھر سے بہتر ——— ایسی روٹی سے بھیک کے ٹکڑے غنیمت ——— ایسے صاف کپڑوں سے مزدوروں کے جیسے چیتھڑے ہزار درجہ بہتر ——— ہائے رے مسرت بہن تم کیسے یہ سب کچھ وبال مصیبت بھرتی ہو؟ مجھے تو سنکر ہی ہول ہونے لگی" ———

مسرت نے ہچکیوں کے ساتھ جواب دیا ——— "یہ بیان کردہ آفتیں تو عشر عشیر بھی نہیں جو کچھ مجھ پر گذرتی ہیں ——— ایسا محسوس ہوتا ہے گویا چاروں طرف آگ ہی آگ ہے جس کی تپش سے جلی جا رہی ہوں پھنکی جا رہی ہوں ——— بس میرے لئے تم سب صبر کی دعا کر دیا کرو ——— ایسا نہ ہو میں گھبرا جاؤں میرے قدم شرافت سے بہک جائیں ——— میں انسانیت کو بھول جاؤں ——— فرض کو فراموش کر ڈالوں ——— جذبات کو فروخت کر دوں ———

باقی صفحہ ۷۶

سر راس مسعود

راس مسعود جاذب نظر تھے مرعوب کن تھے، محبت کے اہل تھے اور محبت کئے جانے کے لائق تھے صورت پرستوں کے لئے وہ تناسب کی بہترین مثال تھے۔ ان میں یونانی مجسموں کی سی دلآویزی تھی اور اس دلآویزی میں مردانہ قوت کا جلال بھی سمویا ہوا تھا۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ روح اپنی منشا کے مطابق اپنا جامہ تلاش کرتی ہے تو راس مسعود اپنی صورت اپنی سیرت اپنے دل نظر اور فکر کے اعتبار سے ان چند روحوں میں سے تھے جن سے رزمیہ کی فضا میں عظمت کا سرور پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے ہماری زندگی میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا شاید اس لئے کہ خود ان کی زندگی میں کوئی زبردست انقلاب نہیں آیا۔ انہوں نے محبت ضرور کی دوستوں سے ادیبوں سے عورتوں سے اور بچوں سے غالباً اسلئے کہ وہ نفرت نہیں کرسکتے تھے۔ نہیں اس لئے کہ وہ صرف محبت کرنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ اگر ان کی زندگی افلاس میں گذری ہوتی تو میرے خیال میں وہ ایک اچھے فنکار ہوتے۔ ایسا نہیں ہوا اگر اس کی تلافی یوں ہوئی کہ ان کی زندگی ایک فنکار کی زندگی بن کر رہ گئی۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ انکی زندگی فن میں تبدیل ہو گئی۔ یہ بہت بڑی بات ہے ان کی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ وہ بڑے آدمی تھے ان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اچھے آدمی تھے۔ انھیں دیکھکر مغلوں کی شان وشوکت آنکھوں میں پھر جاتی تھی اور ان سے مل کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ خدا ابھی تک انسان سے مایوس نہیں ہوا ہے۔

ان کے وقار میں نسائی دلکشی تھی اور ان کی محبت میں مردانہ انکسار اور یہ دونوں باتیں ان کی فطرت میں شامل تھیں۔ وہ دوسروں کے ساتھ حتی الامکان وہی سلوک کرتے تھے جس کا انھیں مستحق سمجھتے تھے۔ یہ توازن ان میں زندگی کے تجربوں سے پیدا ہوا تھا مگر یہ نہ بھول جائیے کہ ان کی زندگی اچھی تربیت وسیع انسانیت اور گہرے علم کی دھوپ چھاؤں میں پروان چڑھی تھی۔ انھوں نے اس دادا کی انگلی پکڑنا سیکھی تھی جو سکوت میں ہنگامہ اور ہنگامے میں سکوت پیدا کرسکتا تھا جس نے زبان میں نثر کو فروغ دیا تھا مسلمانوں میں تعلیم کو اور سرکار میں رواداری کو سر تھیوڈر مارلین سے انگریزی معاشرت کے آداب اور زبان کا لب ولہجہ سیکھا تھا۔

راس مسعود نے اپنا ابتدائی زمانہ انگلستان کی فضا میں گذارا جہاں آسمان کبھی کبھی دکھائی دیتا ہے۔ خاندانی اثرات نے ان کی شخصیت کو بنانے سنوارنے اور متعارف کرانے میں بڑی مدد کی۔ لیکن اس میں ان کی ذہانت ذوق ظرافت قہقہوں سے چھا جانے اور مسکراہٹوں سے موہ لینے کا بھی بہت بڑا دخل تھا۔

بیگم مارلین انھیں اپنی اولاد سمجھتی تھیں۔ اساتذہ ان کے قائل تھے۔ قائل ہونا تو رسمی سی بات ہے انھیں اپنی شخصیت کی معرفت کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ دارالعوام کے اراکین سے ان کی دوستی تھی تعریف کی بات یہ ہے کہ انھوں نے مغرب کو بڑھا دیکھا اور برتا لیکن مغرب سے بے تکلفی کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ انگلستان کے پھولوں کو دیکھ کر انھوں نے وہ خواب کبھی نہیں دیکھے جو انھوں نے ایک ایشیائی جزیرہ نما کے نشیب وفراز میں دیکھے بھی اور بعد میں دکھلائے بھی۔ مشرقیت ان کے لئے ایک جانفزا جذبہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ تہذیب ان کی نظر میں انسانی وحدت تھی لیکن وہ اس تصویر میں اپنے خون جگر کا رنگ بھی دیکھنا چاہتے تھے ورنہ وہ اپنی معاشرت اپنی گفتگو اپنی دلچسپیوں اور اپنے تعلقات کے لحاظ سے آفاقی تھے۔ انگریزی کی اصطلاح میں ہمہ رنگ۔ ان کی نشستگاہ میں جاکر یہ احساس ہوتا تھا کہ دنیا کی طنابیں کھینچ گئی ہیں۔ یا دنیا ایک جام ہے جو اس محفل میں از سر نو گردش میں لایا جا رہا ہے۔

یہ پختگی اور ہمہ گیری شعر وادب کی مرہون منت تھی۔ انگریزی پر تو انھیں مکمل عبور تھا ہی۔ لیکن وہ اور مغربی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ انھیں ہندوستانی اور ایرانی تمدنوں کی میراث شعراء کے واسطے سے پہونچی تھی اسلئے انہیں وہ آفاقیت پیدا ہوگئی تھی جس کی نظر میں زمانہ ایک ہے خدا ایک ہے اور انسان ایک سا ہیں۔ ان کے ڈرائنگ روم میں تصویروں کا انتخاب ان کی لائبریری میں کتابوں کی رنگارنگی ان کی میز پر کھانوں کا اہتمام۔ اور جو کچھ ان کی زندگی میں توجہ کے لائق یا نظر انداز کئے جانے کے قابل ہے غرض ہر بات ان کی وسعت مشرب کی غماز تھی۔

ان کے احباب میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ یہ صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں تھے انگلستان، فرانس، جرمنی، امریکہ، ترکی، جاپان ہر ملک میں ان کے دوست موجود تھے۔ دوست بنانے اور دوستی نباہنے کے لئے سلیقہ درکار ہے دوستی بیک وقت وظیفہ بھی ہے اور نجات بھی ایثار بھی ہے اور انعام بھی عمل بھی ہے اور سکون بھی۔ راس مسعود جذب وسلوک کی ان راہوں سے گزرے تھے۔ ان کے جاننے سمجھنے اور محبت کرنے میں خلوص تھا۔ بڑے آدمیوں کی سیاست اور کاروبار کو مطلق دخل نہ تھا۔ وہ اداشناس تھے۔ اور ان کے دوست ان کی نظر کے قائل تھے۔ انکے تعلق خاطر کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ "ای۔ ایم۔ فاسٹر" نے اپنی مشہور کتاب (A Passage to India) ان کے نام اس زمانہ میں معنون کی تھی جب

خورشید الاسلام

جانے پہنچانے لوگوں میں سے نہیں تھے۔

ادب سے انھیں جتنا شغف تھا بہت کم لوگوں کو ہوگا۔ انیس، حافظ، رومی، اور انگریزی شعرا کا کلام انھیں اس قدر یاد تھا کہ وہ اعتکاف میں بھی کئی روز تک محفل مشاعرہ کا لطف اٹھا سکتے تھے۔ ان کے ادبی ذوق حافظے اور قوت گویائی کا یہ کرشمہ تھا کہ وہ چند لمحوں میں جادو کے جزیرہ کی فضا پیدا کر دیتے تھے۔ جہاں انکے اشارہ پر عالم ارواح کی فلسفی شاعر سنجیدہ اور مضحک روحیں آ کر ناچنے لگتی تھیں۔ وہ اپنی آواز کے زیر و بم سے اطالیہ کی محرابیں بنا سکتے تھے اور اپنے الفاظ کے ذریعہ سے ایک ہی وقت میں ہیلن فاؤسٹ اور ہیملٹ کو ان کی کتابی نیند سے جگا سکتے تھے۔ ڈاکٹر بجنوری کے قلم میں جو بات تھی وہ سر راس کی زبان میں تھی، دونوں مبالغہ کو حقیقت اور حقیقت کو مبالغہ کا رنگ دینے میں کمال رکھتے تھے۔ آخر انھوں نے بلبلوں سے تاج محل بنانا کہاں سے سیکھا تھا۔

راس مسعود کی یہ جامعیت ساز کا پردہ تھی مگر انھوں نے شاعری اور ساحری دونوں سے کام لینا بھی سیکھا تھا۔ معاملات میں انھوں نے ریاضی کے اصول کبھی نہیں برتے لیکن اپنی شخصیت کی اثر آفرینی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا وہ جہاں بھی گئے نمایاں ہو کر رہے۔ وہ جن سے ملے انھیں متاثر کر کے چھوڑا انھوں نے جس کام کو سنبھالا مغلوں کے انداز سے پورا کیا حیدرآباد میں ڈائرکٹر تعلیمات کے فرائض جس خوبصورتی کے ساتھ انھوں نے انجام دئے اسکی داد یا تو مرحوم اکبر حیدری دے سکتے تھے یا زندوں میں ڈاکٹر عبد الحق دے سکتے ہیں۔ خواب دیکھنا خواب دکھانا خواب کی تعبیر ڈھونڈنا ان کی میراث تھی۔ اگر وہ بابر کے خانواد میں پیدا ہوئے ہوتے تو شاہجہاں بنتے۔ وہ سرسید کے پوتے تھے اس نسبت کا احساس ان کے خون کے ذروں میں حل ہو گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بابل کے مغنی کی طرح اپنے گرم سانسوں سے مملکت حیدرآباد میں جامعہ کے آثار پیدا کر سکتے تھے۔ اگر آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیں تو یہ جامعہ اپنے تصور کی توانائی اور تصویر کی رعنائی میں فردوسی کے شاہنامے سے کم نہیں۔

حیدرآباد میں انھوں نے اپنی زندگی کے بارہ تیرہ سال گذارے۔ وہاں کی تاریخ میں سرسالار جنگ کے بعد یہ دوسرے روشن تھے۔ دکن میں ان خدمات کے بعد وہ جو منصب چاہتے حاصل کر سکتے تھے لیکن ان کی سر بلندی نے ان گنجائشوں کو محدود کر دیا تھا یہی ان کی کمزوری تھی اور یہی ان کی طاقت اسلئے جب علیگڑھ سے انھیں آواز دی گئی تو انھوں نے ذاتی خواہشات کو قومی تقاضوں پر قربان کر دیا۔ یہ بہت نازک دور تھا۔ علیگڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر منتخب ہو گئے۔ یہ دیار بظاہر چند عمارتوں کا مجموعہ ہے لیکن ایک بہت بڑا مسئلہ بھی ہے۔ راس مسعود نے اپنی جادو کی چھڑی سے کام لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سائنس کے شعبوں کی عمارتیں رنگ چھیڑنے لگیں اور علیگڑھ میں ایک نیا دور ترقی کا شروع ہو گیا۔ ۴۴

آخری حسرت

صرف اک جام مئے ہوشربا اور سہی
غرق کر دوں گا اسی میں یہ غم و فکر و الم

ایک پروانہ گرا شمع فسردہ کے قریب
ایک تارے نے کہا ٹوٹ کے لو میں بھی چلا
لہر سی دوڑ گئی سرد تمناؤں میں ——
میری گھائل رگِ احساس میں اک درد اٹھا
میرے مفلوج تخیل نے سنبھالا لے کر
عمر رفتہ کے فسانوں میں نیا رنگ بھرا

اپنے جذبات کی لو دیتی ہوئی شمع کے ساتھ
ہاں ادھر دیکھ ذرا برہمیٔ بزم بھی دیکھ

سرنگوں ہو گئے افسردہ و بے جاں شیشے
گر پڑے نیند کے مارے ہوئے ساغر تھک کر
جیسے ساقی کی نگاہوں میں وہ افسوں نہ رہا
بخت شب رنگ میں الجھی ہے ستاروں کی نظر
اور بھی ہو گئیں امید کی پلکیں بوجھل
رات کی زلف سیہ بھیگ گئی تا بہ کمر

کیا یہ بکھرا ہوا شیرازہ بکھر جانے دوں
کیوں نہ اک جام مئے ہوشربا اور سہی!

چند لمحوں میں وہی تلخیٔ دوراں ہوگی
زندگی جس کے تصور سے لرز جاتی ہے
دل میں بھڑکے ہوئے شعلے تو بجھا لینے دو
خیر آنے دو اگر صبح چلی آتی ہے

روک سکتا ہوں سحر کو میں افق کے اس پار
ہاں بس اک جام مئے ہوشربا اور سہی!

سمیع احسن ضمیر

۴۴ بعد میں راس مسعود بھوپال میں وزیر تعلیم کے عہدہ پر مامور ہو گئے اور اپنی زندگی کے آخری سال انھوں نے وہیں گذارے۔ اس زمانہ میں بھوپال نے بہت سی برکتیں حاصل کیں اور بہت سوں کو فیض پہنچایا۔ ان کے دم سے نہ جانے کتنے چراغ روشن ہوئے اور کتنے چراغ روشن ہیں۔ انھیں ڈاکٹر اقبال سے جو محبت تھی اس سے افسانے تو نہیں بنائے جا سکتے لیکن انکے بیان سے دلوں پہ ہلکی پھوار سی پڑتی ہے ٭

بورنیو

وشنو کمار

بورنیو جسکا رقبہ تقریباً تین ہزار مربع میل اور آبادی ۲۰ لاکھ سے زیادہ ہے دنیا کے سب سے بڑے جزیروں میں دوسرے نمبر پر ہے جنوری ۱۹۴۲ء سے اس کے متعلق بہت کم خبریں ملی ہیں حالانکہ جاپانیوں نے اسکو اپنی نئی ہند۔ ایشیائی سلطنت کے انتظامی، اور صنعتی مرکز کے لئے تجویز کیا تھا۔

بورنیو کے تیل کے خزانے، خاص طور پر وہ جو بالک پاپن میں ہیں بارہا اتحادیوں کے بموں کے نشانے بنے۔ یہ معلوم ہونے پر کہ یہاں متعدد مقامات پر خاص طور پر قلعہ بندیاں کی گئی ہیں، اتحادی بمباروں نے بڑی طویل پروازیں کرکے ان استحکامات کو برباد کیا۔ یہاں کے باشندوں پر ظالم حملہ آوروں کے زیر تسلط کیا کچھ گزرتی ہے اس کا حال معلوم نہیں ہوسکا۔

بورنیو کے چار حصے ہیں:- ڈچ بورنیو جو جنوب اور مشرقی ساحل پر واقع ہے ہالینڈ کے مشرقی جزائر کا ایک حصہ ہے، برطانوی شمالی بورنیو جو برطانوی سراوک کے متصل ہے جسکا راجہ بُرکؔ ہے، برطانوی برونی جو شمالی مغربی ساحل پر واقع ہے اور جزیرہ لبوان جو اسٹریٹس سیٹلمنٹ کا ایک جزو ہے۔ ان چاروں علاقوں میں ڈچ بورنیو کل جزیرہ کا ۳/۴ حصہ گھیرے ہوئے ہے۔ بورنیو کے ساحل نیچے اور دلدلی ہیں، میلوں تک خاردار گھنے جھنڈ پھیلے ہوئے ہیں اور اکثر چھوٹے چھوٹے جزیروں اور بیشمار چٹانوں کی وجہ سے جہازرانی کے لئے خطرناک ہیں۔ خود اندرون ملک میں بھی پہاڑی ابھار بڑی کثرت سے موجود ہیں اور گھاٹیاں گھنے جنگلوں سے بھری پڑی ہیں۔

یہاں کے بہت سے دریاؤں میں بڑی بڑی کشتیاں اندر تک جاسکتی ہیں مگران کے دہانوں پر کچھ ایسی رکاوٹیں ہیں جنکی وجہ سے سمندر میں چلنے والے جہاز ان میں نہیں گھس سکتے۔ یہاں بہت سی جھیلیں بھی ہیں اور بالائی علاقوں کے دریا بہت تیزی کیسا تھ بہتے ہیں یہاں کی زمین بہت زرخیز ہے اور ربڑ، گنا، کھوپرا، چانول اور گرم علاقوں کی دوسری اشیا بڑی کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ جانور بھی بڑی کثرت سے ہوتے ہیں جنمیں گینڈا اور ہاتھی خاص ہیں۔

دشمن کے لئے بورنیو زیادہ اہم تیل کے خزانوں کیوجہ سے ہے۔ مشرقی ساحل پر بالک پاپن میں اور شمال میں جزیرہ ترکان میں تیل کے کنویں بڑی کثرت سے ہیں جنمیں سے آکٹین دنیا میں سب سے زیادہ نکلتا ہے۔ سراوک کی شمالی سرحد پر میری میں اور وہاں سے چالیس میل کے فاصلہ پر سیریا میں بھی تیل کی بڑی بہتات ہے۔

جب جاپان نے بورنیو پر حملہ کیا تو اسکو مکمل طور پر اپنے زیر تسلط لانے میں اسے صرف ایک مہینہ لگا۔ لیکن ذرائع کے بہت ہی محدود ہوتے ہوئے بھی انگریزوں اور ڈچوں نے یہاں کے تیل کے چشموں کو برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن یہ بات اب سے تین سال پہلے کی ہے۔ باوجود اتحادیوں کی بمباری کے خیال ہے کہ جاپان کو بہت بڑی مقدار میں یہاں کا تیل دستیاب ہورہا ہوگا۔

بورنیو کی طویل تاریخ میں رنگینی اور مشرقی رومان موجود ہے۔ یہاں کے ساحلی علاقے کے قدیم باشندے (ڈائکس) صدہا سال تک وحشی و مردم شکار رہے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ ملک کے اندرونی حصوں میں جو ابھی تک پورے طور پر دریافت نہیں ہوسکے ہیں یہ لوگ اب بھی اس خوفناک شغل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں کے دوسرے باشندے (لانس) بحری لٹیروں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

چونکہ بورنیو سنگاپور اور جزائر فلپائن اور جنوب مشرقی سیام کے درمیان واقع ہے۔ اسلئے یہ سولہویں صدی کے ڈچ اور پرتگالی تاجروں کے بحری راستہ میں پڑتا تھا۔ سترہویں صدی کے اوائل میں انگریزوں اور ڈچوں کی ایسٹ انڈیا کمپنیوں نے یہاں اپنے تجارتی مرکز قائم کئے ۱۶۹۰ء میں یہاں انگریزوں کی ایک بہت بڑی نوآبادی کا قیام ہوچکا تھا۔

یہاں کے جنگجو قدیم باشندوں کے ساتھ برابر لڑائی جھگڑے ہوتے رہے اور ۱۸۰۰ء میں ڈچوں اور انگریزوں کو اپنی تجارتی کوٹھیاں چھوڑنا پڑگئیں۔ لیکن ان کے چلے آنے کے بعد یہاں کے حکمرانوں میں آپس میں پھوٹ پڑگئی اور لڑائیاں ہونے لگیں۔ یورپی تاجروں نے ان میں سے بعض کو اپنی پناہ میں لے لیا اور خود بھی انہوں نے وہاں دوبارہ اپنے قدم جمالئے۔

سراوک میں بورنیو کی تاریخ کا شاید سب سے زیادہ رومانی حصہ ایک یورپی راجہ کا اپنی ریاست قائم کرنا ہے۔ اس ریاست کا قیام بحری لیٹروں کی باہمی جنگ و نزاع کا نتیجہ تھا۔ ان لٹیروں کا وجود سنگاپور جانے والے تجارتی جہازوں کے لئے ایک مستقل خطرہ کا باعث تھا۔ ۱۸۳۹ء میں جیمز بُرک جو ہندوستانی فوج کے ایک پنشن یافتہ افسر تھے اپنی کشتی (رائلسٹ) میں سوار ہوکر ان لٹیروں کو دبانے کے لئے روانہ ہوئے بُرک جب وہاں پہونچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں کا راجہ صوبہ سراوک میں باغی ڈائکس سے برسرپیکار تھا۔ برک کی امداد سے راجہ نے بغاوت فرد کی اور بُرک کو اعانت کے صلہ میں سراوک کا راج عطا کیا۔ کچھ عرصہ بعد راجہ برک کو سلطان سے لڑنا پڑا۔ سلطان کی فوج کو شکست ہوگئی۔ پھر برک لیٹروں کا قلع قمع کرنے قانون وضابطہ بنانے اور تجارت کو فروغ

باقی صفحہ ۷۴ پر

خلا

افسانہ

میرزا ادیب

نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت، جسے نہ تو نیند کہہ سکیں اور نہ بیداری مگر یہ کیفیت اپنی نوعیت کے لحاظ سے کچھ عجیب طرب ناک، کچھ عجیب سحر انگیز تھی اور جب وہ ننھی ننھی انگلیاں اس کے ہاتھ کی پشت یا پیشانی پر آہستہ آہستہ ناچتیں تو نیند اور بیداری کا یہ ملا جلا لیکن دھندلا احساس گدگدی کے نشہ آلود احساس کے ساتھ مل کر اس کی رگ رگ میں سما جاتا اور بے اختیار مسکراہٹ کی لہریں نیم وا آنکھوں کی پلکوں سے چھن چھن کر اس کے گالوں کی جھریوں میں جذب ہو جاتیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ سو رہی ہے اور واقعی وہ سو جانا چاہتی بھی تھی۔ نیم غنودگی اب نیند میں تبدیل ہو رہی تھی جب سے گرمی شروع ہوئی تھی رات کے وقت اس کو کئی کئی مرتبہ بیدار ہو کر بچی کو پنکھا جھلنا پڑتا تھا۔ اور کل رات تو وہ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے سو سکی تھی اور یہ نیند بھی گہری نیند نہیں تھی۔ اس نے خیال کیا کہ ثریا اٹھی چارپائی سے ہٹ کر کسی کھیل میں یا حسب معمول الماری کے ایک ایک برتن کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی ہے اور وہ سو گئی۔ یکایک اس کے پپوٹوں پر ہلکا سا بوجھ پڑنے لگا جیسے ثریا اس کی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دبی ہوئی ہنسی کے بعد ایک میٹھی سی آواز اماں کہتی ہوئی اس کے ذہن میں گونجی، گونجی اور نیند کے دھندلکے میں سے گزرتی ہوئی اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ اب بڑھیا کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ آنکھیں کھول دے اور بچی کو گود میں بٹھا لے کیونکہ اگر وہ لیٹی رہی تو اس کے سر کے لڑتے بالوں کی خیر نہیں اور اگر یہ نہ بھی ہو تو وہ کم از کم اس کے سینے پر ضرور بیٹھ جائے گی۔ اس نے بچی کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر انہیں اپنی طرف کھینچا۔ لمبے لمبے ریشمیں بال اس کے چہرے کو چھونے لگے، وہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ سو نہیں رہی بلکہ پوری طرح جاگ رہی ہے۔ شاید وہ اس طرح کچھ دیر تک سو سکے لیکن شریر ثریا کو سکون کہاں، اس نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ چھڑا لئے اور کچھ دور کھڑی ہو کر قہقہے لگانے لگی۔ اس کی شرارت پسند نگاہیں کہہ رہی تھیں مجھے دھوکا دینے کی کوشش فضول ہے۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ جب میں جاگ رہی ہوں تو تمہیں سونے کا حق نہیں ہے۔ بڑھیا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ثریا خود بخود اسکی گود میں آ کر اپنے ہاتھوں سے اسکے گالوں کو سہلانے لگی! اس کے بوڑھے، کمزور بازو سات سالہ بچی کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اسے گود سے اتارنا چاہتی تھی لیکن بچی اس سے چمٹے ہی جا رہی تھی۔ "اونہوں ہم نہیں جائیں گے۔ اتار کر دیکھو تو۔" بڑھیا ٹکٹکی باندھ کر اسکی طرف دیکھنے لگی۔ کئی لمحے دیکھتی رہی اور ایک حیرت ناک انقلاب پر وہ خود حیران رہ گئی۔ سات سال کی یہ ثریا جسکا بوجھ اب اس کے بازوؤں کے لئے ناقابل برداشت تھا کچھ عرصہ پہلے ایک نحیف و لاغر سخت کمزور بچی تھی جسے اس نے اس کی مرتی ہوئی ماں کے پہلو سے اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا تھا۔ ایک تو بچی پیدائشی طور پر ہی سخت کمزور تھی یہانتک کہ

سانس بھی بڑی دقت سے لیتی تھی اور دوسرے ماں کے دودھ سے محروم، کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ گوشت کا یہ نیم جان لوتھڑا ایک دن سے زیادہ زندہ رہ سکیگا۔ لیڈی ڈاکٹر تو اس کی زندگی سے بالکل مایوس ہو کر چلی گئی تھی۔ بوڑھیا کو اس گھر میں ملازم ہوئے سات ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ مگر وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ بچی زندہ رہے۔ غیر ہونے کے باوجود وہ بچی کو اسطرح گود میں اٹھائے بیٹھی تھی جیسے وہ اس کی اپنی بیٹی ہے، اسکے اپنے ہی جگر کا ٹکڑا ہے۔ بدنصیب بچی کا باپ ہزاروں میل دور افریقہ میں تھا اور گھر میں بوڑھیا کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ بڑھیا نے بچی کی پرورش کا بوجھ اپنے کمزور بازوؤں پر اٹھا لیا۔ اور اسی دن دنیا کے ہر کام، دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہو کر نیم مردہ بچی کی پرورش میں مشغول ہو گئی۔ اس کی تمام کوششوں کے باوجود، اسکی شبانہ روز محنت کے باوجود بچی کی صحت گرتی جا رہی تھی، اور ایک وقت تو ایسا بھی آیا جب بوڑھیا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے چہرے کو کپڑے سے ڈھانک دیا۔ مگر بچی سانس لیتی ہی رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی صحت پر خوشگوار اثر پڑتا ہی گیا۔ بچی کو زندہ دیکھ کر بوڑھیا کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے دنیا کی سب سے بڑی نعمت مل گئی ہے۔ ایک اتنی بڑی نعمت جسکا اسے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا ــــــ

ایک سال زندگی کا ایک نہایت مختصر حصہ ہے مگر اس نے پہلے سال کے ہر دن اور ہر رات کو آنسو اور آہیں بنا کر، اپنی تمنا آرزو کے ساتھ بچی پر نچھاور کر دیا تھا۔

ثریا کا باپ آیا اور چند روز کے بعد واپس چلا گیا۔ انہی دنوں اطلاع مل گئی کہ وہ فوج کے جس دستے میں شامل تھا اسے دشمن کی فوج نے گرفتار کر لیا ہے۔ گویا جنگ کے اختتام تک اس کی واپسی کی امید قریب قریب ناممکن تھی ۔

بوڑھیا جب بچی کو دیکھتی، اسے گود میں اٹھاتی، اسے سینے سے لگاتی تو اسے یہی یقین ہوتا جیسے وہ اس کی اپنی ہی بیٹی ہے اس کے اپنے دل کا ہی ٹکڑا ہے۔ جیسے جیسے بچی کی زندگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس کی زندگی کے منجمد چشمے میں ایک ہلچل سی، ایک تموج سا پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ شادی کے چار سال بعد اسکا شوہر فوت ہو گیا تھا اسی وقت سے وہ اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرنے لگی تھی اور یہ خلا روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا پھیلتا ہی جا رہا تھا یہاں تک کہ ثریا کا ننھا منا وجود سرکتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ یکایک اس کے زنگ خوردہ دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں، اس کی ساری کائنات سمٹ کر بچی میں سما گئی۔ ثریا کی پیاری پیاری، نیلی نیلی آنکھوں کی روشنی سے اس کی زندگی کی ویران تنگ اور تاریک راہیں یکایک جگمگا اٹھیں اس طرح جگمگا اٹھیں کہ وہ اپنے چاروں طرف روشنی ہی روشنی دیکھنے لگی۔

ثریا بوڑھیا سے اسقدر مانوس ہو گئی تھی کہ وہ کسی وقت بھی اس سے علیحدہ

ہوتا نہیں چاہتی تھی اور جب کبھی وہ کچھ دیر کے لئے اسکی آنکھوں سے اوجھل ہوتی تو بچی کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ ایک لمحہ کے لئے بھی بچی کی یہ حالت دیکھنے کے لئے تیار نہیں تھی!

وقت گذرتا گیا اور ثریا چھ سال کی منزلیں طے کر کے ساتویں سال میں داخل ہوگئی۔ وہ بچی کا دل خوش کرنے کے لئے دن میں کئی کئی مرتبہ اس سے کہتی "چھیا بیٹی! تجھے معلوم نہیں ہے تیرا باپ بڑا آدمی ہے۔ تو ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ اپنے باپ کو دیکھ کر تو بہت خوش ہوگی۔ اور بچی کے رخسار سرخ ہو جاتے، اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں، جیسے وہ اپنے باپ کے بڑے پن میں برابر کی شریک ہو۔ یہ اس کا فطرتی پن ہے۔

اسی طرح ثریا سات سال تک اس کی گود میں پرورش پاتی رہی جو ماں کی گود نہیں تھی لیکن جو ماں کی گود سے کسی طرح بھی کم شفقت انگیز نہیں تھی اور آج اسکا باپ آرہا تھا۔ بڑھیا نے جب سے یہ خبر سنی تھی اسکا دل بلیوں اچھل رہا تھا، اسکی ثریا کا باپ ایک بڑا آدمی اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا گویا وہ خود بھی ایک اہم ہستی بن گئی ہے۔ ایک امیر شخص کی بیٹی کی ماں اور اسکا یہ غرور دنیا کی کوئی طاقت بھی اس سے نہیں چھین سکتی۔ یہ غرور اسکی زندگی کا بہت بڑا، بہت اہم جزو بن کر رہ گیا ہے۔ بار بار سنانے کے باوجود وہ ہر ایک ہمسائی کو یہ خوشخبری سنا رہی تھی "میری ثریا کا باپ رہا ہو رہا ہوگیا ہے" اور وہ یہ خوشخبری سنانا اپنا فرض سمجھتی تھی لئے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ ہمسائیاں اس کے جواب میں کیا کہہ رہی ہیں چنانچہ دو تین ہمسائیوں نے کہا "مبارک ہو تجھے! اپنی محنت کا تجھے پورا اجر ملیگا" تو وہ صرف ہنس پڑی فقرے پر نہیں، کیونکہ وہ فقرے کا مفہوم سمجھ ہی نہیں سکی تھی، وہ صرف اسلئے ہنسی تھی کہ وہ ہنسنا چاہتی تھی۔ قہقہے لگانا چاہتی تھی! جھٹپٹے ہو چکے تھے اور ابھی تک ثریا کا باپ نہیں آیا تھا۔ وہ ثریا کا ہاتھ پکڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکن لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی، ہر موٹر کا ہارن، ہر ٹم ٹم کی گھنٹی اسے چونکا دیتی۔ ہر دور سے آنے والے خوش پوش شخص کو دیکھ کر وہ بچی کے ہاتھ کو زور سے دبا دیتی۔ بچی بڑھیا کی ان حرکتوں پر پریشان ہو رہی تھی اسکا دل چاہتا تھا کہ ابا جلد آجائیں تاکہ اسے ان پریشان کن حرکتوں سے نجات مل جائے!

اچانک دروازہ کھلا۔ ایک بلند قامت شخص اندر آیا اور اس نے آتے ہی بیٹی ثریا کو تکتے ہوئے مبہوت و حیران لڑکی کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اس وقت ثریا واقعی ایک امیرزادی نظر آرہی تھی۔ پہلے سے بہت مختلف، پہلے سے بہت خوبصورت۔ اسکا چہرہ مسرت سے گلنار ہوگیا تھا۔ آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو پہلے کبھی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ بڑھیا کے دل میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ اس نے ثریا کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ ثریا باپ سے چمٹ گئی۔

ساری رات ثریا باپ کے کمرے میں رہی اور بڑھیا آدھی رات تک مختلف کمروں میں گھومتی رہی۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن سے ٹکراتے رہے۔ ایک عجیب سا شبہ، ایک عجیب وہم اسکے دماغ سے چمٹ گیا تھا۔ نئے نئے انداز سے دل کو تسلی دینے کے باوجود وہ اس وہم کو کھرچ دینے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ لمحہ بہ لمحہ یہ دہشت ناک وہم اس کے دماغ میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسکی ثریا اس سے دور ہوگئی ہے، اس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اپنے دل کو تسلیاں دیتی رہی، لیکن جس طرح ایک مبہم آواز کسی گنبد کی محدود وسعت میں گونجتی ہوئی چند لمحوں کے بعد محض ایک تھرتھری بن کر ختم ہونے لگتی ہے اسی طرح تسلی کا ہر لفظ سمٹ سمٹا کر ایک نقطہ بن کر دماغ میں گھومتا ہوا اسی وہم میں گم ہو جاتا!

اسے خیال آیا جیسے وہ بلندی سے نیچے آرہی ہے، ایک ماں کی بجائے کچھ اور بن گئی ہے۔ ایک ملازمہ، ایک دائی۔ وہ اپنے دل کو ملامت کرنے لگی۔ ثریا کو میں نے پالا ہے۔ پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔ اسے مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ اسکا باپ بھی نہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی نہیں۔ مگر اسکا دل ڈوب کیوں رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں پھر وہی کمی کیوں محسوس کرنے لگی تھی۔ اسکے دل و دماغ میں ایک خلا سا کیوں محسوس ہو رہا تھا؟

اس رات کی صبح ہوئی۔ لیکن پچھلے سات سالوں کی صبحوں سے بالکل مختلف۔ ثریا کے بات کرنے کے ڈھنگ میں ایک ایسی چیز پیدا ہوگئی تھی جسے وہ محسوس کرتی تھی۔ صرف محسوس ہی کر سکتی تھی کچھ نہیں سکتی تھی اور جس وقت ثریا نے بڑھیا کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر پرے ہٹ کر ہنستے ہوئے کہا "اماں! میرے ابا بہت بڑے آدمی ہیں — بڑے بڑے روپے نوٹ لائے ہیں" تو بڑھیا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ ثریا اس وقت اسے کن نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ان نظروں کا مفہوم سمجھنا چاہتی تھی۔ وہ ان نظروں کا مفہوم سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ اور تیسرے دن وہ اس عالیشان مکان کو چھوڑ کر اپنی اسی کوٹھری میں چلی گئی جہاں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا ثریا نہ آئی۔ وہ اسکا انتظار کرتی رہی!

چوتھے دن وہ بخار کی حالت میں لیٹی ہوئی تھی اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نرم سی چیز کبھی اس کے ہاتھوں کی پشت اور کبھی اس کی پیشانی کو چھو لیتی ہے اور پھر اسے اپنے ہونٹوں پر ہلکا سا بوجھ پڑنے لگا۔

"اماں!" ایک میٹھی سی آواز اس کے ذہن میں پھیلے ہوئے زہریلے دھوئیں میں سے گزرتی ہوئی دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

"ثریا!" اس نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ اسکی اپنی ثریا اس کے پاس کھڑی تھی کتنی معصوم لگا رہی تھی اسکی، وہی پیاری پیاری، نیلی نیلی آنکھیں، وہی ننھے ننھے ہاتھ، وہی بات کرنے کا معصومانہ انداز۔ بڑھیا کے سینے میں اسکا دل اچھلنے لگا۔ وہ مسکرا پڑی۔ کتنا بیہودہ وہم تھا وہ۔ ثریا میری ہے۔ اسے مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا، اسکا باپ بھی نہیں، دنیا کی کوئی طاقت بھی نہیں۔ ایک ماں کا غرور اسکی رگ رگ سے پھوٹنے لگا!

ابخاموش بیٹھے رہنا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ ایک ماں کے صبر وضبط سے باہر تھا۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ بچی کی طرف بڑھنے لگے۔

"ثریا بیٹی! میری بیٹی!"

"اونہوں اماں! تو آگئی ہے خفا ہو کر۔ تو اتا جان لے ڈسکے ہیں، کہتے ہیں تونے مجھے پالا ہے۔ اب تو خوش ہو گئی ہے نا؟"

اور ثریا کے ہاتھ سے نوٹوں کا بنڈل گر کر بڑھیا کی گود میں جا پڑا۔ بڑھیا کی نگاہیں نوٹوں کے بنڈل پر پڑیں، پھر ثریا کے چہرے پر۔ ایک غرور انگیز مسکراہٹ کی سرخی نے اس کے سارے چہرے کو ڈھانپ دیا تھا! بڑھیا کو یوں محسوس ہوا گویا ایک بھاری پتھر اس کے سینے پر آ پڑا ہے۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ وہیں رک گئے۔ اس کی سانس رک گئی، اس کے دل کی دھڑکن رک گئی۔

"ثریا، ثریا! تو نے" وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

اس کی آواز اس کے اپنے دل کے خلا میں گونجتی رہی — گونجتی رہی۔

دوزخ ——— بقیہ صفحہ ۲

ہمت ہار دوں — اس دوزخ نا گمرت جیمس، ہاکر وحشت میں دیوانی ہو کر ٹھوکریں کھانے جنگل کی راہ لوں۔ تم سب کی ہمدردی کی شکر گذار ہوں۔ شوہر کی محبت تو کبھی خواب میں بھی نہ نصیب ہو سکی۔ لیکن تم سب کی والہانہ الفت کے سہارے میرے دل کو تسکین ملی ہے — تم سب کے بہترین الفاظ میرے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں" — لبنیٰ سے نہ رہا گیا "کیسی بزدل ہو حسرت — ہٹاؤ اپنے شوہر کو ڈال دو اپنی دوسرے جہنم میں — تم نے تو الف۔ اسے تک پڑھا ہے پھر یہ جو ہماں کس لئے آ یہ ناپاک رشتہ ہی کاٹ دو۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری — مزے سے تنہا زندگی گذارو — دنیا بہت وسیع ہے — بہت بڑی — گہری — یہاں۔ دوبارہ نہیں آنا۔ زندگی کے لطف جسقدر بھی اٹھا سکو وقت پر اٹھا لو۔

حسرت نے ٹھنڈی مایوس آہ کی — "لبنیٰ کیا تم یہ جانتی ہو کہ تعلیم کو بدنام کردوں لوگ کہیں دیکھا مصیبت اٹھائی نہ گئی پڑھی لکھی تھی اسے آزادی سے کام تھا" میں نے تو سوچ لیا ہے میری قسمت سے خوشی روٹھ کر دور جا چکی ہے۔ میری دنیا ہی دوزخ ہے شاید کسی ناکردہ گناہ یا کردہ گناہ کی پاداش ہے۔" کبھی مسکراتے ہوئے گنگنانے لگی "واہ:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ... یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

برطانیہ کے نئے وزیر اعظم ——— بقیہ صفحہ ۲۶

دامن میں اس طرح لپٹی ہوئی ہے کہ عوام کی نظریں ان تک نہیں پہنچ سکتیں۔ مگر ان کی سچائی اور دیانتداری کی تعریف سب جگہ ہوتی ہے۔ اگرچہ ان کی تقریر میں جوش اور ولولہ نظر نہیں آتا۔ مگر بیرسٹری نے ان کی تقریر میں غضب کی روانی اور ان کی دلیلوں میں فولاد جیسی منطق بھر دی ہے۔ چنانچہ لیبر پارٹی کے سابق لیڈر مسٹر لینسبری جب اس عہدہ سے سبکدوش ہوئے تو انھوں نے مسٹر ایٹلی کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "یہ شخص ہر موقعے پر کام آ سکتا ہے۔"

گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں مسٹر ایٹلی نے فوجی خدمات انجام دی تھیں۔ اور ایک مدت تک میجر کا لفظ ان کے نام کا جزو بنا تھا مگر چند سال سے یہ صرف مسٹر ایٹلی کہلاتے ہیں۔ جنگ حبش کے موقعے پر مسٹر ایٹلی نے مسولینی اور اس کی پالیسی کے خلاف بہت زبردست تقریر کی تھی۔ اس کے جواب میں اٹلی کے ایک سرکاری اخبار نے مسٹر ایٹلی کو تلوار کی لڑائی لڑنے کا چیلنج دیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے نہایت متانت سے کہا: "تلوار کی لڑائی لڑ کر کسی بات کا فیصلہ کرنا جہالت اور بربریت کی یادگار ہے۔ اور مجھے اس قسم کی جنگ سے نفرت ہے۔"

مگر سیاست کے میدان میں مسٹر ایٹلی کبھی جنگ سے نہیں گھبراتے۔

بورنیو ——— بقیہ صفحہ ۴۳

دینے میں مشغول ہو گئے۔ ان خدمات کے صلہ میں بُرک کو نائٹ بنا دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں راجہ بُرک کو چینی لٹیروں نے وہاں سے نکال بھگایا لیکن برک نے ایک چھوٹی سی جمعیت کے ساتھ وہاں دوبارہ حملہ کیا اور اپنی راجدھانی واپس لی۔ برک نے اپنی زندگی کے آخری ایام ڈیون شائر میں سکون کے ساتھ گزارے۔ اسوقت سے اب تک برک کی اولاد سراوک پر حکومت کرتی آئی ہے۔ سراوک کے موجودہ راجہ کو جاپان کے حملے کے وقت کچھ عرصہ کے لئے آسٹریلیا میں جگہ دی گئی۔

برطانوی شمالی بورنیو میں نوجوان اسکاچستانی فوجی الگزنڈر گوڈی کا قصہ بھی جس نے ہسپانوی ناکہ بندی کو توڑنے میں نمایاں حصہ لیا تھا سراوک کے قصہ کی طرح دلچسپ ہے۔ درحقیقت بورنیو کی تاریخ بہادروں اور ہمندر لٹیروں کے قصوں سے بھری پڑی ہے۔

عورتوں اور لڑکیوں کیلئے اہم انعامات
اگر لڑکیاں اور بیویاں اپنے والدین اور خاوند کو گھریلو زندگی میں خوش رکھیں تو ان کو زنانہ انعامات ملیں اور گھر کی زندگی جنت کا نمونہ بن جائے۔
رضیہ سلطانہ حسن دہلوی کی حسب ذیل کتابیں اپنی مستورات اور لڑکیوں کو منگا کر دیجئے۔ اور پھر اپنے گھر کا نقشہ دیکھئے حقیقت میں ہر گھر میں یہ کتابیں بہت ضروری ہیں
رضیہ کا شاہی دسترخوان
مغلیہ شہنشاہوں کے کھانوں کی ترکیبیں۔ لذیذ قسم کے کھانے وغیرہ جس میں ہر قسم کے ناشتے۔ اچار۔ شربت۔ سکنجبین۔ تاش کریم فالودہ۔ بسکٹ۔ کیک پیسٹری۔ بادامی کیک۔ فرنچ ٹوس۔ شاہی ٹکڑے۔ نمک پارے۔ کباب۔ پتہ بھوت پوریاں۔ آملیٹ۔ بالائی کی پوریاں۔ آم کی پھلکیاں۔ پڈنگ۔ نان خطائی۔ ہر قسم کے حلوے۔ ۲۰ قسم کی روٹیاں ۳۶ قسم کی دالیں۔ مچھلی مختلف اقسام یخنی۔ پلاؤ۔ مغز۔ پچاسوں قسم کے سالن۔ مرغ بنانے کی ترکیبیں۔ ۲۹ قسم کے پکوان۔ ۹۴ قسم کے حلوے۔ ۳۰ قسم کی مٹھائیاں۔ ۳۰ قسم کی چٹنیاں۔ مربے۔ ۱۹ قسم کے ناشتے۔ ۴۰ قسم کے انگریزی کھانے وغیرہ وغیرہ۔ مجلد ڈھائی سو صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲/۸) محصول چھ آنے علاوہ۔
رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری
کشیدہ کاری پر ایک مکمل کتاب۔ تکیوں پر خوبصورت پھول۔ پلنگ کی چادریں۔ دلکش بوٹے۔ فراکیں۔ رنگین گلدستے۔ دوپٹے کی دیدہ زیب بیلیں۔ غرضیکہ گھرداری میں استعمال ہونے والے ہر کپڑے پر پھول بوٹے کاڑھنے کے لئے اس میں سینکڑوں قسم کی حسین و جمیل چیزیں ہیں۔ مجلد قیمت دو روپے بارہ آنے (۲/۱۲)
رضیہ کے خطوط
لڑکیوں کو اردو خط و کتابت اور سلیقہ سکھانے والی بہترین کتاب۔ سہیلیوں، عزیزوں، بزرگوں کو خط لکھنے کے طریقے اردو میں زنانہ خطوط و انشاء کی سب سے زیادہ آسان اور مفید کتاب۔ اس کے مطالعہ کے بعد لکھنے کا رنگ۔ پڑھنے کا ڈھنگ رہنے کا طریقہ جینے کا طرز سب ہی کچھ آجائے گا۔ قیمت ڈھائی روپے (۲/۸) محصول چھ آنے۔
رضیہ کے تین افسانے
شیطان کی کھوپڑی۔ کنیزوں کا انتقام۔ زمین دوز شہر۔ یہ تینوں افسانے الگ الگ کتابی شکل میں ہیں اور تینوں کی مجموعی قیمت پندرہ آنے (۱۵) محصول چھ آنے۔
عورتوں کیلئے دیگر مفید کتابیں
امت کی مائیں:۔ سوانح ازواج پاک۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲/۸)
پتھر سے ہیرا:۔ عورتوں کے لئے بہترین اخلاقی ناول قیمت دو روپے چار آنے (۲/۴)
یہ تمام کتابیں اکٹھی منگانے پر محصول ڈاک معاف
یہ اور ہر قسم کی کتابیں ملنے کا پتہ
نیا کتاب گھر اردو بازار (ے۔ سی) دہلی

اپنے گھر بچاؤ
تاکہ پچھتانا نہ پڑے۔ اندھا دھند علاج سے آپ راضی ہو سکتے ہیں تو بھلا پیٹنٹ ادویات سے
کیوں راضی نہ ہو جاتے اور نیم حکیموں کے علاج سے تو پچھتانا ہی پڑتا ہے۔ لاکھ روپیہ خرچ کرو۔ ان امراض
یعنی کمزوری وغیرہ کا مکمل علاج محال ہے۔ جب تک صحیح رائے اور بہترین دوائیوں سے مکمل
علاج نہ ہو، یہ خاص خاص راز کبھی یونانی اور آیورویدک کتابوں میں بھی نہیں لکھے ہوتے۔
آپ سے نے
جو تعریف کی یہ دوائی کہیں اس سے
زیادہ تعریف کی مستحق ہے ہم
آپ کی قدر کرتے ہیں
فائدہ نہیں ہوتا یا پھر
زیادہ حالت خراب ہو جاتی ہے
میں نے بے شمار
دوائیاں کیں مگر جو تعریف
آپ کی دوائیں دیکھی وہ
کبھی نہیں دیکھی
تو جھوٹی اشتہار بازی سے بچ کر آپ قیمت مکمل آرام کے بعد ادا کیجئے
بیشمار حکیم ڈاکٹر وید بھی ہم سے ادویات منگوا کر خوب نفع کماتے ہیں
وی پی منگوانے والوں کے بھی تعریفی خطوط آتے رہتے ہیں
قیمت حسب حیثیت اور مطابق حالات
دی ہیرو فارمیسی (رجسٹرڈ) وزیرآباد (پنجاب)

آگرہ اسکول کا ایک ماسبق — میری نظر میں

انور بھوپالی

"آجکل" کی اشاعت بابت ۱۹۴۹ء میں جناب آغا اشہر لکھنوی کا ایک تنقیدی مقالہ نظر افروز ہوا۔ اس میں کلام نہیں تنقیدی مضامین ایک ٹھوس ادبی حیثیت رکھتے ہیں اسلئے ان کے افادی پہلو سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسی تنقیدیں جو سرسری نگاہ کا نتیجہ ہوں اور صرف "چھیڑ چلی جائے" کے خیال سے حوالۂ قلم کی جائیں وہ تعمیر کے بجائے تخریب و تنقیص کے سوا کوئی وزن و مرتبہ نہیں رکھتیں، اور اہلِ نظر پہلی ہی نظر میں بھانپ لیتے ہیں کہ جناب نقاد مختلف اندازِ مزاح سے کام لیکر "تفریح" فرما رہے ہیں۔

حضرت آغا اشہر صاحب لکھنوی نے اپنے مقالہ کی تمہید میں نگار کے جس استفسار و جواب کا حوالہ دیا ہے وہاں نیاز صاحب کا یہ جملہ:-

"رہا آپ کے استفسار کو دلچسپ کہنا سو وہ اسلئے ہے کہ جواب حضرت سیماب پر عائد ہوتا ہے اور وہ اس سلسلے میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات لکھیں گے جو کافی پر لطف ہوگی۔ صاف بتا رہا ہے کہ جناب اشہر نے "اسی کافی پر لطف بات" کے سننے کیلئے کاوکاوِ خامہ فرسائی کی زحمت فرمائی ہے۔

حضرت آغا اشہر کی طرزِ تحریر اگرچہ "تقشف" کی حد تک بیوست و سنجیدگی اور شدت الفاظ و تراکیب کی حامل ہونیکے باعث بظاہر مرعوب کن اور وزنی سی چیز معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ساری تحریر کھوکھلی ہے اور اعتراضات از اول تا آخر بالکل سطحی، غلط اور طائرانہ نگاہ نقد کا نتیجہ ہیں جو اشہر صاحب لکھنوی ایسے متین و سنجیدہ نگار کے شایاں نہیں۔

نقدِ نظم کی تمہید اٹھاتے ہوئے جناب نقاد کو حیدرآباد کے ایک صاحب ذوق کا یہ قول یاد آگیا کہ "سیماب ایسا طبیب ہے جس کے ہاتھ میں شفا نہیں" اگر جناب نقاد ان حیدرآبادی صاحب کا نام بھی لکھ دیتے تو ہمیں کم سے کم اتنا تو معلوم ہو ہی جاتا کہ فتحپور کی طرح حیدرآباد میں بھی "صاحب ذوق" موجود ہیں۔

الغرض اس نقد و تبصرہ کیلئے حضرت سیماب کی اس نظم "صلائے بازگشت" کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے جو عرصہ ہوا حضرت جوش ملیح آبادی کی نظم "کشمکش و پیچ" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اور دوسرے نام دہندوں کی طرح جناب اشہر نے بھی پہلے چند تعریفی جملوں سے تمہید اٹھائی ہے مثلاً

"بہر نہج آگرہ اسکول سے جو خصوصیات ادبیہ اپنے حلقۂ اثر میں رائج کئے ہیں ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ادب کی مختلف ڈگریوں پران سے کیا کیا نتائج مرتب ہوئے ...... یہ نظم ان اصلاحی تخیلات کی حامل ہے جو ایک ہمدردِ ادبیات کا مطمحِ نظر ہونا چاہیئے انداز بیان میں بھی موقع کے لحاظ سے بانکپن موجود ہے اور شدت الفاظ و تراکیب کی بھی کمی نہیں بعض بند حسن بندش کے اعلیٰ نمونہ ہیں" اس مدحیہ قصیدہ کے تخلص و گریز کے طور پر ارشاد ہوتا ہے کہ لیکن با ایںہمہ چند خصوصیات نظم ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن سے بہ تعلق معانی و بیان، ارباب ذوق و نظر کو اتفاق نہیں اور نہ وہ سنجیدہ طرز ادا کے تحت میں آنے کی صلاحیت رکھتی ہیں" صلائے بازگشت کا

(۱) اے شخص محبت کہ جنوں زار میں پھر آ   لعلوں بھرے دامن کے سہارے میں پھر آ
صحرائے جنوں خیز و جنوں بار میں پھر آ   واماندہ نہ ہو منزلِ دشوار میں پھر آ
اے صاحب دل کوچۂ دلدار میں پھر آ

اعتراض:- مصرع اول میں "اے شخص" سے حضرت جوش کو مخاطب کیا گیا ہے حالانکہ سنجیدگی خطاب کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے معاصر کو ایسے الفاظ سے مخاطب کیا جائے جو اس کی نمایاں شخصیت میں کسی طرح کا دہن نہ پیدا نہ ہونے دیں یعنی دہن پیدا نہ ہونے دیں۔ ایسے مواقع پر عرف عام پر نظر رکھتے ہوئے "اے نکتہ سنج یا اے سخن طراز" وغیرہ سے مخاطب کرنا زیادہ مناسب تھا اگر اس نظم سے اصلاح تخیل کی علمبرداری مقصود نہ ہوتی بلکہ صرف سرزنش ادبی مطمحِ نظر ہوتی ۔ مضائقہ نہ تھا لیکن سیماب صاحب تو "کشمکش و پیچ" کے قائل کو تخیل شعر کے صحیح و مستقل راستے پر لانا چاہتے ہیں جو بلحاظ موقع و محل "اے شخص" سے مخاطب ہونیکا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس ترکیب ندائیہ سے تو مستفاد ہوتا ہے کہ کسی غیر شاعر سے خطاب ہے باقی مصرعے روانی اور چستی بندش کے صحیح نمونے ہیں۔

جواب:- جناب اشہر بھی جانتے ہیں اور مقالۂ ہذا کے ناظرین بھی کہ تعمیم، تخصیص کے مقابلہ میں زیادہ بلاغت کی حامل ہوا کرتی ہے اور تمام ارباب ذوق و نظر کو بہ تعلق معانی و بیان الکنایۃ ابلغ من التصریح سے اتفاق ہے اور چونکہ "شخص" شاعر بھی ہو سکتا ہے اور غیر شاعر بھی، اسلئے یہ لفظ کنایۃً جسقدر سنجیدگی خطاب لئے ہوئے ہے اتنا سخن طراز یا نکتہ سنج یا اے جوش! (جو سامنے مخاطب تھا) ہرگز نہیں بلکہ اس طرح براہ راست حملہ ہو جاتا جس سے مخاطب کی سنجیدگی بھی خاک میں مل جاتی اور مخاطب کی نمایاں شخصیت میں دہن بھی پیدا ہو جاتا۔ چونکہ سیماب صاحب "کشمکش و پیچ" کے غیر شخص نہیں بلکہ شخص قائل کو تخیل شعر کے صحیح و مستقل راستے پر لانا چاہتے ہیں اور براہ راست حملہ کر کے نہ اس کے دہن پر اسکو قائم رکھنا نہیں چاہتے اسلئے بلحاظ موقع و محل اور باعتبار نیک نیتی اور صداقت خلوص، اسم کنایہ کو منادیٰ بنا کر بہ تعلق معانی و بیان ارباب ذوق و نظر کو اپنی خوش بیانی کے جوہر دکھائے ہیں۔ اور چونکہ اس نظم سے اصلاح تخیل کی علمبرداری بھی مقصود نظر ہے اور ادبی سرزنش بھی، اسلئے جناب نقاد کو تو اس میں کوئی مضائقہ ہونا چاہیئے اور نہ اسم کنایہ کی

ترکیب نداہے یہ مسئلہ ذکر نا چاہیئے کہ کسی غیر شاعر سے تخاطب ہے بلکہ یہ استفادہ کرنا چاہیئے کہ اس نابغہ عصر نے اپنی شیوہ بیانی سے اصلاح فن و ادبی سرزنش کیساتھ ساتھ اس بات کا بھی درس دیا ہے کہ کتابیہ، صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ پورا بند روانی، چستی بندش، رعنائیت اور پاکیزگی تخیل کے اعتبار سے سحر حلال ہے۔

(۲) تصویر کے اس پردۂ سیمیں سے گزر کر — پیوستہ فریب مہ و پرویں سے گزر کر
تلبیس و ریا کار دنیا سے گزر کر — گمنامی کی اس خلوت تسکیں سے گزر کر

علم و ادب و شعر کے دربار میں پھر آ

اعتراض:- پہلے مصرع میں سینمائی شاعری کیطرف لطیف اشارہ ہے جس کے اثر میں اردو شعر اس وقت دبا ہوا ہے البتہ مصرع چہارم میں خلوت تسکیں کی ترکیب اظہار مقصد کیلئے کافی نہیں جس سے سیماب صاحب کی مراد یقیناً خلوت سکوں آمیز ہے فارسی کی کوئی جدید ترکیب جو باعتبار معنی تشنۂ تکمیل ہو ادب اردو میں شامل نہیں ہونی چاہیئے خلوت تسکیں کے آگے پڑھنے والے کا ذہن کسی اور لفظ کا اضافہ چاہتا ہے شعر میں محذوفات داخل ہیں نظم ہوئے ہیں۔ لیکن وہی محذوفات جو پہلی نظر کے ساتھ پڑھنے والے کے ذہن میں آجائیں کوئی گھ دھندلا نہ ہوں۔"

جواب:- تسکین بروزن تفعیل کی اصل سکون ہے اور باب تفعیل جہاں لازم و متعدی دونوں طرح آتا ہے وہیں کئی خصوصیات و معانی پر بھی مشتمل ہے۔ میں عرض کرونگا کہ جناب نقاد نے سرسری نگاہ کے بعد اعتراض فرما دیا ہے ورنہ کیا انکو نہیں معلوم کہ لفظ تسکین اپنے لغوی معنوں کے اعتبار سے سکوں آمیزی، سکوں بخشی اور سکون ہی کا مفہوم بھی اپنے اندر رکھتا ہے؟ خلوت تسکیں فارسی کی جدید ترکیب ضرور ہے لیکن باعتبار معنی تشنۂ تکمیل ہرگز نہیں، اور اس بند کے تینوں مصرعے پڑھ لینے کے بعد اگر قاری کا ذہن خلوت تسکیں کے آگے کسی اور لفظ کا اضافہ چاہتا ہو تو تسکین کے معانی کیطرف اس کی توجہات مبذول کرانیکے علاوہ دو باتیں اور عرض کرونگا (۱) اس نظم کا مخاطب "نشش و پنج" کا مصنف ہے اور وہ تسکین کے معانی سے نابلد نہیں (۲) سیماب صاحب اس شاعری کے علمبردار ہیں جو پہلی نظر کیساتھ پڑھنے والے عوام کے ذہن میں نہ آئے بلکہ اسکے لئے غور و تعمق اور طبیعت و استعداد کی بھی ضرورت ہو۔ اب رہ گیا سوال شعر میں محذوفات کا تو یہاں کوئی لفظ محذوف نہیں ہے اسلئے سیدھی سی بات کو گورکھ دھندا سمجھ لینا معقولیت نہیں۔

(۳) لو اور یہ بازیچۂ ناکام تفکر — رفعت پہ بنا اپنے لئے بام تفکر
اے لذگہ ہے منجملۂ اعظام تفکر — شایاں نہیں ہنگامی خدام تفکر

باجاہ و حشم حسن کی سرکار میں پھر آ

اعتراض:- پہلے مصرع میں بازیچہ کی توضیح "ناکام" سے گویا تحصیل حاصل ہے حالانکہ لفظ بازیچہ میں "چہ" خود تحقیر و تنقیص معنی کیلئے موجود ہے بازیچۂ ناکام غلط نہیں مگر ایک مشاق نظم جسکے قلم سے ایسے ہزاروں الفاظ نکل چکے ہوں زوائد نظم کا استعمال منقصت توجہ کی حد تک پہونچتا ہے۔ البتہ اس صورت سے قبل بازیچہ اضافی صورت میں کثرت سے مستعمل ہوا ہے جسمیں معنا کوئی نقص نہیں پایا جاتا مثلاً بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے، سیماب صاحب اگر کسی طرح بازیچۂ اطفال ہی نظم کر دیتے تو علاوہ الزام فرسودگی کے کوئی قباحت نہ تھی اسوجہ سے کہ چوتھے مصرع میں اضافی صورت میں اس کا تقابل "ہنگامی خدام" بھی (؟) موجود ہے جس سے معناً موافقت ترکیب بھی ہو جاتی۔ شاعر کا پہلا فرض یہ ہے کہ جس مضمون کو کسی منزل سے شروع کرے اس کی تکمیل کے دوران میں انحطاط فکر کا شائبہ بھی پیدا نہ ہونے دے چنانچہ چوتھے مصرع میں ہنگامی خدام تفکر کہہ کے۔ رفعت بام تفکر اور اعظام تفکر سے جو بلندی مقصد حاصل کی گئی تھی وہ آخر میں ہنگامی کے لفظ سے پست ہو گئی یعنی بلند آہنگی تفکر قدم بوس خدام بن گئی، مناسب تھا اگر ہنگامی کی جگہ ہمدوشی خدام فرما دیتے۔

جواب:- یہ بالکل درست ہے کہ "بازیچہ" میں "چہ" خود تحقیر و تنقیص معنی کے لئے موجود ہے لیکن "بازیچہ کی توضیح ناکام سے گویا تحصیل حاصل ہے" درست نہیں۔ کیونکہ بازیچہ کی صفت "ناکام" تاکید کیلئے عمداً لائی گئی ہے تاکہ بازیچہ کی توضیح بھی ہو جائے اور تحقیر و تنقیص کی تاکید بھی۔ ایک مشاق نظم کو جسکے قلم سے ایسے ہزاروں الفاظ نکل چکے ہوں اور جو صفت تاکیدی اور زوائد نظم کے فرق و امتیاز کو بخوبی سمجھتا ہو، زوائد نظم کے استعمال سے متہم کرنا مناسب نہیں۔ سیماب صاحب اگر جناب نقاد کے مشورہ کے موافق "بازیچۂ اطفال" ہی کسی طرح نظم فرما دیتے تو الزام نہیں بلکہ جرم فرسودگی کے ارتکاب کے علاوہ ایک بہت بڑی قباحت یہ پیدا ہو جاتی کہ قافیہ زفرق تا بقدم غلط ہو جاتا اسوجہ سے کہ چوتھے مصرعے میں اضافی صورت میں اس کا تقابل "ہنگامی خدام" بھی موجود ہے جس سے موافقت ترکیب تو ضرور ہو جاتی مگر خدام اور اعظام کا قافیہ اطفال ہو جاتا۔

بیشک شاعر کا پہلا فرض یہ ہے کہ جس مضمون کو کسی منزل سے شروع کرے اس کی تکمیل کے دوران میں انحطاط فکر کا شائبہ بھی پیدا نہ ہونے دے۔ چنانچہ چوتھے مصرع میں ہنگامی خدام تفکر کہہ کے، رفعت۔ بام تفکر اور اعظام تفکر سے جو بلندی مقصد حاصل کی گئی تھی وہ آخر میں ہنگامی کے لفظ سے پست نہیں ہوئی بلکہ "تابہ ثریا" جا پہونچی ہے کیونکہ سیماب صاحب "بلند آہنگی تفکر" کو "قدم بوس خدام تفکر" دیکھکر ادبی سرزنش بھی فرما رہے ہیں اور اصلاح تخیل کی علمبرداری بھی۔ اگر ہنگامی کی جگہ "ہمدوشی خدام" فرما دیتے جیساکہ فاضل نقاد کا مشورہ ہے تو ڈاکٹر اقبال مرحوم کے "مور بے مایہ کو ہمدوش سلیماں" کیوجہ سے علاوہ الزام فرسودگی کے ایک بہت بڑی قباحت پیش آجاتی کہ پورا بند صنعت اہمال کا نمونہ بن جاتا۔ اعتراض کا اصل مصدر و منبع "ہمدوش سلیماں" کی فرسودہ یاد کے علاوہ چوتھے مصرع میں "خدام تفکر" کے مفہوم تک نارسائی فکر اور منقصت توجہ بھی ہے۔ اس بند کا مطلب یہ ہے:-

اے شخص تو چونکہ منجملۂ عظام تفکر ہے لہذا اپنے لئے رفعت پر بام تفکر بنا۔ تجھ ایسا منجملۂ عظام تفکر اور یہ بازیچۂ ناکام تفکر! توبہ توبہ!! خدام تفکر کی ہنگامی تجھ ایسے شخص کے شایاں نہیں، لہذا اس بازیچۂ ناکام تفکر پر لعنت بھیج اور —

باجاہ و حشم حسن کی سرکار میں پھر آ

اگر جناب نقاد طائرانہ نظر کے بجائے سیماب صاحب کی نظم کو غور کیساتھ پڑھتے اور

خدام تفکر" کا مطلب سمجھتے وقت بازیچۂ ناکام کو بھی پیش نظر رکھ لیتے تو غلط فہمی نہ ہوتی۔

(۴) صورت کدۂ ابروگل و مل سے نکل کر — بیکار نگاری کے تسلسل سے نکل کر
ہنگامۂ تزئین و تجمل سے نکل کر — اس شورش و اس ہیجان سے اس غل کو نکل کر
یکسوئی عشرت کدۂ یار میں پھر آ

اعتراض:۔ صرف مصرع اولی کیطرف حضرت سیماب کی توجہ منعطف کرنا ہے یعنی ترکیب عطفی کے مطابق صورت کدۂ ابرو مناسب صورت کدۂ گل، موزوں، لیکن صورت کدۂ مل۔ باوجود صرف استعارہ و مبالغہ سمجھ میں نہیں آیا۔ رہا کیف شراب کی پیدا کی ہوئی خیالی تصویریں، سو وہ "نگس کو باغ میں جانے نہ دینا" کا مترادف ہے۔ باقی مصرعے توضیح مقصد پر نظر رکھتے ہوئے تعریف سے بے نیاز ہیں۔

جواب:۔ پردۂ سیما کی دنیا آجکل اتنی وسیع ہوگئی ہے کہ سینما اور سینما کے اکثر و بیشتر متعلقات، علم الیقین سے گزر کر عین الیقین اور حق الیقین کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں اور ہر شخص کو مشاہداتی تجربہ ہو چکا ہے کہ سینما

ہرچہ در جملۂ آفاق در ایں جا حاضر — شاہد و شمع و شراب و شکر و نائی و سرود

کا مکمل ترین صورت کدہ ہے پھر تعجب ہے کہ محترم نقاد کو صورت کدۂ ابر و صورت کدۂ گل کے مناسب و موزوں ہونے تو کلام نہیں لیکن "صورت کدۂ مل" باوجود صرفِ استعارہ و مبالغہ "سمجھ میں نہیں آیا۔ غالباً جناب نقاد کو صرفِ مبالغہ و استعارہ کے خیال نے سمجھنے سے قاصر رکھا حالانکہ یہاں نہ استعارہ کا صرف ہے نہ مبالغہ کا استعمال، بلکہ بالکل سیدھی سی بات ہے اور صورت کدہ (سینما) میں "ابر و گل و مل" کی محفلیں کی محفلیں نظر افروزی کرتی ہوئی روزانہ دیکھی جا سکتی ہیں رہ گئیں کیف شراب کی پیدا کی ہوئی خیالی تصویریں۔ تو وہ بھی یہاں ہرگز مقصود نہیں اسلئے "نگس کو باغ میں جانے نہ دینا" کا مترادف سمجھنا معقول بات نہیں۔

(۵) مدت ہوئی بیٹھا ہے سر کوئے خموشی — تکلیف نظر ہیں لب و ابروئے خموشی
کب تک یہ اثر کاریٔ جادوئے خموشی — تا چند اسیر خم گیسوئے خموشی
کاشانۂ آزادیٔ گفتار میں پھر آ

اعتراض:۔ یہ پابند تسلسل و ترنم کی بہترین مثال ہے۔ صرف کاشانۂ آزادی گفتار کا سکوت بے ثمر ہے۔ کاشانہ کے معنی خانۂ کوچک و حقیر کے ہیں اور اس کا استعمال فارسی و اردو ادب میں ایسے مواقع پر کیا گیا ہے جن کو بغیر گنجائش تردید مجبوری و تنگی حالات سے تعلق ہو۔ مثلاً کاشانۂ غم کاشانۂ فقر وغیرہ جناب والا آزادی گفتار کو جو وسعت عالم چاہتی ہے ایک کوٹھری میں محدود کر کے جوش صاحب کو حریت نوائی کی دعوت عمل (؟) دے رہے ہیں غالباً "ہنگامۂ آزادی گفتار .... مناسب ہوتا۔

جواب:۔ یہ بالکل درست ہے کہ "کاشانہ" خانۂ کوچک و حقیر کے معنی میں آتا ہے مثلاً کاشانۂ غم وغیرہ اور شاعر بھی اپنے کلبۂ احزاں یا غمکدہ کو کاشانۂ غم ہی کہا کرتا ہے لیکن وہ کاشانۂ شاعر، کوچک و محقر ہونیکے باوجود ایک غلامانہ ذہنیت نہ رکھنے والے شاعر کے لئے اپنے اندر اسقدر وسعتیں پنہاں رکھتا ہے کہ آزاد منش شاعر کو وہاں پوری طرح آزادی گفتار کی گنجائش ہوتی ہے اور سیماب صاحب بھی یہی چاہتے ہیں کہ جوش صاحب سینما کی عریض و طویل دنیا کی پابندی گفتار چھوڑ کر اپنے پرانے کاشانۂ آزادی گفتار میں واپس آ جائیں۔ رہ گیا سوال نقاد صاحب کی اصلاح سے "ہنگامۂ آزادی گفتار" کا تو یہ درست نہیں کیونکہ شاعر بالعموم خلوت پسند ہوتا ہے ہنگامہ پسند ہرگز نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ سیماب صاحب "دعوت عمل" ؟ ہرگز نہیں دے رہے جیسا کہ نقاد صاحب نے منطقی مغالطہ سے کام لیکر غلط مفہوم پیدا کرنے کی غیر مشکور سعی فرمائی ہے۔ مولانا سیماب صاحب جانتے ہیں کہ شاعر "بندۂ عمل و غلام کار" نہیں ہوتا۔ اسی لئے آزادی گفتار کی دعوت دی گئی ہے نہ کہ "دعوت عمل" کی۔ آگے چل کر جناب نقاد فرماتے ہیں:۔ "خلاصہ یہ کہ صحیح مواقع پر صرف الفاظ مشق شعر کی اعلیٰ سند مانی گئی ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ نقاد صاحب کی دانست میں مولانا سیماب صاحب نے چونکہ صحیح مواقع پر لفظ کاشانہ صرف نہیں فرمایا اسلئے (بقول نقاد ایک کہنہ مشق شاعر فی الجملہ تخیل شعر کے مجدد اور مشاق نظم) حضرت سیماب صاحب کو مشق شعر کی اعلیٰ سند مرحمت فرمانے کے لئے جناب نقاد تیار نہیں ہیں۔ آگے چل کر نقاد صاحب مثال کے طور پر فرماتے ہیں کہ "ذرا کہہ تو دیکھئے۔ سامعین ہمہ تن اُذن ہو گئے۔ پھر سوچئے کہ کانوں پر کیا اثر پڑا"۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر مولانا سیماب صاحب جدت سے کام لیکر ہمہ تن گوش کے بجائے ہمہ تن اذن کہدیں گے تو کانوں پر کچھ اثر پڑ جائے گا اور لفظ اذن چونکہ جناب نقاد کے نزدیک صحیح موقع پر استعمال نہیں ہوگا اسلئے مشق شعر کی اعلیٰ سند اس موقع پر بھی مولانا سیماب صاحب کو نہیں ملے گی بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اذن گوش میں عربی و فارسی الفاظ ہونے کے علاوہ کوئی اور معنوی فرق نہیں ہے اسلئے اگر کوئی شخص گوش کی جگہ اذن کہے گا تو غلط ہرگز نہیں ہوگا غیر مانوس ہونے کی وجہ سے محل فصاحت اور غریب سمجھا جائیگا لیکن مانوس و غیر مانوس ہونا اضافی چیز ہونیکے علاوہ ہمارے استعمال پر منحصر و موقوف ہے۔ اگر "ہمہ تن اُذن" بولنا شروع کر دیا جائے تو چند روز میں کان اسکے بھی خوگر ہو جائیں گے۔ کانوں پر اثر پڑنے کے سلسلے میں ایک قصہ یاد آیا کہتے ہیں کہ ابو العلا معری نے قرآن مجید کا جواب لکھا تھا لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس میں قرآن جیسی فصاحت نہیں ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہاں ابھی تم کو معلوم نہیں ہوتی جب سو دو سو برس تک نمازوں میں پڑھا جائے گا تو اس میں بھی ویسی ہی روانی ہونے لگے گی۔ بہر حال لفظ کاشانہ حضرت سیماب صاحب نے غلط ہرگز استعمال نہیں کیا جیسا کہ سطور بالا میں عرض کر چکا ہوں اور اس لفظ کو غیر فصیح کہنا تو کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اسی سلسلے میں جناب نقاد کو ڈاکٹر اقبال مرحوم کی ایک نہایت بلند پایہ نظم کا ایک بہت ہی بلند پایہ شعر حسن اتفاق یا سوء اتفاق سے یاد آ گیا۔ بس پھر کیا تھا، مثال کے طور پر فوراً پیش فرما کر یہ استنتاج فرمایا گیا ہے کہ "جگنو کی مختصر و محدود روشنی کیساتھ کاشانۂ چمن کی ترکیب بتاتی ہے کہ جیسا ظرف ویسا مظروف"۔ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ حضرت جوش چونکہ ایسے بہت زیادہ بھاری بھرکم قسم کے آدمی نہیں ہیں اسلئے انکے واسطے بھی کاشانۂ آزادی گفتار ناکافی نہیں ہوگا۔

(۶) اس کارگہ حرفت و صنعت سے گزر کر — افکار کی اس تنگی و وسعت سے گزر کر

ملاؤں کی نظر بصیرت سے گزر کر   اس گوشۂ گمنام قناعت سے گزر کر

مردوں کی طرح محشرِ بیدار میں پھر آ

اعتراض ملے :-   کا ترجمہ "حرفت و صنعت" سے کیا گیا ہے جو با عتبار استعمال اور بلحاظ دبدبۂ فن "لطیف شعر" اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ صنعت شعر تو خیر مناسب ہے لیکن حرفت شعر محل نظر ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس مقام پر شعر پیشگی کا مفہوم نہیں کھپتا۔ اسوجہ سے کہ قائل دنیائے شعر میں ایک خاص مقام رکھتا ہے اور انفرادیت تخیل کا مالک۔

جواب :- (Poetic Art) کا ترجمہ صنعت و حرفت کا استعمال ممکن ہے اچھا نہ معلوم ہوتا ہو لیکن یہاں چونکہ سینما کی دنیا اور سینمائی شاعری کی تخفیف و تنقیص کا اظہار مطلوب ہے اسلئے موقع و محل کے پیش نظر بہ تعلق معانی و بیان، صنعت و حرفت کو عمداً استعمال کیا گیا ہے کہ اوروں کے بس کی بات نہیں۔ دوسرے یہ کہ سینما اور اسکے متعلقات کے صنعت و حرفت ہو نیسے جناب نقاد انکار نہیں کر سکتے۔ رہا سینمائی شاعری کو "فن لطیف شعر" کہنا اور پھر اس میں دبدبۂ شعر کے وجود کا قائل ہونا ذہن سلیم کے فقدان پر دال ہے۔ اور یہ بھی مناسب نہیں کہ صنعت شعر کو تو مناسب سمجھا جائے اور حرفت شعر کو نامناسب، جبکہ حرفت لغوی اعتبار سے تنہا پیشے ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ "کسب" کے معنی میں بھی آتا ہے اور حقیقت واقعہ یہ ہے کہ سینما کی دنیا من اولہٖ الی آخرہٖ صنعت، حرفت، کسب، اور کسب کے تمام مشتقات کو پوری طرح اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

اعتراض ملا :- دوسرے مصرع میں غیر تنگی افکار سے گزرنا تو درست ہے لیکن وسعت افکار سے بھی گزر رجانا، چہ معنی دارد۔ جبکہ خود محشر بیدار کا وسیع منظر جناب جوش کے حرف افکار کیلئے پیش کیا جا رہا ہے۔

جواب :- یہاں بھی جناب نقاد نے مغالطہ سے کام لیا ہے ایک شاعر کیا غیر شاعر کے بھی دل و دماغ میں ایسی جگہ وسعت افکار پیدا ہو سکتی ہے جہاں ؎

شاہد و شمع و شراب و شکر و نائی و سرود

سب کے سب بیک گردش چرخ نیلوفری یکجا موجود ہوں۔ چہ جائے کہ جوش صاحب جنکا تمام سرمایۂ شاعری تنہا وسعت و افکار ہی کے لئے مشہور ہو گیا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سینما کی دنیا (کارگاہ صنعت و حرفت) ایک شاعر اور اس کی شاعری کو ڈبونے کے لئے گوشہ گمنام سے کسی طرح کم نہیں، اور اسی گوشہ گمنام کے مقابلہ میں اس کارگہ صنعت و حرفت سے باہر کی دنیا کو محشر بیدار سے تعبیر کیا گیا ہے جہاں حضرت جوش کو صرف افکار کا پہلے کی طرح پورا پورا اختیار ہو گا لیکن اس کارگہ صنعت و حرفت کی حدود و قیود میں رہ کر ایک شاعر خواہ وہ جناب جوش کی طرح ہزار وسعت افکار کا مالک ہی کیوں نہ ہو اسے پرکار رہنا ہرگز نہیں ہو سکتا (اور مجھے معلوم ہے کہ جناب جوش اس قید کو

"وی۔ ڈے"

تاباں

خون انجم سے شہابی ہے افق کا دامن
سحرِ ظلمت کا فسوں ٹوٹ چکا
شب کا پندار زبوں ٹوٹ چکا
اے خوشا صبح طرب۔ صبح چمن۔ صبح وطن
زندگی موت پہ غالب آئی
غم سے انسان نے رہائی پائی
چھا گئی روح طرب سُرخ سویرا بن کر
آج ہے بزم کا انداز نیا
لے نئی گیت نیا ساز نیا
نئی دنیا نئے انسان نئی شام و سحر

بری طرح محسوس فرما رہے ہیں) اسلئے ایسی وسعت کس کام کی؟ لہذا مولانا سیماب صاحب کا مشورہ ہے کہ اس وسعت افکار سے بھی گذر جا اور تنگی افکار سے تو بہر حال گذرنا ہی چاہیئے۔

(۷) پینے کا کوئی لطف ہی بے شحنۂ شعور   ہو بند جو کوزے میں تو بیکار ہے جیحوں
یہ خون کے آنسو ہیں نہیں بادۂ گلگوں   ماحول سے باطل کے نکل توڑ یہ افسوں

میخانۂ چشم و لب و رخسار میں پھر آ

یہاں پہنچکر جناب نقاد کو حضرت سیماب صاحب کی خدمت میں مشق سخن کی اعلیٰ سند پیش کرنی ہی پڑی، ارشاد ہوتا ہے کہ اس میں نازک مسائل تحسین کی طرف اشارہ ہے جنہیں ہر شاعر کا قلم ادا نہیں کر سکتا، یہیں حضرت سیماب کی مشاقی اور قدرت نظم کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔

(۸) موجود سمندر ہے نہ ہو سیر ندی سے   واقف نہیں کیا دقتِ وحشت بدی کے
ناحق ہے گرفتار خودی بے خودی سے   منادِ مساوات ہے تو نصف صدی کے

غمخوار گل و خار ، مالک و خار میں پھر آ

اس آخری بند کے لئے فرماتے ہیں کہ یہ بند کامیابی کے ساتھ تکمیل مضمون پر آخری مہر لگاتا ہے اور اصول مسلمہ کے تحت پورے مقصد نظم کا تجزیہ پیش کر رہا ہے۔ چلتے چلتے آخر میں آنجناب پھر فرماتے ہیں کہ الی اصل پوری نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ ناظم محترم کے پاس خزینہ الفاظ ضرورت سے زیادہ موجود ہے جسکی بارش اکثر و بیشتر بغیر امتیاز مقام ہو جاتی ہے۔

یہاں اگر مولانا سیماب سے مجھے کچھ گلہ یا شکوہ نہیں بلکہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے کہ آخر مولانا کے پاس ضرورت سے زیادہ خزینۂ الفاظ کیوں موجود ہے اور اس کی بارش اکثر و بیشتر بغیر امتیاز مقام کیوں ہو جایا کرتی ہے؟

مشرق وسطیٰ کی خبریں

ادارہ

عرب لیگ کی سرگرمیاں

ہندوستان کی طرح مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں بھی حد سے زیادہ کاشتکاری ہوتی ہے۔ ان کی کل آبادی کے ۷۵ اور ۸۰ فیصدی کے درمیان لوگ کاشتکاری کے ذریعہ اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ زراعت کے لئے جدید ترین طریقے ابھی اختیار نہیں کئے گئے۔ زراعتی ترقیوں کے اہم مسائل پر کسی قسم کی تحقیقات نہیں کی گئیں۔ اسلئے اگر عرب لیگ سب کمیٹی نے اس سلسلے میں اپنی بیشتر توجہ مبذول کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو یہ امر قبل از وقت نہیں ہے۔ اس کارِ عظیم میں کافی مطالعہ، تحقیق اور تنظیم کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ تمام عرب ممالک میں ایک ہی قسم کے سکے رائج کئے جائیں اور تجارتی رکاوٹیں اور پابندیاں دور کر دی جائیں۔ ایک یہ اہم تجویز بھی زیرِ غور ہے کہ "عرب کریڈٹ بنک" قائم کیا جائے جو عرب کے ضرورتمند کسانوں کو زرِ پیشگی بطور قرض دے سکے۔ تحقیق کے مسئلے کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا ہے۔ بالکل نئے طریقوں سے اپنی صنعتوں کی مکرر تنظیم کرنے کے خیال سے اہلِ عرب نے فیصلہ کیا ہے کہ ان ملکوں کے طریقۂ کار کا عمیق مطالعہ کیا جائے جو صنعت و حرفت کے میدانوں میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔

تمام دنیا میں جسقدر تیل پیدا ہوتا ہے، اس کا دسواں حصہ صرف مشرقِ وسطیٰ کے میدانوں سے نکلتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ پیداوار ابھی ابتدائی منزل میں ہے، اسلئے مقدار بہت قلیل ہے۔ ورنہ ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ ان علاقوں کے پیٹرولیم کے میدانوں میں اسقدر تیل محفوظ ہے کہ وہ تمام دنیا کی کل مقدار کا ۱/۳ حصہ ہو سکتا ہے۔ حال ہی میں اس پیداوار کا جائزہ لینے کے بعد پتہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۴۴ء میں کل مقدار پر تہائی اضافہ ہو گیا ہے۔

مصر

مصر کے محکمۂ ڈاک نے تاسیسِ عرب لیگ کی یادگار منانے کیلئے ڈاک خانے کے دو نئے ٹکٹ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان ٹکٹوں پر لیگ کے پہلے اجلاس کی تصویر ہوگی۔ حکومتِ مصر ملک میں صنعتی ترقی کیلئے کوشاں ہے۔ اس جوش و خروش کا ثبوت مصر میں ایک صنعتی کریڈٹ بنک کے قیام کی زیرِ غور تجویز سے دیا جا سکتا ہے۔ قوی امید ہے کہ زراعتی کریڈٹ بنک کی طرح یہ بنک بھی حکومت کے زیرِ اہتمام رہے گا۔ اس بنک کا حقیقی مقصد یہ ہوگا کہ صنعتی ترقی کے سلسلہ میں لوگوں کی ہمت افزائی کرے اور ان کو روپیہ قرض دے۔ مصر میں مردم شماری کے ابتدائی نتیجے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آبادی ایک کروڑ چھیانوے لاکھ کے قریب پہنچ گئی ہے۔

لبنان

اس سال لیمو کی فصل کے سلسلے میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ شام سے پانچ لاکھ اور لبنان سے ایک لاکھ پیٹیاں دساور کی جائینگی۔ لیمو کی کاشت کرنے والے اس کوشش میں ہیں کہ وہ اپنے قدیم قدر دانوں یعنی برطانیہ، رومانیہ، روس، ترکی اور فرانس کو کم سے کم چار لاکھ پیٹیاں بھیجنے کی سہولتیں حاصل کر لیں۔ وہ لیمو کے عوض خام اشیاء اور دوسری صنعتی پیداوار لینے کے لئے تیار ہیں۔

فلسطین

فلسطین کے مستقبل کا بہت کچھ دارومدار دوسری پائپ لائن کی تعمیر پر ہوگا جو کرک سے حیفہ تک بننے والی ہے اور جسکی وجہ سے نئی توقعات پیدا ہو گئیں ہیں۔

اگر اس کے ساتھ ساتھ امریکنوں نے سعودی عرب کے تیل کے چشموں سے لیکر بحیرۂ روم تک پائپ لائن بنانے کے ارادہ پر عمل درآمد کیا اور کرنسی کا سوال بھی معقول طریقے سے طے ہو گیا تو اس مسئلہ سے یورپ کی دلچسپی پیدا ہو جانے کا امکان ہے کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ پائپ لائن کے بحیرۂ روم میں خشکی تک آ جانے سے مشرقِ وسطیٰ تیل کی فراہمی کے مرکز سے بہت قریب ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے نہر سوئز عبور کرنے کی فیس سے بچت ہو جانے سے بہت کفایت ہو جائیگی۔

لیکن یہ بات بالکل یقینی ہے کہ دس سال کے اندر حیفہ میں فلسطین کی تیل کی بندرگاہ دنیا میں سب سے بڑی ہوگی اور عرب کے ایک بہت بڑے طبقہ کا معیارِ زندگی اس کے موجودہ معیار سے کہیں زیادہ بلند ہو جائے گا۔

اخبار "فلسطین" کی اطلاع ہے کہ عمان میں فلسطین کے چار عرب لیڈروں اور شرق اردن کے امیر عبداللہ کے درمیان مشورہ کے بعد فلسطین کی عرب جماعتوں کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرنے کے لئے ایک کمیشن کی تشکیل کرنیکا فیصلہ کیا گیا۔

اس کمیشن کی صدارت عرب جماعت کے لیڈر باری باری کریں گے۔

کمیٹی میں عیسائی عربوں کی بھی کافی تعداد شامل ہوگی۔

اس کا ایک دفتر کھولا جا رہا ہے اور ایک ڈائرکٹر اور کلرکوں کا تقرر ہو گیا ہے۔ یہ کمیٹی اپنا کام ۵۰۰۰ پونڈ کے بجٹ سے شروع کرے گی اور اس رقم میں ضرورتوں کے مطابق اضافہ کیا جائے گا۔

اس مشورہ میں عرب پارٹی کے نائب صدر السید توفیق صالح الحسینی اور نیشنل بلاک کے صدر السید عبداللطیف صالح علالت کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے۔ انہیں فیصلہ سے مطلع کر دیا جائے گا اور ان کے اتفاقِ رائے کرنے پر انتظامات شروع کر دئے جائیں گے۔

نقد و نظر

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں ورنہ کتاب یہاں کالموں میں اظہار خیال نہ ہو سکیگا

پنکھڑیاں

مصنفہ "شیریں" ناشر کتب خانہ علم و ادب دہلی۔ قیمت عہ

پنکھڑیوں کی مصنفہ ادب میں بعض دوسری افسانہ نگار خواتین کی طرح بدنام نہیں ہیں۔ ان کا نام سن کر کسی کو اچھلنے یا چونک پڑنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی اس لئے کہ انھوں نے اپنے افسانوں کو ہر طرح کے ہنگاموں سے محفوظ رکھا ہے۔ ان میں نہ تجرد کی بھی نہیں اور بھوک کی، فاقہ کش محبت بھی نہیں۔ یہاں جو کچھ ہے زندگی کی ہموار سطح پر ہے۔ شیریں صاحبہ زندگی کی اس ہموار سطح کو چھوڑ کر نہ گہری تہوں میں اترنے کی کوشش کرتی ہیں اور نہ آسمانوں کی طرف پرواز کرنے کے لئے بے چین نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے کے افسانوں میں زندگی بے قرار بن کر ہمارے سامنے نہیں آتی۔ ان میں مان بھی ہے، مزدور کی بے بسی بھی ہے، ملک و قوم کی محبت کا شدید احساس بھی ہے لیکن ہر چیز کے بیان میں اعتدال اور جذبات کی روک تھام ہے۔ نئے افسانہ نگاروں کو اس چیز سے سبق لینا چاہئے جب تک تجربے میں پختگی، مشاہدہ میں گہرائی اور بیان میں قدرت پیدا نہ ہو افسانہ نگار کو اسی نرم اور دھیمی چال سے چلنا چاہئے جیسے شیریں صاحبہ چلتی ہیں۔

اس مجموعہ کے افسانے سادگی لئے ہونے کے باوجود اچھے آنیوالے زمانہ کی طرف اشارہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

تاریخ گجرات

مترجمہ شبیہہ احمد بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے۔ ناشر ہندستانی پبلشنگ ہاؤس الٰہ آباد۔ ضخامت ۵۸ صفحات قیمت صہ۔

یہ کتاب ابو تراب ولی کی فارسی کتاب 'تاریخ گجرات' کا ترجمہ ہے۔ فارسی کی یہ تاریخ گجرات کے ایک خاص دور کی مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے اسلئے کہ اس کتاب کے مصنف اور اسکے آبا و اجداد کو اس صوبہ کی سیاسی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ خاص کر ابو تراب تو ایک زمانہ میں اس صوبہ کے منصب دار بھی رہے تھے۔ اس تصنیف کا بے مثل نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ ہندوستان کے مشہور انگریز مورخ سر ڈینی سن راسس نے اس نسخہ کی نقل کرکے کتاب کو مرتب کیا اور ۱۹۰۹ء میں اسے شائع کیا۔

شبیہہ احمد صاحب نے اب اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ ترجمہ میں صحت اور اس کے ادبی انداز کو ہر جگہ قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی ایک مفید کام مترجم نے یہ کیا ہے کہ کتاب کے شروع میں کوئی تیس صفحوں میں گجرات کی مربوط لیکن مختصر تاریخ لکھ دی ہے اور اس مقدمہ کی مدد سے اصل کتاب کے واقعات کے سمجھنے میں بے حد مدد ملتی ہے۔ اس مقدمہ اور سر ڈینی سن راس کے دیباچہ کے ترجمہ کے بعد ایک مفصل تشریحی فہرست ابواب، عربی عبارتوں کے ترجمے اور بعض لغات کے معنی بھی درج ہیں۔ کتاب جامع تو بہرحال نہیں لیکن تاریخ کے طالب علم کے لئے اس میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جو صرف فارسی کے مستند ماخذوں ہی سے مل سکتی ہیں۔

سرخ سویرا

مصنف مخدوم محی الدین۔ ناشر اشاعت گھر حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲؍

اس مختصر کتاب کو شروع سے آخر تک مطالعہ کر چکنے کے بعد جو چیز پڑھنے والا شدت سے محسوس کرتا ہے یہ ہے کہ ہمارے نئے شاعروں کے کلام کے ابتدائی (عاشقانہ اور رومانی) انداز اور اس نئے زمانہ کے اضطراب اور اس اضطراب کے پیدا کئے ہوئے انقلابی انداز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فکری اعتبار سے بھی اور فکر سے بھی زیادہ بیان کے جوش اضطراب کے نقطۂ نظر سے بھی۔ مخدوم محی الدین کی ابتدائی نظموں میں، رومان کی وہی شگفتگی اور زندگی ہے جو جوانی اور شعریت کے امتزاج کا لازمی نتیجہ ہے لیکن اس رومان سے زیادہ اہم وہ چیز ہے جسے اجتماعی احساس نے پیدا کیا ہے۔ ہمارے زمانہ کا اجتماعی احساس معاشی حدوں سے بہت آگے بڑھکر سیاست کی پہنوں اور گہرائیوں میں ڈوب چکا ہے۔ یہاں سر انقلاب کے خواب بھی دیکھتا ہے اور ایک نئے پرچم کے لہرانے کے تصور سے ابدی مسرت بھی محسوس کرتا ہے۔ احساس کی شدت اب خون کی سرخی کے نظاروں سے نہیں گھبراتی۔ ہمارے نئے شاعروں میں سے کسی نے بھی آنے والے انقلاب، آئندہ کے زمانے میں لہرانے والے پرچم اور انقلاب اور پرچم کے بیچ میں سرخ خون کی دھاروں کے تصور کو اس شدت اور شاید اس خلوص سے پیش نہیں کیا، جتنا مخدوم محی الدین نے۔

گو اس مجموعہ کی نظموں پر ایک خاص جماعت اور طبقہ کے سیاسی اعتقادات اور تحریکات کی جھلک نے جا بجا ادبی اور فنی خامیاں پیدا کر دی ہیں، پھر بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ نظمیں نئے زمانے کے اجتماعی احساس کی ترجمانی کرتی ہیں۔

تجلیات

میر عثمانی۔ ناشر مکتبۂ قصر الادب آگرہ قیمت عہ

یہ کتاب میر عثمانی صاحب کی غزلوں اور خمسوں کا مجموعہ ہے۔ غزلوں اور خمسوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں وہ چنگاری چھپی ہوئی ہے جو شاعری کو شاعری بناتی ہے۔ اس مختصر سے مجموعہ میں بہت سے شعر ایسے ہیں جو اپنی سادگی بیان اور خلوص احساس کی وجہ سے دل میں گھر کرتے ہیں۔ شعروں میں جا بجا مشق کی کمی کی جھلک ہے۔ اسکے دور ہو جانیکے بعد میر صاحب کا شمار اردو کے اچھے غزل گو شاعروں میں ہوگا۔

کریمائے اعظم

ماہنامہ دستگیر کے ایڈیٹر اعظم جلال آبادی صاحب نے شاعری کے اس دور میں جب ہر طرف نئے تجربے ہو رہے ہیں ایک بہت پرانی روایت کی تجدید کی ہے اور ایسے موضوعوں پر اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھی ہیں جو آج ہماری دنیا کی چیزیں بن کر رہ گئے ہیں۔ مصنف نے لوگوں کو یہ بتانا چاہا ہے کہ سخاوت، بخل، تواضع، تکبر، صحبت جاہلاں، عدل و انصاف، ظلم و ستم، قناعت، حرص، اطاعت و عبادت، کذب، راستی، صبر و شکر اور وفاداری کی ہماری زندگیوں میں کیا اہمیت ہے۔ ایسی نظموں کا انداز بیان جیسا ہو سکتا ہے ویسا ہی ان نظموں کا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ہر شخص کا سعدی بن سکنا ممکن نہیں۔ بہرحال کتاب بے حد مزے دار ہے۔ ایڈیٹر دستگیر، مدرسہ کلاں خانپور ضلع فتحپور میں ملنگا ہے۔

جوہری بم

دنیا اس وقت ایک نئے دور کی چوکھٹ پر کھڑی ہے۔ بارود، بجلی، چھاپے اور لاسلکی جیسی ایجادات نے بھی انسان کو اسقدر مجبور و محض نہیں کیا تھا جس قدر جوہری بم نے کر دیا ہے۔ بادی النظر میں یہ باتیں متضاد معلوم ہوتی ہیں کہ جوہر مادّہ کا جزوِ اقل بھی ہے اور بے پناہ قوت کا حامل بھی۔ جوہر سے اس نئے کام کے لینے کی ترکیب نے جنگ کا نظریہ ہی بدل ڈالا ہے۔ ہیروشیما اس خطرناک آلہ کا پہلا شکار تھا۔ وہاں کا بحری، فضائی اور تمام فوجی بیڑہ جل کر خاک ہو گیا۔ سائنسدانوں کی پیشین گوئی ہے کہ ایک وہ زمانہ بھی آ سکتا ہے کہ صرف ایک حملہ میں شہر کے شہر بالکل تباہ کئے جا سکیں۔ جوہری بم کے پھٹنے سے وہی قوت نمودار ہوتی ہے جو سورج کو روشنی بخشتی ہے اور زمین کو گردش۔ اس قوت کو مفید کاموں میں بھی صرف کیا جا سکتا ہے۔ یعنی مشینیں چلائی جا سکتی ہیں اور شہروں میں روشنی کی جا سکتی ہے۔ لیکن انبوہ اس خیال ہی سے وحشت ہونے لگتی ہے کہ اس قوت کو پہلے پہل ایک انتہائی تخریبی کام میں صرف کیا گیا ہے۔

جوہر کو خالی آنکھ سے دیکھنا ناممکن ہے کیونکہ اس کا قطر ایک انچ کا دو کروڑواں حصہ ہوتا ہے۔ لیکن سائنسدانوں کی نظر سے اسکا بھید مخفی نہیں رہا۔ جوہر کو "ایک چھوٹا سا نظام شمسی" کہہ سکتے ہیں۔ اس میں وہی برقی قوت مخفی ہے جو سورج میں ہے اور یہی قوت جوہر کو مجتمع رکھتی ہے۔ جب یہ گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے یعنی جب جوہر پھٹتا ہے تو یہ برقی قوت آزاد ہو جاتی ہے۔ جوہری بم کی ساخت میں یورانیم کو جو سب سے زیادہ وزنی جزوِ بسیط ہے دو وجہوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اول یہ کہ یورانیم میں سب سے زیادہ قوت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ سب سے زیادہ قوی گرم تاب اجزائے بسیط میں سے ہے۔ جوہری بم بنانے کے لئے سب سے پہلے یورانیم کو صاف کیا جاتا ہے اور سائنسدان کی یہی پہلی مشکل ہوتی ہے کیونکہ یورانیم میں جوہر دو قسم کے ہوتے ہیں اور یہ دونوں ساتھ ساتھ پائے جانے کے باوجود ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں وزن میں بھی اور تیار حالت میں بھی۔ اس سلسلہ میں سائنسدانوں کو ایک خاص قسم کے جوہر کی تلاش ہوتی ہے لیکن ہر دھات میں کام آنے والے جوہر سے دو لاکھ گنی مقدار میں بیکار جوہر ہوتا ہے۔ ان دونوں جوہروں کو الگ الگ کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ابھی تک کوئی خاص کیمیائی طریقہ اس کام کیلئے ایجاد نہیں ہوا ہے۔ یورانیم اکسائڈ میں سے جو خالص یورانیم نکلتا ہے اس کی مقدار بہت ہی تھوڑی ہوتی ہے۔ اسلئے ظاہر ہے کہ اسکی کافی مقدار حاصل کرنے کیواسطے کتنے بڑے بڑے کارخانوں کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ امریکہ میں جو کارخانے اسکے لئے بنائے گئے انکو لقول صدر ٹرومین کے سوا لاکھ آدمیوں نے بنایا تھا۔ انہی کارخانوں میں سائنسدان اپنی تیز ذکاوت اور ذہانت کو بروئے کار لاکر وہ مہیب ترین چیز تیار کرتے ہیں جسکو جوہری بم کہتے ہیں۔

اسکو ایک آتشیں گیند سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو دوپہر کے سورج سے سینکڑوں گنی زیادہ چمکدار ہو۔ اسکے دھماکے سے ڈھائی سو میل کے فاصلہ تک کی کھڑکیاں لرز جاتی ہیں۔

۱۹۰۵ء میں مشہور عالم سائنسدان البرٹ آئنسٹائین نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ مادّہ کو قوت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ پچھلی لڑائی کے فوراً بعد مشہور انگریز سائنسدان لارڈ فورڈنا ٹٹر رودھن کے جوہر کو توڑنے میں کامیاب ہوئے۔ جوہری بم کی تیاری میں تقریباً ہر ملک کا حصہ ہے۔ ۱۹۳۹ء تک یہ کام دنیا کے ہر ملک میں ہوتا رہا خاص طور پر امریکہ، انگلستان، جرمنی، فرانس، اٹلی اور ڈنمارک میں۔ لڑائی شروع ہونے پر صرف امریکہ ہی نمایاں طور پر اس کام کو جاری رکھ سکا۔ کیونکہ صرف اسی ملک میں اتنے چوڑے میدان اور اتنی کثیر قوت میسر آ سکتی تھی۔ امریکہ میں جوہری بم بنانے کے کارخانے لاکھوں ایکڑ زمین گھیرے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس کام میں ہزاروں آدمی لگے ہوئے تھے لیکن اس معاملہ کو اسقدر خفیہ رکھا گیا کہ کسی شخص کو صرف اس کے متعلقہ کام سے بڑھکر کچھ نہیں بتایا گیا۔ جو دو جوہری بم جاپان پر پھینکے گئے اندازہ کیا جاتا ہے کہ ان پر ۲ ارب روپیہ لاگت آئی۔

کچھ عرصہ ہوا مشہور سائنسدان ڈاکٹر ڈبلیو ڈی ڈائیز نے آئندہ رونما ہونے والی باتوں کا ایک دلچسپ مرقع تیار کیا تھا۔ موصوف نے لکھا تھا کہ شمسی قوت سے کام لینے سے زیادہ حیرت انگیز بات جوہر کی مخفی قوت کا مظاہرہ ہوگا۔ یہ خیال عرصہ دراز سے ناول نگاروں اور کارٹون بنانے والوں کی توجہ کا خاص مرکز رہا ہے۔ فی الواقع جوہری قوت کا اظہار سائنسدانوں کا محض خواب ہی نہیں ہے طبعیات کے ماہرین ایک بڑے پیمانہ پر اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ جب جوہری قوت کثیر مقدار میں اور ارزاں قیمت پر دستیاب ہونے لگے گی تو اس وقت کے نتائج بڑے اہم اور قابلِ دید ہوں گے۔ اسوقت کسی کو اس کی پروا نہ رہے گی کہ کس ملک کے قبضہ میں تیل کے میدان اور کوئلہ کی کانیں زیادہ ہیں۔ آپ اپنی کار کے "گیسولین ٹینک" میں ہفتہ میں کئی کئی بار گیسولین بھرنے کے بجائے سال میں صرف ایک دفعہ "پانی" بھر لیا کریں گے اور یہی کافی ہوا کرے گا۔ ہوائی جہاز راستہ میں ایک دفعہ بھی رکے بغیر تمام کرۂ ارض کا چکر لگا لیا کریں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہوائی جہاز بوقت ضرورت مہینوں تک فضا میں

باقی صفحہ ۵۸ پر

ڈی راگھون

تدفین سر جان مور

مصنفہ:- چارلس وولف

ترجمہ:- محمد صدیق خاں جہا

The Burial of Sir John Moore.

Not a Drum was heard, not a funeral note,
As his corpse to the rampart we hurried;
Not a soldier discharged his farewell shot
O'er the grave where our hero we buried.

We buried him darkly at dead of night,
The sods with our bayonets turning,
By the struggling moonbeam's misty light
And the lantern dimly burning.

No useless coffin enclosed his breast,
Not in sheet or in shroud we wound him ;
But he lay like a warrior taking his rest
With his martial cloak around him.

Few and short were the prayers we said,
And we spoke not a word of sorrow :
But we steadfastly gazed on the face that was dead.
And we bitterly thought of the morrow.

We thought, as we hollow'd his narrow bed
And smooth'd down his lonely pillow,
That the foe and the stranger would tread o'er his head
And we far away on the billow!

Lightly they will talk of the spirit that's gone,
And o'er his cold ashes upbraid him
But little he'll reck, if they let him sleep on
In the grave where a Briton has laid him.

But half of our heavy task was done
When the clock struck the hour for retiring;
And we heard the distant and random guns
That the foe was sullenly firing.

Slowly and sadly we laid him down,
From the field of the fame fresh and gory :
We carved not a line, and we raised not a stone,
But we left him alone with his glory.

دہل ہی بج رہا تھا واں نہ کوئی درسا غم ——— لئے ہم جا رہے تھے سوئے خندق لاش جب اسکی
چلائے ہیرو کے مقبرہ پہ اک بندوق سر کر کے ——— نہ دی اس کو سلامی آخری اک لشکری نے بھی

کیا تھا دفن اسے سطح شب تاریک میں ہم نے ——— لحد اسکی بدقت ہم نے سنگینوں سے کھودی تھی
تھی قندیل تو تھی مگر بس دھندلی دھندلی سی ——— تھی روشن شمع بھی لیکن تھی مدھم روشنی اسکی

نہ تابوت مکلف ہم مہیا کر سکے اس کو ——— کفن میں بھی ہم نے اسکی میت کو لپیٹا تھا
پڑا تھا جیسے کوئی سویا ہو آرام کی خاطر ——— لباس حرب میں یوں خاک مرقد پر وہ لیٹا تھا

دعائیں تو پڑھیں تھیں ہم نے لیکن مختصر سی بھی ——— نکالا ہم نے اپنے منہ سے کوئی بھی نہ حرف غم
لگائے ٹکٹکی بس دیکھتے تھے مردہ چہرے کو ——— کہ طاری اپنے دل پہ فکر فردا سے تھا رنج و غم

تھے جب مشغول ہم اس کی لحد تیار کرنے میں ——— یہی رہ رہ کے ہم لوگوں کے دل میں خیال آتے تھے
کہ کر دینگے عدو اور اجنبی پامال گور اسکی ——— مگر ہم بحر کی موجوں پہ کوسوں دور پر ہونگے

حقارت سے کریں گے گفتگو مرحوم کی بابت ——— عدو اکر مذمت بھی کریں گے قبر پر اس کی
نہ پروا ہوگی مطلق گر وہ سونے دیں اسے سکو ——— بنائی ہے لحد اہل وطن نے جس جگہ اس کی

ابھی تو ہم نیم آدھی بھی سر کرنے نہ پائے تھے ——— کہ صد افسوس ہماری واپسی کا وقت آپہنچا
یکایک دور سے آئی گرج توپوں کی کانوں میں ——— عدو کا حملہ بے شست شدت سے جاری تھا

اتارا قبر میں آہستہ ہم نے بادل غمگیں ——— جدا کر کے شہید قوم کو میدان شہرت سے
نہ کندہ کی عبارت ہی نہ کوئی لوح استادہ ——— فقط اسکی شجاعت اور عظمت ساتھ تھی اسکے

ہندوستان میں اونی کپڑے کی صنعت

مسٹر موہن سنگھ

ہندوستان میں عرصہ دراز سے اون ہاتھ سے کاتا اور کھڈی سے بنا جاتا تھا مگر ۱۸۷۰-۱۸۸۰ء سے یہاں اونی کپڑا قوت کی مدد سے بھی بنا جانے لگا ہے۔ اون کی گھریلو صنعت میں معمولی کمبلوں سے لیکر کشمیر کے مشہور شال تک شامل ہیں۔ شروع شروع میں ہندوستان کے تین صوبوں یعنی بمبئی، بنگال، اور مدراس کے صوبوں کی ضروریات کے سبب کارخانے جاری ہوئے پہلے پہلے ملوں نے صرف دھاگا بنانا شروع کیا۔ پھر آہستہ آہستہ طرح طرح کے کپڑے بنے جانے لگے یہاں تک کہ اب کپڑوں کی کئی ایسی قسمیں ہندوستان ہی میں تیار ہونے لگی ہیں جو پہلے باہر سے منگانی پڑتی ہیں۔

[illegible] سے ہندوستان کے ملوں میں اون کے دھاگے بنانے کیلئے مشینیں لگائی جانے لگیں تاکہ فوجوں کو سرج فراہم کی جاسکے ورسٹڈ کی مشینیں کے لئے ہندوستان کے چھوٹے اون سے کام چلانا مشکل تھا لیکن تبت افغانستان اور ایران کا لمبا اون استعمال میں آسکتا تھا۔ ہندوستان میں اونی دھاگوں کی مزید پیداوار سے بہت جلد موزے، اور سوئٹر وغیرہ تیار ہونے لگے۔

ہندوستان میں قوت سے چلنے والی کاتنے کی مشینیں سب سے پہلے کانپور میں لگائی گئیں۔ یہ ریلوے جنکشن تو پہلے ہی سے تھا اور اس میں سوتی کپڑا بننے کے کارخانے اور تجارتی ادارے موجود تھے مگر یہاں اونی کپڑے کی صنعت کے لئے کوئی خاص کشش نہیں تھی۔ اس کے بعد نہر باری دوآبہ کے کنارے پنجاب کے ضلع گورداسپور میں دھاریوال نامی گاؤں کے پاس کارخانہ "ایجرٹن وولن ملز" قائم ہوا۔ ۱۸۸۲ء میں بنگلور وولن ملز کی بنیاد پڑی اور ۱۸۸۶ء میں بمبئی وولن مینوفیکچرنگ کمپنی" قائم ہوئی۔ اب تک ہندوستانی اون کی پیداوار کافی نہ ہونے کی وجہ سے آسٹریلیا سے اون منگانا پڑتا تھا۔

۱۹۱۴ء تک ہندوستان میں جو کارخانے قائم ہوچکے تھے۔ ان سے فوج کے لئے گرم کپڑا تیار کرایا گیا۔ سب سے زیادہ مانگ کمبلوں، چیسٹر کے کپڑوں، فلالین اور سرجوں کی تھی مگر ملوں کی پیداوار فوجی افسروں کی ضروریات پوری نہیں کرسکتی تھی۔ اسلئے انہیں گھریلو پیداوار کے علاوہ درآمد کا سہارا لینا پڑا۔ جب باہر سے مشینیں لاکر لگانا ممکن ہوسکا تو قدرتی طور پر یہاں کارخانہ داروں نے مشینیں لگائیں اور اونی کپڑے کے مل قائم کئے اور معلوم ہوا کہ ملوں اور گھریلو بنائی کے اونی کپڑوں کی بہت مانگ ہے۔ مگر پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ صنعتی خوشحالی بہت کم زمانہ تک قائم رہی۔ اونی کپڑے کے نئے ملوں کو جن کی مشینیں مہنگائی کے زمانہ میں خرید کر لگائی گئی تھیں، سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت کی مانگ گھٹ گئی اور بکری میں کمی آگئی تھی پھر بین الاقوامی تبادلہ کی بری حالت کی وجہ سے اور مصیبت نازل ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ جاپان نے ہندوستان کے لئے اپنی برآمد میں اضافہ کردیا۔ دھاگے کی درآمد سے امرتسر میں بہت سے کپڑا بننے کے کارخانے قائم ہوگئے اور لدھیانہ میں کئی موزے اور سوئٹر بننے کے کارخانے کھل گئے۔ ان میں اب اکثر اس جنگ کے زمانے میں سپاہیوں کے لئے کپڑے اور دوسری چیزیں تیار کر رہے ہیں۔ اتبک صرف امرتسر میں الگ الگ اونی چیزیں بنانا ممکن ہوسکا ہے۔ اندازہ ہے کہ یہاں کے کل کرگھوں میں سے ڈیڑھ ہزار قوت سے چلتے ہیں اور چار ہزار ہاتھ سے۔

اس صنعت میں کتنا سرمایہ لگا ہوا ہے اسکا پتہ نہیں چلتا۔ ٹیرف بورڈ کے اندازہ کے مطابق ۱۹۳۵ء تک کا کل سرمایہ دو کروڑ چالیس لاکھ روپیہ تھا اسوقت سے امرتسر کے کارخانوں میں بہت کام بڑھ گیا ہے۔ فی الحال ملوں میں ساڑھے سینتالیس ہزار اون کی اور ساڑھے سینتیس ہزار ورسٹڈ کی تکلیاں اور ڈیڑھ ہزار قوت کے اور پانسو دستی کرگھے استعمال ہورہے ہیں ان کے علاوہ امرتسر کے علاقہ میں قوت سے چلنے والی آٹھ سو مشینیں ہیں۔ امرتسر کے ملوں میں دو ہزار چار سو اون کی اور اٹھارہ ہزار سوت کی تکلیاں بھی چلتی ہیں۔ مندرجہ اعداد کے علاوہ ہیں۔ اسی علاقہ میں تقریباً سات سو قوت سے چلنے والے اور چار ہزار دستی کرگھے ایسے ہیں جو عموماً اونی کپڑا بننے کے کام نہیں آتے اتبک اس صنعت میں لگا ہوا کل سرمایہ تین سے چار کروڑ روپیہ تک سمجھنا چاہیئے۔ امرتسر کے علاقے کے ملوں کو چھوڑکر باقی کارخانوں میں اس وقت آٹھ سو ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔

ہندوستان کا اکثر اون ورسٹڈ بنانے کے کام نہیں آسکتا۔ اس لئے آسٹریلیا کی اون پر منحصر رہنا پڑتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سرحد کے کچھ اون کے ورسٹڈ کے دھاگے بنائے جاسکتے ہیں پہلی عالمگیر جنگ سے پہلے۔ ہندوستانی مل اونی کپڑا تیار کرنے میں ہندوستانی میدانوں کا اون ہی استعمال کرتے تھے اور خشکی یا سمندر کے راستوں سے آیا ہوا اون ورسٹڈ کی مشینوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ ہندوستان ملوں میں تیار ہونے والے ورسٹڈ کا دھاگا زیادہ تر آسٹریلیا کے اون سے بنایا جاتا رہے گا۔ اس طرح اونی کپڑوں میں فلالین اور عمدہ باناتیں باہر کے اون سے بنیں گی۔ اس صنعت نے جس قسم کے اون کی ضرورت محسوس کی بغیر چیل وحجت باہر سے منگایا ہے یہاں تک کہ عراق، چین،

بادرجنٹائیں اور مشرقی اور جنوبی افریقہ سے بھی اون منگایا گیا۔

ہندوستان میں اون کی صنعت کی ترقی ایک خاص [illegible] سے دوسرے ملکوں کی ترقی سے مختلف ہے۔ یہی ایسا ملک ہے جہاں اونی ورسٹڈ اور سویٹر موزے وغیرہ بننے کا سارا کام ایک ہی جگہ عمل میں آتا ہے۔ ان ملوں میں سے کچھ بہت ہی بڑے ہیں۔ جب اون مِل میں آتا ہے تو اسے الگ الگ کیا جاتا ہے۔ یہیں سے اون اور ورسٹڈ کے شعبوں کا فرق شروع ہو جاتا ہے۔ عام طور پر لمبے ریشے کے اون کو بننے کے لئے الگ کر لیا جاتا ہے۔ اور چھوٹے ریشہ کے اون کو اون کے شعبہ میں استعمال کیلئے رکھ لیا جاتا ہے۔ اسکے بعد اون کو صاف کرتے ہیں عموماً خشک اون سے ایک خاص آلے کے ذریعہ گرد جھاڑ دی جاتی ہے لیکن پہاڑی اون کو جس میں خشک میدانوں کے اون کے مقابلہ میں زیادہ چکنائی ہوتی ہے، ایک منجھائی کی مشین کے ذریعے دھو کر صاف کر لیا جاتا ہے۔ اون کے شعبہ میں صاف کئے ہوئے اون کو جس رنگ میں چاہیں رنگ لیتے ہیں۔ پھر اس میں دوسری قسم کا یا کچا اون ملا کر مشین کے ذریعہ دھنتے ہیں تاکہ اون برابر برابر مقدار میں ملے۔ ورسٹڈ کے دھاگے بنانے کے کئی طریقے ہیں۔ ان سب کا مقصد کچھ اون کے لمبے ریشے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ اور پھر اون کے ریشے جو کہ کشتیوں کی طرح کے ہوتے ہیں بننے کے بعد کپڑے کو دھوتے ہیں۔ پھر ایسے صابن اور دوسری چیزوں سے نرم کر کے مشین میں دبا دیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں تقریباً ہر اونی چیز تیار ہوتی ہے۔ ملوں میں مزدوروں کے ایسے موٹے کمبلوں سے کر اون اور ورسٹڈ کے باریک ملبوس تک تیار ہوتے ہیں۔ ورسٹڈ کے کپڑے، موزوں اور سویٹروں میں نفیس ترین دھاگے استعمال کرنے کی کوشش میں ہم امرتسر کے علاقہ کے ملوں نے جاپان کا نفیس دھاگا استعمال کیا جو ہندوستانی دھاگے سے بہتر ہوتا ہے۔ اس سے ہلکے ورسٹڈ بنانے میں بڑی مدد ملی۔ اس وقت تک ہندوستان کی صنعت خاص طور پر اپنی ملکی ضرورت ہی پورا کرنے میں مصروف رہی ہے۔ البتہ ہندوستان سے کچھ مال خصوصاً بننے کا اون برابر برما جاتا رہا ہے بلکہ نیمین تک گیا ہے۔

کسی زمانہ میں یہاں سے آسٹریلیا کے پاس کے جزیروں کو خصوصاً نیوزیلینڈ کو عمدہ اونی کمبل بھیجے جاتے تھے، اور قاہرہ، ایتھنز اور قسطنطنیہ کی فوجوں کیلئے ہندوستانی کمبلوں اور نمدوں کی مانگ تھی۔ اب حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ اب ملوں کی خواہش ہے کہ ایک فیڈریشن بنا کر نہ صرف حکومت کے مختلف محکموں سے تعلق قائم رکھیں بلکہ صنعت کے عام اور خاص مسئلوں کو حل کریں۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ فیڈریشن جنگ سے پہلے کے مسئلوں، خاص طور پر مقابلہ کو ختم کر دے گی۔ پیداوار پر کنٹرول اور مختلف کارخانوں کے بارے میں صحیح صحیح علم اور باہمی تبادلہ خیالات یہاں کی صنعت کے موجودہ ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں مدد دیں گے۔ اس طرح جتنا اونی کپڑا باہر سے یہاں آتا تھا اگر وہ سب نہیں تو اس میں سے بہت کچھ ہندوستان ہی میں پیدا ہونے لگے گا۔

واپسی

بجھ گئے ساری امیدوں کے شب افروز چراغ
اک اندھیرا ہے مری زیست کے ایوانوں میں
آج سہمے ہوئے جھجکے ہوئے اٹھتے ہیں قدم
جم گیا خون مچلتا ہوا ہیں شریانوں میں

قہقہے ختم ہوئے ٹوٹ گیا ساز طرب
نہ وہ مینا نہ وہ ساقی نہ چھلکتے ہوئے جام
زندگی جیسے گراں بار ہوئی جاتی ہے
آج بدلا نظر آتا ہے دو عالم کا نظام

"لوٹ چل"! خوب کہا اے دل غمگیں تو نے
کس لئے لوٹ چلوں۔ کیا وہ بلاتی ہے مجھے
سچ ہے اک چیخ فضاؤں میں ابھی گونجی تھی!
رُک کے شاید وہ کسی طرح بھلاتی ہے مجھے!

مٹتے رہتے ہیں امیدوں کے گھروندے یوں ہی
کوئی بھی موج انہیں آ کے بہا سکتی ہے
ایک ہی ٹھیس میں یہ موتی بکھر جاتے ہیں
ایک چنگاری انہیں بڑھ کے جلا سکتی ہے

مجھ سے سرزد نہ ہوا کوئی گناہِ آدم
اپنی فردوس سے پھر بھی مجھے آنا ہی پڑا

از نعیم صبری بابری

جوہری بم

بقیہ صفحہ

معلق دہا کریں کے۔

اب زمانہ اس امر کا متقضی ہے کہ سائنسداں اور صنعت گر ان تمام قوتوں کو جو مہیا ہو سکتی ہوں یکجا کریں اور ان سے خدمت خلق کا فرض انجام دیں۔ ابتک اس طرف بہت ہی کم توجہ دیگئی ہے۔ اس کے لئے بڑے طویل عرصہ کی ضرورت ہے کہ جوہری قوت صنعتی کاموں میں استعمال کی جانے لگے۔ جب ایسے طریقے ایجاد ہو بھی جائیں گے تب بھی یہ سوال باقی رہیگا کہ یہ نیا طریقہ کار اقتصادی نقطہ نظر سے کس حد تک مفید ہو سکتا ہے۔ یورانیم کے جوہر کی تقسیم نے ایک نئے باب کا آغاز کر دیا ہے ہم پر ایک نئی صنعتی ترقی کا دروازہ کھل گیا ہے لیکن فی الواقع اس ایجاد سے مفید کام لینے کے لئے بہت عرصہ اور کثیر رقم کے صرف کی ضرورت ہے۔

باکو

باکو میں اگر تیل نہ بھی ہوتا پھر بھی سیر و سیاحت کے لئے روس کا یہ ایک دلکش مقام ہوتا۔ اس کی تاریخ انقلابات سے بھری پڑی ہے اور بہت سے کھنڈر جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ دسویں صدی کے عرب جغرافیہ نویس مسعودی نے باکو کا ذکر کیا ہے۔ ۱۵۰۰ء سے ۱۷۲۳ء تک اس پر ایرانیوں کا قبضہ رہا۔ ۱۷۲۳ء میں اس کو روسیوں نے چھین لیا لیکن ۱۷۳۵ء میں واپس کر دیا تھا ۱۸۰۶ء میں یہ پھر روسی سلطنت کا ایک جزو بن گیا۔

جس علاقہ میں تیل پایا جاتا ہے اس کے مغرب میں جو قدیم شہر ہے اس کی فصیلیں نویں صدی کے عربوں کے طرز تعمیر کی یادگار ہیں۔ یہاں ایک مسجد ہے گیارہویں صدی کے کسی ایرانی بادشاہ کی بنائی ہوئی۔ سولہویں صدی کے ایک شاہی قلعہ کے کھنڈر مقامی حکام کی عظمت رفتہ کی اب تک یاد تازہ کرتے ہیں

سمندر کے کنارے جو مینار ہے جس کا نام مینار دوشیزہ (میڈنز ٹاور) ہے اور اس وقت کے روحانی رجحانات کا پتہ دیتا ہے۔ یہ اس زمانہ کا لائٹ ہاؤس ہوگا باکو سے تیس میل کے فاصلہ پر جزیرہ نما اسفرن پر ایک بستی ہے نردوزن۔ یہاں تیرہویں صدی کے بہت سے آثار پائے جاتے ہیں۔ ریت کے ٹیلوں کے ہٹ جانے سے یہاں شیخ سعید یوسف خلیفہ کا مزار برآمد ہوا ہے جو آٹھویں صدی کی یادگار ہے۔ باکو میں مئی اور جون کے مہینوں میں ایک میلہ لگتا ہے۔ یہاں آذربائیجان اور ایران کے درمیان مال تجارت کا تبادلہ ہوتا ہے۔ روسی شکر کے عوض ایرانی تاجر کپاس، اون، قالیچہ، چاول اور خشک میوہ دیتے ہیں۔

لیکن آج کا باکو ماضی کا نوحہ خواں نہیں ہے۔ یہاں کی فضا فکر و عمل سے پُر ہے۔ کیونکہ تیل ملک کی اقتصادیات کی جان ہے خواہ زمانہ جنگ کا ہو خواہ امن کا باکو کے روسی حکام ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ان کے علاقہ کے آدمیوں کی زندگی صرف تیل نکالنے کے کام میں محدود ہو کر بے لطف نہ ہو جائے۔ ایک آذربائیجان خاتون محمد آغا قشیف باکو کے مرکزی ضلع شاؤمیان کی نمائندہ ہیں اور ان کی سکریٹری فنی آوانیسوف ایک ارمنی خاتون ہیں۔ ان دونوں کی کوشش اور محنت سے اس علاقہ کے باغات اور تفریح گاہیں جنگ چھڑنے کے وقت سے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہیں

باکو کے علاقہ میں تیل کی صنعت کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ گذشتہ صدی کے وسط میں روس کے خام تیل کی مقدار صرف تیرہ ہزار ٹن تھی حالانکہ تیل کے قدرتی چشموں کے وجود کا علم روسیوں کو سینکڑوں برس سے تھا۔ آج بھی قفقاز کے بعض علاقوں میں متعدد گرنے پڑے آتشکدے نظر آتے ہیں۔ پرانے زمانہ میں یہاں سے مسلسل طور پر شعلے بلند ہوا کرتے تھے۔ یہاں کے سادہ لوح باشندے اس مظاہرۂ قدرت سے متحیر ہو کر سربسجود ہو جاتے تھے۔ ان عبادت گاہوں کی تعمیر کی یہی وجہ تھی چونکہ باکو میں تیل کے چشموں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لئے آتش پرستوں کا مرکز یہی علاقہ تھا۔

۱۸۰۰ء کے لگ بھگ زمانہ میں مقامی تجارت پیشہ لوگوں نے جن میں زیادہ تر آرمنی اور ایرانی تجار تھے اس بات کا اندازہ لگایا کہ یہاں کے چشموں سے برآمد ہونے والے خام تیل کو اگر جمع کر کے دوسرے ممالک کو بھیجا جائے تو یہ تجارت بہت نفع بخش ہوگی۔ اس بات کی اطلاع نے کہ اس کے ملک میں پائے جانے والے تیل سے باہر کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، زار کی حکومت کو بہت غیر مطمئن کیا۔ تیل جمع کرنے کا کام اب حکومت نے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن نصف صدی تک اس صنعت نے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی یہاں تک کہ ۱۸۷۲ء میں اس پر سے تمام پابندیاں اٹھالی گئیں۔ اس آزادی کے بعد ترقی کا جو سلسلہ شروع ہوا اس میں ۱۹۰۴-۵ء کے تراجی حالات نے رکاوٹ ڈال دی اور تیل کے بہت سے کارخانے بند اور خلاف قانون قرار دے دیئے گئے۔ انقلاب اور خانہ جنگی سے تیل کی صنعت کو اور زیادہ نقصان پہونچا۔ جب سویٹ روس نے ملک کو قومیت کے رنگ میں رنگا، قفقاز میں پٹرول کی صنعت کو بہت کچھ زوال ہو چکا تھا۔ باکو کے چشمے اپنی قدرتی مقدار کا صرف ایک چوتھائی حصہ پیدا کر سکتے تھے چونکہ کئی سال سے مرمت وغیرہ نہیں ہو سکی تھی اس لئے تیل صاف کرنے کی مشینیں صحیح طور پر کام کرنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔

سویٹ حکومت کے زیر نگرانی قفقاز کی تیل کی صنعت نے خوب ترقی کی۔ اس صنعت کو ترقی دینے کی جو پنجسالہ اسکیم بنائی گئی تھی وہ ڈھائی سال ہی میں پوری ہوگئی کیونکہ جزیرہ نمائے اسفرن میں قدرتی ذرائع کو

کرشن چیتنیہ

جلد سے جلد دریافت کیا گیا اور ان سے زیادہ سے زیادہ کام لیا گیا پچھلے بیس سال میں پچیس سے زیادہ تیل کے نئے میدان دریافت ہو چکے ہیں اور ان میں سے تیل کو نکالا جا رہا ہے تیل کی صنعت کے قومی رنگ میں رنگے جانے سے پہلے جو کنوئیں دریافت ہوئے تھے ۱۹۳۱ء میں ان سے جو تیل دستیاب ہوا وہ کل تیل کی مقدار کا صرف ۲ء۲ تھا۔ باقی تمام تیل ان کنوؤں سے نکالا جاتا تھا جو سویٹ حکومت کے زمانہ میں کھودے گئے۔

انجینئروں کے شوق اور محنت اور سائینس نے تیل کی صنعت کو دن دونی ترقی بخشی۔ انقلاب روس سے بیس سال پہلے آذربائیجان اور باکو کے قریب سراخانی کے مشہور اور قدیم چشموں کو خشک سمجھ کر چھوڑ

دیا گیا تھا لیکن ۱۹۲۷ء میں سراخانی میں دوبارہ تیل نکالا جانے لگا۔ ۱۸۸۰ء ہی میں تیل کے بڑے بڑے بیوپاری باکو کے قریبی اضلاع کالا کی طرف متوجہ ہو گئے تھے لیکن اس وقت اس میں کامیابی نہ ہوسکی۔ مگر ۱۹۳۲ء میں ضلع کالا سے تیل نکالا جانے لگا اور آج اس کے میدان تیل کے سب سے بڑے میدانوں میں سے ہیں۔ تیل کی صنعت کی ترقی میں سائنس نے بہت کچھ مدد دی ہے جزیرہ نمائے اسفرن باکو کے قریب بحیرۂ خزر نے ایک خلیج بنا دی ہے سویٹ سائنسدانوں نے اس خلیج میں تیل کی موجودگی دریافت کی دس سال ہوئے کہ اس خلیج کو پاٹنے کا کام شروع ہوا۔ چنانچہ آج بحیرۂ خزر کی یہ خلیج تیل کے میدان میں تبدیل ہوچکی ہے۔

تیل پیدا کرنے والے بڑے ملکوں میں روس کا نمبر دوسرا ہے ۱۹۳۹ء میں امریکہ نے ایک ارب اکیاون کروڑ پیپے (سات پیپے ایک ٹن) تیل نکالا۔ یہ مقدار دنیا کی تیل کی کل مقدار کا ۶۴ء۰۰ فیصدی تھی۔ روس نے اس سال تیئس کروڑ بہتر لاکھ بچاس ہزار پیپے تیل نکالا۔ یہ مقدار کل مقدار کی ۱۰ء۶ فیصدی تھی۔ روس کے کل تیل کا ۳/۴ قفقاز کے کنوؤں سے خصوصاً باکو کے میدانوں سے نکلتا ہے۔ باکو کا تیل کل مقدار کا ۲/۳ ہوتا ہے۔

باکو کے تیل کے میدانوں میں بالاخانی ہسپونچی، رومانی اور بی بی ایبت کے اضلاع شامل ہیں۔ پہلے تین مقامات باکو سے کچھ فاصلہ پر ایک مرتفع میدان پر واقع ہیں۔ اور بی بی ایبت بحیرہ خزر کے بالکل قریب ایک خلیج کے کنارے واقع ہے اور تیل کے اس میدان کا نام اسی خلیج کے نام پر ہے۔

باکو کے میدانوں کے علاوہ قفقاز میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تیل کا میدان گروزنی کا ہے۔ گروزنی کے میدان کا رقبہ باکو کے رقبہ سے دوگنا ہے لیکن گروزنی میں تیل نکالنے کا کام باکو کی بہ نسبت بہت بعد میں شروع ہوا۔ اپنے ابتدائی زمانہ میں سویت حکومت کو اپنے ملک کی صنعت کو ترقی دینے کے واسطے بیرونی تبادلے کی بڑی سخت ضرورت تھی۔ اشیائے درآمد کے عوض میں دینے کے لئے تیل ہی ایسی چیز تھی جو روس بیرونی ممالک کو سب سے زیادہ مقدار میں دے سکتا تھا۔ تیل کی برآمد کے واسطے گروزنی کی بہ نسبت باکو بہتر حالت میں تھا کیونکہ باکو سے باطوم تک پائپ لائن دہری تھی ۱۹۲۹ء میں گروزنی سے ٹوپسی تک (بحر اسود کے کنارے) ایک پائپ لائن بنائی گئی چونکہ یہ لائن چھوٹی تھی اس لئے برآمد کے سلسلہ میں گروزنی کے تیل کو باکو کے تیل پر ترجیح دی گئی۔

روس کی اندرونی منڈی کے لئے صورت حال اس کے برعکس ہے گروزنی کا تیل "گروزنی - مخلچ کالا" لائن کے ذریعہ بحیرۂ خزر تک پہونچ جاتا ہے۔ لیکن باکو کا تیل چونکہ براہ راست خزر اور وانگا کے درمیانی راستہ پر پہونچ جاتا ہے اس وجہ سے خود روس ہی کے اندر پٹرول کی مانگ کو پورا کرتا ہے۔ باکو کا ساحل بہت عمدہ ہے اس کے لئے جہازی بیڑہ بھی ہے جو خاص طور پر تیل کے حمل و نقل کے کام آتا ہے۔ اس بیڑہ میں موٹر سے چلنے والے جہاز، تیل کی کشتیاں اور ڈونگیاں ہیں۔ بحیرۂ خزر میں چار سو میل چلنے کے بعد جہاز ساحلِ باکو سے استرخان پہونچ جاتے ہیں بلکہ وانگا، نہر گوسکی اور شمالی دریاؤں میں سے گذر کر لینن گراڈ تک پہونچ سکتے ہیں۔

۱۱ر جولائی ۱۹۴۵ء کو اخبار پروادا نے اعلان کیا کہ سویت روس نے موٹریں بنانے کا ایک بڑا بھاری منصوبہ تیار کیا ہے جس سے موٹر سازی کی صنعت کو بڑے پیمانہ پر ترقی اور وسعت ہوجائے گی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ماسکو کے "اسٹالن پلانٹ" میں بنی ہوئی موٹریں دنیائے موٹر سازی میں حرف آخر ہوں گی۔ اس وسیع پیمانہ کی اسکیم سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب روسیوں کے پاس کاریں زیادہ تعداد میں ہوجائیں گی اگر پٹرول کا اندرونِ ملک خرچ بڑھ گیا تو جہاں تک ملک کی اقتصادیات کا تعلق ہے باکو کی اہمیت اور بڑھ جائے گی۔ اس امر کا انحصار کہ باکو آیندہ بھی روس کا ایک اہم تیل کا مرکز بنا رہے گا اس بات پر ہے کہ روس میں اور جو تیل کے دوسرے علاقہ ہیں ان کو کس حد تک ترقی دی جاتی ہے روس کے زمین دوز تیل کے چشمے امریکہ کے چشموں سے بھی زیادہ بڑے بتائے جاتے ہیں۔ یورال - وانگا، کا علاقہ بھی عنقریب باکو ثانی بننے والا ہے۔ روس کی فتح میں باکو کے تیل کے میدانوں کا بہت کچھ حصہ ہے۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱- "نقشِ مجسم" (نظم) .... جناب اثر لکھنوی ......
۲ آرزو لکھنوی کا تخیل (مع تصویر) ...... پروفیسر احتشام لکھنوی ......
۳ رسوا سر بازارے (مراحیہ) ...... جناب ناکارہ حیدرآبادی ......
۴ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ قطعہ ...... جناب محمد عمر (نورالٰہی) ......
۵ عہد علاء الدین خلجی کے ثقافتی پہلو ...... پروفیسر دھرم پال (لاہور) ......
۶ آنکھ مچولی (افسانہ) ...... محترمہ شکیلہ اختر (پٹنہ) ......
۷ صدر ٹرومین .... مسٹر شبیر احمد ......
۸ مغل شہزادے میدانِ شاعری میں ...... جناب کیف سہسوانی ......
۹ ترکی پارلیمنٹ .... جناب جے۔ میل ......
۱۰ "اپنے پرائے" (ڈرامہ) ...... جناب انتصار یوتوی ......
۱۱ ایک رات (افسانہ) ...... جناب قدرت اللہ شہاب ......
۱۲ برہمی رقاصہ (افسانہ) ...... جناب جگپت شرما ......

ترکی رقص

نئی روشنی کے بعض پرجوش دلدادہ اپنی تمام پرانی روایات کو بھول جانے ہیں چاہے وہ کتنی ہی دلکش کیوں نہ ہوں۔ لیکن جدید ترکی اپنے بڑے رہنما اتاترک کی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے اپنی بہت سی پرانی وضعوں کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ چنانچہ ترکوں نے رقص کے قدیم طریقوں کو بھی نہیں بھلایا ہے۔ نیویارک میں کچھ ترکوں نے حال ہی میں اپنے قدیم رقص کا مظاہرہ کرکے حاضرین کو محظوظ کیا۔

میں ترکی رقص کا جو مظاہرہ ہوا اس میں معمر مردوں نے بھی حصہ لیا۔

یہ جوان لڑکیاں اگرچہ ترکی کو چھوڑ کر امریکہ چلی آئی ہیں لیکن انھوں نے اپنے قومی رقص کو نہیں چھوڑا ہے۔

ترک بچے اپنے مخصوص لباس میں رقص کررہے ہیں۔ انکے پاؤں کی حرکت قابل دید ہے۔

انڈیا — ۱۹۴۵

ادارۂ مطبوعاتِ متحدہ دہلی کی طرف سے آٹھ مختلف زبانوں میں ڈیڑھ درجن کے قریب اعلیٰ قسم کے رسالے شائع ہوتے ہیں۔ انڈیا - ۱۹۴۵ء (بزبان انگریزی)، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کی تازہ ترین اشاعت ہندوستانی موضوعات سے متعلق ایسے دلچسپ مضامین اور رنگین و سادہ تصاویر سے مزین ہوگی کہ اسکی خریداری اہلِ ذوق کے لئے ضروری ہو جائیگی۔ ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ ہو۔

ا - خاص مضامین کی فہرست

۱ - ہندوستان میں تعلیمی ترقی
۲ - فتحپور سیکری
۳ - ہندوستان اور بعد جنگ کی دنیا
۴ - نالندہ
۵ - اجنتا
۶ - روئی کے کارخانے
۷ - ہندوستان کی خام اشیاء
۸ - ہندوستان میں زراعت
۹ - پانی سے تیار ہونے والی بجلی
۱۰ - نئے خیال کی ہندوستانی خواتین
۱۱ - ہندوستانی رقص

ب - رنگین تصاویر کی فہرست

۱ - شاہی مسجد لاہور
۲ - لوہے اور فولاد کے کارخانے
۳ - بجلی گھر
۴ - نسیم (فلم اسٹار)
۵ - اودے پور
۶ - اسلامیہ کالج پشاور
۷ - بنارس ہندو یونیورسٹی
۸ - نلینی جینت (فلم اسٹار)

اپنے لئے ایک کاپی آج ہی ایجنٹوں کے ذریعہ محفوظ کرا لیجئے۔

ضخامت ۵۲ صفحات — قیمت ڈیڑھ روپیہ فی کاپی

ملنے کا پتہ

ادارۂ مطبوعاتِ متحدہ — پوسٹ بکس ۱۶۶ — دہلی

Cover Printed at Calcutta Art Press for "UNITED PUBLICATIONS" Delhi. Regd. No. L. 4783

داستانِ ظلم و ستم کا ورق خونیں

کوریا پر اتحادیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد سے اس ظلم و ستم کے بہت سے ہولناک پہلو منکشف ہو ہو کر لگاہوں کے سامنے آرہے ہیں جو جنگ چھڑنے سے بھی پہلے جاپانی نظام کے ماتحت ان کے کارخانوں میں غریب و معصوم مزدوروں پر روا رکھا جاتا تھا۔ رائٹر کے نامہ نگار نے بذاتِ خود ان کارخانوں میں جاکر تفصیلات جمع کی ہیں تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ کوریائی نسل کے وہ مزدور زیادہ تر ایسے زر خرید غلام تھے جن کو اغوا کرنے والے جاپانیوں سے معمولی قیمت پر خرید لیا جاتا تھا۔ ان میں سے بہت سے نوجوان اور کم سن بچے ایسے بھی تھے جنھیں چار پانچ سال سے اپنے کارخانوں کی محدود فضا سے باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بیج خوراک اور بھرپور آرام کا تو ذکر ہی کیا ہے، انھیں معمولی قصوروں اور کوتاہیوں پر ایسی سخت سزائیں دی جاتی تھیں کہ ان کا محض حال سن کر ہی دل لرز جاتا ہے۔ اسلئے ان سب کی صحت خراب تھی۔ ان بیکسوں کی پھٹی پرانی گدڑیاں جوؤں سے پٹی پڑی تھیں جن کے باعث وہ زندگی کو وبالِ جان سمجھنے لگے تھے اور لطف یہ ہے کہ انھیں لئے نہ صرف جائز بلکہ مقدس سمجھکر ارتکاب خودکشی کرنے والی قوم کے ظالم افراد جب کسی کوریائی مزدور کو اس منزل میں قدم رکھتے ہوئے دیکھتے تو اسے بری طرح مارتے پیٹتے اور کسی عنوان جان پر کھیل جانے کا موقع نہ دیتے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ اندازہ لگا لینا آسان ہے کہ تمام ایشیا کے ان نام نہاد رکھوالوں نے ان قوموں پر کیا کچھ ظلم و ستم روا نہ رکھے ہونگے جن پر پچھلے دنوں انھیں عارضی تسلط حاصل ہو گیا تھا۔ یہ خبریں سن سن کر برطانیہ میں سخت اظہار برہمی کیا جارہا ہے۔ اور انصاف پسند طبقہ زور دے رہا ہے کہ جاپانیوں کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا جائے جو جرمن قیدیوں کے لئے مناسب سمجھا گیا۔

نیپالی دستوں کی واپسی

برطانوی اور نیپالی حکومتوں کے مابین دوستی اور اتحاد کا رشتہ گذشتہ ایک سو تیس سال سے تو ہے۔ اس اثناء میں ہر نازک موقع و محل پر ایک کا پُر خلوص ہاتھ دوسرے کی دستگیری میں ہمیشہ بڑھتا رہا ہے۔ خاص طور پر جنگی تاریخ کے صفحات اس دعوے کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم کے موقع پر بھی نیپال نے اپنے بہادر سپاہی حکومت برطانیہ کے سپرد کر کے میدانِ جنگ میں بھیج دئے تھے۔ اس قوم کے نوجوان افراد فطرتاً جنگجو اور بلا کے دلیر ہوتے ہیں۔ اس جنگ کے چھڑنے پر ظاہر ہے کہ نیپال کو اپنے ملک کے لئے کسی قسم کا خطرہ یا اندیشہ تک نہیں تھا لیکن مغرب میں جرمن حملوں کے شروع ہوتے ہی اس نے اپنا دستِ تعاون بڑھایا اور تقریباً آٹھ تربیت یافتہ دستے پیش کر دئے۔ آخر میں ان سپاہیوں نے برما کے محاذ پر اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بڑی بہادری دکھائی اور ہر لحاظ سے دادِ شجاعت حاصل کی جب مشرقِ بعید میں بھی جنگ کا بازار سرد پڑ گیا تو ان دستوں کو وطن لوٹ جانے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ کلکتے سے انکی روانگی کے وقت ہندوستان کے کمانڈر انچیف نے الوداعی پیغام میں فرمایا کہ میں بذاتِ خود اور حکومتِ برطانیہ کی جانب سے ہز ہائی نس مہاراجہ نیپال کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ایسے نازک موقع پر بے دریغ امداد پہنچا کر حق دوستی ادا کیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی قوم کے جنگجویانہ جوش و خروش کی قدیم روایات کو قائم رکھا۔ تم سب بہادر سپاہیوں کی ہمت و شجاعت اور وفاداری لائقِ تحسین ہے۔ میری آرزو ہے کہ تم مسرت و شادمانی کی خوشگوار فضا میں ہمیشہ سانس لیتے رہو۔

سرحدی سپاہی کیلئے اعزازِ عظیم

ضلع کوہاٹ میں ایک چھوٹا سا گاؤں شاہی خیل ہے۔ وہاں کا رہنے والا علی حیدر وہ پہلا پٹھان سپاہی ہے جس نے اس عالمگیر جنگ میں بہادری کے کارنامے پیش کر کے وکٹوریہ کراس حاصل کیا اور تمام ہندوستانی فوج خصوصاً سرحدی قبائل کے دستوں کا سر فخر و انبساط سے اونچا کر دیا۔ یہ کڑیل جوان آٹھویں ہندوستانی دستے میں شامل تھا۔ اس نے اٹلی کے محاذِ جنگ پر اسقدر جانبازی و وفاداری کا ثبوت دیا کہ عسکری نظام کے اربابِ حل و عقد اس کی ہمت و شجاعت کا سراہے بغیر نہ رہ سکے۔ حال ہی میں وہ اپنے وطن واپس لوٹا تو ایبٹ آباد میں سرکاری طور پر اسکا خیر مقدم ہوا۔ پولٹن میدان کی بارہ دری رنگ برنگ کے پھولوں اور قومی جھنڈیوں سے سجی ہوئی تھی، فوجی باجہ بج رہا تھا اور خوش و خرم تماشائیوں کا ہجوم نعرہ ہائے تحسین کے ساتھ اپنے بہادر دوست کو خوش آمدید کہنے کے لئے بے قرار تھا۔ موقت علی حیدر دو صوبیدار میجروں کے درمیان بڑی آن بان سے وارد ہوا۔ ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر میجر ایچ ڈی رشتن نے

آگے بڑھکر معائنہ کیا۔ اسکی وفاداری و شجاعت کی داد دی اور اسے یقین دلایا کہ تمہارا نام ہندوستانی فوج کی تاریخ میں چمکدار ستارے کی طرح ہمیشہ قائم رہیگا۔

روسی مسلمان اور سفرِ حج

۱۹۱۸ء میں رونما ہونے والے اشتراکی انقلاب کے بعد جب زار کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور روس میں سویت یونین قائم ہوگئی تو وہاں کے مسلمانوں کو سفرِ حج کی اجازت نہیں دی گئی۔ ان کے لئے اسقدر سخت ممانعت ہوئی کہ گذشتہ ستائیس سال میں ایک بھی عقیدتمند کو براہ راست اپنے مذہب کے ایک فریضے کی ادائیگی کا موقع نہ مل سکا۔ اب روس کی کوشش ہے کہ کسی طرح مشرقِ وسطیٰ کے مختلف ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرے کیونکہ بین الاقوامی سیاسیات کے پیش نظر یہ مسئلہ کافی اہمیت پکڑ گیا ہے۔ اسلئے مصلحتاً اس سال روسی مسلمانوں کو عرب جانے کی اجازت مل گئی ہے اور سنا گیا ہے کہ معتقدین کا ایک جم غفیر دیارِ نبی کی جانب چل پڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب باہمی تعلقات استوار ہوجانیکا امکان پیدا ہوگیا ہے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ سویت یونین نے یروشلم میں روسی سفارتخانہ قائم کرنیکا فیصلہ کرلیا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ آئندہ عرب اور ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی دنیائے اسلام کے قدیم شہر سمرقند میں جانے کی اجازت مل جائے گی جو جنوب وسطی ایشیا میں ازبکستان کی ایک روسی جمہوریت ہے۔ کافی عرصے سے وہاں غیر ملکی مسلمانوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

ستاروں سے آگے

تصورات کی دنیا میں رہنے والے ہی نہیں بلکہ ہر ملک اور ہر زمانے کے اربابِ علم بھی اس سعی و کاوش میں مبتلا رہے ہیں کہ کسی طرح طبقاتِ آسمانی اور ان کی لانہایت وسعتوں میں پھیلی ہوئی کائنات کے اسرار و رموز منکشف کرکے اس حد تک رسائی حاصل کرنے اور اگر ممکن ہو تو اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کےلئے بڑی بڑی رصدگاہوں میں ایسی تیز نظر دوربینیں نصب کی گئیں جنھوں نے نگاہوں کے سامنے پڑے ہوئے پردے اٹھائے اور "ستاروں سے آگے بہت سے جہاں" نظر آنے لگے۔ مگر پھر بھی سائنسدانوں کی علمی تشنگی کسی عنوان بجھ نہ سکی۔ وہ ان دوربینوں کو ہمیشہ ناکافی سمجھتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں ایک نہایت عظیم الشان دوربین تیار کرنے کا فیصلہ ہوا مگر جنگ چھڑ جانے کے باعث اس کارروائی کو ملتوی کردینا پڑا۔ اب خبر آئی ہے کہ یہ کام وسط نومبر سے دوبارہ شروع ہونے والا ہے اور غالباً جون ۱۹۴۸ء تک مکمل ہوجائیگا۔ کیلیفورنیا کے کوہ پالومر پر رصدگاہ کی شاندار عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی اور ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی تک جانے کےلئے ایک نئی نو میل لمبی سڑک بھی بن گئی ہے صرف دوربین کا مسئلہ باقی ہے۔ مجوزہ خاکے کے مطابق اسکا شیشہ دو سو انچ قطر کا ہوگا۔ اسکا نام "چشم کبیر" رکھا گیا ہے۔ قیاس ہے کہ اس دوربین کو فلکیات کے ضمن میں "حرفِ آخر" کی حیثیت حاصل ہوگی۔ دوسری طرف سیاروں میں پہنچنے کی کوشش کا سلسلہ بھی جاری ہے یہ تحقیق ہوجانے کے بعد کہ مریخ میں یقیناً اور چاند میں غالباً آثارِ حیات پائے جاتے ہیں ایسے تیز رفتار طیارے بنائے جارہے ہیں جو اس کرۂ ارض کے انسان کو وہاں تک پہنچادیں۔ ان میں سے ایک جہاز کی بابت دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ مسلسل پانچسو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتے رہنے پر ۲۰ دن میں چاند تک اور ۲۱ سال میں سورج تک پہنچ جائیگا۔ خدا کرے یہ کوششیں بارآور ہوں اور قلتِ گنجائش سے تنگ آکر دستِ تطاول بڑھانے والی حکومتیں اپنے اپنے ملک کے باشندوں کو ان سیاروں میں منتقل کرکے نوآبادیات کے وہ مسائل حل کردیں جن کی کبھی ختم نہ ہونے والی پیچیدگیوں سے یہ دنیا ہمیشہ میدانِ جنگ بنی رہتی ہے۔

آغا خاں کی جوبلی

اگلے سال کے شروع میں ہز ہائینس سر آغا خاں کی ڈائمنڈ جوبلی بمبئی میں منائی جائے گی۔ تقریباً ستر ہزار اسمٰعیلی خوجے، جو سر آغا خاں کے پیرو ہیں، ہندوستان کے تمام حصوں سے جوق در جوق آکر مضافاتِ شہر کے اس حصے میں جمع ہونگے جہاں اس رسم کی ادائیگی کے لئے بڑے شاندار پیمانے پر ایک علیحدہ کیمپ قائم کیا جائے گا۔ ڈائمنڈ جوبلی کی رعایت سے ہز ہائینس کو ہیروں میں تولا جائے گا۔ اندازہ ہے کہ ہیروں کا مجموعی وزن تقریباً چھ لاکھ پندرہ ہزار قیراط ہوگا۔ بعد میں ان ہیروں کو فروخت کرکے کل قیمت خیراتی کاموں میں صرف کردی جائیگی۔ وسطی ایشیا، افغانستان، عراق، اور شام وغیرہ میں جہاں ہز ہائینس کے بہت سے مرید ہیں کوشش کی جائیگی کہ کم سے کم تعداد میں زائرین آئیں تاکہ بمبئی میں جہاں پہلے ہی سے آبادی بڑھ گئی ہے، ان کے قیام میں کوئی دقت پیش نہ آسکے۔

ہیروں کا تحفہ

سر سی وی رامن مدراس کے ایک ہندوستانی سائنسی ادارے کے روح رواں اور زبردست ماہرِ طبیعیات ہیں۔ ابھی چند سال پہلے ان کو طبیعیات کے ضمن میں چند مفید تحقیقات پیش کرنے پر "نوبل پرائز" ملا تھا۔ اب خبر آئی ہے کہ حال ہی میں ہیروں کی کانوں سے متعلق جنوبی افریقہ کی ایک کمپنی نے موصوف کو تحفتہً سولہ ہیرے پیش کئے ہیں جو ناتراشیدہ اور بالکل ہی خام حالت میں ہیں گویا ابھی کانوں سے نکالے گئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہ ہیروں کی ساخت اور کیمیاوی عناصر پر مزید تحقیقات کرکے دنیا کے سامنے اپنے تجربات کے نتائج پیش کریں۔

مکھی مار

اس جنگ سے قبل بھی کیڑوں، مچھروں، مکھیوں اور دوسرے حشرات الارض کو فنا کرنے کےلئے کئی قسم کے مسالے مستعمل تھے۔ لڑائی کے دنوں میں جہاں اور کئی تحقیقات ہوتی رہیں، اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ایٹم کے اصولوں پر ایک خاص قسم کا تیل دریافت کیا گیا ہے اسے چھڑکنے کےلئے ایک عجیب انجن بھی ایجاد ہوئی ہے جو ایک گیلن تیل کو ایک گھنٹے میں بخارات میں تبدیل کرکے وسیع فضا میں پھیلا سکتی ہے۔ اس سے وہ کیڑے اور جراثیم بھی ہلاک ہوجایا کرینگے جو ابتک کسی مسالے سے فنا نہیں ہوتے تھے۔ انسانی صحت یا کھانے پینے کی چیزوں کے لئے وہ کسی طرح بھی مضر ثابت نہیں ہوسکتا۔

واقعاتِ عالم کا روزنامچہ

۱۶ ستمبر سے ۳۰ ستمبر تک

۱۶- فرانس اور اسپین کے مابین ایک نیا تجارتی معاہدہ ہوا ہے جسکی رو سے آئندہ چھ ماہ کے اندر اندران دونوں ملکوں کے درمیان اسّی کروڑ کے مال کا مبادلہ ہوگا۔ آج گورنمنٹ ہاؤس میں جاپان کی شکست کے محضر پر باقاعدہ دستخط ہوگئے اور ہانگ کانگ تقریباً چار سال تک جاپان کے قبضہ میں رہنے کے بعد پھر برطانیہ کے پاس آگیا۔

۱۷- ہندوستانی فوج میں تخفیف کرنے کی تجاویز کا اعلان ہوگیا۔ حکومت ہند نے اس مسئلہ کے ابتدائی مدارج کو طے کرلیا ہے۔ سابق جاپانی وزیر خارجہ توگو پر بحیثیت جنگی مجرم کے مقدمہ چلایا جائیگا۔ پرل ہاربر پر حملہ کی ذمہ داری اسی پر ہے۔ جاپان میں اتحادی فوج کی مزاحمت نہیں ہوئی اسلئے ملک پر فوجی پہرہ رکھنے کیلئے صرف دو لاکھ فوج کی ضرورت پڑے گی۔

۱۸- لندن میں اخباری نمائندوں کی ایک کانفرنس میں مولوٹوف نے کہا کہ اریٹیریا میں روس اپنا مفاد دیکھتا ہے اور یہ بھی کہ امریکی اخبارات کی یہ خبر بھی صحیح ہے کہ روس تریپولی کا محافظ بننا چاہتا ہے۔ صدر ٹرومین نے بیان دیا کہ امریکہ، برطانیہ، سوویٹ روس، اور چین متحدہ طور پر کوریا کی آزادی کے حامی ہیں۔ والٹر شمٹ کو جو ہٹلر کا دست راست تھا اور جنگی قیدیوں کے کئی کیمپوں کا انسپکٹر بھی پھانسی دیدی گئی۔

۱۹- جرمن ریڈیو کے مشہور مبصر لارڈ ہا ہا کو پھانسی کی سزا کا اعلان ہوگیا لیکن وہ غالباً اپیل کرے گا۔ وائسرائے ہند لارڈ ویول نے لندن سے واپسی پر ہندوستان کے متعلق اہم اعلان کردیا۔ مسٹر اٹیلی نے کہا ہے کہ سر اسٹیفورڈ کرپس کی تجاویز اب بھی قائم ہیں۔ قحط کے تحقیقاتی کمیشن نے اپنی مکمل رپورٹ پیش کردی۔

۲۰- لندن میں ٹریفل گر اسکوئر میں برٹش ایمپائر ڈے منایا گیا، اور ہندوستانی سپاہیوں کا بڑی گرمجوشی کے ساتھ استقبال ہوا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ وائسرائے اور مسٹر اٹیلی کے ریڈیائی اعلان بڑے غور کے ساتھ مطالعہ کرنے کے قابل ہیں لیکن ہندوستان کے مسلمان صرف پاکستان ہی پاکر مطمئن ہوسکتے ہیں۔

۲۱- طہران سے روسی فوجیں ہٹالی گئی ہیں اور شہر سے روس کی تحریری نگرانی بھی۔ جاپان کے تمام جنگی مجرموں سے مواخذہ کرنے کی تمام تجویزیں مکمل ہوگئیں۔ آٹھویں امریکی فوج نے ایک آسٹریلین جان ہالینڈ کو حراست میں لیا ہے اسپر الزام یہ ہے کہ وہ شنگھائی ریڈیو سے جاپانی پروپیگنڈا کیا کرتا تھا۔

۲۲- بلقان میں امن قائم کرنے کے مسئلہ پر اتحادی ممالک کے وزرائے خارجہ کی بحث جاری ہے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ویول پلان پر غور کرنے کے بعد اعلان کیا کہ وہ اس تجویز سے مطمئن نہیں ہے۔

۲۳- واشنگٹن میں امریکہ اور برطانیہ کے نمائندوں کے درمیان مالیاتی گفتگو دینا پٹہ کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے جاری ہے۔ حکومت مصر نے مطالبہ کیا ہے کہ مصر اور سوڈان سے برطانوی فوج ہٹالی جائے۔

۲۴- امریکہ اور برطانوی ایجنٹوں نے اسپین میں جرمنی کی تمام سرکاری جائداد اور صنعت و حرفت کے مرکزوں پر قبضہ کرلیا۔ سائگون پر فرانسیسی قبضہ ہوگیا۔ مشرق وسطے کے تیل کیلئے برطانیہ اور امریکہ کے درمیان ایک نیا معاہدہ ہوا۔

۲۵- فلسطین میں یہودیوں کے خلافِ قانون داخلہ کو روکنے کیلئے مزید برطانوی فوج فلسطین بھیجی جارہی ہے۔ برلن میں ایسے سرکاری کاغذات دستیاب ہوئے ہیں جن سے پتہ لگا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں ہٹلر کا ارادہ جنوب مشرقی انگلستان پر بائیس ڈویژنوں سے حملہ کرنے کا تھا۔

۲۶- ورلڈ ٹریڈ یونین کانگرس میں برطانوی نمائندے سر والٹر سٹرین نے کہا کہ فیڈریشن کے آئین وضوابط کو تسلیم کرنا اس امر پر منحصر ہے کہ ٹریڈ یونینوں کی بین الاقوامی فیڈریشن اور بین الاقوامی ٹریڈ سکریٹریٹ کی درمیانی گفتگو قابل اطمینان طور پر ختم ہو۔

۲۷- شہنشاہ جاپان نے امریکی سفارت خانہ میں جنرل میک آرتھر سے ملاقات کی۔ بارش کی کثرت اور نہر کا بند ٹوٹ جانے سے پٹیالہ کا نصف شہر زیر آب ہوگیا۔ مارشل ژدکوف نے صدر ٹرومین کی دعوت منظور کرلی۔

۲۸- مارشل چیانگ کے شیک اور چین کے کمیونسٹ لیڈر ماؤ تسی تونگ کے درمیان چین کے نئے دستور العمل کے متعلق مفاہمت ہوگئی۔ جنوبی علاقہ کے جاپانی کمانڈر انچیف مارشل کاؤنٹ تراچی کو ہند چینی کے فسادات میں حصہ لینے کے شبہ پر برطانوی فوج نے گرفتار کرلیا۔

۲۹- صدر ٹرومین نے حکومت برطانیہ سے درخواست کی ہے کہ بے گھر یہودیوں کو فلسطین میں داخلہ کی اجازت دیدی جائے۔ برطانوی فوجوں نے جاوا کی بندرگاہ پر قبضہ کرلیا۔

۳۰- جاپان کی مشہور خبر رساں ڈومی ایجنسی کو ختم کردیا گیا۔ اس کی جگہ ایک نئی ایجنسی قائم ہوئی ہے جس کا نام ہے کیوڈو نیوز ایجنسی۔ روسی فوجیں منچوریا سے ہٹنے لگیں۔

سوزِ سفر

ساغر نظامی

مرحبا سوزِ سفر ذوقِ سفر عزمِ سفر
خود ہی رہگیرِ شبِ تار ہوں خود ہی رہبر

مہدِ طفلی میں ہے خوابیدہ ابھی نوعِ بشر
طفلِ خوابیدہ سے کیا تجزیۂ نیکی و شر

جس میں محلول ہے زہرابِ تعلق کی مٹھاس
صاف اقرارِ محبّت ہے وہ نفرت کی نظر

فطرتِ بحر نے صدیوں میں تراشا ہے جسے
گوشِ قدرت کا وہ آویزۂ نادر ہے گہر

کم سے کم اتنی بلندی پہ تو ہو تیرا مقام
کہ ترے سائے میں ہوں خود ترے نجم و اختر

تابکے آہ یہ فرسودہ منازل کا طواف
اک نیا ذوقِ جہاد ایک نیا عزمِ سفر

قربِ افلاک ہے اے دوست ستاروں کا ہجوم
اسی انوار کے سیلاب سے اُچھلے گی سحر

تلخ و نابینا حقائق سے گراں بار نہ ہو
یہی نابینا حقائق تجھے بخشیں گے نظر

خون اور آگ کے غاروں سے ہراساں کیوں ہے
انہی غاروں سے اُبلنے کو ہے طوفانِ گہر

عزمِ پرواز کو اک جرأتِ نو ملتی ہے
جتنے کٹتے ہیں فزوں ہوتے ہیں میرے شہپر

ساغرِ مے سے چھلکتی ہے نشاطِ ابدی
میری توہین ہے اس وقت غمِ نیکی و شر

رتن ناتھ سرشار

اردو ادب میں سماج کی تصویر

فیض احمد فیض

نئی نسل عام طور سے سننے میں آتا ہے کہ اگر آپ اردو ادب میں سماج کی تصویر دیکھنا چاہیں تو آپ کو موجودہ ادب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ہمارا پرانا ادب خیال پرست اور رومانی ہے۔ سماجی زندگی سے بے تعلق اور روزمرہ واقعات سے ناآشنا۔ یہ بات کئی اعتبار سے صحیح ہے لیکن بالکل صحیح نہیں۔ ہمارے ادب کے کئی شعبے ایسے ہیں جن میں لکھنے والوں نے واقعی خیال اور دور از کار باتوں سے دامن چھڑا کر زندگی کے روزمرہ مسائل کو پیش کرنا چاہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ادب کی بعض شاخیں ایسی بھی ہیں جنکی ابتدا حقیقت نگاری سے ہوئی، رومانیت اور حقیقت سے فرار کی باری بعد میں آئی۔ اردو ناول اسی دوسری صف میں شامل ہے، اگر ہم بالکل شروع کے قصے کہانیاں نظرانداز کر دیں جو بیشتر فارسی، ہندی، سنسکرت یا دوسری زبانوں سے ترجمہ ہیں تو اردو کے اولین طبعزاد ناول مولوی نذیر احمد کی تصانیف ہیں اور ان کے بعد سرشار اور سرشار کے معاصرین کی، نذیر احمد اور سرشار دونوں نے اپنے اپنے طریقے سے اپنی اپنی معاشرت کی تصویر دکھانا چاہی، مولوی نذیر احمد کی کتابیں ذرا پہلے کی ہیں اور ان میں سماجی ماحول کی تصویر بھی زیادہ سچی ہے۔ سرشار ذرا بعد میں آئے اور ان کے افسانوں میں حقیقت کے ساتھ ساتھ خیال آرائی اور مضمون آفرینی کی آمیزش بھی بہت زیادہ ہے۔ ان کے بعد بالکل حال کے زمانے تک ہمارے ناول میں حقیقت سے لگاؤ کم اور اسی آمیزش سے محبت بڑھتی گئی، حتیٰ کہ مختلف سماجی وجوہات کے سبب سے جن کے بیان کا یہ محل نہیں، یہ ندی بھی اتر گئی۔ دوسرے لکھنے والے دوبارہ اپنے گرد و پیش کے حالات کو صحیح اہمیت دینے لگے، بہرحال کہنا یہ تھا کہ اردو ناول میں تحریر کا رخ مسلسل طریقے پر رومانیت اور خیال آرائی سے واقعیت اور حقیقت نگاری کی طرف نہیں رہا بلکہ اس کے الٹ، اور اس حقیقت نگاری کے اولین نمائندے ہیں، مولوی نذیر احمد اور پنڈت سرشار، یہ دوسری بات ہے کہ ان کی تصانیف میں سماج کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اور اس اختلاف کی وجوہات بیان کرنا بھی آسان ہے، اوّل تو ان مصنفین کے مزاج اور مقاصد دونوں مختلف ہیں، نذیر احمد کا مقصد بنیادی طور پر اصلاحی ہے تو سرشار کا تفریحی، نذیر احمد کا مزاج متین اور مفکرانہ ہے تو سرشار کا رنگین، ان کے تخلص کے مطابق، نذیر احمد کا انداز ناقدانہ اور ناصحانہ ہے تو سرشار کا خالص بیانیہ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نہ صرف ان کے وقت اور فسانۂ آزاد کے مصوروں کے رنگ اور موقلم الگ الگ ہیں بلکہ خود تصاویر کے موضوع بھی جدا جدا ہیں۔ مولوی نذیر احمد کی سماج دہلی کے شریف سفید پوش گھرانوں سے عبارت ہے تو سرشار کی سماج لکھنؤ کے لاابالی امرا اور ان کے گرد گھومنے والی بے تعداد مخلوق کا مرقع۔ اس وقت ہمیں صرف سرشار کی سماج سے بحث ہے۔ سرشار نے جو تصویر بنائی ہے وہ کچھ حقیقی ہے کچھ خیالی لیکن ان دونوں پہلوؤں میں فرق کرنا مشکل ہے۔

آپ نے انگریزی اخباروں میں مشہور اور معروف چہروں کی بگڑی ہوئی مضحکہ خیز تصاویر دیکھی ہوں گی جنھیں کیری کیچر کہتے ہیں نقاش، چہرے کے اصلی خد و خال میں کچھ ایسی افراط و تفریط کرتا ہے کہ چہرے کی ہیئت بہت کچھ مسخ ہو جانے کے باوجود بھی رہی رہتی ہے۔ کچھ اسی نوع کی افراط و تفریط سرشار نے اپنی تصویروں میں کی ہے، اس تصویر میں عیاش، خالی الذہن امرا کچھ اور بھی زیادہ عیاش دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی مضحکہ خیز درباری محفلیں کچھ اور بھی زیادہ مضحکہ خیز محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے خوشامد پسند درباری کچھ اور بھی زیادہ چاپلوس نظر آتے ہیں۔ اسی طرح چست زبان، طباع بھٹیاریاں کچھ ضرورت سے زیادہ خوش گو ہیں اور شریف گھرانوں کی طرار، چنچل دوشیزائیں ضرورت سے زیادہ طرار ہیں، لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود سرشار کی تصویر میں نوابی کے آخری عہد کے خد و خال نمایاں اور زندگی کے مطابق ہیں پہلی نظر میں یہ دنیا شور و ہنگامہ، رونق اور گہما گہمی، راگ رنگ، رقص و سرود، عشق و محبت، رندی اور بے فکری کی دنیا ہے کہیں بٹیروں پہ شرطیں بدی جا رہی ہیں، پالیاں ہیں کہ میدانہائے جنگ کو مات کرتی ہیں، کہیں میلوں ٹھیلوں میں بانکوں کا ہجوم ہے، کہیں شعر و شاعری کی محفل گرم ہے، کہیں چانڈو پیا جا رہا ہے کہیں شادی بیاہ میں طائفے آ رہے ہیں، مہمانوں میں چہلیں ہو رہی ہیں، ان رنگا رنگ محفلوں کی مخلوق بھی ایسی ہی بوقلموں ہے نواب، امرا، شہسوار، بٹیر باز، بھٹیاریں، بھانڈ ٹھٹھول، چور، گنٹھ کترے، علماء، صوفی، افیمی، قمار باز سب ایک ہمہ گیر بے مقصد دھما چوکڑی میں مصروف اور منہمک ہیں لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ سرشار خوب جانتے تھے کہ یہ چمک بجھتی ہوئی شمع کا آخری سنبھالا ہے۔ یہ رقص محض موت کا رقص ہے۔ یہ عیش و طرب محض یاس اور خوف سے فرار کا بہانہ، سرشار نے اس کا اظہار یوں کیا ہے کہ فسانۂ آزاد کے تمام کردار اور ان کردار کی تمام سرگرمیاں محسوس اور موجود ہونے کے باوجود قطعی غیر حقیقی اور غیر واقعی معلوم ہوتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری سرگرمیاں ناٹک کا کھیل ہیں اور یہ کردار اس جیتی جاگتی دنیا میں نہیں بلکہ کسی بالکل من گھڑت دنیا میں نقل و حرکت کر رہے ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں جسے ان حضرات نے کسی جواز کے بغیر حقیقی فرض کر رکھا ہے۔ سرشار نے یہ بات کس ڈھنگ سے واضح کی۔ یہ میں بعد میں عرض کروں گا پہلے سرشار کی سماج پر دوبارہ نظر ڈالئے۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ سرشار کی تصویر نوابی یا جاگیرداری کے آخری مٹتے ہوئے دور کی تصویر ہے۔ کسی سماج میں یا سماج کے کسی طبقے میں تنزل کیوں آتا ہے

اور کیا صورت اختیار کرتا ہے اس کی کئی طرح سے تشریح اور تفسیر کی گئی ہے۔ غالباً سب سے سیدھی بات یہ ہے کہ جب مادی ذرائع میں ترقی ہو جانے کی وجہ دنیا کے اقتصادی حالات بدلتے ہیں تو سماج کو بھی ان حالات کے ساتھ بدلنا پڑتا ہے لیکن اگر کوئی سماج یا سماج کا کوئی طبقہ بدلنے سے انکار کر دے یا اس انقلاب کا اہل نہ ہو تو زندگی کی رو اسے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ریل گاڑی کسی مسافر کو منزل سے دور ایک اجنبی اسٹیشن پر اتار کے آگے روانہ ہو جائے۔ اس ساکن سماج کے ارد گرد دنیا کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ رہنے سہنے، سوچنے سمجھنے، پڑھنے لکھنے کے ڈھنگ اور ہو جاتے ہیں۔ علوم و فنون کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ معاشرت اور تہذیب کے سانچے نئے ڈھالے جاتے ہیں لیکن یہ پسماندہ طبقہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد چننے میں لگا رہتا ہے اور زندگی سے اس کا تعلق دور سے دور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس بے تعلقی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سماج یا اس طبقہ کی سرگرمیاں دن بدن زیادہ مہمل، زیادہ بے مقصد، زیادہ مضحکہ خیز ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جیسے سماج مجموعی حیثیت سے کسی اگلی منزل پر پہنچنے کی بجائے حرکت بند کر دیتی ہے اسی طرح اس سماج کے افراد اپنے اعمال کو کسی مقصد سے متعلق کرنے کی بجائے چند مرغوب اعمال کی مختلف صورتوں میں تکرار کرتے رہتے ہیں۔ ان کے جواز کی مختلف صورتیں تلاش کی جاتی ہیں۔ ان کے بے جان ڈھانچوں میں مختلف طریقوں سے جان ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مفروضہ حقیقتوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ مثلاً بٹیر بازی اور مرغ بازی تیغ زنی اور جنگ و جدل کا بدل ٹھہرتے ہیں۔ فقرہ بازی اور لطیفہ گوئی، شیریں گفتاری اور شعر و شاعری کی مسند سنبھال لیتے ہیں۔ بے مقصد تکلفات اور مصنوعی رکھ رکھاؤ کو صحیح مروت اور اخلاق کا مرتبہ مل جاتا ہے۔ ساری انسانی صفات یعنی شجاعت۔ سخاوت۔ عالی حوصلگی، دیانت اور راستبازی وغیرہ وغیرہ اپنی ہیئت بدل کر بالکل انجانی صورتوں میں جلوہ گر ہونے لگتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس سماج یا اس طبقے کے افراد کو ایک حد تک ان ساری باتوں کا احساس بھی ہوتا ہے اور ان کی بیشتر کوششیں اسی احساس سے پیچھا چھڑانے میں صرف ہوتی ہیں۔ ہاؤ ہو، شور و شغب، راگ رنگ، رقص و سرود، رندی اور عشق بازی اس کوشش کی مختلف اور ناکام صورتیں ہیں۔ ناکام اسلئے کہ ان کی تہ میں ایک گہری بے اطمینانی، ایک سرد مایوسی اور خوف کا جذبہ چھپا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کی اس پر رونق اور رنگین محفل کے پاس ہی کہیں پس پردہ موت کی مسلسل اور سفاک ڈگڈگی بج رہی ہے۔ بعینہٖ یہی تصویر سرشار نے کھینچی ہے۔ انہیں اس مٹتی ہوئی سماج سے محبت بھی ہے، حقارت بھی۔ اسکی رنگینی سے لگاؤ بھی ہے لیکن اس رنگینی کا انجام بھی معلوم۔ محبت کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اس سماج کے آداب و رسوم کا نقشہ نہایت عرق ریزی اور تفصیل سے کھینچا ہے۔ انہوں نے اس کے ہر منظر کو صنعت اور دلداری سے بیان کیا اور اس کے مختلف طبقوں کے نقوش بہت خوبی سے واضح کئے ہیں لیکن سرشار کی حقارت اور طنز بھی ایسے ہی واضح ہیں۔ اس کا ایک ثبوت وہی فضا قنوطیت کی فضا ہے جس کے متعلق میں نے پہلے اشارہ کیا تھا۔ پنڈت سرشار نے یہ فضا مختلف تدبیروں سے پیدا کی ہے کہ وہ قصے کے واقعات اور کرداروں کے بیان میں جا بجا ایک مزاحیہ غلو اور مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ بٹیر پرست نواب کا قصہ تو شہرۂ آفاق ہے لیکن اس کے علاوہ یہی بات ہمایوں فر اور آزاد کے معاشقوں کے متعلق بھی صحیح ہے۔ اللہ رکھی عرف ثریا بیگم کی ساری زندگی ایک ایسا ہی مبالغہ آمیز افسانہ ہے اور میاں آزاد کا ترکی کا سفر اور روس جنگ میں انکے سورمائے نمایاں اس پہ اضافہ۔ اس فضا کی پیدائش میں دوسرا عنصر نئی اور پرانی دنیا کا وہ تضاد ہے جس کی طرف پنڈت سرشار بار بار اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً سرشار کی دنیا میں بٹیر بازوں کی محفلوں کے ساتھ ساتھ روزانہ اخبار بھی ہیں، ریلیں اور موٹریں بھی اس میں حسن آرا اور ثروت کے دوش بدوش انگریزی میمیں بھی دکھائی دیتی ہیں اور پرانے محلات کی بغل میں نئے فیشن کے بنگلے بھی کھڑے ہیں۔ لیکن سرشار کے طنز کا سب سے بڑا مظہر خوجی کا کردار ہے۔ بزدل اور لنگوڑا لیکن شیخی خور اور لاف زن، بدصورت اور بے ڈول لیکن بزعم خود یوسف ثانی، خوشامد پسند، لالچی لیکن بقول خود خود دار اور فقیر صفت، ہوس پرست لیکن ہوس پرستی کے ثمر سے نا آشنا، یہ مضحکہ خیز شخصیت تنزل پذیر درباری طبقے کی مدِّ آخر ہے، سرشار نے اس شخصیت کو ایک آئینے کے طور پر استعمال کیا ہے جس میں لکھنؤ کے آخری عہد کے درباری اپنے چہرے کا کوئی نہ کوئی نقش دیکھ سکتے تھے۔ سرشار نے خوجی کی تخلیق سے یہ دکھانا چاہا کہ اگر یہ ساری صفات ایک انسان میں اکٹھی کر دی جائیں تو اس کی صورت کیا بنتی ہے۔ خوجی کے علاوہ اس سماج کے دوسرے نقاد آزاد ہیں۔ آزاد جس کی کوئی منزل نہیں جس کے قدموں کو کہیں قرار نہیں ایک نئے طبقے کا نمائندہ ہے جس نے اپنے ماحول سے ناطہ توڑ لیا ہے جسے ماضی کا جمود اور بےحسی ورثہ میں نہیں ملا اور بقول سرشار کے یہی مسافر راہ نورد طبقہ ایسا ہے جو کچھ کر سکنے کا اہل ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سرشار نے سماج کی جو تصویر پیش کی ہے وہ سراسر عیب ہے اور اس میں کوئی خوبی سرے سے موجود ہی نہیں۔ سرشار نے اس سماج کی خوبیاں بھی گنوائی ہیں، اس کے رسوم و رواج میں ایک طرح کی نفاست اور حسن ہے وہ اس کے بہت سے نام لیوا ذہین بھی ہیں بذلہ سنج بھی۔ اس میں ایک خاص طرح کی برداشت اور انسانی عیوب سے چشم پوشی کی صفت ہے جو آجکل کم ہوتی جا رہی ہے، اس میں ایک خاص نوع کے علوم کی بھی قدر ہے۔ وہ علوم یعنی عروض، منطق، تصوف، ہیئت، صرف و نحو وغیرہ جو آجکل مٹتے جا رہے ہیں۔ لیکن ان ساری خوبیوں کے باوجود یہ تصویر ایک جاں بلب مریض کی تصویر ہے جو اپنے آخری لمحوں میں دوا دارو یا مجزو نیاز کے بجائے بادہ گساری اور داد عیش میں مصروف ہے۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو۔ لاہور)

لکھنے والوں سے: موجودہ جنگ نے صحافت کیلئے جو مشکلات پیدا کر دی ہیں ان کے پیش نظر قلمی معاونین سے التماس ہے کہ وہ اپنے مضامین بھیجتے وقت اختصار کو ضرور ملحوظ رکھا کریں ہم طویل مضامین شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ ایڈیٹر

فرقت

افسانہ

ط۔ حسین
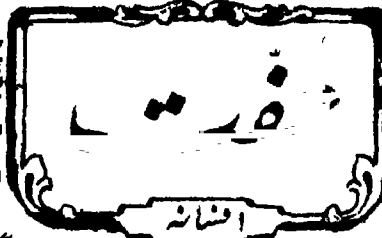
"ہر روز چھ بجے شام کو اس دوا کے دس قطرے اس نوزائیدہ کمزور بچی کی زندگی قائم رکھ سکتے ہیں" ڈاکٹر نے رفیقہ سے کہا۔

معمول کے مطابق رفیقہ اس ناتوان بچی کے لئے جو حقیقی معنوں میں کبھی انسان نہیں کہلائی جا سکتی جسکی زندگی ناکامیابی اور بیماری کے نہ چھٹنے والے سیاہ بادلوں میں نقاب پوش رہیگی دوا تیار کر رہی تھی کہ اس کا دماغ مختلف خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک لنگڑی لولی و بیمار لڑکی بڑے ہو کر محسوس کرے گی کہ وہ دوسروں کے لئے وبال جان ہے۔ اور اس وقت اس کا قلبی انتشار خاموش مگر معصوم جذبات ایک ماں کے دل کو صد چاک کرنے کے لئے کافی ہیں۔ وہ ابھی ان ہی خیالات میں محو تھی کہ آواز آئی "اماں۔ تم کیا کر رہی ہو"۔ رفیقہ نے جلدی سے دوا کے دس قطرے اس بچی کو پلائے اور چلی گئی۔

یہ آواز رفیقہ کے بڑے لڑکے نعیم کی تھی۔ وہ چھ سالہ خوبصورت اور شریر بچہ صحت اور تندرستی کا مکمل نمونہ ہے اور ان خوبیوں کے علاوہ نہایت ہی بدشوق اور خود سر بھی ہے۔

اس بچی کی وجہ سے جسکا نام عفت ہے، رفیقہ و حلیم کے چھوٹے سے گھر پر ہمیشہ اداسی چھائی رہتی ہے۔ رفیقہ دوسرے کاموں میں دلچسپی لینا چاہتی ہے لیکن عفت کا خیال تمام ارادوں کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ عفت کا باپ حلیم جو کلکتہ میں سن کے مل میں ایک قلیل مشاہرہ پر ملازم تھا اور جگہ قسمت آزمائی کرنے جانا چاہتا تھا لیکن عفت کو چھوڑ کر جا نہیں سکتا تھا۔ حقیقتاً وہ دونوں اسے والہانہ محبت کرتے تھے جس میں والدین کی بے لوث محبت کے علاوہ انسانی ہمدردی بھی بدرجہ اتم شامل تھی۔ حلیم نے حتی المقدور علاج معالجہ کرایا۔ تمام اسپتالوں کی خاک چھان ماری لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اگر حلیم و رفیقہ مالدار ہوتے تو ممکن تھا کہ دوسرے ممالک میں لیجا کر علاج کراتے جس سے کم از کم وہ بستر ہی پر بیٹھ سکتی لیکن یہ خیال موہوم تھا انکے پاس روپیہ نہ تھا اور کلکتہ میں علاج ناممکن۔

عفت دو سال کی ہو چکی تھی۔ اسکی نشوونما بہت کمزور تھی۔ ذہنی حالت بھی دوسرے بچوں کی طرح نہ تھی اس کی بے رونق آنکھیں، زرد چہرہ کا بے معنی اتار چڑھاؤ، نحیف و لاغر جسم ہر ایک آنے جانے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی اور رحم کی مستحق ہوتی۔ غرضیکہ وہ رحم دل اور ہمدردوں کی نظروں کی آماجگاہ تھی۔ لیکن رفیقہ اچھی طرح محسوس کرتی تھی کہ یہ رحم و محبت کی نظریں چند دنوں میں نفرت و حقارت سے مبدل ہو جائینگی۔ نعیم اور شریا گو عفت کے حقیقی بہن بھائی تھے لیکن ان کی ابھی سے یہ حالت تھی کہ کبھی کبھی وہ اسے چھانک

چل دیتے تھے۔ وہ ان کے اس طرز عمل کو برا سمجھتی تھی لیکن وہ بچے تھے اور کم عمر۔ ماں کے جذبات کو کیا جانیں۔ ان کو اسی میں لطف آتا تھا کہ جھانکیں اور بھاگیں۔ پیشتر از یں کہ وہ بازپرس کرے۔

مدت کے ارادوں کے بعد ایک خوشگوار دن رفیقہ اپنی سہیلی سے ملنے گئی ہوئی تھی سب بچے گھر ہی پر تھے، جب وہ واپس آئی تو نعیم نہایت تیزی سے اس کے پاس دوڑا گیا اور اس سے پہلے کہ گھر میں داخل ہو کہنے لگا۔ "اماں عفت آپ کے جانے کے بعد رونے لگی۔ ہم نے بہلانے کی کوشش کی لیکن وہ چپ نہ ہوتی"۔ "پھر تم نے کیا کیا" رفیقہ نے پریشانی سے پوچھا۔ "پھر میں سٹول پر کھڑا ہو کر زمین پر کود پڑا۔ وہ ہنس پڑی، اور رونا بند کر دیا۔" وہ بولنا چاہتی تھی، لیکن نعیم نے موقع ہی نہیں دیا۔ اور کہنا شروع کیا۔ "اماں عفت واقعی ہنس دی۔ آپ کہتی تھیں کہ آج تک کبھی نہیں ہنسی چلئے میں آپ کو دکھا دوں۔ وہ اب بھی ہنس رہی ہوگی"۔ رفیقہ نعیم کی باتوں کی رو میں کچھ نہ کہہ سکی اور ساتھ ہولی۔ عفت نعیم کو دیکھ کر پھر مسکرا دی سانپنی اس چھوٹی سی عمر میں پہلی مرتبہ۔ نعیم بچہ مسرور تھا اور اس کے سامنے طرح طرح کی شرارتیں کر رہا تھا۔ وہ برابر ہنس رہی تھی۔ رفیقہ محو حیرت تھی کہ کس طرح اس کے درد آشنا لب مسکرانے کے لئے کھلے۔ کیا اسکی زندگی میں تابندگی آنے والی تھی!

نعیم اب عفت کا گرویدہ تھا اور فخریہ کہا کرتا تھا کہ "میں وہ پہلا جس نے عفت کو ہنسایا"

عفت یوں تو ہمیشہ بیمار ہی رہا کرتی تھی لیکن جب اس کی بیماری زور پکڑتی تھی تو گھر بھر میں صرف نعیم کے ہاتھ سے دوا پیتی تھی۔ اور نعیم بھی اسکی تیمارداری نہایت تندہی اور جانفشانی سے کیا کرتا تھا۔ سکول سے لوٹتے ہوئے اکثر اس کے لئے پھول اور کھلونے لایا کرتا تھا۔ جنکو لے کر وہ اپنی تکلیف بھول جاتی اور کچھ عرصہ کے لئے مسرور ہو جاتی۔

تین برس کی عمر میں اس نے بولنا سیکھا اور پہلا لفظ جو اس نے کہا وہ نعیم تھا۔ نعیم تکبرانہ انداز میں کہتا "میں اس سے باتیں کروا سکتا ہوں" اور پھر نرمی سے پوچھتا "تیرا نام کیا ہے" "نعیم" وہ جواب دیتی اس کا چہرہ کھِلتا اٹھتا اور آنکھیں روشن ہو جاتیں۔

عفت میں کچھ کچھ ترقی کے آثار ظاہر تھے۔ لیکن اب بھی وہ اوسط حالت پر نہ تھی۔ حلیم اور رفیقہ کو رنج ہوتا جب ان کو یہ خیال پیدا ہوتا کہ وہ بڑی ہوگی۔ اسکو اپنے نقائص کا احساس ہوگا اور انکو لوگوں کے ہمدردانہ جملے "غریب لڑکی۔ بدقسمت لڑکی۔ آہ بیچاری۔ زندہ درگور کر دینگے۔"

ایک دن دعوت تھی۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ مہمان رخصت ہو رہے تھے کہ عفت کے رونے کی آواز آئی۔ مہمانوں نے اس کے رونے کی کوئی پرواہ نہ کی۔

لیکن جب وہ اپنی پوری طاقت سے روئی اور آواز سے پکارا نعیم تو رفیقہ دوڑ گئی تھی نعیم کے کمرے میں آگ لگ رہی تھی اور وہ اس کی مدد کیلئے رو رہی تھی جسکی خود کوئی زندگی نہ تھی اس لئے اپنے بھائی اور بہن کی عزیز جانوں کو بچا لیا تھا۔ رفیقہ اور حلیم اس بیمار لڑکی کے احسان مند تھے۔

نعیم عفت کا بیحد ممنون تھا۔ اس کی اس انوکھی امداد نے نعیم کا دل موہ لیا تھا۔ اس کی برادرانہ محبت میں جوش آ گیا تھا۔ اب وہ اس کی مسرت کا پہلے سے بھی زیادہ خواہاں تھا۔ ثریا کو بھی عفت سے انسیت ہو چلی تھی۔ جس طرح نرم و نازک پودا غور و پرداخت سے جلد نشو و نما پاتا ہے۔ اسی طرح عفت میں بھی تبدیلی ہوئی تھی چہرہ کی زردی شادابی و شگفتگی میں تبدیل ہو گئی۔ اب اس کا نازک چہرہ اور خوبصورت جاندار آنکھیں نہایت دلفریب نظر آتیں۔ گلاب کی پتیوں کے مانند ہونٹ محبت بھری نظریں اپنی طرف مبذول کراتے۔

کالج میں دو سال پڑھنے کے بعد نعیم نے ڈاکٹری پڑھنے کا ارادہ کیا۔ تاکہ ڈاکٹر ہو کر عفت کا خود علاج کرے۔ کیونکہ اس کا پختہ خیال تھا کہ جس محبت و شفقت سے وہ علاج کرے گا۔ اس سے یقیناً عفت کو صحت کلی عطا ہو گی لیکن اس ارادہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ نعیم کے والد کو دو ایک ٹیوشنیں دو کالجوں پر فرصت کے اوقات میں ملازمت کرنی پڑی رفیقہ نے بھی کفایت شعاری اختیار کی۔ اور نعیم نے بھی رات کو لڑکوں کو پڑھانا شروع کیا۔

عفت بارہ سال کی تھی جب نعیم میڈیکل کالج میں داخل ہوا۔ اسکی صحت پھر جواب دے رہی تھی۔ ہفتوں بستر پر پڑے رہنے سے وہ اور بھی کمزور ہو گئی تھی۔ نعیم کو اس کی صحت کی بہت فکر تھی۔ وہ اس سے کہا کرتا "عفت دیکھو جب تک میں ڈاکٹر نہ ہو جاؤں تم کو بیمار نہ ہونا چاہیئے۔ بہت سے کام ہیں" سادگی سے وہ پوچھتی "کتنے سال میں ڈاکٹر ہو جائیں گے آپ؟" "پانچ سال میں" نعیم جواب دیتا۔ "لیکن وقت بہت جلدی گزر جاتا ہے" "اچھا" عفت کا مختصر جواب ہوتا۔

نعیم کلاس کا ذہین طالب علم تھا۔ امتحان میں ہمیشہ اول رہتا۔ اعلےٰ نمبر کہ وہ غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا یا سخت محنت کرتا تھا۔ یہ صرف عفت کی وجہ سے تھا جس کا خیال اسکو چین نہیں لینے دیتا تھا کیونکہ وہ جلد از جلد ڈاکٹر ہو جانا چاہتا تھا۔ عفت کی صحت اس عرصہ میں اور خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اسکی زندگی کچے دھاگے کی مانند ہے جو کسی وقت بھی شکستہ ہو جائے۔ عفت دنیا سے بیزار ہو چلی تھی۔ دن بھر وہ نعیم کی منتظر رہتی اور شام کو اسے دیکھ کر بے پایاں مسرت حاصل ہوتی۔ شادمانی سے اس کا چہرہ منور ہو جاتا۔

عفت کی حالت دن بدن تشویشناک ہوتی گئی۔ ایک دن جب اس کی کشتی حیات امید و بیم کے سمندر میں غوطہ زن تھی، اس نے رفیقہ سے کہا "نہ جانے لوگ موت سے کیوں خوف کھاتے ہیں۔ یہ تو نہایت میٹھی نیند اور ابدی راحت ہے۔ جس سے بیدار ہونا کسی کو پسند نہ ہونا چاہیئے۔ اماں آپ کیوں رنجیدہ ہیں؟" رفیقہ کا دل دھڑک رہا تھا اور آنسو بے اختیار نکلنے کے لئے مچل رہے تھے۔ وہ آنسو کو جذب کر کے مسکرانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی ادھوری مسکراہٹ میں آنسو نکل پڑے اور باوجود کوشش کے پریشانی نہ چھپا سکی۔ نعیم اس کے پاس کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اسکے جذبات کی ذلی ترجمانی کر رہا تھا اس نے اپنے پر قابو پانے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے کہا "صرف دو سال باقی ہیں میرے ڈاکٹر ہونے میں عفت تم اپنے وعدہ کو یاد رکھو اور خود کو سنبھالو" "خود کو سنبھالو" عفت نے جملہ دہرایا اور ساتھ ہی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آبدار آنسو نکل پڑے۔ اسکی روح جسد خاکی سے پرواز کرنے والی تھی۔

عفت نے نعیم نے گھبرا کر پکارا "نعیم" اس نے آہستہ سے کہا۔ اس کے بیمار ہونٹوں پر وہی پہلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جس نے نعیم کو اس کا والا و شیدا بنا دیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ نعیم ایک بچے کی طرح جس کا کھلونا کوئی چھین لے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ اسکو ابھی مرنا نہیں چاہیئے تھا۔ اس کا جواب رفیقہ کی طاقت سے باہر تھا۔ حلیم اور ثریا ساکت کھڑے تھے۔

دو سال بعد نعیم کو ڈاکٹری کی سند مل گئی۔ بھیج کا خود مرد (باقی صفحہ ۹۵ پر)

حریفِ تنہائی

روشؔ صدیقی

دل کے سوا ہم اور کسی سے شرحِ تمنا کیا کرتے
عشق تو ہے رسوائے دو عالم حسن کو رسوا کیا کرتے

دور ہٹا کر موجوں کو ہم نے الٹا دریا کا نقاب
دامنِ ساحل میں چھپ کر نظارۂ دریا کیا کرتے

حسرتِ دیدار تنہا حسن حریفِ تنہائی
دیدہ و دل کو ہم شایانِ خوابِ زلیخا کیا کرتے

شامِ ابد کا راز ہے شاید اے دل تیری محرومی
فردا بھی کچھ دور نہیں وہ وعدۂ فردا کیا کرتے

کیف و سکوں کے لاکھوں عالم دردِ محبت میں گم تھے
صورتِ غم بھی بھول گئے ہم فکرِ مداوا کیا کرتے

ان کا تغافل حسنِ نوازش اور یہ نوازش دائم ہو
شکوۂ عشق بجا ہی لیکن شکوہ بیجا کیا کرتے

دنیا اور عقبیٰ کی قیمت کچھ بھی نہیں میخانے میں
بادہ کشو! ہم نذرِ جمالِ ساغر و مینا کیا کرتے

ان کی تمنا اور روشؔ ہم کس کو آ سکتا ہے یقیں
یونہی لیا الزامِ تمنا جرمِ تمنا کیا کرتے

آرٹ اور اقبال

ظفر احسن آصف

کلامِ اقبالؒ اپنے سوز و گداز، صدقِ بیان اور نظریۂ حیات کے اعتبار سے متقدمین و متاخرین سے بالکل علیحدہ اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے چنانچہ اقبال اپنے پیشروؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے خود ہی فرماتے ہیں: ؎

عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے ‏ ‏ اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے ‏ ‏ طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے ‏ ‏ آئی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں

اقبال کے نزدیک آرٹ زندگی کا خادم ہے۔ ان کی شاعری روحانی اور اخلاقی مقاصد کے لئے ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ سامع جذب و قوت کی کیفیات سے فطرت پر قابو پانے کی صلاحیتیں پیدا کرے کیونکہ یہ ہمارے ذوقِ تجسس کی راہ میں سدِ سکندری بن کر کھڑی رہتی ہے۔ چنانچہ حیاتِ انسانی کے لامحدود امکانات اور نفسِ انسانی کی کائنات میں برتری و فوقیت کے عقائد ان کے آرٹ کے دو خاص محرکات ہیں جو وجدانِ شعری کی تخلیق کے علاوہ تمدنی اقرار کو بھی تقویت بخشتے ہیں۔ ان کے شاعرانہ اور فلسفیانہ تصورات زندگی کی اثر آفرینی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے آرٹ کی تہ میں حقیقت پسندی اور شستہ خلوص کے جذبات کارفرما ہیں۔ وہ "ہر کہی ہوئی بات" کا اثر اُن کی گہرائیوں میں تلاش کرتے ہیں۔ مغنی کے نغمات کو صرف سنتے ہی نہیں بلکہ اُن سے کچھ نتائج بھی مترتب کرتے ہیں۔ ان کی نظر "نے نواز" اور "چوبِ نے" دونوں پر ہے۔

اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے ‏ ‏ آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے
جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا ‏ ‏ سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

جلوہ ہائے جمالِ مظاہرِ فطرت اور چمن زارِ قدرت کی تمام دلآویزیاں کسی "دیدہ ور" کے اشعاروں کی منتظر رہتی ہیں۔ بہار پھول کھلاتی ہے مگر آرٹسٹ کی نگاہ ان کے اجزا کی تشریح کرتے ہوئے ان میں جاذبیت اور آب و رنگ پیدا کرتی ہے۔ آرٹسٹ کہسار و سبزہ زار، ندی کے شفاف پانی، گلہائے رنگیں اور ماہ و انجم کے دلکش نظاروں سے اپنی آنکھوں کو محض سیراب ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے اچھوتے اندازِ فکر اور قوتِ متخیلہ سے ان بے جان پیکروں کو زندگی عطا کرتا اور ان کے مقاصد و مفہوم کی وجہ تخلیق بتاتا ہے۔ وہ صرف ایک تماشائی نہیں بلکہ نقاد بھی ہے جو اشیاء کے جزئیات کو جانچتا پرکھتا اور اپنے پیمانۂ تخیل سے ناپتا اور تولتا ہے...... مناظر کے سطحی جمال کی نقالی نہیں کرتا بلکہ انہیں شاعرانہ مصوری اور حسین تشبیہات کے لباس پہنا کر ان کی اصلیت کے پہلو اجاگر کرتا ہے۔ اقبال کی نظمیں بالخصوص "بزمِ انجم" "ایک آرزو" اور "جگنو" ان تمام اوصاف کی حامل ہیں۔ ان میں تشبیہوں کی ندرت کا کمال، ادبی مصوری اور اعجازِ تخیل کے نہایت عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں: —

؎

طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے ‏ ‏ سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے ‏ ‏ پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے ‏ ‏ محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی

اقبال کے ذہن کی تخلیقی استعداد کا اندازہ کیجئے کہ وہ ستاروں کے بیان تک ہی محدود نہ رہی بلکہ اس نے بزمِ انجم کے نورانی جلوؤں سے زندگی کے معانی کا ادراک پیدا کیا اور "ملک" کی زبان میں ستاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ؎

تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمہاری ‏ ‏ اے شب کے پاسبانو، اے آسماں کے تارو!
شاید سنیں صدائیں اہلِ زمیں تمہاری ‏ ‏ آئینہ قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں

یہاں پہنچ کر اقبال کی شاعری کا فقید المثال پس منظر انہیں اقوامِ عالم کی تاریخ عروج و زوال کی یاد دلاتا ہے چنانچہ وہ ابنِ آدم کی جمود پسند حیات میں حرکت پیدا کرنے اور ان کی قوتوں کو غیرت دلانے کی خاطر کچھ طنز کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ اپنے احساسِ قلبی کا اظہار ستاروں کی خاموش زبان میں اس طرح کرتے ہیں: ؎

قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں ‏ ‏ یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام اتنا
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں ‏ ‏ اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں ‏ ‏ ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے

اقبال کی دوسری نظم "ایک آرزو" شاعرانہ مصوری کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ منظر نگاری کا یہ عالم ہے کہ الفاظ کے طلسم اور رنگینیٔ تخیل کی آمیزش نے فطرت کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے مگر اس سلیقہ اور خوبصورتی کے ساتھ کہ ذوقِ ادبی کے وجد کرنے کے ساتھ ساتھ روح بھی رقص کرنے لگتی ہے۔ دنیا کے حادثاتِ غم اور یاس و حرماں سے تنگ آ کر شاعر ایک اور ہی عالم میں زندگی بسر کرنے کی آرزو کرتا ہے۔ وہ عالم کیا ہو؟: ؎

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو ‏ ‏ ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو ‏ ‏ پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو ‏ ‏ مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو

ان کی تیسری نظم "جگنو" حسنِ ترکیب اور لطفِ تشبیہ کے علاوہ ندرتِ مضمون کے لحاظ سے موجودہ اردو ادب میں بہت بلند درجہ رکھتی ہے اور

اکثر ہمارے ناقدین کی نگاہ کی محتاج رہی ہے۔ یہ حسن استعمال اور صنعت شاعری کا بھی اعلیٰ نمونہ ہے:-

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں ۔۔۔ یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ ۔۔۔ یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا ۔۔۔ غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا ۔۔۔ ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نوعیت کی حسین ترکیبیں اور تشبیہات کلام اقبال میں کثرت سے موجود ہیں مگر یاد رکھنے کی بات ہے کہ تشبیہات استعارے اور ترکیبیں صرف چند مرعوب کن خوشنما الفاظ کے مجموعہ تک ہی محدود نہیں بلکہ اپنے پہلو میں ایک مخصوص فلسفہ حیات اور عظمت فکر لئے ہوئے ہیں۔ اقبال ان کے ذریعہ اپنی شاعری کے بنیادی نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں "شبنم اور ستارے" میں وہ اس دنیا کی ماہیت، پستی مذاق، تنگ دلی اور جور و استبداد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ستارے شبنم سے کہتے ہیں کہ تو ہمیں اس کشور دلکش (یعنی دنیا) کا فسانہ سنا چاند جس کی محبت کے ترانے گاتا ہے۔ شبنم جواب دیتی ہے کہ اے ستارو! مجھ سے جہانستان جہاں کا حال مت پوچھو یہ گلشن نہیں بلکہ آہ و فغاں کی بستی ہے جہاں کلی کھلتی ہے مگر مرجھانے کی خاطر۔ یہ کہنے کے بعد شبنم ستاروں سے یوں ہمکلام ہوتی ہے:-

ہیں مرغ نوا ریز گرفتار غضب ہے ۔۔۔ اگتے ہیں تہ سایۂ گل خار غضب ہے
رہتی ہے سدا نرگس بیمار کی تر آنکھ ۔۔۔ دل طالب نظارہ ہے محروم نظر آنکھ
دل سوختۂ گرمی فریاد ہے شمشاد ۔۔۔ زندانی ہے اور نام کو آزاد ہے شمشاد
تارے شرر آہ ہیں انساں کی زباں میں ۔۔۔ میں گریۂ گردوں ہوں گلستاں کی زباں میں
نادانی ہے یہ گرد زمیں طوف قمر کا ۔۔۔ سمجھا ہے کہ درماں ہے وہاں داغ جگر کا

بنیاد ہے کاشانۂ عالم کی ہوا پر
فریاد کی تصویر ہے قرطاس فضا پر

"کاشانۂ عالم" کو "قرطاس فضا پر" "فریاد کی تصویر" کا نام دینا اور شبنم کو "گریۂ گردوں" سے تعبیر کرنا کس قدر بلیغ اور نادر تشبیہات ہیں جن کا اردو ادب میں جواب نہیں۔ یہ نظمیں ان عجلت پسند ناقدین کے لئے لمحۂ فکریہ ہیں جو اقبال کو شاعر تسلیم نہیں کرتے اور شکوہ سنج ہیں کہ اقبال کے ہاں رنگینی افکار، رنگ تغزل و شوخی کلام نہیں اور صرف اخلاقیات اور داخلیت و خارجیت کے متعلق کچھ خشک فلسفیانہ مضامین کی بھرمار ہے۔

اقبال کا نظریۂ آرٹ ان کے نظریۂ حیات کی طرح بہت واضح اور روشن ہے غالباً اس لئے کہ یہ آرٹ، فلسفہ و منطق کی پابندیوں کو قبول نہیں کرتا اور صحیح شعریت کے لباس میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک وہ آرٹ بے معنی اور مہمل ہے جو حیات انسانی کو فروغ، بصیرت اور مسرت بخشنے پر قادر نہیں۔ ان کے خیال میں اہل نظر صرف وہی ہے جو اندرون وجود کو چیر کر اشیاء کی حقیقت و ماہیت کے سراغ لگائے اور اس طرح انسان کی ذہنی و قلبی الجھن کو دور کرتے ہوئے مستقل بصیرت کی تخلیق کرے:-

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن ۔۔۔ جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے ۔۔۔ یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو ۔۔۔ جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

اقبال کا آرٹ مقتضی ہے کہ شاعر زندگی کے انتہائی سنجیدہ اور عظیم الشان مقاصد پیش کرے۔ اس کا دل امین سوز یقین اور مرکز ایمان و خلوص ہو کیونکہ اس کے بغیر وہ انہماک اور قوت فکر پیدا نہیں ہو سکتی جس کی بدولت شاعر پر رموز حیات کا انکشاف ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال تسخیر فطرت کے لئے جذبۂ عشق سے مدد طلب کرتے ہیں اور ان کا نظریہ ہے کہ اس قوت کے ذریعہ زندگی کی تمام مخفی طاقتیں اور خوابیدہ ارادے بیدار ہو جاتے ہیں اور انسان پر وجدانی کیفیت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ وجدان ان کی اصطلاح میں نام ہے اس مستی، انہماک اور جذب کلی کا جو انسان کو قیود زمان و مکان سے آزاد کر کے ایک ایسے مقام پر لے جاتا ہے۔ جہاں شاہد حقیقی بے نقاب نظر آتا ہے۔ لہٰذا تمام ہنگامہ ہائے حیات، ذوق تمنا اور کاروان آرزو کی ہماہمی عشق کی رہین منت ہے جو نشیب فراق سے بیگانہ ہو کر مجاز کی منازل سے گزر جاتا ہے۔ عالم رنگ و بو سے اسے بہت کم تعلق ہے اور وہ اس کی صحبت کو عارضی تصور کرتا ہے:-

من بندۂ آزادم عشق است امام من ۔۔۔ عشق است امام من عقل است غلام من
ہنگامۂ این محفل از گردش جام من ۔۔۔ این کوکب شام من این ماہ تمام من
جاں در عدم آسودہ بے ذوق تمنا بود ۔۔۔ مستانہ نواہا زد در حلقۂ دام من

اے عالم رنگ و بو این صحبت ما تا چند
مرگ است دوام تو عشق است دوام من

عشق اور خودی اقبال کے نظریۂ حیات کے بنیادی تصورات ہیں لیکن وہ خرد کو بھی بے معنی نہیں سمجھتے اور اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ "خرد نے مجکو عطا کی نظر حکیمانہ"۔ مختصر یہ کہ اقبال کے نزدیک صحیح زندگی کا راز خرد اور جنون کے امتزاج میں مضمر ہے جس کا دوسرا نام خودی ہے۔ ان مضامین پر خامہ فرسائی کرنے کے لئے ایک علیحدہ باب کی ضرورت ہے اس لئے میں انہیں کسی اور صحبت پر اٹھا رکھتا ہوں۔

اقبال اور غزل گوئی

غزل کے متعلق ہمارے ناقدین اور اہل قلم حضرات کے مختلف خیالات ہیں۔ ایک گروہ کا تقاضا ہے کہ غزل فی حد ذاتہ صرف معاملہ بندی اور جمالیاتی تصورات کے اظہار تک ہی محدود ہونی چاہئے اور اس میں کبھی کبھی مضامین تصوف بقید فن

غزل آجائیں تو کوئی ہرج نہیں اور یہ بھی اس لئے کہ متقدمین اور متوسلین کی غزلیات میں کم و بیش تصوّف کا رنگ جھلکتا ہے۔ راقم الحروف کو اس خیال سے اتفاق نہیں کیونکہ فنون لطیفہ بالخصوص شعر و ادب کی توسیع و ارتقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ سماجی ماحول اور تہذیب و کلچر کے پیش نظر علوم و فنون میں بھی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی رہیں اور نئے نئے خیالات و افکار کو سلیقہ کے ساتھ ان میں جگہ حاصل ہوتی رہے۔

اقبال کی غزلیں جذبات و کیفیات کی آواز کی بازگشت ہیں۔ ان میں صفائی زبان، سادگی بیان، شوخی و رندی، بلندی تخیل اور شدت احساس کے علاوہ ایک خاص قسم کا درد، سوز، مستی اور جوش و حرکت پائی جاتی ہے ؎

دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کروں — لوٹ جائے آسماں مجھکو مٹانے کے لئے

پاس تھا ناکامیٔ صیاد کا اے ہمصفیر — ورنہ میں اور اڑکے جاتا ایک دانے کے لئے

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل — ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا

پرسش اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری — ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا کیونکر ہوا

علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں — جو تھے چھالوں میں کانٹے نوک سوزن سے نکالے ہیں

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا — جگر کا خون دے دیکر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی — نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

جرس ہوں نالۂ خوابیدہ ہے میری ہر رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقت رحیل کارواں تک ہے

چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیٔ رسم فغاں تک ہے

جوانی ہے تو لطف دید بھی ذوق تمنا بھی
ہمارے گھر کی رونق بس قیام میہماں تک ہے

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے — کہ جنکو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

محبت کیلئے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا — یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

ہے مری ذلت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل — جسکی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں

بزم ہستی اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو — تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں

اقبال کی رعنائی فکر، شوخی گفتار، بیخودی و مستی اور جرأت رندانہ ملاحظہ ہو ؎

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں — کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روز حساب جب پیش ہو مرا دفتر عمل — آپ بھی شرمسار ہو مجھکو بھی شرمسار کر

وہ زمیں ہیں محبت کی گستاخی و بے باکی — ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیباک

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا — یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

ذکر تعلیم لے جبریل میرے جذب و مستی کی — تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

غالب نے کہا تھا ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب — ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

لیکن اقبال کے ہاں یہ مضمون اپنے معانی کی غیر محدود وسعت کیساتھ مختلف انداز میں نظر آتا ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ایک کامیاب آرٹسٹ کے تخیلی پیکر اس کے اندرونی وجدان کا عکس ہونے کے باعث ہمیشہ خون جگر سے پرورش پاتے ہیں۔ تجربات و مشاہدات ان میں رنگ بھرتے ہیں اور حسین الفاظ کی خارجی قبا ان رنگوں کو اس قدر گہرا کر دیتی ہے کہ یہ آہستہ آہستہ زندگی کے انمٹ نقش بن کر رہ جاتے ہیں۔ اقبال ایک ایسے ہی شاعر حیات تھے چونکہ ان کی غیر معمولی شخصیت جامع کمالات تھی اس لئے انھوں نے قدیم و جدید علوم کے ذخیروں کو کھنگال کر ذاتی غور و فکر اور تحقیق و اجتہاد سے مستی، خودی، خرد، جنوں اور حسن و عشق کے مضامین کو ایک مستقل نظام فلسفہ کے تحت ترتیب دیکر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ نطشے، برگساں یا دیگر مغربی مفکرین کے خیالات سے کہیں زیادہ علمائے اسلام کے تصوّرات و معتقدات نے انکی ذہنی تربیت اور نظریات حیات کی تشکیل میں حصہ لیا۔ محسوس استعارے اقبال کے شاعرانہ افکار کی جان ہیں۔ تلمیحات، محاکات، تشبیہات، جوش و اصلیت، شاعرانہ مصوری، جوہر بلاغت اور انشا آفرینی الغرض وہ کونسے محاسن سخن ہیں جو ان کے ہاں بدرجہ اتم نہیں پائے جاتے۔ تجریدی تصوّرات کو جاندار شکل میں پیش کرنا اور ایمائی و اشاراتی اسلوب بیان کے ذریعہ اشیاء و خیالات کی ہوبہو تصویر کھینچ دینا اقبال کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ روحانیت اور رمزیت کے عناصر نے ان کے کلام میں ایک انفرادیت سی پیدا کر دی ہے۔ اقبال حقیقت و مجاز دونوں کو بے نقاب کرتے ہوئے اپنے آرٹ کے ذریعہ وجدان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے متمنّی ہیں وہ اشاروں ہی اشاروں میں حیات و ممات، تقدیر و تدبیر اور غم و مسرت کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کرتے ہیں۔ وہ محض شاعر ہی نہیں بلکہ رمز شناس حیات اور شارح کائنات فطرت بھی ہیں چنانچہ وہ خود ہی فرماتے ہیں: ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

اقبال ایک حقیقی آرٹسٹ تھے جنھوں نے اپنے شاعرانہ افکار سے زندگی کے جمود، بے حرکتی اور جہد و عمل کی کوتاہیوں کے طلسم توڑ کر انسان کو مرگ کے خوفناک تصوّر سے رہائی دلائی اور ایک نہایت خوشگوار مستقبل کی خبر دی۔ وہ مایوس نہیں۔ ان کے کلام میں مسرت، بصیرت اور کامیابی و کامرانی نظر آتی ہے: ؎

سفینہ برگ گل بنالے گا قافلہ مور ناتواں کا — ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

حیدرآباد کا ایک شاعر خاندان

حیدرآباد کو پانچسو سال سے اردو زبان کی آبیاری کا فخر حاصل ہے، بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی ادوار کے بعد آصفی حکمرانوں نے اردو کی سرپرستی فرمائی جسکے باعث اردو زبان کو آج جامعہ عثمانیہ کی صورت میں معراج نصیب ہو رہا ہے۔

قطب شاہی دور میں اردو یا دکنی شاعری کو جس طرح فروغ ہوا وہ اب پوشیدہ نہیں ہے، اس زمانہ کے بیسیوں شعراء اور ان کی مثنویوں اور کلیاتوں کا پتہ چل چکا ہے، اور اردو ادب میں ان کو خاص اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔

آصفی دور کے ابتدا ہی سے اردو زبان کی سرپرستی کا حق ادا ہوتا رہا، نہ صرف ہمارے بادشاہ بلکہ وزراء اور امراء نے بھی اردو کی سرپرستی کو اپنے لئے باعث فخر و امتنا تصور کیا، شعرا اور مصنفین کی قدردانی کی گئی اور صلہ دیگران کی ہمت افزائی ہوتی رہی نہ صرف شاعری کی ترقی ہوئی بلکہ آج سے سو سال پہلے علم سائنس کی کتابیں بھی اردو زبان میں منتقل ہو چکی تھیں۔ اسی قدردانی اور ہمت افزائی کا نتیجہ تھا کہ یہاں ہر زمانہ میں شمالی ہند کے اہل کمال شعرا اور مصنفین آتے اور دکن ہی کو اپنا وطن بنا لیتے رہے، ایک زمانہ تھا کہ مولانا سید غلام علی آزاد بلگرامی اپنے وطن کو خیرباد کہکر اورنگ آباد میں متوطن ہو گئے تھے، ان کے بعد صدہا علماء و فضلاء، شعرا اور ادیب حیدرآباد آئے اور حیدرآباد نے بھی ان کی پوری حوصلہ افزائی کی۔ ارسطو جاہ، شمس الامراء اور چندو لال کی داد و دہش اور اسد دلواری کے باعث کئی شعرا اور ادیب ان کے دربار میں باریاب تھے، جو اصحاب فن اور ارباب ہنر ان لوگوں کی سرپرستی کے باعث اردو زبان کی خدمت کر رہے تھے ان کا تذکرہ اس موقع پر طوالت کا موجب ہوگا، اس لئے اس کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔

مہاراجہ چندو لال جو پیشکار تھے اور دیوانی کے فرائض بھی انجام دیا کرتے تھے نہ صرف شاعروں کی قدر کرتے تھے بلکہ خود بھی شاداں تخلص کے ساتھ شاعری کرتے تھے اور اپنے وقت کے ایک بہترین شاعر تھے۔ ان کے دربار میں شمالی ہند کے کئی شعرا[۱] جمع تھے، جن میں نصیر، حفیظ، مشتاق، صفا، شہید وغیرہ مشہور ہیں، اس موقع پر ہم حضرت شہید کے خاندان کا تذکرہ کرتے ہیں جو چار پشت سے شعر و سخن کی خدمت کر رہا ہے۔ شہید کے فرزند شعلہ اور پوتے لمعہ اور پڑپوتے اور اب پرپوتے برق اردو کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔

شہید: میر احمد علی خان دہلوی، دہلی کے متوطن تھے، شاہ نصیر سے تلمذ حاصل تھا، سکندر جاہ ثالث (۱۲۱۸ھ تا ۱۲۴۴ھ) کے زمانہ میں حیدرآباد آئے، مہاراجہ چندو لال کے درباری شعرا میں شامل تھے، آصفجاہ رابع (۱۲۴۴ھ تا ۱۲۷۳ھ) نے آپکو امیر الشعرا کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اس طرح آپ دربار شاہی کے شعرا میں منسلک ہو گئے، منصب مقرر ہوا، ۱۲۹۳ھ میں شہید کا انتقال ہوا، شہید اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے، آپ کا کلام اپنی برجستگی، نازک خیالی اور لطافت کے لحاظ سے قابل قدر ہے ؎

کیا کمال انسان میں تھا عشق کی تاثیر سے	سجدہ گاہ مرشیاں مٹی کا پتلا ہو گیا
جو ہر تیغ ہے صاحب تمہارے آنے میں	تو باقی کچھ نہیں رہتا ہو جان جانے میں
پان کھا کر ہونٹ دکھلانے لگے	میں شہید اور رنگ تم لانے لگے
نہ فکر زر کی نہ پروائے مال و جاہ رہی	فقط نظارۂ یوسف بقا کی چاہ رہی
سیاہ بختیٔ مجنوں خوش آئی لیلیٰ کو	بنا کے آپ بھی اک خیمۂ سیاہ رہی
شہید فکر کرو ورنہ آگے مشکل ہے	جو ایسا عشق رہا اور ایسی چاہ رہی

شعلہ: میر کاظم علی خاں، شہید کے فرزند تھے، ۱۲۵۳ھ میں تولد ہوئے، اور اپنے والد کے ہمراہ بچپن میں حیدرآباد آئے، مدرسۂ دار العلوم میں تعلیم پائی، عربی اور فارسی میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے، شاعری میں اپنے باپ حضرت شہید سے تلمذ حاصل تھا بیسیوں اصحاب نے آپ سے استفادہ کیا ہے، اپنے وقت کے استاد سخن تھے۔ اپنے والد کی طرح فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے، فارسی اور اردو دونوں دیوان طبع ہو چکے ہیں۔

شعلہ کے زمانہ میں داغ کا طوطی بول رہا تھا، اسکول داغ کی پیروی کی جا رہی تھی۔ شعلہ کا کلام اپنے زمانہ کی تصویر ہے، خیالات کی بلندی، زبان کی صفائی، اسلوب بیان کی سادگی کے جوہر ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں ۱۳۳۰ھ میں شعلہ کا حیدرآباد میں انتقال ہوا، اردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

نصیر الدین ہاشمی

اگر دل بھی ہوتا اگر بار تو کیا ہوتا	دامن بھی قاتل کا دامان قضا ہوتا
وہ شوق شہادت ہے سو بار اگر مرتا	قاتل ہی کے جانب یہ لاشہ بھی پھرا ہوتا
اے ابر کرم گر تو رحمت سے برس جاتا	یہ مشت غبار اپنا ہرگز نہ اڑا ہوتا
سننے کہ نہ سنتے وہ کہنا تھا ہمیں لازم	آتے کہ نہ آتے وہ شکوہ تو کیا ہوتا
کسی کا شعلۂ رخسار شب کو جو چمکا	چھپایا شمع نے اپنا دہن لگن میں دہن
جو شب کو چہرہ مرے رشک ماہ کا چمکا	چھپایا ماہ نے اپنا دہن گہن میں دہن
وہ وضع اور وہ سج دھج خدا کی قدرت ہے	وہ چال اور وہ چلن اور بانکپن میں دہن

زبان خمسہ نظامی کی ہو گئی شعلہ
ہوا جو باز مراد وصف پنجتن میں دہن

---

[۱] :- مہاراجہ چندو لال کے دربار کے شمالی شعرا کے متعلق ہمارا ایک مضمون رسالہ ساقی دہلی بابت اگست ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا ہے۔

لمعہ:- میرزا ارتضیٰ علی نام اور لمعہ تخلص، شعلہ کے فرزند تھے، حیدرآباد میں ۱۲۸۷ھ میں تولد ہوئے، عربی، فارسی، اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ علم طب میں بھی دخل تھا، شاعری میں اولاً اپنے باپ سے تلمذ رہا، اس کے بعد نظم طباطبائی سے بھی اصلاح لی ہے، کئی ایک کتابوں کے مصنف تھے، عربی، فارسی اور اردو میں شعرگوئی کرتے تھے۔

لمعہ کا کلام نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے، ان کی نظمیں اخلاقی عنوان پر ہیں، کلام صاف ہے اور بحر لطافت اور رنگینی سے بھی خالی نہیں، وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ فن شعر سے بھی واقف تھے، اس لئے ان کا کلام عیوب شاعری سے پاک ہے، وہ بڑے نقاد تھے اور اپنے کلام کو بھی پوری تنقید کے بعد شائع کرتے تھے، کلام کا نمونہ یہ ہے:-

آج پھر جام عشرت بہار غواں گردش میں ہے ۔۔۔ میری نظروں میں زمین آسماں گردش میں ہے
واہ رے گردش تہ و بالا زمانہ ہو گیا ۔۔۔ واہ رے چکر زمین و آسماں گردش میں ہے
گردش قسمت کا رونا کس کے آگے روئیں ہم ۔۔۔ دور میں اپنے تو ہر سرو جواں گردش میں ہے

مسجد کو ہم نہ جائیں گے میخانہ چھوڑ کر ۔۔۔ پیماں شکن نہیں تھے نہ پیمانہ چھوڑ کر
میں چاہتا ہوں تیری پرستش کے واسطے ۔۔۔ معبد بناؤں کعبہ و بت خانہ چھوڑ کر
نظروں میں اب کسی کی سماتا نہیں ہوں میں ۔۔۔ گرتی ہیں بجلیاں مرا کاشانہ چھوڑ کر
وہ قال ہے یہ حال ہے، وہ نقل ہے یہ اصل ۔۔۔ کیوں غیر کی سنو مرا افسانہ چھوڑ کر

بھٹکیں اس راہ سے عشق ستم ہے ۔۔۔ نہ تھی جب ابتدا لوح و قلم کی
ترے کوچے کو جب مسکن بنایا ۔۔۔ زیارت کرچکے دیر و حرم کی

بھریں آہیں تو شعلے اور بھڑکے قلب سوزاں میں ۔۔۔ بہے آنسو تو روغن پڑ گیا سرو چراغاں میں
اڑے گا رنگ رُخ گل بنگ بن کے گل آخر ۔۔۔ ہم اے لمعہ سبق عبرت کا پڑھتے ہیں گلستاں میں

زنگی اور آئینہ

کسی زنگی نے اک آئینہ رستے میں پڑا پایا ۔۔۔ نظر آئی جب اس میں شکل زشت اسکی تو گھبرایا
وہ چپٹی ناک وہ نتھنے کشادہ ہونٹ وہ موٹے ۔۔۔ وہ چوڑے دانت جن پر ہو گماں غول بیاباں کا
ہوئیں یہ دیکھ کر غصے سے اسکی لال لال آنکھیں ۔۔۔ تھا کالا کوئلہ پہلے بنا اب سرخ انگارا
لگا مار سیہ کی طرح کھانے پیچ و تاب اس دم ۔۔۔ برائی اپنی صورت کی قصور آئینہ کا سمجھا
رہی باقی نہ تاب ضبط جب اس کو تو جھنجھلا کر ۔۔۔ زمیں پر آئینہ ٹپکا چڑھا کر ناک بھوں بولا
اسی سے تو کسی نے راستے میں اسکو پھینکا ہے ۔۔۔ نظر آتی ہے اس میں کیا بری ہیئت برا چہرا

جو اپنے عیب سے غافل ہیں انکی ہے یہی حالت
خفا اے لمعہ ہوں اس سے بتائے عیب جو ان کا

رعد:- حکیم میرزا نذر علی رعد، شعلہ کے چھوٹے فرزند لمعہ کے بھائی تھے، حیدرآباد میں تولد ہوئے، نامور علماء سے درس لیا چنانچہ شمس الملک آغا شوستری سے بھی استفادہ کیا تھا، عربی، فارسی، اردو کے علاوہ علم طب اور ریاضی میں کامل دسترس تھی، تصنیف اور تالیف سے پوری دلچسپی تھی، ان کی طویل فہرست ہوسکتی ہے جو نظم اور نثر پر مشتمل ہیں، قصص العلماء کا آپ نے ترجمہ کرکے شائع کیا ہے، دیوان مرزا محمد مجذوب تبریزی کو جو ایک نایاب دیوان تھا آپ نے مرتب کرکے شائع کیا ہے، تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ علم ریاضی میں نادر الحساب کے نام سے کئی رسالے شائع کئے ہیں۔

اپنے باپ دادا کی طرح شاعری سے شغف رہا، باپ سے تلمذ حاصل تھا۔ اس کے بعد نظم طباطبائی سے بھی اصلاح لی ہے۔ اردو اور فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کا کلام ایک استاد فن کا کلام ہے، بلند پروازی، صفائی، رنگینی، ندرت سب کچھ انکے یہاں پائی جاتی ہے زیادہ تر غزل ہی موزوں کرتے تھے۔

عرصہ دراز تک کلیشن واڑی پر حکمت کرتے رہے، ماہ صفر ۱۳۶۳ھ میں انتقال ہوا، رعد کی قابلیت کے متعلق ان کے استاد علامہ سلطان العلماء ادیب الدولہ سناء الملک نے اپنے ایک قطعہ میں تحریر فرمایا ہے:-

خوش شاعر و جد و باب شاعر ۔۔۔ پر گشتہ ز آفتاب خانہ
گر قافیہ نشد غلاست ۔۔۔ دعواش خدائی دار شانہ

نادر خوان کہ ہستی امید کہ نادر زمان تیز گردی"

ایک بڑی ہستی کی پیشگوئی غلط نہیں ہوسکتی تھی، حضرت رعد اپنے زمانہ کے استاد سخن تھے، انھوں نے اردو کے مشہور اساتذہ کے رنگ میں اپنا کلام موزوں کیا ہے اور اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ذیل میں ہم رعد کا مختصر کلام پیش کرتے ہیں۔ مثلاً خواجہ میر درد کا رنگ ؎

طالب تو بے شمار ہیں میرے سوا مگر ۔۔۔ مطلوب دوسرا نہیں تیرے سوا مجھے
حشر برپا نقاب سے بھی ہے ۔۔۔ اور کیا ہو اگر اٹھائے نقاب

حال دل سے وہ میرے واقف ہو ۔۔۔ حاجت نامہ و پیام نہیں
جو کرنا ہے وہ کرلے آج نادان ۔۔۔ نہیں معلوم کل کی کیا خبر ہے

مومن کا رنگ ملاحظہ ہو ؎

نہ کر خیال کبھی رعد آشنائی کا ۔۔۔ اگر کیا ہے تو صدمہ اٹھا جدائی کا
اے اجل ابتک امید وصل میں جیتے ہیں ہم ۔۔۔ ورنہ مرنے کے لئے یہ درد فرقت کم نہ تھا
باوفا ہو کر بے وفا لیکن ۔۔۔ دوست آخر عدو سے بہتر ہے
دل گیا جان گئی سب ہوئے جہاں رخصت ۔۔۔ نگئی پر نہ گئی تو شب فرقت نہ گئی

غالب کا رنگ یہ ہے ؎

حالت یاس میں تسکین دل زار تو ہے ۔۔۔ نہ ہی وصل مگر وصل کا اقرار تو ہے
ہوں بے خودی شوق سے سوائے محبت ۔۔۔ کرتا ہوں نہاں راز تو ہوتا ہے عیاں اور
وہ ذوق تماشہ ہے کہ بسمل ہی رہوں میں ۔۔۔ یہ زخم کی لذت ہے کہ تڑپا نہیں جاتا
اہل دلا پہ گرتی ہے برق بلائے ناز ۔۔۔ لیکن مستلزم صبر طلب کا رو دیکھ کر

داغ کے رنگ میں رعد کا کلام ملاحظہ ہو ؎

رعد اپنی بات کی کیا بات ہے ۔۔۔ وہ نہیں سنتے کہے جاتے ہیں ہم

وہ مجھ سے کہتے ہیں شب رعدؔ تاؤ تم تنہا　　مگر نہ ساتھ کبھی دل کی آرزو آئے

میں نے مانا کہ تم مسیحا ہو　　یہ تغافل تو زہر قاتل ہے

ہزاروں وعدے ہیں لیکن وفا کا نام نہیں　　تمہیں کہو کہ تمہارا کچھ اعتبار بھی ہے

مرحوم ریاض خیرآبادی خمریات کے امام تصور کئے جاتے ہیں، رعدؔ کے اشعار میں بھی خمریات کے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

ساقیا دے شراب کیا جانے　　زاہد خشک فیض عالم آب

تائب تو ہوں شراب سے پر شیخ کیا کروں　　آئی بہار اور طبیعت مچل گئی

مست ہوں بادۂ محبت سے　　یہ بھی مے ہے مگر حرام نہیں

تو جانتا ہے خود کہ درِ توبہ بانہ ہے　　کیوں بند محتسب درِ مے خانہ ہوگیا

رعدؔ کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شب فراق میں امید وصل یار تو ہے　　خزاں میں بھی خبرِ آمد بہار تو ہے

ہائے کیا خوب عیادت ہوکہ وہ کہتے ہیں　　قابل دید نہ تھا حال، مگر دیکھ لیا

خرق کامل ہو تو رہبر کی نہیں ہے حاجت　　رہ مقصود کا ملتا ہے پتا آپ سے آپ

تارکِ دنیا بھی ہے زاہد تو دنیا کے لئے　　یا دحب علم و ہنر اس کے سوا کچھ بھی نہیں

اس مختصر انتخاب سے بھی رعدؔ کی شاعری کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

برقؔ :- اب ہم اس خاندان کے موجودہ نوجوان شاعر برقؔ کا تذکرہ کرتے ہیں میر کاظم علی نام اور برقؔ تخلص ہے، رعدؔ کے فرزند ہیں ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد میں تولد ہوئے، ماں کا سایہ بارہ سال کی سن میں سر سے اٹھ گیا، باپ کی ملازمت اضلاع سے متعلق رہی، اس لئے برقؔ کو اعلیٰ تعلیم میسر نہ ہوئی لیکن خاندانی ماحول، ذاتی شوق کے باعث فارسی اور اردو میں کافی مہارت حاصل کرلی ہے، علم حکمت بھی تحصیل کیا ہے۔

برقؔ کی شاعری بچپن سے شروع ہوئی ہے، بارہ سال کی عمر میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور نہ وہ اکتسابی شاعر ہیں، خاندانی میراث کے طور پر قدرت نے ان کو فطری شاعر پیدا کیا ہے، اب تک ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "عقل و جنون" میں مختلف عنوان سے پُر نظمیں شامل ہیں، اور دوسری کتاب "کنول" سے موسوم ہے "برشگال" اور نوبہار کے عنوان کے تحت مختلف نظمیں شریک ہیں، برقؔ کے کلام میں خرافات اور ہذیانات نہیں ہیں، ان کا کلام شاعری کے جدید رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ مزدوروں کی فریاد، غریبوں کا درد، مظلوموں کے آنسو، بہار کی نیرنگی، مناظر قدرت کی دلکشی اور دلفریبی سے ان کا کلام معمور ہے، برقؔ کے کلام میں دلی تڑپ اور مقدس جذبہ موجزن ہے، بقول حضرت جوشؔ "برقؔ کے سینے میں ایک ایسی چنگاری رکھی ہے جو ایک نہ ایک دن شعلہ بن کر رونما ہوگی"

اگر مختصر طور پر برقؔ کے کلام کی تعریف کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت جوشؔ کے رنگ میں اسقدر کامیاب لکھ جاتے ہیں کہ کلام جوشؔ کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔

برقؔ کے کلام کے متعلق زیادہ اظہار خیال کے بجائے ان کا کلام پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ ناظرین خود اندازہ کرلیں کہ برقؔ کے کلام کو کیا رتبہ دیا جا سکتا ہے :-

دولت کی پیشانی کا داغ

نصف شب کو کل نئے پل پر ہوا میرا گذر　　نخت اتری پڑ رہی تھی چاندنی تھی جلوہ گر

جا رہا تھا رائیگاں اس طرح نورِ ماہتاب　　جس طرح بے کیف کٹ جاتا ہے مفلس کا شباب

راستہ چلتا ہوا کوئی نہ آتا تھا نظر　　چل رہا تھا صرف خاموشی کا لشکر راہ پر

آج کو ٹھٹھر رہی تھی سرد ندی کی ہوا　　نج رہے تھے دانت میرے جسم سارا برف تھا

دفعتاً کیا دیکھتا ہوں پل پہ اک لیٹا ہے فقیر　　زر کا ٹھکرایا ہوا، زندانِ عسرت کا اسیر

سو رہا ہے اک پھٹی باریک چادر اوڑھ کر　　پاؤں کو نزدیک کھینچے ہاتھ رکھے زیر سر

دیکھ کر غربت کا یہ عالم یہ عبرت کا سماں　　نم ہوئیں آنکھیں مری اٹھنے لگا دل سے دھواں

نرم نازک بستروں پر سونے والے ہیں کدھر　　آئیں دیکھیں بے کسی کا یہ مرقع اک نظر

صرصرِ افلاس میں ہے جھلملاتا اک چراغ
ننگ اہل عیش کا، دولت کی پیشانی کا داغ

"مزدور حسینہ" ایک طویل نظم ہے اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

مانگ میں ہے تیری صندل کے عوض گرد و غبار　　سر پہ پھولوں کے عوض یہ سنگ سیلو کا ہے بار

دھوپ سے کملا رہا ہے تیرا چہرہ نازنیں　　ہے عرق میں تر عوض چندن کے چاندی سی جبیں

مد بھری آنکھوں میں اور یہ بے کسی کا تو تیا　　تیری چشم مست میں کاجل جو گھلتا خوب تھا

جم رہی ہیں پپڑیاں تیرے لبوں پر دھوپ سے　　خوب جم سکتی تھی مستی پتلے ہونٹوں پر ترے

تیرے ہاتھوں پر ہیں پتھر کی خراشیں جا بجا　　گورے ہاتھوں میں ترے مہندی جو رچتی خوب تھا

سچ ہے تیرا حسن مزدوری کے قابل تو نہ تھا　　لیکن اس کا کیا علاج اے پیکر صدق و صفا

تیرا بس کیا ؟ گو کہ : نیلا ہے تری دار المحن
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

اے مرے مفلس وطن ہندوستاں ہندوستان　　سخت حیرت ہے تجھے کہتے ہیں کیوں جنت نشاں

چلچلاتی دھوپ میں حسن اور مزدوری کرے　　سر پہ پتھر ڈھوئے دن بھر چند پیسوں کیلئے

جنکے نازک ہاتھ ہوں مہندی رچانے کیلئے　　حیف وہ مجبور ہو پتھر اٹھانے کے لئے

جنکے تلوے ہوں مناسب فرش قالیں کیلئے　　حیف وہ سر پا برہنہ سنگریزوں پر چلے

سود خواروں سے غریبوں پر یہ دنیا تنگ ہے
ہند میں اہل وطن سرمایہ داری ننگ ہے

موجودہ دور کے فیشن کا نقشہ "عابد روڈ" کے عنوان سے خوب کھینچا ہے ملاحظہ ہو ؎

لگائے آج اس بازار کے شاعر نے بھی چکر　　ٹہلتے ہیں جہاں تہذیب کے فرزند ننگے سر

اسی بازار میں سب جسکو عابد روڈ کہتے ہیں　　جہاں بہرِ دپئے تقلید کے طوفاں میں بہتے ہیں

وہاں اے ہمنشیں تو نے شاعر نے کیا دیکھا
ہماری جوہ غفلت کے ہوس کا دیوتا دیکھا
گھٹا چھائی ہوئی تھی عیش کی غفلت برستی تھی
ہر اک رخ سے ہویدا ایک شان فاقہ مستی تھی
وہاں ہر کرنی چہرے غازہ زن ہونا نمایاں تھا
وہ اندھی گردوں کی وہ چہرہ کا رنگ کا طوفاں تھا
خراماں ناز سے تصنیفِ اوفائے کے شیدائی
بصد انداز محبوبی بصد اغماض رعنائی
لباسِ مغربی تن پر زباں پر گفتگو ایسی
جسے اردو ہی کہہ سکتا ہے کوئی ورنہ انگریزی
نظر نیچی لبوں پر مسکراہٹ چال اٹھلائی
نکالے مانگ سر پاؤں تک نمائشت چھائی
محبت غرقِ حیرت تھی شرافت خستہ و بندان تھی
عجب منظر تھا روحِ ایشیا سر در گریباں تھی

جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ کیا گیا ہے، برقیؔ کی ہمہ پیر تصنیف "سنبل" میں "برشگال" کے عنوان کے تحت کئی نظمیں موسم بارش کے متعلق ہیں جن میں سے ہر ایک نظم اپنی دلآویزی اور دلکشی میں ایک سے بڑھ کر ایک ہے، بخوفِ طوالت ہم صرف ایک نظم کے چند بند یہاں پیش کرتے ہیں جو "برکھا کے نظارہ" کے نام سے لکھی گئی ہے :-

مدہوش، بلانوش گھٹا جھوم رہی ہے
کلیوں کا ہر ناز سے منہ چوم رہی ہے
بھونروں کی مگن مست صدا گھوم رہی ہے
کوئل کی ملاریں ہیں پپیہے کے کدارے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

سُرخی یہ شفق کی یہ گھٹاؤں کی سیاہی
رنگین دھنک یہ تری قدرت ہے الٰہی
یہ سات جدا رنگ بھلے لگتے ہیں کیا ہی
سورج کی شعاعوں نے عجب رنگ نکھارے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

یہ ٹھنڈی ہوا مست گھٹا ہلکی پھواریں
یہ آم کے باغات یہ جھولوں کی بہاریں
یہ قہقہے، یہ شوخیاں، یہ دھن یہ ملاریں
مرنے کے سامان تو جینے کے سہارے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

کاکل ہے کہ یہ کالی گھٹا سر پہ کھڑی ہے
ناسفتہ یہ موتی ہیں کہ پانی کی جھڑی ہے
یا مانگ میں دلہن کی یہ موتی کی لڑی ہے
لائے ہیں جسے بیاہ کے منڈپ میں سنوارے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

ہلکی ہوئی بہکی ہوئی سرشار ہوائیں
گاتی ہوئی ہنستی ہوئی گلبار ہوائیں
پُر کیف طرب خیز طرب کار ہوائیں
پیغامبر آمدِ فصلِ بہارے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

ہنستے ہوئے یہ کھیت کسانوں کے یہ اوپل
یہ دھان لہکتے ہوئے اڑتی ہوئی چڑیاں
کھیتوں میں مگن پھرتے ہیں گنے گتے دہقاں
کس طرح سے پھولے نہ سماتے ہیں بچارے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

فردوس نظر ہے کہ یہ پھولا ہوا جنگل
بستی میں ہیں رنگ رلیاں تو جنگل میں ہے منگل
پودے یہ مچلتے ہوئے گاتی ہوئی کوئل
موروں کا یہ رقص اور یہ ہرنوں کے ترارے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

بوندیں یہ ٹپکتی ہیں درختوں سے زمیں پر
یا بال جھٹکتی ہے کوئی شوخ نہا کر
یہ برق ہے یا ابر کی چلمن کو ہٹا کر
کرتی ہے کوئی حور بصد ناز اشارے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

یہ تتلیاں اڑتے ہوئے جادو کے چمن ہیں
یہ بوٹیاں چلتے ہوئے بالعل یمن ہیں
یہ صبح کو شبنم ہے کہ دریائے عدن ہیں
یہ شام کو جگنو ہیں کہ چاند اور ستارے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

یوں بدلیوں میں رنگ بدلتے ہیں شفق کے
تو یہ ہے کہ قالین یہ بنتے ہیں جلا کے
آکاش پہ یوں دوڑتے ہیں ابر کے تختے
کشمیر کی جھیلوں میں رواں جیسے شکارے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

"پی پی" سے پپیہے کی دلوں کا یہ اُمڈنا
ہے نام تمنا کا ہر اک دل میں مچلنا
برسات کے یہ روپ مصور سے کھنچیں کیا
شاعر کے سوا کون یہ تصویر اتارے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

سوویت سینما

جنگ ختم ہونے کے ساتھ سوویت سینما کا ایک خاص پہلو بھی ختم ہوگیا۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس دوران میں پوری فلمی صنعت صرف ایک ہی مقصد یعنی قوم کی جنگی کوششوں کے لئے مخصوص تھی۔ اور اگرچہ اس جنگ کے دوران میں تیار ہونے والے فلم بذات خود اس صنعت کی کسی اہم ترقی کو نمایاں نہیں کرتے تاہم وہ رجحانات جو جرمن حملے سے قبل اپنا رنگ جمانے لگے تھے اور جن میں جنگ چھڑ جانے کے باعث شروع میں رخنہ پیدا ہوگیا تھا، زیادہ واضح طور پر ظہور میں آنے لگے اور یہاں تک کہ جنگ ختم ہونے کے وقت تک روز افزوں ترقی پاتے رہے۔ ایسے رجحانات کا ان ترقیوں سے قریبی تعلق ہوتا ہے جو ایک قوم کے خیالات اور اس کی زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ پروفیسر ایسن شٹین کے قول کے مطابق ایک قوم اور اس کے فنون لطیفہ کے مابین ایک قسم کی تعمیری یگانگت پائی جاتی ہے اور چونکہ سوویت حکومت کے نقطۂ نظر سے جملہ فنون لطیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت سینما کو دی گئی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ سوویت فلموں میں جو ترقیاں خاص طور پر نمایاں ہوئیں وہ محض کھیل کود کے دائرے سے کہیں زیادہ آگے بڑھی رہیں۔

سوویت سینما سوویت حکومت کے ساتھ ساتھ وجود میں آیا اور اس نے عہد ماضی سے کسی قسم کی روایات ورثے میں نہیں لیں۔ اس کا اولین مقصد صرف یہ تھا کہ وہ دور ماضی کے تاریخی واقعات کو پیش کرے اور اسی لئے عرصۂ دراز تک واقعیتی اثرات خیالی فلموں پر چھائے رہے۔ شروع دن سے عام لوگ ایسے فلموں کی خصوصاً ایسن شٹین کے فلموں کی تیاری میں حصہ لینے کے عادی رہے جن میں جم غفیر کو ہیرو کی اہمیت دی گئی۔ آجکل فلمی نگار خانے تمام سوویت یونین میں پھیلے پڑے ہیں۔ یہ صنعت، فلموں کی تیاری سے لے کر ان کی نمائش تک یکساں طور پر ماسکو کی آل یونین سینما کمیٹی کے قبضے میں ہے۔ وہی خاکہ بناتی اور پورا اہتمام کرتی ہے۔ لیکن ماسکو اور لینن گراڈ کے بڑے نگار خانوں کے علاوہ خبروں اور واقعاتِ عالم سے متعلق فلم بنانے والے اسٹوڈیو پنج سالہ منصوبے کے سلسلے میں کیف، منسک، تبلیسی اور الما آتا جیسے چھوٹے شہروں میں تعمیر کئے گئے مختصر یہ کہ قومی جمہوریت کے تمام بڑے بڑے مرکزوں میں ان کی بنا ڈالی گئی۔ اس طرح عام لوگوں کے تعلقات سینما کے ساتھ زیادہ وسیع ہوتے چلے گئے۔

سی۔ڈی۔لا۔روش

اور چونکہ قومی زندگی کے جملہ پہلوؤں کو پوری ترقی دینے کے خیال سے اس پنج سالہ منصوبے کے تعمیری دوران میں سوویت فلموں کی توجہ ایسے موضوعات پر مرکوز رہی جو بحیثیت مجموعی تمام قوم کے لئے مفید ہوں۔ خواہ وہ موضوعات واقعات حاضرہ سے متعلق ہوں، خواہ تاریخی یا کلاسیکی ہوں۔ لہٰذا فلم کے نفس مضمون کو اتنی ہی اہمیت دی گئی ہے جتنی اس کی ظاہری تشکیل کو دی جاتی ہے اور اس طرح کسی ایسے موضوع کو پردۂ فلم پر پیش نہیں کیا تاوقتیکہ یہ تسلیم نہ کر لیا گیا کہ وہ سماج کے لئے مفید مطلب ہو سکتا ہے۔ نیچر فلم کی دنیا میں سب سے پہلا اہم قدم واقعات حاضرہ کے بکھرے ہوئے تاریخی شیرازے کو اکٹھا کرنے کے سلسلے میں اٹھایا گیا یا ایسی کہانیوں کے رنگ میں یہ دکھایا گیا کہ وہ حیات انسانی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ (ایسن شٹین کا "جنگی جہاز پوٹمکن" یا پدوفکن کا "ماں" قابل ذکر ہیں) نیز بولتی تصویروں کے ایجاد ہونے کے بہت عرصے بعد تک سوویت سورماؤں کا کردار نہایت واضح اور نمایاں خدوخال میں پیش کیا جاتا رہا جن میں ایک ملنگ اُنہی افراد کی سادگی پائی جاتی تھی۔ ایسے فلموں کی بے پناہ جاذبیت دلچسپ منظر و سامانِ آرائش، سچی اداکاری و لطیف کہانیوں میں پنہاں ہوتی تھی۔ اور پھر افراد تماشہ بھی جانے پہچانے ہوتے تھے۔ یہ خصوصیات محض اتفاق سے پیدا نہیں ہوئیں۔ سوویت آرٹ نے خوب غور و فکر کے بعد خود ستائی کا مظاہرہ کرنے والی انفرادیت کو ترک کر دیا تھا۔ ایک ایسی قوم کے عادات و اطوار میں سطحی نفسیات کو کوئی درجۂ قبول حاصل نہیں ہو سکتا جو سماج کی زندگی سدھارنے پر تلی ہو۔ لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ تمام قوم چند مخصوص افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ یا نامور ہستیاں بذاتِ خود کوئی انفرادیت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ فلمی خیالات کی ترقی کے سلسلے میں دوسرا قدم نئے ہیرو کی تلاش میں اٹھایا گیا۔ اس طرح بہت سی شاندار کامیابیاں حاصل ہوئیں مثلاً واسیلیف برادران کا بنایا ہوا سرگذشتی فلم "چپائیف" یا دونسکوئی کا وہ فلم جس میں گورکی کی زندگی کے تینوں پہلو پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں اعلیٰ اداکاری کے ذریعہ حقیقتاً حسین کرداروں کی تخلیق ممکن کی گئی ہے۔

۱۹۳۰ء کے ختم ہونے تک سوویت سینما کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہوگیا تھا بہت بڑے پیمانے پر دیہاتی زندگی کی عکاسی ہونے لگی۔ اس طرح اداکاروں اور ہدایت کاروں کی ایک نئی نسل وجود میں آئی نیز ہمیشہ اپنا رنگ جمانے والی نکتہ چینی با وجود ضرورت سے زیادہ حقیقت پسندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی رہی۔ اس ضمن میں دوسرے لوگوں کے علاوہ پدوفکن کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لہٰذا اشتراکی حقیقت پسندی کے طور پر سوویت آرٹ کے بنیادی اصول زیادہ مستحکم ہوتے چلے گئے۔ اور بلا شبہ حاصل کی ہوئی فلمی تکنیک کو تقویت اور زیادہ شاندار طریقے پر پیش کرنے کا صحیح وقت یہی تھا۔ لیکن اگر سوویت سینما کی ترقی میں کسی قسم کی یکسانیت یا جمود نظر بھی آجائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ اس فنِ لطیف کی پچیس سالہ تاریخ میں بہت سے تجربات نہیں ہوتے رہے۔ اس کے برعکس نہایت سرگرم عمل کا مظاہرہ ہوتا رہا جس کی بنا پر ایسی مسلسل نئی نئی کوششیں ہوتی رہیں جس کے نتیجے کے طور پر دوژینکو کا بنایا ہوا "دھرتی" نامی جیسا نایاب فلم تیار ہوا۔

مذکورۂ بالا خاکے کے مطابق نہایت سرعت و تیزی کے ساتھ بعض ایسی ترقیاں دورانِ جنگ میں رونما ہوئیں جن کے طفیل ایک نئی منزل مقصود کی طرف ہر قسم کی آمیزش کے دوش بدوش گامزن ہونا ممکن ہوگیا۔ جرمن حملے نے مادی اور اخلاقی دونوں اعتبا

سے فلمی صنعت کو ایک زبردست جھکولا دیا۔ مغربی جمہوریتوں کے تمام بڑے بڑے نگار خانے جن میں ماسکو کا سب سے بڑا نگار خانہ بھی شامل ہے منتقل ہو کر وسطی ایشیا میں پہنچ گئے البتہ خبروں سے متعلق فلم بنانے والے دستوں نے سب سے پہلے تصاویر کی تیاری شروع کی۔ انھوں نے لیے معرکۂ آزادی و اتحاد کی عکاسی کی جو ہولناک ہونے کے ساتھ ساتھ صد درجہ اہم بھی تھے۔ ان موقعوں پر مناسب یہی سمجھا کہ انھیں دستاویزی فلموں کی طرح بنایا جائے۔

اس سلسلے میں "جنگ کا ایک دن" ایک ایسا اعلیٰ اور طویل دستاویزی فلم ہے جسے عین محاذِ جنگ پر پہنچ کر ایک سو ساٹھ کیمرے والوں نے کھینچا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور ڈرامہ نگار کے سیمونوف نے وہی خیال ظاہر کیا جس کی توقع جنگی فلموں کے سلسلے میں عوام کو ہو سکتی ہے کہ فنِ لطیف کو ہمیشہ آئینۂ صداقت ہونا چاہئے خصوصاً جنگ کے دوران میں اسے صداقت سے قریب تر ہونا چاہئے۔ فلم بنانے والے دو نہایت اہم حقیقتیں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اول قوم کی روحانی طاقت اور دوسرے اپنی فتح پر پورا پورا ایمان۔ اسی طرح وہ جنگ کی ہولناکی اور دہشت کو واضح کرنے میں کامیاب رہے ہیں "سرخ فوج کے سپاہی اور کارخانوں کی لڑکیاں یکساں طور پر پتہ لگا سکتی تھیں کہ اس فلم میں کسی حقیقت کے چہرے پر نقاب نہیں ڈالا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر ان کی قربانیوں کو اچھی طرح تسلیم کیا گیا ہے۔ تمام اہم محاصروں، فوج کے اعلیٰ افسروں، بڑے بڑے سیاسی جلسوں اور موت کے ان مرکزوں کے جو اہلِ جرمن نے نصب کئے ہوئے علاقوں میں چھوڑ گئے تھے نیز خارکوف میں جنگی مجرموں کے سرِ عام ہونے والے مقدموں کے غرض ہر موقع و محل کے تاریخی فلم کھینچ ڈالے گئے۔ اور انھیں دیکھ کر تسلیم کرنا پڑا کہ یہ جنگی فلم خود میدانِ جنگ کی طرح موثر اور ہولناک ہیں۔

لیکن ایسے تمام مجتمع واقعات اور حیاتِ انسانی پر ان کے گہرے اثرات کی ترجمانی صرف فیچر فلموں کے ذریعے ممکن ہو سکتی ہے اور یہاں دورِ گذشتہ کی طرح پہلے اصل تمثیلی کرداروں کو چند مخصوص افراد تک محدود کیا گیا مثلاً ڈونسکوی کے فلم "قوسِ قزح" میں افسران کا جوشِ عمل حاوی رہا اور اسی طرح لیوکوف کے فلم "دو سپاہی" میں سرخ فوج کے سپاہیوں کی بہادری اور شجاعت کے سوا کچھ پیش نہ کیا جا سکا۔ ان کرداروں اور ان کہانیوں کو اپنا اصل مقصد حاصل ہو گیا کیونکہ انھوں نے نہایت صداقت کے ساتھ مسائلِ حیات کے طور پر ان فطری خصائل و عادات کو پیش کیا جو ایک دو نہیں ہزاروں افراد کا حصہ ہیں۔ اسی لئے سوویت نقادانِ فن نے ان کی تعریف و توصیف کی۔ اور خوب سراہا۔ تاہم ضرورت ہوئی کہ "نئے انسان" کے کردار کی وضاحت کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ تمام قوم کے جوش و خروش اور مختلف افراد کی باہمی کشمکش کو بے نقاب کیا جائے۔ یہ آواز زیادہ زور و شور کے ساتھ فلمی دائروں میں بلند ہونے لگی چنانچہ "نیا استاد" اور "نقاب پوش" کے ہدایت کار ایس گراسیموف نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے جنگجو بہادر کی ایک سوانح حیات ہے، ایک پیچیدہ مگر مفصل زندگی اور ان میں سے ہر ایک مختلف راستوں سے آگے بڑھنے کا متمنی نظر آتا ہے۔"

عین لڑائی کے دوران میں ماسکو میں ایک علیحدہ نگار خانہ مسودہ نگاری کے سلسلے میں قائم کیا گیا تاکہ ان نوجوانوں کی ہمت افزائی کی جا سکے جن میں منظر نگاری اور افسانہ نویسی کا جوش لہریں مار رہا ہو۔ ۱۹۴۴ء میں شہر بدر کئے ہوئے نگار خانے اپنے اپنے مقامات پر واپس آ گئے اس لئے کام اور بھی زیادہ تیزی پکڑنے لگا۔ نیز سوویت نقادوں نے غور کیا کہ بعد میں بننے والی کئی تصویروں میں کردار نگاری بالکل ہی نئے اور تحقیقی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ اس ضمن میں گراسیموف کا فلم "بڑا عالم" اور پائیریف کے فلم "چھ بجے شام" اور جنگ کے بعد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اسی اثنا میں چند تاریخی تصویریں بھی تیار ہوتی رہیں۔ مثلاً وی پیتروف کے فلم "کوتوسوف" پر جہاں تصدیق نہ صرف مورخین نے ثبت کی بلکہ اکادیمی کے ارباب حل و عقد اور فلمی نقادوں نے بھی اسے سراہا۔ پیتروف وہی ہدایت کار ہے جس نے "پیٹر اول" بھی تیار کیا تھا پھر ایسن سٹین کے "خوفناک ایوان" کی باری آئی جو بہت بڑے پیمانے پر بنا ہوا ایک خاص تاریخی فلم ہے جس میں زار کے کردار کی ترجمانی کرتے ہوئے دکھایا گیا کہ روسی تاریخ میں اس کے عہدِ حکومت کی کس قدر اہمیت تھی۔

اگر جنگ اور حب الوطنی کے فلم سینما کی دنیا پر حاوی رہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عام مذاق کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ گراسیموف نے دیرینہ مخالفتوں کا لفظی فیصلہ ان الفاظ میں تلملند کیا: "دورانِ جنگ میں ہر اس چیز کا وجود جو فنونِ لطیفہ کے ضمن میں آ سکے جائز سمجھا جا سکتا ہے" تاہم الیگزنڈروف کے "والگا والگا" اور پردُمانوف کے "سجارا میں خوش فعلیاں" جیسے دلچسپ مزاحیہ فلموں سے قطع نظر بہت کم فلم ایسے تھے جو اس ضمن میں لائے جا سکتے تھے۔ نیز سوویت فلمی نگار خانوں کی کمی ایک دیرینہ مسئلہ ہے جو کبھی حل نہ ہو سکے گا۔

مزاحیہ نگاروں کی ہمت افزائی کرنے کے لئے ۱۹۴۴ء میں مزاحیہ ڈراموں کا ایک مقابلہ کیا گیا جو مسودہ نگاری کے نگار خانے کے زیرِ اہتمام عمل میں آیا۔ ۱۹۴۵ء کی فلمی تجاویز مرتب کرتے وقت زیادہ زور اسی پر دیا گیا کہ مزاح نگاری کو ترقی دی جائے۔ ایسی تجاویز دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ جوشِ عمل بھی پیدا کر سکتی ہیں۔ اس ضمن میں بھی لڑائی کے موضوعات اور تعمیرِ نو کے فلم اس صنفِ لطیف پر حاوی رہے۔ اور تاریخی موضوعات کو بھی اہم مقام نصیب رہا۔ تاہم سرگذشتی مطالعوں، مزاحیہ ڈراموں اور ادبِ عالیہ کو نئے رنگ میں پیش کرنے کی روش سے بھی غیر متوجہ نہ رہا گیا۔

مختصر یہ کہ سوویت فلم ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ فلمی اداروں کے کارکن جنہوں نے گذشتہ چند سال میں کافی تجربہ حاصل کر لیا ہے نئے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس طرح صنعتِ فلم سازی کی توسیع و ترقی میں جو جنگ کے باعث ایک لحاظ سے رک گئی تھی اور دوسرے لحاظ سے جس میں اضافہ ہوا تھا زبردست سرگرمیاں دکھائی جا رہی ہیں۔ عنقریب مکمل ہو جانے والے فلموں کو دیکھ کر وہ تماشائی بھی جو سوویت یونین کی حدود سے باہر ہیں سوویت قوم کی بابت اچھی رائے قائم کر سکیں گے اور انھیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ پہلے کے مقابلے میں اب اس کی بہت سی باتیں مشترک الخیال ہیں۔

جنگل کی شاہزادی

افسانہ

"یہ منثور تضمین" شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی رومانی نظم "جنگل کی شاہزادی" کے اشعار سے استفادہ کرتے ہوئے لکھی گئی ہے جو "روحِ ادب" میں شائع ہوئی تھی۔ اب جوش صاحب نے ترمیم و اضافہ کرکے اسے "نقش و نگار" میں شائع کیا ہے، مگر میرے پیشِ نظر وہی پرانا نسخہ ہے۔ "مف"

فضل حق قریشی دہلوی

یہ پروازِ تخئیل کی رفعت پذیری ہے نہ افسانہ خواں طبیعت کی جدّت طرازی بلکہ ایک سرگذشتِ حیات ہے ایک روداد قلب۔ میرے دکھے ہوئے دل کی داستان کہا جائے تو بجا ہے، فرضی کہانی سے تعبیر کیا جائے تو غیر مناسب۔ موسمِ سرما کا آغاز تھا اور پُر لطف حصۂ ارض پر ریل کا سفر ؎

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں
ایک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

دل مسرت سے معمور تھا، دماغ کیفِ شادمانی میں ڈوبا ہوا۔ طبیعت کی شگفتگی بجا۔ بے خودی پہنچ چکی تھی بڑے خواجہ کے دربار میں نذرِ عقیدت پیش کرکے وطن واپس جا رہا تھا۔ اس بابرکت مقام کے مقدس ماحول سے متاثر ہوکر کچھ اشعار موزوں کر لئے تھے۔ انہی کو زیرِ لب گنگنانا شروع کر دیا تھا ؎

چند تازہ شعر پڑھتا مسرور جا رہا تھا
اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا

شام ہو چلی تھی۔ چرواہے مویشیوں کو ہانک کر واپس لے جا رہے تھے۔ مرغانِ خوش نوا نے بھی اپنے اپنے گھونسلوں کا راستہ لیا تھا۔ نیلگوں آسمان کے نیچے ان کی سیاہ و سفید قطاریں کتنی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ آفتاب کی وہ شعاعیں جو اپنے شباب کے عالم میں جھلسا دینے کی حد تک گرم تھیں، اب اس قدر مدھم ہو چکی تھیں کہ درختوں کا سایہ نظر سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ تاریکی اجالے پر غالب آ رہی تھی۔ نور ظلمت کے آغوش میں پہنچ کر کافور ہو رہا تھا ؎

طوفان چہچہوں کا، چڑیوں کا تھا بسیرا
گنجان جھاڑیوں کے سایہ میں تھا اندھیرا

ڈاک گاڑی بوجہ تیز رفتاری ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ مفکر کا تخئیل بھی اس سے پیچھے رہا جا رہا تھا اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور انجن کی سیٹی کی آواز بالکل غیر شاعرانہ سہی مگر ان کے مسلسل سوز میں ترنم سا پیدا ہو رہا تھا۔ اور خاص طور پر جب وہ جنگل کی لامحدود فضا میں گونجتی تو ایسا دلفریب نغمہ سنائی دیتا کہ روحِ عالم وجد کرتی اور آسمان کے طبق غش کھانے لگتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ شاید حسن کی دیوی بارگاہِ عشق میں پہنچ کر مضراب بر ساز ہے ؎

تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی
لیلےٰ ستار اپنا گویا بجا رہی تھی

کھیتوں میں پانی دینے کے لئے کسانوں نے جگہ بجگہ جوہڑ اور تالاب بنا رکھے تھے۔ بعض بڑے تھے، بعض چھوٹے۔ کبھی کبھی ایک آدھ مرغابی پانی سے سر نکال کر ساکن سطحِ آب پر تموج پیدا کر دیتی تھی۔ مینڈک بھی اچھل کود رہے تھے۔ پانی کافی شفاف تھا۔ کنارے پر اُگے ہوئے درختوں کا سایہ اس میں منعکس ہو رہا تھا، البتہ جب لہریں پیدا ہوتیں تو سایہ اس طرح حرکت کرتا گویا افعی چادرِ سیماب پر بل کھا رہے ہوں ؎

کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں
تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں

جنگلی مور جھاڑیوں میں اس طرح چھپ کر بیٹھے تھے کہ ان کے پروں کی نیلگوں سبزی ہرے پتوں میں مدغم ہو گئی تھی۔ تاہم گاڑی کے شور سے ڈر کر جب وہ ڈالیوں کے نیچے اور زیادہ دبک جانا چاہتے تو ان کے وجود کا پتہ چل جاتا تھا۔ گاڑی کسی اونچے ٹیلے یا چھوٹی پہاڑی کے مقابل پہنچتی تو سورج اس کے عقب میں روپوش ہو جاتا لیکن جب وہ میدان میں سے گذرتی تو دوبارہ نظر آنے لگتا۔ منظر کی یہ متضاد کیفیت بھی ایک نوع کا تلذذ پیدا کر دیتی تھی ؎

خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں

بقول حضرت غالب ہوا میں اس قدر نشہ آور کیفیات ممتزج تھیں کہ بادہ خواری کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ آتش فروز شفق کی گلناریاں خمکدۂ خیام کی شرابِ کہنہ سے کسی طرح کم نہیں تھیں۔ میں بے پئے مدہوش ہونے لگا۔ مجھے اس امر کا بھی خیال نہ رہا کہ قریب بیٹھنے والے مسافر میری بے خودی کو دیکھ کر آخر کیا کہیں گے ؎

مستی شراب کی سی آنکھوں میں چھا رہی تھی
ہر سانس اک چھلکتا ساغر پلا رہی تھی

میں نے محسوس کیا کہ کوئی اندر ہی اندر دل کو دبوچ رہا ہے، ٹھیک اس طرح جیسے جھولے میں بیٹھتے وقت دل ڈوبنے لگتا ہے۔ معاً کسی کی یاد مجھے ستانے لگی۔ کھڑکی کے کنارے پر سر رکھ کر بے خودی کے عالم میں جھک گیا۔ بادہ پرست کی طرح آنکھیں نیم وا تھیں۔ میں ایک خوابِ بیداری دیکھنے میں محو ہو گیا ؎

لہروں میں جیسے کوئی دل کو ڈبو رہا تھا
میں سو رہا ہوں ایسا محسوس ہو رہا تھا

ہوا کی تیزی سے بال منتشر ہوئے جاتے تھے اور ان کی جڑوں میں نرمی کے باعث خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ بعض زیادہ سرد جھونکوں سے تو جسم کے رونگٹے بھی کھڑے ہو جاتے تھے۔ تمام روح پر ایک کیفیتِ شکر طاری ہونے لگی تھی۔ ہوا کی سائیں سائیں میں گویا پیچھے سروں کا مدھم سا باجہ بج رہا تھا۔ میں نے بھی گنگنا کر قدرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانے کا ارادہ کیا ؎

موسیقیت سے دل کو معمور کر رہے تھے
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مخمور کر رہے تھے

اب گاڑی کافی دیر سے میدان کی لا نہایت وسعتوں میں سے گذر رہی تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کا آخری جلوہ دلربائی کی حد تک حسین تھا۔ سنہری کرنیں درختوں کی صرف پھنگوں پر غازہ پھیر رہی تھیں۔ گویا محفلِ رقص کے لئے عروسانِ نو کی تیاری عمل میں آ رہی تھی۔ شباب و شعر کے اس ہوش ربا ماحول میں گھر کر میں بےخود سا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ وہاں کوئی اسٹیشن نہیں تھا بلکہ راستہ صاف نہ ہونے کے باعث وہ عارضی طور پر ٹھہر گئی تھی ؎

تھیں آخری کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے رستے میں ریل ٹھہری

میں ایک دم چونک پڑا اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کہیں میری منزلِ مقصود تو نہیں آ گئی، گردن کھڑکی کے باہر نکال کر تحقیق کرنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک میری نظر ایک دیہاتی لڑکی پر پڑی جو ریل کی پٹڑی سے بہت تھوڑے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کچھ سہم کر کھڑی ہو گئی تھی۔ گھاس پر اس کے قدموں کے قریب گری ہوئی بانسری اس امر کا پتہ دے رہی تھی کہ غالباً گاڑی کے آنے سے قبل وہ محوِ ترنم ہو گی۔ یقیناً ریل کی آمد اس کی روحانی خلوت میں ایک بیجا مداخلت تھی جسے اس کی خودداری برداشت نہ کر سکی۔ چنانچہ وہ ایک ایسے اظہارِ بیزاری کے ساتھ جس میں کسی قدر خوف بھی شامل ہوتا ہے، وہ اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی ؎

کانٹوں میں خوبصورت اک بانسری پڑی تھی
دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی تھی

اس کا سراپا لکھنا ایک شاعر ہی کا کام ہے۔ میرے پاس بیان کی اہلیت ہے نہ اظہار کی قوت۔ تاہم یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس کے مینائے جسم میں کیفِ جوانی سرایت کر چکا تھا۔ وہ اس کی شانِ استغنا، وہ اس کا بےحجابانہ کھڑے ہونے کا انداز تصنع اور بناوٹ سے قطعی معرا تھا۔ چہرے کی خونچکاں صباحت گلگونہ و غازہ سے بے نیاز تھی ؎

کافر ادا، ستمگر، ساحر، دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رخ، گل رنگ، حشر داماں

سیاہ اطلس کے پردوں میں ملفوف آنکھیں جن کے ساغروں میں سحر ڈھل رہا تھا، صد درجہ فسوں ساز تھیں۔ ان ساغروں میں محبت کی وہ شراب تھی جو غیر مرئی ہونے کے باوجود نظر آ جاتی ہے۔ اس کا پیکرِ حسین صانعِ ازل کی انتہائے خلاقیت تھا ؎

خوش چشم، خوبصورت، خوش رنگ، ماہ پیکر
نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسوں گر

اس کو ایک اور صرف ایک نظر دیکھ لینے کے بعد صبر و قرار کا باقی رہ جانا غیر ممکن تھا۔ دیہات کی غیر صنعتی فضا میں پرورش پانے کے باعث اس کی ہر ادا فطری اور انتہائی سادگی لئے ہوئے تھی۔ اور یہ سادگی ہی ایک ایسی ادا ہے جو کچھ نہ ہونے پر بھی سب کچھ ہوتی ہے ؎

غارتگرِ تحمل، خوں ریز، دشمنِ جاں
پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں

شاید خوفِ تنہائی سے اس کے تنفس میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا جس کے باعث سینے میں نشیب و فراز کی کیفیت جلوہ فرما تھی۔ اگر میں کہوں کہ اس کا پیکر سیمابِ برق در آغوش ہو کر تڑپ رہا تھا تو مبالغہ نہ ہو گا ؎

پرتو ہے بجلیوں کا آئینہ گلی میں
یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نقاشِ فطرت نے قدرت کے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہو کر اپنے تخیلِ حیات آفریں کو متشکل کر دیا ہے ؎

صورت میں عارضوں کی یا گل بدل گئے ہیں
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اعضا میں ڈھل گئے ہیں

ہمیشہ سے میرا ایمان ہے کہ صنفِ نازک کی تخلیق میں عنصرِ اربعہ کے علاوہ کچھ اور رعنائیاں بھی ہوتی ہیں۔ اور یہ انہی رعنائیوں اور رنگینیوں کا اثر ہوتا ہے کہ عورت آفریدۂ ارضی ہونے کے باوجود مخلوقِ سماوی کو مسحور کر لیتی ہے جس کی دیویاں انسانی ہستیوں کے سامنے جھک جاتی ہیں اور خود صانع کا کمالِ فن ان پیکرانِ جمیل پر فدا ہو جانے کا آرزومند ہوتا ہے ؎

حوریں ہزاروں سے قربان ہو گئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر انسان ہو گئی ہیں

نہیں معلوم کہ وہ کن تصورات میں محو تھی کہ نگاہ زمین کی سطح سے اٹھتی ہی نہیں تھی۔ پتھر کی ایک مورت کی مانند۔ اس کا جسم ساکت و بےحس سا معلوم ہوتا تھا تاہم ہوا کے جھونکے جب اس کی چادر کو گرا کر بعض ساغر و مینائے شباب کو عریاں کر دیتے تو اس کی حیا آنچل سنبھالنے کے لئے اپنی مرمریں انگلیوں کو زحمتِ جنبش دیتی۔ اس وقت وہ ایک سوزِ حسرت کے ساتھ کائنات کے ہر ذرے پر نگاہ ڈالتی مگر پھر بھی خاموش رہتی۔ گویا ہوا کی وہ اٹکھیلیاں اس کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں ؎

ہر چیز پر نگاہیں حسرت سے ڈالتی تھی
جھونکے جو چھیڑتے تھے، آنچل سنبھالتی تھی

حسن کے ساتھ ساتھ جس طرح نزاکت کا تصور ذہن میں آجاتا ہے، غرور کا دل میں پیدا ہوجانا بھی لازمی ہے۔ غرورِ حسن مشہور ہے۔ لیکن وہ ہستی جو قدرت کی گود میں پل کر جوان ہوئی ہو، ان سطحی چیزوں سے نا آشنائے محض رہتی ہے۔ مجھ پر ایک نظر ڈال کے وہ یہ معلوم کرنے کے لئے غرق تحیر ہوگئی کہ آخر یہ ہے کون؟ اور اس مقدس فضا میں اس درجہ بے باکانہ طور پر چلے آنے کا مطلب کیا ہوسکتا ہے؟ ؎

لفظ غرور دل پہ مرقوم ہی نہیں ہے۔ میں کون ہوں اسکو معلوم ہی نہیں ہے

ایک حرماں نصیب عاشق کے دل میں بدرِ کامل کا جلوہ محبوب کے حسین چہرے کی یاد تازہ کر دیتا ہے مگر چاند کو اس کا علم ہونے نہیں پاتا۔ اسی طرح اس شباب کی دیوی کو جو مخلوقِ ارضی کے روپ میں جلوہ گر تھی، یہ محسوس بھی نہ ہوسکا کہ اس کی شانِ استغناء میرے قلبِ حزیں کو اور زیادہ گھائل کر دینے کے لئے کافی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ ارادتاً مجھ پر ستم ڈھانے کی کوشش نہ کرتی تو اس درد میں اتنی لذت نہ ہوتی۔ ؎

خونریزیوں سے اپنی واقف مگر نہیں ہے
کس پر چھری چلا دی، مطلق خبر نہیں ہے

وہ حقیقی جادو اور سحر سے ناواقف تھی، وہ منتر پڑھنا بھی نہیں جانتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ستاروں کی رفتار سے کیا کیا کام لئے جاسکتے ہیں مگر پھر بھی اس کی فطرت اس قدر فسوں ساز تھی کہ زبردست ساحر بھی اس کے سامنے سر جھکا لیتے تو تعجب نہ ہوتا تصنع اور بناوٹ سے بے نیاز اس کی سادگی دل موہ لینے کے لئے کافی تھی ؎

نا آشنائے راہ و رسم فسوں گری ہے
درپردہ اس کی فطرت سرگرم دلبری ہے

میں گاڑی کے دروازے میں کھڑا حسن کی دیوی کے اس شاہکار کو بنظرِ غور دیکھتا رہا۔ میرے احساسات سلب ہوچکے تھے۔ میرے قوا مفلوج ہوگئے تھے کیونکہ جسم کی تمام طاقت صرف آنکھوں کے پردوں میں جمع ہوکر بصارت کو تیز سے تیز تر کر رہی تھی ؎

کچھ دیر تک تو میں نے اس کو بغور دیکھا
گم تھے حواسِ خمسہ، ہر مُو تھا چشمِ بینا

لیکن میں نے سوچا کہ قدرت کے اس اختراعِ فائقہ کو کسی قدر قریب سے دیکھا جائے تو بہتر ہے۔ علاوہ ازیں گاڑی کے دوسرے مسافر بھی میری آئینہ سامانی پر متحیر تھے۔ اس لئے میں نے کوشش کرکے پاؤں کو جنبش دی اور اس کے نزدیک پہنچ کر اپنے جذبات کو الفاظ کی شکل میں پیش کرنا شروع کر دیا ؎

گاڑی سے میں اتر کر اس کے قریب آیا
جذباتِ دل کی رو میں میری زباں سے نکلا

میں نے اس سے کہا۔ ہاں۔ اس کو مخاطب کرکے کہا۔ "اس ویران جنگل میں جہاں تیری پرستش کرنے کے لئے کوئی متنفس موجود نہیں ہے تیری زندگی بیکار ہے۔ فطرت کے بلند ترین تخیل نے تجھ کو تخلیق کیا ہے۔ کاش! تیرا مصرف بھی اتنا ہی بلند ہوتا ؎

اے تو کہ تیری نازک ہستی نہ کام آئی
فطرت کی انتہائی، تخئیل دلربائی

شاید صانعِ حقیقی نے تجھ سے بہتر ہستی آج تک تخلیق نہیں کی۔ بلا مبالغہ تو شاہکارِ فطرت ہے، اعجازِ صنعت ہے تو سماوی مغنیوں کو اپنے لحنِ عبودیت کا وہ نسوانی روح بخش سکتی ہے جس کی کیفیت کائنات کے ہر ذرے کو ترنم ریز کر دیتی ہے۔ تو ایک فلسفی کو فلسفۂ حیات کا سبق دے سکتی ہے۔ تو ایک شاعر کے دل میں جذبات کا طوفان پیدا کرکے اسے شعر کہنے پر مجبور کرسکتی ہے ؎

اے درسِ آدمیت، اے شاعری کی جنت
اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت

پہاڑوں کی بلندیاں، وادیوں کی پستیاں، میدانوں کی وسعت، سمندروں کے عمق صرف تیرے ہی ضیاپاش پیکرِ بلور سے اکتسابِ نور کرتے ہیں جنگل کی کائنات پر تیری حکمرانی ہے۔ تیری مقدس الوہیت بتا رہی ہے کہ تیرا تعلق سماوی مخلوق سے ہے ؎

جلووں سے تیرے روشن صحرا و دشت و وادی
عفت کی پاک دیوی، جنگل کی شاہزادی

برسات کے کالے بادلوں کی اسودی کیفیت تیری زلفوں کے مقابلے میں پھیکی پڑ جائے گی کیونکہ وہ سیاہ تو ضرور ہوتے ہیں مگر ان میں ایسا سحر نہیں ہوتا جو صرف تیری زلفوں کے لئے مخصوص ہے۔ چشمے کی شورشوں میں تیرے نام کا باجہ بجتا ہے۔ بادِ صبا کے جھونکے تیری شان میں ترانہ پڑھتے ہیں۔ کائناتِ عالم کا ہر ذرہ ہم آہنگ ہوکر تیرے تقدس کا راگ گاتا ہے ؎

گیسو پہ تیرے صدقے زلفِ سیاہ گھٹا کی
گاتی ہیں گیت تیرے رنگینیاں فضا کی

اگر تو جنگل کی ویرانیوں کو خیرباد کہکر شہر کی جانب اپنا رُخ کرلے۔ اگر تو خلوت سے نکل کر ایک بار جلوت میں آجائے، تو تعجب نہیں کہ نظامِ کائنات درہم برہم ہوجائے۔ تو لوگوں کے دلوں میں سوز پیدا کرسکتی ہے، ان کے حواس سلب کرسکتی ہے ؎

بستی میں تو جو آئے اک حشر سا بپا ہو
آبادیوں میں ہلچل، صحرا میں غلغلہ ہو

تیرے ساغرِ چشم کی کیفیتِ سکر سے مدہوش ہوکر اگر میخوار مئے ناب کے پیالے زمین پر پٹک دیں تو امرِ استعجاب نہیں کیونکہ ان میں وہ شراب بھری ہے جو بے پیئے مخمور و بے خود کر دیتی ہے۔ صوفیائے کرام بھی تیرے سحر سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ تیری ایک نظر کا جادو ان کے صدہا سال کے زہد و تقویٰ کو ایک ہی لمحہ میں مبدل بہ عصیاں کرسکتا ہے ؎

[illegible] جو تجھ کو دیکھے۔ تقوا کے جام چھوٹے
تسبیحِ شیخ الجھے، زاہد کا زہد ٹوٹے

ہفت اقلیم کے بادشاہ تیرے قدموں پر تاجِ زریں رکھ کر سر بسجود ہوجائیں۔ عبادت گذار زاہد معبودِ حقیقی سے منہ موڑ کر تیرے نام کا کلمہ پڑھنے لگیں۔ اور نہ صرف

بلکہ خالقِ کائنات تیرے حضور میں نذرانہ پیش کرکے اپنی اطاعت کا ثبوت دینے لگے ؎

افلاک سے فرشتے لے کر خراج اتریں

زہاد کے عمامے، شاہوں کے تاج اتریں

شعراء کی دنیائے خیال تیرے دم سے آباد ہو جائے۔ تو ان کے دلوں میں اس قدر سوز پیدا کر دے کہ ان کی ہستیٔ فانی رقیق ہو کر آنسوؤں میں تبدیل ہو جائے۔ اس طرح کہ ان کی آنکھ سے گرا ہوا ہر آنسو ایک تازہ شعر بن کر آسمانِ شاعری پر جلوہ گر ہونے لگے ؎

آنسو ہوں خوں بداماں، نالے شرر فشاں ہوں

کیا کیا نہ شاعروں کے ملبوس دھجیاں ہوں

ہر شخص ایک دفعہ دیکھ لینے کے بعد تجھ کو حاصل کرنے کی آرزو کرے۔ اور اگر تیری شانِ استغناء ان کے جذبات کو لائقِ اعتناء نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف التفات نہ کرے، ان کی تمناؤں کو ٹھکرا دے تو یقیناً ان کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ فراق کی گھڑیاں انہیں زندہ درگور کر دیں۔ وہ ایک دوسرے کے رقیب بن جائیں اور اپنی آتشِ رشک کو سرد کرنے کے لئے آپس میں برسرِ پیکار ہو جائیں ؎

چہروں کو اہلِ دل کے بے آب و رنگ کر دے

دنیا کو حسن تیرا میدانِ جنگ کر دے

لیکن میں جانتا ہوں کہ تو جنگل کی پرسکون زندگی کو چھوڑ کر انسانوں کی آبادی میں رہنا کبھی پسند نہیں کریگی۔ تو پھر اے حسن کی دیوی، جنگل کی شہزادی! مجھے اجازت دے کہ میں خود تیرے چرنوں میں آکر سرِ نیاز جھکا دوں۔ بس تیری پرستش کے لئے ہر وقت تیرے حضور میں رہوں چاہے ساری دنیا میری رقیب بن جائے ؎

تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا

اے کاش! جنگلوں میں میرا قیام ہوتا

کائنات کا ایک ایک ذرہ مجھے رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے مجھے دنیا و مافیہا کی خبر نہ ہو۔ تیرا قرب مجھے معصومیت کی ایک ایسی نگری میں لے جائے جو آج تک انسانی ہستی کو نصیب نہ ہوئی ہو جس کی لطیف فضا میں سانس لینے سے فرشتے بھی ہنوز محروم ہوں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو ؎

شام و سحر کے جلوے مجھ سے قریب ہوتے

یہ چاند اور ستارے میرے رقیب ہوتے

میں نے اپنے جذبات کے اظہار میں نہایت دیدہ دلیری سے کام لیا مگر بیسود اس کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ایک مرمریں بت کی طرح ساکت و صامت رہی۔ مگر ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کے اڑتے ہوئے رنگ سے، پلکوں کی تیز تیز حرکت سے، آنکھوں کی وحشیانہ جنبش سے غرض ہر بنِ مو سے اظہارِ استعجاب ہو رہا ہے۔ وہ نہایت عمیق خیالات میں محو ہو کر غرقِ تحیر تھی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے استفسار کیا کہ آخر اس حیرت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے ؎

کیوں؟ میری گفتگو سے حیرت کا جوش کیوں ہے؟

اے زمزموں کے چشمے اتنا خموش کیوں ہے؟

اگر تو اپنے لبوں کو زحمتِ جنبش دے کر ایک اور صرف ایک بار مجھ سے گفتگو کرے تو میرے قلبِ مضطر کو سکونِ عظیم حاصل ہو جائے گا۔ اور دنیا کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بلا استثنے ہر حسینہ کو بے وفا کہنا حد درجہ ناانصافی ہے۔ تو ایک مثال قائم کر دیگی کہ بیشک محبت کا جواب محبت سے بھی دیا جاتا ہے۔ اگرچہ معشوق کا سکوتِ مسلسل عاشق کے سوز و درد کی بہترین داد ہے اور خاموش الفاظ میں جس خوش اسلوبی کے ساتھ احساسِ محبت کا اعتراف کر لیا جاتا ہے، وہ تکلمِ بلیغ سے بھی ممکن نہیں۔ پھر بھی میری آرزو ہے کہ تو اپنے لحنِ عبودیت سے سامعہ نواز ہو جائے۔ میری روح کی تشنگی صرف تیرے ہی نغموں سے بجھ سکتی ہے ؎

بجنے لگیں وفا کی محفل میں شادیانے

ہاں دے لبوں کو جنبش لے سودی ترانے

بول! اے میرے سازِ خاموش! بول۔ لبوں کو زحمتِ جنبش دے۔ تیری خاموشی ایک ایسی ادا ہے جس کا آج تک روئے زمین پر مظاہرہ نہیں ہوا۔ کیا تیری یہ شانِ استغناء ابد تک قائم رہیگی؟ کیا میری آہ و زاری مطلقاً لائقِ اعتناء نہیں؟ ؎

یوں چپ ہے مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے

یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

پھر جس طرح پروانے کے دل کا سوز شمع کے قلب میں تپش پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح میرے دکھے ہوئے دل کی فریاد سے وہ حسن کی دیوی، وہ جنگل کی شہزادی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ لیکن اثر لیا بھی تو اپنے مخصوص اندازِ محبوبیت کے ساتھ یعنی برقِ تبسم گراتے ہوئے۔ وہ مسکرائی اور اس کے ساتھ میرا وہ سب کچھ لوٹ کر لے گئی جس کے لٹ جانے کے بعد کائنات کے ہر ذرے پر قبضہ ہو جاتا ہے ؎

سننا تھا یہ کہ ظالم اس طرح مسکرائی

فریاد کی نظر نے ارمان نے دی دہائی

اس کے چہرے کی سرخی بڑھتے بڑھتے ساری کے رنگ پر سبقت لے گئی، سینے کا جوش بلوریں سطح کے نشیب و فراز میں متشکل ہونے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں وہ سرور پیدا ہو گیا جس سے مئے ناب بھی اکتسابِ نشہ کرتی ہے۔ غرض یہ تھیں وہ کیفیات جن کا بے پناہ ازمسلح سپاہیوں کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر سکتا ہے ؎

دل کو شکست دینے سامانِ جنگ آیا

چہرے پہ خون دوڑا آنکھوں میں رنگ آیا

اور پھر اس خیال کے ساتھ کہ ایک غیر مرد اس کی روحانی خلوت میں مداخلت کا مرتکب ہوا ہے؛ احساسِ نسائیت نے اس کو آ گھیرا۔ شرم و حیا کا قدرتی حجاب اس کے تمام جسم پر طاری ہونے لگا۔ وہ شرما گئی اور ان زلفوں کو جو ہوا کے تیز جھونکوں

سے منتشر ہوگئی تھیں، انگلیوں کو شانہ بنا کر سنوارنے لگی۔ شام کی دیوی کے لئے یہ موقع غنیمت تھا۔ فوراً اس کی زلفوں سے سیاہی چرا کر اپنی ظلمتوں میں اضافہ کرنے لگی۔ ؎

شرما کے آنکھ اٹھائی، زلفوں پہ ہاتھ پھیرا
اتنے میں رفتہ رفتہ بڑھنے لگا اندھیرا

ہوا یہ کہ زلفوں کو درست کرنے کی کشمکش میں اس کے شانے پر پڑا ہوا آنچل سرک گیا اور بلوریں گردن کے ساتھ وہ خام اثمارِ شباب بھی عریاں ہو گئے جو اس کی نسائیت کے علاوہ دوشیزگی کے بھی ترجمان تھے۔ اس کے تنفس میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور وہ ان کبھی نہ مستور رہ سکنے والے جلووں کو پردہ نشین کرنے کے لئے آنچل کی طرف اس طرح متوجہ ہوئی کہ ؎

کچھ جسم کو سمیٹا، کچھ سانس کو سنبھالا
کاندھے پہ سرخ آنچل انگڑائی لے کے ڈالا

ہوا کے جھونکے اس کی محبت کے گیت گانے لگے۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ مست ہو کر اس کے گرد رقص کرنے لگا گویا تمام دنیا گرفتارِ دام ہو کر اظہارِ عشق کر رہی تھی تب اس کی خودداری نے اس جسارت بیجا کو گوارا نہ کیا اور شاید اسی لئے اس نے فیصلہ کیا کہ اب ایسی فضا میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ وہ چلی گئی، ہمیشہ کے واسطے نظروں سے روپوش ہو جانے کے لئے ؎

تاریک کر کے میری آنکھوں میں اک زمانہ
جنگل سے سر جھکا کر ہونے لگی روانہ

میرے دل کے عمیق ترین حصہ سے ایک آہ نکلی جس کی آتشِ خاموش چپکے چپکے شاید تمام عالم کو جلا کر بھسم کر دیتی اگر آنکھوں سے غیر ارادی طور پر بہہ نکلنے والے آنسو اس کی تپش کو سرد نہ کر دیتے۔ کائنات کا ہر ذرہ رو رہا تھا۔ خود قدرت بھی مصروفِ گریہ ہو گئی چنانچہ اس کی آنکھ کا ڈھلکا ہوا ایک آنسو رخسارِ گردوں پر چاندنی کر نمودار ہونے لگا ؎

آنکھوں سے اشک ٹپکے، سینے سے آہ نکلی
گردوں پہ رات نے کر فانوس ماہ نکلی

طیور کے دلفریب چہچہے فریاد و فغاں میں تبدیل ہو گئے۔ جھینگے کی شور شوں میں بجنے والا باجہ نوحہ خوانی کرنے لگا۔ درختوں پر ماتمی لباس کی سیاہی پھیل گئی غرض ہر شئے غم کو پہلو میں دبائے درد کی شدت سے تڑپ اٹھی۔ عین اس وقت کسی کے غیر مرئی لبوں سے نکلی ہوئی مشکل الفہم آواز میں سنائی دیا جیسے کوئی کہہ رہا تھا کہ حسن و جمال سے پیکروں سے دل لگانے کی پاداش یہی عنوان ملتی ہے ؎

آواز ہر طرف سے آئی کراہنے کی
اے جوش یہ سزا ہے اچھوں کو چاہنے کی

میں ٹھیک طور پر یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ وہ کیفیت مجھ پر کتنی دیر

غزل

بارہا میں اپنی تاثیرِ فغاں دیکھا کیا
بارہا برہم نظامِ دو جہاں دیکھا کیا۔

پھر رہی تھی کل جن آنکھوں میں بہارِ آشیاں
آج انہیں آنکھوں نے خاکِ آشیاں دیکھا کیا

نامہ بر کو شک ہوا اس وقت میری زیست پہ
دیر تک جب وہ مرا طرزِ بیاں دیکھا کیا

اک نگاہِ مہر جن ذروں پہ ان کی پڑ گئی
میں زمیں پر ان کو شکلِ آسماں دیکھا کیا

مثلِ غنچہ کھل گئے میرے دلِ پُرغم کے داغ
بیٹھ کر گھر میں بہارِ گلستاں دیکھا کیا

بوئے گل کی طرح میں آوارگانِ عشق کا
دوش پر بادِ صبا کے آشیاں دیکھا کیا

اے شفق ہمدردیٔ الفت پہ اس کی میں نثار
نزع میں وہ میرے مرنے کا سماں دیکھا کیا

شفیق بانو شفق

⁂

تک قائم رہی اور میرے خیالات کا استغراق مجھے کس نگری میں ٹھوکریں کھلا لایا لیکن جب میں دوبارہ اپنے وجود کو اس دنیائے آب و گل میں محسوس کرنے کے قابل ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب پلٹ کر میں نے معلوم کیا کہ گاڑی کو روانہ ہوئے کافی عرصہ گذر چکا تھا کیونکہ اس وقت فضا میں دھوئیں کا غبار تک باقی نہ رہا تھا۔ البتہ صرف دو آہنی پٹڑیاں چاند کی مدھم روشنی میں چمک رہی تھیں اور میں اس لق و دق میدان میں جہاں آدم تھا نہ آدم زاد بالکل تن تنہا کھڑا تھا ؎

مڑ کر جو میں نے دیکھا، امید مر چکی تھی
پٹڑی چمک رہی تھی گاڑی گذر چکی تھی

افغانستان میں قراقلی کی تجارت

افغانستان قراقلی بھیڑ کی کھال بنانے والے بڑے ملکوں میں سے ایک ہے عام طور پر قراقلی غیر ملکی منڈیوں میں ایرانی بھیڑ کی کھالوں کے نام سے مشہور ہیں۔ قراقلی ترکی زبان سے لیا گیا ہے اور دو لفظوں سے مشتق ہے "قرا" بمعنی سیاہ اور "گل" بمعنی پھول یعنی "سیاہ پھول"

افغان قراقلی کا مرکز شمالی اضلاع ہیں خصوصاً مزار شریف اور میمنہ جہاں مویشیوں کے لئے بے قیاس چراگاہیں ہیں اور آب و ہوا بھی ہر لحاظ سے اس قسم کی بھیڑوں کی پرورش کے لئے مناسب و موزوں ہے۔ اندرکوہی کی پیداوار بہترین تصور کی جاتی ہے۔

خود افغانستان میں اس کی کھپت بہت زیادہ ہے۔ وہاں کے لوگ اس کھال کی ٹوپیاں بناتے ہیں سمور کے کوٹ بنانے میں بھی استعمال ہوتی ہے بعض کوٹوں کی قیمت ڈیڑھ ہزار روپے سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

بہت عرصے پہلے اس لطیف شے کی تجارت بہت بے قاعدہ طور پر انفرادی سوداگر کرتے تھے جو زیادہ تر غیر ملکی تاجر تھے۔ نتیجہ یہ کہ آخری منڈی تک پہنچنے میں اسے متعدد ہاتھوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس میں حقیقتاً زبردست قباحت تھی۔

گذشتہ جنگ کے دوران میں افغانی بھیڑوں کی کھالوں کا وہ تجارتی راستہ [illegible]۔ روسی قراقلی کی تجارت کو بھی شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ اس نازک موقع پر کابل کے چند سربرآوردہ تاجروں نے جن میں سے حاجی محمد رفیق خاں اور حاجی محمد افضال خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک قدم آگے بڑھایا اور چند ہندوستانی کمپنیوں کے توسط سے یہ کھالیں لندن بھیجیں اس کے بعد سے لندن افغان قراقلی کے لئے سب سے بڑی منڈی بن گیا۔ اور ظاہر ہے کہ تجارت کو دن دونی رات چوگنی ترقی نصیب ہونے لگی۔

۱۹۳۱ء میں افغانستان کی وزارت تجارت نے لندن میں اپنی ایک ذاتی تجارتی شاخ کا دفتر قائم کرنے کے لئے عملی قدم اٹھایا۔ وزارت کا مقصد یہ تھا کہ اس تجارت کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لے اور اس طرح کمیشن اور دلالی لینے والے ایجنٹوں کے قدم درمیان میں آنے نہ دے۔

لندن کی اس شاخ نے لندن میں افغان قراقلی کی تجارت کا معیار بلند کرنے میں زبردست کارگزاری دکھائی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مال منگانے والے تاجروں کو بے قیاس سہولتیں بہم پہنچائیں۔ ان اقدامات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی تجارت کو بڑی تیزی سے فروغ حاصل ہوتا رہا اور افغانیوں نے بھی قراقلی بھیڑیں پالنے اور انہیں صحیح طریقے سے پرورش کرنے میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لی حتیٰ کہ بعض قبیلوں نے مثلاً غلزئی ہزارہ اور ترکی خیموں نے دوسرے جانور پالنے ہی چھوڑ دئے۔

اب اس کی تجارت اچھی طرح منظم ہے اور اسی مقصد کے لئے بھیڑ کی کھالیں تیار کرنے والے بڑے بڑے مرکزوں میں کئی کمپنیاں کھل گئی ہیں آجکل وہ سب کی سب حکومت کی طرف سے متعین کی ہوئی تعداد کے مطابق ان کھالوں کی بیرونی تجارت میں پوری طرح مصروف ہیں غیر ملکوں میں ان کی فروخت افغانستان کے قومی بنک کے وسیلے سے عمل میں آتی ہے۔ یہ بنک ان کمپنیوں کو جو اپنا مال باہر بھیجتی ہیں، باہر جانے والی کھالوں کی تعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے روپیہ ادھار دے کر ہر قسم کی مدد کرتی ہے تاکہ کاروبار مندا پڑ جانے کی صورت میں بھی وہ قائم رہ سکیں اور ایسا نہ ہو کہ جلد بازی سے کام لیتے ہوئے وہ اپنا مال کسی کم قیمت پر نکال دینے کی کوشش کریں۔ لڑائی سے پہلے لندن اس قسم کی کھالوں کے لئے سب سے بڑی منڈی تھا لیکن اس کے بعد سے وہ نیویارک پہنچ گئی ہے۔

افغانستان میں قراقلی بھیڑوں کی تعداد چالیس لاکھ کے قریب ہے خوشگوار حالات میں ملک سے باہر جانے والے مال کا نصف حصہ صرف اس شے کی تجارت سے متعلق ہوتا ہے ۱۹۳۹ء کے دوران میں باہر جانے والی کھالوں کی تعداد [illegible] تھی لیکن ۴۴-۱۹۴۳ء کے دوران میں وہ کم ہو کر [illegible] رہ گئی یہ زیادہ تر دوران جنگ میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں اور [illegible] کی وجہ سے ہوا۔

گذشتہ گیارہ سال کی بیرونی تجارت کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:۔

سال	کھالوں کی تعداد
۱۹۳۲-۳۳	۹۰۶۴۸۰
۱۹۳۳-۳۴	۱۲۴۴۹۹۴
۱۹۳۴-۳۵	۱۲۵۰۵۲۱
۱۹۳۵-۳۶	۱۵۲۲۶۴۳
۱۹۳۶-۳۷	۱۷۱۵۴۹۵
۱۹۳۷-۳۸	۱۷۶۹۳۹۵
۱۹۳۸-۳۹	۹۱۳۰۵۴
۱۹۳۹-۴۰	۲۲۸۰۳۱۸
۱۹۴۰-۴۱	۱۷۳۶۰۳۳
۱۹۴۱-۴۲	۱۸۸۱۲۶۹
۱۹۴۲-۴۳	۴۷۱۰۰۰
۱۹۴۳-۴۴	۱۰۵۴۶۰

۳۹-۱۹۳۸ء میں عالمگیر اقتصادی پیچیدگیوں کے باعث مقابلتاً کمی واقع ہوئی یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ابھی تک ان کھالوں کا کاروبار پرانے طریقوں کے مطابق ہوتا ہے اور اگر اس کو جدید اور سائنسی طریقوں پر اختیار کیا جائے تو زبردست فروغ ممکن ہے۔

محمد علیخاں غلزئی

غزل

تجھے آستاں کے سجدے مرا آسرا سہارا — یہ وہ راز ہے کہ مجھ پر ہوا آخر آشکارا

کیا بڑھ کے خیر مقدم نگہ کرم نے اسکا — ترے در پہ جو بھی آیا تجھے جس نے بھی پکارا

جسے تیری آرزو ہو جسے تیری جستجو ہو — اُسے ہر الم گوارا اُسے ہر ستم گوارا

مجھے کیا غرض فلک سے تری انگھڑیوں سے تو — یہ چمک رہی ہیں بنکر مرے بخت کا ستارا

یہ تڑپ تو سو نکیں نہیں گو داغ جگر میں — کوئی بیقرار بجلی کوئی شعلہ خو شرارا

یہ جلے جا رہا ہے جاہا ہوں بے بس — مرا ناخدا ہے گویا یم زندگی کا دھارا

بخدا ایمں ہوئی ہے یہی خاکِ کوئے جاناں
ترے زخمِ دل کا مرہم ترے دردِ دل کا چارا

حبیب

غزل

انجمن میں کبھی آ انجمن آرائی کر — ہو تماشا جو تماشا کو تماشائی کر

ہے یہی شبہہ زمانے میں ترے آنے کی — خلق کو دیکھ خدائی سے شناسائی کر

ایک دن خیلِ سکندر سمجھ جاتا ہے — عارضی زیست پہ کیوں حسرتِ دارائی کر

پردے پردے میں ہو انجمن آرا بھی تو کیا — سامنے آکے ذرا انجمن آرائی کر

پہلے تو شرط یہ ہے یار گرہ عشق میں جھک — اور پھر جا کے کسی در پہ جبیں سائی کر

چاہتا ہوں کہ فنا اور بقا کے مالک — تو مسیحا ہے تو میری بھی مسیحائی کر

تجھ کو منزل بھی ملے گی کہ نہیں اے بسمل
یہ سمجھ سوچ کے تو بادیہ پیمائی کر

بسمل الہ آبادی

غزل

بجا اس شوخ کی پھر دہباں معلوم ہوتی ہے — جفاؤں کی بہت پھر جواں معلوم ہوتی ہے

خیال کوئے جاناں کی فریب آمیزیاں توبہ — نگاہِ شوق جذبِ آستاں معلوم ہوتی ہے

نیاں ہی جاتے ہیں جو آنسو چشمِ پُرنم سے — کہ سعی ضبطِ غم بھی رائیگاں معلوم ہوتی ہے

بارائے شب ہجر انہ تا جلوۂ جاناں — وفا کی زندگی اک چیستاں معلوم ہوتی ہے

بچائے سے کیا بجتی ہے یا مرے گل گلشن — نظر گلچیں کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے

مری فنادگی میں بھی ہے شانِ اوجِ ثریا کی — زمیں بھی اس نظر کو آسماں معلوم ہوتی ہے

جسے دیکھو وہ خندہ زن ہے مجھ پر آج اے فضلی
خدائی بھی طرفدارِ بتاں معلوم ہوتی ہے

فضلی

غزل

بارِ غم درد کے ہلکا کر لیا کرتا ہوں میں — تیز رو سیلاب میں بہہ کر جیا کرتا ہوں میں

یوں تو نفرت ہے شرابِ ارغوانی سے مگر — غم غلط کرنے کو اکثر پی لیا کرتا ہوں میں

ہجر کے لمحات کا کیا چھیڑتے ہو تذکرہ — جانے کتنی بار مر مر کر جیا کرتا ہوں میں

آزما کر حوصلوں کو اپنے تھک جاتا ہوں جب — خود کو طوفاں کے حوالے کر دیا کرتا ہوں میں

آنکھ میں آنسو لبوں پہ آہ، دل کھویا ہوا — ہجر کی راتیں بسر ایسے کیا کرتا ہوں میں

رقص کرتی ہے مری دنیا ہوئی ہی نبض بھی — ان نشیلی انکھڑیوں سے جب پیا کرتا ہوں میں

نبض ہو جاتی ہے مدھم ڈوبنے لگتا ہے دل
جرعۂ جام یاس جب بھی سن لیا کرتا ہوں میں

مرتاج عثمانی

سنگاپور - جب پانچویں ہندوستانی فوج یہاں داخل ہوئی۔

ان جاپانی سپاہیوں کے ہتھیار چھین لئے گئے ہیں اور اب یہ سنگاپور سے واپس جا رہے ہیں۔
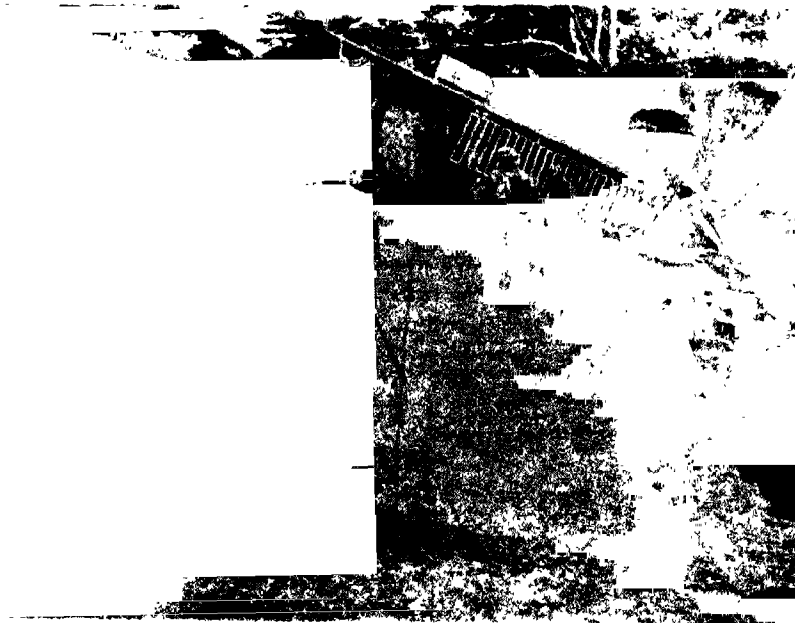
سنگاپور

سنگاپور پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب یہ ہمیشہ انہی کے پاس رہیگا۔ انھوں نے اسکا نام تک بدل ڈالا تھا اور اسکو شونان کہنے لگے تھے۔ لیکن جاپان کو شکست ہوئی اور اسکے تمام ہتھیائے ہوئے ملک اسکے قبضہ سے نکل گئے۔ انہی میں سنگاپور بھی تھا۔ جن لوگوں کو جاپانی راج میں تکلیفیں پہونچی تھیں اب وہ خوش ہیں۔

حبشہ

۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ پر حملہ کیا اور باوجود حبشیوں کے مردانہ وار مقابلہ کے اٹلی کو فتح ہوئی۔ شہنشاہ حبش ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ اسکے چلے جانے کے بعد ملک میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ ۵ مئی ۳۶ء میں اٹلی کی فوجیں عدیس ابابا میں داخل ہوگئیں۔ سات سال تک جلاوطن رہنے کے بعد شہنشاہ حبش اتحادیوں کی مدد سے ۱۹۴۳ء میں ایک فاتح کی حیثیت سے پھر اپنے ملک میں داخل ہوگیا۔

ہیل سلاسی شہنشاہ حبش کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ انکا کتا فرش پر بیٹھا ہے۔

عدیس ابابا میں بہت سی عمارتیں مغربی طرز کی بھی ہیں۔ جب شہنشاہ حبش اٹلی سے شکست کھا کر بھاگ گیا تھا تو شہر کو بلوائیوں نے لوٹ لیا تھا۔

حبشہ کے شاہی نقارچی۔ شہنشاہ کو کوئی خاص اعلان کرانا ہوتا ہے تو انہی نقارچیوں کے ذریعہ کراتا ہے۔ ↓
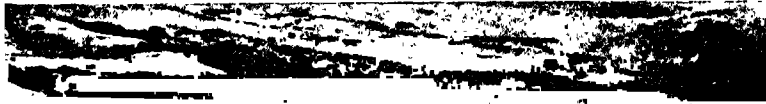
شہنشاہ حبش کا بڑا محل جو عدیس ابابا میں گھوڑدوڑ کے میدان کے قریب ہے۔

ایرانی مصوری

اصفہان میں قصر چہل ستون کی ایک تصویر جو غالباً کسی سوار کی ہے۔

ایرانیوں میں نقاشی کا شوق بہت پرانے زمانے سے ہے۔ زمانۂ قدیم کا شاید سب سے زیادہ مشہور نقاش مانی تھا جسکا زمانہ تیسری صدی عیسوی تھا۔ ساتویں صدی سے ایران پر عربوں کا غلبہ ہوگیا۔ اسلام چونکہ بت پرستی کے خلاف ہے اسلئے عربوں کے زمانہ سے ایران میں نقاشی اور مصوری کا بھی زوال شروع ہوگیا۔ البتہ اس فنی مذاق نے ایک اور راہ نکال لی یعنی ایران میں اب مصوروں کی جگہ خطاط اور خوش نویس پیدا ہونے لگے۔ پھر بھی فن نقاشی بالکل معدوم نہیں ہوا۔

بارھویں صدی میں چینی نقاشی کا اثر پڑنا شروع ہوا مثلاً اکثر تصاویر کے پس منظر میں ہلکے ہلکے بادل بنائے جانے لگے اور اژدہے وغیرہ بھی۔ چودھویں صدی میں یہ فن دوبارہ ترقی کرنے لگا یعنی رنگوں کی آمیزش میں زیادہ نزاکت و لطافت پیدا ہوگئی اور سرو وغیرہ کی اور طرح طرح کے پھول بوٹوں کی تصویریں بننی شروع ہوگئیں۔

پندرھویں صدی میں ایرانی نقاشی کو بہزاد کے ایسے باکمال مصور کی سرپرستی حاصل ہوئی بہزاد نے نقاشی میں بہت سے نئے اسلوب نکالے اور اس نیم مردہ فن کو ایک حیات نو بخشی۔ شاہ طہماسپ کے زمانہ کا ایک مشہور نقاش میرک ہوا ہے۔ مصور خمسۂ نظامی اسکا شاہکار ہے۔ سترھویں صدی کا مشہور نقاش رضائے عباس تھا۔ اس نے قدیم روایات کو چھوڑ کر جانداروں کی تصویریں بھی بنانا شروع کردیں۔ اسی زمانہ میں مغربی نقاشی کا اثر بھی پڑنا شروع ہوا۔ شاہ عباس دوئم کے زمانہ کا ایک نقاش محمد زماں روما گیا۔ پھر ہندوستان آیا۔ اس نے ایرانی فن نقاشی کو اطالوی رنگ بخشا اس یورپی اثر کی نقاشی کے خاص خاص نمونے جلفا میں ہیں محمد زماں کے بعد ایرانی نقاشوں نے جو تصویریں کھینچی ہیں انمیں پہلی نظر میں مغربی اثر نظر آجاتا ہے۔

قصر قیصریہ (اصفہان) کی دیواری نقاشی کا ایک نمونہ۔ →
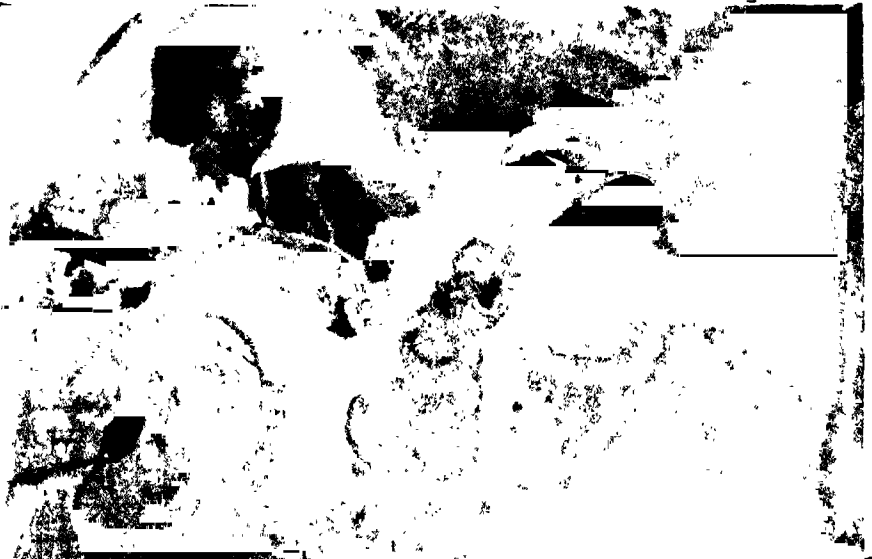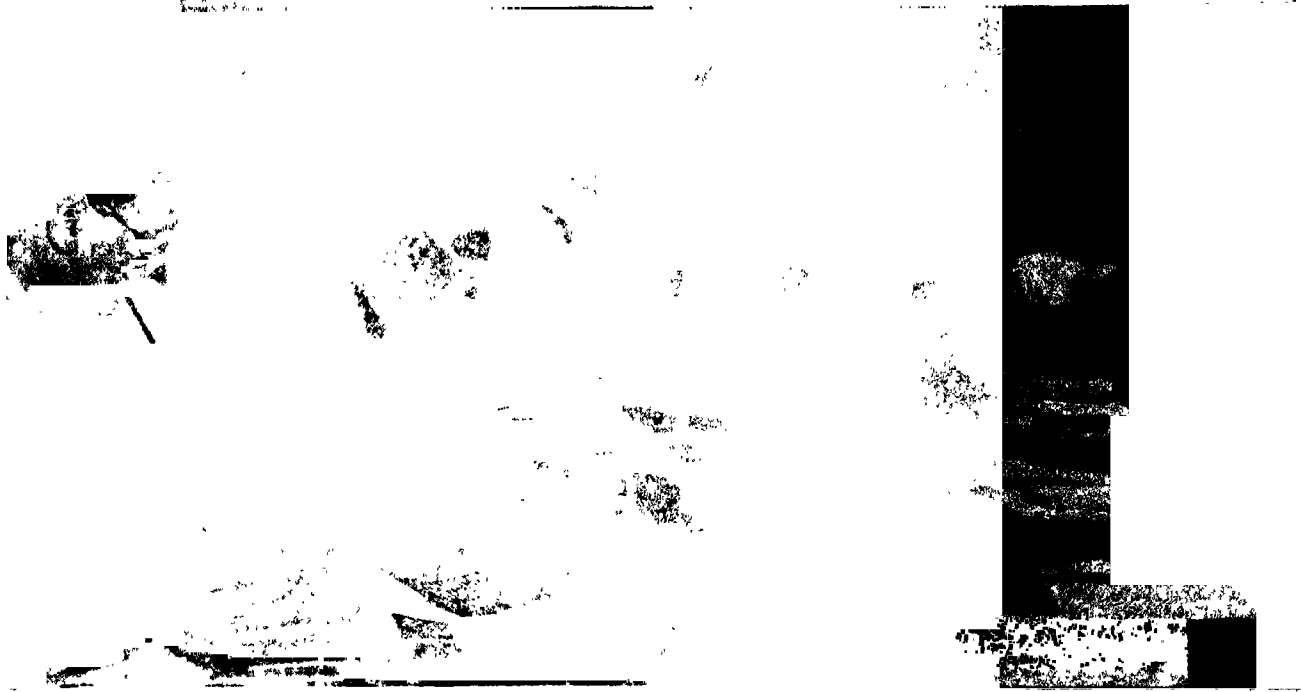
دفتر کا چپراسی کوئی تازہ خبر لایا ہے۔ اب اس پر غور کیا جا رہا ہے کہ آیا یہ خبر قابل اشاعت ہے یا نہیں اور اگر چھاپی جائے تو کس جگہ۔

روزانہ اخبار کی ایجاد کو دنیا کے عجائبات میں شمار کرسکتے ہیں۔ اخبار کے ایڈیٹر کے دفتر میں نامہ نگاروں اور دوسرے ذریعوں سے آئی ہوئی بیشمار خبریں ہروقت آتی رہتی ہیں۔ تجربہ کار نائب مدیر ان خبروں کی معقول طور پر کاٹ چھانٹ کرکے اور انکو مناسب طریقہ پر ترتیب دیکر اخبار میں چھپنے کیلئے تیار کردیتے ہیں۔ جب خبریں پہلی دفعہ چھپ کر آتی ہیں تو انکی تصیحح کی جاتی ہے۔ تبصرہ نگار خاص خاص خبروں اور واقعوں پر تبصرہ لکھتے ہیں۔

اخبارات میں اشتہارات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اسی آمدنی کیوجہ سے اخبارات اسقدر کم قیمت پر بکتے ہیں۔

اخبارات کے چھاپہ خانے بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں اور ان میں بہت سے ماہر فن ہروقت کام میں لگے رہتے ہیں۔

اخبار کا ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسکے پڑھنے سے آدمی واقعات عالم سے باخبر رہتا ہے۔ جو ملک آزادی کا خواہاں ہو اسکے لئے ضروری ہے کہ اخبارات بکثرت ہوں تاکہ ہرشخص کو صحیح خبریں معلوم رہیں اور واقعات عالم پر بے لاگ تبصرہ بھی پڑھتا رہے۔

انگلستان کا ایک بڑا مشہور روزنامہ «ڈیلی میل» ہے۔ یہ اخبار دو بھائیوں الفریڈ اور ہیرلڈ ہارمزورتھ نے قائم کیا تھا یہ دونوں بعد میں لارڈ نورتھ کلف اور لارڈ رودرمیر کہلائے۔

لندن کے بڑے بڑے اخباروں کے شمالی ایڈیشن مانچسٹر سے شائع ہوتے ہیں۔ انکے لئے خبریں اور تصویریں لندن ہی سے بھیجی جاتی ہیں۔ تصویروں کو تار کے ذریعہ بھیجنے کیلئے ایک خاص مشین ہے جسکو «فوٹو ٹیلی گرافی مشین» کہتے ہیں۔

روزانہ اخبار کیسے چھپتا ھے

چھاپے کے سانچے کو بھٹی میں اسقدر باریک اور گول کرلیا جاتا ھے کہ وہ گھومنے والی مشین کے بیلن میں بہ آسانی پھنس سکے۔

جب اخبار کے ورق چھپ چکتے ھیں تو انکو ایک گھومنے وا[لی] مشین میں ڈالدیا جاتا ھے۔ بیلن گھومتے ھیں اور کاغذ مش[ین] میں گھس کر مڑے ھوئے اخبار کی صورت میں باھر نکل آتا[ھے]

جب کوئی خبر ترتیب پاچکتی ھے تو وہ ایک نلکی کے اندر کمپوزنگ کے کمرے میں آجاتی ھے۔ "کی بورڈ" پر انگلی مارنے سے مطلوبہ حرف مشین کے نچلے حصے میں آکر گرم سیسہ سے چپک جاتا ھے اور حرف اسیر چھپ جاتا ھے۔
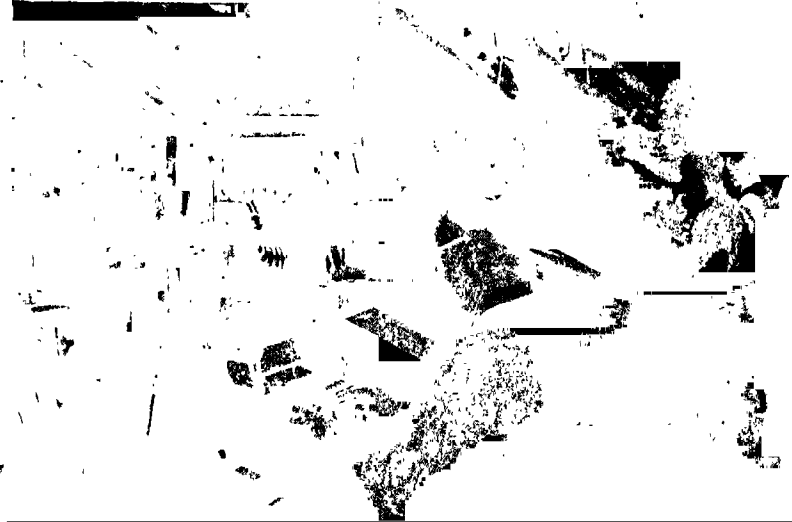
اخبار کے کسی صفحہ کے پروف کی جب تصحیح ھوچکتی ھے تو ٹائپ اور بلاک کا چوکٹا مش[ین] میں کھسا دیا جاتا ھے اور وہ صفحہ چھپ جاتا ھے
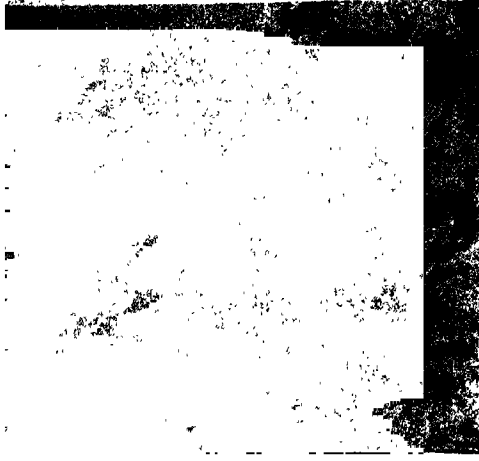
مانچسٹر میں کپڑوں کی نمائش

جنگ ختم ہوچکی ہے۔ اب انگلستان کی پارچہ بافی کی صنعت کو اس وقت کا انتظار ہے جب دور دور سے لوگ یہاں آئینگے اور یہاں کے صنعت گروں کے کمالات دیکھیں گے۔ چنانچہ مانچسٹر میں جو انگلستان کی صنعت پارچہ بافی کا مرکز ہے پوشش کے کپڑوں کی ایک نمائش ہوئی۔ یہی کپڑے آئندہ ہوٹلوں اور مہمان خانوں وغیرہ کی زینت بنیں گے۔

اس نمائش میں جو کپڑے دکھائے گئے ان میں وہ تھے جنسے باورچی خانوں کی سجاوٹ کی جائیگی' تولیے' میزپوش اور رومال وغیرہ وہ تمام کپڑے تیار ہونگے جو انگریزی گھرانوں میں عموماً مستعمل ہیں۔

نمائش دیکھنے والوں نے خاص طور پر ان چھینٹوں کو پسندکیا جنپر پھول بوٹے اور جانوروںکی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ وہ کپڑے بھی جاذب نظر ہوئے جو ہاتھ کے بنے ہوئے تھے اور جنمیں رنگوں کا امتزج بڑی لطافت کیساتھ کیا گیا تھا۔

نمائش کا ایک کمرہ اس سادہ اور دھاری والے ریشم کیلئے مخصوص تھا جو پردوں کیلئے بنایا گیا ہے۔ اس ریشم کے رنگ بہت دیدہ زیب ہیں مثلاً ہلکا بادامی' گہرا نیلا' ہلکا سبز' گلابی اور لیموئی۔

اس ساٹن پر دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی تصویریں بنائی گئی ہیں جنسے کپڑا بہت خوبصورت ہوگیا ہے۔

انگریزوں کا باغبانی اور بحری زندگی کا شوق ان کپڑوں میں بھی ظاہر ہوکر رہا چنانچہ بہت سے کپڑوں پر بڑے خوبصورت پھول بنائے گئے ہیں اور بڑی دلکش سمندر کی لہروں ایسی دھاریاں ابرآلود یا ستاروں بھرا آسمان۔ بعض کپڑوں پر گھوڑے بھی بنے ہوئے ہیں۔ اس ڈزائن سے انگریزوں کا گھڑدوڑ کا شوق ظاہر ہوتا ہے۔

نمائش کے کپڑوں کے تین نمونے۔ (بائیں طرف) خاص سوت کا پوشش کا کپڑا (بیچ میں) جدید طرز کا ہاتھ کا چھاپہ (دائیں طرف) موٹی سوتی ساٹن پر پرانی وضع کا پھول کا چھاپہ۔

ایک نیا روسی فلم

ایوان (زار روس) کی رسم تاج پوشی۔
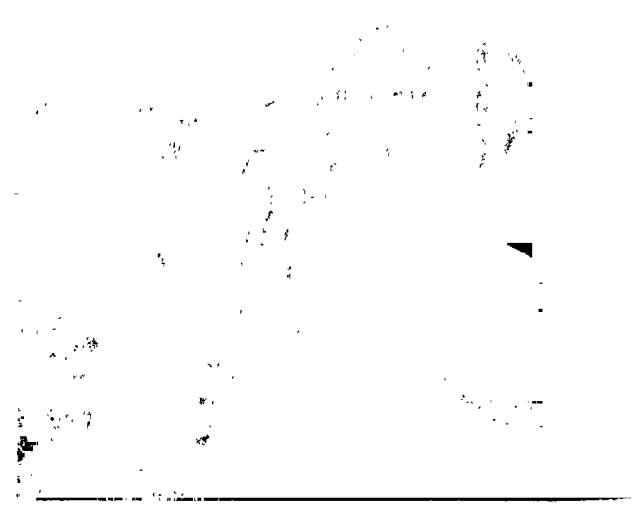
باغی زار روس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔

آئین سٹائین کے آخری فلم «خوفناک ایوان» کا موضوع تاریخی ہے۔ اس میں اس زمانہ کا ذکر ے جبکہ زار روس ایوان کی روسی باغیوں سے شمکش ہو رہی تھی۔ باغی طرح طرح کی سازشوں یں لگے ہوئے تھے زارینہ کو زہر دیا گیا اور وہ ام باتیں ہوئیں جنکو آج ہم «سبوٹیج» سے تعبیر ےتے ہیں۔ زار نے آخرکار اپنی حالت مضبوط بنالی ں نے ایک لشکر تیار کرلیا اور تاتاریوں اور جرمنوں و ملک سے نکال کر الیزبتھ ملکۂ انگلستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات مستحکم کئے۔

روسی سفیر ملکہ الیزبتھ کے دربار میں بھیجا جا رہا ہے۔

« مظہر آرٹ پروڈکشنز » کا یہ دوسرا نیا ستارہ بھی عنقریب پردۂ سیمیں پر طلوع ہونے والا ہے۔

بسکٹ

افسانہ

بارش کا زمانہ تھا، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آرہا تھا۔ ویران سے ویران زمین پر برسات کا جادو چھایا ہوا تھا۔ بارش کے موسم کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ سال بھر میں چند ماہ تک اللہ میاں اپنی تمام جنتوں کو دُھلواتے ہیں اور وہ تمام پانی بہہ کر ہماری زمین پر ٹپکتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں ہماری دنیا میں یہ پانی گرتا ہے وہاں بہشت کا نقشہ پیدا کر دیتا ہے۔

آپ کہیں گے کہ کیا بہشت بھی ایسی جگہ ہے کہ جس کو دھلوانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ تو خود نہایت صاف ستھری جگہ ہوگی۔ صفائی تو گندے مقامات کی کی جاتی ہے۔ یہ درست ہے مگر ساکنانِ جنت کون ہیں؟ ہم آپ جیسے انسان ہی تو ہیں۔ لاکھ وہ بلندی مراتب میں ہم سے بڑھے ہوئے ہوں بیچ تو میں پھر انسان اور انسان جہاں پہنچے گا وہاں یا تو خرافات پھیلائے گا یا معاشقے کرے گا یا لڑے گا۔ بہر نوع ہم کو جنت والوں پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہمیں تو صرف یہ کہنا ہے کہ سال بھر میں جنتیں ایک بار ضرور دُھلوائی جاتی ہیں اور یہ برسات کا پانی انہی کی دھووَن ہے۔

لیکن جس سال میں سفر کر رہا تھا اس سال غضب کی بارش تھی۔ ایسی بارش کہ اس نے فصلوں کو تباہ کر دیا، زمین کو ادھیڑ کر پھینک دیا اور جو بہشتی مناظر ہماری زمین پر پیدا ہو گئے تھے ان کو غارت کر ڈالا۔ یہ جنت کا پانی نہ تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس سال دوزخ کا ٹمپریچر بہت بڑھ گیا تھا اس آگ کو کم کرنے کے لئے وہاں کے تمام نل کھول دئے گئے ہوں گے اور یہ وہیں کا پانی ٹپک پڑا تھا۔

ریل فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی کہ دفعتاً اس کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ بریک دانت بھینچ کر پہیوں سے چمٹ گئے اور چند سیکنڈ میں گاڑی رک گئی۔ معلوم ہوا کہ سامنے والے ایک چھوٹے سے پل کی لائن بہہ گئی ہے۔ اس کے نیچے نالا تو ایک ہی تھا مگر اس میں کوئی اور دوسرا آوارہ و کم ظرف نالا آملا تھا اور اب دونوں دریا بنے ہوئے ٹھاٹ سے بہہ رہے تھے۔ دور دور لائن کا پتہ نہ تھا۔

انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ کی غفلت کہئے یا ہماری شامتِ اعمال کہ اطلاع پہلے نہ مل سکی تھی ریل کو جنکشن سے روانہ کر دیا گیا تھا۔ اب کیا ہوگا ہر مسافر کی زبان پر یہی سوال تھا۔ ٹونڈلا پچاس میل پیچھے ہوگا۔ صبح آٹھ بجے وہاں صرف ناشتہ کر کے روانہ ہوئے تھے۔ اب دس بج رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آخر یہی طے کیا گیا کہ ٹرین واپس لیجائی جائے۔ چنانچہ جس ذلیل سے اسٹیشن کو ہمارا میل حقارت سے دیکھتا ہوا دندناتا گزر گیا تھا اسی پر گاڑی واپس آکر رُکی۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ اس اسٹیشن اور ٹونڈلے کے درمیان بھی پٹریاں بہ گئی ہیں۔ خوب اب گویا ہم ایک جزیرے میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

اب تمام مسافر سخت پریشان تھے جن کے ساتھ کھانا تھا انھوں نے جلد جلد کھانا شروع کر دیا اگر دوسرے بے آذوقہ مسافروں کی تواضع نہ کرنی پڑے۔

ایک بج گیا تھا، میرے پاس چند بسکٹ تھے اور ابھی بھوک بھی معلوم نہیں ہو رہی تھی اس لئے ان کو برساتی کی جیب میں ڈال کر "کسی مستحق" کا انتظار کر رہا تھا۔ آج میں اس اسٹیشن پر بھی کی صاف آواز سن رہا تھا۔ بیابان میں ذرا اور صاف نظر آرہے تھے۔ اس گاڑی میں بہت سے ایسے لوگ ہوں گے جن کے پاس سونے کی اینٹیں بھی ہوں گی اور جواہرات بھی مگر موجودہ "حالات" اور اس اسٹیشن نے ان کو خنف بنا دیا تھا۔ زر کی اس بیچارگی کے باوجود نہ معلوم سرمایہ دار کا مسئلہ اس قدر اہم کیوں بنا دیا گیا ہے۔

تمام بھوکے مسافر اسٹیشن ماسٹر کو گھیرے کھڑے تھے اور وہ معدوم الذرائع انسان اتنی بڑی تعداد کے لئے کھانا فراہم کرنے سے قاصر تھا۔

سامنے والے ڈبے میں سے بچوں کے بلکنے کی آوازیں آرہی تھیں جن کو سن کر کئی ماؤں کے دل بھر آئے تھے اور کئی ماؤں نے اپنے کھانے ان کو دے دئے تھے۔ اس وقت بچے، جوان، بوڑھے سب مادر فطرت کے بچے تھے اور سب بھوک سے بلبلا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بچے تو چپ ہو گئے صرف زنانہ گاڑی میں دو بچے اب بھی رو رہے تھے میں رکتا رکتا گاڑی کے قریب گیا مگر جھجکنے کی کیا بات تھی یہاں قحط نے عشق کو ختم کر دیا تھا۔ شاید قحط کو معلوم نہ تھا کہ مجھے بھوک نہیں لگ رہی تھی یعنی میرا پیٹ بھرا ہوا تھا۔

گاڑی میں زیادہ عورتیں نہ تھیں جتنی تھیں ان میں سے بہت سی بھوکی ان مصیبت کی گھڑیوں کو ختم کر رہی تھیں۔ کچھ اونگھ رہی تھیں اور ایک خاتون اپنے دو بچوں کو بہلا رہی تھیں۔ وہ شاید بھوکے تھے اور ماں کی کوششوں سے چند لمحے کے لئے خاموش ہو کر پھر منہ بسورنے لگتے تھے۔

"معاف کیجئے۔ بچے بھوکے ہیں کب تک بہلائیں گی ان کو آپ میرے پاس بسکٹ ہیں کھلا دیجئے ان کو" میں نے خاتون سے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پہلے تو ارادہ کیا کہ تمام بسکٹ دیدوں مگر میرا معدہ بھی چند سیکنڈ پہلے بھوک کی ایک ہلکی سی آواز بلند کر چکا تھا اس لئے احتیاط کا تقاضہ یہی تھا کہ اس میں سے نصف دیدوں۔ میں نے بڑا سا پیکٹ نکالا اور ماں کو چند بسکٹ دیدئے۔ اس کے بعد میری نظر ڈبے کے ایک کونے پر پڑی جہاں ایک لڑکی عجیب پُراسرار سی بنی بیٹھی تھی۔ اس کی عمر اور شکل و صورت اسرار پناہی کے لئے کسی طرح موزوں نظر نہیں آتی تھی مگر شاید اس نے

قیسی رامپوری

وہاں زندگی محال نظر آرہی تھی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلنے ہی میں خیریت نظر آتی تھی۔

صرف چینی ہوتا ہی تمام مشکلوں کا واحد حل تھا۔ چینی روح اپنا کام کر رہی تھی نظریہ میں تغیر نہ صرف لازمی تھا بلکہ ناگزیر بھی۔ ہندوستان دور تھا۔ روایات ذہن سے غائب ہوتی جا رہی تھیں "خواہش بقا" تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ بہر حال حالات ایسے زیادہ برے بھی تو نہ تھے چینیوں کا تحمل، صبر و استقلال اور صلح جوئی پر آمادگی یہ سب چیزیں ایک مقوی دوا کا حکم رکھتی تھیں۔

غسل کی جگہ ایک لوٹے پانی سے استنجے کرنے نے لے لی۔ مسلمانوں کا ایک ہوٹل تلاش کیا گیا اور ایک ایسا جہاں صرف ترکاریاں ہوتی تھیں۔ ہندو کو تو آرام ہو گیا لیکن مسلمان کے واسطے بڑی مشکل کا سامنا ہوا کیونکہ وہاں حلال گوشت کے معنی تھے بوڑھی اور کمزور بھینس کے رگ پٹھے۔ البتہ ہندوؤں اور عیسائیوں کے لئے مختلف قسم کے کھانے مل سکتے تھے۔ ہندو کے واسطے کئی قسم کی ترکاریاں اور عیسائی کے واسطے عجیب عجیب گوشت۔

کسی ملک کی زبان نہ جانتے ہوئے وہاں کے کسی ہوٹل میں کھانا منگانا ہر ایک کے واسطے اور ہر ملک میں ایک دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ لیکن چین میں خاص طور پر یہ مشکل تر کام ہے کیونکہ ہوٹل کے ملازمین ایک تو موقع و محل کو سمجھنے کے ناقابل ہوتے ہیں دوسرے وہ روزمرہ کے معمول کے اسقدر پابند اور عادی ہوتے ہیں کہ نئی بات کو سلجھانے کے لئے وہ تیار ہی نہیں رہتے۔ تمام کھانوں کے نام یکے بعد دیگرے وہ بڑی تیزی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں بلکہ اگل ڈالتے ہیں اور وہ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ جو گاہک فوراً اپنی مرضی کا کھانا انتخاب کر لیگا۔ اگر اس کو کسی قدر تامل ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ شخص بہرا ہے۔ اس پر کھانوں کی وہی فہرست اسی تیزی کیساتھ لیکن ذرا زور سے اور گاہک کے قریب آکر دُہرا دیتا ہے۔ اب بھی اگر گاہک کو کوئی تامل ہوا اور فوراً اپنا فیصلہ صادر نہ کردے تو اس کو گونگا فرض کر لیا جاتا ہے۔ گونگا اگر بول نہیں سکتا تو لکھ تو سکتا ہی ہے۔ جو لوگ غیر ملکوں سے چونکنگ آتے ہیں ان میں سے اکثر چینی زبان بول تو سکتے ہی ہیں بعض لکھ بھی لیتے ہیں۔ چنانچہ کاغذ اور پنسل پیش کر دی جاتی ہے۔ جب یہ آخری تدبیر بھی کارگر نہیں ہوتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک [illegible] غرق استعجاب ہوتا ہے اور دوسرا اشکال برہمی۔ اب صرف یہ حل باقی رہ جاتا ہے کہ گاہک ہوٹل میں ادھر ادھر چکر لگائے اور دوسروں کے کھانے دیکھکر اشارے سے اپنی ضرورت ہوٹل کے ملازم کو بتائے۔ یہ نرالی حرکت صرف چین ہی میں ممکن ہے اور صرف اسی ملک میں روا ہو سکتی ہے۔ چینی لوگ عملی آدمی ہیں اور اپنی اس خصوصیت کے لئے وہ مشہور ہیں لیکن ان کی یہ خوبی بھی قابل ستائش ہے کہ یہ لوگ ان آدمیوں پر جو عام معاشرتی قاعدے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں نہ کڑی تنقید کرتے ہیں نہ گرفت۔ مذکورہ بالا صورت میں ایسے دوسرے کھانا کھانے والے لوگ ممد ثابت ہوتے ہیں جو یا تو انگریزی جانتے ہیں یا جن میں سمجھ کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ آپ کو ضروری مدد تو دیدیں گے مصافحہ کرلیں گے لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالیں گے۔

چینی لوگ اور کچھ ہوں یا نہ ہوں ان میں دوستی کا مادہ ضرور ہوتا ہے۔ محض ایک سرسری مڈبھیڑ اکثر مستحکم دوستی میں بدل گئی ہے۔ اگر اس سلسلہ میں کوئی رکاوٹ ہوتی بھی ہے تو اس میں قصور ہمارا ہی ہوتا ہے۔ چین میں جا کر ہر شخص گھر کا سا آرام اور چین محسوس کرنے لگتا ہے۔ چینی مہمان اور دوست کسی پر بار نہیں ہوتے۔ اگر ان کی خاطر تواضع زیادہ نہیں ہوتی یا ان پر کوئی زیادہ خرچ نہیں کرتا تو ان کو اس کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ محسوس ہوتا ہے کہ چینی کی دوستی بے لوث ہے۔ گفتگو کبھی بھی بحث کی صورت اختیار نہیں کرتی صحبت خوشگوار ہوتی ہے اور تفکرات کو دفع کر دیتی ہے۔

ہندوستانیوں کی نوآبادی جو اب بھی ایک درجن آدمیوں سے کم پر مشتمل ہے تین سال پرانی ہے۔ ان لوگوں میں زیادہ تر حکومت برطانیہ یا حکومت ہند کے ملازم ہیں۔ کچھ آدمی فلم کمپنیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک شخص تجارت پیشہ بھی ہے مگر یہ بھی فلم ہی سے متعلق ہے۔ ہر نووارد کا استقبال نہایت گرمجوشی کے ساتھ کیا گیا۔ دوستی کے ساتھ بڑی بڑی انوکھی باتیں ظہور میں آتی ہیں۔ مسلمانوں کی شادی میں (چینی عورت کا حسن بلا کا دلکش اور بے پناہ ہوتا ہے) ہندو مسلمان دولھا کا شہ بالا بنتا ہے، مسلمان عیسائی کی تواضع شراب سے کرتا ہے اور ہندو ایک ہی میز پر گوشت خوروں کے ساتھ بیٹھتا ہے۔

اسکاچستانیوں کے متعلق مزاحاً کہا جاتا ہے کہ وہ گھر سے باہر جا کر ہی گھر کا سا آرام محسوس کرتے ہیں۔ یہ مقولہ شاید ہندوستانیوں پر اور بھی زیادہ صادق آتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی ہندوستانی اپنے ملک اور گھر کی تمام جکڑ بندیوں سے خوش ہوتا ہے؟ کیا وہ اس آزادی کا خواہاں نہیں ہوتا جو اسکو صرف باہر جا کر ہی میسر آسکتی ہے؟ مذہب اور روایات پارینہ کا زیادہ سے زیادہ لحاظ اور پابندی اس میں ایک شدید ردعمل پیدا کر دیتی ہے۔

چین میں ملازمین اور دوسرے نیچے طبقہ کے لوگوں کی کم توجہی اور عدم انکسار ایک نووارد کے لئے ایک ذرا عجیب سا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ بجائے تابع فرمان اور خوشامدی ہونے کے آمادہ بہ تندی ہوتا ہے — ہندوستانی مزدوروں سے کس قدر مختلف ہوتا ہے! ہندوستان میں "صاحب" کہلائے جانے والا آدمی یہاں آکر صرف "ہین شینگ" رہ جاتا ہے۔ یہ لفظ صرف "مسٹر" کا مترادف اور رسم چلا ہے۔ یہاں کے دوکاندار خاص طور پر چونکنگ کے خلیق ہوتے ہیں لیکن گڑگڑا کر پیش نہیں آتے۔ اس شہر میں سفیر و قونصل بھی کرایہ کی رکشاؤں میں پھرتے ہیں اور کسی کی خوشحالی اور امارت یہاں کے

غریب سے غریب آدمی کو بھی مرعوب نہیں کر سکتی۔ اگر چونکنگ کی بنا پر کوئی فیصلہ کیا اور حکم لگایا جا سکتا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ چین نے شاید ہندوستان سے پہلے ہی جاگیریت کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور غربا کے طبقہ میں عزتِ نفس کا حس بیدار ہوا۔

اپنے کسی ایسے ہم وطن سے ملاقات جو کچھ عرصے یہاں رہ رہا ہو بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ ملتے ہی ایک بڑی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ پرانی تند خوئی خود اعتمادی اور خود نگری رخصت ہو چکی ہوتی ہے ان کی جگہ رواداری اور میانہ روی لے لیتی ہے۔ آدمی محسوس کرنے لگتا ہے یہ ضروری نہیں کہ صرف وہی حق بجانب ہو دوسرے بھی اسی جیسے ہیں۔

آجکل کی ضروریات کے مطابق تفریحات چونکنگ میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جنگ کی وجہ سے رہے سہے تفریحی مشغلے بھی جاتے رہے اب تو چینی زندگی بڑی خشک اور بے کیف ہے ذرات کی تفریحیں اگر پہلے کبھی تھیں بھی تو اب تو ان کا نام و نشاں بھی نہیں رہا ہے۔ لیکن چونکہ تفریحات کا شوق بڑھ رہا ہے اس لئے امید کی جا سکتی ہے کہ چونکنگ کچھ عرصہ بعد ایک دلچسپ شہر ہو جائے گا۔ یہاں البتہ ایک سینما ضرور ہے جہاں چینی تصویریں بھی دکھائی جاتی ہیں اور غیر ملکی بھی۔ لیکن ڈرامہ صرف چینی پڑھے لکھوں کے لئے ہے۔ جدید چینی ڈرامے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کھیلے جاتے ہیں۔

سینما کا ٹکٹ حاصل کرنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ اسکے لئے زور بازو کی بھی ضرورت ہے تحمل و استقلال کی بھی۔ البتہ ٹکٹ مل جانے کے بعد پھر کسی زور آزمائی یا کشمکش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پھر تو صرف یہ مرحلہ باقی رہ جاتا ہے کہ آدمی داخلے کے ہال میں کھڑا رہے اور اس ساعتِ مسعود کا انتظار کرے جبکہ سینما ہال کا دروازہ کھلے۔ دروازہ کھلتے ہی آپ کو خود اپنے پاؤں چلنے کی زحمت گوارا کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ آپ کو زمانہ قدیم کے شوروغا (ہیرو) کی طرح جوشیلے اور بے تاب تماشائی ہال کے اندر اٹھا کر رکھ دیں گے۔ اندر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اگر آپ ہال کے اندر ادھر ادھر نظر دوڑائیں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ جوش و خروش کا طوفان دب چکا ہے اور کچھ لوگ کمال بے فکری اور بے تعلقی کے عالم میں ادھر ادھر گھوم رہے ہیں بچے بھی طرح طرح سے اپنے اطمینان اور دلجمعی کا اظہار کرنے سے باز نہیں رہتے۔ لیکن زیادہ تر آدمی اپنی اپنی جگہوں پہ بیٹھے اس طرح سستا رہے ہوں گے گویا وہ کوئی بہت بڑی مہم سر کر کے آئے ہیں۔ "فریضہ" کا ضروری رکن سینما جانا ہے۔ تصویر کو بہ نفسہ کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔

پیکنگ ڈرامہ میں ہندوستانی یا کسی بھی غیر چینی کیواسطے دلچسپی اور دلکشی کا سامان نہیں ہوتا کیونکہ اس کے قصے قدیم چین سے متعلق ہوتے ہیں اور غیر چینیوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ ایکٹر کی ہر حرکت اشاری ہوتی ہے اور ناواقف کی درک سے بعید۔ پوشاکیں البتہ زرق برق ہوتی ہیں اور قدیم درباری شان کی یاد دلاتی ہیں۔

جدید چینی ڈرامہ واقعی دیکھنے کی چیز ہوتا ہے۔ اگر مکالمے بالکل سمجھ میں نہ آئیں یا جستہ جستہ آئیں تب بھی ایکٹنگ اتنی اچھی ہوتی ہے کہ دلچسپی کہیں ختم نہیں ہوتی اور اصل قصہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اسٹیج کے اس ایکٹنگ سے ثابت ہوتا ہے کہ چونکنگ جیسی جگہ میں بھی صحیح جوش کیا کیا کچھ کر سکتا ہے یہاں پیدل قدمی سب سے زیادہ دلچسپ اور دلخوش کن مشغلہ ہوتا ہے کیونکہ ایک با مذاق ساتھی کا مل جانا بہت آسان ہوتا ہے (چونکنگ میں ہندوستانی کو بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا) چونکنگ میں ایسی جگہیں کوئی نہیں ہیں جنکو صحیح معنوں میں باغ سے موسوم کیا جا سکے۔

شہر کے مضافات و بیرونجات میں تفریح اور سیر کے لئے جانا وقت طلب بھی ہے اور اس میں خرچ بھی بہت ہوتا ہے۔ بندھی ہوئی صف میں گھنٹہ بھر تک کھڑے رہنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں دوسرے یہ کہ دو گھنٹہ تک بری طرح بھری ہوئی بس کے اندر کھڑے رہنے کی سکت کہاں سے آئے۔ تیسرے یہ کہ صرف چند گھنٹے ایک خوشگوار فضا میں گزارنے کی خاطر یہ کٹھنائی اپنے ذمہ کون لے

غزل

تخیل اک بہلاوا تصور ایک دھوکا ہے
حقیقت خواب ہی ہے خواب کی تعبیر میں کیا ہے

سمجھ لیجے اسی کو ارتقائے سعئ انسانی
کہ دامن زندگی کا شوق کے کانٹوں میں الجھا ہے

ہزاروں گو زمیں عالم میں زیر آرزو ہوں گی
یہی ہوگا یہی اب تک فریب عشق زندا ہے

غم سوز دروں ہے جوہری کو کیا غرض اس سے
یہ کنکر ہے کہ موتی ہے، یہ پتھر ہے کہ ہیرا ہے

الٰہی اس عجب فطرت کا کیا مفہوم ہے آخر
جنہیں سو طرح کے غم ہیں، دل ہے اور تمنا ہے

یہ طفلانِ ازل محرومِ سوزِ عشق کیا جانیں
تمنا نقش ہے یا دل پہ انگارہ دہکتا ہے

نفس ہی ہے یہ میں نہیں دہر کی جولانیاں ساری
جو قطرہ ہے تو دریا ہے، جو ذرہ ہے تو صحرا ہے

جو پہلے جا چکا ہے، وہ زمانہ پھر نہ آئے گا
غرض ثابت ہوا انسان ہر منزل پہ تنہا ہے!

میں خرماں آپ کو تشبیہہ دوں کس تذکرے سے
بس اک گل، جو خراب آباد صحرا میں کھلتا ہے

خرماں خیرآبادی

جبکہ تفریح اور سیر کے دوران میں بھی واپسی میں پیش آنے والی دقتوں کا روح فرسا احساس موجود رہے۔

دوستانہ صحبت خواہ صرف چند ہی آدمیوں پر مشتمل ہو بہت پر لطف ہوتی ہے۔ چینی لوگ تصنع سے بہت دور رہتے ہیں اور شیخی بھی نہیں بگھارتے۔ چینی خاتون خنک مزاج زندہ دل اور دوستی کی قدر دان ہوتی ہے۔ اس میں نہ بے حجابی ہوتی ہے اور نہ مصنوعی حجاب۔ آؤ بھگت اور خاطر تواضع میزبان پر خواہ وہ عورت ہو خواہ مرد بھی بار نہیں ہوتی اور آدمی کو میزبان کے ہاں حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

چونکنگ کے بدیشی آدمی ہندوستان سے اس سے بھی زیادہ ناواقف ہوتے ہیں جیسے معمولی تعلیم یافتہ ہندوستانی امریکہ یا یورپ سے۔ ایسی معمولی سی بات بھی کہ ہندوستانی لوگ انگریزی جانتے ہیں بعض اوقات ان لوگوں کی حیرت کا موجب ہوتی ہے۔ ہندوستانی ایجنٹ جنرل نے جب پہلی تقریر انگریزی میں کی تو لوگوں کو بڑا تعجب ہوا اور بہت سے مشنریوں نے تعریف کی کہ چین ایک بیچ بیچ تو ایسی اچھی انگریزی بولنا جیسی خاص انگریز لوگ! ہندوستانیوں سے اکثر پڈگن انگریزی میں بولا جاتا ہے کیونکہ بعض بدیشی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ زبان ہے جسکو کم از کم تمام کالے آدمی سمجھتے ہیں شاید یہ غلط فہمی خانگی نوکروں اور ہوٹلوں کے نمائندوں کی پھیلائی ہوئی ہے۔ اس نقش اولیں کو مٹانا مشکل ہے۔

ہندوستانی ایجنسی جنرل کے موجودہ صدر نے چینیوں اور دوسرے غیر ملکیوں کی نظر میں ہندوستانیوں کا وقار بڑھانے کی بڑی سعی بلیغ کی ہے (ہندوستانی ایجنسی جنرل کے متعلق یہ غلط فہمی ہے کہ یہ ایک تجارتی ادارہ ہے)

چین میں ہندوستانی لوگ بہت خوش و خرم رہتے ہیں۔ اکثر دقتیں بھی اٹھانا پڑتی ہیں اور بعض موقعوں بڑی تکلیف بھی پہونچتی ہے لیکن ان مشکلات کا معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔ دوستی، ہمدردی اور نیک سلوک کی صورت میں

دو غزلیں

راز الفت عیاں نہ ہو جائے
سعی غم رائگاں نہ ہو جائے

نا امیدی ہے اب تو وہ بیکس
پھر کوئی مہرباں نہ ہو جائے

نگہ لطف سے نہ دیکھ نہ دیکھ
پھر تمنا جواں نہ ہو جائے

ہم ہیں نازاں وفا پہ وہ شاکی
اف کوئی بدگماں نہ ہو جائے

ہم کو مرتے ہیں لے وفا والو
ختم یہ داستاں نہ ہو جائے

خاکساروں کو تو حقیر نہ جان
یہ زمیں آسماں نہ ہو جائے

اے نشیمن کو پھونکنے والے
برق خود آشیاں نہ ہو جائے

تیرے اشعار کی زمیں، سحر
غیرت آسماں نہ ہو جائے

قفس سے سوئے آشیاں دیکھتا ہوں
کہاں ہوں الٰہی کہاں دیکھتا ہوں

ہر اک شے میں جلوہ ترا یا الٰہی
نہاں دیکھتا ہوں عیاں دیکھتا ہوں

مرے دل کی ویرانیوں میں وہ آہیں
مکیں دیکھتا ہوں مکاں دیکھتا ہوں

مکیں دہر کے ذرہ ذرہ میں تو ہے
تجھی کو مگر لامکاں دیکھتا ہوں

میں عاصی سہی بندہ تیرا ہوں لیکن
زمیں ہوں مگر آسماں دیکھتا ہوں

نظر میں ہے دنیا تو دل میں ہے عقبیٰ
یہاں دیکھتا ہوں وہاں دیکھتا ہوں

نظر سے مری بدگماں تو ہے لیکن
میں دل میں تجھے بے گماں دیکھتا ہوں

سحر جس پہ تھا انحصار تمنا
میں وہ آہ بھی رائگاں دیکھتا ہوں

مہندر سنگھ بیدی سحر

حبشہ اور اس کے باشندے

اگر آپ حبشہ کا تصور کرنے لگیں تو میرا خیال ہے کہ بنفشہ اور ریحان تو شاید ہی آپ کے ذہن میں آئیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس ملک میں متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں یہ پھول پائے جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۲ء میں جب میں نے کچھ لوگوں سے ذکر کیا کہ حبشہ جانے والا ہوں تو ان کو مجھ پر بڑا رحم آیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اب کئی برس تک مجھکو تپتے ہوئے ریگستان میں رہنا پڑے گا۔ اور پھر قاہرہ اور عدن میں میرے کرم فرما دوستوں نے بار بار یہی کہا "افسوس! اب تم وہاں سے زندہ واپس نہ آسکوگے۔ اس ملک میں تو ہمیشہ طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہوتی رہتی ہیں"۔

ان باتوں کو سننے کے بعد آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب میں پہلے عدیس ابابا پہونچکر ان باتوں کو بالکل غلط پایا ہوگا تو مجھکو کس قدر تعجب ہوا ہوگا۔ عدیس ابابا تو درحقیقت "باغوں کا شہر" ہے پایۂ تخت سے ذرا ہی باہر کوہ انٹوٹو سے نیچے نظر کرکے دیکھئے تو آپ کو یہ سارا کا سارا شہر یوکلپٹس کے درختوں سے ڈھکا ہوا اور اس کی بھینی بھینی خوشبو میں بسا ہوا نظر آئے گا۔ نیلگوں آسمان کا پس منظر تو اور بھی دلفریب ہوتا ہے۔ یہیں سے آپکو شہنشاہ حبش کا محل سینٹ جارج کا گرجا، ریل کا اسٹیشن اور اکثر سرکاری عمارتیں نظر آجائیں گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ دیکھیں گے کہ اہل حبش کی ہزاروں جھونپڑیوں سے دھواں اٹھ رہا ہوگا۔ یہ عدیس ابابا کا عجیب شہر۔ شہر کو آباد کرنے کے سلسلہ میں واقعی کسی خاص ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اسکو اسی لئے مضافات کا شہر کہتے ہیں اس کا کوئی مخصوص مرکز بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی اس میں ایک ایسی بے نام دلکشی اور رعنائی ہے جس کی وجہ سے بہت سے انگریز خاندانوں نے یہاں اپنا مستقل مسکن بنا لیا ہے۔ اگر آپ صبح سویرے یا غروب آفتاب کے وقت کوہ انٹوٹو پر چلے جائیں تو آپ کو ایسے رنگین مناظر نظر آئینگے جنکو آپ آسانی سے فراموش نہ کرسکیں گے۔

میں "فرینڈس ایمبولینس یونٹ" کے ساتھ طبی کام میں مدد دینے کیلئے وہاں گیا تھا۔ سال بھر تک میں بالکل تنہا رہا۔ میری جائے سکونت بشوفتو سے میلوں دور تک کوئی انگریز نہ تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی جگہ ہے جو اس ریل کے راستہ میں پڑتی ہے جو فرانسیسیوں نے ملک کی سرحدی بندرگاہ سے بنائی تھی۔ میں ایک بہت ہی خوش منظر جھیل کے کنارے ایک پرانے اطالوی ہوٹل میں رہتا تھا۔ یہاں پرندے بڑے بڑے خوبصورت نظر آئے۔ ان میں بیا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی افریقائی چڑیاں تھیں مثلاً لال چڑیا، لال اور صدہا رنگ برنگ کے کرنجے پرندے جنکے نام مجکو معلوم نہیں ہوسکے۔

جھیل کے پاس ہی ایک روسی مرد اور اس کی بیوی کا بنگلہ تھا یہ دونوں یہاں تقریباً چالیس سال سے تھے ہر ہفتہ میں ایک دفعہ ان کے ساتھ چا پینے اور ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی زبان میں بات چیت کرنے جایا کرتا تھا۔ میڈم پالوف رائی کی بڑی مزیدار ڈبل روٹی بناتی تھیں اور چا ہمیشہ بہت ہی چمکدار سماوار میں ہوا کرتی تھی لیموں کا ایک ٹکڑا بھی ضرور رہا کرتا تھا۔ موسیو پالوف نے لیموں بھی اپنے بنگلے کے احاطہ میں دوسرے پھلوں کے ساتھ بو رکھے تھے۔ ان کے مکان کے ایک ایک کونہ اور ایک ایک چیز سے ان کے شکاری ہونے کا ثبوت ملتا تھا مثلاً ردی کی ٹوکری ہاتھی کے پاؤں کی تھی۔

بشوفتو سے میں عدیس ابابا ریل میں جایا کرتا تھا۔ مجکو بطور خصوصی رعایت گارڈ کے ڈبے میں جگہ ملتی تھی۔ ریل کے ڈبوں کے اندر اگر جگہ موجود بھی ہوتی تھی پھر بھی لوگ ریل کی چھت پر بیٹھکر سفر کرتے تھے۔ ریل میں ناشتہ اور کھانے کا ڈبہ نہیں ہوتا لیکن اگر آپ کے ساتھ ملازم ہے تو آپ چائے دان دیکر اسکو انجن میں بھیج سکتے ہیں اور وہاں چا پک سکتی ہے۔

یاد رہے کہ ملک کا زیادہ تر حصہ ۔ ۔ ۔ ۸ عرض البلد میں واقع ہے اسلئے یہ خطہ ایک جھلکتے ہوئے ریگستان کے بجائے اچھا خاصا شاداب علاقہ ہے۔ پانی کی کوئی قلت نہیں اور فصل بڑی آسانی سے تیار ہوجاتی ہے۔ بارش بکثرت ہوتی ہے لیکن صرف تین مہینوں میں جولائی۔ اگست اور ستمبر میں۔ یہ بھی بڑی خوش قسمتی کی بات ہے ورنہ یہ تین مہینے سب سے زیادہ گرمی کے ہوا کرتے۔

جان گرم زویدم

اگرچہ ہم اس زمانہ کو برسات کا موسم کہتے ہیں لیکن یہ زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتا کیونکہ بارش عموماً دن میں صرف تین چار گھنٹے ہوتی ہے مگر جسوقت مینہ برستا ہوتا ہے اسوقت کوئی بھی برساتی کپڑا کام نہیں دے سکتا۔ ایک دفعہ برسات ہی کے موسم میں میرا ایک ڈرائیور لاری کے پچھلے حصہ میں تھا اور بارش بہت تیز ہورہی تھی۔ اتفاق سے اس کے پاس دس مرغیاں بھی تھیں جو اس نے میرے لئے خریدی تھیں۔ ان میں سے چھ تو بہہ کر ڈوب گئیں۔ باقی باورچی خانہ کی آگ میں خوب تاپی گئیں تب جاکر گویا دوبارہ زندہ ہوئیں۔

ایک سال بعد میں ملک کے شمالی حصہ کی طرف چلا گیا۔ مدیگرات میں جاکر رہا۔ یہاں بھی تنہا ہی رہنا پڑا۔ یہ مقام حبشہ کی سرحد پر ہے اور اطالوی نے

لاکھوں روپیہ کے خرچ سے اسکو بنایا گیا ہے۔ اوپر چڑھ کر آپ کو ایک ایسا خوبصورت منظر دکھائی دے گا جسکے حسن کا بیان نہیں ہو سکتا۔ ڈبرامینا کو چھوڑ کر جو عدیس ابابا کے شمال میں ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر ہے آپ تیرہ میل میں سات ہزار فٹ نیچے اتر آئیں گے اور ایک بہت بڑا میدان آپ کے سامنے ہوگا۔ اس کے بعد آپ پھر اوپر چڑھنے لگیں گے اور رفتہ رفتہ ڈیسی تک پہونچ جائیں گے۔

ان ڈھلانوں پر اوپر کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں بعض دفعہ کوئی دیہاتی پاکستان لاری روکنے اور اسکو چڑھنے دینے کی درخواست کرتا ہے لیکن چونکہ اس قسم کے ڈھلان پر بھری ہوئی لاری کو روکنا بڑا مشکل کام ہے اسلئے اکثر انکار کرنا پڑتا ہے۔ آپ ذرا میرے تعجب کا اندازہ کیجئے جو مجھکو اس وقت ہوا ہوگا جبکہ میں نے چند منٹ بعد پھر اسی آدمی کو گاڑی روکنے کی درخواست کرتے ہوئے پایا جسکو کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ اصل میں وہ شخص کسی سیدھے راستہ سے لاری سے بہت جلدی اوپر چڑھ آیا تھا اور لاری ٹیڑھے میڑھے راستوں کو طے کرتی ہوئی اس شخص سے دیر میں وہاں پہونچ سکی تھی۔

شہر کم ہیں اور فاصلہ پر

اس شاہراہ پر شہر بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ ایک دوسرے سے بہت دور دور ہیں اگر راستہ میں لاری خراب ہو جائے۔ اور ایسا اکثر ہوتا ہے۔ تو اگر آپ کے ساتھ کوئی مستری نہیں ہے تو آپ کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑیگا یہ علاقہ زیادہ تر گنجان دیہاتوں کا ہے ایک دفعہ میں نے ایک نقشہ میں ایک جگہ دیکھی اور اپنے اندازہ اور حساب کے مطابق اس جگہ پہونچ گیا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں ایک کافی اہم پینٹھ لگا کرتی ہے اور اگر میں وہاں کسی جمعرات کو پہونچتا تو ہزاروں آدمیوں کو دیکھتا۔

افریقہ کے دیگر مقامات کی طرح حبشہ میں پینٹھ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

دیہاتی لوگ بڑی بڑی دور سے معمولی معمولی چیزیں فروخت کرنے یا ان کا تبادلہ کرنے آتے ہیں۔ ایک ایک یا دو دو گدھوں پر لاد کر لوگ غلہ، مرغیاں، انڈے اور لال مرچیں لاتے ہیں اور ان چیزوں کے عیوض تھوڑا سا کپڑا یا نمک لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور کام بھی ضرور ہوتا ہے وہ یہ کہ ایسے پینٹھ لگے دو ایک گھنٹہ کسی چھوٹی سی سرائے میں بھی ضرور گزارتے ہیں۔ سرائے میں سبز سنٹھے بچھے ہوتے ہیں اور لمبی لمبی نیچی نیچی بنچیں پڑی رہتی ہیں یہاں یہ لوگ کوئی بڑی تیز شراب پیتے ہیں اور گپ شپ لڑاتے ہیں۔ شراب پینے کا گلاس بڑی عجیب و غریب صورت کا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ کسی سرائے میں عدیس ابابا سے آیا ہوا کوئی اخبار بھی موجود ہوتا ہے۔ اخبار میں یا تو مویشیوں کی قیمت درج ہوتی ہے یا وزارت کی تبدیلیوں کا حال لکھا ہوتا ہے۔ دراصل یہ سرائے ہمارے کلبوں کا کام دیتی ہے۔ سرائے میں جو لوگ سودا بیچنے کے بعد جمع ہوتے ہیں ان کے نظریئے بہت تنگ اور محدود ہوتے ہیں اور ایسا ہونا ہی چاہیئے اخبار میں جو چیزیں یورپ کے متعلق درج ہوتی ہیں وہ ان کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان کو بہت کم معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اردگرد کے علاوہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے سمندر کبھی نہیں دیکھا اور عدیس ابابا بھی یہ ایک آدھ ہی دفعہ گئے ہونگے وہ بھی ریل دیکھنے۔ اس صورت حال میں ان لوگوں پر یورپی حالات و کوائف اور جدید ترین مسائل کا انکشاف کرنا بڑی مشکل بات ہے۔

ایک عام حبشی بہت غریب اور تہیدست ہوتا ہے۔ اس کا معیار حیات اور طرز معاشرت قابل افسوس حد تک پست ہے حالانکہ ان کے قبضہ میں بہت سی زرخیز زمین موجود ہے۔ لیکن جبتک اس کو صرف برائے زیبتن روٹی ملتی رہتی ہے یہ اپنی عملی قوت کو خوابیدہ رکھتا ہے کیونکہ اپنے حال کے تقابل کیواسطے اسکے سامنے کوئی اور معیار ہے بھی تو نہیں۔ حبشی بالطبع مہمان نواز ہوتے ہیں جب میں خچر پر سوار کسی گاؤں کی طرف سے گزرتا

غزل

تم نغمۂ ماہ و انجم ہو تم سوز تمنا کیا جانو
تم درد محبت کیا سمجھو، تم دل کا تڑپنا کیا جانو

کیا ذکر صلہ کیا ہوک اٹھی کیوں ٹیس اٹھی کیوں آہ کبھی
تم گم ہو بہاروں میں اپنی، تم غم کا فسانہ کیا جانو

اک صبح تبسم ہونٹوں پر اک نغمۂ رنگیں آنکھوں میں
تم رقص ثریا کیا سمجھو، تم سوز بط زہرا کیا جانو

تم روٹھ گئے جب جب ہم سے، ہم تم کو منا ہی لیتے تھے
اک بار اگر ہم روٹھ گئے تم ہم کو منانا کیا جانو

تخریب محبت آساں ہے تعمیر محبت مشکل ہے
تم آگ لگانا سیکھ گئے، تم آگ بجھانا کیا جانو

دنیائے محبت میں شاید پہلے ہی پہل تم آئے ہو
تم ڈوبتی نبضیں کیا سمجھو، تم دل کا دھڑکنا کیا جانو

تم دور کھڑے دیکھا ہی کئے اور ڈوبنے والا ڈوب گیا
ساحل ہی کو تم منزل سمجھے، تم لذت دریا کیا جانو

تم حسن سراپا اپنی جگہ، اور حسن سراپا خودداری
اقبال کا غم تم کیوں سمجھو، اور اسکا دوا کیا جانو

اقبال عظیم

تو مجکو اکثر ماحضر پر مدعو کیا جاتا تھا۔

حبشیوں کی اصل خوراک روٹی ہے جسکو "انگرا" کہتے ہیں۔ اس کی صورت کلچہ کلچہ ایسی ہوتی ہے۔ رنگ بادامی سا ہوتا ہے اور سائیکل کے پہیے کے برابر بڑی ہوتی ہے اس روٹی پر لال مرچوں کی چٹنی ڈال دی جاتی ہے اور اگر آپ کی قسمت نے زور کیا تو اس پر تھوڑا سا گوشت بھی رکھدیا جاتا ہے۔ چونکہ لال مرچ گرم بہت ہوتی ہے اس لئے ایک خاص قسم کی شراب بکثرت پینا پڑتی ہے۔ یہ شراب مقامی طور پر جَو سے بنائی جاتی ہے۔ یہاں کی بہترین شراب "تیج" ہوتی ہے جو شہد سے بنائی جاتی ہے۔ میں نے انگریزی "میڈ" کبھی نہیں پی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اسی قسم کی ہوتی ہو گی۔

مجکو یہ کھانا مرغوب ہو گیا تھا اور میں نے کئی موقعوں پر کھایا۔ مجکو یاد ہے کہ ایک روز ایک پہاڑی کی چوٹی پر میں نے ایک بہت بڑا شاندار مکان دیکھا۔ میرے ڈریسر نے مجکو بتایا کہ وہ کسی مقامی رئیس کا تھا۔ پس میں نے وہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔ ہم دونوں خچروں پر سوار ٹیڑھے میڑھے راستے سے ہوتے ہوئے وہاں پہونچے۔ ہماری پذیرائی ایک خوش مزاج نوجوان نے کی۔ وہ جگہ بالکل ایسی تھی جیسی میرے ذہن میں ایک قدیم جاگیردار کے محل کی تصویر محفوظ تھی۔ لیکن یہ مکان صرف تیس سال پرانا تھا۔ اس کے چاروں طرف پتھر کی دیوار کھنچی ہوتی تھی اور ملازموں کے رہنے کے متعدد گھر تھے ہال کے اختتام پر پلنگ بچھے ہوئے تھے جن پر بڑے قوق البرق قالین پڑے ہوئے تھے۔ ہال خوش خنک، صاف ستھرا اور بہت بلند تھا۔ دیواروں پر چونے کی سفیدی ہو رہی تھی اور چھت بہت خوبصورت تھی اور پوال کی بنی ہوئی۔ تین پلیاں اور ایک بہت ہی صاف بکری بھی تھی۔ ان سے رئیسانہ شان پوری ہوتی تھی۔ ہال کے باہر انگریزی وضع کا ایک چھوٹا سا صحن تھا۔

حبشہ میں ڈاکٹروں کی بڑی کمی ہے پورے ملک میں پچاس بھی نہیں ہیں۔ اس لئے عدیگرات میں صبح کا بیشتر حصہ میں سپتال ہی میں گزارتا تھا جن کو ہر قسم کی بیماریاں ہوتی تھیں۔ کچھ کیسوں میں ان لوگوں کی جیبوں تک بھی جانا پڑتا تھا۔ زبان کی مشکل نے شروع شروع میں بڑا مذاق رکھا۔ مجکو زبان باہر نکالو" تو حبشی زبان میں کہنا آتا تھا لیکن "اندر کر لو" کہنا نہیں جانتا تھا۔ اس لئے کہ مریض زبان کو خود ہی اندر کرے میں مختلف قسم کے سوالات کرنے لگتا تھا لیکن بیچارہ مریض مجکو تکتا ہی رہتا تھا اس صورت میں کہ اس کی زبان باہر نکلی ہوتی تھی اور منہ کھلا ہوا۔

پچکاری اور سوئی

میرے ڈریسر جلد ہی میری طوطے کی ایسی انگریزی زبان سمجھنے لگے۔ ان لوگوں کو انجکشن بہت پسند ہے۔ اور پچکاری اور سوئی پر بڑا بھروسہ ہوتا ہے۔ مجکو ایک دفعہ بیچ کھیت میں ایک شخص نے روک لیا اور آستین الٹ کر ایک نس کی طرف اشارہ کرنے لگا اسے امید تھی کہ میں وہیں کے وہیں اس کے انجکشن لگا دوں گا۔

اس ملک میں ہر قسم کی بیماری ہوتی ہے۔ بخاروں میں باری کا بخار، ٹائفس، گردن توڑ بخار، نمونیا اور ملیریا عام طور پر ہوتا ہے۔ پھر آنکھوں کی اور جلدی بیماریاں پھوڑے اور ناسور بھی ہوتے ہیں۔ شمالی صوبہ میں جو ویلز سے دگنا ہے "فرینڈس ایمبولینس" کی صرف تین یونٹس تھیں انہیں کے سپرد تمام شہریوں اور بیشتر سپاہیوں کی دیکھ بھال تھی۔ ڈاکٹر صرف ایک تھا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ یہ ڈاکٹر چھ یا سات ہفتوں میں ایک دفعہ میری مدد کرنے آیا کرتا تھا کیونکہ ایسی بہت سی جگہیں ہیں جہاں کبھی کوئی ڈاکٹر گیا ہی نہیں۔ مریض میرے پاس بڑی دور دور سے آیا کرتے تھے۔ بعض صورتوں میں مریض سو سو میل سے گھر کی بنائی ہوئی ڈولی میں آتے تھے جسکو مریض کے دوست اٹھاتے تھے۔ بعض دفعہ کوئی کوئی مریض بڑے خدم وحشم کیساتھ آیا کرتا تھا۔ ایک روز صبح کو میں نے دیکھا کہ معمول سے بہت پہلے سے ہی کوئی پچاس آدمی میرا انتظار کر رہے ہیں۔ جب میں پہلے آدمی دیکھ چکا تو میں نے دوسرے کو بلایا لیکن کوئی بھی نہ آیا۔ معلوم ہوا وہ پہلا شخص کوئی رئیس تھا اور باقی کے انچاس آدمی اس کے نوکر تھے۔

بچوں کا انگریزی کا شوق

سہ پہر کو میں اکثر اسکول میں پڑھانے چلا جاتا تھا۔ آپ کو یہ معلوم کر کے کہ اسکول کے لڑکے انگریزی پڑھنے کے کسقدر شائق تھے بڑا تعجب ہوگا۔ تعلیم کی حبشہ کو بڑی شدید ضرورت ہے تعلیم ترقی کی کلید ہے۔ مدرسے کھل رہے ہیں اور ان میں طلبا بھی پابندی کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں لیکن ان میں تعلیم کا سامان بھی کم ہے اور جگہ کی بھی قلت ہے۔ اس وقت بڑی عمر کے لوگوں میں بہت کم آدمی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا حافظہ اسقدر تیز ہے اور وہ کئی کئی زبانیں جانتے ہیں۔ بہت سے حبشی تین تین اور چار چار زبانیں جانتے ہیں بلکہ میں ایسے لوگوں سے بھی ملا ہوں جو سات سات زبانوں سے واقف ہیں۔ اگر شمالی آدمی کو دنیا کا سب سے بڑا زبان داں آدمی سمجھا جاتا ہے تو میرے خیال میں حبشی اگر اس سے پیچھے ہے تو فرق بہت ہی کم ہے۔

مشرق وسطیٰ کی خبریں

(ادارہ)

مصر اور تعلیم

جامعہ مصریہ کے عزیز نوجوانو! تم اپنے وطن کی مستقل عسکری قوت ہو۔ اس جنگ کے خاتمے کے ساتھ لڑنے والی فوجوں کا فرض پورا ہوگیا لیکن نوجوانوں کی فوج دورانِ جنگ کی طرح امن و عافیت کی فضا میں بھی اپنے مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کمربستہ رہیگی۔ انھیں افلاس، بیماری، جہالت اور خوف و دہشت کے استیصال کا بیڑا اٹھانا ہے تاکہ تمہاری جدوجہد سے غریب مزدوروں اور کسانوں کی زندگی خوشگوار ہوجائے۔ اگر ہر فوج کا ایک جنگی ترانہ ہوسکتا ہے تو تم بھی اپنے لئے ایک ایسا ترانہ منظم کرو جسکی مرنج عمل ملک کے لئے فلاح و بہبود، مریضوں کے لئے صحت و تندرستی، جاہلوں کیلئے تعلیم و تربیت اور دہشت زدہ انسانوں کے لئے اطمینان و سکون ممکن کر دکھائے۔ یہ تھے وہ جوشیلے الفاظ جو شاہ فاروق نے اسکندریہ کے نوجوان طالب علموں کو مخاطب کرکے فرمائے۔ شاہ موصوف ملک کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں خاص دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اور حال ہی میں ایک شہر جامعہ تعمیر کرنے کیلئے تقریباً ایک لاکھ پونڈ کی گرانقدر رقم عطا کی ہے۔ اتنی ہی رقم حکومت نے بھی نذر کردی۔ اب یہ مقصد سامنے ایک غیر سرکاری جماعت شروع کرنالی ہے جسکی سرپرستی بھی خود شاہ فاروق فرمائینگے

عرب لیگ کی نئی سرگرمیاں

حال ہی میں سب آفس کا دفتر اسکندریہ منتقل کیا گیا ہے ارباب حل و عقد نئے نقشے اور لائحہ عمل مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ توی امید ہے کہ بہت جلد لیگ ایک پندرہ روزہ اعلامیہ (بلیٹن) جاری کریگی جسمیں عام اخبارات و رسائل، اراکین پارلیمان اور عوام الناس کی آگاہی اور استفادے کے لئے تمام دنیائے عرب کی خبریں اور مختلف نظریئے شائع ہوا کرینگے۔ ایک سہ ماہی رسالہ جاری کرنیکا ارادہ بھی ہے۔ اس کمیٹی نے جو مسائل صنعت و تجارت پر غور و خوض کرنے کے لئے مرتب کی گئی تھی، بنیادی اصول طے کرکے اپنی رپورٹ پیش کردی ہے جسمیں مشرق وسطیٰ کے ممالک کی اقتصادی اور تجارتی ترقیوں کے سلسلے میں رونما ہونیوالی سرگرمیوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ قیاس ہے کہ ایک مستقل کمیٹی بنائی جائیگی جو تمام عرب ممالک کے مابین صنعتی اور تجارتی قیود کو توڑ کر مدد کو وسیع کرنے کے لئے اپنی رائے پیش کرسکے۔ یہ بھی فیصلہ ہوگیا ہے کہ عرب لیگ سے متعلق تمام ممالک اپنے اپنے بجٹ کے مطابق لیگ کے لئے چندہ دیں۔ حکومت شام نے تجویز کیا ہے کہ عرب لیگ کے ماتحت ایک فوجی ادارہ قائم کیا جائے تاکہ تمام عرب ممالک کے باشندے اسمیں داخل ہوکر فوجی تربیت حاصل کرسکیں۔ کثیر سرمائے سے حمل و نقل کی ایک بری کمپنی بھی قائم ہونے والی ہے جس میں مصر، فلسطین، شرق اردن اور شام کے لوگ شریک ہوں گے۔ بہت سی موٹریں اور سامان ڈھونے کی گاڑیاں مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک کے سرے سے ایک دوسرے سرے تک ملادیگی تاکہ کم خرچ پر سفر کرنا اور مال بھیجنا ممکن ہو جائے۔

سوڈان میں زراعتی ترقی

سوڈان میں قابلِ زراعت اراضی کے قطعات اسقدر وسیع ہیں کہ ان کی پیداوار وہاں کے باشندوں کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے اور اب یہ بھی فیصلہ کیا جاچکا ہے کہ مستقبل قریب میں زراعتی مشینیں بہت بڑے پیمانے پر کام میں لائی جائینگی۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر قسم کے اناج کی پیداوار بے قیاس ہوجائے گی اور سوڈان مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک سے اجناس کی تجارت کرسکیگا۔ کھیتوں میں پرانے ہل وغیرہ کی بجائے اگر مشینیں استعمال کی جائیں تو کم تعداد میں کاشتکار اور مزدور درکار ہونگے ہیں لیکن فی الحال بیکار پڑی ہوئی زمینوں کو جب زراعت کے لئے استعمال کیا جائیگا تو ظاہر ہے کہ ان کی مانگ گھٹنے کی بجائے بڑھ جائے گی اور بے روزگاری کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ اگر مشینیں وقت موجود پر پہنچ گئیں تو آئندہ فصل ہی میں یہ آزمائش بڑے پیمانے پر شروع کردی جائے گی۔

عراق کے گرمائی مدارس

عراق کی وزارت تعلیم طلباء کے لئے ہر سال "گرمائی مدارس" کا اہتمام کرتی ہے جسکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلباء اس یکرنگی و بے کیفی سے نجات پاسکیں جو موسم گرما میں سارے فضا پر طاری رہتی ہے۔ وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں حصہ لے کر ہر لحاظ سے اپنے جوہر ذاتی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ یہ مدرسے موسم گرما کی تعطیلات شروع ہونے سے قبل کھلتے ہیں۔ وہاں ورزش، کھیل، تیراکی، گھوڑا سواری اور موسیقی کے علاوہ نجاری، نقاشی، اداکاری اور ابتدائی تیمار داری میں حصہ لیا جاتا ہے۔ گذشتہ چار سال سے یہ سلسلہ قائم ہے۔ فی الحال بغداد، بصرہ، موصل، کربلا، حلہ، دیوانیہ، عمارہ، یعقوبہ اور کوت یعنی نو صوبے ایسے ہیں جہاں سے ایک ایک مدرسے کے طلبا اسمیں شریک ہونے کے لئے بھیجتے ہیں۔

شرح مبادلہ میں اضافہ

دورانِ جنگ میں حالات نامساعد ہونے کے باعث دو برس تک ہندوستان سے حاجی زیارت بیت اللہ کے لئے نہ جاسکے۔ صرف پچھلے سال حکومت نے بہت محدود تعداد میں ان کی روانگی کا انتظام کیا تھا۔ اس سال کیلئے بھی تعداد کا تعین بقدر نو ہزار ہوا ہے۔ سب سے پہلے حکومت عرب نے شخصی محصول بڑھا کر حاجیوں پر بار ڈالا۔ اب خبر آئی ہے کہ شرح مبادلہ میں اضافہ کرکے ریال کی قیمت سوا روپے کی بجائے پونے دو روپے کردی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ نو ہزار حاجیوں کو کم از کم پندرہ لاکھ روپے زیادہ خرچ کرنے پڑینگے۔ حکومت عرب یہ اصرار بھی کر رہی ہے کہ حکومت ہند بڑھی ہوئی شرح کے مطابق تمام حاجیوں سے محصول پیشگی جمع کرکے اسے بھیجدے۔ حکومت ہند نے اس تجویز میں ترمیم کرتے ہوئے کہا کہ یہ محصولات اس وقت جمع کئے جائینگے جب جہاز کراچی سے روانہ ہوچکیگا۔ مرکزی حج کمیٹی نے اس طریقہ کار کے خلاف سخت اظہار برہمی کیا ہے۔ اس نے ریال کی بڑھی ہوئی قیمت کے خلاف بھی آواز اٹھائی ہے۔

مصر کے پایۂ تخت قاہرہ کے ایک بڑے آباد محلے میں ایک مکان ایسا بھی ہے جس پر خاموشی اور دہشت ہر وقت چھائی رہتی ہے اور اس بنا پر وہ "منزل ویراں" کے نام سے مشہور ہے۔

عرصہ دراز سے اسکے اصلی باشندے اسے چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں اور محلہ کے بڈھے بڈھے اور بوڑھیاں بالاتفاق رائے بیان کرتی ہیں کہ یہ شیاطین کا مسکن ہے۔ ان کے اس قول کے مطابق اسی مکان کے بارے میں طرح طرح کے ڈراؤنے اور خوفناک قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ بہرحال تو ہمات نے اس درخشاں محلے کے وسط میں اس عالیشان مکان پر تاریک پردے ڈال رکھے ہیں۔ اس گھر کا صحن بہت کشادہ ہے جہاں سے صبح و شام چمگادڑوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ ان آوازوں نے قریب کے گھروں میں اس کے خوف اور دہشت میں مزید اضافہ کر رکھا ہے۔

ایک روز اس گھر کے پڑوسیوں کو اس خبر نے دہشت زدہ بنا دیا کہ کسی نامعلوم شخص نے اسی مکان کو اپنا مسکن بنا لیا ہے۔ اس شخص کے دیکھنے والے اسکا یہ حلیہ بیان کرتے ہیں کہ وہ نامعلوم شخص ادھیڑ عمر کا ہے مگر بڑھاپے کے آثار اس پر نمودار ہونے شروع ہو گئے ہیں وہ بدصورت اور بوڑھا ہے اور اس کی کمر کبڑی ہے۔ مغرب کے وقت وہ اس مکان میں ایسی حالت میں داخل ہوا کہ ایک ہاتھ سے وہ لاٹھی کا سہارا لئے ہوئے تھا اور اسکا دوسرا ہاتھ ایک نہایت ہی بدصورت حبشی خادم پکڑے ہوئے تھا اس ہیبتناک منظر سے لوگوں میں جوش اور گھبراہٹ بڑھ گئی اور نئے باشندے کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ بالآخر لوگ اسے ایک جادوگر خیال کرنے لگے جس نے شیطانوں کو تابع کر رکھا ہے۔

یہ شخص صرف جمعہ کے دن فریضۂ جمعہ ادا کرنے کیلئے گھر سے باہر نکلتا تھا اور نماز پڑھتے ہی واپس آ جاتا تھا۔ اس کے بعد کوئی شخص آئندہ جمعہ کے علاوہ اور کسی وقت اسکو باہر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس موقع پر بھی اس کی آمد و رفت کے وقت لوگوں میں طرح طرح کی اشارہ بازی ہوتی تھی۔

اسی دہشت ناک منزل کے سامنے ایک عظیم الشان مکان ہے جس میں ایک امیر کبیر لطیف پاشا اپنی بیوی سیدہ نادرہ اور اپنی انیس سالہ بیٹی فاطمہ کے ساتھ مقیم تھا۔ فاطمہ کی حقیقی والدہ اس کے بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی۔ اسکا باپ پاشا موصوف بھی اپنی زندگی کے مراحل عیش و عشرت دو دو تین تین بیویاں کر کے طے کر چکا تھا۔ وہ اب بوڑھا ہو گیا تھا مگر ابھی تک شباب کے بارگراں کا متحمل تھا اور اسراف پر کمر باندھ رکھی تھی۔ اس کی نئی بیوی نہایت فضول خرچ تھی اور اس پر غالب آکر اپنی نوجوانی کے نازو انداز دکھاتی تھی اور اس طرح اپنے خاوند کو اپنے زیورات، لباس اور سامان آرائش کے مطالبات کے بارگراں سے دبا رکھا تھا۔ ان فرمائشوں کے پورا کرنے میں اسے اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ گھر ویران ہو رہا ہے یا آباد۔ اس پر مزید طرہ یہ تھا کہ پاشا موصوف اسکے حسن و جمال پر اسقدر فریفتہ تھا کہ وہ اسکی فضول خرچیوں سے غافل ہو کر اسکی فرمائشوں کے پورا کرنے پر تلا ہوا تھا۔

فاطمہ نہایت خوبصورت سیاہ چشم دوشیزہ تھی مگر اس کے شباب کی رونق میں سے صرف اس کی تیز نظریں، ذہانت اور ذکاوت قائم باقی رہ گئی تھی۔ شباب کے مظاہرات یعنی لطافت و رعنائیوں کا اکثر حصہ تو اسکی والدہ کے انتقال پر ختم ہو گیا تھا تاہم شباب کی کچھ دھندلی باقی رہ گئی تھی، وہ اسکی سوتیلی والدہ کی بدسلوکی اور مظالم کی نذر ہو گئی یعنی عالم شباب میں آتے ہی یتیمی اور مسکینی نے فاطمہ پر ایسا پردہ ڈالا کہ اس کے محاسن بھی برائیاں بن کر نظر آنے لگے اور اس کی خوبیاں عیب سمجھی جانے لگیں۔ اسی لئے اس نے بچپن ہی سے اپنی قسمت پر شاکر رہنا سیکھ لیا تھا اور بغیر خوشی زندگی کی تلخیاں برداشت کرتی تھی۔

اسکا باپ بدستور فضول خرچی اور عیش و عشرت میں منہمک رہا یہاں تک کہ وہ قرضہ میں نامعلوم طریقہ سے پھنس گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی جائداد ختم ہونے لگی اور وہ دن آیا جسکے قطعی افلاس کا دن تھا یعنی اسکا عالیشان سکونتی مکان بھی فروخت ہو گیا اور اس کو حکم صادر ہوا کہ وہ اپنے رہائشی مکان کو بھی خالی کر دے۔ اسوقت اسکی آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور ہوا اور اسے اپنے قدموں کے نیچے افلاس کا عمیق گڑھا دکھائی دیا۔ بہرحال جب تمام راستے اس کے لئے بند ہو گئے اور اسے ورطۂ افلاس سے مخلصی کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو اس نے اپنا معاملہ قسمت پر چھوڑ دیا اور اس گھر سے نکلنے پر تیار ہو گیا جہاں وہ پل کر جوان ہوا اور جوانی کے بعد بڑھاپا بھی آگیا تھا۔

اگلی صبح جب گھر کے باشندے کوچ کی تیاریاں کر رہے تھے اور انکی آنکھوں پر آنسو جاری تھے، پاشائے موصوف سرنگوں کئے ہوئے سرد آہیں بھر رہا تھا کہ اتنے میں پڑوسی کا حبشی نوکر اس کے پاس آیا اور پاشائے موصوف سے خلیہ میں کچھ کہنے کی خواہش ظاہر کی۔ الگ لیجا کر اس خادم نے اس سے یہ کہا کہ اسکے آقا نے اسے ایک بیش قیمت بالنشان سلام کے لئے اس کے پاس بھیجا ہے۔

پاشا نے کہا "تمہارا آقا کون ہے؟" اس حبشی خادم نے کہا "کیا آپ مجھے پہچانتے نہیں ہیں۔ میں آپکے نئے پڑوسی مختار آفندی کا نوکر سعید ہوں" پاشا نے کہا

"اس شخص کا میرے ساتھ کیا تعلق باقی رہا ہے جبکہ اس نے ہر ایک سے قطع تعلق کر رکھا ہے اور لوگوں نے بھی اسے چھوڑ رکھا ہے۔ میں بھی کوچ کرنے والا ہوں اور ایک آدھ گھنٹے میں ہمارے درمیان سے پڑوسی کے تعلقات بھی منقطع ہو جائیں گے لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ میں اسکا پڑوسی ہوں، تاہم میری طبیعت اس جیسے شعبدہ بازوں سے ملنا نہیں چاہتی"۔ خادم نے کہا "جناب! ایسے شخص کے بارے میں جسے آپ اچھی طرح نہیں جانتے، فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کیجئے میں اس کی جانب سے اس لئے آیا ہوں کہ آپ سے اس گھر کے بارے میں بات چیت کروں"۔ پاشانے کہا "میں اس گھر کی کسی چیز کا مالک نہیں رہا ہوں لہٰذا مجھے اس بارے میں مخاطب کرنے کی ضرورت نہیں ہے"۔ خادم نے کہا "مجھے اس حقیقت کا علم ہے یہ اسکا قبالہ میرے آقا کے نام ہو گیا ہے"۔

"تو کیا اس نے تمہیں اس لئے بھیجا ہے کہ تم ہمیں یہاں سے جلد رخصت ہونے پر مجبور کرو؟ اگر یہ بات ہے تو تم اسے اطلاع دیدو کہ ہم کل جا رہے ہیں اور اسے اس بات سے خوش ہونا چاہیئے"۔

"نہیں نہیں، بلکہ اس نے مجھے اسلئے بھیجا ہے کہ میں آپ سے کہوں کہ آپ یہیں رہیں اور یہاں سے کوچ نہ فرمائیں"۔

پاشا یہ بات سن کر حیران رہ گیا اور اسکی بات کو ٹھیک نہیں سمجھا اسی لئے اس نے کہا "جو تم کہہ رہے ہو میں اسکا مطلب نہیں سمجھ سکا ہوں"۔

خادم نے کہا "میں نہایت صاف اور واضح الفاظ میں گفتگو کر رہا ہوں کہ میرا آقا اس مکان کا مالک ہو گیا ہے۔ لیکن وہ چاہتا ہے کہ اسے آپ رہائش کے لئے اپنے پاس رکھیں، مزید برآں وہ پانچ ہزار گنی سے بھی آپ کی مدد کرنا چاہتا ہے"۔ "کیا تم اور تمہارے آقا میرے ساتھ مذاق کر رہے ہیں؟" خادم نے کہا "جناب ذرا ٹھہریئے، میری باقی گفتگو سنئے، کیونکہ میرا آقا اپنا مال آپ کو مفت نہیں دے رہا ہے بلکہ اس کے بدلے میں وہ یہ چاہتا ہے کہ آپ اسکی شادی اپنی بیٹی فاطمہ سے کر دیں"۔ پاشانے قہقہہ لگایا اور کہا "تمہارا آقا پاگل ہو گیا ہے، میں اپنی بیٹی کی شادی ایک شعبدہ باز بدصورت بڈھے سے کیسے کر سکتا ہوں؟ بے شک فقیری میرے لئے اس چیز سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو"۔

خادم نے کہا "مجھے امید ہے کہ آپ اس معاملہ میں غور کریں گے"۔

مگر پاشانے اسے ٹہلا کر کہا:-

"او ملعون حبشی! یہاں سے دور ہو جا"۔

مگر سعید اسی جگہ کھڑا رہا۔

پاشا کی بیوی اور اس کی بیٹی اسکی چیخ کی آواز سن کر تیزی کے ساتھ اس کے پاس آئیں اور اس نے انہیں سارا ماجرا سنایا۔ اس وقت اسکا جوش کسی قدر کم ہو گیا تھا تاہم کچھ عرصہ تک خاموشی چھائی رہی۔ نادرہ دل ہی دل میں اس قسم کے سلسلۂ ازدواج پر خوش ہو رہی تھی جسکی بدولت وہ مفلسی کے قعر مذلت سے نکل سکے اور اس طرح اس کیلئے سابقہ عیش و عشرت اور فضول خرچی کی زندگی گذارنی ممکن ہو سکتی تھی مگر کوئی لفظ اپنے منہ سے نکالنے کا اسے حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ آخرکار فاطمہ نے خود مہر خاموشی کو توڑا اور باپ کے پاس آکر اسے ترغیب دی کہ وہ سعید کی درخواست کو قبول کرلے اور کہنے لگی:-

"ابا جان! میں اس شخص کو اپنا شوہر بنانے پر رضامند ہوں لہٰذا اس دست بلند کو رد نہ کیجئے جسے تقدیر ہمیں بیکسی کے بھنور سے نکالنے کے لئے دراز کر رہی ہے۔ میں بخوشی اپنے خاندان کی بدنامی کو مٹانے کے لئے قربانی پیش کرنے پر آمادہ ہوں"۔

اسکی اس گفتگو نے نادرہ کو بھی تائید کرنیکا موقع دیا اور اس نے فاطمہ کے قول کو سراہا لہٰذا فاطمہ کے اصرار اور نادرہ کی تائید اور آنے والی مفلسی کے ہولناک تصور کے سامنے پاشائے موصوف کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور معاملات طے ہونے کے بعد فاطمہ کی شادی ہو گئی۔

(۲)

فاطمہ اپنے شوہر کے گھر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آئی اور اس وحشت ناک مکان کی آوازیں اور مالک مکان کی بدصورتی کی داستانیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں، ہر قدم پر وحشت اسکے سامنے مجسم تصویر بن کر نظر آ رہی تھی۔

یہاں پہنچکر مختار آفندی نے فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے تمام کمروں اور بالاخانوں کی سیر کرائی۔ اس نے خلاف توقع مکان کو نہایت عمدہ ساز و سامان اور فرنیچر سے مزین پایا۔ اس کے برآمدے میں چنبیلی، گلاب اور رنگا رنگ کے پھول سایہ فگن نظر آئے، مشک کی بھینی بھینی خوشبو بھی مہک رہی تھی اور طیوری نغمے پرسکون زندگی بخش رہے تھے۔

اس گلگشت کا خاتمہ ایک سبز صحن پر ہوا۔ یہاں فوارے سے پانی بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح برآمد ہو رہا تھا۔ اس مقام پر اس نے فاطمہ کو اپنے پاس بٹھایا۔ وہ اپنے اردگرد ان چیزوں کو دیکھکر بہت متاثر ہو گئی تھی۔ اس کے شوہر نے اسکا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبایا۔ اس پر اس نے ایک سرد لہر محسوس کی جو اسکے تمام رگ و پے میں سرایت کر گئی اور اسکا ہاتھ کانپنے لگا۔ اس کے شوہر کو بھی اسکا احساس ہوا اور وہ مسکرا کر نرمی اور مہربانی کے لہجے میں کہنے لگا۔

"بہت جلد اس نئے مکان میں آپ کا دل بہلنا شروع ہو جائیگا اور یہ وحشت دور ہو جائے گی"۔

اسکا لہجہ اسقدر نرم اور اس کے الفاظ اسقدر شیریں اور دلکش تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک نوخیز نوجوان کے الفاظ ہیں۔ ان کو سن کر فاطمہ نے اپنا سر اس طرح اٹھا کر دیکھا جیسے کہ وہ گہرے خواب سے بیدار ہوئی ہو۔ مگر اس کی ڈاڑھی میں بڑھاپے کی ڈراؤنی تصویر موجود تھی اور اس کی ناک چونچ کی طرح موٹی اور بدنما دکھائی دی۔ لہٰذا اس نے غمگین اور مایوس ہو کر نظریں نیچی کر لیں۔

اسکے بعد وہ پھر لطف آمیز مسکراہٹ اور شیریں کلامی کے ساتھ کہنے لگا۔

آپ اطمینان رکھئے کہ آپ اپنے والد کے گھر سے ایسے گھر میں منتقل ہو گئی ہیں جہاں سراسر لطف مہربانی کا دور دورہ ہے اور آپ کو ہر قسم کا عیش و آرام میسر ہوگا، یہاں آپ واحد حکمران ہونگی اور آپ کا ہر لفظ حکم تصور کیا جائے گا۔ میرا بھی آپ پر اتنا ہی تسلط ہوگا جتنا کہ آپ کی مہربانی اور اجازت سے مجھے اختیار حاصل ہوگا کیا آپ اسپر رضامند ہیں؟"

اس اثناء میں جبکہ وہ یوں سخن سرا تھا، فاطمہ دل ہی دل میں یہ سوال کر رہی تھی کہ یہ کلمات جن سے شباب اور شیرینی ٹپکتی ہے، ایسے منہ سے کیسے برآمد ہو سکتے ہیں جس کے نیچے یہ سفید داڑھی ہو اور اس کے اوپر اس قسم کی ڈراونی ناک ہو، لہذا اس نے دوبارہ اس کے چہرے کی طرف نظر ڈالی اس دفعہ یہ نگاہ رضامندی کی نگاہ تھی اب اسے ایک خوبصورت کشادہ پیشانی نظر آئی اور اس کے نیچے اسکی دونوں آنکھوں سے ملاحت اور مہربانی ٹپک رہی تھی۔ تاہم سفید داڑھی اور ڈراونی ناک کو دیکھکر اس کی نگاہ نفرت کرنے لگی۔ لہذا اس نے اس حیا و شرم کے ساتھ جو پہلے پہل ایک نوجوان عورت کے چہرے پر اپنے شوہر سے آنکھیں دو چار کرنے پر نمودار ہوتی ہے، اس نے اپنی نظریں نیچے کرلیں اور اسوقت پہلی دفعہ اسے اپنی زوجیات کا احساس ہوا۔

فاطمہ نے اپنی ساری رات بیداری میں گذاری، تمام رات اس کی نظروں کے سامنے اس کے شوہر کی شکل دو مختلف قسم کی صورتوں میں نظر آ رہی تھی کبھی اسکے سامنے اس کی داڑھی اور ناک کا منظر تھا جس سے اسکا دل گھبرانے اور نفرت کرنے لگتا تھا اور کبھی وہ اپنی سفید کشادہ پیشانی اور سحر انگیز آنکھوں کے ساتھ نظر آتا تھا جس سے اس کے دل میں مسرت و انبساط کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔ آخرکار پو پھٹی اور پرندوں نے بیک آواز وقت مقررہ پر اپنی زبانیں کھولیں اور بے شمار سنہری پنجروں سے ان کے چہچہانے کے نغمے بلند ہونے لگے۔ ان فردوسی نغموں نے اسے بھی اٹھا دیا مگر فوراً ہی اسکا شوہر اس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ایک نہایت ہی ضروری کام کی بنا پر اسے آج ہی سفر درپیش ہے۔ اس ناگہانی خبر سے وہ بہت رنجیدہ ہوئی اور اس عجیب و غریب شخص کے متعلق غور و فکر کرنے لگی جو ایک رات کے بعد ہی اسے دفعتہً چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اسے خیال ہوا کہ غالباً وہ اس شخص کے لئے مرغوب خاطر نہیں ثابت ہوئی ہوگی کیونکہ اس نے بھی اسے بادل ناخواستہ قبول کیا تھا یہ تصور کرتے ہوئے اسے بدنصیبی کی مجسم تصویر نظر آنے لگی اور اس نے ناراضگی اور مایوسی کی نگاہ سے اسے دیکھا جسکا اس کے شوہر کو بھی احساس ہوا اس لئے اس نے اپنے ہاتھ اسکی گردن میں حمائل کئے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

"میرا سفر آپ پر شاق نہیں گذرنا چاہئے کیونکہ یہ دو مہینے سے زیادہ نہیں ہوگا۔ علاوہ ازیں میں نے اپنے گھر میں وہ سامان راحت مہیا کر دیئے ہیں جن سے آپکی وحشت اور تنہائی کی تلخی دور ہو جائے گی اور درحقیقت اسکا سہرا میرے نوکر سعید کے سر ہے جس نے اس ویران جگہ کو آباد کر رکھا ہے اور اس کے بالا خانوں کو ناظرین کے لئے اس طرح آراستہ کیا ہے کہ غیر محسوس طریقے سے وہ خوبصورت دکھائی دے رہے ہیں حقیقت میں وہ ایک نادر ہستی ہے اور آپ کے لئے وہ نہایت عمدہ قسم کا ہمنشین اور پُر لطف داستان گو ثابت ہوگا۔

فاطمہ نے کہا (غالباً اپنے شوہر کے سامنے یہ اسکی پہلی گفتگو تھی) کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں مجھے آپ سے بے نیاز کر دینگی؟"

شوہر نے کہا "نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا تاہم ان سے کسی قدر تمہارا دل بہل جائے گا۔ علاوہ ازیں میں نے اپنے بھتیجے شکیب کو بھی بلا لیا ہے وہ میری عدم موجودگی میں میرے کاموں کی نگرانی کرے گا اور میرے گھر کے دروازے ہر وقت اس کے لئے بلا روک ٹوک کھلے رہیں گے۔ لہذا آپ سے توقع ہے کہ آپ اس سے حسن سلوک اور دلجوئی کے ساتھ برتاؤ کرینگی کیونکہ وہ نہایت شریف، بااخلاق مہذب باعصمت اور امانتدار نوجوان ہے۔ اس پر مزید طرہ یہ ہے کہ وہ نہایت قابل طبیب بھی ہے لہذا آپ اسکو اپنا مخلص بھائی بنا سکتی ہیں اور اس کی وجہ سے آپ کی شرافت اور پاکدامنی پر کوئی حرف نہیں آئیگا" یہ کہہ کر اس نے اپنی بیوی کو الوداع کہا اور چلا گیا۔

—— (۳) ——

سعید اپنے آقا کی عین توقعات کے مطابق ثابت ہوا کیونکہ اس نے فاطمہ کا دل بہلانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی اور اسکا داستان گو بن کر روزانہ نئے نئے قصے سنانے لگا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے لطائف اور ظریفانہ چٹکلوں سے بھی اسے محظوظ کیا کرتا تھا چنانچہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین دن بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ اس کے افسردہ اور پریشان قلب میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ گئی اور سعید اس کے اعتبار اور اطمینان کے قابل بن گیا۔ چوتھے دن صبح کے وقت سعید نے فاطمہ کے پاس آ کر شکیب کی آمد کی خبر دی اور اسکا سلام پہنچا کر اس کی طرف سے یہ دریافت کیا کہ وہ کسی کار لائق کے لئے، جس کا وہ حکم دیں، تیار ہے۔ فاطمہ اس عیش و عشرت کے ماحول میں اس نام کو بھول گئی تھی لہذا جب سعید نے اسکا نام لیا تو اسے وہ کلمات تحسین و توصیف یاد آ گئے جو اسکے شوہر نے اس نوجوان کے اخلاق و شرافت کے بارے میں کہے تھے۔ اس لئے اس نے اسکے سلام کا جواب دینے اور اسکی عنایت کا شکریہ ادا کرنے میں کچھ جھجک محسوس نہ کی!

سعید اپنی مالکہ کا سلام پہنچانے کے لئے گیا ہی تھا کہ فاطمہ نے موقع پا کر کھڑکی کی چلمن اٹھائی تاکہ وہ اس شخص کی جھلک دیکھ سکے جسکی تعریف میں اسکا شوہر اسقدر رطب اللسان تھا۔ چنانچہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ نہایت ملیح اور خوبصورت ہے اس کی پیشانی گوری تھی اور وہ صحن میں ٹہل رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی فاطمہ کے دل میں وہ خیال پیدا ہوا جسے ایک دوشیزہ اپنے دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔ وہ اس نوجوان اور اس کے اس چہرے کے درمیان مقابلہ کر رہی تھی جس کو قضا و قدر نے اس کی قسمت کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ مزید

غور کرنے پر اسے ان دونوں میں کوئی سلسلۂ مشابہت گوری پیشانی اور سیاہ آنکھوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا۔ ورنہ اس نوجوان کا معتدل قد، مسکراتے ہوئے دانت، خوبصورت مونچھیں، گلابی ہونٹ، ستواں ناک، اور متانت شباب اسکی نمایاں خصوصیت تھیں۔ برخلاف اس کے، اسکے شوہر کی ڈاڑھی سفید اور کمر کبڑی اور خوفناک تھی۔ اس مقابلہ کا فاطمہ کے قلب پر گہرا اثر پڑا جس سے اسکا کلیجہ اچھلنے اور دل دھڑکنے لگا اس لئے اس نے چلمن چھوڑدی اور قریب کے تکیہ پر گر پڑی۔

اس نوجوان کو ایک الگ حصے میں ٹھہرانے کا بندوبست مکمل ہوگیا۔ اب وہ ہر وقت نظر آنے لگا اور اس کی نظروں کے سامنے وہ منظر ہر وقت تازہ رہتا تھا جس نے فاطمہ کے قلب میں سکون و اطمینان کے بعد بے چینی اور اضطراب پیدا کردیا تھا اور اس کے اپنے شوہر کی صورت سے نفرت کا جذبہ بیدار کیا تھا یہ نفرت کا وہ جذبہ تھا جسے اس نے انتہائی کوشش کے بعد دور کیا تھا اور بجبر و اکراہ اپنے دل سے اس جذبہ کو نکال ڈالا تھا۔ بہرحال وہ اس المناک منظر کو برداشت نہیں کرسکی کیونکہ وہ اپنی قسمت پر شاکر تھی اور اپنے عیش و سرور کے ماحول پر، جو خدا نے اس کی قسمت میں لکھا تھا، قانع ہوگئی۔ چونکہ اس کے کمرے کا دریچہ اس کے دل کی بے چینی اور عقل و ہوش کو کھودینے کا سبب تھا لہٰذا اس نے یہی مناسب سمجھا کہ سعید کو اس کے قطعی بند کرادینے کا حکم صادر کرے جو بجالایا گیا۔

شکیب کی آمد کو دو ہفتے گزر گئے مگر فاطمہ اس سے بالکل بے خبر رہ گئی یہانتک کہ وہ شکیب سے متعلق کچھ سننا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ تاہم شکیب نوجوان مرد اور فاطمہ نوجوان عورت تھی اور شباب کی برقی لہریں سرعت کے ساتھ آپس میں اس طرح مل جاتی ہیں کہ ان کے درمیان نہ دیواریں حائل ہوسکتی ہیں اور نہ کھڑکیوں کی بندش سد راہ ہوسکتی ہے۔ فاطمہ نے اپنی آنکھوں کے درمیان رکاوٹ ضرور پیدا کرلی تھی مگر اس کے کانوں اور اس نوجوان کی سریلی آواز کے درمیان کون حائل ہوسکتا تھا جو راتوں کی تنہائی میں دردناک نغموں کے ساتھ بلند ہوتی تھی۔ کون ہے جو ایک تن تنہا نوجوان کی راتوں کی تنہائی میں دردناک نغمے گانے سے روک سکے۔ چنانچہ شکیب گانے پر مجبور تھا اور فاطمہ مجبور تھی کہ وہ چاروناچار اس کے گیتوں کو سنے جو ہوا کو جس میں اس کی آواز شامل تھی، روکنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی کیونکہ اسے اس ہوا میں سانس لینے کی ضرورت تھی۔ اسکی آواز کا بھی اس نے اپنے شوہر کی آواز سے مقابلہ کرنا چاہا مگر اس موقع پر اسے غیر موثر بنادیا گیا کیونکہ شکیب کی آواز ہر لحاظ سے اس کے شوہر کی آواز سے مشابہت رکھتی تھی۔ ان دونوں کی آوازوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ نوجوان کی آواز میں رقت اور نرمی تھی اور اس کے شوہر کی آواز میں وقار اور متانت پائی جاتی تھی۔ تاہم فاطمہ دوبارہ اپنے ناصحانہ سے پر غالب آگئی اور کھڑکی بدستور بند رہی اور نوجوان عالم فراموشی میں رہا۔

(۴)

ان واقعات کے تین دن گذرنے کے بعد شکیب کے گانے کی آواز سننے میں نہیں آئی اس وجہ سے فاطمہ کے دل میں فکر و پریشانی پیدا ہوئی اس نے سعید سے اس کے بارے میں دریافت کرنا چاہا مگر ہچکچائی اور بار بار عزم و ارادہ کے باوجود وہ دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ سعید نے بھی مکمل سکوت اختیار کر رکھا تھا یا وہ قصداً خاموش تھا۔ آخرکار فاطمہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور وہ اس کے بارے میں دریافت کرنے پر مجبور ہوگئی۔ سعید نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا کہ شکیب مریض ہے اور تین دن سے صاحب فراش ہے اور مرض خطرناک ہے۔ فاطمہ یہ خبر سن کر پریشان ہوگئی اور کہنے لگی "تمہیں کس نے روکا تھا کہ تم نے مجھے پہلے دن اسکی اطلاع نہیں دی"

سعید نے کہا "اس کی وجہ یہ تھی کہ آپنے اس سے روگردانی اور تغافل اختیار کر رکھا تھا حالانکہ میرے آقا نے آپ کو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایت کی تھی" فاطمہ نے سرنگوں کرلیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سعید نے کہا "اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اگر آپ میرے ہمراہ چل کر اس سے ہمدردی کے چند کلمات ارشاد فرمائیں جس سے اس کی بیماری میں کچھ تخفیف ہوسکے"

یہ سن کر وہ دوپٹہ اوڑھ کر اس کے ساتھ مریض کے کمرے میں گئی۔ آنکھ دو چار ہوتے ہی اس نے یہ محسوس کیا کہ اسکا قلب اسکے سینے سے نکالا جارہا ہے۔ لہٰذا وہ سینہ پر ہاتھ رکھکر شرماتی ہوئی داخل ہوئی اسے دیکھکر مریض تکیہ کے سہارے اٹھ بیٹھا اور اسکا ہاتھ پکڑ کر اپنے پلنگ کے پاس ایک کرسی پر بٹھادیا اور اسکی تکلیف فرمائی کا اس طرح شکریہ ادا کرنے لگا گویا وہی عیادت اور خبرگیری کرنے والا ہے مگر وہ سرنگوں کئے بیٹھی خاموش بیٹھی رہی۔ آخرکار سعید نے چاہا کہ وہ مہر سکوت توڑے، چنانچہ اس مقصد کیلئے شکیب کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہماری بیگم صاحبہ کو آپکی بیماری کی آج ہی اطلاع ملی ہے اس کے لئے قابل ملامت صرف میری ذات ہے کیونکہ میں نے آپ کی بیماری کی خبر کو چھپائے رکھا تاکہ انکی طبیعت پریشان نہ ہو مگر آخرکار انھوں نے خود ہی آپ کے متعلق دریافت کیا اسلئے چاروناچار مجھے بتانا پڑا" یہ کہہ کر وہ انھیں چھوڑ کر چلا گیا۔

شکیب نے کہا "جناب کی آمد سے مجھے آرام محسوس ہورہا ہے اور میرا خیال کہ مرض جہاں سے داخل ہوا تھا، وہیں سے نکل رہا ہے" اسپر فاطمہ نے زبان کی گرہ کو کھولتے ہوئے کہا "آپ کو کیا بیماری ہے؟"

جواب ملا "مجھے نہیں معلوم ہے" وہ کہنے لگی "تعجب ہے کہ طبیب ہوکر بھی آپ کو اپنی بیماری کا علم نہیں ہے" وہ کہنے لگا "مجھے جو مرض لاحق ہے، طب اس سے ناآشنا ہے"

خاتون موصوف نے کہا "کم ازکم اسکا سبب تو جانتے ہونگے؟"

شکیب نے کہا "جس وقت سے میں اس گھر میں داخل ہوا ہوں، اسوقت سے میں اپنے قلب میں بے چینی اور اپنے جسم میں علت ہلچل محسوس کر رہا ہوں"
اس کے جواب میں خاتون مذکور نے کہا:

"میں بھی، جب سے یہاں آئی ہوں، اس قسم کی کیفیت محسوس کر رہی ہوں لیکن اگر کوئی لڑکی اپنے شوہر کے گھر پہلا قدم رکھنے پر بے چین اور مضطرب ہو تو قابل تعجب نہیں ہے۔ مگر تم؟"

اس نے جواب میں کہا "میں اس گھر میں نہایت اطمینان کے ساتھ داخل ہوا تھا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ قضا و قدر نے میرے لئے کیا چیز پوشیدہ کر رکھی ہے" یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اس عرصہ میں وہ اس کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا جہاں سے فاطمہ جھانکا کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ آنسو بہا کر کہنے لگا "کاش میں اس طرف نہ دیکھتا، کیونکہ یہی کھڑکی میری بیماری کا اصل سبب ہے اور یہیں سے وہ تیر برآمد ہوا تھا جو میرے دل پر جا کر لگا"

یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے خوبصورت چہرے کو چھپا لیا اور اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔

فاطمہ کو بھی ایسا معلوم ہوا کہ زمین پر زلزلہ چھا گیا اور اس کی نظر کام نہیں دے رہی ہے کیونکہ اسے شکیب کے دل کی بات معلوم ہو گئی تھی جسکا مفہوم سوائے محبت کے اور کچھ نہ تھا اور دریچہ میں اس کی بھویں کمان اور پلکیں تیر کا کام دے رہی تھیں۔ لہٰذا اب معاملہ کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں تھی اور اس تلمیح داستان پر مزید توقف و انتظار بے سود تھا کیونکہ یہ محبت کا خاموش اعلان تھا اور اس جذبہ کو مشتعل کر رہا تھا جسے اس نے فوراً دبا دیا تھا اور بھڑک اٹھنے سے پہلے ہی بجھا دیا تھا لہٰذا اب سکے لئے سوائے اسکے اور کچھ چارہ کار نہیں تھا کہ شعلے بلند ہونے سے پیشتر ہی اس سے کنارہ کشی کی جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور یہ الفاظ سنتے ہی اس نے شکیب کے کمرے سے راہ فرار اختیار کی وہاں سے وہ اپنا دامن سمیٹتی ہوئی نکلی جیسے کہ اس کے قدموں کے نیچے سے چنگاریاں اڑ رہی ہوں۔

رات آئی اور کسے کیا معلوم کہ ایک دوشیزہ کی رات کیسے گذرتی ہے جس پر دو سخت طاقتوں کی کشمکش جاری ہو۔ ایک طرف تعلق ہو جو اسے اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ وفاداری پر مجبور کر رہی ہے تو دوسری طرف محبت ہے جو اسے اس نوجوان کی آغوش میں کھینچ کر لئے جا رہی ہے۔ ایسی حالت میں ان دلوں کی بدبختی کا کیا ٹھکانہ ہو سکتا ہے جنہیں قسمت نے دو مخالف جذبات کا شکار بنا لیا ہو۔

تاہم فاطمہ کے دل پر تیروں کی اسقدر بوچھاڑ ہو چکی تھی کہ تیر خود آپس میں ٹکرا کر ٹوٹ چکے تھے۔ اسکی والدہ کا بچپن ہی میں انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت سے یتیمی کی ذلت و رسوائی کا تیر لگا اور اس کے زخم بھرنے نہ پائے تھے کہ قسمت کی طرف سے اس پر سوتیلی والدہ کے ذریعے دوسرے تیر کا وار ہوا۔ یہ تیر نہیں تھا بلکہ ترکش تھا جس کے تیروں کی کوئی انتہا نہ تھی چنانچہ اس کی سوتیلی والدہ برابر اس پر تیر چلاتی رہی یہاں تک کہ اس کے دل پر تیر اندازی کی کثرت سے ایک پردہ چھا گیا۔ فاطمہ پر آخری تیر چلایا گیا وہ اس کی قربانی ہے جسکی بنا پر اس نے اس بوڑھے آدمی کو اپنا شوہر بنانا قبول کیا۔ لیکن زمانے نے اسپر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تیروں کی بوچھاڑ پر محبت کا تیر بھی چلا دیا جسکا ذریعہ شکیب تھا۔ مگر وہ تیر جگہ نہ پا کر قلب تک نہ پہنچ سکا لہٰذا دماغ کی طرف اتر کر اسکی تنگی کا باعث بنا تاہم وہ تمام رات اپنی پیہم آہ و سوزاں کے ذریعے اس تیر محبت کو نکالنے کی کوشش کرتی رہی۔ جب صبح نمودار ہوئی تو سعید روتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

"بیگم صاحبہ! شکیب کے پاس تشریف لے جائے کیونکہ وہ حالت نزع میں ہے وہ آپ کو دیکھنے کا متمنی ہے اور اپنی بیہوشی میں وہ آپ کا نام لے رہا ہے" یہ سنکر وہ تیزی کے ساتھ روانہ ہوئی اور سعید سے پہلے اس کے پلنگ کے پاس پہونچ گئی۔ حسب عادت سعید وہاں سے چلا گیا۔ جب شکیب نے اسے دیکھا تو اس نے اپنے بازو اس کی طرف پھیلائے اور کہا:

"اے فاطمہ! میرے پاس آ کیونکہ میں تیری یہ روگردانی نہیں برداشت کر سکتا۔ آ کہ میں بغلگیر ہوں اور تیرے خوبصورت منہ کو بوسہ دے سکوں اور اسی پر اکتفا کرتے ہوئے دنیا اور اسکی چیزوں کو الوداع کہوں"

یہ سن کر مصری دوشیزہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ تھوڑی دور ہٹ گئی تاکہ وہ اس کے بازوؤں کی گرفت میں نہ آ سکے اسکے بعد وہ نرمی اور مہربانی کے لہجہ میں کہنے لگی۔

"آپ اس بات کا دھیان رکھئے کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے شوہر آپکے چچا ہیں مجھے آپ کو دیکھنے سے پہلے آپ کی عظمت میرے دل میں پیدا کر دی تھی اور انھوں نے آپ کیلئے ایک مخلص بھائی کا درجہ مقرر کیا تھا نہ کہ عاشق آشفتہ سر کا"

وہ کہنے لگا "میں نے آپ کے معاملے میں غور کیا، تو معلوم ہوا کہ آپ شکستہ دل ہو کر نامرادی میں عالم شباب کا زمانہ گذار رہی ہیں اور حقیقت میں میرے چچا اس جرم کا مجرم ہے کیونکہ اس نے زبردستی آپکے باپ کو مجبور کر کے آپ کو لالچ زر سے حاصل کیا ہے۔ لہٰذا آپ ایک ایسے شیخ فانی پر بھینٹ چڑھائی گئی ہیں جس کے ساتھ رہنے میں کسی قسم کا مزہ اور لطف نہیں ہے۔ علاوہ ازیں محبت خاندان اور نسب کے رشتوں سے بالکل بے نیاز ہوتی ہے، بلکہ قدیم زمانے سے وہ اسی قسم کے رشتوں کو قطع کرتی رہتی ہے۔ اس لئے آپکے ساتھ محبت رکھنے کے بعد مجھے اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ میرے اور میرے چچا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ میرے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں یا نہیں"

فاطمہ نے جواب دیا "تمہارا چچا اس جرم سے جسکا تم اسے ملزم گردانتے ہو بالکل بری الذمہ ہے کیونکہ اس نے ہماری طرف ہمدردی کا ایسا ہاتھ بڑھایا جسکا مقصد احسان جتانا اور تکلیف دینا نہ تھا کیونکہ ہمارے لئے یہی مصیبت کافی تھی کہ ہم مفلسی کے قعر ذلت میں گرنے والے تھے۔ اس لئے اپنے اس عظیم الشان احسان کا معاوضہ صرف یہی طلب کیا کہ میں

اس کی شریک زندگی بن جاؤں۔ اس طرح اس نے میری قدر و منزلت بڑھائی اور مجھے اپنی بلند سطح پر لانے کی کوشش کی۔ لہٰذا اگر میں نے کوئی قربانی کی ہے تو وہ اپنے خاندان کے لئے نہیں بلکہ اپنے شوہر کے لئے۔ تم میرے شباب پر ماتم کر رہے ہو مگر یہ میرے لئے نئی چیز نہیں ہے بلکہ زمانہ میرے شباب کا ماتم بہت پہلے کر چکا ہے اور میں بچپن ہی میں اس کا مرثیہ سن چکی ہوں کیونکہ میں آغاز زندگی ہی سے دنیا کی تکلیف میں یہاں پڑی ہوں۔ اب تم اس کی ترچھی کے طعنہ دیتے رہو، مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہیں تمسخر کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ تمہیں اس نرمی اور تازگی پر دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کیونکہ اس کے نیچے رنج و غم کے کانٹے ہیں۔ علاوہ ازیں میں اپنے شوہر کی ممنون منت ہوں کیونکہ اس نے تمہارے خیالات کے برعکس مجھے اپنے مال سے نہیں بلکہ اپنی مروت اور احسان کے ذریعے خرید رکھا ہے۔ میں نے اپنے نفس کو بہت سمجھانا چاہا مگر اس نے زندگی کی مستیوں اور شباب کی ان لذتوں سے جو ضمیر کشی اور بے غیرتی سے لبریز ہے، لطف اندوز ہونا پسند نہیں کیا بلکہ وفاداری کو ترجیح دی کیونکہ یہ چیز اسے زیادہ پاکیزہ اور عمدہ معلوم ہوتی۔

ان الفاظ سے تم پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ میرے جیسے قلب میں محبت کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا اگر تم چاہو تو میں تمہاری بہن بن سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ میرا تمہارے ساتھ اور کسی قسم کا تعلق نہیں قائم ہو سکتا۔"

شکیب نے کہا "میں طبیب ہوں اور آپ کے شوہر کی جسمانی ساخت سے جس قدر میں واقف ہوں، اس قدر آپ نہیں ہیں۔ وہ ذیابیطس کا مریض ہے اور عنقریب اس کی زندگی کا چراغ گل ہونے والا ہے۔" فاطمہ نے جواب دیا۔

"اس بنا پر اس پر مزید توجہ اور مخلصانہ خدمت کرنے اور محض اسی کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔"

"اچھا آپ وعدہ کریں کہ اس کے مرنے کے بعد آپ میری بن جائیں گی۔" اس پر فاطمہ نے کہا۔

"میں اس کا وعدہ نہیں کرتی کیونکہ اگر میں اس چیز کا وعدہ کروں تو میں اس کی جلد موت کی خواہاں ہونگی اور اس طرح اس کی عہد شکنی کی مرتکب ہونگی جو میں نہیں چاہتی۔" شکیب نے کہا۔

"مگر ایسا نہ ہوا تو میں فوراً غم سے مر جاؤں گا اور میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔" فاطمہ نے کہا۔

"...... اگر آپ مر گئے (اور میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ ایسا نہ کریں) تو میں آپ کے شباب کے لئے اسطرح سوگوار ہونگی جس طرح کہ میں نے اپنے شباب کا ماتم کیا ہے تاہم جہاں تک ہو سکیگا، میں تمہاری موت کا بار گراں اٹھاؤنگی مگر یہ بوجھ خیانت اور کتمان خاموشی کے بوجھ سے ہلکا ہوگا۔ اب میں تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں، شاید پھر اس دنیا یا آخرت میں ہم مل سکیں۔"

"نہیں اس گھر کو کل ہی چھوڑ دونگا اب صرف یاس اور ناامیدی ہی کا سہارا رہ گیا ہے کیونکہ امید کی طرح اس میں بھی بڑی طاقت پوشیدہ ہے۔ لہٰذا آئندہ آپ میری کوئی خبر نہیں سن سکیں گی۔" فاطمہ نے کہا۔

"زندہ رہو یا دنیا سے رخصت ہو جاؤ۔ ہر صورت میں تمہارا شباب خدا کو سونپا۔"

(۵)

شکیب نے اگلے دن اپنے چچا کا گھر چھوڑ دیا زمانہ گزرتا گیا اور وہ وقت آیا جب اس کے چچا کو واپس آنا تھا۔ آخر وہ دن آیا جب شام کے وقت مصر کے پایۂ تخت میں ترکی انقلاب کی خبر مشہور ہوگئی جو انجمن اتحاد و ترقی کے اراکین کے ذریعے پیدا کیا گیا تھا۔ یہ خبر سن کر سعید نے اپنے مالک کے گھر کو نعروں سے گونجا دیا۔ فاطمہ نے اس کے نعروں کو سنا مگر اس کی وجہ اسے نہیں معلوم ہوگی۔ وہ اس بارے میں اس سے دریافت کرنے والی تھی کہ اتنے میں اس کا شوہر اپنی سفید داڑھی اور ٹیڑھی ناک کے ساتھ دکھائی دیا۔ اسے اس کھڑکی میں سے یہ نظر آیا کہ وہ اور سعید دونوں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی بیوی سے ملنے کے لئے گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھنا چاہا، مگر سعید اس کے راستے میں حائل ہو گیا اور کہنے لگا۔

"نہیں خدا کی قسم! تم یہاں پر اس وقت تک قدم نہیں رکھ سکتے جب تک یہ منحوس داڑھی تمہارے چہرہ پر لگی ہوئی ہے اور جب تک یہ مضحکہ خیز ناک تمہاری آنکھوں کے اوپر ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم انہیں ایسے ہی جہنم رسید کر دو جیسے دستوری حریت و آزادی نے آستانہ کے جاسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے جو ہر جگہ سایہ کی طرح تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔"

یہ کہہ کر اس نے اس کی بناوٹی داڑھی اور ناک اتار کر پرے پھینک دی۔ فاطمہ نے جب اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو بعینہ وہ شکیب تھا۔ یہ دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئی مگر اس کی حیرت زیادہ دیر تک نہیں رہی کیونکہ اب جا کر اس پر اصل حقیقت کھلی کہ اس کا شوہر جدید ترکی کے ان اکابرین سے تھا جو اپنے وطن کو چھوڑ کر مصر آگئے تھے تاکہ وہ حکومت کے ظلم و استبداد سے محفوظ رہیں۔ اور اس مقصد کے لئے اس نے جاسوسوں کو گمراہ کرنے کے لئے بناوٹی داڑھی اور ناک لگا رکھی تھی۔ اس کے بعد وہ شکیب کے بھیس میں اس لئے نمودار ہوا کہ وہ مصری دوشیزہ کے قلب اور اس کی محبت کا امتحان لے سکے۔

حیدر آباد کا ایک شاعر خاندان ——— بقیہ صفحہ ۱۶

صفحات گزشتہ میں ایک شاعر خاندان کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے اسکے مطالعے سے واضح ہو سکتا ہے کہ گزشتہ صدی سے یہ خاندان اردو زبان کی خدمت میں مصروف عمل ہے، اس خاندان کے افراد نے اپنے زمانہ کے رنگ کے بموجب اپنے کلام کو موزوں کیا ہے، ان کا کلام اپنے ماحول کی تصویر ہے، شہید، شعلہ، اظفر، زاہد کے قطع نظر جو اپنا دور ختم کر کے ہم سے رخصت ہو چکے ہیں، اب ان کے باقیات الصالحات کی طرح برق اردو شاعری کی خدمت میں مصروف ہے۔

انگلستان کی قدیم و جدید یونیورسٹیاں

ارنیسٹ بارکر

جنگ سے پہلے برطانوی یونیورسٹیوں میں طلبا کی کل تعداد پچاس ہزار تھی۔ ان میں تقریباً تین چوتھائی مرد تھے۔ انگلستان کی کل آبادی ساڑھے چار کروڑ ہے جس طرح گویا آبادی کے ہر نو سو آدمیوں میں سے ایک شخص یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ یہ پچاس ہزار طلبا برطانوی یونیورسٹیوں کے چار خاص گروہوں میں منقسم تھے۔ ہر گروہ میں دس ہزار سے زیادہ اور پندرہ ہزار سے کم طالب علم رہتے تھے۔ گویا ہر گروہ کے طلبا کی تعداد برابر سرابر ہی ہوتی تھی۔

آکسفورڈ اور کیمبرج کا گروہ ان چار گروہوں میں سب سے پرانا ہے کیونکہ یہ دونوں یونیورسٹیاں ۱۲۰۰ء کی ہیں۔ لیکن یہ گروہ سب سے بڑا نہیں ہے۔ دوسرے گروہ میں لندن یونیورسٹی ہے جو سو سال پرانی ہے۔ اس کے تمام کالجوں کے طلبا کی تعداد عام طور پر تیرہ ہزار کے لگ بھگ رہتی ہے۔ تیسرا گروہ ان یونیورسٹیوں کا ہے جو زیادہ تر جدید عہد کی قائم شدہ ہیں اور انگلستان کے بڑے بڑے شہروں مثلاً برسٹل، برمنگھم، لیورپول، مانچسٹر، لیڈس اور شیفیلڈ میں ہیں۔ چوتھے گروہ میں اسکاٹلینڈ، ویلز اور شمالی آئرلینڈ کی یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں اسکاٹلینڈ کی چاروں قدیم یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں (جن میں سے تین چودھویں صدی کی اور ایک سولھویں صدی کی یادگار ہے) اس گروہ کی یونیورسٹیوں میں ایبرڈین، سینٹ اینڈروس، ایڈنبرا اور گلاسگو والی خاص ہیں۔ اسی گروہ میں ویلز کی نئی یونیورسٹی جو چار کالجوں پر مشتمل ہے اور شمالی آئرلینڈ کی کوئنس یونیورسٹی بھی داخل ہے۔ موخر الذکر یونیورسٹی بلفاسٹ میں ہے۔

پڑھائی کا طریقہ

پہلا گروہ (جس میں تقریباً بیس کالج ہیں) اسقدر مشہور و معروف ہے کہ اسکا کوئی تفصیلی ذکر غیر ضروری ہے یہ دونوں یونیورسٹیاں لازمی طور پر ریزیڈنشل ہیں۔ ان دونوں میں طریقہ تعلیم یہ ہے کہ طلبا کی ضروریات کی طرف فرداً فرداً توجہ دی جاتی ہے۔ ایک لحاظ سے ان یونیورسٹیوں کو امیر لوگوں کی تعلیم گاہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں ملک کے سب سے زیادہ دولتمند طلبا کو داخلہ ملتا ہے۔ پھر بھی اس کے یہ معنی نہیں کہ طلبا کا انتخاب ان کے جاہ و ثروت کا خیال رکھکر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے یہاں کے طلبا میں نصف سے زیادہ ایسے ہوتے ہیں جن کو مالی امداد ملتی ہے اور جو [illegible]

دوسرے گروہ (لندن یونیورسٹی) میں ایسے متعدد کالج اور اسکول [illegible] [illegible] کرتے ہیں کہ [illegible] طلبا اور استادوں کی [illegible] کی بعض یونیورسٹیوں سے زیادہ ہے۔ ان کالجوں اور اسکولوں میں زیادہ ممتاز یونیورسٹی کالج، کنگس کالج، امپیریل کالج آف سائنس اور لندن اسکول آف اکنامکس ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اہم ادارے موجود ہیں مثلاً کالج اور بارتھولومیو کے طبیہ کالج اور دوسرے مخصوص تعلیم کے ادارے مثلاً اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، انسٹیٹیوٹ آف ہسٹاریکل ریسرچ، انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن اور عورتوں کے کالج خصوصاً بیڈفورڈ کالج۔

لندن یونیورسٹی میں تقریباً ہر مضمون پڑھایا جاتا ہے اور لندن کے عجائب گھروں اور کتب خانوں وغیرہ سے مزید امداد ملتی ہے۔ اس یونیورسٹی کے طلباء کو اجازت ہے کہ وہ خواہ اپنے گھروں پر رہیں خواہ اقامت خانوں میں۔ لیکن خیال ہے کہ بڑھتی ہوئی تعداد کو جگہ، اسکولوں اور کالجوں کے اقامت خانوں میں ہی ملے گی تعلیم عموماً لکچروں کے ذریعہ ہوتی ہے لیکن "ٹیوٹوریل" طریقۂ تعلیم کا بھی رواج ہوتا جا رہا ہے۔

شہری زندگی سے قریبی تعلق

تیسرے گروہ کی یونیورسٹیاں لندن یونیورسٹی اور پہلے گروہ کی دونوں یونیورسٹیوں سے مختلف ہیں۔ کیونکہ یہ کالجوں کی یونیورسٹیاں نہیں ہیں بلکہ یونیٹری یونیورسٹیاں ہیں۔ تمام شہری یونیورسٹیوں میں طریقۂ زندگی اور طریقۂ تعلیم بالعموم ملتا ہی ہوتا ہے جیسا لندن یونیورسٹی میں ہے۔ لیکن شہری یونیورسٹیوں میں کچھ خاص رعایات بھی ہوتی ہیں۔ ان میں تمدن کے لیے استعماری ذرائع نہ سہی لیکن ان میں زندگی شہری زندگی اور شہریت کے مسائل سے زیادہ قریب کا تعلق رکھتی ہے اور بعض شہری یونیورسٹیاں بعض ایسی سہولتیں اور نصاب تعلیم مہیا کرتی ہیں جو اور جگہ نہیں ہوتے۔ مثلاً ریڈنگ یونیورسٹی میں زراعت اور باغبانی کی تعلیم کے واسطے خاص سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں اور لیورپول یونیورسٹی میں ایسی ہی سہولتیں فن تعمیرات اور بحریات کے لئے مہیا ہیں۔ اس قسم کے خاص خاص مضامین اور انکے لئے تعلیمی سہولیات کی فہرست بہت بڑی بن سکتی ہے۔ عام مضامین کے سلسلہ میں بھی جو ہر یونیورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں ایک شہری یونیورسٹی اپنے عملہ اور طلبا کی خوبی میں زیادہ ممتاز ہو سکتی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ کے ضمن میں مثلاً مانچسٹر یونیورسٹی کو اپنے استادوں کی قابلیت کی بدولت ایک خاص اعلیٰ درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

پہلے تین گروہوں میں جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا تمام یونیورسٹیاں صرف انگلستان ہی کی ہیں لیکن چوتھے گروہ میں بیرونی یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں زیادہ ممتاز اسکاٹلینڈ کی قدیم و مشہور یونیورسٹیاں ہیں۔ اسکاٹلینڈ کی یونیورسٹیوں میں کل آبادی کا ایک معتدبہ حصہ یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرتا رہا ہے اور اس سلسلہ میں کسی قسم کے طبقاتی یا معاشرتی امتیاز کو دخل حاصل نہیں۔ انگلستان میں آبادی کے نو سو آدمیوں میں ایک شخص یونیورسٹی کی تعلیم پاتا ہے تو اسکاٹلینڈ میں ساڑھے چار سو
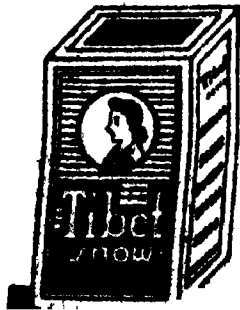
سے ایک یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ یہاں کی یونیورسٹیوں کا علم و فن سے بڑی شہرت کا حامل ہے۔ اٹھارویں صدی میں انگلستان کے امرا اپنے لڑکوں کو گلاسگو یونیورسٹی میں علم و حکمت کے گُر سیکھنے کو بھیجا کرتے تھے۔ اڈنبرا اور اسکاٹلینڈ کی دوسری یونیورسٹیوں کے اکثر شعبہ جات بہت پہلے ممتاز عالم و فاضل لوگ ہیں۔

عام تعلیم پر خاص زور

اسکاٹلینڈ کی یونیورسٹیوں اور برطانوی یونیورسٹیوں میں ایک فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں عام تعلیمات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور خصوصی تعلیم پر کم۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ کسی خاص شعبہ جات میں امتیاز حاصل کرنا وہاں مشکل ہوتا ہے مثلاً اڈنبرا یونیورسٹی خاص طبی تعلیم میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ ویلز یونیورسٹی اور کوئنس یونیورسٹی دونوں قدرتی طور پر اسکاٹلینڈ کی یونیورسٹیوں میں شمار ہونا چاہئیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ یونیورسٹیاں بالکل نئی ہیں لیکن ان میں بھی طلبا کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان استادوں کی تعداد بھی جنہوں نے جلیانسٹ اور ویکز کے سکولوں میں تعلیم پائی ہے بہت بڑی ہے۔

انگلستان کی ان چاروں گروہوں کی یونیورسٹیوں کا فرق واضح ہو گیا لیکن ظاہر ہے کہ بنیادی خوبی میں کوئی بھی کم درجہ کی نہیں ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں بہت پرانی ہیں اور اسی وقت سے مشہور چلی آتی ہیں۔ آج تک ان کی ہر دلعزیزی میں کمی نہیں آئی۔ یہاں طلبا کو جو مالی امداد ملتی ہے وہ بھی ایک خاص کشش کا کام کرتی ہے۔ لندن یونیورسٹی کی دلکشی میں بھی کلام نہیں۔ خاص طور پر جو سہولتیں خصوصی تعلیم کے سلسلہ میں بہم پہنچائی جاتی ہیں وہ ہرگز نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ اسکاٹلینڈ کی یونیورسٹیاں بہت پرانی بھی ہیں اور مشہور و ممتاز بھی۔ یہاں کے طلبا کی زندگی میں جان ہے اور یہاں عام تعلیم پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ یہاں کی شہری یونیورسٹیوں میں شہری زندگی سے خاص تعلق بہم پہنچایا جاتا ہے۔

جمہوریت کی روح

یہ دعویٰ کچھ زیادہ بلند بانگ نہیں کہ انگلستان کی تمام یونیورسٹیوں میں جمہوریت کی روح کو خاص نشوونما ملا ہے اول تو تمام برطانوی یونیورسٹیاں بنیادی طور پر "خود مختار" ہیں۔ ان کو سرکاری امداد ضرور ملتی ہے لیکن حکومت ان پر کسی قسم کا اپنا کوئی لاد نہیں منواتی۔ یہ یونیورسٹیاں ہمیشہ اساتذہ کا تقرر خود کرتی ہیں اور اپنی پالیسی بھی اپنی ہی پسند کے مطابق بناتی ہیں۔ دوم یہ کہ یہ یونیورسٹیاں اس لحاظ سے بھی جمہوریت پسند ہیں کہ ان کے طلبا عوام میں سے ہوتے ہیں محض قابلیت شرط ہے۔ برطانوی یونیورسٹیوں میں مزدوروں اور کاریگروں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی تعلیم پاتی ہیں۔ یہ طلبا اپنی ذہنی فہم و فراست میں سوداگر کہتے ہیں یا خود اپنی محنت کی مزدوری لیتے ہیں۔ انگلستان کی تمام یونیورسٹیاں کالجوں اور ٹیوٹوریل کلاسوں کے ذریعہ تعلیم پھیلانے میں بھی مشغول رہتی ہیں اور یہ مزدوروں اور کاریگروں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع بہم پہنچانے کی کوشش جاری ہے اور تعلیم کے خواہاں لوگ شریک ہیں۔

حشر کا ڈرامہ

محمد عمر (نورالٰہی)

رسالہ آجکل مورخہ ۱ مئی ۱۹۴۵ء میں جناب جگیشور ناتھ صاحب بے تاب بریلوی کا ایک مضمون آغا حشر کشمیری مرحوم کے تعلق میں شائع ہوا۔ میں بے تاب صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ایک بھولا بسرا موضوع یاد دلا دیا۔ اس ضمن پر ناٹک ساگر میں نے بہت کچھ لکھا تھا مگر ہنوز وہ تشنۂ تکمیل چلا آتا ہے۔ بے تاب صاحب نے واقعی ادب کی بہت بڑی خدمت کی کہ حشر مرحوم کی زندگی اور فن کے بارے میں چند ایک ایسے انکشافات کئے جن کی بڑی ضرورت تھی اور جو مجھے ناٹک ساگر کی تکمیل میں بڑا کام دیں گے:۔

حشر ہندوستانی ڈرامے کے ایک دور کے خاتم ہیں۔ جو منشی کریم الدین بریلوی سے شروع ہوا اور اسی دور میں طالب، احسن اور بے تاب نے ڈراما کی قابل قدر خدمت کی۔ حشر نے کچھ تو ان کے رنگ میں اور بعد میں کچھ دست اندازی کی۔ حشر کی بدعت یا جدت نے ڈراما پر کیا اثر ڈالا وہ اچھا تھا یا برا ایک علیحدہ صحبت کا محتاج ہے۔ اس کے بعد جس نے ڈراما لکھا اس نے حشر کی تقلید کی۔ ان مقلدوں کی تعداد پانچ چھ سے زیادہ ہے جن میں سے دیوانہ، عباس، مختشر اور رحمت نے اپنے ماحول میں خوب نام پیدا کیا۔ اس ڈراما کی نمایاں خصوصیات بہ نثر کے دو بالات پہلو بہ پہلو چلتے تھے۔ پلاٹ کے مثلث سے بے نیاز۔ کردار کے ارتقا سے بے پروا۔ ایک سنجیدہ اور ایک مزاحیہ۔ زبان مقفیٰ ہوتی تھی۔ بیت بازی سے قدم قدم پر کام لیا جاتا تھا۔ قمار بازی شراب خوری۔ اور طوائف پرستی بہت دل کش موضوع خیال کئے جاتے تھے۔ ٹریجڈی سے شاذ ہی اعتنا کیا جاتا تھا۔ انجام یا عافیت کبھی بخیر نہ ہوتی تھی۔ بزم ... دلچسپی سے معرا۔ اچانک میلوڈراما کے اکثر عیوب کو ان ڈراموں کے محاسن خیال کیا جاتا تھا۔ صوفیانہ مذاق سے چنداں بہتر نہ تھا۔ بیان بسا اوقات اس قدر لمبا ہو جاتا تھا کہ کسی وعظ کی چھاؤنی بن جاتا تھا۔ ڈرامہ کی طوالت کا یہ عالم تھا کہ عشا سے شروع ہو کر سحر کی خبر لاتا تھا۔ یہ ہے وہ فن جسے "حشر اسکول" سے نام زد کر رہا ہوں لیکن اس کی ذمہ داری صرف حشر کی ذات نہیں بلکہ طالب اور احسن کا بھی اس میں کچھ حصہ ضرور ہے۔ کلکتہ کی سکونت نے ان کے فن پر بہت اثر ڈالا۔ یہ آپ نے بجا فرمایا مگر اس میں ذرا صراحت کی ضرورت ہے۔ یہ بنگالی ڈرامہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک رجعت پسند۔ دوسرا ترقی نواز۔ اول گرش چندر گھوش جانتا کی شکل سے ... جس نے کچھ اجتہاد سے کام لیا اور جاترا کی نمائش بھیٹر کی طرز پر ہونے لگی مگر محض تفریح کی جدت کو تیز کرنے کے لئے خواہشات سے دل کھول کر بہرہ اندوز ہوئے ہیں جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اور کل دیتی ہے۔

جو شخص ہیں اور مقبول عام۔ دوسرا فاؤسٹ کی اس حد تک پہونچا ہے کہ اس نے سیاسیات وقت کی دار و رسن کی معراج کو جا ہاتھ لگایا ہے اس کی پیداوار۔ سراج الدولہ۔ سیواجی میر قاسم اور نندکمار ہیں۔ یہ ڈرامے ضبط ہوئے ان کی نمائش ممنوع قرار دی گئی۔ اور کئی ایک کارندوں کو جیل جانا پڑا۔ اب آپ یہ بتائیے کہ آغا صاحب کس اسکول سے موثر ہوئے۔ اگر پہلے سے ہوئے تو اچھا ہوا کہ انہیں اس سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہ ملا۔ اور دوسرا ایسا نوالہ ہے جسے وہ نگل ہی نہ سکتے تھے۔ بہرکیف یہ عیاں ہے کہ ان کے تاثرات بنگالہ منت کش عمل نہ ہوئے۔ جب تھیٹر ختم ہو گیا اور متکلم فلم نے ڈرامہ کی سرپرستی قبول کی تو یہی حشر سکول کا ڈرامہ اسے وراثت میں ملا اور اسی کو اس نے سنگ میل بنایا۔ چنانچہ پہلی بولتی فلم عالم آرا میں حشر اسکول کی گہری جھلک نظر آتی ہے شیریں فرہاد (دہلی) میں علی حسینی میاں ظریف چہکتے ہیں اور خود آغا کا ڈراما یہودی کی بیٹی فلم میں عہد عتیق کی یادگار ہے۔ دور حاضرہ کے ڈراما نگار حکیم احمد شجاع اپنے فلموں میں حشر اسکول کو یاد کر جاتے ہیں۔ مگر یہ سعی بے وقت کی راگنی بن جاتی ہے تعلیم کی عمومیت۔ کلکتہ بمبئی۔ میرٹھ۔ اور بریلی میں انگریزی تھیٹروں کے قیام نے ہندوستانی ڈرامہ میں انقلاب کا در و بست کر دیا تھا۔ انگریزی اور امریکی فلموں کی نمائش نے حشر اسکول کی رہی سہی ساکھ پر بھی پانی پھیر دیا۔ فلم حشر اسکول سے فرار پر مجبور ہو گئی۔ اب پلاٹ ایک رہ گیا۔ زبان مقفیٰ ہونے کی بجائے سادہ روزمرہ میں تبدیل ہوئی۔ بیت بازی ختم۔ مکالمہ چھوٹے فقروں میں۔ یہ انقلاب تھا جو ڈرامہ میں آیا اور حشر اسکول کو بہا لے گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے لونڈوں سے عورتوں کا کام لینا ترک کر دیا۔ اور حسین لڑکیوں کی اور شاندار ... کے بندھنوں کی متحمل نہ ہو سکتی تھی وہ آرام سے سٹیڈیو کے در سے ... آ بسی اور ... عافیت کی خبر خدا جانے۔ الغرض حشر سکول کی باقی خامیاں ابھی فلمی ڈرامہ میں موجود ہیں جہاں تک زندگی کا تعلق ہے حشر سکول فوت ہو چکا اور اب اس پر بحث محض ایک علمی عیاشی ہے۔ یہ ہے فلم ... جس کا آپ حشر کو بادشاہ بنانا چاہتے ہیں اور ... آپ سے اتفاق نہیں کہ یہ تاج وہ ... ان کے سر کو زیب دیتا ہے۔ اور طالب اور احسن اس کے مستحق نہیں۔ ان کی حیثیت محض جاگیرداروں کی [illegible] ہے مگر یہ ہنگامی زاویہ ہے اگر آپ آغا میں کوئی اور خاص خوبی نکال لیں تو تاج آنا فاناً مٹ سکتا ہے۔ مثلاً آپ کے وہ نغمے جن سے یہ سوال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) دوسرے ڈرامہ نگاروں سے حشر کی استعداد علمی زیادہ تھی۔
(۲) آغا نے دوسرے ڈرامہ نگاروں سے بڑھ کر ادب کی خدمت کی۔
(۳) وہ کیا منتر تھا جو آغا نے دنیائے ادب میں پیدا کیا یعنی دوسرے لفظوں میں حشر نے فن ڈرامہ میں کیا اصلاح کی؟
(۴) یہ بھی بتائیے کہ آپ کا یہ کہنے سے کیا مطلب ہے کہ آغا نے ڈرامہ کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ ڈرامے زمین والوں کے کام کے نہیں اسلئے زمین سے اٹھا لئے گئے تو آمنا و صدقنا...

جو مجھے گوش گذار کرنا تھا کر چکا۔ اب آپ کا اختصار کچھ توضیح چاہتا ہے اس کی نسبت یہ نئی بات ہے کہ آغا صاحب ایک کامیاب اداکار بھی ثابت ہوئے مگر جلد ہی وہ اس پیشہ سے متنفر ہو گئے۔ انہوں نے ڈرامہ اور سٹیج کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ ان کا گٹھ جوڑ ایکٹروں کے ساتھ تھا وہ پردہ کش سے ڈرامہ نگار اور سوتردھار کی حد تک پہنچے تو پھر خدا کے لئے بتائیے کہ انہیں ایکٹری سے کیوں بیر ہو گیا حشر ایکٹری سے کیوں کنارہ کش ہوئے ایک اہم اور تحقیق طلب بات ہے۔ جو تجسس خواہ آپ کریں میں کروں یا میر کریں۔ قرائن تو کہتے ہیں کہ سٹیج پر ان کے قدم نہ جمے۔ وہ اپنے پارٹ بھی نہ سنبھال سکے اور اسلئے سٹیج کے دروازے ان پر بند کئے گئے۔ ورنہ کسی ڈرامہ نگار کا ایکٹر کے فرائض بھی ادا کرنا کوئی بدعت نہیں کوئی عیب نہیں کوئی انوکھی بات نہیں دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں ڈرامہ نگاری اور ایکٹری ایک ہی شخصیت میں مدغم نہ ہوئے ہوں انگلستان میں تو ان کا شیکسپیر۔ بن جانسن۔ ہیک لن۔ گیرک۔ شیریڈن۔ فرانس میں مولیئر۔ جرمنی میں لیسنگ۔ ناروے میں بجورنسن اور کئی ایک مثالیں مل سکتی ہیں۔ خود ہمارے یہاں عباس علی۔ غلام علی دیوانہ نظیر بیگ۔ حافظ عبداللہ نے ڈرامے بھی لکھے اور ادا بھی کئے۔ بنگال پر نظر ڈالئے تو بھارت چندر ماتی لال گریش چندر میں ڈرامہ نگار و ایکٹر یک جان یک قالب ملیں گے۔ ان حالات میں یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ آغا کی طبع خداداد کو قدرت نے بہت کچھ ودیعت کیا ہوگا مگر ایکٹری کے فن سے ناآشنا رکھا۔ بالکل اسی طرح جیسے نقاد کہتے ہیں کہ برناڈ شاہ سب کچھ ہے مگر ڈرامہ نگار نہیں۔

آپ کا یہ کہنا ایک قسم کی خودکشی کی اعانت کرتا ہے کہ "آغا صاحب کی ایک آنکھ میں پیدائشی عیب تھا اسی عیب کی بدولت وہ بہت جلد ایک باہنر اور صاحب کمال ناٹک نویس بن گئے"۔

کہیں پھبتی تو نہیں کہہ رہے آپ اگر یہ درست ہے تو کٹھن ضرور ہے۔ آنکھ دیکر یہ خلعت لینا ذرا مہنگا سودا ہے۔ نہ سوجھا یہ گر سر ولیم آرچر کو ورنہ ڈرامہ نگاری پر اتنی بڑی کتاب نہ لکھنی پڑتی بیچارے کو:۔

آپ بھول گئے کہ چترا بکاؤلی کا مصنف کون ہے میں بھی بھٹک گیا کہ ناٹک ساگر میں اس کی تصنیف کا سہرا سیتی میاں ظریف کے سر باندھ دیا لیکن بعد میں احسن مرحوم نے بتایا کہ اردو زبان کے اس بہترین ڈرامہ کے مصنف منشی کریم الدین بریلوی ہیں۔ اور یہ ان کا شاہکار ہے اور یہ فرمایا کہ وہ ان کے استاد روحانی ہیں۔ آغا سے بھی اسی بات کی تائید ہوئی ہے اس لئے چترا بکاؤلی کے مصنف منشی کریم الدین آپ کے ہم وطن ہیں اور آغا صاحب نے اسے سراہا تو خوب کیا۔

یہ بات بھی اعجاز سے کم نہیں کہ "آغا نے کسی یورپین خاتون کو رفیقۂ حیات بنا لیا" یہ کہانی آجتک نہ سنی نہ پڑھی۔ نہ آپ بتاتے ہیں کہ آپ کو کس طرح ہاتھ آئی۔ نہ قرائن سے اس کا امکان ہے۔ قیاس نہیں مانتا کہ کوئی یورپین لڑکی خواہ کتنی ہی گری پڑی کیوں نہ ہو آغا جیسے مرد سے شادی پر رضامند ہو۔ جو جمالیات سے محروم۔ انگریزی کے لحاظ سے ناخواندہ، انگریزی اخلاق سے بے بہرہ۔ فقرا کی لاابالی سلا کا تنگ دست جیسا کہ آپ ظاہر فرماتے ہیں۔ پھر آپ اس پر روغن قاز ملتے ہیں کہ جس کی امداد سے انہوں نے شیکسپیر کی تصنیفات سے وقوف حاصل کیا۔ اور انہیں شیکسپیر کے تراجم میں کامیابی حاصل ہوئی" فرض کیجئے کہ یہ عقد یا تعلق ہوا بھی ہو پھر بھی ایسی آوارہ مزاج اداکاتی عورت سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ آغا کی قابلیت کے شخص پر شیکسپیر کے نکات روشن کر دے۔ یہ قصہ کسی نے زیب داستان کیلئے آغا صاحب کی زندگی سے وابستہ کیا ہے تاکہ آغا کا شیکسپیر آف انڈیا کہلانا حق بجانب ہو جائے۔ مگر آغا کو شیکسپیر کے قریب لانے کے لئے اس غلو اور تکلف کی ضرورت کیا تھی۔ اس وقت ہندوستان شیکسپیر کے ترجموں کے لئے وقف ہو گیا تھا اور ادب کا مدار اسی صنف کار پر تھا۔ جوالا پرشاد برق۔ رام سہائے تمنا۔ امراؤ علی۔ احمد حسین۔ سیتا رام عاشق حسین۔ شاہ فیروز خاں۔ اور تفضل حسین وغیرہ نے شیکسپیر کے ترجموں کے انبار لگا دئے تھے بہ فضل ۱۸۹۰ء میں شروع ہوا اور ۱۹۱۳ء میں جا ختم ہوا۔ احسن نظیر بیگ اور حشر نے انہیں سے خوشہ چینی کی۔ پھول مترجموں کے تھے اور گلدستے ڈرامہ نگاروں نے بنائے۔ ان حالات میں شیکسپیر کے کامیاب مترجم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دیکھنے کی ضرورت ہی کیا آپ کے کہنے ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ حشر اور نظیر رندی آزاد خیالی اور بے تکلفی میں ایک دوسرے کا جواب ہیں اس سے آگے دونوں کے راستے مختلف ایک دوسرے سے لگاؤ بھی نہیں۔ خدا جانے وہ جاننے والے کون ہیں جو بقول آپ کے اس امر کے شاہد ہیں کہ ہندوستانی ناٹک کمپنیوں کے تمام ناٹک مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جنہیں کسی نامور ہستی سے منسوب کر دیا

جاتا سو" مجھے بڑے بڑے ماہرین غل بانی والا، کاؤس جی بیشہ ٹھونٹی - غلام علی دیوانہ - کریم بخش وغیرہ سے شرف نیاز حاصل ہوا لیکن یہ بات کبھی سنی - ہندوستان کی کسی زبان میں ایسا نہیں ہوا بیشک الزبتھ کے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا (مگر اب تو وہ زمانہ نہیں ہے) اور جس کے معنی ہیں کہ شیکسپیئر کے عہد میں ایسا رواج تھا -

آپ نے ایک پرانا معمہ حل کر دیا یہ بتا کر کہ آغا کے ہندی ڈراموں میں سرجو ہر شاد بہندوا اور ربلدیو پرشاد کھرے کو بہت کچھ دخل حاصل ہے" یعنی آپ دبی زبان سے یہ کہہ رہے ہیں کہ آغا کے ہندی ڈراموں کی تصنیف ان دو شخصوں کے قلم کی مرہون منت ہے - دنیا حیران تھی کہ آغا ہندی سے نابلد سورداس اور بن دیوی کیسے لکھ گئے مگر آپ کے انکشاف نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا حشر کی روح آپ کو دعائیں دیتی ہوگی کہ ان پر اردو سے غداری کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ محض بے بنیاد ثابت کر دیا کیونکہ انہوں نے ہندی میں بذات خود کوئی ڈرامہ نہیں لکھا -

آپ کا یہ فرمانا بجا ہے کہ حشر پلاٹ کی طرف بہت کم توجہ کرتے تھے - یوں فرماتے کہ پلاٹ بالکل سپاٹ ہوتا تھا تو مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا - رہی کردار نگاری تو اس سے ان ڈراموں کو کیا واسطہ - وہ تو اس صنعت ہی کے ناآشنا تھے - سب ڈراموں کے کردار دیکھ جائیے - ایک ہی پریس سے نکلے ہوئے معلوم ہوں گے - تغیر بس - تغیر الفاظ تغیر اسما باقی سب کچھ ایک

رہی شاعری وہ اس وقت زیر بحث نہیں اس کے پرکھنے والے اثر لکھنوی اور کیفی دہلوی جو موجود ہیں خدا انہیں سلامت رکھے :-

عفت ——— بقیہ صفحہ ۹

اور شریر لڑکا اب ڈاکٹر نعیم میں تبدیل ہو گیا تھا - رفیقہ اور حلیم کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی لیکن نعیم کے دل و دماغ پر عفت چھائی ہوئی تھی - دوسرے دن جبکہ رفیقہ حلیم اور نعیم قبرستان سے واپس آ رہے تھے - نعیم برابر رو رہا تھا وہ کہتا تھا کہ اگر میں دو سال پہلے ڈاکٹر ہو جاتا تو گو عفت کو میں زیادہ عرصہ زندہ نہ رکھ سکتا لیکن اسکی زندگی اس دنیا میں آسان ضرور کر دیتا - اب میں بچوں کے امراض کے متعلق پڑھکر اور اس میں ماہر ہو کر اپنی زندگی مرحومہ بہن کی یاد میں معذور بیمار بچوں کے لئے وقف کر دونگا - اس طرح جو اس دنیا میں آرام و سکون سے بیگانہ رہی اسکو دوسری دنیا میں روحانی سکون پہنچاؤنگا - پھر یقیناً اس کی روح بیحد شادمان و مسرور ہوگی "

پانچ سال کے مختصر عرصہ میں نعیم مشہور ڈاکٹر تھا - عوام اسکی عزت کرتے تھے - ہم پیشہ اس کی تعریف اور ننھے مریض اسکو پسند کرتے تھے لیکن یہ تمام کامیابی و رنگ نامی صرف عفت کی وجہ سے ہے - جو نعیم کی زندگی کا نصب العین بن گئی تھی - اس کی بیمار خاموش روح نعیم کو مشہور کر رہی تھی -

رفیقہ اور حلیم اب بھی عفت کے ممنون ہیں - بیمار بچی رخصت ہو چکی ہے لیکن ایک سبق دے گئی ہے کہ دنیا میں جو کوئی آیا ہے وہ زندگی کا کچھ مقصد اپنے ساتھ لایا ہے - خواہ وہ تندرست ہو یا بیمار - کمزور ہو یا طاقتور دولتمند ہو یا مفلس -

حلیم رفیقہ سے اکثر پوچھتا ہے "کیوں رفیقہ اگر عفت بیمار نہ ہوتی تو نعیم جیسا بد شوق شریر ضدی لڑکا ہمارے لئے باعث ننگ و عار ہوتا " "ہاں آپ کا خیال درست ہے " رفیقہ کا جواب ہوتا *

—— •◆• ——

چت چور ——— سوامی مارہروی

سوامی! تم ہی ہو چت چور

آئے براجے من کے دوارے | نے نے پلکن اوٹ سہارے
کمل بل کے لو ہو کے دھارے | نیر س بھئے سب انگ تمہارے
تم ہی ہو چت چور ہمارے | چنچل، ڈھیٹ، چتر، منہ چور

سوامی! تم ہی ہو چت چور

کرنی کر کے مت کھسیاؤ | بھولے ساجن! مت رسیاؤ
اِت کو دیکھو، آنکھ ملاؤ | جیرے سینہ من دکھلاؤ
بیتی بتیاں پھر تو سناؤ | میٹھی سی رس مور

سوامی! تم ہی ہو چت چور

آس لگی تھی تم سے جھوٹی | نیک سی بات میں وہ بھی ٹوٹی
سانچی تھی یا جھوٹی موٹی | رنگ محل کی سوبھا لوٹی
پریت کتھا یہ سب میں پھوٹی | مورے اسٹریوں نا چاموور

سوامی! تم ہی ہو چت چور

تم نے میرا دھیان لیا ہے | برجوری ایمان لیا ہے
تجا کا سامان لیا ہے | اب تو میں نے جان لیا ہے
جان لیا پہچان لیا ہے | چلبلی، بھسبی، ڈھیٹ، کٹھور

سوامی! تم ہی ہو چت چور

آؤ سوامی! ہل مل روئیں | رو کر دھو کر دونوں انکھیاں کھوئیں
کھوٹے روپ کھرے نا ہوئیں | سوکھے رو دکھ ہیری نا ہوئیں
اب نا ہوئیں، تب نا ہوئیں | رات بتا رے ہو گئی بھور

سوامی! تم ہی ہو چت چور

جب دہلی میں غدر پڑا
اور
دہلی کے باکمال پیسہ پیسہ کو محتاج ہو گئے تو وہ راز جو صدیوں سے سینہ بسینہ چلے آتے تھے بھوک سے لاچار انہوں نے بتلانے شروع کر دیئے۔ غدر کی مصیبتیں اور رفاقوں سے تنگ آئے ہوئے اہل کمال اپنا ہنر اور راز کوڑیوں میں فروخت کرتے پھرتے تھے مغل بادشاہوں کے دسترخوان کے کھانے بھی راز تھے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے رؤسا اور جاگیردار اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح شاہی باورچیوں سے ان کھانوں کی ترکیبیں دریافت کر لیں مگر وہ ناکام رہتے
رضیہ کا شاہی دسترخوان
ابھی اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے جو شاہی باورچیوں سے حاصل کی گئی تھی۔ اس کتاب کو جدید انگریزی و دیسی کھانوں کو ملا کر شائع کر دیا گیا۔ اس میں ہر قسم کے ناشتے۔ آئس کریم، فالودہ، کیک، پیسٹری۔ شاہی ٹکڑے، مختلف قسم کی لذیذ روٹیاں، مزیدار پوریاں، پکوان، حلوے، بیسیوں قسم کی دالیں، کھچڑی، انڈے، خاگینہ، قورمہ، کباب مرغ، شکار، یخنی، دہلی کی مشہور نہاری، سبزیاں، نرگسی کوفتے، مچھلی کے سالن۔ اور کباب۔ قیمہ، پلاؤ، مختلف اقسام انگریزی و دیسی مٹھائیاں، نشاستہ، حلوا سوہن، پھینیاں، سب قسم کے مربے، اور چٹنیاں، بیسیوں قسم کی چائے، کافی، شربت، ہر قسم کے انگریزی کھانے، گوشت کی مٹھائیاں، کیلے کا سالن، شاہی مچھلی، غرضکہ کھانا پکانے کی ایک بہترین کتاب ہے۔ ڈھائی سو صفحات قیمت مجلد ڈھائی روپے (عہ/)
رضیہ کی مشرقی کشیدہ کاری
کشیدہ کاڑھنے کی بہترین کتاب۔
قیمت مجلد پونے تین روپے
رضیہ کے خطوط
زنانہ خطوط بہ طرز جدید لکھائی چھپائی نہایت عمدہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/)

نقد و نظر

مشہور دہلی

اشاعت خاص بابت ماہ اگست ۱۹۴۵ء
قیمت دو روپے حکیم محمد تقی صاحب دہلوی

کی ادارت میں یہ رسالہ گذشتہ چھ سال سے شائع ہو رہا ہے ایک طبی مرکز کا رسالہ ہونے کے باوجود اس کی نگارشات خالص ادبی ہوتی ہیں گو کبھی کبھی طبی موضوعات پر مقالات شامل ہوتے ہیں مگر وہ بھی عام فہم زبان میں معلومات عامہ کی ترجمانی کرتے ہوئے۔ اسی لئے یہ رسالہ ہر طبقے میں کافی مقبول ہے۔ سال میں دو تین خاص نمبر شائع ہوتے ہیں جن میں تنوعات کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس اشاعت خاص میں اردو کے مستند اہل قلم کے افکار نظم و نثر موجود ہیں۔ نئے لکھنے والوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔ تقریباً بائیس نظموں غزلوں چھبیس افسانوں اور تین ڈراموں کے علاوہ بہت سے مفید مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتابت و طباعت اور عام تزئین بھی دیدہ زیب ہے۔

عنفوان شباب کے مرغوب اشغال (باتصویر)

مرتبہ حکیم محمد ظفرالدین ناصر رضا سرور

مہتمم صدر مخزن الادویہ سرکار عالی مدیر مسئول ماہنامہ "حکیم دکن"۔ شائع کردہ: ادارہ مطبوعات اردو مغلپورہ۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت تین روپے۔ جنسیات پر عام فہم، دلچسپ اور ایک حد تک مفید کتاب ہے۔ لیکن اس موضوع پر حکیم صاحب موصوف سے قبل دوسرے بہت سے حضرات منتظم اور بیش معلوماتی کتابیں مرتب کر چکے ہیں صرف اتنی بات ہے کہ انھوں نے مذہبی نقطۂ نظر سے زیادہ روشنی ڈالی ہے۔ جس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اس طرح طبی موضوعات کی کتاب صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور یوں بھی پڑھنے والا اسے علمی ملفوظات کی بجائے پند و نصیحت کا دفتر سمجھنے لگتا ہے۔ ایک باب میں چند غیر مستند قصوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورتیں ڈاڑھی والے مرد کو زیادہ پسند کرتی ہیں صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ممالک یورپ میں بھی۔ حالانکہ تازہ خبروں سے پتہ چلا ہے کہ چند ڈاڑھی والے ہندوستانی سپاہیوں کو دیکھ کر یورپ کی نازک دماغ عورتیں ایک دم بے ہوش ہو گئیں۔ آخری ابواب میں چند مفید اور آزمودہ نسخے بھی شامل ہیں۔ کتاب کو "باتصویر" کہنا بھی غلط ہے کیونکہ اس میں صرف مرتب صاحب کی تصویر زینت اوراق ہے۔ کتاب میں املا کی غلطیاں بے شمار ہیں حتیٰ کہ بعض اشعار اور آیات قرآنی بھی غلط درج ہیں معلوم نہیں یہ حکیم صاحب کی حکمت عملی ہے یا کاتب کی اعجاز رقمی چھیانوے صفحات کی کتاب کی قیمت مبلغ تین روپے اس زمانے کے لحاظ بھی زیادہ ہے۔

اقبال پر ایک نظر

مرتبہ سید محمد شاہ ایم۔اے ایڈیٹر رسالہ سپاہی۔ شائع کردہ اقبال اکیڈیمی بیرون موچی دروازہ لاہور صفحات ۲۴۰ قیمت پونے تین روپے شاعر مشرق علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے بلند خیالات کو عوام میں روشناس کرانے کے لئے بے شمار کتابیں اردو زبان میں لکھی جا چکی ہیں۔ قدردانی کی ایسی مثال ہندوستان ہی میں نہیں شاید دوسرے ممالک میں بھی مشکل سے ملے گی۔ علامہ موصوف کی شاعری کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہا جس پر اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔ یہ کتاب اس ضمن کی دوسری کتابوں سے زیادہ ممتاز اور گرانقدر سمجھی جا سکتی ہے کیونکہ یہ مجموعہ ہے ایسے اصحاب کی نگارشات قلم کا جن کی رائے بالکل قطعی اور تنقید نہایت وزنی تسلیم کی جاتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر عابد حسین اور مولانا ماہر القادری کے اسمائے گرامی خاص طور پر جاذب نظر ہیں۔ ان مفید مقالات کے مطالعے سے اقبال کی خودی، ان کے شاعرانہ تصورات اور ان کے مذہبی جوش کو اچھی طرح ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ اقبال اکیڈیمی کی یہ کاوش لائق تحسین ہے۔

مضراب

مصنف: راجہ مہدی علیخاں۔ ناشر: ساقی بک ڈپو دہلی صفحات ۲۰۰ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ یہ راجہ صاحب کی طنزیہ اور رومانی نظموں کا مجموعہ ہے جس کی ترتیب دو حصوں میں کی گئی ہے۔ انداز بیان کے لحاظ سے دونوں رنگ موجود ہیں یعنی کچھ حصہ اس انداز شاعری کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جس کے خلاف عموماً آواز بلند ہوتی رہتی ہے۔ اور کچھ حصہ اس پسندیدہ رنگ کے مطابق ہے جسے آزاد شاعر فرسودہ سمجھنے لگے ہیں۔ تاہم جلدی ہی یہ تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ پرانا رنگ نئے رنگ سے زیادہ ہے طول و عرض کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ عرض و جوہر کے اعتبار سے بھی۔ بغور نظر ڈالی جائے تو ماننا پڑے گا کہ راجہ صاحب ردیف و قافیہ اور بحر و عروض سے بیزار نہیں ہیں بلکہ ان سے اجتناب کسی خاص بنا پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان نظموں میں بھی جنھیں شاید جان بوجھ کر فنی تقاضوں سے محروم رکھا ہے، وہ غیر شعوری طور پر اسکی جھلک دکھاتے چلے گئے ہیں میرے خیال میں یہی ان کے فطری شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ طنزیات کے ضمن میں سب سے آخری نظم "ایک جہلم پر" سب سے اچھی ہے۔ دوسرے رنگ میں نظمیں اس قدر عمدہ ہیں کہ انھیں ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ کتاب کا دیباچہ میراجی نے لکھا ہے جو اپنی جگہ خوب ہے۔

ہچکیاں

مصنفہ: صدیقہ بیگم سیوہاروی۔ ناشر: نفیس اکیڈیمی حیدرآباد دکن۔ صفحات ۱۶۲۔ قیمت سوا تین روپے۔ یہ کتاب "سسکتی ہوئی تہذیب کے نام" معنون کی گئی ہے اس انتساب اور کتاب کے نام سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نفس موضوع کیا ہے۔ دور حاضر کی روش کے مطابق ان گیارہ افسانوں میں محترمہ صدیقہ نے امیر و غریب، آقا و مزدور اور میاں بیوی کی باہمی کشمکش کو تقریباً ایک ہی انداز میں پیش کیا ہے۔ شرابی شوہر اپنی معصوم بیوی کو زد و کوب کرتا ہے۔ سیٹھ غریبوں کی فریاد سننے کی بجائے ان پر اپنے خونخوار کتے چھڑوا دیتا ہے۔ زمیندار کا لڑکا بھکارن کو اپنے نفس کی بھینٹ چڑھانے میں بیچا کر لڑکی سے ماں بنا دیتا ہے اور خنجر جونی اس کے حوالے کرتا ہے۔ یہ باتیں موضوع کے لحاظ سے چھوٹی نہیں ہیں تاہم ان کا انداز بیان خاطر خواہ ابھرتا ہے اور یہی خیر حد سے زیادہ جاذب توجہ ہو کر کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے لئے مجبور کرتی ہے سب سے پہلا افسانہ "چاول کے دانے" قحط بنگال سے متعلق ہے اور یقیناً ایک کامیاب کوشش ہے کوئی خاص پلاٹ نہ ہونے کے باوجود اس ہولناک فضا کی مکمل تصویر نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے اور پڑھنے والا کچھ دیر کیلئے "سوچ کی نگری" میں پہنچ جاتا ہے۔ شاید مصنفہ کے اصل مقصد کی تکمیل اسی طرح ہو جاتی ہے۔ "تصویر" اور "کلرک" بھی اچھے افسانے ہیں۔

"ف - ح"

میرا پہلا براڈکاسٹ

رام پرتاب بہادر

بہت دن نہیں ہوئے ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ یونیورسٹی میں کچھ عرصہ ملازمت کرکے ان دنوں قریب قریب بیکار ہی تھا۔ کسی اور حالت میں یہ نہایت ہی مایوس کن بات ہوتی لیکن صرف اس سن اور اس کی بخشی ہوئی ذہنی صحت ہی کا تقاضا تھا جو میں نے ہمت اور امید کی لگام بالکل نہیں چھوڑی۔ بجائے کسی جان ماایوسی اور بے صبری کے طبیعت کی وہ کیفیت تھی کہ موافق یا غیر موافق ہوا کے چلنے سے تنکے کی ہر حرکت کو، اپنے لئے کسی نہ کسی خوشی کا پیامبر سمجھتا تھا۔ بہر حال ایک دن ایسے ہی بیٹھے بٹھائے دیکھتا کیا ہوں کہ ڈاکئے نے ایک لمبا لفافہ لاکر میرے 'لیٹر بکس' میں ڈال دیا۔ لفافہ جب نکالا تو دیکھا کہ اس پر "آن ہز میجسٹیز سروس" لکھا ہوا ہے۔ اس سے پہلے چونکہ اس قسم کا لفافہ پانے کا کم ہی اتفاق ہوا تھا اسلئے خط کو دیکھتے ہی جیسے آنکھوں میں امید کے آنسو بھر آئے۔ لفافہ ہاتھ میں لیتے ہی ایک دوسری عبارت پر نظر پڑی "آل انڈیا ریڈیو"۔ پھر کیا تھا۔ دل بلیوں اچھلا۔ آپ شاید اسے دماغ کا فتور کہیں۔ لیکن اس وقت جب بھی میں ملازمت کی سوچتا تھا تو یونیورسٹی کے علاوہ، دو ہی اور معقول جگہوں کا خیال آتا تھا، یعنی دلی سرکار کی نوکری یا آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت۔ ایسی حالت میں لفافہ پر آل انڈیا ریڈیو لکھا دیکھ کر دل پر کیا گزری ہوگی، آپ خود ہی سوچئے۔

ریڈیو کے اس لفافہ کو میں نے نوکری کا خط سمجھا۔ میری خوشی اور پریشانی کا اندازہ آپ لگالیجئے۔ لیکن تجربہ کی بنا پر اب یہ کہہ سکتا ہوں کہ دنیا یا اپنی قسمت سے اس قسم کی امیدیں رکھنا اور بالو پر دیوار بنانا ایک ہی ہوا۔ لفافہ پھاڑتے پھاڑتے جیسے دل پھٹ گیا۔ خط کے مضمون سے معلوم ہوا کہ ۱۸ فروری کو لکھنؤ ریڈیو سے ایک تقریر "براڈکاسٹ" کرنا ہے۔ لے دے کے ۲۵ روپیہ۔ جی ہاں کل ۲۵ روپیہ، کیونکہ اس زمانہ میں ایک تقریر کیلئے ریڈیو سے ۲۵ روپیہ کا صرف ایک چک یعنی روپیہ نہیں بلکہ روپیہ ملنے کا کاغذی وعدہ ملتا تھا۔ اسے لڑائی کی مہنگائی یا میری خوش قسمتی کہئے جو آج پچاس روپیہ کے عوض اپنی ۲۵ روپیہ کی ریڈیائی کامیابی کی کہانی آپ کو سنا رہا ہوں۔

لیکن جب سنبھل کر سوچا تو اس نتیجہ پر پہونچا کہ برا کیا ہے۔ اپنے کو سمجھایا۔ بھئی روپیوں کی مت سوچو۔ کچھ معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں نقد کی بات کم اور عزت اور رتبہ وغیرہ کی صورتیں زیادہ سوچی جاتی ہیں۔ ویسے ریڈیو پر بولنے کا حوصلہ تو بہت پرانا تھا، لیکن اور حوصلوں کے ساتھ یہ بھی اس مایوس کن زندگی میں پورا ہوتا دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام بنانے والے ایک صاحب ایک بار اس طرف آئے بھی۔ لیکن یونیورسٹی کے اور لوگوں کے ساتھ میری بھی "قیمتی" رائے لیکر چلے گئے۔ رہ [illegible] اور پیہ ان کی خاطر تواضع میں صرف ہوگئے، ہاتھ کچھ نہ لگا۔ اسلئے سوچا اچھی موقع ملا ہے۔ اسی بہانے سرکاری خرچے پر لکھنؤ ہو آئیں گے۔ لڑائی کا زمانہ ہے۔ وہاں بھی بڑے بڑے دفتر کھل رہے ہیں۔ اقتصادیات والوں کی ان دنوں ہر جگہ کھپت کی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ کون جانے کہاں کام بن جائے۔ ایک ہی ڈھیلے میں دو شکار۔ اور اگر کچھ نہ ہوا تو یہ کیا کم آواز فضا میں کیلاش پربت سے لیکر راس کماری تک لہرائے گی۔ الفاظ ستاروں کے منہ چومیں گے، جیسے کہکشاں سے ہوکر گزر جائیں گے۔

اس طرح اپنی امنگوں کا بوجھ لئے اٹھا۔ خط اٹھاکر پھر سے دیکھا۔ دیوار پر لٹکے ہوئے کیلنڈر سے براڈکاسٹ کی تاریخ ملائی۔ پھر سرخ موٹی پنسل لیکر کیلنڈر پر ۱۸ تاریخ کو ایک سرخ گولائی میں گھیر دیا۔ خط لئے ہوئے اندر گیا۔ میاں کی باچھیں کھلی دیکھکر بیوی مسکرائیں۔ سمجھیں ہو نہ ہو کوئی خوشخبری ہے۔ لیکن اس ڈر سے کہ وہ کچھ زیادہ نہ سمجھ لیں میں نے فوراً بتا دیا "ریڈیو پر بولنے جانا ہے"۔ بچے ایک دم چلا اٹھے "بابو ریڈیو پر بولیں گے، بابو ریڈیو پر بولیں گے"۔ آفت مچ گئی۔ بی بی کو دیکھا، بیچاری کچھ پریشان سی ہیں۔ اس ہنگامہ میں پوری بات ان کی سمجھ میں آبھی نہیں پائی۔ شاید اس خیال سے پریشان تھیں کہ ریڈیو پر تو گانا بجانا ہوتا ہے۔ اسلئے میں نے انھیں سمجھایا "اس دن شملہ کو بولتے سنا تھا نا؟ ہاں، بس وہی"۔

یہ مرحلہ طے ہوا تو اب دوسرے مرحلے پیدا ہوئے۔ سوچنے لگا کہ اس احسان ناگہانی کے لئے کون ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ نیکی کرنا اور اس طرح چھپ چھپ کے۔ دل جیسے بھر آیا۔ بے تحاشا کرشن چندر صاحب کا خیال آیا۔ چونکہ اردو کے بہت بڑے ادیب مانے جاتے تھے اس لئے ایک آدھ قصہ کہانی لکھنے کے ناتے ایک بار ان سے بھی خط و کتابت کر بیٹھا تھا۔ وہ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ملازم تھے۔ میں نے سوچا، ہو نہ ہو میرا آرٹ انھیں بھی پسند آیا۔ اسلئے شاید میری عزت افزائی کی انھوں نے یہ صورت سوچی ہے۔ احسانمندی کے جذبات کے اظہار کی غرض سے فوراً ایک خط انھیں اسی وقت ٹائپ کرکے ڈال دیا اور خط کے آخر میں صاف صاف لکھدیا تھا کہ جب لکھنؤ آؤں گا تو آپ ہی کے وہاں قیام کرونگا۔

خط کے جواب کے انتظار کی کہاں فرصت تھی۔ سوچا، خط پہونچ ہی گیا ہوگا، جواب آئے نہ آئے۔ اصل میں اس دماغی جلدبازی میں اس قسم کے نازک اور "دقیق" پہلوؤں کی طرف خیال بھی کیسے جاتا۔ یہ تو براڈکاسٹ کا بھوت سر سے اترنے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ بیچارے معروف کرشن چندر کو اس براڈکاسٹ کے دعوت نامہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے ہی صاحب کی مہربانی تھی۔ ایسی حالت میں کرشن چندر صاحب میرا خط پاکر شرمندہ نہ ہوتے تو کیا کرتے۔ اور پھر خط میں دھمکی جو تھی یعنی لکھنؤ پہونچ کر انھیں کے وہاں ٹھہرنے کا اصرار تھا۔

ایسی حالت میں خط کا جواب کون دیتا اور اپنے سر بے مانگی مصیبت مول لیتا۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، میرے لئے تو اور ہی سرگرمیاں حاوی تھیں۔ یعنی کس گاڑی سے جاؤں، کس درجہ میں سفر کروں، کیا کیا کپڑے ساتھ لیجاؤں، لکھنؤ میں کتنے دن ٹھہروں، وغیرہ وغیرہ، بات کل ۳۵ روپیہ کی تھی اسلئے یہ خیال مستقل دماغ پر چھایا ہوا تھا کہ لوٹتے وقت ضرور کچھ بچا کر آنا چاہیئے کیونکہ ایک طرح سے وہ میری "پہلی ادبی کمائی" تھی۔ خیر صاحب، ایک ایک کرکے سب منزلیں طے ہوئیں اور میں کسی طرح جان لے کر رات کے ساڑھے نو بجے انٹر کلاس کے ایک ڈبہ میں سوار ہو گیا۔

ویسے تو گھر سے روانہ ہونے سے پہلے مسودہ لکھ چکنے کے بعد اسے کئی بار دوہرا ڈالا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہ مسودہ کا اچھا خاصا حصہ اب حفظ ہو چلا تھا۔ کبھی گھڑی سامنے رکھکر، کبھی کسی دوست کو بٹھا کر، غرضکہ ہر حالت میں اور ہر صورت سے مسودہ کا مطالعہ کرکے اسے پندرہ منٹ کی وقت کی پابندی کے لحاظ سے پکا کر لیا تھا۔

اگر آپ پوچھیں کہ آخر وہ کونسا ایسا اہم مسئلہ تھا جس پر اس بری طرح عقل اور غور و فکر کا صرف ہوا اور اتنی خواہ مخواہ کی پریشانی اٹھانی پڑی، تو صاحب اب مضمون کا عنوان تو یاد نہیں رہا، لیکن اتنا ضرور یاد پڑتا ہے کہ کسی سلسلہ میں لڑائی کے بعد پیدا ہونے والی دنیا کی جیسے ایک مجسّم تصویر کھینچ کر رکھدی تھی میں نے۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ اصل میں ریڈیو کے واسطے مضمون لکھنا بقیہ دیگر لوازمات اور جھنجھٹوں کے مقابلہ میں سب سے آسان کام ہوتا ہے۔ حقیقتاً اس سلسلہ میں جو دو سب سے بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں ان میں سے ایک ہے لکھنؤ تک سفر کرنا اور دوسری ہے ٹھیک پندرہ منٹ میں بغیر کھانسے ہوئے پوری تقریر پڑھکر سنا دینا۔ پہلی دقت کا ذکر کر ہی چکا ہوں۔ دوسری پریشانی کا دورہ ٹرین کے سفر ہی میں شروع ہو گیا۔

تقریر کی ایک نقل پہلے ہی بذریعہ ڈاک لکھنؤ بھیج چکا تھا۔ احتیاطاً دوسری نقل جیب میں رکھ لی تھی۔ چنانچہ ٹرین میں جب تک نیند نہیں آگئی تب تک اسے بار بار پڑھتا رہا۔ پھر بھی دماغ میں مسلسل یہ خلش رہی کہ کس طرح ٹھیک پندرہ منٹ ہی پر، یعنی نہ ایک سیکنڈ پہلے اور نہ ایک سیکنڈ بعد، تقریر ختم ہو جائیگی۔ ساتھ ساتھ جو دوسرا احساس مارے ڈالتا تھا وہ یہ تھا کہ معلوم نہیں ملک کے کونے کونے میں کون کون ہستیاں میری تقریر سنتی ہوں اور پتہ نہیں کیا رائے قائم کریں۔ کبھی گاندھی جی کا اور دیش کے دوسرے نیتاؤں کا خیال آتے تو کبھی لاٹ صاحب وغیرہ کا خیال ستانے۔ دوستوں دشمنوں کو بھی سوچا۔ غرضکہ دماغی کیفیت ایسی تھی کہ بس سارے ملک کو اپنا براڈکاسٹ ہی سنتا محسوس کرتا رہا اور اس خیال سے اسی طرح پریشان ہوتا رہا۔

لیکن اس ڈرامہ کا تقاضہ خیز منظر اس وقت شروع ہوا جب میں لکھنؤ اسٹیشن سے تانگے پر سوار ہو کر ریڈیو اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ ویسے لکھنؤ اس سے پہلے بھی آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن آج لکھنؤ میں داخل ہوتے وقت عجیب تجربہ ہوا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ جیسے سڑکوں پر چلنے والے مجھے دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں اور ان کی پُرمعنی نگاہیں کہتی ہیں "آپ ہی ریڈیو پر آج تقریر کریں گے!" جوں جوں تانگہ شہر کے اندر چلتا گیا یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک اسٹیج ایسا بھی آیا جب میں نے محسوس کیا جیسے سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے بھی مجھے پُرمعنی ڈھنگ سے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کی بنی ہوئی مخصوص صراحیوں نے بھی، جو ایک ٹھیلے پر لدی جا رہی تھیں، منہ کھول کر میرا استقبال کیا۔ مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ آپ میری باتوں پر شاید یقین نہ لائیں، لیکن یہ باتیں دراصل اس طرح ہنسنے سے نہیں بلکہ ریڈیو پر پہلی بار براڈکاسٹ کرنے سے تعلق رکھتی ہیں!

تانگہ ریڈیو ہاؤس کے سامنے ہی پہونچ کر رکا۔ کرشن چندر صاحب کی خط کا جواب نہ دینے کی ترکیب رد ہوگئی۔ اندر میرا پیغام پا کر انھیں باہر نکل کر میرا استقبال کرنا پڑا۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ وہاں ضروریات سے فارغ ہو کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں ریڈیو ہاؤس واپس آیا۔ خود بھی جی چاہا، کرشن چندر صاحب نے بھی براڈکاسٹ کرنے کے کمروں کو اندر سے دکھانے کی خواہش ظاہر کی۔ جو دو چیزیں کثرت سے نظر آئیں وہ مختلف رنگ برنگ کی عورتیں اور قسم قسم کے تار۔ میں سوچنے لگا، اپنی بے عقلی میں میں ریڈیو کو بے تار کا تار سمجھے بیٹھا تھا۔ لیکن یہاں سے زیادہ تار شاید ہی کہیں نظر آئے تھے۔ عورتوں کو دیکھکر اس نتیجہ پر پہونچا کہ ریڈیو وہ دنیا ہے جہاں مردوں سے زیادہ عورتیں ہوتی ہیں۔

ایک کمرہ میں جھانک کر دیکھا۔ کچھ پڑھے لکھے لوگ جھوم جھوم کر اور آگے قدم بڑھا بڑھا کر "مائیک" کے اندر کچھ کہہ رہے تھے، جیسے دیہاتی عورتیں لڑتے وقت ایک دوسرے کو جھپٹ جھپٹ کر گالیاں دیتی ہیں۔ کمرہ میں طرح طرح کی چیزیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دو آدمی مٹی کے دو بڑے ناد اور کونڈے "تھپ تھپ تھپ تھپ" پیٹ رہے تھے۔ میرے دوست نے مجھ سے بتایا، دیہاتی پروگرام "براڈکاسٹ" ہو رہا ہے۔ میں نے کہا "لیکن بھئی یہ لوگ تو پڑھے لکھے لگتے ہیں؟" پھر ان سے معلوم ہوا کہ دیہاتی زبان میں اس کام کو بھی شہری لوگ انجام دیتے ہیں۔ بہرحال کمرہ کے اندر جس قسم کی چیزیں پھیلی ہوئی تھیں ان کی وجہ سے پورا کمرہ جیسے ہندوستان کا نقشہ لگ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، کاش اس کمرہ کے دروازہ پر "ہمارا ہندوستان" لکھا ہوتا۔ ایک دوسرے کمرہ میں اچھی بھلی عورتیں رو دھو کر کہرام مچائے ہوئے تھیں۔ معلوم ہوا دیہاتی عورتوں کے لئے براڈکاسٹ ہونے کے واسطے ڈرامے کا "ریہرسل" ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا، انسانی زندگی کی دکھ درد کی کہانی کا کیا ہی مذاق بنتا ہے یہاں پر۔

اسی طرح اور چیزیں دیکھیں۔ اتنے میں ایک صاحب بہت سے کاغذات وغیرہ لئے ہوئے آگئے اور کچھ بات چیت اور سوال و جواب کے بعد یہ طے پایا کہ

میری تقریر کا بھی 'ریہرسل' ہونا چاہئے۔ اور اب یہیں سے میری مصیبتوں کی گھڑی شروع ہوتی ہے۔ ہم لوگ پھر اس مخصوص کمرہ میں داخل ہوئے جس میں سے صرف تقریریں براڈکاسٹ ہوتی ہیں۔ کمرہ نہایت ہی سجا ہوا، ایک طرف صوبہ کے گورنر صاحب ایک تصویر میں سامنے 'مائک' رکھے تقریر کر رہے تھے۔ دوسری طرف صوبہ کے وزیر اعظم صاحب یہی کام انجام دے رہے تھے۔ اسی طرح اور بھی کئی بڑی بڑی ہستیاں تصویروں میں دیواروں پر لٹکی ہوئی نظر آئیں۔ اب تو میری رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی۔ جس میز پر بیٹھ کر تقریر کرنی تھی وہ پھانسی کا تختہ لگنے لگی۔ مجھے پھانسی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن ایسا محسوس کرنے لگا جیسے پھانسی کی بس تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سامنے دیوار پر جو گھڑی لگی تھی اس میں صرف کچھ کھڑی پڑی لکیریں نظر آئیں۔ یہ اور غضب! بیچ میں وقت دیکھنا چاہئے تو وہ بھی ناممکن۔ معلوم ہوا اس قسم کی گھڑیاں خاص طور سے ریڈیو ہی کے واسطے بنتی ہیں، جو صرف منٹ بتاتی ہیں۔ سامنے جو مائک رکھا تھا وہ بھی کچھ عجیب و غریب قسم کا تھا، یعنی اچھا خاصا شہد کی مکھیوں کا چھتا لگ رہا تھا۔

کمرہ بند ہو جانے کے بعد وہ دم گھونٹنے والا سکوت قایم ہوا کہ بس ایسا محسوس کرنے لگا جیسے بغیر پانی کے گہرے کنوئیں میں پڑا ہوں۔ کھانسی بری طرح آنے لگی۔ گلا سوکھ سوکھ کر پھنستا جاتا تھا۔ ریہرسل کے بعد معلوم ہوا، تقریر ایک منٹ چھوٹی ہے۔ جلدی جلدی دو چار جملے اور گھسیٹ دوں لیکن ایسے ماحول میں قلم بھی ظالم کہاں چلتا، چلتا کم، کاغذ میں گھستا زیادہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے موت کی گھڑی بھی آ گئی۔ جو صاحب براڈکاسٹ کرانے والے تھے انھوں نے جھٹ ایک آلہ اٹھا کر اپنے دونوں کانوں پر لگا لیا اور پھر میرے مسودہ کے صفحوں کو کاغذ کی مختلف دفتیوں پر کلپیں مارنے لگے۔ میں نے پوچھا آخر یہ اہتمام کیوں؟ انھوں نے بتایا کہ اگر صفحے الٹتے پلٹتے وقت ہل گئے تو دور سننے والوں کو ایسا معلوم ہوگا جیسے ریڈیو ہاؤس میں پہاڑ الٹ پڑا۔ میں نے کہا: "اگر ایسی بات ہے تو مہربانی ہو اگر انھیں ابھی طرح خبر دیجئے گھر پر بال بچے سنتے ہوں گے......" جملہ پورا بھی نہ ہو پایا کہ ایکدم انھوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کر دیا۔ دل نے کہا مر گیا میں۔ کیا ظلم! لال روشنی میز پر ہوئی۔ پڑھنے کے لئے انھوں نے بھوت کی طرح ہاتھ سے اشارہ کیا۔ گلا روندھا، زبان لڑکھڑائی۔ لیکن جو پھر بھٹک چلی تو تقریر ختم ہو گئی۔ لال روشنی کی جگہ ہری روشنی میز پر ہوئی۔ انھوں نے کانوں پر سے آلہ اتارتے ہوئے کہا "یہ ایک منٹ پہلے ختم ہوا؟" گھڑی کی طرف دیکھنا چاہا کہ داہنی طرف سے ایک دوسرے صاحب نے میرے سامنے بہت سے کاغذات رکھ دئے "بہت خوب" آجتک 'بہت خوب' اور اس نئی مصیبت کا مفہوم سمجھا تب تک انھوں نے یہ عدد [illegible] تھے۔ داہنے ہاتھ سے چیک دیتے ہوئے انھوں نے میرے سامنے بایاں ہاتھ پھیلایا۔ جیب سے [illegible] ہاتھ پر رکھی تھی کہ پہلے صاحب میرے واسطے کمرہ کا دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔ جلدی سے باہر نکلا۔ دو قدم آگے چل کر جو میں نے سوچا اپنی تقریر کے بارے میں دریافت کرنا چاہا تو مڑ کر دیکھا وہ دونوں صاحب غائب ہو چکے تھے۔ پریشان ہو کر تیز قدم چلنے لگا۔ ریڈیو ہاؤس کی سیڑھیوں پر سے جو اترا تو [illegible] میں [illegible] "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے"

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱ رفتارِ تغزل ——— حضرت سیماب اکبرآبادی
۲ نوتخ ناردی (مع تصویر) ——— پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی
۳ ترکوں کا ذوقِ لطیف ——— جناب عبدالرشید خاں
۴ چوڑیاں (افسانہ) ——— محترمہ ع۔ ق۔ بیگم
۵ موسیقی کے بارے میں ——— جناب غلام عباس
۶ دونا لیزا (نظم) ——— جناب اختر انصاری
۷ روسی ظرافت ——— جناب ولادیمیر شبالف
۸ بی۔بی۔سی الافادی ——— جناب نور محمد
۹ عرب و ہند کے ثقافتی تعلقات ——— جناب م۔ م۔ تقی
۱۰ درد کی دلّی ——— جناب یوسف بخاری
۱۱ انتقام (افسانہ) ——— جناب رشید اختر ندوی
۱۲ شیاپیہ (نظم) ——— سردار مہندر سنگھ کوثر
۱۳ قطبی تحقیقات کا مستقبل ——— جناب فریک ڈینیم
۱۴ کفایت شعار (ڈرامہ) ——— محترمہ مریم سلیم
۱۵ مختصر نویسی ——— جناب فرینک فرینو
۱۶ ٹیکہ (افسانہ) ——— جناب سید تجمل حسین
۱۷ کوریا ——— جناب شنکر دیال

شیخ سنوسی کی واپسی

ایک بوڑھا جو اطالویوں کے جور و ستم نہیں بھولا ہے شیخ سنوسی کو مبارکباد دے رہا ہے۔

زاروں آدمی شیخ کی تقریر سننے آئے۔ اس جلسہ میں چودھویں قبیلہ کے
زاروں آدمی جمع ہیں جو اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہوکر آئے ہیں۔

عرب گارڈ شیخ سنوسی کو سلامی دے رہا ہے۔

سنوسی سید محمد ادریس کو بائیس سال
اطالویوں نے انکے ملک سے نکال دیا تھا
ب برطانیہ نے انکو واپس سائرانیکا بھیج
۔ شیخ سنوسی کے پیروؤں نے آپکی غیر
گی میں بھی آپکو نہیں بھلایا بلکہ
اور سیاسی معاملوں میں برابر آپ سے
کرتے رہے۔ اس عقیدت کی بنا پر شیخ
ابسی پر ملک میں آپکا استقبال بڑی
نی کے ساتھ ہوا۔ سنوسیوں کا ایک
فرقہ ہے جسکے بانی موجودہ شیخ
کے دادا تھے۔ یہ لوگ صوفیوں کی
عابد اور پرہیزگار ہوتے ہیں۔ ریاضت
لے انہوں نے خاص خاص خانقاہیں بنا
ہیں یہ لوگ ممالک غیر کے ساتھ بھی
رکھتے ہیں اسی لئے اطالویوں کو اس
بڑھتے ہوئے اثر سے خطرہ پیدا ہوا اور
نی کے حکم سے اطالوی فوجوں نے انکے
کو منتشر کردیا اور شیخ سنوسی کو
ن۔ یہ لوگ اب پھر اپنی تنظیم کرینگے۔

Cover Printed at Calcutta Art Press for "UNITED PUBLICATIONS" Delhi. Regd. No. L. 4765

شراب کہنہ در جام نو
سرخ افسانے
جنگ روس و جرمنی کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے اور دلچسپ و دلکش تاریخی افسانے۔ قیمت مجلد تین روپے۔
تازیانہ
ایک نازک اندام حسینہ کی دلکش داستان۔ از محمد رحیم دہلوی
قیمت ڈیڑھ روپیہ۔
زارینہ۔ از محمد رحیم
زار روس کی ملکہ زارینہ کی داستان پڑھئے ملک کے لیڈروں نے اس ناول کی تعریف کی ہے قیمت ڈھائی روپے۔
پتھر سے ہیرا
ڈاکٹر سید احمد بریلوی کا اصلاحی اخلاقی اور تبلیغی سچا افسانہ۔
قیمت سوا دو روپے۔
جام و مینا
منشی پریم چند۔ خواجہ حسن نظامی۔ ایم اسلم۔ سدرشن وغیرہ کے افسانے
قیمت ڈھائی روپے۔
سرخ چین کا رہنما
سرخ چین آج کی دنیا میں ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اسکے لیڈر ماؤسی تنگ کی سوانح عمری۔ قیمت تین روپے (ترجمہ از لے لے آزاد)
جواہر لال کی کہانی
بے تاج کے بادشاہ کی سوانح حیات پڑھئے۔ قیمت ساڑھے پانچ روپے
امت کی مائیں
از مولانا راشد الخیری سوانح ازواج پاک مطہرات قیمت ڈھائی روپے۔
(رضیہ کا) شاہی دسترخوان
ہر قسم کے مشرقی مغربی کھانے قیمت ڈھائی روپے۔
(رضیہ کی مشرقی مغربی) کشیدہ کاری
بچوں کو کاڑھنا سکھائیے۔ مجلد پونے تین روپے۔
رضیہ کے خطوط
رضیہ سلطانہ نے خط و کتابت کے ذریعہ لکھنے پڑھنے کے اور سلیقہ مندی سکھانے کے طریقے بتلائے ہیں لڑکیوں اور عورتوں کے لئے بہترین زنانہ خطوط کی کتاب قیمت ڈیڑھ روپیہ۔
دیئے
قاضی امداد انصاری کے رومانی اور تاریخی افسانے۔ مجلد سوا دو روپے۔
نئی امنگیں
جوش وغیرہ کی نظموں کا مجموعہ قیمت سوا دو روپے۔
دیگر دلچسپ اور علمی کتابیں
رضیہ کے تین افسانے
بیوی محبت کیوں کرے
پھانسی۔ منٹو
روسی افسانے
آئینے
مولیساں کے افسانے
سوسائٹی کا گناہ
مغربی افسانے
چاند سورج کی چوری
اشک
نظمی تتلیاں
سات تارے۔ ایم اسلم وغیرہ
مضامین احمد سعید
بیوی۔ شوکت تھانوی
تاجدار رقاصہ
جینٹ
عجیب۔ قاضی عبد الغفار
لعل و گوہر
سنی سنائی
فاطمہ کا لال
شرم گناہ۔ ایم اسلم
مذکورہ تمام کتابیں اچھے کاغذ پر شائع ہوئی ہیں اور مجلد ہیں
ڈسٹ کور حسین محصول علاوہ
یہ اور ہر قسم کی کتابیں ملنے کا پتہ:۔ نیا کتاب گھر اردو بازار (اے۔ سی) دہلی

آجکل

اردو پندرہ روزہ — باتصویر — دہلی

چندہ سالانہ دس روپے ششماہی چھ روپے | سال ۴ نمبر ۱۲ | فہرست | ۱۵ نومبر ۱۹۴۵ء | قیمت فی پرچہ (۶) چھ آنے

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	رفتار زمانہ	ادارہ	۴
۲	واقعات عالم کا روزنامچہ	ادارہ	۶
۳	غزل	استاد السلطان نواب فصاحت جنگ جلیل	۷
۴	رام بابو سکسینہ (مع تصویر)	جناب ایم اے واحد خاں	۸
۵	علی مراد (افسانہ)	جناب ایم اسلم	۱۰
۶	نیم رس نظم نمبر ۲	جناب نور محمد	۱۶
۷	غزل	جناب مہرلال ضیا فتح آبادی	۱۸
۸	غزل	جناب عامر عثمانی	۱۹
۹	فرعون کی نہر	سردار گربچن سنگھ	۲۱
۱۰	برطانیہ کے شاہی محل	جناب ڈی راگھون	۲۲
۱۱	عیدکارڈ (نظم)	جناب خلیل الرحمٰن اعظمی (علیگ)	۲۳
۱۲	بحرالکاہل کے جزیرے	جناب ودیا ساگر	۲۴
۱۳	انوار سحر	تاج الشعراء حضرت نوح ناروی	۲۶
۱۴	آغا حشر کاشمیری حقیقت کی روشنی میں	جناب عشرت رحمانی	۳۵
۱۵	زندگی (غزل)	جناب فیض لدھیانوی	۳۹
۱۶	لوریاں	محترمہ ماجدہ بیگم	۴۱
۱۷	تیری آنکھیں (غزل)	جناب مخمور اکبرآبادی	۴۳
۱۸	شہاب ثاقب اور سنگ شہابی	جناب ح م اسلم عظیم آبادی	۴۴
۱۹	کیا ہوں؟ (غزل)	جناب توصیف احمد علوی ہاشمی کیرانوی	۴۶
۲۰	خوراک پر کنٹرول اور راشننگ	محترمہ لیلاوتی	۴۷
۲۱	فریب مسرت (نظم)	جناب اسلم ضیائی	۴۸
۲۲	مغنی سے (نظم)	جناب محی الدین اعظمی خیرآبادی	۴۸
۲۳	ٹریجڈی (افسانہ)	جناب عبدالستار (جامعی)	۴۹
۲۴	بنتی (گیت)	محترمہ اقبال معروف	۵۱
۲۵	ایران کی بیرونی تجارت	جناب فرہنگ تفرشی	۵۲
۲۶	مسافر سے (نظم)	پروفیسر ایس ڈی شرما بیدار	۵۳
۲۷	حیدرآباد شاہراہ ترقی پر	جناب شنکر دیال	۵۵
۲۸	نقد و نظر	"ف - ح"	۵۷
۲۹	اناطولیہ کے آثار قدیمہ کا انکشاف	ڈاکٹر حامد زبیر قوسے (ترکی)	۵۸
۳۰	غزل	جناب شہید حسین شہید بدایونی	۵۹

مدیر اعلیٰ: آغا محمد یعقوب دواشی — بی اے (علیگ)، ایل ایل بی

نائب: راجیندر ناتھ شیدا — ایم اے

مدیران: فضل حق قریشی — دہلوی — مشیر احمد — ایم اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ — پوسٹ بکس ۱۴۴ دہلی

جاپان میں قحط کے امکانات

جاپان پر امریکی قبضہ حاصل ہو جانے سے دنیا کی سیاسی اور عسکری تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا ہے اور یاس و ناامیدی کی تاریک فضا میں ٹھوکریں کھانے والی ہستیاں بھی اتحادیوں کی ان فتوحات کو شاندار کارناموں سے تعبیر کرنے لگی ہیں لیکن جن دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ان کا صحیح احساس بہت کم لوگوں کو ہے۔ وہ لوگ جو اہل جاپان کی اصل ذہنیت سے واقف ہیں ایک حد تک سمجھ سکتے ہیں کہ جنرل میک آرتھر اور دوسرے ارباب سیاست آئین پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی کرنی پڑ رہی ہوگی۔ حقیقتاً جاپان پر قبضہ کرنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا اب وہاں نظم و نسق قائم رکھنا دشوار ہے۔ اس امر کا بھی امکان ہے کہ اتحادیوں کے موجودہ اعلیٰ کمان کا سلسلہ ختم ہو کر اس قسم کا مشترک انتظامی کمیشن قائم ہو جائے جو ملک جرمنی میں موجود ہے اور وہاں کا بندوبست کر رہا ہے۔ جاپان کی اندرونی بدانتظامی سب سے زیادہ پریشان کن ہے۔ خصوصاً اشیائے خوراک کی غیر معمولی کمی اور معقول وسائل حمل و نقل کے فقدان نے زیادہ پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ اور اسی لئے یہ اندیشہ لاحق ہو چلا ہے کہ کہیں زبردست قحط کی وبا رونما نہ ہو جائے۔ خود جاپانیوں کا خیال ہے کہ اگلے سال کے دوران میں پچاس لاکھ اور ایک کروڑ کے درمیان جاپانی فاقہ کشی اور خراب غذا کے استعمال سے مر جائیں گے ہو سکتا ہے کہ آئندہ مارچ اور اپریل کے مہینے میں چاول نہ ملنے پر مختلف قسم کے فسادات شروع ہو جائیں۔ یہ مشکلات اس لئے پیش آ رہی ہیں کہ خوراک کے سلسلے میں جاپان کیسر دوسرے ملکوں کا دست نگر تھا۔ نیز اسکے ملک کی زمین تمام باشندوں کا پیٹ بھرنے کیلئے کافی نہیں ہے۔

ہندوستان کے آئندہ فوجی افسران

حکومت ہند نے اعلان کیا ہے کہ آئندہ ہندوستان کی بحری اور بری فوجوں میں مستقل عہدے مخصوص ہونگے۔ ہندوستانیوں کے لئے اور ایسے لوگوں کے لئے جو ہندوستان میں قیام پذیر ہونے کے بعد برطانوی رعیت کہلا سکتے ہیں، یا ان کا تعلق کسی ریاست سے ہے۔ چنانچہ ابھی سے اس تخصیص کا لحاظ رکھنا شروع کر دیا گیا ہے۔ تاہم عارضی طور پر محض اس خیال سے کہ فوری ضرورتیں پوری ہو سکیں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ چالیس مستقل عہدے ہندوستانی بحریہ کے ان یورپی افسران کو دیدئے جائیں جن کے نام پہلے سے شامل فہرست ہیں۔ اس طرح ابتدائی طور پر بحری محکمے کو ایسی اعلیٰ ہستیاں مل جائینگی جو تربیت یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ موجودہ جنگ کے تجربات بھی حاصل کر چکی ہیں ورنہ خاص ہندوستانی افسران جو آئندہ کے لئے مفید ثابت ہوں فی الحال ناپید ہیں۔ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ تینوں، بحری، بری اور فضائی محکموں میں ایک خاص تعداد میں برطانوی افسران کو بھرتی کرتے رہنا اس وقت تک ضروری رہیگا جب تک کہ ہندوستانی افسر پوری طرح سند یافتہ ہو کر ان عہدوں پر مامور ہونے کے لئے میسر آ جائیں۔ ایسی صورت میں لازمی ہے کہ ہندوستان کے یہ تینوں محکمے برطانیہ کے شاہی، بحری، بری اور فضائی محکموں سے وابستہ رہیں تاکہ امداد و تعاون کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت کا امکان بھی موجود رہے جوں جوں ہندوستانی افسران ملتے رہیں گے، برطانوی افسران کی تعداد خود بخود کم ہوتی چلی جائے گی۔ یہ سب کچھ طے کر لینے کے بعد اب حکومت ہند اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے کہ برطانوی افسران کی خدمات کن شرائط اور پابندیوں کے ساتھ حاصل کرے اور محکمانہ وابستگی کو قائم رکھنے کی تجویز کس مدت تک کے لئے ہو۔ یہ فیصلے ان برطانوی افسران پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوتے جو ہندوستانی بحریہ اور فوج میں پہلے ہی مستقل عہدوں پر فائز ہیں۔

سرحدی سپاہیوں پر نظر عنایت

لڑائی ختم ہو جانے کے بعد سے فوجی سپاہیوں کی تخفیف کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے لیکن انکی خدمات کا لحاظ رکھتے ہوئے حکومت ان پر نظر عنایت مبذول کر رہی ہے۔ چنانچہ طے پایا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں حصہ لینے والے ان سپاہیوں کو جنھوں نے کارہائے نمایاں دکھائے ہیں خاص طور پر نوازا جائے۔ پہاڑپور کے نہری علاقے کی ۴۸ ایکڑ زمین ان کو دی جائیگی جو وکٹوریہ کراس یا جارج کراس حاصل کر چکے ہیں اسی طرح دوسرے تمغے پانے والوں کو انکی بہادری کے صلے میں ۲۴-۱۲ ایکڑ زمین دی جائے گی۔ ان عطیوں کے علاوہ تعلیمی اور طبی مراعات دینے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان سپاہیوں کی اولاد کو مفت تعلیم کے علاوہ نصاب کی کتابیں بھی دی جائینگی نیز انکی طبی دیکھ بھال کی جائیگی

دلچسپ اور معلوماتی فلم

حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات و نشریات کے شعبۂ فلم سے متعلق جوائنٹ سکریٹری مسٹر پرینا تھ تھاپر کا

بیان ہے کہ امریکی کارٹون اور معلوماتی فلم ہندوستان میں دکھائے جانے کے انتظامات کے سلسلے میں مشہور امریکی فلمساز والٹ ڈزنی سے تبادلۂ خیالات کیا جا رہا ہے۔ یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ صرف وہی فلم قبول کئے جا سکیں گے جن کا زبانی تبصرہ زبانِ اردو میں آسانی سے منتقل کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ۱۶ ملی میٹر عرض کے فلم دکھانے کے لئے مناسب ساز و سامان کی فراہمی بڑی تیزی کے ساتھ عمل میں آ رہی ہے۔ موصوف نے دوسرے نگارخانوں کے اربابِ انتظام سے بھی گفتگو کی ہے تاکہ اچھی قسم کے تعلیمی فلم تمام ہندوستان میں دکھائے جا سکیں۔ حکومت کی یہ کوشش لائقِ تحسین ہے اور توقع ہے کہ اسکا نتیجہ خاطر خواہ نکلیگا۔

فوجوں کی مراجعتِ وطن

جنگ زدہ یا جنگ سے متعلق ملکوں میں جوں جوں امن و عافیت کی فضا قائم ہو رہی ہے، دوسرے مقامات سے آئی ہوئی فوجیں اپنے اپنے وطن کی جانب لوٹتی جا رہی ہیں۔ چنانچہ امریکی فوج کا بہت سا حصہ ہندوستان سے واپس چلا گیا اور باقی واپس جانے کے لئے رختِ سفر باندھ رہا ہے۔ بقول حضرت انشاء ؏

"بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں"

ان کے برعکس ہندوستان کی ان فوجوں کی واپسی کا جو دوسرے ملکوں میں برسرِ پیکار تھیں، سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ سویت روس کے فیصلے کے مطابق منچوریا کے سب علاقے رفتہ رفتہ سُرخ فوج سے خالی ہو جائینگے۔ اسی طرح چین میں قیام پذیر امریکی فوجوں کے کمانڈر انچیف نے اعلان کیا ہے کہ مغربی چین کے امریکی دستوں کی مراجعتِ وطن ۱۵ نومبر تک ختم ہو جائیگی۔ امریکہ کی فضائی فوجیں سرزمینِ چین کو ۱۵ دسمبر تک خیرباد کہہ دینگی بشرطیکہ چین میں رہنے والے تمام جاپانی دستے اسوقت تک ہتھیار ڈال دیں۔ عام سپاہیوں کے چلے جانے کے بعد امریکہ کے فوجی افسرانِ اعلیٰ جو شنگھائی میں موجود ہیں جنوری کے آخر تک چین کو خالی کر دینگے۔

مشرقِ وسطیٰ میں تیل کی نئی پائپ لائن

نیوز کرانیکل کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ عنقریب سعودی عرب کے ان تیل کے میدانوں سے جو الظہران میں واقع ہیں ساحلِ فلسطین تک بارہ سو میل لمبی ایک نئی پائپ لائن ڈالی جائیگی جس پر تقریباً چار کروڑ پونڈ لاگت آئیگی۔ یہ کام امریکن ٹرانس عربین پائپ لائن کمپنی انجام دے گی۔ انتظار اس امر کا ہے کہ فلسطین کے ہائی کمشنر مسٹر گورٹ جو اسوقت یروشلم میں ہیں، معاہدے پر دستخط کر کے کمپنی کو اختیار دیدیں کہ فلسطین کی سرزمین سے پائپ لائن گذار لی جائے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم اٹھانے کے لئے کمپنی کو تمام علاقوں کی دیکھ بھال کے بعد معقول نقشے اور خاکے تیار کرنے پڑینگے۔ اس کے بعد صحرا میں جگہ جگہ بہت سے کنوؤں کی کھدائی عمل میں آئیگی تاکہ کام کے دوران میں مزدوروں وغیرہ کو کسی قسم کی دقّت لاحق نہ ہو۔ یہ ابتدائی کام ہی غالباً ایک سال میں ختم ہوگا۔ اسلئے اندازہ ہے کہ تیل کے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں تقریباً تین سال لگیں گے۔

ایٹم کی قوتوں کا مستقبل

امپیریل کالج آف سائنس کی صد سالہ جوبلی کے موقعہ پر البرٹ ہال لندن میں تقریر کرتے ہوئے بادشاہ سلامت نے فرمایا کہ ہمیں سارے جہان میں امن و سکون قائم کرنے اور دنیا کی بگڑی ہوئی حالت کو ازسرِنو بحال کرنے کے لئے وہی خلوص اور جوشِ عمل دکھانے کی ضرورت ہے جسکا مظاہرہ فتح و نصرت حاصل کرنیکی کوشش میں کیا گیا تھا، اسلئے سائنسدانوں کا فرض ہے کہ وہ عصرِ جدید کی اس زبردست تحقیق کا راز جسے ایٹم بم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اپنے ہی سینوں میں محفوظ رکھیں اور کسی وقت بھی اسے افشا نہ ہونے دیں۔ ایسا نہ ہو کہ حرص و آز کی آگ سے بھڑک اٹھنے والے ممالک اس سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے لگیں۔ البتہ صنعت و حرفت کے میدان میں اگر ایٹم کی تحقیق سے اسطرح استفادہ کیا جائے کہ اس سے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ ایٹم کی قوت سے تخریب کی بجائے تعمیر میں زیادہ کام لیا جا سکتا ہے، اور یہی ہونا بھی چاہیئے۔ صدر ٹرومین نے بھی ایک پریس کانفرنس کے دوران میں فرمایا کہ میں ابھی تک اپنے اس فیصلہ پر قائم ہوں کہ ایٹم بم کے رازہائے سربستہ کو بدستور صیغۂ راز میں رکھا جائے۔ ان فیصلوں کے برعکس فرانس اس کوشش میں سرگرداں ہے کہ جلد از جلد ایٹم کی قوتوں کا راز معلوم کرے۔ اس مقصد کے لئے بہت سے کارخانے عنقریب کھلنے والے ہیں جہاں نت نئے تجربات عمل میں آئینگے اور غالباً تختۂ مشق کے لئے صحرائے اعظم کو بھی استعمال کیا جائیگا۔ اس سلسلے میں قائم ہونیوالے کمیشن کے ڈائرکٹر ایم راؤل دوتری نے کہا کہ ہمیں دوسری قوموں کا آسرا لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہم اپنی دنیا الگ قائم کر سکتے ہیں۔ ایٹم کی قوتوں کی پوری نوعیت معلوم کر کے ہم سب سے پہلے اسے صنعت و حرفت کے کاموں میں استعمال کرینگے اور اگر ضرورت ہوئی تو جلدی ہی میدانِ جنگ میں بھی اس سے کام لینے میں احتراز نہیں کیا جائیگا۔

جرمنی کیلئے سائنسدانوں کے تحقیقاتی وفد

امریکہ اور کینیڈا کی حکومتوں نے اپنے اپنے ملکوں سے سائنسدانوں کے تحقیقاتی وفد کثیر خرچ پر جرمنی بھیجے ہیں تاکہ اس ملک کے سائنسی اسرار و رموز کو سمجھا جا سکے چنانچہ اسی امر کو مدِنظر رکھتے ہوئے تجارت و صنعت کی انڈین چیمبر کمیٹی نے حکومتِ ہند کو مشورہ دیا ہے کہ ہندوستان کے ماہرینِ سائنس و تجارت کو جرمنی بھیجنے میں پوری مدد دی جائے تاکہ وہ بھی امریکہ اور کینیڈا کے نمائندوں کے دوش بدوش ان مسائل کی تحقیق کریں جو آئندہ ہندوستان کیلئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ کمیٹی کے اراکین نے زور دیا ہے کہ اس کا فیصلہ بہت جلد کیا جائے کیونکہ دیر سے پہنچنے کی صورت میں خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکیگا۔ سائنس اور تجارت کے میدانوں میں جرمنی کی گذشتہ عظمت تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا اور اب جبکہ وہاں کے سائنسدان اور ماہرینِ تجارت اتحادیوں کا ساتھ دیتے اور ان رازہائے سربستہ کو منکشف کر دینے کیلئے تیار ہیں، اس امر کی ضرورت ہے کہ اکتسابِ علم میں پیچھے نہ رہا جائے۔ کمیٹی کو قوی امید ہے کہ حکومت ان کے اس جائز مطالبہ کو تسلیم کرے گی۔

واقعاتِ عالم کا روزنامچہ

۱۶- اکتوبر سے ۳۱- اکتوبر تک

۱۶- لندن اور امریکہ میں ہزاروں قلیوں نے ہڑتال شروع کردی۔ رنگون میں برما کے گورنر کے پہنچتے ہی وہاں شہری حکومت قائم ہوگئی۔ برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ زمانۂ جنگ میں جن بعض چیزوں پر کنٹرول قائم کیا گیا تھا۔ وہ پانچ سال کی مدت تک جاری رہے۔

۱۷- لندن کے قلیوں نے انجمن کے مشورے کو ٹھکرا دیا اور ہڑتال جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ نانسی جماعت کے بہاجت سم بجی کا عذات امریکیوں کے ہاتھ لگ گئے جن سے اسی لاکھ اراکین کے نام اور پتے معلوم ہو سکتے ہیں۔ انڈونیشیا کے معاملے میں برطانوی حکمت عملی کی تفصیل مسٹر ایٹلی نے پیش کی۔ روسی حکومت نے اپنے دستے منچوریا سے ہٹانے شروع کر دیئے۔

۱۸- جرمنی کے ۲۴ مجرمین جنگ کا مقدمہ برلن کی عدالت عالیہ میں شروع ہوگیا۔ انڈونیشیا کی آزادی کیلئے ڈاکٹر محمد ہتا نے امریکہ سے مدد مانگی۔ جنرل ہیک آرتھر نے امریکی کانگریس کے جلسے میں تقریر کرنے کے لئے واشنگٹن جانے کا فیصلہ کیا۔ برطانوی کمک جیفا پہنچ گئی۔

۱۹- صدر ٹرومین نے پریس کانفرنس میں کہا کہ خود جاپانیوں کو آزاد انتخاب میں اپنے شہنشاہ کی قسمت کا فیصلہ کرنے دیا جائے۔ وینزویلا میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ ہندوستان کے مشرقی اضلاع میں آندھی کا سخت طوفان آیا۔ سر سلطان نے استعفےٰ دیدیا۔ سر اکبر حیدری ان کی جگہ نامزد کئے گئے۔

۲۰- ہٹلر کو مردہ تصور کرتے ہوئے اسکی تحقیقات کی مسل داخل دفتر کردی گئی۔ برما گورنر نے برطانیہ کے وزیر اعظم کا خط پیش کرتے ہوئے کہا کہ برما کو مکمل خود مختار آزادی دیدی جائیگی۔ نانسی مجرمین جنگ کو تحریری فرد جرم مل گئی۔ فلسطین میں غیر قانونی داخلہ بڑھتا جارہا ہے۔

۲۱- جامعہ فواد کے طلبا نے احتجاج کیا کہ برطانوی فوجوں کو مصر سے چلا جانا چاہئیے۔ فیصلہ ہوا کہ شہنشاہ جاپان کے عزیز و اقارب پر بھی مقدمے چلائے جائیں۔ ہند چینی کے تقریباً دو ہزار سپاہی سیگاؤں پہنچ گئے۔ قوم پرست فرانسیسی تسلط کی مخالفت کیلئے کمر بستہ ہیں۔

۲۲- برطانیہ میں ہڑتال کرنے والے قلیوں کی تعداد ۴۱ ہزار تک پہنچ گئی۔ ایران کے وزیر اعظم مسٹر محسن صدر نے استعفےٰ دیدیا۔ عام انتخابات کے سلسلے میں جنرل ڈی گال کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ جامعہ فواد کے طلبا کو پرامن رکھنے کیلئے مصری فوج کے دستے بلائے گئے۔

۲۳- انڈین نیشنل آرمی کے قیدیوں کی شناخت وغیرہ کے لئے جاپان نے اپنے تین ارباب سیاست کے نام تجویز کئے جو دہلی آکر مقدمے میں حصہ لینگے۔ سیگاؤں میں سرکاری محکمۂ اطلاعات کے دفتر پر ایک بم گرا۔ برطانیہ میں انکم ٹیکس کی شرح گھٹا کر تقریباً وہی کردی جائیگی جو پہلے تھی۔

۲۴- لوزدے کے غدار کوئسلنگ کو پھانسی دیدی گئی۔ اناميوں کی شورشوں کو دبانے کے لئے ہندوستانی دستے استعمال کئے گئے۔ تبریز میں مزید روسی کمک پہنچ گئی۔ فلسطین کے عربوں اور یہودیوں میں مصالحت کے آثار نظر آرہے ہیں۔

۲۵- طے پایا کہ روسی فوجیں ۲۰ نومبر سے منچوریا کو چھوڑنا شروع کر دینگی۔ ہندستانی دستے سورابیہ بندرگاہ پر اترے جو جاوا کے شمال مشرق میں ولندیزی بحری اڈا ہے۔ متحدہ اقوام کے ۲۹ نمائندوں نے باہمی معاہدے کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ پینسلین کے محقق سر الیگزنڈر فلیمنگ اور دو شرکائے کار کو نوبل پرائز دیا گیا۔

۲۶- فیصلہ کیا گیا کہ امریکہ اور برطانیہ متحدہ طور پر فلسطین کا مسئلہ طے کرا ئینگے۔ نانسی لیڈر روبرٹ لی نے قید خانے میں خودکشی کرلی۔ کولمبو میں بموں سے بھری ہوئی لاری ایک پلیا سے ٹکرا کر چور چور ہوئی اور قرب وجوار میں آگ لگ گئی۔

۲۷- صدر ٹرومین نے سرکاری طور پر "بارہ نکات" پیش کئے جن کے مطابق امریکہ کی آئندہ بیرونی حکمت عملی تشکیل پائے گی۔ مسٹر بیون نے کہا کہ یورپ بھر میں پھیلنے والے قحط کی وبا ایٹم بم سے بھی زیادہ خطرناک ہوگی۔ ڈاکٹر سوئیکارنو نے سمجھوتے کی شرائط پیش کیں۔

۲۸- انڈونیشیا کے قوم پرستوں اور ہندوستانی و برطانوی دستوں کے مابین سخت لڑائی چھڑ گئی۔ شانسی کے گورنر نے بتایا کہ شمالی چین کے صوبوں میں کمیونسٹ اور چنکنگ دستوں کے درمیان جو لڑائی ہو رہی ہے اسمیں تقریباً چار کروڑ چینی حصہ لے رہے ہیں۔

۲۹- "فار ایسٹ ایڈوائزری کمیشن" میں سر گرجا شنکر باجپائی ہندوستان کی نمائندگی کریں گے۔ ڈاکٹر سوئیکارنو نے انڈونیشیا کے وطن پرستوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ہتیاروں کی لڑائی بند کر دیں۔ مسٹر آرتھر ہینڈرسن نے دارالعوام میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ حکومت کی خواہش ہے کہ برما میں جلد از جلد نئے انتخابات ہو جائیں۔

۳۰- مسٹر اٹیلی اور صدر ٹرومین کی گفتگو ایٹم بم کے سلسلہ میں شروع ہوگی۔ جہازوں سے سامان اتارنے کیلئے حکومت نے بندرگاہوں پر فوج روانہ کردی۔ اب ہڑتال کا اثر سامان کے حمل و نقل پر کم ہو جائے گا۔

۳۱- انچا لنگا میں ہندوستانی فوج کے کمانڈر بریگیڈیر مالابی کو انڈونیشیا کے وطن پرستوں نے قتل کر دیا۔ جاپانی بحریہ کے تمام بڑے بڑے جنگی جہاز اور آبدوز کشتیاں غرق کر دی جائیں گی۔

غزل

فصاحت جنگ جلیل

سب قطرہ قطرہ بٹ گئی اُس بزمِ ناز میں
جتنی بھری تھی مے مرے جامِ نیاز میں

اُٹھ اُٹھ کے درد نے جو ستایا بہت مجھے
آنسو نکل پڑے طلبِ چارہ ساز میں

میری تڑپ کہاں کسی پروانے کو نصیب
ہاں شمع کچھ شریک ہے سوز و گداز میں

بدنام کُن فقط مرے اشکِ رواں نہیں
آہیں بھی کچھ شریک ہیں افشائے راز میں

ایک ایک درسگاہِ جنوں ہے مرے لئے
حلقے ہیں جسقدر تری زلفِ دراز میں

باتیں خیالِ یار سے کرتا ہوں اس طرح
سمجھے کوئی کہ آٹھ پہر ہوں نماز میں

پریاں ہیں سب یہ غنچہ و گُل اے نسیمِ صبح
کچھ اُٹھ چکی ہیں کچھ ہیں ابھی خوابِ ناز میں

میں شمعِ بزم ہوں نہ چراغِ مزار ہوں
راتیں مگر گزرتی ہیں سوز و گداز میں

اُن کا ہے حُسن اور نگاہیں مری جلیل
پُروانہ ہے نہ شمع کوئی بزمِ ناز میں

رام بابو سکسینہ

محمد عبدالواحد خاں

رائے بہادر رام بابو صاحب سکسینہ ایک متمول کایستھ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب مہاراجہ بالکرشن وزیر اودھ سے ملتا ہے۔ سکسینہ صاحب ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی نانک پرشاد صاحب تھے۔

ایام طفولیت میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس سانحہ کے نقوش انکے کردار میں ملتے ہیں۔ زود رس ذمہ داری نے فطری عزم و استقلال کو اور قوی کر دیا۔ موجودہ امتیاز کے پرتو سکسینہ صاحب کی تعلیمی زندگی میں جا بجا ملیں گے۔ ۱۹۱۷ء میں انھوں نے آگرہ کالج سے انگریزی ادب کا امتحان دیا۔ اور الہ آباد یونیورسٹی میں جو اسوقت صوبجات متحدہ، متوسط، راجپوتانہ اور وسط ہند پر حاوی تھی۔ پہلی ڈویژن اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اسی سال قانون کے امتحان میں بھی انھوں نے اس نتیجہ کو برقرار رکھا۔ آئی سی۔ ایس کے لئے دوبارہ نامزدگی ہوئی اور وظیفہ بھی منظور ہوا لیکن خانگی حالات کی وجہ سے انھیں پراونشل سول سروس پر ہی اکتفا کرنا پڑی (۱۹۱۸ء) اس سروس میں انھوں نے مختلف حیثیتوں سے قابل قدر کام کئے۔ اسوقت وہ بلند شہر میں کلکٹر ہیں۔ اس سے قبل آپ بریلی کے کلکٹر ہونے کے علاوہ یو۔ پی گورنمنٹ کے محکمۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر، ہز ہائی نس مہاراجہ بڑودہ کے پرائیویٹ سکریٹری ریاست "کوٹا" (راجپوتانہ) کے وزیر اعظم و وزیر تعلیم رہ چکے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں انھوں نے گول میز کانفرنس (لندن) میں گورنمنٹ کی طرف سے شرکت کی۔ اجتماع حیثیات سکسینہ صاحب کی شخصیت کا نمایاں وصف ہے۔ ان کی ذات میں صف اول کے کھلاڑی، ممتاز حاکم اور ژرف نظر نقاد کا نادر اجتماع ملتا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں وہ آگرہ کالج کی فٹ بال فرسٹ الیون کے کپتان اور ہاکی ٹیم کے ممبر تھے۔ اب بھی ان کا شمار آل انڈیا ٹینس کے کھلاڑیوں میں ہوتا ہے ـــــ ان کے تدبر اور حسن انتظام کی گواہی وہ اہم وظائف دے رہے ہیں جو وقتاً فوقتاً ان کو ملتے رہے ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں کا ذکر کسی قدر تفصیل سے آگے آئیگا۔

سکسینہ صاحب کی حیات کا یہ پس منظر ہمارے موضوع سے غیر متعلق نہیں کیونکہ یہ ان کی زندگی سے منعکس ہے۔ تبادلوں اور ملازمتی سیاحتوں نے انکو اس بات کا موقع دیا کہ وہ ملک کے بہترین کتب خانوں اور برٹش میوزیم میں تحقیقات کا سامان کر سکیں اور بہت سے غیر معروف مسودات اور نسخوں کو گوشۂ گمنامی سے برآمد کر سکیں۔ یہی نہیں بلکہ ملازمت کے وسیع تجربات نے انھیں کتاب فطرت کے بیشتر ابواب کو بالاستیعاب پڑھنے کا موقع دیا۔

سکسینہ صاحب ان خوش قسمت اہل قلم میں سے ہیں جنکی شہرت ان کی پہلی تصنیف نے ہی قائم کر دی۔ تاریخ ادب اردو، جو پہلی بار ۱۹۲۷ء میں بزبان انگریزی طبع ہوئی اردو تنقید کی تاریخ میں سنگ بنیاد کا مرتبہ رکھتی ہے۔ یہ امر ہمارے ادب کے مسلمات میں سے ہے کہ ابھی تک اس پایہ کی دوسری کتاب سے ہماری تنقید روشناس نہیں ہوئی ہے۔ اس سے پہلے سوائے چند تذکروں اور شاعری کی قدیم وضع کی تاریخوں کے اردو ادب کی کوئی جامع تاریخ نہیں لکھی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ کسقدر بڑی کمی تھی جسے ہمارے مورخ ادب نے بکمال جانفشانی پورا کیا۔ ابھی تک یہ کتاب ہمارے ادب کی واحد مستند تاریخ ہے ـ سچ یہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ پر اسوقت بھی یہی ایک مکمل کتاب ہے۔ "تاریخ ادب اردو" کو اضافۂ اقتباسات اور نظر ثانی نے "ہسٹری" سے بھی زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔ صاحب تاریخ کے وسیع مطالعہ، ملکۂ تحقیق اور ذہنی توازن کا ثبوت ہر صفحہ پر ملتا ہے۔ وہ قدیم یا جدید کسی ایک اسکول کے علمبردار نہیں ہیں اور نہ ایک صنف شاعری کے پرستار۔ لکھنؤ اور دلی دونوں دبستانوں سے وہ حظ اندوز ہوتے ہیں۔ اپنے تربیت یافتہ تنقیدی شعور اور وسعت نظر کی بدولت وہ تمام اقسام داد وار شاعری کی صحیح قدر کر سکتے ہیں۔ ان کی دیانت انھیں معائب پر پردہ ڈالنے کر روکتی ہے لیکن ان کا منصب معائب شماری سے بلند تر ہے۔ معائب ہوں یا محاسن ان کو وہ شاعر یا مصنف کی حیات اور عہد سے متعلق کر کے جانچتے ہیں۔ سکسینہ صاحب کی عظمت کا بڑا راز یہی وسعت نظر ہے جو اکثر مشاہیر کا طرۂ امتیاز رہی ہے"۔ تاریخ ادب کی اہمیت بہت گھٹ جاتی اگر مصنف کسی ایک دبستان کا پیرو بن جاتا۔

یہ بے لاگ تنقید ہمارے ادب میں نئی چیز تھی۔ اس ادب میں جو تذکروں کے بے حد انفرادی۔ نیم ذاتی، نیم تنقیدی، غیر مربوط اشاروں کا عادی ہو چکا تھا۔ جس میں میر و سودا، مصحفی و انشا، آتش و ناسخ، ذوق و غالب، انیس و دبیر، سرور و امن کے تلامذہ نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں اکھاڑے قائم کر رکھے تھے۔ ہر نوخیز شاعر (یا شاعر) کے لئے دو میں سے کسی ایک فریق کی طرف ہونا ضرور تھا ورنہ وہ ٹکسال کے باہر ہو جاتا اور کسی شمار میں نہ آتا۔ تذکروں کے بعد بھی یہ سلسلہ کسی حد تک قائم رہا تھا جس کی نمایاں مثال آب حیات کا ذوقیانہ رنگ ہے۔

یہی نہیں رام بابو صاحب سکسینہ کی تاریخ ادب ہماری زبان میں انگریزی طرز تنقید سے جامع، مسلسل اور معتدل استفادہ کی پہلی کامیاب مثال ہے۔ انھوں نے ہماری تنقید میں انگریزی کے اصول تنقید کو بڑے سلیقہ کے ساتھ سمویا۔ قابل قدر ہے وہ ضبط و اعتدال جنھوں نے ہمارے نقاد کو مغربی ادب کی چمک سے خیرہ نہ ہونے دیا۔ یہ امر اس وقت اور زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے جب ہم اپنے بعض موجودہ انگریزی تعلیم یافتہ

۱؎ :- ریویو ڈاکٹر عبدالحق

نقادوں کی انتہاپسندی، مغرب زدگی اور مشرق بیزاری کو دیکھتے ہیں وہی فطری توازن اور سلامت روی جس نے طالب علم کو کتاب کا کیڑا ہونے سے روکا ہو ہی مصنف کو قدامت یا جدیدیت کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچا رہی ہے۔ یہ چیز ان کے ہر شعبۂ حیات میں جلوہ گر رہی ہے وہ جانتے ہیں کہ شاعری کے قصر میں بے شمار ایوان ہیں اور ہر ایک کا حسن نئی شان رکھتا ہے۔ ایک طرف وہ تصنع اور بے کیف رعایت لفظی کو پسند نہیں کرتے تو دوسری طرف ترقی پسندوں کی خیرہ سری اور بے راہ روی انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ گذشتہ اٹھارہ سال میں ہمارے تنقیدی ادب میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ مختلف کتابیں اور اچھے مقالے لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان کے ہجوم میں ہم تاریخ ادب اردو کی بنیادی اہمیت کو فراموش نہیں کر سکتے۔ مصنفین اس سے ابتک مستفید ہوتے ہیں اور اس کے اقتباسات سند میں پیش کرتے ہیں۔

تاریخ ادب میں جیسا کہ ناگزیر ہے نقاد پر مورخ غالب تھا سکسینہ صاحب کی تازہ انگریزی کتاب "اردو اور فارسی کے یوروپین اور انڈو یوروپین شعراء" میں مورخ اور نقاد ایک دوسرے کے ہمدوش ہیں اور تحقیق ان سے بڑھ آگے۔ "تاریخ" میں صاحب کتاب کو تذکرات پر زیادہ تکیہ کرنا پڑا تھا۔ یوروپین شعرائے اردو فارسی کے گم شدہ دواوین کے مسودات۔ ادب پرور یوروپین خاندانوں کے شجرات۔ اس زمانہ کے سیاسی حالات، سماج اور اقتصادیات۔ ان تمام کا انکشاف، تحقیق و تشریح بجائے خود ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالحق "یوں تو اردو ادب اور اسکے اور اس کی تاریخ کے شائقین اسقدر ضرور جانتے تھے کہ کچھ یوروپین ایسے بھی تھے جو اردو فارسی میں شعر کہتے تھے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ پورے ایک سو خالص یوروپین ایسے ہوئے ہیں جنھیں ہماری زبان کے شعر و سخن کا بڑا شغف تھا اور جن میں بعض کے پورے دیوان موجود ہیں۔ یہ سکسینہ صاحب ہی کی ہمت تھی کہ پورے پندرہ سال اس دھن میں لگے رہے اور کہاں کہاں سے اور کس کس طرح اور کیسے کیسے جتن کرکے ان بھولے بسرے یوروپین اردو شاعروں کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ سچ پوچھئے تو انھوں نے مُردوں کو زندہ کیا ہے۔ ان میں خالص یوروپین اور اینگلو انڈین شاعروں کے علاوہ ارمنی، انڈو برٹش، انڈو پرتگیز، انڈو فرنچ، انڈو جرمن، انڈو اٹالین نیز انڈو یوروپین خواتین بھی ہیں جو اردو زبان میں شاعری کرتی تھیں"۔

"ان تمام حالات کی تحقیق میں فاضل مصنف نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ان شاعروں کے مطبوعہ دیوان جو کسی زمانے میں طبع ہوئے تھے اور اب نایاب ہیں اور جنکا لوگوں کو بہت کم علم ہے بہم پہنچائے۔ ان کے علاوہ ان کے غیر مطبوعہ قلمی دیوان بالکلیں مسلسل اور مستقل جد وجہد اور جستجو کرکے حاصل کیں۔ تمام تذکرے جن میں ان لوگوں کا کہیں ذکر آیا ہے مطالعہ کئے۔ اردو کے دو سنئے اور پرانے رسالے جن میں کہیں ان کے کلام کا حوالہ تھا نیز انگریزی ادبی اور تاریخی رسالے قلمی بیاضیں جن میں بعض ایسی کام کی چیزیں ہیں جنکی توقع نہ تھی ان سب کو پڑھا۔ ہندوستان اور انگلستان کے کتب خانے، نجی کتبخانے، دیسی ریاستوں کے کتب خانے اور سرکاری دفاتر چھان مارے۔ گرجاؤں کو بھی نہیں چھوڑا اور ان کے قبرستانوں میں اپنے مطلب کے کتبے اور ان کے رجسٹروں میں سے اپنے کام کی باتیں ڈھونڈ نکالیں۔ گزیٹیر، سیاحت نامے، سوانح، تاریخیں لغات۔ کتب اسناد، نجی کاغذات سب کھنگال ڈالے اور ہزارہا خطوط دریافت حالات میں مختلف لوگوں کو جگہ جگہ لکھے اور جہاں کہیں سے کوئی بات ہاتھ آئی قلمبند کرلی۔ ... کلام کا انتخاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان یوروپین اور اینگلو انڈین شاعروں نے اردو زبان کو بڑے شوق سے سیکھا تھا ان کا کلام ہر صنف شعر میں پایا جاتا ہے"۔

مندرجہ بالا طویل اقتباس سے یہ تو واضح ہو گیا ہوگا کہ فاضل مصنف نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے لیکن محقق نقاد کا کام یہیں ختم نہیں ہوتا۔ مواد کی ترتیب اور تشکیل میں اسکو جستجو اور انکشاف سے کم عرق ریزی نہیں کرنا پڑتی۔ سکسینہ صاحب نے پوری قدرت کے ساتھ حالات و واقعات کے اس انبار کو ترتیب دیا ہے۔

رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو اس کتاب کو لاثانی قرار دیتے ہیں۔ اس کتاب کے متعلق ڈاکٹر سچدانند سنہا ایڈیٹر ہندوستان ریویو رقمطراز ہیں: "زیر نظر کتاب اس لحاظ سے قطعاً منفرد ہے کہ وہ ایک نئے باب کا آغاز کرتی ہے اسکی اپیل نہ صرف اینگلو انڈین طبقہ کے متمدن افراد تک بلکہ اسکالر روئے سخن اردو شاعری کے عام طالب علم سے بھی ہے...... فاضل اور سرگرم مصنف کو ایسے مواد کے جمع کرنے میں کن کن مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا ہوگا۔ کیونکہ یہ مصالحہ نہ صرف مطبوعہ اور سہل الحصول ذرائع سے بلکہ غیر مطبوعہ اور دشوار رس مخازن سے بھی حاصل کیا گیا ہے ...... انھوں نے ان اشعار کی ادبی اور جذباتی اہمیت کی تشریح میں قابل قدر تنقیدی شعور کا مظاہرہ کیا ہے .... یہ کتاب نہ صرف جامع ہے بلکہ مستند بھی ہے۔ کیونکہ اردو، انگریزی، فرانسیسی، پرتگیزی غرضکہ جملہ ذرائع اور مخازن کو کماحقہ، استعمال کیا گیا ہے لہٰذا یہ کتاب جو اوریجنل ریسرچ اور متبحرانہ علم کی حامل ہے اردو ادب کے متعلق ہماری معلومات کی توسیع کے ضمن میں ایک کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف نے اپنے مواد کو خوش اسلوبی سے ترتیب دیا ہے اور چار سو صفحات کے ایک ضمیمہ میں ان کی شاعری کی بے شمار مثالیں بہم پہنچائی ہیں"۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی فرماتے ہیں "جسطرح آپ کی پہلی تصنیف تاریخ ادب اردو اپنے موضوع پر پہلی جامع کتاب تھی اسی طرح یہ تصنیف بھی اپنے موضوع پر پہلی جامع کتاب ہے اور غالباً آخری بھی۔ آپ نے اپنی اس تصنیف کے لئے جتنے ماخذوں سے مواد فراہم کیا ہے اور جس محنت اور استقلال کے ساتھ اس کام کو تا امکان مکمل کرنے کی کوشش کی ہے وہ اچھے اچھے محققین ادب کے لئے قابل رشک ہے"۔

ان اقتباسات کے بعد غالباً اس کتاب پر مزید تبصرہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آخر میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ مندرجہ ذیل کتب کیلئے مواد فراہم کیا جا رہا ہے

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

علی مراد

افسانہ

ایم۔ اسلم

چاندنی رات تھی اور راوی کا پانی سیماب کی طرح چمک رہا تھا مہتاب کی پیاری پیاری نورانی کرنیں راوی کے نیلگوں سینے پر رقص کر رہی تھیں۔ کنارے کے ساتھ ایک کشتی اس طرح ساکت کھڑی تھی جیسے کوئی مسافر دن بھر کے سفر کے بعد منزل پر جاکر سو جاتا ہے۔ ہر طرف خاموشی مسلط تھی اور گاہے گاہے کونجوں کے قافلے کے پہرہ دار کی آواز سازِ خاموشی کو درہم برہم کر دیتی۔ کونجوں کا یہ قافلہ کنارے سے ذرا فاصلہ پر ریتلے میدان میں چھاؤنی ڈالے بیٹھا تھا جانے کہاں سے آیا تھا اور کدھر کا راہی تھا۔ سب جانور ایک دوسرے کے دوش بدوش ٹھنڈی ریت پر آرام کر رہے تھے۔ ایک پہرہ دار تھا جو ذرا سی آہٹ پر چوکس ہو کر آواز نکالتا اور سونے والا قافلہ بھی چوکس ہو جاتا۔

اس وقت کوئی شخص ہاتھ میں بلم پکڑے دریا سے پایاب اتر کر گاؤں کی طرف جو دریا سے دو پونے دو میل کے فاصلہ پر تھا جا رہا تھا اور اپنے ملک کے مخصوص انداز سے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کر رہا تھا:۔

جوانی کو آرام سے کیا کام
جوانی آگ ہے
جلتی ہے اور جلاتی ہے۔
اپاہج ہو کر جو گھر بیٹھ رہا
قسمت ساتھ نہیں دیتی۔
بہادر اپنی قسمت آپ بناتے ہیں
خواجہ خضر! تیرے نام پر قربان
راوی نے راستہ دے دیا
گیارھویں والا[1] پیر خیر سے واپس لائے۔
تیرے نام کی کھیر دوں
علی مراد کی جوانی کی خیر!
آج مرد کی لاج کا سوال ہے
بڑھوں کی ریت[2] جو پوری نہ کرے
دنیا اس کی عزت نہیں کرتی۔
کتے بھونک رہے ہیں
پہرہ دار ہوشیار ہے
علی مراد کی جوانی کی قسم
اس ماں کا بیٹا نہیں
جو پیٹھ دکھائے۔

یہ آواز لحظہ بہ لحظہ دور ہو رہی تھی۔ علی مراد جب گاؤں کے پاس پہنچا تو کتے اچانک زور زور سے بھونکنے لگے ساتھ ہی پہرہ دار کی آواز آئی:۔

"اللہ ہو! اللہ ہو!"

پہرہ دار اسی جانب آ رہا تھا۔ علی مراد دبک کر جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔ اور پہرہ دار جو ایک تگڑا جوان آدمی تھا بلم کندھے پر رکھے وہی "اللہ ہو!" کا نعرہ مارتا اور خوابِ غفلت میں سونے والوں کو ہوشیار کرتا ہوا پاس سے گذر گیا۔ پہرہ دار کے جانے کے بعد علی مراد بھی کمین گاہ سے نکلا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے جوہڑ کا پانی چمک رہا تھا۔ جوہڑ کے کنارے سے پانی پر برگد کا ایک کہن سال پیڑ سایہ کئے تھا۔ اور پیڑ کی اونچی ڈالیوں پر سپید رنگ کے بگلے گردنیں سکیڑے خاموش بیٹھے تھے۔ جوہڑ سے تھوڑے فاصلہ پر مٹی کی چار دیواری کے اندر ایک چھوٹا سا مکان تھا اور مکان کے بازو میں گھاس پھوس کا ایک چھپر تھا جسے جانگلیوں کی زبان میں "ڈھارا" کہتے ہیں چھپر کے نیچے ایک بڑھیا اور ایک جوان لڑکی جو حسن و جمال میں چاند کا جواب تھی سو رہی تھیں چھپر سے ذرا ہٹ کر مٹی کی چار دیواری کے ساتھ ایک وَن کا پیڑ تھا اور پیڑ کے نیچے کھرلی بنی ہوئی تھی بھورے رنگ کی ایک بھینس بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ علی مراد کی یہ پہلی چوری تھی قسمت یاور تھی گھر کا کتا اتفاق سے موجود نہ تھا۔ اچانک چھوٹی چھوٹی بدلیوں نے چاند کے چہرہ پر نقاب ڈال دی۔ علی مراد کی نگاہ جب اس حسنِ خفتہ پر پڑی تو دل تھام کر رہ گیا۔ لڑکی کی چارپائی کے پاس ہی کوئی پونے دو گز لمبا لٹھ رکھا تھا۔ علی مراد نے لٹھ اٹھا لیا اور چپکے سے اپنی بلم سونے والی کی کھاٹ پر رکھ دی۔ اور بھینس لے کر چل دیا۔ جانگلیوں میں ایک مثل مشہور ہے کہ مویشی اپنے پاؤں کا آپ چور ہوتا ہے۔ چور کے قبضے میں آکر خود بخود تیز قدم اٹھاتا ہے۔ علی مراد بھینس لے کر راوی کے پار اتر گیا اور کھوجیوں کو دھوکا دینے کے لئے چراگاہ کی طرف جہاں میلوں تک سوکھی گھاس تھی ہو لیا۔ تاکہ بھینس کے پاؤں کے نشان پہچانے نہ جا سکیں۔ جب اطمینان ہوا تو اپنے مخصوص انداز سے بولا:

پیر دستگیر[1] پہ درود و سلام
علی مراد کی لاج رہ گئی
گھر والے اس طرح سو گئے
جیسے تقدیر
پنچوں سے کہو مجلس گرم کریں
جالوں کا ترجمان آگیا
مسجد ہو یا مندر
غرض یار کے دیدار سے ہے
بھینس کیلئے پر ہے
اور دل قید میں
دنیا کی زینت عورت ہے۔
علی مراد کے دل کی دنیا اس طرح اجڑ گئی
جیسے چوری ہوئی تھی۔
سونے والی کے گول گول بندے۔

---

[1] گیارھویں والا پیر — پیر دستگیر۔ [2] جانگلیوں میں یہ رسم ہے کہ لڑکا جب تک کم از کم ایک بار چوری نہ کرے اسے بڑوں کی مجلس میں بیٹھ کر بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور بعض قوموں میں تو پہلی چوری کی کامیابی پر پنچوں کی طرف سے پگڑی انعام ملتی تھی۔

فرنگی کی توپ کی گولیاں ہیں
طلے میں چپیٹا لتی ہیں
جیسے دیمک لکڑی ہیں -
بہادروں کی شادی
تلوار سے ہوتی ہے
آن والی ہے تو دوسرے کو حرام سمجھے گی
تارو! تم کیوں کانپ رہے ہو
دل تو علی مراد نے کھویا
بھینس کے چاروں تھن حرام
جب تک بھینس والی خود نہ آکر دوہے

بوڑھوں کو نیند کچھ کم ہی آتی ہے کبھی کھانسی سونے نہیں دیتی کبھی تفکرات نیند اچاٹ کر دیتے ہیں. دل میں خدا کا خوف ہوا تو رات عبادت میں گذر گئی۔ یوں تو بڑھیا رات میں کئی کئی بار جاگا کرتی تھی۔ کبھی لیٹے لیٹے کوٹھری کی طرف دیکھ لیا کرتی۔ کبھی اٹھ کر بھینس کو دیکھتی کہ بندھی ہے یا نہیں۔ جانے آج کیا بات تھی کہ ماں بیٹی کچھ ایسے گھوڑے بیچ کر سوئیں کہ چور بھینس لے گیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ بڑھیا کی آنکھ اس وقت کھلی جب علی مراد راوی کے پار ہو چکا تھا۔ بڑھیا نے پہلے کوٹھری کی طرف دیکھا۔ دروازے بدستور بند تھے۔ پھر ایک اچٹتی سی نگاہ کھرلی کی طرف ڈالی ۔ پھر ذرا غور سے دیکھا پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھی گئی بھینس کھرلی پر نہیں تھی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا کہ شاید صحن میں کہیں پھر رہی ہو۔ لیکن بھینس کہیں نظر نہ آئی۔ پھر بیٹی کو آواز دی:

"ریشم! اے ریشو!"

لیکن ریشم یا ریشو تو جوانی کی گہری میٹھی نیند سو رہی تھی۔ بڑھیا نے اٹھ کر غصے سے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"اماں کیا ہے؟" ریشم نے کروٹ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "کبھی دو گھڑی آرام بھی کرنے دیا کرو۔"

"ریشو!" بڑھیا نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز سے کہا "بھینس لے گیا کوئی۔"

ریشم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ہاتھ میں بلم آ گئی۔

"یہ بلم کس کا ہے؟" ریشم نے تعجب سے کہا

پھر ادھر ادھر دیکھ کر

"بھینس کہاں ہے!"

"وہی تو میں تم سے کہہ رہی ہوں" بڑھیا نے جواب دیا۔ "بھینس چور لے گئے"

ریشم جلدی سے چارپائی سے اٹھی۔ اور لٹھ دیکھنے لگی۔ لیکن لٹھ بھی موجود نہیں تھا۔ ریشم پھر کھاٹ پر بیٹھ گئی۔

ماں بولی:

"اری بیٹھ گئی پھر۔ کسی کو آواز تو دے! ہائے! ہم تو لٹ گئے۔"

"آواز کسے دوں" ریشم نے جواب دیا "بلم والا بھینس لے گیا۔ کالو کو بھی جانے آج موت آ گئی کیا۔"

"کالو تو رات بھر بھونکتا رہا" بڑھیا نے جواب دیا۔

"اچھا!" ریشم نے ایک آہ بھر کر کہا "صبر کر و اب"

"صبر تو میرا بڑے گا ظالم پر" بڑھیا نے ہاتھ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب روشنی ہوئی تو ریشم چارپائی سے اٹھ کر چور کے پاؤں کے نشان دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھتی ہو یہاں؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"چور کے پاؤں کے نشان!" ریشم نے جواب دیا۔

"راوی پار کا چور ہے"

"بلم کیوں چھوڑ گیا؟" بڑھیا نے حیرت سے کہا۔

"شاید کسی روز لینے کو بھی آ جائے" ریشم نے کہا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم" بڑھیا نے جھلا کر کہا۔

ریشم نے کچھ جواب نہ دیا۔

جب دنیا سر گرم تقاضا ہوئی تو بڑھیا اٹھ کر گاؤں کے ملک کے پاس فریاد لے کر گئی۔ رات کے پہرہ دار کو بلوایا گیا اور اسے بہت برا بھلا کہا گیا۔ بڑھیا بیوہ تھی ریشم ہی ایک لڑکی تھی۔ گھر میں کوئی مرد ہوتا تو بھاگ دوڑ بھی کرتا۔ تاہم ملک کے کہنے سے دو تین آدمی چور اور بھینس کا کھوج نکالتے ہوئے دریا تک آئے۔ ریشم بھی ساتھ تھی۔ ہوا تیز چلنے سے تقریباً کھوج مٹ چکا تھا۔ پھر پرائی بلا کون مول لے۔ جب دھوپ چمکی تو تینوں گاؤں کو واپس لوٹ گئے۔

لیکن ریشم کنارے پر جا بیٹھی۔ اپنی بیچارگی اور نقصان پر غور کیا دل بھر آیا۔ درد بھری آواز میں بولی:

سورج سوا نیزہ پہ پہنچا
ریت گرم ہو گئی
غریب کے خون کی طرح
جوش میں آتا ہے
اپنا سینہ جلاتا ہے
اونچے ایوان والے دکھ کی رمز کیا جانیں
غریب کی جوانی
بیر بہوٹی کا رنگ
جب رنگ آیا موت نے آغوش کھولی
کبھی کوے کا نوالہ بنی
کبھی حکیم نے شیشی میں بند کیا
جگنو کی آگ کس کام کی
نہ جلائے نہ جلے
دوسرے کے چراغ سے گھر میں اجالا کرنے والے
گور کی تاریکی کو مت بھول
چڑیوں کو مارنے والا
شاہین نہیں کرگس ہے
شیر گورخر کو مارتا ہے
گیدڑ لنگڑی بکری کی گھات لگاتا ہے
بیکس کا کیا مارنا
جسے تقدیر نشانہ بنائے
سانپنی کا بچہ چور
دبک کر چوٹ کرتا ہے
بہنوں کے بازو بھائی ہیں.
ریشم کا کوئی بھائی ہوتا
راوی پہ بیٹھی آنکھوں سے دریا نہ بہاتی۔

اس واقعے کو بہت روز ہو چکے تھے۔ ریشم چور کے بلم چھوڑ جانے کے خیال سے اکثر پریشان رہا کرتی۔ بھینس چوری جانے سے پیشتر وہ گہری میٹھی نیند سویا کرتی تھی۔ لیکن اب تو راتوں کی نیند بھی اچاٹ ہو گئی۔ پپلو پک چکے تھے۔ اور

ویرانے آباد نظر آتے تھے۔ ریشم اور اس کی سہیلی تاباں بھی بیلو کھانے جایا کرتی تھیں۔ لیکن ریشم عموماً کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی۔ تاباں اگر کچھ پوچھتی بھی تو ریشم مسکرا کر ٹال جاتی۔ لیکن ایک روز جو تاباں نے کچھ زیادہ اصرار کیا تو ریشم کہنے لگی:۔

"تاباں! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ چور ٹلم کیوں چھوڑ گیا؟"

تاباں نے جو بہت شوخ تھی ریشم کے گالوں کو انگلی سے چھو کر کہا! "سمجھ گئی نا اب تو"

"جا لے میری بیزار!" ریشم نے برہم ہو کر کہا۔ "کیا بک رہی ہے تو"

"ریشو!" تاباں ہنس کر بولی۔ "ریجھ گیا تجھ پر"[1]

"دگر دنعان ہو" ریشم نے ہنس کر کہا۔ "رتجھے اپنی کسی لگتی پر۔"

"لیکن!" تاباں بولی۔ "پچھلے زمانوں میں جب دولہا کسی وجہ سے دولہن کے گھر خود نہیں آسکتا تھا تو اپنی تلوار بھیج دیتا تھا۔ اور لڑکی والے تلوار سے لڑکی بیاہ کر لڑکی کو رخصت کر دیتے تھے"

"یہ ڈھکوسلے کہاں سے سنے تو نے؟" ریشم نے ہنسکر پوچھا۔

"اب تو ڈھکوسلے سمجھ یا سچ!" تاباں نے جواب دیا۔ "لیکن اب تو تو ٹلم والے کی ہو چکی۔ میری آج کی بات یاد رکھنا کسی دن پھر بھی آئے گا"

"چور جہاں چوری کرتا ہے پھر وہاں نہیں آتا" ریشم نے جواب دیا۔

تاباں بولی:

"ریشو! آؤ تو ذرا گھاٹ کی طرف چلیں"

"کیوں؟" ریشم نے پوچھا۔ "تیرے کو دل چاہتا ہے کیا؟"

"تیر بھی لیں گے" تاباں نے کہا۔ "لیکن مجھے کچھ اور کام بھی ہے۔"

"کیا؟" ریشم نے پوچھا۔

"تو آ تو سہی!" تاباں بولی۔ "پھر بتا بھی دوں گی"

دونوں گھاٹ کی طرف چل دیں۔ یہاں پہنچ کر تاباں نے ریت پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہاتھ سے ٹلم کا نقشہ بنایا اور ٹلم کی انی کے اوپر عورت کی جوتی کا نشان بنا دیا۔"

"یہ کیا بنا رہی ہے تو" ریشم نے پوچھا۔ "ہوا چلے گی تو سب نشان مٹ جائیں گے"

"مٹ جائیں گے تو پھر نہ بن سکیں گے کیا؟" تاباں نے جواب دیا۔

"لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟" ریشم نے پوچھا۔

"دو چار روز صبر کر۔" تاباں نے جواب دیا۔ "پھر مطلب بھی بتا دوں گی۔"

اس کام سے فارغ ہو کر دونوں کچھ دیر دریا میں تیرتی رہیں۔ پھر گاؤں کی راہ لی۔ راستے میں ون تھے اور دونوں میں سرخ سرخ پیلو لگ رہے تھے۔ دونوں پیلو کھانے لگیں۔ ریشم میٹھی آواز سے بولی:۔

بندے ہلتے ہیں
دل دھڑکتا ہے
سب چور کی نظر سے پہلے
جس نے چہرے پر فریب کی نقاب ڈالی
فرشتوں کو بھی دھوکا دے گیا
بندش بری
محبت کی ہو یا مجبوری کی
مرگ کے گلے میں رسی پڑی
نہ آنکھ کی مستی رہی
نہ چال کا بانکپن
کھلی ہوا میں جوانی کی ٹہنی ہری رہتی ہے
پنجرہ کھلا ہو یا بند
قید ہے
گدھ کا گھونسلہ آسمان پر بھی ہو
نگاہ کا لالچ رسوا رکھتا ہے
جب ہرنی قابو آجائے
صیاد کے دل سے رحم اس طرح اٹھ جاتا ہے
جیسے مطلبی کے دل سے
مطلب کے بعد وفا۔

تاباں ون کی ٹہنی پر کہنی ٹیک کر بولی:

بندے ہلتے ہیں
جوانی جاگتی ہے
مرد کا ہاتھ عورت کے جسم سے لگے
بدن پر رنگ آتا ہے
جوانی کی آنکھ کھلتی ہے
عورت کے دل میں قرب کی آگ بھڑکتی ہے
اکیلا آدم
جنت کے گلزاروں میں اس طرح پھرتا
جیسے بن میں مور۔
حوا نے ساتھ دیا۔ دنیا بنی
شکاری کے پاس تیر ہو کمان نہ ہو۔
نہ تیر کام کا نہ کمان مصرف کا
منڈیر پر کبوتر بیٹھے
محبت کی جوت جاگی
دلوں نے دل کے راز کہے
کالی رات
برا لگنے والے کی مراد ہے
ریشو![2]
جوانی ہو۔ چاندنی ہو
الو کی آواز بھی
دل کو گداز کر دیتی ہے
محبوب پاس نہ ہو
پھولوں کی سیج خار بن جاتی ہے۔

"مردار!" ریشم نے تاباں کے چٹکی لے کر کہا۔ "کیا بک رہی ہے تو"

"وہی!" تاباں نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ "جو تیرے بندے ہل ہل کر تجھ سے کہتے ہیں"

"اور تیرے؟" ریشم نے پوچھا۔ "اب تو یہ کانوں میں سجتے بھی نہیں"

---

[1] ریجھ جانا۔ عاشق ہونا

[2] ریشو۔ ریشم۔ سجتے بھی نہیں۔ لڑکی جوان ہو جائے تو بندے کانوں میں بدنما معلوم ہوتے ہیں۔

تاباں نے ایک آہ بھر کر کہا:
پہلو پک گئے۔
بہار کے دن بیت چلے۔
دنیا کی بری ریت۔
ماں غیر کے لئے بیٹی پالے۔
جوانی کی کونپل پھوٹی
بنجارے بھی آپہنچے۔
گوزِ تخیل کے لئے سانپ کی بانبی
مسجد کافر کے قدم سے ناپاک۔
جوان بیٹی کے لئے ماں باپ کا گھر حرام
جنّت کی شہزادی نبیؐ کی لاڈلی
علیؓ شیرِ خدا کے نصیب جاگے
جس کے گھر میں بی بی فاطمہؓ نے قدم رکھا
فرشتوں نے مبارک باد دی
جوانی کی آگ نے بندوں کے کنٹھے نرم کر ڈالے
سنار[1] سے کہو گا زکی کیا ضرورت
تیرے ہاتھ کا لمس دل کے خزانے کھولتا ہے
جب میوہ پکتا ہے۔
خریدنے والے خود آتے ہیں
دیئے نے پتنگوں کو کب بلایا
جلنے والے خود آپہنچے۔
پانی ہو تو قافلہ قیام کرتا ہے۔
میٹھا ہے یا کھاری
تقدیر کے بھید کون جانے۔
کونج پردیسی
کوئی دن کی مہمان۔
جب تک دانہ پانی تھا چگ لیا۔
ہمجولیو! اللہ بیلی
پردیسی کی منزل راہی کی منتظر ہے۔

"کیا سچ!" ریشم نے ہنسکر پوچھا

"ہاں!" تاباں نے جواب دیا۔ "بفضلہ دید کا چاند مقرر ہو گیا ہے۔"

"تاباں!" ریشم نے ہنس کر کہا۔ "ولیا[2] تو گبھرو جوان"

اور تاباں نے ریشم کے چٹکی لے کر کہا: "خدا کرے! تجھے بھی ایسا ہی مسٹنڈا ملے کوئی"

دونوں ایک دوسرے کے پیچھے اس طرح بھاگنے لگیں جیسے تتلی کے پیچھے تتلی۔

تاباں اور ریشم ہر روز گھاٹ کی طرف جاتیں۔ اور جوتی اور بلم کے نقش جو تقریباً وہ ہر روز بناتی تھیں غور سے دیکھا کرتیں۔ کبھی ہوا کی دست برد سے یہ نقش و نگار مٹے ہوتے۔ کبھی راہ گذر کے پاؤں سے۔ چار پانچ روز اسی طرح گذر گئے۔ لیکن ایک روز انھوں نے دیکھا کہ جہاں بلم کا نشان تھا وہاں جوتی کی بجائے دل کا نشان بنا ہوا تھا۔ تاباں مسکرانے لگی۔ ریشم نے حیرت سے پوچھا "یہ کون بنا گیا؟"

"تیرا بلم والا" تاباں نے شرارت سے سر ہلا کر کہا: معلوم ہوتا ہے آکر واپس چلا گیا ہے۔ "غریب کو موقع نہیں ملا شاید۔"

"ہاں!" ریشم نے کچھ سوچ کر کہا۔ "رات کالو دو ایک بار زور زور سے بھونکا تھا۔"

"لیکن یہ بلم کے ساتھ دوسرا نشان کیا ہے"۔ ریشم نے پوچھا۔

"ہمارے نشان کا جواب" تاباں نے مسکرا کر کہا۔

"جانے!" ریشم بولی "کیا پہیلیاں بُجھا رہی ہے تجھے۔ کبھی کوئی بات صاف بھی کیا کر۔"

"پگلی!" تاباں بولی "بلم والے نے تیرے بستر پہ بلم رکھ کے تجھے یہ جتایا تھا کہ تو اب اس سے منسوب ہو چکی میں نے بلم کے ساتھ جوتی کا نشان بنا دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ میری جوتی کو بھی تیری پروا نہیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ کسی روز پھر آئے گا۔ اس لئے میں نے یہ نشان بنائے تھے کہ دیکھوں محض چور ہی ہے یا ہاتھ پلّے کچھ عقل بھی ہے۔"

"پھر کیا معلوم کیا تو نے" ریشم نے ہنس کر پوچھا۔

"عقل بھی ہے اور تجھے چاہتا بھی ہے"۔ اس نے دل کا نشان بنا کر ہمیں بتایا کہ وہ صرف بلم ہی نہیں چھوڑ گیا بلکہ بلم کے ساتھ دل بھی دے گیا ہے۔ سمجھی؟ اب تو سب تو بھی رات کو ذرا ہوشیار رہا کر۔"

"ہاں!" ریشم نے جواب دیا۔ "آج ہی جو کیدار سے کہہ دوں گی کہ ہماری طرف ذرا زیادہ پھیرا ڈالا کرے۔"

"پھر کیا ہو گا" تاباں نے پوچھا۔ "جو شخص چاندنی میں کام کر گیا وہ اندھیرے میں کسی سے کیا ڈرے گا۔"

"پھر کیا کروں؟" ریشم نے پوچھا۔ "مجھے تو یہ فکر ہے کہیں گھر بھی لوٹ کر نہ لے جائے۔"

"گھر تو اب وہ لوٹنے سے رہا!" تاباں نے ہنس کر کہا "ہاں! گھر والی اپنی خیر منائے۔"

"تاباں!" ریشم ذرا سنجیدگی سے بولی "سوچ تو ذرا کیا کہہ رہی ہے تو۔ سانپ اور چور بھی کسی کا کبھی مترہوتا ہے۔"

"دل بدلتے دیر نہیں لگتی"۔ تاباں نے جواب دیا۔

"دیکھ جب وہ آئے تو ذرا تو بھی عقل سے کام لینا۔"

ریشم نے کچھ جواب نہ دیا اور تاباں بولی:
کالے بادل روز نہیں آتے۔
جس نے پانی باندھا[3]
کھیتی اس کی سوکھی رہی
شور زمین میں ہل چلانا ایسا ہے
جیسے کافر کی خیرات۔
چکی کی آواز میں درد کہاں
مانی کھو کھلی ہو گئی
پاٹ غریب کے سینے کی طرح ٹھنڈے ہو گئے۔
راہنے والے کی آواز سن کر جو خاموش رہا۔
دیمک اس کے گیہوں چاٹ گئی۔
جس طرح فراق جوانی کو۔

---

[1] سنار یعنی منگیتر۔

[2] ولیا۔ تاباں کے منگیتر کا نام۔

[3] پانی باندھنا۔ پانی کو مصرف میں لانا۔

حیف ایسی نیند پر
دروازہ قسمت نے کھٹکھٹایا
آنکھ نہ کھلی۔
بنجارہ گھر سے چلا۔
قسمت نے غلط راہ پر ڈال دیا۔
جو راستہ سے بھٹک کر آگیا
چور نہیں مہمان ہے۔
ابراہیم رسول کی شریعت سے کفر مت کر
جس نے عذاب کے فرشتوں کو مہمان بنایا۔
محبت جوانی کی شراب ہے۔ ساقی جوان ہو
نشہ اس طرح چڑھتا ہے
جیسے عبادت سے ایمان پختہ ہوتا ہے۔

کالی رات تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ کچھ چھاجڑ ساچل رہا تھا کبھی اکی دکی بوند بھی پڑنے لگتی۔ گاؤں پر خاموشی مسلط تھی اور اس خاموشی میں کچھ خوف تھا کچھ ہراس تھا۔ پہرہ دار کی آواز "اللہ ہو" رات کے سناٹے میں توحید کی سطوت کا سکہ جما رہی تھی۔ جانے کیا بات تھی جو ریشم کی آنکھ آج نیند سے آشنا نہ ہوئی۔ بڑھیا تو کوٹھڑی میں کھاٹ ڈالے پڑی تھی۔ اور ریشم چھپر کے نیچے کھاٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس وقت علی مراد جھاڑیوں میں چھپا پہرہ دار کے گزر جانے کا انتظار کر رہا تھا اور مچھر کسی بانئے کی طرح اس کا خون چوس رہے تھے۔

جب پہرہ دار گزر گیا تو کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔ کالو جو چھپر کے نیچے بیٹھا تھا دیوار پر کھڑا ہو کر بھونکنے لگا۔ پھر چھلانگ مار کر نیچے اترا اور بھونکتا ہوا کتوں کی طرف چلا گیا۔ علی مراد جھاڑیوں میں سے نکلا اور دیوار پھاند کر صحن میں آگیا۔ ریشم نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ لیکن وہ خاموش لیٹی رہی۔ علی مراد کتے کی طرح چلتا ہوا چھپر کے پاس آیا۔ اور سر اٹھا کر ریشم کی طرف دیکھنے لگا پھر وہ سرکتا ہوا چارپائی کے قریب آگیا۔ ریشم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ علی مراد نے چارپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ریشم بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھی اور علی مراد کی کلائی پکڑ لی علی مراد نے ہاتھ چھڑانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اب ریشم اس کشمکش میں تھی کہ کیا کرے۔ چور اس کے قابو میں تھا اور ملک کے دستور کے مطابق اس کی سزا یہ تھی کہ لوٹا گرم کر کے اس کی پیشانی داغ دی جائے۔ ممکن تھا کہ ریشم بھی اسے ملک کے پاس لے جاتی لیکن تاباں نے تو اسے کچھ اور ہی منتر سکھا رکھے تھے۔ ریشم علی مراد کو کھینچ کر صحن سے باہر آئی۔ اس وقت کالو بھی آگیا اور زور زور سے بھونکنے لگا لیکن ریشم نے جب چمکارا تو خاموش ہو گیا۔ ریشم علی مراد کو اسی طرح پکڑے گاؤں سے دور نکل آئی۔

"میری بھینس تم ہی نے چرائی تھی؟" ریشم نے پوچھا۔

"ہاں!" علی مراد نے جواب دیا۔

"قلم بھی تم ہی چھوڑ گئے تھے؟" ریشم نے پھر پوچھا۔

"ہاں!" علی مراد نے جواب دیا۔

"قلم کیوں چھوڑ گئے تھے؟" ریشم نے پوچھا۔ "قتل کرنے کا ارادہ تھا کیا؟"

علی مراد نے سر جھکا لیا۔ ریشم بولی:

"جانتے ہو چور کی کیا سزا ہے؟"

"جانتا ہوں" علی مراد نے جواب دیا۔

"اب کیا مرضی ہے؟" ریشم نے پوچھا۔

"میں چور نہیں" علی مراد نے جواب دیا۔

یوسف پیغمبر کو بھائیوں نے چور بنایا۔
محبت کی ایک رسم تھی۔
علی مراد نے رسم پوری کی چوری نہیں کی۔
چور وہ جس نے دل چرایا
وہ آدم کا بیٹا نہیں جو دل دے بیگانہ ہو۔
محبت کی ریت حوا نے ڈالی
حوا کی بیٹی ماں کی ریت پوری کرے
چلتے ہوئے بادلوں کی قسم
تقدیر نے تیرا دروازہ دکھایا
تقدیر نے میرا ہاتھ محبوب کے ہاتھ میں دیا۔
حیف ہے اگر دل دل سے بیگانہ رہے۔

ریشم نے علی مراد کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس وقت چاند چھوٹی چھوٹی بدلیوں کے عقب میں سے نمودار ہو رہا تھا اور کائنات پر سے تیرگی کی چادر اٹھ رہی تھی۔ راوی کا پانی چمکنے لگا۔ روشنی دونوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ علی مراد سر جھکائے خاموش کھڑا تھا اور ریشم کچھ سہمی سہمی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ علی مراد نے ریشم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا:

جو منگیتر چھوڑ جائے وہ مرد نہیں
بہادر دل کے ہتھیار کیل ہوتے ہیں۔
حسن سو رہا تھا
عشق بیدار رہا۔
تقدیر ہنسنے لگی
تیری تاروں ایسی پیاری آنکھوں کی قسم
رسم نے مجبور کر دیا
عزت مصیبت کے بعد ملتی ہے
عورت چاند ہے مرد سورج۔
چاند سورج کا قرضدار ہے
جیسے حسن عشق کا
عشق کی آگ آہوں سے نہیں بھڑکتی۔
محبوب کی محبت اسے ہوا دیتی ہے۔
پنجرے کا قیدی
پنجرہ کب چھوڑتا ہے
جسے زندگی کا مزا قید میں ملے
وہ کھلی فضا میں موت کیوں ڈھونڈے۔

ریشم بولی:-
بھنگ کا پیالہ خوبصورت
زہر سے خطرناک۔
بہشتی رنگ موت کا زنگار
جو محبت کے پردے میں دغا کرے
سانپ ہے۔
ہاتھ میں تسبیح
زبان میٹھی چھری
اس گوسپند کا اللہ نہیں
جس نے بھیڑیے کی بات سنی۔

فریب کی مالا ہاتھ میں۔
ریا کی کفنی جسم پر
ایسے راہبر سے ابلیس بہتر
جو دوزخ کی طرف بلاتا ہے۔
خضر اور سکندر کی دوستی مت بھول
زندگی کے چشمہ پر پہنچکر جس نے دوست سے دغا کی

علی مراد نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ رشیم بولی!
"کھڑے کیوں ہو جاتے کیوں نہیں"
"میں تمہارا مجرم ہوں مجھے ملک کے پاس لے چلو!"
علی مراد نے کہا۔
"غیرت ہو تو پھر راوی کے پار پاؤں مت رکھنا۔"
رشیم نے کہا۔
"غیرت ہی نے تو پاؤں میں بیڑی ڈال رکھی ہے" علی مراد نے ایک آہ بھر کر کہا:۔
محبت کی بیڑی
نہ لوہار کاٹ سکا نہ آگ نرم کر سکی۔
علی مراد کو جس ماں نے دودھ پلایا
سورج کو گرہن لگتے نہیں دیکھا۔
انسان نادان تھا
وہ حامی بھرلی
جس سے فرشتوں نے انکار کیا
پہاڑوں نے منہ موڑا۔
مرد جب ہارتا ہے۔
عورت سے ہارتا ہے۔
پھول کی قدر خار سے ہوتی ہے
محبوب کا دل پتھر نہ ہو تو عشق کا کیا مزا
امتحان مرد کے لئے ہے۔
مرد امتحان کے لئے
گول گول بندوں والی سے کہو
چوری کا طعن مت دے۔۔
تیرا بھائی بھی ہوتا
وطن کی ریت پوری کرتا۔

دونوں میں کچھ دیر اسی طرح نوک جھونک ہوتی رہی جب سورج کی پہلی کرن سبزہ زاروں سے آنکھ مچولی کھیلنے لگی تو شبنم کے موتی سرسوں کی پتیوں پر اس طرح چمکنے لگے جیسے کسی مغنیہ کی ساری پر بادلے کے پھول۔ علی مراد سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اور رشیم پاس بیٹھی مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہاں کیوں بیٹھ رہے" رشیم بولی "گھر ہی چلے چلو!"

علی مراد اٹھ کر ساتھ ہو لیا۔ جب دونوں گھر پہنچے تو بڑھیا نے پوچھا:

"رشیم! یہ کون ہے؟"

"راہی ہے اماں!" رشیم نے جواب دیا "ہمارے ہی گھر کا پتہ پوچھ رہا تھا"

"کیوں؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"اماں!" رشیم نے ہنس کر کہا "خدا کا شکر کرو بھینس مل گئی۔"

"سچ!" بڑھیا نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں سچ!" رشیم نے کہا "کل گھر آجائے گی۔"

"اور چور!" بڑھیا نے کہا "کلمہ نبی کا نصیب نہ ہو ظالم کو۔"

"بد دعا مت دو اماں!" رشیم نے کہا "بھینس کوئی لے نہیں گیا تھا۔ خود ہی کھل گئی تھی۔ اور راوی کے پار اتر گئی۔ اس بھلے آدمی نے اس خیال سے کہ مالک لینے آجائے گا۔ پکڑ کر باندھ لی۔"

"اچھا بیٹا!" بڑھیا بولی "خدا تیرے من کی مراد پوری کرے۔"

"آمین!" علی مراد نے مسکرا کر ہولے سے کہا۔

"جا بیٹی!" بڑھیا نے کہا "تاباں کے گھر سے لسی لا کر پلا مہمان کو۔"

رشیم مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

صبح صبح جو رشیم تاباں کے گھر گئی تو تاباں نے پوچھا۔

"صبح صبح کیسے آئی؟"

ایک مہمان آگیا ہے" رشیم نے مسکرا کر کہا "لسی لینے آئی ہوں"

تاباں نے مسکرا کر پوچھا

"وہی بکم والا"

رشیم مسکرانے لگی۔ تاباں نے رشیم کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور چھوٹا اس وقت جب اس سے رات کا سب قصہ سن لیا۔ تاباں نے لسی کے ساتھ مہمان کے لئے مکھن بھی دیا۔ علی مراد ناشتہ کر کے واپس چلا گیا اور شام ہوتے ہوتے بھینس لا کر رشیم کی کھرلی پہ باندھ دی اڑوس پڑوس والیوں نے بڑھیا کو مبارک باد دی۔ چند روز بعد تاباں کی رائے کے مشورے سے بڑھیا نے رشیم کی علی مراد سے شادی کر دی۔ اور بھینس بیٹی کو جہیز میں دے دی۔ اس طرح وہ رومان جس کی ابتدا فکر اور پریشانی سے ہوئی تھی خیر و خوبی سے ختم ہوا۔

رام بابو سکسینہ:۔ (بقیہ صفحہ ۹) اردو سکسینہ صاحب کے زیر تصنیف ہیں: (۱) جدید اردو ادب (تین جلدوں میں) (۲) اردو ادب میں رومانیت (۳) اردو ادب میں اہل ہنود کا حصہ (۴) میر (۵) غالب (۶) اقبال (۷) اردو ادب۔ خطبات صدارت سکسینہ صاحب کے ادبی امتیازات کی فہرست بہت طویل ہے وہ ہندستانی اکیڈمی کے ارکان اساسی میں سے ہیں۔ اور پی۔ای۔این بنگال اور پی، ای، این ہند کے ممبر ہیں۔ اعلیٰ امتحانات مثلاً آئی۔سی۔ایس۔ پی۔سی۔ایس۔ ایم۔اے اور بی۔اے کے مختلف یونیورسٹیوں میں ممتحن رہے ہیں۔ ہسٹری کانگرس کی دعوت پر وہ اس کتاب کے لئے ادب اردو پر ابواب لکھ رہے ہیں۔ جنگ کے بعد "ہندوستان کی زبان" اس موضوع پر جو مباحثہ نشر ہوا تھا اس میں اردو کی نمائندگی کے لئے آل انڈیا ریڈیو کی نظر انتخاب رام بابو صاحب سکسینہ پر ہی پڑی۔ حکومتیں۔ یونیورسٹیاں اور اردو انجمنیں ان کے قیمتی مشوروں سے وقتاً فوقتاً مستفید ہوتی رہتی ہیں۔ ریسرچ میں وہ اکثر طالب علموں کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ آگرہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری دی ... [illegible]

نسیم رس نالے لغے (۲)

سجّاد انصاری

نور محمد

اردو نثر کا سب سے پہلا باغی مرزا غالب تھے لیکن ان کی یہ بغاوت صرف اظہار بیان تک محدود تھی یعنی انھوں نے اردو نثر میں مسجع اور مقفیٰ عبارت کی جگہ سہل ممتنع کا سنگِ بنیاد رکھا۔ لیکن اردو نثر میں خیالات کے لحاظ سے جس شخص نے بغاوت کی وہ سجاد انصاری تھے۔ سجاد سے پہلے اس قسم کی جرأت رندانہ کی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی جس طرح غالب نے عوام کی شاہراہ سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی بعینہٖ سجاد نے بھی اپنے اسلاف کی ڈگر پر چلنا خلاف شان سمجھا اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کی یہ سرکشی ہی ان کی بقا کی ضامن ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں اور حقیقت یہ ہے کہ اسکے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں کہ زندگی فانی ہے اور سجاد اپنی عمر طبعی پوری کر گئے تو "محشر خیال" سجاد کا نعم البدل ہے۔ سجاد کی زندگی لیل و نہار کے پیمانہ سے نہیں ناپی جاسکتی۔ زندگی اگر نفس کی آمد رفت کا نام ہے تب تو یقیناً سجاد اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے لیکن اگر زندگی سے مراد بقائے دوام ہے تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ سجاد اب بھی ہمیں "محشر خیال" کی صورت میں زندہ نظر آتے ہیں۔

سجاد کی عمر بھر کی کمائی "محشر خیال" ہے جو ۲۰ مختلف مضامین، ایک ڈرامے اور چند غزلیات و نظم پر مشتمل ہے۔ سجاد کے مضامین اور اشعار کم و بیش علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئے۔ اردو ادب کو رشید صدیقی اور خواجہ منظور کا ممنون ہونا چاہیئے کیونکہ نہ ان لوگوں کا اصرار ہوتا نہ یہ مضامین شائع ہوتے۔ سجاد خود لکھتے ہیں:

"آپ نے عجیب عجیب طرح سے اصرار کیا ہے۔ سوا اس کے کوئی تدبیر نہیں کہ کچھ لکھوں حال کے چند اشعار ہیں۔ نثر کوئی نہیں۔ اگر کسی وقت خیال نے لکھنے پر مجبور کیا تو لکھوں گا اور شاید آپ کو بھیج دوں" سجاد کا ادبی اثاثہ مہدی سے بھی کم ہے لیکن ضخامت میں جتنا کم ہے اہمیت کے لحاظ سے اتنا ہی وقیع ہے۔ مہدی کے یہاں صرف حسنِ بیان ہے لیکن سجاد کے یہاں رعنائی خیال بھی ہے اور ندرتِ ادا بھی۔ محشر خیال اردو ادب میں اپنے رنگ کی واحد تصنیف ہے۔ سجاد نے بظاہر کسی نئے موضوع پر قلم نہیں اٹھایا لیکن جس ادا سے انھوں نے قلم اٹھایا ہے وہ ضرور نئی ہے۔ خیالات ہر شخص کے دماغ میں پیدا ہو سکتے ہیں، مضامین ہر عامی کے ذہن میں آسکتے ہیں، ملٹن کا قول ہے کہ "قابل توجہ بات یہ نہیں ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم کس طرح کہہ رہے ہیں" سجاد کے موضوع بہ استثنائے چند وہی ہیں جو اردو ادب میں اس وقت تک بہت عام تھے لیکن حسن ادا نے ان کی قلب ماہیت کر دی ہے جسکی وجہ سے وہ بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں اسی حسن ادا نے سجاد کو دنیائے ادب میں بہت ممتاز کر دیا ہے۔

سرور نے لکھا ہے کہ اُن کے یہاں فلسفہ اور ادبِ لطیف دونوں کا حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے۔ اس بنا پر وہ ادبِ لطیف کے فلسفی کہے جاسکتے ہیں۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں کیونکہ فلسفہ اور ادبِ لطیف قطعی متضاد چیزیں ہیں بقول ایڈگر ایلن پو کے "روح کے پردے میں ہمارے احساسات کو جو کچھ محسوس ہوتا ہے اس کی تشریح کو فنِ لطیف کہتے ہیں" لیکن فلسفہ تو دماغی ورزش کا دوسرا نام ہے اسے حیات اور جذبات سے کوئی واسطہ نہیں وہ تو ٹھوس حقائق سے سروکار رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے ادبِ لطیف انسان کے سوئے ہوئے جذبات لطیف کو بیدار کرتا ہے۔ دل و دماغ کو سکون بخشتا ہے اور مردہ طبیعتوں میں شگفتگی اور زندہ دلی پیدا کرتا ہے لیکن فلسفہ بجائے دماغ کو سکون بخشنے کے اسے تھکا دیتا ہے۔

سجاد کے یہاں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ اظہار بیان کی بے باکی اور آزادی ہے۔ سجاد کی سیرت کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح سوچا بعینہٖ بغیر کسی جھجک اور بغیر کسی ندامت کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ انھوں نے اسکی قطعی پروا نہیں کی کہ اُن کا بے باک قلم جو "عفت نسوانی" ہو یا "مذہب اخلاق" غرضکہ ہر جگہ ایک ہی برق رفتاری کے ساتھ چلتا رہا ہے، ان کے خلاف مخالفت کا طوفانِ نوح پیدا کر سکتا ہے۔ مثلاً

"جوانِ صالح اور زاہدِ خشک کے لئے غیر دلچسپ فرائض مخصوص کر دیئے گئے ہیں اور علمبردارانِ حسن و شباب کے لئے "معاصی لطیف" لیکن ہر خوش مذاق انسان کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ گناہوں کی دل آویزیوں سے لطف اندوز ہو۔ یہ سعادت صرف اُن آشنایانِ حقیقت کے لئے مخصوص ہو چکی ہے جو دنیا والوں کے خود ساختہ مذہبِ اخلاق کی سطحیت سے بھی باخبر ہوں اور گناہ و ثواب کے حقیقی امتیازات سے بھی، ہر انسان اعمال حسنہ کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے اور کارہائے خیر میں اپنی زندگی مبتلا کر سکتا ہے لیکن گناہوں کے لئے یہ آسانیاں نہیں۔ ایک صحیح گناہ کا ارتکاب ہزار نیکیوں سے زیادہ دشوار ہے۔ عمل خیر ایک بیوقوف سے بھی سرزد ہو سکتا ہے لیکن معاصیٔ رنگیں کے رازدار صرف وہ اربابِ نظر ہو سکتے ہیں جن کے قلوب حقیقت آشنا، جن کی نگاہیں حقیقت بیں اور جن کے حوصلے حقیقت طلب ہیں۔

سجاد کے یہاں صرف اظہار بیان کی بے باکی ہی نہیں ملتی بلکہ ان کے مضامین میں خیالات کی جدت بھی پائی جاتی ہے۔ سجاد نے یہ جدت ایک عجیب و غریب فن سے پیدا کی ہے جسے مختصر طور پر توجیہہ باردہ کا فن کہہ سکتے ہیں۔ توجیہہ باردہ جذبات کی زندہ دلی اور آزادانہ روی کا غماز ہوتی ہے۔ نامانوس حقائق توجیہہ باردہ کے

ذریعہ بے نقاب کئے جا سکتے ہیں اور جانی پہچانی حقیقتیں اجنبی معلوم ہونے لگتی ہیں، اس حربہ کا استعمال کوئی آسان کام نہیں ہے۔ الفاظ پر پوری قدرت اور سخت مشق و مزاولت کے بعد یہ حربہ کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سجاد کے یہاں یہ فن اپنے شباب پر ہے۔ مثلاً "فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے۔ ایک حقیقت جب ملیتی ہے دوسری حقیقت ہو جاتی ہے۔ خدا نے ابتدا میں صرف فرشتوں کو پیدا کیا تھا اسوقت تخلیق شیطنت کی ضرورت ہی نہ تھی وہ جانتا تھا کہ خود ملکوتیت میں عناصر شیطنت مضمر ہیں۔ سلسلۂ ارتقا سے شیطان خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ معلم الملکوت کی فطرت میں ملکوتیت کے وہ تمام عناصر مکمل ہو چکے تھے جو تخلیق شیطنت کے لئے لازمی تھے فطرتاً اب اس کے لئے محال تھا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی ملکوتیت قائم رہے وہ شیطنت پر مجبور ہو گیا۔"

جذبہ کی شدت جیسا کہ میں مہدی کے بیان میں عرض کر چکا ہوں اسلوب بیان متعین کرتی ہے۔ سجاد کے یہاں جذبہ اتنا شدید اور تیز ہے کہ غالب کے الفاظ میں آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جاتا ہے بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ خیالات کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ شاعری اصطلاح میں آپ اس شدت یا تیزی کو "آمد" کہہ سکتے ہیں۔ سجاد کی اس آتش بیانی سے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کسوت الفاظ نہ جل جائے "پیام زلیخا" تمام و کمال ایسا ہی آتش پارہ ہے۔

جس طرح کیٹس حسن کا دلدادہ اور حسین چیزوں کا پجاری تھا۔ سجاد بھی حسن پرست تھے لیکن وہ نرا حسن ہی نہیں چاہتے تھے حسن کے ساتھ وہ شعریت کے بھی طلبگار رہتے تھے۔ دنیا کی ہر چیز کو سجاد شعریت کی عینک سے دیکھنا چاہتے تھے انہیں وہ کسی قسم کی تخصیص نہیں کرتے "عفت نسوانی" ہو یا "مذہب اخلاق" "محاسن و معاصی" ہو یا "حقیقت عریاں" "جھوٹ" ہو یا "دغا" غرضکہ ہر چیز میں شعریت چاہتے ہیں اور جہاں اور جب کبھی شعریت کا فقدان دیکھتے ہیں وہ جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ صوفی سے وہ اس لئے بدظن ہیں کہ وہ شعریت سے بیگانہ ہے فلسفی سے وہ اس لئے نالاں ہیں کہ وہ ہر ظاہر کا ایک باطن تلاش کرتا ہے۔ سجاد کے یہاں عورت کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو مہدی کے ہاں ہے لیکن اس کے باوجود "محشر خیال" کا بڑا حصہ صنف لطیف اور اس کے متعلقات کے لئے وقف ہے۔ وہ عورت اور اسکی فطرت اور خصوصیت پر تبصرہ کرنے سے کبھی نہیں جھجکتے لیکن وہ کبھی ایک خیال پر قائم نہیں رہتے۔ اگر ایک جگہ وہ عورت کی شان میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ارتقاء انسانی کی آخری منزل عورت ہے" تو دوسرے مقام پر وہ یہ کہنے سے بھی نہیں جھجکتے کہ "محبت محض ایک افسون شباب ہے اور عورت محض ایک فریب حیات" سجاد ہر عورت کے قائل نہیں وہ مہدی کی طرح یہ نہیں کہتے "آہ۔ عورت! تو فسانۂ زندگی ہے تو جس طرح ایک جھونپڑے کو اپنی صاف شفاف ہستی سے نشیمن گل بنا سکتی ہے بڑے سے بڑے ایوان عیش کی تکمیل اسوقت تک ممکن نہیں جب تک تیری موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں۔" سجاد کے نزدیک کامل عورت وہ ہے جو انبساط شباب کا ایک مجموعہ ہو اور جسکی ہر جنبش اپنے دامن میں کائنات کے لئے ہزاروں برکتیں رکھتی ہو۔ عصمت و عفت سے سجاد کے نزدیک یہ مفہوم نہیں کہ عورت پیکر حیا ہو اور شرم مجسم بلکہ "عورت اپنی نسوانیت اور اپنے شباب کی نیرنگیوں کو محفوظ رکھے۔ وہ کوئی ایسے فرائض انجام نہ دے جن سے حسن و شباب کی لطافتوں کو صدمہ پہنچتا ہو۔"

سجاد کے مرکزی خیالات ہمیں "محاسن و معاصی" میں ملتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "حیات انسانی کا صرف ایک ہی حق ہے اور ایک ہی فرض لطافت خیال اور حسن عمل سے زندگی کے ہر لمحہ کو دلفریبیوں میں محو کر دینا لطافت خیال اور کثافت عمل عمر کو رائیگاں بنا دیتی ہیں حسن خیال اور نیرنگی عمل میں حیات جاوید کے تمام رموز پوشیدہ ہیں لیکن لطافت و کثافت سے اخلاقی حسن و قبح اور مذہبی محاسن و معاصی مقصود نہیں محاسن سے محض خیالات کی رنگینیاں اور حرکات کی لطافتیں متصور ہیں۔ اگر قبیح ترین گناہ انتہائی حسن سے کیا جائے تو وہ محاسن حقیقی میں شامل ہو جاتا ہے اسی طرح ہر نیکی جو حسن عمل سے محروم رہے انتہائی معصیت ہو جاتی ہے۔" انہیں خیالات کا اعادہ ہمیں روز جزا میں خوبصورت مرد کے اس بیان میں ملتا ہے جو وہ معدلت گاہ خداوندی میں دیتا ہے گو اسکا بیان دہرانا صبر آزما ثابت ہوگا، لیکن اس سے مفر بھی نہیں۔ "اے حسن حقیقی ہم نے عقائد لطیف اور اعمال رنگین کے ذریعہ سے تجھے پہچان لیا۔ زاہد کی طرح ہم جاہل اور بدمذاق نہ تھے صوفی کی طرح ہم گمراہ اور حیلہ ساز نہ تھے فلسفۂ کائنات پر غور کرنے والوں کی طرح ہم میں جہل مرکب نہ تھا ہماری زندگی انتشار اور تذبذب میں نہیں گذری۔ مذہب حسن و شباب ہماری صراط مستقیم تھا۔ تیرے شیطان نے ہم کو ان رموز شیریں سے آگاہ کر دیا تھا جو ہمیشہ معصیت رنگین میں پوشیدہ رہے۔ ہم نے وہ گناہ نہیں کئے جن سے فطرت انسانی میں خباثت و سفلگی لطافت و کثافت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم نے وہ نیکیاں بھی نہیں کیں جن سے چہرے سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور طبائع مضمحل۔ غرضکہ ہم سے وہ اعمال حسنہ کبھی سرزد نہیں ہوئے جن سے حسن سیرت اور حسن صورت دونوں کو صدمہ پہنچتا ہے ہماری زندگی حقیقی رنگینیوں اور دلفریبیوں میں بسر ہوئی۔" (صفحہ ۲۶۲)

بعض مقامات پر ہمیں مہدی اور سجاد کے خیالات میں ہم آہنگی اور مماثلت ملتی ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو صرف اسلوب بیان کا مثلاً مہدی صوفی سے کہتے ہیں "آپ فرط سنجیدگی سے حقیقت کے پیچھے پڑے اور جیسے تھے تھے بیس اسی برس کی ریاضات و مجاہدات کے بعد بھی کورے کے کورے رہے میں نے آنکھ کھولی تو کچھ نہ دیکھ سکا اس لئے آپکی اصطلاح میں صرف عشق مجازی سے غرض رکھی۔ یعنی اپنا معبود خود پیدا کر لیا اور تھوڑی عمر جو لے کر آیا تھا اس خیال میں گذار دی ؎

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا
جو آنکھیں دے تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

گوشوارہ پر آپ دیکھیں گے میرا پاکیزہ تخیل بڑے بڑے زاہدوں کے صومعات الطائف سے کتنا اچھا رہا وہ عمر بھر روتے رہے اور روتے گئے اور میں نے ہنستے کھیلتے دن کاٹ دیئے۔" سجاد کہتے ہیں۔

صوفی ان ذرائع سے اور ان مظاہر میں حسن کا متلاشی ہے جو ہر حیثیت سے حسن لطافت سے بیگانہ ہیں۔ وہ حقیقت کو عمر بھر مجاز سمجھتا رہا۔ اُسکی ناکامیوں کا بھی ایک راز ہے۔" نہدی کے نزدیک محبت ایک مقناطیسی کشش ہے جو رت بغیر چاہنے والے کے رہ نہیں سکتی۔ اس کی نزاکتِ فطری چاہتی ہے کہ کسی کا سہارا ہو یعنی دو۔ ایک ہو کر رہیں۔" اور سجاد "محبت صرف اس لطیف جذبہ کو کہتے ہیں جو ایک حسن پرست دل میں صنفِ لطیف کی کشش سے پیدا ہو جاتا ہے جذبات کی باہمی کشش میں کوئی رازِ لطیف پوشیدہ ہے اُسے محبت کہا جائے یا حسن مفہوم ایک ہی رہتا ہے۔"

سجاد کے یہاں الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔ آپ ان کے اکثر مضامین میں یہ بات دیکھیں گے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں، چند ابتدائیہ جملوں میں کہہ دیتے ہیں اور پھر الفاظ سے کھیلنا شروع کر دیتے ہیں جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضمون میں سنجیدگی باقی نہیں رہتی اور سنجیدگی رہے بھی کیسے جبکہ بقول خواجہ منظور کے سجاد کی شریعت میں سنجیدگی الحاد کے مرادف تھی اس لئے میں خواجہ منظور کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ سجاد کے خیالات کے ایک ایک لفظ کو سنجیدگی سے جانچنا اور تولنا سراسر بے معنی اور ان کی لطیف المذاق غیر ذمہ داری کی اہانت ہوگا۔" سجاد کے ہاں ایک چیز ہے جو قاری کی طبیعت پر بار گذرنے لگتی ہے ممکن ہے وہ اوروں کے نزدیک حسن ہو لیکن میں تو اسے عیب ہی کہونگا اور وہ عیب ہے بعض مخصوص چیزوں کا اعادہ۔ مثلاً "لطافتِ خیال" "حسنِ عمل" "معانیٔ لطیف" "اعمالِ حسنہ" "شخصیت رنگیں" "جوانِ صالح" "عمل خیر" "زاہد خشک" غرضیکہ یہی وہ الفاظ جن کی تکرار سے طبیعت میں ایک قسم کا انقباض سا شروع ہو جاتا ہے۔ اس انقباض میں کچھ حصہ لہجہ کی تلخی کا ہے اور کچھ استہزا کا جسے سجاد نے قصداً روا رکھا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود "محشرِ خیال" اردو ادب میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ سجاد نہ صرف خیالات کی وجہ سے اہم بلکہ وہ اپنے انفرادی اسلوب بیان کی وجہ سے اردو کے صفِ اول کے انشاپردازوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ اگر اس کتاب کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی جاتی تو یہ بھی عہد آفریں کتاب ہوسکتی تھی۔ لیکن سجاد نے عوام سے بیزاری دکھائی۔ اسکی پاداش میں عوام نے انھیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا یہی وجہ ہے کہ "محشرِ خیال" سے صرف وہی لوگ شناسا ہیں جو اردو ادب کا اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں۔

"محشرِ خیال" کا ہر صفحہ "دشمنِ ایمان آگہی ہے۔" وہ ہمارے عقائد کو کچھ عرصہ کے لئے متزلزل کر دیتا ہے اور ہماری اخلاقی قدروں کو بے معنی اور فضول قرار دیتا ہے۔ سجاد کا ہر فقرہ "رہزنِ تمکین و ہوش ہے" دورانِ مطالعہ میں ہم اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ سجاد کی ہر بات خراج آمنّا و صدّقنا وصول کر لیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ بچار اور غور و فکر ہمیں اپنی غلطی سے آگاہ کر دیں۔

سجاد کے دینی عقائد کے بارے میں عام طور پر شکوک کا اظہار کیا گیا ہے۔ بعضوں نے انہیں بے دین اور ملحد ٹھرایا لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ کچھ تو ان کا اسلوب بیان ہے اور کچھ ان کا وہ طنزیہ پیرایۂ بیان جو انھوں نے صوفی اور زاہد، عبادت اور معصیت کے بارے میں روا رکھا ہے اور کچھ اس کی وجہ اگر میں نے سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے تو ان کی حد سے زیادہ شہرت پسندی، انانیت اور انفرادیت بھی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ ایک بے دین اور ملحد کبھی یہ عبارت نہیں لکھ سکتا۔

"روشن خیال طبقہ کو یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ قرآنِ پاک میں غسل و طہارت کے علاوہ کائنات کے حقائق بھی پوشیدہ ہیں۔ اب تک جس انداز سے علماء قرآنِ پاک کو پیش کیا کرتے تھے وہ کسی طور پر خوش آیند نہ تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ سمجھتا تھا کہ قرآنِ مجید ختم ہے تنبیہہ و تہدید اور تکفیر و تعزیر پر۔ خود غرض اور تنگ ظرف علما نے انہیں اسی طرح سمجھایا تھا۔

غزل

خوبصورت فریبِ شادی ہے
زندگی غم میں مسکرا دی ہے

مست آنکھوں سے کیا پلا دی ہے
ہوش کی آرزو مٹا دی ہے

ہم نے چھیڑا ہے جب بھی سازِ جنوں
تیرگیٔ شب کی گنگنا دی ہے

اُن کو اپنا بنا سکوں گا، نہیں،
عمر اسی فکر میں گنوا دی ہے

عالمِ وجد و بیخودی میں تجھے
ہم نے آواز بارہا دی ہے

حسن اب احترامِ عشق کرے
عشق نے حسن کو جِلا دی ہے

کوششِ امن تو بجا ہے، مگر
آدمی فطرتاً فسادی ہے

اے خدا تو نے اپنے بندوں کو
زندگی کی کڑی سزا دی ہے

ہم نے طوفانِ شورشیوں سے
کشتیٔ جبر ڈگمگا دی ہے

اے زمیں ہم نے تیرے قدموں پر
آسماں کی جبیں جھکا دی ہے

اے ضیاؔ قلبِ عشق پرور میں
حسن نے آگ سی لگا دی ہے

ضیاؔ۔ فتح آبادی

لیکن جب مولانا آزاد قرآن سے کرائے مسلمان مبہوت ہوگئے کہ تیرہ سو برس کے صحیفے میں حال ہی کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے نکات و حقائق پوشیدہ ہیں"

یہی نہیں بلکہ جب سجاد اقبال کو پڑھتے ہیں تو وہاں انھیں خدا یاد آجاتا ہے ایک بے دین اور ملحد کو خدا سے کیا کام!

سجاد کو مہدی کے مقابلہ میں ایک امتیازی وصف اور حاصل ہے۔ یوں بھی اگر میں اسکا ذکر یہاں نہ کروں تو یہ تذکرہ تشنہ رہ جائیگا۔ سجاد نے یلدرم کی طرح قلمروئے شاعری میں بھی قدم رکھا ہے۔ مذاق شعری کے لحاظ سے سجاد سخت کافر کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے نزدیک صحیح شاعری وہ ہے جو "حقائق کو رنگینیوں سے اسطرح لبریز کردے کہ ہر شعر اپنے علم کی لطافت میں قرآن کی ایک آیت اور علم کی وسعتوں میں حدیث کا ایک ٹکڑا ہو جائے" یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ سجاد نے شاعری کی تعریف میں غلو کی حد کردی ہے کیونکہ قرآن کی آیت کا جواب تو فصحائے عرب اور ابوالعلا معری جیسے قادرالکلام شاعر سے بھی نہ ہو سکا لیکن حسن ادا کا تقاضا یہی ہے کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر ہی کی زبان میں ہو۔ لگے ہاتھوں غزل کے متعلق بھی ان کے خیالات سن لیجئے:۔

"غزل کی اشاعت نہیں چاہتا۔ نظم کا تعلق بالعموم واقعات سے ہوا کرتا ہے اسلئے اسکی اشاعت میں کچھ معنی بھی ہیں لیکن تغزل دوسرے بے تیازیے! اسکا مخاطب صرف میری ہی ذات سے ہے اس کے علاوہ رنگ لطیف اسکی اجازت نہیں دیتا کہ رموز رنگیں کا دامن انکشاف بجائے الجھا دوں۔ میرے لئے محبوب بھی غیر ہے۔ اس سے یاس و تمنا کا راز کہنا نہیں چاہتا پھر عالم غیر سے کیا کہوں۔

"مذاق لطیف کا تقاضا یہ ہے کہ صحیح خیالات غلط دماغوں سے نہ ٹکرائیں صوت موزوں کے لئے سامعہ لطیف چاہیئے۔ میرے اشعار دیدہ کے ٹکڑے ہیں نتیجہ آپ نکال لیں۔

مختصر خیال میں صرف دس صفحے غزل کے لئے وقف ہیں لیکن یہ دس صفحے بھی بعض شاعروں کے دیوان پر بھاری پڑینگے۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

برباد ہو گیا دل حسرت طلب مگر — ہم یونہی صرف کشمکش امتحاں رہے
صوفی کی بیکشی بھی تصوف کا راز ہے — مخمور چشم یار سے سب بدگماں رہے
جبیں میں شوق کی وہ شورشیں باقی نہیں شاید — کھنچا جاتا ہے آخر سقف کیوں آستاں ہم سے
لب خاموش میں بس اک متاع بے نیازی ہے — کہیں اسکو بھی اے حسرت نہ مرہون دعا کرنا
جتا جلووں کی منزلیں بھی گذری جاتی ہیں — کہیں لے جائیگی آخر مجھے ناکامیاں میری
میں نے ہجوم حشر میں رکھ لی خدا کی شرم — ہر جرم پر کہا کہ میرا ہی قصور تھا

اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سجاد کے یہاں کچھ کچھ فانی کا رنگ جھلکتا ہے لیکن افسوس کہ یہ "مے چھلک کے ابھی اس حسن کو پہنچ بھی نہ سکی تھی" کہ سجاد خدا کو پیارے ہوگئے۔ اردو ادب کی اس سے بڑھکر اور کیا بدقسمتی ہوسکتی ہے کہ اس کے دو ہونہار ادیب اسوقت چل بسے جبکہ اُن کے قلم نے جوانی کی پہلی انگڑائی لی تھی۔ خاتمہ بحث میں یہی کہوں گا کہ قدرت نے ان دو پاک روحوں کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو منتقل کرنے میں بہت جلدی کی اگر وہ اسے اتنے عزیز تھے تو کیا ہمیں عزیز نہ تھے لیکن اس کی مرضی مقدم، اسکا حکم اٹل، ہم مجبور۔ لاچار بے بس۔

کیٹس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ عالم شباب میں نہ مرتا تو شیکسپیر کے ہم پلہ ہوتا۔ میں سجاد کے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ بھی جوان نہ مرتے تو نثر کے غالب ہوتے۔ رہے مہدی اگر موت نے انھیں بھی مہلت دی ہوتی تو ان کا چلبلا اور البیلا قلم وہ گلکاریاں دکھاتا کہ خود ادب و انشا کو مہدی پر ناز ہوتا۔

مہدی و سجاد کی قبل از وقت موت نے اردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ مضمون ضرورت سے زیادہ طویل ہوگیا۔ اس کے لئے میرے پاس یہ حسین اور رنگین عذر ہے کہ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

غزل — عامر عثمانی

نہ تاب نظارہ میرے بس میں نہ ضبط غم میری دسترس میں
تری حکومت نظر نظر پر ترا تصرف نفس نفس میں

کسی کا دامن تو آچکا تھا ہمارے دست جنوں کے بس میں
برا ہوا اس ہوش و آگہی کا الجھ گئی عقل پیش و پس میں

ہزار تو رسم و راہ چھوڑے، ہزار میں ضبط شوق کر لوں
مگر محبت کا ربط باہم نہ تیرے بس میں نہ میرے بس میں

عبادتوں کے صلے میں زاہد یہ کیوں ہے جنت کا ذکر پیہم
وفا کی توہین کرنے والے تمیز کر عشق اور ہوس میں

تپش سے جنکی جلا نشیمن وہ بجلیاں خانہ زاد نکلیں
تباہی آشیاں سے پہلے وہ تھیں نشیمن کے خار و خس میں

مقام دل کی بلندیوں سے نگاہ ڈالی تو ہم نے دیکھا
یہ وصل و فرقت بھی خامکاری یہ سنگ در بھی فضول رسمیں

نشاط ظاہر تھی جن کی منزل رہے اسیر تلاش برسوں
جو روح منزل سے آشنا تھے وہ کھو گئے نغمۂ جرس میں

بجا سہی دخت رز کی حرمت مگر مجھے تجھ پہ شک ہے واعظ
ذرا سی چکھ لے تو پھر میں دیکھوں یہ تیری توبہ یہ تیری قسمیں

درست صیاد کا ستم بھی مگر حقیقت تو یہ ہے عامر
کہ ننگ آداب گلستاں تھے جو لا کے رکھے گئے قفس میں

جب دہلی میں غدر پڑا
اور
دہلی کے باکمال پیٹ پیٹ کو محتاج ہو گئے تو وہ راز جو صدیوں سے سینہ بسینہ چلے آتے تھے بھوک سے لاچار ہو کر
انھوں نے بتلانے شروع کر دیئے۔ غدر کی مصیبتیں اور فاقوں سے تنگ آئے ہوئے اہل کمال اپنا ہنر اور راز کوڑیوں میں
فروخت کرتے پھرتے تھے۔ مغل بادشاہوں کے دسترخوان کے کھانے بھی راز تھے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے رؤسا اور جاگیردار اس
فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح شاہی باورچی سے ان کھانوں کی ترکیبیں دریافت کرلیں مگر وہ ناکام رہتے تھے:۔
رضیہ کا شاہی دسترخوان
بھی اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے جو شاہی باورچی سے حاصل کی گئی تھی۔ اب اس کتاب کو جدید انگریزی و دیسی کھانوں کو ملا کر شائع کر دیا
گیا۔ اس میں ہر قسم کے ناشتے، آئس کریم، فالودہ، کیک، شاہی ٹکڑے، مختلف قسم کی لذیذ روٹیاں، مزیدار پوریاں، پکوان، حلوے
بیسیوں قسم کی دالیں، کھچڑی، انڈے، خاگینہ، قورمہ، کباب، مرغ، شکار، یخنی، دہلی کی مشہور نہاری، سبزیاں، نرگسی کوفتے،
مچھلی کے سالن، اور کباب، قیمہ پلاؤ، مختلف اقسام، انگریزی و دیسی مٹھائیاں، نشاستہ، حلوہ سوہن، پھینیاں، سب
قسم کے مربے اور چٹنیاں، بیسیوں قسم کی چائے، کافی، شربت، ۸۴ قسم کے انگریزی کھانے، گوشت کی مٹھائیاں، کیلے کا
سالن، شاہی مچھلی، غرضکہ کھانا پکانے کی ایک بہترین کتاب ہے۔ ڈھائی سو صفحات۔ قیمت: مجلد ڈھائی روپے (عہ۸)
رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری
کشیدہ کاڑھنے کی بہترین کتاب جسمیں سینکڑوں قسم کے پھول بوٹے اور کشیدہ کے سینکڑوں نمونے اپنی بہار دکھلا رہے ہیں قیمت: مجلد دو روپے بارہ آنے (۱۲/۲)
رضیہ کے خطوط
زنانہ خطوط بہ طرز جدید۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ قیمت: ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ۸) محصول بذمہ خریدار
علاوہ محصول ڈاک۔
نیا کتاب گھر۔ اردو بازار۔ (اے۔ سی) دہلی

فرعون کی نہر

گربچن سنگھ

فراعنہ کے زمانہ میں بحیرۂ احمر سے دریائے نیل کے دہانہ تک ایک نہر بنائی گئی تھی جس کے کچھ آثار آج بھی موجود ہیں۔ چار سو سال قبل مسیح ایرانیوں نے جو اس وقت مصر پر حکمراں تھے اور ان کے بعد پھر مسلم فاتحین نے اس نہر کو صاف کرایا لیکن جب موجودہ نہر سوئیز بننا شروع ہوئی اس وقت سابقہ نہر کے آثار تقریباً مٹ چکے تھے۔

نہر سوئیز تاریخ بشر میں سب سے پہلی بڑی مصنوعی نہر تھی۔ فن انجینیرنگ کے اعتبار سے یہ بڑی جرأت کا کارنامہ تھا۔ اس سے ہندوستان کے سفر میں سات سے دس دن تک کی بچت ہوگئی۔ اس نہر کی اسکیم فرانسیسی انجینیر دی لیسپس نے پانچ سال میں مرتب کی۔ اس عرصہ میں وہ اپنے کمرے میں بند رہتا اور بہت کم لوگوں سے ملتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے خدیو مصر کی ہمدردی حاصل کی اور ۱۸۵۶ء میں نہر سوئیز کمپنی کی بنا ڈالی گئی۔ نصف سے زیادہ سرمایہ فرانس نے اور بقیہ خدیو نے مہیا کیا۔ چار برس پیمائش میں اور گیارہ برس تعمیر میں لگے۔ اس پر ایک کروڑ ستر لاکھ پاؤنڈ لاگت آئی جو تخمینے سے دوچند تھی۔ اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ نہر کے دونوں طرف کے سمندروں کی سطح برابر ہے یا نہیں نیز یہ اندیشہ تھا کہ اسکی تہ مٹی سے بھر جائے گی۔

پیمائش کے دوران میں بے شمار مشکلات اور مصیبتیں پیش آئیں۔ پیمائش کرنے والوں کے سامان لے جانے کے لئے ساٹھ اونٹ ہوتے تھے اور وہ لوگ متمدن دنیا سے مہینوں کٹے رہتے تھے۔ پینے کا پانی ساحل سے لایا جاتا تھا۔ اسکیم کے مخالفوں کے اطمینان کے لئے نہر میں مختلف مقامات پر سترہ برمے لگائے گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زمین کافی مضبوط ہے اور نہر کے ریت سے اٹ جانے کا امکان کم ہے۔

نہر کے راستے میں پانچ جھیلیں پڑتی تھیں۔ اس سے تعمیر میں بہت آسانی ہوگئی۔ ان جھیلوں کی لمبائی ستائیس میل اور بندر سعید سے بندر سوئیز تک نہر کی لمبائی سو میل ہے۔ ۲۵ر اپریل ۱۸۵۹ء کو بندر سعید میں باقاعدہ کام شروع ہوا۔ اور ابتدا ہی میں دقتیں پیش آنے لگیں۔ مزدوروں کو خیموں میں رہنا پڑتا تھا۔ دو سال کی محنت شاقہ کے باوجود نہر کا صرف پچاسواں حصہ کھودا جا سکا اور اسی لاکھ پاؤنڈ کی منظور شدہ رقم ناکافی ثابت ہوئی۔ خرچ کم کرنے کی غرض سے بعض مقامات پر نہر کی مجوزہ چوڑائی تقریباً آدھی کرنا پڑی۔

خدیو مصر نے تیس ہزار مزدور بھیج دئے۔ لیکن یہ بیگار کا کام تسلی بخش نہیں تھا۔ چنانچہ انجینیروں کو تہ صاف کرنے اور اوپر اٹھانے کی کلیں استعمال کرنا پڑیں۔ ہر بڑی کل کی قیمت بیس ہزار پاؤنڈ تھی۔ مہینے میں ستائیس لاکھ تیس ہزار مکعب گز مٹی ہٹائی جاتی تھی اور پوری نہر کے بنانے میں آٹھ کروڑ مکعب گز ریت، زمین اور چٹانیں کھودی گئیں۔ ۱۵ر اگست ۱۸۶۹ء کو (دس سال بعد) کھدائی ختم ہوئی اور ۱۷ر نومبر کو ملکہ یوجین نے رسم افتتاح ادا کی۔

اس نہر کے بننے سے مغربی یورپ اور ہندوستان کا فاصلہ ۱۱۳۷۹ سے ۶۰۱۷ میل رہ گیا۔ لیسپس کا خیال تھا کہ پہلے سال تیس لاکھ ٹن جہازی مال نہر سے گذرے گا اور دوسرے سال اس سے دوگنا۔ پہلے سال صرف ۴۹۱ جہاز نہر سے گذرے جن کا کل وزن ۴۳۲،۶۱۸ ٹن تھا۔ لیسپس کی پیشگوئی کہ ایک کروڑ ٹن کا جہازی مال ایک سال میں اس نہر سے گذرے گا نو برس بعد پوری ہوئی۔ اس وقت اس نہر سے سال میں پانچ ہزار جہاز گذرتے ہیں جن کا کل وزن تین کروڑ ٹن ہوتا ہے جس میں نصف سے زیادہ وزن برطانوی جہازوں کا ہے۔ نہر کا کل سالانہ محصول ایک کروڑ دس لاکھ پاؤنڈ ہے۔ سامان لئے ہوئے جہاز سے چھ شلنگ آٹھ پنس فی ٹن کے حساب سے محصول لیا جاتا ہے اور ہر مسافر کو دس شلنگ دینا پڑتا ہے۔

۱۸۸۶ء تک کوئی جہاز رات کے وقت نہر سے نہیں گذر سکتا تھا لیکن بعد میں اجازت مل گئی اس شرط پر کہ ہر جہاز پر ایک زبردست لیمپ لگا ہوا ہو جس کی روشنی چار سو فٹ تک پڑ سکے۔ بادبانی جہاز کو رات کے وقت چلنے کی اجازت نہیں ہے اور بڑے دخانی جہازوں کی رفتار بھی زیادہ سے زیادہ ساڑھے سات میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

معمولی جہاز بارہ سے سولہ گھنٹے میں نہر سے گذر جاتے ہیں۔ قدرتی مناظر چنداں دلکش نہیں ہیں۔ نہر کے کنارے درخت اور جھاڑیاں ہیں۔ مشرقی کنارے سے فلسطین کی ریلوے کا اسٹیشن القنطرہ دکھائی دیتا ہے اور مغربی کنارے سے مصر کی سرکاری ریلوے لائن نظر آتی ہے۔ نہر کے دفاتر اور ملازمین اور ملاحوں کے مکانات اسماعیلیہ میں ہیں جو جھیل کے کنارے بندر سعید سے کوئی اڑتالیس میل دور واقع ہے۔ یہ شہر بہت بارونق ہے اور یہاں سینما تھیٹر اور کلب ہیں۔ نہر کی دونوں جانب ریگستان ہے جہاں کبھی کبھار اونٹوں کے قافلے دکھائی دیتے ہیں۔

ریلوے کی طرح اس نہر پر بھی سگنل کا پورا انتظام ہے۔ کمپنی کی اجازت کے بغیر کوئی جہاز آ جا نہیں سکتا۔ صرف ڈاک لیجانے والے جہاز بغیر کسی روک ٹوک کے آ جا سکتے ہیں۔ نہر پر تیرہ سگنل اسٹیشن ہیں اور ان کا صدر اسٹیشن اسماعیلیہ ہے۔ ان اسٹیشنوں پر ٹیلیفون بھی ہیں۔

شروع میں یہ نہر ۲۶ فٹ گہری تھی اور اس کی تہ ۷۲ فٹ اور پانی کی سطح ۱۵۰ فٹ چوڑی تھی۔ اب اس کی گہرائی ۳۸ فٹ، تہ کی چوڑائی ۱۴۷ فٹ اور اوپر کی سطح کی ۲۴۰ سے ۳۶۰ فٹ ہے۔ اس کے تیار ہونے پر ایک کروڑ چالیس لاکھ پاؤنڈ لاگت آئی۔ اس صرفہ کثیر کے باوجود بھی یہ نہر آمدنی کے اعتبار سے بہت کامیاب رہی ہے۔ ۱۸۷۵ء میں انگلستان کے وزیراعظم لارڈ بیکنس فیلڈ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے کمپنی کے چوالیس فیصدی حصے خدیو مصر سے خرید لیے۔ بقیہ حصے زیادہ تر فرانس کے پاس ہیں۔ جنگ ہو یا امن بین الاقوامی معاہدہ کی رو سے تمام ممالک کے جہاز اس نہر سے آ جا سکتے ہیں۔

۱۷ نومبر ۱۹۶۸ء کو یہ نہر حکومت مصر کی ملکیت ہو جائے گی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا لیکن گمان غالب یہ ہے کہ نہر کا انتظام مصر ہی کے ہاتھ میں

باقی صفحہ ۴۳ پر

برطانیہ کے شاہی محل

ڈی راگھون

ایک مرتبہ ایک فرانسیسی انگلستان آیا۔ اس نے اس خوبصورت جزیرے کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک کا نام "سبز انگلستان" رکھا اور دوسرے کا "سیاہ انگلستان"۔ پہلے حصے میں خوبصورت ہرے بھرے میدان، گرجا اور محل شامل تھے اور دوسرے میں معروف صنعتی شہر۔ برطانیہ کے لوگ اپنی سادہ عادتوں اور ہمہ گیر مذاق کے لئے مشہور ہیں لیکن ہندوستانیوں کی طرح وہ اپنے سماجی اور سیاسی اداروں کی شان و شوکت برقرار رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس کی سب سے اہم مثال شاہی حکومت ہے۔ شاہی محلوں سے جو ملک کے ہر حصے میں موجود ہیں صدیوں پرانے تاریخی واقعات کا دامن وابستہ ہے۔ سبز انگلستان میں اس وقت بھی انسانی فنکاری کے بہت سے نادر نمونے موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص سیاحت کی غرض سے انگلستان جائے تو وہاں کے محلات اور قلعے اس کے دل میں انگلستان کے شاندار ماضی کا احساس پیدا کرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

لندن کی ایسی عمارتوں میں "قصر بکنگھم" کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس میں حضور شہنشاہ اور ان کے اہل خاندان رہتے ہیں اور بڑے بڑے سرکاری کام بھی یہیں انجام پاتے ہیں۔ غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ حال ہی میں اس محل میں بادشاہ سلامت نے ایک موقع پر تین ہندوستانیوں کو وکٹوریہ کراس عنایت فرمائے تھے۔ اس سادہ مگر حسین و شاندار عمارت کو دیکھ کر اہل لندن کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ یہ ۱۸۲۵ء میں جارج چہارم کے لئے تعمیر کرائی گئی تھی۔ قیام لندن کے زمانہ میں ملکہ وکٹوریہ اور ایڈورڈ ہفتم اسی میں رہتے تھے۔ جارج پنجم نے اس میں بہت سا اضافہ کرا کے حقیقی معنوں میں شاہی محل بنوا دیا۔

لندن کا ایک اور شاہی محل "سینٹ جیمز پیلیس" ہے جہاں امن کے زمانہ میں شاندار دربار ہوتے تھے۔ اس محل کو بھی دنیا بھر جانتی ہے کیونکہ دوسری سلطنتوں کے سفیر جو برطانیہ میں متعین ہوتے ہیں "سینٹ جیمز کے باریاب" کہلاتے ہیں۔ اگرچہ لندن میں تعمیری منصوبوں کے مطابق بنائی ہوئی عمارتیں نہیں ہیں اور اعلیٰ اسلوب کے مناظر بھی کم ہیں۔ لیکن اس میں ایسی عمارتیں بہت کافی ہیں جو اپنے طرز تعمیر میں یگانہ ہیں اور جو تاریخی واقعات سے تعلق رکھنے کے سبب اور زیادہ دلکش معلوم ہوتی ہیں۔ "سینٹ جیمز پیلیس" ان قدیم ترین عمارتوں میں ہے جن کی دلکشی زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ سب سے پہلے ہنری ہشتم نے اسے اپنا محل بنایا تھا اور اسی میں چارلس اول نے اپنی قید کے آخری دن بتائے۔ ۱۶۸۸ء میں جیمز دوم اس ملک سے فرار ہو کر فرانس گیا تھا۔ انہی اور ایسے ہی واقعات کی وجہ سے اہل لندن کے دل میں اس عمارت کی بڑی وقعت ہے۔ جب وہ سینٹ جیمز اسٹریٹ سے پکاڈلی تک کے فاصلے کے مقابل اس کے پھاٹک کے مکان اور قریب ہی جہاز سازی کے کارخانے کو دیکھتے ہیں تو ان کے دلوں میں اس کے لئے ایک محبت کا عجیب و غریب جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

"ونڈسر کاسل" کی تاریخ نہایت طویل اور دلچسپ ہے۔ جب ۱۰۶۶ء میں ولیم فاتح نے سمندر کے راستہ دریائے ٹیمز کے دہانے پر حملہ سے بچاؤ کے لئے لندن کا مشہور مینار تعمیر کرایا تو اس نے پچاس میل کے دائرے میں قلعے بھی بنوائے جن میں "ونڈسر کاسل" سب سے بڑا تھا۔ یہ قلعہ ایک چٹان کی چوٹی پر ۸ جیسی شکل کا ہے اور اس کا رقبہ چودہ ایکڑ ہے۔ اس کی فصیلوں سے جہاں جانے کی عام اجازت ہے، ایٹن کالج کی تاریخی عمارتیں اور کھیل کے میدان نظر آتے ہیں جو دریائے ٹیمز کے پار وادی میں واقع ہیں۔ جنوب سے قلعہ میں آنے والی تقریباً تین میل لمبی سایہ دار سڑک کے دونوں طرف ایلم درختوں کی دوہری قطاریں ہیں۔ یہ درخت ۱۶۸۲ء میں لگوائے گئے تھے اور ملک بھر سے سب میں زیادہ شاندار خیال کئے جاتے ہیں۔ قلعہ کا ایک چوکور احاطہ خاص خاص موقعوں اور دعوتوں کے لئے مخصوص ہے جن میں دو سو پچاس شاہی مہمان ٹھہر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں تمام سال پچاس اور کنبے جداگانہ مکانوں میں رہتے ہیں خواہ ملک معظم یا ملکہ معظمہ تشریف رکھتی ہوں یا نہ رکھتی ہوں۔ اس کے دو صحنوں میں سے ایک میں محل گرجا "سینٹ جارج چیپل" ہے جس کے اردگرد پادریوں کا پورا عملہ رہتا ہے۔ یہ محل تعمیرات کا بہترین نمونہ ہے۔ "ونڈسر کاسل" اب ایک عرصہ سے قلعہ نہیں رہا کیونکہ اب یہ چار سو سال سے شاہی محل کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ شاہی خاندان کے لوگ بھی اسی شاندار عمارت میں رہتے ہیں اور خاص طور پر اس زمانہ میں جبکہ اسکوٹ کی مشہور گھوڑ دوڑ ہوتی ہے اور میدانوں میں بے شمار لوگ اکٹھا ہو کر اس کی قدیم شان و شوکت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

"ہیمپٹن کورٹ" انگلستان کے سارے محلوں سے زیادہ خوبصورت اور شاندار ہے چھٹی کے دنوں میں لوگ اس کے میدانوں اور گیلریوں میں جمع ہو کر اس کے چمکیلے فواروں اور حوضوں کا نظارہ کرتے ہیں۔ جس طرح پچھلے دنوں میں یہاں تفریح کے لئے بادشاہ اور ان کے متعلقین آیا کرتے تھے ایسے ہی اب یہ لوگ اکٹھا ہو کر اس کی رونق بڑھاتے ہیں۔ پہلے یہ ہسپتال تھا پھر اسے ۱۵۱۴ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ کارڈینل ولزے نے حاصل کر کے اس میں ایک عالی شان محل تعمیر کرایا جس میں اپنے ہمعصر عیش پسند بادشاہ ہنری ہشتم سے بھی زیادہ شان و شوکت سے رہنا شروع کر دیا۔ ولزے کا زمانہ اقتدار ختم ہونے کے بعد ہنری ہشتم نے اس عمارت کو اپنا محل بنایا اور اسے عمدہ ساز و سامان سے آراستہ کیا۔ اس زمانے میں

"ہیمپٹن کورٹ" میں پانچسو خاندان اور ملازمین مستقل طور پر رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں مہمانوں کے لئے دوسو اکیس کمرے بھی تھے۔ ہنری ہشتم یہیں رہنے لگا اور اس کی ملکہ کیتھیرین ہاورڈ، کیتھیرین پار اور این آف کلیوز کے علاوہ بعد کی ساری بیگمات بھی یہیں رہتی تھیں۔ ہیمپٹن کورٹ کی رعنائی اور دلکشی کیوجہ سے اسپین کے بادشاہ فلپ اور ملکہ میری نے اپنا ماہ عروسی یہیں گذارا۔ ملکہ ایلزبتھ ہر سال یہاں آیا کرتی تھی ان موقعوں پر شاندار ناٹک اور ڈرامے کھیلے جاتے تھے کیونکہ ملکہ کو ان میں بڑی دلچسپی تھی۔ ۱۷۶۰ء میں جارج سوم کی تاجپوشی کے بعد یہ شاہی محل نہیں رہا۔ اب اس میں تقریباً پچاس کمروں کے سٹ ہیں۔ جن میں ان آدمیوں کی بیوائیں رہتی ہیں جنہوں نے سلطنت کی خاص خدمات انجام دی تھیں۔ عوام اس شاہی محل سے لطف اٹھانا بہت پسند کرتے ہیں خصوصاً اس لئے کہ یہ لندن سے بہت قریب ہے۔ انگلستان کی سیر کرنے والوں کو کہیں بھی اس خولصورت اور تاریخی عمارت کے نظارے سے زیادہ لطف نہیں آتا۔

"کینسنگٹن" اگرچہ محل کہلاتا ہے لیکن وہ درحقیقت دیہاتی مکان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہائڈ پارک کے وسیع سرسبز میدان اس کی کھڑکیوں تک پہنچتے ہیں اور ایلم کے اونچے اونچے درخت دوسرے مکانوں کو نگاہوں سے پوشیدہ کردیتے ہیں۔ اس سے اس کی دیہاتی فضا اور بھی پر اثر ہوجاتی ہے۔ حالانکہ کینسنگٹن محل شہنشاہ جارج ششم اور ملکہ ایلزبتھ کی رہائش گاہ نہیں ہے لیکن سب مورخ جانتے ہیں کہ ملکہ ایلزبتھ یہیں پیدا ہوئی تھیں اور ان کا بچپن بھی یہیں بسر ہوا تھا۔ اپنے رشتہ دار اور ان کے ہونے والے شوہر شہزادہ البرٹ سے پہلے پہل یہیں ملاقات ہوئی تھی اور یہیں اگلے سال کنٹربری کے لاٹ پادری نے ان کی اٹھارہ برس کی عمر میں شادی کرا کے انہیں ملکہ بنایا تھا۔ اب چونکہ یہ شاہی محل نہیں رہا ہے اس لئے وقتاً فوقتاً اس کے اکثر حصے شاہی خاندان کے کمتر درجہ کے لوگوں کو دئے جاتے رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس محل کے باغوں کو ایک عرصہ ہوا ہائڈ پارک میں شامل کردیا تھا۔

لندن سے دور نارفوک کے دیہات میں انگلستان کے بادشاہوں کا ایک خولصورت محل واقع ہے جو "سندرنگھم ہاؤس" کہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ سات ہزار ایکڑ زمین ہے جس میں دوسو ایکڑ کا باغ بھی شامل ہے۔ اسے ۱۸۶۱ء میں بادشاہ ایڈورڈ ہفتم نے خریدا تھا۔ اس کے میری میگڈالین کے گرجا میں شاہی خاندان کی یادگاروں کا نادر مجموعہ موجود ہے۔

اسکاٹلینڈ کے سب سے قدیم محل "بالمورل" اور "ہالی اوڈ" ہیں۔ "بالمورل کاسل" پتھر کا بنا ہوا ہے اور اس کا اسلوب اسکاٹلینڈ کے امرا کے مکانوں جیسا ہے جس میں ایک خولصورت اونچا مینار ہوتا ہے۔ "ہالی اوڈ" کی جائے وقوع شاہی محلوں میں سب سے عمدہ ہے۔ جب آپ قدیم شہر ایڈنبرا کی قرون وسطیٰ کی پیچیدہ سڑک سے شہر کے باہر آئیں گے تو آپ کو ایک عجیب وغریب منظر نظر آئے گا۔ حالانکہ بادشاہ اور ملکہ معمولی حالات میں گرمیوں کے کچھ دن "ہال اوڈ" میں بسر کرتے ہیں لیکن وہ وہاں دعوتیں نہیں دیتے۔ نہایت قدیم اور تاریخی محلوں میں ہونے کی وجہ سے اسکے متعلق بہت سی روایات اور کہانیاں مشہور ہیں اور اس میں تصویروں کا غیر معمولی مجموعہ موجود ہے۔ اس مجموعہ میں تاریخ کی ابتدا سے لے کر اب تک کے اسکاٹلینڈ کے سارے بادشاہوں کی تصویریں شامل ہیں۔ محل کے ایک کونے کے قریب ایک صندوق میں بادشاہ رابرٹ بروس کی کھوپڑی کا حصہ رکھا ہوا ہے۔ عہد قدیم میں اس محل میں بے شمار جشن اور تقریبیں منائی جاچکی ہیں۔

عید کارڈ

عید آئی
کہ بہاروں کی جوانی آئی
دل میں اک طرفہ امنگ
اور خوشی کی لہریں
گنگناتی ہیں محبت کے رسیلے نغمے
آہ مجھ کو تو مگر اس سے سروکار نہیں
جو مری جان سے پیارا ہے مجھے۔

آرزوؤں کا چمن
وہ مری دنیا کا چاند
وہ گلے ملنے کو بھی آج مرے پاس نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ یہ عید نہیں میرے لئے
ہر طرف کیف کا ساغر چھلکے
اور میں بوند کی خاطر ترسوں
کوئی ہلکی سی کرن
میرے دل کے اندھیرے میں اجالا کردے
اب نہیں میرے لئے
میں تڑپنے کو ہوں
اور میرے لئے پیار نہیں

ان گھٹاؤں میں مگر
اک اجالا سا ہوا
اک برق یکایک چمکی
عید ملنے کو
مرا دوست، مرا پیارا، نیاز
جب کہ اس کارڈ کے پردے میں مرے ہاں آیا۔

اعظمی

بحرالکاہل کے جزیرے

ودیا ساگر

بحرالکاہل کے [illegible] جنگ
لڑائی جیتنے میں کافی د[illegible] [illegible] دنیا میں
امن وامان ہو رہا ہے [illegible] دوسرے ملکوں
کے ساتھ ساتھ اس نئے دور کی خوشحالی اور ذمہ داریوں
میں شریک رہیں گے۔ ان جزائر کو جنگ میں جو اہمیت حاصل
ہے وہ اب ظاہر ہو گئی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ چاروں خطوں کے باہمی ارتباط کو ترقی دینے
میں اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے گا۔ اس جنگ کے دوران یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ان
جزائر میں سے بعض اس نادر قدرتی ثروت کے مالک ہیں کہ اگر اسے ترقی دی جائے تو ان
جزائر اور ہمسایہ ممالک کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

آبادی

یہ جزائر بحرالکاہل کے غربی جزائر نیوگنی اور پلاؤ سے لے کر شرقی جزائر ہوائی وغیرہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ رقبہ جس میں یہ جزائر واقع ہیں براعظم یورپ سے بڑا اور ہندوستان سے تین گنا ہے۔ البتہ ان جزائر کا اپنا رقبہ بہت کم ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ ان کا کل رقبہ صوبجات مدراس، بمبئی، بنگال، پنجاب اور آگرہ اور اودھ کے کل رقبہ کے برابر ہے۔ ان جزائر کی آبادی بھی بہت کم اور چھدری ہے۔ کل آبادی زیادہ سے زیادہ پچیس لاکھ ہے جو صوبہ سرحد کی آبادی سے بھی کم ہے۔ ان جزائر میں سب سے گھنی آبادی جزیرہ اوردکی ہے۔ اس کا کل رقبہ ۸٫۵ مربع میل اور آبادی ۳٫۸۳ و ۳ ہے یعنی ۲۰۲٫۷ فی مربع میل۔ سب سے بڑا علاقہ ہالینڈی نیوگنی ہے لیکن سب سے زیادہ چھدرا ہے۔ اس کا رقبہ تو ایک لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل ہے مگر آبادی چار لاکھ سے بھی کم ہے۔ یعنی ڈھائی فی مربع میل۔ نیوگنی کے دوسرے حصہ (جو آسٹریلیا کے قبضہ میں ہے) کا رقبہ نوّے ہزار مربع میل اور آبادی ۵۸۷٬۶۲۵ (۶٫۲۳ فی مربع میل) ہے اور پاپوا کا رقبہ نوّے ہزار مربع میل اور آبادی ۲۳۹٬۴۰۰ (۲٫۷ فی مربع میل) ہے۔ یہ اوسط تبت بلکہ آئس لینڈ سے بھی گری ہوئی ہے اور دنیا کے سب سے کم آباد ملکوں لیبیا اور جنوب مغربی افریقہ سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

یہ جزائر اتنے بنجر نہیں ہیں جتنا کہ آئس لینڈ یا تبت یا لیبیا ہے۔ ان جزائر کی دوری کے باعث ان کی بے پناہ قدرتی ثروت کی طرف ہم جو لوگ متوجہ نہ ہو سکے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یورپی اور دیگر اقوام ان جزائر سے ناآشنا تھیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تقریباً سب یورپی اقوام کبھی نہ کبھی ان جزائر پر حکمران رہی ہیں۔ برطانیہ نے سترھویں صدی کے اوائل میں ان جزائر میں دلچسپی لینی شروع کی۔ پہلی عالمگیر جنگ کے اختتام پر جرمنی کے مقبوضہ جزائر ہتھیا لینے کے بعد سے جاپانی جنوبی جزائر میں آباد ہونے لگے۔ چینی مہاجر بھی ان سب جزیروں میں پائے جاتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے سانحہ پرل ہاربر سے پہلے ہی سے ان جزائر میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ بلکہ تجویز تھی کہ جزیرہ ہوائی کو ریاستہائے متحدہ امریکہ کی انچاسویں ریاست قرار دیا جائے۔ برطانوی ہند نے جزیرہ فجی کو آباد کرنا شروع کیا اور اب وہاں تقریباً ایک لاکھ ہندوستانی آباد ہیں۔ اس جنگ سے قبل ان جزائر پر سات مختلف ملکوں یعنی برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا، ہالینڈ، جاپان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا تسلط تھا۔ رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا حصہ آسٹریلیا کے پاس ہے۔ اس علاقہ کا رقبہ ۱۸۳٬۵۴۸ مربع میل اور آبادی ۹۳۰٬۰۰۰ سے زائد ہے۔

تجارت

شروع میں بیرونی بیوپاری مبادلہ کیا کرتے تھے لیکن ۱۹۳۸ء میں ان جزائر کی مجموعی تجارت کی مالیت ۱۱۵ کروڑ روپیہ تک پہنچ گئی تھی۔ جس میں چھپن کروڑ تو درآمد کی مالیت تھی اور بقیہ برآمد کی۔ اس تجارت میں بیشتر حصہ جزیرہ ہوائی کا تھا جو ان جزائر میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس جزیرہ کی تجارت کو چھوڑ کر باقی جزائر کی مجموعی تجارت کوئی بتیس کروڑ روپیہ کی رہ جاتی ہے۔ ان جزائر کی تجارت میں ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ حکمران ملک تک محدود نہیں ہے جغرافیائی اور دیگر عناصر نے ان جزائر کی معاشیات کو پردیسی رنگ دے دیا ہے۔

ان جزائر سے سب سے زیادہ نکاس ناریل (کھوپرا) کی ہے ۱۹۳۸ء میں ۲۱۴٬۰۰۰ ٹن کھوپرا برآمد ہوا۔ کھوپرا ان جزائر کی سب سے بڑی زراعتی پیداوار ہے۔ اس کے بعد شکر ہے جو زیادہ تر فیجی، ہوائی اور جاپان کے مقبوضہ جزائر میں بویا جاتا ہے۔ قہوہ کی کاشت تو شروع ہی میں ہونے لگی تھی لیکن تجارت کے لحاظ سے اس کی اہمیت بہت کم ہے۔ میوہ بھی بڑا ذریعہ آمدنی ہے۔ کیلا اور اناناس بھی کثرت سے ہوتا ہے۔ اور ان دونوں پھلوں کی وجہ سے گذشتہ دس برس میں یہ جزائر دنیا سے بخوبی روشناس ہو گئے۔ جزیرہ پٹکیرن میں بڑا ذریعہ معاش سنگترہ ہے۔

گذشتہ بیس برس میں ان جزائر کے حالات بہت کچھ بہتر ہو گئے ہیں اور مزید ترقی کی کافی گنجائش ہے۔ نیوگنی، پاپوا اور جزائر سلیمان میں بہت سے وسیع رقبے ہیں جہاں مطلق کاشت نہیں ہوتی ہے۔ دوسرے جزیروں میں بھی زیادہ استفادہ کی گنجائش ہے۔ ناریل کے پیڑ پرانے ہو گئے ہیں اور نئے پیڑ لگانے کی ضرورت ہے۔ بہت سے جزیروں میں ناریل کی نئی کاشت ہو رہی ہے لیکن ابھی کم ہے۔ ابھی تک ناریل کے گودے کو ٹین کے ڈبوں میں بند کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ ویسی خوراک یہی ہے۔ اس کا ذائقہ اتنا اچھا اور غذائیت اتنی زیادہ ہے کہ یہ ایک نہایت منفعت بخش صنعت بن سکتی ہے۔

پھلوں کی صنعت کو اگر پوری توجہ اور انہماک سے ترقی دی جائے تو ان جزائر کی معاشیات میں کایا پلٹ ہو سکتی ہے۔ ان جزائر میں پھلوں کا وہی مرتبہ ہے جو انگلستان میں کوئلہ کا ہے۔ پھلوں کو ڈبوں میں بند کرنے کی صنعت ۱۸۹۲ء میں شروع ہوئی اور پھلوں کی کاشت برابر بڑھتی رہی ہے۔ جزائر ہوائی، فیجی، غربی ساموا اور ٹونگا میں اناناس کی صنعت بہت زیادہ ہے اور جزائر نیو اور ٹونگا میں کیلا اور لیمو وغیرہ

کی۔ وسائل حمل ونقل بہتر ہو جائیں تو پھلوں کو ڈبوں میں بند کرنے کی صنعت بہت ترقی کر جائے گی اور دیسی آبادی جس کا زیادہ تر کاروبار پھلوں کی کاشت ہے بہت فائدے میں رہے گی۔ نکاس کی غرض سے ترکاریوں کی کاشت صرف جزائر ہوائی اور لنک میں ہوتی رہی ہے اور اس میں کامیابی کی بہت امید ہے۔ آلو ہوتا تو ہے لیکن اتنا نہیں کہ برآمد کیا جا سکے۔

معدنیات

زراعت سے زیادہ معدنیات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ نیوگنی میں سونا، کوئلہ، تانبا، چاندی، پلاٹینم، لوہا، پنسل کا سرمہ اور دیگر بہت سی دھاتیں پائی جاتی ہیں اور فرانسیسی جزیرہ نیوکیلیڈونیہ میں نکل، کروم، لوہا، منگنیز اور کوبالٹ۔ ان کے علاوہ تانبا، سرمہ، شنگرف، چاندی، سیسہ اور کوئلہ بھی دستیاب ہوتا ہے۔ جزائر نیو ہیبرڈیز میں سونا، کروم، لوہا، منگنیز، تانبا، گندھک اور کوبالٹ کا بھی سراغ ملتا ہے لیکن ابھی تک کانکنی شروع نہیں ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جزائر سلیمان میں سونا، تانبا، جست، ابرک، پائیٹ، پھٹکری، دودھیا شیشہ اور گندھک بھی موجود ہے۔ لیکن دھاتوں کے یہ وسیع منابع ابھی تک تشنۂ توجہ ہیں۔ ان کے علاوہ اور دھاتیں بھی ہیں جن کا جاپانیوں نے پتہ چلایا تھا اور جن سے انھوں نے جنگ کے دوران میں بہت کام لیا۔

ان میں سے بعض دھاتیں بذریعہ کانکنی نکالی گئی ہیں لیکن اس ضمن میں مزید ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ ۱۸۸۸ء سے سونے کی کانکنی ہوتی آئی ہے پھر بھی جزیرہ پپوا میں سونے کے بہت سے ذخیرے ہیں جن تک ابھی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ جزیرہ نیوکیلیڈونیہ میں نکل اور کروم کی کانکنی انیسویں صدی کے اواخر سے ہو رہی ہے لیکن کچھ عرصہ ہوا یہ تخمینہ کیا گیا تھا کہ اس جزیرہ میں ابھی دو کروڑ ٹن نکل اور بیس لاکھ ٹن کروم زمین کے اندر موجود ہے۔ فاسفوری نمک نے ناورا جیسے چھوٹے جزیرے کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جزائر ناورا اور اوشن میں دس کروڑ ٹن فاسفوری نمک موجود ہے جس میں سے ۱۹۳۹ء تک صرف ساٹھ لاکھ ٹن نکالا جا چکا تھا۔ دس لاکھ ٹن فی سال کے حساب سے سارا نمک نکالنے کے لئے ایک صدی درکار ہے۔ جزائر مکاٹیا اور رانگور میں بھی کم از کم ایک کروڑ دس لاکھ ٹن فاسفوری نمک محفوظ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا کے کل کروم کا گیارہ فیصدی اور نکل کا بارہ فیصدی اور چالیس لاکھ ڈالر کا فاسفوری نمک (سونے اور دوسری دھاتوں کے علاوہ) ان جزائر سے دستیاب ہوتا ہے۔

تیل

تیل جس نے اقوام متحارب کی قسمتوں کا فیصلہ کیا ہے ان جزائر میں بھی پایا جاتا ہے۔ برطانوی، ہالینڈی اور امریکی کمپنیوں نے نیوکیلیڈونیہ میں کچھ عرصے سے تیل نکالنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ نیوگنی میں سب سے زیادہ تیل کی توقع کی جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر تیل کی صنعت کو پوری ترقی دی گئی تو یہاں کی پیداوار بونیو سے ٹکر لینے لگے گی۔ ایسی صورت میں فضائی سفر اور بہت سی دوسری صنعتوں کو بڑی مدد ملے گی۔ ذرائع حمل ونقل کے بڑھنے سے ملکی تجارت بہت بڑھ جائے گی۔ معدنیات کا حمل ونقل ابھی تک تو ہوائی جہازوں کے ذریعے ہو رہا ہے لیکن تیل کثرت سے پیدا ہونے لگے تو ہوائی جہاز دیگر پیداوار کے لانے لیجانے میں بھی کام آسکیں گے۔ ایسے گرم منطقوں میں بیماری اور جنگل کثرت سے ہوتے ہیں۔ پپوا، نیوگنی اور ہالینڈی نیوگنی کے کارآزمودہ سپاہی ان مشکلات کے رفع کرنے میں مدد کر سکتے ہیں۔

یہ ہیں ان جزائر کی آئندہ ترقیات کی صورتیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان جزائر میں وہی گذشتہ اعلیٰ تمدن اور وہی وسیع شہر پھر ظہور میں آسکیں گے جن کے آثار اب بھی بعض جزیروں میں پائے جاتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ان جزیروں میں سے بعض براعظم ایشیا کا جزو تھے اور اس براعظم کے تمدن سے متمتع تھے۔ اب یہ جزیرے دنیا سے الگ تھلگ ہیں گو جدید ذرائع آمد ورفت کے بڑھ جانے سے یہ پھر براعظم سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ نئی دنیا کو پرانی سے ملانے میں ان جزائر کو بڑا دخل ہوگا۔ اگر پریزیڈنٹ تھیوڈور روزویلٹ کی یہ پیشگوئی پوری ہوگئی کہ تاریخ بشر بحیرۂ روم سے شروع ہوکر بحر اوقیانوس سے ہوتی ہوئی اب بحر الکاہل میں داخل ہو رہی ہے" تو ان جزائر کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی۔ (فار ایسٹ بلیٹن سے ماخوذ)

انوارِ سحر

جناب کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب سحر سے پہلے پہل جے پور کے مشاعرے میں ملنے کا اتفاق ہوا پھر دلی کے اس غیر طرحی مشاعرے میں بھی ملاقات ہوئی جو میرے دلی جانے پر دھرم شالہ میں ہوا تھا ان مواقع کے علاوہ میری نظر سے اکثر ان کا کلام رسالوں میں گذرتا رہتا ہے اور میں نہایت ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں۔ خدا کا شکر ہو کہ موجودہ مذاقِ سخن کی بے راہ روی سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اہم اور سخت ذمہ داریوں پر وہ کیونکر شعر کہہ لیتے ہیں کیونکہ شاعری کے لئے بہت ضرورت ہے کہ انسان مطمئن ہو اور کسی حد تک ذمہ داریوں سے بھی الگ رہے۔ مجھے ان کے ذاتی وقار سے کوئی تعلق نہیں اس کو تو سب جانتے ہی ہیں کہ وہ اس وقت ایک ممتاز عہدے پر فائز ہیں لیکن جس نے مجھے اظہارِ خیال پر مجبور کیا وہ ان کی ایک غیر مردّف غزل ہے جو "آج کل" دلی کے سال نامہ میں شائع ہوئی ہے اس غزل کو میں نے کئی بار پڑھا اور ہر بار ایک نیا لطف میرے دل نے اٹھایا۔ مطلع ہے ؎

حسن کو مطلق نہیں ہے ثبات
عشق آیا ہے پی کے آبِ حیات

فی الحقیقت عشق کے مقابلے میں حسن کو ثبات نہیں حسن کیا ہے ایک ڈھلتی دھوپ یا بدلتی ہوئی چھاؤں ہے۔ جو چیز آج حسین نظر آتی ہے وہ کچھ دنوں کے بعد حسن زائل ہونے پر بے کار معلوم ہوتی ہے لیکن عشق کی یہ صورت نہیں عشق کا تو ہمیشہ ایک حال رہتا ہے۔ اس مضمون کے ادا کرنے کو کیا اچھے اچھے الفاظ ملے ہیں دوسرے مصرعہ کی بلاغت کو کہاں تک سراہا جائے۔ عشق آبِ حیات پی کے آیا ہے اس ندرتِ خیال کو دیکھنا چاہئے۔

ہجر میں یوں گذرتے ہیں لمحات
اک نفس موت ہے تو ایک حیات

عاشق کو ہجر میں جو تکلیف ہوتی ہے وہ پوشیدہ نہیں لمحات کی کشمکش کوئی اس سے پوچھے جس کو اس کشمکش سے سابقہ پڑ چکا ہو کشمکش کا لفظ مطلع میں نہیں مگر ہونے کے برابر ہے کشمکش یا امید و بیم میں یہی انسان کا حال ہوتا ہے کہ کبھی زندگی کا خیال آجاتا ہے اور کبھی یہی زندگی کا خیال بدل کر موت کا تصور یا گمان بن جاتا ہے ان باتوں پر لحاظ کرتے ہوئے کیوں نہ اس مطلع کی داد دینے پر وہ لوگ مجبور ہوں جو ماہرانِ فن ہیں اور شعر کو پرکھنا جانتے ہیں

عشق ہے مشعلِ نظر ورنہ
زندگی کیا ہے اک اندھیری رات

سبحان اللہ سبحان اللہ کیا شعر کہہ دیا ہے زندگی کو اندھیری رات قرار دے کر عشق کو مشعلِ نظر قرار دینا کس قدر لگتی لگاتی بات ہے دنیا میں زندگی کو اصولاً اگر کوئی چیز روشن کر سکتی ہے تو وہ عشق کی مشعل ہے۔ اگر اندھیری رات میں کوئی روشنی موجود نہ ہوئی تو کس قدر تکلیف دہ صورت سامنے ہوگی اس شعر کی خوبیاں مکمل طور سے ظاہر کی جائیں تو کئی صفحوں پر بھی تمام و کمال نہیں سما سکتیں۔

عقل کی استقامتیں تسلیم
لغزشِ بے خودی بھی ہے اک بات

دوسرا مصرعہ نہیں قیامت ہے قیامت اس حسن بیان کے قربان جائیے عقل کی استقامت کو مانتے ہوئے لغزشِ بے خودی کو بھی کسی قدر اہمیت دیدی ہے لغزش حالانکہ لغزش ہے مگر تخیل اور خوبیٔ بندش نے اس لفظ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا صرف لغزش نہیں کہا بلکہ لغزشِ بے خودی کہا ہے پھر شعر کو پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

مرگ کیا ہے ممات خواہشِ زیست
زندگی کیا ہے آرزوئے حیات

دنیا میں مرگ و حیات کے علاوہ تیسری کوئی ایسی چیز نہیں جو مقابلے میں پیش کی جا سکے لہٰذا ان دونوں کی حقیقت کس خوبی سے بیان کی گئی ہے دونوں مصرعے بتلاتے ہیں کہ مرگ و حیات کیا ہے اتنے بڑے مضمون کو ان مختصر لفظوں میں کہہ دینا کوئی آسان بات نہیں یہ شعر جس کو سنا دیا جائے وہ خود سمجھ لے گا کہ مرگ و حیات کا فلسفہ کیا ہے۔

؎ جو نہ حاصل ہوئی فرشتوں کو درحقیقت ہے عشق وہ سوغات

اس شعر کا لطف اہلِ ذوق خاص طور سے اٹھا سکتے ہیں عشق کے مراتب ایسے ویسے نہیں کہ سب لوگ واقف ہو جائیں یا عشق ایسی سوغات نہیں جو ہر کس و ناکس کو مل جائے یہ تو وہ چیز ہے جو بشر کیا فرشتوں کو بھی نہ حاصل ہوئی یعنی اس کے قابل فرشتے بھی نہیں سمجھے گئے شعر کے مفہوم سے اندازہ کرنا چاہئے کہ اللہ اللہ عشق کا رتبہ کتنا بلند ہے۔

؎ کشتگانِ ستم کو خوش خبری اشکِ غم ہے شریکِ آبِ حیات

بعض شعر ایسے ہوتے ہیں کہ دل لطف اٹھاتا ہے زبان مفہوم کو پورے طور سے ادا نہیں کر سکتی آبِ حیات میں اشکِ غم شریک ہیں اسلئے کشتگانِ ستم کو خوشخبری دیجاتی ہے کشتگانِ ستم کیلئے اشک کیسے ہوا اشکِ غم جو شریکِ آبِ حیات یعنی زندگی عشق بخشنے والے ہیں کیوں نہ خوشخبری پر مجبور کریں یہ الفاظ نہیں نگینے ہیں جو اپنی اپنی جگہ چمک رہے ہیں۔

خلد پرور ہے ہر نگاہِ سحر
یہ خطِ جام ہے کہ راہِ نجات

اس تمام و کمال غزل میں پہلے مصرعہ کے علاوہ بھی جتنے دوسرے مصرعے ہیں وہ کڑی کمان کے تیر ہیں خطِ جام کو راہِ نجات کہہ دینا بالکل جدید تخیل ہے اسکی داد کہاں تک دیجائے پھر پہلے مصرعے میں خلد پرور کی ترکیب مجبور کر رہی ہے کہ تعریف کے جاؤ اور کبھی خاموش نہ ہو۔

الغرض یہ غزل مجھے اس قدر پسند آئی کہ بغیر کسی تحریک و مقصد کے یہ چند سطریں مجھ سے میرے دل نے لکھوائیں اور میں لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

نوح ناروی

چھانگی شا

لڑائی جھگڑا ہو یا امن و عافیت، اسے اپنی نیند سے سروکار ہے۔

چینی کے برتن بیچنے والے کی دوکان لڑائی سے قبل خو
سجی ہوئی تھی۔

ایک تجارتی عمارت کے سامنے پوشیدہ طور پر ایک توپ لگا کر

برطانیہ کے شاہی محلات

سینٹ جیمز پارک کی جھیل کے کنارے «قصر بکنگھم» کا ایک لطیف نظارہ ←
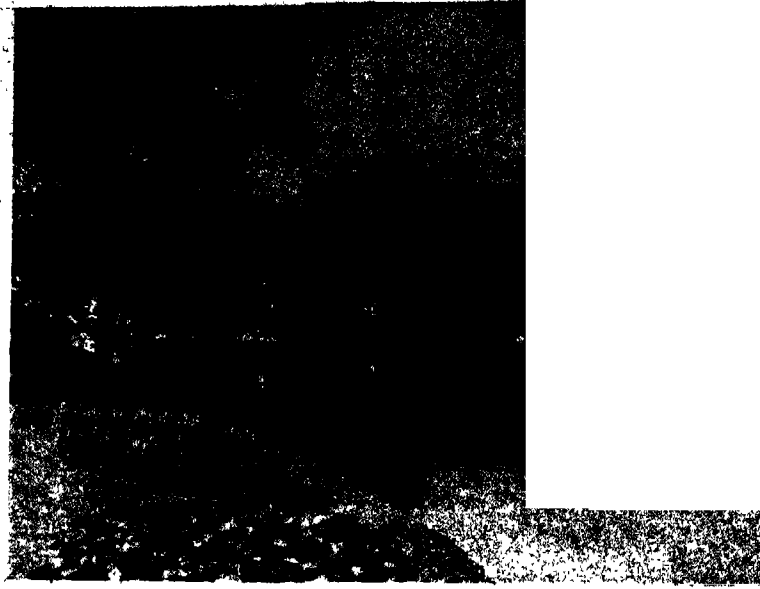
ر فوک کے شہر سندر نگھم میں
ک اور عظیم الشان شاہی محل۔

یچھے) گیارھویں صدی عیسوی میں
رمن بادشاہ ولیم اول نے لندن
ے دریائے ٹیمز کے کنارے اس
قصر ونڈسر» کی بنا ڈالی. آجکل
س میں ہز مجیسٹی شاہ جارج
شم اور ملکہ الیزبتھ قیام پذیر
یں۔ اس تصویر میں دائیں طرف
ینٹ جارج کا گرجا نظر آرہا ہے.
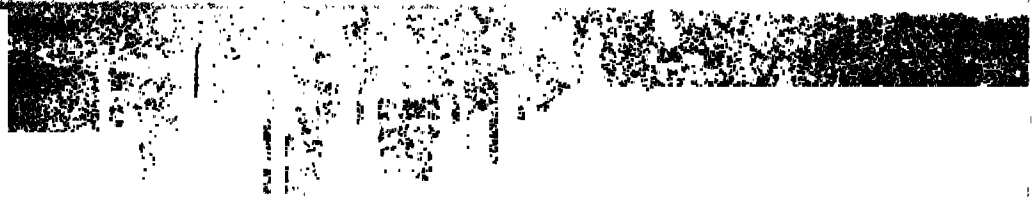
قدیم افغان آرٹ

۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کے «آجکل» میں قدیم افغان آرٹ کی اجمالی تاریخ پیش کی جاچکی ہے۔ ظہور اسلام سے پہلے کی نقاشی کے بعض نمونے صدیاں گذر جانے کے باوجود ابتک اچھی حالت میں موجود ہیں۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے فنون لطیفہ پر بدھ مت کا اثر کس درجہ حاوی تھا۔

فندکستان میں کھدائی کے بعد ایک بدھی خانقاہ سے اس مجسمے کو برآمد کیا گیا ہے۔ اسے دیکھنے سے ساتویں صدی کی پارچہ بافی او زیور سازی کے کئی پہلوؤں پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

اس تصویر کے نقش و نگار دیکھکر اجنتا کے غاروں کی نقاشی یاد آجاتی ہے۔

پہلی یا دوسری صدی میں یہ تصویر ہاتھی دانت کے ایک ٹکڑے پر بنائی گئی تھی۔ یہ بگرام کے آثار قدیمہ سے برآمد ہوئی ہے۔

حیدرآباد کے ایک بڑے بازار کا عام نظارہ

ہندوستان کے اس عظیم الشان شہر کو قطب شاہی خاندان کے پانچویں بادشاہ محمد قلی نے ۱۵۸۹ء میں دکن کے دریائے موسی کے کنارے آباد کیا تھا. اسکے گرد پتھر کی پختہ فصیل ہے جو نظام اول کے عہد میں تیار ہوئی تھی۔ حیدرآباد خاص سے پانچ میل جانب غرب گولکنڈہ کا قلعہ اور شہر کی شکستہ حال عمارتیں ہیں۔ گولکنڈہ [illegible] دکن کی زبردست سلطنت کا صدر مقام تھا۔ مسلسل محاصروں، لڑائیوں اور قتل و غارت کے ہنگاموں نے اسکی شان و شوکت کو خاک میں ملا کر رکھدیا۔ اب اسمیں شاہی خزانہ اور جیل خانہ ہے۔ موجودہ حیدرآباد کی سج دھج اسقدر شاندار اور پرشکوہ ہوگئی ہے کہ اسے پچھلے آثار سے کسی قسم کا تعلق نہیں رہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ موجودہ فرمانروا کے زریں عہد میں شہری زندگی میں نت نئی ترقیاں رو نما ہوتی رہی ہیں اور [illegible] سی ترقیوں کا امکان ہے۔

حیدرآباد دکن

اجنتا کے ایک غار کا اندرونی منظر دیکھئے۔ نقاشی کے نمونے قابل دید ہیں۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے چند طلبا چھٹی ہونے کے بعد صدر دروازے سے نکل رہے ہیں۔

اٹھارویں صدی کی بنی ہوئی ایک شاندار مسجد جس کے صحن کے تین طرف آہنی کٹہرا لگا ہوا ہے۔
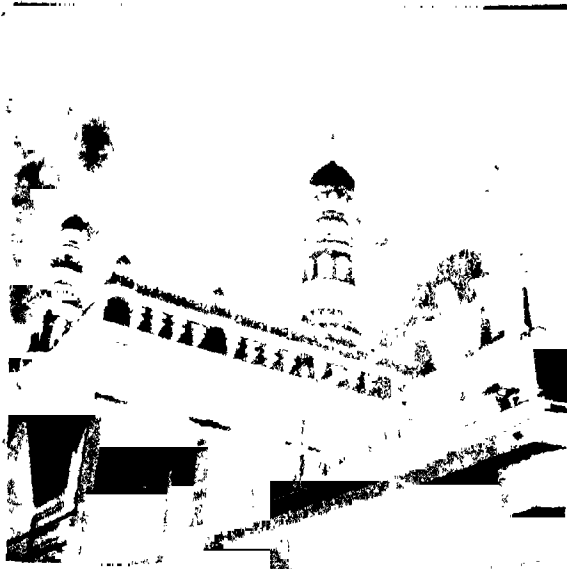
قدیم قلعہ گولکنڈہ کا ایک عبرت ناک منظر جس کے کھنڈر قدیم عظمت کی یادگار ہیں۔

شہاب ثــاقب

ایک شہاب ثاقب کی
اندرونی ساخت

اس تصویر کے بیچ میں شہاب ثاقب کے آہنی ذرے
ہیں جنکو خوردبین کے ذریعہ بڑا کرکے دکھایا
گیا ہے۔ ادھر ادھر خاک کے ذرے ہیں۔ دونوں
کا درمیانی تناسب قابل غور ہے۔

اقبال مرحوم نے فرمایا تھا۔
«ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں»
اس صفحہ کی تصویریں اسی خیال کا
ثبوت ہیں۔ «شہاب ثاقب اور سنگ شہابی»
پر ایک بسیط مقالہ صفحہ ۴۴ تا ۴۶
ملاحظہ ہو۔

چودہ سو پونڈ کا ایک
پتھر جو امریکہ کے ایک
شہر میں گرا تھا۔

↑ ہیلے کا دمدار ستارہ جو ۴ مئی
۱۹۱۰ء کو یرکیز کی رصدگاہ
سے نظر آیا تھا۔
ہیلے کا دریافت کیا ہوا دمدار
ستارہ جو سفید خطوط کے
درمیان نظر آرہا ہے۔ →

قاهرہ کے مناظر

یہ بچے ہنستے ہنساتے چڑیا گھر کی طرف
جا رہے ہیں

ایک دیہاتی خاندان کے لوگ چڑیا گھر کی سیر کر رہے ہیں

چند دیہاتی لڑکے ایک صاف ستھرے شربت فر-
سے باتیں کر رہے ہیں
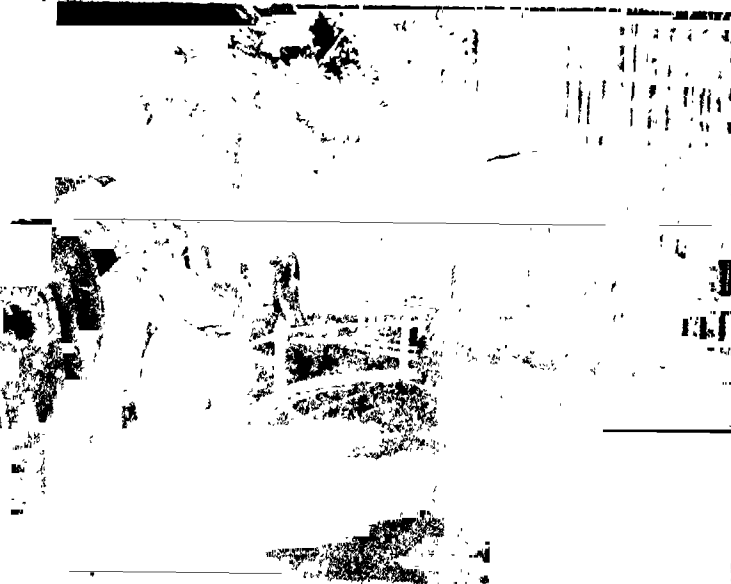
ہر سال پگھلی ہوئی برف کے پانی سے
دریائے نیل خوب لبریز ہوتا ہے اور عمدہ فصل
کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں تو آس پاس کے
دیہاتی اور کسان ایک خاص تہوار منانے کیلئے
ہرہ آتے ہیں۔ اس تہوار کو باقی تمام دیہاتی
واروں پر فوقیت حاصل ہے۔ اس موقع پر
ہر کے اکثر مقامات خصوصاً چڑیا گھر کی
وب سیر کی جاتی ہے۔ قاهرہ کا چڑیا گھر
شرق کے چڑیا گھروں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

چند خوش پوش دیہاتی لڑکے شیروں کے
پنجرے کے سامنے کھڑے ہیں۔

ثریا — ایک فلمی ستارہ

آغا حشر کاشمیری حقیقت کی روشنی میں

عشرت رحمانی

ہر نفس سے بربط گیتی پہ ہوں مضراب زن اضطراب برق ہے اک رقص مستانہ مرا

تحریر و تقریر کی بڑائی ثابت کرنیکا ایک ذریعہ عوام میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی بڑے آدمی کے مشہور مقولہ کو زیب عنوان بنا لیا جائے۔ اسی طرح بعض حضرات اپنی شخصیت کی بڑائی کیلئے کسی مشہور ہستی سے ذاتی واقفیت یا وابستگی کا اظہار کرکے اپنی بلندی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں طرح طرح کی افسانہ طرازیاں فرمانے میں بھی انہیں مطلق پس و پیش نہیں ہوتا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل شخصیت کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں عوام میں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور حقیقت کا کوئی رخ بھی ہمارے سامنے نہیں آنے پاتا۔ انہیں غلط فہمیوں کی بنا پر ہمارے ادب کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ تاریکی میں ہے۔ اور اس "ذاتی واقفیت" کی بیجا تا واقفیت نے بہت سی ہستیوں کو عجب عجب رنگ میں پیش کر رکھا ہے۔ آغا حشر کاشمیری کی وفات کو مشکل سے دس سال ہوئے ہیں لیکن انکی شخصیت، علمی قابلیت اور ذاتی حالات کے بارے میں اسقدر غلط تحریریں بعض نامنصف حضرات کی کوششوں سے عوام کے سامنے آئیں کہ انہیں دیکھکر ایک واقف انسان افسوس کے ساتھ حیرت میں رہجاتا ہے کہ آغا صاحب مرحوم جو دس سال پہلے ہم میں تھے، ان کا ظاہر و باطن انکے جاننے والوں کے سامنے تھا، انہوں نے اپنی زندگی کا کوئی پہلو کسی سے پوشیدہ نہ رکھا۔ ان کے واقف حضرات اور احباب کی ایک بڑی تعداد اب بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کا بھرا پرا خاندان بفضلہ سلامت ہے۔ خاندان کے اکثر افراد تعلیم یافتہ اور خوش حال ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی خدانخواستہ کس مپرسی کی زندگی میں نہیں، جو ان بر خود غلط شہرت پسند حضرات کے بیانات نہ پڑھ سکے۔ لیکن اس کے باوجود اس غلط جرأت پر حیرت ہوتی ہے کہ کس کس طرح ایک باکمال ہستی پر بہتان تراشے جاتے ہیں اور ان افسانہ طراز حضرات میں سے اکثر کو یہ بھی نہیں معلوم کہ آغا صاحب مرحوم کی پیدائش کہاں ہوئی اور ان کے خاندان کے افراد کون کون اور کہاں کہاں ہیں۔ اگر انہیں اسکا بھی علم ہوتا تو شاید وہ ایسی جرأت نہ کرتے۔ اس قسم کے مضامین کی اشاعت سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ ہمارے اس دور کا ایک بلند پایہ اہل کمال اس طرح بعض ناواقف حضرات کے ہاتھوں غلط فہمیوں کا نشانہ بنجائے، اور عوام میں غلط حالات کی ترویج ہوتی رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ غلط فہمیاں اصلیت کا روپ اختیار کرلیں گی، اور حقیقت پر پردے پڑ جائینگے۔ افسوس ہے کہ آغا صاحب مرحوم کے چند مخلص دوست جو تھوڑی مدت پہلے ہم میں تھے اب وہ بھی نہ رہے۔ اگر ان کے قلم سے آغا صاحب کے سوانح حالات شائع ہو جاتے تو اس قسم کی بے بنیاد لغویات کی اشاعت نہ ہو سکتی۔

تاہم ان کے خاندان کے اکثر ذمہ دار حضرات موجود ہیں اور ان کے اصلی واقفین میں سے چند ہستیاں اب بھی ہیں۔ جن میں سے خصوصیت سے ذکر کے قابل خان بہادر حکیم احمد شجاع سکریٹری لیجسلیٹو اسمبلی (پنجاب)، سید امتیاز علی تاج (لاہور)، مرزا عباس بیگ مختار (بنارس) حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی، پنڈت نرائن پرشاد بیتاب ڈرامہ نسٹ، سید محمد تقی خسرو، سید جمیل مظہری، محمود طرزی صاحبان (اور چند دیگر اصحاب) ان حضرات نے آغا صاحب کو بڑی حد تک قریب سے دیکھا اور ان کی زندگی اور کمالات سے بہت کچھ واقف ہیں۔ خاندانی افراد میں سے خصوصاً آغا محمود شاہ کاشمیری (برادر آغا حشر مرحوم) مولانا آغا محمد عبد القدوس کاشمیری۔ آغا محمد جمیل احمد شاہ نشتر کاشمیری اور ان کے برادران۔ افسوس کہ ان کے مخلص احباب خصوصی میں سے حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم، شیخ عبد اللطیف تپش مرحوم، بھیا عنایت دہلوی مرحوم اب زندہ نہیں۔ جو ان کے صحیح معنوں میں سوانح نگار ہو کے جائز حقوق ادا کر سکتے تھے۔

راقم الحروف کو زیادہ قریب کا شرف حاصل نہیں تاہم آغا صاحب مرحوم جہاں جہاں رہے ایک بار سے زیادہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فن ڈرامہ کے بارہ میں گفتگو کرنیکا کئی بار موقعہ ملا۔ میں ان کے فنی کمالات سے بخوبی واقف تھا۔ انہیں ڈرامہ لکھاتے اور ڈائرکٹ کرتے کئی بار دیکھا۔ فنی باریکیوں پر بحث کرتے سنا لیکن جو دعوے اب تک اکثر مضمون نگار اور مقررین حشر نے ذاتی واقفیت کے کئے ہیں میں ایسے محروم ہوں۔ اور مجھے ایسی کوئی واقفیت حاصل نہ ہو سکی۔ ان کے تمام قریبی احباب سے اچھی طرح واقف ہوں ان کے اعزاز سے یگانگت کے تعلقات ہیں۔ میں نے آغا صاحب مرحوم کو دیکھا اور جب تک دیکھا وہ ان کے عروج اور بلندی کا ہی دور تھا

> عشق نے غالبؔ نکما کردیا ؎ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ شعر صرف آغا صاحب کو دہراتے ہی نہیں سنا بلکہ اس کے ثبوت میں کسی کے پائے ناز پہ حشر کا سر نیاز رکھا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جب کہ عشق کے آنسو حشر کو ہی بیتاب نہیں کئے ہوئے تھے بلکہ دیکھنے والے کو بھی رلا رہے تھے۔ یہ کلکتہ کی زندگی کے دور کی ایک جھلک تھی۔ مضمون نگاروں نے آغا حشر مرحوم پر قلم اٹھایا اور سینکڑوں غلط بیانیوں کے طومار سے انصاف کا خون بہایا، انہوں نے کبھی یہ کوشش بھی نہ کی کہ آغا صاحب مرحوم کے کسی واقف دوست یا عزیز سے ہی استصواب کرلیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا کوئی جمیل صاحب ہیں۔ انہوں نے حیات حشر پر ایک کتاب مرتب کر ڈالی۔ مگر حسب تول کتاب کے مضامین غلطیوں کے ڈھیر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح دہلی کی مشہور رسالہ "آجکل" کی اشاعت ۱۵ مئی ۱۹۴۵ء میں ایک مضمون میری نظر سے حال ہی گذرا جسے پڑھکر میں یہ مختصر مقالہ لکھنے پر مجبور ہوا جس کے دیکھنے کے

فاضل مقالہ نگار مگبشوسناتھ صاحب بیتاب بریلوی کا پرزور دعویٰ ہے کہ یہ مقالہ ان کی ذاتی معلومات کا نچوڑ ہے۔ ہم بیتاب صاحب کے اس مضمون کے کچھ حصے یہاں نقل کرکے انکے مقابلہ میں حشر کی زندگی کے ماخوذ و صحیح واقعات لکھتا ہوں جو محض اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر نہیں بلکہ آغا صاحب مرحوم کے اہل خاندان سے ضروری تصحیح کرنے کے بعد شائع کرنے کی جرأت ہوتی ہے۔

جناب بیتاب بریلوی کا مضمون "میتھو آرنلڈ" کے ایک بڑے مقولے سے شروع ہوتا ہے کہ "دنیا میں کچھ ہی لوگ بڑے کام کرنے کیلئے ہوتے ہیں اور وہ اپنے کارناموں کی بدولت بڑے آدمی بنتے ہیں"۔ آغا حشر مرحوم بھی ایسے ہی ایک بڑے آدمی تھے (بحوالہ شعلہ) اسکے بعد فرماتے ہیں۔

"ان کی پیدائش (یعنی آغا حشر مرحوم کی) کا فخر سرزمین پنجاب کو حاصل ہے۔ لیکن ان کے بزرگوں کا وطن کشمیر تھا"

حالانکہ اصلیت یہ ہے کہ آغا محمد شاہ (حشر کاشمیری) کی پیدائش شہر بنارس میں پہلی اپریل ۱۸۷۹ء کو جمعہ کے دن ہوئی۔ اور جس آبائی مکان میں ہوئی وہ محلہ دال منڈی کے قریب اب بھی موجود ہے۔ ان کے والد کا اسم شریف آغا محمد غنی شاہ تھا اور ان کا مکمل شجرۂ نسب ان کے اہل خاندان کے پاس محفوظ ہے جو میں پڑھ چکا ہوں۔

بیتاب صاحب لکھتے ہیں۔

"گو آغا صاحب کی مکتبی تعلیم نہایت محدود تھی لیکن ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ اردو کے علاوہ دیگر ملکی زبانوں کے علم و ادب تک انکی دسترس تھی۔ مگر ان کی واقفیت کا ذریعہ بالعموم اردو تراجم ہی تھے"

حقیقت یہ بتانی ہے کہ آغا حشر کی خاندانی روایات کے تقاضہ کے مطابق قرآن شریف کا درس ختم کرکے انہیں فارسی عربی کی تعلیم دلائی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ بنارس کے جے نرائن ہائی اسکول میں انگریزی کی (مکتبی) تعلیم کا آغاز ہوا۔ انہوں نے اپنی فطری ذہانت کے تقاضہ سے عربی فارسی میں اوائل عمر میں ہی مہارت حاصل کرلی۔ لیکن انگریزی کی درسی تعلیم باقاعدہ آٹھویں جماعت تک حاصل کرسکے۔ گو انگریزی زبان کی کامل مہارت حاصل نہ ہوسکی۔ تاہم جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس دور کی آٹھویں جماعت کا معیار آجکل کے مقابلہ میں کتنا اونچا تھا۔ اور اس لحاظ سے ان کی ہمہ گیر طبیعت نے اس میں کوئی دشواری محسوس نہ کی کہ جب وہ اسکول چھوڑ کر درس تدریس کی جکڑ بند سے اپنے ذاتی مطالعہ میں مصروف ہوئے تو ملکی اور غیر ملکی زبانوں کو سیکھنے اور ان کے علم و ادب تک دسترس حاصل کرنے میں اردو تراجم کا سہارا نہ لینا پڑا۔ بلکہ بین ثبوت موجود ہیں کہ غیر ملکی لغات کے انبار کے ضروری مطالعہ سے غیر ملکی ادب پر بھی براہ راست دسترس حاصل کی۔ یہ مان لینے میں کوئی عذر نہیں کہ آغا صاحب مرحوم کسی یونیورسٹی کے سند یافتہ زباندان نہیں تھے۔ اردو زبان پر انہیں پوری قدرت تھی اور اسکے ساتھ ہندی پر بھی۔ اور دراصل انہیں دونوں کو وہ شیر و شکر سمجھکر بول چال اور تصانیف میں استعمال کرنا مایۂ ناز سمجھتے تھے۔ وہ خالص ہندوستانی تھے اور ہندوستانی زبان کا ایک باکمال آزاد مصنف سمجھنا ہی اپنے اور اپنے وطن کے لئے فخر سمجھتے تھے۔ فطری ذہانت اور فطری قابلیت ہی ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت تھی۔ ان کے مطالعہ کی وسعت اور ہمہ گیری کا ثبوت ان کا وہ کتب خانہ تھا جس کا ایک بڑا حصہ بمبئی سے کلکتہ اور کلکتہ سے لاہور منتقل ہونے میں ضائع ہوتا رہا۔ اور بہت کچھ ان "اغیار" کی نذر ہوا جنکی بدولت جان عزیز تک نہ بچ سکی۔ تاہم باقیات الصالحات کے طور پر اب بھی کچھ حصہ بنارس کے مکان میں محفوظ ہے جس میں ملکی اور غیر ملکی زبان کے لٹریچر کی کافی کتابیں مختلف فنون (تاریخ۔ ادب۔ اسٹیج آرٹ وغیرہ) پر پائی جاتی ہیں۔ اور ان کے حاشیوں پر بے شمار نشان اور نوٹ بار بار کے غائر مطالعہ کا ثبوت ہیں۔

اس کے بعد فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں۔

"ابھی مکتب ہی میں تھے کہ ناٹک دیکھنے کی چاٹ لگ گئی۔ اور وہ گھر والوں سے چھپ چھپ کر تماشے دیکھنے لگے۔ والدین کی فہمائش پر وہ ایک روز موقع پاکر ایکٹر بننے کی دھن میں گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ کرنے کو تو انہوں نے اداکاری کا پیشہ اختیار کیا لیکن ڈائرکٹروں کی سخت گیری سے انہیں ایسی ہمت شکن ناکامی و مایوسی ہوئی کہ انہوں نے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا خیال کرکے خود کو گنگا کے دامن میں چھپانا چاہا۔ لیکن قسام ازل کو کچھ اور ہی منظور تھا ــــ چنانچہ گنگا نے انہیں اٹھاکر کنارے پر پھینکدیا"

یہ بیان پڑھنے اور سننے کے لئے کافی مؤثر ہوسکتا ہے۔ اور حشر جیسے باکمال ڈرامہ نویس کی زندگی کے کسی حصہ کو اس طرح کا افسانوی رنگ دیدینا شاید کچھ بیجا نہ معلوم ہوتا ہو۔ اور جبکہ فاضل مقالہ نویس نے حشر کو باکمال ہستی ماننے کے باوجود یہ تہیہ کرلیا ہو کہ ابتدا سے انتہا تک انہیں ایک کم حیثیت کم درجہ "پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل" قسم کے جاہل ایکٹر کے زمرہ میں شامل کردکھائیں اور یہ ثابت کریں کہ حشر ذاتی طور پر کسی خوبی یا لیاقت کے مالک نہ تھے۔ شہرت خداداد بات ہے۔ خدا نے انہیں بڑا آدمی بنا دیا دوسروں کے سہارے اور وسیلہ سے احباب یا ملازمین کی خوشہ چینی یا امداد سے ناٹک کی دنیا میں ایک حشر پیدا کیا۔ اور یہی وہ کارنامے تھے جنکی بدولت وہ بڑے آدمی بنے۔

جناب بیتاب اول تو سوانح نگاری کے فن سے ہی ناواقف ہیں۔ اپنے مضمون میں قدم قدم پر خود اپنی تردید کرتے جاتے ہیں کہیں حشر کی تنقیص ہے تو کہیں تعریف جو واقعات انہوں نے حشر کی ذات سے منسوب کئے ہیں وہ بے بنیاد ہیں۔ اپنے ہر بیان کی بے دلیل بنیاد کو مضبوط کرنیکے لئے "ذاتی واقفیت" آڑ لی ہے۔ اور اس پردہ میں قارئین کو مجبور کیا ہے کہ وہ ان کی بے بنیاد دلیلوں پر ایمان لائیں کہ "راقم الحروف کی تمام تر واقفیت کا دارومدار خود مرحوم کی بیان کردہ سرگذشت پر ہے"

معلوم نہیں بیتاب صاحب بریلوی کی ملاقات آغا صاحب مرحوم سے زندگی میں ہوئی تو کب اور کہاں ہوئی؟ بہرحال ہمیں یہ حق نہیں کہ بیتاب صاحب کی ملاقات کا بطلان کریں۔ ممکن ہے یہ بیان کسی اور وساطت سے ان تک پہنچا ہو اور راوی ضعیف ہو اور بیتاب صاحب کی خوش اعتقادی نے اسپر اعتبار کیا ہو لیکن ہمیں اسکا یقین ضرور ہے کہ ان حالات کا کوئی ٹکڑا بھی آغا صاحب مرحوم کی بیان کردہ سرگذشت پر مبنی نہیں۔

حقیقت کی داستان یہ ہے کہ جب آغا صاحب مرحوم نے آٹھویں جماعت سے تعلیم کو خیرباد کہا۔ اسوقت ان کی عمر تقریباً ۱۷–۱۸ سال کی ہوگی۔ انہوں نے ۱۸۹۷ء میں سب سے پہلا ناٹک "آفتابِ محبت" لکھا۔ جو اس عہد کے عام ناٹکوں کے انداز سے ملتا جلتا ہے۔ وہی مقفیٰ نثر اور ملی جلی نثر و نظم کے مکالمے، اشعار اور گانوں کی بہتات موجود ہے۔ اس ناٹک لکھنے کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ بنارس میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی۔ منشی احسن لکھنوی کا ناٹک "چترا بکاؤلی" اس کمپنی کا مایۂ ناز کھیل تھا۔ آغا صاحب مرحوم نے وہ ناٹک دیکھا اور اس سے متاثر ہوکر اسی انداز پر "آفتابِ محبت" لکھ ڈالا جسکے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ناٹک "چترا بکاؤلی" کا جواب تھا۔ اس تھیٹریکل کمپنی سے آغا صاحب کا کوئی واسطہ یا تعلق نہ تھا نہ انہوں نے اس میں اداکاری کی حیثیت سے کوئی حصہ لیا۔

پھر تھیٹریکل کمپنی چلی گئی۔ بات آئی گئی ہوئی۔ ناٹک کا مسودہ آغا صاحب مرحوم کے پاس محفوظ رہا۔ اپنے احباب کو سنایا اور داد لی۔ انمیں مرزا عباس بیگ اب بھی اسی محلہ دال منڈی میں مرحوم کے خاندانی مکان سے متصل سکونت پذیر ہیں۔ اس حقیقت سے باخبر ہیں۔ آغا صاحب مرحوم کو جاننے والے بخوبی واقف ہیں کہ ان کی طبیعت کی افتاد لڑکپن سے عاشقانہ رہی بقول ؎

مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

مرحوم خود اس کی تصدیق کرتے تھے اور ان کی زندگی کا ہر دور عشق و محبت کی ایک دلکش اور پرسوز حکایت دوہرا رہا ہے۔ چنانچہ اسی عرصہ میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا (جسکی تفصیل کا نہ یہاں موقع ہے اور نہ گنجائش) کہ مرحوم نے والدین کی لاعلمی میں وطن کو خیرباد کہا لیکن نہ انہوں نے باہر جاکر کہیں اداکاری کا پیشہ اختیار کیا۔ نہ ڈائرکٹروں کی سخت گیری برداشت کرنیکا موقعہ ملا اور نہ ہمت شکن مایوسی کا منہ دیکھکر گنگا جمنا یا کسی اور دریا کے دامن میں پناہ لینے کی کوئی کوشش کی۔ جو مادہ انہیں قدرت سے ودیعت ہوا تھا اور جسکے لئے قسامِ ازل نے منظوری دی تھی وہ اسی راستہ پر پہنچے۔ بنارس کے ایک پبلشر عبدالکریم خاں عرف بسم اللہ خاں کو ناٹک "آفتابِ محبت" کا مسودہ سونپا جاچکا تھا اردو پریس کی جو کس مپرسی اور اردو مصنفین کے سلسلہ میں سرمایہ دار پبلشرز کی ناحق شناسی جواب ہے اس وقت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ ایک نوخیز مصنف کی پہلی تصنیف کیلئے پبلشر مذکور نے حاتم وقت بنکر مبلغ چودہ روپے اس جواں سال ناٹک نویس کو بخشدئے اور "آفتابِ محبت" شائع ہوا۔ آغا صاحب مرحوم نے جب بنارس کو خیرباد کہکر بمبئی کی روانگی اختیار کی۔ اسوقت ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی اور یہ سنہ ۱۹۰۱ء کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ تک انہوں نے کسی تھیٹریکل کمپنی میں کسی حیثیت سے ملازمت نہیں کی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں پہلی بار پارسی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی نے انہیں ڈرامہ نویس کی حیثیت سے انتخاب کیا۔ اور آغا صاحب ملازم ہوگئے۔ اس سے پہلے سنہ ۱۹۰۱ء میں بمبئی کے قیام کے دوران میں انہوں نے ناٹک "مرید شک" لکھا۔ یہ ناٹک "آفتابِ محبت" کے انداز سے بدلا ہوا تھا۔ اس لئے ان کا پہلا دور آفتابِ محبت سے شروع ہوکر اسی پر ختم سمجھنا چاہئے۔ دوسرے دور کے ناٹکوں میں "مرید شک"، "اسیر حرص"، "صید ہوس"، "خوبصورت بلا" اور "سفید خون" وغیرہ ہیں۔ جناب بیتاب نے آغا صاحب مرحوم کے ذاتی حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ

"وہ بڑے فخر کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرتے تھے کہ انہوں نے ناٹک نویسی کا درس اولیں چترا بکاؤلی کے مصنف سے لیا ہے مرحوم ان کا بھلا سا نام بتلاتے تھے جو اسوقت یاد نہیں آتا۔ اور یہ بھی فرماتے تھے کہ وہ بریلی کے ساکن تھے۔ کٹرہ مان رائے میں کسی جگہ ان کا مکان تھا۔ اپنے ابتدائی زمانہ میں لالہ روشن لال مرحوم رئیس اعظم کی کمپنی کے روحِ رواں تھے راقم الحروف (بیتاب صاحب) نے ان کا پتہ لگانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔"

چترا بکاؤلی کی تقلید یا مقابلہ کا تذکرہ اوپر تفصیل سے آچکا ہے۔ اس سے اس واقعہ پر روشنی پڑتی ہے کہ آغا صاحب مرحوم نے کس طرح اور کس حیثیت سے مصنف چترا بکاؤلی کا ذکر کیا ہوگا۔ ناٹک چترا بکاؤلی کا ذکر کیا ہوگا۔ ناٹک چترا بکاؤلی کے مصنف کا حوالہ اور ان کے نقش قدم پر آغا صاحب مرحوم کب سے کب تک چلے اس کی وضاحت بھی اوپر کی جاچکی ہے۔ حیرت ہے کہ ایسی معمولی غلط فہمی کو آغا صاحب مرحوم سے اس طرح منسوب کیا جاتا ہے۔ پھر اسی سلسلہ میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ

"ان کے (مصنف چترا بکاؤلی کے) ہونہار شاگرد (حشر مرحوم) نے اپنے استاد کے نقش قدم پر چل کر آج وہ مرتبہ حاصل کیا کہ ملک کے طول و عرض میں کوئی ایک متنفس بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کا پاسنگ بھی قرار دیا جاسکے۔"

معلوم نہیں یہاں مضمون نگار کو اس بیان سے آغا صاحب مرحوم کی توصیف منظور تھی یا کیا؟ پھر فرماتے ہیں۔

"حشر صاحب کی کمزوریوں اور خامیوں کو فراموش کرنے کی سفارش تو نہیں کی جاسکتی لیکن اس حقیقت سے مجال انکار نہیں ہے کہ ان کے لئے وہ تنہا ذمہ دار نہیں ہیں۔ بلکہ جب وہ توجہ دلانے پر اکثر کہا کرتے تھے کہ مالکان کمپنی کی فرمائش کی تکمیل ان کی مرضی کے مطابق ہی ہونا چاہئے اس سے مفر نہیں کھیل لکھتے وقت ان کا قلم مطلقاً آزاد نہیں ہوتا۔ آغا صاحب کی سہراب و رستم، صرف ایک ایسی تصنیف ہے جو متذکرہ پابندیوں سے بے نیاز ہے بقیہ تمام ناٹک —— سر بسر اسی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں۔"

یقیناً اس سے انکار کی مجال نہیں کہ حشر مرحوم کے دوسرے دور تک کے ناٹکوں میں بیشتر فنی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ اور واقعی طور پر مرحوم کو خود ان کا اعتراف تھا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ان میں بیشتر کمزوریاں مالکان کمپنی کی فرمائشوں، وقت کی ضرورت

اور اسٹیج کی مانگ کے سبب سے تھیں۔ لیکن غالباً بیتاب صاحب کو اس کا علم نہیں کہ حشر مرحوم کے اصلی مسودات کچھ اور ہوتے تھے اور اسٹیج پر وہ کسی اور ہی رنگ میں پیش کئے جاتے تھے۔ ناٹک لکھتے وقت مرحوم کا قلم مطلقاً آزاد ہوتا تھا۔ اسوقت ان کے سامنے نہ کسی مالک کمپنی کی فرمائش ہوتی تھی اور نہ تماشائیوں کی طلب کا تقاضا نہیں کسی طرح مجبور کرتا تھا۔ البتہ لکھے جانے کے بعد جب وہ ناٹک کی نظرِ ثانی کرتے تھے اسوقت کہیں کہیں ہنگامی ضرورت کو سامنے رکھکر خود تبدیلیاں مالکان کمپنی کے تقاضوں پر کر دیتے۔ اور اسٹیج کا مسودہ اصلی ناٹک سے بالکل مختلف بنا رہتا یہی سبب ہے کہ آج ہمارے سامنے حشر کے مطبوعہ ناٹکوں میں سے جتنے بھی موجود ہیں سب کے سب مسخ شدہ صورت میں آتے ہیں۔ پھر ناشرین نے بھی کافی سے زیادہ دست درازی کی ہے اور رائٹروں کی یادداشت پر پورے پورے ناٹک چھاپ کر حشر کے غیر فانی نام کو رسوا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہے۔ مطبوعہ ناٹکوں میں سے اکثر ایسے ہیں جن میں افراد کے نام اور کہیں کہیں چند بے ربط جملے ان کے ہیں اور باقی کو مکمل طور پر ہم حشر کی تصنیف ماننے کو ہی تیار نہیں۔ اس کا ثبوت مرحوم کے وہ غیر مطبوعہ مسودات ہیں جو ان کے منشیوں کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ مگر ان میں حشر کے اپنے قلم کی اصلاحیں موجود ہیں۔ جو نظرِ ثانی کے دوران میں کی گئیں۔

اس کے علاوہ مرحوم کے تیسرے دور کے ناٹکوں میں جنہیں سب سے پہلا "بلوا منگل" (سور داس) ہے بہت کچھ اصلاحیں نظر آتی ہیں اور اس کے بعد کے ناٹک "بن دیوی"، "گنگا اوترن"، "یہودی کی لڑکی"، "آنکھ کا نشہ"، "رستم و سہراب"، "ترکی حور"، "دھرمی بالک"، "دل کی پیاس"، "سیتا بن باس"، "پہلا پیار"، "ہندوستان" وغیرہ اصلاحی دور کی وہ اعلیٰ مثالیں ہیں جن کا جواب آج کا ادب بھی پیش نہیں کر سکتا تو پھر انکا ولی کے دقیانوسی دور کے مصنف کو اس کی ہوا کہاں سے لگتی اور یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آغا صاحب مرحوم نے ان کا تتبع کرکے اور ان کے نقشِ قدم پر چلکر ناٹک کی دنیا میں یہ لاثانی کامیابی حاصل کی۔ یہ سب ڈرامے آغا صاحب کے حشر نگار قلم کی جدتوں اور ندرتوں کے شاہد ہیں۔ اور غالباً بیتاب صاحب نے ان میں سے اکثر ڈراموں کو ملاحظہ بھی نہیں فرمایا۔ ورنہ یہ کہنے پر مجبور نہ ہوتے کہ "رستم و سہراب" اور دوسرے سب ڈرامے ابتدائی دور کے ڈراموں کی طرح انہی دقیانوسی خامیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ جبکہ حشر مرحوم کا انداز زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ برابر بدلتا رہا ہے اور انہوں نے ہر دور میں اپنا ایک جداگانہ معیار قائم کیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں آغا صاحب کے تیسرے اور آخری دور کے ڈراموں کے مفصل تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ ورنہ چند نمونے پیش کرکے یہ ظاہر کیا جاتا کہ آخری دور کی تصنیفات "پہلا پیار" وغیرہ میں ان کا قلم کسی قید یا فرمائش کا پابند نہیں اور کسی جدید تصنیف سے یہ ڈرامے کسی طرح پیچھے نہیں بلکہ اپنے انداز میں ایک بلند اور مخصوص حیثیت کے مالک ہیں۔ اور بیتاب صاحب کا یہ کہنا کہ "آغا صاحب کی "سہراب و رستم" صرف ایک تصنیف ہے جو مذکورہ پابندیوں سے بے نیاز ہے" قطعی طور پر فاضل مضمون نگار

کی لاعلمی پر دلالت کرتا ہے۔ آغا صاحب مرحوم کی زباندانی کے بارہ میں بیتاب صاحب کی واقفیت حیرت انگیز ہے۔ لکھتے ہیں۔

"مرحوم کو اردو زبان پر خاصہ عبور تھا۔ انہیں تلاوتِ قرآن کے سبب عربی کے معانی و مطالب کے سمجھنے کی بھی کچھ کچھ شد بد ہو گئی تھی۔ اور یہ قیام بنارس کا تبرک تھا کہ ہندی الفاظ غیر مانوس نہ معلوم ہوتے تھے۔ ہندی کی طرح انگریزی کے بھی کچھ الفاظ ان کی زبان پر چڑھ گئے تھے جنکا وہ کبھی کبھی استعمال بھی کیا کرتے تھے۔"

یہ بھی فاضل مقالہ نگار کی لاعلمی کا ہی نتیجہ ہے کہ "تلاوتِ قرآن" کو عربی کے معانی و مطالب کے سمجھنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ محض تلاوتِ قرآنِ کریم سے عربی کے معانی و مطالب پر عبور نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں حشر مرحوم کی ابتدائی تعلیم گو باضابطہ کسی مدرسہ یا "بحر العلوم" میں نہیں ہوئی مگر اردو فارسی اور عربی کی معقول تعلیم خاندانی روایات کے مطابق انہوں نے حاصل کی۔ اردو زبان پر خاصہ نہیں کامل عبور مرحوم کو حاصل تھا جسکا زندہ ثبوت ان کی تصانیف ہیں۔ اور اسی قدرت کا سبب تھا کہ وہ اردو زبان کے علاوہ انگریزی یا کسی اور زبان میں گفتگو نہیں کرتے تھے گو انگریزی زبان کا بھی مطالعہ کافی تھا۔ جس کے سبب سے وہ انگریزی بول اور سمجھ سکتے تھے۔ لیکن عام بول چال میں کبھی کوئی نامانوس انگریزی لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ہندی کے بارہ میں یہ کہنا کہ قیام بنارس کے تبرک کے طور پر انہیں رسم الخط سے واقفیت ہو گئی تھی عجیب ہے۔ بنارس میں سالہا سال سے جو خاندان آباد ہیں ان میں سے ایک فرد بھی اس زبان کی تعلیم حاصل کئے بغیر ہندی کے ایک لفظ سے بھی مانوس نہیں۔ کیونکہ بنارس کی عام بول چال ہندی نہیں۔ ورنہ محض قیام کے اثر سے رسم الخط سے واقفیت کیا معنی؟ علاوہ ازیں بنارس میں قیام کی مدت ابتدائی تعلیم کے زمانہ کو چھوڑ کر کچھ بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم نے ہندی زبان پر باقاعدہ عبور حاصل کیا تھا۔ اور اپنے ہندی ناٹکوں میں جو زبان استعمال کی ہے ایک معمولی ہندی داں ہندی میں ایسی فصیح اور شاعرانہ عبارت نہیں لکھ سکتا۔ اسی سلسلہ میں بیتاب صاحب لکھتے ہیں کہ

"بمقت بخبر سے انگریزی ادب تک بھی ان کی دسترس تھی۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے کسی یوروپین خاتون کو اپنی رفیقۂ حیات بنا لیا تھا۔ جس کی امداد سے شیکسپیر کی تصانیف سے وقوف حاصل کیا اور اس کے چمنستانِ تخیل سے گلچینی کی۔"

جہاں تک آغا صاحب مرحوم کی حقیقی زندگی کا تعلق ہے اس بیان میں ذرہ بھر بھی سچائی کو دخل نہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

"مرحوم کے لئے اکثر انگریزی اور ہندی الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ان کی تحریروں میں بھی جا بجا ہندی الفاظ غلط طور پر مستعمل ہیں۔"

اس غلط بیانی کے بطلان کے لئے آغا صاحب مرحوم کے مخلص احباب شاہد ہیں۔ رہا ان کی تحریروں میں ہندی الفاظ کا غلط استعمال۔ اس کا انصاف خود ہندی کے فاضل مصنفین کے سپرد ہے جن حضرات نے مرحوم کی تصانیف "گنگا اوترن"، "بن دیوی"، "آنکھ کا نشہ"، "دھرمی بالک"، "پہلا پیار"، اور "سیتا بن باس" دیکھے ہیں یا ان میں کسی

ایک ناٹک کا کچھ حصہ بھی پڑھا ہے وہ اس غلط بیانی کی تردید کر سکتے ہیں۔ جا بجا اغلاط تو کجا کسی ایک لفظ کا استعمال بھی کہیں غیر فصیح نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ہندی زبان کے ناقدین جب انصاف کی نظر سے ان تصانیف کو دیکھتے ہیں تو حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ ہندی زبان پر مرحوم کو کس قدر عبور حاصل تھا جو وہ ایسی حسین و جمیل اور فصیح شاعرانہ عبارت لکھنے کی قدرت رکھتے تھے۔ بیتاب صاحب کو چاہئے کہ وہ پہلے حشر مرحوم کی صحیح تصانیف بغور پڑھیں اور عام بازاری چھاپے کی غلط کتابوں کو اپنا ذریعہ معلومات نہ بنائیں۔ ورنہ ایک بلند پایہ مصنف کے بارے میں ایسی صریح غلط بیانی خود ان کی نقادی کا بھرم کھول دے گی۔ حشر مرحوم کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فاضل مقالہ نگار اس سے زیادہ افسوسناک غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:—

حشر کی سرشت میں ایک بالکل عجیب بات یہ تھی کہ وہ طالب، بیتاب۔ اور احسن کی طرح پہلے شاعر اور پھر ناٹک نویس نہ تھے۔ بلکہ وہ پہلے ناٹک نویس اور بعد میں شاعر بنے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابتداً انہوں نے اپنے ناٹکوں میں تیر، غالب وغیرہ کے اشعار کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ اسکے بعد کچھ پیشہ کے لگاؤ اور کچھ طبعی مناسبت سے انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا شکوۂ یورپ، اور شکریۂ یورپ، کو چھوڑ کر مرحوم کے بہت کم متفرق اشعار ایسے ہونگے جو کسی ناٹک کیلئے نہ کہے گئے ہوں۔ ان کے ناٹکوں میں جا بجا غزلیں موجود ہیں۔ لیکن یہ سب کی سب موقع اور محل کے لحاظ سے عشقیہ ہیں۔ البتہ بعض بعض غزلیات کی بندش اور ندرتِ ترکیب قابلِ داد ہے"۔

اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگار نے عجیب انداز کے متضاد بیانات پیش کئے ہیں جن سے پورے طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل انکا مقصد کیا ہے اور شاعری کی دنیا میں حشر مرحوم کو وہ کیا درجہ دینا چاہتے ہیں۔ یہاں وہ تمام بیانات نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہیں مثلاً متذکرہ بالا رائے ظاہر کرکے آگے ارشاد ہوتا ہے۔ آغا صاحب کو دیکھکر نظیر اکبرآبادی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ وہی آزاد خیالی اور وہی رندی و بدمستی اپنے طاری رہتی تھی اس کے بعد:—

"نظیر ہی کی طرح ان کی مخلوط اردو تصنیف مثلاً "عورت کا پیار"، "سفید خون"، "اسیر حرص"، "خوبصورت بلا"، اور "سلور کنگ"۔ وغیرہ کو اٹھا کر ان کی لطافت کے ادبیت سے بے رنگ ہونیکا الزام لگا دیجئے اور بے سر و پا الزام کی تردید کیجئے"۔

سمجھ میں نہیں آتا یہاں ادبیت سے مراد کیا ہے؟ اور شاعری پر تبصرہ فرماتے ہوئے ان ناٹکوں کی بحث درمیان میں کیوں آگئی۔ بہرحال یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ ان ڈراموں کی اردو مخلوط ہے بھی کیا؟ اور رنگین ادبیت کیلئے مغلظ اردو، کا استعمال کہاں تک جائز یا مناسب ہے؟

درمیان میں ناٹکوں پر پھر کسی قدر لمبی بحث آجاتی ہے۔ اور بعد میں شاعری کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں اکثر ذاتیات پر بھی اتر آئے ہیں جن سے قطع نظر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:—

"جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ مرحوم کی غزل گوئی دراصل ان کی ناٹک نویسی کا ایک جزو تھی۔ بہت کم غزلیں آپ کو ایسی ملیں گی جو حشر نے محض تکمیلِ شوق کے لئے، آزادانہ طور پر کہی ہوں لیکن ان کی غزلوں پر رائے زنی کرنے سے پہلے ہمیں ان باتوں کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ اول یہ کہ حشر کے عہد کے زیادہ تر ناٹک میلوڈرامہ اور اوپیرا ہی کا مجموعہ تھے۔ اور انکے لئے جو غزلیں کہی گئیں وہ محض گانے اور جا بجا جذباتِ عشق کے اظہار کے لئے مخصوص ہیں۔ دوم یہ کہ حشر کی غزل گوئی کی ابتدا اس عہد میں ہوتی ہے جبکہ داغ مرحوم کا طوطی بول رہا تھا۔ اور ان کی چلبلی عشقیہ غزلیں عوام کے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھے ہرچند حشر کا کلام جذباتی ہے لیکن ان کے مخصوص رنگ سے اس میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

آگے ملاحظہ ہو۔

"حشر کی تمام غزلیں بلاشبہ ممتنع کا ایک نادر نمونہ ہیں اور ان میں کافی کشش موجود ہے۔ ان کے آخری دور کی غزلیں خصوصیت کیساتھ اردو شاعری ادب میں اپنا ایک خاص درجہ رکھتی ہیں —— مرحوم نے غزل کو ایک فنکار کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی —— یہ واقعہ ہے کہ حشر ایک بلند پایہ غزل گو ہوتے ہوئے بھی ایک بہت بڑے اور لاثانی فنکار تھے۔

اسی بیان کی تکرار دوسری طرح ملاحظہ ہو۔

زندگی

غم نہیں ہے موت گل کر دے چراغِ زندگی
ماہِ کامل سے فزوں تر ہے داغِ زندگی

عقل گم ہے دل پریشاں ہے نظر بیتاب ہے
جستجو سے بھی نہیں ملتا سراغِ زندگی

لب پہ آیا ہی تھا معراجِ محبت کا بیاں
عرش پر پہنچا الفت کا بچھا دماغِ زندگی

منتظر ہوں نامرادی کی تکمیل میں
کس کو حاصل ہے زمانے میں فراغِ زندگی

اوس پڑ جائیگی پھولوں پر خزاں چھا جائیگی
ایک دن پامال ہو جائیگا باغِ زندگی

سب کو صیادِ اجل کا خوف دامن گیر ہے
عندلیبِ زندگی خوش ہے نہ زاغِ زندگی

ساقیِ بزمِ ازل نے فیض یہ کچھ کر دیا
بادۂ ایماں سے بھر کر ایاغِ زندگی

فیض لودھیانوی

"بیاشبہ حشر ایک برے غزل گو نہ تھے بلکہ بہت بڑے فن کار تھے جس سے مزلیں کہیں اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم انہیں محض ایک تیسرے درجہ کا غزل گو قرار دے کر ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ جیسا کہ معلوم ہوگا۔ ان کا [illegible] سے بھی کافی بلند ہے،

چند اشعار نقل کرکے ارشاد ہوا ہے :-

"کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار غزل کے جدید رنگ [illegible] نہیں ہیں اور [illegible] اردو زبان رہتی دنیا تک مٹا نہیں سکتی [illegible] حشر کے یہاں رنگ بھی ہے اور تغزل بھی یعنی غزل گو نہیں تھے [illegible] کہیں یہی مطلب ہے ؟؟؟) ان کے آخری دور کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی رنگینی اور اچھوتا انداز بیان اور شوکت الفاظ ہیں کہیں کہیں انہوں نے خالص تغزل کے رنگ میں فلسفیانہ عقائد کی بھی موشگافیاں کی ہیں "

جناب بیتاب کے بلند پایہ انداز بیان کے اقتباسات درج کرکے ناظرین کی رائے پر فیصلہ چھوڑنا پڑتا ہے کہ وہ فاضل مضمون نگار کی موشگافیوں کے بارہ میں الگ الگ کے ٹکڑوں کو ملا کر خود ہی اندازہ کرلیں کہ اصل مقصد کیا ہے۔ البتہ اظہار حقیقت کے طور پر صرف اتنا ضرور کہنا ہے کہ آغا حشر مرحوم کے بارہ میں یہ غلط فہمی ہے کہ وہ پہلے ناٹک نویس تھے اور پھر شاعر۔ وہ پہلے شاعر تھے۔ تقریباً تیرہ چودہ برس کی عمر میں بنارس کے قیام کے دوران میں شعر کہنا شروع کئے۔ اور حضرت فائز دہلوی مرحوم سے تلمذ حاصل تھا۔ دوستوں کی فرمائش بالطبیعت کی اپج سے مشاعرہ کی شرکت کی غرض سے اکثر اسی زمانہ میں غزلیں کہیں جنمیں سے شاید ہی کوئی غزل شائع بھی ہوئی ہو۔ ان میں سے چند البتہ ابتدائی دور کے ناٹکوں میں شامل ہوئیں۔ جناب بیتاب صاحب نے اپنے بیان کے ثبوت کے لئے جو استدلال فرمائے ہیں ان میں سے اول تو یہ کہ حشر مرحوم "نے چونکہ ابتدائی دور کے ناٹکوں میں میر انیس کے اشعار درج کئے ہیں اسلئے وہ پہلے شاعر نہ تھے" اور دوسرے یہ کہ ان کی غزلیں بیشتر عشقیہ ہیں" یہ دونوں دلیلیں ماننے یا نہ ماننے کا سوال جب پیدا ہوتا جبکہ آغا صاحب مرحوم کے اعزاء اور احباب (جیسا کہ اوپر درج ہوچکا ہے) موجود نہ ہوتے۔ اور ان کے پاس کلام حشر بھی محفوظ نہ ہوتا۔ ابتدائی عہد کی غزلیات سے لیکر آخری دور تک کے کلام سے ان کے بھتیجے آغا محمد جمیل شاہ نشتر نے دیوان حشر مرتب بھی کرلیا ہے۔ جو عنقریب شائع ہونیوالا ہے۔ اسکے علاوہ مرحوم کے قیام لاہور کے دوران میں مولانا ظفر علیخاں صاحب نے ان کے ترتیب شدہ کلام پر تبصرہ لکھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا اور غالباً وہ مجموعہ مولانا موصوف کے مطالعہ سے گذر بھی چکا ہے۔ ایسی صورت میں ایک بے سر و پا اور بے دلیل بات کا بتنگڑ بنا کر ایک بے جوڑ ثبوت فراہم کرنا تنقید نگاری کی توہین ہے۔ علاوہ ازیں بیتاب صاحب نے حشر کی شاعری کو اپنے متضاد دعوں سے عجیب گورکھ دھندا بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ بجائے خود مضحکہ خیز ہے۔ کہیں نظیر اکبرآبادی کی یاد تازہ کی جارہی ہے تو کہیں "مغلظ اردو" کا الزام دیکر حشر کی ادبیت کو سراہا جارہا ہے۔ کہیں غزل گو نہیں قرار دیتے، اور کہیں بلند پایہ غزل کہنے والے تسلیم کرتے ہیں۔ کبھی فرماتے ہیں "حشر کی شاعری محض جذباتی ہے" تو کبھی ارشاد ہوتا ہے۔

"مرحوم نے فلسفیانہ عقائد کی بھی موشگافیاں کی ہیں"۔ ان کے اپنے متفرق بے جوڑ بیانات میں سے اگر قابلِ فہم جملے جمع کئے جائیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ حشر مرحوم ایک بلند پایہ خوشگو شاعر تھے" اور یہی حقیقت ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ حشر محض ایک غزل گو نہ تھے۔ قدرت نے انہیں ایک شاعر کا دماغ عطا کیا تھا اور ان کی تصنیف کی ابتدا ہی شاعری سے ہوئی۔ اس میں غزلیں بھی شامل ہیں اور متفرق اشعار بھی۔ فرد، قطعات، مثنوی سب موجود ہیں۔ غزلیں ناٹکوں سے الگ بھی کافی ہیں۔ اور بقیہ حصہ نظم متفرق صورتوں میں بکھرا ہوا ہے۔ خود جناب بیتاب نے اپنے مضمون میں جو غزلیں نقل کی ہیں انہیں سے بیشتر وہ ہیں جو ڈراموں کے لئے نہیں لکھی گئیں۔ اور وہ حشر کو ایک مستند خوش گو اور قادر الکلام شاعر تسلیم کرانے کے لئے کافی ہیں۔ کیا یہ اشعار تغزل کا دلکش اور ارفع نمونہ نہیں ؟ ؎

کیا اے حسرتِ نظارہ آخر تو نے شرمندہ — شکایت کر رہے ہیں جلوہ ہائے رائیگاں ہم سے
محبت کا فسانہ کہہ رہا ہے ایک اک آنسو — نجانے کب سنی آنکھوں نے دل کی داستاں ہم سے

نیازِ عشق نے گل کے عوض سجدے بکھیرے ہیں — جہاں تیرا قدم دیکھا وہیں نقشِ جبیں پایا
کتنی گھٹائیں آئیں برس کر نکل گئیں — آنسو مگر مرے نہ تھمے تم سے چھوٹ کے
چوری کہیں کھلے نہ نسیم بہار کی — خوشبو اڑاکے لائی ہے گیسوئے یار کی
آباد تیری یاد سے تھا جو دیارِ عشق — برباد ہے تباہیِ اہلِ وفا کے بعد
سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجکو مانگ کے — اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد
لب سی دئے ہیں خوفِ شکستِ امید نے — کس سے کریں گے تیرا گلہ پھر خدا کے بعد
ڈر ہے کہ کہیں چھین نہ لے ذوقِ طلب بھی — ہمت کو دعا کوشش ناکام دئے جا
اے حشر نظر پھیر کے جاتا ہے وہ کافر — کہہ اس سے کہ ظالم مرا سلام دئے جا

طوالت کے خوف سے یہاں حشر کے کلام پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ نہیں کیا جاسکتا اس کے لئے ایک مبسوط مقالہ کی ضرورت ہے جو کسی وقت علیحدہ پیش کیا جاسکے گا۔ اس مضمون میں محض چند غلط فہمیوں کا ازالہ مقصود تھا۔ ورنہ حشر کے سرودِ شکریں کی کیفیات سے کس اہلِ نظر کو مجال انکار ہے۔ ؎

محبت حشر سازِ حسن کے تاروں کی جنبش ہے — اسی سے روحِ شاعر نے سرودِ شکریں پایا

فرعون کی نہر

بقیہ صفحہ ۲۱

رہے گا۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس صدی کا عظیم ترین انجینیری منصوبہ برطانیہ کے زیر غور ہے۔ وہ یہ کہ بندر آکہ سے لے کر خلیج فلسطین کے بندر حیفہ کے شمال میں واقع ہے ایک نئی نہر بنائی جائے۔ یہ نہر بحیرہ مردار میں سے ہوکر جاسکتی ہے نہر سوئیز بہت بڑے جہازوں کے لئے کافی گہری اور چوڑی نہیں ہے۔ آجکل کی سہولتوں کے پیش نظر نہر سوئیز کے مقابلہ میں اس نہر کے بنانے پر لاگت بھی کم ہوگی اور وقت بھی کم لگے گا۔ پیمائش کا کام مکمل ہوچکا ہے۔

لوریاں

ہاجرہ بیگم

یوں تو لوریاں اور بچوں کے بول ہندوستان میں کہاں اخراطے نہیں ہوتے لیکن ہمارے صوبے میں جہاں لوریوں کی کمی نہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ اتنی مختلف قسم کی لوریاں بھی پائی جاتی ہیں کہ یہ کہہ دینا کہ اس صوبہ کی لوری کی خصوصیت کیا ہے خاصہ مشکل کام ہے۔

پہلے تو زبان کا ہی سوال ہے۔ دوسری جگہوں پر گجراتی مراٹھی یا بنگالی میں لوری ہوگی تو یہاں نہ صرف الگ الگ جگہ کی زبان برج بھاشا۔ اودھی بھوجپوری اور کھڑی بولی مل جل گئی ہے بلکہ تاریخی لحاظ سے فارسی اور بعض مقام پر پشتو کا اثر بھی پایا جاتا ہے۔

مثلاً۔ ایک لوری یہ عام رائج ہے۔

جھجو جھجو کوڑی مانگتا
کوڑی لے بھڑ بھونجے کو دیا
بھڑ بھونجہ ہمیں لاوا دیا
لاوا لے میں گئیا کو دیا
گئیا ہمیں دودھ دیا
دودھوں میں نے کھیر پکائی
میں نے کھائی بھیا نے کھائی
اماں کا حصہ دھرا تھا
بلی آئی کھا گئی
کتا آیا سونگھ گیا

اس لوری میں لاوا یعنی بھاڑ میں بھنی کھیلیں۔ اور گئیا الفاظ ایسے ہیں جو آپ کو لکھنؤ اور اس کے پورب میں ہی ملیں گے۔ اسی طرح سے یہ لوری ہے:۔

چڑیا موسی آئی ہے	لال کھلونا لائی ہے
کوا ماموں آوا ہے	بتوا میں گڑ لاوا ہے

بتے کو بتوا اور آنے والے کو آوا۔ لاوا کہنا یہ بھی یہاں کی ہی خاصیت ہے مگر اسی قدر عام یہ بھی لوری ہے جس میں سوائے لفظ مسکے کے۔ جو کہ مکھن کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ باقی زبان بالکل سیدھی ہندوستانی ہے۔

ہم ننھی منھی بیٹیاں	تال کھودے گئیاں
تال نے ماری لات	میں جا پڑی گجرات
گجرات کی بیوی موٹی	وہ کھائے چنے کی روٹی
روٹی کے اوپر مسکا	لونڈی کو لگا جھسکا

بعض بعض جگہ صرف اکے دکے الفاظ نہیں بلکہ پورے پورے مصرعے ایسے قائم رہ گئے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبان پر دوسری کا اثر ہوا ہے۔ یہ سنئیے:۔

جھول ماموں جھول	تیری پگڑی میں پھول
پگڑی رکھی طاق میں	گھوڑا چھوٹا باغ میں
پھول گدا کھلائے	بیٹا گئیں رجھائے

اس لوری میں جہاں پھول کے کھلانے پر ننھی منی کے رد ھنے کو ان دو مصرعوں نے "پھول گدا کھلائے۔ بیٹا گئیں رجھائے" بڑی پیاری طرح بتا دیا وہاں یہ بھی دیکھئے کہ بجائے بگیا کے لفظ گڑہی اور بگیا کی جگہ باغ استعمال ہوا ہے۔ اس طرح سے مسلمان گھرانے میں جہاں کابل اور قندھار کا تصور ہندوستان میں بھی قائم ہے جب کابل سے مغلانی آتی ہے، تو سکھ کے ساتھ آرام کا نغمہ بھی رہ جاتا ہے۔ اور ماں کہتی ہے:۔

آرام کا ہے پالنا۔	سکھ کی لاگی ڈور
کابل سے مغلانی آئی۔	جھونکا دے گی زور

لوریوں میں بھی اکثر لوریاں ہمارے یہاں کرشن کنھیا اور بنسری والے کی نسبت ہوتی ہیں۔ بچے کا ندھے پر ڈنڈا رکھ کر کہتے ہیں:۔

ہاتھی گھوڑا پالکی	جے کنھیا لال کی

لیکن میں ان لوریوں کو چھوڑ کر صرف ان کا ذکر کرتی ہوں جن سے ہمارے پرانے ریت رواج کا پتہ چلتا ہے۔ آپس کے رشتے داروں سے برتاؤ بڑے چھوٹے میں بھائی بہن میں کیا طریقہ بہن بہن کا پرانے زمانے میں تھا اس کا ذکر آپ لوریوں میں پائیں گے۔ دیکھئے ایک نند اپنی بھابی سے کیا کہتی ہے:۔

کدوں دل بھابی کدوں دل

کدوں کا مان پیسے گا	میری بھابی کا لکھن بیچے گا
تو اول بھابی تجھ سے	ستھورا کے تجھ سے
ستھورے میں کی رائی	جیئیں میرے باپ اور بھائی

یعنی۔ اے بھابی تو جلدی جلدی کدوں کا ناج پیس لے اور اس کو پکانے کے لئے بھگو دے۔ اے بھابی جب تو محنت کرے گی تو تیرا زیور بھی جھمک جائے گا۔ لیکن تجھے ستھورا پکانا چاہئے۔ اور مجھ سے بولنا بھی چاہئے۔ میری دعا تیرے لئے یہی ہے کہ جیسے ستھورے میں رائی لازمی ہے ایسے ہمیشہ تو میرے باپ اور بھائی جیتے رہیں۔ لڑکیوں کو سکھایا جاتا تھا کہ بھاوج اور نند کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے اور اس کی منہ مانگی مراد پوری کرنی چاہئے۔ اس لئے۔

جھم جھم جھم جھم پانی برسے	پانی کہا جائے
آدھا پانی نواڑ تلے بہے	آدھا بیرن نہائے
بیرن لائے پان مٹھائی	لو بھاوج جی کھاؤ
میں اکیلی کیسے کھاؤں	میری نند کو بلاؤ
نند مانگے کنگھی چوٹی	سر سوے کی چوٹی

کبھی کبھی نند بھاوج کی نوک جھونک کی بھی جھلک ان لوریوں میں آجاتی ہے جیسے:-

بھیا گیا ہیرا شکار   ہرن لایا دو چار
بہنیں جھانک جھانک جائیں   سالیاں بھون بھون کھائیں

یعنی ایسی میری بھاوج تھی کہ چار چار ہرن گھر میں آتے تھے لیکن وہ اپنی بہنوں کو بھون بھون کھلا دیتی تھی۔ بہنیں بیچاری جھانک جھانک کر رہ جاتی تھیں۔

لڑکیوں کی لوریوں میں بھائی کی محبت کا ذکر بہت پیار اور چاؤ سے کیا جاتا تھا۔ ہمارے یہاں شادی ہونے تک لڑکیاں پیا اور ساجن کے گانے نہیں گاتی تھیں۔ بلکہ اپنے میکے کی محبت میں چور رہتی تھیں۔ خربوزے کی نرم نرم ٹہنیاں دیکھ کر ایک بہن کو سوت کی مچھیاں یاد آتی ہیں اور وہ کہتی ہے:-

خربوزے رے   خربوزے رے
تیری لمبی لمبی بیل   لچک لچک ساری ڈالیاں
میں تو کاتوں گی   میں تو کاتوں گی   ننھا ننھا سوت
کات بنا بیرا پاگڑی

تو تو بن دے رے   بندیا کے لال   کات بنا بیرا پاگڑی
تو تو رنگ دے رے   رنگریزن کے لال   کات بنا بیرا پاگڑی
وہ تو باندھیں گے   میرے ننھے سے بیر   باندھ چلے سسرال کو
وہ تو پوچھیں گی   بیرا کن نے بنی   تمہاری پاگڑی

بیاہی لڑکی سسرال میں جب جب نیم کے پیڑ پر نمکولی پکتے دیکھتی ہے تو بیقرار ہو کر کہہ اٹھتی ہے۔ ؎

نیم کی نمکولی پکی   ساون بھی کبھی آئے گا
جیوے میری ماں کا جایا   ڈولی بھیج بلائے گا

میکے کی محبت میں ماموں کی محبت بھی شریک ہوتی ہے، لڑکیاں ماموں کو ایسے دعا دیتی ہیں ؎

جھجو جھجو نٹے   ماموں ہو نٹے
ماموں کی کمر میں   سونے کے سونٹے

ہماری لوریاں اس بات کو بھی صاف دکھاتی ہیں کہ غریبی اور امیری۔ مصیبت اور فارغ البالی بچہ کا ماحول اس بچپن سے ہی اثر ڈالنے لگتا ہے۔ ایک طرف تو ایک رئیس گھر کی ماں اپنے لورِ نظر کو یوں سلاتی ہے:-

بھیا ہمارا راج کرے   کہہ دو شہر بھر سے چپکا رہے
دادا سے بولو گودی میں لے   انا سے کہہ دو پنکھا جھلے
بھیا ہمارا گھوڑے چڑھے   گھوڑے پہ چڑھے اور دولہا بنے
دلہن کو گودی میں لے کر دھرے   گھم گھم ڈولی مہرا کرے

دوسری طرف وہ ماں ہے جو مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے۔ اس کے منہ سے یہ نکلتا ہے۔

سو میرے بالے   تو سو میرے بھولے
جب تک کہ باقی   ہے نیند
پھر جو پڑے گا   تو دنیا کے پھندے
تو کیسا ہے پالنا   کیسی ہے نیند
کھیل تم ایسے   کھیلنا للنا
جس میں نہ ہو   ماں باپ کا جلنا
چکنی ہے گھاٹی   رستہ پھسلنا
سنبھل سنبھل کے   دیکھ کے چلنا

چڑیا کی چوں چوں سن کر بڑے گھر کی ماں کہتی ہے:-

چوں چوں کرتی آئی میری چڑیا
میاں کا منگنا لائی میری چڑیا
پروں میں شکر لائی میری چڑیا
چونچ میں چھوارے لائی میری چڑیا

لیکن ایک کسان ماں کی نظر میں چڑیا خوشی کا پیام نہیں لاتی بلکہ اس کا کھیت اجاڑنے کو آتی ہے۔ اس لئے وہ کہتی ہے:-

چڑیا پھوڑوں تیرا پیٹ   کاہے کو کھائے بھیا کا کھیت
کھیت دکھائے بھیا جائے   روٹھے کے منیا جائے

ایک بڑے گھرانے کی لاڈلی بیٹی ہٹ کر کے لیٹ جاتی ہے اور غصہ سے منہ پھلا لیتی ہے، اس کے منانے کو ماں کہتی ہے: ؎

ہوئی بیٹیاں   چھپر کھٹ پہ لیٹیاں
مارے مغروری کے   جواب نہ بتیاں

لیکن ایک محنت کرنے والی ماں کو ان سب نخروں کی فرصت کہاں۔ وہ تو یہ کہنے پر مجبور ہے:-

گھومر گھومر دودھ بلوئے   جاٹنی کا چھورا روئے
روتا ہے تو رونے دو   مو کو دودھ بلونے دو

یہ چھوٹے چھوٹے بول بچے کی واقفیت بڑھانے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ اور بچے ان میں اپنے گرد و نواح کی چیزیں۔ جانوروں پرندوں وغیرہ کے نام سیکھ جاتے ہیں۔ اور ایسے بول ان کو خوب بھاتے ہیں۔ جیسے:-

بی بی مینڈکی رہی   تو تو پانی میں کی رانی
کوا تیرا بھائی بھتیجہ   چیل تیری پورانی
بگلا تیرا چھوٹا دیور   تو کہاں کی رانی

سن سن سکھی ایک پھپھی کا بیاہ تھا۔ پائل مولا ناچتی تھی

بگلا براتی آئے　　جگنو مشعل لائے
ڈ ییر تو خوب بولے　　ڈومنی برات گائے
پودنا ستائی　　بلبل کرے لڑائی
بلّی جوناین آئی　　ساری سبھا بھگائی

لڑکے دِنوں کے نام ایسے سیکھتے ہیں:۔

جمعرات میری دائی　　جمعہ کی خبر لائی
جمعہ میری میتا　　میں کھیلوں دھمک دھیا
سنیچر میرا نانا　　مجھے کان پکڑ بلانا

ہماری لوریوں میں مزاقیہ بول بھی ہوتے ہیں اور بے تکے بول بھی ہوتے ہیں۔ حالانکہ جو ہمیں مہمل بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں وہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں جبکہ بول چال کی زبان اور تھی۔ مزاقیہ تو ایسے دیکھئے:

اختر نے پکائیں ٹریاں　　بخشو نے پکائی دال
اختر کی ٹریاں جل گئیں　　بخشو کا برا حال

یا لڑکے کہتے ہیں

تختی پے دانے　　ملّاجی دیوانے
تختی پے روڑ　　ملّانی جی بھوڑ
تختی پے تختی　　ملّاجی کی کمبختی
اچک دانہ بچک دانہ　　دانہ ہے پرانہ
چھجے اوپر مور ناچے　　بٹیا ہے دیوانہ

اور:۔

اے بوا بھائی　　کاہے کی دال پکائی
مسور کی دال پکائی　　جس میں مرچ نہ کھٹائی

ہر زمانے کی لوریاں اپنے وقت کی جھلک لئے رہتی ہیں۔ کرشن کنھیا اور رام جی سے لے کر آج تک ہمارے دیش میں جو کچھ گذری ہے۔ اگر چھان بین کی جائے تو وہ عوامی ادب میں مل ہی جائے گا حتےٰ کہ کمپنی کے زمانے کی لوریاں موجود ہیں:۔

کوئیے جاؤ بیرا　　ہٹ راجاؤ صاحب
پالکی لاؤ بیرا　　پالکی لو صاحب
بی بی بڑی ہلکی　　آیا بڑی موٹی

یہ تو اس وقت کا ذکر ہے جب پالکی سے صاحب لوگ کلکتہ آتے تھے لیکن جب ریل ایجاد ہوئی تو بچوں نے اس کو ایسے کہنا شروع کیا:۔

ایسا فرنگی پیسہ کا لوبھی　　دھوئیں کی گاڑی اُڑائے لئے جائے
ذات نہ پوچھے صفات نہ پوچھے　　سب کو برابر بٹھائے لئے جائے

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو لاہور کی اجازت سے)

تیری آنکھیں

سرورِ بیخودی کی مے، پلادی تیری آنکھوں نے
نویدِ خلوت آرائی، سنادی تیری آنکھوں نے

سحر جس پیار سے منہ چوم کر، کلیاں کھلاتی ہے
یونہی اک دن، کلی دل کی کھلادی تیری آنکھوں نے

نمِ نرگس میں سچے موتیوں کی آب، حل کر کے
محبت کی کڑی صہبا، پلادی تیری آنکھوں نے

مجھے کہنا نہیں آتا کہ میرے قلبِ ناداں میں
تمناؤں کی اک بستی بسادی، تیری آنکھوں نے

اتر کر دل کی گہرائی میں، جنسِ دل پرکھتی ہیں
دنائے عشق کی قسمت جگادی تیری آنکھوں نے

وہ شرمیلی نگاہوں کا تبسم، بے حجابانہ
حکایت شوقِ پنہاں کی سنادی، تیری آنکھوں نے

صنم آخر صنم ہے، دل کو تسکیں کس طرح ہوتی
مگر روحِ وفا، عریاں دکھادی، تیری آنکھوں نے

فسونِ نازکی محفل، ترے جلووں سے قائم ہے
اور اس محفل میں، شمعِ دل، جلادی تیری آنکھوں نے

نہ بھولے گا وہ لمحہ جب مرے غم کے فسانے پر
کرم کی رس بھری ندی بہادی تیری آنکھوں نے

نہ آئی نیند جب تیرے تصور میں تو پھر ہنس کر
وہی، کافی کی مدھم گت بجادی تیری آنکھوں نے

نیازِ عشق کی وسعت سے دل آگاہ تھا لیکن
حریمِ ناز کی رفعت، دکھادی تیری آنکھوں نے

امید و یاس پر تیری خدائی کا یہ عالم ہے
کہ اک دنیا رچائی، اک مٹادی تیری آنکھوں نے

مخمور اکبرآبادی

شہابِ ثاقب اور سنگِ شہابی

اسلم عظیم آبادی

موسم برسات میں جب فطرت کے ابر آلود آنسوؤں سے فضا دھل دھلا کر صاف ہو جاتی ہے اور نیلگوں آکاش کی لامتناہی وسعت اپنا ہلکا رنگ بہت نمایاں ہوتی ہے، افق مغرب میں شمس کے ڈوبتے ہی دور بہت دور کی سیاہ، بلند پہاڑیوں اور کالی بدلیوں سے بچ نظر آتی ہے۔ ان گل بوٹوں کی ہلی ہلکی چپکی تابانی سپوتی ہوئی پرنت کے کھیت کی اس خاموش لہر جیسی ہوتی ہے جیسے ہوا کا ایک تند جھونکا ہو سے بیدار کر دیتا ہے۔ اس زمانہ میں آکاش سنہرے پھولوں کے کھیت کی طرح لہلہاتا ہوتا ہے۔ قدرت کی اس نگار خانہ کھیتی کے آس پاس ہی ایک پگڈنڈی ہوتی ہے۔ ننھے ننھے انجمات کی ایک پتلی سی لکیر جو منزل مقام کے قیود سے آزاد افق مشرق سے بیچ ہوتی ہوئی دھندلی گوشہ میں کھو جاتی ہے شاعر اسے دیکھ کر دوشیزہ کی اس سفید مانگ میں گم ہو جاتا ہے جو صبح پیشانی سے ابھرنی ذرات تاباں کو جگمگاتی سنبل و ریحاں والے گیسوؤں کو چیرتی دور سمٹے ہوئے پیچھے میں روپوش ہو جاتی ہے۔ ماہر نجوم قدرت کی اس پگڈنڈی اور دوشیزہ کی اس مانگ کو آفاقی ذرات اور روحانی تجربات اور لکھو کھا انجم کا ایک گنجان اجتماع قرار دے کر اسے کہکشاں کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ بہت زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ اس کھیت کے چند پھول اپنے برگ نہاں سے بکھر کر گرتے دکھائی دیتے ہیں اور آس پاس کا کوئی درخشندہ تارا آتشی بوندیں بکھیرتا نیچے کی گہرائی میں تیرتا نظر آتا ہے۔ ”ارے دیکھیے وہ تارا ٹوٹا !!“ تقریباً دو سو میل نیچے سطح زمین پر ان ٹوٹتے ہوئے تاروں کو دیکھ کر ہم مسرت و استعجاب سے چلا اٹھتے ہیں۔ یہ تارے زیادہ فاصلہ کبھی نہیں طے کرتے کہ شب کی سیاہی میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ دم بھر کی زندگی والے ان تاروں کو شہابِ ثاقب کہتے ہیں۔

سنگ شہابی وہ چٹانیں اور ٹھوس پتھر ہیں جو کبھی کبھی آسمان سے یکایک آ کر معلق گرتے ہیں۔ گفتگو کا موضوع شہابِ ثاقب اور سنگ شہابی ہیں۔ اور اس وقت ہم انہیں جغرافیہ اور سائنس کی حقیقی اور اصلی شعاعوں ہی پر کہیں گے۔

شہابِ ثاقب اور ان کی رفتار

شہابِ ثاقب کی بنیاد پر روشنی ڈالنا قدرے دشوار مسئلہ ہے۔ ہاں ان کی تخلیق و تشکیل سے متعلق اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ آفاقی ذرات کی مجتمع شکل ہیں یا پھر کائنات کے بہت ہی ننھے ننھے مادے جو ادھر ادھر رواں دواں ہیں جنھیں ہم شہابی سنگ ریزے یا شہابی ریزے کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہمیں اس وقت نظر آتے ہیں جب یہ اپنی آپس کی فطری کشش کھو کر ہمارے کرۂ باد میں داخل ہوتے ہیں۔ کرۂ باد سے اوپر کائنات میں ان کی تعداد عموماً ایک چھوٹے بیج کے برابر ہوتی ہے مگر بعض کا وزن ایک یا دو آونس سے اوپر بھی ہوتا ہے وہاں یہ بالکل ٹھوس اور سرد ہوتے ہیں۔ سطح زمین پر آتے وقت ان کی رفتار زمینی کشش کی بنا پر غیر معمولی طور پر تیز تر ہو جاتی ہے۔ یہ رفتار تقریباً تیس میل فی سکنڈ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ہوا کی بلند ترین تہیں ان حیرت انگیز رفتار کو بالکل اسی طرح روکتی ہیں اور ان کی راہ میں حائل ہوتی ہیں جیسے رائفل کی گولی کی رفتار کو سطح آب کم کر ڈالتی ہے۔ اسی طرح گویا یہ تہیں شہابی ریزے کے لئے تارپیڈو نٹ کا کام کرتی ہیں۔

شہابِ ثاقب کا ظہور

شہابی ریزے کی قوت رفتار ہوا کی رگڑ کے سبب حرارت پیدا کرتی ہے۔ اور اسی حرارت سے شہابی ریزوں کا ٹھوس پن پگھل کر زائل ہو جاتا ہے۔ سطح زمین سے تقریباً اسی میل کی بلندی پر وہ پہلے آتش سرخ جیسے رونما ہوتے ہیں پھر بتدریج آتش سفید کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور آخر ش حرارت انھیں اس درجہ جلا ڈالتی ہے کہ چند لمحوں قبل کا وہ ٹھوس اور سرد مادہ خاکستر ہو کر سیب و شفاف راکھ جیسا ہو جاتا ہے۔ کرۂ باد میں تقریباً تیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سابق شہابی ریزے ہوا میں بالکل تحلیل ہو جاتے ہیں اور نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ عموماً یہ اسی میل کی بلندی میں آ کر پگھلا کرتے ہیں اور سطح زمین سے پچاس میل کی بلندی تک آتے آتے پگھل گھلا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ فاصلہ ہوتا ہے جس درمیان ہمیں کوئی درخشندہ تارا چنگاریاں بکھیرتا نیچے کی گہرائی میں تیرتا نظر آتا ہے۔ گویا ہم شہابِ ثاقب کو صرف اس وقت تک دیکھ سکتے ہیں جب تک وہ ہم سے پچاس میل کی بلندی پر ہو۔ اس سے آگے آنے پر اس کی سابق مقدار و جسامت اتنے متعدد ذرات میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ وہ ہماری بصارت سے قطعاً دور ہو جاتے ہیں۔

شہابِ ثاقب کی بارش

چشم دوربین کی مدد سے دنیا کے مختلف حصوں میں شہابِ ثاقب کی بارش، ان کا ظہور اور ان کی حرکت و رفتار پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ کائنات میں ان کی تعداد اربوں سے بھی زیادہ ہے اور یہ ہر لمحہ نمودار ہوا کرتے ہیں۔ کچھ تو آفتاب کی تیز کرنوں کی وجہ سے اپنی تابندگی کھو ڈالتے ہیں اور دن کو نظر نہیں آتے اور بعض اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ انھیں دیکھنے میں بجز دوربین کوئی دوسری شئے ہماری معاون نہیں ہوتی۔ کافی غور و خوض کے بعد یہ پتہ چلا ہے کہ سال میں ایک خاص وقت ہوتا ہے جب شہابِ ثاقب کی بارش زیادہ پیمانہ پر ہوا کرتی ہے۔ یہ اوقات ۱۳ رنومبر اور ۱۰ راگست بتائے گئے ہیں۔ ان وقتوں میں ہماری دنیا دمدار تاروں کے مداروں سے گذرتی ہے اور اس وجہ سے یہ آتشی منظر بہت عریاں ہوتا ہے۔ نومبر کی بارش اگست کی بارش سے زیادہ تعداد میں اور نمایاں طور پر ہوا کرتی ہے۔ اس وقت ہر لمحہ رات کی سیاہی ان کی آتشبازیوں کے پیہم شراروں سے منور نظر آتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک دیرپا بڑا شہابِ ثاقب نمودار ہوا تھا۔ اور اس کی اطلاعات محفوظ کر لی گئی تھیں۔ اسی سال ایک جلیل القدر مورش شاہ کا انتقال ہوا تھا۔ اور ستاروں کی اس عظیم بارش کو شاہ کے سانحۂ انتقال سے وابستہ کیا گیا۔ ایک قدیمی روایت کا اقتباس یہاں درج ہے۔

"بالکل سیاہ رات تھی اور ساکت فضا۔ بادشاہ کی علالت کی وجہ سے اجالا جیسی بڑھ رہی تھی۔ شب نے ایک تنہائی منزل طے کی تھی کہ شاہ رخصت ہوگیا۔ ہوا کی لہروں میں تیزی آگئی اور آسمان سے کئی تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد یہ منظر اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ جیسے آکاش سے تاروں کی بارش ہو رہی ہو..."

یہ خیال کرنا غالباً دیومالائی روایت پر مبنی ہوگا کہ قدرت تاروں کی اس زبردست بارش سے موش شاہ کی وفات پر انسوغم اور الم نچھاور کر رہی تھی۔ ہاں وہ روایت اس لئے وقعت رکھتی ہے کہ سنہ ۹۰۲ء میں شہاب ثاقب بہت زیادہ طور پر نمودار ہوئے تھے۔ علم نجوم میں یہ تجربہ شدہ واقعہ بہت ہی اہم درجہ رکھتا ہے کیونکہ یہ ان دو متعین اوقات کی بارشوں میں سب سے پہلی رپورٹ ہے جسے انسان نے محفوظ کر لیا تھا۔ سال مذکور کے بعد سے بڑے پیمانہ پر اب تک دو سو بہتر بار شہاب ثاقب کی بارش ہوئی ہے۔

شہاب ثاقب کے عناصر

یہ کہا جا چکا ہے کہ کرہ باد میں تیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد شہابی ریزے اپنی اگلی شکل و صورت و جسامت و ماہیت کھو ڈالتے ہیں اور راکھ ہو کر ہوائیں جذب ہو جاتے ہیں۔ ہوا کی لہریں اس خاکستر مادہ کو اور تحلیل کر دیتی ہیں۔ اور پھر ان میں ٹھنڈک آ جاتی ہے۔ کرہ باد کے گرد و غبار کی ٹکر اور ہواؤں کا تھپیڑا اس مادہ کو پیس کر لاتعداد ریزوں میں منقسم کر دیتا ہے اور آخر ش وہ منزل آ جاتی ہے جب یہ اپنی کل سابق ماہیت کھو چکنے کے بعد فضا میں جذب ہو کر ان کی لہروں کے ہمراہ ادھر ادھر تیرتے پھرتے ہیں۔ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ تقریباً دس ارب لاکھ شہابی ریزے ہر روز کرہ باد میں کائنات سے گرا کرتے ہیں۔ گہری سمندری سطح کی مٹی اور ہوا کی کیمیائی تحقیق کے بعد یہ پتہ چلا ہے کہ سمندروں کی تہہ اور ہوا میں شہابی ریزے کی کافی مقدار ہوتی ہے۔ پھر ان کے تجزیے سے یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ شہابی ریزوں میں دیگر سخت دھاتوں کے علاوہ سخت خام لوہا اور سلور کا بہت زیادہ عنصر ہوتا ہے۔ اس کیمیائی تجزیہ سے اگر یہ کہا جائے کہ ہماری دنیا میں کائنات سے دھات اور تجربات کی مسلسل اور متواتر آمد ہوا کرتی ہے تو کچھ تعجب خیز نہ ہوگا۔

سنگ شہابی

یہ تو وہ مادے ہوئے جو سطح دنیا پر بہ شکل ریزے اور ذرات گرا کرتے ہیں۔ اب ان شہابی ریزوں کا حال سنئے جو بڑی بڑی چٹان اور پتھر کے عظیم ٹکڑوں کی شکل میں سطح دنیا پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ سب چونکہ اپنی جسامت و ماہیت کے ہمراہ آتے ہیں اور اتنی بڑی مقدار رکھتے ہیں کہ ان کی شان شعل دنیا اور اس کے بسنے والوں کے لئے اکثر سامان تباہی اور ہلاکت ہو جاتا ہے۔ ایسے شہابی ریزوں کو سنگ شہابی کہتے ہیں۔ اگلے لوگوں نے ایسے سنگ شہابی کو مسلم تاروں کے نام سے یاد کیا ہے جو معلق آسمان سے آگرے ہیں۔ تاریخ نے چند ایسے سرگزدہ تاروں پر روشنی ڈالی ہے جو غیر متعین اوقات میں کائنات سے چٹان اور پتھر کی شکل میں ہماری دنیا میں گرے ہیں۔ موجودہ مشاہدوں کے قبل یہ باتیں ہمیں ذرا عجیب نظر آتی ہیں، مگر رصدگاہوں کی مدد سے کائنات کی چھان بین میں سیاروں اور سیارچوں کی گردش تاروں کی نقل و حرکت پر کافی غور و خوض اور نگہبانی کے بعد انسان نے ان قدیم روایات کی حقیقت کو عریاں کر دیا ہے اور یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ اوپر سے پتھروں کا یکایک معلق گرنا قطعاً کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔

سنگ شہابی کیا ہیں؟

سنگ شہابی کی ماہیت اور تخلیق بھی شہابی ریزوں جیسی ہوتی ہے۔ یہ بھی کائنات کے ذرات کی سرد اور ٹھوس مجتمع شکل ہیں۔ ان میں بھی سخت خام لوہا اور سلور کا عنصر شامل ہے۔ ذاتی کشش کھو کر جب یہ سطح دنیا پر گرتے ہیں تو کرہ باد سے گذرتے وقت ان کی جسامت و مقدار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ اتنی بڑی جسامت کے مالک ہوتے ہیں جو اکثر ایک ٹن وزن سے اوپر ہوتی ہے کہ کرہ باد کی ٹکر کی وجہ سے اگر ان میں حرارت پیدا ہوتی ہے تو وہ اتنے کم درجہ پر ہوتی ہے کہ یہ کسی تغیر و تبدیلی کے بغیر ہی سطح زمین پر آ موجود ہوتے ہیں۔ چونکہ بڑی جسامت کی وجہ سے یہ کافی وزنی ہوتے ہیں، اس لئے کرہ باد سے گذرتے وقت ان کی رفتار شہابی ریزوں سے کئی گنا تیز ہوتی ہے اور ان کے ساتھ راہ میں پگھل کر خاکستر ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس وجہ سے سنگ شہابی ہماری دنیا پر اپنے پورے آب و تاب اور ڈیل و ڈول کے ہمراہ قیام پذیر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات سنگ شہابی جن کی مقدار چھوٹی ہوتی ہے، ہوا کی ٹکر سے ترخ بھی جاتے ہیں اور کئی ٹکڑوں میں منقسم ہو کر فضا سے برستے ہیں۔ ان کے ٹوٹتے وقت بڑی ہیبتناک آواز ہوتی ہے اور ان کی بارش بڑی جانکاہ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ بارش میں قطروں یا آتشی بوندوں کے عوض چٹان اور پتھر کے ٹکڑے برستے ہیں۔

سنگ شہابی کے گرنے کی چند شہادتیں

سنگ شہابی کے گرنے کا کوئی معین وقت نہیں ہوتا اور نہ یہ دنیا کے کسی مخصوص حصے میں گرا کرتے ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں ان کے گرنے کے واقعات سنے گئے ہیں۔ چند جگہوں کی شہادتیں درج کی جاتی ہیں۔

"تقریباً ۴۰۹ برس پہلے کا ذکر ہے کہ جزائر جاپان کے جنوبی خطے میں دنیا کا ایک بڑا سنگ شہابی گرا تھا۔ ابتدا میں آسمان شہاب ثاقب جیسے تاروں سے یکایک روشن ہوگیا۔ یہ روشنی ہر لمحہ بڑھتی گئی اور آہستہ آہستہ اوپر سے عجیب عجیب قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں زمین و سمندر پر چھوٹے چھوٹے پتھروں کی بارش ہونے لگی اس کے ساتھ آوازوں کا شور و غل اس قدر بلند ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری زمین ہل جائے گی اور ملک تباہ و برباد ہو جائے گا۔ لوگ اس آفت ناگہانی سے خوف و دہشت کے مارے چیخنے اور چلانے لگے ...."

جب بڑے بڑے سنگ شہابی سطح زمین پر گرتے ہیں تو ان کے گرنے سے اکثر خطۂ زمین میں ہیجانی کیفیت ہو جاتی ہے اور سنگ شہابی زمین میں کئی فٹ نیچے دھنس جاتے ہیں۔ اکثر ملکوں میں ان کے گرنے کی جگہوں پر بڑے بڑے گہرے غار دیکھے گئے ہیں۔

ایریزونا میں ایک گہرا غار ہے جس کا قطر تقریباً تین میل ہے۔ اس گہرائی کا اندازہ لگایا گیا تو پانچ سو ستر فٹ سے بھی زیادہ عمیق معلوم ہوا۔ ماہرین طبقات الارض

نے اس کی بنیاد و تخلیق پر مطالعہ کرنے کے بعد یہ ظاہر کیا کہ یہ کوئی عظیم سنگ شہابی کا خود ساختہ غار ہے اور وہ چٹان اس میں موجود ہے ...“

۱۹۰۸ء میں دنیا کا ایک بہت جسیم سنگ شہابی سائبیریا کے شمالی حصے میں گرا تھا۔ یہ بھی بہت ہیبتناک آوازوں کے ہمراہ آیا تھا۔ اس سے بیس میل تک کے درخت اور پودے جھلس گئے تھے۔ ہزاروں میل رقبے کی زمین برباد ہو گئی تھی اور کئی جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس سنگ شہابی کی دھمک اور گونج انگلستان کے علاقوں میں محسوس کی گئی تھی۔

سنگ شہابی کہاں سے آتے ہیں

سنگ شہابی کی بنیاد کے متعلق اب تک کئی نظریے پیش ہوئے ہیں مگر ان کی صحت کو صحیح قرار دینا از حد شکوک سے کم نہ ہوگا۔ ان نظریوں میں سے چند نظریئے درج کئے جاتے ہیں:۔

ابتدائی نظریہ، سنگ شہابی کی ابتدائے آفرینش کو آفاقی ذرات کی گردش اور نقل و حمل پر مبنی کرتا ہے۔ ایک ابدی ملت سے کائنات بعید از قیاس ذرات سے بھری ہے جو ہمیشہ سے متحرک ہیں۔ ان کی مختلف مقدار و حجم ہوتی ہے۔ جس طرح سیارات کا ہر ننھا قطرہ اپنی فطری کشش کی بنا پر ایک دوسرے سے وصل کر لیتا ہے اسی طرح یہ ذرات بھی ایک دوسرے میں مل کر اپنی مقدار میں گوناگوں اضافہ کر لیتے ہیں۔ اور شہابی ریزے بن جاتے ہیں پھر اسی طرح سے لیکن کچھ مدت بعد سنگ شہابی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

دوسرے نظریئے کے مطابق سنگ شہابی کسی ستارہ یا سیارچہ یا کسی فلکی جرم کا کوئی ٹکڑا، کوئی عضو یا کوئی حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ کائنات میں اب تک صرف ایک نظام کا پتہ چلا ہے جسے نظام شمسی کہتے ہیں۔ اس نظام میں متضاد اقسام، مقدار اور شکل و صورت کے متعدد سیارے، سیارچے، قمر، دمدار تارے شامل ہیں۔ یہ تمام اجرام فلکی ہمیشہ گردش میں ہوتے ہیں۔ بعض کوئی معین رفتار سے چلتے ہیں۔ بعض کسی مقررہ اوقات پر نمودار ہوتے ہیں اور بعض اپنے مخصوص مدار پر سفر کرتے ہیں لیکن بہت بڑی تعداد ایسے اجرام کی بھی ہے جن کی نہ کوئی معین رفتار ہے نہ مقررہ وقت اور نہ کوئی مخصوص مدار۔ یہ بالکل آزادانہ رواں دواں ہوتے ہیں۔ ان کی اسی مکمل آزادی کا اکثر یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ یہ آپس میں ٹکرا جاتے ہیں اور کسی سیارہ یا تارے سے زبردست تصادم کر بیٹھتے ہیں۔ اپنے سے بڑی جسامت کے اجرام سے ٹکرانے پر یہ بالکل پاش پاش ہو جاتے ہیں اور ان کے اجزا منتشر ہو کر کائنات میں ادھر ادھر گر پڑتے ہیں۔ وہ ٹکڑا جو ہماری دنیا میں آجاتا ہے ہم اسے سنگ شہابی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

تیسرا نظریہ سنگ شہابی کو آتش فشانی مادہ قرار دیتا ہے۔ بہت سے سیاروں اور قمروں کی سطح اور شکل و صورت کو دوربین سے مشاہدہ کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر بھی ہماری دنیا جیسے آتش فشاں کہسار موجود ہیں اور ان میں اکثر کی سطحوں پر جوالا مکھی کے نشانات پائے گئے ہیں۔ ان باتوں سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کے یہاں آتش فشاں پہاڑ نمودار ہوتے ہیں جو اپنے دہانوں سے آتشی لاوا اگلتے ہیں۔ اب یہ ممکن ہے کہ کسی پر زور آتش فشاں کا لاوا اس قدر بلندی پر چلا جاتا ہے جہاں پہنچ کر وہ سرد ہو جاتا ہے اور قوت کشش سے دور ہو جانے پر یہ کائنات میں ادھر ادھر سنگ شہابی جیسا گر جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نظریہ قدرے قابل یقین سا ہے مگر یہاں اصول ریاضی اور سائنس کی بنا پر قوت کشش پر چند اہم سوالات اٹھتے ہیں اور بڑی بڑی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں اور آخر میں اس کی صحت میں بھی خامی نظر آتی ہے۔ ان نظریوں پر ماہران نجوم، اہل ریاضی اور سائنسدانوں نے خوب رائے زنی کی ہے۔ ان کی صحت پر بڑی بڑی تنقیدیں ہوئی ہیں اور اب تک کوئی متفق الرائے اور جامع نظریہ پیش نہ کر سکا۔ ہاں سبھوں کو اس رائے سے اتفاق ہے کہ سنگ شہابی سخت چٹان یا پتھر ہیں جو غیر معین اوقات میں کائنات سے گرتے ہیں۔

کیا ہوں

[illegible]

عاصی

سنگ شہابی کی اہمیت

آفاق کے یہ ننھے ننھے ذرات اور کائنات کی یہ بڑی بڑی چٹانیں جو بسا اوقات تباہی اور ہلاکت برپا کر ڈالتی ہیں، سائنس اور جغرافیہ کی دنیا میں بہت بڑی ہستی کی مالک ہیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ شہابی ریزے کی کیمیائی تجزیے سے دو دھات برآمد ہوتی ہیں۔ خام لوہا اور نکل۔ جہاں کہیں سنگ شہابی کے گرنے کے واقعات سنے گئے ہیں وہاں جا کر ماہرین طبقات الارض نے انہیں کھوج کھوج کر ڈھونڈھا اور اسے رصد گاہوں اور عجائب خانوں میں لے جا کر محفوظ رکھ لیا۔ کچھ سنگ شہابی کے کئی ٹکڑے کئے گئے اور انہیں بھی کیمیائی طریقہ سے جانچا اور پرکھا گیا۔ وہاں بھی وہی عناصر ملے خام لوہا اور نکل۔ اس تجربے سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ہماری دنیا جو خود بھی نظام شمسی کا ایک اہم جزو ہے اور تمام اجرام فلکی میں یہ دھات شامل ہیں۔ اس سے تخلیق نظام شمسی اور بنیاد دنیا کے گہرے اور عمیق مسئلوں کی چھان بین میں بڑی مدد ملتی ہے۔ سائنسدان علم طبقات الارض

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

خوراک پر کنٹرول اور راشننگ

ہر جمہوری حکومت کا فرض ہے کہ اپنے ہر شہری کو کافی اور اچھا کھانا بہم پہنچائے خوراک کی پیداوار کے مناسب بندوبست ہی سے ایسا ممکن ہو سکتا۔ جہاں تک خوراک کا تعلق ہے ابھی ہمارا ملک اپنی ضرورت خود پوری نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کے لئے عمدہ خوراک فراہم کرنے کے لئے ہمیں دوسرے ملکوں اور خصوصاً برما کا سہارا تکنا پڑتا ہے۔ جنگ سے پہلے بھی ہم اپنی روزانہ ضرورت پورا کرنے کے لئے کافی غلہ پیدا نہیں کر پاتے تھے باقی بچا ہوا تھوڑا سا گیہوں باہر ضرور بھیجا جاتا تھا مگر ساتھ ہی ہمیں اس سے کہیں زیادہ چاول منگانا پڑتا تھا۔ آج حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہیں۔ اب پیداوار تو کافی بڑھ گئی ہے لیکن آبادی بڑھنے، غریبوں کے فی کس پہلے سے زیادہ خوراک کھانے اور فوجی ضرورتوں کے سبب پہلے سے کہیں زیادہ اناج کھایا جا رہا ہے۔ ملک میں خوراک کی پیداوار کی کمی ہے، باہر سے کم غلہ آرہا ہے، نقل و حمل کے ذریعے محدود ہیں اور اناج کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ کیا ان حالات میں کنٹرول ہٹانا اور راشننگ (خوراک بندی) ختم کرنا مناسب ہوگا؟ اگرچہ اب لڑائی کا جھگڑا نبٹ گیا ہے لیکن ابھی ہمیں زمانہ امن کا سکون حاصل نہیں ہو پایا، دنیا کی اقتصادیات کو یکایک جنگ سے پہلے کے حالات پر نہیں لایا جا سکتا۔ جنگ اور امن کے درمیانی زمانہ میں ہمیں زمانہ جنگ سے بھی زیادہ مشکل مسائل حل کرنے ہوں گے۔ اب یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ آخر کنٹرول کب تک قائم رہے گا؟ اسے کب اور کس طرح ختم کیا جا سکیگا؟ اور زمانہ امن کے حالات واپس لانے کے لئے کیا کیا جائے؟ یہ ایسے بڑے بڑے مسائل ہیں جنھیں حسن و خوبی کے ساتھ حل کرنے پر ہمارے ملک کی آئندہ اقتصادیات کا انحصار ہے۔

حال ہی میں دہلی کا ایک روزنامہ یہ سرخی دیتا ہے: "بنگال میں دوسرے قحط کا خوف بڑھتا جا رہا ہے"۔ ہم میں سے بہت سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اس لئے اب ۱۹۴۲-۴۳ء کی طرح دوسرا قحط نہیں پڑے گا؛ اسے آسانی سے روکا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنا اسی صورت میں آسان ہے کہ ہم احتیاط رکھیں اور جن باتوں پر اسوقت عمل نہ کر سکے اب ان پر عمل کریں ورنہ یہ مسئلہ بہت مشکل ہو جائے گا اور پہلے سے بھی زیادہ بُرے نتائج کا خطرہ پیدا ہو جائیگا۔ "تحقیقات قحط کے کمیشن" نے اپنی رپورٹ میں، جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے، "جنگ کے فوراً بعد خوراک کا انتظام" کے عنوان سے ایک مفید باب لکھا ہے اس موضوع کے متعلق مختلف مسائل سے بحث کرنے کے بعد کمیشن یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ "معمولی حالات رفتہ رفتہ ہی واپس آسکتے ہیں اور اس کے لئے تعاون اور باقاعدہ عمل کی ضرورت ہے۔ ورنہ انہی خطرناک قیمتوں اور خوراک رسانی کی دقتوں کے دوبارہ رونما ہو جانے کا خطرہ ہے جو ۱۹۴۳ء کی گرمیوں اور ۱۹۴۳ء کے زیادہ حصہ میں ملک کے اکثر حصوں کی تباہی کا باعث بنے۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ عبوری دور میں خوراک کا انتظام کرتے وقت ہمیں جلد سے جلد قبل جنگ کے حالات واپس لانے کی کوشش کرنے کے بجائے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جس سے معمولی حالات میں خوراک کی قیمتیں زیادہ نہ گھٹ بڑھ سکیں۔ کنٹرول کا موجودہ نظام نہایت پیچیدہ ہے جس میں مرکزی، صوبائی اور ریاستی حکومتوں کا طرز عمل ایک دوسرے پر منحصر ہے۔ یہ نظام رفتہ رفتہ ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک ہمارے ذرائع خوراک کا تعلق ہے، ہمارے حالات اب بھی زمانہ جنگ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ اب عبوری دور اس وقت سے شروع ہوگا جب ہمیں برما سے کافی مقدار میں چاول ملنے لگے گا اور یہ ابھی کچھ وقت تک ضرور باقی رہے گا کیونکہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن پر حکومت ہند ابھی قابو نہیں پا سکتی۔ اول تو برما کے چاول کی درآمد اتنی ہونی چاہیئے کہ اپنے ملک کی پیداوار کی کمی پوری ہو جائے اور اسٹاک دوبارہ بھرے جا سکیں۔ دوسرے اس عبوری دور میں کافی ذرائع نقل و حرکت حاصل ہونے میں دشواری ہوگی۔ جب تک یہ ذرائع کئی گنے نہ ہو جائیں خوراک کے حالات کا بہتر ہونا مشکل ہے۔ دنیا میں خوراک کی کمی ہے مگر دنیا میں گیہوں کی کمی نہیں ہے بلکہ گیہوں منتقل کرنے کے ذریعوں کی کمی ہے۔ جاپان پر فتح پانے کے بعد ہر شخص کو چاول کی کمی پڑنے کا اندیشہ تھا، خاص طور پر ان ملکوں میں جن پر جنگ کا براہ راست اثر پڑا تھا۔ حالات سدھرتے سدھرتے ہی سدھرتے ہیں۔ ہم یکایک میدان جنگ کو کھیتوں میں تبدیل نہیں کر سکتے اور نہ ہی تلوار کو ہلوں کے سانچوں میں ڈھال سکتے ہیں۔ اس لئے یہ عبوری دور اسوقت تک قائم رہے گا جب تک کہ دنیا میں خوراک اور جہازوں کی کمی پوری نہ ہو جائے۔ یہ رفتہ رفتہ ہی ہو سکتا ہے اور تحقیقات قحط کے کمیشن کی رائے میں یہ حالات ۱۹۵۱-۵۲ء تک باقی رہ سکتے ہیں۔ رپورٹ میں تحریر ہے کہ خوراک کے حالات میں زیادہ خرابی ۱۹۴۲-۴۳ء میں پیدا ہونی شروع ہوئی اور شاید یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ دس برس سے کم وقفے میں معمولی حالات پیدا ہو سکیں گے"۔ اگر ہم نے اس زمانہ میں خوراک کے انتظام کے لئے مناسب نظام قائم کر لیا تو یہ دقت کچھ زیادہ نہیں ہے۔

لیسلا دتی

اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ہمیں سارے عبوری دور میں کنٹرول اور راشننگ قائم رکھنے ہوں گے۔ حکومت کا طرز عمل یہ رہے گا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اقتصادی کنٹرول ہٹ لئے جائیں لیکن جب تک چیزوں کی کمی ہے کنٹرول کا باقی رہنا ضروری ہے تاکہ چیزوں کی قیمتوں اور تقسیم میں زیادہ کمی زیادتی نہ ہونے پائے اور ذخیرہ اندوزی

اور نفع بازی رُک جائے۔ ابھی یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ خوراک کا راشننگ کم از کم ایک سال اور چلے گا اور جب تک کپڑا کافی تعداد میں حاصل نہ ہونے لگے کپڑے پر کنٹرول قائم رہیگا خوراک کے ممبر نے حال ہی میں ایک بیان دیتے ہوئے موجودہ حالات اور آئندہ امکانات یوں بیان کیے ہیں:۔ "میرا خیال ہے کہ جن حالات کے ماتحت "بنیادی پلین" اور کنٹرول وجود میں آئے تھے ان میں کم از کم ۱۹۴۷ء کے ختم تک کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوگی" دنیا میں ۱۹۴۵ء کے مقابلہ میں ۱۹۴۶ء میں خوراک کے حالات کا بہتر ہونا مشکل ہے۔ یورپ کے تباہ شدہ ملکوں کو بڑی مقدار میں دوسرے ملکوں سے خوراک منگانی پڑے گی۔ اگرچہ ۱۹۴۶ء میں برما اور مشرق بعید کے دوسرے ممالک مثلاً سیام اور ہند چینی سے چاول باہر بھیجا جا سکتا ہے لیکن برآمد کی مقدار قبل جنگ سے بہت کم ہوگی۔ بہر صورت وہ ممالک جو لڑائی کی وجہ سے تباہ ہو گئے ہیں یا جہاں پہلے بھی مشرق بعید ہی سے چاول آتا تھا ہندوستان کی طرح اسی مقدار میں سے چاول حاصل کرنے کی کوشش کرینگے"

چالیس کروڑ انسانوں کے پیٹ بھرنے کا مسئلہ ہمیشہ پیچیدہ رہیگا جنگ کے حالات میں کنٹرول اور تقسیم کے جدید طریقے سے چالیس کے چالیس کروڑ لوگ پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکتے لیکن لوگوں نے اصولی لحاظ سے راشننگ کے ذریعہ "برابر تقسیم" کے خیال کی بڑی قدر کی ہے۔ بنگال کے قحط نے لوگوں کو سبق سکھا دیا ہے اس لئے اب ملک کے ہر حصہ میں راشننگ کا خوشی کے ساتھ استقبال کیا جا رہا ہے اور اسے باہمی امداد کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ خوراک کے کنٹرول اور راشننگ میں کام کرنے والے پچاس ہزار مردوں اور عورتوں نے اس خوبی سے خدمات انجام دی ہیں کہ حکومت اکثر انہی کے ذریعہ کپڑا، ایندھن اور مٹی کا تیل تقسیم کرانے میں کامیاب ہی ہے۔ اگر ہم فوراً جنگ سے پہلے کے طریقے اختیار کریں اور کنٹرول اور راشننگ ختم کرنے کے لئے چلائیں تو اسکا نتیجہ سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ سر ارد شیر دلال نے بھی حال میں یہی کہا ہے کہ پچھلی جنگ کے بعد کے برے حالات کے خلاف اس مرتبہ ملک کو تباہی سے بچانے کیلئے ہمیں آہستہ آہستہ کنٹرول ہٹانے چاہئیں۔ بیشک اب پوری طرح کنٹرول ہٹا کر دوبارہ لگانے سے تو یہی بہتر ہے کہ کنٹرول ہٹانے کے کام میں جلدی نہ کی جائے۔

شہابِ ثاقب اور سنگِ شہابی ـــــ بقیہ صفحہ ۲۱

کی روشنی میں سنگ شہابی سے تجربہ شدہ دھاتوں کے تموستین اور کثافت پر غور و خوض کر رہے ہیں کہ کس درجہ حرارت، کتنی مدت اور کتنی ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد لوہا اور سلور ایسی ماہیت، تموستین اور کثافت وغیرہ اختیار کرتے ہیں۔

سائنس کے موجودہ اقدام کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب حضرت انسان لوہا جیسے گرانبہا اور اہم دھات کی تلاش میں کائنات کے سیاروں اور تاروں پر جا پہنچیں گے۔ اور ان کے سینوں کو چیر کر کائنات کے ان دور افتادہ سیاروں کو بھی اس بیچاری، بڑانی، غریب دنیا جیسی مفلس و کنگال بنا ڈالیں گے

فریبِ مسرت ــــ مسلم ضیائی

مسرت نام ہے شاید اسی کا باغ ہستی میں
کہ شبنم پھول کے رخسار پہ آنسو بہاتی ہے
چمن میں نالہ و شیون سے اس کے حشر برپا ہے
مگر احباب کہتے ہیں کہ بلبل چہچہاتی ہے
بہار شادمانی شادماں ہونے کے دھوکے میں
خزاں کی آمد آمد پر سریلے گیت گاتی ہے
سیہ بادل پیامی برق خرمن سوز کا آیا
مگر دہقاں سمجھتا ہے کہ قسمت مسکراتی ہے

یہ سب معلوم تھا پھر بھی فریب زندگی کھایا
مسرت کا شجر کیف و طرب کے بار دبرلایا
صبا اٹکھیلیاں کرتی تھی کلیاں مسکراتی تھیں
نشاط انگیز لَے بلبلیں گلشن میں گاتی تھیں
محبت کو نہ دیکھا، ہائے ان کی کم نگاہی نے
اجاڑا گلستاں کو صرصر بے اعتباری نے
نہ دیکھا داغ حسرت لالۂ خنداں کے سینے کا
نظر آیا نہ روزن قلب مسلم کے سفینے کا

مغنّی سے ــــ عرشی خیر آبادی

اے مغنّی تیرے نغموں میں بلا کا سوز ہے
درد میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے تیری ہر صدا
رات کی خاموشیوں میں جب کبھی گاتا ہے تو
ذرّہ ذرّہ کو جہاں کے مست کر دیتا ہے تو
مجھ کو مثلِ ماہیٔ بے آب تڑپاتا ہے تو
جام آنکھوں کا سرشک خوں سے بھر دیتا ہے تو

. . . .

ہاں ذرا پھر ہو اسی انداز سے نغمہ سرا
ڈوب جاتی پھر شراب عشق میں ہر ایک شے
یہ جمود خود فراموشی مغنّی! تا بہ کے؟

پڑوسی

عبدالستار

ڈاکیہ نے خط لاکر دیا، کھول کر دیکھا تو خوشی سے اُچھل پڑا۔ وائسرائے بہادر کے دفتر میں تین سو روپے کی ملازمت مل جانا کچھ کم خوشی کی بات نہ تھی، میں نے تیاری کی اور چار بجے کی گاڑی سے دہلی روانہ ہوگیا۔

پنچکوئیاں روڈ پر اچھا خاصا کوارٹر مل گیا تھا، ایک کھانا پکانے اور اوپر کا کام کرنے والے لڑکے حمید کو گھر سے ساتھ لیتا آیا تھا۔ کوارٹر میں میرا ساتھی وہی ہوتا میں اس کو بھائی کہہ کر پکارتا اور وہ جواب میں "جی میاں" کہہ دیتا، ہم دونوں آپس میں اتنے گھُل مل گئے تھے کہ کوئی اجنبی ہرگز یہ اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ حمید میرا ملازم ہے جبوقت ہم علی بخبتاری کی طرف ہم چہل قدمی کی غرض سے نکلتے تو معلوم ہوتا تھا کہ حمید میرا چھوٹا بھائی ہے اور میں اسکا بڑا ——

حمید اب تک ان خوش نصیبوں میں تھا جن سے شرعاً پردہ جائز نہیں وہ سب کوارٹروں میں بھاگا بھاگا پھرتا اور لوگوں کے چھوٹے چھوٹے کام کر دیتا، جس سے لوگ اس سے بہت خوش رہا کرتے تھے، جس کوارٹر میں ان کا رسوخ ہوتا وہ کوارٹر پنچکوئیاں روڈ کی تازہ خبروں سے محروم نہ رہتا تھا۔ ہر نئی بات کو آناً فاناً سب کے گھر لگا آنا ان ہی کا کام تھا۔

میں ناشتہ سے فارغ ہو چکا تھا۔ حمید دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا "میاں ہمارے برابر والے کوارٹر میں ایک مسلمان آئے ہیں ان کے ساتھ ان کے گھر والے بھی ہیں"
"تو کیا ہے تم کو جی بہلانے کا ایک اور راستہ ملا" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
رونی صورت بنا کر بولا: "اچھا میاں اگر آپ کو بُرا لگتا ہے تو میں کہیں بھی نہ جایا کروں گا کسی کی سبزی ترکاری لا دیتا تھا وقت بے وقت مصالحہ پیس دیتا تھا سو اب وہ بھی نہ کیا کروں گا" "نہیں نہیں میرا مطلب یہ نہ تھا میں تو تم کو صرف چھیڑ رہا تھا" میں نے مناتے ہوئے کہا۔ میاں حمید خوش ہو کر بولے "اچھا میاں ذرا دوڑ کر پوچھ آؤں کہاں سے آئے ہیں، اپنی طرف کے معلوم ہوتے ہیں، پہن پہناؤ، بات چیت سب اپنے یہاں کی سی ہے۔

پردیس میں دیس کی قدر کون نہیں کرتا، گھر کا نام آتے ہی میرا دل اُمنڈ آیا، کیا ہی اچھا ہو، وہ اپنی طرف کے نکل آئیں، تب تو خوب دن کٹیں گے، بس گھر ہی کی باتیں کیا کریں گے، میں نے دل ہی دل میں کہا، حمید وہاں سے جا چکا تھا۔

لتنے تیز طرار تھے تو بس میاں حمید ہی کون کہے، پانچ منٹ میں پوری تحقیقات کر آئے، سنا آپ نے، میں آپ سے کیا کہتا تھا، اپنے ہی یہاں کے نکلے اور بالکل گھر کے آدمی۔ بڑے میاں سے کہتے ہیں بڑی دوستی ہے۔ آپ کو بچپن میں دیکھا ہے، میاں حمید نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ "ابو جان سے دوستی ہے؟" میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ "جی ہاں بہت" حمید میاں نے جواب دیا: آپ کو بلا رہے ہیں کہتے ہیں میں تو تھکا ہوا ہوں۔ اگر تمہارے میاں ہی آ جائیں تو اچھا ہے۔

میں شش و پنج میں پڑ گیا، کون ہیں؟ والد صاحب کے دوست ہیں تو ہمارے بزرگ ضرور ہوئے۔ ان کے سامنے کھل کر بات بھی نہ کر سکیں گے، اگر کہیں ساتھ میں پرانے فیشن کے بھی نکلے تو مصیبت ہی آ جائے گی، اب نماز پڑھو، اب روزہ رکھو، اب وہاں جاؤ، اب یہاں آؤ، اس سے تو ہم ویسے ہی اچھے تھے۔

"السلام علیکم" کسی نے مجھے زور سے سلام کیا۔ میں چونکا تو دیکھا ایک صاحب باقاعدہ ہیٹ پتلون میں ملبوس نئے فیشن کے دلدادہ سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ صورت سے معلوم ہوتا تھا زندہ دل ہیں کہنے لگے:
"بیٹا! تمہارے والد صاحب میرے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں، لیکن اس ملازمت کی وجہ سے برسوں ملنا نصیب نہ ہوا۔ اب تمہیں دیکھ کر تمہارے ابو جان یاد آ گئے ہیں، آؤ چلو گھر میں تمہاری چچی بلا رہی ہیں"۔ میں ساتھ ہو لیا گھر پہنچا تو یقین آیا کہ واقعی یہ تو سب اپنے ہی آدمی ہیں ——

عبدالکریم جنھیں اب میں چچا سے تعبیر کروں گا، بالکل نئے زمانے کے آدمی تھے روزہ، نماز کے پابند تھے، لیکن کوئی ایسی نشانی جس سے معلوم ہو کہ مسلمان ہیں نہ تھی، داڑھی صاف، چڑھی مونچھیں، انگریزی بال، چوڑی پیشانی، یہ انکا حلیہ تھا۔ مجھ سے حد درجہ اُنس ہو گیا تھا، شرم اور جھجک کے ہوتے ہوئے صبیحہ (چچا کی بڑی لڑکی) کو مجھ سے پردہ توڑ دینا پڑا، ایک صاحبزادے بھی تھے، جنھیں چچا میاں نے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ لکھنؤ چھوڑ دیا تھا، بیوی اور والدہ کے علاوہ تین ملازم رکھ چھوڑے تھے!

چچا میاں کے حد درجہ اصرار پر مجھے دن میں متعدد بار کوارٹر میں جانا پڑتا تھا۔ اس عرصہ میں مجھے "صبیحہ" سے اُنس ہوتا جا رہا تھا، میں اس سے محبت کرتا تھا اور اتنی پاکیزہ کہ خود بھی نہ سمجھ سکتا تھا کہ اتنی ہمت مجھ میں کس طرح پیدا ہوئی مجھے یقین ہے کہ وہ بھی مجھ سے ضرور لگاؤ رکھتی ہوگی، لیکن اظہار میں نے اس کی زبان سے اشارتاً بھی نہیں سنا۔

انسان سہل پسند واقع ہوا ہے مجھے یہ ضرور معلوم تھا کہ صبیحہ مجھ سے لگاؤ رکھتی ہے، اور میں یہ بھی خوب سمجھتا تھا کہ وہ زمانہ جدید کی ان تیز طرار اور بے باک لڑکیوں کی طرح نہیں جو ہر طرح مرد کا موقع بے موقع جواب دینے کی منتظر رہتی ہیں مگر کیا جائے کہ سہل پسندی انسان کی سرشت میں داخل ہے، مختصر یہ کہ میں صبیحہ کی اس خاموش روش پر مطمئن نہ تھا اور ایسے راستے کی تلاش میں تھا جو جلد از جلد مجھے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے یعنی شریک زندگی بنانے میں پوری پوری مدد دے۔

آج دفتر میں بہت کام تھا۔ جنگ کی مصیبت ختم ہوتے وقت کسی لے کلرک کو سب سے بڑا شیر دلوایا تھا، صبح سے شام ہوجاتی لیکن اس کمبخت لڑائی کا حساب کسی طرح چکانے میں نہ آتا تھا۔ آج میں خلاف معمول زیادہ کام کرنے کی وجہ سے تھوڑی سی تھکن محسوس کرتا تھا، میں تھوڑی دیر لیٹ رہا لیکن اس وقت آرام کرنے میں خاص لطف نہ آیا، لہٰذا چہل قدمی کے لئے چل کھڑا ہوا ——

پہاڑ گنج کے موڑ پر ایک تانگے والے نے میرے چہرے اور پین پہناوے پر نظر ڈال کر پوچھا، "بابو جی! ہیگ اسکوائر کوارٹر نمبر ۳۰ ہ کے لئے کس طرف جاؤں میں نیا ہوں راستہ نہیں جانتا۔" "ہاں صاحب بڑی مہربانی ہوگی آپ کی بچوں کا ساتھ ہے اور اسی وقت سامان بھی ٹھیک کرنا ہے" ایک صاحب نے جو تانگہ میں بیٹھے ہوئے تھے فرمایا۔ میں تعجب اور حیرت کا مرکز بن کر رہ گیا۔ کوارٹر نمبر ۵۳۵ میرے کوارٹر کے ملحق تھا۔

دو تانگوں میں سامان لدا ہوا تھا اور دو تانگوں میں ہمارے ہمسایہ یعنی خدابخش صاحب کے گھر والے سوار تھے۔ ایک تانگہ میں میں نے بھی اپنے لئے جگہ نکال لی، اور راستہ بتاتے ہوئے کوارٹر نمبر ۳۵ ہ تک لے آیا۔

میرے برابر والے کوارٹر یعنی نمبر ۳۵ ہ میں پہلے ایک بنگالی بابو رہتے تھے، انکا تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے خدابخش صاحب ان کی جگہ آئے تھے نئے زمانے کی داد تو کوئی ان سے لے، انتہا پسند واقع ہوئے تھے، ان کی چال ڈھال بولنے چالنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانی نہیں ہیں مگر بیچارے یا تو خود ہی اس چیز کو نباہ نہ سکتے تھے یا نباہنا نہ چاہتے تھے، لاہور کے رہنے والے تھے۔ آئندہ جانئے کا احتمال طراروں کی دو فرلانگ تک آواز، چائے پیتے وقت سرسڑ کا نغمہ ان کے ہندوستانی ہونے میں مانع ہو جاتا، دو بڑی لڑکیاں، ایک چھوٹا لڑکا، اور ایک ماما، یہ تھی ان کے کوارٹر کی کل کائنات۔

بڑی لڑکی کا نام فیروزہ تھا اور چھوٹی کا گلنار۔ لڑکے کا نام زیر تجویز تھا —— باپ کا اثر آخر صاحبزادیوں پر کیسے نہ پڑتا۔ بڑی لڑکی میٹرک پاس کر چکی تھی اور چھوٹی لڑکی نویں جماعت میں علم کی سعی پیہم سنبھال رہی تھی، دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں نے کم از کم پیرس بیوٹی کورس کا مطالعہ ضرور کر لیا ہے سنئے نئے کاسمٹک کے جمپر، ہر گشتہ بالوں کی نئے انداز سے ترتیب دینا۔ آپس میں "یس سر" اور "نو سر" کا استعمال ان کا خاص مشغلہ تھا۔ لپ اسٹک اور پاؤڈر کوئی ان کے برابر چہاں تو کرے، ایسا معلوم ہوتا تھا پیدائشی ہے،

پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے اتنی گھل مل گئیں کہ مجھے خود تعجب ہوتا تھا، میں نے اپنی تمام تر توجہ ویسے تو فیروزہ پر دے رکھی تھی لیکن سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لئے گلنار سے بھی معاملہ کرنا پڑتا تھا۔ فیروزہ میری بات کو سمجھتی میں دن کو رات کہتا تو وہ میری اطلاع تائید کرتی گویا مجھ سے پہلے اس کے لئے تیار تھی

ایک طرف تو مجھے اپنی کامیابی پر ناز تھا دوسری طرف مرد خداوندی کا یقین ہو چلا کہ منہ مانگی مراد اور اتنی آسانی سے مل جانا قدرت الٰہی کے سوا کسی دوسری طاقت کا کام نہ معلوم ہوتا تھا۔

ہم ایک دوسرے سے ملتے تھے اور اپنے جانتے اتنے قریب آگئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت ہم کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے گی، صرف اب کمی رہ گئی تھی تو رشتہ ازدواج کی۔

اس عرصہ میں میں نے جمیلہ سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا تھا، ان کے کوارٹر سے ملحق ہونے ہوئے بھی میں ان سے کوسوں دور تھا، وہی آنکھیں جو کبھی جمیلہ کو دیکھنے کے لئے بیتاب رہتی تھیں اب کسی دوسری راہ کی متلاشی تھیں اور گرگٹ کی طرح اس صفائی سے رنگ بدل گئی تھیں کہ پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ کیونکر ——

میرے نزدیک قصور جمیلہ ہی کا تھا اگر شروع ہی سے وہ مجھے اس بات کا موقع نہ دیتی تو میں کیوں دوسری راہ تلاش کرتا، اس نے مجھے اتنا موقع بھی نہ دیا تھا کہ میں کبھی اس سے اظہار تمنا بھی کر سکوں، برخلاف اس کے فیروزہ جو ہر وقت مجھے اپنا بنانے کی کوشش کرتی تو کیوں نہ میں اسکی طرف جھکتا۔

وائسرائے بہادر کے شفاخانہ خاص میں ایک نئے ڈاکٹر صاحب کا اضافہ ہوا تھا، انگلینڈ ریٹرن ہونے کے بعد ماہر فن مشہور ہوگئے تھے، اچھے سجیلے جوان تھے نام تھا مسٹر جمیل ——

خدابخش صاحب سے دفتر میں ملاقات ہوگئی تھی اور وہ انہیں گھر پر آنے کی دعوت دے آئے تھے، نئے فیشن میں دعوت دی جائے اور کوئی جنٹلمین اسے قبول نہ کرے تو بہت برا سمجھا جاتا ہے، مسٹر جمیل شام ہی کو کوارٹر میں آدھمکے، فیروزہ نے ان کا استقبال کیا، آپس میں خود ہی ایک دوسرے نے اپنا تعارف کرالیا اور دیر تک بیٹھے خوش گپیاں کرتے رہے۔

مجھے یہ سب باتیں جمیلہ سے معلوم ہوئی تھیں۔ آج دفتر میں "تار ملا، والد صاحب مع گھر والوں کے نوچندی کا میلہ دیکھنے میرٹھ پہنچ گئے تھے مجھے فوراً بلایا تھا کہ دو دن کی چھٹی لے کر میلہ دیکھ جاؤ —— والد صاحب کے حکم کو ٹالنا آسان کام نہ تھا، کوارٹر پر واپس آیا اور ضروری سامان لے کر اسٹیشن جانے کی تیاری کرنے لگا، روزمرہ کی طرح آج بھی فیروزہ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی کہ چلتے ملتے چلیں لیکن فوراً کسی وجہ سے رکا، کل کی رقابت جو مسٹر جمیل کے آنے سے پیدا ہوگئی تھی خود کرآئی اور میں ان کے کوارٹر نہ جا سکا۔

دو ہی دن کے بعد میرٹھ سے واپس آگیا، آکر دیکھتا ہوں تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ تانگہ سے اترتے ہی پیانو کی دلکش آواز میرے کانوں میں آئی، یقیناً فیروزہ گا رہی ہے، میں نے دل میں کہا "لیکن یہ پیانو کون بجا رہا ہے" میں نے کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے سوچا، دل دھک سے ہوگیا، آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں

تیچے سا سالن تیچے اور اوپر کا اوپر۔ مسٹر جمیل جھوم جھوم کر پیانو پر کھیل رہے تھے۔

فیروز جس کے ساتھ جس کے ساتھ اسکا دور کا بھی واسطہ نہیں اس طرح گا رہی ہے، والد دفتر گئے، گلنار اسکول گئی ہے گھر میں اس کے سوا کوئی نہیں۔

یہ الفاظ تھے جو بے اختیار میرے منہ سے نکل پڑے، اور میں سیدھا کوارٹر میں چلا گیا۔

نہ معلوم کیوں دفتر میں کام نہ ہوتا تھا، کیا بات ہے بھائی، آجکل کیسے اداس رہتے ہو، آئینہ دیکھا ہے کیسی پھول سی صورت تھی اور کیسے مرجھا گئی، کیا کوئی خاص بات ہے؟ میرے برابر والے کلرک نے سوالات کی بوچھار کردی "نہیں تو یونہی رات کو جاگ گیا تھا طبیعت خراب ہو رہی ہے" میں نے گھبراتے ہوئے کہا اور وہ میری طرف متوجہ ہوگیا، گویا اب مزید سوالات کا جواب دینا میرے بس کی بات نہ تھی۔

روز بروز میری حالت گر رہی تھی، میرا چہرہ جو کبھی مسکراہٹ بلکہ قہقہوں کا میدان تھا افسردگی کا مسکن بن گیا۔

آج شام دفتر سے واپس آرہا تھا، کوارٹر کے سامنے لان پر فیروز اور جمیل بیٹھے محبت کی پینگیں بڑھا رہے تھے۔ میں قریب سے گزرا، مسٹر جمیل نے میری طرف دیکھ کر فیروز سے کہا "یہ کون رہتے ہیں آپ کے برابر والے کوارٹر میں۔ ہر وقت ان کا چہرہ اداس کیوں رہتا ہے۔ میں نے انہیں کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا" "ہاں یہ ہمارے نئے ہمسایہ ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے آئے ہیں" فیروز نے جواب دیتے ہوئے کہا "نئے ہمسایہ" میں نے ایک بار دہرایا، اتنی بے رخی، اتنی بے اعتنائی کہاں سے پیدا ہوگئی تھی ان میں۔ اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے چاہتا تھا کہ جلد از جلد کوارٹر مجھے اپنے اندر چھپالے۔

آج کمبخت حمید بھی بیمار پڑگیا تھا، سبزی لینے خود جانا پڑا، واپسی میں چچا میاں سے ملاقات ہوگئی "کہاں رہتے ہو بیٹا؟ کتنے دنوں سے تمہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں۔ ارے تم تو بہت دبلے ہوگئے۔ اچھا اب میں سمجھا بیمار ہوگئے تھے میں غلطی سے سمجھ بیٹھا کہ بیٹا ہم سے ناراض ہے۔ میں کوئی غیر تھا کہ مجھ سے کہلا کر بھی نہ بھیجا" انھوں نے بناوٹی سے کہا "اور یہ سبزی خود کیوں لا رہے ہو؟" چچا میاں نے پوچھا "حمید کہاں گیا آج؟" "وہ بیمار ہوگیا" میں نے آہستہ سے کہا "تو چلو ہمارے گھر کھانا کھانا، نہ معلوم صبیحہ تمہیں کتنی مرتبہ یاد کر چکی ہے۔ کل بھی کہہ رہی تھی کہ بھائی جان کیوں نہیں آتے۔ کیا ناراض ہیں کچھ ہم سے؟" انھوں نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اور میں سان پکڑی بھیڑ کی طرح ساتھ ہو لیا۔

دستر خوان چنا گیا، سب نے مل کر کھانا کھایا، رائے عامہ نے میرے اتنے دن تک نہ آنے کی یہ سزا تجویز کی کہ مجھے شام تک یہیں رکھا جائے، صبیحہ نہ معلوم کیوں سب سے زیادہ خوش نظر آرہی تھی۔

"فیروز تو اچھی ہیں؟ کتنے ہی دن سے انھیں نہیں دیکھا" صبیحہ نے مجھ سے پوچھا اور میری آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا نے لگیں۔ فیروز کا نام سنتے ہی مجھ سے نہ رہا گیا

بنتی

اقبال معروف

آ بھی جا موری نگری کے راجا، بن کے امبر نگریا پہ چھا جا
مورے ہونٹوں کو ہنسنا سکھا جا، بن کے آشا تو من میں سما جا
موری سونی نگریا بسا جا

مورے جیون میں چھایا اندھیرا، یہ بتا دے کہ کہاں ہے سویرا
آ کے اکبار تو مسکرا دے، مورے جیون کے دیپک جلا جا
موری سنسار کو جگمگا جا

آ کے بس جا نگریا میں موری، مورے پریتم نہ کر جورا جوری
کاہے کی تھی مورے من کی چوری، پریم کو آ کے پھر سے جگا جا
من کے مندر کو تو جگمگا جا

تورے درشن کو انکھیاں ترستی، مورے پریتم بنا سونی بستی
آ کر چھا جائے دنیا پہ مستی، موری انکھیوں کو مدھرا پلا جا
مورے پرانوں کو پیاسا نہ تو جا

راہ تکتی ہیں انکھیاں تہاری، موری انکھیاں، وہ برہا کی ماری
موری انکھیوں سے آنسو ہیں جاری، موری انکھیوں کو ہنسنا سکھا جا
مورے نینوں میں تو مسکرا جا

توری ڈگری میں انکھیاں بچھا دوں، بن کے دیپک میں جیون جلا دوں
من کو میں بھینٹ تورے چڑھا دوں، ایک جھلکی سجن جو دکھا جا
مورے نینوں کو امرت پلا جا —— آ بھی جا موہے مکھڑا دکھا جا

میں جی بھر کے رو دیا اور صاف صاف قصہ صبیحہ کو سنا کر نہ معلوم کتنی دیر تک مال سے اپنا قصور معاف کراتا رہا۔

اب مجھے محبت کے ساتھ ساتھ صبیحہ سے عقیدت بھی ہو چلی تھی، اور اب میں سمجھا تھا کہ میں نے صبیحہ کی خاموش محبت کو ٹھکرا کر کتنی بھول کی تھی، واقعی فیروز اس لوکی کی بیل کی طرح تھی جو آناً فاناً پھیل کر چند دن بہار دکھا کر ختم ہو جاتی ہے اور صبیحہ اس برگد کے پیڑ کی طرح جو بڑھتا تو آہستہ آہستہ ہے لیکن طول عمر کے ساتھ ساتھ مستحکم اور سایہ دار۔

کوارٹر کے سامنے تانگہ رکا، میں بہت خوش تھا۔ والدہ اور والد میرے نوکر ہو جانے کے بعد پہلی مرتبہ میرے مہمان ہوئے تھے مگر چلنے کی تیاری کرو بیٹا، تم نوکر تو ہو ہی چکے ہو اب ہم تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں "والد صاحب نے میرا منہ چومتے ہوئے کہا، میں نے سوالیہ نگاہوں سے والد صاحب کی طرف دیکھا۔ پیچھے چچا میاں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ——

ایران کی بیرونی تجارت

فرہنگ قزوینی

قدیم فارس نے دنیا کو علم و فن دیا، تہذیب دی، تمدن دیا اور اس لئے فارس حسن و فن کے شیدائیوں کا کعبہ بن گیا۔ جدید فارس (ایران) تیل کا سرچشمہ ہے اور دنیا کو اس سے یہ دولت ملی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف بیوپاری حریفوں کے اختلافات کا میدان بن گیا ہے۔ تیل فارس کی قومی دولت اور اسکی بیرونی تجارت کی کنجی ہے۔ اس سے فارس کی تجارت میں ایک ایسا توازن پیدا ہوتا ہے جس سے اُسے دنیا کے تجارتی نقشہ میں ایک نمایاں جگہ مل جاتی ہے۔

اس کے باوجود صنعتی یا اقتصادی حیثیت سے فارس کی جگہ کچھ زیادہ اونچی نہیں بلکہ سچ پوچھئے تو بہت سی باتوں میں ابھی وہ اقتصادی سفر کی بالکل ابتدائی منزلوں میں ہے۔ تیل ساری دنیا کے لئے مشینی قوت کا سرچشمہ ہے لیکن یہ تیل خود اپنے وطن کو کوئی بڑی صنعت یا بڑے کارخانے دینے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس قوت کے باوجود فارس اب تک ایک زراعتی ملک ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پچھلے دنوں ملک کو صنعتی ترقی دینے کی طرف خاصی توجہ کی گئی اور بعض راہوں میں نمایاں ترقی بھی ہوئی، لیکن مجموعی حیثیت سے قوم کی بیرونی تجارت کے مرکزی رجحان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اور ایران اب بھی کچے مال کا بیوپاری اور بنے ہوئے مال کا گاہک ہے۔ جو مال ایران سے باہر کے ملکوں کو جاتا ہے اسمیں پہلا نمبر پٹرول کا ہے اور اسکی قیمت اس کے پورے بیوپار کا دو تہائی ہے، باقی ایک تہائی میں قالین اور دوسری بنی ہوئی چیزوں کے علاوہ، چاول، کھالیں، انیمن، مچھلی کا اچار وغیرہ شامل ہیں۔ جو مال وہ دوسرے ملکوں سے خریدتا ہے اُن میں سے مشینری، کپڑا، موٹر اور موٹر کے پرزے، کھانے پینے کی تیار کی ہوئی چیزیں، انجنیئری کا سامان، کیمیائی اشیاء اور دوائیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ امن کے معمولی دنوں میں ایران کو کھانے پینے کی چیزیں منگانے کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ اُس کے پاس یہ سامان فاضل بچ جاتا ہے۔ لڑائی سے ذرا پہلے ایک تجارتی سمجھوتے کی بنا پر ایران یہ کھانے پینے کا فاضل سامان جرمنی بھیج دیتا تھا۔ لیکن لڑائی نے وسط مشرق کے دوسرے ممالک کی طرح ایران پر بھی اثر ڈالا اور کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ زندگی کی دوسری ضروریات مثلاً شکر کی شدید کمی یہاں بھی محسوس کی گئی اور اس کمی کو پورا کرنے کے لئے فارس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہزاروں ٹن گیہوں، چنا اور شکر ڈھو ڈھو کر یہاں لایا گیا۔ لڑائی ختم ہو گئی اور اب ایران رفتہ رفتہ اپنی اصلی تجارتی حالت پر واپس آ رہا ہے۔

انیسویں صدی کے آخر تک فارس اور بیرونی ممالک کے درمیان بہت کم تجارتی تعلقات تھے۔ ایران اپنی ضرورت کی چیزیں خود پیدا کرتا تھا، وہ کسی کا محتاج نہ تھا۔ اسکی بیرونی تجارت نہ ہونے کے برابر تھی، اور اس کی مجموعی قیمت تقریباً اسّی لاکھ پونڈ تھی۔ ۱۹۱۰ء میں اس نے ۵۵ لاکھ پونڈ کا مال دوسرے ملکوں سے خریدا اور ۲۰ لاکھ پونڈ کا مال اُن کے ہاتھ بیچا۔ لیکن ۱۹۱۰ء تک بیرونی ممالک کی بنی ہوئی چیزوں کی ایک باقاعدہ یورش شروع ہو گئی اور چند برس کے اندر ایران کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ، زندگی کی ساری ضروریات کے لئے دوسرے ملکوں کا محتاج بن کر رہ گیا اور جو تجارت ۱۹۰۱ء میں ۸۰ لاکھ پونڈ کے قریب تھی وہ ۱۹۱۹-۲۰ء میں بڑھ کر [illegible] کروڑ ۹۹ لاکھ پونڈ تک پہنچ گئی۔ اس زمانہ میں ایران نے دوسرے ملکوں سے سوتی کپڑا، تاگا، شکر، چائے، مٹی کا تیل، مشینری، لوہے کا سامان اور پٹرول جیسی چیزیں حاصل کیں اور ان چیزوں کا ملکی تجارت پر اتنا بوجھ پڑا کہ ۱۹۲۳-۲۴ء تک اسکا سارا توازن بگڑ گیا۔ ۱۹۲۴-۲۵ء میں صورت حال بدلی اور اس نے ایک کروڑ ۳۸ لاکھ کا مال بیچا اور دو کروڑ ۲۸ لاکھ کا خریدا۔

دنیا کی بڑی معاشی کساد بازاری کے زمانہ میں ایران کو پھر دھکا لگا اور ۱۹۳۲-۳۳ء میں اسکی خریداری ایک کروڑ ۷ لاکھ پونڈ اور فروخت ایک کروڑ ۰۰،۷ لاکھ ۵۰ ہزار پونڈ رہ گئی۔ یہ صورتِ حال بے حد پریشان کن تھی اور رضا شاہ پہلوی کی حکومت نے اگر اس کا علاج نہیں کیا تو کم سے کم اس کی روک تھام کی طرف ضرور قدم بڑھایا۔ فروری ۱۹۳۰ء میں غیر ملکی تبادلہ کا کنٹرول اور ۲۵ فروری ۱۹۳۱ء کو قانون غیر ملکی اجارہ داری کے نام سے دو قوانین پاس کئے گئے۔ دوسرے قانون نے ایران کی اقتصادی ترقی کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولدیا۔ اس قانون کی رو سے چند خاص قسم کی چیزوں (خصوصاً تفریحی) کی درآمد قطعی بند کر دی گئی، بعض دوسری چیزوں کی درآمد پر پابندی لگا دی گئی اور جن چیزوں کی درآمد کی اجازت دی گئی اُس کے لئے بھی اجازت نامہ کی شرط لازمی کر دی گئی۔ اس کے علاوہ اس قانون کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ کسی مال کی درآمد اسوقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اُسی قیمت کا مال باہر نہ بھیجا جائے۔ مختصر طور پر یہ قانون کچھ اسطرح کا تھا :-

اگر کوئی شخص ایران سے باہر کچھ مال لے جانا چاہے تو مال لے جانے سے پہلے اسے حکومت سے لائسنس حاصل کرنا پڑتا تھا۔ لائسنس صرف اس شرط پر ملتا تھا کہ اس مال کی قیمت نقد نیشنل بنک میں جمع کر دی جائے۔ بنک میں جمع کئے ہوئے روپے کی ضمانت پر باہر کے تاجر کو اس بات کی اجازت دی جاتی تھی کہ وہ جمع کئے ہوئے روپے کی زیادہ سے زیادہ نصف قیمت کے برابر مال ایران میں لا سکتا ہے۔ اسطرح بچا ہوا آدھا روپیہ سرکاری خزانہ میں منتقل ہو جاتا تھا۔ اور اس سے اس قسم کے کام لئے جاتے تھے جیسے طالب علموں کو یورپ بھیجنا یا فوج اور پولیس کے لئے سامان وغیرہ خریدنا۔

اس قانون کے نفاذ سے ایران میں نہ صرف تجارتی توازن قائم ہو گیا بلکہ اس سے

ملکی تجارت میں بے حد ترقی ہوئی اور ۳۷-۱۹۳۶ء تک درآمد کے مال کی قیمت ایک کروڑ ۳۰ لاکھ اور برآمد کے مال کی قیمت ۲ کروڑ ۱۴ لاکھ ہو گئی۔ جنگ کے دوران میں درآمد کی مقدار ویسی ہی رہی لیکن برآمد کی مقدار میں ترقی ہوئی ۳۹-۱۹۳۸ء میں باہر جانے والے مال کی قیمت ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ پونڈ تھی ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۲ کروڑ ۲ لاکھ اور ۴۱-۱۹۴۰ء میں ۳ کروڑ ۴ لاکھ۔ اس اضافہ کی خاص وجہ یہ تھی کہ باہر جانے والی چیزوں کی قیمت میں اضافہ ہو گیا تھا جن ملکوں سے ایران کی تجارت زیادہ ہے ان میں سے روس، امریکہ، جرمنی، ہندوستان، انگلستان، ترکی، عراق اور جاپان خاص ہیں۔ ایران کے تجارتی نقطۂ نظر سے وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں کی حیثیت بدلتی رہی ہے۔ مثلاً پچھلی لڑائی سے پہلے ایران کی بیرونی تجارت کا سب سے بڑا شریک روس تھا۔ برطانیہ اور برطانوی حکومت کے ممالک، جن میں ہندوستان بھی شامل ہے، دوسرے نمبر پر تھے۔ ترکی، جرمنی، اور فرانس کا نمبر اسکے بھی بعد آتا تھا۔ لڑائی کے بعد بالشویک انقلاب کی وجہ سے حالات بالکل بدل گئے۔ روس تجارتی دوڑ میں بالکل پیچھے رہ گیا اور ہندوستان اور انگلستان نے ایران کی تین چوتھائی بیرونی تجارت پر قبضہ جما لیا یہ صورت کوئی ۱۹۲۵ء تک رہی اس کے بعد روس نے اس تجارتی دوڑ میں پھر اپنی جگہ حاصل کر لی۔ ان دنوں جرمنی، جاپان اور امریکہ نے بھی بڑا زور لگایا۔ دوسری جنگ (جو ابھی ختم ہوئی ہے) میں روس کو جرمنی کے ساتھ الجھنا پڑا اور اس لئے تجارتی ترازو کا پلڑا امریکہ کی طرف جھک گیا اور اسکا نام فہرست میں سب سے پہلے آگیا۔ جرمنی اور جاپان بھی پیچھے رہ گئے اور یورپ کے ملکوں نے جو بازار خالی چھوڑ دیا تھا اس پر ہندوستان، انگلستان اور عراق قابض ہو گئے۔

ایران کو دوسرے ملکوں سے جو مال لینا پڑتا ہے اس میں خاص خاص مشینری لوہے کا سامان کیمیائی اشیاء، دوائیں، کپڑا، موٹریں، چائے اور شکر ہیں۔ پچھلی بڑی لڑائی سے پہلے ان چیزوں میں کپڑے اور شکر کا نمبر سب سے پہلا تھا۔ ۱۲-۱۹۱۱ء میں ۱۷ کروڑ ۸۰ لاکھ قران کا سوتی کپڑا اور ۱۲ کروڑ ۸۰ لاکھ قران کی شکر دوسرے ممالک سے ایران میں آئی ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۹ء تک کپڑے کی درآمد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اور شکر کی درآمد بہت کم ہو گئی۔ اس کے بجائے چائے اور مشینری کی درآمد بڑھ گئی۔ ۱۹۳۱ء میں حکومت نے تجارتی تحفظ کے لئے باہر والوں پر پابندیاں لگائیں اور ملکیوں کو اجارہ داریاں دینے کا ایک لمبا چوڑا پروگرام شروع کیا۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ ایران کم کم سوت، سوتی کپڑے، اونی کپڑے، ریشم، سن، شکر، تیل اور لوہے کے سامان کے لئے دوسرے ملکوں کا محتاج نہ رہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ملک کے مختلف حصوں میں کارخانے کھولے گئے۔ اور ان تحفظات سے بعض باتوں میں حیرت انگیز ترقی ہوتی رہا تک کہ ۱۹۳۵ء کے بعد سے تاگا باہر سے آنا بالکل بند ہو گیا) پھر بھی رضا شاہ پہلوی کا یہ خواب کہ ایران بیرونی درآمد کا محتاج نہ رہے شرمندۂ تعبیر رہا۔ ایران اب بھی بیرونی درآمد کا محتاج ہے اور ابھی کچھ عرصہ تک رہے گا۔ جنگ سے پہلے ۳۸-۱۹۳۷ء میں ایران نے بیرونی ممالک سے ۱۰ کروڑ اسی لاکھ ریال کا لوہے کا سامان ۱۸ کروڑ ۳۰ لاکھ ریال کا سوتی کپڑا اور سامان، ۹ کروڑ ۲۰ لاکھ ریال کی مشینری، ۹ کروڑ دس لاکھ ریال کی شکر، ۶ کروڑ ریال کی چائے، ۴ کروڑ اسی لاکھ کی موٹریں اور پرزے اور اس کے علاوہ برتن اونی کپڑا اور سیمنٹ وغیرہ خریدا۔ ۳۶-۱۹۳۵ء تک تو تیل بھی روس سے آیا کرتا تھا۔ اسلئے کہ جنوبی ایران کے مقابلہ میں روس سے لانے میں خرچ کم پڑتا تھا لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد سے، ایک ریلوے لائن کے بن جانے اور کرمان شاہ میں تیل کے صاف کرنے کے کارخانہ کے قیام کی وجہ سے اب ملک کے مختلف حصوں میں تیل آسانی سے اور کم قیمت پر پہنچایا جا سکتا ہے۔ جنگ کے دوران میں کھانے پینے کی بھی بہت سی چیزیں باہر سے منگانی پڑیں لیکن جہازوں کی کمی کی وجہ سے بھاری مشینری اور انجنیری کا سامان بڑی مقدار میں نہیں لایا جا سکا پھر بھی لڑائی کی بڑھی ہوئی قیمتوں کی

مسافر سے

اے مسافر، راہرو، اتنا پست ہمت کیوں ہے؟
نیند میں تو اسطرح سرمستِ غفلت کیوں ہوا؟

یہ کُرۂ ذوقِ طلب میں کیسا سرگرداں ہے دیکھ
یہ جہاں کیسا دورِ شوق میں رقصاں ہے دیکھ

ہے صدائے برق سے پیدا نشاطِ زندگی
اسکے حق میں ہے چراغِ راہ اس کی روشنی

اس چمن کی نوبہار و حُسن کا مقصد ہے کیا
آسماں پر ازدہامِ ابر کا مقصد ہے کیا

وادیوں میں کوہ کی کیوں آبشاریں ہیں رواں
کیوں بہار آتی ہے کرنے سبزہ کو پھر سے جواں

دیکھ کیسا مہر کی اُلفت میں سرگرداں ہے ماہ
کاروانِ نجم ہے دن رات کیسا گرمِ راہ

کیوں عناصر میں ہے حرکت، پھول کیوں رنگین ہے
دیکھ غنچے کا تبسم، کیوں کرن زریں ہے

چشم وا کر، دیکھ رفتارِ جہانِ تیز گام
وارِ دنیا میں ہے انساں پر تن آسانی حرام

یاد رکھ، تو اشرفِ مخلوق ہے اے بے خبر
دیں ملائک سجدۂ تعظیم جس کو، وہ بشر

خوابِ غفلت چھوڑ، وہ آتی ہے آوازِ درا
راہرو بیدار ہو، رختِ سفر سر پر اُٹھا

بیدار

وجہ سے ملک میں بعض چھوٹی چھوٹی صنعتیں مثلاً سوڈیم کاربونیٹ، سوڈیم ہائڈروکسائڈ پوٹیشیم بائی کاربونیٹ، نفت وغیرہ قائم ہوگئیں اور ان چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی وجہ کر ان چیزوں کی درآمد نسبتاً کم ہوتی۔

ایران کی ساری درآمد کا دار و مدار اس کی کچے مال اور خصوصاً تیل کی کثیر برآمد کی مقدار پر ہے۔ ملک کی برآمد کا دو تہائی حصہ تیل ہے۔ باقی ایک تہائی میں پھل، قالین، سوت، اون، گوند، بادام، افیون، چاول اور کھالیں شامل ہیں پچھلی جنگ عظیم سے پہلے، جب تیل کی صنعت نے اچھی طرح ترقی نہیں کی تھی۔ ایران کی بیرونی تجارت میں سب سے پہلا نمبر پھلوں کا تھا لیکن چند سال بعد پہلا نمبر تیل نے لے لیا ۱۹۲۱ء میں ایران نے دس لاکھ ٹن تیل دوسرے ملکوں کو دیا ۱۹۴۲-۴۳ء میں یہ مقدار ۴۳ لاکھ ٹن ہوگئی تیل کے بعد دوسرا نمبر اون کا اور تیسرا قالینوں کا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں جو مال ایران نے دوسرے ملکوں کو بھیجا اس کی قیمت کا خلاصہ یہ ہے:-

اون، ۱۴ کروڑ ۱۵ لاکھ ریال، قالین ۱۲ کروڑ ۱۶ لاکھ ریال، گوند ۸ کروڑ ۲۶ لاکھ ریال، بادام سات کروڑ تین لاکھ ریال، افیون ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ ریال، سوت تین کروڑ ۴۰ لاکھ، ریال، کشمش ۲ کروڑ ۹ لاکھ ریال اور چاول ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ ریال۔

ایران کی بیرونی تجارت میں ہندوستان کی ایک اہم حیثیت ہے۔ اب سے مدتوں پہلے بھی ان دونوں ملکوں کے تجارتی تعلقات بہت گہرے تھے۔ ہندوستان ایران کو اور ایران کے راستے سے دوسرے ملکوں کو اپنی ململ، تن زیب، جواہرات زردوزی، اونی اور ریشمی کاموں کے لباس، ہاتھی دانت کا سامان اور بہت سی چیزیں بھیجتا رہا ہے۔ یہ ساری بیرونی تجارت مدتوں عرب اور ایرانی تاجروں کے ہاتھ میں رہی ہے۔

آج کل بھی ہندوستان اور ایران میں تجارتی تعلقات قائم ہیں اور یہ تجارت خشکی کے راستے سے برطانوی بلوچستان میں ہوکر اور بحری راستہ سے خلیج فارس میں ہوکر کی جاتی ہے۔ ان دونوں راستوں سے دونوں ملکوں میں تجارت ہورہی ہے موجودہ جنگ سے پہلے (۱۹۳۸-۳۹ء میں) ایران سے ہندوستان آنے والے سامان کی قیمت تین کروڑ ۸۴ لاکھ روپے تھی، اور اس سامان میں پھل بادام، کشمش، کھجوریں، جڑی بوٹیاں، کھالیں، دھاتیں، تیل، رنگ اور وارنش بیج، قالین اور خوشبودار چیزیں شامل تھیں۔ لڑائی کے زمانہ میں یہ درآمد اور بھی زیادہ ہوگئی۔ خاصکر تیل کی زیادتی کی وجہ سے ۱۹۴۱-۴۲ء میں درآمدہ اشیاء کی قیمت ۶ کروڑ ۳ لاکھ تک پہنچ گئی اور ۱۹۴۳-۴۴ء میں ۱۸ کروڑ ۳۰ لاکھ تک۔ خشکی کے راستہ سے دونوں ملکوں میں جو تجارت ہوتی رہی ہے اس کے اعداد و شمار صرف یکم اپریل ۱۹۴۱ء کے بعد سے مل سکے ہیں۔ اس سے پہلے اس تجارت کے اعداد و شمار نہیں محفوظ نہیں ہیں ۱۹۴۱-۴۲ء میں خشکی کے راستہ کی درآمد ایک کروڑ ۴۴ لاکھ روپے ہے۔ اس میں صرف پھلوں، میووں اور ترکاریوں کی قیمت ۳۵ لاکھ روپے ہے۔ قالینوں اور کمبلوں کی ۳۰ لاکھ، مسالوں کی ۱۷ لاکھ، اور کھالوں اور سموروں کی تیرہ لاکھ روپے۔

اس کے مقابلہ میں ہندوستان سے جو مال ایران گیا اس کی تفصیل یہ ہے:-
۱۹۳۸-۳۹ء میں ۸۰ لاکھ اور ۱۳ ہزار روپے ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۹۱ لاکھ ۵۵ ہزار روپے ۱۹۴۰-۴۱ء میں ۶۵ لاکھ ۱۰ ہزار روپے، ۱۹۴۱-۴۲ء میں ایک کروڑ ۳۲ لاکھ ۵۹ ہزار روپے ۱۹۴۲-۴۳ء میں ۴ کروڑ ۲ لاکھ، ۵۰ ہزار روپے کا مال ہندوستان سے ایران گیا۔ جو چیزیں ہندوستان سے ایران گئیں ان میں سے خاص خاص چائے، کافی، کھانے پینے کی چیزیں، چاول، شکر، سوتی سامان، سن کی بنی ہوئی چیزیں، شیشے اور المونیم کی بنی ہوئی چیزیں، دوائیں اور کیمیائی اشیاء وغیرہ ہیں۔ لڑائی کے زمانہ میں کھانے پینے کے سامان، شکر اور کپڑے کی مقدار بڑھ گئی ۱۹۴۲-۴۳ء میں صرف ہندوستان سے ایران جانے والے کپڑے کی قیمت ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ تھی۔ اس زمانہ میں سرحد کے خشکی کے راستہ سے بھی ہندوستان سے بہت زیادہ مال ایران گیا ۱۹۴۲-۴۳ء میں ہندوستان سے ایران جانے والے مال کی قیمت ۴ کروڑ، ۳۰ لاکھ روپیہ تھی۔

ان اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مال کی ایران میں بڑی اچھی کھپت ہے۔ جنگ نے جرمنی اور جاپان کو ایران کی منڈی سے باہر نکال دیا ہے۔ یہ جگہ ایران کا پڑوسی ہندوستان آسانی سے لے سکتا ہے۔

حیدرآباد شاہراہ ترقی پر

شنکر دیال

اعلیٰحضرت نواب سرعثمان علی آصف جاہ ہفتم نظام حیدرآباد و برار کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ انفرادی طور پر دنیا کے سب سے زیادہ امیر انسان ہیں تاہم اس قدر دولت و ثروت نے ان کو بالکل غیر متاثر رکھا ہے۔ انہیں امیرانہ ٹھاٹ دکھانے سے سخت نفرت ہے اور اسی لئے وہ ایک معمولی انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا لباس بالکل سادہ ہوتا ہے۔ ظاہری شان اس میں مطلق نہیں ہوتی۔ تاہم اس بے رنگ بیرونی سطح کے نیچے ایک غیر معمولی شخصیت پوشیدہ ہے۔ اعلیٰ درجہ ذہین و فطین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ عربی، اردو، فارسی کے عالم و فاضل ہیں اور انگریزی زبان بھی خوب جانتے ہیں۔ وہ بڑے محنتی اور جفاکش ہیں۔ تمام وقت سرکاری کاغذات پر دستخط کرنے اور نظام حکومت کی دیکھ بھال میں گذر جاتا ہے۔ وہ اپنی رعیت کی فلاح و بہبود چاہتے ہیں۔ اور اسی لئے ان کی رعیت بھی ان کی لائق تحسین خوبیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے پوری طرح وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیتی ہے۔

اس ریاست کا رقبہ جس پر اس حلیم الطبع، فاضل اجل اور پابند دین متین بادشاہ کی حکومت ہے، جزائر برطانیہ سے بھی زیادہ ہے کیونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت پیدا ہوتی رہی ہے۔ قدیم زمانے میں یہاں علی التواتر آندھرا، چالوکیہ اور راشٹرا کوٹ جیسے با اقتدار خاندانوں کی حکومت رہی ہے۔ قرون وسطیٰ میں بہمنی خلفا کا پرچم بھی اس جگہ لہراتا رہا ہے۔ نیز احمد نگر میں نظام شاہی، گولکنڈہ میں قطب شاہی اور بیجاپور میں عادل شاہی حکومتوں کا سکہ چلتا رہا ہے۔

حیدرآباد میں فنون تعمیر و لطیفہ کے بے بہا خزانے وراثت انسان بنے رہے ہیں۔ بھلا کس شخص نے ایلورا اور اجنتا کے ان غاروں کا حال جو چٹانیں کاٹ کاٹ کر بنائے گئے تھے اور ان کی دیدہ زیب نقاشی کی تعریف نہ سنی ہوگی۔ دیواروں کی استرکاری پر بنے ہوئے نقوش کی تعریف کرتے ہوئے مسٹر جون گریفتھ نے جو اجنتا کے وفد آثار الصنادید کے سرگرم رکن رہے ہیں، بیان کیا ہے کہ وہاں کے لطیف و رنگین نقش و نگار فن کا مکمل ترین نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس درجہ حسین و دلآویز ترجمان حقیقت و پاسبان روایات، مختلف النوع اور دیدہ زیب ہیں کہ انہیں اٹلی کی اس قدیم مصوری کے برابر سمجھنے کے لئے مجبور ہوں جس کی تعریف ساری دنیا کرتی ہے۔ بلاشبہ فنون لطیفہ کی تعلیم دینے کے سلسلے میں ہندوستانی فنون کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے اجنتا کے نقوش میں بہترین نمونہ کے پیش کئے جاسکتے ہیں"۔ اسلامی عمارتوں کے ضمن میں گلبرگہ کی جامع مسجد، دولت آباد کی چند مینار، محمود گاواں کا مدرسہ اور حیدر کی مشہور عمارت، چار مینار کو مشرق کی اعلیٰ ترین یادگاروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

حیدرآباد کا بہت بڑا حصہ ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتا ہے جنوبی ہند کے دو بڑے دریا کرشنا اور گوداوری اپنے بہت سے معاونین سمیت اسے سیراب کرتے ہیں۔ تمام ریاست کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مغربی علاقہ جہاں مرہٹی بولی جاتی ہے، مرہٹ واڑا کہلاتا ہے مشرقی علاقہ جہاں تلیگو عام فہم ہے تلنگانہ کہلاتا ہے نسلی اور لسانی اختلافات کے علاوہ دونوں علاقے جغرافیائی اعتبار سے بھی الگ الگ ہیں۔ مغربی حصے میں سرسبز و شاداب مرغزار، خوشگوار پہاڑیاں اور پرفضا وادیاں ہیں۔ جہاں بہت بڑی مقدار میں روئی کی کاشت ہوتی ہے۔ دوسرا حصہ جہاں کی مٹی میں شورے اور کھار کی آمیزش ہے۔ نہایت خشک اور بنجر ہے اور اس کی آبادی بھی زیادہ گنجان نہیں ہے۔ حیدرآباد کی سرزمین معدنیات کے لحاظ سے بھی مالامال ہے۔ کئی مقامات سے لوہا اور کوئلہ برآمد ہوتا ہے۔ ورنگل کے ضلع میں ابرق، نیلم، لعل و یاقوت اور کریم نگر میں ایک قسم کے سرمے کی کانیں ہیں۔ گلبرگہ کے قریب شاہ آباد سے چونے کا پتھر نکالا جاتا ہے جو زیادہ تر فرش بنانے کے کام آتا ہے۔ اس کا سیمنٹ بھی بنتا ہے۔ چنانچہ شاہ آباد کا سیمنٹ مشہور ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے قلب ہندوستان میں واقع ہونے کے باعث حیدرآباد ہندوستان کے تقریباً سب مذہبوں، قوموں اور ثقافتوں کا مرکز رہا ہے۔ اس کی کل آبادی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے جس میں سے زیادہ تعداد بمبئی، مدراس، صوبجات متحدہ و متوسط اور پنجاب کے رہنے والوں کی ہے۔ بعض لوگ ان ایرانیوں، عربوں اور ترکوں کی اولاد میں سے ہیں جو صدیوں پہلے یہاں آئے تھے۔ اسی طرح ہر مذہب کے پیرو اس ریاست میں موجود ہیں اور کئی قسم کی زبانیں رائج ہیں۔ ان اختلافات کے باوجود سب لوگ ایک بڑے کنبے کے افراد معلوم ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ریاست کے حکمرانوں کی حکمت عملی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ مختلف عقائد کے ماننے والوں کے ساتھ بالکل غیر جانبدارانہ سلوک روا رکھا جائے۔

حیدرآباد کے موجودہ حکمران خاندان کی بنیاد نواب آصف جاہ نے رکھی تھی جو شہنشاہ اورنگ زیب کی فوج کے سالار تھے۔ اعلیٰ حربی اور سیاسی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک ناموریستی ہونے کے باعث ان کو نظام الملک کا خطاب دے کر ۱۷۱۳ء میں دکن کا نائب السلطنت مقرر کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت سے آج تک حیدرآباد کے تمام فرمانرواؤں کو یہ خطاب ورثے میں ملتا رہا ہے۔ سلطنت مغلیہ کو زیادہ مستحکم کرنے کے سلسلے میں آصف جاہ کی پیہم کوششیں ناکام رہیں۔ چنانچہ ملک بھر میں پھیلنے والی بدامنی کا جھگڑا چکانے کے لئے انھوں نے یہ ترکیب کی کہ اس صوبے کو امن و عافیت کے ساتھ اپنے ہی زیر تسلط رکھنے کے خیال سے ۱۷۴۲ء میں اپنی خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا۔ موجودہ نظام جو اس خاندان کی ساتویں پشت میں ہیں ۱۹۱۱ء میں تخت نشین ہوئے اس وقت ان کی عمر صرف ۲۵ سال تھی جو دوسرے حکمرانوں کی بہ نسبت بہت کم تھی تخت نشین ہونے کے فوراً ہی بعد نظام نے اعلان کیا۔ "میری زندگی کا نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ اس لئے اس وقت مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں

کہنا کہ میرے سینے میں جوش عمل نے ایک زبردست ہیجان برپا کر رکھا ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں اپنے دادا بزرگوار کے نقوش قدم پر چلتے ہوئے حکومت ہند اور اپنی رعایا دونوں کے ساتھ وہی حسن عمل روا رکھوں جو ان کے پیش نظر تھا۔ تاکہ میں اپنے آپ کو ایک باوفا دوست ہونے کے ساتھ ساتھ رعیت کا بہی خواہ ثابت کر سکوں۔" آج ان کی حکومت کے ۳۵ سال گذرنے کے بعد ہر شخص بلا تامل کہہ سکتا ہے کہ نظام دکن نے رعایا کی ان توقعات کو پورا کر دکھایا ہے جو اس موقع پر قائم کی گئی تھیں۔ نظام نے ہر لحاظ سے اپنی رعایا کی عام زندگی کی اس خوش اسلوبی کے ساتھ کایا پلٹ دی ہے کہ حیدرآباد کا ظاہری نقشہ ہی بدل گیا ہے اور اس کا شمار عہد حاضر کی ترقی یافتہ نئی سلطنتوں میں ہونے لگا ہے۔

گذشتہ سال حضور وائسرائے نے دورۂ حیدرآباد کے موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا۔ "اگر ہندوستان کی ریاستیں ہندوستان کی آئندہ حکمت عملی میں کوئی کارِ نمایاں کر دکھانا چاہتی ہیں تو ان کے لئے مناسب ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی ہی حدود کے اندر اعلیٰ قسم کی مستحکم و مضبوط آئینی حکومتیں قائم کر کے انھیں اچھی طرح ترقی دیں۔" چنانچہ ۱۹۳۹ء کے شروع ہی میں نظام دکن نے حضور وائسرائے کے فرمان کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک اہم قدم آگے بڑھا دیا۔ یعنی اس خیال سے کہ حکومت اور رعایا کے مابین ایک قریبی تعلق پیدا ہو، ایسی آئینی اصلاحات کا اعلان کر دیا جو نتائج کے اعتبار سے بہت موثر ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس تجویز کے مطابق نہایت وسیع پیمانے پر ایک ایسی مجلس قانون ساز قائم ہوئی ہے جس میں اکثریت منتخب شدہ اراکین کی ہوا کرے گی۔ اور طے کرنے کے لئے عام قسم کے مسائل اس کے پیش نظر رہا کریں گے مجلس عظمیٰ اور تمام مقامی جماعتوں کے لئے بنیادی نمائندگی مخلوط انتخابات کے ذریعہ عمل میں آیا کرے گی۔ اسی تجویز کے مطابق چند مجالس مشاورت بھی قائم ہوا کریں گی جو حکومت کے مختلف محکموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے ہوئے مذہبی، مالیاتی، تعلیمی اور زراعتی موضوعات پر مفید مشورے دیتی رہیں گی۔ چنانچہ مختلف اصلاحات کو تیزی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔

جملہ اصلاحات میں سے جن کو حیدرآباد میں مد نظر رکھا گیا ہے، غالباً سب سے زیادہ اہم اصلاح جس کی مثال ہندوستان بھر میں کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی تعلیم کے میدان عمل میں ہے۔ کچھ عرصہ سے تمام ملک کے اعلیٰ ماہرین تعلیم سختی کے ساتھ اس ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں کہ ذریعہ تعلیم کسی ایک ہندوستانی زبان میں ہوا کرے لیکن حیدرآباد کے سوا کسی ریاست یا صوبے نے اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں یہ ضروری تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔ نصف صدی سے زیادہ مدت تک ریاست والوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام مدراس یونیورسٹی کے سپرد رہا لیکن نتائج اسقدر ہمت شکن رہے کہ آخرکار ۱۹۱۷ء میں سر اکبر حیدری نے کل صورت حالات کا جائزہ لیا اور ایک یونیورسٹی کا افتتاح کرنے کی سفارش پیش کی تاکہ اس کے ماتحت تعلیم کے ساتھ ساتھ امتحانات بھی ہوا کریں۔ اور یہ بھی طے کیا کہ اردو زبان ذریعۂ تعلیم رہے اور اسی میں امتحان لئے جایا کریں۔ یہ سفارشات قبول ہو گئیں اور ۱۹۱۸ء میں ایک شاہی فرمان کے بموجب جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آگیا۔ جامعہ کے لئے اردو کی کتابیں مہیا کرنے کی غرض سے ترجمہ و تالیف کا ایک ادارہ قائم ہوا۔ اس ادارے نے ہر قسم کے فنی اور دوسرے علمی موضوعات پر اعلیٰ کتابیں مرتب کر کے زبان اردو کو صد درجہ مالا مال کر دیا۔

حیدرآباد کا مالیانہ ہر سال بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ صورت ٹیکس میں اضافہ کر دینے سے پیدا نہیں ہوئی ہے (درحقیقت حیدرآباد میں مختلف ٹیکسوں کی شرحیں اسقدر قلیل ہیں کہ شاید دنیا میں کہیں نہیں ہوں گی) بلکہ زراعتی اور صنعتی ذرائع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے سے ایسا ہوا ہے۔ بہت سی بنجر زمین کو مزروعہ کر لیا گیا ہے۔ ریاست کے محکمۂ زراعت نے کسانوں کو اعلیٰ قسم کے بیج دینے کے ساتھ ساتھ کاشتکاری کے ترقی یافتہ طریقے سے بخوبی واقف کر دیا ہے۔ نیز امداد باہمی کی بہت سی انجمنیں کھول کر غریب کسانوں کو سخت گیر مہاجنوں کے ظالم چنگل سے بچا لیا ہے۔ گاؤں میں دیہاتیوں کی اقتصادی حالت کو زیادہ سدھارنے کے لئے بہت سی گھریلو صنعتوں کی ہمت افزائی شروع کی گئی ہے۔ دیہات سدھار کے سلسلے میں ہر سال کثیر رقم صرف کی جاتی ہے۔ حال ہی میں جاگیرداروں کے نام ایک فرمان جاری ہوا ہے کہ وہ اپنے ہی علاقوں میں رہ کر متعلقہ معاملات میں ذاتی طور پر دلچسپی لیا کریں۔ سیمنٹ، کاغذ، شکر اور پارچہ جات تیار کرنے کے کارخانے بڑی تیزی کے ساتھ کھلتے جا رہے ہیں۔ مزید صنعتی اور زراعتی ترقیوں کے لئے عنقریب ایسے منصوبے پیش ہونے والے ہیں جن پر دو ارب روپے صرف ہوں گے۔ ان منصوبوں میں آبپاشی، پانی کے ذریعہ بجلی کی تیاری، اور ریلوں اور سڑکوں کی تعمیر سے متعلق تجویزیں شامل ہیں۔

اس مختصر مضمون میں چند اصلاحات کی محض اجمالی کیفیت بیان کی گئی ہے اگر قارئین مفصل طور پر مطالعہ کرنا چاہیں تو "حیدرآباد کے مختلف پہلو" کا مطالعہ کریں۔ جسے ریاست کے ادارۂ اطلاعات نے شائع کیا ہے ٭

اصغر ہائی اسکول گونڈہ

مندرجہ ذیل خبر آپ کے جریدہ کے لئے بھیج رہا ہوں امید ہے کہ اسے جلد شائع فرما کر ممنون کیجئے گا۔ (جگر مراد آبادی)

یہ خبر تعلیمی اداروں سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں یقیناً باعث مسرت ہوگی کہ شہر گونڈہ میں حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کی یادگار میں ایک ہائی سکول قائم کیا گیا ہے۔ اسوقت اس اسکول میں انگریزی کے ساتویں درجے تک تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مستقبل قریب میں دسویں جماعت تک کامیابی کے ساتھ تعلیم کا انتظام کیا جا سکے گا جس کے لئے محبان تعلیم کے مشورہ اور اعانت کی ضرورت ہے۔ ان حضرات سے جو حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کی شخصیت سے آشنا اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف ہیں خاص طور پر امید کی جاتی ہے کہ وہ اس یادگار کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے میں میرا ہاتھ بٹائیں گے ٭

نقد و نظر

نئے ترک اور ترکی

مصنف و مولف: محمد عبدالرشید خاں صاحب سابق ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات یو پی۔ ملنے کا پتہ: میسرز نذیر حسین نظام الرحمٰن تاجران کتب دریبہ کلاں دہلی ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۳۴۴ صفحات علاوہ تصاویر مجلد قیمت پانچ روپے جنگ عظیم کے بعد سے موجودہ لڑائی شروع ہونے کے وقت تک تقریباً ۲۰ سال کی قلیل مدت میں ترکی نے ایسی زبردست ترقی حاصل کی ہے کہ وہ یورپ کے دوسرے متمدن ملکوں کے ساتھ صف اول میں شریک ہونے کے لائق ہو گیا ہے لیکن مختلف شعبوں میں یہ ترقی کس حد تک ہوئی؟ اور ایوان ملت کی تعمیر میں سقف و بام کو بلند رکھنے کے لئے کن کن ستونوں نے حصہ لیا؟ اس کی تفصیل سے بہت کم لوگ خصوصاً ہندوستان کے لوگ پوری طرح واقف ہیں۔ کیونکہ معلومات عامہ کے لئے زبان اردو میں اب تک ایسی کوئی کتاب نہیں چھپی جو اس اہم ضرورت کو پورا کرتی ہیں عبدالرشید خاں صاحب کا شکرگذار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس فہرست کمی کو پورا کیا اور اس قدر بہتر حاصل طریقے سے کہ "نئے ترک اور ترکی" کو پڑھنے کے بعد کسی قسم کی ذہنی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ فاضل مولف نے اس کتاب کے ۲۳۔ ابواب میں پچھلی حالت کو ہر جگہ پس منظر میں رکھتے ہوئے ترکی کی موجودہ سیاسی، اقتصادی، صنعتی، تجارتی، تعلیمی، لسانی اور ثقافتی ترقیوں پر مفصل بحث کی ہے اور حسب ضرورت سولہ تصاویر سے اوراق کتاب کو مزین کیا ہے۔ موضوع سے متعلق نقشے اور اعداد و شمار کے جدول ان کے علاوہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ترکی ہندوستان کے لئے کوئی ہمسایہ ملک نہیں ہے لیکن اتنا دور بھی نہیں کہ ہم اس سے کسی قسم کی بے تعلقی گوارا کرلیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا مطالعہ ہم سب کے لئے نہایت مفید ہے۔ خصوصاً اس اعتبار سے کہ ترکی کی درخشاں مثال جس کے رہنے والے شاہراہ ترقی پر مستعدی کے ساتھ گامزن ہو کر منزل مقصود تک پہونچ چکے ہیں، ہمارے لئے مشعل راہ بن سکتی ہے۔

آئین جغرافیہ

مصنف: پروفیسر ایم اے علوی صاحب بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی (علیگ)، ناشر: مسلم ایجوکیشنل پریس علیگڑھ ۲۰×۲۶/۱۶ کے ۳۴۴ صفحات معہ ضمیمہ۔ قیمت تین روپے بلا جلد۔ چند قومی اداروں کو چھوڑ کر ہندوستان عام درسگاہوں کے موجودہ خصوصاً تاریخ و جغرافیہ کے نصاب تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑیگا کہ وہ فرسودگی کے ساتھ ساتھ حد درجہ ناقص ہے۔ وہ روش جو شروع میں اختیار کی گئی تھی، بدستور قائم ہے۔ حالانکہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ غور و فکر کی راہیں بدل چکی ہیں اور ضرورت ہے کہ تعلیم و تدریس کا نیا اسلوب مد نظر رکھا جائے۔ اس نقص کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے پروفیسر صاحب نے ۲۵۔ ابواب میں "آئین جغرافیہ" بالکل ہی نئے اور لائق تحسین انداز میں تصنیف کیا ہے۔ یہ کتاب اگر نصاب تعلیم میں شامل کرلی جائے تو طلبا جو سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی گرد و پیش کے ماحول سے کما حقہٗ واقف نہیں ہوتے ان اوراق سے بہت کچھ سبق حاصل کرسکتے ہیں اور اس کا مطالعہ مدرسہ کو خیرباد کہنے کے بعد بھی ان کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ جغرافیہ کی یہ کتاب کسی خاص ملک یا خطۂ زمین سے متعلق نہیں ہے بلکہ فاضل مصنف کے پیش نظر تمام کرۂ ارض ہے۔ انھوں نے تاریخ سائنسی تحقیقات کا لحاظ رکھتے ہوئے زمین و آسمان کی تشکیل اور حیاتی عناصر قدرت پر تفصیلی بحث کرنے کے ساتھ ساتھ موسمی و مقامی ہواؤں، ابخرات کی مختلف شکلوں، حیوانات کی قسموں نیز دریاؤں، جھیلوں اور برف کے تودوں کی جغرافیائی سیر کرائی ہے اور پھر انداز بیان اتنا لطیف اختیار کیا ہے کہ مدرسوں اور کالجوں کے طلبا کے علاوہ عام لوگ بھی اس کتاب کا مطالعہ نہایت دلچسپی سے کرسکتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اصطلاحات علمیہ کی طویل فہرست بھی شامل ہے۔

پریشان جلوے

مرتب: حیات ترین صاحب۔ ناشر: عباسیہ اکاڈمی بغداد الجدید ریاست بھوپال ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۰۴ صفحات مجلد قیمت ۱۲/ ۔ اس مجموعے میں بارہ افسانوں کے علاوہ انیس شاعروں کا کلام شامل ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ لکھنے والے حضرات خاص بھوپال کے باشندے ہیں یا ان کو اس ریاست سے کسی قسم کا تعلق رہا ہے۔ ایک مخصوص دائرہ کی نگارشات لطیف کو اس طرح کتابی صورت میں پیش کرنے کی یہ کوشش یقیناً لائق تحسین ہے لیکن قدرتی طور پر اس میں کوئی توازن قائم نہ رہ سکا بعض چیزیں بہت عمدہ اور معیاری ہیں اور بعض گھٹیا سارے مجموعے میں صرف ایک خاتون بیگمت جمال صاحبہ کا افسانہ درج ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھوپال کی نسوانی دنیا میں ادبی ذوق نسبتاً بہت ہی کم ہے۔ افسانوں میں ترقی پسندی کا انداز نمایاں ہے مگر منظومات میں آزاد شاعری پر قدیم رنگ تغزل حاوی ہے۔ زبان کے اعتبار سے تحریروں میں مقامی رنگ جھلکتا ہے بعض الفاظ اور محاورے ایسے استعمال کئے گئے ہیں جو غالباً بھوپال اور اس کے قرب و جوار میں عام ہوں گے۔ دوسرے لوگوں کو ان کے سمجھنے میں الجھن سی محسوس ہوتی ہے۔ حیات ترین صاحب یا خود مصنفین اگر حاشیہ پر ایسے الفاظ و محاورات کی تشریح کر دیتے تو اچھا ہوتا۔ افسانہ نگاروں اور شاعروں کے خود نوشت مختصر حالات زندگی سے مجموعے کو زینت دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ آخری صفحات میں محمود شمسی صاحب نے جو افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے بھی اس مجموعے میں شامل ہیں، سب لکھنے والوں کا تعارف نہایت دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ دبے لفظوں میں بعض کھری کھری باتیں بھی کہدی گئی ہیں۔

ایشیا کی سب سے بڑی شخصیت

مصنف: محمد عبداللہ منہاس۔ ناشر: مکتبہ راست گفتار ہال بازار امرتسر ۲۰×۲۶/۱۶ کے ۸۴ صفحات۔ مجلد قیمت ۱۲/ ایک انگریز مصنف کے قول کا لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کے قائد اعظم محمد علی جناح کو ایشیا کی سب سے بڑی شخصیت ثابت کرنے کیلئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ جو مختصر ہونے کے باوجود موصوف کی زندگی کے تقریباً سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ خصوصاً ان لوگوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے جو بہت ہی قلیل وقت میں مسٹر جناح سے غائبانہ تعارف حاصل کرنا نیز مسلم لیگ کی اہمیت اور اس کے آئندہ لائحہ عمل کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ بر سبیل تذکرہ ملک کے دوسرے راہنماؤں کے طریقۂ کار پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔

ف۔ ح

اناطولیہ کے آثارِ قدیمہ کا انکشاف

علامہ ڈاکٹر حامد زبیر قوسے ڈائرکٹر آثارِ قدیمہ اور عجائب خانہ کے ذیل کے مضمون اور اس کے ساتھ کی تصویروں سے اناطولیہ کی قدیم تاریخ کے اس دور پر روشنی پڑتی ہے

جب اہلِ ملک کی دستکاری کا انحصار کانسہ پر تھا۔ علاقہ ہویوق کے نواح میں کھدائی سے ایسی معلومات دستیاب ہوئی ہیں کہ حیرت خیز ہونے کے ساتھ بلحاظ ثروت علم اور معاشرت پروریوں کے عراق کے علاقہ اُر کی تفصیلات سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتیں۔

ترکی میں ۱۹۳۲ء تک ملکی اور غیر ملکی علماء کی جماعتیں صرف اس خیال سے کام کرتی رہی ہیں کہ تاریخ اناطولیہ کی تہذیب میں ان حصوں پر روشنی ڈال سکیں جو ابھی تک تاریکی میں رہے ہیں مگر جنگ نے اس سلسلہ کو بھی بند کر دیا۔ جس کے بعد غیر ملکی انہیں ملکوں کو واپس ہو گئیں اور ترکی محققین بنیاد تاریخی کی جماعت تنہا رہ گئی۔ تاہم ڈاکٹر موصوف کے زیرِ ہدایت اس جماعت کی سرگرمیاں ان دنوں سے جاری رہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے زیرِ ہدایت آثارِ قدیمہ کی تلاش کا سلسلہ ۱۹۳۵ء میں شروع ہوا تھا اور ۱۹۴۰ء تک کے دفینوں پر ایک سرکاری رپورٹ بھی مرتب ہوئی تھی۔ اب طویل وقفہ کے بعد رپورٹ سے یہ انکشافات اوّل اوّل روشنی میں آرہے ہیں۔

ہویوق (ترکی میں جس کے معنی ٹیلہ کے ہیں) وسط اناطولیہ میں واقع ہے۔ کچھ زمانہ سے اس پر ایک گاؤں آباد ہے یہاں سے کوئی ۲۰ میل جنوب میں بوغز کوئی کا مشہور قصبہ ہے کسی زمانہ میں حطیوں کا پایۂ تخت ہوٹاسس یہیں پر آباد تھا۔ ۱۸۳۵ء میں مشہور سیاح ڈبلیو جے ہیملٹن نے ترکی میں سفر کرتے ہوئے اسطرف کچھ توجہ کی تھی۔ اور ابوالہول کے متصل ایک راستہ بھی دریافت کیا تھا۔ ان آثار کو اپنی یادداشت میں تو ضرور قلمبند کر لیا لیکن اسکا خیال اس حد تک نہ پہنچ سکا کہ ان سے وابستہ کسی زمانہ یا قوم تک پہنچ جاتا۔ اس کے بعد ۱۸۶۱ء میں محقق جی پیرٹ ۱۸۹۸ء میں سر ڈبلیو رامزے ۱۸۹۳ء میں ای چانٹرے اور ۱۹۰۷ء میں مقرر مدی بے جیسے محققین نے اپنی اپنی باری میں معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ کیا اور مجموعی طور پر انہیں حطی ملت سے منسوب کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ان مجاہدین کو ٹیلہ کے گرد کے شکستہ ستونوں کے پایوں پر نقوش کے مطالعہ کا بھی موقعہ رہا لیکن زمین کھود کر اس کے اندر گھسنے کا ارادہ کسی نے نہیں کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں ترکی ماہرین فن نے جب ترکی اور اسکی تاریخ کے مفید مطلب موقعوں پر کھدائی شروع کی اور اسکا یقین کر لیا کہ اس ٹیلہ میں کئی تہذیبوں کے آثار مخفی ہیں تو (ڈاکٹر حامد زبیر صاحب مضمون میں بھی لکھتے ہیں) ہم نے ایک گہرا آزمائشی گڑھا بناکے متفرق سطحوں کی صحت کے بارے میں رائے قائم کر لی۔ پھر جب کام بڑھنے لگا تو ہم نے ٹیلہ پر رہنے والوں کے واسطے دوسرے مکانات بنوا کر ٹیلہ کے گھر گرادیے۔ اس کے بموجب پہاڑی کی کھدائی مسلسل ہوئی تو حیرتناک باتیں دریافت ہوتی چلی گئیں۔ جو بلحاظ ثروت معلومات اور معاشرتی مقبولیتوں کے عراق کے علاقہ اُر کے دفینوں سے کسی طرح کم نہ تھیں۔

ان تمام معلومات کو ترتیب دینے سے ایک ایسی تہذیب کا سلسلہ معلومات بن جاتا ہے جو دنیا میں پہلی مرتبہ ہی روشنی میں آتا ہے لیکن کبھی زمانہ تھا حطیوں سے بھی پہلے۔ جب اناطولیہ میں اسی تہذیب سے رونق تھی۔ یہ دور تین ہزار سال قبل مسیح تھا۔ ان آثار کے نیچے ایک اور قدیم تر تہذیب کے نشان ملے ہیں جو چالکوتھی عصر کی یادگار ہیں یعنی اس وقت کی جب تانبہ کی دستکاری سنگین اوزاروں کی جگہ لے رہی تھی۔ یہ دور چار ہزار سال ق م تھا۔ ظاہر ہے کہ تاریخ انسانیت میں اس تمدن نے بھی ایک گرانقدر حق ادا کیا ہے۔

غرضکہ علاقہ ہویوق مجموعی طور سے ذیل کی تہذیبوں کا امین رہا ہے۔

۱۔ بازنطین رومی عہد کے آثار جو بہت معمولی ہیں۔

۲۔ عصر فریجی (۱۲ سے ۷ صدی ق م) اس دور میں فریجیوں کی آمد اور سکونتیں رہیں۔ ان کا پایہ تخت گوردیان تھا۔ ان لوگوں نے حطی اثرات کے کھنڈروں پر عمارتیں بنالیں یا ان کی قدیم عمارتوں میں حسب ضرورت ترمیم کر لی تھیں انھوں نے اپنی تحریروں کے جو نقش چھوڑے ہیں۔ سر ولیم رمزے انہیں کے مطالعہ کر کے اس بالا نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ اس عہد کی بستیاں مجموعی طور پر دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتی ہیں

۳۔ عصر حطی (۲۱-۱۲ صدی ق م) اب جس جگہ بوغز کوئی آباد ہے حطی فرمانرواؤں نے اپنا پایۂ تخت یہیں قائم کر کے قلعے اور عالیشان عمارتیں کھڑی کی تھیں اور اس ٹیلہ کو فوجی چھاؤنیوں اور دینی معبدوں، مندروں کے واسطے محفوظ رکھا تھا۔ گو اس دور کی عمارتوں میں اکثر تین اور کہیں کہیں چار سطح دریافت ہوئیں لیکن ہمارے پاس جو معلومات ہیں ان عمارتوں کی اہم حیثیتوں کے باوجود ہم ان سے انکے نام معلوم نہ کر سکے۔ شہر کے گرد گارہ کے پشتوں پر اینٹ اور گارہ کی فصیل بنی ہے۔ ابوالہول والا راستہ اور اس کی بغل والا دوسرا راستہ اسی دیوار تک آتا ہے۔ ابوالہول والے راستہ پر کچھ دور اندر بڑھ کر اوپر نیچے دو مندر ملتے ہیں جو حطی دور کے دو مختلف زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیچے والے مندر میں پورے طور کھدائی کی گئی۔ عمارت کا طول و عرض ۷۰×۱۱۰ میٹر یعنی تقریباً ۳۶۱ فٹ لمبی اور ۲۳۰ فٹ چوڑی ہے۔ مندر کے برابر میں لوگوں کے مکانات اور گلی کوچے تھے۔ ان عمارتوں کے سیاق و سباق میں اکثر مہریں ملی ہیں جن پر خطوط مصری میں تحریریں کندہ ہیں۔ ایک تختی پر خطوط میخی (اشوری) بھی ہیں۔ مٹی کے بہت سے برتن اور

حامد زبیر قوسے

دھاتکی چیزیں بھی ملی ہیں۔ قابل ذکر ایک چیز یہ بھی ہے کہ چند غیر مکمل سانچے لوہے کے ڈھلے ملے جنکا مجموعی وزن نئو کیلوس سے کچھ زیادہ ہے قریب ہی وہ بھٹی بھی ہے جسمیں یہ سانچے ڈھلتے تھے۔ مصر نحاس (تانبہ کا دور ۳۰۰۰ سے ۲۰ صدی ق م) نہانکا ابتدائی زمانہ بھی رہا ہے۔ تاہم اہل ادب نے اس زمانہ کو تانبہ کے دور میں شامل کیاہے۔ اس زمانہ کی عمارتیں چار سطحوں کی واقع ہوئی ہیں۔ ان عمارتوں میں تیرہ خولصورت قبریں ملی ہیں۔ ٹیلہ پر اوپر سے شروع کرکے یہ قبریں ۵ سے ۷ درجہ کی سطحوں پر ہیں اور بیسویں صدی قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہیں جسپر ماہرین آثار قدیمہ کو بھی اتفاق ہے یہ قدیم زمانہ کے کسی شاہی خاندان کے لوگوں کی قبریں معلوم ہوتی ہیں۔ مُردے لمبے مرتبانوں میں محفوظ کیئے جاتے تھے۔

قبروں کے اندر ان کے علاوہ دھات کے شمسی قرص، عورت کی پُتلی، سانڈ اور بارہ سنگھا کے پتلے تھے۔ ان پتلوں سے ان کے مذہبی عقائد پر روشنی پڑتی ہے۔ زیورات، ہتھیار اور ظروف نے جنہیں مُردوں کے ساتھ سوغات میں رکھا جاتا تھا صناعی کی تاریخ میں ان چیزوں کو خاص دخل ہے اور ابھی ان کی ابتدا پر قیاس کرنا مشکل ہے۔ بارہ سنگھا کی موجودگی سے اسکی تصدیق ہوتی ہے کہ یورپ اور ایشیا کے ان علاقوں میں کیا مذہب تھا۔ بارہ سنگھا سورج کا اوتار تھا۔ عورت کی پُتلی پیداوار کی دیوی تھی۔ سانڈ سے ظاہر ہے کہ ایشیائے کوچک میں بُت پرستی کا بہت زور تھا۔

ان میں سے دو قبروں کی تفصیل سے باقی قبروں کی کیفیت بھی سمجھ میں آسکتی ہے۔ مشرق مغرب دو خندق کے اندر ۸ x ۱۰۱۱۰ انچہ کی تھرکی سلیں سطح کے پانچویں درجہ پر ملی گئی ہیں۔ مُردہ کسی شاہزادی کا ہے جسکو سارے ذاتی زیورات سے سجایا گیا ہے سر پر سونے کا تاج ہے۔ اسکو دبکے ہوئے انداز میں جنوب کی طرف سر کرکے اور اکتا کرکے رکھا گیا ہے اس کے سرہانے تین تھلیاں رکھی ہیں اور ان کے پاس دھات کی ایک کنگھی ہے۔ ہاتھ کے بازو میں مٹی کی دو کلھیوں میں سونے کے دلے اور جواہرات سے بھرا ایک کنٹھے کا پیالہ ہے۔ ٹھوڑی کے گرد سونے کے زیورات میں ناچتی تپلیوں کی پانچ جوڑیاں دائرہ میں لگی ہوئی ہیں۔ ہاتھوں میں سونے کی پہنچیاں اور ان کے برابر گیارہ

گول سرکی کیلیں لگی تھیں۔ پیروں میں چاندی کی جھانجھریاں تھیں۔ پیٹھ پر سونے کا پیالہ قیمتی پتھروں یا سنگریزوں سے جڑا ہوا رکھا تھا۔ قبر کی دوسری چیزوں میں چاندی کے جام، تانبہ کے برتن، چاندی کے ایک گول پرت میں تانبہ کا گنڈہ جڑا ہوا تھا۔ مٹی کے تین برتن تھے۔ لکڑی کے ایک بکس پر دھات کا ڈھکن اور چھلے لگے تھے۔ سانڈ کے ایک تانبہ کے پتلہ پر چاندی سونے کے مرکب سے قلعی تھی اور کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔ ان تمام چیزوں کو قبر میں لبطور سوغات رکھکر اسے بے تراشی لکڑی کی موٹی بلیوں سے پاٹ دیا گیا تھا اور اوپر سے چھل کر دوزردگی گارہ سے بھر کر اوپر مٹی ڈالدی گئی تھی۔ قبر کے گرد پتھر کھڑے کرکے اسکو مکمل کردیا تھا۔ متوفی کی مغفرت کے لئے کم سے کم دو سانڈ قربانی کرکے ان کے گوشت سے کھانا کھلاکر ان کی پنڈلی کی ہڈیاں اور سر جوڑ کر قبر کے اوپر رکھدئے جاتے تھے۔ بعض قبروں پر ایسے سر اور ہڈیوں کی زیادہ تعداد بھی تھی کہیں کہیں سئور اور بھیڑوں کے سر بھی شامل تھے۔ قبر کے جنوبی سمت کتوں کی کھوپریاں بھی ملیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی ملکہ کے محبوب تھے۔ شاید یہ دستور تھا کہ قبر میں جنازہ رکھتے وقت ایسے جانوروں کو بھی مار کر دفن کردیاجاتا ہوگا۔

اوپر سے شروع کرکے تقریباً تین گز نیچے ساتویں سطح پر قبر قائم ہے۔ اسکا دفینہ بھی ہے۔ اس میت کی ہڈیاں زیادہ بوسیدہ نہیں۔ دفینہ دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کسی شاہزادی کی قبر ہے۔ سوغات دفینہ میں سنہرا تاج اور چاندی کی تپلی کی جوتیاں اور چھاتیاں سونے کی ہیں جو میّت کے سینہ پر رکھی تھیں۔ ایک تانبہ کی تھیلی سونے کے دستہ کی چاندی کی چمچی۔ سونے کا جام۔ سونے اور چاندی کی تپچیوں کی ایک جوڑی سونے کے سر کی ایک چاندی کی کیل، چاندی کی صراحی جسمیں پانی کی رعایت سے خم تھا اسکی تہ سونے کی، چاندی کا شمسی قرص۔ سانڈ کے تانبہ کے پتلہ پر چاندی سونے کے مذکور مرکب کی قلعی ہے۔ قبر کے اوپر بیلوں کے سر کی پانچ جوڑیاں اور پنڈلیوں کی ہڈیاں بہت احتیاط سے رکھی تھیں۔

باقی قبروں کے دفینوں میں کچھ اور چیزیں بھی تھیں جو کم و بیش اسی قسم کی تھیں مگر

غزل

زمانے کی خورش سے بڑھنے نہ پائے ‏ بہت دور ساتھ آئے ماضی کے سائے

محبت میں اس کے سوا اب رہا کیا ‏ وہ جب یاد آئے کچھ آنسو بھر آئے

گوارا ہے کیا یہ خدا کو بھی میرے ‏ زمانہ مرے حال پر مسکرائے

وہاں پر مسرت بداماں تھی دنیا ‏ جہاں پر مجھے غم میسر نہ آئے

وہ آج اشک بن کر ترے سامنے ہیں ‏ لبوں تک ہمارے جو شکوے نہ آئے

زمانے کی پیہم نوازش نہ پوچھو ‏ زمانے کے بعد آج وہ یاد آئے

ہنسی آگئی ان کی بیگانگی پر ‏ وہ گذرے برابر سے دامن بچائے

مری غیرت غم گوارا کرے کیوں ‏ کہ اشک الم تیرے دامن تک آئے

بڑی چیز ہیں دل کی بربادیاں بھی ‏ ترے نام پر آج آنسو بھر آئے

شہید ہے ہواؤں میں کچھ انکی خوشبو
یہ جھونکے کہیں سے انھیں چھو کے آئے

شہید۔ بدایونی

ان میں ہتھیار بھی شامل تھے اس لئے خیال ہے کہ یہ مُردوں کی قبریں تھیں۔ ایک خنجر بہت نفیس اور اسی طرح کا تھا جیسا اُر کے دفینوں میں مل چکا ہے اسکا پھل فولاد کا تھا۔ ایک جگہ لوہے کے دستہ کے تیر، خنجر وغیرہ اسی جگہ سونے کے کچھ اور زیورات بھی بیان کردہ شکلوں سے ملتے جلتے تھے مگر ٹوٹے ہوئے اور استعمال شدہ معلوم ہوتے تھے۔ ان ٹکڑوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ لاشیں کیسی تدبیر تھی۔ غریبوں کی میتیں بیان کردہ طریقوں پر مٹکوں میں دبا کر ان کے منہ پر پتھر کی سلیں رکھدی جاتی تھیں۔ مُردوں کے دفن کے ایسے طریقے دوسری جگہ بھی۔ علی سار (وسط ترکی) اور انترہ کے پاس الاتی ہیل دیکھنے میں آئے ہیں۔ لیکن اس جگہ کے دفینوں سے ان کے زمانہ کی تہذیب کی بلندیوں پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے جو ۳۰ سے ۲۰ صدیاں ق م تھا اور حطیوں کی آمد سے بہت پہلے دنیا کی نیرنگیوں کا مرکز تھا۔

الاجہ کے دو ہزار سال قبل مسیح کے باشندوں نے اعلیٰ درجہ کی ترقیاں کی تھیں یہاں تک کہ آج بھی انکی دستکاریوں کو پسند کیا جا رہا ہے۔ سناروں اور مینا کاروں نے تو خاص کمال پیدا کئے تھے مگر دوسری دستکاریوں میں بھی یہ دخل رکھتے تھے مثلاً دھلائی سادہ کاری اور مختلف دھاتوں کو ملا کر ایسی خوبصورتی سے جوڑ بٹھا دیتے تھے کہ ذوق حسن بھی داد دینے پر مجبور تھا۔ کاریگر اپنی حرفتوں میں نئے نئے نمونے نکالتے رہتے۔ دھاتوں کے بیان کردہ جوڑ اور میل سے برتنوں کی خوبصورتی میں نئے نئے نمونے نکالتے تھے جن سے قیاس ہوتا ہے کہ ہویوق تانبہ کے دور میں تہذیب عصری کا مرکز تھا۔ یہ تمدن ہویوق کے شمال اور مشرق و مغرب میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ البتہ مشرقی جانب وان۔ ارض روم اور تراث (ایرانی) کے سرحدی علاقوں میں مقامی تاثرات طبیعتوں پر غالب تھے لیکن چار ہزار سال قبل مسیح کے ماکولیتھی تمدن کا اثر بعد کے زمانوں سے زیادہ عام اور قوی معلوم ہوتا ہے۔ وادی دجلہ و فرات تک کے لوگ اسی تمدن کے گرویدہ تھے ہویوق کی تعمیرات کی تحقیق ہونے سے ہوتی ہے۔ یہ عمارتیں چوتھے درجہ کی سطح پر بنی ہیں مٹی کے برتنوں سے خالی تھیں۔ یہ یا تو پیلے یا زرد تھے اور ان پر تلبیدیں کی شکلوں پر سیاہ رنگ میں گلکاری اور پچکاری نظر آتی ہے۔ اناطولیہ کی مٹی کی دستکاریوں میں اب بھی یہ چیزیں شامل ہیں۔ سیاہ رنگ دینے کے لئے مٹی میں خاص سیاہ چکنا ریشہ پانچ فیصدی شامل کیا جاتا ہے۔ یہ نسخہ ماکولیتھی زمانہ کی ایجاد ہے جسکے حق میں یہاں کا موسم اور اسباب کچھ ایسے راس آئے کہ اس صنعت نے یہیں گھر کر لیا ہے۔ گارہ کی اینٹیں ۳۵×۲۵×۷½ سینٹی میٹر (تقریباً ۱۴ انچہ لانبی چوڑی اور ۳ انچہ موٹی) بنتی تھیں لیکن زمانہ کی رفتار کے ساتھ ان پیمانوں میں تبدیلیاں ہو گئیں اور ایک ایک فٹ لمبی چوڑی اور ۵۔ انچہ موٹی بننے لگی تھیں۔ تعمیرات میں سرکنڈوں کی جافری سے اینٹیں لگا کر بناتے اور اوپر سے گارہ کا لیپ کر دیتے تھے۔ السیڈن (انچ) کی طرح سیاہ مادہ اکثر ہڈیوں کے اوزار کثیر تعداد میں دستیاب ہوئے جو نہایت حیرتناک ہیں۔ اس علاقہ میں گو جگہ جگہ پکی مٹی ملتی ہے لیکن ابھی تک عصر حجری یعنی پتھر کے قدیم زمانہ کی مد نہیں معلوم ہوتی ہے۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱	کیا کہنا! (غزل)........	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری۔
۲	بیدی کی افسانہ نگاری.......	پروفیسر وقار عظیم........
۳	بچ........	محترمہ فاطمہ بیگم نسرین........
۴	موجودہ فارسی کی سب سے پرانی کتاب	جناب حبیب انصاری........
۵	میر انیس	جناب محمد حیدر اسد........
۶	نشانی (افسانہ)........	محترمہ تسنیم سلیم چھتاری........
۷	ارسی سرو استو........	جناب ڈی۔ راگھون
۸	اٹھارویں صدی میں اردو سائے ہندوکا حصہ اردو شاعری میں........	جناب عبدالسلام خورشید........
۹	ساحر لدھیانوی........	جناب احمد ندیم قاسمی........
۱۰	بھٹکا مسافر (روسی ڈرامہ)........	فضل حق قریشی دہلوی........
۱۱	لام شکنی کے بعد........	جناب یوگ راج کھنہ........
۱۲	خمر........	جناب ربط تلہری........
۱۳	جنائز اٹلان........	جناب جی ایم۔ راؤ تھ........
۱۴	آنسو (افسانہ)........	محترمہ حق اکبری........

کانو کا ایک خوبصورت مکان ۔ دیواروں کے اندر گارا ہے
لیکن باہر سیمنٹ
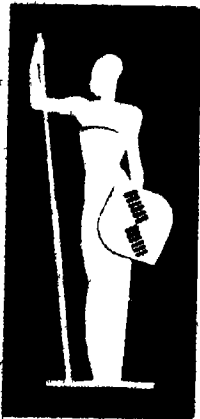
"لوہار کا شہر"

کانو نائیجیریا کا بہت پرانا شہر ہے ۔ جو قوم اب
ہوسا کہلاتی ہے۔ اسکے آبا و اجداد گیارھویں صدی میں
یہاں آکر آباد ہوئے تھے ۔ اس وقت ایک آریائی قوم
ناگیاوا نے انکو شمال سے جنوب کی طرف دھکیل دیا
تھا شہر کانو میں ایک خاندان موجود ہے جسکا دعوی
ہے کہ وہ کانو کی اولاد میں سے ہیں ۔

ہوسا قوم نے ایک بڑی مضبوط شہر پناہ بنائی تھی
جسکے دروازے رات کو بند کردئے جاتے تھے لیکن اس
زمانے کے زمانہ میں دروازوں کو توڑ دیا گیا تا کہ ایمبولینس
کی لاریاں ہر وقت آجا سکیں ۔ شہر کی آبادی زیادہ تر
مسلمانوں پر مشتمل ہے ۔ یہاں کے بازاروں میں کبھی کبھی
کوئی بڑا عرب تاجر بھی نظر آجاتا ہے ۔ یہاں کے بازاروں
میں ہر ملک کا سکہ نظر آتا ہے کوڑی یہاں اب تک چلتی
ہے ۔ یہاں کے لوگوں کو گہرے رنگ بہت مرغوب ہیں ۔
انکو گھوڑوں کا بہت شوق ہے گھڑدوڑ اور پولو کا بھی
رواج ہے ۔ یہاں کا قانون خاص اسلامی ہے ۔

اوپر کا محافظ دستہ ۔ ایک سپاہی
کی زرہ بکتر وہ ہے جو صلیبی
جنگوں کے زمانہ میں [illegible]
یہاں آئی تھی ۔

ہندوستان

چینی تھیٹر

جنگ کے ہولناک حادثات چین میں دکھائے جانے والے کھیل تماشوں پر کسی لحاظ سے بھی اثرانداز نہیں ہوئے، بلکہ صدیوں پرانی فضا بدستور قائم رہی - تھیٹر اور سینما تماش بینوں سے اس طرح بھرے رہے گویا رفتار زمانہ میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے - ملک کے بیشتر حصوں میں قدیم طرز کے ناٹک ابھی تک دکھائے جاتے اور اسی ذوق و شوق کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں - تاہم چینی مصنفین کے طبعزاد ڈرامے بھی مقبول ہو رہے ہیں - چینی تھیٹروں میں زنانہ پارٹ عموماً مرد ہی کرتے ہیں - وہاں کے دو مرد اداکاروں نے زنانہ روپ میں پارٹ کرکے غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے - اس کے برعکس کہیں کہیں عورتیں مردوں حتی کہ جنگجو سپاہیوں کے بدلے اداکاری کے جوہر دکھاتی ہیں -

ایک مشہور و معروف چینی ایکٹر، مسٹر مار، سنجیدہ اداکاری کے جوہر دکھا رہا ہے -

[illegible] کی مضحکہ خیز ڈرامہ [illegible] گوئیلن تھیٹر کے کمرۂ ملبوسات [illegible]

بچوں کے لئے بسکٹ کے انتخاب میں
ماں کو چکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ممکن
ہوا تو وہ ہمیشہ برطانیہ بسکٹ خریدیگی۔ کیونکہ
وہ لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ صحت بخش بھی ہوتے ہیں
برطانیہ بسکٹ

آج کل
اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ دس روپے ششماہی چھ روپے | سال ۴ نمبر ۱۳ | یکم دسمبر ۱۹۴۵ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	رفتار زمانہ	ادارہ	۴
۲	کیا کہنا (نظم)	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری	۶
۳	آر۔ سی۔ سرلو استو	جناب ڈی راگھون	۷
۴	بیدی کی افسانہ نگاری	پروفیسر وقار عظیم	۹
۵	جذبات مضطر	جناب گنگا پرشاد مضطر لکھنوی	۱۰
۶	ثانی (افسانہ)	محترمہ تسنیم سلیم چھتاری	۱۳
۷	اٹھارویں صدی میں دسانے ہنود کا حصہ اردو شاعری میں	جناب عبدالسلام خورشید بی اے لاہور	۱۸
۸	لیچ	محترمہ فاطمہ بیگم نسرین	۲۱
۹	رنگا رنگ	جناب حرماں خیرآبادی	۲۲
۱۰	تصویر دیکھ کر	جناب ساگر نکودری	۲۲
۱۱	حقیقت (ڈراما)	جناب مرزا امتیاز حسین	۲۳
۱۲	انگلستان سے آسٹریلیا تک	مسٹر اے ایچ نارالکٹ	۲۴
۱۳	جوانی کی باتیں	جناب ساحل بلگرامی	۲۵
۱۴	غزل	جناب شکیل بدایونی	۲۶
۱۵	غزل	جناب آل رضا رضا لکھنوی	۲۶
۱۶	غزل	جناب رضاء اللہ خاں رضا ٹونکی	۲۶
۱۷	غزل	جناب جمیل الدین عالی	۲۶
۱۸	حضرت بلھے شاہ	جناب ضیاء الدین احمد برنی (بمبئی)	۳۵
۱۹	میرانیس	جناب محمد حمید سعید (سیتاپور)	۳۶
۲۰	آنسو (افسانہ)	محترمہ ص اکبری (جمشید پور)	۳۸
۲۱	خمر	خانصاحب سید امانت حسین نبط بلہری	۴۱
۲۲	انتظار (نظم)	پروفیسر عبادت بریلوی	۴۱
۲۳	لام شکنی کے بعد	جناب یوگ راج کھنہ	۴۲
۲۴	کیا کروں؟ (قطعہ)	جناب سرور جالندھری	۴۳
۲۵	ساحر لدھیانوی	جناب احمد ندیم قاسمی	۴۵
۲۶	مکتوب رنگیں	جناب الیاس عشقی	۴۷
۲۷	موجودہ فارسی کی سب سے پرانی کتاب	جناب حبیب احمد انصاری	۵۰
۲۸	غزل	جناب محمد ابراہیم نجم ندوی (حیدرآباد)	۵۲
۲۹	جوائنرانڈمان	مسٹر جی ایم اداکھ	۵۴
۳۰	نقد و نظر	ف۔ ح	۵۶
۳۱	بھٹکا مسافر (روسی ڈراما)	فضل حق قریشی دہلوی	۵۷
۳۲	انجم (نظم)	جناب ثانی صدیقی (جبل پور)	۵۸

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے (علیگ)، ایل، ایل، بی

نائب مدیران
راجیندر ناتھ شیدا — ایم۔ اے
فضل حق قریشی — دہلوی
مشیر احمد — ایم۔ اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۳۶ دہلی

نت نئی شورشیں

المانوی و جاپانی فتنوں کے استیصال کے بعد یقین کر لیا گیا تھا کہ اب جبکہ دنیا کے دو بڑے شورش پسند ملک تباہی اور بربادی کی آخری منزل پر پہنچکر تاریخ عالم کے صفحاتِ اولین میں نقوشِ عبرت بن رہے ہیں، ساری دنیا امن و عافیت کی خوشگوار فضا میں سانس لینے لگے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ خلافِ توقع مختلف مقامات پر دبی چنگاریاں لَو دینے لگیں۔ کہیں خانہ جنگی نے اپنا رنگ جمایا اور کہیں حکومتِ وقت کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونے لگی کہیں حدودِ سلطنت کو وسیع تر کرنے کے خیال سے ان مقامات پر مستقل اقتدار قائم کرنے کے منصوبے باندھے جانے لگے۔ جہاں دامنِ صلح کے زیرِ سایہ بظاہر امن و عافیت کا نام لے کر عارضی ڈیرے ڈالے گئے تھے نتیجہ یہ کہ وہ ملک جو ذاتی اغراض و مفاد کے تحت رہ کر جانبازانے ظلم و ستم سے کنارہ کش رہنا چاہتے ہیں، انکی طرف سے مشکوک ہو گئے۔ اسی دوران میں ایک طرف یہ اعلان کرنا پڑا کہ ایٹم بم کا راز روس پر کسی عنوان سے منکشف نہ کیا جائے اور دوسری طرف جاوا کے انتہا پسندوں پر بمباری کرنی پڑی تاکہ وہ زہر جو جاپانیوں نے وہاں رہ کر پھیلایا تھا زائل ہو جائے۔ عہدِ حاضر کے یہ دو مرحلے خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔

روس کے نئے منصوبے

کوریا سے جب یہ خبر آئی کہ سرخ فوج تیرے پہرے کے پرے سرحد پر ڈیرے ڈال رہے ہیں اور اسکے ساتھ ہی ساتھ روس نے چینی دستوں کو ڈائرن اور پورٹ آرتھر میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دی ہے تو ساری دنیا میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ کیونکہ ان اقدامات سے ظاہر ہو گیا کہ روسی فوجیں اپنے وعدے کے بموجب کوریا سے واپسی کرنے کی بجائے کم سے کم شمالی حصے میں اپنا استحکام قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ نومبر کے شروع میں جب کومنتانگ فوجی فوج امریکہ کے جنگی جہازوں میں سوار ہو کر وہاں پہنچی اور منچوریا میں نقل و حرکت کی تیاری عمل میں آئی تو کسی قسم کی مزاحمت یا اعتراض کی صورت پیدا نہیں ہوئی لیکن پھر یکایک روس نے اپنا قدم درمیان لاکر سارے منصوبے کو مکمل کر رکھدیا۔ اس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ روس فوجی حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے کوریا میں دوبارہ تسلط کا خواہاں ہے۔ اسکا منشا ہے کہ چین کے ساتھ ساتھ اپنا اقتدار بھی وہاں قائم رکھے۔ روز بروز پہنچنے والی کمک سے قابض دستوں کو زبردست تقویت حاصل ہو رہی ہے۔ ہر قسم کا سامانِ حرب کثیر مقدار میں جا چکا ہے اور سلسلہ ابھی بند نہیں ہوا ہے۔ اگر روس چین کو شمالی کوریا کی سرحد تک پہنچنے کی اجازت دے دیتا تو پھر یہیں روسی فوج اور نئے دستوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہو جاتی اور اس طرح وہ منصوبے جن کی حقیقت ابھی پوری طرح منکشف نہیں ہو سکی ہے، باطل ہو کر رہ جاتے۔ فی الحال اس طرزِ عمل کو مشکوک نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔

ایٹم بم پردۂ راز میں

صدر ٹرومین کی "بارہ نکات" والی تقریر پر دار العوام میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے مسٹر چرچل نے موصوف کی حکمتِ عملی کی تائید کی اور فرمایا کہ اسمیں شک نہیں کہ اس جنگ میں روس کی جد و جہد لائقِ تحسین رہی اور اس کی قربانیوں سے انکار بھی نہیں ہو سکتا لیکن میری ذاتی رائے یہی ہے کہ ایٹم بم کا راز سویت یونین پر منکشف نہ کیا جائے۔ امریکہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان بموں کی تیاری کے عملی طریقے ظاہر نہ کئے جائیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں روسی ماہرین کو امریکی ذخائرِ حرب میں داخلے کی اجازت دینی پڑے گی اور یہ گوارا نہ ہو سکیگا کیونکہ کسی ایسے ہی مقصد کے ماتحت اگر ہم یا امریکی روس کے ذخائرِ حرب میں کبھی داخل ہونا چاہیں تو ہمیں یقین ہے کہ اسکی اجازت نہیں ملیگی۔ علاوہ ازیں جنگ کے زمانہ میں ہم نے اپنے بہت سے راز روس پر ظاہر کر دیئے لیکن انکے جواب میں ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا گیا اور نہ ہمیں اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لہٰذا مجھے امید ہے کہ برطانیہ، کینیڈا اور ریاستہائے متحدہ صدر ٹرومین کی حکمتِ عملی کو تسلیم کرینگے اور اپنی معلوماتِ عظیم کو ایک مقدس راز کی طرح ہمیشہ محفوظ رکھیں گے تاکہ دولتِ متحدہ امن پسند اقوامِ عالم اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کر سکیں۔

اس کے بعد واشنگٹن میں اسی ایٹم بم کے راز کے سلسلے میں ایک خاص مجلس منعقد ہوئی جسمیں برطانیہ کے وزیرِ اعظم مسٹر اٹیلی، صدر ٹرومین اور کینیڈا کے صدر مسٹر میکنزی کنگ نے حصہ لیا۔ اور باتفاقِ رائے فیصلہ ہوا کہ ایک "سکیوریٹی کونسل" مقرر کر کے مکمل راز اسکے سپرد کر دیا جائے اور اس کونسل میں پانچوں اتحادی قومیں شامل ہوں۔

انڈونیشیا میں جنگ کے شعلے

جاوا میں جاپانیوں کا عارضی قبضہ ہونے کے بعد زبردست تغیرات رونما ہوئے

دعالی طور پر ہوا یہ کہ ان فتنہ پردازوں نے بہت سے ہتھیار اور بارود ی سامان جزیرے والوں میں تقسیم کردیئے تاکہ بدامنی کی فضا قائم ہوجائے۔ سقوط جاپان کے بعد جنرل ماؤنٹ بیٹن نے جاوا پر اتحادی فوجیں اتار دیں تاکہ بچے کھچے جاپانیوں اور اصل باشندوں سے ہتھیار واپس لے لئے جائیں لیکن اہل جاوا سیدھے بھاؤ اسکے لئے تیار نہیں ہوئے اسی اثنا میں ولندیزی حکومت کے گورنر جنرل نے چند تجاویز پر مشتمل ایک بیان جاری کیا جس میں صاف لفظوں میں کہا گیا کہ انڈونیسیا ولندیزی دولت مشترکہ میں پوری طرح حصہ دار ہوگا۔ اسی بیان میں وعدہ کیا گیا کہ حکومت نئے طریقے کا نظام تعلیم قائم کرے گی تاکہ عام جہالت کا قلع قمع ہوجائے اور اس کے لئے ضروری قرار دیا کہ انڈونیسیا کی زبان سرکاری زبان تسلیم کی جائے اقتصادی حکمت عملی کے سلسلے میں کہا کہ حکومت اہل ملک کو زیادہ سے زیادہ موقع دیگی کہ وہ تجارت میں ذاتی سرمایہ لگا کر خود نفع حاصل کریں۔ ان تمام تجاویز پر تفصیلی غور و خوض کرنے کے لئے ایک گول میز کانفرنس کا قیام عمل میں آنا تھا جس میں خود انڈونیشیا کے باشندے برابر کے شریک ہوتے لیکن انہیں سے کوئی بھی بات نہیں مانی گئی۔ بلکہ ڈاکٹر سوئیکارنو نے کہہ دیا کہ ہم ولندیزی شہنشاہیت کی بجائے جمہوریت قائم کرنا چاہتے ہیں سانے سبھی تو ذکر کردے انہوں نے کہا کہ ہم آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے اپنا نظام حکومت خود قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بہر یہ کہ جمہوریت قائم ہوجانے کے بعد ہم ولندیزی حکومت کے وہ تمام قرضے جو ہماری خاطر اتنک برداشت کئے گئے ہیں۔ فوراً ادا کردینگے۔ اس رائے سے قطع نظر ایک جماعت اتحادیوں کا تعاون چاہتے ہوئے آرزومند تھی کہ متحدہ اقوام کی سرکردگی میں نیا نظام قائم ہو۔ اختلاف رائے کی بنا پر حکومت برطانیہ کو مداخلت کرنی پڑی۔ انڈونیسیا والوں کو الٹی میٹم دیدیا گیا کہ ہتھیار واپس کرتے ہوئے شورشوں کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ ورنہ شدید حملے شروع کردیئے جائیں گے۔ وہ لوگ بھلا کیا ماننے والے تھے۔ لہٰذا بری، بحری اور فضائی حملے ہونے لگے۔ نتیجہ یہ کہ اب جبکہ یہ الفاظ لکھے جارہے ہیں، انڈونیشیا بھر میں آگ لگنے کے باعث جہنم زار بنا ہوا ہے اور ہزاروں انسان موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ مرنے والوں میں وہ جاپانی بھی شامل ہیں جو انڈونیسیا والوں کو اکسا کر خود بھی انکا ساتھ دے رہے ہیں۔

پنجاب کے اسپیکر

بیس سال تک لائق تحسین خدمات انجام دیتے رہنے کے بعد پنجاب کی مجلس قانون ساز کے اسپیکر سر شہاب الدین نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدیا۔ وہ آئندہ انتخاب میں کھڑے ہونیکی جستجو نہیں کرینگے۔ ان کے چلے جانے پر پنجاب کے اس ایوان میں زبردست کمی محسوس کی جائے گی جہاں اراکین کی گرماگرم بحث کبھی کبھی کان پڑی آواز سننے نہیں دیتی تھی۔ یہ موصوف ہی کا دل گردہ تھا کہ وہ مجلس کی جوشیلی ہستیوں پر آسانی سے قابو پالیتے تھے اور اس کی صورت یہ تھی کہ وہ سکون قائم کرنے کے لئے ان سے بھی زیادہ چیخکر بولنے لگتے تھے۔ وسیع تجربے کے ساتھ ساتھ ان کا حافظہ بے پناہ تھا۔ اس لئے بحث و تمحیص کے موقعوں پر صحیح حوالہ دینے میں وہ کبھی نہ چوکتے تھے۔ کچھ عرصہ سے قوت بصارت کم ہوجانے کے باعث وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کافی دقت محسوس کررہے تھے۔ انہوں نے برطانوی دارالعوام کی روایتی شان اور وضعداری کے خلاف ہمیشہ چشمہ لگایا کیونکہ ان کا قول تھا کہ پنجاب کی مجلس قانون ساز دارالعوام کے مقابلے میں بہت مختصر ہے۔ حکومت پنجاب موصوف کو ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ پنشن عطا کرنے کے مسئلے پر غور کررہی ہے لیکن وہ خود پنشن کی بجائے چند مربعوں پر قناعت کرلینے کو ترجیح دینگے۔ ہندوستان کی پہلی ہستی ہے جس نے پنشن حاصل کرنے کی مدت تک اسپیکر کے فرائض انجام دئے۔

آٹھ ہزار سال پرانا تمدن

اس صدی کے شروع سے ان مقامات پر جہاں ماہرین تاریخ کے قیاس کے مطابق قدیم قوموں نے تہذیب و تمدن کی بنیادیں رکھی تھیں۔ کھدائی کا سلسلہ کبھی کبھی اپنا رنگ دکھاتا رہتا ہے۔ کبھی مصر کی تاریخ کے ورق الٹ کر ایک باب کا اضافہ کردیتے ہیں اور کبھی شام کی تاریخ پر پڑے ہوئے پردے چاک ہوکر ان چیزوں کو بے نقاب کردیتے ہیں جو اب تک عام نگاہوں سے اوجھل رہی ہیں۔ ماہرین کا بیان تھا کہ میسوپوٹامیہ کے علاقے میں سب قدیم تہذیب "اُر" میں آباد تھی لیکن جدید انکشاف نے اس دعوے کو باطل کر ڈالا ہے۔ اُر سے تقریباً چار سو میل پرے بمقام حسونا کھدائی ہونے پر ایک ایسی تہذیب کے نقوش برآمد ہوئے جو اندازاً آٹھ ہزار پرانی سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کامیابی کا سہرا سعود صفر کے سر ہے جنکی نگرانی میں اس زمین دوز شہر کی کھدائی عمل میں آئی جہاں ولادت مسیح سے چھ ہزار سال پہلے زندگی سانس لیتی تھی۔ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر جنرل نے ایک بیان میں فرمایا کہ "حسونا سے برآمد ہونے والے ظروف کاسہ ہائے سر اور دیگر لوازمات زندگی کو مدنظر رکھکر یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ اس جگہ کا تمدن آٹھ ہزار سال پرانا ہے۔ یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کرنے کے علاوہ مویشی بھی پالتے تھے۔ ان کے مکانات چوکور کچی مٹی کے تھے۔ ہر مکان میں صحن کے علاوہ حسب ضرورت تین چار کمرے ہوتے تھے۔ انہیں نقاشی کا بھی خوق تھا۔ کٹائی کے اوزار جو سخت ترین پتھر کی دھار نکال کر بنائے گئے تھے، اسقدر زمانہ گذرنے کے باوجود ایسے تیز ہیں کہ اب بھی ان سے خاطرخواہ حملہ کیا جاسکتا ہے۔ بعض قبروں میں سے جو مردے نکلے ہیں، ان کے معائنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ اس زمانے کے عراقیوں سے بالکل مشابہ ہونگے۔ کیونکہ قدوقامت کاسہ ہائے سر کی ساخت اور دماغی خلا کی پیمائش سے اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے۔ ان تمام نوادر کو جو کھدائی کے بعد دستیاب ہوئے تھے۔ بغداد کے قومی عجائب خانے میں محفوظ کردیا گیا ہے۔

کیا کہنا

فراق گورکھپوری

رس میں ڈوبا ہوا لہراتا بدن کیا کہنا
کروٹیں لیتی ہوئی صبح چمن کیا کہنا

مدبھری آنکھوں کی السائی نظر پچھلی رات
نیند میں ڈوبی ہوئی چندر کرن کیا کہنا

ارضِ جنت پہ گھٹا جیسے برس کر کھل جائے
سوندھی سوندھی تری خوشبوئے بدن کیا کہنا

روپ سنگیت نے دھارا ہے بدن کا یہ رچاؤ
تجھ پہ لہلوٹ ہے بے ساختہ پن کیا کہنا

ٹھہری ٹھہری سی نگاہوں میں یہ وحشت کی کرن
چونکے چونکے سے یہ آہوئے ختن کیا کہنا

جیسے لہرائے کوئی شعلہ کمر کی یہ لچک
سربسر آتشِ سیال بدن کیا کہنا

نرم دوشیزہ ادائیں ہیں کہ جنت کی ہوائیں
تاروں کے گیت کی لے مست چلن کیا کہنا

قامتِ ناز لچکتی ہوئی اک قوسِ قزح
زلفِ شب رنگ کا چھایا ہوا گھن کیا کہنا

جس طرح جلوۂ فردوس فضاؤں سے چھنے
پیرہن میں تری رنگینیٔ تن کیا کہنا

جلوہ و پردہ کا یہ رنگ دمِ نظارہ
جس طرح ادھ کھلے گھونگھٹ میں دلہن کیا کہنا

سربسر کیف و کم و رمز و کنایات وہ آنکھ
یعنی ہر گھات میں ہر بات میں کن کیا کہنا

دل کے آئینے میں اس طرح اترتی ہے نگاہ
جیسے پانی میں لچک جائے کرن کیا کہنا

تو محبت کا ستارا تو جوانی کا سہاگ
حسن لو دیتا ہوا لعلِ یمن کیا کہنا

چشمِ مخمور، صراحی بہ بغل، جام بکف
نغمۂ حافظِ شیراز بدن، کیا کہنا

یہ نگاہوں کی کھنک، تیغِ ادا کی جھنکار
روپ سرتا بہ قدم بوپتارن کیا کہنا

زلفِ شبگوں کی چمک، پیکرِ سیمیں کی دمک
دیپ مالا ہے سرِ گنگ و جمن کیا کہنا

نیلگوں شبنمی کپڑوں میں بدن کی یہ جوت
جیسے چھنتی ہو ستاروں کی کرن کیا کہنا

تیری آواز سویرا، تری باتیں تڑکا
آنکھیں کھل جاتی ہیں اعجازِ سخن کیا کہنا

میرے ہاتھوں چڑھے پروان تو اے پریم کی بیل
پلو رے جوبن پہ ہے جیسے مرا فن، کیا کہنا

آر۔ سی۔ سریواستو

ڈی راگھون

پچھلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں لندن کا ذکر ہے کہ ایک دبلا پتلا لمبا آدمی جو حال ہی میں جنوبی افریقہ سے آیا تھا ایک انڈین ایمبولینس کور کی تنظیم کیواسطے سرتوڑ کوشش میں مصروف تھا۔ اس کی ضرورت فرانس کی لڑائی کے زخمیوں کیواسطے تھی۔ جو ہندوستانی اس زمانہ میں انگلستان میں مقیم تھے انہوں نے اس شخص کی آواز پر فوراً لبیک کہا۔ طلباء، صحافت نویس اور تجارت پیشہ غرض ہر طبقہ کے آدمیوں نے رضاکارانہ طور پر اپنے تئیں پیش کر دیا۔ جو شخص نیلا سوٹ پہنے اس کام میں پیش پیش تھا وہ وہی تھا جو آگے چل کر ہندوستان کا سب سے بڑا آدمی بنا۔ یعنی مہاتما گاندھی جو اسوقت مسٹر موہن داس کرمچند گاندھی کہلاتا تھا۔ اس طبی وفد کے رضاکاروں کو کیا معلوم تھا کہ اس ایمبولینس بریگیڈ کا کمانڈر ایک دن ان کے ملک کا ایک بڑا سیاسی رہنما بنے گا ان رضاکاروں نے اپنی خدمات صرف بنی نوع کی ہمدردی اور بہبود کے جذبہ کے ماتحت پیش کی تھیں۔ انہی لوگوں میں ایک نوجوان سریواستو بھی تھا جو ۱۹۱۱ء میں بحیثیت ایک اسٹیٹ اسکالر (سرکاری وظیفہ یاب طالب علم) کے شکر سازی کی صنعت میں خصوصی تعلیم حاصل کرنے انگلستان گیا تھا۔

جب نوجوان سریواستو ۱۹۱۶ء میں اپنی ٹریننگ ختم کرکے ہندوستان واپس آیا تو اس نے اپنے تئیں سودر لینڈ کی فیکٹریوں سے وابستہ کرلیا اور دو ہی سال کے اندر وہ ایک کارخانہ کا منیجر ہو گیا۔ اس کے بعد سے اسکو ہندوستان میں شکر کے نئے نئے کارخانے کھولنے کی دھن لگ گئی۔ گنا بکثرت مہیا ہوسکتا تھا، روپیہ کی بھی کمی نہ تھی۔ ضرورت صرف ایک صحیح مشورہ کار اور ماہر صنعت کی تھی۔ سریواستو کے جوش، فنی معلومات اور شکر سازی کے کام کے تجربہ نے اسکو وہ زریں موقع بہم پہونچا دیا جسکی اسکو تلاش تھی ۱۹۲۱ء میں وہ بڑے مقتدر کاروباری امبالال سرابھائی سے ملا اور اسکو شکر سازی کے کام کی اہمیت اور مستقبل کے امکانات سے باخبر کیا اور یقین دلایا کہ اگر صحیح قسم کی فنی بنیادوں پر منحصر کرکے اس کام کو کیا جائے تو بڑے فائدہ کی امید ہے۔ اس واقف رموز تجارت میں مردم شناسی کا مادہ بدرجہ اتم تھا اس لئے اس نے خود مسٹر سریواستو ہی کو ایک نئی وضع کی فیکٹری قائم کرنے کا مجاز بنا دیا اور کہا کہ اس فیکٹری کو جلد از جلد چالو کر دو۔

اچھی قسم کی مشینیں حاصل کرنے کے لئے انگلستان اور یورپ کے طویل دورہ کی ضرورت تھی چونکہ مسٹر سریواستو میں تن دہی کا مادہ اور سائنسی قابلیت بہت زیادہ موجود تھی اسلئے وہ ۱۹۲۳ء میں ایک نئی فیکٹری قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس نئے کارخانہ "بہار شوگر ورکس" کو بڑی نمایاں کامیابی ہوئی مسٹر سریواستو ۱۹۲۸ء تک اس کارخانے کے منیجنگ ڈائرکٹر رہے۔ ۱۹۲۸ء میں حکومت صوبجات متحدہ نے جس کو شکر سازی سے خاص شغف اور دلچسپی ہے، آپ کی خدمات اپنے محکمہ صنعت و حرفت کیلئے لے لیں آپکو اس محکمہ کا ڈپٹی ڈائرکٹر بنا دیا۔

مسٹر سریواستو کی داستان حیات اور ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت کی درجہ بدرجہ ترقیوں کی داستان ایک ہی ہیں۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ اس بچہ صنعت کو پال پوس کے جوان کیا بلکہ ہر ہر درجہ اور منزل پر اس کی ترقی کا خاص خیال رکھا اور جب کبھی بھی اسکو کسی خطرہ کا سامنا ہوا آپ نے اسکو محفوظ رکھنے کی پوری پوری کوشش کی شکر سازی کی صنعت اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی صنعتوں میں دوسرے نمبر پر ہے اس ترقی کیلئے مسٹر سریواستو کا نام ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہیگا۔ آپ کئی معنوں میں اس صنعت کے بہترین خیرخواہ، رہنما اور نکتہ داں ہیں۔ آپ نے اس صنعت کی اعلیٰ تعلیم بحیثیت سرکاری وظیفہ یاب کے حاصل کی تھی اس کے صلہ میں آپ نے اس صنعت کو بہترین فنی بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ اس سے بھی بڑھ کر آپ کی خدمت یہ ہے کہ آپ نے "امپیریل انسٹی ٹیوٹ آف شوگر ٹیکنالوجی" کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارہ کا کام ہندوستانی شکر سازی کی صنعت میں مزید ترقی میں اور بھی زیادہ ممد و معاون ہوگا۔

۱۹۲۹ء میں "امپیریل کونسل آف ایگریکلچر" حکومت ہند کو یہ بات جتا رہی تھی کہ ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی سخت ضرورت تھی۔ کونسل نے مسٹر سریواستو کی اس تحریر پر جو آپ نے اس صنعت کے مستقبل کے بارے میں لکھی تھی، غور کیا اور اس سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے طے کر لیا کہ "شوگر ٹیکنالوجسٹ" کے عہدے کیواسطے آپ مناسب ترین آدمی ہیں۔ یہ جگہ اسی زمانہ میں حکومت نے منظور کی تھی۔ یہ ذکر ۱۹۲۹ء کا ہے۔ "امپیریل کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ" کے شوگر ٹیکنالوجسٹ کی حیثیت سے اس نئی صنعت میں نئی روح پھونکنے کی بڑی بھاری ذمہ داری آپ پر آ پڑی مسٹر سریواستو کی خواہش تھی کہ ہندوستان اس صنعت کی سلسلہ میں تمام جدید ترین ایجادات اور انکشافات سے فائدہ اٹھائے۔ اسی خیال کے ماتحت آپ نے تمام یورپ کا دورہ کیا اور ۳۱-۱۹۳۰ء میں امریکہ کا۔ آپ کی واپسی پر امپیریل کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ کے وائس چیرمین سر ٹی۔ وجے رگھواچاریہ نے مسٹر سریواستو سے دو شرطیں کرالیں اول یہ کہ آپ سوائے علالت کے اور کسی موقع پر چھٹی نہیں لیں گے دوسرے یہ کہ آپ کے زمانہ ملازمت میں ہر سال کم از کم ایک کارخانہ شکر سازی کا ضرور کھلا کرے گا اسوقت تمام ملک میں صرف اکتیس کارخانے تھے۔ آپ کے زمانہ ملازمت کے پہلے تین سال میں فی الواقع کام اس قدر زیادہ رہا کہ آپ پہلی شرط کو بھی پورا کرنے پر مجبور رہے اور ایک دن بھی آرام نہ کر سکے۔

ہندوستان کی شکر سازی کی صنعت کو سرکاری اعانت ۱۹۳۲ء میں ملی۔ پہلا سال مسٹر سریواستو کیلئے سب سے زیادہ انہماک کا تھا۔ آپ کو شکر کے نئے کارخانے کھولنے کا ارادہ رکھنے والے بیسیوں آدمیوں کو رائے اور مشورہ دینا۔ نئے کارخانوں کے واسطے مناسب جگہوں کا انتخاب کرنا اور زیر تعمیر کارخانہ جات کا معائنہ کرنا پڑا۔ نئی مشینیں دیکھیں، اور کام کو ترقی دینے کیواسطے نئی نئی تجویزیں بنائیں۔ کارخانوں کی اطلاع کیواسطے آپ نے رپورٹیں تیار کیں اور کام سیکھنے والوں کی تعلیم کا نصاب بنایا اور نجی کارخانوں میں ریسرچ کرنے کا کام شروع کرایا۔ اصل میں شکر کے کارخانوں کیواسطے آپ نے ایک طرف تو جیسے خانے انفارمیشن بیورو کا کام دیا اور دوسری طرف کارخانہ جات اور پبلک کے درمیان ایک رابطہ منسلکہ کا۔ یہ کام خود صنعت کے ساتھ ساتھ بڑی تیز گامی کے ساتھ ترقی کرتا اور بڑھتا چلا گیا۔

اس صنعت کی ترقی کے ابتدائی درجوں میں مسٹر سریواستو کو متعدد رلیسرچ کرنے والے جوشیلے آدمیوں سے بھی بڑی مدد ملی۔ انہی لوگوں سے آگے چل کر امپیریل انسٹی ٹیوٹ آف شوگر ٹیکنالاجی بنا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی آزاد زندگی کا دور یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ "ہارکوٹ بٹلر ٹیکنالاجیکل انسٹی ٹیوٹ" کا ایک حصہ تھا۔ آج شکر سازی کی صنعت تمام فنی امور کے سلسلے میں اسی انسٹی ٹیوٹ سے مشورہ کرتی ہے۔ اگرچہ اس ادارہ کو گنے کے زراعتی پہلو سے کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن اس کو گنے کی پیداوار کے متعلق تمام اطلاعات ملتی رہتی ہیں اور اس کا کام یہ بھی ہے کہ شکر کے کارخانہ جات کو ضروری مقدار میں گنے بہم پہونچتے رہیں۔ ہر سال اس ادارہ سے متعدد تربیت یافتہ شوگر ٹیکنالاجسٹ نکلتے ہیں چنانچہ ابتک اس صنعت کے مختلف شعبوں میں مہارت رکھنے والے چارسو سے زیادہ ماہرین اس ادارہ میں تربیت پاچکے ہیں۔ ہندوستان بھر کے تمام کارخانوں میں تیار ہونے والی شکر کا یہاں معائنہ اور اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

حال ہی میں جب میں مسٹر سریواستو سے کانپور میں ملا تو آپ نے مجھکو اپنے انسٹی ٹیوٹ میں گھمایا اور بڑے موثر لہجہ میں کہا "چند ہی سال ہوئے یہ انسٹی ٹیوٹ صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ لیکن آج یہی ادارہ اور اس کی لیبورٹیریاں اس بڑی عمارت کے ایک بہت بڑے حصہ پر حاوی ہیں۔ یہ ادارہ ہندوستان بھر میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے اور شکر سازی کی صنعت کی جان یہی ادارہ ہے۔"

مسٹر سریواستو نے شکر بنانے کی ایک چھوٹی سی مشین بھی کانپور کے انسٹی ٹیوٹ میں لگوائی ہے۔ یہ چھوٹی مشین ان علاقوں میں بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے جہاں گنا تو پیدا ہوتا ہے لیکن حمل ونقل کے معقول ذرائع نہ ہونے کی بنا پر وہاں کا گنا شکر کے کارخانوں کو نہیں بھیجا جا سکتا۔ آپ نے کہا "آپ گڑ کو دیکھکر گھبرایئے نہیں یہ کالے رنگ کا گڑ اور شکر سفید شکر سے زیادہ صحت بخش اور مفید ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ گڑ میں مٹھاس زیادہ ہوتا ہے بلکہ بطور غذا کے بھی یہ ایک مفید صحت چیز ہے۔ اگرچہ گڑ بنانا ایک چھوٹے درجہ کی دیہاتی صنعت ہے لیکن گڑ بنانے میں جتنا گنا کھپتا ہے وہ اس گنے سے چوگنا ہوتا ہے جو سفید شکر بنانے میں ہر سال کام آتا ہے۔" آجکل مسٹر سریواستو

گڑ اور لال شکر بنانے کی صنعت سے متعلق مشکلات کو حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ آپکا اصول یہ ہے "ہندوستان گنے کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ جب یہ بات ہے تو کیوں نہ ہندوستان کو ہر قسم کی شکر سازی کا مرکز بنادیا جائے؟"

مسٹر سریواستو اپنے طریق زندگی اور نظریات میں سو فیصدی ہندوستانی ہیں حالانکہ آپ نے غیر ملکوں کا خوب دورہ کیا ہے۔ آپ شراب نہیں پیتے لیکن پان کھانے کا بہت شوق ہے پان کا پیش کش آپ ہر وقت قبول کرلیتے ہیں اور آپ کی میز پر پانوں کی ڈبیہ ہر وقت موجود رہتی ہے دس سال ہوئے جب برلا والوں نے "شوگر کانفرنس" کے ممبروں کو بڑی پرتکلف دعوت دی تھی تو قاعدہ کے مطابق کھانے کے بعد سگریٹ پیش کی گئی۔ مسٹر سریواستو کھڑے ہوگئے اور آپنے کہا "کوئی ہندوستانی دعوت خواہ وہ کتنی ہی پرتکلف کیوں نہ ہو جبتک اس میں پان نہ ہو اسکو مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ پان کا ایک ٹکڑا مقوی نہ سہی ہاضم ضرور ہوتا ہے"۔ اسوقت سے کوئی "شوگر کانفرنس" پان کے بغیر نہیں ہوئی۔

مسٹر سریواستو سر جے۔ پی سریواستو۔ فوڈ ممبر کے بھائی ہونے کی حیثیت سے بعض دفعہ برادر جے۔ پی کہلاتے ہیں۔ مسٹر آر۔ سی کا مقصد حیات یہ ہے کہ ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت کو انتہائی ترقی دی جائے۔ چنانچہ یہ ملک شکر بنانے میں آج تمام دنیا کے ملکوں سے آگے ہے۔

بیدی کی افسانہ نگاری

وقار عظیم

بیدی اُردو کے سب سے زیادہ جذباتی افسانہ نگار ہیں۔ اور ان کی افسانہ نگاری کا ہر پہلو اسی گہری جذباتیت سے پیدا ہوا ہے۔ جذباتیت کو ہم عموماً ایک ایسے مفہوم میں استعمال کرنے کے عادی ہیں، جو ہر چیز کو عقل اور ادراک کی حدوں سے پرے پھینک دیتا ہے۔ اور اسکی حدوں میں داخل ہو کر انسان اپنی پسند، اپنی سہولت، ذہنی آسائش اور سہل انگاری کے آگے باقی ہر چیز کو بے حقیقت گردانتا ہے۔ اپنا وجود اور اس کے خود غرضانہ میلانات ہی سب کچھ بن جائیں تو انسان دیوانوں کی طرح دوسروں کو اپنے اندر جذب کرنے کی فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ دیوانگی دنیا کی سیدھی سادی غیر اہم باتوں میں خطابت کا جوش، شاعری کا غلو اور مبلغ کی شدت احساس پیدا کر کے، سننے والوں کے کانوں میں ڈھول اور نقارے بجانے لگتی ہے۔ اور اس ساری شدت، غلو اور جوش کا نتیجہ عموماً صفر نکلتا ہے۔

بیدی کی جذباتیت اس سستے قسم کی جذباتیت سے بالکل مختلف ہے اس میں خطیبانہ جوش کی جگہ ایک ہمدرد انسان کی سی نرمی اور دردمندی ہے اور شاعری کی گھلاوٹ اس میں اونچے اور فہم سے دور رہنے والے فلسفے، اور کتابوں سے سیکھی ہوئی نفسیات کا جھوٹا سہارا نہیں۔ یہ جذباتیت دنیا کے دکھ درد کو بھیانک بنا کر پیش کرنا بھی نہیں جانتی اور اپنی دیکھی ہوئی ہر چیز کو کاغذی آگل دینے کا شوق بھی نہیں۔ یہ جذباتیت تو دنیا کی اچھی اور بری بہت سی چیزوں پر گہری نظر ڈالنے کی عادی ہے۔ اسے ہر چیز کی اوپری سطح سے نیچے، بہت دور گہرائی میں پہنچ جانے کی عادت ہے اور اسی لئے اس کے ہیجان اور اضطراب میں بھی ہر جگہ سکون ہے۔

بیدی کی جذباتیت میں گہرائی اور سکون ہے اور اسی گہرائی نے ان کے افسانے کو اسکا موضوع بھی دیا ہے اور فن بھی۔ اور اسی چیز نے انکی دیکھی، سوچی اور محسوس کی ہوئی چیزوں کو آپس میں بالکل گھلا ملا دیا ہے۔ کائنات کا بیرونی اور مادی پہلو نظر کے سامنے آتا ہے اور جذبات اور فکر اس مادی پہلو کی پوری دل کر کے اسے اپنے اندر ضم کر لیتے ہیں اور اس طرح اس کائنات کے مناظر اور واقعات اور افسانہ نگار کی ذہنی کائنات، اسکا تخیل اور اس کے جذبات آپس میں مل کر ایک نئی کائنات کی تعمیر کرتے ہیں۔ یہ نئی کائنات بیدی کے افسانے ہیں۔

بیدی کی افسانوی کائنات بہت سی چیزوں سے مل جل کر بنی ہے۔ لیکن جس چیز نے اس میں سب سے زیادہ چہل پہل اور گہما گہمی پیدا کی ہے وہ اس کے کردار ہیں۔ بیدی کا کوئی افسانہ پڑھئے اُسے ختم کر چکنے کے بعد اور بہت سی چیزوں کے نقش سے زیادہ گہرا کسی نہ کسی خاص آدمی کے وجود کا نقش ہوگا، جو باقی ہر چیز کو پیچھے کی تہوں میں دھکیلتا ہوا ذہن کی سطح پر سب پہ چھا جائیگا۔ کسی کہانی میں ایک کسی میں دو اور کسی میں دو سے بھی زیادہ کردار اِدھر سے اُدھر چل پھر کر، اپنی باتوں سے، عادتوں سے، اور ان کے علاوہ اپنے سوچنے کے مخصوص انداز سے ہم پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کی ہم نے صرف جھلک دیکھی ہے اور کچھ کو اتنی اچھی طرح دیکھا ہے کہ انھیں ہم شاید کبھی بھول ہی نہیں سکتے۔ 'کوارنٹین' میں بھاگو یا زین العابدین' میں خود زین العابدین دو ایسی ہستیاں ہیں جو بیدی کی کہانیوں کے ذکر کے ساتھ زندہ رہیں گی۔ پھر ان کے علاوہ اغوا میں بہت سے آدمی اور ان بہت سے آدمیوں میں شیخ جی، یا زین العابدین میں طرح طرح کے لوگ اور ان طرح طرح کے لوگوں میں خود زین العابدین کا ہیرو۔ اس طرح کے ان گنت کردار بیدی کے افسانوں میں ہیں جو اس بھیڑ بھاڑ میں بھی ایک دوسرے سے الگ اور اتنے نمایاں ہیں کہ ان کی ذہنی تصویر بنانے اور بہت سی ملی جلی تصویروں میں سے نکال کر انھیں الگ کر دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ ہم بیدی کے کرداروں کو اردو کے تمام افسانوی کرداروں سے بھی الگ کر سکتے ہیں اور خود ان کے اپنے کرداروں میں بھی۔

دوسرے افسانوی کرداروں سے تو اس طرح کہ ان کے خاص خاص کرداروں میں تخیل کی رنگینی اور بخیہ کاری ہوتی ہے اور تخیل کی یہ رنگینی اور بخیہ کاری انھیں طرح طرح کی ذہنی اور بعض اوقات جسمانی آلام میں مبتلا کرتی ہے۔ ہمدوش کے کئی کردار، گرم کوٹ کا ہیرو، اور رحمان اسی کے بہکائے ہوئے ہیں یا دوسرا کتا نہ مایا آتا نش بھی اسی نفسیاتی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ بیدی کے کردار کسی خاص الجھن میں مبتلا ہیں۔ اس الجھن میں ان کے جذبات میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ ایک خیال پیدا ہوتا ہے، وہ دوسرے خیال کو جگہ دیتا ہے لیکن فوراً ہی کوئی واقعہ جسے اتفاقیہ ہوتے ہوئے بھی اتفاقیہ نہیں کہا جا سکتا خیال کی رَو کو بدل دیتا ہے۔ کچھ دیکھا یا کچھ سُنا اور اس ذرا سے دیکھنے یا سننے نے خوشی کو مایوسی یا مایوسی کو خوشی سے بدل دیا۔ بیدی کردار کے اس ذہنی اور جذباتی اتار چڑھاؤ کی بہت اچھی مصوری کرتے ہیں۔

تخیل کی رنگینی اور بخیہ کاری کے علاوہ ایک دوسری چیز جسکا بیدی کے کرداروں پر گہرا اثر ہے، وہ عادت کی پختگی ہے۔ عادت راسخ ہو جاتی ہے تو نفسیاتی اصلاحوں کو بھی ان کے آگے سپر ڈالنی پڑتی ہے۔ زین العابدین ہزاروں جتنوں کے بعد بھی جیسا تھا ویسا ہی رہتا ہے، اور بوڑھا رام پنشن لینے کے بعد بھی غلامی کے دکھائے ہوئے راستہ پر چلتے رہتے ہیں۔ انسان کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی ذہنی عمل اور جذبات کا جو گہرا دخل ہے، بیدی نے اسکی اہمیت پر غور کیا ہے اور اس لئے جو بات دوسروں کی کہانیوں میں بالکل غیر ضروری اور سپاٹ معلوم ہوتی ہے، انکی کہانیوں میں کسی نہ کسی نفسیاتی تحریک کی تشریح بن جاتی ہے۔ 'ہڈیاں اور پھول' میں کئی موقع ایسے ہیں جو دیکھنے میں بے محل معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں انکی کہانی میں

موجودگی اس کی نفسیاتی بنیاد کو زیادہ مضبوط اور مستحکم بنانی ہے۔ بیدی نے اپنے افسانوں میں جتنے کرداروں سے ہمارا تعارف کرایا ہے انھیں کھوکھلا ڈھانچا بنا کر معلق نہیں چھوڑا ہر کردار کی تخلیق کسی خاص موقع اور مقصد کے لئے ہوئی ہے اور اس موقع اور مقصد کیلئے اس میں جو جذباتی اور نفسیاتی عنصر ڈالے گئے ہیں وہی اس کردار کو ہر دوسرے کردار سے الگ تھلگ کر دیتے ہیں۔ بیدی کا ہر کردار جب کچھ کہتا یا کرتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی خاص وجہ ہوتی ہے، اس کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت کے لئے کوئی جذباتی یا نفسیاتی جواز موجود ہے اور یہی جذباتی یا نفسیاتی جواز ہے کہ بیدی کی کردار نگاری میں حقیقت نگاری کی گہرائیاں اور باریکیاں دونوں موجود ہیں۔ انکی صحبت میں رہ کر ہم کبھی اکتاتے یا گھبراتے نہیں۔ اس کے تخیل کی پختہ کاری جب اسے سوچنے پر مجبور کرتی ہے تو ہمیں اس کی رنگینی میں لذت محسوس ہوتی ہے اور ہم خود بھی افسانہ نگار کی طرح یہ سوچنے لگتے ہیں، کہ جذبات آدمی کو خیرہ سے نپٹنے پڑتے ہیں لیکن دیرپا خرد سے وقتی جذبات یقیناً بہتر ہیں۔

بیدی کے نزدیک ہر انسان کے ہر عمل کی نفسیاتی دلیل اور جذباتی تحلیل کی جا سکتی ہے عموماً اس فلسفیانہ خیال کو تخلیقی ادب میں اپنا رہنما بنانے میں دو اندیشے ہوتے ہیں۔ فلسفہ کی خشکی اور شاعری کی مبالغہ آمیز رنگینی لیکن بیدی نے ہر جگہ اس بے رنگی و رنگینی سے اپنا دامن بچا لیا ہے۔ ان کے کردار زندگی کی حدوں سے ایک قدم بھی آگے نہیں نکلتے۔ انکی نفسیاتی یا جذباتی زندگی بیرونی حالات کی پیدا کی ہوئی ہے۔ واقعات اور کرداروں میں برابر ایک گہرا اور بامعنی ربط ہے۔ واقعات ہی انسان کو تخیل اور فکر پر آمادہ کرتے ہیں اور وہی کسی نہ کسی عمل کی طرف لے جاتے ہیں۔ انہیں سے گذری ہوئی زندگی کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں اور اس لئے کسی کردار کو اس کے بیرونی ماحول سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

بیدی کی کردار نگاری کی بنیاد تین چیزوں پر ہے۔ وسیع اور عمیق مشاہدہ، مطالعہ کا پیدا کیا ہوا نفسیاتی نقطۂ نظر اور گہری جذباتیت سے متاثر فکر و تخیل کا انداز۔ مشاہدہ نے دنیاوی زندگی کے ہزاروں پہلوؤں کی چھوٹی بڑی باتیں دکھائیں، نفسیاتی نقطۂ نظر نے آنکھوں سے دیکھی ہوئی حقیقتوں میں چھپی ہوئی ایک اور گہری حقیقت کی طرف مائل کیا اور جذباتیت اور فکر نے اس نئی حقیقت میں فنی رنگ آمیزیاں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی کی کردار نگاری اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے والی حقیقت نگاری عام حقیقت نگاری سے بالکل مختلف ہے۔ وہ چیزوں کو جیسا دیکھتے ہیں ویسا ہی پیش کر دینے کو فن کے منافی سمجھتے ہیں، ہر دیکھی ہوئی چیز (خواہ وہ فطری منظر ہو یا انسانی عمل) جو کچھ وہ نظر آ رہی ہے، اس سے کہیں زیادہ چھپی ہوئی ہے۔ بیدی اس ظاہری حقیقت سے زیادہ اس کے پیچھے یا اس کی تہ میں چھپی ہوئی گہری حقیقت کے مصور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی افسانے میں محض منظروں کے حسن اور دلکشی کے علاوہ اس کے وجدانی اور نفسیاتی اثرات پر زور دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر تخیل اور جذبات کا رنگ چڑھا کر اس میں زندگی اور اس کے نیتوں کی گہرائی پیدا کر دیتے ہیں۔

بیدی نے انسانی کردار کو جذبات اور تخیل کے جس دائرے میں چلتا پھرتا دکھایا ہے، اس کے پیچھے ہر جگہ سچی زندگی کا پس منظر ہے۔ اور یہ پس منظر کسی جگہ کھوکھلا یا سپاٹ نہیں۔ اس میں تنوع کی رنگینی بھی ہے اور نظر کی گہرائی بھی۔ انھوں نے زندگی کے ایک نہیں بہت سے پہلوؤں کو ان کی باریکیوں اور گہرائیوں میں جا کر دیکھا ہے۔ اپنے کئی افسانوں میں انھوں نے اپنی ہندو گھرانوں کی زندگی کو اپنے خیال اور فکر کا محور بنایا ہے۔ اس زندگی میں انسان جو کچھ کرتا ہے اور اس کرنے میں اس کے خیالات اور جذبات کی رو جس طرح نت نئے راستے اختیار کرتی رہتی ہے اسے بیدی نے ایک مصور کی طرح پیش کیا ہے جس کے ذہن پر موضوع کے ہر خد و خال کا گہرا نقش ہوتا ہے لیکن وہ اپنی فنی نظر کی رہبری میں ان بہت سی چیزوں میں سے صرف گنی چنی چیزوں کو اپنے شعور کی گہرائیوں میں نکالتا ہے اور ان گنی چنی چیزوں سے اپنی تصویر میں زیادہ سے زیادہ تاثیر اور نظر فریبی پیدا کر لیتا ہے۔ بیدی کا بھی یہی حال ہے۔ انھوں نے بظاہر ہندوؤں کی سماجی، مذہبی اور ذہنی زندگی کا مشاہدہ اور مطالعہ اسی گہرائی سے کیا ہے۔ ان کے کرداروں میں ان کے

جذباتِ مضطر

میں ادھر خودی میں ہوں مبتلا وہ ادھر فدائے جمال ہے
ہے عجب طرح کی کشمکش مجھے سجدہ کرنا محال ہے

کوئی دیکھے تو کہ الٹی تہ اب ادھر سے پرسشِ حال ہے
جو کبھی نگاہِ جواب تھی وہی اب نگاہِ سوال ہے

میں ادھر ہوں فکر میں کیا کہوں اور ادھر وہ محوِ خیال ہے
یہ عجیب منظرِ عشق ہے نہ جواب ہے نہ سوال ہے

مجھے ترکِ عشق میں عذر کیا کہ تری نصیحتیں ہیں بجا
مگر ایک بات ہے ناصحا مری زندگی کا سوال ہے

تجھے حسن پر جو غرور ہے تو مجھے بھی عشق پہ ناز ہے
ترے پاس حسنِ نظر ہے تو مرے پاس حسنِ جمال ہے

یہی حسن کی ہے جھلک نہاں وہ کسی لباس میں ہو عیاں
وہ نگاہِ عشق ہی کفر ہے جسے امتیازِ جمال ہے

ترا بندہ ہونے کی فائدہ تری آرزو میں جو غم ملا
تو وہ منکرا اچھا بدر جہا کہ جو بے نیازِ جمال ہے

ترے پاس آ کے بہک گیا تو نہ اس کے بعد سنبھل سکا
جو یہ حال ہے ترے قرب کا تو جدائی اور محال ہے

زہے عشقِ مضطرِ باوفا جو غرض سے دل نہ ہو آشنا
اور اگر رہینِ طلب ہو تو وہ سوال کوئی سوال ہے

مضطر لکھنوی

سلسلے میں مختلف رسم و رواج، شادی بیاہ اور اس طرح کے اور بہت سے سماجی اور معاشرتی ادارے، ان میں بلا جلا عقیدہ اور توہم یہ سب چیزیں ان کی نظر میں سمائی ہوئی ہیں۔ اور وہ ان میں سے ہر ایک چیز سے مناسب موقعوں پر مناسب کام لیتے ہیں۔ چھوکری کی لوٹ، جنگل، ممتا، گرہن اور غلامی میں متوسط گھرانوں کا یہی ملا جلا ماحول ہے اور اسی ماحول میں رہ کر بیدی نے فنکار مصوّر کی طرح ہمارے ذہن کو کچھ گہری نفسیاتی اور جذباتی حقیقتوں سے روشناس کرایا ہے۔

ان متوسط گھرانوں کے علاوہ، بیدی کے افسانوں میں متوسط طبقے کی زندگی کا گھیلو اور روزمرہ ماحول ہے۔ کلرک ہیں، ان کے معمولاتِ زندگی ہیں۔ مزدور ہیں اور اقتصادی بدحالی سے لبے جھکے غریب ہیں لیکن ان سب چیزوں میں ان کا نقطۂ نظر محض اشتراکی نہیں، وہ اشتراکیت سے بھی آگے بڑھ کر انسانیت کے وسیع اور دردمند نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ وہ ہڑتال اور اقتصادی بدحالی سے زیادہ اہم اس چیز کو سمجھتے ہیں کہ آدمی کمائے کیا۔ کل ہونے والی بات سے کہیں زیادہ اہم ان کے نزدیک آج کی بات ہے۔ اور اس آج کی بات میں جہاں ایک طرف انھوں نے حقیقت نگاری کے مادی پہلو پر بھی کہیں زیادہ اس کے نفسیاتی تجزیہ پر زور دیا ہے وہاں ہماری سماجی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر تنقیدی اور طنز آمیز نظر بھی ڈالی ہے۔ اس تنقید اور طنز میں مصوّری بھی ہے اور کردار نگاری بھی اور اسکے ساتھ ملا جلا ہی نفسیاتی اور تحلیلی اندازِ بیان بھی۔

اُردو کے بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح بیدی کے افسانوں میں بھی بہت سی جگہ عورت نظر آتی ہے، لیکن ان کے یہاں دو ایک موقعوں کو چھوڑ کر، عورت صرف رومان کا دوسرا نام نہیں۔ عورت کے تصوّر کے ساتھ رومان کا جو قدرتی جذبہ موجود ہے اسکا احساس بیدی کو بھی شدّت سے ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو چیز برابر اس تصوّر کی ہم عناں رہتی ہے وہ دنیاوی علائق ہیں۔ وہ عورت اور اس کے رومان کو اُن تعلقات کی فضا میں رہ کر دیکھتے دکھاتے ہیں، جن کے بغیر عورت کی فطرت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ عورت ماں ہے، بیوی ہے، بہن ہے اور اس کے علاوہ اسکے دم سے دنیا کے اور بہت سے رشتے ناطے ہیں اور انہیں رشتے ناتوں میں رومان بھی ہے۔ عورت کا وہ دل ہے جس کی محبت میں سمندروں کی گہرائی ہے، اور وہ سماج بھی ہے جو عورت کو اسکے حق نہیں دیتا۔ بیدی کے دل میں اس عورت کے لئے جو بیوی ہے گہرے رومانی جذبات ہیں مگر کے سیدھے سادے ماحول میں، انھوں نے جہاں کہیں اس سچے اور پُرخلوص جذبہ کی ترجمانی کی ہے، پڑھنے والے کا دل اسی رومان کی لطافتوں میں ڈوب جانا چاہتا ہے اس سکون بھرے منظروں کو دیکھ کر آنکھوں میں خوشی اور تاثیر کے آنسو جھلکنے لگتے ہیں ان کے افسانہ "گرم کوٹ" میں عورت کی اس فطرت کی جتنی اچھی تصویر ہے میرے نزدیک اُردو کے کسی اور افسانے میں نہیں۔ عورت جسے سماج میں بہت اونچا درجہ ملنا چاہیئے، اسے سماج نے اور سماج کے اخلاقی نظریوں نے بہت نیچا گرا دیا ہے، اور اس چیز نے بیدی کو بھی متاثر کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اسکا ذکر بھی ہنیں

چھچھوری جذباتیت پر آمادہ نہیں کرتا۔ وہ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں لیکن ہلکے اشاروں اور لطیف کنایوں میں۔ عورت کے لئے ہمدردی کا ایک لفظ کہنے کا موقع مل سکے تو یہ اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

بیدی نے عورت کو اپنے اعصاب پر سوار نہیں کیا، پھر بھی اس کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے، کہا ہے اور لطیف، شاعرانہ انداز میں کہا ہے۔ اس عورت کے متعلق بھی جو خالص ہندستان کی اور اسکی گھریلو زندگی کی پیداکی ہوئی ہے، اور اس عورت کے متعلق بھی جو مغرب نے ہندستان میں پیدا کر دی ہے۔ اس عورت کے لئے ان کے تحت الشعور میں کوئی اونچی جگہ نہیں۔ اس لئے کہ اس نے عورت کی اس مشرقیت کا خون کیا ہے، جو محبت، خلوص، ایثار اور ان سے پیدا ہونے والے رومان سے مل جُل کر بنی ہے۔

بیدی کے افسانوں کی تعمیر اور تشکیل کئی چیزوں سے مل کر ہوئی ہے۔ گہری جذباتیت، رنگین تخیل، کرداروں کی تحلیل اور ان کے عمل کا نفسیاتی تجزیہ، ان کرداروں کے پس منظر میں سچی زندگی، یہی اس کے موضوع اور فنی عناصر ہیں۔ اسی لئے ان کی کہانیاں شروع سے آخر تک پلاٹ کی کہانیاں نہیں ہیں۔ پلاٹ کے نقطۂ نظر سے ان کی کہانیوں کی ہیئت کئی طرح کی ہے۔ بعض کہانیوں میں صرف چھوٹی چھوٹی تصویریں ہیں اور یہ بہت سی تصویریں مل کر ایک مجموعی اور گہرا اثر پیدا کرتی ہیں بعض کہانیوں میں پلاٹ شروع ہوتا ہے اور کسی نقش کو واضح یا گہرا کر کے کہیں غائب ہو جاتا ہے بعض دفعہ پلاٹ کہانی پر شروع سے آخر تک چھایا رہتا ہے اور بالکل آخر میں جا کر اسکا تصوّر زا خاتمہ پلاٹ کو پس پشت ڈال کر کسی چھپی ہوئی چیز کو ابھار کر سب سے اوپر اور سب سے آگے لے آتا ہے اور کہیں مناظر، واقعات اور ان سے بنا ہوا پلاٹ رفتہ رفتہ کسی کردار کو ابھارتا رہتا ہے اور کہانی ختم کر چکنے کے بعد صرف ایک خاص کردار کی تصویر کے سوا اور کچھ ذہن میں باقی نہیں رہتا۔

ان سب چیزوں میں بیدی کو اپنے ہی تہائے ہوئے فن سے مدد ملی ہے ہر جگہ اُن کا اپنا فن اُن کا سہارا ہے اور اس فن میں بہت سی ملی جلی چیزیں ہیں معترضہ جملے، چھوٹی چھوٹی باتوں کو ضرب المثل بنا کر کہہ دینے کا انداز ایک ہی افسانے میں کسی خاص لفظ، فقرے یا جملے کی تکرار، خود انھیں کی بنائی ہوئی تشبیہیں اور کہیں معصوم طنز کا ہلکا سا پرتو اور کہیں کہیں لطیف مزاح۔

بیدی معترضہ جملوں سے دو خاص کام لیتے ہیں، ایک طنز کا اور دوسرے گذرے ہوئے واقعات کو تصوّر میں لانے کا۔ ان کے معترضہ جملوں کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔

"جیب میں دام ہوں تو انارکلی میں سے گذرنا معیوب نہیں"۔ (گرم کوٹ)

"جس شخص میں محبت کی سی کمزوری ہو وہ اپنے اعتقادسے ٹھکرا دیا جاتا ہے"۔ (دس منٹ بارش میں)

"چوری عجب قسم کی علت ہے جسکی تلقین ہماری مذہبی کتابوں میں شاید غلطی سے رہ گئی ہے"۔ (زین العابدین)

"انسان کو قدرت محض اس لئے کچھ دیتی ہے تاکہ پھر اس سے چھین لے۔ قدرت اپنی

حزینہ تمثیل کو مسام اور تک پہنچانے کے بہت سے طریقے جانتی ہے۔ (معاون ادیب)

ان مذکورہ جملوں میں طنز کی کمی نہیں گہرائی ہے اور جس ماحول میں یہ استعمال کئے گئے ہیں اُسے زیادہ گہرا، اہم اور پُر تاثیر بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے سے جملے بیدی نے اپنے جذباتی تخیل اور اپنی نفسیاتی فکر کے لئے بھی جا بجا استعمال کئے ہیں اور جس جگہ وہ استعمال کئے گئے ہیں وہاں ان کی حیثیت ضرب المثل کی سی ہو گئی ہے۔

"نہ تخیل آتا رنگین ہو اور نہ محرومی سے اتنا دکھ پہنچے۔" (گرم کوٹ)

"انسان ہمیشہ اصلیت کی نسبت اس کے دھوکے کو پسند کرتا ہے۔" (ہلی)

معترضہ جملے کہاوتوں کا سا تیکھا پن رکھنے والی برمحل باتیں اور اسی سے ملتی جلتی ایک اور تیسری چیز، فقروں اور جملوں کی تکرار ——— یہ تینوں چیزیں مل کر بیدی کے انداز میں تصور آفرینی کے سارے ایسے عناصر پیدا کرتی ہیں۔ ان تینوں میں بھی تکرار کے فن سے بیدی نے بہت سے موقعوں پر کام لیا ہے۔ مجھے کئی جگہ تکرار کے اس فن میں طنز کی گہرائیاں اور تخیل کی رنگینیاں ملی ہیں لیکن ایک موقع پر خاص کر اسکی ادبی لطافت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ 'زین العابدین' میں ایک جگہ بیدی نے زینو کی زبان سے یہ لفظ نکلوائے ہیں۔

"آپ کے خیال میں جیل کی زندگی اس زندگی سے بڑی ہے؟ وہاں بھی اللہ روٹی دے گا۔ اللہ سب کا رازق ہے ——— واللہ خیرالرازقین"

اس سے کوئی دس صفحے آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔

"میں خراماں خراماں گھر کو لوٹ رہا تھا اور سوچتا تھا کہ آج زینو کتنا خوش ہوگا وہ مجھے کتنا فرشتہ سیرت سمجھے گا۔ اس خوشی میں وہ کتنی چھلانگیں لگائے گا مجھ سے لپٹ کر کہے گا اللہ تمہیں ایک خوبصورت بیوی دے! اللہ سب کا رازق ہے۔ واللہ خیرالرازقین۔"

تکرار یوں بھی ایک لطیف چیز ہے۔ بیدی نے افسانوں میں اس لطافت سے مختلف طرح کے فنی کام لے کر اسے اپنے فن کا ایک ضروری سا جزو بنا لیا ہے۔

بیدی نے تشبیہوں اور استعاروں سے زیادہ اشاروں اور کنایوں سے کام لیا ہے۔ نئی تشبیہیں، نئے اشارے اور نئے کنائے وضع کئے ہیں۔ ان چیزوں کے لئے بیدی ادب کے روایتی سرمایہ اور اشتراکی تخیل کے دست نگر نہیں۔ وہ ایک وقتی اثر پیدا کرنے کے لئے افسانہ ہی کے ماحول اور فضا میں تشبیہیں یا کنائے تلاش اور وضع کر لیتے ہیں اور یہ تشبیہیں اور کنائے اپنا کام کر کے کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ فضا پیدا کرتے ہیں اس کے اثر کو بڑھاتے ہیں۔ روایتی کنایوں کی طرح [illegible] کو اپنے حسن میں ہو کر کے فضا کے تاثر میں کمی نہیں کرتے۔ بیدی کے جن افسانوں کی فضا نفسیاتی یا تخیلی ہوتی ہیں ان خود ساختہ کنایوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کنایہ انداز بیان میں لطف اور لطافت پیدا کرتا ہے اور افسانہ کی فضا کے لئے ایک نفسیاتی یا فلسفیانہ نکتہ سہل بن جاتا ہے کوئی گہری بات آسان بن جاتی ہے اور کوئی گتھی خود بخود سلجھ جاتی ہے۔ بیدی نے افسانے کو محض واقعاتی حد سے نکال کر ذہنی اور نفسیاتی زندگی کا ہم سفر بنانے کی کوشش کی ہے اور اس چیز میں انھیں اپنے کنایوں سے بہت مدد ملی ہے۔ لیکن جہاں کہیں انھوں نے صرف کنایوں ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا وہاں زندگی کا فلسفیانہ پہلو فن پر غالب آ گیا ہے اور اس ادبی کیف کی وجہ سے افسانہ زندگی سے دور جا پڑا ہے۔ ایک لاش، زندگی اور فلسفہ کی ایسی ہی الجھی ہوئی شکل ہے۔

بیدی کے فن کا ایک اور پہلو ان کی زبان ہے۔ عام طور پر ان کی زبان کے اس حصہ پر اعتراض کیا جاتا ہے جس پر مقامی اثرات غالب ہیں اور ان میں سے بعض سے ان کے طرز کی شگفتہ سنجیدگی کی روانی میں فرق بھی پڑتا ہے، لیکن اس سلسلے میں اس سے بھی زیادہ اہم ایک بات اور ہے جو ہر پڑھنے والا ان کے افسانوں میں محسوس کرے گا۔ جن باتوں کو آسان اور سیدھی سادی زبان میں کہہ کر زیادہ موثر بنایا جا سکتا ہے انہیں بیدی نے دقیق اور مشکل زبان میں کہا ہے اور اس سے ہر جگہ افسانہ کی فضا میں ایک بوجھل پن پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں تصنع آ گیا ہے اور بات میں شاید وہ تاثیر بھی باقی نہیں رہی جو افسانہ کی مجموعی فضا کے لحاظ سے ضروری تھی۔ مثلاً ان کے افسانہ رد عمل کی ایک عبارت ہے۔

"ان کے لب آہستہ آہستہ پھڑک رہے تھے گویا ایک صدیوں سے آشنا، پُر حلاوت، جذبات سے لبریز ایک قسم کے ہسٹریکل بوسے کے لئے مرتعش ہوں ...... اور جیسے اُن کی روح عریاں ہو کر قلب کی اندرون ترین ماہیتوں میں ایک نیلے ہلکے تھلکے، میٹھے مدہوش کن صوت ازلی اور ایک ایسی خنک سی تجلی کی متلاشی ہو جو اس مقام ہو کی عمیق بیکراں تاریکیوں میں اس کے لئے شمع بردار ہو جائے اور اس کی رہنمائی کی وجہ سے وصل تام ناممکن ......؟" (رد عمل ——— دانہ و دام)

مشکل پسندی کی ایسی مثالیں ان کے دونوں مجموعوں (دانہ و دام اور گرہن) میں اتنی زیادہ تو نہیں ہیں کہ انہیں بیدی کے طرز کی خصوصیت کہا جا سکے پھر بھی ایسی مثالیں آسانی سے اور خاصی تعداد میں مل جائیں گی جو اگر اسی آسان اور عام فہم زبان میں ہوتیں جس سے 'گرم کوٹ'، 'اغوا'، یا 'زین العابدین' ہیں تو ان افسانوں میں ایک خوشگوار ہمواری پیدا ہو جاتی۔

فکر و بیان کی اُن بہت سی خصوصیتوں کے علاوہ، جنھوں نے بیدی کے افسانوں میں ایک خاص قسم کی عظمت پیدا کی ہے، ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے وہ صرف اسوقت لکھتے ہیں جب واقعی انہیں کچھ کہنا ہوتا ہے اور پھر اسی کہی جانے والی بات کو اپنی شخصیت میں اچھی طرح گھلائے بغیر دوسروں کے سامنے لانا بھی اُن کے فنی منصب کے خلاف ہے۔ تجربہ کی اہمیت اور پھر جذبات اور تخیل کی گلکاری، جب تک یہ دونوں چیزیں اپنے منتہا پر نہ پہنچ جائیں ان کا کوئی افسانہ دوسروں کے لئے افسانہ نہیں بنتا جب تک یہ بات قائم ہے بیدی کی افسانوی عظمت کو قیام و ثبات ہے۔

نشانی

افسانہ

تسنیم سلیم

کبھی جذبات کی فراوانی سے چہرہ سرخ ہو جاتا تھا اور کبھی کسی نامعلوم سے خوف سے زرد۔ دل کی دھڑکن گھڑی کی ٹک ٹک کا ساتھ دے رہی تھی اور جوں جوں گھنٹے کی سوئی ایک طرف کھسک رہی تھی اس کا دل بھی اندر کی طرف دھنسا جا رہا تھا۔

وقت کی ایک ہی رفتار ہے وہ نہ تیز چلتا ہے اور نہ ہولے!

ایک دفعہ جب سورج ڈوب جاتا ہے تو یہی ایک رات کسی کی بے خواب آنکھوں میں رینگتی لڑکھڑاتی اور دم توڑتی ہوئی داخل ہوتی ہے اور کسی کی چاند سے اجلی راتوں میں ناچتی گاتی اور ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی... ہمارے اپنے احساسات مسرت کے گھنٹوں کو لمحوں سے بھی مختصر تصور کر لیتے ہیں اور دکھ کا ایک ایک لمحہ صدیوں میں گزر پاتا ہے ورنہ وقت کی تو وہی ایک چال ہے... ہمیشہ سے!

ریکھا کی زندگی میں ایسے دن بھی آئے تھے جو ہزار کوشش کے باوجود گھڑی بھر بھی ٹھہرنے کو راضی نہ ہوئے ایسی راتیں بھی گزری تھیں جب اس نے رو رو کر جان کا خون کیا لیکن کیا مجال جو صبح ہونے کا نام لے!

مگر یہ ایک رات بھی کیسے کیسے رنگ دکھلا رہی تھی جب اس کو اس پہلی اور آخری رات کا دھیان آتا جو اس کی خاموش اور مریض زندگی میں نئی صبح لے کر آ رہی تھی تو کلائی پر بندھی ہوئی ننھی سی گھڑی جس کو آج لاکھ مرتبہ ریڈیو سے ملایا تھا چابی کے ہوتے ہوئے بھی رک جاتی... اور ذرا سے میں تیر کی طرح یاد آ جاتا نرنجن داس... اور اپنا معصوم بچہ... قانون مذہب نہ جانے کیا کیا... تو ساری قیمتی گھڑیوں کے انجر پنجر بگڑ جاتے منٹ کی سوئی سیکنڈ پر بھاگنے لگتی اور گھنٹے کی سوئی منٹ کی رفتار اختیار کر لیتی... اس کا چہرہ فق ہو جاتا اور سانس چڑھ جاتی..!

اسی طرح ایک بج گیا!

ذہنی اضطراب کی طرح دیوار پر چڑھے ہوئے کلاک نے ٹن سے ایک کا گھنٹہ بجایا اور وہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے بہت زور سے کانپی جیسے کہ اس کی رگوں میں جوانی کے گرم خون کی جگہ برف کے ٹکڑے بھر گئے ہوں!

"تو ایک بھی بج گیا... اب کیا کروں... وہ آتا ہی ہوگا" ریکھا نے بیتاب ہو کر پہلو بدلا اور اپنی سوالیہ نگاہیں ایک تصویر پر جما دیں... یہ اس کی اپنی تصویر جو شادی کے دن کھینچی گئی تھی جس میں تانبے موتی پہنا کر اس کے آنسوؤں کی چمک کو پائمال کر دیا تھا!

یاقوت اور ہیرے کی شعاعیں اس کے معصوم چہرے کی زردی پر سرخی و سفیدی کا پردہ ڈال رہی تھیں۔ زرین ساڑی کا بیش قیمت سنہری بارڈر سر سے کھسک کر شانوں پر آ رہا تھا اور مانگ بھرا ہوا سہاگ کا سیندور جیسے خون تمنا بن کر آنکھوں سے نہ جانے کب ٹپکنے لگے گا! شہر کے سب سے بڑے اور مشہور مصور نے اس تصویر میں رنگ بھرے تھے سرخ، سبز، زرد، اور سفید! سیٹھ نرنجن داس کو یہ تصویر بہت پسند آئی تھی اور انہوں نے مصور کو بہت کچھ انعام بھی دیا تھا مگر نقش فطرت کے مصور کو کسی نے داد نہ دی جس نے ایک ہی رنگ سے ریکھا کو زندگی بھر کے لئے بدل ڈالا تھا.. محض ایک رنگ... یاس کا... دو سال میں یہ رنگ بڑھتا اور چڑھتا ہی رہا... یہاں تک کہ آج بھی تو اتنا ہی گہرا تھا جبکہ رات کی تاریکی کو چیرتا ہوا سماج بندھن اور قانون کی آہنی زنجیروں کو توڑتا ہوا رندھیر اس سے کچھ کہنے اور کچھ سننے کو آنے والا تھا!

ریکھا کو آج اس تصویر میں بہت اجنبیت نظر آئی۔ جیسے وہ جانتی ہی نہیں کہ یہ کون ہے... گردن میں بڑے موتیوں کے متعدد ہار اور گلے سے لپٹا ہوا جواہر نگار گلوبند... جسے ایک ایک نگاہ نے لاکھ لاکھ مرتبہ پرکھا تھا اور ہر دفعہ پھر سے دیکھنے کی تمنا باقی رہ گئی تھی! ریکھا کے لئے پھانسی کے پھندے سے کم نہ تھا۔

اسے اب سے دو سال پہلے کی بات یاد آ گئی "بھابی جی" نے بڑے ارمان سے چڑھاوے کا سارا زیور پہنا کر جب اسے نرنجن کے سامنے بٹھایا اور نرنجن سے ہنس کر آہستہ سے کہا تھا "ریکھا آج ان زیورات کی قسمت کھلی ہے" تو اس کو محسوس ہوا تھا کہ گلوبند کی گرفت سخت ہو رہی ہے اور ہاتھوں میں یہ کنگن ہتھکڑی کی طرح ہو گئے ہیں۔ کانوں میں بڑے بڑے کرن پھول پہنا کر اسے حلقہ بگوش کیا گیا تھا اور ناک کی طلائی تھ صحیح معنوں میں وہ نکیل تھی جس کو ڈال کر ایک آزاد ہرن کو قیدی بنا دیا جائے!

ریکھا نے تصویر کو حقارت سے دیکھا۔

"بھابی جی" کہتی ہیں کہ ریکھا ان گہنوں سے تمہارے حسن میں چار چاند لگ گئے ہیں اور اندر ہی اندر جو گہن لگ گیا تھا اس کو کسی نے نہ دیکھا۔

ریکھا کو جو بھی اس کی شادی کے بعد دیکھتا وہ ہی انگشت بدنداں رہ جاتا۔ اس کے اپنے گھر والے اس کی سہیلیاں سب کا کہنا تھا کہ ریکھا تم اجاڑ جنگل کی کلی تھیں، باغیچہ کا پھول اب بنی ہو۔ سیٹھ نرنجن داس کا سب سے بڑا ارمان یہی تھا کہ ان کی خوبصورت بیوی ہر دم دیوالی کی گڑیا بنی رہے کہیں جاتے اور نئے سے نئی طرح ساڑیاں خرید لاتے کہیں دیکھتے اور عمدہ سے عمدہ زیور بنوا منگاتے اگر کہیں باہر جاتے وقت ریکھا کوئی معمولی سی سادہ یا ہلکا سا زیور پہن لیتی تو سیٹھ نرنجن داس کو سخت ناگوار ہوتا۔ دراصل ان کو دکھنے سے زیادہ دکھانے کا چاؤ تھا۔ وہ لوگوں کو بتانا چاہتے تھے کہ سیٹھ نرنجن داس کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ ریکھا کو ان کے اس شوق سے نفرت تھی! دن بھر سیٹھ صاحب کاروبار میں الجھے رہتے ہیں اور رات بھر تھک کر خراٹے لیتے ہیں پھر یہ کیا ظلم ہے کہ شام کو جب گھومنے نکلیں گے تو ریکھا نمائش بنی ہوئی زینت پہلو ہوگی۔ سیٹھ صاحب کسی سے باتیں کرنے میں لگ جائیں گے اور وہ راستہ چلتوں کا مرکز نگاہ بنی رہے گی۔ ان امرا کی یہی تو ذہنیت ہے رشک اور حسد کی نگاہوں سے اپنے مال کی قیمت وصول لیتے ہیں۔

پھر اسے رندھیر کا خیال آتا۔ وہ سیٹھ صاحب سے کتنا مختلف تھا تین سال پہلے کی بات ہے ریکھا اپنے بھائی اور بھاوج کے ساتھ سنیما جا رہی تھی۔ رندھیر بھی ساتھ تھا

...اتفاق سے ریکھا نے اس دن کوئی بہت ہی خوش رنگ ساڑی پہن رکھی تھی رندھیر نے چپ چاپ اس کے کان میں کہا: "دیکھا ایسے شوخ رنگ کے کپڑے پہن کر باہر نکلا کرو دیکھو سب لوگ تمہیں کس طرح گھور رہے ہیں... بھئی ہم کو تو اچھا نہیں لگتا"۔ رندھیر کی اس بات سے ریکھا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ آئندہ کیسا ہی موقعہ کیوں نہ ہو وہ اس طرح کا لباس نہ پہنے گی جس سے دکھاوے کا پہلو نکلتا ہو۔

وہ اپنا ارادہ کہاں اور کیسے نباہتی متوسط گھرانے کی لڑکی ایک کروڑپتی سے بیاہ کر گئی تھی اور سیٹھ صاحب یہ کہنے سے کبھی نہ چوکتے تھے کہ "ریکھا تم جو لاپرواہی برتتی ہو تو تم حقیقت میں ان چیزوں کی قدر و قیمت سے ناواقف ہو"۔

اس پر ریکھا کے دل کو ٹھیس لگتی اور وہ حکم کی تعمیل میں انمول پتھروں کا ڈھیر لا دیتی تھی... ایک ذرا ڈھارس بھی رہتی کہ اچھا ہے رندھیر یہاں موجود نہیں ہے۔ اس نے کبھی مجھ کو اس حالت میں نہیں دیکھا ورنہ بھگوان جانے اس کو کتنا دکھ ہوتا... اور پھر اتفاقاً ایک دن!

گذشتہ اتوار کی شام میں وہ نیلی ساڑی کا جھلملاتا ہوا آنچل جڑاؤ سیفٹی پن میں اٹکائے ہوئے بڑی محویت سے کلب میں ڈانس دیکھ رہی تھی تو اسے پشت سے ایک ایسی آواز سنائی دی جو بیک وقت دلکش بھی کہی جا سکتی تھی اور محض ایک کراہ بھی!

ریکھا نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا تو رندھیر کھڑا تھا...

اچھی طرح سے پہچان لینے کے باوجود بھی ریکھا دیر تک انجانوں کی طرح کھڑی گھورتی رہی۔ اس کو معلوم تھا کہ جس دن اس کی شادی ہوئی اس کے دو چار دن بعد ہی رندھیر فوج میں بھرتی ہو کر دلی سے باہر چلا گیا تھا۔ آج دو سال بعد وہ دفعتاً کیپٹن کی وردی پہنے ہوئے اور ہاتھ میں خالی گلاس لئے شراب کی بوتل پر جھکا ہوا نظر آیا تو ریکھا کے جسم میں سے کسی نے روح کھینچ لی۔ وہ ہکا بکا ہو کر تکنے لگی۔

رندھیر اسے اپنی طرف مخاطب پا کر سنبھلا اور گلاس کو میز پر رکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھ آیا۔ سیٹھ نرنجن داس ذرا فاصلے پر کسی سے کاروباری مشورہ کر رہے تھے۔ رندھیر نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا: "ریکھا یہ تم ہو؟"

ریکھا چپ چاپ کھڑی رہی۔

"تم کس لئے حیران ہو؟... مجھے زندہ دیکھ رہی ہو اس لئے؟ یا پھر اس لئے کہ تم نے میرے ہاتھ میں "وسکی" کی بوتل بھی دیکھ لی ہے؟" رندھیر نے ریکھا کو اب بھی خاموش پا کر طنزیہ طور پر کہا: "تم اس لئے بات کرنے سے گھبراتی ہو کہ اب تم کوئی معمولی عورت نہیں بلکہ دلی کے بہت بڑے سیٹھ کی چہیتی بیوی ہو!... کیوں یہی بات ہے نا؟" رندھیر کے لہجے میں جو طنز تھا ریکھا اس کی تاب نہ لا سکی اور اس نے کانپ کر کہا "ذرا ٹھہرو... رندھیر تم بلا سوچے سمجھے کہے جا رہے ہو"

"دو سال کے طویل عرصے کے اندر مجھ میں تم میں اور اس دنیا میں کتنے انقلابات آئے ہیں کہ میں سوچ سمجھ کر بھی ڈھنگ کی بات نہیں کہہ سکتا... میں نہیں جانتا کہ جب ایک لڑکی عورت بن جائے تو اس سے کس طرح گفتگو کرنی چاہئے!... بلکہ مجھے کہنا چاہئے کہ میں نہیں جانتا جب ایک عورت طلائی اور نقرئی اینٹوں میں زندہ دفن کر دی گئی ہو اور اپنے حال پر بہت خوش بھی ہو تو اسے کس طرح کی باتیں بھلی لگتی ہیں اور وہ کس کس انسان سے بات کرنا پسند کرتی ہے"۔ رندھیر نے حقارت کے ساتھ ریکھا کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

ریکھا کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اس نے رک رک کر کانپتی آواز میں کہا:

"رندھیر جب میں خوش تھی تب تم میرے ساتھ ہنسا کرتے تھے۔ اب میرے دکھ پر اگر تم آنسو نہیں بہا سکتے تو بھگوان کے لئے چرکے بھی نہ لگاؤ..."

"دکھ؟! تمہارا دکھ؟"

"ہاں میرا دکھ... تم نے بھی دنیا والوں کی طرح محض میرے کپڑوں اور زیور پر نگاہ ڈالی۔ میرے دل کا رستا ہوا گھاؤ نہ دیکھا"۔

رندھیر نے متعجب ہو کر کہا: "ریکھا مجھے کیا معلوم تھا کہ تم کو بھی کوئی غم ہے... میں تو یہی سمجھتا تھا کہ تم بہت خوشی کی زندگی گزار رہی ہو... موہن نے بھی ہمیشہ یہی لکھا"۔

"بھیا کو کیا خبر..." ریکھا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "تم مجھ سے پوچھتے"۔

"اچھا یہ بتاؤ کیا تم مجھ سے علیحدہ میں کچھ باتیں کر سکتی ہو...؟ ہمارا اس طرح کھڑے ہو کر باتیں کرنا ٹھیک نہیں"۔

"تو پھر؟"

"آؤ باہر چل کر ذرا دیر بیٹھتے ہیں"۔

ریکھا رندھیر کے ساتھ چمن میں نکل آئی سیٹھ صاحب ہنوز سرگرم گفتگو تھے۔ اور ریکھا کو اطمینان تھا کہ کم از کم ان کو گھنٹہ بھر تو کسی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ہوگی۔

بہت دیر تک باتیں کرنے کے بعد جب وہ دونوں وہاں سے واپس لوٹے تو رندھیر نے کہا: "اور دیکھو، ریکھا، میں تمہیں اس شان میں نہیں دیکھنا چاہتا کہ مارے رعب کے میرے منہ سے بات نہ نکلے... سنا تم نے... مجھ سے اسی شکل و صورت میں ملنا جیسا کہ تم ہوا کرتی تھیں... سمجھ گئیں نا... سیٹھ نرنجن داس کی امیر بیوی بن کر نہیں محض ریکھا بن کر... بے گائے ہوئے گیت کی مانند"۔ ریکھا نے ہولے سے "اچھا" کہا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے سنا کہ سیٹھ نرنجن داس اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے: "بھئی یہ معاملہ تو خود ہی بات چیت کے بعد طے ہوگا اب میں تین دن کے بعد بمبئی جا رہا ہوں"۔

ریکھا کو یقین ہو گیا کہ سیٹھ صاحب نے اس کی عدم موجودگی کو محسوس نہیں کیا اور وہ مطمئن ہو کر بیرے کو لائم جوس لانے کا حکم دیتے ہوئے بیٹھ گئی۔

سیٹھ صاحب مال کی خرید و فروخت کے سلسلے میں بمبئی چلے گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ریکھا بھی ساتھ چلے۔ مگر ریکھا لاکھ بہانے کر کے ٹال گئی کبھی طبیعت کی سستی کا بہانہ اور کبھی یہ کہ نوزائیدہ بچے پر سفر کا برا اثر پڑے گا۔ وہ جاتی بھی کیسے! اس کو آخری مرتبہ رندھیر سے ملنا تھا... رندھیر کو کل صبح پانچ بجے کی گاڑی سے لڑائی پر چلا جانا تھا... شاید ہمیشہ کیلئے۔

ریکھا نے آج رندھیر کی بات کا پورا خیال رکھا تھا۔ ململ کی سفید ساڑی میں آج وہ اسی قدر معصوم نظر آ رہی تھی جیسے کہ اب سے دو سال قبل تھی!

اس نے تصویر کی طرف حقارت سے دیکھا اور پھر گھڑی کی طرف جس میں ایک بجے بہت دیر ہو چکی تھی۔
"زندھیر آ گیا ہوگا... اب مجھے جانا چاہیئے"

اس فوری خیال کے تحت وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور متجسس نگاہوں سے چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے پھر اس کی نگاہیں اپنی تصویر سے ٹکرائیں۔ اس نے محسوس کیا کہ تصویر کی نگاہوں کا غم گہرا ہوتا جا رہا ہے اور غیر محسوس سی آواز اس کے ہونٹوں سے نکل رہی ہے۔ "سیٹھ نرنجن داس کی پتی ودتا استری کو رات اندھیرے میں چھپ کر ایک غیر مرد سے ضرور نہ ملنا چاہیئے۔"

یہ اپنا داخلی خیال تھا اور اپنے ہی ضمیر کی آواز... سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ لرزہ براندام ہو گئی اور دوبارہ صوفے پر بیٹھ کر اس نے اپنے دل کو سنبھالا "میں صرف اس سے ملنا اور اس سے باتیں کرنا ہی تو چاہتی ہوں۔ اس میں پاپ اور پن کا سوال کہاں پیدا ہو سکتا ہے...... اگر عیب نہیں گناہ نہیں تو رات کی تاریکی کیوں مدنظر رکھی گئی۔ سیٹھ صاحب کی عدم موجودگی کو کیوں ملحوظ رکھا گیا... ڈر کیوں لگتا ہے... دل کیوں دھڑکتا ہے... اگر یہ برا نہیں تو کیا دنیا اسے اچھی نگاہ سے دیکھے گی... ؟

اسے اپنی حماقت پر غصہ آنا شروع ہوا! "میں ایک فیصلہ نہیں کر سکتی اور وہ غریب اس شدت کی سردی میں میری خاطر سے باہر کھڑا کانپ رہا ہوگا" یہی سب خیال آنے تھے تو اس وقت کیوں نہ آئے جب میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں تم سے ضرور ملوں گی ... پھر اس کو جانا ہے لڑائی پر..." ریکھا نے صوفے پر سے گرم کوٹ اٹھا کر شانوں پر ڈالا اور میز پر سے ٹورچ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی "توبہ اس وقت دو بج چکے ہیں اور اس نے کہا تھا کہ جیسے ہی ایک بجے گا میں حاضری دے کر آ جاؤں گا"

بغیر کچھ اور سوچے ہوئے اس نے دروازے کی چٹخنی کھولی اور دبے قدموں گیلری کی طرف نکل آئی... گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اس کو دیوار سے ٹکر لگی اور گھبرا کر ٹورچ جلائی... روشنی کی تیز شعاعیں سب سے قبل جس چیز سے ٹکرائیں وہ نرنجن داس کی قد آدم تصویر تھی... ریکھا کے تمام جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ کاغذی پیکر نہیں بلکہ خود نرنجن داس کھڑے ہوئے اسے ملعون نگاہوں سے گھور رہے ہیں وہ چند لمحوں کے لئے بے حس و حرکت ہو گئی تاریکی کا گہرا پردہ ہٹا کر روشنی میں صرف نرنجن داس کا چہرہ نظر آ رہا تھا "کہاں جا رہی ہیں دیوی جی؟" جیسے یہ بھی کسی نے اس سے سوال کر لیا اور وہ گھبرا کر پیچھے کی طرف پلٹی لرزتے ہاتھوں سے چٹخنی لگا کر کرسی پر گر پڑی اور اس نے اپنے آپ کو گالیاں دینی شروع کیں۔ میں نے کیوں نہ کہہ دیا کہ میں تم سے اس طرح ہرگز نہ مل سکوں گی۔ میں پابند ہوں اور بالکل مجبور!"

پھر اس کو خیال آیا کہ اس نے یہ سب کچھ کہا تو تھا۔ پر زندھیر نے ایک بھی چلنے دی تو... کس کس طرح سے خوشامدیں کیں۔ ہاتھ جوڑے یہاں تک اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا... آخر ریکھا ایک عورت تھی۔ اس مرد کے آنسو کس طرح دیکھتی... جس کی مورتی ہمیشہ سے پوجتی چلی آئی تھی... جس کی وجہ سے اس کی زندگی جیتے جی جہنم میں گزر رہی تھی، جس کی وجہ سے وہ بیوی بن کر بھی نرنجن داس کے نزدیک نہ پہنچ سکی تھی...

زندھیر چاہتا کیا تھا محض یہ کہ ایک دفعہ آخری دفعہ کہوں سے بیٹھ کر تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں"۔

ریکھا نے کہا تھا: "زندھیر سکون تو اب میرے اور تمہارے دونوں کے لئے ناممکن ہے۔ رہا ملنے کا سوال تو اب اس سے فائدہ کیا۔ ہم تم لاکھ مرتبہ ایک دوسرے سے ملیں۔ درمیان میں جو سنگین دیوار ہے وہ ہم کو کبھی ایک دوسرے سے نزدیک نہ ہونے دے گی"۔

زندھیر نے کہا: "ریکھا یہ سب باتیں میں بھی جانتا ہوں لیکن تم اس کا بھی تو احساس کرو کہ تم انجان بن کر مجھے اور بھی تکلیف پہنچا رہی ہو قدرت نے جو دیوار حائل کر دی ہے اس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے نزدیک نہیں آ سکتے مگر ایک دوسرے کی آواز تو سن سکتے ہیں تم چاہتی ہو کہ مجھے یہ بھی حاصل نہ ہو سکے یہ قدرت کا ظلم نہیں بلکہ تمہارا ظلم ہے"۔

ریکھا نے کہا: "تم کو میری مجبوریوں کی خبر نہیں تم سوچو تو میں آخر یہ کیسے کر سکتی ہوں"

زندھیر نے کہا: ہاں تم میرے لئے کچھ نہیں کر سکتیں... میں نے بھی تو تمہارے لئے کچھ نہیں کیا... بس یہی کہ زندگی کو موت کے ہاتھوں فروخت کر دیا... دنیا اور دنیا والوں سے نفرت کی... گھر اور گھر والوں کو چھوڑ دیا... سارے ارمان مٹی میں مل گئے اور میں نے اُف نہ کی میرا دل اور میرے دل کی ساری امنگیں خاک ہو گئیں پھر میں نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی... جن محفلوں میں میرے دم سے جان پڑ جاتی تھی وہاں اب میں صرف ماضی کا افسانہ ہو کر رہ گیا ہوں۔ جو لوگ میری ہنسی پر تعجب کرتے تھے وہ اب میرے آنسوؤں سے اکتا گئے ہیں... یہ سب کس کے لئے... کہہ دو کہ تم نہیں جانتیں... کہہ دو کہ تمہیں کچھ خبر نہیں..." ریکھا چپ چاپ بیٹھی رہی اور زندھیر کہتا چلا گیا۔

"میں شراب پیتا ہوں... کیا عیش کرنے کو... یا مجھے بیہوش کرنے کا شوق ہے... بھگوان جانتا ہے کہ شراب میرے لئے اب بھی زہر سے بدتر ہے۔ مجھے نہ اس سے سکون ملتا ہے اور نہ میرا دکھ مٹتا ہے پھر بھی میں اس کو پیتا ہوں اس لئے نہیں کہ تمہیں بھول جاؤں بلکہ اس لئے کہ میری زندگی جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ مجھ میں جو خامیاں رہ گئی ہیں وہ سب پیدا ہو جائیں اور میں بالکل پاگل ہو جاؤں... یہ سب کیوں... کس لئے..."

ریکھا نے کہا "بس کرو زندھیر میرے لئے جینا اب بھی آسان نہیں ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں دیواروں سے سر پھوڑ لوں خودکشی کر لوں؟..."

نہیں میں یہ نہیں چاہتا... میری بس اتنی خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے ایک دفعہ اپنی زندگی کا ماحصل پا لوں... تمہیں سامنے بٹھا کر جو کچھ مجھ پر بیتی ہے وہ سنا دوں ... میرا درد بھرا ایک دفعہ تم کو رولا دے میری باتیں پھر ایک مرتبہ تم کو ہنسا دیں... پھر میں خوشی سے چلا جاؤں گا... اور ہنستے ہنستے گولیوں کی زد میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ مجھے بھی غم نہ رہے گا کہ قدرت نے مجھ پر ظلم کیا..."

ریکھا نے کہا "زندھیر تم کو معلوم ہے کہ میں ایک بچے کی ماں بن چکی ہوں"۔

زندھیر نے جواب دیا: "کیا مجھے یہ معلوم ہونا ہی کافی نہیں کہ تم سیٹھ نرنجن داس کی بیوی بن چکی ہو؟... اور تمہارا یہ کہنے سے مطلب کیا ہے؟ کیا تم مجھ سے یہ کہنا چاہتی ہو

کہ میں ذلیل ہوں؟ یا کیا تم مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرتیں؟ ... اور ریکھا تمہیں آج اس کا تو خیال ہوا۔ وہ دن بھول گئیں جب میں نے اور تم نے گھنٹوں ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کی ہیں مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ تمہارا ہاتھ بھی چھو سکوں ... اور جب تمہاری شادی ہونے لگی تو تم کتنا دکھی تھیں ... اس وقت تم میری محبت کے دھارے میں آنکھیں بند کرکے بہہ رہی تھیں اگر میں چاہتا تو تم لمحوں میں راستے سے بھٹک سکتی تھیں ... تم نے مجھ سے میرا رہا سہا دھن بھی چھین لیا ... اچھا ہے اگر تم مجھ سے یہ کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے..."

ریکھا کے سارے وار خالی گئے اور آخرکار وہ نہتی ہو کر رہ گئی۔

"تم میری بات نہیں سمجھے! اچھا میں بتاتی ہوں ... بولو کب؟"

"اس ایک رات کو جب سیٹھ صاحب بمبئی جا چکے ہونگے اور صبح کو مجھے فوج کے ساتھ لڑائی پر جانا ہوگا۔"

اور وہ ایک رات آگئی جب سیٹھ صاحب بمبئی جا چکے تھے اور صبح پانچ بجے کی گاڑی سے رندھیر کو لڑائی پر جانا تھا ... ریکھا کے دماغ میں ایک ایک بات آئی۔ ایک ایک لفظ گونجا پھر ایک بار اس نے ہمت کر لی کہ جاکر رندھیر سے ملوں گی اور ضرور ملوں گی ... اب جب کہ اس کے جانے میں بہت تھوڑا عرصہ رہ گیا ہے۔

اس کو جاکر باغ کا پھاٹک کھولنا تھا جہاں اس خون منجمد کرنے والی سردی میں رندھیر اس کا منتظر ہوگا ... پھر اس کے ساتھ "شیلٹر" میں بیٹھ کر باتیں کرنی ہیں ... ہاں "شیلٹر" میں! اس نے سوچا تھا کہ ایک کپتان سے ملنے کے لئے اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی ہے ... بم سے نہ سہی سرد ہوا اور دنیا کی نگاہ سے بچنے کے لئے یہ بہت محفوظ جگہ ثابت ہوگی ... وہ رندھیر کا اتنا ہی سواگت کر سکتی تھی۔

باغ میں جانے کے لئے اور بھی تو راستہ ہے ... اس نے سوچا کیا ضرور کہ میں گیلری میں ہوکر ہی جاؤں۔

خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ریکھا نے ڈگمگاتے قدموں سے اپنی خوابگاہ کا رخ کیا۔ جہاں سے ایک راستہ باغ کی طرف جاتا تھا اور جہاں اس کا دو ماہ کا معصوم بچہ سویا ہوا تھا۔

پلنگ کے پاس پہنچ کر ریکھا کے قدم رک گئے "بہت سردی ہے! بچے کو ٹھنڈ تو نہ لگ رہی ہوگی" ایک لمحے کے لئے ریکھا محض ماں ہو کر رہ گئی۔ سب کچھ بھول کر اس نے دوسرا کمبل بچے کو اڑھا دیا، اور جھک کر بچے کا منہ چوم لیا۔ بچہ نیند سے چونک کر ماں کی طرف دیکھنے لگا اور یونہی نیند میں دھیرے سے مسکرا دیا ... ریکھا کی آنکھوں میں آپ سے آپ آنسو بھر آئے! میں ایک عورت ہی نہیں ماں بھی تو ہوں ... میں یہ کیوں بھول گئی کہ میں نرنجن داس کے بیٹے کو جنم دے چکی ہوں ... وہ یہاں موجود نہیں پر کیا اپنے ساتھ مضبوط زنجیر بھی لے گیا جس سے مجھے شادی کے دن باندھا گیا تھا ... رندھیر کو مجھ سے ملنا تھا تو وہ دن میں کیوں نہیں آیا ... نرنجن داس کی موجودگی میں کیوں نہیں آیا ... اور مجھ سے ذرا سی بھی لغزش ہوگئی تو کیا اس کے نتائج بچے کو بھی بھگتنے پڑیں گے! لغزش جس کا کوئی امکان نہیں مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ رندھیر مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہو ... اس نے مجھ سے مایوس ہو کر یہ راستہ اختیار کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ موت کے منہ میں جاتے وقت مجھے بھی زندگی سے بیزار بنا دینا چاہتا ہو پھر اب وہ شراب بھی تو پینے لگا ہے اگر نشے میں بہک گیا تو اس کا کیا بگڑے گا مگر میں ... جو ایک شادی شدہ عورت ہی نہیں ماں بھی ہوں ...

ریکھا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ... اس نے سوچا کہ میں ایک غلطی کو دوسری غلطی سے مٹا رہی ہوں اور جو کہیں اس بھول نے بھی کسی گناہ کا بلیدان مانگا .. نہیں نہیں میں رندھیر سے ملنے نہیں جاؤں گی میں اس کو خوش کرنے کے لئے اپنے خاوند سے بغاوت نہیں کر سکتی ... اس کے حکم کی تعمیل میں بھگوان کی لگائی ہوئی پابندیاں نہیں توڑ سکتی .. میں نے شادی کے وقت پنڈت کو نہیں بھگوان کو وچن دیا تھا کہ میں نرنجن داس کو اپنا دیوتا مانتی ہوں ... آج اس دیوتا سے بچ کر میں ایک انسان کی پناہ لینا چاہتی ہوں اور جو کہیں اس نے میرے منہ پر کالونچ کا ٹیکہ لگا دیا تو ... میں ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ میں اپنا زیور اپنا روپیہ اور اپنا ہر ایک سرمایہ تج سکتی ہوں مگر یہ بچہ! کہیں نرنجن داس کو پتہ چل جائے اور وہ مجھ سے میرا بچہ چھین لیں"

عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے تو اس کی ساری نسائیت بروئے کار آجاتی ہے .. عورت صرف چند جذبات کا مجموعہ ہے اور دل کی سلگتی ہوئی آگ سے مجبور ہو کر اپنی ہٹ کو پورا کرنے کے لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی ہے ... پھر یہ سب کچھ اس وقت تک ہے جب وہ محض ایک عورت رہتی ہے ... ماں کا درجہ عورت سے بہت بلند ہے ... ماں بن کر اس کی نظر میں دنیا کا سارا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصور کو اپنی تصاویر پر، ایک بت تراش کو اپنے شاہکار پر، ایک شاعر کو اپنے اشعار پر اتنا ناز نہیں ہو سکتا جتنا کہ اس عورت کو جو ایک انسان کی تخلیق کا باعث ہوتی ہے ...

بچہ کے خیال نے ریکھا کو اور بھی لاچار کر دیا اور مضمحل ہو کر اپنے بستر پر گر پڑی۔

"رندھیر کچھ بھی سوچا کرے میرا دل تو مجھے شرمندہ نہ کرے گا ..." ململ کی باریک ساڑی میں ٹھٹھرتے ہوئے اس نے چند لمحوں کے لئے طمانیت قلب کو محسوس کیا .. چند لمبے لمبے سانسوں نے جب راکھ کی پتلی سی تہہ کو منتشر کر دیا تو پھر اس چنگاری نے سر نکالا جو برسوں سے دل کی گہرائی میں سلگتی رہی تھی۔ ریکھا کی بند آنکھوں میں چپ چاپ کسی کا مغموم چہرہ آگیا بھیگی ہوئی پلکیں، کانپتے ہوئے ہونٹ اور لرزتی ہوئی آواز ..."

"ریکھا میں پیاسا مر رہا ہوں اور تم مجھے پانی کے چند قطرے بھی نہیں دے سکتیں ... کسی دم توڑتے ہوئے انسان کے منہ میں پانی ٹپکانا تو گناہ نہیں ہے .. تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تم سے کسی چیز کا طالب نہیں ہوں ... حالات میرے سامنے ہیں اور میں ان سب کو اچھی طرح سمجھتا ہوں ... انسان سے بھول ضرور ہو جاتی ہے مگر تمہارے معاملے میں! ... تمہارے سامنے بیٹھ کر .. شراب کی زہریلی بوتلیں جس خیال کو ایک لمحے کے لئے بھی ذہن سے محو کر سکیں چند گھنٹوں کی آخری ملاقات میں کس طرح میرے دل سے نکل جائے گا! ... ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے اور میری بھی خواہش ہے کہ مجھے سکون کی موت نصیب ہو جائے جب سنسناتی ہوئی گولیاں میرے سر پر سے گزریں اور خوفناک بم میرے برابر آ کر پھٹیں تو دم توڑتے وقت مجھے یہ خلش باقی نہ ہو کہ میں تمہیں اپنی بپتا نہ سنا سکا"

ریکھا نے آنکھیں میچ لیں۔ کان بند کر لئے۔ مگر دل پر کوئی رہ رہ کر ڈنک لگاتا رہا۔

میری کہانی ادھوری رہ گئی میں نے تمہیں دیکھ لیا مگر تم سے کچھ نہ کہہ سکا کاش میں سانسوں کی قیمت دے کر بھی کوئی ایسا لمحہ خرید سکتا جب بیتے ہوئے دنوں کی یادگار منا سکوں... موت سے پہلے ایک دفعہ! آخری دفعہ!"

ریکھا کی آنکھوں کے سامنے جنگ کا ہولناک میدان آگیا رندھیر دم توڑ رہا ہے اور نزع کے جھٹکوں میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں:

"آہ تم نے میری بات تو سن لی ہوتی"

کسی نے کھینچ کر اس کو پلنگ سے کھڑا کر دیا۔ مٹھ کر باتیں کرنے کا وقت تو گزر گیا تو اس سے کھڑے کھڑے ہی جا کر کہہ دے کہ رندھیر میں تمہاری بات سننے آگئی ہوں... آخری بات!...

ریکھا نے مضطرب ہو کر پلنگ پر سے ٹورچ اٹھائی اور دروازہ کھولنے سے قبل ایک دفعہ سنگ مرمر کی بنی ہوئی "سیتا جی" کی مورتی کے قدموں میں دوزانو ہو گئی... سیٹھ نرنجن داس نے کئی ہزار میں یہ مجسمہ بمبئی سے خریدا تھا اور ریکھا روز صبح کو اپنا عقیدت سے بوجھل سر پرنام کے لئے اس کے چرنوں میں جھکاتی تھی۔

ریکھا نے "سیتا" کے سرد اور مرمریں پاؤں پر اپنا سر رکھ کر کہا "دیوی جی مجھے شکتی دیجئے!"

ریکھا نے ہزار مرتبہ دل کی بے چینی سے لپسپا ہو کر اسی طرح اپنا سر جھکا یا تھا اور ہر مرتبہ اس کے دل کو ڈھارس ہو گئی تھی... آج اس نے محسوس کیا کہ اس کا سر محض ایک بے جان پتھر سے ٹکرایا ہے اس میں دیوی جی کا تقدس وجود نہیں ہے... اس کو مغلوب ہوتے دیکھ کر ضمیر نے پھر سے اپنی آواز بلند کی بدنصیب عورت تو اس ہستی سے شکتی کی طالب ہے جس کی پاکدامنی ہمیشہ دنیا میں ایک مثال ہو کر رہی ہے جس نے راون کے خونناک پنجوں سے بھی اپنی عصمت کو بچائے رکھا جس کی عزت کے لئے آگ کی لپٹوں نے بھی گواہی دی... جس نے بن باس کے بارہ سال رام نام رٹ کر گزار دیئے اور آخرکار اپنے پتی کے چرن چھو کر زمین میں سما گئی... تجھ کو شرم نہیں آتی کہ وہ ایک رات جو تجھ کو من مانی کرنے کے لئے مل گئی تو اس میں لپنے مذہب سے، اپنے پتی سے اپنے بچے سے دنیا کی ہر چیز سے باغی ہو گئی ہے... کیا تو وہی ریکھا ہے جو "سیتا جی" کی پجارن بنتی تھی، جو "ہندو یدی" کے گن گاتی تھی اور جس کی آنکھوں میں "ساوتری" کا تصور رہتا تھا... تجھے ان کا نام تو یاد ہے مگر گن بھول گئی!

آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور لاوا ابلنے لگا... ریکھا نے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کیا... یہ چوٹ ایسی پڑی کہ دماغ کے سارے تار جھنجھنا اٹھے...

نہ اس کو وقت کے گزرنے کا احساس ہوا اور نہ صبح کی آمد کا جو بند دریچے کے شیشوں میں سے جھانک رہی تھی... جب ایک ایک آنسو نچڑ چکا تو اس نے "سیتا جی" کے بھیگے ہوئے قدموں سے اپنا سر اٹھایا اور متورم آنکھوں سے بے بسی کے ساتھ چاروں طرف دیکھا "صبح ہو چکی ہے اور وہ آکر چلا بھی گیا ہوگا!"

مرتی ہوئی امنگ نے سانس کے جھٹکوں میں کہا "اس نے تم سے کہا تھا کہ میں اس وقت تک تمہارا انتظار کروں گا جب تک ساری امیدیں ایک ایک کر کے نہ ختم ہو جائیں اور جانے والی گاڑی مجھے ہمیشہ کے لئے تمہاری آنکھوں سے اوجھل نہ کر دے"۔

"ہاں اس نے یہ کہا تو تھا... پھر اب تو وہ امیدیں ختم ہو چکی ہوں گی... اب تو ٹوٹ بھی گیا ہوگا... کون جانے... کون جانے..." "ہاں کون جانے" ریکھا نے دل ہی دل میں یہ الفاظ دہرائے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اب وہ کتنا سنتا نہیں صرف تمہیں دیکھنے کی خاطر سے رکا ہوا ہو... اب بھی اس کو یہ آسرا ہو کہ تم کو آخری بار دیکھے گا... وہی رندھیر جس نے تمہارے کارن اپنی جوانی کو موت کے بھینٹ چڑھا دیا"

"میرے کارن؟" ریکھا نے اپنے دل سے سرگوشی کی۔

"جیسے کہ تم نہیں جانتیں" رندھیر کا ہنستا ہوا سایہ ریکھا کی پلکوں پر تھرتھرایا۔ گناہ اور ثواب کا وقت گزر چکا ہے اب محض ایک نظر تمہیں دیکھ لینے کا ارمان باقی رہ گیا ہے... تا کہ آخری جھلک کو اپنی پلکوں میں موند لوں اور ناکام محبت کی یہ نشانی لے کر موت کے ہم آغوش ہو جاؤں"

"نشانی!؟!؟" ریکھا نے چونک کر کہا "نشانی" تو مجھے بھی چاہئے جو اس کے چلے جانے پر... اس کے مر جانے پر بھی میرے پاس رہے! جو ہمیشہ ہمیشہ میرے دل میں اس ملاقات کی یادگار بن کر کھٹکتی رہے۔ جب وہ اور میں ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی قریب رہے تھے... یہ بغاوت نہیں گناہ نہیں... میں اس سے ملنے نہیں جا رہی، میں اس کو دیکھوں گی بھی نہیں میں صرف اس کے سامنے اپنے ہاتھ پھیلا دوں گی اور کہوں گی: "رندھیر تم مجھے کچھ دے کر بھی نہیں جا رہے..." نشانی رکھنا تو عیب نہیں میری آنکھوں میں اس کی شکل ہے... میرے سینے میں اس کا درد ہے... کیا یہ بھی میری خطا ہے... پھر اگر میں اس سے کوئی نشانی لے لوں تو قانون کی کونسی کڑی ٹوٹ جائے گی... مذہب کا کونسا تار الز جائے گا ...میں اس سے کچھ کہنے اور کچھ سننے کو نہیں گئی... میں اس سے ملنے اور اسے دیکھنے کو نہیں گئی... میں صرف ایک نشانی لینے جا رہی ہوں... آخری یادگار...

ریکھا نے پاگلوں کی طرح کواڑ کھولے اور صبح کے دھندلکے میں باہر نکل گئی ...بھاگتے بھاگتے اس کا سانس پھولنے لگا... ہوا کے جھونکے سے اس کی ساری کا پلہ نیچے گر کر اوس سے بھیگی ہوئی زمین پر گھسٹ رہا تھا... ایک ہی جھٹکے سے اس نے باغ کا آہنی پھاٹک کھول دیا... مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا...

"وہ آکر چلا بھی گیا... اور میں اس کی بات نہ سن سکی... میں اس کی شکل نہ دیکھ سکی... میں اس سے کوئی نشانی بھی تو نہ مانگ سکی... آہ اس کی آخری یادگار...!"

ریکھا کا خیال غلط تھا... جانے والے کی آخری یادگار اب بھی موجود تھی۔ جب ریکھا کی مایوس نگاہیں زمین کی طرف جھکیں تو اس نے دیکھا:

"گیلی مٹی پر قدموں کے نشان!!..."

اٹھارویں صدی میں رؤسائے ہنود کا حصہ اردو شاعری میں

اردو شاعری کو جہاں عام ہندو ادبا نے فروغ دیا رؤسائے ہنود بھی ان کے قدم بہ قدم چلتے رہے اٹھارہویں صدی میں ہندو شاہی خاندانوں کے کئی افراد نے اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ آج ہم سب سے پہلے مہاراجہ بینی بہادر بہادر کا ذکر کریں گے۔

مہاراجہ بینی بہادر بہادر

مہاراجہ بینی بہادر بہادر قوم کے کائستھ تھے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر والیٔ اودھ کے خاص مصاحبوں میں سے تھے۔ سیر المتاخرین میں آپ کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے۔

"راجہ بینی بہادر مرجع جمیع ملازماں وزیر و مختار حل و عقد معاملات اوبود۔ وجرأتے داشت کہ شل او درآں وقت در رفیق برنیا وشرفا نوازی کسے نبود و در معاملہ رسی و سیاق فہمی و سرانجام امور دشوار و مقدمات مالی و ملکی ید طولیٰ داشت"

جب شجاع الدولہ اور انگریزوں میں جنگ چھڑی۔ تو مہاراجہ بینی بہادر شجاع الدولہ کے ساتھ تھے۔ جنگ میں شجاع الدولہ کو شکست ہوئی۔ لیکن انگریزوں کے منظور نظر راجہ شتاب رائے کی سفارش پر شجاع الدولہ کو پھر اودھ کا حاکم بنا دیا گیا۔ راجہ شتاب رائے نے سفارش اس لئے کی تھی کہ وہ مہاراجہ بینی بہادر سے بہت گہرے تعلقات رکھتے تھے۔ بہادر کو شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ ان کے کلام میں سے صرف ایک ہی شعر ملتا ہے لیکن اسی سے انکی خوش فکری ظاہر ہوتی ہے

سیاہی تو کی گئی دل کی آرزو نہ گئی — ہمارے جامۂ کہنہ سے مے کی بو نہ گئی

راجہ جسونت پروانہ

مہاراجہ بینی بہادر کے صاحبزادے راجہ جسونت سنگھ پروانہ المعروف کاکاجی ایک حسین اور خوبصورت نوجوان تھے۔ نہایت خوش و خرم رہا کرتے تھے۔ اور بہت شگفتہ باتیں کیا کرتے تھے شعر و شاعری کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ آپ مصحفی اور میر حسن کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ لیکن وہ اس کے جواز میں کوئی دلیل پیش نہیں کر سکے۔ علاوہ اردو کے فارسی میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ ان کی فارسی شاعری سے ایک لطیفہ وابستہ ہے جو غالباً آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ایک دفعہ شیخ علی حزیں نے آپ کو بلوا بھیجا اور ساتھ یہ مصرعہ لکھ بھیجا ؎

دریں بزم راہ نیست بیگانہ را

پروانہ نے فی الفور یہ مصرعہ جواب میں لکھ بھیجا ؎

کہ پروانگی داد پروانہ را

شیخ علی حزیں اس برجستہ جواب پر بہت خوش ہوئے۔

راجہ جسونت سنگھ پروانہ نے ایک دیوان بھی شائع کیا تھا۔ تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

نسیم آہ نے شاید کسی کے کی تاثیر — شگفتگی سی ترے غنچۂ دہاں پہ ہے
بحر ہستی میں ترا جسم ہے مانند حباب — تیسہ اک دم کی ہوا کھانے پہ مغرور ہے تو
آئینہ ساں ہے صاحب جوہر کو زنگ غم — اس دور میں کہ عیب و ہنر دونوں ایک ہیں

راجہ بہادر راجہ

مہاراجہ بینی بہادر بہادر کے دوست مہاراجہ شتاب رائے ناظم صوبہ بنگال کے دو لڑکے تھے۔ ایک کا نام راجہ بہادر راجہ اور دوسرے کا راجہ کلیان سنگھ عاشق تھا۔ راجہ بہادر راجہ عظیم آبادی اس دور کے مشہور شاعر اشرف علی فغاں کے ہم عصر تھے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے — ہم ان تلک نہ پہنچے وہ ہم تلک نہ پہنچے

راجہ کلیان سنگھ عاشق

راجہ بہادر راجہ کے بھائی راجہ کلیان سنگھ عاشق کو بھی شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنا مجموعۂ کلام بھی شائع کیا تھا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

مچایا ہے جگر نے حشر کا سا شور پہلو میں — مگر دیکھا ہے یہ حال دل رنجور پہلو میں

راجہ رام نرائن موزوں

موجودہ تذکروں میں اگرچہ موزوں کا نام شاعر کی حیثیت سے آیا ہے لیکن انھوں نے شعر و ادب سے کہیں بڑھ کر وقت کی سیاسی کشمکشوں میں حصہ لیا جنہیں عام تذکرہ نگاروں نے بیان نہیں کیا۔

علی وردی خاں کو جب بنگال، بہار اور اڑیسہ کی عملداری پر تمکن حاصل ہوا تو اس کی پہلی کوشش طبعاً یہی ہونی چاہئے تھی کہ اس تمکن کو ہر امکانی خطرے سے محفوظ کرے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ایران و توران سے آنے والے قسمت آزماؤں نے ہندوستان میں جہاں جہاں اقتدار کی بنیادیں استوار کیں ان پر سب سے پہلا حملہ ان کے ہم وطن رفیقوں ہی نے کیا جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے بعد موقع پاتے ہی خود سر ہو کر حکمراں سے ٹکرا گئے یا باہم لڑنے لگے۔ لہٰذا اس نے اپنے ساتھیوں کو بڑھانے کی بجائے زیادہ تر قابل ہندوؤں کو ذمہ داری کے عہدے

پر مامور کیا۔ جن سے شور اور خودسری کا چنداں خطرہ نہ تھا نیز وہ جب چاہتا انہیں برطرف کرسکتا تھا۔ ان ہندوؤں میں ایک راجہ رام نرائن موزوں بھی تھا۔ جسے عظیم آباد کا نائب ناظم بنا دیا گیا۔

علی ویردی کے بعد سراج الدولہ کے عہد میں بھی رام نرائن عظیم آباد کا نائب ناظم یا گورنر بنا رہا۔ میر جعفر نے اپنے آقا سے غداری کرکے خود حکومت سنبھالی تو موزوں کے اکثر دوست اور مشیر اصرار کرتے رہے کہ میر جعفر کی مخالفت کا علم بلند کیا جائے۔ لیکن موزوں کافی خرچ اور ساز و سامان کے باوصف اس اقدام پر آمادہ نہ ہوسکا۔ میر جعفر کو اس پر اعتماد نہ تھا۔ لیکن رام نرائن نے انگریزوں کے ساتھ گہرے تعلقات پیدا کرلئے۔ اور خود کلائیو اس کا سرپرست بن گیا۔ میر جعفر اسے گورنری سے الگ کردینا چاہتا تھا۔ لیکن کلائیو نے یہ کہہ کر روک دیا کہ رام نرائن کے پاس کافی فوج موجود ہے نیز وہ شجاع الدولہ یا فرانسیسیوں یا مرہٹوں سے امداد لے سکتا ہے۔

رام نرائن کو ایک بڑی مصیبت یہ پیش آئی۔ کہ شہزادہ عالی گوہر نے جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے لقب سے ہندوستان کا بادشاہ بنا عظیم آباد پر حملہ کردیا۔ شہزادہ وزیر عماد الملک کی سختیوں سے تنگ آکر دہلی سے نکلا اور الہ آباد میں آپہنچا جہاں کے حاکم محمد قلی خاں کو ساتھ ملا کر اس نے بنگال و بہار و اڑیسہ پر قبضہ جمانا چاہا۔ اس حملے میں سب سے پہلا ہدف عظیم آباد بنا۔ رام نرائن نے مرشد آباد میں نواب ناظم کو اور کلکتے میں انگریزوں کو امداد کے لئے پے در پے لکھا۔ جب کوئی صورت نظر نہ آئی۔ تو شہزادے سے مصالحت کی طرح ڈالی۔ اسے خیال تھا کہ شہزادے کے ساتھ بہت بھاری لشکر ہوگا۔ لیکن جب اطاعت گزار کی حیثیت سے دربار میں پہنچا تو لشکر کی بے سروسامانی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور اپنی اطاعت پر بہت پشیمان ہوا۔ واپس جاتے ہی اس نے مقابلے کی ٹھان لی۔ اور قلعے میں بیٹھ کر مدافعت کے انتظام شروع کردیے۔ شہزادے اور قلی خاں نے عظیم آباد پر حملہ کردیا جس کی کامیابی کے زبردست امکانات تھے۔ لیکن اس حالت میں خبر ملی کہ شجاع الدولہ والئے اودھ نے محمد قلی خاں کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر الہ آباد پر قبضہ جما لیا ہے۔ محمد قلی خاں اپنے گھر کے بچاؤ کی غرض سے فوراً واپس آیا لیکن اسے شجاع الدولہ نے قید کرلیا اور مار ڈالا۔ شہزادہ تنہا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا رام نرائن کے لئے خود بخود مخلصی کی راہ نکل آئی۔ شہزادے نے اس سلسلے میں جو مزید اقدامات کئے ان کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

جب انگریزوں نے میر جعفر کو معزول کرکے اس کے داماد میر قاسم کو مسند نظامت پر بٹھایا۔ تو رام نرائن کے اقبال کا ستارہ گردش میں آگیا۔ میر قاسم بڑا ہوشمند اور منتظم حاکم تھا۔ اس کے ماتحت ملک کی انتظامی حالت یقیناً بہتر ہوسکتی تھی۔ اور انگریزوں کو روپیہ زیادہ مل سکتا تھا۔ لیکن اسے حسب دلخواہ کام کرنے کا موقع نہ دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں اور قاسم کے درمیان جنگ کی صورت ہوگئی۔ اور بکسر کی شکست کے بعد میر قاسم نے اپنی زندگی کے آخری سال فرید آباد میں بہ حالت گمنامی گزارے۔

میر قاسم کی اصلاحی تدبیروں میں سے ایک یہ تھی کہ اس نے تمام امراء کے پرانے حسابات کی پڑتال کرائی۔ اور ہر خرچ کی رسیدیں طلب کیں۔ اس ضمن میں رام نرائن بھی معرض احتساب میں آیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بڑی بڑی رقمیں کھا چکا تھا لیکن اس نے سارا جمع کیا ہوا روپیہ اس خیال سے ادھر ادھر چھپا دیا کہ حساب میں خیانت آشکارا نہ ہوجائے۔ غرض اسے گرفتار کرلیا گیا۔ ابتدا میں انگریز اس کی حمایت کرتے رہے۔ لیکن آخرکار میر قاسم کو محاسبے کا پورا موقع دے دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ مدت کے بعد میر قاسم کے حکم سے اسے گنگا میں ڈبو دیا گیا۔ یہ غالباً ۱۷۶۲ء اور ۱۷۶۴ء کے درمیان کا واقعہ ہے۔

رام نرائن موزوں ان پیچیدہ سیاسی کشمکشوں کے باوجود ادب سے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ نثر نہایت رنگین لکھتے تھے۔ زیادہ تر فارسی شعر کہے لیکن بعض اوقات اردو شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ شیخ علی حزیں ان کے استاد تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

مت مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے ساتھ — ابر ہوگا تو خجالت سیتی پانی پانی

دل لگا جو ہے پڑا سنگ سنگبار کے ساتھ — کچھ گرانی نہیں مجھ کو وہ ستمگار کے ساتھ

رائے سرب سنگھ دیوانہ

مہاراجہ رام نرائن موزوں کی ہمشیرہ کے صاحبزادے رائے سرب سنگھ دیوانہ اردو اور فارسی کے بڑے اچھے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اپنے وقت کے مستند شاعر تھے۔ دلی کے رہنے والے تھے۔ بنارس اور لکھنؤ میں کافی عرصہ قیام رہا۔ ان کے فارسی کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے فارسی میں دس ہزار شعر کہے۔ بعض اوقات ریختہ میں بھی فکر سخن کیا کرتے تھے۔ بلکہ اس میں استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہندوستان کے بلاد شرقیہ کے اکثر شعراء نے ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ لکھنؤ کے مرزا جعفر علی حسرت (استاد جرأت) اور میر حیدر علی حیران ان کے شاگردوں میں خاص طور پر ممتاز تھے۔ ۱۲۰۶ھ مطابق ۱۷۹۲ء میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

وے یار کہاں کہ یار باشی کیجے — وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے

اک گوشے میں بیٹھ کر دیوانہ تنہا — اب ناخن غم سے دل خراشی کیجے

دل ہے کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل نہ جائے — رستم کا کب جگر ہے جو زہرہ پگھل نہ جائے

جب نہ تب سنیئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر — گفتگو ہم سے اسے پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پرفن بیٹھے — گرمی بزم کہاں اس بت عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے یہ جلیسوں نے کہا — ہوچکی اس کو شفا شربت دیدار بغیر

جان پر آ بنی ہمدم مری خاموشی سے — بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے — کیونکہ دیوانہ بھلا جیئے اب اس یار بغیر

راجہ بہادر سنگھ بہادر

ایک کشمیری نژاد برہمن شاعر راجہ بہادر سنگھ بہادر

کا بھی ایک شعر ملاحظہ ہو۔ یہ انشا کے شاگرد تھے :-

جب جاتا ہوں آئینہ ہی دیکھے ہے دو جو دیں — اس طرف دیکھے ہے مجھے ہے یہ عجب صحبت

مرزا راجہ رام ناتھ بہادر ذرہ

مرزا راجہ رام ناتھ بہادر ذرہ عنایت شاہ عالم آفتاب پر مامور تھے۔ اگرچہ ہندو تھے لیکن محرم الحرام کے دنوں میں تعزیہ بناتے۔ خود سبز پوش رہتے۔ خیرات کرتے اور لوگوں کو شربت پلاتے تھے۔ صاحب ثروت ہونے کے ساتھ ساتھ نیک فطرت بھی تھے۔ چونکہ شاہ عالم کا تخلص آفتاب تھا اس لئے آپ نے اپنا تخلص ذرہ رکھا۔ دو شعر ملاحظہ ہوں :-

غضب ہے آنے عاشق کو لٹا دیتی ہیں لال آنکھیں — چھپا لیتی ہیں میری جان وہ کافر چھپالی آنکھیں
ترے کوچے میں روز و شب پڑا پھرتا ہے یہ ذرہ — بجا ہے ایسے دیوانہ کے مطلب کو روا رکھنا

مرزا راجہ شنکر ناتھ بہادر صبا

راجہ رام ناتھ بہادر ذرہ کے فرزند راجہ شنکر ناتھ بہادر صبا سعادت یار خاں رنگین سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔ اکثر اپنے اہتمام میں مشاعرے کیا کرتے تھے۔ انکے دو شعر سنئے :-

کیا پوچھتے ہو جور و ستم مجھ سے یار کا — دیکھو نہ حال میرے دل بے قرار کا
دل جب اس کی نگہ مست کا مخمور ہوا — سر فروش کیفیت بادہ انگور ہوا

مرزا راجہ گوپال ناتھ بہادر غلام

مرزا صبا کے بھائی مرزا گوپال ناتھ بہادر غلام بھی مشق سخن کیا کرتے تھے۔ انشا کے دوست تھے۔ اس لئے ان سے کبھی کبھی اصلاح بھی لے لیا کرتے تھے۔ انکے دو شعر ملاحظہ ہوں :-

جو ہم بستر کبھو ہم ہوں غلام اس خوبصورت سے — نہ لیں واللہ تا روز قیامت دوسری کروٹ
خط دے یا نہ دے گوش بر آواز ہیں قاصد — مژدہ تو ہمیں یار کے آنے کا سنا دے

مرزا راجہ رام ناتھ بہادر ذرہ کے ان دونوں بیٹوں کو شاہ عالم آفتاب کا قرب حاصل تھا اور انھیں اکثر اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔

راجہ نول رائے وفا

نول رائے وفا صفدر جنگ والئے اودھ کے بڑے معتمد علیہ امیر تھے۔ روہیلکھنڈ میں اس زمانے میں متعدد افغان خاندان برسر اقتدار تھے۔ جن کی جنگی قوت بڑی زبردست تھی صفدر جنگ نے روہیلکھنڈ کو اپنی عملداری میں شامل کرنے کی نیت سے افغانوں میں تفرقہ ڈال دیا۔ اور قائم خاں بنگش والئے فرخ آباد کو حافظ الملک حافظ رحمت خاں سے لڑا دیا۔ حافظ الملک نے لڑائی کو روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن نہ رکی اور اس میں قائم خاں مارا گیا۔ حافظ الملک نے اس افسوسناک واقع کے بعد قائم خاں کی والدہ سے مصالحت کی ہر ممکن تدبیر کی۔ اور گنگا پار کا سارا علاقہ بی بی صاحب کے گزارے کے لئے دے دیا۔ لیکن صفدر جنگ نے فتنے کی آگ کو فرو نہ ہونے دیا۔ وہ خود فرخ آباد پہنچ گیا۔ اور بی بی صاحبہ کو پیغام بھیجا کہ میں قائم خاں کا بدلہ لوں گا۔ آپ ملاقات کے لئے تشریف لائیں تو ضروری مشورے کر لیں۔ بی بی صاحبہ سادگی سے صفدر جنگ کی چال کو نہ سمجھ سکیں۔ ملاقات کے لئے پہنچیں تو انھیں گرفتار کر لیا گیا اور نول رائے کو فرخ آباد کا حاکم بنا دیا گیا۔

قائم خاں کا بھائی احمد خاں اس وقت تک دلی میں تھا اسے خاندانی ریاست چھن جانے اور والدہ کے گرفتار ہونے کی خبر ملی تو فوراً فرخ آباد پہنچا لیکن نول رائے کے ملازموں نے عوام پر ہیبت بٹھا رکھی تھی۔ احمد خاں کو کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ مایوس ہو کر وہ گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھا۔ اور بیکاری میں وقت گزارنے لگا۔

اچانک ایک معمولی سا واقعہ پیش آگیا جو احمد خاں کی کامیابی کا ذریعہ بن گیا۔ ایک غریب پٹھان عورت سوت بیچا کرتی تھی۔ ایک دفعہ نول رائے کے ایک ہندو ملازم نے سوت خرید لیا۔ سودے پر کافی مدت گزر گئی تو اس شخص نے سوت واپس کرنا چاہا عورت نے کہا۔ کہ اول تو میرے پاس پیسے نہیں ہیں کہ قیمت واپس کر دوں دوسرے سودے پر کافی مدت گزر چکی ہے ہندو غصے میں آ گیا۔ اور اس نے خاتون کو جوتے لگائے عورت روتی پیٹتی ہوئی احمد خاں کے پاس پہنچی۔ اور کہنے لگی کہ محمد خاں کے گھر اگر تیری جگہ لڑکی ہوتی تو بہت اچھا ہوتا۔ لعنت ہے اس پگڑی پر جو تو باندھے ہوئے ہے میں فلاں آفریدی کی بیوی ہوں۔ لیکن ایک معمولی ہندو سپاہی نے مجھے سر بازار گالیاں دیں اور جوتے بھی لگائے احمد خاں نے شرم سے اپنا سر جھکا لیا۔ دو روز تک کچھ نہ کھایا۔ تیسرے روز رستم خاں آفریدی کو سارا واقعہ سنایا۔ وہ بلا توقف امداد کے لئے تیار ہو گیا۔ بہت سا روپیہ احمد خاں کی نذر کیا۔ اسی وقت سے احمد خاں نے اپنی ساری توجہ قوت بڑھانے پر مرکز کر دی۔

اُدھر احمد خاں کی والدہ کے ایک وفادار ہندو ملازم جب صاحب رائے نے مدد دھر کو اسیری سے رہا کرانے کا انتظام کر لیا۔ نول رائے ایک روز شراب پی کر ہوش و حواس کھو بیٹھا تو جب صاحب رائے نے بی بی صاحبہ کی رہائی کے اجازت نامے پر دستخط کرا لئے اور اس طرح وہ رہا ہو گئیں۔ نول رائے کو ہوش آیا تو وہ پریشان ہوا۔ اور صفدر جنگ کو اطلاع دی اس نے لکھا۔ کہ فوراً فرخ آباد پہنچ کر بی بی صاحبہ اور احمد خاں کو گرفتار کیا جائے۔ نول رائے کثیر فوج لے کر نکلا۔ اور فرخ آباد کے رؤسا کو پیغام بھیج دیا کہ بی بی صاحبہ اور احمد خاں کو حوالے کر دیں۔ رؤسا کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔ اور احمد خاں کی سرکردگی میں لڑائی کے لئے تیار ہو گئے لیکن بارہ تیرہ ہزار سے زیادہ سپاہی جمع نہ کر سکے۔ ادھر نول رائے کے ساتھ چالیس ہزار سپاہی تھے۔

افغانوں نے صبح کے تین بجے نول رائے کے لشکر پر شب خون مارا۔ وہ اس وقت پوجا پاٹ میں مشغول تھا۔ ابتدا میں اس نے یہ خبر سنی تو اس کی صحت پر یقین نہ آیا۔ پھر مقابلے کے لئے اٹھا لیکن افغانوں نے اس کے ہاتھی کو نرغے میں لے لیا۔ اور حودے کو ہاتھی سے اتار کر نول رائے کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ یہ غالباً ۱۱۶۳ھ کا واقعہ ہے۔

نول رائے کا تخلص وفا تھا۔ شعر کا ذوق رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں میں ان کے دیوان موجود ہیں :-

بکھرائے کوئی زلف کو اپنی جو لے وفا — پھر آہ کس طرح لے میرا سراغ دل
کہنے لگا وہ سُن کے مرا نالۂ و فغاں — یارب جیلے ہے گا یہ بیچارہ کب تلک

لحج

فاطمہ بیگم نسرین

جزیرہ نمائے عرب میں یمن سے متصل ایک چھوٹی سی سرسبز و شاداب ریاست لحج واقع ہے۔ ہے تو چھوٹی ہی سی ریاست جس کا مجموعی رقبہ ۵۲۰۰ میل ہے اور آبادی تین لاکھ نفوس۔ مگر بہت زرخیز سیر حاصل اور ترقی یافتہ ریاست ہے۔ اس کے جنوب میں بحر عرب کا ساحل باب المندب بلحاف تک پھیلا ہوا ہے۔ شمالی حدود سلطنت یمن کی حدود سے جا ملتے ہیں، مشرق میں حضر موت اور مغرب میں بحر احمر واقع ہے۔ اسکی آبادی شافعی حنفی جعفری اسماعیلی اور زیدی وغیرہ اسلامی فرقوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے افراد پر بھی مشتمل ہے جن میں عیسائی یہودی اور ہندو شامل ہیں۔ یہاں اب تک بعض ایسے قبائل بھی پائے جاتے ہیں جو زمانہ جاہلیت کی قدیم روایات کے سختی سے پابند ہیں اور اسلامی تعلیمات سے بیگانہ ہیں۔ ریاست کے مشہور مقامات سقرہ حوطہ بلحاف ابین الفاب ادیمیر وغیرہ ہیں۔ لحج میں بسنے والے حسب ذیل مشہور قبائل ہیں۔ عبادلہ۔ بوافع۔ آل فضل عوالق حواشب۔ لحج کے موجودہ فرمانروا ہز ہائینس سلطان سر عبدالکریم فضل العبدلی قبیلہ عبادلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اب سے تقریباً دو سو برس پہلے ریاست لحج سلطنت یمن کے مقبوضات میں شامل تھی اور اس کا ایک صوبہ سمجھی جاتی تھی ۱۷۲۴ء میں یمنی حکومت کی طرف سے ایک زیدی فوجی افسر یہاں کا گورنر تھا جس کے دل میں آزاد حکومت قائم کرنے کی خواہش ہوئی اس نے عدن پر قبضہ کرکے لحج میں مستقل حکومت قائم کر لی سلاطین لحج میں سے چار سلطان بہت مشہور ہیں۔

(۱) سلطان محسن بن فضل۔

یہ انتہائی غیور اور حریت پسند سلطان گزرے ہیں۔ ان کا برتاؤ قبائل عرب اور علماء کے ساتھ صد درجہ شریفانہ تھا۔ ملک گیری اور توسیع سلطنت کا جذبہ بہت شدید تھا جس کے لئے وہ موقع کے منتظر رہا کرتے تھے۔ اصابت رائے زمانہ شناسی عاقبت اندیشی اور عالی ہمتی ان کے کردار کی قابل قدر خصوصیتیں ہیں انھوں نے اپنے عہد سلطنت میں لحج کی اصلاح و ترقی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اگرچہ ان کی سلطنت کا زمانہ بہت ہی مختصر تھا مگر اپنی عالی ہمتی کی وجہ سے اس قلیل مدت ہی میں مالیات۔ فوج اور علوم و فنون کی ترقی و اصلاح میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ مرتے وقت اپنی تمام دولت شفاخانوں مدرسوں کے لئے وقف کر گئے۔

(۲) سلطان فضل بن علی بن محسن۔

سلطان محسن بن فضل کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے یہ بھی دلاوری موقع شناسی اصابت رائے اور فرزانگی میں اپنے پیشرو سے کسی طرح کم نہ تھے ان کا مقولہ تھا کہ "دولت کے بغیر نہ بادشاہ کی کوئی عزت ہے نہ حکومت کی" اسی لئے اپنے عہد سلطنت میں انھوں نے اپنی پوری توجہ قیام امن اور ترقی زراعت کی جانب مبذول رکھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ توسیع سلطنت سے بھی غافل نہ رہے اور حواشب پر قبضہ کرکے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ان کا زرین عہد حکومت ۳۰ سال ہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے انتہائی عدل و انصاف سے حکومت کی اوقاف زراعت اور قبائل کے باہمی تعلقات سے متعلق ایسے اچھے قوانین بنائے جو ابتک دستور العمل کا کام دیتے ہیں۔

(۳) سلطان احمد بن فضل بن محسن۔

سلطان فضل کے بعد سریر آرائے سلطنت ہوئے انھوں نے علم دوستی فرزانگی اور اصابت رائے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پائی شجاعت اور حوصلہ مندی میں اُن سے بڑھے ہوئے تھے۔ اگرچہ فیاضی میں ان کے ہم پلہ نہ تھے۔ ایک طرف سلطان احمد کے تعلقات انگریزوں سے بہت خوشگوار تھے اور دوسری جانب امام یحییٰ والئی یمن سے۔ انھوں نے ترکوں کے مقابلے میں ہمیشہ امام یمن کی مدد کی یہ عرب پر کسی غیر عرب قوم کی سیاست سخت ناپسند کرتے تھے۔ یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے دنیا کے سامنے عرب فیڈریشن کا خیال پیش کیا۔ اپنے دور حکومت میں اتحاد عرب کی زبردست کوشش بھی کی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے سلاطین عرب کی ایک کانفرنس منعقد کرنا چاہتے تھے جس کے لئے فرمانروان عرب کو دعوت نامے بھی بھیجے لیکن بعد میں کسی نامعلوم سیاسی سبب کی بنا پر یہ تجویز ملتوی کر دی۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو اپنی تحریک کو بار آور دیکھ کر کس قدر خوش ہوتے۔

(۴) ہز ہائینس سلطان سر عبدالکریم فضل العبدلی کے۔ سی۔ ایم۔ جی۔ کے۔ سی۔ آئی۔ موجودہ فرمانروائے لحج۔

یہ سلطان انتہائی حریت پسند آزاد خیال اور علیحدہ ذات حکمران ہیں۔ انکے کردار میں اپنے اسلاف کی تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ بہت علم دوست ہیں عرب اور اسلام کی تاریخ کے مطالعہ سے خاص دلچسپی ہے۔ سلطان کا مطالعہ بیحد وسیع ہے جدید ترین کتابیں اور مصر و شام سے شائع ہونے والے تمام اخبارات زیر مطالعہ رہتے ہیں جس وقت یہ سیاسیات عالم پر بحث کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی وسیع النظر ماہر سیاست گفتگو کر رہا ہے۔ تنگ نظری سے ان کو نفرت ہے۔ ان کا قول ہے کہ "مذہبی تنگ نظری اور تعصب اقوام عالم کی سب سے بڑی مصیبت اور وطنیت کی بدبختی ہے۔ کاش عرب سمجھ لیتے کہ ان کی آزادی کا دارومدار دماغ پر ہے نہ کہ دل پر۔" وطنیت اور قومیت ان کے رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی ہے۔ اپنے محبوب وطن میں وہ غیر ملکی اثرات کو نفرت سے ناپسند کرتے ہیں اور مکمل آزادی کے خواہاں ہیں۔ حکومت برطانیہ میں سلطان عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

اور حکومت عدن بہت احترام کرتی ہے۔ قبائل عرب کے اندرونی معاملات کے متعلق ان سے مشورہ لیتی ان کی عدالت پر کار بند ہوتی ہے سان کے اعزاز میں گیارہ توپوں کی سلامی دی جاتی۔ سرکاری مراسلات میں خاص طور سے اعزاز ملحوظ رکھا جاتا۔ صاحب السلطنة العربیة عمدة الامراء الکرام محبی و صدیقی وغیرہ الشانی طرز کے بڑے بڑے القاب لکھے جاتے ہیں ۲۳۸۰ روپے ماہوار اعزازی وظیفہ مقرر ہے۔

سلطان عبدالکریم اپنی ریاست کی ترقی میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ متعدد بڑے بڑے اسپتال اور اسکول قائم کر دئے ہیں اسکولوں میں مصر و شام کی نئی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ زراعت سے سلطان کو خاص دلچسپی ہے اپنا خالی وقت زراعت اور باغبانی میں صرف کرتے ہیں۔ انھوں نے زراعت کے نئے آلات منگوائے جن سے ملکی زراعت کو خاصا فائدہ پہنچا ہے روئی کی کاشت بھی شروع کردی ہے بارود سازی کا کارخانہ بھی قائم ہے۔ اور بعض دوسرے صنعتی ادارے بھی۔

عدن سے لحج تک ریلوے لائن ہے جس کی ترقی کیلئے سلطان ابتدائی تدابیر کر رہے ہیں اس کے علاوہ حدود سلطنت کے اندر پختہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے جو بڑے شہروں کو ایک دوسرے سے ملحق کئے ہوئے ہے۔ بجلی، ٹیلیگراف، ٹیلیفون اور ریڈیو غرضکہ جدید تمدن کا سب سامان مہیا ہے۔

سلطان کی روشن خیالی اور وسیع النظری کے باعث لحج میں مغربی تمدن بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے خود سلطان کی ذات مشرقی اور مغربی تمدنوں کا ملا جلا نمونہ ہے وہ انگریزی سوٹ پر عربی عبا پہنتے ہیں اور ہندوستانی طرز کی پگڑی باندھتے ہیں سان کا قصر بھی ان دونوں تہذیبوں کا سنگم ہے جو عربی انگریزی مخلوط طرز تعمیر کی عمارت ہے اس کی اندرونی تقسیم میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا ہے بعض کمروں میں انگریزی وضع کے کوچ کرسیاں میزیں۔ پیانو، ریڈیو غرضکہ سب سامان نظر آئے گا تو بعض کمروں میں قدیم عربی طرز کے صوفے بیش قیمت قالین قدآدم آئینے اور مشرقی آرائش کا سامان دکھائی دے گا۔ کتب خانہ میں ایک طرف معرّی، متنبی، امرء القیس کے دیوان رکھے ہیں تو ان کے ساتھ شیکسپیئر اور ملٹن کے ادبی ذخیروں کی جلدیں بھی ہیں۔ اسی طرح باغ میں "شقائق النعمان" کے برابر برسیلی کے پھول مسکراتے دکھائی دیں گے۔

امید ہے کہ عرب کی یہ ریاست بہت جلد ترقی کر کے پورے جزیرہ نما کے لئے مشعل ہدایت بنے گی ۔

• ——— • ——— ❖ ——— • ——— •

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ منیجر

رنگارنگ

پھول بے آرزو میں یاد یار آنے لگی
پھول کیسے جب تو کانٹوں پر بہار آنے لگی!

خیر سے اب پھر تمناؤں میں ہیں جولانیاں
چھٹ گئے باطل شعارِ انتظار آنے لگی!

وہ تو یہ کہئے کہ بس آنکھوں میں آنسو آگئے
اک تو اس کی یاد! اور بے اختیار آنے لگی!!

• ——— ❖ ——— •

فضا چمن کی نظر میں سمائی جاتی ہے
نسیم برق بلا بن کے چھائی جاتی ہے

اگر کہو تو ابھی جان کو فدا کر دوں
یہ کس ادا سے محبت جتائی جاتی ہے

• ——— ❖ ——— •

نہیں معلوم کس جانِ طرب کی آمد آمد ہے
ہوا کے نرم جھونکے اگنی سی گائے جاتے ہیں

زمانہ ہو گیا اس زلف کی افسوں طرازی کو
مگر آنکھوں میں اب تک سانپ سے لہرائے جاتے ہیں

دمکتی چاندنی، بہکی ہوائیں، شب کی خاموشی
یہ ساماں اور تنہائی میں مجھ کو کھائے جاتے ہیں

• ——— ❖ ——— •

خیالِ نو بہ نو سے محفل مستی سجاتا ہوں
ترے حسن تصوّر! دل کا ویرانہ پرستاں ہے

الٰہی! اس تہی سامان دنیا سے کدھر جاؤں
تمنائیں ہیں لامحدود اور محدود امکاں ہے

حرماں خیر آبادی

تصویر دیکھ کر

حیراں ہوں اپنے خواب کی تعبیر دیکھ کر
تصویر بن گیا ہوں میں تصویر دیکھ کر

چمکا نصیب حسن کی تنویر دیکھ کر
سر جھک گیا مرا تری تصویر دیکھ کر

مجھ سے نہ پوچھئے مری حیرانیوں کی وجہ
آتے اگر وہ اپنی ہی تصویر دیکھ کر

ہوتا ہے اس مکان کو پرستان کا گماں
گھر میں جگہ جگہ تری تصویر دیکھ کر

جی چاہتا ہے ہاتھ مصوّر کے چوم لوں
تجھ سے بھی کچھ حسیں تری تصویر دیکھ کر

اشعار کہہ رہا ہوں تصور میں آپ کے
تصویر کھینچتا ہوں میں تصویر دیکھ کر

ثابت قدم نہ ترکِ محبت پہ رہ سکا
پیار آگیا مجھے تری تصویر دیکھ کر

آئے گا تیرے سامنے کیونکر اسے سکوں
جو دل پھڑک اٹھے تری تصویر دیکھ کر

نفرت کچھ اس قدر تھی مری شکل سے انہیں
تلوار کھینچ لی مری تصویر دیکھ کر

شاکر کو اور کوئی سہارا نہیں رہا
بہلا رہا ہے دل تری تصویر دیکھ کر

شاکر ٹکوری

حقیقت

ڈرامہ

ممتاز حسین

افراد:۔ مسافر ——— اور ——— فقیر

منظر:۔ رات کا وقت تھا ہوا تیزی سے چل رہی تھی کالے کالے بادل امنڈا منڈ کر آسمان پر چھا رہے تھے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک فضائے بسیط میں ہلچل مچا رہی تھی ایک بدقسمت مسافر اندھیری رات کی بھول بھلیوں میں راستہ بھول گیا اور ایک جنگل میں آنکلا۔

مسافر:۔ اُف کتنی بھیانک رات ہے۔ خدایا میں کدھر جاؤں۔ اب تو ہی راہ پر لگا۔ خیر (لمبی سانس بھر کر) ہمت مرداں مدد خدا۔ چلو شاید کہیں پناہ مل جائے۔

(مسافر چلتا ہے۔ بادل کی گرج۔ بجلی کی چمک۔ آندھی کا شور۔)

فقیر:۔ (دور سے گانے کی آواز) ہری ہر کے گن گاؤں میں۔ گاؤں میں۔ ہری ہر کے گن۔ گاؤں میں۔

مسافر:۔ ارے یہ کون گا رہا ہے۔ چلوں آج یہیں رات بسر کر دوں (خوشی کے لہجہ میں)

(مسافر آواز کی طرف چلتا ہے ہر قدم پہ آواز تیز ہوتی جاتی ہے۔)

مسافر:۔ بابا کیا میں اندر آسکتا ہوں۔

فقیر:۔ (گاتے گاتے رک جاتا ہے) تم کون ہو بابا اس اندھیری رات میں یہاں کیسے بھٹک پڑے)

مسافر:۔ باباجی میں ایک طالب علم ہوں چھٹیوں میں اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ راستے میں شام ہوگئی اور پھر چاند بھی ان کالے کالے سیاہ بادلوں میں چھپ گیا۔ اور میں اس تاریک رات میں راستہ بھول گیا۔ میں برابر چلتا رہا اور راستہ تلاش کرتا رہا یکایک میں نے ہری ہر کی آواز سنی شاید آپ گا رہے تھے۔ اس آواز نے میرے لئے بانگ درا کا کام کیا میں آواز کی طرف بے تحاشہ چل دیا۔ کیونکہ رات بسر کرنے اور راہ پا جانے کے لئے میں صرف یہی راہ نکال سکا۔

فقیر:۔ جیوں اسپل بنائے گا   کچھ کھوئے گا کچھ پائے گا۔

کاش خدا تجھے راہ پہ لگا دے بابا۔

مسافر:۔ کیا میں آپ کے یہاں رات بھر ٹھہر سکتا ہوں۔

فقیر:۔ ہاں بابا شوق سے۔ یہ سب جو تو دیکھتا ہے اس میں میرا اپنا کچھ نہیں ہے سب ایشور ہی کا ہے جس طرح میں اک ایشور کا بندہ ہوں اسی طرح تو بھی ہے۔ اس لئے تجھے پورا حق ہے کہ جس طرح جی چاہے رہے اور جب تک دل چاہے رہے۔ ایشور کی چیزوں میں کسی کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ کوئی مذہب و ملت کا سوال نہیں ہے۔ آخر تمہیں بتاؤ کہ جب ہم سب زمین سے اگا ہوا اناج اور پھل کھاتے ہیں یعنی ایک ہی دھرتی ماتا میں اُگی اور پکی چیزیں کھاتے ہیں تو آخر چھوت چھات کیا۔ اور جب ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ سب ایک دن اسی مٹی میں مل جائیں گے اور سب کا ایک ہی سا حال ہوگا تو پھر نیچ اونچ اور ذات پات کیا۔

مسافر:۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔

فقیر:۔ شاید تم اس لئے میرا نام پوچھنا چاہتے ہو کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں کس مذہب کا ہوں تو سنو! نہ میں ہندو ہوں نہ مسلمان تم لوگوں کے عقیدے کے مطابق لامذہب ہوں اور ایشور کے سوا میرا کوئی نہیں ہے تمہیں بتاؤ کہ مذہب کیا ہے؟ صرف خدا تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے تو پھر آپس میں یہ لڑائی جھگڑا کیسا۔ مذہب کے نام پہ خون کیوں۔ کیا ایشور ان باتوں سے خوش ہوتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں ایک ہاتھ اور پانچ انگلیاں ہیں جو بھی کٹے گی اسے تکلیف ہوگی۔

مسافر:۔ لیکن بابا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں سے خدا مل جاتا ہے۔

فقیر:۔ نہیں میرا یہ خیال نہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ خدا خلق کی خدمت کرنے سے ہر انسان کو ہر جاندار کے ساتھ بھلائی کرنے سے اور ہر انسان کو بھائی سمجھنے سے خدا کا نور دل کو روشن کر دیتا ہے۔ اچھے کام کرنے سے جو ایک روحانی خوشی ہوتی ہے اور دل میں اک نور سا پیدا ہو جاتا ہے حقیقت میں خدا ہی کے نور کا تھوڑا عکس ہمارے دل میں آجاتا ہے۔ اور یہ روحانی سکون اس کا نتیجہ ہے۔

مسافر:۔ میں سمجھتا ہوں بقول شاعر ؎ فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں۔ ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں۔ یعنی بحث اور دلائل سے خدا نہیں ملتا۔

فقیر:۔ ہاں ہاں تم نے ٹھیک کہا خدا بحث کرنے کی چیز نہیں ہے۔ اس کا تعلق دل سے ہے اور اسی لئے اسے دل سے ماننا چاہئے نا کہ دماغ سے۔

مسافر:۔ بابا آخر آپ آبادی میں کیوں نہیں جا کر لوگوں کو درس دیتے ہیں؟

فقیر:۔ بیٹا اوّل بات یہ ہے کہ یہ نئی تہذیب کے دیوانے ہماری بات کب سنتے ہیں۔ وہ تو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ ابھی میری آواز میں اتنی طاقت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ ان نئی تہذیب کے دلدادہ لوگوں کے دلوں میں جگہ کرلے۔

مسافر:۔ بابا آج میں نے اندھیری رات میں وہ نور دیکھا جو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اندھیری رات کی سیاہی میں راستہ بھول نہیں گیا۔ بلکہ حقیقت کی راہ سے واقف ہو گیا میں نے رات کے سناٹے میں آپ کے گانے کی آواز نہیں سنی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آواز میں حقیقت بھی شامل تھی جس نے مجھے راہ پر لگا یا اب میں آپ کی کیا تعریف کروں، اور آپ ہی کی طرح ان خیالات کا لوگوں پر اظہار کرتا رہوں گا۔ (بجلی کی چمک اور بادل کی دل ہلا دینے والی گرج)

فقیر:۔ (کچھ خوشی کے لہجے میں) اچھا اچھا جو جی چاہے کرنا، بابا تو بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے اب ذرا سو جا پھر صبح کو بات کریں گے؟

انگلستان سے آسٹریلیا تک ساٹھ گھنٹے میں

اے ایچ نارا کسٹ

برطانیہ کی ایئر سروس نہ صرف یہ کہ دنیا میں سب سے تیز ہے بلکہ برطانوی ہوائی جہازوں کی اڑان کا راستہ بھی سب سے زیادہ لمبا ہے ہفتہ میں دو دفعہ انگلستان میں بنے ہوئے لنکاسٹری ہوائی جہاز انگلستان سے روانہ ہوتے ہیں اور بارہ ہزار میل کی مسافت طے کر کے صرف ترسٹھ گھنٹے میں سڈنی پہونچ جاتے ہیں۔ جب ہوائی جہازوں کی تعداد بڑھ جائے گی تو انگریزی جہاز اور بھی جلد جلد اڑانیں کرنے لگیں گے یہانتک کہ جہاز ہر طرف روزانہ جانے لگیں گے۔

انگلستان اور آسٹریلیا کا درمیانی ہوائی راستہ تجارتی کاروبار کے لئے نہیں تھا مشرق بعید میں جاپان سے لڑنے کے لئے اور جنگی ضروریات کو پورا کرنے کیواسطے یہ راستہ کھولا گیا تھا اور مسافر لوگ زیادہ تر وہی ہوتے تھے جو جنگ سے متعلق تھے اور تمام سامان بھی جنگی نقطۂ نظر ہی سے اہم ہوتا تھا مشینوں کے پرزے۔ لنکاسٹری ہوائی جہازوں نے ان جہازوں کے کام میں بڑی مدد دی جو کئی ماہ پہلے سے یہی کام انجام دے رہے تھے۔ آسٹریلیا اور ہندوستان کے درمیان ہوائی انتظام کوانٹس ایمپائر ایئرویز کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کمپنی برٹش اوورسیز ایئرویز کارپوریشن کی ایک آسٹریلیائی شاخ ہے لیکن یہ سروس ذرا دھیمی ہے۔

لنکاسٹری ہوائی جہاز جنکو لنکاسٹری بمبار بنا دیا گیا تھا انگلستان سے لیڈا تک بیچ میں رکے بغیر اڑان کرتے ہیں لیڈا سے کراچی، کراچی سے لنکا اور پھر لنکا سے بحیرۂ ہند پر ڈھائی ہزار میل لمبی اڑان کر کے آسٹریلیا کے مغربی ساحل پر پہونچ جاتے ہیں۔ یہاں سے تیل لیکر سڈنی پہونچ جاتے ہیں۔ اب اگرچہ جاپانی لڑائی ختم ہو گئی ہے تو بھی انگلستان کا تعلق آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ساتھ بدستور قائم رہیگا اور برطانوی ہوائی جہاز 'ٹیوڈر نمبر ایک' حسب دستور سابق ڈاک لے جایا کریں گے۔ زمانۂ امن میں ہوائی اڑان میں جو نمایاں ترقی ہوئی ہے اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں جب جنگ چھڑی تھی تو انگلستان سے آسٹریلیا پہونچنے میں ساڑھے نو دن لگا کرتے تھے۔

آرام دہ نشستیں

ظاہری صورت میں لنکاسٹری جہاز چار انجن والے لنکاسٹری بمبار سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا لیکن اس میں ایک تو انجن پوشیدہ نہیں ہوتا دوسرے اس میں بیٹھنے کی جگہ بہت آرام دہ ہوتی ہے۔

لنکاسٹری ہوائی سروس کھولنے میں انجینیری کی بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ 'مرلن' انجن اس وضع کے بنائے گئے تھے کہ وہ معتدل آب و ہوا میں کام دے سکیں اور یہ کہ وہ بمباری صرف انہی اڑانوں میں کر سکتے تھے جو ایک ہزار میل سے زیادہ لمبی نہ ہوں۔ جرمنی اور اٹلی کی نشانہ گاہیں دور بھی تھیں اور ان پر وار کرنا مشکل بھی ہوتا تھا لیکن گھر کی طرف واپس آتے ہوئے مشین ہلکی ہو جایا کرتی تھی کیونکہ بم پھینکے جا چکے ہوتے تھے اور پٹرول کی بڑی مقدار ختم ہو چکی ہوتی تھی۔ مگر انگلستان اور آسٹریلیا کی درمیانی سروس میں جہازوں کو ڈھائی ہزار میل سے زیادہ فاصلہ تک بیچ میں رکے بغیر اڑان کرنی پڑتی ہے اور مختلف قسم کی آب و ہوا اور بدلتی ہوئی موسمی حالت سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ممکن ہے کہ جہاز جاڑے کے موسم میں انگلستان سے اس وقت روانہ ہو جب ٹمپریچر صفر سے ۲۰ ڈگری نیچے ہو اور بحیرۂ احمر پر اسی زمانہ میں پچاس ڈگری کا ٹمپریچر ہونا کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ ہندوستان اور اس راستہ میں پڑنے والے دوسرے مقامات میں گرد و غبار کا مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے۔ ایسے مقامات پر ہو سکتا ہے کہ انجن چلتے چلتے رک جائیں یا اور اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو جائیں جو سمندر پار اڑانوں میں بہت ہی مخدوش ہوتی ہیں۔ دھول کے مسئلہ پر اس ترکیب سے قابو پا لیا گیا ہے کہ انجنوں میں 'ایئر فلٹر' لگا دیئے گئے ہیں۔ برٹش اوورسیز ایئرویز کے انجینیروں نے مختلف قسم کی آب و ہوا سے پیدا ہونے والی دقتوں پر قابو پانے کی بھی ترکیبیں سوچ لی ہیں۔ 'مرلن' انجن نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ ان موسمی حالات میں بھی پورے طور پر کام دے سکتا ہے جنکے لئے وہ بنایا نہیں گیا تھا۔

اڑانوں کا رکارڈ

برطانیہ اور آسٹریلیا کے درمیان ہوائی راستہ ۱۹۳۴ء سے جاری ہے لیکن دوسری عالمگیر جنگ سے اس کو بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دشمن کی کارستانیوں اور جنگی حالات کے تغیرات کا سب سے زیادہ اثر اسی سروس پر پڑا ہے۔ جون ۱۹۴۰ء تک اس سروس کا راستہ وہی پرانا راستہ تھا جو مارسلز، روما، برنڈیسی، ایتھنز، قاہرہ، تبریاس، ہبانیہ، بصرہ، بحرین، ڈبائی، کراچی، کلکتہ، اکیاب، رنگون، بنکاک، پنانگ، سنگاپور، شرق الہند اور ڈارون سے ہوتے ہوئے سڈنی پہونچتا تھا۔ جب ۱۱ جون ۱۹۴۰ء کو اٹلی نے اعلان جنگ کر دیا تو ایک دوسرا راستہ کھولا گیا جو بوڈو، لاگوس، اورن، گاؤ، فورٹ لیمی، اور خرطوم سے جاتا تھا لیکن اس نئے راستہ پر ابھی صرف چند ہی اڑانیں ہو سکی تھیں کہ فرانس نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس وجہ سے اس راستہ کو بھی چھوڑنا پڑا۔

کچھ عرصہ کے لئے انگلستان اور مصر کے درمیان غیر جنگی امور کیواسطے

ہوائی رشتہ بالکل منقطع ہوگیا تھا اور جہازوں کی اڑان کی مغرب میں آخری حد ڈربن رہ گیا تھا۔ ڈربن سے خرطوم اور قاہرہ وہاں سے عراق، اور ہندوستان کے راستہ ملایا اور آسٹریلیا پہونچتے تھے۔ کیپ سے انگلستان کا تعلق صرف آبی جہاز کا رہ گیا تھا۔ برٹش اوورسیز ایئرویز کے کپتان اے۔ سی۔ لورین کا ہمیں شکرگزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے اگست سنہ ۱۹۴۰ء میں پہلی اڑان کرکے پرانے ہوائی راستہ کو پھر کھول دیا۔ کپتان لورین کو انگلستان سے لزبن۔ باتھرسٹ فری ٹاؤن اور لیگاس تک ایسے راستہ پر پرواز کی جسکا کوئی نقشہ تیار نہ تھا۔

فلائنگ بوٹ سروس

سنہ ۱۹۴۱ء کی گرمیوں میں عراق اور شام میں جب گڑبڑ ہوئی تھی تو عارضی طور پر اس ہوائی راستہ میں بھی بے ترتیبی پیدا ہوگئی تھی۔ مئی میں ہباینہ کا ہوائی اڈہ جنگی منطقہ میں تھا اور اس سے کام نہیں لیا جاسکتا تھا چنانچہ ستّرہ دن تک یہ خلل قائم رہا۔ اگلے مہینہ میں شام کی گڑبڑ نے تبریاس کے اس ہوائی اڈے کو بیکار کردیا جس کو بیچ کے دنوں میں استعمال کیا جارہا تھا لیکن اس دوران میں ہبانیہ پھر کھل گیا تھا اور جہازوں کی آمد و رفت حسب دستور سابق جاری ہوگئی تھی۔ اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء سے اگلے مارچ تک بحیرۂ روم کے راستہ قاہرہ تک "فلائنگ بوٹ سروس" قائم رہی۔ اس کے اسٹیشن لزبن، جبرالٹر اور مالٹا تھے۔ اس سے برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان ایک مختصر ہوائی رابطہ پیدا ہوگیا تھا۔

جب دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء جاپان نے ملایا پر حملہ کیا تو اس ہوائی راستہ کا رخ براہ رنگون اور جزیرہ سماٹرا کردیا گیا لیکن جنوری سنہ ۱۹۴۲ء میں جاپانیوں کی پیش قدمی کے پیش نظر رنگون کا اڈا توڑ دیا گیا اور جب برما پر دشمن کا قبضہ ہوگیا تو اس ہوائی راستہ کی حد کلکتہ رہ گیا تھا۔ پھر ۳ مئی سنہ ۱۹۴۳ء تک انگلستان اور آسٹریلیا کے درمیان کوئی ہوائی تعلق نہیں رہا۔ ۳ مئی کو رائل ایئر فورس نے لنکا سے آسٹریلیا تک ایک براہ راست ہوائی "سروس" قائم کی۔ دو ماہ بعد یہ سروس کوانٹس ایمپائر ایئرویز نے اپنے تحت لے لی۔ پھر اس کو ہندوستانی کمپنی "ٹاٹا ایئرویز" کے ساتھ کراچی سے کولمبو تک کے لئے منسلک کردیا گیا۔

۳۰ نومبر کو "کوانٹس سروس" کی توسیع کراچی تک کردی گئی۔

جون سنہ ۱۹۴۴ء میں اس ہوائی راستہ کو ایک "لبریٹر سروس" سے بھی تقویت پہونچی۔ اس کا سلسلہ لنکا سے مغربی آسٹریلیا تک تھا۔

چنانچہ یہ انتظام اب تک جاری اور قائم ہے۔ اسی دوران میں انگلستان اور مشرقِ وسطےٰ کے درمیان بھی براہ لزبن اور جبرالٹر اور الجزائر اور قاہرہ ایک اور راستہ کھولا گیا۔ سنہ ۱۹۴۳ء کے آخر میں انگلستان سے کراچی تک براہ قاہرہ ایک "فلائنگ بوٹ سروس" جاری کی گئی۔ فرانس پر مغربی اتحادیوں کا قبضہ ہوجانے پر انگلستان اور مصر کے درمیان ایک اور سیدھا راستہ کھل جانا ممکن ہوگیا۔

ایک تیز تر سروس کے کھل جانے سے انگلستان اور برطانیہ کے بعید ترین مقبوضات کے درمیان مزید سلسلۂ آمد و رفت ممکن ہوگیا ہے۔ ہوائی راستہ کو کھلا رکھنے کے لئے چھ سال تک ہر ممکن کوشش جاری رہی چنانچہ اس عرصہ میں صرف ایک دفعہ یہ سلسلہ منقطع ہوا اور وہ بھی محض عارضی طور پر حالانکہ اطالوی، جرمن، جاپانی اور شام اور عراق کے جرمن کارپردازوں نے خلل اندازی کی پوری پوری کوشش کی۔

جوانی کی باتیں

وہ راتیں اور وہ گھاتیں وہ ملاقاتیں جوانی کی
خدارا یاد دلواؤ نہ اب باتیں جوانی کی

کسے اور کسطرح بتلاؤں کیا ہوجاتا ہے دل کو
جو یاد آجاتی ہیں گزری ہوئی باتیں جوانی کی

چمن ہے، دیر ہے، ہے جام ہیں امنگیں ہیں
کسی کے ساتھ یوں کٹتی ہیں برساتیں جوانی کی

کسی کی آرزو دل میں کسی کا نام ہونٹوں پر
وہ دنیائے محبت میں مناجاتیں جوانی کی

مجھے تو یاد ہیں تم کو بھی شاید یاد آتی ہوں
وہ تاریکی کے پردہ میں ملاقاتیں جوانی کی

یہی آنکھیں جو اب بے نور سی مرجھائی رہتی ہیں
سمائی رہتی تھیں ان میں کبھی راتیں جوانی کی

جگر میں ٹیس ہے دل میں درد اور آہ و فغاں لب پر
زمانہ ساتھ لایا ہے یہ سوغاتیں جوانی کی

کوئی لیتا ہے جیسے چٹکیاں سی دل میں اے ساحل
تصور میں جو آجاتی ہیں برساتیں جوانی کی

ساحل بلگرامی

غزل — رضا لکھنوی

نظر نواز ہو دل، چشمِ انتظار ہنسے
کھلے وہ پھول، کھلا کر جسے بہار ہنسے

ہنسو، ہنسو، مری دیوانگی کی ضد ہے یہی
جو ایک بار ہنسا ہے، وہ بار بار ہنسے

عجب حساب ہے یہ، دفترِ محبت کا
لکھا لکھا کے خطائیں، گناہگار ہنسے

گلوں کو پھینک کے ہم کانٹوں میں آئے یوں دامن
کہ دل کے ساتھ گلستاں پہ خار خار ہنسے

قرار ڈھونڈھ تھکے بے قرار ہو ہو کر
سمجھ میں آ گئی نہ اپنی ہنسی ہزار ہنسے

شریکِ حسنِ عمل بن، بطرزِ طنز سہی
میں دل کو پھول بناؤں، تری بہار ہنسے

یہ کیا ہوا، تری غربت نواز غیرت کو
ترا فقیر صدا دے، ترا دیار ہنسے!

بڑا مزا ہے منانے میں اے رضا جس دم
مزاجِ یار ہو برہم، نگاہِ یار ہنسے

غزل

غزل

غزل — رضا ٹونکی

بے وجہ کیوں زمانے سے پردہ کرے کوئی
شاید یہ راز ہو کہ تمنا کرے کوئی

پھر اسکا کس زبان سے شکوہ کرے کوئی
جب جور بھی بقدرِ تمنا کرے کوئی

ہر خار ایک پھول ہے اپنی جگہ مگر
رعنائیٔ خیال تو پیدا کرے کوئی

ساقی بغیرِ واسطہ جب خود کرم کرے
کیوں اہتمامِ ساغر و مینا کرے کوئی

مجھ کو تو اپنے فرض کی تکمیل سے ہے کام
کچھ بھی جنونِ شوق کو سمجھا کرے کوئی

اُف اس نگاہِ ناز کے انداز دقت ذیر
جیسے کہ اعترافِ تمنا کرے کوئی

کیا جانے کس مقام پہ لے آئی چشمِ شوق
اب میری التجا ہے کہ پردہ کرے کوئی

اہلِ رضا کی بے جگری کچھ نہ پوچھئے
آساں نہیں کہ ترکِ تمنا کرے کوئی

پی۔ای۔این۔کانفرنس

سر رادھا کرشنن جنھوں نے پی۔ ای۔ این کانفرنس میں ایک بصیرت افروز مقالہ پڑھا ۔

جے پور کا مشہور سوائی مان سنگھ ٹاؤن ہال جس میں پی۔ای۔این۔ کانفرنس منعقد ہوئی ۔

حال ہی میں جے پور میں پی ۔ ای ۔ این ۔ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس علمی اور ادبی جلسہ میں ہندوستان اور باہر کے ملکوں کے جن بڑے بڑے ادیبوں نے شرکت کی انمیں مندرجۂ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ھیں :۔ سررادھا کرشنن ۔ مسز سروجنی نائڈو ۔ پنڈت جواھر لعل نہرو ۔ رائے بہادر رام بابو سکسینہ ۔ پروفیسر احمدشاہ بخاری ۔ میڈم سوفیہ واڈیا ۔ پروفیسر لویکیلی ۔ پروفیسر فینڈ تنگمی (چین) ای ۔ ایم ۔ فارسٹر ۔ پروفیسر اولیویر لیکوم (فرانس) رالف بلاک (امریکہ)۔ انکے علاوہ مولانا آزاد ۔ ایچ جی ویلز اور ایڈیتھ سٹویل نے پیغامات بھیجئے جو کانفرنس میں پڑھے گئے ۔

اس ادبی انجمن کے بانی اور سکریٹری مسٹر ھرمن اولڈ اور مشہور انگریز ناول نگار ای ۔ ایم ۔ فارسٹر ۔

ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی لکھنؤ یونیورسٹی شعبۂ تاریخ کے پروفیسر کانفرنس میں اپنا مقالہ پڑھ رہے ھیں ۔ →

منقش شیشے

ایک قدیم صنعت جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں مٹ گئی اور نئی دنیا کے لوگ اس سے محروم ہوگئے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صنعت شیشہ سازی
ی داغ بیل مشرق قریب میں پڑی اور غالباً وہیں سے منقش
یشوں کا رواج بھی شروع ہوا۔ لیکن یہ امر پایۂ ثبوت کو
ہیں پہنچا کہ نویں صدی عیسوی میں بھی مختلف قسم کے
نگین شیشے بنانے کا دستور دائرۂ عمل میں تھا یا نہیں اور
، وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کونسی کھڑکیوں کے
یشے قدیم ترین ہیں۔ یہ صرف قیاس کہتا ہے کہ اوگسبرگ کے
رجا سے برآمد ہونے والے نقوش جو تقریباً ۱۰۵۰ء کے
ونگے سب سے زیادہ پرانے ہیں۔

صنعت شیشہ سازی مشرق قریب سے اٹلی پہنچی کیونکہ
ینس دسویں صدی میں فنون لطیفہ کا گہوارہ تھا۔
ہاں سے ترقی پاکر وسطی یورپ کے نوخیز شہروں
ک منتقل ہوتی چلی گئی وہیں کی عمارتوں
یں کھڑکیوں کے شیشوں پر نقش و نگار کے آثار پائے
گئے ہیں۔ یہ صنعت بارھویں صدی میں پایہ تکمیل ک
پہنچی۔ یہ فن بہت ہی نازک اور باریک تھا۔ فنکار سب س
پہلے ایک سفید تختے پر دلپسند تصویر بنا لیتا اور مرضی ک
مطابق رنگ بھر لیتا۔ پھر انہی رنگوں کے لحاظ سے رنگی
شیشوں کے ٹکڑے تصویر کے اصل نقوش کی صحیح پیمائش
لحاظ رکھتے ہوئے تراش لیتا۔ اسکے بعد شیشہ کی ر
کرچیں ایک خاص مسالے کی لاک سے تصویر پر ترتیب وا
جمادی جاتی تھیں۔ شیشہ کاٹنے کیلئے سخت گرم لوہا استعما
ہوتا تھا۔ بعد میں ہیرے کی کنی کام آنے لگی۔

چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں اس صنعت کو غی
معمولی ترقی ہوئی نہایت پتلے اور ہلکے اور گہرے رنگ ک
شیشے کام میں لائے جانے لگے۔ یہ نمونے اب بھی یورپ ک
کلیساؤں اور مشہور عمارتوں میں موجود ہونگے۔ بشرط
جنگ کی تباہ کاریوں نے انکو ملیا میٹ نہ کر دیا ہو۔

جی اور منظر جسکی
حیح شناخت نہیں ہو
کی۔ غالباً "بفتاح کی قسم"
، متعلق ہے۔ اسکی بیٹی
واز جاہ میں لئے اور

حضرت سلیمان کا عدل۔ ایک
مشہور تاریخی موضوع ہے۔
وہ بچے کے برابر ٹکڑے کر
دینے کا حکم جلاد کو دیکر
دونوں عورتوں کی طرف
دیکھ رہے ہیں یہ معلوم
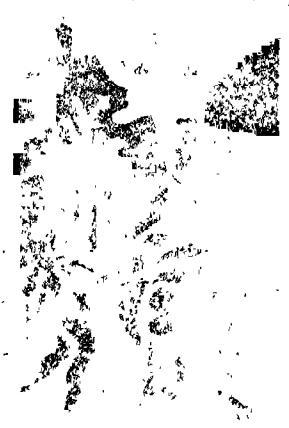
ایک دیدہ‌زیب منظر جسکی
صحیح شناخت نہیں ہوسکی
غالباً کسی عبادت گاہ سے
متعلق ہے تاہم پٹی پر
کھدے ہوئے ۱۵۵۸ء سے

ملکہ سبا حضرت سل
کے دربار میں۔ افس
ہے کہ بعض نسار
خطوط کے غائب
جانے سے ملکہ کا

کھاری پانی سے نمک

ہندوستان میں ہر سال تقریباً پندرہ لاکھ ٹن
کی کھپت ہے۔ اسکی نصف مقدار کھاری پانی
کرکے حاصل کی جاتی ہے۔ اسکی تین
ہیں۔ کچھ نمک راجپوتانہ کی مشہور جھیل
کے پانی سے بنتا ہے۔ کچھ خلیج کچھ کے
پانی سے۔ بمبئی، مدراس اور دریائے
دہانے کے قریب قائم کئے ہوئے کارخانوں
سمندری پانی سے تیار کیا جاتا ہے۔ ان
صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ پانی بڑے
اتھلے تالابوں میں بھر کر سورج کی گر
خشک ہونے کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ د
ہی دن میں پانی کی سطح پر نمک کی پپڑ
لگتی ہے اور تمام پانی خشک ہونے کے بعد
کی مانند نمک کے پترے باقی رہ جاتے
انہیں کھرچ کر بڑے بڑے چھلنوں میں
لیتے ہیں تاکہ گرد و غبار الگ ہو جائے۔
ادھر پنجاب میں نمک کی ایسی کانیں ہیں
جو غالباً کبھی ختم ہونے کا نام نہ لیں

نمک بڑی احتیاط سے چھانا جا رہا ہے تاکہ گرد و غبار اس سے الگ ہو جائے۔

شاہد ہے کہ ہندوستان پر سکندر اعظم کی
چڑھائی کے وقت بھی ان کانوں سے نمک
نکال کر تجارت کی جاتی تھی کل مقدار کا
تقریباً نصف حصہ سرکاری محکمۂ نمک کی
نگرانی میں تیار ہوتا اور نکالا جاتا ہے۔ باقی
لائسنس کے کارخانے بناتے ہیں جن سے
محصول لیا جاتا ہے۔

تمازت آفتاب سے پانی بخارات بنکر اڑ گیا ہے
اور اب نمک کے چمکتے ہوئے ٹکڑے کھرچ
کھرچ کر جمع کئے جا رہے ہیں۔ ←

فردوسی کی عزت افزائی

اعلیحضرت شہنشاہ ایران نے فردوسی کے اسی مجسمے کی جو ہندوستان سے بھیجا گیا تھا بڑی شان و شوکت کے ساتھ نقاب کشائی فرمائی۔

فردوسی ایران کے مشہور ترین شاعروں میں سے ہے اور طویل زمانہ گذر جانے کے باوجود اس کی شہرت کا سکہ اسی طرح رواں ہے جیسا کہ سلطان محمود کے عہد میں تھا۔ «شاہنامہ» کے علاوہ اس نے اور کئی کتابیں لکھیں جن میں سے «یوسف زلیخا» کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس مثنوی کے نو ہزار اشعار ہیں۔ فردوسی کو سلطان محمود کی بارگاہ سے خاطر خواہ انعام نہ مل سکا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے وہ رقم جو اسے بھیجی گئی تھی' پائے تحقیر سے ٹھکرا کر ایک نائی اور شربت فروش کے درمیان تقسیم کردی۔ فردوسی معمر اسی سال ۱۰۲۰ء میں اس جہان سے گذر گیا' اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا اسکا ثانی پیدا نہیں کرسکی

حال ہی میں ان ایرانی پارسیوں نے جو ہندوستان میں مقیم ہیں' فردوسی کا کانسی کا مجسمہ راؤ بہادر جی' کے' ماتھر سے بنواکر ایران بھیجا اور اعلیحضرت شاہ ایران سے استدعا کی کہ وہ اس مجسمے کی نقاب کشائی فرمائیں۔ ایران و ہند کے مابین ثقافتی تعلقات پہلے سے موجود ہیں۔ اب اس پیشکش سے ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

ی کا مجسمہ جسے ہندوستان کے مشہور مجسمہ ساز رائے بہادر جی' کے' ماتھر نے کیا اور جسکی نقاب کشائی ۲ اکتوبر ۰٤٥ کو طہران کے باغ فردوس میں ی۔ بائیں طرف کے خاکے میں دکھایا گیا ہے کہ مجسمہ سامنے سے دیکھنے پر یسا نظر آتا ہے درمیانی حصہ پر ایک کتبہ ہے جس پر قطعۂ تاریخ نقش ہے۔
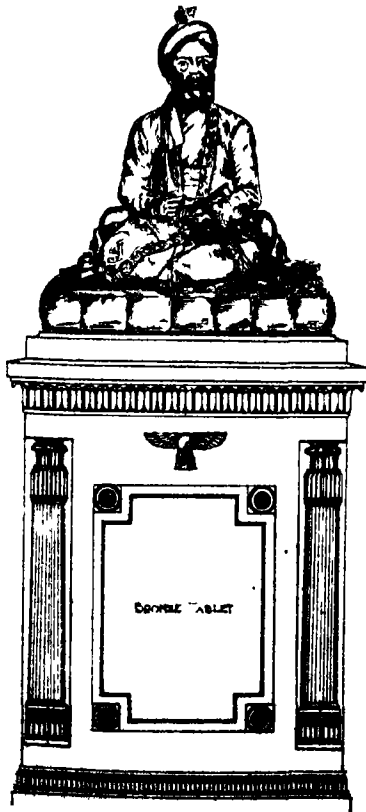
ہندوستانی اخبارات کے چند نامہ نگار جو مشرق وسطی کی سیاحت کرنے کے بعد
[illegible]

اعلیحضرت شہنشاہ ایران
جنہوں نے فردوسی کے
مجسمے کی نقاب کشائی
کرکے شعر و ادب کی دنیا
پر بڑا احسان کیا

یہ تصویر اس موقع کی ہے جب ایران
کے وزیراعظم نے اس عمارت کا سنگ
بنیاد رکھا تھا جس پر فردوسی کا
مجسمہ نصب کیا گیا ہے۔ اس مجمع
میں وزیر اعظم کے علاوہ اس ثقافتی
مشن کے چند اراکین بھی موجود
ہیں جو ۱۹۴۴ء میں ہندوستان
آیا تھا۔
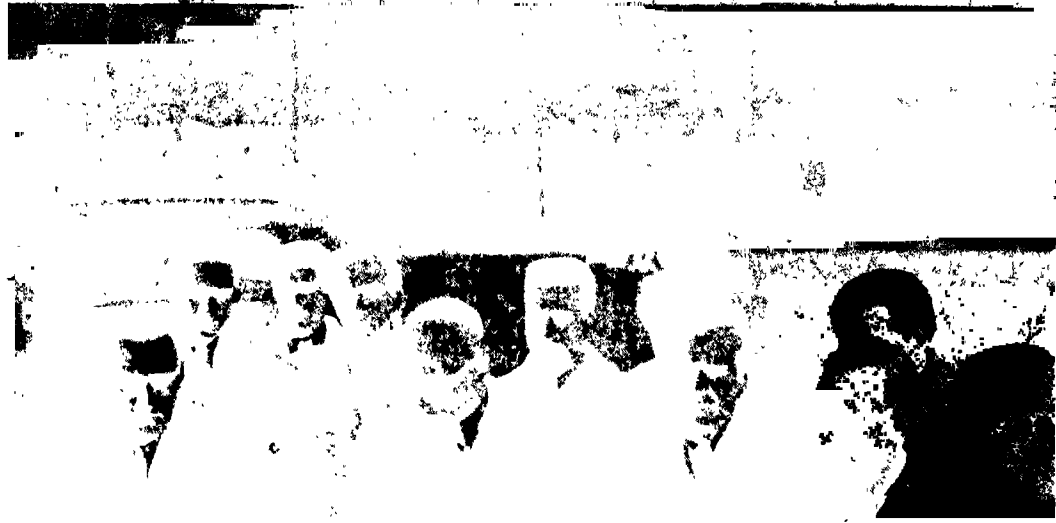
سرکاؤس جی جہانگیر جو
ایران کے پارسیوں کی
جماعت کے صدر ہیں اور
بمبئی میں قیام فرماتے ہیں۔

یہ تصویر اس وقت لی گئی تھی
جب ایران کا ثقافتی مشن کچھ
عرصہ پہلے بمبئی پہنچا تھا۔ تصویر
میں دائیں جانب بمبئی کے مشہور
رئیس و۔ا۔ تاراپور والا رونق
افروز ہیں۔ فردوسی کے مجسمے
کی تیاری میں انکو بڑا دخل
حاصل ہے۔
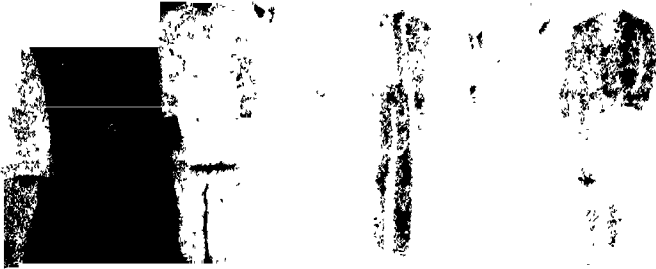
اس شمارے میں

جناب راجندر سنگھ بیدی جو اردو کے مشہور ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ انکی افسانہ نگاری پر پروفیسر وقار عظیم کا مقالہ اسی اشاعت کے صفحہ ۹ پر ملاحظہ ہو۔

جناب آر۔سی۔سریواستو جو شکرسازی کی صنعت کے زبردست ماہر ہیں۔ انکی صنعتی سرگرمیوں سے متعلق جناب ڈی۔راگھون کا مقالہ اسی شمارے کے صفحہ ۷ پر ملاحظہ ہو۔

جناب ساحر لدھیانوی جو اردو کے ایک نوجوان شاعر ہیں۔انکی شاعری سے متعلق جناب احمد ندیم قاسمی کا مقالہ اسی شمارے کے صفحہ ۴۵ پر ملاحظہ ہو۔

ایٹم بم کے اثرات
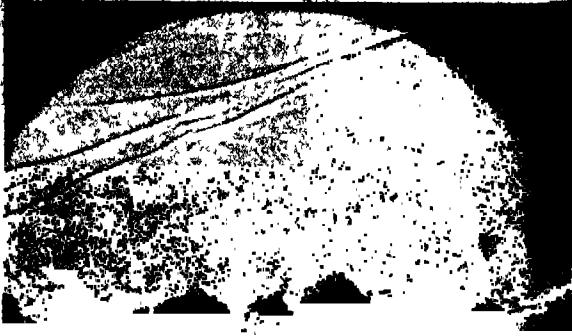
دھماکے سے پھٹنے کی ابتدا۔ سیاہ نشان سورج سے بھی زیادہ روشن تھا۔

چکاچوندھ پیدا کردینے والا شعلہ اور دھوئیں کے بادل

جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم گرانے سے قبل اسکے اثرات کی آزمائش کی گئی تھی۔ اس موقعہ پر یہ تصاویر چھ میل کے فاصلے پر کھڑے ہوکر کھینچی گئیں۔ مشہور برطانوی سائنسداں سر ٹیلر کا بیان ہے کہ دھماکے کے ساتھ ہی سورج سے کہیں زیادہ تیز روشنی نمودار ہوئی اور پھر چھتری کی وضع کا روشن غبار تقریباً چالیس ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ گیا۔ ٹوکیو ریڈیو کے اعلان سے پتہ چلا کہ ہیرو شیما اور ناگاسا کی میں دو لاکھ اسی ہزار انسان ان بموں سے ہلاک ہوئے۔ بعد کے اثرات سے مسلسل مرتے رہنے والے اس تعداد کے علاوہ ہیں۔

دنیا میں جہنم کا نمونہ جو ایٹم بم کے پھٹنے سے رونما ہوا۔

(بائیں طرف) بم پھٹنے کے زبردست دھماکے سے جب مرکز کی ہوا بڑی تیزی سے پھیلنی شروع ہوئی۔ (نیچے) فولادی خود کی مانند سفیدی مائل گرم ہوا کا غبار جو فضا پر مسلط ہوگیا۔

میر انیس

محمد حمید راشد

مسٹر پرسی سائیکس نے لکھا ہے کہ جذباتی تمثیلوں (PASSION PLAYS) کی بنیاد میدان کربلا میں امام حسینؑ کے المناک واقعۂ شہادت سے پڑتی ہے ... میں نے ان تمثیلوں کو بذات خود دیکھا ہے اور میں اس کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ خواتین کی دردناک چیخوں کی صدا اور مردوں کی فریادوں کا سننا ساتر انگیز ہوتا ہے کہ تمام ویز بدیر اتنی جوش و خروش سے جو اس وقت حاضرین میں ہوتا ہے بعض و تنفر پیدا کرنا مشکل ہے در حقیقت یہ جذباتی تمثیلیں اسی تلخ رنج و الم کی مظہر ہیں جن کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے اور مناظر جو میں نے دیکھیں میں جب تک جیتا ہوں نہیں بھولوں گا۔"

مسٹر سپیرد کے حسب بالا بیان سے جس شدت احساس کا اظہار ہوتا ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ موصوف یہ سطور حوالۂ قلم کرنے سے قاصر رہتے اگر انہیں مراثیٔ انیس کے مطالعہ کا موقع حاصل نہ ہوتا۔ انیس کے کلام پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے چلکر آپ لکھتے ہیں۔ "یہ انیس کی بڑی خوبی ہے کہ انہوں نے اس عظیم الشان واقعہ کو اس نظر سے دیکھا جس سے ان کے ہم مذہب اسے ہمیشہ دیکھتے ہیں لیکن سی کے ساتھ انہوں نے اپنی نظموں کے موضوع کو علوئے تخیل اور شدت جذبات سے اس طرح گرانبار بنا دیا ہے کہ ان کا اثر صرف ان کے ہم مذہب افراد تک محدود نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے موضوع کو حد درجہ بلند کر دیا ہے گو اس محل پر کربلا کی دلدوز داستان کے خونچکاں مرقع تحریک جذبات کے بنیادی اسباب ہیں لیکن تمثیل نگار کی نادرالوجود ڈرامائی ذہانت اور فطانت کا زور یقینی طور پر سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔

"دنیا کے مسلمہ معیار شاعری کے اعتبار سے ایپک اور ٹریجڈی یعنی رزمیہ شاعری اور حزنیہ تمثیل کا مرتبہ بہت بلند ہے" شاعری کی ان اصناف نے جتنا گہرا اثر عام اور خاص اذہان پر چھوڑا ہے غالباً اس کے ثبوت کے لئے مجھے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں۔ انیس کے پہلے اور انیس کے بعد ان اصناف شاعری پر طبع آزمائی کرنے والوں کی کمی نہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ جس گہرے تاثر کے ماتحت ان میں سے اکثر نے قلم اٹھایا اور دل و دماغ کی آمیزش سے جو لازوال مرقعے انہوں نے صفحۂ قرطاس پر چھوڑے وہ آپ اپنی مثال ہیں۔ مگر انیس نے جس خوبی جس متانت اور جس جوش سے خارجی واقعات و مقامات کی منظر کشی کی ہے اس پر صرف انہیں کی وہ داخلی شاعری فوقیت پا سکتی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ناقابل تقلید زبان میں ہر حساس طبیعت کو متاثر کرتے ہیں۔ ...... یہ بھی انہیں کے لئے سب سے زیادہ صحیح طریقے پر کہا جا سکتا ہے کہ شاعری ان کی گھٹی میں پڑی ہے اور وہ ایک فطری اور پیدائشی شاعر ہیں" حیات انسانی کی گہرائیوں میں جا کر اتنے سچے موتی کوئی نہ لا سکا۔ جذبات کے پر پیچ راستے پر چلکر ثابت قدمی اور منزل شناسی کی اتنی درخشاں مثال کوئی نہ پیش کر سکا۔ مجھے کہنے دیجئے کہ انیس ہی وہ شاعر ہے جو بجا طور پر الہامی شاعر کہا جا سکتا ہے اس کی شاعری فنی حیثیت سے اسقدر مکمل ہے کہ ناقد کو اس کے باب میں مجال سخن نہیں۔"

میر انیس کا بیدرد سے بیدرد نقاد بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ کسی دوسرے مصنف نے ہمارے لئے انیس سے زیادہ گرانقدر خزانہ نہیں چھوڑا" اور یہ امر بھی مسلم ہے کہ انیس کے مطالعے کے بعد بہ انصاف لہذا اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ زبان اردو میں انسانی دماغ کے عمیق ترین خیالات و جذبات کا ذریعہ بننے کی کسقدر اہلیت ہے لیکن دور حاضر کی انقلابی رو میں ہمارے نظام ادب کی بنیادیں اسقدر متزلزل ہیں کہ فی زمانہ بعض ہمیشہ ہمیشہ کے لئے طے شدہ مسائل کو بھی ایک نانزاشیدہ اور نااہل نقاد منقلب کر دینا اپنا حصہ سمجھتا ہے۔ غیر معیاری نقادوں کے ایک گروہ کے ہاتھوں بعض مسلم الثبوت شعراء پر خود اپنی تنگ نظری اور فقدان وسعت کی وجہ سے اعتراضات بیجا کیے گئے اور کئے جا رہے ہیں کہ بیخود موہانی جیسے ٹھنڈے دماغ کا انسان بھی چیخ اٹھا۔

"یہ دور ہندوستان کے لئے انقلابات کا دور ہے۔ دنیا کی دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آ رہی ہے اور کچھ ایسے مناظر پیش نظر ہیں کہ حسرت دو کف حسرت اور حیرت محو حیرت ہے۔ ذوق شعری موت کی نیند سو رہا ہے۔ ناآشنایان رموز تحقیق کے ہاتھوں تنقید کا خون ہو رہا ہے کل کسی بانی بیداد نے کسی تاجدار سخن کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ تو آج کسی جلاد نے کسی شہریار نکتہ پروری کی لاش قبر سے نکال کر پامال کر ڈالی۔"

اسلئے اس عبوری دور میں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ کہ ناقدین فن جوش سے زیادہ ہوش سے کام لیں اس محل پر حواس بجا رکھنا ہی کمال نقد ہے۔ ترقی پسندی میرا ایمان ہے اور میں ان تمام ہواؤں کا مذاق اڑاتا ہوں جو رجعت پسندی کے ویرانے سے آتی ہیں۔ لیکن مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ کس قوم کی تاریخ کا سب سے سیاہ ورق وہ ہے جہاں اسکے سب سے بڑے محسن کے کارنامے دھندلے پڑ جائیں۔ یہ ہماری بدبختی ہی سمجھئے کہ مراثیٔ انیس میں حسینؑ کا ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا جانا شیعی دنیا کے علاوہ اسلام کے بعض فرقوں کے اندر پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا گیا اور اس ناپسندیدگی کی وجہ سے انیس کے اس زندہ جاوید کارنامے کو صرف موضوعی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ فنی حیثیت سے بھی نامکمل، ناقص اور اردو ادب کے دامن پر ایک بدنما دھبہ قرار دیا گیا۔ یوں تو تاریخ ادب اردو کے صفحات پر انیس کا ذکر ناگزیر ہے لیکن جس جلالت اور شاندار طریقہ پر اس امین اردو کا ذکر

ہوتا ہے کہ انیس کی صحیح جگہ متعین کرتے وقت دانستہ طور پر سخت ناانصافی سے کام لیا گیا ہے۔

انیس کی شاعری کو زوال پذیر عصر کی شاعری کہنا اتنا ہی غلط ہے جتنا علامہ اقبال کے الہامات کو بے وقت کی راگنی کہنا اپنی زبان کے چند الفاظ کو الٹ پلٹ کر مرعوب کن یا خوش آئند جملے بنانا شاعری نہیں ہے۔ شعر و ادب کی بنیاد یا تو انسان کے ذاتی تجربوں اور احساسات پر ہوتی ہے یا کائنات اور حیات کے حقائق کے متعلق غور و فکر پر۔ اس میں خارجی حالات کا تاثر شعوری اور غیر شعوری طور پر داخل ہوتا ہے"۔ شاعری اور حقیقت نگاری میں جتنا گہرا تعلق فی زمانہ پیدا کرنے کی مستحسن کوشش کی جارہی ہے اس کی رو سے انیس کو اپنے زمانے کے لحاظ سے غیر ترقی پسند کہنا بڑا ظلم ہے۔ غالباً یہ کہنا کسی طرح بھی غلط نہیں کہ انیس کے کلام میں کائنات اور انسانی نفسیات کے وہ نازک نکات جھلکتے ہیں جنکے اظہار کے لئے حکیم یا فلسفی صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیتے ہیں انیس ایک مصور جذبات کی حیثیت سے اس چابکدستی اور شدت سے بعض اوقات اپنے ہیرو کے ماحول پر قلم اٹھاتا ہے کہ اس کے کمال فن پر ناظر عالم وجد میں بے قابو ہو جاتا ہے مثلاً حُر تلواروں سے چور ہو کر زمین پر آتے ہیں اور امام حسینؑ ان کے سرہانے موجود ہیں۔ موت کا انتظار ہے اور بہ لبید اہتمام اس کے خواہشمند ہیں کہ حر کی زبان سے کوئی فقرہ نکلے جس کی تعمیل کر دوں لیکن اطمینان مرگ اور حسینؑ کی بیچارگی اور وفاداری کی لاج۔ حُر یہ کہکر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔

بات بھی اب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہے کچھ اڑھا دیجئے مولا مجھے نیند آتی ہے

ظاہر ہے کہ انیس نے جو کچھ حُر کی زبان سے کہلوایا وہ کوئی تاریخی چیز نہیں بلکہ ایک نفسیاتی مطالعہ جسکی تشریح اتنے انوکھے پن سے انیس کے علاوہ شاید اس موقع پر کسی دوسرے کے بس کی چیز نہیں یہ کوئی روکھی پھیکی واقعہ نگاری نہیں بلکہ شاعرانہ رنگ آمیزی میں ڈھلا ڈھلایا ایک حسین مرقع ہے۔ بعض غیر اہم کڑیوں کو حذف کرنا اور بعض جزئیات کو اجاگر کرنا ہی واقعہ نگار شاعر کے انداز بیان کی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے اور اس کی لاتعداد مثالیں انیس کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ انیس ایسے نازک موقعوں سے جس کامیابی سے گزرے ہیں اس کی مثال شاید دنیا کے کسی دوسرے شاعر میں نہ مل سکے۔

انیس پر یہ اعتراض ہے کہ وہ "تاریخ سے چشم پوشی کر جاتے ہیں" معترض کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ انیس کے پیش نظر طبری یا تمدن عرب کی تدوین نہ تھی بلکہ شاعری کی جاندار تصویریں اس عنوان سے پیش کرنا تھیں کہ ناظرین کرداروں کی طرف زیادہ شغف سے متوجہ ہوں" وہ کردار جنکی تاریخی زندگی اخلاق اور بلندی ایثار کی روح تھی۔ پھر اس کے کرداروں میں حجازی روح کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ماحول کا جو امتزاج نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکو ناظر کے سامنے ایسے مرقعے پیش کرنا تھے جو باوجود عربی روح کے اس ملک کے تمام اذہان پر زندہ کرداروں کی طرح اثر انداز ہو سکیں۔ عرب کی تاریخ کے ایک خونچکاں ورق کو ہندوستانی رنگ سے بھرنا ایک ایسا نازک موقع تھا جہاں بڑے بڑے فنکاروں کے قلم میں لغزش پیدا ہو جاتی مگر انیس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ وہ خونچکاں ورق ان کے ایمان کا سرمایہ تھا اور اسلئے جہاں تک کرداروں کے مراتب کی نقاشی کا تعلق ہے کسی نقاد کو ایک نقطہ رکھنے کی گنجائش نہیں"۔ انہیں شاعری کے فن کی واقفیت کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسی حالت میں انسان کی نفسی حالت کا تقاضا یہی ہے کہ ان مرقعوں میں اس کے ارد گرد کا ماحول ہو۔ ورنہ اجنبی فضا کبھی بھی فنی بلندی کی ضامن نہیں بن سکتی ہر انسان اپنے ماحول سے متعلق واقعات اور تجربات کو بہ نسبت اجنبی ماحول کے واقعات سے زیادہ لطف اندوز ہوتا اور دلچسپی کا اظہار کرتا ہے اسی لئے انیس نے ان چیزوں کا پوری طرح احساس کر لیا تھا کہ اگر وہ دنیا کے سامنے کوئی قابل فخر چیز پیش کرنا چاہتے ہیں تو ایسا لب و لہجہ اور ایسی فضا قائم کرنی چاہیے جس سے ناظر مانوس ہو۔

انیس کی شاعری سے افادیت کا مطالبہ بھی عجیب ہے۔ آج افادیت کے متعلق اس قدر غلط فہمی ہوئی ہے کہ اس کا اندازہ مشکل ہے ایثار اور قربانی انسان کے افعال میں وہ بلند جگہ ہے جہاں انسانیت کو مراتب تقسیم ہوتے ہیں۔ دنیا کی بساط پر ابتک جتنے نیک یا ایثار اور سرفروش گذرے ہیں ان کے سامنے سب سے واضح منزل سب سے بلند نصب العین کیا تھا؟ امام حسینؑ ہی کی قربانی کو لیجئے۔ کربلا اور افادیت میں کیا تعلق ہے؟ مادی افادیت کی توقع اس محل پر اتنی ہی لغو ہے جتنی سیاہی سے امید نور لیکن مادی افادیت سے کہیں ارفع، زیادہ مستقل اور سچی افادیت وہ ہے جو سکون دل کے نام سے یاد کی جاتی ہے، اس دور کے افادئین میرے اس بیان کو کتنا ہی سے تعبیر کریں مگر میں اس چیز کو بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں کہ یہ چیز انسان کی زندگی میں ایک مستقل جگہ رکھتی ہے۔ جن افراد کی یاد تازہ کرانے میں انیس نے اپنے فنی کمالات کی انتہا کر دی کیا ان کے اعلیٰ کردار انکا بلند مقصد حیات اور سب سے بڑھکر اس ناقص بساط عالم پر ان کی عملی جد و جہد کوئی معمولی چیزیں ہیں؟ کیا انسان ان سے کوئی روشنی نہیں پاتا؟ کیا محبت، صداقت، عرفان، عزت نفس اور خودداری کے مکمل ترین نمونے ان صاحبانِ وفا کے روپ میں نظر کے سامنے نہیں آتے؟ انیس کے یہ مرقع زندہ ہیں۔ وہ جملے وہ الفاظ وہ حروف وہ نکتے سب کے سب جاندار ہیں جنکے جامہ میں ان محیر العقول انسانوں کی روح شعری فن کے ہاتھوں کارفرما ہے اگر پھر بھی یہ کہا جائے کہ انیس مرچکا تو گویا زندۂ جاوید کی زندگی سے انکار ہے ان تمام اقدار سے انکار ہے جنکا سرچشمہ فیض زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ یہ انیس کی اس روح سے انکار ہے

باقی صفحہ ۵۲ پر

آنسو

ص اکبری

"نا بہن چاہے تم مجھے چار میں چھی چھی کرواؤ پر میں تو قیامت تک اپنی نرگس کا بیاہ اقبال سے نہ ہونے دوں گی"

"واہ بہن تم تو خواہ مخواہ اقبال کے سر ہو گئیں، میرا مطلب یہ ہے کہ لڑکا اپنے گھر کا ہے، ناک نقشے میں بھی کسی سے کم نہیں، چار پیسے کما کر لا رہا ہے، یہ میں نے مانا کہ اس کی تعلیم اتنی نہیں جتنی ہماری نرگس کی ہے، پھر بھی تو یہ ضرور کہوں گی کہ اقبال نے اچھے اچھوں کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں"

"اے واہ کیا بھنگ پی رکھی ہے آج، اللہ رکھے میں نے نرگس کو بی، اے تک کی تعلیم دلوائی ہے، کن ڈھنگ کا نبوایا ہے، اب یہ تو نہیں کہ جس کے چاہو سر منڈھ دوں، میں تو اپنی نرگس کا بیاہ اس سے رچاؤں گی، جو اس کے برابر تک کی تعلیم کا ہو"

"اور جو کوئی اتنی تعلیم تک کا نہ ملے تو"

"تو کیا میری بچی بیٹھی رہی ہی سے جو سڑ جائے گی، اور میں یہ کہوں کہ تم خواہ مخواہ کیوں سر ہو رہی ہو، وہی مثال آتی ہے کہ دھا مرے کمہار کا دھو بن ستی ہو"

"لو تم تو خواہ مخواہ خفا ہو گئیں، نہ کرتی ہو نہ کرو، پھر میں یہ کہے دیتی ہوں کہ اقبال جیسا تو ڈھونڈ سے چراغ لے کر ڈھونڈو گی تو نہ ملے گا، اور میں بھی تو دیکھوں کس سے بیاہتی ہو، اور کیسا گل کھلاتی ہیں بی نرگس بھی"

"آج کیا کچھ لڑنے جھگڑے کی ٹھانی ہے جو یہ جلی کٹی سنا رہی ہو"

"اے تو بہ شیطان کے کان بہرے میں کون ہوتی ہوں کہنے والی، میں اس کی خالہ ٹھہری، تم اس کی ماں ہو تم چاہو تو قتل کر دو اور میں انگلی لگانے سے رہی، خیر اب میں چلی، پھر بہن بھول وہی جو بھیش پڑھے ......"

یہ بھی وہ گفتگو جو نرگس کی ماں اور خالہ میں ہوئی، ویسے تو نرگس کے آبا و اجداد خاندانی تعلیم یافتہ نہ تھے، بلکہ وہ تو اندھوں میں کانا راجہ کی طرح خود پڑھے لکھے تھے، نرگس کے والدین نے نرگس کو دل کھول کر پڑھایا، اس کی تعلیم کے لئے پیسہ پانی کی طرح بہایا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ نرگس کے گھر میں من برستا تھا، لیکن اتنا ضرور تھا کہ ان کے جا پانچ سو آدمیوں کے محلے میں ان کی ٹکر کا کوئی نہ تھا، نرگس کے والد بڑے ملنسار تھے، کیا چھوٹا کیا بڑا ہر کوئی ان کی عزت کرتا تھا۔ تھے وہ قدامت پسند، لیکن ان کی بیوی تھیں ذرا نئی روشنی کی دلدادہ، اس لئے ان کی طبیعت کا میلان بھی قدرے نئی تہذیب کی طرف تھا، یا یوں کہیے کہ قدامت پسند طبیعت پر مغربی تہذیب کا ملمع چڑھا ہوا تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ نرگس پڑھی اور خوب پڑھی، لیکن تہذیب و تمدن و نئی روشنی کی جھلک بھی اپنے سینے میں لیتی آئی۔ اپنی گرہ میں باندھی ہوئی آئی۔

۲

نرگس کے ابا اقبال کے رشتے میں ماموں لگتے تھے، بچپن میں اقبال کے والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے اقبال کی تعلیم ادھوری رہ گئی، کھاتا پیتا گھرانہ تھا لیکن باپ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ جانے کے بعد نہ وہ امارت رہی اور نہ وہ فارغ البالی، اس لئے اقبال کو خود گھر کا بار اپنے سر اٹھانا پڑا، گھر میں صرف اس کی ماں تھی اور چھوٹی بہن خانم، اب کون تھا جو ان کو سنبھالتا، دیکھتا، آڑے وقت میں کام آتا چاہیے تو یہ تھا کہ نرگس کے والدین اقبال کی ادھوری تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے، لیکن جب اقبال کی ممانی نے ادھر سے چپ سادھ لی تو ماموں کے دلی خواہشات پر جو ان کو اقبال کی ادھوری تعلیم کو پورا کرنے کی طرف تھیں پانی پھر گیا اور بیوی کے تیور بدلتے دیکھ کر اس کی پیروی کرنا ہی مناسب سمجھا ---- اور ادھر اقبال کی ماں کی خود دار طبیعت نے بھی یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے، منہ کھولے، ---- اقبال سلیم الطبع، خوش اخلاق اور ذہین تھا، لیکن حد درجہ خاموش واقع ہوا تھا، قدرت نے اسے ایک حساس دل بخشا تھا، وہ اپنی زندگی کو وطن کی فلاح و بہبودی کی بھینٹ چڑھا دینا چاہتا تھا۔ اقبال چند معتبر لوگوں کی سفارش سے اچھے عہدے پر مامور ہو گیا، اس کی فہم کی، عقلمندی اور ایمانداری نے لوگوں کے دلوں میں ایسا گھر کیا کہ ہر کوئی اس کا کلمہ پڑھنے لگا، ہر کوئی اقبال کو اپنے سر آنکھوں پر جگہ دینے لگا۔

۳

کہنے سا ہونی شدنی، جو بات ہونے والی ہوتی ہے وہ ہو کر ہی رہتی ہے، کسی کی کیا مجال کہ دخل دے، نرگس کی ماں کو کچھ ضد سی ہو گئی تھی کہ جب تک نرگس کی برابر تک کی تعلیم کا نہ آوے، نرگس کو بیاہے نہ، سینکڑوں پیغام آئے بیسیوں نیوتے آئے لیکن نرگس کی ماں کی وہی مرغی کی ایک ٹانگ رہی، نرگس کے ابا نے کہا بھی کہ ایک تو تم نے پہلے اقبال کے رشتے کو نامنظور کر دیا اور پھر اتنے سارے پیغام آئے اس پر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتیں، آخر یہ کیا ضد ہے، لڑکی پرائے گھر کی ہے، زمانہ خراب ہے، خدا نہ کرے کبھی کچھ ہو جائے تو زمانہ میں ناک کٹ جائے، چار میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں، یہی مرزا نجمی کی لڑکی خورشید کے واقعہ ہی کو لو، زیادہ دن نہیں ہوئے، کیسے کیسے گل کھلائے تھی خورشید نے اور آج زمانہ انگشت نمائی کر رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ لڑکی گھر میں ہو اور پیغام و نعام نہ آئے تو جبر سے لوگوں کے سامنے کہنے کو منہ ہو گا، لیکن پیغام آنے پر بھی بٹھائے رکھنا، بھلا کہاں کی عقلمندی ہے اور پیغام بھی کیسے ایک سے ایک، لیکن نرگس کی ماں کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور ٹال مٹول کرتی رہی۔

زمانہ کی ستم ظریفی، آخر ایک دن ایسا ہوا کہ سہ پہر کے وقت نرگس کی ماں نے چند ٹکڑے ککڑیوں کے کھائے، ہمسایہ کے یہاں سے آئے ہوئے وہ چار دہی بڑے چکھے، رات گھر میں میٹھے چاول پکے تھے، بس چاول کیا کھایا کہ موت کا بہانہ ہو گیا، پیٹ میں خفیف سا درد اٹھا، ہائے کہہ کر پڑ رہی، گھر میں اجوائن کا عرق تھا، دیا گیا، لیکن اس سے کیا ہوتا درد بڑھتا گیا، چارپائی سے لگ گئی، پنڈا پھیکا پڑ گیا، اول فول بکنے لگی، ڈاکٹر بلوائے گئے، حکیم لائے گئے، دوائیں دی گئیں، انجکشن دیا گیا، لیکن ساری تدبیریں بے سود، سارے کام فضول، وہاں تو چل چلاؤ تھا، دانت لگ گئے، آنکھ کی

پتلیاں گھومنے لگیں، پاؤں سرد پڑ گئے، انگلیاں اینٹھنے لگیں، ہونٹ سوکھ گئے، سانس میں خرخراہٹ پیدا ہوگئی اور اکھڑ اکھڑ کر آنے لگی، آخر بندی خدا کی خدا کے گھر سے نہ لوٹی اور اسی رات چٹ پٹ ہوگئی، نہ نرگس کے سر پر سہرا دیکھا، چھلا نہ انگوٹھی، نہ ہوائیں نہ برات، ساری امیدیں دل میں لے قبر میں جا سوئی۔

——— ۴ ———

مادرِ شفقت کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد نرگس کے ابا کو نرگس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی، آخر کب تک کوے سے لگائے بیٹھے رہتے ویسے تو پہلے ہی نرگس کے ابا کی نظر انتخاب اقبال پر پڑی تھی، اور ایک دو دفعہ اس طرف سے بات بھی ہوئی تھی لیکن جب تک نرگس کی ماں زندہ رہی، ان لوگوں کی ایک نہ سنی اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہیں، لیکن نرگس کی اماں کے آنکھ بند ہوتے ہی خالہ نے اقبال کی ماں سے کہہ سن بول بتا اس رشتہ کو پھر مضبوط کر دیا، پہلے تو اقبال کی ماں نے انکار کر دیا اور کہا بڑی بھابی، مولی کو اپنے پتے ہماری خیر اللہ کا دیا سب کچھ ہے، روکھی سوکھی جیسی بھی ہو پیچھے بیٹھ کر کھا لیتے ہیں، لیکن وہ ٹھہری پڑھی لکھی، کرسی والی تو بھلا یہ کیونکر..... اور ویسے مجھے انکار تو نہیں بھابی پھر جب تک کہ ہر دو طرفین کے مزاج قدرے یکساں نہ ہوں تو زندگی کی گاڑی چل کیسے سکتی ہے، کہاں اقبال کا سادہ مزاج اور کہاں نرگس انگریزی چال چلن کی دلدادہ، آگ اور پانی.....“ لیکن نرگس کی خالہ کچھ ایسی قسم کھائی ہوئی تھیں کہ اپنے ارادے سے نہ ٹلیں اور کہا ”بہن ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ، نرگس کے چاؤ چونچلے تو صرف اس وقت تک کے لئے ہیں جب تک باپ کے کلیجے سے لگی چمٹی رہے، جب کسی کی بن بیٹھے گی تو سمجھ لو یہ سب ناز و نخرے ختم“ اقبال کی ماں نے بہت ناں ہوں کیا لیکن بڑی بھاوج کے سامنے کچھ بولتے نہ بنی، آخر بات پکی ہوگئی اور کچھ دن بعد نرگس اور اقبال کو ازدواجی زندگی میں جکڑ دیا گیا۔

——— ۵ ———

شادی کے بعد نرگس کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی آزاد چڑیا کو جو جنگل و بیابان میں بے فکر چہچہاتے پھر رہی ہو قید کر لی گئی، اس کی آزادی سلب کر لی گئی، اسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے دنیا کی تمام مسرتیں اور خوشیاں اس سے چھین لی گئی ہوں، اس کی ساری تمنائیں اور آرزوئیں جو اس کے دل کی عمیق گہرائیوں میں نہاں تھیں اور جس کے وہ اکثر سہانے خواب دیکھا کرتی تھی، ملیامیٹ ہوگئی ہوں، نرگس یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایک طائرِ قفس کی طرح بند پھڑ پھڑاتی رہے جس کا کوئی پرسان حال نہ ہو، وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا حسن اس کی خوبصورتی، اس کی رعنائی کی تعریف صرف اقبال تک ہی محدود رہے بلکہ وہ ساری دنیا کو دعوت نظارہ دینا چاہتی تھی، تاکہ اس کی خوبصورتی اس کی رعنائی چار دانگ عالم میں مشہور ہو اور وہ اسے سن سن کر پھولے نہ سمائے، اقبال کی خاموش طبیعت نے اس کے دل پر بہت برا اثر کیا، نہ گھر کی چہار دیواروں میں نبد رہ کر ننھے ننھے بچوں کی پرورش کرنا نہیں چاہتی تھی، وہ گھنٹوں اس بارے میں سوچا کرتی کہ ابا اور خالہ جان نے مجھ پر بہت بڑا ظلم کیا ہے، انھوں نے میرا ہاتھ کیوں ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دیا جو دنیا کی لطافت اور رنگینیوں سے بے بہرہ ..... بالکل بے بہرہ ہے، انھوں نے ایک ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے جس کی تلافی ہی نہیں ہو سکتی۔ مجھے جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں میں دھکیل دیا گیا، جہاں سے نکلنا بعید از قیاس ہے۔ خدا نے بھی میرے ساتھ بے انصافی برتی ہے، اقبال کو کسی صورت میں بھی میرا شریک حیات نہیں بننا چاہئے تھا، کیا صرف اقبال ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ میٹنگوں، پارٹیوں میں جائے، گھومے، سیر کرے، میں کیوں نہیں جا سکتی، خدا نے مجھے بھی پیر، ہاتھ دیئے ہیں عقل دی ہے، پھر میں کیوں نہ جاؤں، کیوں نہ سب میں حصہ لوں۔ مجھے بھی اس کی اجازت دی جائے، میں اس چہار دیواری میں گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی.... جب چاندنی چاند نی سارے کرہ ارض پر پھیلی ہوئی ہو، اس وقت میں اس سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں..... میں چاہتی ہوں کہ کوئی میرے گلے میں باہیں ڈال دے، میں ندی کے اونچے، نیچے ٹیلوں اور چمکتے ہوئے بالو کے ذرات پر بھاگوں، اور کوئی میرا تعاقب کرے، کوئی مجھے میٹھے اور درد بھرے گیت سنائے، اور میں اسے سن کر مدہوش ہو جاؤں..... میں چاہتی ہوں کہ جب میری مجولیاں مجھے بلانے آئیں تو میں ان کے ساتھ بلا چون و چرا چلی جاؤں، مجھے کیوں ان بندشوں میں گھیر دیا گیا ہے، میں اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں..... مجھے ان سے نفرت.....“ فطرت کے تقاضے ماحول پر حاوی ہو گئے، محبت کو جس نے دل کی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش نہ کی، جس نے صرف ننھے گھڑے اور بناوٹی الفاظ کی ادائیگی کو محبت جانا، تو اس نے محبت کی تحقیر کی، وہ محبت کے حقیقی معنی سے بے بہرہ رہا —— یہ ضرور تھا کہ اقبال کی طبیعت میں خاموشی تھی..... بس گھر، اخبار یا کبھی کبھار کسی قومی جلسہ کی شرکت یہ اس کا معمول تھا، اس کا روزنامچہ تھا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایک شوہر کے فرائض کے انجام دہی سے بے خبر تھا، نہیں، بالکل نہیں، بلکہ اس نے اپنی ہر ممکن کوشش سے نرگس کو خوش رکھنے کی کوشش کی، اقبال کو نرگس سے والہانہ محبت تھی، خاموش محبت کسی سے کہی نہیں جاتی، اسے صرف دل کی آنکھیں ہی دیکھ سکتی ہیں، لیکن نرگس نے اقبال کو کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، کبھی اس نے دل کی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں کہ اقبال کی سچی محبت اقبال کو نرگس پر سے قربان بھی کر سکتی ہے، کاش! نرگس اقبال کو سمجھنے کی کوشش کرتی۔

——— ۶ ———

آجکل کی لڑکیوں میں یہ بات عام طور سے پائی جاتی ہے، کہ اگر وہ میکے میں کچھ کام کاج کی عادی رہیں تو بیاہ ہونے کے بعد سسرال آکر نری کاہل ہو جاتی ہیں، اللہ خیر سے اگر ساس تیّ کٹی اور سنجیدہ مزاج ہیں تو ”بہو بیگم“ نے میدان مار لیا، بس چولہے میں تپی پڑی اور لاڈو گھوڑے چڑھی، گھر کا سارا کام دھندا ساس ہی کے سر، کوئی مرے یا کٹے، کوئی جئے یا رہے۔ اس کی انھیں نہ فکر اور نہ غرض، ساس کرے تو ہو کے لئے، نہ کرے تو ہو کے لئے، اور اگر ساس ضعیف العمر ہو تو آئے دن گھر میں ”تو تو، میں میں“ ہوا کرے، بیات بڑوں

ناراض۔ اتنے محلے والے ناخوش، لوگوں میں تھڑی تھڑی ہو۔ بہوؤں کو چاہیئے کہ ساس، سسر کے بڑھاپے کا سہارا ہوں، ان کے آرام دہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گھر کے کام کاج کو سنبھالیں، بڑے بوڑھوں کی دعائیں لیں، جس سے دنیا اور عقبیٰ دونوں میں راحت ہو۔ نرگس کام دھندوں کو کیا سنبھالتی، اور کیا دیکھتی۔ اسے تو صرف یہ فکر دامنگیر تھی کہ اس کی زندگی سوگوار بن گئی ہے اور وہ اس تلخ زندگی سے کنارہ کش ہو جانا چاہتی تھی، ویسے تو اللہ کا دیا سب کچھ تھا، کھانا، پینا، کپڑا لتا، زر زیور کیونکہ اقبال نے ان دنوں خاصی اچھی ترقی کر لی تھی، اس لئے سب کچھ مہیا کر دیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر ساس کا پیار۔ لیکن نرگس کے لئے یہ سب بے سروسامان دے کیف تھے۔ اقبال کی ماں گو ضعیف العمر تھیں، لیکن کبھی بھی نرگس کے ہاتھ سے ایک گلاس پانی نہیں منگوایا، بلکہ کبھی کبھی چولھے پر کی ہانڈی نرالے دانے ... ہر طرح سے اسے خوش رکھنا چاہتی تھیں، وہ ... سمجھتی تھیں کہ نرگس اپنی ... بھاوج کی ... ۔ نرگس کو ناخوش رکھنا ... دنیا اس کی ماں کی روح کو صدمہ پہنچانا ہے۔

۷

دن ہفتے، مہینے گزرتے گئے، اور اوپر آٹھ ماہ ... مشکل ... بہار آئی اور چلی گئی، خزاں آئی اور تم ... لیکن ... نہ ہوا ... زندگی میں ... نرگس کے خیالات میں۔ ایک دن اقبال دفتر سے چھوٹ کر گھر پہنچا اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد اخبار دیکھ رہا تھا، نرگس آئی اور کہنے لگی۔

اقبال نے حسب معمول نظریں نیچے کئے ہوئے جواب دیا ”کیا ہے؟“

”میں دو تین ماہ کے لئے ابا کے ہاں جاؤں گی، میرا یہاں جی نہیں لگ رہا ہے مجھے۔“

”دل نہیں لگ رہا ہے!“ اقبال نے تعجب سے سر اٹھا کر نرگس کو دیکھتے ہوئے کہا

”ہاں مجھے یہ بے کیف زندگی پل بھر چین لینے نہیں دیتی ہے ....“

”بے کیف زندگی“ اقبال نے اسی لہجہ میں ... نرگس کو دیکھتے ہوئے کہا

”تم مجھے وہاں بھیج دیجئے، میری زندگی شاید وہاں خوشگوار ....“

”مجھے سخت حیرت ہے نرگس کہ کیوں تم وہاں جانے کے لئے مصر ہو، دو مہینے قبل بیس دن رہ کر آئیں، پرسوں پھر تم دو ہفتے کے لئے گئیں، نرگس! خدا کے لئے اگر تمہیں کوئی تکلیف یہاں میری ذات سے پہنچ رہی ہو تو اسے جلد بتاؤ، کیا امی نے کچھ برا بھلا کہا، کیا خانم سے کوئی بات ہو گئی، کیا نوکر تمہارا حکم نہیں مانتی، بولو، تمہیں نہیں معلوم نرگس جب تم یہاں سے چلی جاتی ہو تو یہ گھر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے، اور جب تم یہاں رہتی ہو تو مجھے قدرے سکون ہوتا ہے، لیکن یہ آج مجھے معلوم ہوا کہ تم مجھ سے بیزار ہو، تم چند دن پہلے کھوئی کھوئی سی تھیں، میں نے وجہ دریافت کی لیکن تم بہانہ کر گئیں، آج مجھے اس بھید کا جواب مل گیا .... خیر اگر تم وہاں خوش رہ سکتی ہو تو میں خوشی سے اجازت دیتا ہوں“

نرگس حیران، ششدر، مبہوت، ساکت کھڑی اقبال کا منہ تک رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا کہ حد درجہ خاموش اقبال اتنے سارے الفاظ کہاں سے پا گیا، وہ زیادہ دیر تک ٹھہر نہ سکی، اس کی قوت متخیلہ جواب دے چکی تھی، وہ دوسرے کمرے میں جا پلنگ پر پڑ رہی۔ دوسرے دن ڈولی منگوا سیدھے اپنے ابا کے ہاں چلی آئی۔ نرگس کا اچانک ڈولی کروا کر چلا آنا کچھ ساعت تک نرگس کے ابا کو عالم حیرت میں رکھا لیکن نرگس کے یہ کہنے پر کہ ”ابا آپ کی یاد مجھے تڑپانے لگی اور بے چین سی ہو گئی، بس ڈولی کروا کر چلی آئی“ نرگس کے ابا کے سارے شکوک رفع دفع ہو گئے۔ زمانہ نے کروٹ لی، نرگس کے اپنے میکے جانے کے کچھ دن بعد اقبال کو ایک قومی جلسہ کی تقریر میں گرفتار کر لیا گیا اور شہر کے سنٹرل جیل میں بھیج دیا گیا — اقبال کے نظر بند ہونے کے بعد، نرگس کا اپنے میکے ہی میں رہنا اور سسرال نہ جانا کوئی معمولی بات نہ تھی، محلے والوں میں کانا پھوسی شروع ہو گئی، جتنے منہ اتنی باتیں ہونے لگیں اری بہنو دیکھتی ہو، آجکل کی لڑکیوں کو ان کے والدین ... انگریزی پڑھا کر آزادی کیا دیتے ہیں کہ ان کے گلے میں لعنت اور بدنامی کا تمغہ باندھ دیتے ہیں .. موئی گوریاں ایسی ہی بے ساختہ ہیں، توبہ توبہ، نہ کسی کا ادب نہ ... کا پاس .... اس نرگس کو دیکھو اتنا ... جیل میں ہے، ساس اور نند رو رو کر ... بلکان ہو رہی ہیں، اور ... اپنے میکے بیٹھی گلچھرے اڑا رہی ہے، جانے کیا جواب دے گی اللہ کے گھر ... اور ... کرتی ہے ان کے ساتھ گھوما کرتی ہے جیسے یہ سب اس ... ہیں، اور میں کہوں میاں عابد کی صاحبزادی جمو تو تھی خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ... کی وہ وہ خدمتیں کی ہیں کہ کیا کوئی ایسا کرے گا، آخر دیکھو تو محلہ بھر اس کا گن گا رہا ہے .... اے ہاں سچ ہے خدا چھیوں کو نہیں دیکھتا .. ہاں بولا کی آنکھ جاڑے بھاری ... اور یہ نرگس کے ابا کو کیا ہو گیا ہے، یہ کچھ ... نہیں ... کہتے کیوں نہیں آنکھوں دیکھی مکھی نگلی نہیں جاتی بہت کچھ کہا پر کوئی سنے، وہ تو نیچے پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور سر پکڑ کر ہائے ہائے کر رہے ہیں کہ نرگس تو اب دو لڑکی نہیں .... مجھے تو ایسا معلوم پڑتا ہے کہ داروغہ جی کا لڑکا جو بار بار ... کرتا ہے، گھر پر کچھ دال میں کالا ہے اور دو چار مرتبہ تو میں نے کل گڑی کو باتیں کرتے بھی دیکھا .. اے واہ ری نرگس خوب ڈھنگ نکالے ہیں، خوب روشن کر رہی ہے خاندان کا نام ... اے خدا کرے تجھے ڈھائی گھڑی کی موت آئے —

۸

نرگس کی مغربی تعلیم اور آزاد طبیعت نے آخر رنگ دکھلایا، اس نے اپنی زندگی خوشگوار بنانے کے ذریعے ڈھونڈ نکالے تھے، اور اب شہر کے داروغہ جی کے فرزند ارجمند کے ہتھے چڑھی ہوئی تھی۔

”آؤ نرگس آج سنٹرل باغ کی سیر کر آئیں“

”چلو“

شہر کے سنٹرل جیل کے باغ کو اگر فردوس بریں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، جیل کا پھاٹک کھلا، نرگس اور داروغہ جی کے صاحبزادے اندر باغ کے داخل ہوئے ”یہ دیکھو نرگس یہ گلاب کے پھولوں کا جھنڈ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے اور اس پھول کو دیکھو

(بقیہ صفحہ ۵۲ پر)

خمسہ

بر غزلِ اعلیٰحضرت راجہ محمود آباد اسٹیٹ

کہیں لیلائے غم کا پردۂ محمل نہ بن جائے   کہیں راہِ وفا کی پُرخطر منزل نہ بن جائے
کہیں ما نگاہِ ناوک تو قاتل نہ بن جائے   تڑپ کر یادگارِ حسرتِ بسمل نہ بن جائے
نظر کرتا ہوں نہ ذرہ پر کہیں یہ دل نہ بن جائے

یہ کیوں سنگ در پہ یہاں ہو کر تو میری جا پر   جو ہونا تھا ہوا چھوڑ دو مجھے مجبورِ قسمت پر
نگاہ اتنی تو چاہیئے عرض محبت پر   کرو کیوں منحصر دیدار فردائے قیامت پر
جو آساں آج ہے وہ کل کہیں مشکل نہ ہو جائے

مری جان حزیں کیا کیا کری ابتدا ہی پر   مری آنکھوں سے ناکامی لہو بن کے بہتی ہے
خلش اس فکر کی دن رات سینے میں رہتی ہے   سفر ہی در کا اور ناتوانی مجھ سے کہتی ہے
جہاں تو تھک کے بیٹھے بس وہیں منزل نہ بن جائے

تجھے کو یہ کہ ذرہ ذرہ میں انداز وحشت تھا   دل برباد کی بربادیوں کا خاص منظر تھا
کہاں تک ضبط کرتا اب مری ہمت سے باہر تھا   سکوں ملتا تو لطفِ زندگی کھونا یہی ڈر تھا
کہ موجِ اضطرابِ دل کہیں ساحل نہ بن جائے

کہا دل کو مرے مجبورِ جب بیدادِ الفت نے   تبسم ہی سے اک حیلہ کیا اس فتنہ قامت نے
ستایا ہیں یہ اندازِ ستم تیری محبت نے   یہ کہہ کر پھیر لی مجھ سے نظر اس بے مروت نے
نگاہِ ناز تیری آرزوئے دل نہ بن جائے

چلا جاتا ہوں کس سمت میں ایسے کچھ دیکھتا بھی ہو   ترا نقش قدم اس حد میں تیرا رہنما بھی ہو
یہ اندازِ جنوں تو ہے کوئی شرم و حیا بھی ہے   سنبھل اے قیس جذبِ عشق کی کچھ انتہا بھی ہو
یہ غم لیلیٰ نہ بن جائے یہ دل مجنوں نہ بن جائے

اُدھر تو آتشِ فرقت برابر مشتعل میری   اُدھر آغاز تا انجام قسمت پا بہ گل میری
معاذ اللہ محرومی اور اتنی مستقل میری   جلا کر حسن نے برباد کر دی خاکِ دل میری
یہ ڈر تھا بجھ کے بھی شمعِ سرِ منزل نہ بن جائے

کوئی امید پوری ہو بھلا کیا اس ستمگر سے   کہ جس سے بات کرنے کیلئے بھی عمر بھر ترسے
زبانِ شکوہ کی ہلتی اُن بن سنبھال سر او مقدر سے   خموشی میں گزاری زندگی عشقِ ان کی ڈر سے
کہ وہ آہ مجنوں پردۂ محمل نہ بن جائے

یہاں ربطؔ خاموشی ہے رازِ آئینِ الفت کا   مگر ہیں بھی ہے اندیشہ سوزِ دروں پیدا
کرے خون گرمی الفتِ غم کی سعی زیر پردا   نہ ہو محبوب داغ دامنِ دل ضبطِ شکوہ کا
نشانہ زخم کا بڑھ کر نمانہ کہیں نہ ہو جائے

ربطؔ ظہری

نظم

انتظار

خموشیوں سے یہ کہہ رہی ہے، اداس راہوں کی چشم حیران
ابھی تو وہ کارواں نہ گزرا کہ جس کے غم میں ہے اشک افشاں
یہ مہر و مہ یہ چمکتے تارے، یہ سحر آگیں حسین نظارے،
یہ ریگ زاروں کے تپتے ذرے، یہ بہتی ندی کے مڑتے دھارے
ہیں جذب کب سے خموشیوں میں، ہزاروں چیخیں ہزاروں آہیں۔
فضا کے سینے میں گھل چکی ہیں، کروڑوں درد آفریں کراہیں
تڑپ چکی ہیں، تڑپ رہی ہیں، ہزاروں لاشیں اسی زمیں پر
ہے ذرے ذرے میں خونِ انساں، جو بول اٹھتا ہے نور پا کر۔
مگر یہ کیا ہے کہ پربتوں کی، وہ اونچی اونچی سی چوٹیاں اب
جبیں پہ افشاں لگا چکی ہیں، مگر ہیں پھر بھی سکوت بر لب
اور ان کے اس پار کچھ ستارے، فضا میں ربط بنا رہے ہیں
اداس راہوں کی خامشی کو، جو زمزمے سے سنا رہے ہیں۔
اداس راہیں مگر یہ اب تک، ہزاروں صدیوں سے سوچتی ہیں
نہ جانے گزرے گا کارواں کب، یہاں تو نظریں بھی تھک چکی ہیں

عبادت بریلوی

لام شکنی کے بعد

لوک راج کھنہ

تاریخ انسانی کی سب سے بڑی لڑائی ختم ہو گئی ہے۔ وہ لاکھوں اور کروڑوں مرد اور عورتیں جنہوں نے اتحادیوں کو فتح پانے میں مدد دی، اس ہولناک جنگ کے اختتام پر نہ صرف خوش ہیں بلکہ انکی نظریں ایک ایسی نئی دنیا کی تلاش میں ہیں جس میں ہر شخص کو کام کاج کی اور رہن سہن کی مکمل آزادی ہو گی۔ جنگ کے میدانوں سے سپاہی عنقریب بڑی تعداد میں واپس آنے والے ہیں۔ شہری زندگی میں داخل ہوتے ہوئے انہیں امید ہو گی کہ ان کو نئی نئی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔ اتحادیوں کی اس فتح میں ہندوستانی فوج کا حصہ کچھ کم نہیں ہے۔ ہندوستانی سپاہیوں نے بہادری، رہنمائی، ذمہ داری اور اتحاد عمل کی خصوصیات میں امتیاز حاصل کیا۔ نئی نئی صنعتوں اور نئے ہنروں میں مہارت حاصل کی، تنظیم کے نئے طریقے سیکھے اور مختلف تمدن کے آدمیوں سے مل جل کرنے نئے طور طریق اور فکر و عمل کی نئی نئی راہیں جانیں۔ کیا امن ہو جانے پر یہ سب کیا دھرا یونہی ضائع ہو جائے گا؟ یقیناً نہیں۔ مرکزی حکومت اور صوبجاتی حکومتوں نے ان سپاہیوں کے مستقبل کے لئے بہت سے منصوبے سوچے ہیں۔

تخفیف کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ اکثر سپاہی یہ چاہیں گے کہ جہاں تک ہو سکے وہ بدستور اپنی اپنی جگہوں پر قائم رہیں لیکن اس بڑھی ہوئی فوج کو صرف زمانۂ امن کی ضروریات کے مطابق کم کرنا بھی لازمی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ فی الحال ہندوستانی فوج میں ساڑھے آٹھ لاکھ سپاہی شامل ہیں جن میں ایک لاکھ تیس ہزار رنگروٹ ہیں۔ ابتداء میں تخفیف کو آٹھ مہینوں پر پھیلایا جائے گا اور یہ مدت یکم اکتوبر سے شروع ہو گئی ہے۔ سب سے پہلے رنگروٹوں کو جواب دیا جائے گا۔ پھر تربیت یافتہ سپاہی اس ترتیب میں علیحدہ کئے جائیں گے:۔

(۱) وہ لوگ جو خود علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔ (۲) وہ جو پنشن کے مستحق ہیں۔ (۳) وہ جن کو طبی بنا پر علیحدہ کرنا چاہیے۔ (۴) وہ جوان مذکورہ صورتوں کے علاوہ بھی غیر ضروری ہوں۔

تخفیف کے ہر مرکز پر تنظیم جدید کی مجلس مشاورت کے عہدیدار موجود ہوں گے جو تخفیف شدہ سپاہیوں کی خواہشات سنیں اور مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے مقاصد میں کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو ریزیٹلمنٹ کے معاش بہم رسانی کے دفتروں" سے مدد ملے گی۔ یہ دفتر بھرتی کے ایک سو بیرہ دفتروں سے بنائے گئے ہیں اور تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان دفتروں کا مقصد یہ ہے کہ یہ معاش تلاش کرنے والوں اور ملازموں کے ضرورتمندوں کے درمیان ایک باقاعدہ رشتہ قائم کر دیں اور تخفیف شدہ سپاہیوں کو ان کی قابلیت کے مطابق معاش دلا سکیں۔ اطلاعات کا خاص ذریعہ وہ لفافے ہوں گے جو تخفیف کے مرکزوں پر پھرے جاتے ہیں اور جن میں ہر تخفیف شدہ مرد اور عورت کے تمام ضروری حالات درج ہوتے ہیں۔

جن لوگوں نے جنگی خدمات انجام دی ہیں ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے مرکزی حکومت اور صوبجاتی حکومتوں میں بہت سی جگہیں خالی رکھی گئی ہیں جن میں سے اکثر انہی جنگی خدمات انجام دینے والوں کو دی جائیں گی۔ دستکاری کی تعلیم بھی ضرورتمندوں کو دی جا سکے گی۔ اس قسم کی تربیت گاہوں میں تقریری، تجارتی، انجنیری، تعمیراتی، زراعتی، صنعتی اور معاشرتی کاروبار کی بھی تعلیم دی جائے گی۔ یہ تعلیم مفت ہی نہیں ہو گی بلکہ کام سیکھنے والوں کو وظیفے بھی دیئے جایا کریں گے۔ ناکارہ آدمیوں کو صنعتی تربیت کے لئے خاص خاص سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی اور مناسب حال کام کاج دلانے کا بھی انتظام کیا جائے گا۔

فوجی خدمات سے سبکدوش کئے ہوئے مردوں اور عورتوں کے بارے میں حکومت ہند نے جو تجاویز تیار کی ہیں وہ ایک کتابچہ میں درج ہیں جس کا نام ہے "تخفیف اور نیا انتظام" یہ ہندوستان کے "محکمہ فلاح عامہ" کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس کتابچے کے مطالعہ سے دریافت ہوا ہے کہ لام شکنی کی طرف سب سے پہلا قدم یہ ہو گا کہ تخفیف کے لئے نامزد ہونے والوں کے واسطے تعلیمی اور پیشہ ورانہ مختصر تعلیم کا انتظام کیا جائے گا جن لوگوں کی انگریزی کی استعداد کافی ہو گی ان کو موقع دیا جائے گا کہ وہ "نیول ہائر ایجوکیشنل ٹیسٹ" یا "انڈین آرمی اسپیشل سرٹیفکیٹ" کے امتحان میں شرکت کریں۔ ان دونوں امتحانوں کو اکثر یونیورسٹیاں میٹرکیولیشن کے برابر تسلیم کرتی ہیں۔ دستکاروں کو موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنی صنعتی معلومات کو فوجی کارخانوں میں نئے سرے سے تازہ کر لیں۔ جن لوگوں کا تعلیمی سلسلہ کسی وجہ سے منقطع ہو گیا تھا ان میں سے بعض کو غیر فوجی ٹریننگ مفت حاصل کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ سبکدوشی کے بعد کی ٹریننگ میں بہت سے مضامین شامل ہوں گے مثلاً انجنیری اور طرح طرح کی دستکاریاں یہ فائدے جنگی انعامات اور با تنخواہ چھٹی کے علاوہ ہیں۔ جن عورتوں نے فوجی خدمات انجام دی ہیں ان کو علاوہ عام سہولتوں کے امور خانہ داری اور اقتصادیات کی تعلیم دی جائیگی۔

تنظیم بعد از جنگ کی عام تجاویز کے علاوہ جو اس وقت حکومت ہند کے زیر غور ہیں ہر صوبجاتی حکومت کے پاس اپنے ذاتی فنڈ بھی ہیں جن میں بہت سا روپیہ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں خرچ ہو گا۔ ان تجویزوں سے تخفیف شدہ فوجیوں کو بھی معاش حاصل کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آئے گا۔ حکومت پنجاب نے گرام سدھار کی ایک بہت بڑی تجویز تیار کی ہے جس کے طفیل ہزاروں ایسے بیکار فوجیوں کو ملازمتیں مل جائیں گی اور صوبے کی عام مالی حالت بھی بہتر ہو جائے گی۔ مدراس میں کروڑوں روپیہ کے خرچ سے سڑکیں بننے کی تجویز تیار ہو گئی ہے۔ ان سڑکوں سے نہ صرف یہ کہ صوبہ کے مختلف مقامات عمدہ اور بڑی بڑی سڑکوں سے آپس میں مل جائیں گے بلکہ فوج سے واپس آئے ہوئے ہزاروں سپاہیوں کی معاش کا ذریعہ بھی نکل آئے گا۔ چونکہ اکثر مدراسی سپاہی موٹر ڈرائیور ہیں۔ اس لئے ان میں سے اکثر سڑکیں بنانے کے کام میں ضرور مفید ثابت ہوں گے۔ اس سلسلہ میں ایک بالکل نئی اور بہت ہی اہم بات یہ ہے کہ تعمیرات کا یہ کام عام ٹھیکہ داروں کو نہیں

دیا جائے گا بلکہ مزدور سبھاؤں کے زیر نگرانی ہوگا۔ ان سبھاؤں کے ممبر فوج سے تخفیف شدہ ہی ہوں گے۔ ان کاموں سے جو منافع ہوگا وہ انہی لوگوں کی جیبوں میں جائے گا۔ حکومت بمبئی نے ایک پندرہ سالہ اسکیم بنائی ہے جس کے تین حصے ہیں۔ اس اسکیم میں جہاں زراعت، چھوٹی دستکاریوں، تعلیم، سڑکوں اور صحتِ عامہ کے متعلق منصوبہ بندی کی گئی ہے وہاں فوج سے تخفیف شدہ سپاہیوں کی فلاح کے بارے میں بھی تجویزیں سوچی گئی ہیں۔ غرض ہندوستان کے ہر صوبہ نے تنظیم بعد از جنگ کی منصوبہ بندیوں میں فوجی خدمات سے سبکدوش شدہ سپاہیوں کے انتظام کو فوقیت دی ہے۔

بعض صوبوں اور ریاستوں نے اعلان کیا ہے کہ جن سپاہیوں نے دوران جنگ میں خاص امتیاز حاصل کئے ہیں ان کو زمینیں بطور انعام دی جائیں گی بعض حکومتوں نے فوج سے نکلے ہوؤں کی نوآبادیات قائم کرنے کی تجویزیں بنائی ہیں۔ صوبہ سرحد کی حکومت نے طے کیا ہے کہ اراضی کی صورت میں عطیات کے علاوہ تعلیم و تربیت اور علاج و معالجہ کے سلسلہ میں بھی رعایتیں دی جائیں گی حکومت پنجاب نے اعلان کیا ہے کہ سو روپیہ سالانہ آمدنی کی جاگیر ہر اس شخص کو دی جائے گی جس نے کم از کم تین بیٹوں کو لام پر بھیجا تھا۔

ان کے علاوہ سرکاری حکام نے اور بھی بہت سی ایسی تجویزیں تیار کی ہیں جن پر عملدرآمد کرنے کے سلسلہ میں حکومت کو عوام کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ملک کی بھلائی اسی میں ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے جنگ کے اختتام سے ملک کی عام اقتصادی حالت میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ لڑائی کے چھ سالوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ ہمارے ملک میں بیشمار چھوٹی بڑی دستکاریاں ابھر آئی ہیں اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے نئی نئی صنعتیں سیکھ لی ہیں۔ حکومت نے ان نئی دستکاریوں کے تحفظ کا کام اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ ہزاروں فوجیوں کو اس کا موقع مل سکتا ہے کہ وہ ان صنعتوں میں کام پر لگ جائیں۔ جو سپاہی زراعت میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کی مرضی کا کام محکمہ آبپاشی میں نکل آئے گا۔ جنگ اور امن کا درمیانی زمانہ واقعی مشکوک ہوتا ہے لیکن ہم کو زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اور حکام ہماری تمام مشکلات اور مسئلوں کی نزاکت سے باخبر ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ گتھیاں جنگی پیچیدگیوں سے زیادہ گنجلک نہیں ہیں ؛

ایک جدید تر شاعر

ساحر لدھیانوی

ندیم قاسمی

انسان کی شدت احساس نے شاعری کو جنم دیا۔ تفکر کی گہرائی نے اسے پروان چڑھایا، صوتی آہنگ نے اسے شباب جاوداں بخشا۔ اور مشاہدے کی ہمہ گیری نیز ماحول کی اثر آفرینی نے اس میں رنگ بھرے۔ آپ زمانۂ حال سے تدریجاً پیچھے ہٹتے جائیں، یا قرنوں تک نکل جائیں۔ آپ کو ہر زمانہ کی شاعری میں یہی سلسلہ نمایاں نظر آئے گا۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو جملہ فنون لطیفہ اسی مختصر سے سلسلے کی تخلیقات معلوم ہوتے ہیں۔ شاعری کبھی نقادوں کی گھڑی ہوئی اصطلاحات کی محتاج نہیں رہی۔ ہیئت کے بے شمار نمونے رائج ہوئے اور ناپید ہو گئے لیکن اگر کوئی چیز قائم و دائم رہی، تو وہ شدت احساس، تفکر کی گہرائی، صوتی آہنگ، مشاہدے کی ہمہ گیری اور ماحول کی اثر آفرینی ہے۔

اس مختصر سی تمہید کا مقصد محض یہ ہے کہ ساحر لدھیانوی کی شاعری میں جن خصوصیات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں احساس کی شدت بہت نمایاں ہے اور چونکہ ساحر کے فن کی بنیادیں صالح اور خلوص بھرے احساس پر استوار ہیں۔ اس لئے اس کے ہر شعر میں تفکر، آہنگ، مشاہدہ اور ماحول کے اثرات موجود ہیں۔ اور انھیں کے باعث وہ دور جدید کے نوجوان شعرا میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔

اردو شعرا کے موجودہ دور کو اکثر نقادوں نے تجرباتی دور کہا ہے۔ تجربے کی افادیت سے مجھے انکار نہیں کیونکہ بعض تجربات اہل صداقتیں بن جاتے ہیں۔ اور دنیا، تمدن تک ان کے سہارے چلتی رہتی ہے حقیقت میں جدید تہذیب کا یہ عروج بھی مختلف قسم کے تجربات کی ایک کڑی ہے اور اگر ہر تجربے کو اپنا لیا جائے تو عین ممکن ہے کہ عروج کا یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہو، اور امکانات کے دائرے وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جائیں۔ دراصل اس ضمن میں سب سے خطرناک مسئلہ نامکمل تجربات کا تسلسل ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ گذشتہ دس پندرہ برس میں بے شمار تجربات کئے گئے۔ نظم کی نئی نئی ہیئتیں نکالی گئیں۔ کسی نے ماضی کی روایات سے علی الاعلان بغاوت کر دی۔ کسی نے معمولی سی تبدیلی پر اکتفا کی۔ کوئی نظم کی پرانی صورتوں میں نیا مواد پیش کرنے میں کوشاں رہا۔ کسی نے نفسیاتی معموں کو معموں ہی میں نظم کر ڈالا۔ کسی نے جنسی ترغیبات کے کھلم کھلا ذکر سے گھبرا کر انتہا درجہ کے مبہم استعاروں کی پناہ لی۔ الغرض بے شمار پینترے بدلے گئے اور بدلے جا رہے ہیں، لیکن کسی تجربے نے صداقت کی صورت اختیار نہ کی بلکہ ہر تجربہ مزید تجربات کے بوجھ تلے بودا اور ہیچ ہوتا گیا۔ اور آجکل یہ حالت ہے کہ اردو شاعری کا ہیئتی نظام افراتفری کے عالم میں ہے۔ دور جدید کے چند ممتاز شعرا کا کلام دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے یہ تمام حضرات ایک ہی مرکز سے وابستہ ہیں مگر ان کی منزلیں بلکہ راہیں تک متعین نہیں۔ نصب العین کا فقدان ہے اور وہ شاعری جس نے جمہور کی بیداری کا بیڑا اٹھایا تھا، ابہام اور بے راہ روی کا ایک طومار بن کر رہ گئی ہے۔ جب تجربات کا یہ عالم ہو تو ضروری امر ہے کہ گذشتہ دور کی صورتوں میں حسب ضرورت تبدیلیوں کے بعد چند ہیئتیں معین کر لی جائیں۔ کیونکہ تعین ترقی کی کلید ہے اور ہر تعین مستقبل میں ایک نئے تجربہ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

ساتھ ہی یہ امر بھی قابل غور ہے کہ نئی نئی ہیئتوں کے جنون میں کئی شعرا نے معنی کو پس پشت ڈال دیا ہے، حالانکہ ادب میں ہر نوع کا اجتہاد سب سے اول معنی سے شروع ہونا چاہیئے۔ معنی یا مواد یا موضوع کے مقابلے میں ہیئت ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور اگر کہنے والے کا احساس پختہ اور تخیل صاف ستھرا اور بلند ہے، تو معنی خود بخود اپنی پسند کی ہیئت میں جلوہ گر ہوتے رہیں گے۔

نظم کی جدید سے جدید تر صورتیں صرف اس لئے ایجاد کی جاتی ہیں کہ شاعر کی قوت بیان کسی قسم کی رکاوٹ محسوس نہ کرے، اور موضوع کے جو نشیب و فراز، تاثرات اور نتائج اس کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ وہ براہ راست پڑھنے والے کے دل میں اتر جائیں۔ لیکن اردو شاعری میں ہیئتی انقلاب نے (گنتی کی مستثنیات کو چھوڑ کر) اکثر ایسے شاعر پیدا کئے ہیں جنھوں نے کسی سے فرائیڈ کے چند تجربات اور ان کی نفسیاتی تاویلوں کا ذکر سن لیا ہے اور وہ اپنے ہر ذہنی ہیجان، اپنی ہر جسمانی امنگ، اپنی ہر جنسی بیقراری کو سنی سنائی نفسیات کے گورکھ دھندے میں چھپا کر اسی کیفیت کی حالت میں عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ ان شعرا کی انتہا درجہ کی مبہم نظموں نے جدید اردو شاعری میں ایسا طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا ہے کہ اب شاعری بچوں کا کھیل سمجھی جانے لگی ہے مصرعوں کو کتر کر، توڑ موڑ کر، کھینچ تان کر، دبا کر، پھیلا کر یا توانی سے چھٹکارا حاصل کر کے چند الفاظ میں ایک دور از کار موضوع پیش کیا جاتا ہے۔ اس دعوے کے ساتھ کہ اگر ہماری شاعری مبہم ہے تو صرف اس لئے کہ ہمارا ماحول مبہم ہے۔ ہمارا مذہب ہمارا قانون، ہماری سماج ہماری حکومت — سب کچھ ابہام ہی ابہام ہے، اور انسان چونکہ سماج اور مذہب سے پیچھا نہیں چھڑا سکا، اور شاعر بھی انسان ہے اس لئے شاعر کا مبہم ہونا حیرت انگیز نہیں — کم از کم میرے نزدیک جدید شاعری میں منتشر نظموں کے ابہام کی یہ تاویل قطعی طور پر طفلانہ اندازی ہے۔ اگر شاعر ابہام سے پیچھا نہیں چھڑا سکا، اگر اس کے اشعار پڑھنے سے قاری کو دقت محسوس ہوتی ہے۔ تو وہ شاعری ہی کیوں کرتا ہے۔ اگر وہ سماجی اور قانونی دھندلکوں میں اس حد تک کھو چکا ہے کہ محض اپنی مجبوریوں کے قصے کو موضوع شاعری بنانے پر تل گیا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکی فنی قوتیں محدود ہیں۔

ان جملہ معترضات کے علاوہ ایک اور "ادبی فتنہ" نے اردو شاعری میں بہت عروج حاصل کیا ہے اور وہ ہنگامی شاعری ہے۔ جوش ملیح آبادی کی انقلابی نظموں کی اشاعت کے بعد اس فتنہ کی ابتدا ہوئی، اور تمام ہندوستان کا شعر

صوبجات متحدہ میں اس گرجتی اور دمانی ہوئی شاعری نے وہ عروج پکڑا کہ اچھے اچھے سخنور اس کی رو میں بہ گئے۔ آج بھی جبکہ سستی شاعری کافی حد تک زوال پذیر ہو چکی ہے۔ ہندوستان کے کسی نہ کسی گوشے سے اس "توڑ پھوڑ" کا نعرہ سنائی دیتا ہے لیکن جدید شعرا کے صاحب نظر طبقے نے جس فکری شاعری کو رواج دیا ہے، وہ اب ان وعدوں اور غلغلوں کو بہت دیر تک زندہ نہیں رہنے دے گی۔ اگر یہ شاعری کسی حد تک بلند ہو سکتی، افراط و تفریط کے نازک خطوط کو دیکھ سکتی، اور صرف جوش کی تقلید ہی کو کعبۂ مقصود نہ بناتی، تو اسے برداشت کیا جا سکتا تھا، مگر مصیبت یہ تھی کہ ان شعرا نے صرف جوش کو دیکھا، وہ جوش کی انفرادیت، زور بیان اور شدت احساس کو نہ دیکھ سکے اور اس لئے چند قیمتی برس اس سطحی شاعری میں گنوا دیئے۔

نئی تعلیم، نئے تجربے اور نئے زاوئے اگر ایک نئی اور شاداب زندگی کے حصول میں ہمارے لئے ممد ثابت ہوں تو ان کی ترقی، ترویج اور عروج پر کون کافر مسرور نہ ہوگا لیکن اگر ہر نیا تجربہ، نئی بدعت اپنے ہمراہ لائے تو اسے ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اردو ادب کا جدید دور بے شمار خوبیوں اور بہت سی بدعتوں کا ایک مرکب ہے۔ لیکن مدتوں کی محکومی سے ہماری قوتیں اتنی شل ہو چکی ہیں کہ ہم خوبی و بدعت میں امتیاز نہیں کر سکتے، اور اگر کوئی ننھا سا امتیاز محسوس بھی ہوتا ہے تو قانون، پریس، یا سماج کے خوف سے ذہنوں ہی میں گھٹ گھٹ کر نابود ہو جاتا ہے۔ عجیب غریب استعاروں میں ناگفتہ بہ جنسی حرکات کی تفصیلیں، نہایت بھونڈی تمثیلوں میں جنگ پر اظہار خیال — اور ابہام کی وہ شدت کہ اگر خود شاعر نظم کا مطلب نہ سمجھائے تو پڑھنے والے اس بھول بھلیاں میں مرتے دم تک سر پٹختے رہ جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ سطحی شاعری کا فروغ، اردو زبان کی پاکیزگی سے علی الاعلان بے پروائی، یہ اور اس قسم کی ان گنت دوسری بدعتیں اردو شاعری میں فروغ پا چکی ہیں۔ لیکن مقام تشکر ہے کہ چند شعرا جن کی انفرادیت زندہ ہے، اور جو صرف اپنے دماغ سے سوچتے ہیں، اردو شاعری کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیئے چلے جا رہے ہیں، اور ان شعرا میں ہمارا نیا مگر پختہ کار شاعر ساحر بھی شامل ہے۔

ساحر نے ہیئت کے معاملہ میں کسی قسم کا اجتہاد نہیں کیا، اسکی بیشتر نظمیں پابند ہیں اور کوئی ایک آدھ نظم اس پابندی سے آزاد بھی ہے، تو اس کے پڑھنے سے فوراً اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نظم کا شاعر قافیہ اور ردیف کے حسن اور ترنم کا قائل ہے، ساحر نے ہیئت کے بجائے معنی اور موضوع اور سب سے زیادہ انداز بیان میں اجتہاد کیا ہے جس طرح میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اسکی شاعری کی بنیاد شدت احساس پر ہے، اور میرے خیال میں اس کے اسلوب کا حسن بھی شدید احساس ہی سے عبارت ہے، ساتھ ہی اسے ابہام سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ خود ایک جگہ کہتا ہے؎

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے، وہ لوٹا رہا ہوں میں

ان تجربات و حوادث کا ابہام سے کوئی تعلق نہیں۔ ابہام صرف ذہنی [illegible] پیدا ہوتا ہے، جہاں ذاتی تجربات کا فقدان ہو، اور کتابی علم موضوع شاعری ہو۔

ساحر کی شاعری آج کی شاعری ہے۔ اس کے تین ادوار مقرر کئے جا سکتے ہیں رومان — حقیقت — اور رومان، پہلا رومان ابتدائے شباب کا کوئی سانحہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد حقیقت کا دور آتا ہے جس پر مارکسی تعلیمات کا اثر بہت نمایاں ہے تیسرا دور بھی کسی رومان ہی سے وابستہ نظر آتا ہے، لیکن اس میں نئی قسم کی اٹھان ہے جو پہلے رومانی دور سے قطعاً مختلف ہے۔ آخری دور کی یہ رومانی کیفیت ابھی عروج تک نہیں پہنچی اور ساحر حقیقت اور رومان کے دوراہے پر کھڑا زندگی کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی قدروں کا جائزہ لے رہا ہے۔ البتہ یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ دوسری راہ سے نفرت نہیں کرتا، بلکہ اس نے صرف ایک جذباتی افتاد کے زیر اثر رومانی راہ اختیار کر لی ہے۔ وہ چاہے بھی تو حقیقت سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔ وہ حقیقت جو اس نے مارکس اور اس کے عظیم المرتبت جانشینوں کی تعلیمات سے اخذ کی، اور جس کو فن کے سانچے میں ڈھال کر واضح تر کر دینا اسکا مقصد حیات ہے۔

دنیا کی ہر زبان کے ادب عالیہ کا موضوع عموماً محبت رہا ہے، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف ادب ہی نہیں، بلکہ ہماری زندگی کا نظام کسی نہ کسی محبت کا مرہون منت ہے اور جنسی محبت ان سب میں ممتاز اور نمایاں رہی ہے۔ ابتدائے محبت کی دلنشین رنگینیاں ہر سچے شاعر کے ابتدائی کلام میں موجود ہوتی ہیں لیکن یہ دیکھ کر ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ساحر شروع ہی سے محبت کی تلخیوں کا قصہ چھیڑ دیتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ بہت دیر رومان کے دھندلکوں میں نہیں رہا اور حقائق کے ان کھلے میدانوں میں نکل آیا جہاں قدم قدم پر خلاف فطرت معاشرتی مفروضوں اور خود ساختہ اخلاقی معیاروں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے اور اگر احساس زندہ ہو تو جنگ بھی ہوتی ہے، اور سیاست، معاشرت اور مذہب کی کہنہ اقدار کے ملبے سے نئی، جاندار اور پائندہ اقدار کا خمیر اٹھانا پڑتا ہے۔

جوانی اور محبت کے ابتدائی دور میں ہر شاعر عشق و محبت کی رنگینیوں اور سرشاریوں کے گیت گاتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ ساحر ابتدا ہی سے محبت کی انتہائی تلخیوں کی ترجمانی کرنے لگا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ہمارے نوجوان شعرا کے "معمول" کے خلاف ساحر کی ذہانت تیزی سے ابھر آئی اور اسے ایک ایسا شعر کہنا پڑا جو صرف ایک جہاں دیدہ اور پختہ کار شاعر ہی کہہ سکتا تھا:—

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

ساحر کی محبت ایک سرکش کی محبت ہے۔ وہ محبت جو بورژوا طبقے کی بے شمار اور نفرت انگیز حد بندیوں کی وجہ سے پنپ نہ سکی اور وہ اپنی محبت کی شدت اور اپنی محبوبہ کی بے بسی سے متاثر ہو کر حقائق حیات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے پر مجبور ہو گیا میں اسے مجبوری ہی کہوں گا کیونکہ انسانی جبلت کا فوری انقلاب ناممکن ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی سخت مجبوری کا مرہون منت نہ ہو۔ اسکی ابتدائی نظموں میں بار بار یاسیو

اور مجبوریوں کی تہوں کے نیچے سے تجدیدِ محبت کا ہنگامہ بلند ہوتا ہے لیکن تلخیوں نے اسکے ذہن کو اس شدت سے محصور کر رکھا ہے کہ وہ کسی سہارے پر بھروسہ نہیں کر سکتا، اور پکار اٹھتا ہے:

میری محبوب، یہ ہنگامۂ تجدیدِ وفا — میری افسردہ جوانی کے لئے راس نہیں
میں نے جو پھول چُنے تھے ترے قدموں کیلئے — اُن کا دھندلا سا تصوّر بھی مرے پاس نہیں

اس نفسیاتی تسلسل کی دوسری کڑی ساحر کی فکری شاعری ہے، جب محبت کا انجام "سوقح" ہو، تو ضروری امر ہے کہ محبت فروعی حیثیت اختیار کر کے پیچھے ہٹ جائے اور زندگی کے دیگر بے شمار بند حصوں سے سابقہ پڑے، دوسرے دور کی نظموں میں وہ اکثر کھویا کھویا اور سوچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ سب سے اول وہ محبت کے متعلق سوچتا ہے لیکن جب اپنے ذہنی انقلاب کی روشنی میں اسے پرکھتا ہے، تو یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے:-

سوچتا ہوں کہ محبت ہے جنونِ رُسوا
چند بیکار سے بیہودہ خیالوں کا ہجوم

اگرچہ اُسے اقرار ہے کہ:-

نہ ہی شعلے مرے سینے میں نہاں ہیں لیکن

سَاحر کے تجربات نہایت تلخ ہیں، اسلئے وہ عشق و محبت کے پوشیدہ شعلوں کو بھڑکانے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ یہ کہہ کر انھیں ایک حد تک بجھا دیتا ہے:-

آہ اس کشمکشِ صبح و مسا کا انجام
میں بھی ناکام، مری سعئ عمل بھی ناکام

یہاں سے آگے ساحر کی نظموں میں عشق و محبت کا ذکر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کوندے کی طرح چمک کر غائب ہو جاتا ہے، اور مارکس کے ایک مخلص مرید کی طرح

"تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہے مجھے"

کہکر ایک اور راہ اختیار کر لیتا ہے، جہاں قدم قدم پر اسے بھوک، بیکاری، افلاس، انسانیت کی آہ و بکا، کارخانوں میں لوہے کے شور سے کفن لاشوں، زرد رو بچوں، بکتے ہوئے جوان جسموں، قانون کی گرفت محکومی اور سب سے زیادہ جاگیردارانہ نظام کی غلط تقسیم وغیرہ سے نبٹنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ اسکا احساس پختہ اور صیقل ہے، اس لئے اس کے مشاہدے میں گہرائی اور اسلوب میں توازن ہے۔

اس سے قبل ایک "ادبی فیشن" کے متعلق ذکر کیا جا چکا ہے۔ بھوک، مزدور، غلامی اس فیشن کے محور میں پیچ و خم، ڈھانچا اور ہوا دیا۔ اس فیشن کا طرۂ امتیاز رہے، اور بے شمار نوجوان شعرا کے لئے یہ فیشن بہت مدت تک سستی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ یہ مسلّم حقیقت ہے کہ جدید ہندوستان میں شاعری کا موضوع صرف محبت نہیں رہا۔ تمدّن کی غلامی کے بعد سیاسی بیداری فنونِ لطیفہ کی ہر شاخ پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اور شاعری جسے حقیقت کی ترجمانی کا دعویٰ ہے اس خوش آئند تغیّر سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے لیکن ماحول کی عکاسی اور پروپیگنڈا میں بہت بڑا فرق ہے۔ ساحر کی دوسرے دور کی نظمیں پڑھتے چلے جایئے۔ آپ کو بہت کم مقامات ایسے ملیں گے جہاں اس نے فن کو جذباتیت پر قربان کر دیا ہو۔ اسکی ان نظموں میں بے پناہ خلوص ہے، وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے، وہی کہتا ہے، اور کچھ اس انداز سے کہتا ہے کہ اسکی ان نظموں کا تاثر پڑھنے والے کے احساسات میں ایک کرب آمیز جھنجھناہٹ پیدا کرتا، اور اسے بہت دیر تک سوچتا چھوڑ جاتا ہے۔ ان نظموں میں ساحر کی انفرادیت اس قدر نمایاں ہے کہ ہمیں اس کے ایک ایک شعر سے ایک نئے فکر، ایک نئے زلزلے اور ایک نئی صبح کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

"تلخیاں" جو زمانہ حال کے ہر نوجوان کو ورثہ میں ملی ہے اور جس سے بالخصوص ہم ہندوستانیوں کو مفر نہیں۔ ساحر کی نظموں میں بھی موجود ہے۔ "سوچتا ہوں"۔ "ناکامی"۔ "مجھے سوچنے دے" اور "گریز" وغیرہ میں ساحر نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی ہولناک ظلمتوں سے نکل جانے کی بہت کوشش کی ہے لیکن اسکی روح مضمحل ہے۔ اسکی قوتیں شل ہیں۔ اس کے حوصلے مذبذب ہیں۔ اور وہ جب کبھی اپنے وطن کی ذلت، مجبوری، اور غلامی کو دیکھتا ہے، تو نہایت اداس لہجے میں اتنا کہتا ہے:- "یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو"

"مکتوبِ رنگیں"

ہاں اُسی انداز سے پھر مسکراتے آؤ نا ! — نغمہ بن کر پھر فضائے تار پر چھاؤ نا !
ظلم کر کے پھر اسی انداز سے پچھتاؤ نا ! — میری دلجوئی کرو اب چپ مجھے بہلاؤ نا !
گنگنا کر پیت کردو نغمۂ طاؤس و چنگ — مسکرا کر ننھی کلیوں کو ہنساتے آؤ نا !
پھر چھپا کر مجھ کو دُزدیدہ نظر سے دیکھ لو — دیکھ کر پھر مجھ کو اپنے آپ ہی شرماؤ نا !
مُڑ کے دیکھو ہر قدم پر ایک انگڑائی کے ساتھ — بجلیاں سی میرے دل پر پھر گراتے آؤ نا !
پھر مری تقدیر کے ہر پیچ و خم کی طرح سے — اپنے اُلجھے گیسوؤں کو ناز سے سلجھاؤ نا !
میرے شکوؤں کو ہنسی میں ٹال کر اب ایکدن — تم زمانے کی حقیقت پھر مجھے سمجھاؤ نا !
بے نیازی کی ادا دانستہ کر کے اختیار — ظاہری بے التفاتی سے مجھے تڑپاؤ نا !
پھر سوالوں کی کرو بوچھار مجھ کو دیکھ کر — میری گھبراہٹ پہ پہلے کی طرح گھبراؤ نا !
اشک کے چھینٹوں سے جو پڑتی چلی ہے مدہمی — دے کے دامن کی ہوا وہ آگ پھر بھڑکاؤ نا !
ایک پُرمعنی خموشی سے مجھے دو دادِ شعر — اب بھی کوئی تبسم میری زیرِ لب دہراؤ نا !
پھر مرے زخموں کو چھیڑو دلنشیں آواز سے — پھر انہیں میٹھے سُروں میں میری غزلیں گاؤ نا !
پھر کرو بے وجہ تنہائی میں میرا انتظار — پھر ہر اک آہٹ پہ چونکو اور دھوکا کھاؤ نا !
اب بھی ہے جس کی تمنا عشقِ ناشاد کو — ساتھ اپنے پھر وہی دنیائے رنگیں لاؤ نا !

بھول کر ہی ختم کر دو اب تو یہ طولِ فراق
شام کو پھر مسکراتے ایک دن آ جاؤ نا !

"الیاس عشقی"

اظہار خیال کیلئے چند صورتیں معین کرلی ہیں اور وہ ان صورتوں میں موضوع و خیال کی نئی نئی جنتیں آباد کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسکی شاعری میں ابہام کا شائبہ بھی نہیں۔ نہایت نرم و نازک اشارتیں اسکے فن کی خصوصیت ہے، جو پڑھنے والے کے ذہن میں ایک ارتعاش سا پیدا کر کے معانی کی ایک بے کراں دنیا پر سے نقاب اٹھادیتی ہے۔ قانون، مذہب یا سماج کا ابہام دور کرنے کیلئے وہ ابہام ہی سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ نہایت صاف ستھرے انداز میں اس ابہام کی قلعی کھولتا ہے، وہ قاری کو متاثر اور محفوظ کرتا ہے، دُور از کار استعاروں اور اجنبی تشبیہوں سے اسکی طبیعت کو مکدّر نہیں کرتا، کیونکہ تکدر شاعری کیلئے زہر ہے۔ ساحر کے فن کی خصوصیات میں احساس کی شدت سب سے ممیز اور نمایاں ہے، اور چونکہ اسکا احساس زندہ اور بیدار ہے، اسلئے اسکی انفرادیت کسی قسم کے بیرونی اثرات کی شرمندۂ احسان نہیں، اردو کے جدید تر شعرا میں اسکا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اگر اسکے کلام کی پختگی، زبان کی پاکیزگی اور اسلوب کی بے پناہ جاذبیت کے مقابلہ میں اسکی عمر کو دیکھا جائے، تو تعجب ہوتا ہے لیکن شاعری سن و سال کی محتاج نہیں۔ ساحر کی اٹھان، اس کے نہایت درخشندہ مستقبل کی غمازی کر رہی ہے۔ اگر وہ افراط و تفریط سے بچا رہا اور اپنے خلوص کو بے لوث اور احساس کو بے داغ رکھنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ بہت جلد ہندوستان کے ممتاز ترین شعرا کی صف میں شامل ہو جائیگا۔ میں اس نتیجہ پر محض اس لئے پہنچا ہوں کہ جدید تر شعرا میں مجھے ساحر کی سی مکمل انفرادیت کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ انفرادیت جس نے "تاج محل" ایسی غیر فانی نظم کو جنم دیا۔ تاج محل کے متعلق آج تک ہر زبان میں بے شمار مضامین نثر و نظم لکھے گئے۔ لیکن جس زاویہ سے ساحر نے اس مرمریں رعنائی کو دیکھا وہ اول و آخر ساحر ہی کا ہے۔ صرف مارکس کا ایک مخلص مقلد ہی اس طرح کے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ صرف "تاج محل" ہی میرے اس دعوے کے ثبوت کیلئے کافی ہے کہ معنی یا مواد یا موضوع کے مقابلہ میں ہیئت ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور اگر کہنے والے کا احساس پختہ، اور تخیل صاف ستھرا اور بلند ہے تو معنی خود بخود اپنی پسند کی ہیئتیں میں جلوہ گر ہوتے رہینگے۔

میں ساحر کے فن کی خصوصیات گنوا کر اور اسکی مثالیں پیش کر کے اس تحریر کو طول نہیں دینا چاہتا۔ اسکی کوئی نظم لے لیجئے، آپکو اس میں شدت احساس، تفکر کی گہرائی، صوتی آہنگ، مشاہدے کی ہمہ گیری اور ماحول کی عکاسی کی بہت سی مثالیں مل جائینگی۔ "چکلے" (کہاں ہیں؟) میں شاعر کی قوت مشاہدہ اپنے عروج پر ہے، لیکن اسی نظم میں آپکو دیگر خصوصیات بھی پوری شدت سے جلوہ گر نظر آئینگی۔ اسی طرح "تاج محل"، "لمحۂ غنیمت ما"، "اجنبی محافظ"، "شعاع فردا"، "شہزادے"، "فن کار"، "کبھی کبھی"، "فرار"، "کل اور آج"، "ہراس" اور "اسی دوراہے پر" وغیرہ تمام نظمیں شدت تاثر، حسن بیان اور رعنائی خیال کے لحاظ سے اردو شاعری میں معرکے کے فن پارے ہیں۔ جن کا شاعر نہ پرانے شاعروں کے لا ابالیانہ پن کا شکار ہے، اور نہ نئے شاعروں کے جنون جدت پسندی کا، وہ ایک واضح اور معین پیغام کا حامل ہے، ایک ایسا پیغام جس میں کسی قسم کے تکلف اور تزئین کی ضرورت نہیں ؎

دیکھو تو در افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا

موجودہ فارسی کی سب سے پرانی کتاب

حبیب انصاری

یہ مضمون میرزا محمد خان بن عبدالوہاب قزوینی کی کتاب "بیست مقالہ قزوینی" سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ کتاب مذکور پروفیسر پور داؤد ایرانی ثقافتی مشن کے معزز رکن نے مرتب کی ہے۔ علامہ قزوینی نے ایڈیٹر صاحب "ایران شہر" کے سوال، "فارسی کی سب سے پرانی کتاب کون ہے؟" کا جواب اس مختصر مضمون کی شکل میں دیا ہے ——

پیرس ۱۳ ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ

جناب ایڈیٹر صاحب "ایران شہر"

آپ دریافت فرماتے ہیں کہ موجودہ فارسی کی سب سے پرانی کتاب کون ہے؟ دراصل اس سوال کا جواب دینا جس طور پر آپ دریافت فرماتے ہیں بہت ہی مشکل ہے۔ اس لئے کہ ایران پر عربوں کے تسلط کو تیرہ سو برس گزر چکے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسے وسیلے نہیں رہے جس سے ہم یہ پتہ چلا سکیں کہ سب سے پہلی کتاب جو موجودہ رسم الخط (خط پہلوی اور پازند میں نہیں) میں لکھی گئی تھی کس زمانہ میں تھی، کس موضوع پر تھی اور کس کی لکھی ہوئی تھی لیکن اگر آپ یہی سوال اس طرح کریں کہ موجودہ فارسی کی سب سے پرانی کتاب کون ہے جو اب بھی باقی ہے؟ تو اس کا مجمل طور پر جواب دیا جا سکتا ہے۔

اس بارے میں عام طور پر یہی مشہور ہے کہ سب سے پرانی کتابیں جو اسلام کے تسلط کے بعد اب بھی باقی ہیں، تین ہیں اور ان کا زمانہ تالیف بالکل قریب ہی قریب ہے۔

(۱) طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی کتاب "تاریخ کبیر" کا فارسی ترجمہ —— یہ ترجمہ منصور بن نوح بن نصر چھٹے سامانی بادشاہ (۳۶۶ — ۳۵۰) کے وزیر ابوعلی محمد بن محمد البلعمی (متوفی ۳۸۶) نے بادشاہ کے حکم سے ۳۵۲ھ میں یعنی اصل کتاب کی تصنیف سے ۵۰ برس بعد اسناد و احادیث حذف کر دینے کے بعد کرایا تھا۔ اس کتاب کے متعدد نسخے اب بھی موجود ہیں، اور لکھنؤ (ہندوستان) میں چھپ بھی گیا ہے۔

یہ فارسی ترجمہ (اصل متن عربی نہیں)، ترکی شرقی، ترکی عثمانی اور فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ترکی شرقی اور فرانسیسی میں تو چھپ بھی چکا ہے۔(۱)

(۲) ان ہی طبری کی "تفسیر کبیر" کا فارسی ترجمہ —— یہ ترجمہ بھی بادشاہ منصور بن نوح کے حکم سے کیا گیا۔ اس کی صحیح تاریخ ہمیں معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ کے عہد ہی (۳۶۶ — ۳۵۰ھ) کے درمیان ہی ترجمہ ہوئی ہے۔ اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے اس کتاب کے دو نسخے اب بھی موجود ہیں مگر ناقص ہیں۔

اس کتاب کی سات جلدیں تھیں۔ ایک جلد جس میں سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ نساء کی تفسیر ہے، پیرس کے قومی کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ سب سے پرانا ہونے کے علاوہ بہت ہی نفیس ہے۔ ۶۲۴ھ سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

راقم الحروف نے اس کے دیباچہ کا ایک حصہ، محض اس زمانے کی فارسی کے نمونے کے طور پر "مرزبان نامہ" کے مقدمہ میں نقل بھی کیا ہے۔ اور وہی حصہ پرانے املا کے ساتھ بغیر ایک حرف اور ایک نقطے کی کمی بیشی کے یہاں درج کیا جاتا ہے:-

"و این کتاب تفسیر بزرگست از روایت محمد بن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ کردہ بزبان پارسی و دری راہ راست و این کتاب را بیاوردند از بغداد چہل مصحف بود این کتاب نبشتہ بزبان تازی و باسنادہای دراز بود و بیاوردند سوی امیر سید مظفر ابوصالح منصور بن نوح بن نصر بن احمد بن اسمعیل رحمۃ اللہ علیہم اجمعین پس دشخوار آمد بر وی خواندن این کتاب و عبارت کردن آن بزبان تازی و چنان خواست کی مرین را ترجمہ کنند بزبان پارسی پس علماء ماوراء النہر را گرد کرد و این از ایشان فتوی کرد کی روا باشد کما این کتاب را بزبان پارسی گردانیم گفتند روا باشد خواندن و نبشتن تفسیر قرآن بپارسی مر آن کسی را کہ او تازی نداند از قول خدای عز و جل کی گفت وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ۔ گفت من ہیچ پیغامبری را نفرستادم مگر بزبان قوم او و آن زبانی کایشان دانستند و دیگر آن بود کاین زبان پارسی از قدیم باز دانستند از روزگار آدم تا روزگار اسمعیل علیہ ہمہ پیغامبران و ملوکان زمین بپارسی سخن گفتندے و اول کسی کی گفت بزبان تازی اسمعیل پیغامبر بود علیہ و پیغامبر ما صلی اللہ علیہ از عرب بیرون آمد و این قرآن بزبان عرب بر او فرستادند و اینجا بدین ناحیت

(۱) تاریخ طبری کا اصل متن عربی سب سے پہلے ۱۸۷۹ء — ۱۸۹۰ء میں لیڈن (ہالینڈ) میں ۱۵ جلدوں میں چھپا۔ اور دوبارہ ۱۳۲۶ھ میں مصر میں ۱۳ جلدوں میں چھپا۔

زبان پارسی است وملوکان این جانب ملوک عجم اندپس فرمود ملک
مظفر ابوصالح تا علمای ماوراء النهر راگرد آوردند از شهر بخارا چون[1]
. . . . وہم ازیں گونہ از شہر سمرقند واز شہر اسپیجاب
وفرغانہ وهر شهری کبوذ بماوراء النهر اندرهمہ رابیاوردند وهمہ
خطها بدازند بر ترجمۂ ایں کتاب کاین راه راسنت پس بیرون آمد
فرمان امیر سید ملک مظفر بردست کسهای او ونزدیکان او ووزیران
او وبندیان خاصہ او وخادم او ابو الحسن فایق الخاصہ سوی این
جماعت مردمان واین علما تا ایشان ازمیان خویش ہر کدام
داناتر اختیار کردند تا ایں کتاب را ترجمہ کردند واز جملہ مصحف
اسنادهای دراز بیفگندند واقتصار کردند بر متون اخبار" الخ
دوسرا نسخہ برٹش میوزیم لندن میں ہے اس میں سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ
مائدہ تک کی تفسیر ہے - یہ ۸۴۳ء کا لکھا ہوا ہے[2]۔

(۳) "کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ" علم طب میں ہے - ابو منصور موفق
بن علی الهروی کی لکھی ہوئی ہے - یہ بھی منصور بن نوح کے زمانے میں لکھی گئی ہے -
اس کتاب کا صرف ایک نسخہ جو ایک ہی جلد میں ہے مشہور شاعر علی بن احمد طوسی اسدی
مصنف گرشاسپ نامہ ولغات اسدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ویانا کے کتب خانے میں
موجود ہے - یہ نسخہ شوال ۴۴۷ھ میں خط کوفی یا نسخ (جو مشابہ ہے کوفی سے) میں
لکھا گیا تھا - (۳)

یہ اسدی جن کو اسدی صغیر یا اسدی ثانی کہنا چاہیے اسدی اول یا اسدی
کبیر ابو نصر احمد بن منصور الطوسی (مصنف مشہور قصائد مناظرہ، "مناظرہ بین مغ ومسلم"
"مناظرہ بین شب وروز" وغیرہ کے لڑکے ہیں - اسدی کبیر فردوسی کا ہمعصر تھا -
اور بعضوں کے قول کے مطابق اس کا استاد بھی - سلطان محمود غزنوی (۳۲۱ - ۴۲۱)
کے زمانے میں رحلت کی - ان کے بیٹے اسدی ثانی کی تاریخ وفات صحیح طور پر معلوم
نہیں - مگر یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ۴۵۸ھ کے بعد ہوئی جو گرشاسپ
نامہ کی تصنیف کا سال ہے - اور ان شاعروں (مثلاً معزی وبہرامی وغیرہ) کے
ذکر سے، جن کے اشعار "لغات اسدی" میں ہیں یہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ اسدی

---

(۱) یہاں علماء ماوراء النهر کے نام طوالت کے خوف سے حذف کر دیے ہیں -
(۲) تفسیر طبری کا اصل متن عربی ۳۰ --- ۱۳۲۳ء میں ۳۰ جلدوں میں بولاق
(مصر میں چھپا ہے)
(۳) مقابل کے صفحے پر کتاب الابنیا میں حقایق الادویہ، کے پہلے صفحے کا
بلاک ہے - یہ صفحہ "بنام ایزد بخشایندہ بخشایشگر" سے شروع ہوتا ہے -
اور اسی خط میں لکھا ہوا ہے جس کا اوپر ذکر آیا ہے -

۴۵۸ھ کے بہت بعد تک زندہ رہے[1] - یہاں اس بات کو نہ بھولنا چاہیے کہ اکثر
تذکرہ نویسوں نے ان دونوں (اسدی صغیر وکبیر) کے درمیان خلط کر دیا ہے -
اور خصوصیتوں کے علاوہ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ
علاوہ اصل کتاب کے پرانے ہونے کے یہ فارسی کی سب سے پرانی قلمی کتاب کا نسخہ ہے
جو اب تک موجود ہے یعنی جہاں تک کہ ہم کو یورپ، مصر، ترکی، اور ہندوستان
کے کتب خانوں کی فہرستیں دیکھنے سے پتہ چلا ہے - ممکن ہے کہ ایران یا ترکی یا اور
کسی جگہ کے کتب خانوں میں جن کی فہرستیں ابھی تک نہیں چھپی ہیں، اس سے بھی پرانی
کوئی کتاب موجود ہو -

موسیو زلیگمن[2] نے ۱۸۵۹ء میں اس کتاب کو بہت ہی اہتمام کے ساتھ
چھاپا ہے اور اس نسخے کے تین صفحے کا بلاک بھی نمونتاً کتاب میں شامل کر دیا ہے
تاکہ ناظرین اس زمانہ کے رسم الخط اور قدیم وعجیب املا کا اندازہ کر سکیں - اس کتاب
کا ترجمہ جرمن میں عبد الخالق آخوندوف بادکوبہ نے کیا ہے اور چھپوا بھی دیا ہے -

ان سب باتوں سے اتنا ضرور پتہ چلا کہ یہ تینوں کتابیں ایک ہی زمانے میں
یعنی منصور بن نوح کے عہد میں لکھی گئی ہیں - لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ان میں
سب سے پہلے کون لکھی گئی - اسی وجہ سے ہم نے بھی اگلوں کی پیروی کی اور تینوں کتابوں
کو فارسی کی سب سے پرانی کتابوں میں جو اس وقت موجود ہیں شمار کیا ہے -

لیکن میرے خیال میں ان تینوں کتابوں سے بھی پرانی ایک کتاب ایسی
موجود ہے جس کو اگرچہ "کتاب" نہیں کہا جا سکتا ہے مگر بہر صورت وہ فارسی
نثر کی ایک تصنیف ضرور ہے - یہ "شاہنامہ کا سب سے پرانا دیباچہ" ہے جو کہ بھی
بعض قلمی نسخوں میں دیکھا جاتا ہے - یہ دیباچہ اس دیباچے سے بالکل مختلف
جو زیادہ تر قلمی نسخوں اور مطبوعہ نسخوں میں تو ہر ایک میں موجود ہے جس کو
امیر تیمور کے نواسے بایسنغر (متوفی ۸۳۷ھ) نے جمع کیا تھا - یہ دیباچۂ بایسنغری
کے نام سے مشہور ہے -

بعض دلائل کی بنا پر جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے اور جن میں سے
بعض کا ذکر مجلہ "کاوہ" جلد ۵ شمارہ ۳ کے صفحہ ۵ میں میں نے کیا ہے
یہ مقدمہ (یا زیادہ صحیح طور پر صرف اتنا ہی حصہ جو ابتدا سے لے کر فردوسی اور

---

(۱) "لغات اسدی" قطعی طور پر "گرشاسپ نامہ" کے بعد تصنیف ہوئی -
اس لئے کہ اس میں "گرشاسپ نامے" کے اشعار سند کے طور پر پیش کئے گئے
ہیں - "لغات اسدی" ۱۸۹۶ء میں مشہور مستشرق آل جہانی
پاول ہارن کے اہتمام سے برلن میں چھپ گئی ہے -
(۲) FR. R. SELIGMANN

محمود کی ملازمت تک کا ہے، بغیر کسی کمی وبیشی یا تغیر کے بالکل وہی مقدمہ ہے جو اُس نثری شاہنامے کے لئے لکھا گیا تھا جو ابومنصور محمد بن عبدالرزاق طوسی کے اہتمام سے ۳۴۶ میں جمع کیا گیا تھا اور فردوسی نے اسی شاہنامے کو نظم کیا تھا۔ علاوہ بریں یہ مقدمہ شاہنامہ تاریخ طبری کے ترجمے سے جو ۳۵۲ کا ہے ۶ سال پرانا ہے اور منصور بن نوح سامانی کی تخت نشینی سے چار سال قبل کا ہے۔

کاوہ' دور جدید کی جلد ۲ کے تیسرے شمارے میں علامہ آقائی محمد قزوینی نے اسی نثر کے شاہنامے پر ایک مقالہ نہایت ہی تحقیق اور قابلیت سے تحریر فرمایا ہے جو مغربی مستشرقین خصوصاً جرمنی کے استاد نولدکے کی پیروی میں لکھا گیا تھا۔ 'کاوہ' کے آخری تین سالوں کے مختلف شماروں میں ان ہی علامہ محترم نے اپنی تحقیقوں سے اس میں اضافہ فرمایا ہے اور اگر کوئی ان سے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو اسکو 'کاوہ' کے ان شماروں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ ہماری بدقسمتی کہ یہ قیمتی مقدمہ (تقریباً ایک ہزار برس قبل کا لکھا ہوا ہے) امتداد زمانہ اور کاتبوں کی غفلت کی وجہ سے بالکل خراب ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض مقامات تو بالکل مسخ ہو گئے ہیں۔

میں نے اس مقدمے کے بارہ نسخے جو پیرس لندن کیمبرج اور برلن کے کتب خانوں میں موجود ہیں اور جن میں سب سے پرانا نسخہ ۶۷۵ھ کا ہے ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے اپنے امکان بھران کی تصحیح کر دی ہے۔ اور یہ خیال تھا کہ میں اس کو چھپوا دوں گا مگر چونکہ اب بھی اس کے بعض مقامات بالکل سمجھ میں نہیں آتے ہیں اور قطعی وہ غلط ہیں لہذا اس کی جرأت نہ کر سکا کہ اپنے اس خیال کو پورا کروں۔ ممکن ہے کوئی شاہنامہ ۶۷۵ھ یا اس سے پہلے کا نکل آئے اور اس میں یہ مقدمہ بھی موجود ہو تو پھر اسکی پورے طور پر تصحیح ہو سکے گی۔

میر انیس —— بقیہ صفحہ ۳

جس میں بنی نوعِ انسان کی مکمل خودی کا راز مضمر ہے اس انکار کا مطلب اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ مستقل پیغام جسکی تصویر کشی انیس نے کی ہے ایک بے معنی ایک گھٹیا اور معمولی وقوعات میں سے ہے۔ کربلا کی روح محسوس اور غیر محسوس دونوں طریقوں سے پکار رہی ہے لیکن گوشِ حقیقت نیوش چاہئے۔

زمانے نے ہزاروں پلٹے کھائے۔ انقلاب کی رو فضائے دہر پر وقتاً فوقتاً پھرتی رہی۔ انسانی تاریخ میں ابتک بجانے کتنے تغیرات اور موڑ آئے مگر یہ حقیقت ہے اور اسے ضرور باقی رہنا چاہیئے کہ واقعۂ کربلا اپنی نوع کا اہم ترین واقعہ ہے اور اس کا نقاش و مصور جو انیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اپنے فن میں منفرد ہے۔ جو اس اہم ترین واقعہ کو شاعری کے ایسے معجزہ کی شکل میں پیش کرتا ہے کہ جس سے بہتر تصور میں نہیں آتا۔ لفظوں کے اس ساحر نے اظہار کی ان تمام دشواریوں پر قابو پالیا تھا جو ایک شاعر کی حیثیت سے پیش آتی ہیں۔"

غزل

دہانِ زخم میں قاتل نے خنجر کی زباں رکھدی / شہیدِ ناز کے قالب میں عمرِ جاوداں رکھدی

بنا کر شاخِ گل پر آشیاں تنکوں سے کون الجھے / نہالِ خود فراموشی پہ طرحِ آشیاں رکھدی

ادھر ساقی نے پیمانِ وفا اک سامنے رکھا / اُدھر میخوارں نے لا کر متاعِ دو جہاں رکھدی

کہیں بیخودی دیکھی نہ توڑے طاقِ نسیاں میں / خدا جانے کتابِ آرزو دل نے کہاں رکھدی

حریمِ ناز میں سجدہ کا اب جو حشر ہو لیکن / جبینِ شوق پر قدرت نے خاکِ آستاں رکھدی

جنونِ بیخودی میں امتیازِ دیر و کعبہ کیا / جبینِ شوق سجدے میں جہاں رکھدی وہاں رکھدی

جب آئینِ وفا میں جرم ہو ذوقِ فغاں یارب / عنادل کے دہن میں کیوں نہ پھر گل کی زباں رکھدی

قفس میں آبروئے ضبط کا اللہ حافظ ہے / رہائی کیلئے صیاد نے شرطِ فغاں رکھدی

عطا فرمانے قسامِ ازل نے خلعتِ ہستی / اجل کی تیز قینچی بھی برائے امتحاں رکھدی

تصور نے بسا کر اک نئے انداز کی دنیا / دہانِ کائناتِ شوق میں دل کی زباں رکھدی

خدا جانے نگاہِ یار کی جنبش سے کیا سمجھا / کہ سب و بیکسوں میں دل نے بکھر داستاں رکھدی

جوانی میں محبت کی کشاکش نجم کیا کہیئے
بھنور میں نا خدا نے کشتیٔ عمرِ رواں رکھدی

نجم ندوی

آنسو —— بقیہ صفحہ ۳۲

نام صرف نرگس" ہے اس نرگس کے پھول کی تشبیہ شاعر معشوق کی آنکھ سے دیتا ہے لیکن تم تو سراپا نرگس ہو، تمہیں کس سے تشبیہ دی جائے"

"ہاں! بس بس زیادہ خوشامد نہیں، چلو پودوں کے پاس"

"چلو" نرگس اور داروغہ جی کا لڑکا آہستہ آہستہ چلنے لگے، اتفاق بھی عجیب شئے ہے۔ جیسے ہی دونوں چنبیلی کی ایک بیل کے پاس پہنچے، نرگس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، خوف سے کانپنے لگی، اقبال گھومتا ہوا ادھر آنکلا تھا اور زمین پر گرے ہوئے چنبیلی کے پھولوں کو اکٹھا کر رہا تھا، پیروں کی چاپ سن کر اقبال نے اپنا سر اٹھایا، لبوں کو ذرا سی جنبش ہوئی "کون نرگس!"

اس آواز میں ایک درد تھا، ایک خلش تھی جس نے نرگس کے سارے حواس مختل کر دیئے اور آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو کے قطرے زمین پر گرے اور خود بھی گر پڑی، معلوم نہیں یہ آنسو صرف ایک بے کس کی بے بسی پر گرائے گئے تھے یا ملک کی بارہ کروڑ آبادی پر —

دوسرے دن اقبال نے جیلر اور اس کے چند ساتھیوں سے باتیں کرتے ہوئے سنا کہ نرگس نے خودکشی کر لی، معلوم نہیں کیوں!!! —

بواسیر کا خاتمہ
اس مرض میں ہمدرد مرہم
کے حیرت انگیز اثرات
HAMDARD OINTMENT
HEALING, SOOTHING & ANTISEPTIC
ہمدرد مرہم
رجسٹرڈ
हमदर्द मरहम
HAMDARD DAWAKHANA DELHI
بواسیر کے مسے جب پیدا ہو جاتے ہیں، تو
ان کی وجہ سے مریض کو سخت تکلیف ہوتی ہی تناؤ
ہوتا ہی قبض ہوجاتا ہی اور حتیٰ کہ ٹانگوں میں درد تک ہوجاتا ہی۔ ہمدرد مرہم درد کی اس شدت
کو جلد رفع کر دیتا ہی۔ یہ مسّوں کے تناؤ کو دور کرتا ہی اور اسکے پاس کی ساختوں کو ڈھیلا کرتا ہی۔ مسے
اس سے جلد ہلکے ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ مرجھا جاتے ہیں۔ خون آثار نو صحیح طریقے پر بند ہوجاتا
ہی۔ وہاں کوئی جراثیم حملہ نہیں کر سکتے اور یہ معمولی مسے ہرگز ناصور میں تبدیل نہیں ہوتے۔ اپنی
تکلیفوں کے لیے ایک ڈبیہ فوراً خرید لیجیے۔
چربیوں سے قطعی پاک۔ خالص نباتی۔
ہمدرد مرہم
ہر جگہ ملتا ہے
جلد کی تمام بیماریوں کے لئے اکسیر
ہر جگہ ملتا ہے۔

جزائر انڈمان

جی۔ ایم۔ راٹھور

جنوب مشرقی ایشیا [illegible] کے بعد اب جزائر انڈمان کے مستقبل پر غور کرنا ہے۔ [illegible] معلوم ہوتا ہے ۱۸۵۷ء کے غدر کے دنوں سے مارچ ۱۹۴۲ء [illegible] جبکہ ان پر جاپانیوں نے قبضہ کیا ہندوستانی [illegible] لئے کالے پانی کے طور پر استعمال کئے جاتے [illegible] میں فیصلہ ہو چکا تھا کہ وہاں لوگوں کو [illegible] رہتے تھے [illegible] طریقہ [illegible] ختم کر دیا جائے اور جاپانیوں نے تو جزائر کو [illegible] اور بندرگاہ [illegible]

مختلف قسم کی قدیم نسلوں [illegible] کی وجہ سے بھی دلچسپی پیدا نہیں آئی کیونکہ پہلے وہاں [illegible] ہزار افراد بسائے جاتے تھے مگر تیس برس بعد ۱۹۳۱ء میں گھٹ کر چار سو ساٹھ اور اس کے بعد ۱۹۴۴ء میں محض باسٹھ رہ گئے۔ [illegible] پیدائش کم ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی تو پرانی نسلیں ناپید ہو جاتی ہیں اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ ان جزیروں میں مقامی نسل کا ہی خاتمہ ہو جائے گا۔

اب [illegible] دوسری جگہوں [illegible] ثابت ہوا ہے، [illegible] جزائر کا رقبہ ۲۵۰۸ مربع میل ہے اور اسے ترقی دینے [illegible] باقاعدہ [illegible] کی جا سکتی ہے۔

[illegible] ڈھالی [illegible] نظر آتی ہے [illegible] جزائر کو ہندوستان [illegible] ارکان ہی کا حصہ ہیں۔ شاید یہ راس نارگر اور [illegible] کے درمیان [illegible] سلسلہ کسی زمانہ میں سمندر سے باہر تھا مگر اب جگہ جگہ سے سمندر میں غرق ہو جانے کی وجہ سے الگ الگ ٹاپو بن گئے ہیں۔

مستقبل کے لئے نقشہ بناتے وقت خارجی تعلقات اور داخلی ترقی کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے [illegible] دونوں کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ بنگال کی کھاڑی میں بہت سے جہاز ڈوبتے ہیں جن کو ۱۸۶۷ء سے بندرگاہ بلیئر کے اسٹیشن پرانا [illegible] رہا ہے کیونکہ یہاں سمندری طوفانوں اور طوفانی ہواؤں کی شدت اور سمت کے متعلق پہلے سے اندازہ لگا کر براڈکاسٹ کرنا ممکن ہو سکا ہے۔

حال میں ہوا بازی کی ترقی کے سلسلہ میں بندرگاہ بلیئر میں اڑن کشتی کے اسٹیشن کی حیثیت سے بہت دلچسپی لی گئی کیونکہ یہ ہندوستان سے آسٹریلیا کے سیدھے راستہ پر پڑتا ہے۔ جب ہوائی جہاز ایک ساتھ اور زیادہ لمبا سفر کرنے لگیں گے تو اس بندرگاہ کی اہمیت صرف یہ رہ جائے گی کہ یہاں ضرورت کے وقت ہوائی جہاز اتر سکے مگر ابھی وہ دن دور نظر آتا ہے۔

جزائر انڈمان کی اقتصادی ترقی ہی سے [illegible] وابستہ ہیں جس کے لئے کافی سرمایہ اور محنت کا حاصل ہونا ضروری ہے [illegible] صورت میں [illegible] محکموں کو بہت سالوں تک مل جل کر کام کرنا ہوگا [illegible] ہم جزائر انڈمان کے سلسلہ میں بھی کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر سکتے ہیں لیکن یہ احساس شکست ہمارے اس نوآبادیاتی کردار کے خلاف ہوگا جس کا ہم نے حال میں ثبوت دیا ہے۔ ہم ہندوستان اور آہستہ آہستہ برما میں صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے کروڑوں پونڈ خرچ کر رہے ہیں جبکہ جزائر انڈمان کے قیمتی ذرائع وہاں کے اخراجات کو پورا کر دیں گے۔

ممکن ہے یہ پلان آخرکار منظور ہو جائے اور ماہرین کے کمیشن کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچے۔ اس کا خاص مقصد جنگلات کی ترقی ہوگا۔ اس پر باقاعدہ عمل ہونے کے لئے جہازوں، سڑکوں اور کام سیکھے ہوئے اور معمولی مزدوروں وغیرہ کی ضرورت پڑے گی۔ زراعت اور مویشی بھی ضروری ہیں۔ اگرچہ سبزیاں، گوشت، مرغیاں، انڈے اور دودھ مکھن کے انتظام میں ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی مگر اب ان کا فراہم ہونا ممکن نظر آتا ہے۔ اگر پیداوار کے مناسب ذرائع اختیار کئے گئے تو جزائر انڈمان میں ہر چیز پیدا ہو سکتی ہے۔ چائے، انگلستان کی طرح باہر کے بازاروں کا مقابلہ کرنے کے لئے یہاں پیداوار ممکن نہ ہو [illegible] کچھ فصلیں اتنی آسانی سے اگائی جا سکتی ہیں جتنی کہ انگلستان میں ممکن نہیں [illegible] پیداوار۔ مثلاً [illegible] نمکین دھان، تمباکو، ہلدی، مرچ، کپاس، [illegible] باجرا اور [illegible] سے منگانا پڑتا ہے۔ کیلے، [illegible] پھل، نارنگیاں، [illegible] بھی [illegible] پیدا ہوتے ہیں۔

جب کبھی یہ پلان عمل میں آئے گا [illegible] ہوٹل، ٹامس کک کے دفتر اور ٹالی اینڈ او اور برطانوی ہند کے جہازوں کے چھوٹے چھوٹے راستے پھر کھل جائیں گے جس سے مسافروں کی تفریح اور مقامی باشندوں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔

شکر مقامی ضرورت پوری کر کے برما میں بھی بھیجی جا سکتی ہے۔ انڈمان کے حالات تقریباً مثالی ہیں۔ چاول کے پرانے کارخانے خریدے جا سکتے ہیں۔ اپریل میں بیج بونے اور سردیوں میں آٹا پیسنے کے لئے سوئش روزانہ کی مشین نہایت مناسب ہے۔ مگر بیج کے انتخاب، کھاد اور پانی کے سوالات کے متعلق پہلے سے کہیں زیادہ غور اور مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

انڈمان میں چائے اور قہوہ پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حالات مناسب نہیں تھے بلکہ درحقیقت سرکاری امداد اور ہمت افزائی کی کمی رہی۔ ذاتی باغ لگانے والوں کے تجربوں سے معلوم ہو سکا ہے کہ بارش تک میں سبزیاں بوئی جا سکتی ہیں۔

سنہ ۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق ایشیا والوں کی خاص خوراک دھان کی کاشت چار ہزار ایکڑ زمین میں ہوتی تھی وہاں ایک قسم کا چاول کاٹنے کا آلہ استعمال کیا جاتا تھا لیکن چونکہ طرح طرح کے چاول ہوتے تھے اور یہ آلہ ایک ہی طرح چاول کاٹنے کے لئے مخصوص تھا اس لئے بڑے بڑے چاول تو ٹوٹ جاتے تھے اور

چھوٹے چھوٹے بغیر گابھے رہ جاتے تھے۔ یہ چاول صرف مویشیوں کو کھلایا جاتا تھا۔

عمارتی لکڑی کے امکانات اور بہتر ہیں اگرچہ اس سلسلہ میں بھی کچھ دشواریاں ہیں۔ درخت دوسری فصلوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مفید ہیں اور اگر ان سے نئے طریقوں سے استفادہ کیا جائے تو بہت نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ جنگلات اتنے گھنے ہیں کہ یورپی کیا ہندوستانی بھی بڑا جاتو استعمال کرے تو ایک دن گزرنے گھنٹے ہی کی رفتار سے اندر جا سکتے ہیں۔ صرف اونگا اور دوسرے مقامی نسل کے لوگ اپنی مرضی سے اندر گھوم پھر سکتے ہیں۔ اس کے خلاف لمبی لمبی تنگ وادیاں ہیں اور لمبے لمبے تنگ جزیروں کے درمیان بہت سے قابل جہاز رانی تنگ بحری نالے موجود ہیں جو ان قیمتی جنگلات تک پہنچنے میں مدد دیتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ایک ہی طرح کے درخت ایک جگہ نہیں ملتے اس لئے الگ الگ درختوں کا پتہ چلانا پڑتا ہے اور ہاتھیوں اور مشینوں کے ذریعہ درخت اکھاڑنے پڑتے ہیں۔ "سنورگرے" نامی خوبصورت درخت کا بھی یہی حال ہے۔ "کوکو" اور "توگ تنگ" حالانکہ کم مشہور ہیں مگر عمدہ فرنیچر بنانے میں کام آتے ہیں "کرجان" اور "بادام" کم سے کم ہندوستانی دیودار اور امریکی وائٹ ووڈ جیسے عمدہ ہیں اور ہلکا فرنیچر بنانے کے کام آتے ہیں۔ "پیتیا" دیا سلائی بنانے کے کام آتا ہے یہ سیڈن کے درخت جیسا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے درخت ہیں ۱۹۳۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق ملین ٹن عمارتی لکڑی فروخت کی جا سکتی تھی بڑی بڑی مشینوں کے ذریعہ ہر سال ایک لاکھ ٹن درخت اکھاڑے جا سکتے تھے مگر اب تک صرف آدھے درخت گرائے جا سکے ہیں۔ یہاں ساگون خوب اگتا ہے اور اگر باقاعدہ جنگل لگائے گئے تو یقیناً یہ تعداد دگنی ہو سکتی ہے۔ کسی زمانہ میں یہ جنگلات "بمبئی برما ٹریڈنگ کارپوریشن" کے سپرد دینے کی تجویز تھی لیکن حکومت نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ جاپانی انڈمان میں بندرگاہ کا رنواسی کو دوبارہ کھول کر وہاں چھاؤنی قائم کرنی پڑے گی حکومت ہند اس مسئلہ کو کیسے حل کرے گی؟

اب تک سب سے بڑی دقت یہ رہی ہے کہ حکومت نے کوئی لمبا منصوبہ بنا کر مستقل طور پر کام نہیں کیا۔ مگر اب حکومت ہند بہت سا سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہے۔ اب تک تو سارا روپیہ حفاظت پر خرچ ہوتا رہا۔

اس کے باوجود کچھ گورنروں خاص کر کرنل فیرر نے واقعی دلچسپی لی اور عمدہ کام کیا۔ بڑے حکام اور اس کے بعد کے گورنروں کو اس کے کام کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ لیکن ترقی میں کامیابی کا سارا تحقیقی کام اور اقتصادی مسائل حل کرنا ایک آدمی کے بس کا نہیں تھا۔

اب جب کہ راستہ ہموار ہو چکا ہے نئی حکومت ہند وہاں تحقیقات اور مطالعہ کرے گی۔ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ جزائر انڈمان اور شاید جزائر نکوبار ہندوستان کی اقتصادیات میں خاص اہمیت حاصل نہ کر لیں۔

(کرنل جی ایم روتھ کے مضمون سے ماخوذ۔ جن کی جزائر انڈمان کے متعلق معلومات بہت وسیع ہیں)

بھٹکا مسافر

مصنفہ: اے افینو گنیف

مترجمہ: فضل حق قریشی دہلوی

افراد

۱۔ نسطیبۂ:۔ ریلوے لائن کی دیکھ بھال کرنے والی لڑکی۔
۲۔ لیبو بر:۔ تسلیمر کی بسلی کھیتوں میں کام کرنے والی طالبات کی افسر۔
۳۔ ایک مسافر۔

منظر:۔ ریلوے لائن کے پاس معمولی قسم کی کوٹھڑی۔

لیبو بر:۔ نسطیبۂ! گاڑی کے رکتے ہی میں یہاں سے روانہ ہو جاؤنگی۔

نسطیبۂ:۔ ساری رات یہیں گذارو نا لیبو بر!

لیبو بر:۔ ہاں۔ چاہتی تو میں بھی ہوں مگر کیا کروں مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ یونین نے وہ تمام طالبات میرے سپرد کر دی ہیں جن سے فصل کٹوانے اور اناج جمع کرنے میں امداد لی جائے گی اور تم خود اندازہ لگا سکتی ہو کہ سختی روا رکھے بغیر ان سے کام لینا مشکل ہے۔ طالبات ہونے کے باعث وہ دن بھر قدیم یونان کے تاریخی واقعات اور نپولین کی سیرت وصورت پر بحث کرتی رہتی ہیں۔ لیکن کھیت میں کام کرتے وقت ان بے تکی باتوں سے احتراز کرنا ہی پڑے گا۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کی مدد سے ساری فصل بہت جلد کٹ جائیگی اور گیہوں کی کسی بال میں ایک دانہ بھی رہنے نہیں پائے گا۔ اگر موقع ملا تو کل پھر تم سے ملنے کے لئے آجاؤں گی۔ اب تو جانے ہی دو۔

نسطیبۂ:۔ اچھا خیر۔ لیکن کل آنا ضرور۔ ایک سے دو مل بیٹھیں تو وقت اچھا گذر تا ہے۔

لیبو بر:۔ ہوں! خاوند کی جدائی شاق گذر رہی ہوگی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟

نسطیبۂ:۔ ہاں ایک حد تک ان کی بجائے لائن مین کا فرض ادا کرتے رہنا بھی غنیمت ہے۔ اس طرح ان کی جدائی کا احساس طبیعت پر زیادہ اثر نہیں کرتا۔ تم جانتی ہو۔ لڑائی چھڑنے سے پہلے وہ ایک دو بار جا کر قریب کی لائنوں کو دیکھ بھال لیتے تھے۔ لیکن اب مجھے کافی دور دور اور دن میں کئی کئی بار جانا پڑتا ہے۔ میں تھوڑی دیر آرام کرتی ہوں اور ہر گاڑی گذر نے کے بعد لائنوں کا جائزہ لیتی ہوں کہ اس عرصہ میں کوئی گڑ بڑ تو نہیں کر دی گئی۔ لیبو بر! تم ایک روز یہاں آکر اندازہ تو لگاؤ کہ محاذِ جنگ پر کیا کچھ بھیجا جا رہا ہے۔ اور کتنی گاڑیاں روزانہ جاتی ہیں۔ تم آسانی سے ان کا شمار بھی نہیں کر سکتیں۔

لیبو بر:۔ ہاں مجھے معلوم ہے ان کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی لئے میرا قیاس ہے کہ اس سال ہم فصلی تہوار کا ناٹک بھی نہیں کھیل سکینگے لیکن لڑائی ختم ہونے کے بعد ہمارا سب سے پہلا دلچسپ کام یہی ہوگا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ میں اپنا سارا پارٹ زبانی یاد کر چکی ہوں اور بھیس بدلنے کے سلسلے میں ایسے عجیب وغریب طریقے معلوم کئے ہیں کہ بیان نہیں کر سکتی۔ بس دیکھنے سے تعلق ہے۔ خصوصاً بڑھیا کا بہروپ بھرنے میں تو کمال حاصل کر لیا ہے۔ اور ایک روز تو میری اماں بھی مجھے نہیں پہچان سکیں۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ ستیپرنے دیکھکر کہا کہ واقعی تم نے کمال کر دیا۔ تم تو سچ مچ کی بوڑھی کھوسٹ معلوم ہوتی ہو۔ اور پھر جاتے ہوئے اس نے چپکے سے میرے کان میں کیا کہا۔ وہ بولا "میں سب سے پہلا جرمن ٹینک تمہاری خاطر توڑوں گا۔ اور وہ گویا تحفہ ہوگا ایک نوجوان شوہر کی طرف سے اس کی حسین بیوی کے نام"۔ اُف! کس قدر خوشی ہوگی جب وہ دنادن گولے برسا کر بہت سے ٹینکوں کا صفایا کر دے گا۔

نسطیبۂ:۔ ہاں یہ ٹھیک ہے لیبو بر! لیکن میدان جنگ کی حالت روح فرسا اور خوفناک ہوگی۔ ہر طرف تڑاخے بھرتی ہوئی گولیاں ہوں گی اور دھماکے سے پھٹتے ہوئے بم۔ آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہوگی موت کا بازار گرم ہوگا۔

لیبو بر:۔ لوگ کہتے تھے کہ نبرد آزمائی صرف مردوں کا حصہ ہے۔ لیکن اب لڑکیاں بھی اس میدان میں پیچھے نہیں رہیں۔ خود میرا جی چاہ رہا ہے کہ محاذِ جنگ پر اپنی بہادری کا ثبوت پیش کروں۔ میں اپنی مشین گن سے ان نازی لٹیروں اور فاشی بھیڑیوں کو ہرگز بچ کر نکلنے نہ دوں۔ چن چن کر سب کو فنا نہ کر دوں تو میرا نام نہیں ہے۔ میں نے بہت اصرار کیا مگر سالارِ فوج نے ایک نہ سنی۔ اس نے کہا کہ تم اسی جگہ کام کرتی رہو۔ یہ بھی محاذِ جنگ کے برابر ہے۔ غضب خدا کا ان نازیوں کے جہاز کتنی لمبی پرواز کرتے ہیں۔

نسطیبۂ:۔ کچھ بھی ہو وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم ان سے بہت دور ہیں۔

لیبو بر:۔ پیدل یا گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کرو تو یقیناً فاصلہ بہت زیادہ ہے لیکن ہوائی جہاز کے لئے کچھ بھی نہیں۔ اور ہمیں ان کے آنے کا علم بھی نہیں ہوتا کہ یکا یک گولے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں اور آنِ واحد میں آگ کے شعلے نظر آتے ہیں اور موت کی چیخیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

نسطیبۂ:۔ کیا واقعی؟ تم سنجیدگی سے کہہ رہی ہو؟

لیبو بر:۔ ہاں سنجیدگی سے۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ پوری طرح تیاری بھی نہ کی گئی ہو اور یکا یک دم مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ میری طالبات تمہاری مدد کا فیصلہ کر کے ایک خندق کھود رہی ہیں تاکہ زیادہ حفاظت

ممکن ہو سکے۔ اور یوں بھی کبھی کبھی ہم سب یہاں آتے رہینگے۔ تاکہ تمہارے دکھ درد کا حال معلوم ہو سکے۔ یہ جگہ بہت ہی سنسان ہے پہلے سے اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ کب کونسا واقعہ ظہور پذیر ہو جائے۔ تم جانو۔ لڑائی کا زمانہ ہے ہر بات ممکن ہو سکتی ہے اچھا۔ میں کل ملوں گی۔ اب خدا حافظ! (لیڈر چلی جاتی ہے۔ نسطیبر لیمپ کی طرف متوجہ ہو کر ریلوے لائینوں کے اگلے معائنے کے لئے جوتے پہنتی ہے۔ وہ تھوڑا اٹھا کر باہر نکلنا ہی چاہتی ہے کہ عین اسوقت دروازے پر دستک سنائی دیتی ہے۔ وہ کھڑکی کے قریب جا کر باہر نظر ڈالتی ہے۔ دوبارہ دستک سنائی دیتی ہے)

نسطیبر:۔ اندر آؤ۔ دروازہ مقفل نہیں ہے۔

(ایک مسافر اندر داخل ہوتا ہے۔ اس کی ٹوپی کا کالا اوپر کی طرف اٹھا ہوا ہے جسکی وجہ سے چہرا نظر نہیں آتا۔ وہ جھٹکا دیکر برساتی پر سے پانی کے قطرے جھاڑ دیتا ہے اور ساتھ ہی نسطیبر سے مخاطب ہوتا ہے)

مسافر:۔ میں راستہ بھول گیا۔ نہ جانے اس بارش اور تاریکی کا خاتمہ کب ہوگا۔

نسطیبر:۔ تم کس طرف جاتے ہو؟

مسافر:۔ شہر کی طرف۔ ہاں ہاں شہر کی طرف

نسطیبر:۔ تو پھر بائیں طرف سے جاؤ۔ بڑی سڑک سے ہو کر۔

مسافر:۔ ہاں یہ تو میں جانتا ہوں لیکن وہ سڑک دکھائی نہیں دیتی۔ نظر نہیں آتی اور اسی لئے راستہ بھول گیا۔

نسطیبر:۔ تم آ کس طرف سے رہے ہو؟

مسافر:۔ دیہات سے۔

نسطیبر:۔ بہت سے دیہات ہیں غالباً اوستشکوف سے آ رہے ہوگے؟

مسافر:۔ ٹھیک ٹھیک۔ اوستشکوف سے آ رہا ہوں۔ کیا میں کچھ دیر یہاں رہ کر اپنے کپڑے سکھا سکتا ہوں۔

نسطیبر:۔ ضرور۔ تم اوستشکوف میں بالکل نو وارد ہو گے جبھی تو شہر جانے والی سڑک کا تمہیں علم نہیں ہے۔

مسافر:۔ ہاں بالکل نو وارد۔ میں خاص اور اہم خدمات کے لئے متعین کیا گیا ہوں۔

نسطیبر:۔ اچھا تو شاید تم ان طلباء میں سے ہو جنکو فصل کاٹنے اور اناج جمع کرنے کیلئے مقرر کیا گیا ہے۔

مسافر:۔ ہاں ہاں۔ تم ٹھیک سمجھ رہی ہو۔

نسطیبر:۔ تم لیوبر کو جانتے ہو؟

مسافر:۔ کون؟ لیوبر کون؟

نسطیبر:۔ لیوبر پرونزوور۔ وہ بھی اوستشکوف کی رہنے والی ہے۔ ساری فصل کی دیکھ بھال اسی کے ذمے ہے۔

مسافر:۔ ایں۔ ہاں۔ پرونزوور۔ میں جانتا ہوں — کیا شہر اس جگہ سے بہت دور ہے؟

نسطیبر:۔ شاہراہ کے ذریعہ تقریباً بیس میل ہے لیکن ریل کی پٹڑی پٹڑی جانے کی صورت میں کسی قدر نزدیک ہے۔

مسافر:۔ تب تو میں پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلا جاؤنگا۔

نسطیبر:۔ لیکن آجکل اس کی اجازت نہیں ہے۔ دریا پر پل بھی تو ہے۔

مسافر:۔ کیا وہ بہت دور ہے؟ میرا مطلب — وہ پل بہت دور ہے؟

نسطیبر:۔ کیا چیز — پل — نہیں۔ وہ تو بالکل قریب ہے۔ بس اس گھنے جنگل سے ذرا آگے بڑھکر — ارے رے رے۔ تم نے تو اپنے جوتوں کا ستیاناس کر لیا۔ وہ بری طرح کیچڑ میں سنے ہوئے ہیں۔

مسافر:۔ کیا میرے جوتے؟ ہاں کیچڑ بہت ہی چپچپی تھی۔ خیر پروا نہ کرو۔ میرے پاؤں خشک ہیں۔

نسطیبر:۔ لو اس سے صاف کر لو۔ (وہ برش پیش کرتی ہے۔ مسافر جوتے صاف کرتا ہے)

مسافر:۔ کیا تم تنہا رہتی ہو؟

نسطیبر:۔ کون؟ میں؟

مسافر:۔ ہاں تم۔

نسطیبر:۔ ایں۔ ہاں میں۔ میں ہوں۔ نہیں۔ میرے سب گھر والے رہتے ہیں۔ میرا شوہر۔ میرا باپ اور........

مسافر:۔ وہ کہاں ہیں؟

نسطیبر:۔ کون؟

مسافر:۔ ارے کتنی بے وقوف ہو۔ میں ہر سوال کو دہراتا ہی رہوں۔ میں پوچھتا ہوں وہ کہاں ہیں؟ — تمہارا شوہر، تمہارا باپ اور باقی سب........

نسطیبر:۔ شوہر؟ ہاں میرا شوہر ہے۔ وہ تھان پر گایوں کو چارہ دے رہا ہے۔ تم کہو تو بلا لوں؟

انجم

جاں نثار اختر کی انجم سے معذرت کیساتھ!

کس کے پہلو میں رہو گی انجم
کیا کوہ آوارہ سا شاعر ہوگا
یا غلامانِ امارت کا خدا
یا کوئی مفلس و نادار و گدا

کس کے پہلو میں رہو گی انجم
مولوی ہوگا کہ قومی رہبر
یا سڑک جھاڑنے والا مہتر
یا کوئی بوڑھا جذامی زرگر

کس کے پہلو میں رہو گی انجم
حاکمِ وقت کہ محکوم کوئی
خوگرِ ظلم کہ مظلوم کوئی
خادمِ حسن کہ مخدوم کوئی

کس کے پہلو میں رہو گی انجم

[illegible]

مسافر:۔ نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔

نسطیبُر:۔ نہیں۔ میں بلائے لیتی ہوں۔ وہ تمہیں صحیح راستہ بتا دیگا۔ ایسا نہ ہو کہ تم دوبارہ بھٹک جاؤ۔

مسافر:۔ ضرورت نہیں سنو بالکل ضرورت نہیں ہے۔ سنا تم نے (جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے) میں کہتا ہوں کہ ضرورت نہیں ہے۔ فوراً ٹھہر جاؤ۔ قدم آگے نہ بڑھیں۔

نسطیبُر:۔ اوہ! میرے خدا! آخر تم ہو کون؟

مسافر:۔ خاموش رہو۔ ورنہ یہ تمہاری زبان کا آخری فقرہ ہوگا۔ بیٹھ جاؤ۔ بولو مت۔

(نسطیبُر غیر ارادی طور پر بیٹھ جاتی ہے۔ مسافر لیمپ اٹھاتا ہے اور کھڑکی کے سامنے دھر ادھر اور نیچے اوپر کر کے ہلاتا ہے۔ یکایک دروازہ کھلتا ہے۔ مسافر لیمپ رکھ کر جلدی سے ایک اور ریوالور نکال لیتا ہے اور دروازے کی جانب نشانہ باندھتا ہے۔ ایک بوڑھی عورت داخل ہوتی ہے جس نے بارش سے بچنے کے لئے اپنا سر ٹاٹ کی بوری سے ڈھانک رکھا ہے۔ وہ بمشکل قدم اٹھا کر چلتی ہے۔)

بوڑھی عورت:۔ ارے۔ اری نسطیبُر! تو ابھی تک سوئی نہیں۔ آخر کیوں۔ اور یہ کون ہے۔ خدا نے اپنے کس بندے کو ہماری دہلیز تک بھیجا ہے۔

مسافر:۔ چپ رہ بڑھیا۔ خاموش ہو کر بیٹھ جا۔

بوڑھی عورت:۔ کیا۔ کیا کہا تم نے؟

مسافر:۔ بیٹھ جا۔ چپ ہو کر فرش پر بیٹھ جا۔ بڑبڑ نہ کر۔

بوڑھی عورت:۔ ابر! ہاں ابر چھایا ہوا ہے۔ بارش بھی ہو رہی ہے۔

مسافر:۔ خاموش رہ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔

بوڑھی عورت:۔ اچھا! — ہاں۔ ہو تو رہی ہے۔

نسطیبُر:۔ تم نہیں جانتے۔ یہ عورت بالکل بہری ہے۔ تمہارا ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی۔

مسافر:۔ بہری ہے تو اچھا ہے۔

بوڑھی عورت:۔ اری نسطیبُر! آج کی ٹھنڈی ہوا نے تو میرے جوڑ جوڑ میں درد پیدا کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مرتے دم تک برقرار رہیگا۔ اور ہاں یہ بتایا ہی نہیں کہ ہمارے گھر میں یہ کس نیک آدمی نے قدم رکھا ہے؟

مسافر:۔ (کان کے قریب چیخ کر) یہ ہمارے مہمان ہیں دادی اماں۔

بوڑھی عورت:۔ اچھا مہمان ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائینگے؟

مسافر:۔ او شیطان کی خالہ! چپ رہ۔ اگر پستول کی آواز کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ضرور تم دونوں کو گولی کا نشانہ بنا ڈالتا۔ (نسطیبُر سے) خیر یہ بتاؤ کہ تمہاری گاؤں کا تھان کس طرف ہے؟ بتاؤ تمہارا خاوند کہاں ہے؟

نسطیبُر:۔ زیادہ دور نہیں۔ برابر کے دروازے سے گھس کر وہاں جا سکتے ہو۔

مسافر:۔ اچھا میں ڈھونڈھ لونگا۔ بھیس جانے سے قبل . . . (وہ اپنی جیب سے موٹی سی نکال کر نسطیبُر کے ہاتھ باندھ دیتا ہے۔ پھر منہ میں کپڑا ٹھونسنے لگتا ہے۔ بوڑھی عورت موقعہ پاکر ریوالور اچک لیتی ہے اور پھر مسافر کی پیٹھ پر نشانہ باندھ کر زور سے کہتی ہے)

بوڑھی عورت:۔ ہاتھ اٹھاؤ۔ فوراً ہاتھ اٹھاؤ۔ ذرا بھی حرکت کی تو جان جاتی رہیگی۔ (وہ بائیں ہاتھ سے دوسرا ریوالور اسکی جیب سے نکال لیتی ہے) اچھا۔ اب لڑکی کے ہاتھ کھولو۔ تم نے باندھے ہیں۔ تم ہی کھولو۔ چلو۔ جلدی کرو۔

(مسافر نسطیبُر کے ہاتھ کھول دیتا ہے۔ نسطیبُر منہ کے اندر ٹھسا ہوا کپڑا نکال دیتی ہے)

مسافر:۔ (بے تحاشہ ہنستے ہوئے) بڑی ہوشیار لڑکیاں ہو تم (نسطیبُر اور لیبو بہ حیران ہو کر اسکی طرف دیکھتی ہیں) اچھی چالاکی دکھائی۔ بہت خوب۔ (لیبوبر ریوالور کی نال نیچے جھکا لیتی ہے) میں سرکاری ہدایت کار ہوں۔

لیبوبر:۔ کیا مطلب؟

مسافر:۔ مجھے سوویت یونین کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے۔ میرا کام یہ ہے کہ تمام اہم مقامات کا دورہ لگاؤں اور اچھی طرح جائزہ لیتے ہوئے یہ معلوم کروں کہ ہر کام صحیح طریقے پر انجام پا رہا ہے یا نہیں۔ یہ دیکھو۔ یہ ہے میری شخصیت کا تصدیق نامہ۔ (جیب میں سے ایک دستاویز نکال کر نسطیبُر کو دیتا ہے) اگر تم پڑھنا جانتی ہو تو اسے پڑھ کر دیکھ لو۔

نسطیبُر:۔ (دستاویز لیکر پڑھتی ہے اور پھر لیبوبر اسے پڑھتی ہے) ٹھیک ہے تم شہر سے آئے ہو اور سرکاری ہدایت کار کی حیثیت سے ہو۔ لیکن مطلب کیا ہوا؟

مسافر:۔ میں بیان کر دوں گا۔ لیکن پہلے یہ بتا دوں کہ (نسطیبُر سے) تمہارا طریقہ کار درست نہیں ہے۔ تم نے فوراً مجھے بتا دیا کہ پل کہاں ہے اور شہر کتنی دور ہے۔ بلکہ مجھے لقمہ دیکر خود تم نے میرے لئے یہ کہنا آسان کر دیا کہ میں کون ہوں، کہاں سے آ رہا ہوں۔ اور کہاں جاؤں گا۔ حالانکہ میں یہ سب باتیں تم سے اگلوا رہا تھا۔ تمہیں اجنبی لوگوں سے گفتگو کرتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ اگرچہ اس جگہ امن و عافیت کی فضا قائم ہے تاہم اس حقیقت کو فراموش کرنا نہیں چاہیئے کہ دوسرے مقامات پر خوب لڑائی ہو رہی ہے۔ دشمن بہت چالاک اور عیار ہیں۔ اسلئے ہو سکتا ہے کہ یہ پرسکون مقام بھی کل محاذِ جنگ بن جائے۔ (لیبوبر سے) البتہ تم بہت چست اور چالاک ہو۔ غالباً تم ہی راستے میں مجھے ملی تھیں اور مجھے اس کوٹھری کی طرف آنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن چلے جانے کی بجائے تم لوٹ آئیں اور وہ بھی ایک بوڑھی عورت کا بھیس بدلکر۔ بہت خوب ہے! تمہاری یہ اداکاری لائقِ تحسین ہے۔ میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں تم نے اس ہوشیاری سے سوانگ بھرا کہ میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا۔

لیو بر:- خیر اب تمہیں ہمارے ساتھ کھیتوں کی طرف چلنا پڑے گا۔

مسافر:- نہیں۔ پھر دیکھا جائیگا۔ فی الحال میں یہ تسلیم کرسکتا ہوں کہ تم نے خوب اداکاری کی۔ (احتراماً جھکتا ہے) لیکن آئندہ بھی اتنی ہی احتیاط برتنا۔ آج تم اپنی آزمائش میں کامیاب ہوگئی ہو۔ میں افسر اعلیٰ سے تعریفی الفاظ میں تمہارا ذکر کروں گا۔ سرکاری رپورٹوں میں تمہارا ذکر خیر سنہرے الفاظ میں کیاجائے گا۔ شاید کوئی انعام بھی مل جائے لیکن اب مجھے آگے جانا چاہیئے۔ کئی جگہ معائنہ کرنا ہے۔

نسطیئر:- تمہارے قول کے مطابق ہم اس آزمائش میں کامیاب ہو گئے۔

مسافر:- ہاں شاندار طریقے پر۔

نسطیئر:- لیکن تم- تمہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ (لیو بر کے ہاتھ سے ایک ریوالور لیتی ہے) ٹھیر جاؤ۔

مسافر:- مطلب کیا ہے؟ میں نے ہر بات وضاحت سے بیان کردی ہے۔

نسطیئر:- جہاں کھڑے ہو، بغیر ہلے جلے کھڑے رہو۔

مسافر:- کیوں؟ کیا تم کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ میں نے صاف روسی زبان میں تم کو سب باتیں سمجھائی ہیں۔

نسطیئر:- ہاں روسی زبان میں۔ لیکن سویٹ یونین کے مقررہ الفاظ میں نہیں۔

مسافر:- کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس سے تمہارا مطلب کیا ہے؟

نسطیئر:- سنو۔ ایک سویٹ ہدایت کار یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ "بڑی ہوشیار لڑکیاں ہو تم" اور پھر تعریف کرتے وقت احتراماً سر جھکانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

مسافر:- اوہ۔ یہ بات ہے لیکن میں نے یہ سب کچھ ارادتاً بلکہ مصلحتاً کیا۔

نسطیئر:- اور یہ جوتے جو تم پہنے ہوئے ہو یہ بھی کسی مصلحت کے ماتحت ہیں؟

مسافر:- میرے جوتے! (حیران ہوکر ان کی طرف دیکھتا ہے)

نسطیئر:- تم اس قسم کے جوتے روس بھر میں کہیں نہیں خرید سکتے۔ جب میری نظران پر پڑی، میں اصل تہ کو پہنچ گئی۔ اچھا ادھر آؤ۔ بدمعاش کمینے جاسوس!

(جلدی سے باہر نکل جاتی ہے)

مسافر: (اپنے جوتوں پر نظر ڈالتے ہوئے) ستیاناس ہو ان کم بخت جوتوں کا۔

لیو بر:- تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ بیشک ستیاناس ہیں، خصوصاً تمہارے حق میں۔

مسافر:- سن لڑکی! مجھے روپے کی ضرورت ہے۔ میں بہت روپے دے سکتا ہوں۔ میں اتنی زیادہ رقم پیش کرونگا جو تم تو ایک سال میں بھی نہیں کما سکوگی۔

لیو بر:- بیٹھ جاؤ۔ اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کرو۔ میں ہر سال آٹھ سو دن کا کام کرتی ہوں۔ ان کی اجرت بہت کافی ہو جاتی ہے۔ پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔

مسافر:- اچھا کان کھول کر سن لو۔ سو آدمی میرے پیچھے میری مدد کے لئے آرہے ہیں۔ میں نے لیمپ کی روشنی سے ان کو خاص اشارہ دیا تھا۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتی ہو تو مجھے خاموشی کے ساتھ چلا جانے دو۔

لیو بر:- فکر نہ کرو۔ تمہارے سو آدمیوں کا استقبال کرنے کے لئے ہم کھیت کے سب آدمیوں کو جمع کرلینگے۔

مسافر:- ہمارے پاس بندوقیں ہیں اور بے قیاس سامان حرب۔

لیو بر:- اور کیا تم سمجھتے ہو۔ ہمارے پاس درانتیوں اور کدالوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ عرصہ دراز سے میری آرزو تھی کہ کوئی کم بخت فاشی میرے ہتھے چڑھے اور میں اس کی آنکھوں کو اپنی گولی کا نشانہ بناؤں۔ میں انتظار کرتی رہی۔ اور آج اس انتظار کی گھڑیاں پوری ہوگئیں۔ تم ظالموں کی ٹکڑی میں خواہ سو بھیڑیے ہوں، خواہ ایک ہزار، ہم ایک کو بھی زندہ بچکر جانے نہیں دینگے (باہر بندوق چلنے کی آواز سنائی دیتی ہے) ارے! یہ کیا؟

مسافر:- (اچھل کر) ہمارے سو آدمی آن پہنچے۔

لیو بر:- آگئے تو آجانے دو۔ تمہیں خاموش رہنا چاہیئے۔ ورنہ ابھی لقمۂ اجل بنجاؤگے۔

(نسطیئر داخل ہوتی ہے)

نسطیئر:- ایک اور خبیث چھپتا چھپاتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ (مسافر سے) میرے ساتھ آؤ۔ اب تمہاری باری ہے۔

آئندہ اشاعت کے چند منتخب مضامین

۱- مرثیۂ سائل .... حضرت نوح ناروی ....
۲- سائل اور ان کی شاعری .... جناب نہال سیوہاروی ....
۳- پتھر کی مورت (افسانہ) .... ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ....
۴- آفرینش نظام شمسی .... پروفیسر محمد رشید فریدی (بریلی) ....
۵- دکنی مرثیوں پر ایک طائرانہ نظر ... جناب نصیر الدین ہاشمی (حیدرآباد) ...
۶- کنیڈا اور ہندوستان کے مابین تجارت ... محترمہ مسز لارانی بھردواج ....
۷- آتش (ڈرامہ) .... جناب سید بادشاہ حسین (حیدرآباد)
۸- ہندوستان میں آبپاشی .... جناب ام بہادری ننگ پال ....
۹- بیگم شمرو .... جناب ظفر قریشی دہلوی ....
۱۰- مچھلیوں کی کیمیاوی پرورش ... محترمہ جون ہینی ....
۱۱- تیر اندازی کے آئندہ فاکلے .... سردار ہیر دمن سنگھ ....
۱۲- کباب سیخ (افسانہ) .... محترمہ ف۔م۔خانم ....
۱۳- غزل .... جناب جاں نثار اختر ....
۱۴- شعلۂ حذرات .... جناب ادیب مالیگانوی ....
۱۵- غریب نواز .... جناب ناصر لکھنوی ....

«شیش محل» لاہور کی ایک جھلک۔

E FOR DESCRIPTIVE LEAFLET CONTAINING FULL PARTICULARS TO:

UNITED PUBLICATIONS

ہندوستان
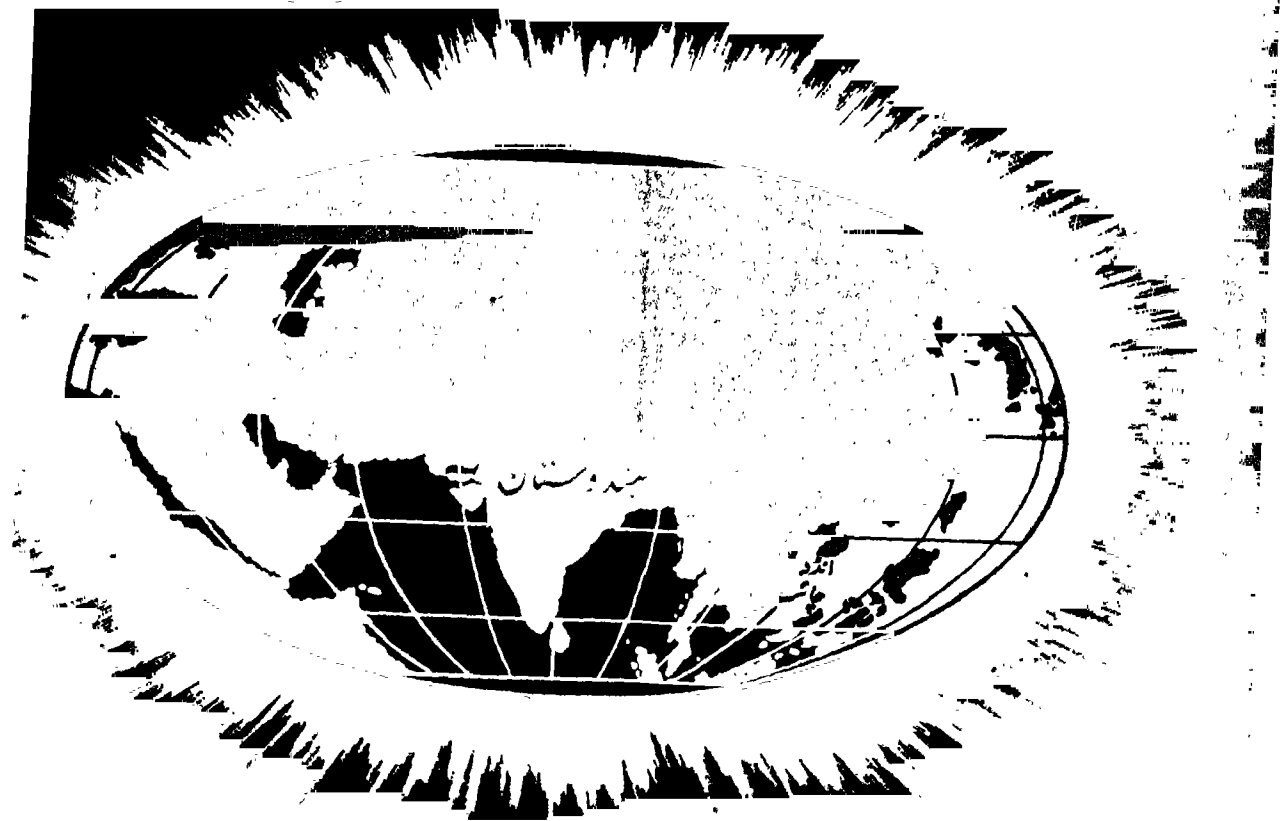
طنجہ کی دو جھلکیاں

طنجہ سیاسی نقطۂ نظر سے اہم ہونے کے علاوہ دنیا کے بہت ہی رنگین اور رومانی مقامات میں سے ہے۔ یہ ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں کے باشندے خوددار اور محنتی ہیں اور بھیک نہیں مانگتے۔ شہر صاف ہے اور عمارتیں خوبصورت ہیں۔

عجائب خانہ کا یہ بوڑھا محافظ یہاں آنے والوں کا استقبال ایسی گرمجوشی کے ساتھ کرتا ہے گویا وہ اسی کے مہمان ہیں۔
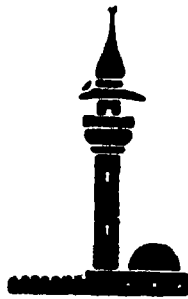
طنجہ کی ایک گلی جس میں تنگی کی وجہ سے گاڑیاں نہیں آ جا سکتیں۔

بچّوں کے لئے بسکٹ کے انتخاب میں ماں کو چکھنے کی
ضرورت نہیں ہے۔ اگر ممکن ہوا تو وہ ہمیشہ برطانیہ بسکٹ
خریدیگی۔ کیونکہ وہ لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ صحت بخش بھی ہوتے ہیں
برطانیہ بسکٹ
پہلی ضرورت
اسی کی ہے

سالانہ چندہ دس روپے ششماہی چھ روپے | سال ۴ - نمبر ۱۴ | فہرست | ۱۵ دسمبر ۱۹۴۵ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	نقارِ زمانہ	ادارہ	۴
۲	مرثیہ	تحقیق شعرا حضرت نوح ناروی	۷
۳	سائنس اور اس کی شاعری	جناب ... سیوہاروی	۸
۴	قطعہ تاریخ وفات	جناب غضنفر علی غضنفر	۹
۵	قطعہ تاریخ وفات	جناب تمنا [illegible]	۱۱
۶	پتھر کی مورت (افسانہ)	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	۱۲
۷	مونالیزا - بین رڈوے (نظم)	جناب عبدالحسیم شیرکوٹی	۱۵
۸	بیگم شمرو	جناب لطف ... دہلوی	۱۶
۹	شعلۂ جذبات (غزل)	جناب ادیب مالیگانوی	۱۹
۱۰	دکنی رتوں پہ ایک طائرانہ نظر	پروفیسر نصیرالدین ہاشمی	۲۰
۱۱	کباب سیخ (افسانہ)	محترمہ الف۔ ایم خانم	۲۳
۱۲	پانی کی قیمت	جناب نفس لکھنوی (مدیر نظارہ لکھنؤ)	۲۶
۱۳	ماتم سرِ ...	جناب نہال سیوہاروی	۳۵
۱۴	مچھلیوں کی کیمیاوی پرورش	محترمہ جون مینی	۳۶
۱۵	ہندوستان اور ایران کے ثقافتی تعلقات	جناب م۔ ن۔ سمیعی طہرانی	۳۷
۱۶	دھندلکا (نظم)	جناب نعیم الرحمٰن صاحب	۳۸
۱۷	آفرینش نظام شمسی	پروفیسر رشید فریدی	۳۹
۱۸	غزل	پروفیسر سید جاں نثار اختر	۴۱
۱۹	غزل	جناب عزم اکبرآبادی	۴۳
۲۰	غزل	جناب آرزو اکبرآبادی	۴۳
۲۱	کینیڈا اور ہندوستان کے بین تجارت	محترمہ سرلا رانی [illegible]	۴۵
۲۲	دو گیت	جناب ہرگوبند ادیب [illegible]	۴۶
۲۳	آتش (فیچر)	سید بادشاہ حسین حیدرآبادی	۴۷
۲۴	ہندوستان میں آبپاشی	جناب رام بہاری ننگپال	۵۰
۲۵	پس اندازی کے آئندہ فائدے	سردار پرمن سنگھ	۵۲
۲۶	اِدھر اُدھر سے	ادارہ	۵۵
۲۷	چینگ نو	محترمہ پاربتی مینن	۵۶
۲۸	نقد و نظر	"ف۔ ح"	۵۹

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی۔ اے (علیگ)۔ ایل۔ ایل۔ بی

نائب مدیر
راجیندر ناتھ شیدا
ایم۔ اے

فضل حق قریشی
دہلوی

مشیر احمد
ایم۔ اے

ادارہ مطبوعات متحدہ — پوسٹ بکس ۲۶۲ دہلی

بین الاقوامی نظامِ تعلیم

متحدہ اقوام کی اس کانفرنس میں جو گذشتہ مہینے لندن میں منعقد ہوئی بہت سے اہم مسائل کے ساتھ چوالیس اراکین نے اس امر کا فیصلہ بھی کیا ہے کہ ایک عالمگیر نظامِ تعلیم قائم کیا جائے اور اس کی داغ بیل اس طرح پڑے کہ ہر ملک اور ملک کے ہر حصے میں ثقافتی معیار بلند ہو جائے۔ اگر یہ تجویز باقاعدہ عمل میں آگئی تو اس کا نام "متحدہ اقوام کا تعلیمی سائنسی اور ثقافتی نظام" ہوگا۔ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ تعلیم کا مسئلہ تاریخ عالم میں پہلی بار بین الاقوامی حیثیت اختیار کریگا کیونکہ اس سے قبل کبھی اس پہلو پر اسقدر گہرائی اور دور رسی کے ساتھ غور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اسطرح تعلیمی سرگرمیاں قومی حدود کو توڑ کر اپنی سرحدوں سے پرے ہو جائینگی۔

اس سلسلے میں بعض نہایت ہی اہم اصول مرتب کئے ہیں اور زیادہ زور اس امر پر دیا ہے کہ جہالت اور بے علمی کو یکسر دور کر دیا جائے۔ بلاشبہ مشترکہ طور پر یقین و اعتماد ترقی پا جانے کے بعد ہی امن و عافیت کی فضا ساری دنیا میں قائم ہو سکتی ہے۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ مختلف ملکوں کے مابین استادوں اور فن کے جاننے والوں کا تبادلہ بڑے پیمانہ پر کیا جائے۔ نیز ہر قسم کی تعلیمی کتابیں وغیرہ دوسرے ملکوں میں بھیجی جائیں تاکہ نت نئی معلومات سے پوری طرح واقف رہنے کے ساتھ ساتھ ان سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا جا سکے۔ اس نظام کا صدر مقام پیرس میں ہوگا اور اس کی صحیح آزمائش اسوقت اپنا رنگ لائیگی جب عملی مرحلے طے کرنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا جائیگا۔ فی الحال ایک سب کمیٹی بنائی جانے والی ہے جو ان ملکوں کی ضروریات کا مطالعہ کرے گی جنہیں موجودہ جنگ نے تباہ کر دیا ہے اور ساتھ ہی وہ سرکاری یا نجی طور پر فوری امداد پہنچانے کی کوشش کریگی۔

جن اقوام کے نمائندے جب دستور العمل کو تسلیم کرلیں گے تو نیا نظام معرض وجود میں آجائیگا۔ ابتک مختلف ممالک کے نمائندوں نے جس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام بہت جلد پورا ہو جائے گا۔ چنانچہ قوی امید ہے کہ مستقل نظام کا پہلا اجلاس مئی ۱۹۴۶ء تک پیرس میں منعقد ہو سکے گا۔

پنجاب کا تعلیمی لائحہ عمل

حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم نے اپنے صوبے میں بعد جنگ کی تعلیمی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک نہایت مفید خاکہ تیار کیا ہے جسے حکومت نے منظور کر لیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گذشتہ پچیس سال کے دوران میں تعلیم کا زبردست پرچار رہا اور اس کو غیر معمولی وسعت حاصل ہوئی ہے لیکن پھر بھی صوبے کی مختلف نوع ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے سب قسم کے اسکولوں اور کالجوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے مطالبہ برابر جاری ہے۔ اب محکمے نے جو پنج سالہ خاکہ مرتب کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ ایسی مزید سہولتیں بہم پہنچائی جائیں کہ ہر خاص و عام کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ سب سے پہلی تجویز یہ ہے کہ ہر قسم کے استادوں کی تنخواہیں بڑھا دی جائیں اور ایسے مدرسوں کے لئے جہاں استادوں کی کمی محسوس کی جاتی رہی ہے کم و بیش ڈیڑھ ہزار استاد رکھے جائیں۔ نیز غریب اور مستحق طلبا کو زیادہ سے زیادہ وظیفے دئے جائیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ کے وظائف دینے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

پورا خاکہ پانچ سال کے لئے ہے۔ اسکے مطابق نئے ابتدائی مدارس کھولنے کی اوسط چھ سو سالانہ رہے گی۔ ان کو کامیاب بنانے کے لئے جبریہ تعلیم کا نفاذ ہوگا۔ پھر اس خیال سے کہ بڑی عمر کے لوگ بھی جاہل اور علم سے بے بہرہ رہنے نہ پائیں، ڈھائی سو مدرسے تعلیم بالغان کے لئے جاری ہوں گے جن میں تھوڑے وقت کام کرنے والے استاد رکھے جائیں گے۔ اس سلسلے میں ان فوجیوں کی خدمات بھی حاصل کی جائیں گی جن کو فوجی ملازمت سے الگ کر دیا گیا ہو اور وہ پڑھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ مڈل اسکولوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا۔ اسی طرح ہر سال پانچ نئے ہائی اسکول اور ایک کالج کھولنے کی کوشش کی جائے گی۔ صرف فنی تعلیم کو ترقی دینے کے لئے تقریباً پونے دس لاکھ روپے مخصوص کر دئے گئے ہیں۔ محکمہ تعلیم کے دو افسران ہر سال غیر ملکوں میں اس غرض سے بھیجے جایا کریں گے کہ وہ وہاں کی نت نئی تعلیمی سرگرمیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے ملک کے سامنے بہتر نصاب تعلیم پیش کر سکیں۔

حیدرآباد کی بعد جنگ ترقیاں

ایک پریس کانفرنس میں جس میں حیدرآباد کی مجلس انتظامیہ کے صدر نواب صاحب چھتاری اور دوسرے افسران موجود تھے، بتایا گیا کہ زراعت اور صنعت و حرفت کو وسعت اور عوام کی صحت و تعلیم کو ترقی دینے کے لئے ریاست نے ایک خاکہ مرتب کیا ہے جس پر ابتدائی پندرہ سال کے دوران میں تین ارب سینتالیس کروڑ اڑسٹھ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ اس خاکے کے بموجب لوگوں کے عام معیار زندگی میں اضافہ ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ قومی دولت اور روپے کی قوت خرید بڑھ جائے گی۔ زراعت کی ترقی اور مویشیوں کی پرورش کے سلسلے میں جس قدر رقم صرف ہوگی اس کا اندازہ سوا اکیاون کروڑ کے قریب ہے۔ خاکے کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ زراعتی تحقیقات کے نتائج کو عملی طور پر آزمانے کے لیے ہر تعلقے کے صدر مقام میں ۲۵۰ ایکڑ زمین کا قطعہ مخصوص کر دیا جائے۔ نیز وہ اراضیات جو دیہات کے مہاجنوں کے پاس رہن پڑی ہیں اور ان کو استعمال نہیں کیا جا رہا ہے واپس لے کر کھیتی باڑی کے لئے مفید کر لیا جائے۔ آبپاشی کے جدید طریقوں کو بھی اختیار کرنے کی ضرورت ہوگی۔

ان صنعتوں میں جن کو ترقی دینے کی تجویز ہے، پارچہ بافی اور تیل نکالنے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ پارچہ بافی کے سلسلے میں طے پایا ہے کہ ۴۵۰۰ (؟) تکلوں اور ۱۱۰ (؟) کرگھوں کا اضافہ کرنے کے ساتھ چھ نئے کارخانے کھولے جائیں۔ اور جو موجود ہیں ان میں کسی قدر کفایت شعاری سے کام لیا جائے۔ تیل کے سلسلے میں فوراً ایک مرکزی کارخانہ کھولا جائے جو تیس ہزار ٹن بناسپتی گھی اور بغیر بو والے تیل بنا سکے۔ ان کے علاوہ زرخیزی پیدا کرنے کے لئے کیمیاوی مرکبات کا اور ایک سیمنٹ کا کارخانہ گوداوری کے علاقے میں قائم ہوگا۔

صحت عامہ کی دیکھ بھال کے لئے حفظان صحت کے مرکز ہر گاؤں میں قائم ہوں گے اور ایسے دس گاؤں کو ایک نظام کے ماتحت رکھا جائیگا۔ ادویات کے دیسی طریقوں کو بھی اس ضمن میں شامل کیا گیا ہے۔ پندرہ سال کے عرصے میں تعلیمی ترقی کے لئے خرچ کا اندازہ پینتالیس ارب چھبیس کروڑ لگایا ہے۔ ابتدائی تعلیم ریاست کے ہر باشندے کے لئے لازمی ہوگی۔

سکندرآباد کی واپسی

سکندرآباد کی واپسی کا سوال عرصہ دراز سے بادشاہ سلامت کی حکومت کے پیش نظر تھا اور اس پر کافی غور و خوض سے کام لیا جا رہا تھا۔ آخرکار حکومت نے ازراہ عنایت اسکا الحاق ریاست حیدرآباد کے ساتھ منظور کر لیا اور یکم دسمبر ۱۹۴۵ء سے وہ سلطنت نظام میں شامل ہو گیا۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ۱۷۹۸ء (؟) اور ۱۸۰۰ء کے معاہدوں کے بموجب ایسٹ انڈیا کمپنی اور نظام دکن کے مابین طے پایا تھا کہ کمپنی کے بہت سے دستے ذاتی محافظت و مدافعت کے خیال سے حسین ساگر نامی جھیل کے شمالی اضلاع میں مستقل طور پر رہا کریں گے۔ چنانچہ ۱۸۰۶ء (؟) سے وہاں فوجی تنظیم و نسق قائم ہوا اور باقاعدہ چھاؤنی بن گئی جس کا نام حیدرآباد کے اس زمانے کے حکمراں کے نام پر سکندرآباد رکھا گیا۔ چھاؤنی قائم ہونے کے بعد لوگوں کی توجہ کاروباری اعتبار سے اس طرف مبذول ہوئی اور بڑی تیزی کے ساتھ شہری آبادی میں اضافہ ہونے لگا یہاں تک کہ فوجی آسائشوں میں رخنے پیدا ہوگئے۔ اس لئے چھاؤنی کا مرکز شمال اور مشرق کی جانب ہٹتا چلا گیا اور سکندرآباد کی شہری آبادی نے ایک علیحدہ صورت اختیار کر لی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ چونکہ فوجی سلاح کا اصل شہر سے کوئی تعلق نہیں رہا اس لے اس کی واپسی کا سوال اٹھایا گیا اور نظام دکن کی درخواست قبول کر لی گئی۔ شہر کی موجودہ آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ وہاں کی کئی صنعتیں مشہور ہیں اور تجارتی اعتبار سے بھی شہر کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔

چھپن لاکھ روپے کے ہیرے

ہز ہائینس سر آغا خاں کی ڈائمنڈ جوبلی کے سلسلے میں چند مزید اطلاعات ملی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں ہیروں سے تولنے کی رسم ۲۰ مارچ کو بمبئی میں ادا ہوگی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کا وزن ۲۴۵ پونڈ ہوگا لیکن احتیاط کے طور پر پانچ لاکھ قیراط یعنی تقریباً ۲۶۴ پونڈ ہیروں کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اتنی کثیر مقدار میں خصوصاً آجکل ہیروں کا جمع ہونا بظاہر مشکل ہے تاہم حکومت برطانیہ کے ڈائمنڈ کنٹرولر کے تعاون سے انگلستان کی دو کمپنیوں نے جو ہیروں کی تجارت میں مشہور ہیں، ذمہ لیا ہے کہ وہ اتنی مقدار کے ہیرے کسی نہ کسی طرح جمع کر کے عارضی طور پر دیدیں گی۔ ہیروں سے تولنا محض رسمی طور پر ہوگا، تاکہ وزن کا لحاظ رکھتے ہوئے اصل قیمت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ کل رقم جو چھپن لاکھ روپے کے قریب ہوگی ہندوستان اور افریقہ کے ان غریبوں میں تقسیم کر دی جائے گی جو اسماعیلی فرقے میں شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نصف رقم زراعتی توسیع کے لئے ہوگی اور نصف اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لئے اور روپے کی تقسیم خود آغا خاں کی مرضی کے مطابق عمل میں آئیگی۔

دلّی کے نیچے خلا

حکومت ہند کے مشیر معدنیات مسٹر ڈی۔ این۔ واڈیا نے دہلی میں ایک تقریر کے دوران میں اس دلچسپ حقیقت کا انکشاف کیا کہ دلی کے نیچے اور پنجاب اور راجپوتانہ کے درمیان زمین میں ایک ساڑھے چھ ہزار فٹ گہرا خلا ہے لیکن اس کو پر کرنے کا کام دریا برابر انجام دے رہے ہیں۔ ٹھوس زمین کی دبازت ۳۰ (؟) میل ہے اور جن مادّوں سے زمین بنی ہے انہیں تغیر شدید (؟) دقیق ہیں اسی وجہ سے پہاڑ اپنی جگہ سے سرکتے اور براعظم ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ کوہ ہمالیہ کا بوجھ سہارنے کو زمین کی دبازت کافی ہے مگر ہمالیہ کا دباؤ اسکی قوت برداشت سے باہر ہے۔

مرثیہ

نوح ناروی

بر وفات حسرت آیات جناب ابو المعظم نواب مرزا سراج الدین احمد خانصاحب سائل دہلوی

آج دنیائے سخن کیوں مورد آلام ہے
آج کیوں ارباب فن میں ہر طرف کہرام ہے

آہ کاہش آہ کاوش آج دونی ہو گئی
آہ دلی آہ دلی آج سونی ہو گئی

قوت ضبط و تحمل سے رہا جاتا نہیں
منہ کو آتا ہے کلیجہ کچھ کہا جاتا نہیں

دفعتاً تاریکی قسمت کا پھیرا ہو گیا
مٹ گئی ساری تجلی گھپ اندھیرا ہو گیا

دل تڑپنے سے کوئی لحظہ کو رکتا نہیں
دامن تسکیں کسی صورت ہاتھ آتا نہیں

دے دیا فکر و تردد کا سبق افلاک نے
بے طرح الٹا زمانے کا ورق افلاک نے

زمزمہ پردازیاں رنگیں چمن کی ہائے ہائے
معرکہ آرائیاں بزم سخن کی ہائے ہائے

آفتاب آسمان کا زیر زمیں پوشیدہ ہے
کثرت گریہ سے ہر دیدہ ہے وہ نم دیدہ ہے

حوصلہ مندی کی فضائیں خاک میں سب مل گئیں
لالہ و گلزار کی ہنسیں قبر داغم سے جل گئیں

ہر در و دیوار پر بے رونقی سی چھا گئی
وقت سے پہلے زمانے میں قیامت آ گئی

کم ہیں انساں جن کے حق میں کسی انساں کا غم
قہر ہے مرزا سراج الدین احمد خاں کا غم

داغ دیکر حضرت سائل جہاں سے اٹھ گئے
داغ کی آغوش میں پہنچے یہاں سے اٹھ گئے

داغ ہی کا داغ دنیا کے لئے کچھ کم نہ تھا
کونسا وہ دل تھا جو پر داغ فرط غم نہ تھا

بھول کر بھی عرض حاجت کی نہ کرتا مال تھا
تھا تخلص صرف سائل ورنہ وہ سائل نہ تھا

ایک مدت تک کہن میں کچھ دکھائی رہی
دم بدم ساعت بساعت بزم آرائی رہی

فیض دونوں نے اٹھایا صحبت استاد کا
سیکھ لی طرز سخن گوئی سخن ایجاد سے

کون کہہ سکتا ہے اب تذکرے بے سود ہیں
دیکھنے والے مرتبے کے ابھی موجود ہیں

جانتے تھے ناس وہ اپنا تمنائی سب تھے
کس کو بھائی میں کہوں کہ ان سب کے بھائی تھے

پاک فطرت پاک سیرت اور انسا کون تھا
نیک نیت نیک خصلت اور انسا کون تھا

خوش زبانی وضعداری جا بجا ہی ختم تھی
دلربائی دلستانی دل فریبی ختم تھی

قول فیصل سب موقع یاد کیا کیا آئیگا
جو پڑیگی بحث سے کیونکر کوئی سمجھائیگا

کس کی تحقیقات پر فکر رسا اترائے گی
کس کی بولی متن عالم میں مانی جائیگی

ہائے وہ ان کا تکلم وہ ادب دانی کی شان
ہائے وہ انکا ترنم وہ غزل خوانی کی شان

جب نہ مشکل حل ہو پائیں اپنے دل کے پاس
کس سے لیں اصلاح شاگرد ایڈیٹر کس کے پاس

تھا جہاں آباد میں جس کے وقار شاعری
تخت گھر سے اٹھ گیا وہ تاجدار شاعری

دن گذارے زندگی کے حشمت و شوکت کے ساتھ
ملنے والا کوئی آیا تو ملے الفت کے ساتھ

تھے ہزاروں نکتہ ہائے خوب تر ہر بات میں
جمع تھے لاکھوں فضائل آپ ہی کی ذات میں

جو غزل لکھی وہ معنی کا خزینہ بن گئی
بیت جو نکلی قلم سے وہ نگینہ بن گئی

حرف لکھنا سہل تھا ان نکتہ چیں کیواسطے
لفظ جیسا تھا جہاں بھی تھا وہیں کیواسطے

قدر دانوں سے کوئی پوچھے یہ کیسی موت ہے
درحقیقت شاعری کی موت ایسی موت ہے

دیکھکر مغموم بیگم صاحبہ کو اس طرح
چین اعزا کو اگر آئے تو آئے کس طرح

آرزوئیں خون ہو کر چشم تر سے بہہ گئیں
وہ نہ باقی رہ گئے صرف انکی باتیں رہ گئیں

روح فرسا درد و غم ایک ایک دل کو دے گئے
خاندانی جو شرف تھا ساتھ اپنے لے گئے

روک لینا آنسوؤں کا کس کے ہے امکان میں
جان ہے اہل عزا کی مبتلا ہیجان میں

جسقدر احباب تھے اس رسم پر مائل ہوئے
ابن سائل جانشین حضرت سائل ہوئے

قدسیہ کا تذکرہ تھا پردۂ فریاد میں
داغ تھا محبوب کا تازہ دل ناشاد میں

سر بسر گریاں ہوئے نالاں ہوئے غمگیں ہوئے
باپ کے سایہ سے بھی محروم قطب الدین ہوئے

جب نگاہ حسرت آگیں جانب مدفن گئی
سرمۂ چشم بصیرت خاک مرقد بن گئی

بھیڑ سنسان گھر تکلیف روحانی ہوئی
شعر خوانی کے عوض میں مرثیہ خوانی ہوئی

کچھ دنوں تک تو الم رلوائے گا تڑپائے گا
آخر آتے آتے آتے صبر آ ہی جائے گا

سب کہیں آمین سنکر اس دعائے نوح کو
دے جگہ فردوس میں اللہ انکی روح کو

سائل اور اُنکی شاعری

نہال سیوہاروی

بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار　　شب انجمن میں سائلِ جادو بیان تھا
(حالی بتصرف)

خاکِ دہلی اپنے نشو ونمائے شاعرانہ کے جوہر دکھا چکی تھی، سراج الدین خان آرزو میر، سودا، درد، ذوق، غالب، مومن، آزردہ، صہبائی، مجروح، حالی، آزاد اور داغ جیسے اربابِ کمال اس اُمّ الادب کی فضاؤں میں پروان چڑھ کر اپنے شاعرانہ کمالات کا لوہا ایک دنیا سے منوا چکے تھے کہ ۲ شوال ۱۲۸۱ھ المطابق ۱۸۶۴ء کو ایک گوہر گرانمایہ اس معدنِ ادب سے عالمِ وجود میں آیا جس نے سراج الدین خاں نام اور سائل تخلص سے ادبی دنیا میں اپنا پرچم شہرت لہرایا۔ مرزا غالب نے دنیائے ادب کے اس ہمیر نو کی آمد پر مندرجہ ذیل فارسی قطعہ لکھا جو اُن کے لسان الغیب ہونے کی دلیل ہے:-

درخشید از سپہر جاہ ماہے　　بفرخ طالع و فرخندہ ہنگام
نہے چشم و چراغ دودۂ حسن　　کہ افزاید فروغ دینِ اسلام
سراج الدین احمد خاں بہادر　　نہادند اخترِ رخشندہ را نام
ہمیں نام است تاریخ ولادت　　خوشا نام آور شائستہ فرجام
خدایا اندریں گیتی کہ آنرا　　نداند جز تو کس آغاز و انجام
رسد تا قطرہ زن ابر از پئے باد　　شود تا جلوہ گر صبح از پس شام
نگہدار ایں ہمایوں نامور را　　نشانندش ز طالع عیش و آرام

مرزا سراج الدین احمد خان سائل نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے تیسرے بیٹے اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں جاگیردار لوہارو کے پوتے تھے۔ خاندانی شجرہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائیگا کہ مرزا غالب مرزا ضیاء الدین احمد خاں کے بہنوئی ہوتے ہیں۔ یہ مسافرِ راہِ ہستی ابھی عمر کی چھٹی منزل کو نہ پہنچا تھا کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، دادا اور چچا نے اپنے ظلہائے عاطفت میں پروان چڑھایا، نواب غلام حسین خاں محو شاگرد مرزا غالب اور شاہزادہ عبدالغنی ارشد گورگانی جیسے نامور اساتذہ کی شاگردی کا فخر حاصل تھا، اول الذکر عربی و فارسی کے اُستاد اور آخر الذکر ان کے اولین رہنمائے عرصۂ سخن تھے۔ آپ نے چودہ سال کی عمر میں علوم متداولہ کی اچھی استعداد حاصل کر لی تھی اور میدانِ شاعری میں گامزن ہو گئے تھے۔ تخلص کے باب میں نواب سعید الدین احمد خان طالب اور دوسرے حاضرین جلسہ ایک روز سرگرمِ فکر تھے کہ ایک شریف اور سوالی صورت انسان نے آکر سلام کیا۔ غرضِ تشریف آوری معلوم کرنے پر آنے والے صاحب نے عرض کیا کہ سائل ہوں چنانچہ اسی لفظ سائل کی طرف توجہ منعطف ہوئی، قرعہ ڈالا گیا اور حسبِ مراد حاصل ہوا۔ قدرت کی نیرنگی دیکھئے کہ جو شخص خاندانی نواب ہو اور یہ کہے کہ "نواب پانچ پشتوں سے اسکا خطاب ہے" اس کے لئے بارگاہِ شعر میں سائل سے زیادہ موزوں تخلص دوسرا تجویز نہ ہو۔ کچھ عرصہ کی مشقِ سخن کے بعد حضرت سائل فصیح الملک نواب مرزا خان داغ کے شاگرد ہوئے بلکہ عقدِ ثانی ان کی نسبتی صاحبزادی سے کیا اور مدتوں حضرت داغ کی خدمت میں رہ کر شعر و ادب کی دشوار گذار وادیوں کو طے فرمایا۔ چنانچہ اپنے طغرائے امتیاز میں فرماتے ہیں ؎

تاجِ ارشد، جامِ غالب، ماہِ داغ　　سائل اندر کاسہ دارد سہ چراغ

اسی حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر باندازِ دگر یوں فرماتے ہیں:-

رفیق کرتے ہیں ایراد کیوں تخلص پر　　ہنر کو چھوڑ کے نسبت سے باوقار ہوں میں
ظہیر و غالب و ارشد کا ہوں جگر گوشہ　　جنابِ داغ کا تلمیذ و یادگار ہوں میں
امیر کرتے ہیں عزت مری بکو وہ سائل　　گلوں کے پہلو میں رہتا ہوں ایسا خار ہوں میں

حضرت سائل کے زمانۂ حیات میں یہ بات عام طور سے مشہور تھی کہ جس شخص نے مرزا غالب کو پیکرِ عنصری میں نہ دیکھا ہو وہ حضرت سائل کو دیکھ لے اور وہ حقیقتاً اپنی بلند قامتی و دلکش خد و خال کے باعث ایسے وجیہہ انسان تھے کہ انکی نظیر سرزمینِ جہان آباد میں شاید ہی نظر آسکے، چہرے کا رنگ سرخ و سپید تھا جس سے باوجود عالمِ ہشتاد سالگی جلال و جاذبیت نمایاں تھی۔ ان کا لباس دہلی مرحوم کے گذشتہ تمدن کی یاد تازہ کرتا تھا۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی کہ شاہزادگانِ خاندانِ تیموری کے ساتھ مخصوص ہے اور مغلئی انگرکھا زیب تن فرماتے تھے۔ ان کے زمانۂ شاعری سے بیشتر نظم و غزل کو ترنم سے مشاعروں اور دیگر ادبی مجلسوں میں پڑھنے کا دستور نہ تھا مگر ان کی خوش الحانی یہاں تک ہندوستان گیر ہوئی کہ ترنم اس ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشے تک مقبول و مرغوب ہوا۔ با ایں ہمہ ان کے منفرد اندازِ غزل خوانی کی تقلید کسی سے بن نہ آئی، قدرت کی فیاضی نے اس دلکش صنعت انسان کو حسنِ صورت کے علاوہ حسنِ سیرت سے بھی بدرجۂ اتم سرفراز فرمایا تھا۔ اپنے مخالفین کی سنگباری کے جواب میں وہ صبر و تحمل کے علاوہ کسی دوسرے حربے سے کام لینا جانتے ہی نہ تھے۔

اُردو غزل کی مثال اس نگارِ تلوّن مزاج کی سی ہے جس نے مختلف زمانوں میں مختلف قسم کے ملبوس زیبِ تن کئے ہوں، اس شاہدِ فتنہ ساماں نے کبھی اپنی سادگی سے دلوں کو تسخیر کیا ہے تو کبھی اپنی شوخی سے وہ قیامت ڈھائی ہے کہ نعرہائے الاماں بلند ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں ولی دکنی سے لیکر داغ و امیر تک غزل کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کا ایک مختصر سا خاکہ ملاحظہ فرمایئے۔ داغ و امیر کے بعد حالی، اکبر، اقبال، ریاض، فانی، حسرت

یگانہ، جگر، سیماب، جوش نے چمنستانِ غزل میں جو گلکاریاں کی ہیں ان کی مثالیں میں نے اس لئے پیش نہیں کیں کہ حضرت سائل کے عہدِ تغزل کو امیر و داغ کے زمانۂ غزل سرائی سے قریبی تعلق ہے۔

جادہ گر جب ترا جمال ہوا — نورِ خورشید پائمال ہوا (ولی)
دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر — لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا (سودا)
غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — دل کے جانیکا نہایت غم رہا (میر)
تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے — کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے (درد)
آسماں دردِ محبت کے جو قابل ہوتا — تو کسی سوختہ کا آبلۂ دل ہوتا (ذوق)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں (غالب)

دردِ ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا (مومن)

لیں دعمری پاس ہے اپنے نہ ملک و مال — ہم سے خلاف ہوکے کریگا زمانہ کیا (آتش)
دھوپ بہتر ہے شبِ فرقت کی بدتر چاندنی — صاعقہ کے طور سے پڑتی ہے مجھپر چاندنی (ناسخ)

کیا کہا پھر تو کہو دل کی خبر کچھ بھی نہیں
کیوں یہ کیا ہے خمِ گیسو میں اگر یہ بھی نہیں (داغ)

کھینچتی ہیں دلِ بیتاب پہ خنجر پلکیں — ناتواں پاکے چڑھالاتی ہیں لشکر پلکیں (امیر)

مندرجۂ بالا اشعار سے ولی کی سادہ نگاری، سودا کا شکوہ بیان، میر کا سوز، درد کا تصوف، ذوق و ناسخ صاحب آتش کا شیوۂ مردانہ، ناسخ و امیر کا مخصوص رنگ اور داغ کا لطفِ زبان واضح ہے، مدعا یہ ہے کہ اردو شاعری اسقدر مراحل طے کر چکی تھی کہ بزمِ دلی کا ایک ممتاز فرد پھر آرائشِ گیسوئے سخن کی طرف متوجہ ہوا۔ حضرت سائل کا ذخیرۂ شعری ایک لاکھ اشعار سے زاید ہے جسے ایک قلزمِ بے کراں کہنا مبالغہ نہ ہوگا، اس قلزمِ بیکراں میں کہیں آبِ شیریں ہے، کہیں آبِ شور، اُن کا (بقول لالہ سری رام مصنفِ خمخانۂ جاوید) یہ فرمانا کہ "میرے کلام میں نہ فلسفہ ہے نہ الٰہیات، نہ استعارے ہیں نہ تشبیہات ہیں تو صرف اپنے گھر کی زبان اور شہر کی بولی ٹھولی کو ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ادا کرتا ہوں" شاعرانہ انکسار پر مبنی ہے۔ سُنا ہے کہ مولانا حالی نے جب اپنا مشہور مسدس مدوجزرِ اسلام تصنیف فرما کر اردو شاعری میں ایک انقلابِ عظیم کی بنیاد رکھی تو کسی مردِ خیر اندیش نے فصیح الملک مرزا داغ دہلوی سے جو اپنے دور کے شہنشاہِ غزل تھے ہمنوائے سعدیِ ہند ہونے کی درخواست کی مگر فصیح الملک مرحوم نے جنکی نگاہ اپنے آرٹ اور زبان کی خوبیوں پر بقدرِ تیقن تھی اپنے جادۂ غزل سے سرِ مو انحراف نہ فرمایا۔ ماحول کا شاعری پر اثر انداز ہونا لازمی ہے اس لئے اگر حضرت سائل کے کلام میں ہمنشینیٔ حضرتِ داغ کے باعث وہ خصوصیاتِ غزل بھی نظر آئیں جو آج سے پچاس سال پیشتر محاسنِ غزل میں داخل تھیں، تو محلِ استعجاب نہیں۔ حضرت داغ کا یہ مطلع

گدائے میکدہ ہوں ہر طرح کی ہے پیالہ میں — وہ قطرہ کونسا گل میں ہے کیا ہے شاخِ لالہ میں

اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو حضرتِ سائل کی شاعری پر ایک مکمل تبصرہ ہے۔ اس بلبلِ جہاں آباد کا کلام عارفانہ، عاشقانہ، اور رندانہ مضامین کا ایک گل کدہ ہے اور زبان کا تو کہنا ہی کیا۔ استاد مرحوم اردوئے معلّیٰ کے کما حقہٗ جاننے والے اور روزمرّہ کے استعمال کو بدرجۂ کمال پہچاننے والے تھے۔ بلکہ یوں کہئیے زبان اُن کے گھر کی لونڈی تھی اور وہ آقائے زبان ؎

سرِ بزمِ سخن سائل کو سُنکر ہو چلے چرچے — جنابِ داغ کے داماد ہیں یہ دلّی والے ہیں

خدا بخشے حکیم ناصر نذیر فراق مرحوم جانشین خواجہ میر دردؒ فرمایا کرتے تھے کہ نہاں جس کلام میں رنگِ تصوف نہیں وہ غذائے بے نمک ہے، لذت سے عاری، کیف سے محروم۔ تصوف کو اردو شاعری میں داخل کرنیکا سہرا خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے سر ہے۔ انکے بعد مرزا غالب نے مرزا بیدل کے اتباع میں اپنے مائدۂ سخن میں تصوف کو ایک مناسب حصہ مرحمت فرمایا ہے، حضرتِ سائل کا کلام بھی علم معرفت کے جواہر پاروں سے خالی نہیں۔ مرزا غالب کا یہ شعر ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہر چند بے مثل ہی مگر اسی حقیقت ... بلتی جلتی حقیقت کا اظہار دلی کی ... اور ستھری زبان میں کچھ کم دلکش نہیں ...

قطعۂ تاریخِ وفات

خبر یہ ناگہاں آئی کہ سائل — سخن گوئے پسندیدہ و کامل
نشانِ داغ و نامِ نقشِ غالب — سخن پرور سخن پرداز فاضل
خدا بخشے کہ جہانِ فتنہ ہو سے — ہوئے خلدِ بریں کو آج واصل
وہ تھا خوش خلق خوشخو اور خوش گو — نکو صورت نکو سیرت نکو دل
زباں اُسکی تھی اردوئے معلّیٰ — معانی پر بھی قدرت اُسکو حاصل
سخن اُسکا تھا پاکیزہ و شستہ — روانی اور فصاحت پر تھا مائل
رحیت اُسکی تھی شیریں کلامی — سلاست روزمرّہ پر تھا عامل
نہایت دل شکن ہے ہجرِ سائل — نہ کیوں ہو کر کے ٹکڑے ٹکڑے دل
ندا ہاتف نے دی کہہ دے غضنفر — کہ اب ہے دلپہ داغِ ہجرِ سائل

غضنفر سونی پتی — ۱۳۶۴ھ

وہ آشوب تجلی بس رہا ہے گوشۂ پردہ   مگر عکسِ تبسم آپڑا ہے سارا چلمن پر

صوفیائے کرام کے نزدیک کمالِ جذب و تصور یہ ہے کہ طالب مطلوب کے خیال میں وہ محویت تام حاصل کرے کہ عارف و معروف اور شاہد و مشہود کی تمیز و تشخیص کالعدم ہوکر من و تو کے امتیازات یکسر مٹ جائیں۔ ہر چند کہ اس مضمون کے اردو اور فارسی شاعری میں لاکھوں شعر ہوں گے مگر انصاف کیجئے کہ یہ شعر اپنی ندرت اور انوکھے پن میں کیا کم دلآویز اور ناقابلِ فراموشی ہے ؎

مٹایا ہے دوئی کو اسقدر تیرے تصور نے   کہ دیدار آئینے میں پیدا ہو نہیں سکتا

غزل کیا ہے؟ ایک ترکشِ ادب جسکا ہر شعر ایک تیرِ دل دوز اور ابدی خلش کا ضامن ہو، اقبال کا داغ کو "ناوک فگن" کہنا غالباً اسی حقیقت کی تشریح تھی، حضرتِ سائل کے سرمایۂ سخن میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو دل کو برمانے اور جگر میں چٹکیاں لیتے ہیں۔

سعدیؒ کا مشہور شعر ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن   دل بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن"

مگر ریختے کا شاعر اس پامال مضمون کو جس ٹھاٹ سے نظم کرتا ہے اس پر اگر فارسی کو بھی رشک ہو تو بعید نہیں ؎

عمر بھر میں ایک تو پہچان ہم کو ہو گئی   اسکا عاشق جان لینا جسکو حیران دیکھنا!

تاثر اور محض تاثر ہی نہیں، شدتِ تاثر غزل کی جان ہے۔ ذیل کے اشعار جن کیفیاتِ درد کے حامل ہیں وہ اربابِ درد سے پوشیدہ نہیں۔ نقادِ فن فیصلہ کریں کہ وہ شاعر جو یہ کہتا تھا کہ میں نے اپنے شوق کو اپنی ذہنی اور مادری زبان تک محدود رکھا ہے، کیا انتہا درجے کا منکسر المزاج نہ تھا؟ مومن خاں کی نزاکتِ خیال اور داغ کے لطفِ زبان کو پہچاننے والے اگر حضرت سائل کے ان اشعار پر سر نہ دُھنیں تو ستم بالائے ستم ہے ؎

خموشی میں ہے عرضِ حال کیا کیا   کوئی سمجھے ہمارا مدعا کیا

پھر آئی یادِ چشمِ سرمہ آلود   ہے پھر خاک میں ارمان کیا کیا

پھر ہے بہارِ نادِ ستمگر کی آرزو   سینہ دفورِ داغ سے پھر گلستاں ہوا

ستا کر مجھکو اتنا، تو خجل ہے کسقدر دیکھا   پرائی مری، تیری پشیمانی نہیں جاتی

وہ تم سے کم، نہ تم فلکِ فتنہ ساز سے   نکلے ہوئے ہو دونوں حدِ امتیاز سے

پروانے مرتے رہتے ہیں تری شمعِ بزم پر   یہ انجمن اک اور تری انجمن میں ہے

ہمیشہ خونِ دل رویا ہوں میں لیکن سلیقے سے   نہ قطرہ آستیں پر ہے، نہ دھبہ جیب و دامن پر

فارسی اور اردو شاعری میں محاکاتِ رندی و سرمستی کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے، حافظ و خیام نے فارسی میں، اور غالب، ریاض اور جوش ملیح آبادی نے اردو میں خمریات کو وہ مقبولیت بخشی ہے کہ بوئے بادہ سے مشامِ زہد بھی غرقِ کیف و سرور ہوگیا ہے۔ وارداتِ میخانہ خواہ حقیقی ہوں یا مجازی۔ اسقدر دلکش ہیں کہ عالمگیر جیسا متقی بادشاہ بھی دیوانِ حافظ کی عظمت کا صدقِ دل سے معترف تھا۔ فارسی و

اردو شاعری کے رندانہ اشعار ہی وہ جھروکے ہیں جن سے زہد ریائی کے حقیقی خد و خال اسقدر صاف نظر آتے ہیں کہ معصومیت کو گنہگاری کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ حضرتِ سائل نے بھی اس باب میں مُنہ زندانہ منظر نگاری سے یہاں تک کام لیا ہے کہ رندانہ اشعار زاہدان تُنک سر کیلئے دشنہائے تیز بن گئے ہیں۔ اُن کا یہ قطعہ واعظانِ ریاکار پر ایک طنزِ بے پناہ نہیں تو اور کیا ہے؟ ؎

درِ میخانہ چوپٹ ہے تہجد کو ہوئی چوری   ٹُوٹے ہوئے شیشے فقط جھوٹے پیالے ہیں

گماں کس پر کریں نیش ادھر واعظ، اُدھر صوفی ÷ خدا رکھے، محلے میں سبھی اللہ والے ہیں

اسی غزل کا رندانہ مطلع اردو شاعری کا ایک کارِ نامہ ہے، سنئے ؎

یہ اودی اودی بدلی ہے، یہ بادل کالے کالے ہیں

درِ میخانہ پر سو سو برس کے پینے والے ہیں

جی چاہتا ہے کہ اسی قبیل کے کچھ اور اشعار جو اس پیرِ مغانِ ادب نے فرمائے ہیں آپکو سناؤں اگرچہ مضمون طویل ہوتا جاتا ہے مگر حدیثِ میکدہ بھی تو لذیذ ہے ؎

عمل جب ہمدِ تقوی کے دھرے رہجائیں اے زاہد   کوئی کالا گر مچائے تو کپڑے اتروائے

نہ کیجو اعتبارِ جُبّہ و دستار اے ساقی   شراب ناب تیجیے نہ بیچو، پہلے دام دھروالے

بزم میں عشاق کی ساقی نے خود کردی تمیز   جام بھر کر کہدیا، تیرا، تمہارا، آپ کا

تمہیں رنگِ مے شیخ مرغوب کیا ہے، گلابی ہو یا زعفرانی کہو تو

پلائے کوئی ساقی حور پیکر، مصفا کشیدہ پرانی کہو تو

شاعر کے لئے لازم ہے کہ ملتی داس ہوتے ہوئے کسی حد تک گوتم بدھ بھی ضرور رہے۔ "کسی حد تک" میں نے اسلئے کہا کہ سخن سنج دانا کے لئے ضروری نہیں کہ صاحبِ اخلاق محتسی بن جائے۔ اخلاقی اشعار کی تعداد حضرتِ سائل کے کلام میں بہت کم ہے مگر جسقدر ہے وہ لطف سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

خیال چاہیئے انساں کو آبرو کے لئے   نہ یہ کہ تنکے چُنے دل کی آرزو کے لئے

سائل سوال کرکے، نہ کھونا تم آبرو   دنیا میں ایک چیز ہے لبِ آدمی کی بات

آسان نظر آئے ہر اک مشکل دنیا   دے ساتھ اگر ہمتِ مردانہ کسی کا

منعم بے بصر یونہی دیکھئے تا کُجا رہے   محوِ نشاط و خوشدلی نغمۂ تارِ ساز پر

صحتِ زبان کا حضرتِ سائل کو اتنا ہی خیال تھا جسقدر کہ ایک استادِ کامل کو ہونا چاہیے۔ مگر وہ روزمرّہ کو صرف اسلئے کہ اس کی اشعار میں زیادہ کھپتے ہو، کبھی استعمال نہ کرتے تھے جہاں استاد کے یہاں کچھ ایسے بھی اشعار ملتے ہیں جو چغلی کھاتے ہیں کہ ہم محاورات کو محفوظ کرنے کے لئے کہے گئے ہیں۔ مثلاً ؎

"لطف آرام کا نہیں ملتا   آدمی کام کا نہیں ملتا"

یا   "مٹی کی بھی سلے تو روا ہے شباب میں"

حالانکہ شاعر کا فرض یہ ہے کہ وہ وجدان کے تحت میں شعر کہے نہ کہ مزدور کی طرح محاورات کو محصور کرنے کے لئے نام نہاد ادبی چار دیواری تعمیر کرے کیونکہ اگر محاورے میں

قوّتِ حیات ہوئی تو وہ از خود زندہ رہیگا ورنہ اپنی موت مرجائے گا، حضرت سائل کے چند اشعار جو اُردوئے معلّٰی کے نگینے ہیں ذیل میں درج ہیں: ؎

یہ بھی کوئی رونا ہے کہ دو اشک بھر آئے — آنکھوں میں لہو بن کے دل آئے جگر آئے
ساقی نے بادہ خوار کو دی ہے نہ شیخ کو — اُس نے کہا مجھے ملے، اس نے کہا مجھے
ہوا پر ہیں جسدن مری فریاد کے ٹکڑے — اُڑا اُڑا لینگے اِس چرخِ ستم ایجاد کے ٹکڑے
کل شب کو بزم میں عدو جہاں نہ تھا — بگڑو نہیں، خفا نہو، جانے دو ہاں نہ تھا
نقرے فریب دے کے دل مبتلا لیا — مجھکو غریب جان کے تم نے بنا لیا

تخلص کے نباہنے میں مومن خاں کی طرح دِلّی کے اس مرتب استاد کو بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ میرا دل تو یہی چاہتا تھا کہ موجودہ قحط الرجال کو دیکھتے ہوئے آخری مرتب اُستاد کہوں مگر اہلِ شہر سے کون جھگڑا مول لے

حضرتِ سائل تخلص کو شاہِ شطرنج سمجھنے کے سخت مخالف تھے اُن کے مقطعاتِ غزل انکے کردار اور انکی زندگی کی جیتی، جاگتی تصویریں ہیں شاعر کی جیون کہانی خود اس کی زبانی سنئے: ؎

بن گئے سائل تو کیا شانِ امارت مٹ گئی
دیکھنے والے نہیں کھاتے ہیں دھوکا نام سے

دربان کو تاکید ہے دروازے پہ روکو
آئندہ کسی بھیس میں سائل اگر آئے

یا زندگی کے ایام آخریں کا مقطع جبکہ وہ پاشکستہ اور چلنے پھرنے سے قطعی معذور تھے کسقدر درد انگیز ہے ؎

رکھا ہے تخلص مجبوراً سائل ہوئی تھی جب احتیاج نکل
سے دانہ کھانے کو جب دانہ مانگو میسر ہو پینے کو پانی کہو تو

جادۂ حق سے روگردانی نہ ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ اُستاد مرحوم کے گلستانِ سخن میں گلہائے رنگا رنگ کے ساتھ کچھ ایسے کانٹے بھی ہیں جو نگاہوں میں کھٹکتے ہیں۔ مگر ان کانٹوں سے کس شاعرِ بہار آفریں کی بیاضِ سخن خالی ہے۔ میر جیسے خدائے سخن کے متعلق کسی صاحب الرائے کا قول ہے "پستش بغایت پست و بلندش، بغایت بلند"۔ حضرتِ سائل کے کلام میں ایسے اشعار جن پر "بغایت پست" کا اطلاق ہو نایاب ہیں، ہاں جیساکہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کچھ کانٹے ہیں جو ممکن ہے سلیم المذاق پر بار گزریں۔ شاعر نے ان تخیلات کو پھولوں کے پیرہن دئے تھے جو انکی واژ دنی قسمت سے کانٹوں میں تبدیل ہوگئے ؎

بچپنے میں یہ ستم ہیں تو جوانی میں کہیں — ہو نہ جائے ترا دل سیم بدن پتھر کا
مٹھی میں جا کے دل نہ ملیگا خبر نہ تھی — لوٹے گا دونوں ہاتھوں سے وُزدِ حنا مجھے
شامِ عدو جی کڑا کرکے یہ لکھ بھیجا اُنھیں — جھوٹے وعدے کی طرح جھوٹی قسم ہونیکو ہے

حضرتِ سائل مرحوم ایک صلح کل اور مرنجاں مرنج طبیعت کے انسان تھے، دہلی و لکھنؤ کے مکاتبِ سخن میں اتحاد ان کا مقصدِ حیات تھا انکی شاعری کہیں کہیں اِن دونوں مدارسِ شعر و سخن کا امتزاج ہوگئی ہے، ثبوت کے لئے ان کے مندرجۂ ذیل اشعار کافی ہیں: ؎

شاخِ نبات جیسے زباں کے دہن میں ہے — جب یہ مٹھاس ایسی حلاوت سخن میں ہے
پروانے مٹ رہے ہیں تری شمع بزم پر — یہ انجمن اک اور تری انجمن میں ہے
ملتے ہی آنکھ تم اُسے پہچان جاؤگے — دُزدِ شمیمِ زلف تمہارا ختن میں ہے

جسکو نظارۂ رگِ گُل بھی تھا ناگوار
وہ دل اسیرِ زلفِ شکن در شکن میں ہے

گلرو ہے، شمع رُو ہے تو، تیرا فریفتہ
پروانہ انجمن میں ہے بلبل چمن میں ہے

غور کیجئے کہ جس سخنور سحر البیان نے تقریباً ۶۶ سال ریاضِ سخن میں صرف کئے ہوں اس نے اپنی طویل مشاعرانہ زندگی میں کیا کچھ نہ فرمایا ہوگا، چنانچہ ان کے کلام میں غزل، مثنوی، نعت، اور قومی و ملی نظمیں بھی کچھ ہے۔ وہ اُن سنہ ہلے کے مشاعروں میں جو منشی التفات رسول دہلوی مرحوم تعلقہ دار سندیلہ کے اہتمام میں ہوئے جنھیں مشاعرے نہیں بلکہ پہلوانانِ شعر و سخن کے دنگل کہنا زیادہ مناسب ہوگا، اکابرِ فن سے نمایاں خراج عقیدت حاصل کرتے رہے نیز انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں انکی شاعرانہ آگ برسانے والی نظمیں دلوں کو جوش میں لاتی اور جسمِ ملّت میں خون گرم دوڑاتی رہی۔ حضرتِ سائل مرحوم نے چھ دیوان اور ایک طویل مثنوی کہ ایوانِ اُردو کے ستون ہیں یادگار چھوڑے ہیں۔ کاش وہ مبارک دن بھی آئے کہ اُن کا کلام زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر رونق افزائے محفلِ ادب ہو۔ آمین۔

میر کا مشہور مطلع ؎

"باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سُنئے گا۔ کہتے کسی کو سُنئے گا تو دیر تلک سر دُھنئے گا"

آج ان کے حسبِ حال ہے۔ انکے مکارمِ اخلاق کا بیان ایک جداگانہ دفتر چاہتا ہے جسکی اس مختصر صحبت میں گنجائش نہیں۔ ناتوانی اور مسلسل عوارض سے آخر عمر میں چلنا پھرنا محال تھا مگر وادارے وضعداری جن لوگوں سے زمانۂ صحت میں رسم و راہ تھی انکی مزاج پرسی کو

باقی صفحہ ۵۳ پر

قطعۂ تاریخ وفات

چو سائل شاہِ اقلیمِ سخن حیف — رہِ ملکِ عدم ناگاہ پیمود
گلستانِ ادب وقفِ خزاں شد — سخن سنجی ز دنیا گشت مفقود
جہانِ شاعری زیر و زبر گشت — اہلِ حشرے چہ پیش از حشر بنمود
سخن سنج و سخن فہم و سخندان — کہ مسجودِ ادب خاکِ درش بود
دُرِ یکتائے دریائے معانی — شد از دستِ قضا ہیہات نابود

تمنا بہرِ سالِ رحلتش گفت
بہ جنّت جانشینِ داغؔ آسود
۱۹۴۵ء

تمنا بجنوری

"پتھر کی مورت"

اختر حسین رائے پوری

تالاب کے کنارے اونچے سے ٹیلے پر شراب خانہ تھا۔ گھاس پھونس کی جھونپڑی جسکے اندر لکڑی کے بے ڈول پٹرے ٹوٹی پھوٹی ٹانگوں پر کھڑے ہوئے شرابیوں کا بوجھ اٹھائے تھے۔ اور ادھر ادھر بھی میزیں جو پیڑ کے تنوں سے بھانت بھانت کی بنائی گئی تھیں، دو دیئے مٹی کی دیواروں پر دیوٹ میں شام ہوتے ہی دھندلے چراغ ٹمٹمانے لگتے تھے۔ اور ایک کونے میں کلوار کی چوکی جو تاڑی کے مٹکوں اور ٹھرے کی بوتلوں کے انبار میں اپنے سپید دامن [illegible] کے سامنے یوں روپوش ہوجاتا گویا خود سرے کا بت بنا بیٹھا ہو۔ شراب خانے کے دروازے پر ایک جوان عورت سر شام سے بیٹھی انگاروں پر کباب بھونا کرتی تھی، اور آگ کی آنچ میں دور سے اسکا تمتمایا ہوا چہرا بڑا بھلا لگتا تھا۔

دن بھر شراب خانہ میں سناٹا رہتا لیکن شام ہوتے ہی اسمیں زندگی کے آثار پیدا ہوجاتے تھے۔ مستری، قصاب، بڑھئی اور اسی قماش کے لوگ ایک ایک کرکے آنے لگتے۔ پہلے وہ تالاب میں ہاتھ منہ دھوتے، اور کئی تو اسکے پانی میں ننگ دھڑنگ نہانے بھی لگتے تھے۔ جیسے ہی دیوٹ پر دیئے روشن ہوتے اور کباب والی ہوا میں اپنی خوشبو پھیلاتی شراب خانہ میں جاگ سی پڑ جاتی تھی۔ بوتل کے کاگ اچھلتے، مٹکے [illegible] لگتے۔ کباب کی سیخیں ملاملا اٹھتیں، [illegible] کی کوٹھری میں [illegible] کافور ہوجاتی اور دلوں کے دکھ ٹھرے کی بوندوں سے دم بھر کے لئے دھل جاتے تھے۔

اس رات کو شراب خانہ میں غیر معمولی بھیڑ تھی، مویشیوں کا بازار ابھی پوری طرح جمنے بھی نہ پایا تھا کہ ہیضہ کے ڈر سے میونسپل کمیٹی نے اسے منتشر کردیا۔ دیہاتی جو آکر ہیضہ سے زیادہ کمیٹی کو کوستے ہوئے اونے پونے سودا چکا کر واپس [illegible] گئے لیکن شہر کے قصاب اور گذریئے گذریوں کے مول بکری بھیڑ خرید کر جشن منانے شراب خانہ میں آ جمع ہوئے تھے۔

گذریوں کے چودھری نامی نے ہر شخص کو ٹھرے کی ایک ایک بوتل [illegible] دی اور کباب والی کو گود میں کھینچ کر کہا: "اری آج تو میں تجھے سونے سے لاد دوں گا!"

چمپا نے للچائی ہوئی نظروں سے نامی کی [illegible] جیب کو [illegible] روپیوں کے بار سے ادھر گیا تھا لیکن کلوار کے ڈر سے آنکھیں جھکا لیں۔

راجو مویشی خدا جانے کب سے دروازہ کی اوٹ میں کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ہفتوں سے اسکی یہی کیفیت تھی۔ کلوار ترس کھانے کی [illegible] نہ تھی اور کلوار نے اسکا آنا جانا بند کردیا تھا۔ بیچارہ راجو رات کے اندھیرے میں آتا، باہر کھڑا کباب اور شراب کی مہک سونگھتا اور نامراد الٹے پاؤں گھر لوٹ جاتا۔ لیکن آج نامی کی دریا دلی نے اسے سہارا دیا اور عین اس وقت جب نامی کے [illegible] محفل سے [illegible] دوبارہ بھرے جارہے تھے۔ راجو اندر گھس آیا [illegible] نامی چودھری کے سامنے آ بیٹھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا" چودھری! آج تو مجھے کچھ [illegible] دیا جائے"

نامی کا دل اس وقت دوست داری کے جذبہ سے بھرپور تھا۔ مویشیوں کے بازار میں اس نے اتنا سستا سودا کیا تھا کہ ہزار روپیوں سے کم منافع کی امید نہ تھی۔ اور پھر یہ راجو لاکھ گیا گذرا سہی لیکن اسمیں ایک بڑا وصف تھا۔ اس کے گلے میں بلا کا رس تھا اور جب وہ گاتا تو اس کی تان بادلوں کی خبر لاتی تھی۔ سننے والوں کا بیان تھا کہ کئی بار سانپ اسکے گانے پر سر دھنتے پائے گئے اور یہ تو سب جانتے تھے کہ راجو کے گلے سے آواز نکلتے ہی تالاب کے مینڈکوں کا لامتناہی کورس بالکل ساکن ہوجاتا تھا۔

لہٰذا کلوار کے احتجاج کی پرواہ نہ کرکے نامی نے آج کی رات راجو کی سرپرستی کا تہیہ کرلیا۔ اور اپنی گری ہوئی مونچھوں کو تاؤ دینے کی بیہودہ کوشش کرتے ہوئے رئیسانہ تپاک سے کہا "راجو آؤ۔ بھلے پراجو، بولو کیا پیوگے تاڑی یا ٹھرا؟"

راجو نے ایک سانس میں تاڑی کی لبنی ختم کردی اور دیر تک بیٹھا ہونٹ چاٹتا رہا۔ کلوار جو اس کی حرکتوں پر جل رہا تھا اپنی جائے پناہ سے پکار اٹھا:۔

"بہت بڑا چار سو بیس ہے یہ راجو کام نہ دھام، نہ گانٹھ میں دام۔ دن بھر مدک خانوں میں بڑا مدکیوں کو کہانیاں سناتا اور مفت مدک وصول کرتا ہے۔ رات کو یہاں اُدھار یا مفت کی ٹوہ میں آتا ہے۔ میں نے تو اسکا آنا جانا بند کردیا ہے۔"

راجو کے پڑوسی رستم قصاب نے اسکی تائید کی" اجی بڑا اپاہج ہے یہ راجو ایسا نکھٹو تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اسکی بڑھیا ماں سویرے سے شام تک گھر گھر پانی ڈھوتی ہے چکی پیستی ہے اور اسے روٹی کھلاتی ہے اور یہ سانڈ بنا یہاں وہاں آوارہ گردی کیا کرتا ہے۔"

سب نے حتیٰ کہ نامی نے بھی حقارت سے راجو کی طرف دیکھا لیکن اسکے ماتھے پر بل تک نہ آیا اپنی بھیگی ہوئی مونچھوں کو زبان کی نوک سے چاٹتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا:" بھائیو! رام جی کی مرضی یہی ہے کہ کچھ کام کریں کچھ بیٹھے کھائیں۔ یہ سادھو سنت اور لالہ بنئے کونسا پہاڑ توڑ دیتے ہیں۔ پھر بھی حلوا پوری کے سوا اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ تو پھر میں نے ہی کونسا پاپ کیا ہے؟"

ممکن ہے یہ بحث طول کھینچتی لیکن اسی وقت دروازہ چرمرایا اور نجم مستری کی شکل نمودار ہوئی۔ اب تو شراب خانہ میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ گو نجم بوڑھا تھا لیکن گانے میں راجو کا مقابل اسکے سوا کوئی نہ تھا۔ ان دونوں کا ساتھ مل بیٹھنا بڑی بات تھی اور لوگ ایسی سنگت کے آرزومند رہتے تھے۔

نجم کی آمد جگت میں ہر طرف سے خیر مقدم ہوئی۔ جب راجو نے اپنے ٹوٹے ہوئے اشعار پر [illegible] لگایا: "استاد

ست دلوں بعد پکڑ میں آ سکے۔"

نجم نے اپنی کم بین آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرکے اسے دیکھا اور پہچان کر شرارت سے مسکرایا

"ٹھہر جا بے بدماش، آج ہی تیری پول کھول کر رکھوں گا۔ ارے تو نہ تال کا نہ سُر کا۔ چلا ہے مجھ سے باتیں بنانے۔"

کسی نے ٹوک کر کہا: "مستری یہ نہ کہو۔ یہ جو بھی ہی۔ مگر ہے صورت سے جان استاد کا سکھایا ہوا۔"

نجم کے گلے کا گھونٹ وہیں اٹک گیا۔ "ایں تم جیسے تو سکھئے بھی میرے منہ آنے لگے۔ آخر اس بھورے خاں کو ہی کیا آتا ہے۔ ٹھمری کے سوا وہ گا ہی کیا سکتا تھا۔ راس کی آوازشت" نجم نے فاتحانہ انداز سے سب کو دیکھا: "اسکی آواز اونچ سے اوپر چڑھتی بڑھتی بانس کی طرح پھٹ جاتی تھی۔" "نجم" "سُر تو ایک نجم مستری ہی گا سکتا ہے"

تلسی پواڑی نے لقمہ دیا: "کیوں نہ ہو، پاربتی دیوی کی دین ہے مستری کو"

مگر راجو کے ایک حامی نے بات چلنے نہ دی۔ "اجی اس دیوی میں بھی کوئی جان ہے۔ پتھر کی مورت ہے نہ مستری کے کام کی نہ اور کسی کے کام کی۔"

نجم اس بدھ بت کو مارنے ہی اٹھتا لیکن نامی چودھری نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ اس نے راجو کو ڈانٹا "کیا میں نے تجھے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لئے بلایا ہے؟"

راجو کو بھی طیش آ گیا: "جمپا لکالن تو طبلہ کی جوڑی۔"

نامی نے حکم دیا۔ "یلا دو سب کو ایک ایک ادھا"

کسی نے طبلہ کو تھاپ دی۔ راجو نے ملہار کا الاپ کھینچا۔ اور کلوار اپنی شکایت کو بھول کر چلایا: "اری دیکھتی کیا ہے باندھ لے گھنگھرو۔"

بادل برس کر کھل چکے تھے اور ہوا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بسی ہوئی تھی ایک عجیب والہانہ شان سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور آسمان اتنا صاف ہو گیا تھا کہ زمین سے تاروں کی آنکھوں کا اشارہ نظر آتا تھا۔ راجو کے گلے سے راگ کے بول نکلے سُر گویا ہوائی سیڑھیوں پر چڑھتے گئے چڑھتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ بادلوں کی طرف جا کر غائب ہو گئے یکبارگی بجلی کی طرح وہ نیچے جھپٹے اور قریب آ کر ہر طرف بکھر گئے۔ ملہار کا سرگم کبھی بادلوں کی طرح اُمنڈ آمنڈ کر آتا، کبھی گرجتا اور کبھی ہلکے ہلکے برس کر پھر کھل جاتا تھا۔ اور جمپا اپنے میلے لہنگے کے سرے کو کمال نزاکت سے ایک ہاتھ میں تھامے اور دوسرے سے اوڑھنی کا چھور منہ پر ڈالے زمین پر ٹھوکر لگاتی شرابی دلوں کو گھنگھرو کی چھما چھم پر نچاتی ادھر اُدھر گردش کر رہی تھی۔

اور جب راجو چپ ہوا تو دم بھر ولیا ہی سناٹا رہا جیسا زور کی بارش کے یکبارگی تھمنے کے بعد ہوتا ہے۔ پھر وہ جادو ٹوٹا اور جوش کے عالم میں ہر سمجھدار اور ناسمجھ وجد کرنے لگا۔ کلوار اپنے جسمانی ہیولی کو اٹھائے قریب آیا اور ایک پوری بوتل راجو کے منہ سے لگا کر بولا: "جیتے رہو راجو کیا کھاؤ گے"

اب نجم مستری کی باری تھی اس نے بھاگ کا نقشہ کھینچا اور سب سانس روک کر بیٹھ گئے۔ گویا اس دیس کی تھکی ہاری انسانیت کا قدیمی غم کراہنے لگا اور وہ لوگ جن کے شب و روز غلاظت اور کثافت میں رنگے ہوئے تھے آپ ہی آپ کسی نامعلوم درد کے احساس سے رو پڑے نغمہ مرغ بسمل کی طرح کراہا تڑپا اور مجروح پرندہ کی طرح کبھی اوپر اٹھا، کبھی نیچے گرا لوڑھے گوئیے کی ہر تان ایک ہوک تھی جو پھانس بنکر ہر سننے والے کے دل میں کھٹک اٹھی

اسی طرح وہ دیر تک گاتے رہے اور سنگت کی موج نے ان کے دلوں کی کدورت کو دھو دیا۔ جب بہت رات بیت گئی تو وہ لڑکھڑاتے ڈگمگاتے اٹھے اور چودھری نامی نے جمپا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گانا شروع کیا۔

"دریا سے بہا آئی گنگا"

سب نے آواز ملائی اور جمپا نے گھنگھرو کی ٹھوکر لگا کر اس ناؤ تاؤ سے سارے ہو کے دراہی جھگڑے کا خاکہ اڑایا کہ سب عش عش کر اٹھے۔ اور نامی چودھری کو جمپا کباب سے زیادہ لذیذ معلوم ہوئی —

— — — ❊ — — —

نجم کو قدرت نے گویا بنایا تھا۔ اس ترنگ میں وہ دور دور مارا پھرا۔ برسوں کسی استاد کا حقہ بھرا کسی گرو سے پاؤں دبائے کسی کے لئے بھنگ گھونٹی۔ دانی بن اسے گانے کا شہرہ ہوا کہ پاربتی کے مندر میں وہ نوکر رکھ لیا گیا۔ اس علاقہ کا یہ سب سے بڑا مندر تھا اور راجہ رجواڑوں نے اسکی رکھوالی کے لئے اچھی خاصی جاگیر دے رکھی تھی۔ نجم صبح شام مندر میں حاضری بھرتا اور بھجن کیرتن گاتا ہوا کبھی اس سیبہ کو گھورتا کبھی اس ماہ پارا سے آنکھیں لڑاتا۔ آخر اس کی رنگ رلیوں نے گل کھلایا۔ سب ہی نے اسے کمال ماہر مانا۔ یوں تو یہ پجاری بداعت خود اخلاق کا چوکیدار تھا۔ مگر ایک وہ ٹھیرا برہمن دوسرے پجاری۔ البتہ جیسے حامیوں کو وہ تاک جھانک کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اور مندر کے سوکوں کو لنگوٹ کے سچے رہن کی تلقین کیا کرتا تھا۔

نجم بھی اپنے فن پر بڑا گھمنڈ تھا۔ مندر سے برخاست ہونے کے بعد اس نے اپنے گھر پاربتی کی مورت بٹھائی۔ ایک اندھیری سی کوٹھری میں اس نے طاق پر یہ دیوی بٹھلائی اسے سندور سے لال گلال کیا۔ اسے چاندی کی آنکھیں عطا کیں ہر روز اسے پھول نچھاور کئے اور گھی کے چراغ اس کے حضور میں روشن کئے۔ ہر روز صبح اٹھ کر وہ مورت نہلاتا اور شام کو اس کے سامنے دوزانو بیٹھ کر سنگت کی منت کرتا تھا لیکن نہ تو تھرالے اس دیوی پر مہربان ہوئے اور نہ دیوی نے اس پر کرم کیا۔ اس دوران میں کئی مرتبہ جیٹھ، ہیضہ اور بیماری کی یلغار ہوئی لیکن نجم کی دیوی اپنے طاق پر تسکین بیٹھی رہی۔ کسی کی بنی پر اس نے دھیان نہ دیا۔ اور نہ نجم کی حسنہ جانی پرائے رحم آیا۔ ہر سکار لوگوں نے اس دیوی کے درشن سے کردیئے اور نجم تالوں سے تنگ آکر لوہے کے کارخانے میں مستری بن گیا۔

نوجوان ہاتھوں سے نمودار ہوتے۔ باجے والوں نے اپنی خدمات مفت پیش کیں اور بہت پرانی دیویوں کو نئے عجیب وغریب باجوں کے ساتھ جلوس میں شامل ہوئے۔ جلوس کا نظام پروہتوں کی آرتی کی تھالیاں سے شروع ہوئیں اور سڑک کے دائیں بائیں ہزاروں بچے بوڑھے آ کھڑے ہوئے۔ رتھ کے روپہلے دھوپ میں چمکا ئے اور سنہری باجے بجنے۔ ان جوتشی عالم میں اس تیرہ کر دوڑ کے جانے لگے۔ رتھ کے اندر ڈھول منجیرں نے قیامت برپا کر رکھی تھی وہاں کی ایک ایک آواز دیر میں تیر کے وزنی گٹے بالسے دو دست جیسے تھے۔ رتھ کے اندر دیوی کے عین مقابل آسن جمائے تھے۔ دیوی کا سکھن کا رتھ۔ پارتی کی مورت پھولوں کی ڈھیری میں چھپی ہوئی تھی اس کی آنکھیں رتھ میں انگاروں کی طرح جلتی ہوتی تھیں۔ اس کے ماتھے پر چاند چمکتی تھی وہ رو پہلی اور چھوٹے ہوئے گہنوں سے لدی تھی۔ مندر کے بالا خانوں سے پھولوں کی بارش ہوتی اور بجنے کا رکی حالت نہ ٹوٹی۔

یہ نجم کی زندگی کا سب سے بڑا دن تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ رقت کے مارے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کے گال محبت کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ اس کے پاس راجو ڈھولی بیٹھا دونوں ہاتھوں سے مال غنیمت کو بٹور رہا تھا کبھی وہ چاندی کی چھاگلوں کو ہاتھ میں تولتا کبھی سونے کے چھلوں کے دام آنکتا اور بیچ بیچ میں دیوی کے آگے سجدہ کر کے کوئی نیا راگ چھیڑ دیتا تھا۔

رتھ چیونٹی کی چال چلتا ہوا بڑے مندر کے سامنے پہنچا اور ایک بار گی پاربتی کی جے کے نعروں سے اس کے سنسان در و دالان گونج اٹھے۔ ڈھول منجیروں اور گھنٹوں کا شور اتنا بڑھ گیا کہ کان کے پردے پھٹنے لگے۔ راجو ڈھولی کے اشارہ پر ہر طرف مشعلیں سلگ اٹھیں۔ گیس کے لیمپ روشن ہو گئے۔

بڑے مندر کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ چوروں نے دیوی کے گہنے چرا کر مورت کو باؤلی میں پھینک دیا ہے۔ کسی نے ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا بلکہ ایک بگڑے دل نے سب کو سنا کر کہا کہ نجم کی پاربتی کو بڑے مندر میں جگہ ملنا چاہیئے۔

یہ نجم کی فتح اور شادمانی کی معراج تھی وہ تن من کی سدھ بدھ بھول کر اپنی دیوی کو رجھانے کے لئے گوری راگ گانے لگا اور اسے محسوس ہوا کہ دیوی اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ یک بیک وہ تیورا کر آسن سے گرا اور نیچے اس کے ہاتھ سے نیچے ڈھلک پڑے اور دفعتاً چاروں سناٹا چھا گیا۔ باجے بند ہو گئے۔ ہاتھی گھوڑے کھڑے ہو گئے۔ سب سکتہ میں آ گئے۔

نجم کا جسم لرزا، ایسی اینٹھن ہوئی اور وہ برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ قے اس کے منہ سے نکل کر کلوں اور گردن پر پڑ گئی۔ ہیبت کے مارے سب لوگ پیچھے [illegible]۔ [illegible] کسی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

مونا لزا — لیونارڈو سے

اے تری پُر پیچ واسطے رخ فطرت کی نقاب
تیری تخئیل کی زد میں مہ و پروین و شہاب
میں نے مانا کہ ہے فنکار، تو یکتائے جہاں
تیری تخلیق کا ممکن نہیں دنیا میں جواب
لیکن اک بات بتا دوں جو اجازت ہو تری
غیر تزئین صداقت نہیں کچھ حسن و شباب
اسمیں سب تک نہو تو تی ہی جگر سوزی کی
آب گل رنگ کو کیسے کوئی کہدے شاداب
کامیاب اپنے کو کہتا ہے فقط حسن خیال
آہ اِ شرمندۂ تعبیر نہیں تیرا یہ خواب!!
تو نے سوچا — اگر افسوس غلط تھا یہ قیاس)
حسن جب ہوتا ہے دریوزہ گر چنگ و رباب
آنکھیں ہو جاتی ہیں تابش میں ستاروں کی حریف
جگمگا اٹھتی ہے ہونٹوں پہ تبسم کی شراب
ہوش یہ نکتہ تری عقل پہ روشن ہوتا
مسکراہٹ ہے مری طنز دلِ خانہ خراب!
میں تری تنگ نگاہی پہ تھی خونابہ فشاں
تو یہ سمجھا کہ ہے درپاش مری چشم پُر آب!

دل کی بے کیفیوں کا عکس نہیں تھا اسمیں
تھی مسرت مری یک چشم زدن مثل سراب!

عبدالعلیم شیرکوٹی

رتھ بانوں نے اپنے کاندھے الگ کر لئے۔

نجم کے سر کو ذرا سی جنبش ہوئی اور اس نے دھیمی آواز میں کہا: "چپ کیوں ہو گئے راجو۔ گوری راگ گاؤ بھیا۔ دیوی کو یہ راگ بہت پسند ہے۔"

اور گوری دھرگم ایک فریاد کی طرح آسمان کی طرف اڑا۔ کبھی وہ تھکے ہوئے عبادت گذار کی طرح گڑگڑا کر رہ گیا اور کبھی بہرے دیوتاؤں کے کان میں چلایا کہ کسی کے اخلاص کو نہ ٹھکراؤ۔ راگ کے بول میلے میں بھٹکے ہوئے بچے کی طرح مچل مچل کر روئے اور کسی طرح انہیں تسلی نہ ہوئی۔

بیگم شمرو

ظفر قریشی دہلوی

ہندوستان کی تاریخ میں جہاں اور بہت سی معروف ہستیاں ہیں وہاں ایک بیگم شمرو کی بھی ہے۔ لیکن بیگم شمرو کی پرشکوہ داستانِ زندگی جن میں آخری مغل بادشاہوں، ملکی طوائف الملوکی اور دیگر مسائل تاریخ و تمدن کے مناظر ملتے ہیں۔ جو لوگ دہلی اور میرٹھ کے نواح میں رہتے ہیں ان کے لئے بیگم شمرو کا نام کچھ زیادہ اجنبی نہیں ہے مثلاً میرٹھ کے راستے میں "بیگم آباد" جہاں موٹر رکتی ہیں، اور خاص شہر میرٹھ میں "جان جہاں کی چھاؤنی" "بیگم کا پل" وغیرہ سب انہی بیگم شمرو کی یادگار ہیں۔ دہلی میں لال قلعہ کے سامنے چاندنی چوک میں ایک محلہ انہی کے نام پر مشہور ہے۔ جہاں ایک جگہ نے بورڈ بھی آویزاں کرا دیا ہے۔ یہ باغ بیگم شمرو کہلاتا ہے اور ٹھیک بر موجودہ بنک یا بنگال بینک کی قدیم عمارت ہے انہی کے محل کا حصہ تھا جس کی انگریزی طرز اور مشرقی آرائش تعمیر اس ہستی کی دوگانہ حیثیت کی داستان کو واضح کر دیتی ہے۔ دریبہ کے سامنے جو کلیسا ہے ممکن ہے کہ اسی عہد کی یادگار ہو کیونکہ بیگم شمرو کے محل سے متصل ہے گو کسی حوالہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا مگر یہ کلیسا قبل از غدر کی عمارت ضرور ہے۔

بیگم شمرو کا اصلی نام باوجود تحقیق کے معلوم نہیں ہو سکا۔ کیونکہ عرفاً وہ بیگم شمرو مشہور تھیں اور "ایسٹ انڈیا کمپنی" یا آخری مغل بادشاہوں کے کاغذات میں اس کا خطاب "زیب النساء" درج ہے کیونکہ یہ خطاب مغل دربار سے عطا ہوا تھا اس لئے "ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر" کے کاغذات میں وہ القاب و خطاب استعمال کئے جاتے تھے جو مغل دربار سے تفویض شدہ ہوتے تھے۔

بیگم شمرو کا مولد میرٹھ کے ضلع میں "کوتانہ" نامی قصبہ ہے۔ صحیح ترین تاریخ ولادت جو تسلیم کی گئی ہے وہ ۱۷۴۶ء ہے بیگم شمرو کے باپ کا نام لطف علی خاں تھا۔ اور عرب نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ خاندان کوئی دو پشت سے آکر ہندوستان میں آباد ہوا تھا اور فارسی ان کی گھریلو زبان تھی۔ ان کی رشتہ داریاں عام شرفا میں جو نواح میں آباد تھے ہوا کرتی تھیں۔ بیگم شمرو کی عمر صرف چھ سال کی تھی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اس کے سوتیلے بڑے بھائی نے جب اسے اور اسکی والدہ کو بہت پریشان کیا تو وہ دونوں دہلی آ گئیں۔

بیگم شمرو پستہ قد گداز بدن عورت تھی۔ خوبصورتی میں یکتا تھی اور ذہانت و طباعی قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ خطروں کی پرواہ نہ کرتی تھی اور مردوں کی طرح ہر کام خود سرانجام دیتی تھی۔ اور ہزاروں آدمی رعایا کے اور سینکڑوں کی فوج ظفر کا انتظام اس طرح کرتی تھی کہ بڑے بڑے مدبر بھی دنگ رہ جاتے تھے۔

بیگم شمرو کی عمر ۱۹ سال کی تھی کہ ایک جرمن نوجوان "رینہارڈ" کی اس پر نظر پڑ گئی اور دونوں میں ایسا ربطِ خاطر پیدا ہوا کہ دونوں کی شادی ہو گئی۔ اسی وقت سے یہ بیگم شمرو مشہور ہوئیں۔ اب اس کی دلچسپ وجہ تسمیہ سنئے۔

یہ نوجوان جرمن طبیعت کا بہت سنجیدہ اور کم سخن تھا۔ چونکہ غریب الوطنی اور سپاہیانہ زندگی کی کھکیڑ اسے راس نہ آتی تھی۔ اس لئے اکثر چپ چپ اور افسردہ سا رہتا تھا۔ اور اسی سنجیدگی کی وجہ سے اس کے یورپین احباب اسے "سومبر" کہتے تھے اور یہ نام اس قدر زبان زد عام ہوا کہ ہندوستانیوں کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانوں پر جب پہنچا تو سومبر سے ایک دم شمرو ہو گیا اور یہی ہندوستانی لقب ہر کہ و مہ کی زبان پر چڑھ گیا۔ اب خود رینہارڈ یا جرمن سپاہی کی بابت کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

یہ غدر سے کوئی سو سال پہلے کا ذکر ہے کہ یہ شخص ہندوستان میں قسمت آزمائی کے لئے آیا۔ اس وقت اکثر یورپین یہاں کی بساطِ سیاست و تجارت پر آکر جم جاتے تھے اور ملک کی عام ابتری اس باب میں بہت ممد ثابت ہوتی تھی۔ والٹر رینہارڈ شروع شروع میں بنگال کی فرانسیسی فوج میں ملازم ہوا تھا پھر یہ شخص نواب بنگال کے ہاں ملازم رہا۔ پھر خواجہ گریگوری خاں یا گرگین خاں مشہور آرمینی مدبر کے پاس چلا گیا جو میر قاسم کی افواج کا سردار تھا۔ یہ جرمن سپاہی فوجوں کو قواعد پریڈ سکھاتا تھا۔

یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ تباہ حال ملک میں پہنچ کر وہاں کی دیسی ریاستوں کو دبانا اور خراج وصول کرنا شروع کر دیا۔ پھر وہاں سے اس نے بھرت پور کا رخ کیا اور یہاں پہنچ کر اس نے خود ایک فوج مرتب کی جس میں چار پیادہ پلٹنیں، ایک رسالہ اور چھ توپیں تھیں۔ اب اس نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ اپنا لشکر کرایہ پر چلانے لگا۔ یعنی جس فریق نے روپیہ دیا اس کی طرف سے لڑنا شروع کر دیا۔ فوج مرتب کرنے کے بعد شمرو سات آٹھ سال تک جے پور کا بھی ملازم رہا۔ کبھی بھرت پور میں آ جاتا تھا اور ان دونوں ریاستوں میں رہ کر اس نے اکثر معرکے کی لڑائیاں لڑیں۔

شاہ عالم ایک عرصہ دراز تک الہ آباد میں رہا اور دلی کی حکومت سہارنپور کے نواب نجیب الدولہ کے سپرد رہی۔ اس کی وفات پر اس کا لڑکا ضابطہ خاں اس کا جانشین ہوا اور دسمبر ۱۷۷۲ء میں جب شاہ عالم الہ آباد کے قید و بند سے چھوٹے اور پایہ تخت دہلی میں آئے تو قلمدان وزارت نجف خاں نامی ایک ایرانی کو سپرد کر دیا کیونکہ وہ شاہ عالم کے دکھ درد میں عرصہ تک شریک رہا تھا۔ ضابطہ خاں کو یہ چیز بہت اکھری اور وہ کھلی بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ مگر نجف خاں نے شمرو سے مدد مانگی اور وہ ضابطہ خاں کی بے ضابطگی کی اصلاح کے لئے ایک لشکر لے کر روانہ ہوا۔ ضابطہ خاں سے غوث گڈھ پر مقابلہ ہوا جس میں ضابطہ خاں کو ہار ہوئی اور اس کا خزانہ شمرو کے دستِ تصرف میں آیا۔ اس کامیابی سے اس کی قسمت کا ستارہ اور بھی چمک اٹھا۔ اب اسے مغل دربار سے چھ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی اور اس نے اپنا صدر مقام سردھنہ کو بنا لیا جو میرٹھ سے ۱۲ میل چھاؤنی سے آگے ایک قصبہ ہے۔ یہ جاگیر ۱۷۷۳ء میں اسے عطا ہوئی تھی اور گنگا جمنا کے دوآبہ میں پھیلی ہوئی تھی یعنی مظفر نگر سے لے کر علی گڈھ کے علاقہ تک۔ ۱۷۷۵ء میں اسے بھرت پور کے خلاف بھی نجف خاں

کے اشارہ سے لڑنا پڑا حالانکہ وہ اس ریاست کا ملازم رہ چکا تھا۔ سمرو نے اسی طرح کی زندگی بسر کرتا ہوا وہ ۴ مئی ۱۷۷۸ء کو جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔ اس کی وفات کے بعد سمرو کے یورپین افسران اور دیسی سپاہیوں کی متفقہ درخواست پر شاہ عالم نے اس کی بیوہ کو سردارا اور وارث جاگیر تسلیم کرلیا۔ اور وہ بدستور سردھنہ کی جاگیر پر قابض رہی۔ سمرو کے ہاں اس مسلمان بیگم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی لیکن اسکی ایک اور مسلمان بیوی سے جو پہلے اس کے نکاح میں آچکی تھی ایک لڑکا تھا جس کا نام ظفریاب خاں تھا۔ جاگیر جب بیگم کو ملی اس وقت یہ لڑکا نابالغ تھا۔ سمرو کی وفات کے تین برس بعد بیگم نے ۷ مئی ۱۷۸۱ء کو عیسائی مذہب اختیار کرلیا اور اس کا مسیحی نام جوآنا رکھا گیا اور ظفریاب خاں بھی عیسائی ہوا اور اس کا نام والٹر بلتھزار رکھا گیا۔

غلام قادر روہیلے نے ۱۷۸۸ء میں مغل بادشاہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ یہ ضابطہ خاں کا لڑکا تھا اور اپنے باپ کی کھوئی ہوئی عظمت کی واپسی کے لئے دلی پر چڑھ آیا تھا۔ اس زمانہ میں سکھوں نے زور باندھ رکھا تھا اور شاہ دلی کی طرف سے بیگم سمرو پانی پت میں سکھوں سے لڑ رہی تھی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ غلام قادر نے دلی کے لال قلعہ میں پہنچ کر شاہ عالم کی بری حالت کردی ہے تو وہ شیرنی کی طرح بپھری ہوئی دہلی واپس آئی اور قلعہ کے لاہوری دروازہ یعنی چاندنی چوک کی طرف کے دروازہ کے سامنے اس نے ڈیرے ڈال دیئے۔ غلام قادر نے سلطنت مغلیہ باہم تقسیم کر لینے کے لئے ایک تجویز کی مگر بیگم سمرو نے اسے نمک حرامی قرار دے کر تجویز کو مسترد کردی۔ دونوں فوجوں میں گولہ باری کا مقابلہ ہوا۔ غلام قادر کی توپیں قلعہ کے پاس سلیم گڈھ پر نصب تھیں غلام قادر کو تھوڑے ہی عرصہ میں معلوم ہوگیا کہ یورپین طرز پر سدھی ہوئی فوج اور ولائتی توپخانہ سے اس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ بھاگ کھڑا ہوا اور اس طرح شہنشاہ ہند کی جان بخشی ہوئی۔ اس کے صلہ میں بادشاہ نے اسے "زیب النسا" کا خطاب عطا کیا۔ ایک اور موقع پر نجف قلی خاں نامی ایک جاگیردار نے بغاوت کی تو اس وقت بھی بیگم سمرو نے جانفروشی سے کام لیا۔ اور بادشاہ کی جان بچائی۔ مگر دلی کی حکومت اس وقت اس قدر کمزور اور محدود ہوگئی تھی کہ ہر کس و ناکس کو سرکشی کی جرات ہو جاتی تھی۔ اس زمانہ میں مغل سلطنت کا یہ عالم تھا کہ دلی میں یہ فقرہ مشہور ہوگیا تھا۔

"سلطنتِ شاہ عالم از دلی تا پالم!"

پالم ایک گاؤں ہے دلی سے بارہ میل، قطب سے اس طرف، گڑگاؤں سے نزدیک' جہاں آج کل دلی چھاؤنی واقع ہے۔

۱۷۹۲ء میں بیگم سمرو کی زندگی میں ایک انقلاب آیا اور وہ یہ تھا کہ اس کی فوج میں مفسدوں کا زور ہوگیا اور آئے دن جھگڑے رہنے لگے۔ بیگم سمرو کے بہی خواہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کرلے تو اس طرح دوسرے شوہر کی موجودگی کی وجہ سے وہ مشکلات پر عبور کرے گی۔ اس وقت بیگم کی عمر (۴۵) سال کی تھی جارج ٹامس نامی ایک افسر جو اس کے ساتھ کئی لڑائیوں میں رہ چکا تھا ایک عرصہ سے بیگم کی طرف مائل تھا مگر بیگم کی طبیعت کا رجحان ایک فرانسیسی "لے وشو" کی طرف تھا کیونکہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نیک اطوار شخص تھا۔ ۱۷۹۳ء میں بیگم نے "لے وشو" سے شادی کرلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں افسروں میں اب باقاعدہ ٹھن گئی اور جارج ٹامس کی مفسدہ پردازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیگم سمرو اور اس کے نئے شوہر کے خلاف ساری فوج باغی ہوگئی اور لوگوں میں عام خیال یہ ہوگیا کہ بیگم نے "لے وشو" سے شادی کرکے مرحوم شوہر سمرو کی عزت کو بٹا لگایا ہے علاوہ ازیں "لے وشو" کی جب سے بیگم سے شادی ہوئی تھی اس میں تکبر اور طنطنہ بھی بہت آگیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری فوج میں وہ بری نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس چیز نے بیگم کی بھی زندگی دوبھر کردی۔ ان آئے دن کے قصوں کو دیکھتے ہوئے بیگم سمرو نے سوچا کہ گوالیار کے حکمران سندھیا کو یہ جاگیر سپرد کردی جائے جاگیر کی آمدنی بدستور سردھنہ میں مقیم فوج کو ملتی رہے۔ اور سمرو کے لڑکے ظفریاب خاں کو دو ہزار روپیہ مہینہ تاحینِ حیات ملتا رہے۔ لے وشو نے چندر نگر واپس جانے کے لئے سرجان شور گورنر جنرل کو لکھا ابھی خط کے جواب کا انتظار تھا کہ فوج میں بغاوت ہوگئی۔ جارج ٹامس کے ایک دوست لیگوئیس نے ظفریاب خاں کو دہلی سے بلوایا۔ مگر لے وشو کو بھی اس کا علم ہوگیا اور وہ بیگم کو اپنے ہمراہ لے راتوں رات سردھنہ سے نکل کھڑا ہوا۔ ابھی یہ لوگ سردھنہ سے کوئی تین میل ہی پہنچے ہوں گے کہ باغی فوج کے اکثر لوگوں نے انہیں جا لیا۔ بیگم بدستور پالکی میں سوار تھی۔ اور "لے وشو" گھوڑے پر۔ باغی فوج کی ایک ٹکڑی نے بیگم کو گھیر لیا۔ اور دوسری ٹکڑی نے "لے وشو" کو۔ دونوں طرف سے بندوقیں دغنے لگیں پہلی بندوق جو چھوٹی تو معاً بیگم کو یہ خدشہ ہوا کہ اس کے شوہر کو گولی ماردی گئی اور ممکن ہے اس کو بھی یہ حشر دیکھنا پڑے یہ خیال آنا تھا کہ اس نے اپنی کمر سے زرکار پیش قبض نکال کر خود ہی سینہ میں پیوست کرلیا۔ پالکی میں بیٹھی ہوئی کنیزوں نے ایک دم چیخنا چلانا شروع کردیا۔ لے وشو دوسری جگہ نرغہ میں پھنسا ہوا تھا پوچھنے لگا کہ یہ شور و غوغا کیسا ہے۔ کسی نے اسے بتایا کہ بیگم نے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا۔ چنانچہ ایک کنیز نے پالکی کا پردہ اٹھا کر یہ دکھایا کہ بیگم کا نقاب خون آلود ہے۔ لے وشو نے جو یہ ماجرا دیکھا تو اسے دنیا اندھیر نظر آنے لگی اور اس نے بھی اپنی داب میں سے طمنچہ نکال کر اپنا دماغ پاش پاش کرلیا۔

اگرچہ بیگم نے خود اپنے سینہ میں خنجر پیوست کیا تھا مگر ہاتھ اوچھا پڑا تھا کیونکہ ایک جاں نثار کنیز نے عین موقع پر ہاتھ کو جھٹک کر خنجر گرا دینے کی ناکام کوشش کی تھی لیکن اس سے اتنا ضرور ہوا کہ (MOMENTUM) میں یعنی رفتارِ عمل میں فرق آگیا اور وار اوچھا ہوا۔ بیگم صرف زخمی ہوئی اور مری نہیں باغیوں نے اسے تین روز تک توپ سے باندھے رکھا لیکن تین روز کے بعد ایک یورپین افسر کے سمجھانے بجھانے پر کہ عورت کی ایسی توہین مذہباً حرام ہے اسے توپ کی قید سے چھڑا دیا گیا۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء میں

جب کہ یہ واقعہ ہوا [illegible] ظفر یاب خاں جسے شاہ دہلی نے ظفر الدولہ کا خطاب دیا تھا [illegible] واپس آگیا اور خود [illegible]

اسی زمانہ میں جارج طامس [illegible] سردھنہ کی طرف لپکا [illegible] وہ ابھی لکھنؤ [illegible] بیگم شمرو کی ملازمت [illegible] جارج طامس نے [illegible] [illegible] یہ لکھا اس کی ماں بھی [illegible] ظفر یاب خاں بھی [illegible] دیوانگی نے گھیرا۔ [illegible] بیگم شمرو کو ازسرنو مسند نشین کیا گیا [illegible] انہوں نے [illegible] نے انھیں معاف کردیا [illegible] چھوڑ دیا۔

اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور دورہ عام ہوچکا تھا۔ تقریباً سارے ہندوستان میں جان کمپنی بہادر کا حکم چلتا تھا [illegible] ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" یہ وہ اعلان ہوتا تھا جب [illegible] جا کر کوئی سرکاری اعلان یا حکم بازاروں میں نشر کرتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ دہلی کی بادشاہی کی کیا حقیقت تھی اور کلکتہ زیادہ طاقتور تھا یا لال قلعہ۔ لارڈ ویلزلی نے حکم دیا کہ سردھنہ کی جاگیر ضبط کرلی جائے لیکن کچھ ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ یہ منصوبہ عمل میں نہ آسکا مگر جب لارڈ کارنوالس ہندوستان کے گورنر جنرل ہوکر آئے تو انہوں نے بیگم شمرو کو ۱۷ اگست ۱۸۰۵ء کو ایک خط لکھا کہ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی ہے کہ آپ نے انگریزوں کی طرفداری اور مدد کا حلف اٹھالیا ہے۔ اکتوبر ۱۸۰۳ء میں جب سکھوں نے سہارنپور پر قبضہ کرکے وہاں کے کلکٹر صاحب مسٹر جی۔ ڈی۔ گیتھری کو شیر سنگھ سکھ سردار فوج نے قید کرلیا تو آپ نے انھیں قید سے چھڑایا۔ اور ان کے ساتھ سردھنہ میں حسن سلوک سے پیش آئیں اس لئے میں آپ کے رویہ سے خوش ہوکر آپ کی جاگیر کے الحاق کے سابقہ احکام جو سابق گورنر جنرل نے پاس کئے تھے واپس لیتا ہوں۔ آپ کی جاگیر بحالہٖ قائم رہے گی کیونکہ مجھے آپ کی وفاداری پر کامل اعتماد ہے۔" لیکن جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا بیگم شمرو سے معاہدہ ہوا تو اس میں یہ کلاز بڑھادیا گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ "زیب النساء جب تک زندہ ہے اس وقت تک اس کی حکومت دوآبہ (گنگا وجمنا) پر قائم رہے گی۔" یعنی مرنے کے بعد اس کا الحاق کمپنی بہادر کے علاقہ میں ہو جائے گا۔ ۱۸۰۲ء میں ظفر یاب خاں نے ہیضہ کیا اور دہلی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی لاش آگرہ پہنچائی گئی جہاں اس کا باپ بھی مدفون ہے۔

مختصر علالت کے بعد ۲۷ جنوری ۱۸۳۶ء کو بدھ کے دن صبح کے ساڑھے چھ بجے یہ نامور خاتون (۹۰) سال کی عمر پاکر اس دنیا سے رحلت کر گئی جس وقت اس بیگم کے مرنے کی خبر پھیلی تو محل کے باہر ہزاروں آدمیوں کا ہجوم جمع ہوگیا۔ ہر شخص رنج وغم کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس روز رعایا، فوج اور دیگر اہل علاقہ نے فاقہ کیا۔ رات کے نو بجے سے دوسری صبح کے آٹھ بجے تک اس کی لاش سردھنہ کے محل میں عام لوگوں کے دیکھنے کے لئے رکھی گئی اس کے بعد دفن کردی گئی تجہیز وتکفین اور دیگر رسوم مسیحی مذہب کے مطابق ادا کی گئیں۔ اور اسی موقعہ پر میرٹھ کے مجسٹریٹ مسٹر ہملٹن نے اعلان کیا کہ از روئے معاہدہ علاقہ سردھنہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں [illegible] ہے۔ اور آج سے یہاں انگریزی علاقہ کا قانون رائج مانا جائے گا جس وقت بیگم شمرو کا انتقال ہوا اس وقت اس کی فوج میں پیادہ پلٹن یعنی (۲۹۴۶) آدمی موجود تھے۔ (۱۰۰) توپخانے تھے۔ رسالہ میں (۲۴۵) تھے۔ باڈی گارڈ کے آدمی (۲۶۶) تھے اس کے علاوہ ایک اسلحہ اور توپیں ڈھالنے کا ایک کارخانہ بھی تھا۔ اس کے علاقہ میں کبھی قحط نہیں پڑا۔ اس کی رعایا ہمیشہ سرسبز وخوشحال رہی بیگم ہروقت ان کی دلجوئی اور حفاظت و مدد کا خیال رکھتی تھی۔ انگریزی کاغذات میں اسے "ہر ہائینس" لکھا جاتا تھا اور باوجود مذہب عیسوی اختیار کر لینے کے اس نے اپنا شاہی لقب "زیب النساء" برقرار رکھا کیونکہ اس وقت بادشاہ دہلی کے ہوتے ہوئے لقب کو استعمال نہ کرنے کی جرأت نہ ہوسکتی تھی حالانکہ مغل سلطنت برائے نام کی تھی۔

ہندوستان میں اس وقت جو یورپین آتے تھے وہ اپنا تمدن بالکل ہندوستانی بنا لیتے تھے لباس ہندوستانی شرفاء کا پہنتے تھے۔ بولی ان کی فارسی ہوتی تھی لکھت بھی فارسی میں ہوتی تھی حرم اور حقہ کا استعمال کرتے تھے۔ حد یہ کہ نام بھی اور خطابات بھی فارسی الاصل استعمال کرتے تھے۔ غرض وہ ہر طرح "نواب" ہوتے تھے۔ ان کی زندگی پر میرے استادِ تاریخ (جن کے لکھوائے ہوئے حوالوں سے اس مضمون میں مدد ملی) ڈاکٹر ٹی جی پی سپیر نے ایک کتاب "دی نواب" لکھی ہے۔ جو ان کا "ڈاکٹریٹ" کا مضمون تھا۔ اس میں انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان یورپینوں کے طرز معاشرت اور طریقہ ہائے بود و باند پر نظر ڈالی ہے۔ جو اس زمانہ میں ہندوستان آکر رہتے بستے اور قسمت آزمائی کرتے کرتے ملک کے حکمراں ہوگئے۔

بیگم شمرو رحمدل، ہمدرد اور نیک طبع عورت تھی۔ وہ باپ کی طرف سے عرب، ماں کی طرف سے ایرانی نژاد ہندوستانی اور شوہر کے رشتے سے جرمن کی جورو تھی جنگ کے میدانوں میں عربوں کی بسالت اور جوشش کا زندہ نمونہ خود بن کر افواج کی کمان کرتی تھی حملہ کرنے میں شیرنی کی طرح ہولناک اور تند ثابت ہوتی تھی۔ فیصلہ کرتے وقت ہر چیز کا پس وپیش خود سوچتی تھی پھر مشورہ کرتی تھی اور ایک فیصلہ کرنے کے بعد کسی عنوان اس سے پیچھے نہ ہٹتی تھی۔ ہر مذہب والے کے ساتھ اس کا سلوک مساویانہ تھا مگر جب سے اس نے مذہبی تبدیلی اختیار کرلی تھی۔ خدا ترس اور دیندار مسیحیوں کی بہت مدد کرتی تھی اور اسی وجہ سے تو مسیحی دور دور کے علاقوں سے کھنچ کر سردھنہ اور اس کے آس پاس آکر جمع ہوگئے تھے۔ وہاں اب بھی ایک مشن موجود ہے۔ جہاں میں اپنے ایک دوست بزرگ مسٹر فرانسس نے جو وہاں مقیم تھے جاکر

لا تھا۔ بیگم شمرو کیتھولک مذہب و مسلک کی تھی۔ میں نے اس کا بنا ہوا گرجا بھی دیکھا۔ گرجا کے صدر دروازہ پر کچھ اطالوی عبارت ہے اور فارسی عبارت بھی ہے جو مجھ سے پڑھی نہیں گئی مگر ایک کتاب سے لے کر لکھتا ہوں :-

یا مددِ خدا افضلِ مسیحا   بال شرِ دہ صد عشرین انما

بدل . . . نبا النسا عمدۃ الراکیں   نباشر مودہ غالب ان کلب

بیگم شمرو نے ہمیشہ دیسی بود و ماند رکھی۔ نہ لباس تبدیل کیا نہ ولایتی کھانے کھائے۔ وہ کسی کے سامنے بھی نہ ہوتی تھی ہمیشہ پردہ کے پیچھے بیٹھ کر بات کرتی تھی۔ گورنر جنرل کے ہاں جب وہ دعوتوں میں جاتی تو مکروہات استعمال نہ کرتی تھی اور پس پردہ نقاب پوش، دکرگعت و منیا میں مصروف رہتی۔ جو عورت انگریز یا دیگر یورپین قوم کی اس سے ملنے کیلئے آتی تو ہندوستان کی سوغاتیں جیسے کہ میدے کی شال دوشالے، ریشم کے تھان، زیورات وغیرہ انھیں تحفہ میں دیتی تا کہ یہ سوغاتیں جب اہل یورپ کے پاس پہنچیں تو وہ اس کے ملک کی مصنوعات و ہندوستان کی کاریگری کی ۔۔۔ ہیں۔ اس کا توشہ خانہ ہر وقت سامان و تحائف سے بھرا رہتا تھا۔ جس وقت اس کی جاگیر انگریزی علاقہ میں ضم ہوئی تو زرِ نقد نصف کروڑ کے قریب نکلا۔ اس کا ایک وارث ڈیوڈ آکٹر لونی سومبر تھا یعنی شمرو صاحب کا پڑپوتا۔ اس کی یادگار میں کلکتہ میں ایک مینار بھی ہے جو اختر لونی کا مینار کہلاتا ہے۔ دراصل یہ اوکٹر لونی ہے جو بگڑ کر اختر لونی ہو گیا۔ مرنے کے بعد وصیت کے مطابق بیگم شمرو کے معالج ڈاکٹر ٹامس ڈریور کو بیس ہزار روپیہ ملے۔ ڈیڑھ لاکھ روپیہ پاپائے روم کو اس نے اپنی حین حیات میں خیرات کاموں کیلئے مختلف اوقات میں بھیجا۔ مرنے کے بعد اسکی دولت مختلف لوگوں کو ملی جو زرِ وصیت سرکار نے تقسیم کی تھی۔ بیگم شمرو کا محل سردھنہ مشن کے پاس ہے۔ محل کے دربار ہال میں ۲۵ عمدہ پینٹنگ تھیں انہیں اتار کر یوپی گورنمنٹ نے عجائب خانہ میں رکھوا دیا۔ سومبر کی اولاد میں آخری آدمی ڈائس سومبر تھا جسکا ۱۸۵۱ء میں بمقام لندن انتقال ہوا مگر اس کی لاش ۱۸۵۲ء میں سردھنہ لا کر اپنی دادی بیگم شمرو کے پہلو میں دفن کی گئی اور اسکے ساتھ ہی والٹر رینہارڈ عرف سومبر عرف شمرو، جرمن قسمت آزما سپاہی کے خاندان کی آخری یادگار بھی مٹ گئی۔ اب سوائے بیگم آباد، بیگم پل میرٹھ چھاؤنی کی ایک گرجا، سردھنہ کے محل اور دہلی کے باغ بیگم شمرو (جو ایک محلہ ہے اور محل بھی بدل چکا ہے) اب شاید ہی کوئی یادگار موجود ہو۔ السٹریٹڈ ویکلی میں اس جلیل القدر اور اولوالعزم بیگم کے کچھ حالات اس خاندان کے ایک رفیق کے قلم سے کچھ عرصہ ہوا گذرے تھے اور قلمی تصویر بھی تھی جس کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں اس راقم مضمون کو بھی کچھ معلوم نہ تھا لیکن افسوس کہ اس مضمون کے ساتھ اسکی تصویر دینا نہ ہوسکی لیکن ایک مجسمہ جو گیارہ قد آدم مجسموں کا مجموعہ ہے ایک اطالوی سنگ زن ڈالیس سومبر کے حکم سے بنایا تھا اس میں بیگم شمرو کی تشبیہ دیکھی جا سکتی ہے۔ بیگم شمرو اوپر کے حصہ میں ہے کرسی پر بیٹھی ہے اسکے بعد نفرین میں مثلاً ڈائس سومبر، دیوان رائے سنگھ، سردھنہ کا بشپ جولیس سیزرس اور رعنا بیت اللہ جیسے اے۔ ڈی۔ سی۔ کہہ سکتے ہیں۔

شعلۂ جذبات
ادیب مالیگانوی

وہ آئے اور میری خلوتِ غم میں یوں بصد انتظام آئے
حسین ستاروں کی بزم رنگیں میں جیسے ماہِ تمام آئے

فضا میں رنگینیاں لٹاتے وہ ابرِ نازک خرام آئے
یہ وہ سماں ہے کہ آسماں سے پیام کچھ میرے نام آئے

مجاز کی سرزمیں پہ حقیقتِ سحر پہ ہنسنے کو شام آئے
اگر کہیں آدمی کے ہاتھوں میں زندگی کا نظام آئے

مجھے زمانے کی گردشوں نے اٹھا کے پھینکا ہے میکدے میں
نہ کوئی غم میرے دل پہ ٹوٹے نہ میرے ہاتھوں میں جام آئے

سب اپنے اپنے خیال میں تھے ادھر توجہ نہ تھی کسی کی
جھکا کے ہنستی ہوئی نگاہیں ہمیں وہ کرنے سلام آئے

غبار ہو جیسے آئینے پر گھٹائیں ہوں جیسے چاندنی میں
تمہاری جانب سے یوں بھی دل میں کبھی خیالاتِ خام آئے

نہ جانے دوری میں فیضِ ساقی سے کوئی ہوتا ہے شاد کیونکر
کہ ہم تو اکثر اس انجمن میں گئے بھی اور تشنہ کام آئے

کبھی کبھی ان سے دور رہنا بھی مصلحت سے نہیں ہے خالی
یہ وہ ادا ہے کہ حسن والوں کو عشق کا احترام آئے

نہ ہو اگر سوز و ساز دل میں تو ہے چمکنا محال تیرا
مٹے جو مانندِ شمعِ محفل، تو لوحِ شہرت پہ نام آئے

سرشتِ انساں ہے اک تماشا، مزاجِ فطرت ہے اک معمہ
اسی کی دشمن ہو ساری دنیا جو ساری دنیا کے کام آئے

یہی ہے فیضِ بہار یارب؟ یہی ہے کیا رت اس چمن کی
کھلے جو خوش رنگ پھول کوئی تو دستِ گلچیں کے کام آئے

یہ اہلِ تہذیب کی سیاست ہے یا مشیت کی خوش ادائی
ہو کوئی دولت کا کھیل لیکن "لہو غریبوں کا" کام آئے

مرے فروغِ سخن کے آگے ادیب گل ہو کے رہ گئے سب
ہزار سحر البیان اٹھے ہزار تشبیہیں کام آئے

دکھنی مرثیوں پر ایک طائرانہ نظر

نصیر الدین ہاشمی

ہر زبان کے ادبیات میں مرثیے بھی پائے جاتے ہیں اور ان کا خاص درجہ ہوتا ہے۔ مغربی زبانوں سے قطع نظر اگر ہم عربی مرثیوں کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سوز و گداز اور قوت تاثیر کے باعث دلوں میں ولولہ جوش اور انتقام کی آگ روشن کر دیتے تھے زمانہ جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں کے مرثیے اپنی فصاحت و بلاغت و سوز و گداز کے باعث مشہور ہیں۔

عربی کی طرح فارسی میں بھی مرثیوں کا رواج تھا ان پر عربی مراثی کے اسلوب بیان کا بہت کافی اثر ہوا۔ ملا محتشم کاشی کے زمانہ میں شہادت امام حسین علیہ السلام کے متعلق پر درد سوگوار فارسی مرثیے لکھے گئے اور بیسیوں شہادت نامے قلمبند ہوئے۔

اردو زبان میں انیس اور دبیر کے مرثیے اپنے خصوصیات کے لحاظ سے مشہور ہیں مگر لکھنؤ میں مرثیوں کا آغاز نہیں ہوا۔ شاعری اور نثر نگاری کی طرح مرثیوں کی ابتدا بھی دکن سے ہوتی ہے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کی حکومتوں کو سکا امتیاز حاصل ہے۔ چونکہ ان دونوں حکومتوں کا مذہب امامیہ تھا اور ایران کی صفوی حکومت سے دوستانہ تعلقات اور مراسم تھے اس لیے دکن میں مجلس عزا اور مرثیوں کا خاص دستور تھا۔ مجالس عزا میں ابتداء تو محتشم کاشی کے بند پڑھے جاتے تھے مگر چونکہ اردو یا دکھنی زبان عام طور سے مروج تھی شاہی دربار اور سلطانی محل سراؤں، امیروں کے قصر اور ان کے ایوانوں، درویشوں اور اہل تصوف کے خانقاہوں، شعراء اور ادیبوں کی محفلوں میں یہی زبان مروج تھی۔ اسی میں اظہار خیال ہوتا تھا۔ اس لئے مرثیوں کا دکھنی زبان میں لکھا جانا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ایک خاص گروہ مرثیہ گویوں کا پیدا ہوگیا۔ اور دکھنی مرثیے ایسے مقبول ہوئے کہ مغلیہ لشکر کے سپاہیوں نے بھی ان کو یاد کر لیا اور ان کے ذریعہ وہ شمال ہند میں بھی پہنچے اور وہاں بھی اردو زبان میں مرثیے لکھے جانے لگے اور روز بروز ان کو ترقی ہوتی گئی حتی کہ انیس اور دبیر نے ان کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔

اگرچہ اس طرح اردو مرثیوں کو شمالی ہند یا لکھنؤ میں خاص ترقی ہوئی لیکن جو خصوصیات دکھنی مرثیوں کو حاصل تھی وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

دکھنی مرثیوں کو ہم دو اقسام پر تقسیم کر سکتے ہیں ایک تو وہ مرثیے یا تفصیلی واقعات شہادت ہیں جن کو دکھنی شعراء نے شہادت ناموں اور قصیدوں کی صورت میں قلمبند کیا ہے۔ دوسرے وہ مرثیے جو مختصر ہیں۔

پہلا شہادت نامہ ۹۰۹ھ کا ہدست ہوا ہے۔ اس کا مصنف اشرف ہے "نوسرہار" کے نام سے یہ شہادت نامہ لکھا گیا ہے بیجاپور اور گولکنڈہ سے قطع نظر یہ احمد نگر کی تصنیف ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی طرح احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت میں بھی اردو یا دکھنی کا رواج تھا۔

گولکنڈہ کے شاعر خواص کا شہادت نامہ قصۂ حسینی کے نام سے ملتا ہے۔ جو ۱۰۵۰ھ میں تصنیف ہوا ہے۔ بیجاپور کے شاعر سیوا کے شہادت نامے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ولی دیلوری کا شہادت نامہ روضۃ الشہدا مشہور ہے۔ عطا نے دوازدہ مجلس شیدا نے روضۃ الاطہار، باقر آگاہ نے ریاض الجنان کے نام سے واقعات شہادت قلمبند کئے۔ غرض اس طرح بارھویں صدی ہجری تک کئی شہادت نامے لکھے گئے ہیں۔ بیجاپور کے ملک الشعراء ملا نصرتی کا نہایت طویل قصیدہ ہے جس میں بیجاپور کے محرم اور وہاں کے عاشور خانہ کا تفصیلی حال لکھا گیا ہے۔

یہ ہم کو معلوم ہے کہ دکھنی شاعری فارسی کو نمونہ قرار دے کر شروع ہوئی تھی۔ اس لئے کئی دکھنی منظوم کتابیں فارسی کتابوں کا ترجمہ ہیں۔ اس تفصیل میں شہادت نامے بھی شامل ہیں۔ دکن میں جو شہادت نامے قلمبند ہوئے ان میں سے بعض تو دکھنی شعراء کی اپنی خیالات اور افکار کا نتیجہ ہیں اور بعض فارسی شہادت ناموں کا ترجمہ۔ ان شہادت ناموں میں اکثر و بیشتر دس مجلسوں میں واقعات کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ ایام عزا کے دس دن تک یہ عاشور خانوں میں پڑھے جاتے تھے۔ امام حسینؑ کا مکہ سے روانہ ہونا، حضرت مسلم کی شہادت۔ علی اکبر و علی اصغر فرزندان امام حسین اور قاسم فرزند امام حسنؑ کی شہادت، حضرت حر کی آمد اور ان کا امام پر نثار ہو جانا اور حضرت حسینؑ کی شہادت وغیرہ کی مجلسیں قرار دی گئی ہیں۔ ان شہادت ناموں میں بڑی حد تک صحیح واقعات بیان کئے جاتے تھے۔ زمانہ مابعد میں جس طرح زیادہ تر فرضی روایات کو مرثیوں کا جزو اعظم قرار دیا گیا وہ ابتدائی دکھنی شہادت ناموں میں نہیں پائے جاتے۔

شہادت ناموں کے سوا دوسرے دکھنی مرثیے وہ ہیں جن کو اکثر دکھنی شعراء نے موزوں کیا ہے۔ دکھنی شعراء دوسرے اصناف سخن کے ساتھ مرثیے بھی عموماً قلمبند کرتے تھے۔ ان کے علاوہ کئی شعراء ایسے تھے کہ صرف مرثیہ گوئی ہی اُن کا مشغلۂ زندگی بنا ہوا تھا۔ اس قسم کے جو مرثیے دستیاب ہوئے ہیں ان میں قطب شاہی دور کے شعراء وجہی۔ غواصی لطیف وغیرہ کے علاوہ خود سلطان محمد قلی۔ سلطان محمد اور سلطان عبداللہ کے مرثیے موجود ہیں۔ ان کے سوا جو شعراء صرف مرثیہ گوئی کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں ان میں کاظم۔ مرزا، شاہی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ اسیطرح

بیجاپور میں بھی خاص مرثیہ گو شعرا موجود تھے۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ بیجاپور اور گولکنڈہ میں مرزا تخلص کے دو شاعر گذرے ہیں جن کا زمانہ تقریباً ایک ہے اور یہ دونوں مرثیہ گوئی میں خاص شہرت کے مالک تھے۔

دکھنی شعراء کے یہ مرثیے بھی پھر دو قسم پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ طویل مرثیے ہیں جن میں سے بعض کو خاص عنوانوں کے تحت لکھا گیا ہے۔ اور بعض بلا عنوان کے لکھے گئے ہیں۔ ان کو نوحوں اور سلام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ بعض شعرا نے تو غزلوں کی طرح مرثیوں کو ردیف وار ترتیب دیا تھا۔ چنانچہ ہاشم علی برہان پوری کے یہ مرثیے دیوان حسینی سے موسوم ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں بھی ہے جس کو ہم نے بھی دیکھا ہے۔ جو مرثیے عنوان کے تحت لکھے گئے ہیں ان میں سے بعض عنوان یہ ہیں:۔

قصۂ امام حسینؑ۔ قصۂ حضرت قاسم۔ قصۂ حر شہید۔ مرثیہ امام حسینؑ۔ مرثیہ حضرت علی اکبر۔ مرثیہ بی بی شہر بانو۔ دولہن کا ماتم۔ قاسم کی سواری۔ مسلم کی شہادت وغیرہ۔

اسی قسم کے طویل مرثیوں میں تفصیلی واقعات کا اظہار ہوا کرتا تھا۔ مثلاً امام حسینؑ کا جنگ کے لئے تیار ہونا، میدان جنگ میں تشریف لے جانا، دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمانا۔

حضرت قاسم کی شجاعت اور ان کی شادی۔ حضرت حر کی شہادت، ان کی فوج کی تعداد، ان کا مخالفین اسلام سے گفتگو کرنا، بحیثیت مہمان امام حسینؑ کے پاس آنا، پھر ان کا جنگ کے لئے اجازت طلب کرنا وغیرہ۔ اس کے علاوہ زمانہ مابعد میں لکھنؤ اسکول کے مرثیے جس طرح واقعہ نگاری اور منظر نگاری کے لحاظ سے قابل ستائش قرار دئے گئے ہیں اسی طرح دکھنی مرثیوں میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً رات کا سماں، صبح کا منظر، گرمی کا موسم، سفر کی حالت، لڑائی کا میدان، بے کسی و تنہائی، جدائی و مفارقت، بیوہ کی مصیبت اور اس کا رنج والم، بہن کا بھائی کی موت پہ آنسو بہانا وغیرہ ان واقعات یا مناظر کو دیکھ کر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ مابعد میں لکھنؤ کے شعراء نے اس قسم کی منظر نگاری میں جو کمال دکھایا ہے وہ دکھنی شعراء کے مرثیے کو دیکھ کر ہی پیدا ہوا تھا۔

دکھنی مرثیوں میں جو باتیں خصوصیت سے مابہ الامتیاز پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) ان مرثیوں سے صاف طور پر مرثیہ پن ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا اصلی مقصد حضرت امام حسینؑ اور اہل بیت رسالت کا غم کرنا، آنسو بہانا، صف ماتم قائم کرنا، اور مجالس عزا کو شکل بارگیر ہونا تھا۔ کوئی مرثیہ اس خصوصیت سے خالی نہیں ہے۔

(۲) دکھنی مرثیوں میں جذبات نگاری کے جوہر موجود ہیں۔ انسانی جذبات کی تفصیل واضح طور پر کی گئی ہے۔

(۳) ان مرثیوں میں سیرت نگاری کا حق بھی ادا ہوا ہے۔ ان میں نہ صرف بیانی سیرت نگاری ہے بلکہ مکالمے کے ذریعہ بھی سیرت نگاری کی گئی ہے۔

(۴) ان دکھنی مرثیوں میں ہندوستانی فطرت کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہندوستانی ماحول کا اثر ان کے مرثیوں میں نمایاں ہے۔ ہندوستانی ماں ہندوستانی بیوہ، ہندوستانی بہن اور ہندوستانی دلہن کی جھلک ان کے مرثیوں میں نظر آتی ہے۔

(۵) مرثیوں میں ادبی شان پائی جاتی ہے۔ بلحاظ ادب ان کو خاص درجہ دیا جا سکتا ہے۔

(۶) ان مرثیوں سے مرثیہ گویوں کے متعلق بعض تاریخی حالات ان کے نام، ان کے وطن اور ان کے ہمعصر مرثیہ گویوں کی صراحت معلوم ہوتی ہے۔

یہ اور اسی نہج کی کئی باتیں دکھنی مرثیوں کا جزو اعظم ہیں۔ دکھنی مرثیے صرف قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ ان سلطنتوں کی تباہی کے بعد بھی لکھے گئے ہیں۔ ایسے کئی مرثیہ گو شعرا مشہور ہیں جو مغلیہ دور حکومت میں دکن میں مرثیہ گوئی کرتے تھے۔ چنانچہ ذوقی، احمد، اشرف، امامی، رضی، روحی، ندیم، قادر وغیرہ خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں۔ ان کے مرثیوں کا اچھا ذخیرہ فہرست ہو چکا ہے اور بعض اصحاب نے ان کو ترتیب بھی دیا ہے مگر افسوس ہے کہ اب تک ان کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔

دکھنی مرثیے مختلف نہج پر ملتے ہیں مگر اکثر مربع بندوں کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ ہر مرثیے کے پہلے بند کے چار مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں اور ہر بند کا چوتھا مصرعہ اسی ردیف اور قافیے میں لکھا جاتا ہے۔ جو ابتدائی بند کا ہوتا ہے۔ بعض مرثیے غزل نما ہیں، بعض مسدس، بعض خمسے بھی۔ دکھنی مرثیے صرف منبر پر بیٹھ کر پڑھنے کے لئے ہی مخصوص نہیں ہوتے تھے بلکہ زیارت، چالیسویں نیز الوداعی بھی ہیں جو علموں اور تعزیوں کو ٹھنڈے کرنے اور لے جاتے اور واپس کرتے ہوئے راستہ میں پڑھے جاتے تھے۔

المختصر دکھنی مرثیے نہ صرف سوز و گداز اور پر اثر ہونے کی حیثیت سے بلکہ بلحاظ واقعہ نگاری، اسلوب بیان، طرز ادا اور بلحاظ لطف زبان بھی قابل تذکرہ ہیں۔ یہ موقع نہیں ہے کہ مرثیوں کا نمونہ پیش کیا جائے یا ان کا اقتباس درج ہو اس خصوص میں ہمارے کئی مضمون "مقالات ہاشمی" میں شائع ہو چکے ہیں جن سے تفصیلات واضح ہو سکتی ہیں۔

مش کررہی تھیں۔ ان نیرنگیوں میں عجب کشش اور جاذبیت ہوتی ہے اگر انسان فکروں اور پریشانیوں سے آزاد ہو کر اپنے منظر دیکھے تو دنیا و مافیہا کو بھول کر ایک سرور سرمدی میں غرق ہو جاتا ہے۔ قدرت اپنی تمام رعنائیوں اور دلربائیوں سے اپنی طرف مدعو کر رہی تھی۔ مگر تو بہ کیجئے۔ وہاں دماغ تو دونوں کی باتوں اور قہقہوں میں پھنس کر رہ گیا اور آنکھیں بھی کھوئی سی جا رہی تھیں میں نامعلوم کہاں؟

عالم خیال میں ٹہلے جا رہی تھی۔ پاؤں اپنا کام کر رہے تھے۔ اور دل و دماغ اپنا۔ اتنے میں "ہو" کی پرزور آواز نے مجھے گویا پھر زمین سے اٹھا دیا۔ شرافت کی عجب کیفیت۔ ۔ ۔ اسلم پاس کھڑے زور زور کے قہقہے لگا رہے تھے اور بھی ان کی صورت دیکھ اور آگ سی بھڑک اٹھی۔

"کیوں آئے یہاں۔ جائیے یہاں سے"۔

آزردہ۔ اچھا تو آپ خفا ہیں۔ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔ کیا بتا سکتی ہیں اس خفگی کی وجہ؟ پروین آخر خفا ہونے کی کیا بات تھی۔ ہم تو کالج سے سوچ کر چلے تھے۔ گھر پہ اسی طرح دلچسپی رہے گی۔ آپ خواہ مخواہ خفا ہو گئیں۔ آپ سے تو اچھی بھابی جان رہیں (بیاہی ہوئی بھابی) وہ تو نہایت سمجھدار انسان نکلیں۔ انھوں نے میری بے سر و پا باتوں میں معنی پیدا کر کے مصرع کی حقیقت نکلوا کر چھوڑی۔ اور تم خفا ہو کر بھاگ چھوٹیں۔ دیکھا فرق ماں اور بیٹی کا۔ جب ہی تو کہتے ہیں ذرا کم غصہ کیا کرو۔ تیکھی رہنا مردوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

"رہنے دیجئے اپنی نصیحتیں۔ بڑے ملاجی بن کر آئے۔ خود تو اپنی خامیاں دور کر لیجئے پھر نصیحت کا قدم بڑھائیے"۔

"آخر وجہ بتانے میں کیا حرج ہے۔ پھر یہ پارہ کیوں چڑھ گیا؟"

"کیا پاگل سمجھا ہے آپ نے مجھے؟"

"ارے غضب کرتی ہو پروین۔ کیا جوتے کھلوانے کا ارادہ ہے بھابی جان سے۔ اگر میں پاگل کہہ دوں تو وہ میری جان کو آجائیں۔ اکلوتی بیٹی۔ ناز و نعمت میں پلی۔ بھلا مجال کوئی پاگل کہہ جائے یہ تو تمہاری ہی اختراع ہے ابھی میرا تو ایسا خیال بھی نہیں"۔

"جی۔ ۔ ۔ آپ میں دراصل اتراہٹ زیادہ پیدا ہو گئی ہے۔ میڈیکل کالج میں قدم رکھتے ہی معلوم ہوا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ ابھی کیا۔ شروع میں ایسی حالت آخر میں نامعلوم کیا بن جائیں گے آپ؟"

"بات تو سچ کہی۔ ارادہ تو بعد میں "کچھ اور" ہی ہونے کا ہے۔ اترااہٹ جیسی چیز تم نے مجھ میں پالی۔ چشم بینا رکھتی ہیں آپ تو"۔

آپ بہت زیادہ چل نکلے ہیں۔ آپ پر کالج کی ہوا کا اثر زیادہ ہوا۔ سب کالج کے لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور آپ سب سے بڑھ چڑھ کر۔ ۔ ۔ مجھے تو نفرت ہوتی ہے۔ ۔ ۔" اتنا کہنا تھا وہ اس زور سے ہنسے کہ میری جلن میں بدستور اضافہ ہی ہوتا گیا پھر ہوش میں آ کر بولے۔

"آخر نفرت کیوں ہوتی ہے ہم سے"۔

"بس باتیں نہ بنائیے اور راستہ ناپ لیجئے اپنا"۔

"اب اس قدر عتاب نازل ہو رہا ہے۔ اچھا آئیے چاند دیکھ لیں رمضان کا تاکہ عید اور روزے اچھی طرح گذر جائیں"۔

"چھوڑئیے میرا ہاتھ۔ ورنہ امی سے کہتی ہوں اپنا مہمان سنبھال کر رکھا کیجئے سب کو اپنے مہمان کی خاطر و تواضع۔ ۔ ۔"

"ہم آپ کے مہمان نہیں ہیں"۔

"ہرگز نہیں"۔

"اب تو بس کیجئے۔ میل کر لیں۔ ہماری دعوت قبول کر لیں"۔

دعوت کا سن کر میں چونک پڑی۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آیا کیسی دعوت۔ ذومعنی الفاظ سے اکثر کوفت ہو جایا کرتی ہے۔ ایک بات کے دو پہلو۔ اب کونسی سمجھی جائے۔ سادہ بات کی طرف بھلا دماغ کیوں جانے لگا۔ اس کے لئے تو نیا مواد چاہئے۔ معمولی دعوت سے اس کو کیا سروکار۔ یہاں تو گہرے معنی کی تلاش۔ ۔ ۔ ارادہ تو بولنے کا قطعی ہی تھا۔ بات کی کھوج لگانے والی فطرت بیدار ہو گئی۔ اب کیا تھا۔ منت و سماجت پر نہ ماننے والی انسان لفظ دعوت سن کر نہ رہ سکی۔ آخر سوال کر ہی بیٹھی۔

"کیسی دعوت"؟

دل تو چاہتا ہے بتانے کو کیسی دعوت مگر آپ ویسے ہی کیا ہی ہیں اور نہ۔ ۔ ۔ اسی لئے فرض کر لیجئے کھانے پینے والی دعوت۔ اور بھی کسی قسم کی دعوت ہوتی ہے کیسی ہیں تو پتہ نہیں۔ تمہیں معلوم ہو تو بتاؤ۔ شاید دعوت۔ ۔ کا خیال ہو آپ کو۔ ۔ ۔"

"تو پھر کس چیز کی دعوت؟ پارٹی ہو گی؟ یا شام کا کھانا ہو گا؟ پھر آخر کیا چیز؟ وہ دیکھو چاند۔ ۔ ۔ وہ۔ ۔ ۔ وہ۔ ۔ ۔ اوپر۔ ارے نیچے کی طرف۔ ۔"

چاند دیکھتے ہی دونوں نے بارگاہ ایزدی میں سر نیاز خم کر لئے۔ کافی عرصہ اسی طرح حضوری میں کھڑے رہے پھر آنکھ کھول کر ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ دیکھیں کیسے گذرتے ہیں رمضان اور عید۔

"آپ کی تو روتی شکل ہے اسی لئے مجھے تو ابھی سے اندیشہ ہے۔ ۔ ۔ ۔" میں بولی۔

"اور جنابہ تو حور پری ہیں۔ پھر اپنی تو بہت عمدہ گذرے گی"۔

ہم دونوں دوڑ کر نیچے آئے۔ سب لوگوں کو چاند کی خبر سنائی۔ سب دیکھ چکے تھے سوائے امی کے۔ انھیں مجبور کیا چلیں اور چل کر دیکھیں مگر انھیں تو کاموں سے فرصت کہاں۔ اسوقت باورچی خانے میں سحری کا انتظام بڑے

شد و مد سے ہو رہا تھا۔ کون سنتا ہے اپنی۔

رات کو کھانے کے بعد اسلم بھائی کالج واپس چلے گئے۔ دوسرے روز امی سے میں نے دعوت کا پوچھا تو انھوں نے سب بتا دیا۔ اسلم سیخ کے کباب مع پلاؤ اور کھیر کے بتا گئے ہیں۔ ہم لوگوں کے دن دعوت کے انتظار میں کٹ رہے تھے۔ دیکھیں کیسی رہتی ہے یہ دعوت۔ اور امی ہر چیز کے انتظام میں دن کاٹ رہی تھیں دودھ والی سے کہا گیا فلاں دن فلاں تاریخ کو اتنا چاہئے دودھ۔ اسی آرزو میں دن کٹتے گئے۔ روزے کے بعد تو چٹ پٹی چیزوں کو دل چاہتا ہے اور پھر کسی کو کباب مل جائیں تو یا نصیب!! صبر سے کام کیا جا رہا تھا۔

چلتے وقت وہ امی سے کہہ گئے تھے جتنا قیمہ درکار ہو وہ منگا لیں مسالے وغیرہ اگر نہ ہوں تو وہ بھی۔ دودھ اور چاول اور پلاؤ کے لئے عمدہ سا گوشت۔ باقی جس چیز کی ضرورت ہوگی ہم سائیکل پر جا کر لے آئیں گے۔

بصد ناز و انداز سے آئی اتوار۔۔۔ اپنے ساتھ دعوت لائی کیوں نہ اہمیت دی جائے ایسی اتوار کو۔ بس اب شام کا انتظار کب آئیں بھائی اور کب لائیں اپنے کباب بیر کو۔ میں تو باہر کے کمرہ کی کھڑکی پر سوار انتظار کر رہی تھی۔ کھٹ پٹ۔ چھوٹی ٹری جیسی آواز پیدا ہوئی بس نظریں پھاٹک پر۔ اتنے میں اسلم بھائی آتے نظر آئے۔ میں سنبھل گئی۔ اور بولی

"کہئے آپ کے وہ نہیں آئے"۔

ہمارے وہ آتے ہی ہوں گے (ایسا سوال پوچھا جا چکا تھا) اسلم بھائی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ تو امی جان کے پاس چلے گئے میں کمرہ میں ہی رہی۔ مبادا ایسے وقت میں جھڑپ نہ ہو جائے۔ اور پھر کباب بھی ہاتھ سے جائیں۔ ایسے موقعوں پر تو وہ اپنے کو ایک بہت بڑی ہستی تصور کرنے لگتے ہیں۔ بارہا میں نے اس چیز پر غور کیا۔ بس ان کی یہ اترانے والی چھچھوری عادت ہی تو مجھے سخت ناپسند تھی۔ جب ہی میری ان کی کم بنتی تھی۔

جیسے ہی ایک کڑیل۔ تو ندو۔ اور موٹے موٹے بازو والا انسان میں نے دیکھا بھاگی میں تو اندر۔ اور جا کر خبر دی وہ آگیا۔ جلدی کیجئے روزے سے پہلے تیار ہو جائیں۔ تاکہ روزہ ذرا ان سے کھلے تو مزہ آئے۔

امی بولیں "اسلم جا کر اسے جگہ بتا دو۔ کہاں بنائے گا۔ باہر یا باورچی خانے میں تو ویسا انتظام کیا جائے"۔

کبابوں کے لئے جگہ مخصوص کی گئی۔ مسالے وغیرہ سب دوڑ دوڑ کر فراہم کئے گئے۔ کباب بننے شروع ہو گئے۔

پروین تم وہاں بیٹھ کر دیکھو کیسے بناتا ہے پھر آئندہ ہم بھی ویسے ہی بنائیں گے امی نے حکم صادر کیا۔

جس نے دعوت دی ہے وہ بیٹھ کر دیکھے اور ہمیں بتائے ترکیب تو اچھا ہے۔ دعوت کھلائی اور ترکیب بھی بتائی۔ پھر اس سے اچھا کون؟؟"

"کہی تو اچھی۔ آپ اس فکر میں ہیں کہ ہمیں بھی کبابوں کے ساتھ کباب بنا ئیں اور پھر چٹ کر جائیں"۔ اسلم بھائی بولے۔

"خیال تو ایسا ہی ہے"۔ میں نے ایک انداز سے کہا۔

جب کباب سیخوں پر چڑھائے گئے اور کوئلوں پر جانے لگے اور آگ تیز کی گئی اس وقت خوشبوئیں پھوٹ نکلیں۔ روزے والے منہ میں پانی ہی بھر آیا۔ اب چاہے روزہ مکروہ ہو یا بالکل ٹوٹ جائے مگر حقیقت تھی۔ وہ خوشبوئیں پھیل پھیل کر زبان حال سے یہ ہی مصرع کہہ رہی تھیں۔ یہ غلط فہمی تھی اپنی اس کو خوشبو سمجھے جا رہے تھے۔ دراصل مصرع ناکوں سے ہوتا ہوا کانوں میں جا رہا تھا۔

ان کرتوتوں کے بعد ہی تو اس قابل ہوتے ہیں کہ اس نام سے موسوم کئے جائیں۔ اس مزے سے یاد کئے جائیں۔ اس مصرع میں ایک بڑی حقیقت پوشیدہ ہے۔ میں نے کئی بار یہ مصرع پڑھا۔ اسلم بھائی نے سن لیا۔ اب تو شامت آئی۔ بولے

"کہئے اب آپ کو مرغوب ہوا یہ مصرع۔ جس چیز میں حقیقت ہوتی ہے وہ ضرور مرغوب ہوتی ہے۔ سنا آپ نے۔ اس روز تو اس پر خفا ہو گئی تھیں اور آج خود یہ فرما رہی ہیں"۔

"رہنے دیجئے۔ سوچ رہے ہیں لڑ لوں تو کباب سب خود ہی چٹ کر جائیں گے۔ آج ہماری طبیعت لڑنے کو نہیں چاہتی۔ کباب کھانے ہیں ہمیں تو"۔

"بڑی مطلبی ہے یہ دنیا"

"ہو گی دنیا ہم تو نہیں"

"آپ جیسے دنیا سے انوکھی اور دنیا میں نہیں"۔

کباب تیار ہوتے رہے۔ روزے کا وقت ختم ہونے پر سب نے پہلے کبابوں پر ہی اپنے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ چٹنی لگا لگا کر سی سی کرتے کرتے۔ کھا کھا کر پاگل تھے۔ اس کے بعد گرم گرم پلاؤ میٹھی میٹھی کھیر بھی منگانے کی رائے پیش ہوئی (منظور) پھر کیا تھا ڈٹے رہے۔ مزے دار زیادہ کھانا۔۔ خوشیاں اور خوش گپیاں انسان کو خدا سے دور کر دیتا ہے نتیجہ یہ ہوا سب کی مغرب کی نماز گول۔ ایک بچے نے یاد بھی دلائی۔ باجی!۔ ارے خالہ!! نماز بھی تو پڑھنی ہے آپ لوگوں کو۔ کسی نے گویا اس کے اس جملے پر کان ہی نہیں دھرا۔ خوب کھایا۔ خوب ہی مزا آیا۔ اور کیوں نہ آتا؟؟؟ مال بھی تو اس قدر خرچ ہوا۔

بعد کو پتہ ہوا۔ پڑی چپت کس پر؟ دعوت دی کس نے؟ بھرتی پڑی کس کو؟ امی جان ہی پر پڑی۔ بھائی تو صاف بچ گئے۔ یہ تھی دعوت یہ تھے کباب سیخ۔ اور یہ تھا مرغوب مصرع

"کباب سیخ ہوں میں کروٹیں ہر سو بدلتا ہوں"

پانی کی قیمت

گھرے کوئی سیتے دیا چلتی نہریں، اور گرتے ہوئے آبشار عام ہیں، انسان، حیوان، چرند و پرند، جسکا جی چاہے پانی پئے اور پلائے۔ ہندو ہو یا مسلمان سکھ ہو یا عیسائی، پارسی ہو یا یہودی، کرۂ ارض کے ہر ذی روح کے لئے پانی کی نعمت، بغیر کسی خصوصیت کے موجود ہے — دریا لک ہوتے ہیں لیکن اسکا پانی بلک نہیں ہوتا۔ پیاسے پر پانی بند کردینے کا کسی مذہب، کسی حکومت اور کسی قانون کو حق نہیں ہے۔ نہ ایک گلاس پانی اُٹھتی ہوئی موجوں کو بجھا سکتا ہے نہ ایک جام سے دریا کی روانی کم ہو سکتی ہے۔

تاریخ دنیا کی ہر گرانی میں پانی سستا رہا۔ ہر کال میں پانی بغیر قیمت فروخت ہوا جن مقامات پر پانی نایاب ہوتا ہے وہاں بھی پانی کی قیمت کہکر دام لیتے ہوئے دنیا شرم کرتی ہے۔ ہندو کی پیاس مسلمان اور مسلمان کی پیاس ہندو نہیں دیکھ سکتا۔ غربت اور مفلسی روپیہ مانگنے میں انسانیت کا ہاتھ روک دیتی ہے۔ تیسرے فاقہ کے بعد بھی روٹی طلب کرنے میں انسانیت کو حجاب آجاتا ہے لیکن پیاس کا بھڑکا ہوا شعلہ، اور سوکھا ہوا حلق، ہر انسان کو پانی پلا دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ نہ قدرت نے پانی نایاب کیا ہے نہ فطرت نے مہنگا خریدا ہے۔ غیر ضروری الیسا کہ زمین سے کئی گنا زیادہ اور ضروری اتنا کہ ہر ذی روح کی حیات کے لئے لازم۔ غرضکہ پانی وجود عالم کی بنیاد بھی ہے، اور شاید حشر کا پیش خیمہ بھی ہو جائے۔

چل انسان چل! تیرہ سو سال پہلے تجھے ایسے جنگل میں لے چلیں، جہاں "پانی" انسانی جانوں کی قیمت پر فروخت ہو رہا ہے، جانیں جا رہی ہیں لیکن پھر بھی پانی نہیں ملتا! — آفتاب کی گہری شعاعیں زرہوں کو توڑ کر انسانی جسموں تک گرمی پہنچا رہی ہیں جبر کا پرچم اڑ رہا ہے، سچائی کے قدم گڑے ہوئے ہیں۔ ۷۲ نگاہیں، بہتّر ہزار سے ٹکرا رہی ہیں۔ ہمت کی صف آراستہ ہے، عزم کے علم اونچے ہیں، ثباتِ قلب فولاد کو موم کر رہا ہے۔ آفتاب جھک رہا ہے کمر ٹوٹ رہی ہے۔ مظلوم سکھر کٹ جانے پر آمادہ ہے مگر ظلم و استبداد کے سامنے جھک جانے پر تیار نہیں ہے۔

لڑائی تو چاند کی دسویں کو ہوگی۔ مگر پانی ساتویں ہی تاریخ سے بند کر دیا گیا۔ دریا اگرچہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھ کی طرح چمک رہا ہے اور سطح آب سانپ کے پیٹ زخم، کی طرح جگمگا رہا ہے لیکن پیاسوں کو ایک قطرۂ آب نہیں مل سکتا۔ واہ رے انصاف!۔ خدا کی عام نعمت پر حیوانیت کا خاص قبضہ؟ بوڑھوں اور جوانوں کے ساتھ، عورتوں اور بچوں پر بھی پانی بند؟ ممکن ہے ہزاروں فوجوں کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ پانی تو صرف ۷۲ سپاہیوں پر بند تھا لیکن چھ ماہ کے بچے نے اس خیال کو دماغ میں آنے سے پہلے ہی ختم کر دیا۔

آفتاب تھرتھراتے ہوئے دل کی طرح بیٹھ رہا ہے۔ آباد ڈاڑھی پر ٹپکے جو ٹکے بربادی کا اعلان کر رہے ہیں —— وہ دیکھو انسانیت کی مدِ نظر!۔ سنسناتے بھرتے ہوئے تیروں میں، کوندتی ہوئی تلواروں کی بجلیوں میں جھنجھناتی ہوئی برچھیوں میں، تڑپتے ہوئے خنجروں، اور چمکتے ہوئے نیزوں میں ضعیف، غریب، اور مظلوم باپ اپنے چھ ماہ کے پیاسے بچے کو فطرت کے ہاتھوں سے سنبھالے، انسانیت کے کلیجے سے لگائے، اُمید کے راستے پر قدم بڑھا رہا ہے۔

انسانوں سنو! "میرا بچہ پیاسا ہے۔ اس کے ہونٹ خشک ہیں، ننھی سی زبان سوکھے ہوئے پھول کی پتی کی طرح ہلکی سانس کے سہارے جنبش کر رہی ہے۔ اس کی ماں کا دودھ، تین دن کی بھوک اور پیاس سے خشک ہو چکا ہے۔ جنگ تو مجھ سے اور تم سے ہے۔ بھلا اس شیر خوار بچہ نے کیا کیا؟ —— اور اگر تم یہ سمجھو کہ باپ اپنے بچے کے نام سے پانی طلب کر رہا ہے، اور خود پینا چاہتا ہے تو آؤ —— اس بچہ کو اپنے ہاتھ سے پانی پلا جاؤ۔"

ہوا کا تیز جھونکا، سطح سمندر کی بالائی موجوں کو جنبش دیتا ہوا نکل گیا۔ یا ایک روشن ستارہ، چبھتے ہوئے کانٹوں تک اپنے نور کی شعاعیں پہونچا کر ڈوب گیا۔ تقریر کے الفاظ کانوں سے دلوں میں اترتے چلے گئے، نگاہیں جھکیں، انسانیت شرمائی۔ اخلاق نے ٹھوکے دیئے۔ فطرت نے آمادہ کیا۔ بلکہ بعض نے تو دبی زبان سے یہ بھی کہدیا کہ "بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ بچہ سے اور جنگ سے کیا غرض"؟

مگر نہیں۔ دریا کی روانی ظلم کے پہاڑ سے ٹکرا کر بیٹھ گئی۔ ارادہ کو استبداد نے کچل دیا۔ حیوانیت نے انسانیت کو دبا دیا۔ فوج کے سردار نے قطع کلام کا حکم دیدیا — اور ایک انسانیت کا باغی حیوان کاندھے سے کمان اتار کر آگے بڑھا۔ اور اب جو تین بھال کے تیر کو کھینچ کر چھوڑ دیا تو —— انسانی تصورات کانپ گئے، سینوں میں دل الٹ پلٹ ہو گئے۔ فطرت کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے —— ظلم، ظلم، اور تاریخ کا انوکھا ظلم، دنیا کا اکیلا ظلم، بنی نوع انسان میں اپنی نوعیت کا پہلا ظلم؟ —— پانی کے سوال پر تین بھال کا تیر؟ بچے کا نازک حلق۔ اُبلتا ہوا خون! بیچارگی کا وقت۔ نا اُمیدی کی موت، ہمت کا ہنگام، صداقت کی آزمائش، عبرت کا مرقع —— انسانیت دانتوں میں انگلی دبائے دیکھ رہی ہے، اور بچہ اپنے باپ کی گود میں ہچکیاں لے کر خون اُگل رہا ہے —— بچہ مر گیا مگر پانی کی قیمت ادا نہ ہوئی۔ یہ کربلا کا جنگل تھا، محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ یزید کی ٹڈی دل فوجوں کا تاریخی ظلم تھا۔ امام حسینؑ کی تقریر تھی! پسر سعد کا حکم تھا۔ حرملہ کا تیر تھا اور چھ ماہ کے علی اصغرؑ کی دردناک شہادت کا منظر۔ دنیا قیامت تک تاریخ کے ورق اُلٹتی رہے گی مگر نہ کربلا ایسی جنگ مل سکتی ہے، نہ حسینؑ جیسا بہادر، اور صبر کرنے والا ٭

فضل لکھنوی
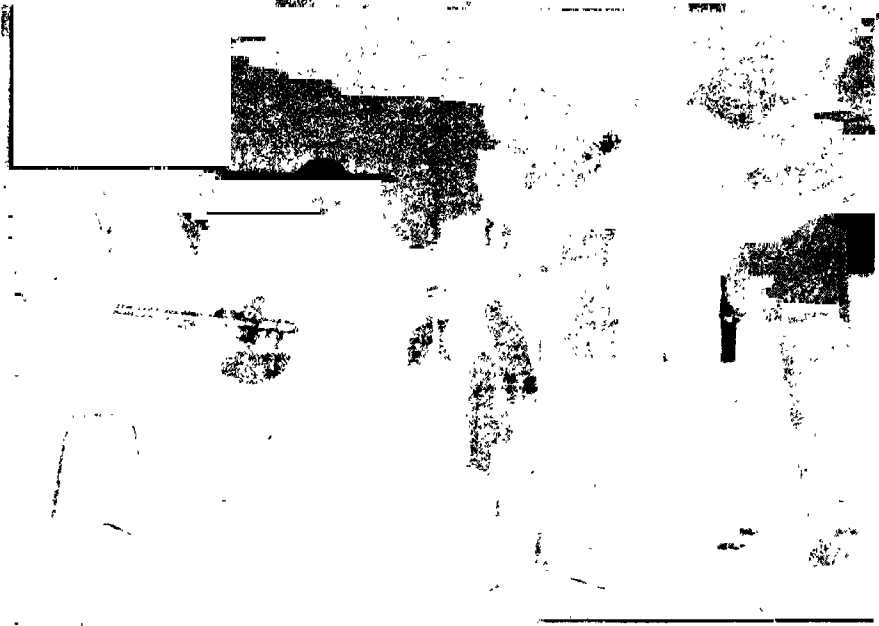
علی زاهدی۔ ضرب نواز۔ چند ایرانی ماہرین موسیقی جنہوں نے نئی دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے ایرانی گانے وغیرہ نشر کیے۔

ایرانی ساز اور سازندے
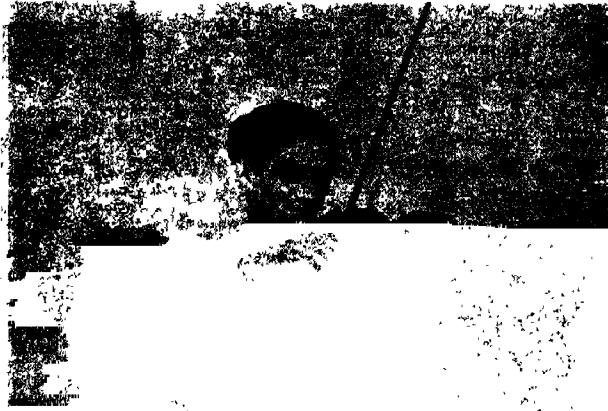
آقائے یوسف قاموسی۔ تار نواز۔

آقائے علی اکبر پروانہ۔ تار نواز۔

آقائے مہدی خالدی۔ رباب نواز

فائیسیلیا

یہ پرتگال کے قریب سمندر میں پایا جانے والا ایک عجیب و غریب جانور ہے جسے مچھلی کی ایک قسم کہا جاسکتا ہے۔ یہ پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے۔ اسکے جسم کا باقی حصہ جو ریشے دار گچھے کی وضع کا ہوتا ہے' پانی سے نیچے رہتا ہے۔ یہ جانور سات آٹھ انچ لمبا ہوتا ہے لیکن بعض ریشے اس سے بھی زیادہ طویل ہوتے ہیں۔ وہ انہی ریشوں کی مدد سے چھوٹے موٹے کیڑے خصوصاً چار انچ تک کی مچھلیاں پکڑ کر ہضم کرلیتا ہے۔ اگر یہ ریشے انسان کے جسم میں چبھ جائیں تو زخم پڑ جاتا ہے۔ گچھے کے بالائی حصے میں چند عضلات منہ کے طور پر جانوروں کو ہڑپ کرنے کیلئے ہوتے ہیں۔ اس جانور کا رنگ اوپر سے زردی مائل بلکوں اور پیٹ گلابی ہوتا ہے۔

ایک فائیسیلیا خوراک کی تلاش میں پانی کی سطح پر تیرر ہاہے۔

ایک مچھلی پھنس گئی ہے جسے کھانے کی کوشش کر رہا ہے

ننھی مچھلی مر گئی ہے۔ اب اسے ہضم کرلینا آسان ہے۔

مصری کالجوں کی لڑکیاں اور مخالف جنس کے ایک ہم جماعت طلبا جو مخلوط طورپر تعلیم حاصل کرتے ہیں

مصری کالجوں کی لڑکیاں

وہ مطالعے میں بڑے انہماک کے ساتھ مصروف رہتی ہیں۔

بہت سی مصری لڑکیاں ظاہری سج دھج اور شان و شوکت ہی پر اکتفا نہیں کرتیں۔ بلکہ اپنی دماغی صلاحیتوں کو بھی خوب پروان چڑھانا چاہتی ہیں۔ اسی لئے وہ مدرسوں اور کالجوں میں لڑکوں کے دوش بدوش تحصیل علم میں مصروف نظر آتی ہیں وہ اس تعلیمی دوڑ میں اپنے ہم جماعت لڑکوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہتیں بلکہ انکے ہم پلہ اور ہمسر ثابت ہوتی ہیں۔ اس صفحے کی تصاویر کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصری کالجوں کی لڑکیوں کا دن کس طرح گذرتا ہے۔

کالج میں حاصل کی ہوئی تعلیم کو زیادہ مکمل کرنے کیلئے وہ لائبریری میں مزید مطالعہ کر رہی ہیں۔

دن بھر کے کام سے فارغ ہوکر وہ شام کے وقت سیر و تفریح کیلئے جا رہی ہیں۔

سم کا ایک منظر۔ تعمیر کا کام ابھی جاری ہے ۔ پاپاناسم آبشاروں کے بالائی حصے میں یہ بند ساڑھے پانچ ارب مکعب فٹ پانی کو روک کر آبپاشی کیلئے مفید ثابت ہوگا۔

جنوبی ہند کا عظیم الشان بند

دریا کے دونوں طرف ایسی چٹانیں موجود ہیں جنکا پتھر کاٹ کاٹ کر بند کی تعمیر میں لگایا جارہا ہے۔

جنوبی ہندوستان میں دریائے تھمبراپرنی کی روانی اور پاپاناسم آبشاروں کا زور دونوں اس لائق تھے کہ ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاتا۔ ایک طرف بند لگا کر پانی کا ذخیرہ جمع کیا جا سکتا تھا تاکہ قریب کی زمینوں میں خوب آبپاشی کرکے زراعت کو ترقی دی جائے اور دوسری طرف پانی کی بجلی بھی تیار ہوسکتی تھی۔ عرصہ دراز تک اس طرف توجہ مبذول نہ ہوسکی لیکن اب ان کاموں کو عملی جامہ پہنایا جا

بند کے اوپر بنے ہوئے ذخیرۂ آب سے پانی لے جانے والی پائپ لائن۔
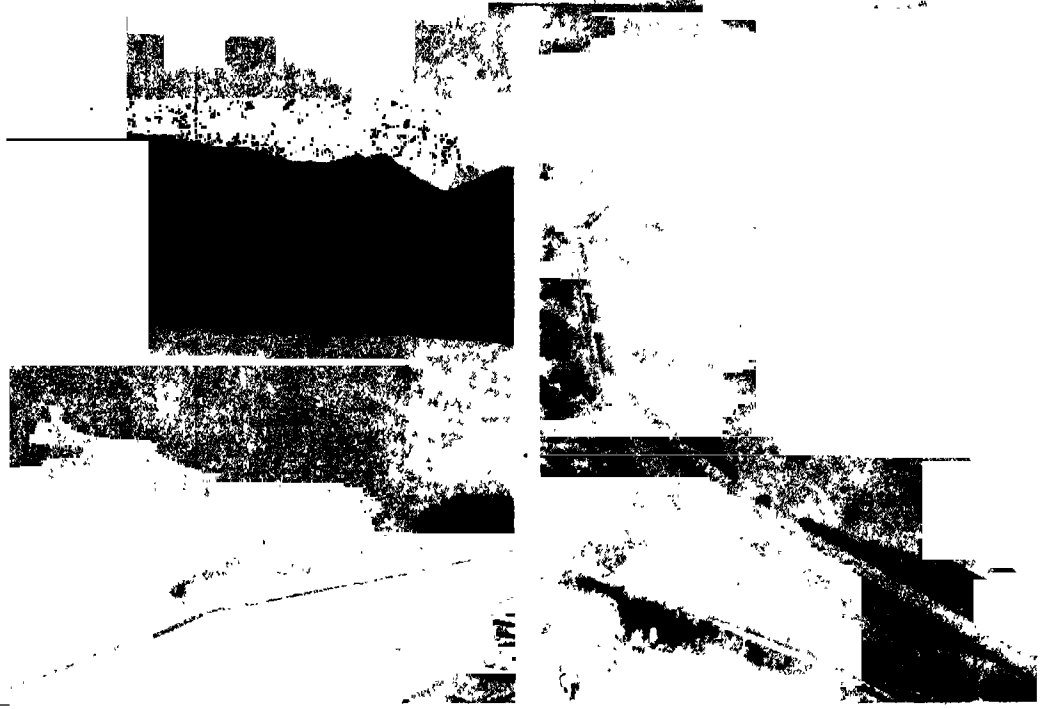
بند لگنے سے پاپاناسم آبشاروں سے کچھ دور دریائے تھمرا پرنی کے کنارے ایک جھیل سی پیدا ہوگئی جسے «جھیل امید» کہتے ہیں۔

آبی ذخیروں میں جمع کیا ہوا پانی جب تیزی کے ساتھ نلوں سے گذرتا ہے تو خاص مرکزوں پر لگی ہوئی مشینیں حرکت میں آجاتی ہیں اور آبی بجلی تیار ہونے لگتی ہے۔ یہ اسی موقع کی تصویر ہے۔
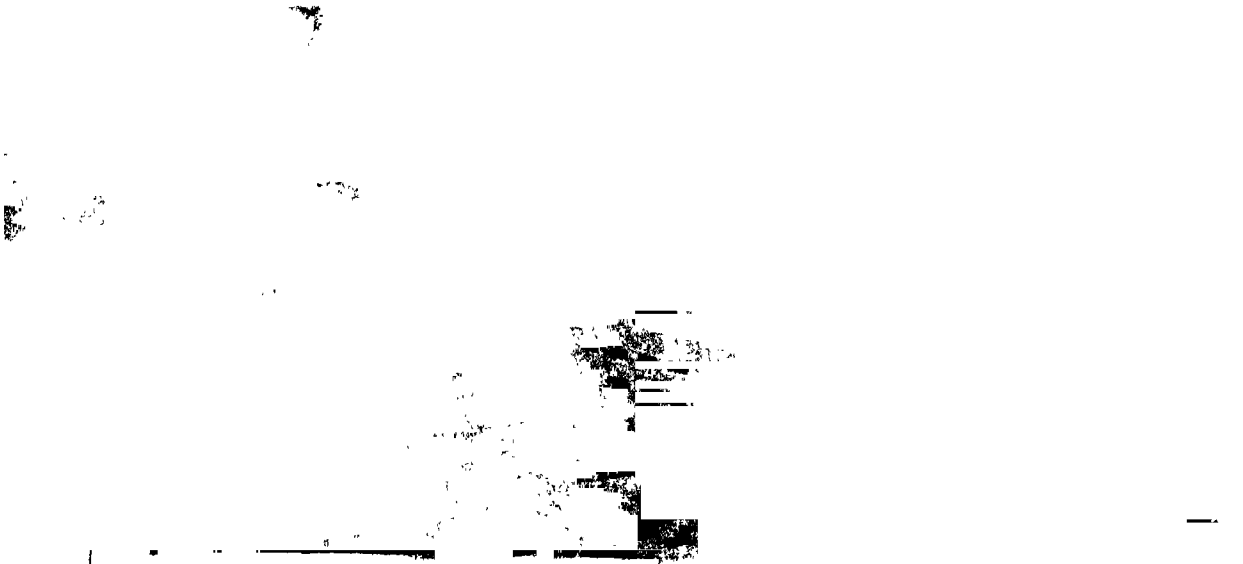
روسی ناچ

مقدونیہ کی عورتوں کا ناچ ←

روسی ناچ کی ایک قسم جو «مازرکہ» کہلاتی ہے۔

روسی ناچوں میں بیلے سنکیت اور ک
کے دوسرے ناچ شامل ہیں۔ ہر موقع پر
ایک ڈرامہ پیش کر دیا جاتا ہے جس
پلاٹ کافی پیچیدہ اور کردار عجیب و
ہوتے ہیں۔ بعض عوامی ناچوں
سویت یونین کی اصل روح اپنی جھل
دکھاتی ہے۔ مختلف صوبوں اور عا
کے ناچ مختلف ہیں پھر بھی ان میں
ایسی یکانگت نظر آتی ہے کہ انہیں د
ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کس ۔
سے متعلق ہیں۔ ماسکو کی دلچسپیو

قابل ذکر ناچوں کی ایک نمائش ہے جس میں ازبکستان جورجیا' استونیا' کریلین اور دوسری قوموں کے ناچوں کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

ناچ کی ایک اور قسم جو «پانکا» کہلاتی ہے۔ ←

ماتمِ سائل

نہال سیوہاروی

ہے جوشِ غم ہمہ تن، بے قرار ہے دلی
کسی دکھے ہوئے دل کی پکار ہے دلی

فغاں کا عالمِ شعر و سخن سے شور اٹھا
گری چمن پہ وہ بجلی، چمن سے شور اٹھا

رہینِ نوحہ گری ہر ادب شناس ہوا
دیارِ غالب و مومن اداس، اداس ہوا

ظہورِ ظلمتِ غم بزم بے چراغ سے ہے
بلند شورِ بکا سرزمینِ داغ سے ہے

دلِ جہاں پہ قیامت گذر گئی یارب
ضیائے نیرِ رخشاں کدھر گئی یارب

جفائے خنجرِ دوراں سے دلفگار ہوں میں
ندیم! جام اٹھا لے کہ سوگوار ہوں میں

نکاتِ فن کئے اک عمر جس نے حل نہ رہا
دریغ ساقیِ میخانۂ غزل نہ رہا

زدیدہ موجۂ خوناب حاصل است مرا
چہ دشنہ در جگر از مرگِ سائل است مرا

بلند رتبہ و عالی مقام تھا سائل
جہانِ شعر و ادب کا امام تھا سائل

سخنوری میں مسلّم وقار تھا اُس کا
ہر ایک شخص عقیدت گذار تھا اُس کا

وہ کیف بار و حیات آفریں غزل اُسکی
بہارِ تازہ کی صورت حسیں غزل اُسکی

وہ مثنوی میں طبیعت کا رنگِ جولانی
فرازِ کوہ سے بہتا ہو جسطرح پانی

جُدا زمانے سے انداز شعر خوانی کا
ہر اک زباں پہ وہ ذکر اس کی خوش بیانی کا

اسیرِ خوابِ اجل نغمہ خواں ہوا صد حیف
خموش طوطیِ ہندوستاں ہوا صد حیف

بیاں نہ ہو وہ مصیبت ہے رحلتِ سائل
وداعِ خُلق و مروت ہے رحلتِ سائل

ترے فراق میں خوں گشتہ ہر جگر ہے آج
شبیہہِ غالبِ مرحوم تو کدھر ہے آج

گذر جہاں تھا وہ راہیں تلاش کرتی ہیں
ترے وطن کی نگاہیں تلاش کرتی ہیں

مچھلیوں کی کیمیاوی پرورش

ایک دورافتادہ اسکاچستانی جھیل میں تین سال کے مسلسل تجربے دنیا کے ہر ملک کی ماہی گیری کی صنعت میں ایک انقلاب عظیم برپا کرنے والے ہیں۔ اسوقت بعض موسموں میں مچھلیوں کی جو کمی ہو جاتی ہے آئندہ یہ نہ ہوا کرے گا۔ سمندر کی مچھلیاں جو آجکل کے بازاروں میں خاص تجارتی چیز سمجھی جاتی ہیں دو سال کے عرصہ میں اتنی بڑی اور پرورش یافتہ ہونے لگیں گی جتنی چھ سال کے عرصہ میں ہوتی ہیں۔

ان نئے تجربوں کا سلسلہ پوشیدہ طور پر ۱۹۴۰ء میں شروع ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب دشمن کی آبدوزوں اور طیاروں کا بحر شمالی اور بحر اوقیانوس پر بڑا دور دورہ تھا اور انگلستان میں مچھلی نایاب ہو گئی تھی۔ ان کوششوں کی ابتدا اور ان کو پروان چڑھانے کا سہرا بہت بڑے بڑے سائنسدانوں کے سر ہے۔ مثلاً پروفیسر جیمز ریچی (ایڈنبرہ یونیورسٹی میں حیوانات اور نباتات کے پروفیسر) اے۔ سی۔ ہارڈی (ابرڈین یونیورسٹی کے پروفیسر) اور سر جان گراہم کر (سابق پروفیسر گلاسگو یونیورسٹی) جو اب اسکاچستانی یونیورسٹیوں کی طرف سے برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ ان لوگوں کو "امپیریل کیمیکل انڈسٹریز" کے سرچشموں سے بھی برابر مدد ملتی رہی۔

ان تجربات کے پیچھے جو بنیادی خیال کام کر رہا ہے اس کو مختصراً اسطرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ سمندر کی مچھلی ہی ایک ایسی غذا ہے جو ابتک صرف شکار ہی کے ذریعہ دستیاب ہو سکتی ہے۔ اور دوسری تمام اشیائے خوردنی پر (خواہ وہ ترکاری کی قسم سے ہوں یا گوشت کی) پورا پورا انسانی قبضہ ہو چکا ہے۔ زراعت کے نئے نئے طریقوں کی وجہ سے فی ایکڑ زمین کی پیداوار میں اس زمانہ کی بہ نسبت جب انسان کا گزران فقط شکار پر تھا اس زمانہ میں بے انتہا اضافہ ہو چکا ہے۔ کیا اسی قسم کے جدید طریقوں کے ذریعہ سمندری مچھلی کا بھی زیادہ سے زیادہ دستیاب ہونا ممکن ہے؟

جون پینی

جس طرح خشکی پر طرح طرح کے پودے اور ہری بھری گھاس ہوتی ہے اسی طرح سمندر کے اندر بھی زندگی ہوتی ہے۔ سطح آب پر بہت ہی چھوٹے چھوٹے حیوانات تیرتے رہتے ہیں جو صرف خوردبین ہی سے نظر آ سکتے ہیں۔ ان سمندری نباتات و حیوانات میں بھی زندگی ہوتی ہے۔ ان حیوانات و نباتات کو اتنے ہی بڑے دوسرے حیوانات کھا جاتے ہیں۔ پھر ان کھانے والے حیوانات کو چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اور دوسری قسم کے بہت سے سمندری حیوانات کھا لیتے ہیں۔ پھر ان چھوٹی مچھلیوں اور دوسرے حیوانات کو وہ بڑی مچھلیاں کھا جاتی ہیں جن کا شکار کیا جاتا ہے۔ گویا جسطرح خشکی کے جانوروں کی خوراک کا دارومدار گھاس اور سبز چارہ پر ہے اسی طرح سمندر میں بھی مچھلیوں کو سمندری حیوانات و نباتات کی ضرورت ہے۔ اور مچھلیوں کی تعداد کا انحصار اسی سمندری خوراک کی مقدار پر ہے۔

عام طور پر ایک مکعب فی میٹر پانی میں کئی کئی ہزار سمندری حیوانات ہوتے ہیں۔ ایک ایکڑ سمندر میں تقریباً دس ٹن ایسے غیر مرئی کیڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ان سمندری حیوانات میں کسی کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسکاچستانی جھیل میں جو تجربے کئے گئے ان کا مقصد یہ تھا کہ محدود سمندری پانی میں ان سمندری حیوانات کی تعداد کو کیمیاوی طریقے سے بڑھایا جائے اور دیکھا جائے کہ سال کے مختلف حصوں میں مچھلیوں کی تعداد اور جسامت پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔

سمندر کے پانی میں مذکورہ بالا سمندری حیوانات کی تعداد جاڑوں اور گرمیوں میں گھٹ جاتی ہے اور بہار اور خزاں میں بڑھ جاتی ہے۔ اسکاچستانی جھیل میں تجربہ کرنے والے سائنسدانوں نے ستر ہزار مکعب میٹر پانی میں دس مختلف تاریخوں میں چھ سو پونڈ سوڈیم نائٹریٹ اور چار سو پونڈ سپر فاسفیٹ ملا دیا۔ سمندر میں قدرتی طور پر یہ دونوں چیزیں جتنی مقدار میں پائی جاتی ہیں اس طرح پر اس مقدار میں پانچ اور دس گنا اضافہ کر دیا گیا پھر اس پانی میں دو ہزار سات سو چھوٹی چھوٹی فلاؤنڈر مچھلیاں اور چھ سو پلیس مچھلیاں ڈال دی گئیں تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مچھلیوں کو پکڑا گیا اور جس قدر ان کا وزن بڑھا اس کی یادداشت لکھ لی گئی۔ اس ترکیب سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ بہت ہمت افزا تھے۔ عام طور پر جاڑے کے مہینوں میں مچھلیوں کا وزن نہیں بڑھتا۔ اس کی وجہ آب و ہوا کا تغیر تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن دیکھا گیا کہ اس مخصوص پانی میں رہنے والی مچھلیوں کا وزن سال کے ہر حصہ میں بڑھتا رہا۔ ۱۹۴۲ء تک سمندری نباتات کی مقدار میں ڈھائی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ چھوٹے بچوں کی تعداد میں بھی ڈھائی گنا اضافہ ہوا اور بڑی مچھلیوں کی جسامت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ قصہ مختصر دو سال کے عرصہ میں اس ترکیب سے فلاؤنڈر مچھلی کا وزن اور لمبائی اتنی بڑھ گئی جتنی معمولی حالات میں چار سال کے اندر بڑھتی۔

دوسرا تجربہ جھیل کے ایک دوسرے گوشہ میں کیا گیا۔ اس دفعہ پانی کا جو رقبہ لیا گیا اس کو پہلی دفعہ کی طرح محدود نہیں کیا گیا۔ یہ قطعہ تقریباً دو سو ایکڑ کا تھا اور سمندر اس سے بہت ہی قریب تھا۔ اس پانی میں فی ایکڑ

(بقیہ صفحہ ۳۸)

ہندوستان اور ایران کے ثقافتی تعلقات

ایران و ہند سکین یک دو دماں بُدند — باشد گواہِ من کتب باستان ہند
یک دین و یک تمدن و فرہنگ داشتند — ہم مردمانِ ایراں ہم مردمانِ ہند

زمانہ قدیم کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ثقافتی نقطۂ نظر سے ہندوستان اور ایران ہمیشہ سے ایک مضبوط رشتۂ ارتباط و اتحاد میں منسلک چلے آتے ہیں۔ گو ناگوار واقعات کی بنا پر اس علمی اور ادبی ربط ضبط کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لئے ضرور ٹوٹ گیا تھا لیکن جلد ہی یہ دونوں ملک پھر ایک دوسرے کے قریب آتے گئے حتیٰ کہ ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو ایک ایسا اہم بالشان واقعہ رونما ہوا جس نے ان روابط و ضوابط کی داستانِ کہنہ میں ایک بالکل نئے اور بڑے درخشاں باب کا اضافہ کر دیا۔ میرا روئے سخن اس ایرانی ثقافتی مشن کی طرف ہے جو جناب علی اصغر حکمت کی قیادت میں ہندوستان آیا۔ مشن کے دوسرے اراکین جناب شید یاسمی اور پروفیسر پور داؤد تھے۔ سارا کین مشن وائسریگل لاج میں فروکش ہوئے تھے اور دہلی کے قیام کے تینوں دن ہز ایکسلنسی لارڈ ویول وائسرائے ہند کے مہمان خاص رہے۔ یہ مشن تین ہفتہ تک تمام ملک ہندوستان کا دورہ کرتا رہا اور ملک کے خاص خاص علمی اور ادبی مرکزوں مثلاً لاہور، علی گڈھ، بنارس، الہ آباد، بمبئی، حیدرآباد (دکن) بنگلور اور مدراس میں گھوم کر ۲ اپریل ۱۹۴۴ء کو بمبئی سے ایران واپس چلا گیا۔

اس ایرانی مشن کی آمد سے بڑے بڑے فائدے مستنبط ہوئے۔ اراکین مشن کی پذیرائی ہندوستان میں ہر جگہ بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہوئی۔ اس تپاک اور خلوص کی وجہ صرف یہی تھی کہ اس سے ہندوستان اور ایران کے باہمی تعلقات میں مزید خوشگواری اور استحکام کے پیدا ہونے کی امید تھی۔ اراکین مشن کے دہلی میں قیام کے دوران میں ایرانی قونصل جنرل جناب علی معتمدی کی جانب سے سفارت خانہ میں ایک بڑا شاندار اور پرشکوہ جلسہ ہوا جس میں ہندوستان کے کمانڈر انچیف سر کلاڈ آکنلیک اور ملک کی مقتدر ہستیاں اور مشہور ادیب مدعو تھے۔ جناب قونصل اور آپ کی بیگم صاحبہ محترمہ نے اپنے بہترین طرز عمل سے ثابت کر دیا کہ آپ ہندوستان اور ایران کے باہمی تعلقات کو خوشگوار تر اور پائندہ تر بنانے میں کسقدر ساعی ہیں۔ تہذیب انسانی کی تاریخ میں ایران کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یورپ کے مورخین اس بارے میں بالکل متفق الرائے ہیں کہ ایران تہذیب عالم کا گہوارہ ہے یعنی تہذیب و تمدن کا آفتاب سب سے پہلے اسی سرزمین پر چمکا اور دنیا کے دوسرے ملک اسی خوان یغما کے زلہ ربا ہوئے۔ اس کا ثبوت بھی تاریخی کتب سے بخوبی ملتا ہے کہ تہذیب کی دوڑ میں ہندوستان ایران کا ہمدوش رہا ہے۔

ایسا ہی ایک دوسرا ثقافتی وفد حال ہی میں ادھر آیا۔ اس وفد کو موسیقی دانوں کا وفد کہہ سکتے ہیں۔ قائد وفد جناب جواد بدیع زادہ تھے اور دوسرے اراکین مہدی خالدی، علی اکبر پروانہ، یوسف قاموسی اور زاہدی صاحبان ہیں جو ایران کے مشہور ترین موسیقی داں ہیں۔ خالدی صاحب وائلن بجانے میں ایران میں اپنا نظیر نہیں رکھتے اور زاہدی صاحب ضرب بجانے میں نامور ہیں۔ ان حضرات نے آل انڈیا ریڈیو سے اپنے گانے سنا کر اور اپنے مخصوص آلات موسیقی بجا کر سب کو کمال محظوظ کیا اور جو جلسہ ایرانی قونصل جناب معتمدی نے اعلیٰحضرت محمد رضا شاہ پہلوی کی سالگرہ کے مبارک و مسعود موقع پر منعقد کیا اس نے تمام شرکا و حاضرین کو بدرجہ اتم محظوظ کیا۔ نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی اور شہزادہ احمد علی خاں نے جو اس بزم موسیقی میں موجود تھے ایرانی نغمہ و غنا کی اس نمائش کو بے حد پسند کیا۔ ان حضرات کی گرویدگی کا محرک بھی وہی معنوی ربط ہے جس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

اس بزم میں جو ترانہ سب سے پہلے سنایا گیا وہ ڈاکٹر مشائخ کا نتیجۂ فکر تھا۔ اس کی دھن جناب بدیع زادہ نے بنائی تھی۔ (ترانہ کے اشعار پایان مضمون میں نقل ہوں گے۔) اس ترانہ میں ہندوستان، ایران کے قدیم روابط و ضوابط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ امیر خسرو دہلوی، فیضی اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کا پایہ ادبیات فارسی میں اس قدر بلند ہے کہ ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ شعرائے ہندی سعدی، حافظ اور فردوسی سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

یہ نزہت بخش جلسہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو منعقد ہوا تھا۔ جلسہ میں تشریف لانے والے حضرات کی پذیرائی خود قونصل ایران فرما رہے تھے۔ جلسہ کی کارروائی اس طرح شروع ہوئی کہ جناب قونصل ایران نے مائکروفون کے سامنے کھڑے ہو کر تمام ایرانی سازندوں کا تعارف کرایا اور فرمایا کہ ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کے درمیان ہم آہنگی کا ایک ثبوت یہ ہی ہے کہ ایرانی تار اور ہندوستانی ستار بڑی حد تک یکساں ہوتے ہیں۔

ترانہ جو ڈاکٹر مشائخ نے لکھا اور بدیع زادہ نے پیش کیا۔

ملک باستانی گلستان جائے دوستاں ہندوستاں۔

م۔ ن۔ سمیعی

خاک ایماں مہد شیراں جائے دلیراں چوں بوستاں
اے سرزمین ہند ہمسایہ گرام اسے خاک کشورت بہتر ز زر خام
خاک زرخیز با دگل بیزا بر ز ریز زاں توشہ
دشت و لالہ زار باغ بہ ہزار افزوں ز صد ہزار بر ما تمام
ملک پاکستان ہمچو گلستان الخ

مایہ نشاط ملک ہند باشد رود گنگ و سندھ
کشوری مہد شگفتی و عجب مرزش فارغ از اندوہ و تعب
پیرورد . . . . پیرورد . . . . پیرورد در دامان خویش امثال دہلوی
مانند اقبال و فیضی دکن مرد معنوی
آثار شان زیب فرہنگ خود سازند
دمی کہ ہنگامہ جنگ جاں بازند
اکنوں بیا با نوائے چنگ ایں نغمہ آغازیم
ملک پاکستاں ہمچو گلستاں . . . . تا آخر

بنگر زعجب بہ ہیبت کا روں برتر بود ز مکنت قاروں
بہ ملک جم میراث داریوش بود موطن گردان پرخروش
کہ بستر د۔ کہ بستر د۔ کہ بستر دا ز دلہا محنت ایں بوستان ما
مثنوی و شہنامہ و گلستان ما
سعدی اندر قدرت بیان چوں کیمیاست
حافظ اندر آتش زبان آیہ خداست
اکنوں بیا با نوائے چنگ ایں نغمہ آغازیم
ملک پاکستاں ہمچو گلستاں . . . . تا آخر

مچھلیوں کی پرورش : ——— بقیہ صفحہ ۲۶

کھاد ملا دیا گیا اور پانی کے تیز بہاؤ کے باوجود دیکھا گیا کہ سمندری حیوانات کے نشو و نما کو ترقی ہوتی رہی اور اسی وجہ سے اس جھیل کی مچھلیاں بھی خوب اچھی طرح اور جلد بڑھیں۔
ان تجربوں کے علاوہ اور بھی تجربے ہو رہے ہیں ممکن ہے کہ انکا سلسلہ جھیل کے بجائے کھلے سمندر تک بھی پہنچ جائے۔ اگر سمندری تجربے کامیاب ہوگئے تو سمندری مچھلی کی بہم رسانی جو انسانی غذا کا ایک بہت اہم جزو ہے۔ بہت بڑھ جائیگی اور ان مصنوعی طریقوں سے مچھلیوں کی پیدائش اور پرورش پر پورے طور پر انسانی قبضہ ہو جائیگا اور اس سے انسانی غذا کی بڑی بہتات ہو جائے گی۔

دھندلکا ——— نعیم صبا

چلو کہ زلف سیہ کی گھنیری چھاؤں میں
سنہری خواب کی وادی میں اپنے نغموں کو
نشاط نے کی طرب آفریں فضاؤں کو
سمالیں اپنی محبت بھری جوانی میں
حسین چاندنی راتیں مری کہانی میں
یہ خواب کی سی فضائیں، یہ رات کا جوبن
گری ہوئی ہے فضاؤں شباب کی چلمن
فضا پہ نرم، دھندلکا اُداس اور سیمیں
یہ رس میں ڈوبی ہوائیں، یہ چاندنی زریں
یہ نیم تیرہ فضائیں، رگوں میں نرم کسک
یہ کہکشاں اور ستاروں کی یہ سہانی جھلک
اتھاہ سکوت ہے لیکن نمی ہے سلجھی ہوئی
کسی خیال میں کھوئی ہوئی ہے خاموشی
یہ حسن اور جوانی میں ڈوبی انگڑائی
یہ رنگ و روپ، یہ رنگیں جمال، بے خوابی
یہ حسن، شعلۂ سیمیں، یہ مرمریں سینہ
کنول کی طرح مہکتا ہوا یہ آئینہ
یہ جگمگاتی کرن اور نیلگوں ٹھنڈک
جبینِ نور پہ ایمن کی بجلیوں کی جھلک
شباب سے ہیں معطر گھنی گھنی پلکیں
نشیلے ہونٹوں میں میگوں گلابیاں چھلکیں
نمی نمی سی فضا میں سکوت کی دھڑکن
یہ دلفریب مناظر، خمار بادہ کہن
چلو کہ آج دھندلکوں کے نرم آنچل میں
سفید چادرِ سیماب پھر بہانے دے
چراغِ بربط و مینا مجھے جلانے دے
نشاطِ لمحۂ فانی کہاں گیا ہے آج
مئے حیاتِ محبت چھلک رہا ہے آج
ہر ایک شے ہے فضا میں سکوں بدوش ابھی
رُباب بزمِ مسرت کے ہیں خموش ابھی

آفرینشِ نظامِ شمسی

رشید فریدی

آفرینش عالم کے مسئلہ نے زمانہ قدیم سے انسان کو متوجہ رکھا لیکن یہ راز سربستہ نہ زمانہ قدیم میں بڑے بڑے فلاسفروں سے کھل سکا نہ زمانہ حال کے سائنسداں اس مسئلہ کو حل کر سکے۔ اور نہ شاید کبھی انسان اس حقیقت کی تہہ تک پہونچ سکے۔ زمانہ قدیم میں تخلیق ارض کے متعلق لوگ عجیب و غریب خیالات رکھتے تھے۔ مثلاً اسکنڈی نیویا کے رہنے والے یہ خیال کرتے تھے کہ زمین کا بیضہ ایک بہت بڑے سارس جیسے پرندے نے دیا تھا۔ قدیم مصریوں کا یہ اعتقاد تھا کہ بیضہ پانی سے پیدا ہوا اسکے دو حصے ہو کر ایک زمین اور دوسرا آسمان بن گیا۔ اہل فنیشیا کے نزدیک زمین کا بیضہ آفتاب سے پیدا ہوا تھا۔ پولی نیشیا کے رہنے والوں میں سے ایک یہ کہانی مشہور ہے کہ آسمان اور ہوا کے دیوتا نے پانی کے اوپر ایک پرند کی مانند عرصہ تک منڈلا کر زمین کا بیضہ دیا تھا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق برہما عرصہ دراز تک کنول کے پتہ پر کھڑا غور و فکر کرتا رہا۔ بالآخر اس نے عالم کے برابر ایک سنہرا بیضہ پیدا کیا۔ اس میں سے نظام عالم کے جملہ افراد نے اپنی اپنی مخصوص شکل و حالت اختیار کر لی۔

زمانہ قدیم میں لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ انسان کے رہنے کے لئے زمین پیدا ہوئی۔ کچھ انسانی ضروریات زمین سے پوری ہوتی ہیں اور کچھ دیگر اجرام فلک سے۔ مثلاً آفتاب سے انسان حیوان اور نباتات کو زندہ رہنے کیلئے گرمی اور روشنی ملتی ہے۔ قمر سے رات کی تاریکی رفع ہوتی ہے۔ ستاروں سے رات کیوقت سمت اور راستہ معلوم ہوتا ہے۔ دمدار تارے زمین پر آنے والی کسی مصیبت کی اطلاع دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح جملہ اجرام فلک زمین کے لوازم سمجھے جاتے تھے۔ اسی لئے تخلیق ارض کے ساتھ تخلیق عالم کا مسئلہ بحث میں آجاتا تھا۔

توہمات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس مسئلہ کی تحقیق کی طرف غالباً سب سے پہلے یونانیوں نے توجہ کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اول اول انسان یہ خیال کرتا تھا کہ نظام عالم کی یہ ترکیب اور یہ شکل و صورت ہمیشہ سے ایسی ہی ہے لیکن جب انسان نے گرد و پیش کی دیگر مادی اشیا کو وجود میں آتے اور ایکوقت کے بعد فنا ہوتے دیکھا تو یہ خیال کرنے لگا کہ دوسری مادی اشیا کی مانند یہ عالم بھی عدم سے وجود میں آیا۔ اس خیال کے ساتھ عالم کے خالق کا تصور لازمی تھا۔ اسلئے مذاہب نے عالم کا خالق خدائے برتر کو مانا۔ غیر مہذب اقوام نے توہمات کے مطابق مجلس عالم کو دوسری طاقتوں کا کرشمہ سمجھا۔ اب ایک یہ نیا سوال کھڑا ہو گیا کہ جس مادہ سے زمین اور دیگر اجرام فلک بنے ہیں وہ اس عالم کے موجودہ تشکیل پانے سے پیشتر موجود تھا یا نہیں۔ اسی مسئلہ پر زمانۂ قدیم ہی میں علماء کے تین گروہ ہو گئے تھے۔

(۱) ایک گروہ یہ خیال کرتا تھا کہ زمین اور اجرام فلک ہمیشہ سے یہی ترتیب اور شکل و صورت اختیار کئے ہیں جو اسوقت ہے۔ یعنی عالم ازلی اور ابدی ہے۔ کہتے ہیں ارسطو کا یہی اعتقاد تھا۔

(۲) دوسرا گروہ یہ خیال کرتا تھا کہ مادہ قدیم ہے اور نظام عالم حادث یعنی مادہ منتشر حالت میں تمام فضائے بسیط میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کی نہ کوئی شکل تھی نہ حد۔ زمانہ دراز گذرنے کے بعد کچھ قدرتی قوانین کے ماتحت اس مادہ میں حرکت پیدا ہوئی اور نظام عالم وجود میں آگیا۔ اس قیاس کے مطابق مادہ تو قدیم ہے لیکن نظام عالم حادث۔ حادث شے کی ابتدا انتہا ہوتی ہے۔ یعنی وجود میں آنے کے بعد ایک خاص مدت تک وجود میں رہ کر فنا ہو جاتی ہے چنانچہ ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ایک زمانہ کے بعد نظام عالم منتشر ہو کر پھر مادہ کی شکل اختیار کر کے پھیل جائے گا اور شاید عرصہ دراز سے بکھرا ہوا مادہ پھر مجتمع ہو کر ایک نیا نظام عالم مرتب ہوگا۔ کہتے ہیں کہ زمانہ حال کے سائنسدانوں کا بھی یہی خیال ہے۔

(۳) تیسرے گروہ کا خیال تھا کہ نظام عالم کی تخلیق سے پیشتر مادہ بھی وجود میں نہ تھا۔ یعنی مادہ اور نظام عالم دونوں حادث ہیں۔ جب مادہ بھی موجود نہ تھا تو اس نظام عالم کی تخلیق کیسے ہوئی؟ ایسی صورت میں دہریہ کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی بڑی قوت نے ان سب کو پیدا کیا۔ وہ بڑی قوت کیا تھی؟ مسلمان، یہودی، عیسائی اور دوسرے اعلیٰ مذہب والے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر نے عالم کو پیدا کیا۔ مسلمانوں کی مقدس کتاب "قرآن مجید" کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ اور کل کائنات خدا تعالےٰ کے حکم سے وجود میں آئے جسکی تکمیل چھ ہزار سال میں ہوئی۔

مولانا ابو الکلام آزاد اپنی مشہور تفسیر ترجمان القرآن میں تخلیق عالم کے متعلق قرآنی آیتوں کا حوالہ دیتے ہوئے یوں تحریر کرتے ہیں۔

"آسمان اور زمین کی پیدایش ایسے مادے سے ہوئی جسے قرآن نے "دخان" کہا ہے۔ دخان کے معنے دھوئیں کے ہیں یا ایسی بھاپ کے جو ابر چڑھی ہوئی ہو۔ یہ مادہ دخانیہ ابتدا میں ملا ہوا تھا۔ الگ الگ نہ تھا۔ پھر اسکے مختلف حصے ایک دوسرے سے جدا کر دئے گئے اور ان سے اجرام سماویہ کی پیدائش ہوئی۔" آگے چلکر لکھتے ہیں "ابتدا میں مادہ دخانی تھا۔ پھر اس میں انفصام ہوا۔ یعنی سب سے پہلے ٹکڑے ہوئے۔ پھر ہر ٹکڑے نے ایک کرہ کی شکل اختیار کر لی۔ اور اسی کے ایک ٹکڑے سے زمین بنی۔ پھر زمین میں کوئی ایسی تبدیلی واقع ہوئی کہ دخانیت نے مائیت کی شکل اختیار کر لی یعنی پانی پیدا ہو گیا۔ پھر خشکی کے قطعات درست ہوئے۔ پھر پہاڑوں کے سلسلے نمایاں ہوئے پھر زندگی کا نمو شروع ہوا۔ آخر میں مولانا فرماتے ہیں "موجودہ زمانہ میں اجرام سماویہ کی ابتدائی تخلیق اور کرۂ ارض کی ابتدائی نشو و نما کے جو نظرئے تسلیم کر لئے گئے

ہیں یہ اشارات بظاہر ان کی تائید کرتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان بنیادوں کی شرح وتفصیل کی بڑی بڑی عمارتیں اٹھا سکتے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا کرنا صحیح نہ ہوگا۔ یہ نظریے کتنے ہی مستند تسلیم کیے گئے ہوں لیکن پھر نظریے ہیں اور نظریات حزم و یقین کے ساتھ حقیقت کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔

سائنسداں کہتا ہے کہ مادہ پیشتر سے موجود تھا اور اس مادہ کی حرکت سے سب کچھ وجود میں آیا۔ اس سوال کا جواب کہ مادہ کہاں سے آیا اور اس میں قوت حرکت کیسے اور کیوں پیدا ہوئی سائنسداں یہ دیتا ہے کہ مادہ کی پیدائش کا سوال حدود سائنس سے باہر ہے۔ سائنس کسی موجود شے کی فطری قوت کے عمل اور نتائج پر بحث کرتی ہے نہ کہ اسکی تخلیق پر۔ اگر ہم سائنسدانوں کا یہ خیال تسلیم بھی کر لیں کہ مادہ پیشتر موجود تھا اور اس سے نظام عالم کی تخلیق ہوئی تب بھی مادہ کو پیدا کرنے والے اور اس مادہ میں کچھ فطری قوت ودیعت کرنے والے کی ہستی کا اقرار کرنا پڑتا ہے جس سے آخر کار سائنسداں بھی منکر نہیں۔

زمانہ حال کا سائنسداں اس درجہ پر تو آگیا کہ مادہ اور اسکی قوتوں کا خالق خدا ہے لیکن یہ سمجھتا ہے کہ خدا کا بنایا ہوا مادہ منتشر صورت میں موجود تھا۔ اس میں کچھ فطری قوتیں بھی موجود تھیں جنکی وجہ سے مادہ نے مختلف ارتقائی مدارج طے کرکے نظام عالم کی موجودہ شکل اختیار کر لی۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنسدانوں کا یہ قیاس بظاہر صحیح بھی معلوم ہوتا ہے لیکن سائنس کے نظریے جدید مشاہدات کے سانچوں میں نئے نئے روپ بدلتے رہتے ہیں۔ قدیم یونانی فلاسفروں کے مسلم نظریے زمانۂ وسطےٰ میں غلط سمجھے جانے لگے اور زمانہ وسطےٰ کے نظریات کو آج ایک اسکول کا لڑکا بھی تسلیم نہیں کرتا۔ انیسویں صدی عیسوی میں تخلیق عالم کے متعلق جو نظریہ عام طریقہ سے تسلیم کیا جاتا تھا کچھ عرصہ کے بعد نظروں سے گر گیا بیسویں صدی میں جس نظریہ پر جمہور علما کا اتفاق ہے خدا معلوم کس دن غلط ثابت ہو جائے۔ اسلئے تخلیق عالم کے متعلق سائنس کا پیش کردہ وہ نظریہ جو آجکل عام طریق پر مانا جاتا ہے اس مسئلہ کا آخری حل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ بالآخر گھوم پھر کر سائنس بھی ایکدن یہیں آجائے کہ [illegible] اور عالم سب حادث نہیں۔ اور عالم کی پیدائش کے بعد سے اب تک زمین کی شکل وصورت میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں بس انہیں تک اسکا قانون ارتقا محدود ہو جائے۔

اصلاً آفرینش عالم کا مسئلہ علم فلسفہ سے متعلق ہے جغرافیہ سے اسے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ لیکن چونکہ علم … کے طالب علم کو بھی کبھی تخلیق ارض کے سوالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور چونکہ موجودہ صورت کے مطابق تخلیق ارضی نظام شمسی کے ساتھ ہوئی ہے اس سے نظام شمسی کی تخلیق کے متعلق جو نظریات سائنس نے پیش کئے ہیں ان کو اجمال واختصار کے ساتھ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

نظام شمسی کی تخلیق

زمانہ قدیم کے اعتقادات کے مطابق ہماری زمین کو کائنات میں وہ غیر معمولی اہم اور قابل رشک جگہ حاصل تھی جو آج آفتاب یا کسی بڑے سے بڑے ستارے کو بھی میسر نہیں۔ اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین تمام عالم کے مرکز پر واقعہ ہے اور تمام سیارگان۔ ثوابت آفتاب۔ قمر اور دیگر اجرام سماوی اس کے گرد گھومتے ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس نے زمین کے بجائے آفتاب کو عالم کا مرکز قرار دیا۔ سترھویں صدی میں سب سے پہلے کیپلر نے یہ ثابت کیا کہ ہمارا آفتاب دوسرے ستاروں کی مانند ایک معمولی ستارہ ہے اس کے چاروں طرف کچھ سیارے گھومتے ہیں جن میں ایک زمین بھی ہے۔ اور یہ نظام شمسی کائنات کے بے پایاں فضائی سمندر میں ایک چھوٹے جزیرہ کی مانند ہے۔ اس طرح سترھویں صدی کے بعد سے زمین کی حیثیت تو محض ایک چھوٹے سیارہ کی رہ گئی۔ آفتاب صرف نظام شمسی کا مرکز قرار پایا۔ اور ہمارے نظام شمسی کی وقعت کائنات میں ایک ذرۂ بے مقدار سے زیادہ نہ رہی ان انکشافات کے بعد تخلیق عالم اور تخلیق نظام شمسی دو الگ الگ مسائل ہوگئے۔ اب ہم ایک ایک نظریہ کو لیکر اس کی تشریح کرتے ہیں۔

(۱) نظریہ سحابیہ

جرمن پروفیسر کانٹ نے ۱۷۵۵ء میں سب سے پہلے نظام شمسی کی تخلیق کے متعلق ایک حکیمانہ نظریہ پیش کیا۔ اس نے دیکھا (۱) تمام بڑے بڑے سیارے اور سیارات صغیرہ میں کم از کم پانچسو اسی ایک مخصوص سمت میں آفتاب کے گرد گھومتے ہیں جس میں آفتاب محوری حرکت کرتا ہے (۲) تمام سیاروں کی مداری حرکت قریب قریب ایک ہی سطح پر ہے اور سب کے مدار بھی کم وبیش مدور ہیں۔ (۳) اکثر سیاروں کی محوری حرکت بھی اسی ایک مخصوص سمت میں ہے۔ اور (۴) سیارگان کی رفتار بھی سوائے چند مستثنیات کے قریب قریب اسی سطح پر اور اسی ایک مخصوص سمت میں اپنے اپنے سیارے کا طواف کرتے ہیں۔ اس غیر معمولی مطابقت کا سبب بقول پروفیسر کانٹ یہ ہو سکتا تھا کہ تمام نظام شمسی ایک ہی سبب سے ایک ہی حالات کے ماتحت اور ایک ہی وقت معرض وجود میں آیا چنانچہ پروفیسر مذکور نے نظام شمسی کے وجود میں آنے کی یہ تشریح کی کہ اول اول مادہ گیس کی صورت منتشر حالت میں آفتاب کے مقام سے لیکر آخری سیارے کی حدود سے بھی باہر تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک زمانہ کے بعد یہ بڑا سحاب ٹھنڈا ہو کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ زیادہ کثیف حصوں نے آس پاس کے منتشر اجزا کو جذب کر لیا اور اس طرح سحاب کی بجائے چند گول جسم وجود میں آ گئے۔

چند سال بعد فرانسیسی عالم لاپلاس نے ۱۷۹۶ء میں اپنی کتاب میں پروفیسر کانٹ کے نظریہ کو واضح کرتے تخلیق کے مختلف درجات کی مکمل تشریح کی۔ لاپلاس کے خیال کے مطابق جب اس وسیع سحابیے نے آہستہ آہستہ اپنی گرمی خارج کرکے سکڑنا شروع کیا تو اس میں مغرب سے مشرق کو محوری حرکت پیدا ہوگئی۔ محوری حرکت سے اس سحابیے نے کم وبیش ایک قرص کی شکل اختیار کر لی۔ جیسے جیسے یہ قرص ٹھنڈی

ہوکر وسعت میں کم ہوتی گئی ویسے ویسے اسکی محوری حرکت بڑہتی گئی جسکی وجہ سے قوت دافعہ عن المرکز بھی زیادہ ہوتی گئی جب قوت دافعہ عن المرکز قوت جاذبہ سے بڑھ گئی تو اسی سحابی قرص کا باہری حصہ ایک حلقہ کی شکل میں اصل جسم سے جدا ہوکر وہیں رہ گیا۔ چونکہ یہ سحابی حلقہ گھومتے ہوئے جسم سے جدا ہوا تھا اسلئے یہ حلقہ بھی مغرب سے مشرق کو حرکت کرتا رہا۔ اصل قرص ٹھنڈی ہوکر سکڑنے کیوجہ سے اس حلقہ سے دور ہوتی رہی ادہر اس سحابی حلقہ کے اجزا یکے بعد دیگرے ٹھنڈے ہونے شروع ہوئے جو اجزا سب سے پہلے ٹھنڈے ہوئے وہ ایک مرکز پر جمع ہوگئے اب یہ چھوٹی منجمد گانٹھ وسطی سحاب کے گرد گھومنے لگی۔ اور دوران طواف میں جو اجزا ٹھنڈے ہوتے رہے ان کو جذب کرکے اپنی جسامت بڑہاتی رہی یہانتک کہ تمام اجزا کو جذب کرکے اس سحابی حلقہ کی جگہ ایک گول جسم وجود میں آگیا۔ فضا میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس جسم کو آفتاب کے گرد گھومنے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش کرتی اس لئے یہ جسم سیارہ بن گیا۔ جس طرح اصل سحاب کے سکڑنے سے اس میں محوری حرکت پیدا ہوگئی تھی اسی طرح اس سیارہ کے سکڑنے سے اس میں محوری حرکت پیدا ہوگئی۔ لاپلاس کے نظریہ کے مطابق نظام شمس کی ابتدا دور ترین سیارے پلوٹو سے ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد جب اصل سحابی قرص ٹھنڈی ہوکر اور زیادہ سکڑی تو پلوٹو کے مانند نیپچون یورینس۔ زحل اور مشتری علی الترتیب معرض وجود میں آئے۔ مشتری کے بعد جو سحابی حلقہ اصل قرص سے جدا ہوا وہ یا تو مشتری (جو سیارگان میں سب سے بڑا ہے) کی عظیم قوت کشش کے باعث کسی ایک مرکز پر مجتمع نہ ہوسکا یا اسکے اجزا یکے بعد دیگرے ٹھنڈے ہونے کے بجائے تمام کے تمام بیک وقت ٹھنڈے ہوگئے اور فوراً آس پاس کے اجزا میں جذب ہوکر بہت سے چھوٹے چھوٹے اجسام کی شکل میں تبدیل ہوگئے۔ اس لئے مشتری اور مریخ کے درمیان بے شمار چھوٹے چھوٹے ستارے پائے جاتے ہیں جنکو سیارات صغیرہ کہتے ہیں سیارات صغیرہ کے بعد مریخ۔ زمین زہرہ اور عطارد یکے بعد دیگرے وجود میں آئے۔ اصل سحاب کا جو حصہ مرکز پر باقی رہ گیا وہ اور زیادہ سکڑ کر آفتاب بن گیا۔

اول اول ہر سیارہ سحاب یعنی گیس کی حالت میں تھا۔ اور جسطرح اصل سحاب کی محوری گردش اور سکڑنے سے سیارگان بنے ٹھیک اسی طرح یہ سیارے ٹھنڈے ہوکر سکڑنے پر ایک یا زیادہ حلقے جدا ہوکر کچھ عرصہ کے بعد سیاروں کی مانند گول منجمد اجسام بن گئے۔ اور جس طرح سیارے اپنے مرکز (آفتاب) کے گرد گھومتے تھے اسی طرح یہ اجسام اپنے مرکز (سیاروں) کے گرد گھومنے لگے۔ ان اجسام کو اقمار کہتے ہیں۔ ایک قمر ہماری زمین کے گرد بھی طواف کرتا ہے۔

لاپلاس کے نظریہ کی بنیاد وسیع سحاب کے ٹھنڈے ہوکر سکڑنے پر تھی۔ اصل سحاب کا مرکزی حصہ اسوقت آفتاب کی شکل میں موجود ہے۔ اگر لاپلاس کا نظریہ صحیح ہے تو آفتاب کو اب بھی ٹھنڈا ہوکر سکڑتے رہنا چاہئے۔ اگر آفتاب اس طرح ٹھنڈا ہوتا جاتا ہے تو اسکی حرارت میں بتدریج کمی ہونی چاہئے لیکن کم از کم کئی ہزار سال کے تاریخی قرائن وشہادات سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ پہلے آفتاب کی حرارت اس وقت سے زیادہ تھی۔ اس چیز سے لاپلاس کے نظریہ میں زبردست شک پیدا ہوتا ہے لیکن جرمن عالم ہیم ہولز کے نظریہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کو باور کیا جاسکتا ہے کہ آفتاب کی حرارت میں کمی واقعہ نہ ہو۔ آفتاب گرمی خارج کرنے سے ٹھنڈا ہوکر سکڑتا ہے۔ سکڑنے سے اس کے اجزا دبتے ہیں اجزا دبنے سے مزید حرارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نئی پیدا شدہ حرارت کم وبیش اتنی ہوتی ہے جتنی آفتاب سے خارج ہو پاتی ہے۔ اس لئے باوجود ٹھنڈا ہونے کے آفتاب کی حرارت میں کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس نظریہ کی

غزل

اے جوشش طوفاں ہے نہ وہ شورش سیلاب
دریا ہے محبت تو نہ تھا جو ہے تنک آب
اللہ رے حسن کہ وہ لمحۂ نایاب
[illegible] بیکار ہیں بھی تری خواب
ہر سانس میں ٹوٹے ہوئے تاروں کی صدا ہے
اب ساز مرے دل کا نہیں تشنۂ مضراب
ہائے تری محبت کی کبھی پیاس ہے اب بھی
[illegible] دل سے مرا سیراب
یا آج اسی پیالہ ہے [illegible]
[illegible]
دامن پہ مرے آف [illegible]
وہ جن کی [illegible] بھی ہے [illegible]
آنکھوں میں نہ حسرت ہے نہ [illegible]
[illegible] گرداب
طوفان میں ساحل کی طرف [illegible]
ساحل [illegible] اشک ہیں اختر
یا آج تجھے [illegible] تبسم [illegible] نایاب

جاں نثار اختر

روشنی میں اس بات کا امکان تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کروڑوں سال بیشتر مادہ بہت وسیع سحاب کی شکل میں پھیلا ہوا ہو اور اسی کا مرکزی حصہ سکڑ سکڑ کر آفتاب کی شکل بن باقی ہو۔ اس طرح ہیم ہولز کے نظریہ سے لاپلاس کے قیاس کو بہت تقویت ہوئی۔

نظام شمسی کے تخلیق کا یہ سب سے پہلا حکیمانہ نظریہ تھا۔ اس نظریہ کی زمین سر ولیم ہرشل نے ہموار کی۔ بنیاد کانٹ نے ڈالی۔ عمارت لاپلاس نے تیار کی۔ اور اسی عمارت پر استرکاری دیگر علمائے سائنس و ریاضی کے ہاتھوں ہوئی۔ اس نظریہ کو نظریہ سحابیہ یا لاپلاس کا نظریہ کہتے ہیں۔

واضح ہو کہ نظریہ سحابیہ کی جو تشریح یہاں کی گئی ہے بجنسہ کانٹ اور لاپلاس کی پیش کردہ نہیں۔ بلکہ لاپلاس کی وفات کے بعد متعدد علمائے سائنس و علمائے ریاضی نے نئے نئے مشاہدات اور نئے طبعی قوانین کی روشنی میں وقتاً فوقتاً اس نظریہ میں کمی بیشی کر کے اسے مکمل کیا۔ لاپلاس کے پاس نہ بڑی دوربین تھی نہ اس نے اپنی آنکھ سے کسی گھومتے ہوئے سحاب کو دیکھا۔ چنانچہ اسکی وفات کے بعد جب لارڈ روس نے اپنی بڑی دوربین سے سحابوں کو دیکھ کر یہ اعلان کیا کہ دراصل سحاب ستاروں کے انبوہ ہیں تو لاپلاس کا نظریہ دم توڑنے لگا۔ لیکن جلد ہی سر ولیم ہگنس کے مشاہدات سے جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ جس قسم کے سحابوں کا ذکر لاپلاس نے کیا ہے آسمان پر موجود ہیں تو لاپلاس کے نظریہ کے جان میں جان آئی۔ پھر خود لارڈ روس نے بھی محوری حرکت کرتا ہوا ایک سحاب دیکھ لیا۔ علمائے ریاضی نے یہ ثابت کیا کہ ٹھنڈا ہونے سے سحاب میں محوری حرکت پیدا ہونی چاہیئے اور محوری حرکت سے سحاب کو قرص کی شکل اختیار کر لینی چاہیئے۔ سر ولیم ہگنس نے مشاہدات کر کے یہ بھی بتایا کہ ایسے متحرک سحابوں میں بہت سی چھوٹی چھوٹی گانٹھیں موجود ہیں۔ یہ گانٹھیں سیاروں کی ابتدائی منزل ہیں۔ ہیم ہولز نے یہ ثابت کیا کہ ٹھنڈا ہو کر سکڑنے کے باوجود سحاب کی حرارت میں کوئی نمایاں کمی نہیں ہو سکتی۔ اس طرح لاپلاس کے بعد علما نے مشاہدات کر کے اور نئے طبعی قوانین معلوم کر کے تخلیق سیارگان کے جملہ منازل کی مکمل تشریح کر کے لاپلاس کے قیاس کو نظریہ بنا دیا۔

لاپلاس کے خیال کے مطابق اول اول سحاب گرم دہکتے ہوئے مادہ کا بنا ہوا تھا۔ وہ پھیلا ہوا گرم سحابی مادہ ٹھنڈا ہو کر سکڑا۔ سکڑنے سے تمام اجرام وجود میں آئے۔ اگر اجرام کے وجود میں آنے کے لئے اسی منتشر مادہ کا سکڑنا بقول لاپلاس ضروری ہے تو یہ لازمی نہیں کہ گرم تپے ہی ٹھنڈی ہو کر سکڑے بلکہ ٹھنڈے بکھرے ہوئے اجزا بھی تجاذب مادی کے ماتحت سکڑ سکتے ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اول اول سحاب ٹھنڈے اور تاریک منتشر اجزا سے بنا ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر آفتاب میں گرمی اور روشنی کیونکر پیدا ہوئی؟ اس کا جواب علمائے سائنس دے چکے ہیں کہ تجاذب مادی کے باعث اجزا مرکز کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس سے آپس میں تصادم پیدا ہوتا ہے۔ تصادم سے گرمی پیدا ہوتی ہے حرارت کی زیادتی سے مادی اجزا اول رقیق اور بعد میں گیس کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح ٹھنڈے تاریک اور پھیلے ہوئے سحاب سے بھی آفتاب بن سکتا ہے۔ چنانچہ اگر لاپلاس کے سحاب کو گرم اور روشن ماننے کے بجائے ٹھنڈا اور تاریک تسلیم کر لیا جائے تب بھی لاپلاس کے قیاس کے بموجب مکمل نظام شمسی وجود میں آ سکتا ہے۔ آجکل نظریہ سحابیہ کے ماننے والے علما میں سے زیادہ تر اصل سحاب کو ٹھنڈا اور تاریک ہی تسلیم کرتے ہیں۔

(۲) نظریہ شہابیہ

نظریہ سحابیہ پر پروفیسر مولٹن نے چند ایسے معقول اعتراضات کئے کہ علما ہیئت کو شکوک پیدا ہو گئے۔ لاپلاس کے ایک صدی بعد انگلستان کے ایک عالم سر نارمن لاکیئر نے نظام شمسی کی تخلیق کا دوسرا نظریہ پیش کیا۔ سر نارمن کے قیاس کے بموجب اول اول مادہ گیس کی حالت میں نہ تھا بلکہ نہایت لطیف ٹھوس اجزا پر مشتمل تھا۔ اور تمام فضائے بسیط کو گھیرے ہوئے تھا۔ قوت جاذبہ کے ماتحت لطیف اجزا اول اول ذرات میں تبدیل ہوئے۔ بعدہٗ یہ ذرات مجتمع ہو کر شہاب بن گئے۔ ایسے شہابی انبوہ سے نظام شمسی کی تخلیق ہوئی۔ اس انبوہ کے شہاب قوت جاذبہ سے اور زیادہ سمٹے۔ کچھ سحاب ایک مرکز پر مجتمع ہوئے۔ ان کا یکایک ساکت ہو جانے سے ان کی قوت حرکت حرارت میں تبدیل ہو گئی۔ اور سکڑنے سے زیادہ گرم ہو کر شہابوں نے آخرکار دہکتے ہوئے گیس کی شکل اختیار کر لی۔ یہ ہمارا آفتاب بن گیا۔ مرکز آفتاب کے آس پاس اور شہاب مختلف فاصلوں پر مجتمع ہو کر چند چھوٹے چھوٹے دوسرے اجسام بن گئے۔ یہ اجرام آفتاب کے گرد گھومنے لگے اور سیارے بن گئے۔ اس نظریہ کی حمایت سر جارج ڈارون نے کی اور یہ ثابت کیا کہ اگر تمام حدود نظام شمسی میں چھوٹے شہابوں کا انبوہ پھیلا ہوا ہو تو وہ کسی دوسرے ستارے سے دیکھنے پر بالکل گیس کے سحاب کی مانند نظر آئے گا۔ سر نارمن یا سر جارج نے اس نظریہ کی مکمل تشریح نہیں کی۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ معرض وجود میں آ جانے کے بعد کیوں تمام سیارگان قریب قریب ایک ہی سطح پر آفتاب کے گرد گھومنے لگے۔

اس نظریہ کے مطابق نظام شمسی کی ابتدا شہابیوں سے ہوئی اس لئے اس نظریہ کو نظریہ شہابیہ کہتے ہیں۔

(۳) نظریہ سیاریہ

چیمبرلن نے لاپلاس کے سحاب کو ٹھوس یا رقیق اجزا سے بنا ہوا اپنے مرکز پر تیزی سے گھومتا ہوا تسلیم کیا۔ گھومتے ہوئے سحاب سے قوت دافعہ عن المرکز کے باعث سحابی مادہ پر پیچدار طرف بازوؤں کی شکل میں باہر کو نکلا۔ ایسے گھومتے ہوئے بہت سے سحاب خود چیمبرلن نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ خاص خاص کے فوٹو بھی لئے۔ اس قسم کے بہت سے سحاب اس وقت بھی بذریعہ دوربین دیکھے جا سکتے ہیں۔ چیمبرلن کے قیاس کے بموجب

جب کوئی دوسرا ستارہ اس سحاب کے قریب آیا تو اس کی قوت جاذبہ کے باعث اس سحاب کے باہر نکلے ہوئے بازو اور زیادہ باہر کو بڑھے۔ اور جس سمت وہ ستارہ حرکت کر رہا تھا اس سحاب کے بازو اسی سمت گھوم گئے۔ ہر بازو کے مادہ سے الگ الگ گانٹھ بن گئی اور اس میں محوری حرکت پیدا ہو گئی۔ یہ چھوٹے چھوٹے بے شمار سیارے بن گئے جو بڑے مرکزی مادے کے گرد گھومتے تھے۔ قوت جاذبہ کے ماتحت بڑے بڑے سیاروں نے چھوٹے سیاروں کو جذب کرنا شروع کیا یہاں تک کہ ہزاروں سیاروں کی جگہ چند بڑے بڑے باقی رہ گئے۔ وسطی جسم سب سے بڑا تھا۔ اس کی قوت جاذبہ سب سے زیادہ تھی اسلئے اس پر زیادہ تعداد میں اور زیادہ تیزی کے ساتھ سیارے گرنے لگے۔ اس کی سطح پر گر کر یکایک ساکت ہو جانے سے سیاروں کی قوت حرکت حرارت میں تبدیل ہوتی گئی۔ اس جسم نے حرارت زیادہ ہونے پر اول اول رقیق اور بعد میں گیس کی حالت اختیار کر لی۔ اس طرح ہمارا آفتاب وجود میں آگیا۔ زمین کے اندرونی طبقات کی گرمی بھی انہیں ٹکڑوں کے گرنے سے پیدا ہوئی اس نظریہ کو نظریہ سیاریہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس کے مطابق نظام شمسی کے افراد کی ابتدا سیاروں سے ہوئی۔

(۴) نظریہ مدّ و جذر نظام شمسی کی تخلیق کا چوتھا نظریہ پروفیسر جینز کا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق نظام شمسی کی تخلیق مندرجہ ذیل طریق پر ہوئی۔ اگرچہ ستارے ایک دوسرے سے بے اندازہ فاصلوں پر واقعہ ہیں لیکن کبھی کبھی گھومتے پھرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آنکلتے ہیں۔ زمانہ دراز گذرا جب کہ آفتاب کے اجزا ایک دوسرے کے ساتھ بہت سختی سے داخل نہ ہوئے تھے اور اسلئے وسعت میں بہت پھیلا ہوا تھا ایک بہت بڑا ستارا آفتاب کے قریب ہو کر گذرا۔ یہ ستارہ جسامت میں آفتاب سے بہت بڑا تھا اور اسی لحاظ سے اس کی قوت جاذبہ بھی بہ نسبت آفتاب کے بہت زیادہ تھی چنانچہ اس کی عظیم کشش سے سطح آفتاب پر اتنے زبردست مد و جزر پیدا ہوئے کہ آفتابی مادہ لمبے سگار کی شکل میں اس ستارے کی طرف کھنچا۔ یہ مادہ آفتاب اور ستارے کے قریب اسقدر موٹا نہ تھا جسقدر درمیانی حصہ میں تھا جس سمت ستارہ سفر کر رہا تھا اس سمت آفتاب بھی محوری حرکت کرتا تھا اسلئے اس خارج شدہ مادہ کی پٹی بھی اسی سمت حرکت کرنے لگی۔

یہ ستارہ اسی پٹی کو حرکت دیکر اپنے سفر پر آگے بڑھ گیا۔ اس مادہ نے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مجتمع ہو کر آس پاس کے منتشر اجزا کو جذب کرنا شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد چند دہکتے ہوئے گیس کے گولے الگ الگ تشکیل پا کر آفتاب کے گرد گھومنے لگے۔ آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہونے سے ان میں محوری حرکت بھی پیدا ہو گئی۔ ٹھنڈے ہوتے ہوتے آخر کار یہ ٹھوس اجرام رہ گئے۔ اور انہیں میں سے ایک ہماری زمین ہے۔

یہ نظام شمسی کی تخلیق کے ان چار نظریات کا اجمالی خاکہ ہے جو بڑے بڑے مفکرین۔ فلاسفر فلکیئن۔ اور علماء کی ڈیڑھ دو صدی کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ لیکن بقول مولانا آزاد کے یہ نظریات ہی ہیں اور نظریات حقیقت کا فیصلہ نہیں کر سکتے اصل تو یہ ہے کہ موجودہ سائنس اور فلسفہ کی جو روشنی اس مسئلہ کی گہرائیوں میں ہماری رہبری کرتی ہے وہ ہی ابھی تک اسقدر مدھم ہے کہ دور افتادہ چیزوں کو بخوبی نہیں دکھا سکتی۔ اور اسی وجہ سے ہم بھی کسی ایک نظریہ پر اکتفا نہیں کر سکتے۔ فلاسفر اور علماء اپنے مبلغ علمی کے مطابق ضرور یا اس نظریہ کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں لیکن ترجیح دینے سے ہمارا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا جس رفتار سے ہماری سماوی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے اس کے پیش نظر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابھی سینکڑوں یا شاید ہزاروں سال تک حقیقت کی تلاش میں بھٹکتے پھرنے کے بعد بھی ہم اصلیت تک نہ پہونچ سکیں یہ سوا اسکے کہ اصل حقیقت سوائے خالق کے کوئی نہیں جان سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ ایسے نتائج پر پہنچ جائیں جو حقیقت کے قریب قریب ہوں۔ واللہ اعلم

غزل — عزم اکبرآبادی

بڑھا چل دل تیز گام محبت !!! — کہیں تو ملے گا مقام محبت !!!
ابھی تک نہیں بدگماں ان کی نظریں — زباں پر نہ آجائے نام محبت !!!
بلائیں قیامت لے لیں میرے دل کی — دیا شوق نے جب پیام محبت !!!
دل مبتلا کروٹیں لے رہا ہے ؟ — نہ ہو جائے برہم نظام محبت !!!
ہوئیں چار آنکھیں تو نظریں جھکا لیں — لیا کس ادا سے سلام محبت !!!
ہے صبح محبت قیامت کا عنواں ؟ — قیامت سے بڑھ کر ہے شام محبت !!!

ہے دیکھ کر عزم کہتی ہے دنیا
جنوں کا پیمبر امام محبت !!!

غزل — آرزو اکبرآبادی

خوننابہ اپنی جان حزیں کر سکے تو کر ؟ — تکمیل عشق سہل نہیں کر سکے تو کر ؟
اس دردکافری میں بھی از راہ مصلحت — سجدہ کوئی حرم کے قریں کر سکے تو کر ؟
قانع ہوا ہے رفعت کون و مکاں پہ کیوں — اس سے بھی گر بلند جبیں کر سکے تو کر ؟
مہمل سا اک اصول ہی یہ رسم بے خودی — سجدہ بقید ہوش کہیں کر سکے تو کر ؟
یوں تا بکے خیال تجلی میں کاہشیں — اپنی نظر پہ حسن یقیں کر سکے تو کر ؟
ہو دیر یا حرم ہو نہیں اس سے واسطہ ؟ — تکمیل کار عشق کہیں کر سکے تو کر ؟

اے آرزو مذاق تغزل ترا اخیر !
کچھ اور اس سے سخت زمیں کر سکے تو کر ؟

جب دہلی میں غدر پڑا
اور
دہلی کے باکمال پیسہ پیسہ کو محتاج ہوگئے تو وہ راز جو صدیوں سے سینہ بسینہ چلے آتے تھے بھوک سے لاچار انھوں نے بتلانے شروع کردئے۔ غدر کی مصیبتیں اور فاقوں سے تنگ آئے ہوئے اہل کمال اپنا ہنر اور راز کوڑیوں میں فروخت کرتے پھرتے تھے مغل بادشاہوں کے دسترخوان کے کھانے بھی راز تھے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے رؤسا اور جاگیردار اس فکر میں رہتے تھے کہ کسیطرح شاہی باورچی سے ان کھانوں کی ترکیبیں دریافت کرلیں مگر وہ ناکام رہتے۔
رضیہ کا شاہی دسترخوان
بھی اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے جو شاہی باورچی سے حاصل کی گئی تھی۔ اس کتاب کو جدید انگریزی و دیسی کھانوں کو ملاکر شائع کردیا گیا ہے اس میں ہر قسم کے ناشتے آئس کریم، فالودہ، کیک، پیسٹری، شاہی ٹکڑے، مختلف قسم کی لذیذ روٹیاں، مزیدار پوریاں، پکوان، حلوے، بیسوں قسم کی دالیں، کھچڑی، انڈے، خاگینہ، قورمہ، کباب، مرغ، شکار، یخنی، دہلی کی مشہور نہاری، سبزیاں، نرگسی کوفتے، مچھلی کے سالن، اور کباب، قیمہ پلاؤ، مختلف اقسام انگریزی و دیسی مٹھائیاں، نشاستہ، حلوا سوہن، پھینیاں، سب قسم کے مربے اور چٹنیاں، بیسوں قسم کی چائے، کافی، شربت، ہر قسم کے انگریزی کھانے گوشت کی مٹھائیاں کیلئے کا سالن، شاہی مچھلی غرضکہ کھانا پکانے کی ایک بہترین کتاب ہے۔ ڈھائی سو صفحات قیمت مجلد ڈھائی روپے
رضیہ کی مشرقی کشیدہ کاری
کشیدہ کاڑھنے کی بہترین کتاب
قیمت مجلد پونے تین روپے
رضیہ کے خطوط
زنانہ خطوط بہ طرز جدید لکھائی چھپائی نہایت عمدہ
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے
کتاب گھر
اردو بازار
دہلی

کینیڈا اور ہندوستان مابین تجارت

مسٹر ایم۔آر۔آہوجہ نے جو حکومت ہند کی طرف سے کینیڈا میں ٹریڈ کمشنر ہیں اور آجکل ہندوستان آئے ہوئے ہیں۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو نئی دہلی کی پریس کانفرنس میں کہا " ہندوستان اور کینیڈا دراصل زراعتی ملک ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں اپنی صنعتی ترقی کے لئے بڑی کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کے صنعتی ذرائع اور ان کا اقتصادی ڈھچرا ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے اور آپس میں مقابلہ بازی کا کوئی امکان نہیں ہے "

ہندوستان سے کینیڈا کو مال بھیجنے کے سلسلہ میں آپنے کہا کہ ہندوستان کو کینیڈا کی اندرونی پیداوار سے ڈرنے کا کوئی موقع نہیں ہے خاص طور پر اس حد تک جہاں تک اشیائے برآمد کی موجودہ دھچ کا تعلق ہے۔ ہندوستان سے جو مال کینیڈا جاتا ہے اس میں زیادہ تر کچا زراعتی سامان ہوتا ہے یا فلزاتی، اور ظاہر ہے کہ ان چیزوں کے سلسلہ میں کینیڈا کی اندرونی پیداوار سے مقابلہ کا کوئی سوال ہے ہی نہیں۔ زمانۂ بعد از جنگ میں اصل خطرہ تو کینیڈا کے علاوہ ان دوسرے ملکوں سے ہے جہاں دوران جنگ میں مال کی درآمد و برآمد کا سلسلہ عارضی طور پر منقطع ہو گیا تھا۔

خوراک کا سامان

ہندوستان اور کینیڈا کی باہمی تجارت میں عدم مقابلہ بازی کی تشریح کرتے ہوئے مسٹر آہوجہ نے کہا کہ کینیڈا گیہوں، سُور کا گوشت، انڈے، پنیر اور خشک دودھ کی برآمد بکثرت کرتا ہے۔ ہندوستان میں گیہوں کی پیداوار سے اسکی اپنی ضروریات بمشکل پوری ہوتی ہیں اور کھانے کی دوسری چیزوں کی تو بہت ہی کمی ہے۔ ہندوستانی اناج مثلاً مٹر اور دالیں جو پہلے کینیڈا جاتی تھیں وہاں پیدا نہیں ہوتیں۔ سوائے گھٹیا قسم کی ہلدی کے کینیڈا میں مسالہ کسی قسم کا پیدا نہیں ہوتا۔ ادرک، سیاہ مرچ، ہلدی، دھنیا، رائی، اجوائن اور کلونجی زیادہ سے زیادہ مقدار میں ہندوستان سے کینیڈا بھیجی جایا کرتی ہیں۔

دوسری اشیا

ہندوستان میں کئی قسم کے روغنیات اور تیل کے بیج بکثرت پیدا ہوتے اور باہر بھیجے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کینیڈا میں نہیں ہوتے۔ خاص خاص تیل جو ہندوستان سے کینیڈا جاتے ہیں اَنڈی کے اور "پی نٹ" (پھلی) کے ہیں۔ کینیڈا میں کسی قسم کی بھی گری اتنی مقدار میں پیدا نہیں ہوتی کہ وہ اسکی تجارت کر سکے۔ ہندوستان سے جو گریاں کینیڈا جاتی ہیں وہ یہ ہیں:- کاجو، اخروٹ اور بادام۔

چائے اور قہوہ کی کینیڈا میں پیداوار نہیں ہوتی۔ سن اور اس سے تیار ہونیوالی چیزیں ہندوستان سے کینیڈا جانے والی اشیا میں اہمیت کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہیں۔ ہندوستان سے کپاس کی بھی کینیڈا میں درآمد ہوتی ہے۔ کچا اون بھی جو قالین بننے کے کام آتا ہے۔ کینیڈا ہندوستان ہی سے جاتا ہے۔

کینیڈا میں ایسی چیزیں بھی بکثرت پیدا ہوتی ہیں جو کاغذ بنانے کے کام آتی ہیں اور یہ چیزیں باقاعدہ ہندوستان آتی ہیں۔ کینیڈا کو لاکھ ہندوستان سے جاتا ہے کیونکہ یہ وہاں پیدا نہیں ہوتا۔

فلزات

بقول مسٹر آہوجہ دونوں ملکوں کی معدنیات کا بھی یہی حال ہے۔ کینیڈا میں نکل، جست، تانبا اور سیسہ کثرت سے ملتا ہے۔ یہ چیزیں ہندوستان میں یا تو سرے سے ملتی ہی نہیں اور ملتی ہیں تو بہت کم۔

ہندوستان سے کھالیں، کمایا ہوا چمڑہ اور کچی فر بڑی پابندی کے ساتھ کینیڈا جاتی ہے۔ بکری اور بھیڑ کی کھالیں کینیڈا میں اتنی نہیں ہوتیں کہ ان کی تجارت ہو سکے۔ فر خود کینیڈا میں کافی ہوتی ہے لیکن ہندوستانی فر کی بھی کینیڈا میں بڑی مانگ ہے۔

مسٹر آہوجہ نے یہ بھی کہا کہ سن کی چیزوں کے علاوہ اُونی قالین اور غالیچے، چٹائیاں، کھیل کا سامان، پیتل کے برتن، لکڑی کا سامان، کڑھے ہوئے کپڑے اور چین بیل وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو علاوہ کچے مال کے ابتک کینیڈا بھیجی جاتی رہی ہیں۔ اسکے برخلاف کینیڈا سے تیار مال اور کیمیا وی غذاؤں کی یہاں درآمد ہوتی رہی ہے۔ جس میں موٹریں اور ان کے کل پرزے خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور کل سامان درآمد کی نصف یہی چیزیں ہوتی تھیں۔ اس طرح تیار مال میں بھی کینیڈا کے اور ہندوستان کے سامان درآمد و برآمد میں مقابلہ بازی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

بعد جنگ تجارتی امکانات

ہندوستان سے کینیڈا جانے والی اشیا کا فرداً فرداً جائزہ لیتے ہوئے مسٹر آہوجہ نے کہا " کینیڈا میں چائے کی کھپت بہت ہے جتنی چائے وہاں پی جاتی ہے اس کی ۵۰ فیصدی ہندوستان سے جاتی ہے اور تیس فیصدی سے کچھ زیادہ لنکا سے۔ یہ تو ہوئی کالی چائے۔ جنگ سے پہلے تیس لاکھ پونڈ سبز چائے کینیڈا دوسرے ملکوں سے لیتا رہا ہے یہ تجارت چونکہ اب بالکل بند ہو چکی ہے اسلئے ہندوستان کم از کم بیس لاکھ پونڈ کالی چائے سالانہ وہاں بھیج سکتا ہے۔ پچھلے بارہ سال کے اندر قہوہ کا رواج کینیڈا میں بہت بڑھ گیا ہے اور وہاں ہندوستانی قہوہ کی کھپت کا امکان نکل آیا ہے۔

سرلا رانی بھردواج

سن اور کپاس

" سن اور سن سے بنے ہوئے سامان کو کینیڈا بھیجنے کا تو گویا ٹھیکہ ہی ہندوستان کے پاس ہے۔ کریچ کے بوروں کی جگہ سوت اور کاغذ کے تھیلے بڑی کثرت سے استعمال میں آ رہے ہیں۔ لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ زمانۂ بعد از جنگ میں جب پچھلے ایسے خوشگوار حالات پھر لوٹ آئیں گے تو کریچ کے بورے پھر اپنی جگہ حاصل کر لیں گے۔

جب تک ہندوستانی نواڑ کی قیمت میں مقابلہ کی سکت ہے ہندوستان کو بیلجیم یا کسی اور ایسے ملک سے جہاں نواڑ بنی جاتی ہے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

کینیڈا میں سن کے قالینوں کی بڑی مانگ ہے۔ اگر ہندوستان میں صحیح قسم کے کرگے اس قسم کے قالین بننے کے لئے استعمال ہونے لگے۔ تو اس کی تجارت کے بڑھنے کا پورا پورا امکان ہے۔

گریاں اور تیل

"کینیڈا میں گریوں، خاص طور پر کاجو، اخروٹ، بادام اور "پی نٹ" (پھلی) کی کھپت کے امکانات بہت ہیں۔ ہندوستانی گری کینیڈا میں بہت مقبول ہو چکی ہے اسلئے کوشش اس بات کی ہونی چاہئے کہ گریوں کی برآمد کی مقدار موجودہ سطح پر قائم نہ رہے۔ بلکہ بڑھتی رہے۔ ہندوستانی گریاں دوسرے ملکوں کی گریوں کے مقابلہ میں سستی بھی ہیں اور بہتر بھی

"نباتی تیلوں میں جو ہندوستان سے کینیڈا جاتے ہیں ارنڈی کا تیل اور "پی نٹ" کا تیل خاص ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ناریل اور کھوپرے کے تیل کی تجارت بھی اسی طرح پھل پھول سکتی ہے۔

کھالیں اور اون

"ہندوستان کی بکری اور بھیڑ کی کھالوں کا کینیڈا میں کوئی اور ملک مد مقابل ہے ہی نہیں اسلئے وہاں ان کی کھپت رہیگی۔

"ہندوستان سے جو اون کینیڈا جاتا ہے اس میں سے زیادہ تر قالین، غالیچے اور دوسری گھر دری چیزیں بنی جاتی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے ساتھ اس سلسلہ میں تو زیادہ مقابلہ بازی نہیں ہے، لیکن قالینوں کیواسطے جو مصنوعی ڈورا (اون کی جگہ) استعمال کیا جانے والا ہے اسکے سلسلہ میں واقعی مقابلہ بازی شاید بہت سخت ہو جائیگی"

دالیں اور مسالہ

ہندوستان کی دالوں، دانوں اور مسالہ وغیرہ کے لئے کینیڈا میں بازار کھلے پڑے ہیں۔ اگرچہ اب بھی یہ چیزیں وہاں بھیجی جاتی ہیں لیکن اب بھی اس تجارت میں پھیلاؤ ہو سکتا ہے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان چیزوں کی کوالٹی، پیکنگ اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔

کینیڈا کو لاکھ ہندوستان ہی سے پہونچتا ہے معلوم نہیں اس تجارت کی آئندہ کیا صورت ہو۔

میکا، منگنیز اور چمڑا

میکا اگرچہ کینیڈا میں بھی بہم پہونچنے لگا ہے لیکن امید ہے کہ ہندوستان سے جانے والے میکا کی تجارت میں کوئی زوال نہیں آسکتا۔

ہندوستانی منگنیز آکسائڈ اور کچا کروم کینیڈا میں اچھے ثابت ہو چکے ہیں۔ اسلئے زمانۂ بعد از جنگ میں اس تجارت کو مزید فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔

ہر قسم کے ہندوستانی فرش کینیڈا میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ جنگ کے زمانہ کی پابندیوں کی وجہ سے انکی درآمد میں بہت کمی آگئی تھی حالانکہ مانگ برابر بڑھتی رہی جہاں کیا جاتا ہے کہ اب اس تجارت کو بڑی ترقی ہو جائے گی۔

کچی کپاس اور سوتی مال

ہندوستانی کپاس کی کینیڈا میں ذرا کم درآمد ہوتی ہے اگرچہ ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں پچھلے سالوں کے مقابلہ میں آگئی تھی لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ اسکی مقدار کچھ اور زیادہ بڑھ سکیگی۔

جنگ سے پہلے ہندوستانی سوتی کپڑوں کی بعض قسمیں کینیڈا میں بہت پسند کی گئی تھیں۔ آئندہ سالوں میں ان کپڑوں کی باقاعدہ تجارت بڑے پیمانہ پر ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی بڑی آسانی سے جاپانی تجارت کی جگہ لے سکتی ہے۔

زمانۂ بعد از جنگ میں ہندوستانی کپڑے کی تجارت کینیڈا کے ساتھ بڑے پیمانہ پر ہو سکتی ہے قمیصوں کے کپڑوں، چادروں، تولیوں اور رومالوں وغیرہ کے علاوہ ایسی چیزیں بھی جیسے میز پوش، گدیاں، تکیہ غلاف اور بچھونوں کی فرائیں وغیرہ کینیڈا بڑی آسانی سے بھیجی جا سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ بیل، فیتوں، کڑھائی کے سامان اور جرابوں بنیانوں وغیرہ کی تجارت بھی کی جا سکتی ہے۔

فٹ بال، ٹینس اور بیڈمنٹن کے بلے بھی کینیڈا میں ہاتھوں ہاتھ بک سکتے ہیں۔

دستکاری اور فنکاری کا سامان

لڑائی سے پہلے دیسی دستکاریوں کی چیزیں باقاعدہ ہندوستان سے کینیڈا جایا کرتی تھیں۔ صورت حالات کے درست ہوتے ہی جو چیزیں پہلے سے کینیڈا میں معروف ہیں پھر بکثرت وہاں پہنچنے لگیں گی۔ مال کے بہتر انتخاب اور رنگوں کے بہتر امتزاج سے اور ڈزائن اور پیکنگ کی بہتر صورت سے اس تجارت کو اور بھی زیادہ ترقی ہو سکتی ہے۔ سینگ اور ہڈی کی بنی ہوئی چیزیں مٹی کے برتن، مصنوعی زیورات، چاندی کے برتن، سنہری اور روپہلی گوٹ کے جوتے اور چپل، پتھر اور سنگ مرمر کی چیزیں، ہاتھی دانت اور صندل کی اشیا ایسی ہیں جن کا شوق کینیڈا والوں کو ہو رہا ہے۔

(مسٹر آہوجہ کی رپورٹ سے ماخوذ)

دو گیت

آج کا دن بھی بیت گیا
پھولوں کا اک ہار بنایا
آشاؤں کا دیا جلایا
بے دردی لیکن نہیں آیا
آج بھی بالم جیت گیا
آج کا دن بھی بیت گیا
پہلی کرن نے آس بندھائی
اندھیارے میں جوت جگائی
شام ہوئی آشا مرجھائی
جانے کہاں من میت گیا
آج کا دن بھی بیت گیا

آلی۔ کیسا بار سنگار
کس کو دکھانا کس کو لبھانا
اب کاہے پیتم کو بھانا
بیت گیا خوشیوں کا زمانہ
جینے سے بیزار۔ آلی
کیسا بار سنگار۔
چھایا چاروں اور اندھیرا
اب کت جاؤں کون ہے میرا
اندھکار نے ایسا گھیرا
ہار گئی میں ہار۔ آلی
کیسا بار سنگار۔

ہرگوبند

آتش

افراد فیچر

(۱) معلن (۲) آتش کی بیوی
(۳) مرزا تقی (۴) ایک بانکا
(۵) غازی الدین حیدر

مجمع: **معلن** - آتش کا تعلق دہلی کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ ان کے والد خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلی چھوڑ کر فیض آباد آئے اور محلہ مغل پورہ میں رہنے لگے۔ یہیں ۱۷۶۴ء میں خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے۔ ابھی تعلیم نامکمل ہی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ نوجی لڑکوں کی صحبت میں آوارہ گردی اختیار کرلی اور بہت جلد طبیعت کی شورہ پشتی نے اس زمانے کے بانکوں میں شامل بلکہ بانکوں میں بھی سر برآوردہ کر دیا۔ رواج کے مطابق تیغ زنی میں مہارت پیدا کی۔ اور موقع بے موقع ایسی شہ زوری دکھائی کہ اطراف واکناف میں ان کی جوانمردی کے ڈنکے پٹ گئے۔

انہی دنوں لکھنؤ میں مصحفی اور انشا کی نوک جھونک ہو رہی تھی آتش فطرت سے شاعرانہ دل ودماغ لے کر آئے تھے اس لئے شاعری کے چرچوں نے انہیں بہت متاثر کیا۔ شعر کہنے لگے اور مصحفی کے شاگرد ہوگئے۔ یار لوگوں نے مشورہ دیا کہ مطالعہ کے بغیر شعر کہنا بے سود ہے۔ اس پر کتب بینی کا شوق ہوا مگر اتنا ہی پڑھا جتنا کہ انہیں ضرورت تھی۔ البتہ مشق سخن دل لگا کر کیا کرتے تھے اور اس سبب سے بہت جلد صاحب طرز ہوگئے۔ اس پر ناسخ کا مقابلہ۔ سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ کیونکہ اپنے حریف کو نیچا دکھانے کی فکر میں انھیں حد سے سوا محنت کرنی پڑی۔

جوں جوں عمر بڑھتی گئی فقر اور قلندری کی طرف طبیعت زیادہ رجوع ہوتی گئی۔ طبیعت گو کہ ابتدا ہی سے لا اُبالی تھی اور جو کچھ ملتا بلا سوچے سمجھے اٹھا دیتے کبھی فکر فردا نہیں کی۔ اسی وجہ سے دو دن کھاتے تو دو دن فاقہ کرتے۔ نوابوں اور امرا کی صحبت سے پرہیز کرتے تھے اور کسی کا سلوک گوارا نہ کرتے تھے۔ بڑے خوددار اور بہت قانع تھے حسن اتفاق سے بیوی بڑی سگھڑ ملی تھی اور وہی نیکبخت ان کے لئے دو وقت کی روٹی کا جوں توں کر کے انتظام کر دیتی تھی۔ آتش کا کلام تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔ سادگی اور روانی غضب کی ہے۔ محاورات ایسے برمحل استعمال کئے ہیں کہ شاعری مرصع کاری معلوم ہوتی ہے اور لطف یہ کہ ٹھونس ٹھانس اور آورد نہیں معلوم ہوتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آتش کے ہاں فکر اور خیال کی بلندی نہیں ملتی لیکن جذبات کی ترجمانی جس موثر انداز میں انھوں نے کی ہے اردو کے کم شاعروں کو یہ انداز نصیب ہوئے ہیں۔

مصحفی اور انشا کی مانند آتش و ناسخ میں بھی رقابت تھی اور عام طور پر خوب نوک جھونک ہوتی تھی لیکن انشا اور مصحفی کی طرح کبھی ابتذال کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ آتش اگر فقیر اور قلندر تھے تو ناسخ متین اور سنجیدہ طبیعت کے مالک۔ آتش کو عوام میں مقبولیت ہوئی تو ناسخ کے علم وفضل کا سکہ پڑھے لکھے لوگوں کے دلوں پر جم گیا۔ ایک پر فن تھے تو دوسرے سادہ لوح۔ مقابلہ برابری کا تھا۔ اور دونوں حریف اپنے اپنے رنگ کے بلاشبہ استاد مانے جاتے تھے۔

نواز گنج کے قریب جو پیٹھوں کے آگے مادھو لال کی چڑھائی مشہور رہے وہاں سے اتار پر ایک چھوٹا سا باغیچہ اور ایک کچا مکان تھا وہ آتش نے خرید لیا اور وہیں رہنے لگے۔ ایک دن زنان خانے میں منہ لٹکائے ہوئے گئے تو بیوی نے پوچھا۔

بیوی:- کیوں خیر تو ہے نصیب دشمناں آج بہت ہی اداس معلوم ہوتے ہیں آپ؟

آتش:- اداس کیا، بحالی کیا —— بہرحال زندگی ہے گذر ہی جاتی ہے۔

بیوی:- للہ بتائیے تو سہی بات کیا ہوئی آخر؟

آتش:- تمہارے بس کی بات نہیں سن کر کڑھو گی۔ البتہ کچھ روٹی ٹکڑا ہو تو فقیر کی جھولی میں ڈال دو کہ اب کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ سے باہر جانے کا ارادہ ہے۔

بیوی:- میں بھلا کب کہتی ہوں کہ کوئی بات میرے بھی بس کی ہو سکتی ہے۔ آپ ہی کے بس کی ہوگی۔ مگر ممکن ہے کہ میں سمجھا دوں۔

آتش:- بھئی بات یہ ہے کہ بادشاہ سلامت کے ہاں آج شام مشاعرہ ہے۔ نواب معتمد الدولہ ناسخ کے طرفداروں میں ہیں اور انھوں نے مجھے آج نیچا دکھانے کا سامان کیا ہے۔

بیوی:- یعنی؟

آتش:- یعنی یہ کہ ناسخ کو تو کئی دن پہلے سے مشاعرے کی تیاری کا موقع دیا مصرع طرح بھی انہیں سے حاصل کیا اور میرے ہاں آج صبح دعوت نامہ آتا ہے۔

بیوی:- بے شک نواب معتمد الدولہ کو ایسا نہ کرنا چاہئے تھا لیکن آپ لیپت ہمت کیوں ہو رہے ہیں اللہ مالک ہے۔ اسی نے عزت دی ہے اور وہی بے عزت بھی کرنے والا ہے۔ کسی اور کے کئے دھرے سے کیا ہوتا ہے۔ ابھی وقت ہے فکر کیجئے۔ غزل ہو ہی جائیگی۔

آتش:- ہونے کو تو غزل ہوگی اور ہزار بار ہوگی مگر روا روی میں کہنا اور بات ہے اور خوب غور وفکر کر کے کہنا اور بات ہے ناسخ نے اپنی طبیعت پر انتہائی زور دے کر غزل کہی ہوگی۔ اللہ نے ابتک عزت بچالی مگر اب خیر نظر نہیں آتی۔ اگر میں نے کبھی انہیں نیچا نہ دکھایا ہو تو انکو بھی اس کا موقع نہیں ملا چوٹیں برابر کی ہوا کیں۔

بیوی:- ایک بات کہوں۔ سنئے گا۔ آپ ہی نے تو بارہا کہا تھا کہ ناسخ باوجود علم و فضل میں بڑھے ہوئے ہونے اور بال کی کھال کھینچنے کی فکر میں لگے رہنے

بادشاہ حسین

کے آپ کی سی ہر دلعزیزی حاصل نہ کرسکے یشعر تو سوجھتا ہے علم و فضل سے گھرا نہیں جاتا۔

آتش:۔ سب کچھ صحیح ہے۔ پھر بھی اندیشہ برا ہے۔

بیوی:۔ للہ آپ اس اندیشہ کو دل سے نکال دیجئے حواس جمع کیجئے اور سکون دل سے فکر سخن کیجئے چٹکی بجانے میں بہترین غزل نہ کہہ لیں تو میرا ذمہ۔

آتش:۔ نہیں تم سمجھتی نہیں۔ یہ بڑا بھاری جوا ہے۔ عمر بھر کی شہرت ایکطرف اور کلنک کا ٹیکہ دوسری طرف معتمدالدولہ کی اس حرکت سے اتنی تکلیف پہنچی ہے کہ حواس منتشر ہیں اور لیبے ہیں سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ لکھنؤ سے کچھ دنوں کے لئے منہ چھپا لیا جائے۔ تم فکر نہ کرو انشاءاللہ جلد ہی کوئی مناسب بندوبست کردوں گا۔ خدا حافظ۔

بیوی:۔ سنئے تو سہی ——

معلن:۔ بیوی بیچاری مناتی ہی رہی مگر آتش کسی کے روکے کب رک سکتے تھے۔ گھر سے نکلے تو لکھنؤ چھوڑنے کا ارادہ پکا تھا لیکن یہ طے نہ کیا کہ کدھر جائیں اور کس کے پاس جائیں۔ بلا ارادہ ایک طرف کو چل دیئے کچھ تو غصہ سے لال پیلے ہو رہے تھے کہ معتمدالدولہ نے ان کے ساتھ برا سلوک کیا اور ان کی رسوائی کا سامان مہیا کیا اور کچھ اپنی لاچاری پر افسوس تھا کہ کاش وہ اس قابل ہوتے کہ مخالفین کو مزا چکھاتے سنہری برج کے قریب پہونچے تھے کہ ایک طرف سے ایک وارفتہ مزاج بانکا اپنی دھن میں منہ اٹھائے بھاگا بھاگا آ رہا تھا۔ نہ اسے ان کی خبر ہوئی نہ انہیں اس کی پلک جھپکتے میں دونوں ایک دوسرے سے چقماق کے پتھروں کی طرح ٹکرا گئے اور ساتھ ہی دونوں بھڑک اٹھے۔

آتش:۔ لاحول ولا۔ آدمی ہے یا پیل مست؟

بانکا:۔ ذرا زبان سنبھال کے۔ خود ہی تو راستہ میں حائل ہو گیا اور خود ہی کہتا ہے کہ ہم جانور ہیں۔

آتش:۔ اچھا تو ہم حائل ہوئے راستہ میں حضور پر نور کے۔ پتہ نہیں یہ کیا معلوم تھا کہ اعلیٰحضرت کی سواری آ رہی ہے۔

بانکا:۔ یہ طعن و طنز اٹھا رکھئے کسی اور وقت کے لئے۔ بے شک ہم بھی بادشاہ ہیں اپنے گھر کے اونچے ہیں اپنی بادشاہت اپنے زور بازو سے۔

آتش:۔ تو پھر آجایئے ہو جائیں دو دو ہاتھ۔ سنبھالئے اپنا کھانڈا اور دیکھئے فقیر کے بھی جوہر شاید کسی قابل ہوں۔

بانکا:۔ انکساری رکھئے بالائے طاق دکھلایئے تو اپنے جوہر۔

آتش:۔ نہیں نہیں پہل تو حضور ہی کو کرنی ہوگی۔

بانکا:۔ جی نہیں پہلے آپ اپنے ارمان نکالیئے۔

آتش:۔ ایسی گستاخی تو اس ناچیز کی طرف سے کبھی نہیں ہو سکتی۔

معلن:۔ اسی تکرار کے دوران میں لوگوں کا ہجوم ہو گیا اور ان میں سے اکثر آتش کے شناسائی تھے وہ بیچ بچاؤ کر ہی رہے تھے کہ دفعتاً سامنے کے بالاخانہ سے میرزا محمد تقی نے جو یہ ماجرا دیکھا تو بے تحاشہ بھاگتے ہوئے آئے۔

میرزا صاحب دس ہزار ماہوار کے وثیقہ دار تھے۔ شہر بھر میں بڑی عزت تھی۔ شعر و شاعری کا اچھا مذاق تھا اور آتش ہی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ وضع کے پابند اور پرخلوص شاگرد تھے۔ ان کو آتا دیکھ کر لوگ ہٹ گئے اور آتش اور بانکے کے درمیان جو نوک جھونک ہو کر تلوار زنی کی نوبت آ گئی تھی رک گئی۔

میرزا صاحب نے فوراً ہی بیچ بچاؤ کیا اور بانکا بھی ہتھیار ڈال کر عذر خواہی کرنے لگا۔ میرزا صاحب آتش کو گھر لے آئے اور دریافت کیا کہ استاد کدھر کا ارادہ تھا۔ آتش تو بھرے ہی بیٹھے تھے مخلص شاگرد کے اصرار پر کراہ اٹھے اور سارا ماجرا جوں کا توں بیان کر دیا۔

مرزا تقی:۔ استاد یہ صحیح ہے کہ معتمدالدولہ کو ایسا نہ کرنا چاہئے تھا مگر جو آپ کر رہے ہیں وہ بھی آپ کے شایاں شان نہیں۔

آتش:۔ ارے بھئی۔ فقیر کو شان سے کیا تعلق ہم کو اگر فکر ہے تو اپنی عزت کی ہے ایسا نہ ہو ناک کٹ جائے۔

مرزا تقی:۔ بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ میرے پاس پانچ سو بانکا پچاس پچاس روپے ماہوار کا ملازم ہے۔ آخر یہ کس دن کام آئیگا۔ آپ دیکھ لیں گے کہ اگر معتمدالدولہ نے ہٹ دھرمی کی تو بارہ دری میں خون کی ندیاں بہیں گی۔

آتش:۔ میری وجہ سے تم کیوں آفت مول لیتے ہو۔

مرزا تقی:۔ واہ یہ بھی ایک ہی کہی کیا استاد کی عزت میری عزت نہیں ہے؟ یہ کسطرح ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ میں مرزا تقی زندہ رہے اور اس کے استاد آتش کی عزت محفوظ نہ ہو۔

آتش:۔ بھائی تمہارا شکریہ۔ تم نے حق شاگردی ادا کر دیا۔ مگر میں تو یہ کبھی نہ چاہونگا کہ میری وجہ سے خواہ مخواہ دو اچھے دلوں میں برائی پڑ جائے۔ اس لئے مناسب ہے کہ مجھے اجازت دیدو۔

مرزا تقی:۔ نہیں نہیں استاد یہ قیامت تک نہ ہوگا۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اللہ نے چاہا تو لکھنؤ دیکھے گا کہ آپ کس شان سے بارہ دری پہنچتے ہیں۔ اب آپ فکر سخن کیجئے ابھی بہت وقت ہے۔ سر شام چلے چلیں گے۔

معلن:۔ مرزا تقی کے اصرار پر آتش کو رکنا ہی پڑا جب تک وہ غزل کی فکر کرتے رہے مرزا تقی نے آتش کی طرف سے ایک درخواست لکھی جس کا مضمون تھا

"حضور میں ایک گوشہ نشین ہوں اگر حضور نے یاد فرمایا ہے تو اتنی اجازت چاہتا ہوں کہ سب سے پیشتر غزل پڑھوں اور دوسری گذارش یہ ہے کہ گرگابی خاص مرحمت ہو" یہ عرضداشت اس طرح پیش ہوئی کہ بادشاہ نے اجازت مرحمت فرما دی حالانکہ شاہی دربار میں سوائے بادشاہ کے ولی عہد تک کو اجازت نہ تھی۔ شام سے پہلے ہی اس مشاعرہ کی شہرت تمام شہر میں ہو گئی۔ آتش کے شاگرد اور ہوا خواہ جوق جوق مرزا تقی کی کوٹھی پر جمع ہونے لگے۔ ادھر آتش نے غزل تیار کر لی ادھر لوگوں لے چلنے کی درخواست کی۔ مرزا تقی نے ایک جلوس ترتیب دیا۔ آگے آگے بوچے پر آتش سوار تھے۔ گورا لیکن زردی مائل رنگ چاروں ابرو کا صفایا، اور آدھے سر پر پٹا، چھریرا بدن گیروے رنگ کا ایک ڈھیلا ڈھالا کرتا اور اسی رنگ کا تہہ بند، کمر میں کھانڈا، ہاتھ میں ڈنڈا جس میں ایک سونے کا چھلا لگا ہوا۔ پاؤں میں بیٹے کام کی سلیم شاہی جوتی ایک اشرفی کی قیمت کی پہنے ہوئے تھے۔ ان کے بعد مرزا تقی پوری نوابی سج دھج کیساتھ اور ان کے پیچھے نواب محمد خاں رند، نواب نصرت یار خاں، نواب غضنفر الدولہ، نواب مہدی علی خاں خلیل، خواجہ وزیر وغیرہ تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے مرزا تقی کے ملازم پانچ سو بانکے کمروں میں تلوار باندھے، ہاتھوں میں تیغے سنبھالے ہوئے تھے۔ راستہ سے تماشائی بھی جوق جوق اس جلوس کے ساتھ ہو لئے۔

آتش شاہی بارہ دری میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ اندر شہ نشین پر کرسی پر غازی الدین حیدر متمکن ہیں۔ ادھر ادھر ارکین سلطنت مودب کھڑے ہیں۔ شہ نشین کے نیچے داہنی طرف ناسخ مع اپنے شاگردوں کے بیٹھے ہیں۔ بائیں طرف آتش کے لئے جگہ خالی ہے۔ بیچ کے در میں کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ مرزا محمد تقی آتش کو لئے ہوئے بیچ کے در میں پہنچ گئے۔ جلوس کا انداز دیکھ کر حاضرین محفل تصویر بنے رہے۔ چوبداروں اور خدمتگاروں کو بھی حوصلہ نہ ہوا کہ روکیں ٹوکیں۔ آتش مجرا بجا لاکر بڑے ٹھاٹھ سے عین مقابل ہی ٹک گئے۔ البتہ شاگردوں کو اشارہ کیا کہ شہ نشین کے بائیں طرف بیٹھ جائیں۔

آتش:۔ بعد آستاں بوسی ادباً گذارش ہے کہ حضور ایفائے وعدہ فرمائیں۔

بادشاہ:۔ دیکھو ایک خاص گرگابی خواجہ صاحب کے لئے حاضر کرو۔

معلن:۔ حکم کی دیر تھی کہ گرگابی پیش کی گئی اور آتش مزے لے لے کر اس لطف خاص سے محظوظ ہونے لگے۔ البتہ ناسخ کا ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔

بادشاہ:۔ کہئے خواجہ صاحب مزاج تو اچھے ہیں؟

آتش:۔ حضور کی عنایت سے اچھا ہوں ——— اگر حسب وعدہ اجازت عالی ہو تو غزل شروع کروں۔

بادشاہ:۔ ہوں ——— کیا مضائقہ۔

آتش:۔ ملاحظہ ہو عرض کیا ہے:۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا
کیا کیا الجھتا ہے تری زلفوں کے تار سے — بخیہ طلب ہے سینۂ صد چاک شانہ کیا
زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف — قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا
اڑتا ہے شوق راحت منزل ہو اسپ عمر — مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا
زینہ صبا کا ڈھونڈھتی ہے اپنی مشت خاک — بام بلند یار کا ہے آستانہ کیا
چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر — دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا
صیاد اسیر دام رگ گل ہے عندلیب — دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے آب و دانہ کیا
طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال — ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا
آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو — دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا
ہوتا ہے زرد سن کے جو نامرد مدعی — رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا
بے یار ساز گار نہ ہوگا وہ گوش کو — مطرب ہمیں سناتا ہے اپنا ترانہ کیا
صیاد گلعذار دکھاتا ہے سیر باغ — بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا
بیتاب ہے کمال ہمارا دل حزیں — مہماں سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا
ترچھی نظر سے طائر دل ہو چکا شکار — جب تیر کج پڑیگا تو دیگا نشانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

معلن:۔ محفل پر ایک سناٹا چھا گیا۔ آتش کے شاگردوں کے دل کی کلی کھلی جاتی ہے اور وہ مست اور بے خود ہو رہے ہیں۔ مرزا تقی خوشی سے پھولے نہیں سماتے ہیں۔ خود بادشاہ سلامت بھی حد درجہ متاثر نظر آتے ہیں ناسخ کی حالت یہ ہے کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں اور ان کے سب ہوا خواہ انگشت بدنداں ہیں کہ اسے کیا کہئے۔ بے چارے معتمد الدولہ شرم سے پانی پانی ہوئے جاتے ہیں۔ ایک لمحہ سکوت کے بعد آتش عصا ٹیک کر اٹھے۔

بادشاہ:۔ کوئی ہے؟ خلعت فوراً حاضر کرو۔

آتش:۔ ادباً عرض ہے کہ اس ناچیز کے لئے یہی عزت کافی ہے کہ اس کو حضور نے خاص گرگابی مرحمت فرمائی اور سب سے پہلے غزل سنانے کے معروضہ کو شرف قبولیت بخشا۔ یہ خلعت ناسخ کو سرفراز فرمایا جائے کہ ان کو زیب دے گا یہ فقیر تو گودڑی ہی میں مست ہے۔ اجازت کا طلبگار ہے، مجرا عرض کرتا ہے۔

معلن:۔ یہ کہہ کر آتش نے فراشی سلام کئے اور دروازے کی طرف [illegible] اٹھنا تھا کہ سارے شاگرد اور ہوا خواہ بھی اٹھے اور ساتھ ہو لئے جس شان سے جلوس آیا تھا اسی شان سے واپس ہوا۔ بادشاہ [illegible] سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں اس بات کا بھی خیال [illegible] ناسخ مع شاگردوں کے غزل سنانے بیٹھے ہیں۔ دربار برخاست کرنے کا حکم [illegible] خود بھی فوراً [illegible]

باقی [illegible]

ہندوستان میں آبپاشی

رام بہاری ننگپال

"خدا کہتا ہے سب چیزیں پانی سے بنی ہیں۔ اس لئے میں حکم دیتا ہوں کہ اس دشت کو جس میں لوگ پیاسے رہ کر غذا حاصل کرتے ہیں، آرام دہ جگہ میں تبدیل کردیا جائے" اکبر اعظم کی اس سند پر ۱۵۶۸ء میں دستخط ہوئے تھے۔ اس کے مطابق وہ قدیم نہر جواب "جمنا کی مغربی نہر" کہلاتی ہے ضلع حصار کی آبپاشی کے لئے دوبارہ جاری ہوئی۔

ہندوستان میں آبپاشی کی ذمہ داری ہمیشہ سے حکومت کی رہی ہے۔ اسکی وجہ ملک کے قدرتی حالات ہیں۔ یہاں بہت سے دریا ہیں، کہیں بارش زیادہ ہوتی ہے کہیں کم اور پھر کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں، اس لئے اکثر قحط پڑجاتا ہے۔ موسم کے اعتبار سے دریاؤں کا پانی بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ کبھی خطرناک باڑھ آجاتی ہے اور کبھی پانی بہت کم رہ جاتا ہے۔ آسام کی پہاڑیوں میں تو ہر سال چار سو ساٹھ انچ سے زیادہ مینہ برستا ہے اور سندھ میں صرف تین انچ۔ ہندوستان میں برسات کا خاص زمانہ جون سے اکتوبر تک ہے۔ سردیوں میں بارش صرف ایک سے دو انچ تک ہوتی ہے اور گرمیوں میں تو ہوتی ہی نہیں۔

ظاہر ہے کہ اس بڑے زراعتی ملک میں بارش کے کم زیادہ اور غیر یقینی ہونے کی وجہ سے آبپاشی پر انحصار رہتا ہے۔ اس ہندو دیومالا کی قدیم روایت سے بھی کہ گنگا کیسے ہمالیہ پہاڑ میں گنگوتری سے جنوبی وادیوں میں لائی گئی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک کی تاریخ کے کسی بہت قدیم زمانہ میں راجاؤں نے آبپاشی کے ذریعے مہیا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

ہندوستان میں آبپاشی کی تاریخ ملک کی تاریخ اور ترقی پر روشنی ڈالتی ہے۔ ہندوستان کے ابتدائی انگریز انجنیروں نے بھی اپنے وقت کے وسائل کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ اس وقت ان ذرائع میں پنجاب میں "مغربی جمنا نہر" یوپی میں "مشرقی جمنا نہر" اور مدراس میں دریائے کاویری کا ڈیلٹا شامل تھا۔

ان کوششوں کے نتائج نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کی ہمت بڑھائی اور انھوں نے مشہور نہر گنگ بنوائی جو بعد کے کاموں کے لئے نمونہ ثابت ہوئی۔

انیسویں صدی میں آبپاشی کے جو ذرائع وجود میں آئے وہ انجنیری کے اعتبار سے نہایت کامیاب رہے اور انھوں نے ملک کی خوشحالی میں بڑی مدد دی حصہ داروں کو منافع بھی کافی تقسیم کیا گیا۔ کیونکہ یہ چیزیں ایسے علاقوں اور حالات میں وجود میں آئی تھیں کہ اقتصادی لحاظ سے ان کا اہم ہونا یقینی تھا۔ لیکن بہت سے ایسے بڑے بڑے علاقے باقی رہ گئے جہاں ذرائع آبپاشی کی ضرورت تھی لیکن ان سے زیادہ نفع حاصل ہونے کی امید نہیں تھی۔ اس لئے ۱۹۰۱ء میں "انڈین اریگیشن کمیشن" مقرر ہوا تاکہ قحط سے بچنے کے واسطے آبپاشی کے ذرائع بڑھانے کے لئے رپورٹ تیار کرے۔ حکومت ہند کی اس قرارداد میں جس کی رو سے یہ کمیشن مقرر ہوا تھا صاف صاف بیان کیا گیا تھا کہ ہمارے پیش نظر یہ سوال نہیں ہے کہ نئے کام سے براہ راست کتنا نفع حاصل ہوگا بلکہ سوال یہ ہے کہ حکومت ان اخراجات کا جو سود اور دوسرے مستقل مصارف برداشت کرے گی وہ قحط سے حفاظت کے لئے ضرورت سے زیادہ تو نہیں ہوں گے اور یہ کہ ان ذرائع کی آمدنی سے یہ مصارف برداشت کئے جاسکتے ہیں یا نہیں۔ اس کمیشن نے محض بچاؤ کے ذرائع ہی کا مشورہ نہیں دیا بلکہ اور بھی نئے کاموں کے امکانات کے بارے میں غور کیا۔

ابتک کا کام

اس پالیسی کے نتائج نہایت ہمت افزا ثابت ہوئے۔ ۱۹۳۷-۳۸ء میں حکومت نے آبپاشی کے ذرائع پر ۵۰۹،۰۰۰،۰۰۰ روپیہ خرچ کیا اور اسے کل خرچ کا ۵ء۹ فیصدی بطور آمدنی حاصل ہوا۔ صرف پیداوار کے کاموں سے ۸ء۴۴ فی صدی آمدنی ہوئی۔ ہندستان میں آبپاشی کی زمین دنیا کے ہر ملک سے زیادہ ہے۔ سندھ کے سکھر بند کی نہروں سے پچپن لاکھ ایکڑ زمین میں آبپاشی ہوتی ہے۔ جنوبی نہر جہاں سب سے بڑی ہے، پچیس لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین کی سینچائی ہوتی ہے۔

آبپاشی کی تمام اسکیموں میں پانی جمع کرنے کا مسئلہ سب سے پیچیدہ ہے کچھ جگہوں پر تو قدرتی حالات پانی جمع کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً کوہ ہمالیہ پر جہاں برف جمی رہتی ہے خود ہی بہت کافی پانی جمع ہوتا ہے۔ مگر اکثر دوسری جگہوں پر پانی جمع کرنے کا انتظام کرنا پڑتا ہے اور یہ کام بڑا دشوار ہے۔ اکثر اوقات بڑی ہوشیاری اور استقلال سے بڑے بڑے بند باندھنے پڑتے ہیں۔ مثال پریذیڈنسی کا "پیار بند" ہر زمانہ میں دنیا کے عجائب میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ یہ مغربی گھاٹ کے تین ہزار فٹ اونچے V کی شکل کے تنگ راستہ پر باندھا گیا ہے۔ اس نے ایک دریا کے رخ کو بحر ہند کی طرف سے ہٹا کر بنگال کی کھاڑی کی طرف کردیا ہے۔ یہ ایک ٹھوس چٹان میں ایک میل لمبی سرنگ کھود کر ممکن ہوسکا۔

یہاں ملک کی آبپاشی کے مختلف ذرائع کا ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جن نہروں کا انحصار دریا کے قدرتی بہاؤ پر ہے وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ نہریں جن میں ہمیشہ پانی رہتا ہے اور دوسری وہ جن میں برسات کے دنوں میں پانی رہتا ہے۔ پہلی تو ایسی بنائی گئی ہیں جن میں خواہ دریا کی سطح کچھ بھی کیوں نہ ہو ہمیشہ پانی آسکتا ہے لیکن دوسری قسم کی نہروں کا انحصار پانی کی سطح پر ہے۔

پانی دو طرح اکٹھا کیا جاتا ہے - یا تو چھوٹے چھوٹے تالابوں میں یا بڑے بڑے بندوں کے ذریعہ - یہ بند بھی انجنیری کے حیرت انگیز کارنامے ہوتے ہیں جیسے لائڈ بند اور میٹور بند - ہندوستان میں آبپاشی کا انحصار پانی کے مصنوعی ذخیروں اور نہروں ہی پر نہیں ہے کچھ صوبوں میں ٹیوب ویل بھی ساتھ ہوگئے ہیں -

ہندوستان میں آبپاشی کے مستقبل کی بہت کچھ امیدیں اس انجنیری فن میں مزید تحقیقات سے وابستہ ہیں - یہاں کے پانچ تحقیقاتی اڈوں میں سب سے زیادہ مشہور پونا کا "سنٹرل اریگیشن اینڈ ہائڈرو ڈائنمک ریسرچ اسٹیشن" ہے اس کا انتظام حکومت ہند کے ہاتھ میں ہے - آبپاشی کے مرکزی بورڈ سے متعلق ایک اطلاعات کا محکمہ بھی ہے جو نہ صرف ہندوستانی انجنیروں سے بلکہ غیر ملکی خاص کر امریکی ماہرین سے تبادلہ معلومات میں مدد دیتا ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آبپاشی کی سائنس نے نمایاں ترقی کرلی ہے -

بعد جنگ کے کام

حکومت آبپاشی کے نئے نئے ذرائع پیدا کررہی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ملک کی آبادی بھی بڑھتی جا رہی ہے - پچاس لاکھ آدمیوں کا ہر سال بڑھ جانا مباحثوں کے لئے عمدہ موضوع ہوسکتا ہے لیکن ہندوستان کے حکام کے لئے ان لوگوں کو خوراک اور روزگار فراہم کرنا ایک مشکل معاشی مسئلہ ہے - گو اس کا حل ناممکن نہیں ہے - اندازہ یہ ہے کہ ان پچاس لاکھ آدمیوں کو مناسب خوراک بہم پہنچانے اور ہندوستان کی ایک تہائی آبادی کے لئے جنہیں اسوقت مناسب خوراک نہیں ملتی بہتر خوراک فراہم کرنے کے لئے کم سے کم ستر لاکھ ٹن اناج کی پیداوار بڑھانے کی ضرورت ہے - اس میں پچاس لاکھ ٹن صرف موجودہ آبپاشی کے ذرائع میں اضافہ کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے - اس کے معنی ہیں کہ تقریباً دو کروڑ ایکڑ مزید زمین میں کاشت ہونی چاہئے مگر اب بھی چھ کروڑ ایکڑ زمین ایسی ہے جس میں آبپاشی کے ذریعے کاشت ہوسکتی ہے -

بعد جنگ کی آبپاشی کی اسکیموں میں مرکزی، صوبائی اور ریاستی حکومتوں کے پیش نظر یہی مقصد ہے "سنٹرل واٹر ویز، اریگیشن اینڈ نیویگیشن کمیشن" (نہروں، آبپاشی اور جہازرانی سے متعلق مرکزی کمیشن) کے قیام کو ہندوستان کی آبی اقتصادیات کے ایک نئے باب کی ابتدا سمجھنا چاہئے - یہ کمیشن کچھ پرانے نقائص کو دور کرکے پانی کے ذرائع کو قومی ضروریات کیلئے استعمال کرنے کا پروگرام تیار کریگا - گذشتہ زمانہ میں دریاؤں کے وہانے کو واحد بنیاد قرار دے کر نہریں بنانے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے - درحقیقت صوبائی اختلافات جن میں اکثر اوقات ریاستیں بھی شامل ہوجاتی تھیں، آبپاشی کی تجویزوں میں رکاوٹ ڈالتے رہے حالانکہ یہ تجویزیں سارے علاقوں کے لئے مفید ثابت ہوتیں نئے کمیشن سے ایسے نقائص کے دور کرنے کی امید کی جاتی ہے -

بعد جنگ کی آبپاشی کی تجاویز میں "دامودر ویلی پروجیکٹ" (وادیٔ دامودر کی تجویز) جو مرکزی، بنگال اور بہار، حکومتوں کے متفقہ فیصلہ سے وجود میں آنے والا ہے اور جس کے پیش نظر کئی مقاصد ہیں آئندہ صورت حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے - یہ تجویز امریکہ کی "ٹینیسی ویلی اسکیم" کے مطابق بنائی گئی ہے لیکن یہ اسکی بالکل نقل بھی نہیں ہے - اس تجویز سے فی الحال جو مسائل حل اور جو فائدے حاصل ہوں گے وہ ہندوستان کے آبی ذرائع کے اقتصادی اور قدرتی پہلوؤں پر روشنی ڈال سکیں گے - سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کسی وقت پانی کی افراط اور کسی دوسرے وقت پانی کے قحط سے بچا جاسکے - اس غرض سے بہت سے بند باندھنا اور جنگلات لگانا ضروری ہے - ساتھ ہی ساتھ بند باندھتے وقت آس پاس کی زمین کا بھی خیال رکھنا چاہئے - اس سے نہ صرف پانی اکٹھا کرکے ضرورت کے وقت نہروں کے ذریعہ فراہم کیا جاسکے گا بلکہ بجلی بھی بنائی جاسکے گی -

یہ برقابی کا عہد ہے - اس اسکیم سے جو برقی قوت حاصل ہوگی اس سے یوپی کی طرح ان علاقوں میں جو نہروں سے دور ہوں بجلی کے کنوئیں چلانے کا کام لیا جاسکتا ہے - سر ولیم اسٹیمپ نے انسٹیٹیوشن آف انڈین انجنیرز (ہندوستانی انجنیروں کا ادارہ) کے سامنے ۱۰ نومبر ۱۹۴۴ء کو تقریر کرتے ہوئے اس مفید پہلو پر بہت زور دیا دیہاتی صنعتوں کی تجدید میں بھی بجلی کی قوت سے بہت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور پھر یہ آس پاس کی صنعتی ترقی میں بہت مدد دے گی

پس اندازی کے آئندہ فائدے

پردھمن سنگھ

کسی نے حال ہی میں کہا ہے کہ "لڑائی کے زمانہ میں ذخیرہ اندوزی جرم ہے لیکن روپیہ جمع کرنا اس کا الٹ ہے" یہ بیان ایک اہم حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے اور اگر یہی جمع کیا ہوا روپیہ سوچ سمجھ کر کسی مفید کام میں لگایا جائے تو ہماری بہت سی اقتصادی مشکلات آسانی سے حل ہو جائیں۔ آج کل پانچ ارب روپیہ سے زیادہ کے نوٹ اور سکے استعمال میں آ رہے ہیں۔ اگر اس میں سے آدھا روپیہ بھی بچا کر سرکاری اور ذاتی اچھے کاموں میں لگایا جائے تو نہ صرف کافی سود حاصل ہو بلکہ آئندہ زیادہ چیزیں خریدی جا سکیں گی۔ جو آدمی ہوشیار ہے وہ اس زمانہ میں روپیہ بچائے گا کیونکہ آجکل روپیہ کی قیمت پہلے سے بہت گھٹ گئی ہے اور آئندہ جب اقتصادی حالات پھر پہلے جیسے ہو جائیں گے تو روپیہ کی قیمت کا بڑھ جانا لازمی ہے۔

روپیہ بچانے کا ایک فائدہ تو فوراً ہی حاصل ہوگا یعنی بہت سی چیزوں کی قیمتیں گر جائیں گی۔ اس بات کو ہر شخص بغیر حیل و حجت تسلیم کریگا کہ آج ہماری قوت خرید ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ اگر ہم اپنے اخراجات پر دھیان دیں اور صرف ضروری اور مناسب موقعوں پر پیسہ خرچ کریں تو ہم کافی روپیہ بچا سکتے ہیں جو ملک کی اقتصادی ترقی میں کام آ سکتا ہے۔ روپیہ جمع کرنا اچھی عادت ہے۔ اس کے علاوہ یہ قربانی، دور اندیشی اور عقلمندی کی دلیل ہے۔ ہندوستان جیسے غریب ملک میں جہاں پیداوار کے کاموں میں روپیہ لگانے کے امکانات بہت زیادہ ہیں کفایت شعاری کے فائدے ظاہر ہیں۔ معمولی حالات میں تو محض نفع حاصل کرنے کے لئے کافی روپیہ بچانا مناسب ہے لیکن جس زمانہ میں جنگ نے روپیہ کی قیمت گھٹا دی ہو روپیہ بچانے سے نفع ہی مقصود نہیں ہوتا بلکہ یہ قوم کی زندگی اور موت کا سوال بن جاتا ہے جنگ کے دنوں میں شہریوں کے لئے چیزوں کی کمی پڑ جاتی ہے اور روپیہ کی افراط ہو جاتی ہے۔ اس لئے قیمتیں بڑھنی شروع ہو جاتی ہیں۔ تاجر خوب نفع کماتا ہے۔ جن لوگوں کو روپیہ پہلی مرتبہ حاصل ہوا ہے انہیں فضول خرچی کرتے ڈر نہیں لگتا۔ اس سے غریبوں کو بڑا نقصان پہنچتا ہے جن کی تعداد اس ملک میں بہت زیادہ ہے۔ اس خطرہ کے پیش نظر حکومت نے روپیہ کی قیمت برقرار رکھنے کی کئی طرح کوشش کی ہے، خاص کر چیزوں کے بھاؤ پر کنٹرول کر کے۔ راشننگ رائج کر کے اور ذخیرہ اندوزی کے خلاف قوانین بنا کر۔ لیکن محض یہی چیزیں کافی نہیں ہیں بلکہ دو اور باتیں بھی ضروری ہیں ایک محصولات لگانا اور دوسرے اپنی مرضی سے روپیہ بچانا۔ چونکہ محصولات بڑھانے سے آخرکار غریبوں کو نقصان پہنچنا لازمی ہے اس لئے روپیہ بچانے کا طریقہ بہتر ہے اس وقت بے دھڑک خرچ کر دینے کے معنے ہیں ان بچتوں کو ہضم کر جانا جو آئندہ ہونے کے لئے بچانے چاہئیں۔ آج کل ہم غیر معمولی حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہم میں سے ہر شخص کو دوبارہ تعمیری کاموں کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے تاکہ ہم اس عبوری دور سے آسانی سے گزر سکیں جو موجودہ اقتصادی حالات کے ختم ہونے پر ہونا لازمی ہے۔ ہم جنگ کے بعد کی اکثر تجویزوں پر غور کر رہے ہیں۔ ہمارے پیش نظر تعلیم، صحت عامہ، صنعتی ترقی اور مشینوں کے ذریعہ کاشت کی بڑی بڑی سکیمیں ہیں۔ ان کے علاوہ آبپاشی کے ذرائع پیدا کرنے کی بھی بڑی بڑی تجویزیں ہیں جن میں بہت سرمایہ لگانا پڑے گا۔ ہندوستان میں سب سے بڑا مسئلہ عوام کی غریبی ہے۔ مناسب وقت میں ان کی آمدنی کو دگنی اور تگنی کرنے کے لئے ہمیں ابھی سے بچانا شروع کرنا چاہیئے۔ اگرچہ جنگی صنعتوں نے ملک کی دولت میں اضافہ کر کے پیداوار بڑھا دی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس نے مصیبتوں میں بھی اضافہ کیا ہے۔ ملک غربت کا شکار ہے اس لئے مالداروں کو اپنی ذمہ داریاں اور بھی محسوس کرنی چاہئیں

برطانیہ اور امریکہ جیسے ملکوں میں حکومتیں کل قومی آمدنی کا چالیس فیصدی محصولات کی شکل میں واپس لے رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم اس ملک میں جہاں کم آمدنی والے بہت زیادہ اور زیادہ آمدنی والے بہت کم ہیں۔ اس قسم کے محصولات نہیں لگا سکتے۔ علاوہ اس کے غریبوں پر محصولات لگانا انتظامی نقطۂ نظر سے مشکل اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بے انصافی بھی ہوگا۔ لہذا محصولات سے ملک کی آمدنی کا بہت تھوڑا حصہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اور حکومت کو بڑی حد تک لوگوں کے رضاکارانہ چندوں پر ہی منحصر رہنا ہوگا۔ جنگ کی وجہ سے ہر سچے شہری کے دل میں روپیہ بچانے اور جنگی کاموں کے لئے جمع کرا دینے کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

غریب چین تک میں سنہ ۱۹۴۰ء سے ایک "قومی کفایت شعاری اور تعمیر نو کی تحریک" جاری ہے۔ اس سے سنہ ۱۹۴۳ء تک تقریباً بچاسی کروڑ ڈالر اکٹھا ہو سکے۔ روس میں جہاں روپیہ بچانے کا کام عوام نہیں بلکہ اصولی طور پر حکومت کرتی ہے اس قدر کفایت برتی گئی کہ "روسی حفاظتی فنڈ کی تحریک" نے صرف پہلے آٹھ ہفتوں میں تقریباً چھیالیس کروڑ روبل نقد اور ہزاروں ٹن گوشت، غلہ اور دودھ کی بنی ہوئی چیزیں جمع کریں۔ برطانیہ میں روپیہ بچانے کی تحریک میں تین لاکھ گروہ شامل تھے جنہوں نے مل کر ساڑھے آٹھ ارب پونڈ اکٹھا کئے۔ ان میں تین ارب پونڈ قلیل رقموں کی شکل میں تھے۔

ایسی ہمت افزا مثالوں کے ہوتے ہوئے ہر غریب اور امیر ہندوستانی کا فرض ہے کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ بچا کر ایسی محفوظ جگہوں میں جمع کرے جہاں

وہ قوم کی تعمیر اور آئندہ خوشحالی کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ اس کے لئے نئے دستورالعمل کے مطابق بنی ہوئی نئی حکومت کو زیادہ اختیارات کی ضرورت ہوگی کیونکہ یہ حکومت تعلیم، حفظانِ صحت، ذرائع آمد و رفت، کاشتکاری اور صنعت کی ترقی کے لئے نئی نئی تجویزوں پر عمل کرے گی۔

سادگی اور کفایت شعاری کی ہر مذہب نے تلقین کی ہے۔ ہم اپنے اخراجات کو جائز ثابت کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ جنگ نے ہمارے اندازوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ ہم جس طرح پہلے رہتے تھے ویسے رہنے کی کوشش میں جو کچھ کماتے ہیں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ حالانکہ اب لڑائی ختم ہوگئی ہے مگر ابھی جنگی حالات باقی ہیں۔ چیزیں مشکل سے ملتی ہیں اور فراہمی اور مطالبہ کے درمیان خلیج بدستور حائل ہے مگر ہم یہ نہیں سوچتے کہ اب بہت جلد حالات سدھرنے والے ہیں۔ ہم روز بروز محسوس کرتے ہیں کہ عنقریب بازار ضرورت کی چیزوں سے بھر جائے گا۔ اس لئے جب چیزیں سستی ہو جائیں گی تبھی چیزیں خریدنا بہتر ہوگا۔ اس دوران میں ہمیں تفریحوں۔ جواہرات اور اس قسم کے دوسرے اخراجات پر، جنہیں ہم کچھ وقت کے لئے آسانی سے ملتوی کرسکتے ہیں، روپیہ خرچ نہیں کرنا چاہیئے۔ "جہاں تک ممکن ہو سکے کفایت شعاری سے کام لینا چاہیئے" اگر ہم اس اصول پر عمل کریں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔

سائل اور انکی شاعری: ——— بقیہ صفحہ ۱۱

رکشا میں سوار ہو کر روزانہ اُن کی قیام گاہوں پر جاتے اور پھر دن بھر ان سے گفتگو فرماتے تھے۔ انتقال سے ایک روز قبل وہ سر شام ریاست پٹودی سے دہلی تشریف لائے اور آنے کے بعد ہی رکشا میں سوار ہوئے اور ان لوگوں سے ملے جن سے ملنا اُنکے روزانہ پروگرام کا جزو لازم تھا۔ یہ انکی اپنے دوستوں سے باوجود شدت مرض الموت آخری ملاقات اور جہاں آباد کی راہوں کا آخری پھیرا تھا۔

اُستاد مرحوم کی طبیعت اس حادثۂ پاشکستگی کے بعد جو مئی ۱۹۳۸ء میں پیش آیا تھا مُسلسل ناساز رہی مگر اس عالم میں بھی وہ ایک طویل مثنوی جو شہنشاہ جہانگیر اور ملکۂ نورجہاں کے حالات عشق پر مبنی ہے، تصنیف فرماتے رہے۔ افسوس کہ یہ مثنوی جو اُردو لٹریچر میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے ناتمام رہ گئی۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو دن کے دس بجے وہ اس کاروان سرائے ہستی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے اور ۱۶ ستمبر کو ہم نے جنہیں انکی مہربانیوں نے زیادہ سے زیادہ نوازا تھا اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کیا۔

بنگر کہ عزیزان ہمہ در خاک شدند ۔۔۔ در صیدگہ فنا بہ فتراک شدند
آخر ہمہ را زیر زمیں باید شد ۔۔۔ گیرم کہ بر فعت ہمہ افلاک شدند

(سید ۔۔۔ (اسر مرحوم)

۱۹۴۶ء کا حسین ترین ادبی تحفہ

چمنستان دلی

کا

سالنامہ

۸ جنوری ۱۹۴۶ء کو شائع ہو رہا ہے

جس میں ہندوستان کے بہترین فنکار شریک ہو رہے ہیں۔ یہ نمبر اپنی گوناگوں رعنائیوں کی وجہ سے اردو ادب میں ایک نیا اضافہ ہوگا۔ فہرست چمنستان دلی کے دسمبر ۱۹۴۵ء نمبر میں ملاحظہ فرمایئے

ایجنٹ حضرات۔ دسمبر ۴۵ء کے دوسرے ہفتہ تک اپنے آرڈر بک کرسکتے ہیں۔ اسکے بعد آرڈر نہیں لئے جائینگے۔ آرڈر کے ہمراہ نصف رقم آنی ضروری ہے۔

قیمت :- فی پرچہ ۸/ ——— مینیجر چمنستان۔ دلی

آتش: ——— بقیہ صفحہ ۴۹

مکلسرا میں داخل ہوگئے۔

آتش کو ناسخ کے مرنے کا بہت رنج ہوا اور شعر کہنا چھوڑ دیا کہتے تھے کہ کہنے کا لطف سننے اور سنانے کے ساتھ ہے جس شخص سے سنانے کا لطف تھا وہ نہ رہا تو اب شعر کہنا نہیں، بکواس کرنا ہے۔ زندگی کے آخری ایام اس طرح گذارے گویا کہ کوئی قلندر تکیہ پر بیٹھا ہو جب جی چاہا کوٹھڑی کا دروازہ کھلا رکھتے تھے اور جب جی چاہا بند کرتے۔ عقیدت مندوں میں سے کوئی آتا اور طبیعت موزوں ہوتی تو منہ لگاتے ورنہ ڈانٹتے۔ کیوں صاحب بوریئے کو دیکھتے ہیں آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے؟ یہ تو فقیر کا تکیہ ہے یہاں مسند کہاں؟

اسی حال میں آخر ایک دن ۱۲۶۳ھ کو دفعتاً انتقال کر گئے۔

تصحیح یکم اکتوبر ۱۹۴۵ء کے "آجکل" میں جناب میرزا یگانہ چنگیزی کا مقالہ "ادب خبیث" شائع ہوا تھا جس میں کتابت کی چند غلطیاں رہ گئیں قارئین اپنے اپنے پرچوں میں تصحیح فرمالیں۔

صفحہ ۵۲۔ کالم ۱۔ سطر ۱۔ "نفسی" کی جگہ "نفس"
صفحہ ۵۲۔ " ۱۔ " ۲۷۔ "صفوں" کی جگہ "مضمون"
صفحہ ۵۳۔ " ۱ " ۱۵۔ "سا" کی جگہ "کہا"
صفحہ ۵۳۔ " ۲ " ۳۰۔ "قافیہ" اور "کی" کے درمیان "بے خبری کا نتیجہ ہے قافیے کے بہت سے اقسام ہیں مشکل قسم کے بھی ہیں اور آسان قسم کے بھی۔ قافیہ" کا اضافہ فرمالیں۔
صفحہ ۵۵ کالم ۱ سطر ۳۳۔ "پھر" کی جگہ "پھر بھی"

(ادارہ)

ادھر ادھر سے

ادارہ

مصر آجکل حکومتِ مصر اہم سماجی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہے۔ اگلے سال کے دوران میں ایک "جامعۂ عوام" قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ثقافتی مسائل کو ترقی دینا، فالتو اوقات کو مفید بنانا اور نئی پود کے افراد کو اس طرح تربیت دینا کہ وہ اچھے شہری ثابت ہو سکیں اس نئے ادارہ کا سب سے بڑا مقصد ہوگا۔ تمام طبقوں کے طلبا جن کی عمر سولہ سال سے زیادہ ہو بلا امتیاز لیاقت وقابلیت اس جامعہ میں داخل کئے جایا کریں گے۔ حال ہی میں تین سو سے زیادہ مصری طلباء اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی غرض سے یورپ اور امریکہ گئے ہیں۔ ان کی روانگی سے قبل شاہ فاروق نے ان سب کو چائے کی دعوت دی۔ موصوف بہت دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے اور یہ توقع ظاہر کی کہ وہ غیر ملکوں میں رہ کر اپنے چال چلن کو مثالی نمونے کی صورت میں پیش کریں گے۔

سعودی عرب اس سال تمام حاجیوں کی تعداد ۵۰،۶۸۵ رہی ہے جن میں سے اہل مصر کا شمار سب سے زیادہ یعنی ۰۹،۹ تھا اور دوسرے نمبر پر ہندوستانیوں کی تعداد ۷،۰۰۹ رہی۔ پھر شامی اور فلسطینی ہیں جن کی مجموعی تعداد ۶،۸۰۰ رہی ہے۔ سوڈانی اور مغربی افریقہ والے ۳،۸۳۶ تھے۔ جنوبی اور مشرقی افریقہ والے ۱،۲۵۲ اور عدنی صرف ۱۱۱۔

عراق حکومت عراق اپنے ملک میں طبی خدمات کو وسعت دینے کے لئے عملی قدم اٹھا رہی ہے۔ عمرانی معاملات کی وزارت نے مجلس وزراء کے روبرو تجویز پیش کی ہے کہ بصرہ میں ایک میڈیکل کالج قائم کیا جائے۔ توی امید ہے کہ آئندہ سال تک اس کالج کا افتتاح ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں بہت سے ماہرین فن جن میں لائق سرجن بھی شامل ہوں گے، انگلستان سے بلائے جائیں گے۔ عراق کے ریجنٹ امیر عبد العلی چار ماہ تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ عظمیٰ، یورپ اور ترکی کی سیاحت کرنے رہنے کے بعد ۲۱ ستمبر کو اپنے ملک واپس آ گئے ہیں۔ بغداد کے فضائی مستقر پر نوجوان بادشاہ امیر زید (قائم مقام ریجنٹ) عراق کے وزیر اعظم کابینہ کے اراکین، عمائدین سلطنت اور حکومت کے دوسرے ارباب حل وعقد نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ پھر نہایت شان وشوکت کے ساتھ ان کا جلوس نکلا اس طرح کہ تمام بازار جھنڈیوں وغیرہ سے سجے ہوئے تھے اور فوج کے دستے سلامی کے لئے موجود تھے۔

ایران اس جنگ کے دوران میں امریکہ نے فوجی ضروریات کے لئے ایران میں ٹیلیفون کا عارضی سلسلہ قائم رکھا تھا۔ اب حکومت ایران نے اس تمام سازو سامان کو تین لاکھ ڈالر کے عوض خرید لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ دونوں ملکوں کے مابین اس تبادلہ کے مناسب انتظامات عمل میں آ رہے ہیں۔ ایران کے وزیر مال نے ڈاکٹر علی امینی کو متعین کیا ہے کہ وہ ہندوستان آ کر ہندوستان اور ایران کے مابین قریبی تجارتی تعلقات کا عمیق مطالعہ کریں۔

روس روسی صنعتوں کے سلسلے میں کپاس کی کاشت کو خاص اہمیت حاصل ہے چنانچہ اس وقت تقریباً ڈیڑھ کروڑ ایکڑ زمین اسی مقصد کیلئے مخصوص ہے۔ ان وسیع قطعات میں اعلیٰ آبپاشی کا نظام قائم رکھنے کے لئے کئی ارب روبل سالانہ خرچ کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ روئی تیار کرنے والے مرکبات کی جتنی مقدار روس میں تیار ہوتی ہے اس کا ساٹھ فیصدی حصہ کپاس کے کھیتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کاشت کے سلسلے میں کاشتکار سائنٹفک تحقیقات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے تحقیقاتی ادارے، تجرباتی مرکز اور تجربہ گاہیں ایسے آزمائشی میدان ہیں جہاں حاصل شدہ نتائج کو باقاعدہ دائرہ عمل میں لایا جاتا ہے۔ زراعت کے تحت میں [illegible] جو پنج سالہ خاکہ مرتب کیا گیا ہے اس میں کپاس کی مقدار کو غیر معمولی طور پر بڑھانے کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ مقصد مختلف کیمیاوی اور معدنی مرکبات کھادیں ملانے اور نئی مشینوں کے کثرت استعمال سے حاصل ہو سکے گا۔

جاوا آجکل جاوا کی خبروں کا بازار گرم ہے اس لئے قدرتی طور پر شخص اس کی بابت بہت کچھ جاننا چاہتا ہے۔ جاوا جنوب مشرقی ایشیا کا ایک نہایت اہم جزیرہ ہے۔ اس کا رقبہ پچاس ہزار مربع میل ہے۔ آبادی چار کروڑ ہے۔ قرب و جوار کے جزیروں کے ساتھ اس پر بھی ولندیزی حکومت کا پرچم لہراتا ہے۔ زمین چونکہ قدرتی طور پر زرخیز ہے اس لئے دنیا کے ان خاص علاقوں میں سے ہے جہاں سب سے زیادہ کاشت ہوتی ہے۔ جنوب کے ہموار علاقے میں چاول اور پہاڑی علاقے میں چائے اور قہوہ بویا جاتا ہے۔ سورابایا کی جانب نصف مشرقی حصہ میں گنے کی کاشت ہوتی ہے۔ اس علاقے کے دوسرے جزیروں کے مقابلے میں جاوا کا تعلیمی معیار بھی سب سے زیادہ بلند ہے۔ متعدد درسگاہیں ہیں اور بہت سے جاوی لوگ اعلیٰ سندیں حاصل کر چکے ہیں۔ ملک کا صدر مقام یعنی بٹاویا جاوی علماء وفضلا کا مرکز ہے۔

ملایا شروع میں جزیرہ نمائے ملایا میں صرف ملایا کے لوگ آباد تھے لیکن بعد ترک وطن کر جانے والے ہندوستانی اور چینی وہاں پہنچ کر تعداد میں ان سے بازی لے گئے۔ اولین اعداد وشمار جو حاصل ہو سکے ۱۹۱۱ء کے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ملک کی آبادی کل چھبیس لاکھ تھی جس میں سے ملایا کے باشندے صرف پندرہ لاکھ تھے۔ تاہم ۱۹۴۰ء تک کل آبادی بقدر تیس لاکھ زیادہ ہوئی، اور

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

چینگ ٹو

چین کے صوبہ سوچوان میں ایک شہر ہے جسے چینگ ٹو کہتے ہیں اور اسی کو کبھی کبھی "چھوٹا پیکنگ" بھی کہہ لیتے ہیں۔ چین کے باشندے جو اصل پیکنگ کے حالات سے واقف ہیں، محسوس کرتے ہیں کہ چینگ ٹو کو چھوٹا پیکنگ کہنا زیب نہیں دیتا لیکن چونکہ آجکل لڑائی کے باعث اس قدیم عظیم الشان صدر مقام تک پہنچنا مشکل ہے اس لئے اسی شہر کو اس نام سے یاد کر لینا کسی قدر تسلی بخش ہے۔

پیکنگ سے چینگ ٹو تک کا فاصلہ تقریباً چار سو میل ہے اور سفر بڑا دلچسپ رہتا ہے خصوصاً اس لئے کہ راستہ دنیا کے ایک زرخیز ترین حصے میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اس حصۂ زمین کو چار دریا سیراب کرتے ہیں جن میں یانگ سی بھی شامل ہے۔ سی چوان کے لغوی معنے "چار دریاؤں کی سرزمین" ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے پنجاب پانچ دریاؤں کی وجہ سے مشہور ہے۔ چونکہ یہ علاقہ پہاڑی ہے اسلئے کسان ڈھلوان حصوں میں سیڑھیاں سی بنا کر کاشتکاری کرتے ہیں لیکن اس سے مقامی حسن میں نقص پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہر حصہ زمین کارآمد ہو جاتا ہے۔ اسپر مختلف قسم کی جو فصلیں پرورش پاتی ہیں ان سے سرسبزی کا یہ عالم رہتا ہے کہ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی اپنی پیٹھوں پر بچے باندھے ہر وقت کھیت میں لگی رہتی ہیں۔ وہاں سے گذرتے وقت سب سے پہلے دیہات کے کتے مسلسل بھونکتے سنائی دیتے ہیں۔ چھوٹی منڈیوں میں عجیب قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ نیکیانگ جو اس راستے پر تقریباً بیچ میں واقع ہے، اچھا خوشحال چھوٹا سا قصبہ ہے جو اپنی لذیذ مٹھائیوں اور خشک پھلوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ تھوڑے فاصلے پر سی لیو چنگ ہے جہاں ہزاروں سال پرانی نمک کی کانیں ہیں۔ نمک نکالنے اور اسے صاف کرنے میں کوئی نئی قسم کی مشین استعمال نہیں کیجاتی۔ سی لیو چنگ کے بعد راستہ نشیب کی طرف اترنے لگتا ہے حتی کہ چینگ ٹو پہنچنے تک زیادہ پہاڑی رہتے نہیں پاتا۔ یہاں اکتوبر اور نومبر کے مہینے میں سرسوں کے زرد پھول کھلے نظر آتے ہیں۔ یہ سفر مختلف طریقوں سے طے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً موٹر کار میں، ہوائی جہاز میں (جس سے جانے میں پورے ۴۵ منٹ بھی نہیں لگتے)، ورنہ عام لاریوں یا ڈاک خانے کے ٹھیلوں میں۔ اس طرح موسمی حالت اور گاڑی کی نوعیت کے لحاظ سے کم سے کم دو دن اور زیادہ سے زیادہ بیس دن لگتے ہیں۔ نوروز کی چھٹیاں گذرنے کے بعد جب میں چینگ ٹو میں اپنے کالج جانے لگی تو ڈاک خانے کے ایک چھکڑے پر سفر کرنا پڑا جو بہت دلچسپ ثابت ہوا۔ گاڑی بان کے علاوہ ڈاک خانے کے انسپکٹر صاحب بھی ساتھ تھے۔ ہمیں ڈاک کے تھیلوں اور پارسلوں کے انبار پر بیٹھنا پڑا تھا۔

پاربتی مینن

ہندوستان کے بعض قدیم شہروں کی طرح چینگ ٹو بھی فصیل سے گھرا ہوا ہے اور ایک دروازے سے گذر کر شہر میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ شہر مختلف حصوں میں تقسیم ہے۔ مثلاً خرید و فروخت کی منڈی، سرکاری کوارٹر، یونیورسٹی کا علاقہ اور عام رہائشی حصہ وغیرہ۔ لیکن ان حد بندیوں کا کچھ زیادہ لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

بحیثیت مجموعی چینگ ٹو کی سادگی اور قدیم روش بدستور قائم ہے۔ یہاں چنکنگ یا چین کے دوسرے شہروں کی طرح مکار فضا نام کو بھی نہیں ہے اور نہ تصنع اور بناوٹ سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک روز میں نے چینگ ٹو کے گورنر کو جو اچھے خاصے مرد معقول تھے یونہی معمولی طور پر سڑک کے کنارے پیدل چلتے دیکھا۔ وہ نہ تو عام لوگوں سے بچ کر چل رہے تھے اور نہ ان کے جلو میں کوئی سرکاری دستہ تھا۔ جب سے وہاں ہوائی جہازوں کے میدان بنے ہیں اور کچھ چینی ہوا باز بھی آکر رہنے لگے ہیں چینگ ٹو نے فوجی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ لیکن پھر بھی لوگوں میں خطرات جنگ کا احساس بالکل نہیں ہے اور یہ شاید اسلئے کہ وہاں کبھی بمباری نہیں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں پرانی وضع کی بہت سی عمارتیں برقرار ہیں۔ اس کے برعکس چنکنگ میں نئی فضا قائم ہے۔ مجھے چینگ ٹو میں اپنے چند احباب کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کے مکانوں میں وسیع کمرے اور پرانی وضع کے صحن موجود تھے۔ مکانوں کی تعمیر میں زیادہ تر لکڑی استعمال ہوتی ہے اور لکڑی کے سیاہ دروازوں پر سنہرے حروف میں کچھ چینی عبارتیں لکھ دی جاتی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ یہ حروف مدہم نہیں پڑتے بلکہ ویسے ہی زرتر رہتے ہیں۔ کمرے بڑے بڑے اور ان کی دیواریں اونچی ہوتی ہیں اور دیواروں کو بانس کی منقش پٹیوں سے زینت دی جاتی ہے۔ اس فن میں چینگ ٹو بہت مشہور ہے۔ وہاں کی خطاطی کے نمونے بھی قابل قدر سمجھے جاتے ہیں۔ نہایت عمدہ چاندی کی زیبائشی چیزیں اکثر کمروں کی رونق ہوتی ہیں کیونکہ یہاں کے سادہ کار بھی مشہور ہیں۔ بعض مکانوں کے ساتھ پائیں باغ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ایک سبک خرام ندی کے کنارے خوبصورت سی بارہ دری بھی ہوتی ہے تاکہ وہاں کنبے کی کوئی بزرگ ہستی بیٹھ کر مسائل حیات پر غور و فکر کر سکے۔ ہر گھر میں ایک صحن ہوتا ہے جہاں بچے کھیلتے ہیں اور بڑے لوگ دھوپ میں بیٹھکر غپ شپ کرتے ہیں۔ بدھ اور تاؤ کی خانقاہیں قابل دید عمارتوں میں شامل ہیں جو سارے چینگ ٹو میں پھیلی پڑی ہیں۔ ان کی شان و شوکت، خصوصاً مخروطی ستونوں کی زیبائش، اور چینی وضع کی نازک چھتیں زائرین پر حیرت انگیز اثر ڈالتی ہیں۔ ان کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چین کی مذہبی اور سیاسی زندگی پر مذہب کس درجہ حاوی ہے۔ بدھی خانقاہوں میں بدھ کی مورتیں اس خاص ہندوستانی طرز میں نظر آتی ہیں کہ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں اور ہتھیلی سامنے کے رخ پھیلا رکھی ہے۔ ان کے برعکس بالکل نئی وضع کی عمارت سابق گورنر کی خانقاہ ہے جو شاہراہ کے سرے پر واقع ہے۔

چینگ ٹو چونکہ صوبہ کا تسلیم شدہ صدر مقام ہے اسلئے یہاں محفلوں کی رونق اور لطف و نشاط کی فضا میں دخل حاصل ہے۔ تن لوتانگ کا قول ہے

کہ اسے "آداب قہوہ خانہ کا شہر" کہا جا سکتا ہے۔ اس سے بہتر اور مناسب تعریف نہیں ہو سکتی۔ خوش قسمتی سے چائے یہاں کی چند سستی چیزوں میں سے ہے۔ پھولوں اور پھلوں کا بھی یہی حال ہے بخصوصیت کیساتھ موسم گرما میں میٹھے خربوزے اور موسم بہار میں آلوچے کے پھولوں کی ڈالیاں بکثرت اور سستی بکتی ہیں۔ چینگ ٹو کا ہر باشندہ پھول خریدنا اپنا فرض سمجھتا ہے چنانچہ ضرب المثل کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر تمہارے پاس ایک روٹی موجود ہو تو آدھی بیچ کر پھول خرید لو۔ سادہ دلچسپیوں کے اور طریقے بھی ہیں۔ میں نے اکثر لوگوں کو مٹھائی والے کی دوکان کے سامنے اس طرح کھڑے دیکھا ہے کہ مٹھائی والا کھانڈ کے کھلونے بنا رہا ہے اور وہ ذوق و شوق سے خرید رہے ہیں اگر مٹھائی والا خوش طبع ہے تو وہ سب سے چھوٹے بچے کو ایک دو کھلونا بطور کے طور پر دیدیتا ہے اور اس سے دلچسپی دوبالا ہو جاتی ہے۔ بعض تفریحات مسرت خانہ ہیں۔ مثلاً وہاں تھیٹر اور اعلیٰ قسم کے رستوراں بھی ہیں۔ ان مقامات پر بڑی بھیڑ رہتی ہے کیونکہ چینگ ٹو کا نوجوان طبقہ وہاں جاکر لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ چین کے اہم درسی شہروں میں سے ہے اور دوسرے یہ کہ وہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ شاید ہی کوئی گلی کوچہ ایسا ہو جہاں کوئی طالب علم یا استاد نظر نہ آئے۔ اندھیرا چھا جانے کے بعد اس بے ڈھنگے سے پل پر جو یونیورسٹی اور چائے کی دو کانوں کے بازار کے درمیان واقع ہے بہت سے طلبا اپنے ہوسٹلوں کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بھوسے یا بانس کی مشعلیں روشن کر لیتے ہیں تاکہ اندھیرے میں راستہ نظر آتا رہے۔ چینگ ٹو میں بہت سے مصور، ادا کار اور ادیب بھی موجود ہیں۔ فنی نمائش کے موقع پر یہ مصور نمائش گاہ کے ایوان میں بڑی شان سے گھومتے نظر آتے ہیں۔ وہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے بعض نمائشی چیزوں کی اچھائی برائی پر اظہار خیال کرتے ہیں اور اگر کبھی کوئی قدردان فن و ادب آ نکلے تو اس سے موجودہ فنی اور ادبی رجحانات پر گفتگو بھی کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ قدیم روایات کو محفوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ چینگ ٹو جمالیاتی اور ذہنی زندگی کا آئینہ دار ہے۔

چینگ ٹو کو تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے اور پھر آجکل لڑائی کے دنوں میں اس کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے اور اس کے ڈانڈے تمام دنیا سے جا ملے ہیں۔ لیکن جنگی جدوجہد کے لحاظ سے چینگ ٹو چنکنگ کی طرح نہیں ہے صدیاں گذریں جب وہ چین کا صدر مقام تھا اور وہ بھی تھوڑے عرصے کے لئے۔ یہ شہر تانگ خاندان کے ایک سابق شہنشاہ اعظم کی دلپسند حسین محبوبہ یانگ کوئی فئی کا وطن تھا اور یہیں وہ مشہور جنگجو عورت بھی رہتی تھی جو نام نہاد لٹیروں اور منگولوں کے خلاف لڑنے کے لئے متواتر فوجیں لے جاتی رہی۔ اس لحاظ سے بھی چینگ ٹو پرانے چین کا ایک ٹکڑا اور تہذیب قدیم کا ایک یادگار نمونہ ہے اور تمام یادگاروں کی طرح اس کی قدر و قیمت بھی اس کی قدامت و عزابت میں پنہاں ہے۔

اِدھر اُدھر سے

بقیہ صفحہ ۵۵

اس میں سے اہل ملایا کی بڑھتی ہوئی تعداد دس لاکھ سے کچھ ہی زیادہ تھی حال ہی میں دستیاب ہونے والے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اب چینی تعداد میں اہل ملایا سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ ٹین اور ربڑ کی صنعتی ترقیوں نے ان غیر ملکیوں کو ترک وطن کی ترغیب دی تھی۔ اتنے عرصے قیام کرنے کے بعد بھی بہت سے بدیسی لوگ ملایا میں اپنے قیام کو عارضی تصور کرتے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ جوں ہی قسمت کا دست کرم ان پر دراز ہو وہ اپنے اپنے وطن مالوف کو لوٹ جائیں وہاں ہندوستانی چینیوں سے زیادہ نہیں ہیں لیکن ان سے پہلے پہنچے تھے۔ ۱۹۲۱ء تک ہندوستانیوں کی کل تعداد ساڑھے سات لاکھ تھی چینیوں اور ہندوستانیوں کے علاوہ وہاں ولندیزی جزائر شرق الہند کے رہنے والے بھی آباد ہیں۔ لیکن وہ اصل باشندوں میں اسقدر گھل مل گئے ہیں کہ ان کی انفرادیت باقی نہیں رہی۔

آسٹریلیا

ہندوستان کی طرح آسٹریلیا بھی زراعتی پیداوار خصوصاً گندم کی کاشت کے لئے مشہور ہے لیکن آسٹریلیا میں گیہوں جن خاص طریقوں سے پیدا کیا جاتا ہے وہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے طریقوں سے مختلف ہیں چونکہ بارش کم ہوتی ہے اور زمین میں قدرتی طور پر نشو و نما کی صلاحیت بھی قلیل ہے اس لئے زیادہ رقبے میں کاشتکاری ضروری ہے۔ وہاں کھیتوں کا سب سے بڑا قطعہ ترسٹھ ہزار ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ اس لئے تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ آسٹریلوی کسان بیرونی فنون اور مشینوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ جان رِدلی کی زراعتی مشین ۱۸۴۳ء میں ایجاد ہوئی تھی وہ گھوڑوں سے چلتی اور کئی قسم کے کام انجام دیتی ہے ۱۸۸۴ء میں اس مشین نے ترقی حاصل کی اور مخلوط طور پر وہ بالوں سے اناج الگ کرنے اور بھوسا اڑانے کا فرض بھی انجام دینے لگی ان مشینوں کے استعمال کرنے کے علاوہ آسٹریلوی کسان کیمیاوی اور معدنی کھاد بھی اپنے کھیتوں میں ڈالتے ہیں۔ نیز وہ اس امر کا لحاظ رکھتے ہیں کہ اچھی نسل کا گیہوں بویا جائے۔ اس طرح ان کے کھیتوں میں نہ صرف یہ کہ اناج زیادہ مقدار میں پیدا ہوتا ہے، خرچ بھی زیادہ نہیں بیٹھتا۔ آسٹریلیا میں بنی ہوئی کاشتکاری کی مشینیں روس اور ارجنٹائن تک جا پہنچیں بلکہ ان کی کافی تعداد برطانوی کھیتوں تک میں استعمال ہو رہی ہے۔ اب آسٹریلیا ایسی صورت پیدا کر رہا ہے کہ دوبارہ زراعتی ترقیوں کے ساتھ وہ جاوا، ملایا، لنکا، ہندوستان، بحیرۂ احمر، خلیج فارس اور چین تک کی گیہوں کی منڈیوں پر حاوی ہو جائے۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد قلیل مقدار میں آسٹریلوی گیہوں ہندوستان آ چکا ہے۔ تاہم زیادہ مقدار میں پسا پسایا آٹا جاوا، بورنیو، ہانگ کانگ اور ان دوسرے مقامات پر بھیج دینے کے انتظامات عمل میں آ رہے ہیں جن کو دشمن کے پنجۂ استبداد سے آزادی دلائی گئی ہے۔

ایک منٹ میں فوٹو اتارلو
جو لوگ کیمرے کا بٹن دبانا بھی نہیں جانتے وہ
بھی ان سے نہایت آسانی سے چلتے پھرتے مرد، عورت
بچے، تصویر دوڑ، باغ، باغیچہ، ہر قسم کے حسین سبزیاں، دریا،
پہاڑ، سمندری نظارے اور بڑی بڑی عمارات وغیرہ
کے خوبصورت اور شاندار فوٹو اتار کر اپنی شہرت اور قسمت
چمکا سکتے ہیں یہ کیمرے مضبوط باڈی خوبصورت اور
چست و طاقتور لینز پرزوں سے آراستہ ہیں
قیمتیں بہت ہی کم رکھی ہیں
بکس کیمرہ پانچ روپے بارہ آنے 5/12/- - بڑھیا قسم سات روپے چار آنے 7/4/-
بیبی گولڈن کوالٹی فولڈنگ کیمرہ پندرہ روپے 15/- محصول ڈاک پیکنگ وغیرہ ہر ایک کا ایک روپیہ
نوٹ
ہر ایک کیمرے کے ساتھ فوٹو اتارنے کیلئے کاغذ، فلمیں دھونے کے مکمل مصالحہ جات وغیرہ اور باتصویر ترکیب استعمال
مفت روانہ ہوگی جلدی منگالیں ورنہ ختم ہونے پر ایسا مال اتنی کم قیمت پر نہ ملے گا اس لئے آج ہی وی پی منگائیں
آرڈر دیتے وقت اخبار یا رسالہ کا حوالہ ضرور دیں اور اپنا نام و پتہ خوشخط لکھیں سامان ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس ہوگی
ملنے کا پتہ: امپیریل چیمبر آف سائنس پی بی 61/41 لاہور (انڈیا)
IMPERIAL CHAMBER OF SCIENCE. P.B. 61, LAHORE (INDIA)

نقد و نظر

ایک زمانہ تھا کہ کتب خانہ دار البلاغ کی صرف چار کتابوں (کامیاب مرغی خانہ، تجارتی مرغی خانہ، طبیب مرغی خانہ اور بطخ فیل مرغ) کے اشتہارات تقریباً ہر رسالے اور ہر اخبار میں نظر آتے تھے اور وہ اسلئے کہ دار البلاغ کی یہ کتابیں جن کے مصنف جناب خواجہ عبد السلام فرخی خاص طور پر پرندوں کی پرورش کے سلسلے میں ایک زبردست ماہر فن تسلیم کئے جاچکے ہیں، ہاتھوں ہاتھ بکا کرتی تھیں۔ اسوقت علمی طبقوں میں جب اس کتب خانے کا ذکر ہوتا تو مرغی خانہ کا عکس نگاہوں کے سامنے آجاتا اور جب غیوں اور دوسرے پرندوں کی بابت گفتگو ہوتی تو دار البلاغ کے اشتہارات اپنی جھلک دکھانے لگتے اور اس طرح ایک حد تک لازم و ملزوم ہوجانے کے باعث محسوس ہونے لگتا کہ دار البلاغ اور مرغی خانہ شاید ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ پھر بدلتے ہوئے رنگ کے ساتھ اس ادارے نے ایک کروٹ لی اور خالص ادبی کتابوں کی اشاعت کے لئے بھی اپنی توجہ محسوس کرلی۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ اس کے منتظم نے عام روش سے الگ ہٹ کر اپنے لئے ایک ایسا ادبی راستہ اختیار کیا جس پر چلتے وقت دامن اشاعت الفاظ کے رنگ یا لبس کو بچا رہتا ہے اور جسطرح نیو تھیٹرز کی تصویروں نے اپنے اعلیٰ مذاق اور بلند معیار سے فلمی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا، اسی طرح دار البلاغ کی مطبوعات منصۂ شہود پر آئیں اور نا قدرین ادب سے خراج تحسین لئے بغیر نہ رہ سکیں۔ یہ امر قابل ہے جبکہ اسی شہر کے دوسرے کئی ادارے عریاں بلکہ ایک حد تک فحش ادب شائع کرکے بری طرح روپیہ بٹورنے میں مصروف تھے۔ ابتدائی منزل میں قدم رکھتے ہی اس ادارے کی خوش قسمتی سے میاں ایم اسلم جیسا جوہر قابل مل گیا جن کی شخصیت افسانوں اور ناولوں کی دنیا میں اپنی نظیر آپ ہوگئی ہے۔ چنانچہ ان کے وہ قیمتی موتی رشتۂ ادب میں منسلک ہوکر عروسِ اردو کو چار چاند لگانے لگے جنہیں وہ کسی قیمت پر بھی دوسرے انگھڑ ہاتھوں میں سونپنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس اصلاحی مقصد کو جس کی ترجمانی اپنی تحریروں میں کی ہے، پیش نظر رکھتے ہوئے یہ گوارا نہ کرسکے کہ اپنی کتابیں ان اداروں کے وسیلے سے چھپوائیں جو اسی مقصد کے برعکس تختۂ گل پر کانٹے بونے میں منہمک تھے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے اطفالِ معنوی کو سینے سے لگائے ایک ایسی دایہ کے منتظر رہے جو ظاہر میں پرورش کا فن جاننے کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس کے اصول سے بھی واقف ہو اور جب دار البلاغ کا وسیلہ مل گیا تو ان کے ناول اور افسانوں کے مجموعے دورانِ جنگ میں تیار ہونے والے بموں کی طرح میدانِ ادب میں آنے لگے۔ چنانچہ اسوقت میاں صاحب کی پانچ کتابیں پیش نظر ہیں جن کو کتب خانہ دار البلاغ نے شائع کیا ہے۔

(۱) "شمسہ" ایک ایسا طبع زاد ناول ہے جسمیں مشرق و مغرب کی متضاد تہذیبوں کے بہت سے پہلو وضاحت سے دکھاتے ہوئے انہیں آپس میں ٹکرا دیا گیا ہے لیکن اسطرح سے تہذیب کے خلاف کھلے لفظوں میں زہر نہیں اگلا بلکہ ایمائی کیفیت سے کام لیتے ہوئے ثابت کیا گیا ہے کہ حماقت سے ہنس کی چال چلنے والے کوّے بے شمار مصائب و آلام کا شکار ہوجاتے ہیں۔ یہ موضوع بذات خود اچھوتا نہیں ہے لیکن جس زاویہ سے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہ ضرور لائق تحسین ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ خصوصیت کے ساتھ ہمارے ان نوجوانوں کے لئے مفید ہے جو اپنی مشرقی روایات کی طرف سے آنکھیں بند کرکے اس نئی فضا میں سانس لینے کے تمنی رہتے ہیں جو بظاہر بڑی رنگین اور دلکش معلوم ہوتی ہے۔

(۲) "حسنِ سوگوار" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ایک دردناک ناول ہے جس میں چین و جاپان کی حال ہی میں ختم ہوجانے والی لڑائی کے المیہ واقعات کو دو لبریز محبت دلوں کی رومانی جذبات قلب کے پس منظر میں اسقدر خوش اسلوبی سے اسطرح پیش کیا گیا ہے کہ بہت سے تاریخی اور نیم تاریخی واقعات جن کی تفصیلات سنی اور پڑھی جاچکی ہیں، آئینہ بن کر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک طرف اہل چین کی وہ زبردست جد و جہد ہے جو وطن عزیز کو دشمنوں کے نرغے سے بچانے کے لئے اختیار کی گئی تو دوسری طرف جاپانیوں کی اس سفاکی و بربریت کی خونچکاں داستان ہے جسکا محض تصور ہی دل ہلا دینے کے لئے کافی ہے۔ اس ناول کے بہت سے کردار نہ صرف حقیقی بلکہ سرِ وقت موجود ہیں۔ اسی لئے اسکی عظمت دوسرے چینی ناولوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ یہ تصنیف طبعزاد نہیں ہے بلکہ اسے مشہور چینی مصنف لن یوتانگ کے ایک ناول "لیف ان دی اسٹورم" کو سامنے رکھکر لکھا ہے۔ لن یوتانگ چینی ادب میں سب سے مقبول اور سب سے بڑا ناول نویس مفکر اور سیاستدان سمجھا جاتا ہے۔ اسکی تحریر میں بیک وقت فلسفے، شاعری اور موسیقی کے امتزاج کی جھلک نظر آتی ہے جسے قائم رکھنے میں اسلم صاحب نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔

(۳) "رقصِ بہار" بھی ایک طویل ناول ہے اور اس کا پلاٹ "شمسہ" سے کسی قدر ملتا ہے۔ اس میں بھی مشرق و مغرب کی متضاد تہذیبوں کے خاکے کھینچے گئے ہیں۔ قصے کا مرکزی مقام روسی ترکستان کا ایک قصبہ ہے جہاں سوویٹ روس کے معاشرتی اصول اپنا رنگ جمانے لگے ہیں اور آہستہ آہستہ اسلامی تہذیب خطرے میں پڑتی جارہی ہے۔ قصبے کے لوگ سادہ لوح ہیں، وہ ترغیبات کے زیر اثر اپنی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ حسن و عشق کی رنگینیوں کے ماتحت عمل میں آتا ہے لیکن اس بظاہر لطیف فضا میں بھی اپنی پرانی روایات کا احساس غیر شعوری طور پر نہیں کھلائے جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح جو شام تک گھر لوٹ آتا ہے، اپنی پرانی روش دوبارہ اختیار کرلیتے ہیں اور یہ مراجعت بھی اعجازِ محبت کے طفیل ممکن ہوتی ہے۔ پہاڑی مقام اور اس کے شاداب مرغزاروں کے فرحت بخش مناظر کو اسقدر رنگین بیانی کے ساتھ اسلم صاحب نے پیش کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ خصوصاً موثر اشعار کے برمحل استعمال نے سونے پر سہاگے کا کام کر دکھایا ہے۔ اس ناول کی مقبولیت کا اندازہ اسی اعتبار سے ہوسکتا ہے کہ پہلا ایڈیشن بہت جلد ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب دوسری اشاعت کا ایک نسخہ زیر نظر ہے۔

"ف۔ ح"

(۴) "جام شکستہ" دس افسانوں کا مجموعہ ہے جو افسانوی نماکوں اور موضوعات کے لحاظ سے مختلف ہونے کے باوجود عام تاثرات خصوصاً انجام کے اعتبار سے یکساں ہیں یعنی تقریباً سبھی میں محبت کی حرماں نصیبیاں اور قسمت کی بے چارگیاں اپنے رنگ جما چکتی ہیں۔ پہلا افسانہ "راوی کے پار" بہت ہی دلچسپ ہے۔ اسمیں پنجابی گیتوں نے اصل لطف کو دوبالا کر دیا ہے جن کو اردو لباس میں اس نئی قسم کی آزاد شاعری کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے جو خود مصنف صاحب کی اصطلاح میں "اونٹ مارکہ شاعری" کہلاتی ہے۔ چوتھا افسانہ "چھٹی" جو فہرست میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے، ان لوگوں کو ضرور پڑھنا چاہیئے جو کلرک کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آٹھواں افسانہ "نیا مریض" جو آجکل کی اشاعت بابت یکم جون ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا، نفسیاتی اعتبار سے بہت ہی قابل قدر ہے۔ آخری افسانہ "جام شکستہ" جس کی رعایت سے کتاب کا نام رکھا گیا ہے، کافی طویل ہونے کے باوجود اسقدر جاذب توجہ ہے کہ ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اسلم صاحب افسانوی خطوط لکھنے میں بڑے مشاق ہیں اور یہ صلاحیت اس افسانے میں اچھی طرح نظر آتی ہے۔

(۵) "ہیر رانجھا" سرزمین پنجاب کی مشہور المناک داستان محبت ہے جسے ملک الشعرا سید وارث شاہ نے قلمبند کیا تھا۔ پلاٹ وغیرہ کے متعلق کچھ کہنا بے سود ہے جبکہ اسکے خلاصے وقتاً فوقتاً اردو میں پیش کئے جا چکے ہیں اور یہ نظر رکھتے ہوئے ایک فلم بھی بن چکا ہے۔ البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ اسلم صاحب نے مکمل افسانے کو اصل طرز تحریر کا لحاظ رکھتے ہوئے پہلی بار زبان اردو میں پیش کیا ہے اور یہ خدمت اسقدر لائق تحسین ہے کہ صرف اس ترجمے سے بھی موصوف اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ ترجمہ عبارت میں بڑی دلآویزی اور جادو اثری ہے اور اس لئے ہم ان کے اس "عاذے کہ پنجابی زبان کی نطافتوں اور نزاکتوں کو اردو زبان میں بیان کرنا مشکل ہی نہیں، بلکہ غیر ممکن ہے" کسی طرح بھی متفق نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اردو زبان کا دوسری ہر دوسری زبان کے تجربات و طرز بیان کو اصل باریکیوں کے ساتھ اپنے اندر ڈھال لینے میں پوری صلاحیت رکھتی ہے اور یہ ترجمہ بھی اسی دعوے کا ثبوت ہے۔

یہ پانچوں کتابیں ۲۰×۳۰/۱۶ کی تقطیع پر عمدہ کتابت نفیس طباعت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں، مجلد ہیں اور دیدہ زیب گرد پوشوں سے مزین ہیں۔ علی الترتیب ۲۹۰، ۲۸۰، ۳۶۰، ۲۸۰ اور ۱۶۷ صفحات پر مشتمل ہیں اور مبلغ پانچ، تین، ساڑھے تین، تین اور دو روپے میں کتب خانہ دار البلاغ، محمد نگر، میور روڈ، لاہور سے مل سکتی ہیں۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱	میر حسن دہلوی کا غیر مطبوعہ کلام	مرسلہ جناب عبد العلیم شیر کوٹی
۲	میر حسن اور لکھنوی	محترمہ بیگم قمر امداد لکھنوی
۳	اپیندر ناتھ اشک (مع تصویر)	پروفیسر وقار عظیم
۴	"ہندوستان ہمارا" کی شان نزول	جناب محمد عمر (نور الٰہی) امجون
۵	اردو ادب میں روشن خیالی کی تحریک	جناب حسن امام (پٹنہ)
۶	گلی کا نام (افسانہ)	جناب اپیندر ناتھ اشک
۷	شیکسپیئر کے ڈرامے ترکی میں	جناب اے۔ آر۔ ہمفریز
۸	روداد (مع تصاویر)	مسٹر شیر احمد
۹	ہوش نگر کا شباب (افسانہ)	جناب پنڈت سدرشن
۱۰	معمہ بین	جناب سلطان احمد قریشی
۱۱	مسئلہ فلسطین	جناب ظفر محمود
۱۲	خیام کی ایک شام (منظوم خاکہ)	جناب سلام مچھلی شہری
۱۳	جبر الطیر	جناب ایس پی بی مالس
۱۴	زندانی (آزاد نظم)	پروفیسر عبادت بریلوی
۱۵	فریب (افسانہ)	جناب ناصر (لکھنوی)

آجکل — یکم جنوری ۱۹۴۶ء

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے	سال ۴ نمبر ۱۵	فہرست	یکم جنوری ۱۹۴۶ء	قیمت فی پرچہ چھ آنے

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	رفتار زمانہ	ادارہ	۲
۲	میر حسن دہلوی کا غیر مطبوعہ کلام ..	(مرسلہ) جناب عبدالعلیم شیرکوٹی	۵
۳	فلسطین کا مسئلہ	جناب ظفر محمود	۶
۴	کچھ نہیں (غزل)	جناب میکش اکبرآبادی	۷
۵	بے بسی (نظم)	جناب منیر کمال	۸
۶	کلاتِ شیکسپیئر	پروفیسر تلوک چند محروم	۹
۷	ساجن سے (گیت)	محترمہ نسیمہ نوز	۹
۸	سنہری ساڑی (ڈرامہ) ...	جناب آئی اے چودھری	۱۰
۹	اپندرناتھ اشک (مع تصویر)	پروفیسر سید وقار عظیم	۱۳
۱۰	ازالہ (ایک دوست کے نام) ...	جناب شمس مینائی	۱۵
۱۱	خمسہ	خانصاحب سید امانت حسین ربط تاہری	۱۶
۱۲	ہوش نگر کا شباب (افسانہ)	پنڈت سدرشن	۱۷
۱۳	بیتے ہوئے دن (آزاد نظم) ..	جناب ساغر جلیلی	۱۷
۱۴	غزل	سید معین الدین احمد عرشی بھوپالی ..	۱۷
۱۵	سودایہ	مشیر احمد	۱۸
۱۶	...... مجبور ہو تم (نظم)	جناب مرزا عابد عباس (آگرہ)	۲۱
۱۷	شیکسپیئر کے ڈرامے ترکی میں	مسٹر اے آر ہمفریز	۲۳
۱۸	گلی کا نام (افسانہ)	جناب اپندرناتھ اشک	۲۴
۱۹	بھوسے بھنے جلوے	جناب عزیز احمد بی اے (عثمانیہ) ...	۲۶
۲۰	ہماری شام و سحر	محترمہ سیدہ اختر حیدرآبادی ..	۲۶
۲۱	مشکلات	جناب سائل ابیٹھوی	۲۶
۲۲	منبشن امروز	جناب سرور قدوائی	۲۶
۲۳	زندانی (آزاد نظم)	پروفیسر عبادت بریلوی	۳۵
۲۴	خیام کی ایک شام (منظوم فیچر)	جناب سلام مچھلی شہری	۳۶
۲۵	من کے دیپ کی جوت جگا لو	جناب پریمی رامپوری	۳۷
۲۶	روسی ادب میں روشن خیالی کی تحریک	جناب حسن امام (پٹنہ)	۳۸
۲۷	معدہ بین	جناب سلطان احمد قریشی	۴۰
۲۸	غزل	جناب اقبال عظیم	۴۱
۲۹	جبرالٹر	مسٹر ایس پی بی مائس	۴۲
۳۰	ماں (اطالوی گیت) ...	جناب عبدالرزاق کلیانوری	۴۳
۳۱	فریب (افسانہ) (۱)	جناب "ناصر"	۴۴
۳۲	تجلیات رعنا	شہزادی گوہر تاج نواب صفیہ	
	....	سلطان جہاں بیگم رعنا (جاورہ)	۴۵
۳۳	روایاتی شاعرے (نظم) ..	جناب غلام ربانی تاباں	۴۷
۳۴	میر حسن اور مثنوی ...	محترمہ قمر امداد لکھنوی	۴۹
۳۵	تعلیم بالغان	مسٹر ڈنلیٹ برم	۵۳
۳۶	ہندستان کا بہترین سفیر ..	جناب ڈی ایف کراکا	۵۵
۳۷	تلمعات	جناب شاطر حکیمی کاظمی	۵۶
۳۸	نقد و نظر	"فرح"	۵۹
۳۹	کوک کوئلیا کوک (گیت)	جناب ابراہیم ناظر غزنوی پشاوری	۶۰

مدیر اعلیٰ: آغا محمد یعقوب دواشی، بی اے (علیگ) ایل ایل بی

نائب: راجیندرناتھ شیدا، ایم اے

مینیجر: فضل حق قریشی، دہلوی

مدیر: مشیر احمد، ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ ۱ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

۱۳۰ نئے ریڈیو اسٹیشن

حکومتِ ہند بعد جنگ کے نشریاتی منصوبوں پر غور و خوض کرنے میں بہت زیادہ منہمک ہے۔ بہت سی تجاویز زیرِ غور رہ چکی ہیں۔ چنانچہ محکمہ نے اعلان کیا ہے کہ ہندوستان کے سات لاکھ دیہاتوں میں سرکاری طور پر ریڈیو سیٹ لگانے کا خیال ہے تاکہ وہ غریب لوگ جو بذات خود ریڈیو کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے، اسطرح دیہاتی پروگرام سے استفادہ کریں۔ نیز ہندوستان چونکہ ایک وسیع ملک ہے۔ اس لئے مختلف صوبوں کی ضروریاتِ زندگی، رسم و رواج اور بول چال وغیرہ کا لحاظ رکھتے ہوئے مختلف نشر گاہوں کے قیام کی ضرورت لازمی طور پر محسوس ہوگی لہذا سارے ملک میں نشر الصوت کے تقریباً ایک سو تیس مرکز قائم کرنے کا خاکہ مرتب کیا گیا ہے۔

حکومتِ ہند کے محکمۂ نشر و اطلاعات کے سکریٹری مسٹر پی۔ این تھاپر حال ہی میں انگلستان، ریاستہائے متحدہ اور کنیڈا کا تین مہینے تک دورہ کرتے رہنے کے بعد واپس آئے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق نشریاتی حکمتِ عملی کو یکسر تبدیل کرنا ہوگا کیونکہ دورانِ جنگ میں دوسرے ملکوں میں جو تجربات ہوتے رہے ہیں، اُن سے اس نتیجے پر پہنچا گیا ہے کہ ریڈیو کو صرف تفریح طبع کا ذریعہ ہی نہ سمجھا جائے۔ اسے تعلیم و تربیت کا نہایت مفید آلہ بھی بنایا جا سکتا ہے اور ترقی پسند حکومت بھی اس سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتی ہے۔ چنانچہ ان ایک سو تیس اسٹیشنوں سے جنکا ذکر اوپر کیا گیا ہے کم و بیش چالیس زبانوں اور بولیوں میں ایسے پروگرام نشر ہوا کریں گے جو شہریوں اور دیہاتیوں کے لئے نہایت کار آمد ہو سکیں۔

نیپالی کمانڈر انچیف کی سبکدوشی

نیپال کے وزیر اعظم اور سپریم کمانڈر انچیف جنرل ہز ہائینس مہاراجہ سر جودھا شمشیر جنگ بہادر رانا تیرہ سال تک گرانقدر خدمات انجام دیتے رہنے کے بعد اپنے مناصبِ جلیلہ سے سبکدوش ہو گئے۔ اب ان کے بھتیجے جنرل سری تین شمشیر جنگ بہادر رانا ان کی جگہ مامور کئے گئے ہیں۔ موصوف سے پہلے ان کے بڑے بھائی اس عہدے پر فائز تھے۔

ان مہاراجہ صاحب نے جو اپریل ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے، شہری اور فوجی نظام، عدالتی طریقۂ کار، تعلیم و تربیت، رسل و رسائل اور صنعت و تجارت کو ان تیرہ سال کے دوران میں ایسی غیر معمولی ترقی دی کہ ان کا نام نیپال کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہیگا۔ سماج سدھار کے ضمن میں بھی ان کے نمایاں کارنامے قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے صغر سنی کی شادی پر سخت پابندیاں عائد کیں، اور شادی کی رسومات کے سلسلے میں بیجا اخراجات کو روکا۔ آج سے تقریباً بتیس سال پہلے وادیٔ کھٹمنڈو میں بجلی کی لہر پہلی بار دوڑائی گئی تھی۔ موصوف کے زمانے میں ۱۹۳۳ء میں، پانی سے بجلی تیار کرنیکا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم کیا گیا جو بہت بڑے حصۂ ملک کے لیے کافی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں پہلا نیپالی بنک کھٹمنڈو میں قائم ہوا۔ نیز حال ہی میں زرِ کاغذی کا وجود عمل میں آیا ہے۔ گھریلو صنعتوں کو بھی غیر معمولی ترقی ہوئی۔ دیا سلائی بنانے کا ایک کارخانہ کھولا گیا، اور سن، چاول اور شکر کے کئی مل قائم ہوئے۔ پچھلے زلزلے کے بعد بہت سی نئی وضع کی عمارتیں اور کشادہ سڑکیں بنائی گئیں جن سے شہری سہولت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

پچھلی جنگِ عظیم کے دوران میں سینئر کمانڈنگ جنرل کی حیثیت سے مہاراجہ صاحب نے بہت سے نیپالیوں کو اپنی نگرانی میں فوجی تربیت دے کر لڑائی کے لئے تیار کیا تھا۔ جب دوسری جنگِ عالم چھڑی تو انھوں نے بڑی تیزی کے ساتھ گورکھا پلٹنوں میں اضافہ کرتے ہوئے انکی تعداد ۲۰ سے ۴۰ کر دی اور ان کو ہندوستانی فوج کے ساتھ مل کر لڑنے کے لئے بھیجدیا۔ ملک کی کل آبادی ستر لاکھ ہے اور جو گورکھا سپاہی بھیجے گئے انکی کل تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔

حکومتِ برطانیہ نے مہاراجہ کو ۱۹۱۹ء میں کے سی آئی ای ۱۹۳۳ء میں جی سی آئی ای ۱۹۳۵ء میں جی سی ایس آئی اور ۱۹۳۹ء میں جی سی بی کے اعلیٰ خطابات عطا کئے۔ ان کے علاوہ بھی موصوف نے دوسرے ملکوں سے اعزاز حاصل کیا نیز ۱۹۴۲ء سے انھیں برطانوی فوج میں جنرل کا اعزازی عہدہ ملا ہوا ہے۔

ناکارہ فوجیوں کا مستقبل

حکومت ہند نے بعد جنگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں ان فوجیوں کے لئے جو لڑائی کے دوران میں ناکارہ ہوگئے ہیں، مصروف کار رکھنے کے لئے ایک معقول خاکہ پیش کیا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ستمبر ۱۹۳۹ء سے اختتام جنگ تک جو فوجی مجروح، مریض یا ناکارہ ہوگئے ہیں حقدار ہوں گے کہ ضروری علاج معالجے اور تربیت کے بعد کسی موزوں کام میں لگا دیئے جائیں تاکہ ان کی زندگی اطمینان و سکون کے ساتھ بسر ہوسکے۔ ان فوجیوں کو بھی جو اس وقت سرکاری اسپتالوں میں زیر علاج ہیں، تندرستی حاصل کرنے کے بعد یہ سہولت دی جائیگی۔ اس مقصد کے لئے فی الحال سات مرکز قائم کئے جارہے ہیں جہاں ایسے لوگوں کو کاروباری تربیت حاصل کرنیکا موقع ملیگا۔ وہ حسب منشا لکڑی کا، ٹین کا، دوسری دھاتوں کا، چمڑے کا، سلائی کا، بید کی ٹوکریاں اور کپڑا بننے کا کام سیکھ سکینگے۔ وہ فوجی بھی جو اس خاکے کے مرتب ہونے سے قبل ملازمت سے برطرف کئے جاچکے ہیں، اپنے حقوق جتا کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو وہ پنشن جو ناکارہ ہونے کے باعث دی جانی منظور ہوئی ہے بدستور ملتی رہے گی اور اتنا الاؤنس بھی ملیگا کہ دونوں رقمیں مل کر اصل تنخواہ کے برابر ہوجائیں۔

حیدرآباد میں تحقیقاتی ترقیاں

اعلیحضرت نظام دکن کی حکومت نے اپنی ریاست میں صنعتی اور سائنسی تحقیقات کے لئے ایک مرکزی معمل اور ایک تحقیقاتی ادارہ جامعہ عثمانیہ میں قائم کرنے کی منظوری حال ہی میں دی ہے۔ مسٹر مظفر الدین قریشی پی ایچ ڈی (برلن) جو جامعہ عثمانیہ میں کیمسٹری کے مدیر ہیں، اس معمل کے ناظم اعلیٰ ہوں گے۔ اس کام کے لئے پانچ سال تک دو لاکھ روپے سالانہ سرکار نظام کے خزانے سے دیئے جائیں گے۔ نیز ابتدائی کام کے لئے پندرہ لاکھ روپے یکمشت دینے منظور ہوئے ہیں۔ اسی طرح تحقیقاتی ادارے کے لئے ایک لاکھ روپے یکمشت اور تین لاکھ روپے سالانہ کی منظوری ہوئی ہے۔ سب سے پہلے، ریاضی، اعداد و شمار، فلکیات، طبیعات، کیمیا، حیاتیات، اور انجینئرنگ کے سلسلے میں تحقیقات کی جائینگی۔ ادارہ قانون، دینیات اور فنون کی تحقیقات میں مدد دیگا۔

گذشتہ ستائیس سال سے جامعہ عثمانیہ نہایت مفید اور کاموں میں مصروف ہے۔ ذریعہ تعلیم اردو ہے تاہم انگریزی بھی دوسری زبان کی حیثیت سے لازمی ہے۔ ۱۹۴۵ء کے آخر تک سوا چار سو کے قریب کتابیں غیر ملکی زبانوں سے ترجمہ ہوچکی تھیں۔ یہ کام دار الترجمہ کے ماتحت عمل میں آیا۔ ۱۹۴۵ء میں جامعہ عثمانیہ اور الحاق شدہ مدارس میں ۲۳۰۰ طلبا پڑھتے تھے۔ زنانہ تعلیم کے لئے خواتین کا ایک کالج بھی ہے جس میں ۱۹۴۳ء میں ۱۷۷ طالبات پڑھتی تھیں۔

ترکی اور مسئلہ درۂ دانیال

ترکی اس معاہدۂ مانٹرو پر جس کی رو سے درۂ دانیال کا نظم و نسق اب تک قائم رہا ہے، نظر ثانی کرنے کے سلسلے میں ریاست ہائے متحدہ کی تجویز اصولی طور پر قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ ترکی کے وزیر اعظم سراج اوغلو نے انقرہ کی ایک پریس کانفرنس میں فرمایا کہ ریاستہائے متحدہ کی حکومت نے چار تجویزیں پیش کی ہیں:-

(۱) ہمیشہ تمام قوموں کے تجارتی جہازوں کو آبنائے میں سے گذر جانے دیا جائے۔

(۲) ان قوموں کے جنگی جہازوں کو جو بحیرۂ اسود کے کنارے آباد ہیں بلا معاوضہ ہمیشہ گذر جانے دیا جائے۔ ان قوموں میں سوویٹ یونین، رومانیہ اور بلغاریہ کے باشندے شامل ہیں۔

(۳) ان قوموں کے جنگی جہازوں کو جو بحیرۂ اسود کے کنارے آباد نہیں ہیں گذرنے نہ دیا جائے۔ البتہ ایک متفقہ فیصلے کے مطابق مقررہ وزن کے جہاز مستثنیٰ رکھے جائیں اور وہ بھی اسوقت جبکہ بحیرۂ اسود کی ساحلی قوتیں اسپر رضامند ہوں یا وہ جہاز متحدہ اقوام سے متعلق ہوں۔

(۴) جاپان کو اس معاہدے میں سے خارج کرکے اس کی جگہ متحدہ اقوام کو شامل کیا جائے۔ مسٹر سراج اوغلو نے یہ بھی فرمایا کہ ریاستہائے متحدہ کی تجاویز کے ساتھ حکومت برطانیہ بھی یہی فیصلہ صادر ہونے کی آرزو مند ہے۔ تاہم ان کا خیال ہے کہ یہ معاملہ اتنا اہم نہیں ہے کہ اسپر کارروائی فوراً شروع کردی جائے۔

ترکاریاں خشک کرنے کے کارخانے

دوران جنگ میں فوجی ضروریات پوری کرنے کے لئے ترکاریاں خشک کرنے کے بہت سے کارخانے کھولے گئے تھے۔ اس اثنا میں محسوس کیا گیا کہ یہ طریقہ بہت ہی مفید اور کارآمد ہے۔ چنانچہ مرکزی محکمۂ خوراک کے دعوت نامے پر ایسے کارخانوں کے نمائندے نئی دہلی میں جمع ہوئے اور اس امر پر غور کیا گیا کہ کیا عام شہریوں کی ضروریات کے لئے بھی خشک ترکاریاں فراہم کرنیکا انتظام جاری رکھا جاسکتا ہے جبکہ فوجی مطالبات تقریباً ختم ہوچکے ہیں۔ محکمے کے نائب ناظم مسٹر اوبو بریمو نے سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ محکمۂ خوراک فنی مشورے اور امداد حاصل کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ ہے اور اس حد تک تیار ہے کہ ترکاریاں خشک کرنے والے کارخانوں کو کنٹرول قیمت پر ترکاریاں اور تیاری کے آلات بھی فراہم کرادے لیکن ماہرین فن کی رائے ہے کہ شہریوں کے لئے خشک ترکاریوں کا مسئلہ قابل غور ہے اور سوچ سمجھ کر تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قدم بڑھایا جائے۔ فوجی مطالبات کے بعد شہری ضروریات کو ملحوظ رکھنے کے سلسلے میں یہ خاکہ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ امریکہ اور

برطانیہ میں بھی زیر غور ہے کیونکہ وہاں ترکاریاں خشک کرنے کا طریقہ کافی ترقی کر گیا ہے۔

اصل مقصد یہ ہے کہ اصل موسموں میں کثرت و افراط کے باعث بہت سی ترکاریاں گل سڑ کر برباد ہو جاتی ہیں، اس وقت اگر صحیح ضرورت کے علاوہ باقی ترکاریاں خشک کر کے محفوظ کر لی جایا کریں تو یقیناً ان کی افادیت بڑھ سکتی ہے اور وہ ایسے دنوں میں بھی کام آ سکتی ہیں جب فصل کے اعتبار سے ان کا ملنا محال ہوتا ہے۔

اعداد و شمار سے پتہ چلا ہے کہ ۱۹۴۴ء کے دوران میں اٹھارہ کارخانوں نے تقریباً ۲۴۰۵۰ ٹن خشک ترکاریاں تیار کیں اور ان سب سے فوجی ضروریات کو پورا کیا گیا۔

چین میں نئی ریلوے لائن

چین میں ہزاروں میل لمبی ریلوے لائنیں ڈالنے کے نئے خاکے مرتب کئے گئے ہیں تاکہ مختلف بندرگاہوں کے ڈانڈے اندرون ملک کے اہم مرکزوں سے مل جائیں۔ اس طرح ان علاقوں کے مابین بھی سلسلہ قائم ہو جائیگا جہاں کی قدرتی پیداوار اور معدنیات قومی مفاد کے لئے بہت کار آمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ خاکے وزارت رسل و رسائل نے مرتب کئے تھے لیکن سنٹرل پلاننگ بورڈ سے بھی ان کی منظوری حاصل ہو گئی ہے۔ چین کی اقتصادی تعمیر نو کے سلسلے میں یہ پنجسالہ خاکے کا ایک جزو ہے۔ ریلوے لائنوں کی تعمیر کے سلسلے میں زیادہ سامان دوسرے ملکوں سے منگایا جائے گا۔ فی الحال موجودہ آٹھ بڑی لائنوں پر مرمت اور دیکھ بھال کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔

سوویٹ روس میں موٹر کے کارخانے

موٹروں کی صنعت کے سلسلے میں روس کا نیا پنج سالہ خاکہ عوام کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ موٹروں، لاریوں اور ٹرکوں کی تیاری مستقبل قریب میں اسقدر تیزی کے ساتھ عمل میں آئے گی کہ سوویٹ روس دنیا بھر کی تجارتی منڈیوں میں امریکہ اور برطانیہ کا مقابلہ کر سکیگا۔ ابتدائی تجویز یہ ہے کہ اس صنعت کے موجودہ کارخانوں کو حیرت انگیز حد تک وسیع اور طاقتور کر دیا جائے۔ ان کے ساتھ ساتھ وہ کارخانے بھی جو جنگ کے دوران میں تباہ ہو گئے ہیں مکرر تعمیر کئے جائیں۔ اس سلسلے میں ماسکو، گورکی، اور یورال کے تین بڑے کارخانوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائیگا۔ گورکی کا کارخانہ جنگ کے دوران میں بھی بڑی تیزی کے ساتھ ٹینک بناتا رہا ہے۔ اب اس کی رفتار عمل میں اتنا اضافہ کیا جائیگا کہ وہ روزانہ ایک ہزار موٹر تیار کر سکے۔ صرف ایک کارخانے کا یہ عالم ہوگا تو باقی کے متعلق خود اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس اعلان سے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ کارخانوں میں دستور کے مطابق آٹھ گھنٹے روزانہ کام ہوا کریگا یا مختلف ٹکڑیاں چوبیس گھنٹے تک کام کرتی رہا کریںگی۔ یورال کے کارخانے کی قوت عمل بقدر ڈھائی گنی زیادہ کر دی جائے گی۔ اعلان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یاروسلاف کا کارخانہ دنیا بھر کے کارخانوں میں اپنی نظیر آپ ہوگا۔ وہ حد سے زیادہ وسیع اور مضبوط ٹرک تیار کریگا۔ ان کارخانوں سے متعلق تمام نئی مشینیں سائبریا، یوکرین، سفید روس اور جورجیا میں بنائی جائینگی۔ کہا جاتا ہے کہ جنگی انہماک کے باوجود جنرلیسیمو اسٹالن نے اس صنعت کی ترقی ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھی اور اس وقت بھی جب آگ اور خون کی ہولی سرزمین روس پر کھیلی جا رہی تھی، وہ اسی امر پر زور دیتے رہتے تھے کہ نت نئی وضع کی گاڑیاں وجود میں لائی جائیں۔

سوویٹ روس کی سب سے زیادہ نئی وضع کی موٹر کا نام "نصرت" رکھا گیا ہے۔ اسمیں پانچ نشستیں ہونگی، ۷۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلے گی، لیکن خرچ دوسری گاڑیوں کے مقابلے میں نہایت قلیل رہیگا۔

جاپان سے تاوانِ جنگ

تباہ شدہ چین کے مختلف علاقوں سے سینکڑوں افسران یہ اندازہ لگانے کے لئے چنانگ میں جمع ہو رہے ہیں کہ جاپانیوں کے آٹھ سال کے تسلط اور لڑائی جھگڑوں کے دوران میں کسقدر نقصان ہوا تاکہ اسی کے مطابق تاوانِ جنگ وصول کیا جا سکے۔ قیاس کہتا ہے کہ اس سلسلے کی رقم کروڑوں روپے کے برابر ہوگی۔ بعض علاقوں میں پورے کے پورے شہر اور دیہات اس طرح مٹ گئے گویا صفحۂ ہستی پر کبھی ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ ہزاروں مکان، پبلک عمارتیں، کارخانے رفاہِ مشترک کے ادارے، اور عبادت گاہیں کھنڈروں کی صورت میں پڑی ہیں۔ چین کے بعض حصے تباہی اور بربادی کے اعتبار سے یورپ کے خراب ترین میدان جنگ سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ خانماں برباد لوگ بعض جگہ اس لکڑی اور اینٹ پتھر وغیرہ سے اپنے لئے مکان بنانے لگے ہیں جو پناہ گاہوں کی تعمیر میں استعمال ہوئے تھے۔

انجمن رفاہِ مشترک کی سرگرمیاں

رفاہ مشترک کی انجمن چین کے مفلوک الحال خاندانوں کی امداد کیلئے سرگرمی سے مصروف عمل ہے تاکہ خوراک کی فوری قلت ملنے کے ساتھ ساتھ موسم سرما سے بچنے کی صورت بھی ممکن ہو جائے مگر مصیبتوں سے پوری طرح نجات ملنی مشکل ہے۔ ان کے پاس نہ ایندھن ہے نہ کمبل، نہ ادویات۔ یہ انجمن ابتک ضروری اشیاء سے لدے ہوئے آٹھ بڑے جہاز بھیج چکی ہے اور تیس جہاز بھیجے جا رہے ہیں بشرطیکہ سامان لادنے اور اتارنے کے سلسلے میں مزدوروں کی کافی تعداد میسر آ جائے۔ ملک کے دور افتادہ علاقوں تک سامان پہنچانے کی دقت بھی پیش آ رہی ہے کیونکہ حمل و نقل کے ذرائع محدود ہیں۔ یورپ کے ملکوں میں ان دشواریوں کا سامنا نہیں ہوتا۔ ان اندرونی دقتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے انجمن رفاہِ مشترک امریکہ نے برطانیہ اور ناروے کے سمندری اور ہوائی جہاز ۴۰ لاکھ امریکی ڈالر خرچ کر کے ہر ماہ کیلئے مستعار لے رکھے ہیں تاکہ مصیبت زدہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جا سکے۔

میر حسن دہلوی کا غیر مطبوعہ کلام

مجھے اپنے محترم دادا صاحب کی لائبریری سے ایک قلمی نسخہ کلیات میر حسن مرحوم کا دستیاب ہوا ہے جس میں بہت سی ایسی غزلیں اور دیگر اصناف سخن موجود ہیں جو اس وقت تک منظر عام پر نہیں آسکی ہیں۔ اس میں سے ایک غیر مطبوعہ غزل اور دو رباعیاں ناظرین آجکل کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

عبد العلیم۔ شیر کوٹی

غزل

ہجر سے اسکے تنگ آیا ہے جی
ابتو اپنا سخت گھبرایا ہے جی

ایک تو روتا ہوں اپنے دل کو میں
ناصحوں نے اور بھی کھایا ہے جی

وصل کا پیغام اس نے بھیج بھیج
باتوں ہی باتوں میں بہلایا ہے جی

دمبدم آئینے کو دیکھے ہے تو
یاں تو کچھ تیرا بھی للچایا ہے جی

ایک دن کا ہو تو رونا روئیے
ابتو اس رونے سے اوکتایا ہے جی

میں کہا تیرا بھی دل آیا ادھر
ہنسکے بولا کیوں نہیں آیا ہے جی

آتش دل بجھ گئی تھی شعلہ رو
پھر لگا کر تجھ سے سلگایا ہے جی

مجھکو کہتا ہے وہ ظالم دیکھکر
کیوں عبث میری طرف لایا ہے جی

جان کو کھوئے ہوئے بیٹھا ہے تو
میں نے تیرا اے حسن پایا ہے جی

رباعی

آباد ہے ملک دل الم سے تیرے
سرسبز ہے کشت جان قدم سے تیرے
رنج و الم و حسرت و داغ و اندوہ
وہ کیا ہے جو یہاں نہیں کرم سے تیرے

رباعی

خط آوے یا آپ وہ یار آجائے
یا اسکی خبر ہی اک بار آجاوے
اس سے بھی نہیں کام مجھے کچھ لیکن
اس دل کو کسی طرح قرار آجائے

فلسطین کا مسئلہ

فلسطین جیسے مختصر ملک کا جو مشکل مسئلہ آجکل درپیش ہے، اس پر غور کر کے ہر اعتدال پسند شخص اپنے بال نوچ لینے کے لئے تیار ہے اور ہر انتہا پسند کا ہاتھ تیر و تفنگ کی جانب بڑھنے لگتا ہے۔ اس سے متعلق ہر جماعت کا دعویٰ ہے کہ صرف وہی راہ راست پر ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ برطانیہ اور امریکہ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے خواہ کتنا ہی زور لگائیں نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوگا اور کہا یہی جائے گا کہ خلاف انصاف قدم بڑھایا جا رہا ہے۔

ولادت مسیح سے تقریباً نو سو سال پہلے کا ذکر ہے کہ بنی اسرائیل نے یہود پر قبضہ کیا اور تقریباً ایک ہزار سال تک اسے اپنا مسکن بنائے رہے۔ اس کے بعد اہل روما نے آکر اسے تباہ و برباد اور اسرائیلیوں کو منتشر کر دیا۔ ۶۳۲ء میں عربوں نے فلسطین فتح کیا اور اس وقت سے اس پر قابض ہیں۔ اس بات کو تقریباً تیرہ سو سال گذر گئے۔ منتشر ہونے کے وقت سے آج تک یہودی ساری دنیا میں پھیلتے چلے گئے اور وہ ہر اس قوم کے ساتھ جس نے ان کو پناہ دی ایک نئی مماثلت پیدا کرتے گئے اور اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے ذریعہ ان کی مادّی اور ثقافتی ترقیوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ اب چونکہ ان کا کوئی ذاتی وطن برقرار نہیں رہا تھا، اس لئے تاریخ عالم میں انھوں نے ایک عجیب و غریب حیثیت اختیار کر لی اور ہر ملک میں اپنی مذہبی اور قومی خصوصیات کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دوسری قوم میں مدغم ہونے سے اپنے آپ کو بچائے رکھا اور یہی ان کی جیت تھی۔ اب ہر یہودی پورے شد و مد کے ساتھ کوشاں ہے کہ من حیث القوم اس کا وطن ہونا چاہیے۔ چنانچہ قومیت کا احساس اس سے وحشیانہ حرکات کا ارتکاب کرا رہا ہے اور اس کی مشکلات بھی حد درجہ خوفناک صورت اختیار کر گئی ہیں۔ اس طرح وہ ہر لحاظ سے نقصان میں ہے۔ اسے صرف اس لئے دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ وہ اپنے لئے ایک قومی حکومت قائم کرنے پر مصر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ فلسطین میں جو اس کے آبا و اجداد کا وطن ہے ایک یہودی سلطنت کی بنیاد رکھے۔

۱۹۱۵ء میں اہل عرب اپنے ترک آقاؤں کے خلاف بغاوت کرنے کے منصوبے گانٹھ رہے تھے لیکن اتحادیوں کے ساتھ کسی قسم کا سلسلہ پیدا کرنے سے قبل وہ اس امر کا یقین چاہتے تھے کہ آزادی لازمی طور پر حاصل ہو جائے گی اور کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ ایک آقا کے بعد دوسرے آقا کی صرف تبدیلی ممکن ہو جائے۔ چنانچہ عرب کے رہنماؤں اور برطانوی ہائی کمشنر متعینہ مصر کے مابین طویل مراسلت ہوتی رہی اور نتیجہ یہ رہا کہ برطانیہ نے حلفیہ وعدہ کیا کہ تمام مشرق وسطیٰ میں عربوں کی آزادی قائم رکھنے اور تسلیم کرانے میں خاطر خواہ مدد دی جائیگی۔

اس وقت عربوں کے نقطۂ نظر سے مشرق وسطیٰ میں فلسطین بھی شامل تھا کیونکہ وہاں ان کی آبادی نوے فی صدی تھی۔ اس کے بعد عربوں کی معاونت کے ساتھ ساتھ برطانوی فوج نے جنرل ایلن بی کی سرکردگی میں زبردست محاصرہ اور فیصلہ کن لڑائی شروع کر دی۔

۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ کے معتمد خارجی مسٹر اے۔ جے بالفور نے لارڈ روتھ چائلڈ کو خط لکھا جس میں حسب ذیل سرکاری اعلان تھا اور وہ فوراً اتحاد الصہیونین کے علم میں لایا گیا:۔

"بادشاہ سلامت کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لئے ایک قومی وطن قائم کر دینے کے حق میں ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن سہولت بہم پہنچانے کی کوشش کرے گی۔ تاہم یہ اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ ایسی کوئی بات دائرۂ عمل میں نہیں آئے گی جس سے فلسطین کی موجودہ غیر یہودی جماعتوں کے شہری یا مذہبی حقوق کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ یا ان حقوق اور سیاسی حیثیت پر کسی قسم کا اثر پڑے جو اس وقت یہودیوں کو دوسرے ملکوں میں حاصل ہے۔"

اس اعلان کی تصدیق صدر ولسن سے پہلے ہی حاصل کر لی گئی تھی۔

برطانیہ نے ایک طرف عربوں کی آزادی تسلیم کرنے اور اسے تقویت دینے کا تہیہ کر لیا تھا اور دوسری طرف اس امر کی سر توڑ کوشش تھی کہ فلسطین میں یہودیوں کے لئے ایک "قومی وطن" قائم ہو جائے بشرطیکہ ملک کی دوسری جماعتوں کے شہری یا مذہبی حقوق پر کسی قسم کا ناگوار اثر نہ پڑے۔

۱۹۱۹ء میں امیر فیصل نے اہل عرب کی جانب سے ایک صلح کانفرنس طلب کی تاکہ شام و فلسطین کے باشندوں کے مطالبات معلوم کرنے کے لئے ایک وفد بھیجا جا سکے۔ چنانچہ تحقیقات شروع ہوئیں اور وفد مذکور نے اس صہیونی منصوبے کی سخت مخالفت کی کہ فلسطین میں یہودی سلطنت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اور ساتھ ہی تجویز کیا کہ امریکہ سے استدعا کی جائے کہ وہ شام و فلسطین کی مندوبیت اپنے ذمہ لے لے لیکن امریکہ نے صاف انکار کر دیا۔ آخر برطانیہ نے ۱۹۲۲ء میں فلسطین کے سلسلے میں مندوب ہونا قبول کر لیا۔ اس پر مجلس اقوام نے خوب لے دے کی کہ یہ دو عملی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک طرف باشندگان ملک کو بہت جلد فضائے آزادی میں سانس لینے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف یہودیوں کو ان کے قومی وطن کے قیام کی امید دلائی جا رہی ہے۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

ظفر محمود

فلسطین میں رہنے والوں کے مذہبی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑے گا خواہ وہ کسی قوم اور دین سے متعلق ہوں۔ تاہم ۱۹۲۲ء میں جب ایسے یہودی فلسطین میں داخل ہونے شروع ہوئے جو ماہرین علم و فن ہونے کے ساتھ ساتھ مالکان جاہ و ثروت بھی تھے تو عربوں نے باہمی منفعت کا لحاظ رکھتے ہوئے بھائی چارے کے طور پر ان کا خیر مقدم کیا۔

اسی سال حکومت برطانیہ نے اس معاملے سے متعلق اپنا مطمح نظر ایک سرکاری بیان میں واضح کیا۔ اعلان کیا گیا کہ فلسطین میں یہودیوں کے قومی علاقے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باشندگانِ فلسطین پر بحیثیت مجموعی یہودی قومیت عائد کر دی گئی ہے۔ یہودی مہاجرین ملک میں آتے رہیں لیکن یہ ہجرت اعداد و شمار کے لحاظ سے اتنی زیادہ نہ ہو کہ ملک کی اقتصادی صلاحیت جواب دے جائے۔

اس کے بعد دس سال تک نت نئے قضیے کھڑے ہوتے رہے، حالانکہ برطانوی تحقیقاتی وفد اس جگہ موجود رہا اور مستقل وفد مندوبین کی رپورٹیں بحث مباحثے کے بعد برابر شائع ہوتی رہیں مگر ۱۹۳۳ء میں جونہی جرمنی پر ہٹلر کو اقتدار حاصل ہوا فلسطین کی صورت حالات بھی بدل گئی خصوصاً اس وقت سے جب نورمبرگ کے فیصلے کے بعد یہ حکمت عملی طے کر لی گئی کہ یہودی قوم کو خارج الملک کر دیا جائے۔ نتیجہ یہ کہ یہودی بڑی سرعت کے ساتھ اپنا سرمایہ ساتھ لے کر فلسطین میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں ساٹھ ہزار نفوس وہاں پہنچے۔ یہ ان یہودی باشندوں کی تقریباً نصف تعداد تھی جو ۱۹۱۴ء سے قبل فلسطین میں آباد تھے۔ عربوں نے اپنی زمینیں بڑی بھاری رقموں کے عوض یہودیوں کے ہاتھ فروخت کر دینے سے احتراز نہیں کیا تاہم وہ اس ریل پیل سے خوفزدہ ضرور ہو گئے۔ نو واردوں کے خلاف خوف اور نفرت کی آگ جو شروع میں بالکل نہیں تھی، شعلہ بن کر بھڑک اٹھی اور ۱۹۳۶ء میں اہل عرب بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ یہ صورت ۱۹۳۹ء تک قائم رہی اور اس تین سال کے دوران میں برطانوی سنگینوں کو ان عربوں کے خلاف ایک منظم محاذ قائم رکھنا پڑا جن کے آباء و اجداد نے ایلن بی کی جانب اسے ایک زبردست آزادی دہندہ سمجھتے ہوئے نظریں اٹھائی تھیں۔ ۱۹۳۶ء میں پیل کمیشن کے نام سے ایک اور شاہی وفد فلسطین بھیجا گیا تاکہ صورت حالات کا مطالعہ کر کے اس جمود کو توڑنے کے لئے کوئی معقول تجویز پیش کی جائے۔ عمیق تحقیقات کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس مرض کا علاج کسی تیر بہدف دوا سے کیا جائے۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ بظاہر اس مسئلے کا حل اس طرح نہیں ہو سکتا کہ عربوں اور یہودیوں کو وہ سب کچھ مل جائے جو وہ الگ الگ طلب کرتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ فلسطین پر انجام کار کس کی حکومت ہو تو جواب یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی کی بھی نہیں۔ یہ کہ کوئی بڑے سے بڑا مدبر سیاست یہ فرض نہیں کر سکتا کہ دونوں قوموں کے مابین باہمی مفاہمت کی امید اس طرح ہو سکتی ہے کہ برطانیہ وہ چار لاکھ یہودی (جن کی تعداد اب تقریباً پانچ لاکھ ہے) ان عربوں کو سونپ دے جنہیں فلسطین میں داخل ہوتے وقت حکومتِ برطانیہ نے مدد دی تھی جبکہ ایسا کرنے کے لئے مجلسِ اقوام نے بھی منظوری دے دی تھی۔ ورنہ بصورتِ دیگر یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اگر یہودیوں کی اکثریت قائم ہو جائے تو دس بارہ لاکھ عربوں کو ان کا محکوم بنا دیا جائے لیکن چونکہ دونوں میں سے کوئی قوم بھی از روئے انصاف فلسطین پر حکومت کرنے کا حق نہیں رکھتی اس لئے اگر ممکن العمل ہو سکے تو کیوں نہ ہر ایک کو اس کے تھوڑے تھوڑے حصہ پر حکومت کا موقع دے دیا جائے"۔

اس طرح انہوں نے ایک قسم کے عدل سلیمانی کی سفارش پیش کی فلسطین کو تقسیم کر دیا جائے۔ ساحلی علاقے میں جہاں یہودیوں کی آبادی نہایت گنجان

"کچھ نہیں"

جام کا اعتبار کیا کام و دہاں بھی کچھ نہیں
دیر و حرم کو کیا کہوں کون و مکاں بھی کچھ نہیں

سوز نہاں بھی کچھ نہیں حسن عیاں بھی کچھ نہیں
یعنی یہاں بھی کچھ نہیں اور وہاں بھی کچھ نہیں

یہ بھی تری نگاہ سے وہ بھی ترے خیال سے
جوش جنوں بھی کچھ نہیں درد نہاں بھی کچھ نہیں

آپ ہی خود سنبھال لے آ کے حدودِ ناز کو
ہو گیا گم جو میں تو پھر تیرا نشاں بھی کچھ نہیں

خود مرا مدعا بتا خود ہی اسے قبول کر
میری دعا بھی کچھ نہیں میری زباں بھی کچھ نہیں

کر کے تباہ کائنات دردِ نہاں ملا مجھے
آ گئے پاس تم تو اب دردِ نہاں بھی کچھ نہیں

تم ہو سرورِ دل سہی تم ہو سکونِ جاں مگر
یہ مرا دل بھی کچھ نہیں یہ مری جاں بھی کچھ نہیں

ذوق نیاز تک رہیں حسن کی بے نیازیاں
میرا جہاں تو تھا ہی کیا تیرا جہاں بھی کچھ نہیں

میکش اکبر آبادی

تھی، یہودیوں کی آزاد حکومت قائم ہو اور انھیں اختیار دیا جائے کہ وہ جتنے مہاجرین چاہیں اپنے علاقے میں بلالیں اور مل جل کر اپنی صنعتوں کو ترقی دیں۔ دوسرا علاقہ عارضی طور پر برطانیہ کے زیر سرپرستی رہے جہاں عرب اور یہودی تحصیل اراضی کی اسکیم کے مطابق فائدہ اٹھاتے رہیں۔ باقی ملک میں عرب اس آزادی کی فضا میں سانس لیں جس کی تمنا انھیں عرصۂ دراز سے ہے۔

پیل کمیشن اسکیم میں سب سے زیادہ قابل افتخار امر یہ تھا کہ اس نے یہودیوں کو ایک علاقے میں مکمل آزادی دے دی اور دوسرے میں ترقی پانے کا موقعہ دیا۔ اس نے عربوں کو بھی باقی حصے میں آزادی دی اور نہ صرف یہ بلکہ یہ خوف ان کے دلوں سے نکال دیا کہ کہیں یہودیوں کی اکثریت سارے فلسطین پر نہ چھا جائے۔ کیونکہ انتہا پسند صیہونیوں کا مقصد یہی تھا۔ اس اسکیم میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ فلسطین کو جسے ایک اقتصادی قطعے کی حیثیت حاصل ہے تقسیم کر دینے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس طرح نہ صرف تجارتی اور مالی دشواریاں پیدا ہوتیں بلکہ ہر قسم کی ترقی رک جاتی عین ممکن ہے کہ اس مشکل کا کوئی حل وفاق فلسطین کے ماتحت نکل آئے لیکن اس کا صحیح وقت ابھی نہیں آیا ہے کیونکہ دونوں طرف سے کشیدگی اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔

۱۹۳۸ء میں علاقوں کی حدود قائم کرنے اور فلسطین کو تین حصوں میں بانٹنے کی تیار کرنے کے لئے وڈہیڈ (ٹکنیکل) کمیشن بھیجا گیا۔ تقسیم ملک کے سلسلے میں عربوں کا مخاصمانہ طرز عمل بدستور قائم رہا اور اسی لئے انھوں نے کمیشن مذکور کا بائیکاٹ کر دیا۔ بہت سے صیہونین کسی قدر بہتر شرائط پر پیشکش کو قبول کرنے کے لئے تیار تھے لیکن ان میں سے بھی بعض انتہا پسندوں نے کسی قسم کی مفاہمت سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ارض اسرائیل کا ایک ٹکڑا بھی کسی کو دینا نہیں چاہتے تھے۔

تب حکومت برطانیہ نے عرب اور یہودی راہنماؤں کو گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے لندن میں بلایا۔ بہت سی توقعات قائم ہوئیں کہ آخر کار یہ عقدۂ لاینحل اب باہمی راضی نامے سے طے پا جائے گا لیکن بدقسمتی سے کوئی معقول نتیجہ برآمد نہ ہوا عربوں اور یہودیوں نے بیک وقت ایک کمرے میں بیٹھ کر گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔ انتہائی کوششوں کے باوجود سخت جمود و تعطل طاری رہا اور کانفرنس بے نیل و مرام ختم کر دی گئی۔

۱۹۳۹ء میں حکومت برطانیہ نے تقسیم فلسطین کا خیال ہی ترک کر دیا۔ تاہم فیصلہ ہوا کہ اگلے پانچ سال کے دوران میں پچھتر ہزار اور یہودیوں کو فلسطین میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ اس طرح یہودی کل آبادی کا تہائی حصہ ہو جاتے اور ان کی حیثیت کسی قدر مضبوط ہو جاتی ۱۹۴۴ء کے بعد مزید یہودیوں کو عربوں کی رضامندی کے بغیر فلسطین میں داخل ہونا نہیں تھا اور ساتھ ہی وعدہ کیا گیا تھا کہ ۱۹۴۹ء میں سارے ملک کو آزادی دے دی جائے گی بشرطیکہ اس وقت تک صورت حالات زیادہ مستحکم رہیں۔

۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑ جانے کے بعد سے کسی قدر اطمینان و سکون کی فضا قائم رہی اور عرب اور یہودی دونوں مل کر اتحادیوں کے مفاد مشترک کو تقویت پہنچاتے رہے۔

اچانک اس سال یورپ کی جنگ ختم ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک بار پھر مدھم چنگاریاں روشن ہو کر لو دینے لگیں اور فلسطین میں نیا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:۔

(۱) وہ تاریخ قریب آ گئی جبکہ مزید یہودی مہاجرین کے سلسلے میں عربوں کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہو گئی۔ تاہم یہ امر ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ۱۹۳۹ء میں چھڑ جانے والی لڑائی کے باعث مہاجرین کی کل تعداد پچھتر ہزار تک نہیں پہنچی تھی۔

(۲) عربوں اور یہودیوں کے لئے جو محوری خطرہ سامنے تھا، پوری طرح دور ہو گیا اور مشرق وسطی کے ملکوں کو مشرق و مغرب کی کسی بھی لڑائی کے لئے جنگی سرگرمیوں کا اڈہ بننے کی ضرورت باقی نہیں رہا۔

”بے بسی“ ——— منیر کمال (جالندھری)

بھیگے بھیگے سے یہ ہنگام گریزاں اب بھی
آگ برسا کے مرے دل پہ گزر جاتے ہیں

کیا خبر کیا ہے سلگتی ہوئی حسرت کا مآل
شب کی تنہائی میں اکثر یہ خیال آتے ہیں

دور سے منزل سلمیٰ کے وہ دھندلے سے نقوش
جھوم کر روح کی تقدیس پہ چھا جاتے ہیں

درد احساس کے تاروں سے لرز اٹھتا ہے
سوچ میں پھر یونہی گرداب سے بن جاتے ہیں

میرے سپنوں میری یادوں کی سیہ کاری
جھلملاتے ہوئے مہتاب سے بن جاتے ہیں

رشتۂ گل میں پرو دیتی ہے شبنم آنسو
چہرۂ غم پہ حسین خواب سے بن جاتے ہیں

کہکشاں چاند کے جائیں گے کہاں سیارے
چاند تاروں سے برسنے دے مئے نور ابھی

تشنگی درد کی۔ بیداد کی یہ روح کسک
سایۂ تیغ و تبر میں ہے سر شور ابھی

اپنے مرکز کی طرف دوڑ رہی ہے ظلمت
کارواں سنگ نشاں سے ہے بہت دور ابھی

میری بے ذوق زیست کی تجھے کیا پروا
اور پامال ہے ہر راہ میں نکہت میری

اوس کے قطروں کی مانند اڑی جاتی ہے
سیل ایام کے شانوں پہ لطافت میری

بس ہیں میرے نہ ستارے ہی۔ نہ اعجاز سحر
میرے فردوس میں گلپوش ہے ظلمت میری

(۳) سان فرانسسکو کانفرنس میں فیصلہ ہوا کہ مجلس اقوام کو ختم کر کے ایک نیا نظام عالم قائم کیا جائے جس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بھی ایک نمایاں رکن کی حیثیت حاصل ہو۔

(۴) یورپ میں اختتام جنگ کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ تمام دنیا کے لئے حل طلب ہو گیا کہ تارک الوطن لوگوں کا کیا حشر ہو۔

(۵) مذکورہ بالا نمبر ۲ کو مدِنظر رکھتے ہوئے صدر ٹرومین نے حکومت برطانیہ کی رضامندی چاہی کہ ایک لاکھ اور یہودیوں کو فلسطین میں داخل ہونے کا حق دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ تعداد کا تعین یہودیوں کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر کیا گیا تھا اور ان امکانات کا خیال نہیں رکھا تھا کہ فلسطین میں کتنے لوگوں کی کھپت ہو سکتی ہے۔ یہودیوں کی مزید ہجرت کے سوال پر حسبِ ذیل اصولوں کے پیشِ نظر غور و خوض کرنا ہوگا۔

(۱) برطانوی اصول جو سنہ ۱۹۲۲ء میں بیان کیا گیا تھا کہ یہودی مہاجرین ملک میں آتے رہیں لیکن یہ ہجرت اعداد و شمار کے لحاظ سے اتنی زیادہ نہ ہو کہ ملک کی اقتصادی صلاحیت جواب دے جائے۔" یہ اقتصادی صلاحیت کسی مقررہ مقدار میں نہیں تھی بلکہ ظاہر تھا کہ وقتاً فوقتاً بدلتی رہے گی۔ ہجرت کے باعث فلسطین میں یہودی آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ عربوں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا لیکن اسے کوئی تاریخی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ جب یہودیوں کے نئے صنعتی ادارے کھلنے لگے تو فلسطین کی بحالی میں اضافہ ہوا اور فالتو ملازمتوں کے امکانات نکل آئے۔

(۲) اس کے بعد یہودیوں کی ہجرت صرف اسی وقت عمل میں آ سکتی ہے جب پہلے سے عربوں کی رضامندی حاصل کر لی جائے۔

(۳) پروفیسر ہارلو کے بیان کے مطابق عرب ریاستوں نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ یورپ سے آنے والے یہودیوں کو اپنے ملک میں قیام کی اجازت دینے کے لئے رضامند ہیں بشرطیکہ یہ صورت ایک منظم بین الاقوامی اسکیم کے ماتحت ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ قوم یہود کی موجودہ زدہ حالت کو بہتر بنانے کے امکانات پر بالکل غیر جانبدار ہو کر غور و خوض کرنا چاہئے۔

نکاتِ شیکسپیئر

قسم لے ماہرو! مت چاند کی کھا — ہے فطرت میں تلوّن آشنا چاند
بدلتا ہے مہینے کے مہینے — نئی صورت دکھاتا ہے سدا چاند
کہیں ایسا نہ ہو تیری محبت — بنے تغیّر کے افلاک کا چاند

Romeo and Juliet, Act 2, Sc. 2

جو ناپاک تخیل ہے اس پہ لعنت — ہیں نفریں کے قابل ہوس عیش و عشرت
ہوس کیا ہے؟ اک آتشِ خونچکاں ہے — بُری خواہشوں سے جو ہوتی جواں ہے
جلا اٹھتی ہے دل میں بھڑکتی ہے یکسر — ہوا دیتے ہیں جب خیالات ابتر

Merry Wives of Windsor, Act 5, Sc. 5

آہیں نہ بھرو، تم اے حسینو! — ایسا نہ کرو، تم اے حسینو!
ہے مرد کی ذات ازل سے عیار — دو کشتیوں میں ہمیشہ سوار
اس کا ہے یہی وطیرہ دائم — اک بات پہ کب رہا یہ قائم!

Much Ado About Nothing, Act 2, Sc 3

تلوک چند محروم

"ساجن سے ---!" — نسیمہ سوز

کوئلیا جب بن میں گائے — بھولی بسری یاد دلائے
آنکھ میں آنسو بھر بھر آئے — دھیرے دھیرے لب پہ آئے
ہائے منوا ہائے!

پریت کا ناتا جوڑ کے ساجن — من مورکھ کو توڑ کے ساجن
مجھ کو روتا چھوڑ کے ساجن — کس نگری کو جائے
ہائے منوا ہائے!

جیسے کوئی پنچھی آ کے — پھول کو اپنا میت بنا کے
پھر اڑ جائے گیت سنا کے — ایسے تم بھی آئے
ہائے منوا ہائے!

دکھیا من کیسے بہلاؤں؟ — نینوں سے میں نیر بہاؤں
سپنا میں تم کو پا جاؤں — پھر نینا کھل جائے
ہائے منوا ہائے!

سنہری ساڑی

ڈرامہ

آئی۔اے۔چودھری

افراد۔

سیٹھ یوسف:۔ ایک دولتمند تاجر
گلنار:۔ ایک تعلیم یافتہ نوعمر عورت
کریم:۔ سیٹھ کا ملازم
مسز فیروز:۔ شہر کے دولتمند طبقہ کی ایک معزز خاتون
منیجر:۔ ایک چھوٹے ہوٹل کا مالک

شہر بمبئی

منظر اوّل

(سیٹھ یوسف کی دوکان)

گلنار:۔ (داخل ہوتے ہوئے) مجھے ایک معمولی قیمت کی ساڑی چاہئے۔

سیٹھ:۔ آئیے۔ آئیے۔ کریم آپ لوساڑیاں دکھاؤ۔ کل جو مال کارخانہ سے آیا ہے اس کے دو چار جوڑے لے آؤ۔ دیکھئے چیز اچھی ہے۔ کپڑا ملاحظہ ہو، بارڈر کتنا پیارا ہے۔ ہر کام میں ملے گی اور مال دیکھتے ہوئے دام کچھ بھی نہیں صرف اسٹھ روپے پانچ آنے۔

گلنار:۔ مگر سیٹھ جی مجھے تو پچاس سے اونچی نہیں چاہئے۔

سیٹھ:۔ بہتر۔ بہتر۔ ملاحظہ ہو۔ کیسا نکھرا ہوا فیروزی رنگ ہے۔ کوئی اڑتالیس روپے آٹھ آنے میں پڑے گی۔ معاف کیجئے گا۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کو اپنے ہی واسطے چاہئے یا کسی اور کو دینا ہے۔

گلنار:۔ چاہئے تو اپنے ہی واسطے تھی۔

سیٹھ:۔ تو پھر یہ تینتیس والی لیجئے۔ دام تو ضرور ہلکے ہیں مگر اس کا چمپئی رنگ بس آپ پر کھل کر رہ جائے گا۔ میں آپ کا قیمتی وقت خراب تو نہیں کر رہا ہوں۔

گلنار:۔ نہیں نہیں نوازش کا شکریہ اکثر آپ کی تعریف سنتی تھی۔ آپ اس معاملہ میں کافی شہرت پا چکے ہیں۔ اور آپ سے بہتر مشورہ دینے والا اس شہر میں تو کوئی ہے نہیں۔

سیٹھ:۔ یہ سب گاہکوں کی قدر دانی ہے۔ ورنہ میں کس قابل ہوں۔ بچپن میں ڈرائنگ سے دلچسپی تھی وہی شغل اب تک چلا آتا ہے۔ برا بھلا جو سمجھ میں آیا اپنے خریداروں سے کہہ دیتا ہوں۔ کوئی سنتا ہے کوئی نہیں۔ تجارت سے نفع ضرور اٹھاتا ہوں۔ مگر آخر کس کے لئے۔ نہ بیوی نہ بچے۔ سال ایک کر مجھے خوشی تب ہی ہوتی ہے جب یہ اطمینان کر لوں کہ جو چیز جسے دی جاوے اس کے لئے مناسب بھی ہو۔

گلنار:۔ سیٹھ جی سنتی ہیں یہی ہوں کہ گاہک کو مشورہ دیتے وقت آپ اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں کرتے۔

سیٹھ:۔ مگر سنتا کون ہے۔ آج ہی مسز فیروز کی گیارہ ہزار کی ساڑی بن کر آئی ہے۔ وہ کسی ریاست میں مہمان جا رہی ہیں۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ ہلکے کاسنی رنگ میں موتیوں کا پلین بارڈر اچھا رہے گا مگر انہیں ضد ہی تو ہو گئی۔ کہ انارجی رنگ۔ موتیوں کے جال کا بارڈر نیلم اور یاقوت کے آویزے۔ تیس سال کے کلک بھگ سن ہو گا۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ ایسی ساڑی ان پر کیا خاک جچے گی۔ ہاں البتہ گستاخی معاف۔ اگر آپ اسے پہن کر میرے شو روم میں ان چھپنی کی پتلیوں کے برابر ایک گھنٹہ بھی کسی شیشہ کی الماری میں کھڑی ہو جائیں تو آپ دیکھیں گی کہ لیڈیز اور جنٹس کے ابھی ابھی ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں کہ نہیں۔ دوکان کے سامنے کہیں تل رکھنے کو جگہ نہ ملے گی (لمبی سانس لے کر) تناسب بھی عجب چیز ہے۔

گلنار:۔ سیٹھ جی (گہری سانس لے کر) اپنی اپنی قسمت ہے۔ گیارہ ہزار کی ساڑی پہننا تو دور رہا۔ آج پہلی ہی بار آپ کے منہ سے اتنی قیمتی ساڑی کا ذکر سنا ہے۔ اچھا یہ دام لیجئے اور تینتیس والی چمپئی ساڑی بندھوا دیجئے۔

سیٹھ:۔ ابھی لیجئے۔ ساڑی ساتھ جائے گی یا کسی ایڈریس پر بھیج دوں۔

گلنار:۔ شکریہ اس وقت مجھے ایک دوسری جگہ جانا ہے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو کمرہ نمبر گیارہ۔ دلکشا ہوٹل۔ ہرمزجی روڈ پر گلنار کو بھجوا دیجئے۔

سیٹھ:۔ بہت خوب۔ ہاں خوب یاد آیا۔ مسز فیروز کے آرڈر کی ساڑی ذرا دیکھتی تو جائیے۔ کاش کہ آپ مجھے اس کی آدھی لاگت ہی دے سکتیں۔ (جواب کا انتظار کئے بغیر) کریم آج جو ساڑی کارخانہ سے آئی ہے اٹھانا۔

گلنار:۔ کیوں تکلیف کیجئے گا سیٹھ جی۔

کریم:۔ سرکار۔ آج بس ایک ہی ساڑی بن کر آئی ہے مسز فیروز کے آرڈر کی ہے۔

سیٹھ:۔ (ساڑی اٹھاتے ہوئے) سامنے کا پلو ملاحظہ ہو۔

گلنار:۔ اس کا کہنا ہی کیا۔ جگمگا رہا ہے۔ کناری کی بیل کتنی سبک ہے۔ اور اتنے بھاری کام پر بیل کو خوب نبھایا ہے۔

سیٹھ:۔ تو کیا آپ.... اسے نصف قیمت... میرا مطلب ہے پانچ ہزار میں بھی لینا پسند کریں گی۔

گلنار:۔ سیٹھ جی۔ (دابی ہوئی سانس لے کر) اگر میرے پاس دولت ہوتی تو اس کے گیارہ ہزار ہی دیتی۔ اچھا اجازت ہے۔

سیٹھ:۔ جائیے گا۔ بہت خوب۔ کبھی کبھی یہ دوکان یاد کر لیا کیجئے گا۔ عنایت کا شکریہ۔

—•—

منظر دوئم

(دلکشا ہوٹل نمبر ۱۱)

کریم :- دلکشا ہوٹل یہی ہے سرکار-
منیجر :- ہاں۔ ہاں۔ چاہئے کیا ہو۔
کریم :- کمرہ نمبر گیارہ-
منیجر :- وہ کمرہ تو اٹھا ہوا ہے کوئی اور نمبر بولو-
کریم :- ہوٹل ہی کس مشکل سے ڈھونڈ سکا نمبر کیا بولوں گا۔ پٹنے کا ڈر نہ ہوتا تو یہ نمبر بھی بھول جاتا۔ سرکار آپ نے بھی کہاں ہوٹل کھولا ہے گرینڈ ہوٹل میں کھولا ہوتا تو دن میں دس بیس پھیرے بھی ہوتے۔ اچھا کمرہ نمبر گیارہ تبلا تو دیجئے۔
منیجر :- اتنا بھی نہیں سمجھتے یہی سامنے والا کمرہ ہے۔ مگر اس میں تو مس گلنار ٹھہری ہوئی ہیں-
کریم :- تب ہی تو میں بھی گنتا آیا ہوں۔ یہ تو تیسرا ہی کمرہ ہے۔ اور سرکار سچ پوچھئے تو آپ کے ہوٹل میں گیارہ کمرے تو مجھے دیتے بھی نہیں پھر بھلا نمبر گیارہ آیا کہاں سے۔ مگر نام یہی ہے جو آپ نے تبلایا۔ مس گلنار-
(زور سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے-)

گلنار :- (دروازہ کھول کر) کون کریم-
کریم :- جی سرکار سیٹھ یوسف ہارون نے یہ پیکٹ دیا ہے-
گلنار :- کریم تمہیں بہت تکلیف ہوئی۔ لو یہ رکھو (چونی دیتی ہے)
کریم :- سرکار آپ ہی کا کھاتے ہیں۔ اس کی ضرورت کیا تھی۔ اچھا سلام-
گلنار :- (دروازہ بند کرتے ہوئے) یہ پیکٹ کتنا بھاری ہے سیٹھ جی نے دھوکہ میں کہیں گیارہ ہزار والی ساڑی تو نہیں بندھوا دی (پیکنگ توڑتی ہے) بنڈل کتنا خوبصورت ہے۔ اوہ یہ تو وہی جگمگاتی ہوئی ساڑی ہے۔ بڑا دھوکہ ہوا۔ انھوں نے کریم سے کہا ہوگا۔ اس نے اسے باندھ دیا۔ مگر اب تو وہ چلا بھی گیا شام کو جاکر واپس کروں گی۔

منظر سوم

(ساڑی کی دوکان)

مسز فیروز :- (داخل ہوتی ہیں) ول سیٹھ ہمارا ساڑی دلواؤ-
سیٹھ :- آہا مسز فیروز۔ آئیے۔ آئیے۔ آپ ہی کا انتظار تھا۔ اگر آپ خود نہ آجاتیں تو میں آپ کے یہاں حاضر ہونے کو اپنی کار مانگ چکا تھا۔
مسز فیروز :- تھینکس۔ جلدی کرو سیٹھ۔ اسوقت ہم بات کم مانگتا ہے - ایٹ فائٹی فائیو پر ہمارا ٹرین جاتا ہے۔ اور ابھی بہت سارا پیکنگ کرنا ہے-
سیٹھ :- سرکار۔ یہی تو میرا بھی مطلب ہے۔ آج یوں بھی دیر ہوگئی ہے کل اسی ٹرین سے جایئے-
مسز فیروز :- نہیں نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہم پروگرام بدلنا نہیں مانگتا۔ ساڑی پلیز۔ کوئک۔ کوئک-
سیٹھ :- آج پہلی مرتبہ مجھے آپ سے شرمندہ ہونا پڑا ہے۔ جلدی میں سر کام بگڑ جاتا ہے۔ آپ کی ساڑی کی تیاری میں بھی جلدی کی تھی۔ جانتا تھا کہ آپ آج ہی جا رہی ہیں۔ مگر بدقسمتی کاریگروں نے پوری ایک کناری کی بیل الٹی بنا ڈالی۔ مجبوری کا نام صبر ہے۔ اب کل چھ بجے شام سے پہلے آپ کے آرڈر کی تعمیل ممکن نہیں۔ جو پنالٹی آپ تجویز کریں دینے کو حاضر ہوں۔
مسز فیروز :- ہوپ لیس۔
گلنار :- (مع ایک پیکٹ کے اچانک داخل ہوتی ہے) معاف کیجئے سیٹھ جی۔ میں کچھ دیر سے پہونچ سکی۔ معلوم ہوتا ہے کریم سے کچھ غلطی ہوگئی۔ وہ مجھے میری تیس والی ساڑی کے بدلے آپ کی گیارہ ہزار والی ساڑی دے آیا۔ جو شاید آپ نے اسی کے ہاتھ مسز فیروز کو بھیجی ہوگی پیکٹ بدل گیا دیکھئے نا وہی ہے کہ نہیں۔
کریم :- نہیں نہیں مس صاحب مجھے سیٹھ نے صرف ایک ہی پیکٹ اور بس آپ ہی کے واسطے دیا تھا۔ اور پیکنگ خود اپنے ہی ہاتھوں کیا تھا چھوٹے آدمیوں سے اتنی بڑی بھول چوک نہیں ہوتی-
مسز فیروز :- فنی انڈیڈ (گلنار سے) چھوکری-
گلنار :- (جلدی سے) مجھے گلنار کہتے ہیں-
مسز فیروز :- آل رائٹ مس گلنار۔ کیا میں ساڑی دیکھ سکتی ہوں-
گلنار :- شاید اسوقت مجھے مسز فیروز سے بات کرنے کی عزت حاصل ہے-
مسز فیروز :- اسٹرینج۔ تو آپ مجھے جانتی ہیں۔ اجازت ہے۔ ساڑی دیکھوں-
گلنار :- شوق سے میں سمجھتی ہوں کہ یہ آپ ہی کی ہے-
مسز فیروز :- بنی تو میرے آرڈر سے ضرور تھی مگر سیٹھ نے آپ کو بخشش دی ہے آپ اسے پہن کر آئی ہوتیں-
سیٹھ :- مسز فیروز۔ غلطی میری ہے اور میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ جو کہنا ہو مجھے کہئے۔ مگر آپ کو مس گلنار پر محض اس لئے کہ وہ آپ جیسی دولتمند نہیں طعنہ نہ توڑنا چاہئے-
مسز فیروز :- (ساڑی کا پیکٹ زور سے فرش پر پھینک کر) بالکل میں نے ہی تمہیں گمنامی سے سوسائٹی میں ابھارا تھا اور اب میں ہی تمہارے

کرتوتوں کو دنیا پر ظاہر کرکے تمہیں اور تمہارے رپیٹیشن کو ملیامیٹ کردوں گی۔
(زور سے زمین پر پاؤں پٹک کر ادھا باز جھلیا۔ (تیزی سے نکل جاتی ہے)
گلنار: سیٹھ جی معاف کیجئے میں بہت شرمندہ ہوں مجھ سے جان بوجھ کر غلطی نہیں ہوئی۔ (جاتی ہے)

منظر چہارم

(بمبئی کی ایک تنگ گلی)

پھیری والا۔ جوڑے دھوتی کے۔ کپڑا قمیص وال۔ ململ دوپٹہ وال۔ مالکین۔ لٹھا۔ ڈوریہ۔

ایک زنانی آواز۔ کپڑے والے۔ اوکپڑے والے۔ ادھر آنا۔

پھیری والا:۔ لایا مہ کار (دم سے گٹھری زمین پر اتارتا ہے اور پنجی مار کر بیٹھ جاتا ہے) جوڑے دکھلاؤں یا جمہ کا کپڑا۔

زنانی آواز۔ ہائیں۔ کون سیٹھ یوسف ہارون۔

پھیری والا۔ (جو در اصل سیٹھ یوسف ہے) گلنار... میری... میری گلنار۔

گلنار:۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ میری آنکھیں ضرور دھوکہ کھا رہی ہیں۔

سیٹھ:۔ اگر تم یہ نہ دیکھتیں جو دیکھ رہی ہو۔ تو آج دس سال بعد میری آنکھیں تمہیں اس تنگ و تاریک گلی میں کیونکر ڈھونڈھ نکالتیں۔

گلنار۔ اٹھئے سیٹھ جی اٹھئے اندر چل کر بیٹھئے میں آپ کی گٹھری اٹھاتی ہوں۔ یہ تو بہت وزنی ہے۔ اس میں وہ گیارہ ہزار والی ساڑی بھی تو نہیں باندھ رکھی۔

سیٹھ:۔ باندھ نہ رکھتا تو وہ دے کسے دیتا؛ ورنہ وہ تمہاری تنبیہ والی بھی ہے جو تم میری دوکان پر چھوڑ آئی تھیں۔ تمہارے جانے کے بعد سارا شہر چھان مارا۔ دلکشا ہوٹل کے سینکڑوں ہی پھیرے کئے مگر تم نہ ملنا تھا نہ ملیں ہاں اتنا پتہ ضرور چلا کہ کہیں باہر سے آکر رہی تھیں اب ملازمت کر لی ہے اور کوئی چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا ہے۔ ادھر مسٹر فیروز نے گاہک کو جھوٹ کا کر اور ناشہ دغ لگا دیا بس میری اس ٹوٹ گئی کمر آکر کارخانہ اونے پونے سات چار لاکھ میں فروخت کر دیا بس ایک ساڑی رکھ لی تھی نوٹ اور وہ ساڑی گٹھری کی تہ میں اب بھی ہے بس مسکین کا کپڑا لے لیا تھا اسی گز لوٹ تھا ہر دن بھر شہر کی خاک چھان کر تیسا اگو جہاں جگہ ملی پڑ رہتا ہوں۔

گلنار:۔ آپ نے بڑی مصیبت جھیلی ہے مجھے اس کی کیا خبر تھی یہاں دل کہتا تھا کبھی نہ کبھی مل رہیں گے آپ کے یہاں سے آنے کے دوسرے ہی دن مجھے ایک چھوٹے سے اسکول میں لڑکیاں پڑھانے کی جگہ مل گئی تھی اب بھی وہیں پڑھاتی ہوں اور اسی مکان میں پڑ رہتی ہوں۔ آپ منہ ہاتھ دھوئیے میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں اور اب نوکری چھوڑ کر بس آپ ہی کی خدمت کیا کروں گی۔

سیٹھ:۔ نہیں نہیں۔ میری گلنار مجھے اب نہ بہلاؤ۔ پہلے یہ ساڑی پہن کر مجھے دکھلا دو۔ تب کچھ اور سنوں گا؎

اُپندر ناتھ اشک

ایک ایسی بے تکلف محفل میں جہاں معنفوں کی شخصیتوں کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں، میں نے ایک ایسے صاحب سے جنھوں نے اپندر ناتھ اشک کی تحریروں سے اُن کی شخصیت کی ذہنی تصویر بنا رکھی تھی یہ پوچھا کہ بھلا آپ کے نزدیک اپندر ناتھ اشک کی عمر کیا ہوگی؟ ان صاحب نے سوچنے کی ضرورت محسوس کئے بغیر پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ فرما دیا "یہی کوئی ۴۵، ۴۶ برس"۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے کسی قدر رعایت برتی ہے اور ۵۰، ۵۵ کہنے کے بجائے ۴۵، ۴۶ کہہ دیا۔ وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اول تو اشک کے افسانوں، ڈراموں اور ناول کے اخلاقی اور اصلاحی انداز نے انھیں اس نتیجہ پر پہنچایا ہے اور دوسرے انکی تصانیف کی تعداد نے۔

اشک کی تصانیف کی تعداد سے آپ بھی واقف نہیں ہونگے — ہندی میں اب تک ان کی آدھے درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ نظموں کے دو مجموعے کہانیوں کے دو مجموعے، ایک ناول، چند ڈرامے اور ان کے علاوہ ایک نیم تنقیدی سی کتاب۔ اور اردو میں ایک ایکٹ کے ڈراموں کے دو مجموعے (پاپی اور چرواہے) ایک ناول (ستاروں کے کھیل) اور افسانوں کے سات مجموعے — نورتن، عورت کی فطرت، ڈاچی، کونپل، قفس، ناسور اور چٹان۔

ہندی میں اشک کا شمار بقول شخصے "صفِ اول" کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ شاعری میں انھیں "صفِ اول" میں جگہ نہیں ملی، لیکن سُنا ہے کہ جب ان کا ناول "گرتی دیواریں" شائع ہو جائیگا وہ ناول نگاروں کی بھی "صفِ اول" میں آجائینگے لیکن مجھے شاید سُنی سنائی باتیں کہنے کا حق نہیں اور اس لئے میں آپ کو ان کے اُردو کے ڈراموں، افسانوں اور ناول کے متعلق کچھ بتاؤں گا۔

اشک کے افسانوی خمیر میں باقی ہر چیز کے مقابلہ میں دو باتیں نمایاں طور پر شامل نظر آتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ناول، ڈرامہ، یا افسانہ لکھنے سے پہلے، لکھنے والے کے ذہن میں اسکا کوئی نہ کوئی اصلاحی یا اخلاقی مقصد ضرور ہونا چاہیئے۔ اور دوسری بات یہ کہ اس اصلاحی یا اخلاقی مقصد کے اظہار میں خواہ اور کچھ ہو یا نہ ہو افسانویت کا ہونا ضروری ہے۔ اشک کی افسانوی دنیا (جس میں ناول، ڈرامے اور افسانے سب شامل ہیں) کی تعمیر ان دو چیزوں سے ہوئی ہے، اصلاحی مقصد اور افسانوی انداز۔

"ستاروں کے کھیل" کا بنیادی خیال ہماری زندگی کی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ زندگی کی اس حقیقت کو اشک نے زندگی کی صحیح فضا میں پیش کیا ہے اور اس فضا میں چلنے پھرنے والے کردار اپنی معمولی معمولی باتوں میں بھی ہماری جانی پہچانی شخصیتوں کے عکس معلوم ہوتے ہیں۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں، جو کچھ کہتے ہیں اور ان دونوں سے الگ جو کچھ سوچتے ہیں، اس کے ایک ایک حرف میں زندگی چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ اور اس چلتی پھرتی زندگی کے بدنما پہلوؤں پر ناول نگار کی اخلاقی اور اصلاحی ضربیں، زندگی کی حقیقت سے اور بھی زیادہ قریب سے آتی ہیں۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ کہانی میں ہر جگہ اصلاح کا جوش، اور اسے دلچسپ اور عام پسند بنانے کی زبردست خواہش کا احساس بھی موجود ہے۔ یہ ساری باتیں ناول کو دلچسپ بنا سکتی ہیں لیکن ان سب سے زیادہ اہم ایک چیز اور ہے — لفظ، نظر کی وسعت اور گہرائی یہ اس ناول میں سرے سے مفقود ہے اور میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ناول نگار اصلاحی جذبہ کے جوش میں اکثر مصنف کی بلند اور غیر جانبدارانہ سطح پر چھوڑ کر، زندگی کی عام سطح پر اتر آتا ہے اور یہاں آکر اس کی نظر میں نہ وسعتیں سما سکتی ہیں نہ گہرائیاں۔ جن لوگوں نے اشک کے ناول "گرتی دیواریں" کے جستہ جستہ حصے دیکھے یا اس کے مختلف باب پڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اشک چاہیں تو اس جذباتی کمزوری پر قابو پاکر وہ زندگی کی گہرائیوں میں اتر سکتے ہیں لیکن ستاروں کے کھیل میں انھوں نے اپنے آپ کو اوپر کی سطح میں اس درجہ گم کر دیا ہے کہ نچلی، زیادہ گہری اور زیادہ وسیع سطحوں کا وجود انکے لئے بے معنی بن گیا۔

ڈراموں میں اشک نے اکثر اپنی اس جذباتی کمزوری پر فتح پالی ہے۔ اور یہاں بھی گو اصلاح کا جذبہ باقی ہر جذبہ پر غالب ہے، لیکن فن عموماً اس جذبہ کا ہم عناں ہے۔ اور اسی لئے باتوں میں سطحیت نہیں، گہرائی ہے۔ لہجہ میں کھوکھلا جوش نہیں، خلوص ہے۔ اور ڈرامہ کے عام انداز میں زندگی بھی ہر جگہ فن کی نزاکتوں کی تابع ہے۔ "پاپی" ان ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے اور اس مجموعے کے ڈراموں کو پڑھ کر آسانی سے یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ لکھنے والا ایک خاص قسم کی جذباتی کشمکش میں مبتلا ہے — ایک طرف زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں، اور اصلاح کار فطرت ان تلخ حقیقتوں پر کاری ضربیں لگانے کے لئے بے چین اور بے قرار۔ اور دوسری طرف فن کا پاسبان جو اس بے چینی اور بے قراری کو مناسب حدوں کے اندر رکھنا چاہتا ہے۔ اس کشمکش میں عموماً اصلاح کار فطرت کی جیت ہوتی ہے اور جب جذباتی جوش شاعرانہ اور خطیبانہ، تندی اور تیزی دکھا کر اپنی تسکین کا سامان مہیا کر لیتا ہے۔ دوسرے مجموعے "چرواہے" میں یہ کشمکش تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ یہاں جذباتی جوش میں گہرائی اور معنویت ہے، اصلاحی جذبہ میں خلوص اور سچائی ہے۔ اور اظہار میں نری شاعری نہیں بلکہ ایک چیز اور بھی ہے۔ ہر ڈرامہ ایک لطیف کنایہ ہے جو تھوڑی سی بات کہہ کر بہت سا اثر پیدا کرتا ہے۔ تصویر کے نقوش کو داغ کئے بغیر اس میں ایک گہرے نقش کی ساری رعنائیاں بھر دیتا ہے۔ اور اس طرح سطحی جذباتیت کی نہیں، فن کی تسکین ہوتی ہے فنی حیثیت سے "چرواہے" کے افسانے بلاشبہ "پاپی" کے افسانوں سے بہت آگے کی کسی منزل کا پتہ

وقار عظیم

دیتے ہیں —— یہاں سب کچھ فن کا تابع ہے۔

اشک نے ناول لکھا، ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے —— اور ان ایک ایکٹ کے ڈراموں سے گنتی میں کہیں زیادہ اور انداز میں کہیں زیادہ متنوع افسانے لکھے اور اس لئے اردو ادب نے انھیں ناول نگار اور ڈراماٹسٹ کے مقابلہ میں افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ جانا پہچانا ہے —— اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انکی افسانہ نگاری کی عمر اب ابرس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔

اپند ناتھ اشک اردو میں اس زمانہ سے افسانے لکھتے ہیں جب کتابوں سے انتساب اور ان کے مقدمے دونوں نثر میں نہیں نظم میں لکھے جاتے تھے اور افسانوں میں صرف تاریخ، اخلاق، مذہب اور شاعری کی ترجمانی کی جاتی تھی۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "نو رتن" کے نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسرا مجموعہ عورت کی فطرت ۱۹۳۳ء میں۔ اس مجموعے کے زیادہ افسانے معاشرتی ہیں اور ان کے طرز پر جابجا پریم چند کے ابتدائی رنگ کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ نفس مضمون میں بھی اور طرز بیان میں بھی۔ ان مجموعوں کے تقریباً سارے افسانوں کو پڑھنے والے اب بھول چکے ہیں اور میرے نزدیک یہ چیز افسانہ نگار اور ناظر دونوں کے لئے فائدہ کی ہے۔

اشک کو اردو داں طبقے نے نئے افسانہ نگار کی حیثیت سے انکی کتاب "ڈاچی" کے ذریعہ پہچانا ہے۔ ڈاچی کے ان افسانوں کو چھوڑ کر جن کا پس منظر تاریخی اور نفس مضمون اور مرکزی خیال اخلاقی اور اصلاحی ہے، اکثر افسانوں کا ماحول سیاسی ہے اور اس سیاسی ماحول میں بہت سی چیزیں مل جل کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ نان کوآپریشن کی وہ تحریک جس کے شعلوں کی لپک دوکانوں اور بازاروں سے بڑھ کر اسکولوں اور کالجوں میں پہنچی۔ پرجوش تقریریں ہوئیں۔ دلوں میں گرمی پیدا ہوئی، کالج بند ہو گئے اور جلوس نکلنے لگے۔ اسکولوں اور کالجوں سے بھی آگے بڑھ کر یہ آگ گھروں کی چار دیواری میں پہنچ گئی اور عورتیں جو پہلے صرف گھروں کی زینت تھیں پلیٹ فارم پر آگئیں۔ سیاسی تحریک میں ایسی تندی و تیزی پیدا ہو گئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ کانگریس، حکومت کے قانونوں کی خلاف ورزی، جلوس، بندے ماترم، اور گرفتاریاں —— اور پھر اس کے بعد نہ معلوم کیسے ان ہندو مسلمانوں میں اختلاف جو ایک جان دو قالب ہو رہے تھے اور پھر اس اختلاف کے بعد بلوے، خونریزیاں اور جیلیں۔ سیاسی تحریک کا شعلہ سرد ہو گیا۔ ڈاچی کے زیادہ افسانوں میں ہندوستان کی سیاسی زندگی کے خارجی پہلو کی بہت سی تصویریں ہیں۔ اردو کے نئے افسانہ نگاروں میں سے بعض ایسے ہیں جنھوں نے اس سیاسی تحریک کے نفسیاتی پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے اور ان جلوسوں اور بلووں کی منظر کشی کرنے سے زیادہ ان کے پیچھے چھپی ہوئی مصلحتوں اور ان مصلحتوں سے زیادہ ان کی جذباتی اور نفسیاتی بنیادوں کو افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ ایسے افسانے فنی اعتبار سے زیادہ موثر ہیں۔ لیکن اشک کے افسانے تصویر کے ظاہری پہلو کو نمایاں کرتے ہیں اور اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں اس ظاہری پہلو کی اتنی زیادہ، اتنی صاف اور صریح تصویریں نہیں ملتیں جتنی اشک کے یہاں۔

اشک نے سیاسی پس منظر کے جتنے افسانے ڈاچی میں لکھے ہیں ان پر ہر جگہ ایک گہرا اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر چھایا ہوا ہے اور اسی اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر نے اردو کو ایک خاص طرح کے کردار سے روشناس کرایا ہے۔ سیاست کے ساتھ ساتھ انھوں نے سیاست کے نگہبانوں کو بھی دیکھا ہے اور اس کی سیرت کے جو مرقعے ہیں ڈاچی کے افسانوں میں جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے رنگوں میں ہر جگہ اخلاقی احساس کی شدید تلخی موجود ہے اور اسی لئے چاہے ہم افسانوی اور فنی حیثیت سے ان کی سیاسی فضا کو بھول بھی جائیں لیکن اس فضا میں رنگ بدلتے ہوئے سیاسی گرگٹ کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ ڈاچی میں اس کے علاوہ دو طرح کے افسانے اور بھی ہیں۔ رومانی افسانے جن میں انسان اس درجہ جذباتی ہو جاتا ہے کہ وہ محبت کے پیچھے ماں باپ کو چھوڑ دیتا ہے اور پھر فرض کی خاطر محبت کو۔ ان رومانی افسانوں کے علاوہ معاشرتی افسانے جہاں امیری غریبی کے فرق کا تماشہ دکھایا گیا ہے لیکن ان تماشوں میں بھی واقعات کی محفل تخیل کی سجائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اخلاقی اور اصلاحی پہلو یہاں بھی فنی پہلو پر غالب ہے۔

ڈاچی کے بعد افسانوں کے تین اور مجموعے شائع ہوئے۔ کونپل، قفس، ناسور میں صرف رومانی افسانے ہیں اور اپنے طرز اور موضوع دونوں کے لحاظ سے انھیں ڈاچی سے بھی پہلے چھپنا چاہیئے تھا۔ اس مجموعے کے افسانوں کی دنیا صرف جذبات تصور اور تخیل کی بنائی ہوئی ہے اور اس عارضی جنت میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ کہانی کا مزا ہے۔ کہانی مزیدار ہو، اس میں اصلاحی مقصد ہو اور وہ اخلاق کی بلندی کے نمونے پیش کر سکے تو اس کے بعد اشک اسے اپنے حال پر چھوڑ دینے میں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ ناسور کے افسانوں کے موضوع میں گہرائی نہیں۔ لیکن بیان میں جوش ضرور ہے لیکن اسکا جواز شاید یہ ہے کہ وہ ایسے دور کے افسانے ہیں جب پلاٹ کو دلچسپ بنانا ہی سب سے بڑا فن تھا اور اشک باقی ہر چیز کے مقابلہ میں اس چیز میں ہر جگہ کامیاب رہے ہیں۔

کونپل اور قفس کے افسانوں میں جا بجا فنی احساس کی جھلک نمایاں ہے، اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اشک نے اپنی افسانہ نگاری کے ہر دور میں ہر مذاق کے ناظر کی دلچسپی کا خیال رکھا ہے۔ اُن کے افسانوں کا کوئی مجموعہ پڑھ کر اس آدمی کی بھی تفریح ہوتی ہے جو صرف ہلکے پھلکے رومانی افسانے پڑھ کر خوش ہوتا ہے، اور اس آدمی کو بھی جو پڑھی ہوئی چیز میں کسی نہ کسی اخلاقی درس کا جویا ہے۔ اور اس سے بھی مختلف ایسے لوگ بھی ان سے مسرور و محظوظ ہو سکتے ہیں جو کہانی کی بنیاد میں زندگی کا صحیح پس منظر تلاش کرتے ہیں۔ کونپل اور قفس کے افسانوں سے تقریباً ہر مذاق کے پڑھنے والوں کو تسکین ہوتی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے ان مجموعوں میں اشک کا

فرق نمایاں طور پر آگے کو بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ زندگی اور اس کی تفصیلوں میں بھی اور انداز بیان میں بھی۔ ان افسانوں میں سے کچھ میں ہندوؤں کے اوسط گھرانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں ہیں۔ روزانہ کی زندگی میں، اور اس روزانہ کی زندگی سے بڑی حد تک مختلف شادی بیاہ اور تہواروں کے موقعوں کی زندگی میں، ہندو گھرانوں میں جو رسمیں رائج ہیں۔ جن عقیدوں کی پیروی کی جاتی ہے، یا اور ان رسموں اور عقیدوں کے اظہار میں جن عادتوں اور ذہنیتوں کو دخل ہے ان کا ذکر اشک نے اپنے افسانوں میں خلوص اور سچائی سے کیا ہے۔ سوا اسکے علاوہ انھوں نے عورت اور اسکی فطرت کو بھی اپنے خاص نقطۂ نظر سے دیکھا اور اسے اپنے افسانوں میں اسی نقطۂ نظر کے ماتحت دیانتداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان دو مجموعوں کے افسانوں میں جابجا ہمیں زندگی کی صداقتوں میں ڈوبے ہوئے کردار بھی اپنی جھلک دکھلاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے خیالات، ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیتیں بھی ہمیں اسی طرح دکھائی دیتی ہیں جیسے زندگی کے مادّی واقعات۔ ان افسانوں میں ہندوستانی سماج کے مختلف طبقوں کے باہمی فرق کے شدید احساس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اور اس احساس نے زندگی کے صحیح پس منظر میں بعض افسانوں کے پلاٹ کی تشکیل بھی کی ہے۔ زندگی کے ان واقعات کے ذکر میں اب کسی قدر پیچیدگی بھی نظر آتی ہے۔ اور یہی چیز اشک کے فنی احساس کے ارتقا کا پتہ دیتی ہے۔ ان مجموعوں کے بعض افسانوں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اشک فن کی پیچیدگیوں کے قائل نہیں۔

وہ ہمیشہ کہانی کے الگ الگ حصوں کو اہم سمجھ کر ان پر زور دیتے ہیں اسکی ابتدا پر، اس کے خاتمے پر، اس کے منتہا پر اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ پلاٹ کے تسلسل پر فن کی اس اہمیت کو شدّت سے محسوس کرتے ہوئے انھوں نے افسانے کی ظاہری شکل صورت اور اس کے ڈھانچے میں توڑ مروڑ کی کوشش نہیں کی اور اسی لئے ان کے افسانے فن کی اس پابندی کے باوجود پڑھنے والے کے ذہن کو سیدھی ڈگر سے ہٹا کر کہیں نہیں لیجاتے۔ ان افسانوں کو پڑھ کر ذہن فکر اور تعمیر دھندلے نقش کو واضح بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ان افسانوں میں بیان کی سادگی اور اسکی ادبیت، اشاروں

اور کنایوں کا نسبتاً گہرا مقصد، لفظوں اور فقروں سے فضا پیدا کرنے کی کوشش، خاتموں کا ڈرامائی انداز، جیسی چیزیں بھی جابجا نظر آتی ہیں لیکن جذبات اور ان کی پیدا کی ہوئی تنقید میں ان افسانوں میں بھی جذب نہیں ہوئیں۔ ان کا اظہار اب تک افسانہ نگار لفظوں ہی میں کرتا ہے۔ جذبات اور تنقید کی وہ گہرائی جو بیدے سادے لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی، بلکہ چیزوں میں سما جاتی ہے، ان افسانوں میں اب تک پیدا نہیں ہوئی۔

اُردو کے کسی افسانہ نگار نے افسانہ نگاری کے ارتقا کی اتنی زیادہ منزلیں طے نہیں کیں جتنی اشک نے۔ ان کے افسانے فن کی اس منزل سے شروع ہوئے جہاں کوئی فن تھا ہی نہیں۔ جہاں افسانہ صرف اس لئے لکھا جاتا تھا کہ اس میں دلچسپی ہوتی ہے، اور کوئی نہ کوئی اخلاقی درس ہوتا ہے۔ اور اب ان کے افسانوں کے آخری دَور کی نمائندگی کرنیوالا افسانوں کا مجموعہ "چٹان" ہے۔ افسانہ نگار اس فن کی مختلف منزلیں طے کرتا ہوا اب اس منزل پر پہنچا ہے جہاں افسانے کا "نیاپن" مختلف شکلوں میں نمایاں طور پر نظر آرہا ہے۔ ان افسانوں میں بھی عمل اور فکر کا دائرہ تقریباً وہی ہے جو اس سے پہلے کے افسانوں میں مسائل میں بھی، ایک آدھ موقع کو چھوڑ کر کوئی نیاپن نہیں۔ افسانوں کا ماحول اور ان کی مادّی فضا بھی پہلے ہی جیسی ہے۔ لیکن اب افسانہ نگار کی نظر میں گہرائی آگئی ہے، اور اسکا قلم اس گہری نظر کا ہمنوا بنتا دکھائی دیتا ہے۔

اشک ان افسانوں میں بھی عورت

دولت اور سماج کے پیدا کئے ہوئے جماعتی تفاوت اور اونچ نیچ ہی کو دیکھ رہے ہیں لیکن اس دیکھنے کا انداز بدلا ہوا ہے۔ اب جماعتی تفاوت انھیں جسمانی زندگی سے بھی زیادہ ذہنی زندگی اور انسان کے خوابوں اور خیالوں پر چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس لئے انھیں نتیجوں میں بھی مادّی اثرات سے کہیں زیادہ نفسیاتی اور جذباتی نتیجوں کی فکر پیدا ہوگئی ہے۔ اور اس فکر کا اظہار انھوں نے عموماً سطحی جذباتیت کی قید و بند سے آزاد ہوکر فنی انداز میں کیا ہے۔ یہ سطحی جذباتیت جو اس سے پہلے انکی واقعہ نگاری، ان کی طنز، اور ان کے اشاروں اور کنایوں تک پر چھائی ہوتی تھی۔

ازالہ

ایک دوست کے نام

چند بھولے ہوئے ٹکڑے تھے کسی گیت کے وہ
ورنہ کچھ اور ترنم سے تو مقصود نہ تھا
میری آنکھوں میں تھا کانَن کا سراپا اے دوست!
جلوۂ "شاہدِ معصوم" تو موجود نہ تھا!!

ہاں یہ سچ ہے کہ تخیّل کے پسِ منظر میں
چند بیمار سے سایوں کی ہے دنیا آباد
ایک ہلکی سی خلش دل میں ہے باقی اب بھی
میرے خاموش ترنم بھی ہیں گویا فریاد

سچ کہا تم نے "زمانے نے بدل لی کروٹ"
ہو سکا کوئی نہ آئینِ وفا کا پابند
ہاں مگر عشق کے اجڑے ہوئے گلشن کی قسم
حُسن کی صبحِ بہاراں کے ہزاروں سوگند

"یادِ ایامِ محبت" مرا دستور نہیں
حُسن مجبور ہی کچھ عشق تو مجبور نہیں

ش صہبا

اب رفتہ رفتہ اپنا سایہ ہٹا رہی ہے۔ وہ لفظوں کے ظاہری روپ کی پابند رہنے کے بجائے خیال اور اس خیال کے بنائے ہوئے پلاٹ کی گہرائیوں میں پیوست ہونے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اسی لئے افسانہ نگار کے اشاروں میں اب معنویت آ رہی ہے۔ اشارے اب پلاٹ کے تسلسل میں مدد دیتے ہیں، کہانی کے بنیادی خیال میں تاثیر پیدا کرتے ہیں اور کردار کو پختہ بناتے ہیں۔ اشک کے افسانوں میں اب طرزِ بیان کی روانی اور خود اعتمادی پیدا ہو رہی ہے۔ وہ جنسی جذبات کے اظہار میں بے باک ہونے کو بھی عیب کی جگہ ہنر سمجھنے لگے ہیں۔ انھوں نے افسانوں میں اب زندگی کی جزئیات اور تفصیلیں بھرنی شروع کر دی ہیں اور ان تفصیلوں میں کچھ ایسی بات ہوتی ہے کہ ان سے پڑھنے والا اکتاتا نہیں۔

اشک میں افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ وہ ہر زمانہ میں ہر انداز کی کہانیاں لکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کسی رنگ کو اپنا بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اور اس لئے ان کی افسانہ نگاری میں کسی انفرادی نقش کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک دوسری چیز کا جسے ان کے افسانے پڑھنے والا شدت سے محسوس کرتا ہے یہ ہے کہ وہ جس واقعہ یا تجربے کو افسانہ کا موضوع بناتے ہیں، اسے اپنے ذہنی تجربات اور تخیل میں اچھی طرح گھلائے ملائے بغیر ہی دنیا کے سامنے لے آتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں ذاتی عنصر کی شدید کمی ہے۔ فن کی نزاکت اور اس کی تاثیر میں اس ذاتی عنصر کو بڑا دخل ہے۔ اشک اگر چاہیں تو اس نزاکت اور تاثیر کو اپنا بنا سکتے ہیں۔ یہ میں اسلئے کہہ رہا ہوں کہ جب کبھی انھوں نے ایسا چاہا ہے تو ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جنہیں اردو کے بہت اچھے افسانوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے — پھر افسانہ نگار اسے اپناتا کیوں نہیں؟ شاید اس لئے کہ زمانہ اس سے ہر روز ایک نیا افسانہ طلب کرتا ہے اور فن کارانہ فطرت اس تقاضہ کا ساتھ دینے سے معذور ہے۔

افسانہ نگار چاہے تو زمانہ کی سستی پسند کو اپنا بنا لے یا فن کے تقاضوں کا ساتھ دے میرے نزدیک پہلی بات اُسکے لئے بہت مضر ہے اور زمانہ کے لئے بے حد خطرناک ،،

خمسہ

بر غزل مہاراجکمار راوف محمود آباد اسٹیٹ

کس نے دیکھا آپ کا بیمار اچھا ہو گیا — کون کہتا ہے کہ جینے کا سہارا ہو گیا
اک محبت کی بدولت ہائے کیا کیا ہو گیا — قلبِ دو با شامِ غم طوفان برپا ہو گیا
اشک کے قطرہ نے کروٹ لی تو دریا ہو گیا

جان حیرت ہو گیا جان تمنا ہو گیا — جان دل جانِ نظر جان سراپا ہو گیا
انقلاب حسن عشق آموز دنیا ہو گیا — جلوہ خال رخ معشوق کیا کیا ہو گیا
آنکھ میں تل ہو گیا دل میں سویدا ہو گیا

جوشِ وحشت کا فضائے نجد پر چھایا اثر — اف وہ بل کھاتی ہوا وہ خاک صحرا کا اثر
ذرہ ذرہ میں اثر اور پھر جنوں افزا اثر — گیسوئے پرپیچ لیلیٰ کا زمیں پر تھا اثر
عنصر خاکی بیاباں میں بگولہ ہو گیا

یہ محبت کا اثر اب دل میں ہے پہلو نشیں — سوز جاں سوز جگر اب دل میں ہے پہلو نشیں
نخل الفت کا ثمر اب دل میں ہے پہلو نشیں — پہلے نفرت تھی مگر اب دل میں ہے پہلو نشیں
غم برا تھا آپ کی خاطر سے اچھا ہو گیا

دفعتاً یوں بھی کہیں اٹھتے ہیں نظروں سے حجاب — حسن کی فطرت میں ممکن ہیں کہاں یہ انقلاب
جذب الفت تو نے مغرب سے نکالا آفتاب — قسمت دل تھی الٹ دی میری نالوں نے نقاب
مفت میں آخر جمالِ یار رسوا ہو گیا

گوشہ گوشہ میں جہاں کی بھر گیا اعجاز حسن — ذرہ ذرہ عالم امکاں کا ہے دمساز حسن
گو نجتی ہے شش جہت میں ہر طرف آواز حسن — داستاں طور ہیں کب تک چھپے کا راز حسن
کہئے اب کچھ اور یہ قصہ پرانا ہو گیا

حسن کی سرگرمیوں کو یوں مٹا سکتا تھا کون — پردہ برق تجلی یوں اٹھا سکتا تھا کون
دست قدرت کے کرشمے یوں دکھا سکتا تھا کون — تاب تابش ہائے برق حسن لا سکتا تھا کون
دیدۂ موسیٰ کی خاطر طور سرمہ ہو گیا

اس سے کیا مجھ کو زمانہ ہے کہ تھا محروم دید — خود ہی جب کمزور نظروں سے ہوا محروم دید
کس کے در پر جائے اب یہ آپ کا محروم دید — آپ نے الٹی نقاب اور ہیں یہاں محروم دید
حسن کا جلوہ میری آنکھوں کا پردہ ہو گیا

آہ اس کافر کا انداز جوانی کیا کہوں — پھک گیا دل جگر گیا سوز نہانی کیا کہوں
کر دیا مجبور تو نے بے زبانی کیا کہوں — یاس کے عالم میں ہیں دل کی کہانی کیا کہوں
مختصر یہ ہے کہ محروم تمنا ہو گیا

دیکھئے جس کو وہی ہے دل فگار عشق حسن — کیا جراحت پاش ہے ساز بہار عشق حسن
اے میرے درد آفریں پروردگار عشق و حسن — وصل و ہجراں میں یہی ہے اختیار عشق و حسن
میں جو چاہوں وہ نہ ہو تم نے جو چاہا ہو گیا

کیا کہوں کیوں کر کہوں مجبوریوں میں راز دل — ہے غم انجام دل شرح غم آغاز دل
جب نہ پایا ربط اپنا کوئی ہمدم ساز دل — ڈھونڈتا ہوں ہو کے مسحور نگاہ ناز دل
کیا کہوں بیٹھے بٹھائے مجھ کو یہ کیا ہو گیا

ربط تلہری

ہوش نگر کا شباب

افسانہ

آدھی رات کو جب چودھویں کا بدر دروازہ کھلا۔ اور حسن اپنی فتوحات کے سفر پر روانہ ہوا۔ اور اس کے ساتھ چاند کی جوان کرنیں تھیں اور پھولوں کا حسین جادو تھا۔ اور پرستان کے دلنواز سپنے تھے اور اس کی آنکھوں میں، ہونٹوں میں اور ادھ کھلی پنڈلیوں میں شراب کے جام چھلکتے تھے۔

مگر خود اس کے ہاتھ خالی تھے۔ اور وہ جانتا تھا کہ اس کا خالی ہاتھ ہونا ہی اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو گیا اور چاروں طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور جس جس جوان دل نے اس کی یہ مسکراہٹ دیکھی وہی اس کے روبرو اپنی ساری رضا اور رغبت کے ساتھ جھک گیا۔

اور چاند کی جوان کرنوں نے پھولوں کے حسین جادو نے اور پرستان کے دلنواز سپنوں نے کہا "حسن سب کو جیت سکتا ہے حسن کو کوئی نہیں جیت سکتا"

کچھ فاصلہ پر ہوش نگر کا شباب اپنے کھردرے بستر پر سو رہا تھا، اس نے غرور کے یہ لفظ اپنی نیند میں سنے اور کھڑا ہو کر بولا "میں حسن اور غرور دونوں کو جیت سکتا ہوں" یہ کہکر وہ پورنماسی کی چاندنی رات میں پھولوں اور سپنوں کے درمیان تن کر کھڑا ہو گیا۔

حسن نے اس کی طرف اپنی مسکراہٹ کے تیر چلائے مگر ہوش نگر کے شباب نے ان تیروں کو قہر کی آنکھوں سے دیکھا اور انہیں ہوا میں آگ لگ گئی۔

اور حسن نے ایک دلنواز نغمہ گایا۔ مگر ہوش نگر کے شباب نے اس کی طرف سے اپنے کان بہرے کر لئے اور وہ نغمہ ہوا میں مرجھا کر رہ گیا۔

اب حسن نے ہوش نگر کے اس ہٹیلے شباب پر اپنے گلابی ہونٹوں کی گرمی سے حملہ کیا مگر ہوش نگر کے شباب نے اپنے منہ سے سرد مہری کا صرف ایک لفظ نکالا اور وہ گرمی حسن کے ہونٹوں پر برف کی طرح جم گئی۔

یہ دیکھکر دنیا کے دو جوان دلوں نے کہا "ہوش نگر کا شباب سب کو جیت سکتا ہے اسے کوئی نہیں جیت سکتا" مگر جب وہ جوان دل اسکے پاس پہونچے تو ان میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک کہتا تھا۔ یہ شباب نہیں دانائی ہے۔ دوسرا کہتا تھا یہ شباب نہیں بڑھاپا ہے۔

حسن اپنی ہار میں مرجھایا ہوا تھا۔ اسے یہ سنکر حوصلہ ہوا اور اس نے کہا یہ دانائی اور بڑھاپا نہیں سرد اور سیاہ دل والی موت ہے۔

سُدرشن

بیتے ہوئے دن

اے جہاں، اے زندگی، اے دورِ وقت!
جادہ پیما ہوں تمہاری راہ پر
جب سفر میں یاد آجاتی ہیں پچھلی منزلیں
تھر تھرا اٹھتا ہے دل!
اے جہاں، اے زندگی، اے دورِ وقت!
کیا نہیں لوٹ آئے گی عہد جوانی کی بہار؟
آہ —— یہ ممکن نہیں۔ ممکن نہیں!
میرے روز و شب سے ہمدم!
چھن چکی ہیں زندگی کی عشرتیں!
یہ شگفتہ سی بہار اور یہ فسردہ سی خزاں
میرے پائمال دل پر اور ڈھاتی ہیں ستم
راحت و آرام کا اب ذکر کیا؟

(دہلی) —— ساغر جلیلی

غزل

ہر نفس مجھکو جو پیغامِ شفا دیتا ہے
کون یہ دامن نرگس سے ہوا دیتا ہے

فلسفی کس لئے الزام فنا دیتا ہے
لفظ کن، خود مری ہستی کا پتا دیتا ہے

چارہ گر یاس کے تیور سے تسلی دے کر
اور بیمار کو بیمار بنا دیتا ہے

لن ترانی بھی تھی اک مصلحت خاص جمال
شوق نظارہ کی قیمت کو بڑھا دیتا ہے

کچھ تو ہوتا ہے حسینوں کو بھی احساس جمال
اور کچھ عشق بھی مغرور بنا دیتا ہے

ہو گیا ترک مراسم کو زمانہ لیکن
آجتک دل تری نظروں کو دعا دیتا ہے

وہ نظر ملتے ہی اک خاص تبسم ان کا
اور بھی ربطِ محبت کو بڑھا دیتا ہے

تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے دوا کے بدلے
چارہ گر آج نہ جانے مجھے کیا دیتا ہے

دار مل ہی گئی منصور کو واعظ ورنہ
کون دنیا میں محبت کا صلا دیتا ہے

ہائے اس بیکس و مجبور کی قسمت عرشی
شام سے پہلے ہی جو شمع جلا دیتا ہے

—— عرشی بھوپالی

رودابہ

مصنف: ہاشم اصفہانی
مترجم: مشیر احمد

ہم ان مستشرقین کے مرہونِ منت ہیں جنہوں نے انیسویں صدی میں ہندوستان میں فردوسی کے کلام کی چھان بین کی اور بڑی محنت کے بعد شاہنامہ کو موجودہ صورت میں ترتیب دیا۔ سنہ ۱۸۱۱ء میں شاہنامہ فردوسی سیاوُش کی حکایت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ اہتمام کلکتہ سے شائع ہوا۔ انیسویں صدی کے وسط میں ٹرنر ماکن نامی ایک مستشرق نے جس کو فردوسی سے خاص لگاؤ تھا کمپنی سے درخواست کی کہ مکمل شاہنامہ کی اشاعت کے لئے مالی امداد دی جائے۔ مسٹر ہیرنگٹن نے جو اس زمانہ میں کمپنی کے وزیر مال تھے اس بنا پر انکار کر دیا کہ حکومت بنگال کے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا کہ اس مد میں خرچ کیا جاتا۔ نصیر الدین حیدر نواب اودھ کو جب اس درخواست اور مسٹر ہیرنگٹن کے انکار کا حال دریافت ہوا تو انھوں نے شاہنامہ کے کل اخراجات کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لی۔ اس پر مسٹر ماکن پورے اطمینان سے شاہنامہ کی ترتیب میں مصروف ہو گئے۔ اُس وقت شاہنامہ کے اٹھارہ نسخے دستیاب ہوئے۔ انہی اٹھارہ نسخوں کی چھان بین کے بعد شاہنامہ موجودہ صورت میں مرتب ہوا ہے۔ اِن اٹھارہ نسخوں میں سے چار مسٹر ماکن کے اپنے ذاتی تھے، چار ایسٹ انڈیا کمپنی کے، چھ کلکتہ کے مختلف انگریز علم دوست اصحاب کے تھے اور چار ہندوستانی صاحب ذوق حضرات کے۔ جو لوگ آج شاہنامہ کے مطالعہ سے مستفیض ہوتے ہیں وہ لوگ دراصل نواب نصیر الدین حیدر اور مسٹر ماکن کے رہینِ منت ہیں جنہوں نے اس دریا دلی سے اس کی اشاعت کے صرفہ کا بار اٹھایا اور انتہائی محنت سے اس کی ترتیب دی۔ شاہنامہ مکمل صورت میں پہلی دفعہ سنہ ۱۸۲۹ء میں بپٹسٹ مشن پریس سے لوہے کے چھاپہ میں کلکتہ سے شائع ہوا۔

فردوسی جس کی شاعری رہتی دنیا تک قائم رہے گی اور جس کی وجہ سے فارسی زبان کو عالمگیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی طوس کے قریب شاذان میں پیدا ہوا۔

فردوسی نے شاہنامہ میں جن عورتوں کا ذکر کیا ہے ان کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے سے ان کے اخلاق اور عام کردار کا ایک خاص نقشہ ہمارے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ تاریخ ایران کے صفحات پر بہت سی ممتاز عورتوں کے نام جلوہ گر ہیں مثلاً آتوسہ دختر سیروس اور دارا گشتاسپ کی بیوی، پارازتیا خشایارشاہ کی بیوی اور سیروس صغیر کی ماں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے زمانہ میں بڑے بڑے نمایاں کام کئے ہیں اور ان کو امور سلطنت میں خاص دخل تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی آزادیٔ گفتار اور جوشِ عمل ایران کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔

تمام تاریخی حکایات میں عشق و محبت کا عنصر بہت غالب ہوتا ہے چنانچہ فردوسی نے بھی اپنے قصہ کے کرداروں کو مقبول عام بنانے کے لئے شاہنامہ کو حالاتِ عشق سے محروم نہیں رکھا۔ رزمیہ قصوں کی ممتاز عورتیں عام طور پر حسن کا مکمل نمونہ ہوتی ہیں چنانچہ فردوسی نے بھی ان کی یہ خصوصیت قائم رکھی ہے۔ اگرچہ شاہنامہ کے تمام قصوں میں ایک طرح کی یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن اسی کے ساتھ انفرادیت بھی موجود ہے اور پڑھنے والے کا جی ان کے مطالعہ سے گھبراتا نہیں ہے۔ ان قصوں کو پڑھ کر ایران کے ایک اعلیٰ درجہ کے مہذب و متمدن معاشرہ کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

فردوسی نے عورتوں کی شخصیت پر بڑا زور دیا ہے اور یہی خصوصیت شاہنامہ کو دوسری رزمیہ نظموں اور حکایتوں سے ممتاز کرتی ہے۔ ہومر اور ورجل نے صرف مردوں کے کارناموں کو اجاگر کیا ہے اور عورتیں پس پشت پڑی رہ گئیں۔ فردوسی نے ہمارے لئے اس معاشرہ کی نقاشی کی ہے جس میں نہ صرف یہ کہ عورتیں مردوں کی آلۂ کار ہی نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی ذاتی شخصیت کی مالک ہیں، خوددار ہیں، فکر و عمل میں آزاد ہیں اور مردوں کی دست نگر نہیں ہیں۔ ایرانِ قدیم کی ان ممتاز عورتوں کی قلمی تصویریں فی الواقع مستحقِ داد ہیں۔

فردوسی نے شاہنامہ پر تیس سال تک شدید محنت کیوں کی؟ اس کے متعلق متعدد قصے مشہور ہیں۔ لیکن واقعات ذیل سے واضح ہوگا کہ فردوسی نے یہ کام سلطان محمود کے کہنے پر اپنے ذمہ نہیں لیا۔

یزدجرد سوئم کے عہد میں جو خاندان ساسان کا آخری تاجدار تھا ایران قدیم کی ایک تاریخ لکھی گئی جس کا نام خدائے نامہ تھا۔ عربوں کی فتح کے بعد اس کتاب کا ترجمہ عربی میں ہوا۔ اس عربی کتاب کا سامانی عہد میں پھر فارسی میں ترجمہ ہوا۔ آخری سامانی بادشاہ عبدالملک نے فردوسی سے اس تاریخی کتاب کو نظم کرنے کی فرمائش کی۔ نظم کہنے کے دوران میں فردوسی کی تنخواہ محمد لشکری حاکمِ خراسان نے مقرر کر دی۔ ایک روایت یہ ہے کہ عبدالملک نے علی دیلمی کو حکم دیا تھا کہ وہ فردوسی کی کفالت کرے۔ شاہنامہ سنہ ۹۹۰ء میں اختتام کو پہنچا لیکن اس وقت سامانیوں کا زوال ہو چلا تھا اور فردوسی کو یہ امید نہیں رہی تھی کہ دربار سامانی سے اس کو خاطر خواہ صلہ مل سکے گا۔ چنانچہ فردوسی نے کچھ عرصہ انتظار کیا[۱]

---

[۱] فردوسی کا بیان ہے کہ اس نے بیس سال تک انتظار کیا۔ وہ کہتا ہے:
سخن را نگہدا شتم سال بیست ... بداں تا سزاوار این گنج کیست

سلطان محمود غزنوی جب ہندوستان سے زر و جواہر کا خزانہ لوٹ کر لایا اور زر و سیم کی بارش غزنی میں کرنی شروع کی اور سلطان کی فیاضی کا شہرہ فردوسی کے کانوں تک بھی پہنچا تو یہ بھی غزنی کی طرف چل دیا۔ سلطان محمود کی تعریف اور اس کے جود و سخا کا شایان شان حال شاہنامہ میں شامل کر کے فردوسی نے اس گنج شائگاں کو محمود غزنوی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب فردوسی نے اپنی نظم میں سے جستہ جستہ اشعار پڑھ کر سنانے شروع کئے تو محمود کی زبان سے بیساختہ نکل گیا کہ تمہاری نظم کا تو ایک ایک شعر ایک ایک اشرفی کے برابر ہے۔ محمود کے ان الفاظ کو شاعر موصوف نے ایک حتمی وعدہ پر محمول کر لیا اور جب اشرفیوں کے بجائے چاندی کے سکے پائے تو سخت مایوس و برافروختہ ہوا اور حدود سلطنت سے نکل کر محمود کی شان میں ایک ہجو کہی جو اب تک فردوسی سے منسوب چلی آتی ہے۔ میرے خیال میں فردوسی کا ایسا بلند خیال شخص اور عالی دماغ شاعر اس قدر پستی کی طرف راجع نہیں ہو سکتا کہ اسی محمود کی شان میں ایسی سخت ہجو کہتا جس کی اس نے انتہائی تعریف کی تھی۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فردوسی ایسی حرکت کر کے اپنے تئیں منافق، ابن الوقت اور زر پرست ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

فطرت انسانی کی یہ عام کمزوری ہے کہ ہر قوم پچھلی قوم کی تہذیب و تمدن کے آثار کو برباد کرتی رہی ہے۔ تاریخ عالم کے اوراق اس کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یونانی تہذیب کے کھنڈروں پر اہل روما نے اپنی تہذیب کی عمارت کھڑی کی۔ ان کی تہذیب کو نابود کر کے نارمنوں نے اپنا جھنڈا بلند کیا۔ یونانیوں، عربوں اور تاتاریوں نے قدیم ایران اور ہسپانیوں نے قدیم امریکہ کی تمام یادگاروں کو خاک میں ملا کر اپنا دور دورہ قائم کیا۔ اقوام کے عروج و زوال کی طرف یہ ادنیٰ سا اشارہ ہوا۔ جو تباہ کاریاں قبیلوں اور خاندانوں کے ہاتھوں ہوئیں ان کا تو معمولی سا ذکر بھی یہاں مشکل ہے۔ بدقسمتی سے اس قسم کی تباہ کاریاں بہ نسبت اور ملکوں کے ایران میں زیادہ ہوئیں۔ مثلاً خدائے نامہ میں خاندانِ اشکانی کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ اس خاندان کے سلاطین صدیوں تک سرزمین ایران کو اہل روما کے لگاتار حملوں سے بچاتے رہے ہیں۔ چونکہ فردوسی کو یہ کتاب محض نظم کے ڈھانچہ میں ڈھالنا تھی اس لئے اس نے بھی اشکانی شہنشاہوں کا سرسری سا ذکر کیا ہے۔

سلطان محمود نے سنہ ۹۹۶ء سے سنہ ۱۰۳۰ء تک گویا تیس سال حکومت کی۔ محمود کا بیٹا بہت مختصر سے زمانہ حکومت کے بعد جنگ ہرات میں سلجوقیوں سے شکست کھا گیا اور اہل سلجوق نے غزنویوں کی حکومت کے کھنڈروں پر اپنی سلطنت کا قلعہ کھڑا کیا۔ اس صورت میں بھی وہی مذکورۂ بالا انسانی کمزوری بروئے کار آئی اور سلجوقیوں نے غزنویوں کی شان و شوکت پر پردہ ڈال دیا جس کو فردوسی نے اس قدر اجاگر کیا تھا۔ انھوں نے سلطان محمود کی ناقدری اور فردوسی کی مایوسی کے قصہ کو انتہائی اشاعت دی۔

اب ہم اصل مقصد پر آتے ہیں اور شاہنامہ کو شمع راہ بنا کر یہ دکھاتے ہیں کہ ایران قدیم میں معاشقہ کا کیا طریقہ تھا۔

زال و رودابہ کا معاشقہ

سام نریمان، منوچہر بادشاہ ایران کے دربار کا پہلوان تھا۔ زال اسی سام کا بیٹا تھا۔ زال کے سر کے بال پیدائشی سفید تھے جس سے سام کو سخت رنج ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ بچہ کو کوہ البرز پر لے جا کر چھوڑ دیں۔ سیمرغ کا آشیانہ اتفاق سے اسی پہاڑ میں تھا۔ سیمرغ کو اس بیکس بچہ پر رحم آ گیا۔ اس نے اس کی پرورش اور تربیت اپنے ذمہ لے لی یہاں تک کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ایک بڑا کڑیل پہلوان بن گیا۔ اسی اثنا میں سام نے ایک خواب دیکھا جس میں اس کو اپنے بیٹے کے بڑے ہونے اور اس کی پہلوانی کا حال دریافت ہوا۔ اگلے ہی دن سام کوہ البرز کی طرف روانہ ہو گیا اور اپنے بیٹے زال کو ساتھ لے آیا۔

زال میں شجاعت اور بہادری بہت تھی۔ اس لئے اس نے زور آزمائی کے خیال سے تمام ایران کا دورہ کرنے کا ارادہ کیا۔ کابل کے قریب جب وہ پہنچا تو وہاں کا بادشاہ مہراب زال کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا اور اس کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ اپنے ہاں ٹھہرایا۔ اسی قیام کے دوران میں مہراب کے ایک درباری نے زال کو شہزادی رودابہ کے بے مثل حسن کا قصہ سنایا۔ رودابہ کا نقشہ فردوسی نے یوں کھینچا ہے:

پس پردۂ او یکے دختر است — که رویش ز خورشید روشن تر است
ز سر تا به پایش بکردار عاج — برخ چوں بہار و به بالا چو ساج
براں سفت سیمیں دو مشکیں کمند — سرش گشته چوں حلقۂ پاى بند
رخانش چو گلنار و لب ناردان — ز سیمیں برش رسته دو ناردان
دو چشمش بسانِ دو نرگس بباغ — مژه تیرگی برده از پر زاغ
اگر ماه جوئی همه روئے اوست — وگر مشک بوئی همه موئے اوست

بہشتی است سرتا سر آراسته
پر آرائش و رامش و خواسته

یہ سن کر زال کے سینہ میں آتش عشق بھڑک اٹھی۔ رودابہ بھی زال کا ذکر اپنے والدین سے سن کر اس کی مشتاق ہو چکی تھی۔ ایک روز اس نے اپنے اشتیاق کا حال رازدارانہ طور پر اپنی سہیلیوں کو کہہ سنایا وہ خبر سن کر ہکا بکا رہ گئیں۔ انھوں نے سوچا کہ رودابہ کا باپ اپنی لڑکی کی شادی ایک سفید سر کے آدمی سے کرنے کو کبھی تیار نہ ہوگا۔ رودابہ کو اس کے خیال سے باز رکھنے کے واسطے انھوں نے کہا:

ترا خود بدیدن درون شرم نیست — پدر را بنزد تو آزرم نیست
که آں را که انداخت از بر پدر — تو او را بخواہی که گیری به بر
کس از مادران پیر هرگز نزاد — وزاں کس که زاید نشاید نژاد
ترا با چنیں روئے و بالائے و موئے — ز چرخ چہارم خور آید بشوی

یہ سن کر رودابہ بہت ناراض ہوئی اور اس نے جوش میں کہدیا کہ اس کیلئے زال دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ہے۔ اس کی سہیلیوں نے جب رودابہ کو اس قدر پکا پایا تو وہ بھی اس کی مشکل حل کرنے کی فکر میں ہوئیں۔

ایک روز جب یہ لڑکیاں پھول چننے کے واسطے دریا کے کنارے جا رہی تھیں تو انھوں نے دیکھا کہ دریا کے اس پار زال کا خیمہ لگا ہوا ہے۔ زال نے دریافت کیا کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئی ہیں جب اس کو معلوم ہوا کہ وہ شہزادی رودابہ کی سہیلیاں ہیں تو اس نے اپنے نوکر سے اپنی تیر کمان منگائی اور ایک مرغابی مار گرائی جو دریا کے اس کنارے گری جہاں وہ چھوکریاں تھیں نوکر سے لڑکیوں نے پوچھا کہ وہ کس کا ملازم ہے اور وہ مرغابی کس نے ماری ہے جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ زال کا نوکر ہے تو انھوں نے اس سے رودابہ کے حسن کا حال بیان کیا اور خواہش ظاہر کی کہ کاش زال رودابہ کو ایک دفعہ دیکھ لیتا اور اس سے مل لیتا۔

کہ ماہے است مہرابرا در سرائے | بہ یک سر ز شاہ تو برتر بپائے
بہ بالائے ساج ست ہم رنگ عاج | یکے ایزدی بر سر از مشک تاج
دو نرگس دژم ابروان پر ز خم | ستون دو ابرو چو سیمیں قلم
دہانش بہ تنگی دل مستمند | سر زلف چوں حلقۂ پابند
دو جادوش پر خواب و پر آب روے | ز لالہ رخسار و از مشک موے
نفس را مگر بر لبش راہ نیست | چو او در جہاں نیز یک ماہ نیست

سزا باشد و سخت در خور بود
کہ با زال رودابہ ہمسر شود

زال کے خادم نے واپس آکر تمام ماجرا زال کو سنایا۔ زال نے جوش ہو کر قیمتی جواہرات ان چھوکریوں کو بھیجے اور انھوں نے زال کو پیغام بھیجا کہ وہ ان دونوں کی ملاقات کا انتظام کردیں گی۔ چنانچہ ایک روز رات کے وقت زال اور رودابہ کی ملاقات ہوگئی زال رودابہ کے بالاخانہ کے نیچے آکھڑا ہوا۔ فوراً رودابہ اوپر دریچہ میں آکھڑی ہوئی اور آہستہ سے زال کا نام لے کر پکارا۔ لیکن رودابہ کا کمرہ زمین سے جہاں زال کھڑا تھا بہت اونچا تھا اور زال رودابہ کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ اس پر زال نے درخواست کی کہ رودابہ اس کو اپنے حسن کی ایک جھلک قریب سے دکھا دے۔ رودابہ نے اپنی زلفوں کی لٹیں لٹکا دیں اور کہا کہ انکو کمند سمجھ کر اوپر چڑھ آ!

پری روے گفت و سپہبد شنود | ز سر شعر گلنار بکشود زود
کمندے کشاد او ز سرو بلند | کس از مشک زینساں نپیچد کمند
خم اندر خم و مار بر مار بود | بر آں غبغبش تار بر تار بود
فرو ہشت گیسو ازاں کنگرہ | کہ یازید و شد تا بہ بن یکسرہ
پس از بارہ رودابہ آواز داد | کہ اے پہلوان بچۂ گرد زاد

کنوں زود برتاز و برکش میاں | بر شیر بکشا و چنگ کیاں
بداں پرورانیدم ایں تار را
کہ تا دستگیری کند یار را

زال بھلا ان مشکبو لٹوں کو پکڑ کر ان سے سیڑھی کا کام کیا لیتا۔ اس نے بیتابانہ ان کو چومنا شروع کردیا۔ اتنے میں اس کے خدمتگار نے اس کو کمند دی جس کے ذریعہ وہ جلدی جلدی اوپر چڑھ گیا اور ساری رات اپنی محبوبہ کی آغوش میں گزاری:

چو بر بام آں بارہ بنشست باز | بیامد پری روے و بردش نماز
گرفت آں زماں دست دستاں بدست | برفتند ہر دو بکردار مست
دو رخسارہ چوں لالہ اندر چمن | سر جعد زلفش شکن بر شکن
ہمی بود بوس و کنار و نبید | مگر شیر کو گور را نشکرد
ہمی مہر شاں ہر زماں بیش بود | خرد دور بد آرزو پیش بود
چناں تا سپیدہ بر آمد ز جائے | تبیرہ بر آمد ز پردہ سرائے
پس آں ماہ را زال پدرود کرد | تن خویش تار و برش پود کرد
سر مژہ کردند ہر دو پر آب | زباں برکشادند بر آفتاب

کہ اے فر گیتی یکے لخت نیز
نبایست بودن چنیں در ستیز

دونوں نے عہد وفا باندھا لیکن ان کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل تھی۔ رودابہ عیلام نژاد تھی اور زال آریائی نسل کا شریف زادہ تھا۔ اس لئے زال نے اپنے باپ کو خط لکھا:۔

من از دخت مہراب گریاں شدم | چو بر آتش تیز بریاں شدم
ستارہ شب تیرہ یار من است | من آنم کہ دریا کنار من است
چہ فرمایدا کنوں جہاں پہلواں | کشایم ازیں رنج و سختی رواں

جب سام کو زال کا یہ خط ملا تو وہ سخت رنجیدہ ہوا۔ اس نے مذہبی عالموں اور منجموں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے حکم لگایا کہ زال و رودابہ کی مواصلت اس کے خاندان کے واسطے موجب سعادت ہوگی۔ سام نے اپنی رضامندی کا خط زال کو بھیج دیا اور زال نے یہ خوشخبری اپنی محبوبہ کو بھیج دی۔ اس پر رودابہ نے ایک انگوٹھی اور خلعت زال کے لئے روانہ کردی۔ جس وقت رودابہ کی کنیز یہ چیزیں لے کر محل سے باہر جا رہی تھی ملکہ سیندخت نے دیکھ لیا اور اس کنیز سے اصل ماجرا دریافت کیا۔ ملکہ زال کے متعلق اچھی رائے رکھتی تھی لیکن اس کو مہراب کی طرف سے ڈر تھا۔ اسی لئے اس نے یہ خبر کانپتی ہوئی آواز میں اپنے شوہر کو سنائی۔ مہراب یہ سن کر آپے سے باہر ہوگیا اور اپنی بیٹی کے قتل پر آمادہ ہو

چو بشنید مہراب بر پائے جست | نہاد از بر دستہ تیغ دست
تنش گشت لرزاں و رخ لاجورد | پر از خون جگر لب پر از باد سرد
ہمی گفت چوں خوستر آمد پدید | ببایستمش در زماں سر برید

اگر سام یل یا منوچہر شاہ　　بیابند بر ما یکے دستگاہ
زکابل برآید بخورشید دود　　نہ آباد ماند نہ کشت و درود

ملکہ نے مہراب کو ٹھنڈا کیا۔ اسی اثنا میں سام نے منوچہر شاہ کو بھی اس واقعہ کی اطلاع دی۔ منوچہر سخت برافروختہ ہوا اور اس نے کابل پر لشکر کشی کا حکم دیدیا تاکہ ضحاک کی اولاد کا بچہ بچہ نیست و نابود کردیا جائے۔

زال اپنے باپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور استدعا کی کہ وہ شاہ ایران کی خدمت میں ایک دفعہ اور درخواست کرے کہ وہ اپنے ارادہ سے باز رہے۔ سام رضامند تو ہوگیا لیکن اس نے کہا کہ تو خود میرا خط لے کر شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہو۔ زال حاضر دربار ہوا اور اس نے سام کا خط پیش کیا۔ منوچہر شاہ زال کی شخصیت اور اس کی شجاعت و مردانگی سے متاثر ہوگیا اور اس نے مجوزہ شادی پر اپنی رضامندی دے دی۔

زال کابل واپس آیا اور وہاں شادی کی خوشیاں ایک ہفتہ تک منائی جاتی رہیں۔ اسی موقع پر سام نے زابلستان کی حکومت زال کو تفویض کردی۔

رودابہ کے بطن سے رستم پیدا ہوا۔ اس طرح اس عورت نے ایران کی قومی تاریخ میں ایک دائمی شہرت پائی۔

گلی کا نام ——— بقیہ صفحہ ۲۵

لالہ جی ٹھنڈے ہوگئے۔ کمیٹی نے شاید ان سے جل کر پہلا ہی نام رہنے دیا تھا یا شاید گلی کا اتنا لمبا نام کمیٹی کو پسند نہ آیا تھا۔ یا شاید جوند سنگھ صرف جاٹ ہی نہ تھا بلکہ ایسا جاٹ تھا جس کے متعلق پنجابی میں کہا جاتا ہے "گنا جاٹ خدا کو ٹھگ لے"۔ لالہ جی چپ چاپ چل دیئے۔ گھر پہنچکر انھوں نے سائیکل ڈیوڑھی میں کھڑی کی اور چپ چاپ جاکر بستر پر لیٹ گئے۔

شام کو جب دستوران کے پڑوسی پنڈت گوبند رام انہیں سیر کے لئے بلانے آئے تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ لالہ جی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔

اس کے بعد پھر لالہ جی کی طبیعت کبھی ٹھیک نہ ہوئی۔ آریہ سماج مندر اور گوردوارہ سے بھی جوان کا نیا نیا پیار جاگا تھا وہ بھی نہ جانے کہاں سوگیا۔ پڑوسیوں سے راہ و رسم بھی جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک ختم ہوگئی۔

اب لالہ جی پھر دفتر سے آکر چارپائی پر لیٹے رہتے ہیں اور گلی میں آتے جاتے کو ایک نظر دیکھ کر پھر کروٹ بدل لینے ہی کو ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے برابر سمجھتے ہیں۔

"مجبور ہو تم" ....

جانتا ہوں کہ ملاقات سے مجبور ہو تم　　اپنی تہذیب کی زنجیر سے محصور ہو تم
جانتا ہوں کہ نئے عشق سے مخمور ہو تم　　کیا قیامت ہے کہ بر کھا میں بہت دور ہو تم
ہاں بہت دور بہت دور بہت دور ہو تم

میں نے کب تم سے ملاقات کی جرأت کی ہے　　میں نے کب تم سے کسی بات کی چاہت کی ہے
میں نے کب تم سے شکایات کی ہمت کی ہے　　ہے قصور اتنا کہ بس تم سے محبت کی ہے
پھر یہ بتلاؤ کہ کس واسطے رنجور ہو تم

یہ نہ سمجھو کہ مرے دل میں تم آباد نہیں　　دل وہ کب ہے جو تمہارے لئے برباد نہیں
یہ نہیں ہے کہ زباں پر مری فریاد نہیں　　ہاں تمہارے سوا اب مجھکو کوئی یاد نہیں
دل سے نزدیک ہو آنکھوں سے اگر دور ہو تم

غم فرقت میں مرے دیدۂ تر تم چاہو　　دل مضطر کی تڑپ دردِ جگر تم چاہو
ہاں چھپا رکھنا جو الفت کی نظر تم چاہو　　میں ہر اک بات پہ راضی ہوں اگر تم چاہو
گر یقیں ہو کہ محبت میں بدستور ہو تم

میں کبھی دردِ محبت سے نہ گھبراؤنگا　　بس تمہارے لئے سب کچھ میں سہے جاؤنگا
تم اگر چاہو تو دنیا کو یہ دکھلاؤنگا　　توڑ کر انجم و مہتاب بھی لے آؤنگا
میں تو مجبور نہیں، آہ! جو مجبور ہو تم

مجھکو معلوم ہے کس کس نے یہ سازش کی ہے　　اور تمہیں مجھ سے چھڑا دینے کی کوشش کی ہے
میرے احباب نے مجھپر بھی نوازش کی ہے　　ہاں مگر میں نے محبت میں نہ لغزش کی ہے
اور تم پر بھی یقین ہے کہ بدستور ہو تم

دیکھنا ہر غمِ دنیا کو گوارا کرنا　　شیوۂ عشق ہے طوفان سے کھیلا کرنا
ضبط جب حد سے گذر جائے تو ایسا کرنا　　اپنی مجبوریوں میں مجھ پہ بھروسا کرنا
یعنی دنیا نہ سمجھ جائے کہ مجبور ہو تم

زیورِ ہمت و جرأت سے سنورنا دیکھو　　اور آلامِ زمانہ سے نہ ڈرنا دیکھو
ظلم اور جور کی ہر حد سے گذرنا دیکھو　　شک مگر میری محبت پہ نہ کرنا دیکھو
تم مری جاں ہو مرے قلب میں مستور ہو تم

ترکِ الفت کا اگر تم سے تقاضا ہو جائے　　ہاں مخالف مری الفت کی یہ دنیا ہو جائے
اس طرف تم ہو اُدھر سارا زمانا ہو جائے　　تم کو مجھپر جو ذرا سا بھی بھروسا ہو جائے
پھر نہ رنجور، نہ معذور، نہ مجبور ہو تم

عابد

شیکسپیر کے ڈرامے ترکی میں

اے آر ہمفریز

تسلیمات! آج کی رات میرا موضوع "شیکسپیر کے ڈرامے ترکی میں"[1] استنبول تھیٹر کے شاندار کارنامے کی کہانی ہے۔ یہ کارنامہ صرف ایک شخص کا مرہون منت ہے جسکا میں ذکر کروں گا۔

شیکسپیر اور اس کے معاصرین یہ سمجھتے تھے کہ ترک جدھر رُخ کرتے ہیں فتح پاتے ہیں اور قسطنطنیہ کے پُراسرار سلاطین کے خوف سے سارا یورپ بے چین تھا۔ آج اسی دلکش شہر میں، جو اب استنبول کہلاتا ہے، لوگ بڑے اشتیاق سے شیکسپیر کے ڈرامے کھیلتے اور دیکھتے ہیں۔ بھلا شیکسپیر کے عہد میں کون خیال کر سکتا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا؟

آیئے میں بتاؤں کہ کس کی کوششوں سے ایسا ممکن ہو سکا۔ یہ شخص استنبول تھیٹر کا ڈائرکٹر ارتغرل محسن ہے۔ ایک میانہ قد، چوڑا چکلا ترک ہے جس میں ترکوں کے قدرتی دلکش حرکات وسکنات اور ساتھ ہی ساتھ ایک اداکار کی لپک جھپک اور ڈائرکٹر کی سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ اگر اسے پتہ چل جائے کہ آپ ڈرامے کو پسند کرتے ہیں تو اسکا محبت آمیز چہرہ خوشی سے چمکنے لگتا ہے۔ اگر آپ اس سے اسکے صاف ستھرے دفتر یا آرام دہ اور قدیم طرز کے تھیٹر میں ملیں، جو انیسویں صدی کی سنہری تحریروں اور گل بوٹوں سے مزین ہے، تو وہ آپ کو اپنی یادگار چیزیں دکھائے گا۔ ترکی کے اس سب سے بڑے تھیٹر میں، جو احساس خودی اور روایات کی پابندی سے آزاد ہے، شیکسپیر ایک مذہب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر آپ زندگی میں پہلی مرتبہ شیکسپیر کے کسی کھیل میں، ہیملٹ کی خود کلامی، میکبتھ کا قتل، مرچنٹ آف وینس کا مقدمہ یا اتھیلو کی تقریباً ناقابل برداشت سازشیں دیکھیں تو آپ کو کیسا محسوس ہوگا۔ یہ بھی قیاس کیجئے کہ جب ڈرامے کا انجام قطعی غیر یقینی ہو تو جذبات میں کیسا ہیجان پیدا ہوتا ہے ارتغرل محسن تھیٹر دیکھنے والوں کو یہی تجربہ کراتا ہے۔ ترکی میں ہیملٹ پہلی مرتبہ ۱۹۱۲ء میں کھیلا گیا تو ہیملٹ کا پارٹ ارتغرل محسن ہی نے کیا تھا۔ اس کے بعد یہ ۱۹۲۷ء میں کھیلا گیا۔ اس مرتبہ ڈرامہ کا ترجمہ بھی اسی نے کیا تھا۔ پھر تیسری مرتبہ اسکا ترجمہ ترکی کی سب سے بڑی اور مایۂ ناز ادیبہ محترمہ خالدہ ادیب نے کیا اور یہ ڈرامہ ۱۹۴۲ء میں کھیلا گیا۔ اس سے بڑی سنسنی پھیل گئی۔ ترکی کے ناقد اپنے فرائض کے بہت پابند ہیں اور اداکار ناقدوں کی اچھی طرح خبر لیتے ہیں لہٰذا ہفتوں تک استنبول میں اعتراضات اور قانونی کارروائیوں کا ہنگامہ برپا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اسکول کے بچے ہر منظر کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے کہ وہ اصلی ہی ہوں۔

ارتغرل محسن نے اپنی تحریک ۱۹۲۷ء میں شروع کی۔ وہ ہر سال کی ابتدا شیکسپیر کے ایک نئے ڈرامے سے کرتا ہے۔ اس کے اداکاروں کو تو شیکسپیر کے ڈرامے اس لئے پسند ہیں کہ انکا کھیلنا آسان نہیں ہے اور دیکھنے والوں کو اس لئے کہ وہ ان ڈراموں کی اداکاری اور زبان کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اگر شیکسپیر کے ڈرامہ کا ترجمہ عمدہ ہو تو ترکوں کو بہت ہی پسند آتا ہے۔ کیونکہ انھیں دلپذیر فقروں اور خوش آہنگ زبان کا بہت شوق ہے۔ ارتغرل محسن اسکا انتظار نہیں کرتا کہ لوگ استنبول آکر شیکسپیر کے ڈرامے دیکھیں بلکہ وہ جگہ جگہ ڈرامے کھیلتا ہے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے سارے اناطولیہ میں ہیملٹ اور اتھیلو کھیلا، ان دیہاتوں میں بھی جہاں اب تک صرف گھومنے پھرنے والے گویئے اور بازی گر پہنچے تھے۔ دیہاتوں کو یہ ڈرامے بہت ہی پسند آئے۔ ارتغرل محسن کو یاد ہے کہ لوگ اس موقع پر کس طرح جوش میں آکر اچھل پڑتے تھے۔ جب ہیملٹ کے خاتمہ پر رانی گرٹروڈ زہر کا پیالہ پیتے ہوئے یہ چلاتی ہے "اسپیرا اسپیرا..... وہ زہر پی رہی ہے وہ زہر پی رہی ہے!"

اگرچہ ہیملٹ سب سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے مگر یہ شیکسپیر کے ان متعدد ڈراموں میں سے ایک ہی ہے جو ترکی میں کھیلے گئے! اسکے علاوہ نشاطیہ ڈراموں میں ٹویلفتھ نائٹ، دی ٹیمنگ آف دی شریو، دی مرچنٹ آف وینس، اے ونٹرز ٹیل، دی میری وائیوز آف ونڈسر، میژر فار میژر اور ایز یو لائک اٹ اور المیہ ڈراموں میں رومیو جولیٹ، میکبتھ، کنگ لیئر اور اتھیلو شامل ہیں۔ اس سال ایز یو لائک اٹ پیش کیا گیا تھا۔ یہ ڈرامہ عہد الیزبتھ کے مزاح کا حقیقی آئینہ دار ہے۔ جب انسان کے ساتوں عہد کے مناظر موسیقیت آمیز ترکی زبان میں سنے گئے تو تھیٹر میں سناٹا تھا۔

اب تک جو کچھ ممکن ہو سکا ہے وہ یہ ہے لیکن اب سوال یہ ہے کہ مستقبل میں کیا ہو سکیگا؟ آثار تو اچھے نظر آتے ہیں کیونکہ لوگوں میں شوق ہے اور اداکار بھی موجود ہیں جن میں کہ اکثر نوجوان ہیں اور اداکاری کا شوق ہونے کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی تنخواہ پر کام کرتے ہیں اسکے علاوہ ڈرامانگاروں کی بھی کمی نہیں۔ سب سے زیادہ مقبول تو شیکسپیر ہے مگر دوسرے لوگ یعنی ایسکلس، سوفوکلس، یوروپیڈیز، بین جانسن، مولیئر، گالڈونی، گوئٹے، شیلر، چیخوف، گالز وردی، بیری کے ڈرامے بھی پیش نظر ہیں! اس وقت سومرسٹ ماہم کا ڈرامہ "ہوم اینڈ بیوٹی" کھیلا جا رہا ہے۔ اور پھر ڈرامہ بنانے والا بھی موجود ہے۔ اب جبکہ مضمون ختم ہو رہا ہے ہم اس سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آپکو ترقی کے کیسے امکانات نظر آتے ہیں۔ اس پر وہ کہے گا کہ "ہم کوئی معمولی یا چلتا ہوا کام کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہم شیکسپیر کے ڈرامے اسٹریٹ فورڈ والوں سے بہتر کھیلنے کا ارادہ رکھتے ہیں"۔ کیا اس سے بہتر خواہش اور ارادہ ممکن ہے؟

(ایشیاٹک ریویو کے اپریل ۱۹۴۵ء کے پرچہ سے ماخوذ)

---

[1] یہ مضمون مسٹر اے آر ہمفریز نے جو لیورپول یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں انقرہ سے براڈکاسٹ کیا تھا۔

گلی کا نام

افسانہ

لالہ بھگوانداس سا خاموش اور متین شخص سارے بسنت نگر میں کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ اپنی کلرکی کے بارہ سال لاہور کی گنجان و تاریک گلی کے ایک اور بھی گنجان اور تاریک مکان میں گزار کر انھوں نے اتنا اثاثہ جمع کر لیا تھا کہ لاہور کے باہر چٹیل میدانوں اور ویرانوں میں بننے والی نو آبادیوں میں سستی قیمت پر زمین لے کر مکان بنوالیں۔

اپنی گلی میں سب سے پہلا مکان انہی کا تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں تو اوقی اور برسات میں اتنا پانی جمع ہو جاتا کہ لالہ جی کا مکان ایک چھوٹا سا جزیرہ نظر آنے لگتا۔ لیکن آہستہ آہستہ جہاں صرف انھیں کا مکان روشنی کے مینار کی طرح اکیلا کھڑا تھا وہاں دوسرے مکان بھی بننے لگے اور ایک گلی کی صورت نکل آئی۔ پھر مالک مکان آئے۔ کرائے دار آئے۔ ان کی بیویاں بچے اور بچیاں آئیں اور جہاں دوپہر کو ہوا کی سائیں سائیں اور رات کو جھینگروں کا شور سناٹوں کو اور بھی گہرا کر دیتا تھا وہاں اب کبھی کبھی گراموفون کے ریکارڈ بجنے لگے۔ ایک دو گھروں میں ہارمنیم کی پیں پیں بھی سنائی دینے لگی۔ کبھی کبھی ہفتے میں صبح شام سنکیرتن کی "رادھا۔ کرشن" یا "رام دتی رام" کی پکار بھی آنے لگی۔ بسنت نگر میں اب آریہ سماج اور گوردوارہ بھی بن گیا۔ کھیل کود کے لئے میدان اور کشتی کے لئے اکھاڑا بھی قائم ہو گیا۔ آریہ سماج کی طرف سے کبھی کبھی پربھات پھیری بھی ہونے لگی۔ لیکن یہ سرگرمیاں لالہ جی کی خاموشی اور بے حسی کو نہ توڑ سکیں۔ پہلے اگر شام کو کبھی باہر میدان میں گھوم لیتے تھے تو اب اس سے بھی گئے۔ صبح اٹھ کر چپ چاپ دفتر چلے آتے اور واپس آکر ایک بار جو گھر میں داخل ہوتے تو پھر انھیں کوئی نہ دیکھ پاتا۔ بیوی بچے تھے مگر وہ ان کی اس خاموشی اور بے حسی کو دور نہ کر پاتے۔ شوہر بیوی میں کبھی ہنسی دل لگی کی ایک بات نہ ہوئی۔ کبھی مسکراتے بھی تو اس متانت سے کہ غریب کو کبھی جواب تک دینے کا حوصلہ نہ ہوا۔ لالہ جی نے کبھی کسی کتاب سے کا تھا بھی نہیں کی اور سیاسیات میں ان کی دلچسپی اپنے ساتھی کلرکوں کو اخبار پڑھتے دیکھنے سے زیادہ نہیں بڑھی۔ دفتر سے آکر کھانا وغیرہ کھانے کے بعد جا کر چارپائی پر لیٹ جاتے اور کھڑکی میں سے کسی راہ چلتے کو دیکھ کر پھر کروٹ بدل لینے کو ہی مادنٹ ایورسٹ سر کرنے کے برابر سمجھتے۔

ایک دن لالہ جی صبح سویرے جو کسی کام سے گھر کے باہر نکلے تو انھیں اپنے گھر کے بالکل سامنے کے مکان کی سفید دیوار پر ایک نیلا بورڈ لگا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ذرا آگے بڑھے بورڈ پر خوبصورت الفاظ میں لکھا ہوا تھا "جوندسنگھ سٹریٹ"۔ بورڈ تو شاید کچھ دن پہلے سے لگا ہوا تھا لیکن لالہ جی کو اسی دن دکھائی دیا۔ انہیں کچھ حیرت ہوئی کچھ صدمہ ہوا کچھ غصہ آیا۔ یہ جوندسنگھ۔ یہ ان کے دفتر کا معمولی جونیر کلرک سب سے آخر میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر گلی کا مالک بن بیٹھا۔ اس چپاٹ میدان کو گلزار بنانے کی داغ بیل خود انھوں نے ڈالی۔ گلی میں سب سے پہلے مکان انھوں نے بنوایا۔ مکانوں کی حفاظت کے لئے چوکیدار انھوں نے رکھا۔ گلی میں سب سے بڑا مکان اُن کا، پھر یہ جوندسنگھ ان کا حق چھیننے والا کون؟

وہ جوش سے گھر کے اندر گئے جس کام سے باہر آئے تھے وہ بھول گیا۔ انھوں نے بیوی کو فوراً غسل خانے میں پانی رکھنے کو کہا اور ادھر ہینڈ پمپ کی آواز ختم ہوئی ادھر وہ غسل خانے میں جا داخل ہوئے۔ ان کی بیوی نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی اور گالوں کے پھولے ہوئے گوشت کی وجہ سے اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی۔ ان کا جسم جس نے بیجی کی وجہ سے گوشت پھول کر رکھا تھا جیسے ایکبار ہی اپنی غلطی کی تلافی کر لینا چاہتا تھا۔ اسے اس طرح دیدے پھاڑے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر لالہ جی کی بھنویں تن گئیں لیکن دوسرے لمحے ان کی بیوی باہر نکل گئی۔ جلد از جلد غسل خانہ سے فارغ ہو کر وہ بازار گئے۔ پینٹر کی دوکان پر جا کر اسے ایک بڑا سا بورڈ لکھا کر دینے کا آرڈر دے آئے۔ اس سے تاکید کی کہ شام تک ضرور تیار کر دے۔

بازار جانے اور پینٹر سے مول تول کرنے میں انھیں دیر ہو گئی تھی اس لئے وہ سائیکل کو اندھا دھند بھگاتے ہوئے دفتر پہنچے۔ جب وہ آکر اپنی کرسی پر بیٹھے تو ان کا سانس پھول رہا تھا۔

دفتر میں اس دن ان کا جی نہ لگا۔ جوندسنگھ کی اس گستاخی پر ان کا جی جلتا رہا۔ سارا دن بیٹھے بیٹھے وہ اس مسئلہ پر غور کرتے رہے۔ انھوں نے اپنا سارا لائحہ عمل تیار کر لیا اور دل ہی دل میں اس بات کا فیصلہ کیا کہ وہ جوندسنگھ کو کبھی اپنی حق تلفی نہ کرنے دیں گے۔ شام کو وہ دفتر سے سیدھے پینٹر کی دوکان پر پہنچے بورڈ تیار نہ تھا۔ لالہ جی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ ان کی خاموشی اور متانت نہ جانے کہاں اڑ گئی۔ اپنا وعدہ پورا نہ کرنے پر انھوں نے پینٹر کو بے طرح ڈانٹا۔ آخر جب اس نے وعدہ کیا کہ وہ دو گھنٹے میں لوٹ کر آئیں بورڈ انھیں تیار ملے گا تو جا کر لالہ جی کا غصہ شانت ہوا اور وہ گھر کی طرف چلے۔

لیکن گھر آکر انھیں چین نہ ملا۔ جلدی جلدی کھانا کھا کر وہ پھر شہر گئے اور پینٹر کے سر پر جا سوار ہوئے۔ بتیاں جل چکی تھیں جب انھیں بورڈ ملا۔ سائیکل کا لیمپ وہ گھر بھول گئے تھے۔ ٹریفک پولیس ان دنوں بڑی مستعدی سے کام کر رہی تھی۔ ناچار دو میل پیدل چل کر وہ بسنت نگر پہنچے۔ ایک پیسے کے کیل انھوں نے راستہ میں لے لئے تھے۔ گھر پہنچ کر سائیکل ڈیوڑھی میں رکھی۔ اندر سے سیڑھی لا کر باہر دیوار کے ساتھ لگائی اور ہتھوڑی کی مدد سے انھوں نے وہ بورڈ گلی کے

اپندرناتھ اشک

نکڑ پر اپنے مکان کی دیوار سے لگا دیا۔

صبح اٹھ کر وہ سب سے پہلے باہر گئے۔ دیکھا بڑے بڑے خوبصورت الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔

"بھگوانداس حویلی والا سٹریٹ"

پہلے انھوں نے گلی کا نام صرف بھگوانداس سٹریٹ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس وقت انھیں یاد آیا کہ ان کے گاؤں ملکیرمیں ان کے اجداد کی ایک بڑی حویلی تھی اور ان کے پرکھوں کو "حویلی والے" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اسوقت اگرچہ نہ ان کے پاس وہ حویلی تھی اور نہ وہ نام لیکن اپنے نام کے ساتھ حویلی والا لگا کر انھوں نے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنے پرکھوں کے اس اقتدار کو بھی زندہ جاوید کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا — بھگوانداس حویلی والا سٹریٹ بورڈ کو دیکھ کر ان کا دل مسرت سے کھل اٹھا۔

ان کی بیوی رسوئی خانے میں بیٹھی آگ سلگا رہی تھی۔ اچانک اس کے ہاتھوں نے پنکھا ہلانا بندکر دیا۔ اس کے کان سننے لگے۔ لالہ جی گا رہے تھے۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ وہ رسوئی کی چوکھٹ پر آ کھڑی ہوئی۔ لالہ جی صحن میں گھومے جاتے تھے اور گائے جاتے تھے۔ میرے من میں اے جی میرے من سنو جی میرے من میں بسا ہے چور...... چور.....

وہ ششدر سی وہیں چوکھٹ پر کھڑی رہ گئی۔

اس دن سے لالہ بھگوانداس کی زندگی میں انقلاب سا آگیا۔ تیسی کی جگہ پھرتی نے لے لی خلوت سے نکل کر وہ جلوت میں آ گئے۔ پڑوسیوں سے راہ و رسم بڑھائی۔ بسنت نگر کی آریہ سماج کے ممبر بن گئے۔ گوردوارہ میں بھی شری گورو صاحب کی باتیں سننے کے لئے جانے لگے۔ گلی کی حالت کو سدھارنے کے لئے انھوں نے محلے کی ایک کمیٹی بنائی۔ سب سے پہلے خود چندہ دیا اور پھر دوسروں کے خاموش ہو جانے پر خود تمام خرچ چلاتے رہے۔ اپنی جیب سے خرچ کر کے انھوں نے گلی میں عارضی نالیاں بنوائیں لیکن جب ان سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا اور برسات میں گلی کی حالت بدتر ہو گئی تو انھوں نے "بھگوانداس حویلی والا سٹریٹ" بسنت نگر کی زبوں حالی پر اخباروں میں شور مچایا۔ کمیٹی کی بےحسی کو کوسا اور جب اتنے پر بھی کوئی شنوائی نہ ہوئی تو انھوں نے کمیٹی کو ہرجانے کا نوٹس دیدیا۔

بات یہ تھی کہ گلی میں پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ آبادی نئی تھی اور اس کے لئے نالیوں کی سکیم بنی نہ تھی۔ مالک مکانوں نے اپنے اپنے مکانوں کے سامنے ہودیاں (چہ بچے) بنوا رکھے تھے۔ لالہ بھگوانداس کی کرپا سے عارضی نالیاں بھی بن گئی تھیں۔ ان سب کا پانی اس بڑے چہ بچے میں اکٹھا ہو جاتا جو کمیٹی نے لالہ جی کے مکان کے قریب بنوا رکھا تھا۔ ہر روز کمیٹی کی موٹر آتی اور اس چہ بچے کو خالی کر جاتی لیکن برسات کے دنوں میں اس چہ بچے کی کیا بساط۔ اردگرد بہت جگہ کھلی تھی اتنا پانی جمع ہو جاتا کہ موٹر ہفتوں لگی رہتی تو خالی نہ کر پاتی۔ لالہ جی کا مکان گلی کی نکڑ پر تھا اس لئے گلی کا اور چہ بچے کا سارا گندہ پانی انہیں کے اردگرد پڑا سڑا کرتا۔ اس کی بنا پر کمیٹی کو نوٹس دیدیا تھا کہ اگر وہ فوراً گلی میں پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہ کرے گی تو وہ اس پر ہرجانے کا دعویٰ کر دیں گے۔ کیونکہ ان کے مکان کی بنیادوں کو ضعف پہونچ رہا ہے اور پانی کی سڑاند کے سبب ان کا کنبہ بیمار پڑا رہتا ہے۔

انھوں نے اخباروں میں اتنا شور مچایا تھا۔ اتنے جلسے کئے اور اتنے بیان شائع کرائے تھے کہ کمیٹی نے سارے بسنت نگر میں پکی نالیاں اور فرش بنوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بجٹ پاس ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتے۔ راج مزدور آئے اور دوسری گلیوں کے ساتھ انکی گلی میں بھی فرش بننے لگا۔ گلی والوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ ان دنوں لالہ جی کے لئے تو گھر میں بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ جوند سنگھ کے علاوہ سب پڑوسیوں کے گھر جاتے، سب سے اپنی کارگذاری کی کہانی سناتے۔ خوب بڑھا چڑھا کر سبھی بناتے۔ کھیل کے میدان اور اکھاڑے میں جا کر وہی باتیں بار بار سناتے روز صبح و شام گلی میں نالیاں و فرش بنتے دیکھتے گویا یہ سب انہیں کے خرچ سے بن رہا ہو۔

ان کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ان کے پڑوسی اب گلی کے نام پر کوئی اعتراض نہ کریں گے۔ اکثر نے ان کو یقین دلایا تھا کہ وہ جب بھی خط لکھتے ہیں اپنا ایڈریس "بھگوانداس حویلی والا اسٹریٹ" ہی دیتے ہیں۔ اور انہیں اس پتہ سے فوراً ہی خط پہنچ بھی جاتے ہیں۔ وہ حیران ہوتے کہ جب گلی کا نام بھگوانداس حویلی والا سٹریٹ مشہور ہو گیا ہے تو جوند سنگھ کمبخت ابھی تک کیوں اپنے مکان پر وہ ذرا سا بورڈ لگائے ہوئے ہے۔

"جاٹ جو ہوا" لالہ جی استہزا سے کہتے اور دل ہی دل میں اسے اس بیوقوفی پر معاف کر دیتے۔

ایک دن لالہ بھگوانداس جب دفتر سے آئے تو انھوں نے دو آدمیوں کو گلی کے سرے پر نار سے ایک بڑا بورڈ لٹکاتے دیکھا۔ نام پڑھا تو ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ دوسرے لمحے انھوں نے غضبناک ہو کر پوچھا۔

"یہ بورڈ کس کی اجازت سے لگا رہے ہو؟"

"کمیٹی کی" کیل ٹھونکتے ہوئے ایک نے جواب دیا۔

"کونسی کمیٹی؟" لالہ جی گرجے۔

"میونسپل کمیٹی"

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

بکھرے ہوئے جلوے

مری نگاہِ تخیل نے جھکولے شعلے
بصد غرور مری عاجزی پہ خندہ زناں
مہِ تمام کی لہروں میں جگمگاتے ہوئے
وفا پہ میری کبھی اشکِ غم بہاتے ہوئے
لچکتی شاخ میں غنچوں کی مسکراہٹ میں
لئے نکہتِ گل کے لطیف جھونکوں میں
سکوں فروشِ شفق کی تند موجوں میں
جمالِ حسن کی مستیوں تو بہتے ہوئے
صبا کے دوش پہ بکھرائے اپنی زلفِ دراز
قدم قدم پہ نئی زندگی عطا کرتے

کچھ ایک بار نہیں بار بار دیکھا ہے
افق سے دور ترے روپ کو سا دیکھا ہے
مثالِ برقِ درخشندہ شعلہ بار دیکھا ہے
جفا پہ اپنی کبھی شرمسار دیکھا ہے
بیاب نظر تجھے اے گلعذار دیکھا ہے
مثالِ مشکِ ختن عطر بار دیکھا ہے
ترا ہی روپ ترا ہی نکھار دیکھا ہے
تری ادا میں نے خمار دیکھا ہے
مرے فناؤں نے آئینہ وار دیکھا ہے
تجھی کو ہمرہِ فصلِ بہار دیکھا ہے

دنی ہی ظلم کے اشعار لکھے ہوئے
ادا کے ساتھ دو بار دیکھا ہے

عزیز احمد (عثمانیہ)

ہماری شام و سحر

نشاطِ دردِ جگر، آہ اس کو کیا کہیے؟
زبانِ شوق پہ اُن کا ہی نام رہتا ہے!
نظر کو ساغرِ غم میں ڈبوئے رہتی ہوں
نہ ہوشِ حال نہ احساسِ حال رہتا ہے
ہزار دل سے ہم انکو بھلائے جاتے ہیں
اندھیری رات میں بھی منظرِ درخشاں ہیں
صبا کے دوش پہ اُن کے سلام آتے ہیں
ہمارے آہ غمِ عشق بے اثر کو نہ پوچھ

فراغِ شام و سحر! آہ اسکو کیا کہیے؟
انھیں کی یاد کہ ہر لحظہ کام رہتا ہے
تصورات کی دنیا میں کھوئے رہتی ہوں
بس ایک فکر انھیں کا خیال رہتا ہے
نہ جانے کیوں وہ ہمیں یاد آئے جاتے ہیں
جدھر نگاہ اُٹھاتی ہوں وہ نمایاں ہیں
ستارے لے کے نیا اک پیام آتے ہیں
بلاکشانِ محبت کی تو سحر کو نہ پوچھ

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند
بلاکشانِ محبت بہ کوئے یار روند

سیدہ اختر

مشکلات

اُف مشکلاتِ راہِ عدم کچھ نہ پوچھیے
میری حکایتِ غمِ ہجراں طویل ہے
تخیل ہی کی انجمن آرائیاں ہیں سب
کچھ دل پہ انحصار نہیں بزمِ حسن میں
دل بیقرار آنکھوں میں نم روح مضطرب
اس قیدِ بندِ زیست میں آن مگر بلا
جوشِ امتدادِ غم کا ہے ستم
ہے انتظارِ دیدِ جمالِ سبب ابھی

رک رک کے آہ ہی بس قدم کچھ نہ پوچھیے
دل کب سے ہے رہینِ ستم کچھ نہ پوچھیے
روداد سیرِ دیر و حرم کچھ نہ پوچھیے
کیا کیا الم کے آئے ہیں ہم پہ کچھ نہ پوچھیے
ہم آفرینیِ شبِ غم کچھ نہ پوچھیے
کب سے اٹھا رہے ہیں ستم کچھ نہ پوچھیے
کس طرح تیر کرتے ہیں ہم کچھ نہ پوچھیے
آنسو نہیں کیوں نکلتا ہے دم کچھ نہ پوچھیے

ان قافیوں میں حضرتِ قائل یہ چند شعر
لکھے گئے ہیں میں نے رقم کچھ نہ پوچھیے

سائل انبہٹوی

بینشِ امروز

بھرے احساس کی شمعیں ہیں فروزاں لیکن
دل میں جذبات کی امواج ہیں رقصاں لیکن
چہرۂ شوق ہے تابندہ و خنداں لیکن
جستجو ہر گھڑی کوشاں ہے کہ درماں ہو جائے
وہی گلشن وہی سبزہ ہے وہی ابر مگر
وہی رنگینیٔ غنچہ وہی رعنائیٔ گل
دستِ گردوں میں چھلکتے ہوئے ساغر ہیں وہی
ہے بستگیٔ رنگین تصور ہے مگر
پی ہے جیسے کہیں زہر میں حل کردہ مٹھاس
روح پھونکی کوئی تصویرِ شکیبائی میں

زیست میں پھر بھی اندھیر نظر آتا ہے مجھے
درد بھرا ہوا دریا نظر آتا ہے مجھے
چشمِ امید میں قطرہ نظر آتا ہے مجھے
دم مگر عیش کا گھٹتا نظر آتا ہے مجھے
حسنِ ہر کیف کا پھیکا نظر آتا ہے مجھے
رنگ لیکن ذرا دھندلا نظر آتا ہے مجھے
پھر بھی آغوش پیاسا نظر آتا ہے مجھے
پھول کی اوٹ میں کانٹا نظر آتا ہے مجھے
تلخیٔ غم میں اضافہ نظر آتا ہے مجھے
جسمِ بے جان لرزتا نظر آتا ہے مجھے

اب بھی آجائے جو کوئی کہ کروں استقبال
دل سے یکلخت بھلا دوں غمِ ماضی و حال

سرور قدوائی
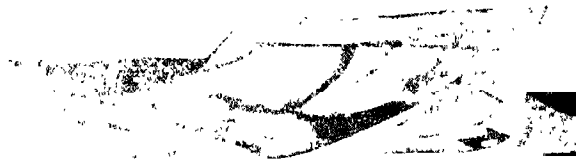
شاہ فیصل

شاہ فیصل تاج محل کے موڈل کا معائنہ کر رہے ہیں۔ یہ موڈل آپکے کمرے کی زینت کیلئے ہندوستان سے بھیجا گیا ہے۔

عراق کے نوعمر بادشاہ شاہ فیصل ثانی اپنے والد شاہ فیصل اول کے اچانک انتقال کے بعد ۱۹۳۹ء میں تخت نشین ہوئے۔ آپکو لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ ورزش اور کھیل کود کا بھی بڑا شوق ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، حساب، ڈرائنگ اور انگریزی زبان ماہر استادوں سے پڑھتے ہیں۔ فٹ بال، تیراکی اور سائیکل کی سواری کا بھی شوق ہے۔ آپ اکثر اپنی سائیکل یا موٹر میں سوار ہوکر شہر میں گھوما کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ادبی اور سیاسی جلسوں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔

شاہ فیصل ہندوستان کے بعض مقامات کی تصویریں دیکھ رہے ہیں واقعی ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لینا آپ کیلئے ضروری کیونکہ ہندوستان اور عراق ایک دوسرے سے کچھ زیادہ دور نہیں ہیں

زال و رودابہ

بھوسی فارسی کا مشہور شاعر ہوا ہے۔ اسکی کتاب "شاہنامہ
یا کی سب سے زیادہ مشہور کتابوں میں سے ہے۔ شاہنامہ
بے فردوسی نے قدیم ایران کی تاریخ قومی نقطۂ نظر سے
لم کی ہے۔ موجودہ زمانہ میں شاہنامہ کی ہردلعزیزی
بہت بڑھ گئی ہے۔

شاہنامہ کا اصل مقصد تو ایران کے قدیم بادشاہوں
کے کارناموں کو زندگئی جاوید بخشنا تھا لیکن اپنی طویل
ظم میں دلچسپی پیدا کرنے کیواسطے فردوسی نے بعض
عشقیہ قصے بھی درج کردئیے ہیں جن میں زال اور رودابہ
بہت مشہور اور دلچسپ ہے۔

زال منوچہر بادشاہ ایران کے درباری پہلوان سام
یمان کا بیٹا تھا اور رودابہ مہراب بادشاہ کابل کی بیٹی۔
ال رودابہ پر عاشق ہوگیا اور آخر میں ان دونوں کی
ادی ہوگئی

زال اور رودابہ کی ملاقات

طوس میں فردوسی
کا مقبرہ

ایک امریکی اسٹوڈیومیں ڈائرکٹر کنٹرول بورڈ سے
مختلف زاویوں سے پروگرام دیکھ رہا ھے

یہ اخباری مبصر ایک امریکی پروگرام میں جاپان کے فوجی اڈوں
پر بمباری کا حال آلہ غائب بینی کے ذریعہ بیان کر رہا ھے۔

آلۂ غائب بینی میں نئی ترقی

جب ریڈیو پر ہم کسی بڑے آدمی کی تقریر یا کسی مشہور گانے والے کا گانا سنتے ہیں تو قدرتی طور پر ہمارے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ہم اس مقرر یا فنکار کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اب کچھ ہی عرصہ میں ہماری یہ دلی آرزو پوری ہوتی نظر آرہی ہے۔ لڑائی سے پہلے صرف انگلستان میں آلۂ غائب بینی کے تجربے کئے جارہے تھے لیکن لڑائی کے زمانے میں اسکی ترقی رک گئی۔ البتہ امریکہ چونکہ جنگ سے محفوظ رہا اسلئے وہاں لڑائی کے دوران میں بھی یہ تجربات جاری رہے۔ انگلستان میں اسکی ترقی باقاعدہ طور پر تو رکی رہی لیکن مسٹر بیرڈ نے نجی طور پر اپنے تجربات برابر جاری رکھے۔ اب کچھ ہی دنوں بعد ہم ہر چیز کی تصویر ریڈیو پر دیکھ سکینگے۔

آلۂ غائب بینی کے مشہور انگریز موجد مسٹر بیرڈ اور
نیا آلہ جو کچھ ہی عرصہ میں عام طور پر بازاروں میں بکنے لگا

مدراس کے جنر

اہل مدراس خوش قسمت ہیں کہ انکے صوبے میں ا
ایسا ہسپتال موجود ہے جسکا کل انتظام انکے صوبہ
حکومت کے ہاتھ میں ہے اور جسکا طبی سامان جدید تر
ہے۔ اس ہسپتال کے ڈاکٹروں کی قابلیت اور تجربہ ا

اس کمرے میں مریضوں کا معائنہ اور انکا دریافت
حال زیادہ تر طلبا کرتے ہیں۔

زیادہ ہے کہ یہ جنرل ہسپتال دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ
ملک کے ہسپتال کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ ان ڈاکٹروں کے
زیر نگرانی نوجوان طلبا طبی تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں
جو شخص اس ہسپتال میں جائیگا وہ اسکی عمارت سے
متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اتفاقی حادثوں کے
شکار مریضوں کی بروقت دیکھ بھال کیلئے اس ہسپتال کا ایک
شعبہ رات دن کھلا رہتا ہے۔ سرطان کا علاج یہاں کیلئے
خاص ہے اور مفت کیا جاتا ہے۔ علاج کیلئے مریض یہاں
دور دور سے آتے ہیں۔ "ایکسرے" کا محکمہ بھی خاص ہے

س کمرے میں جدید ترین آلوں سے آپریشن کیا جا رہا ہے۔
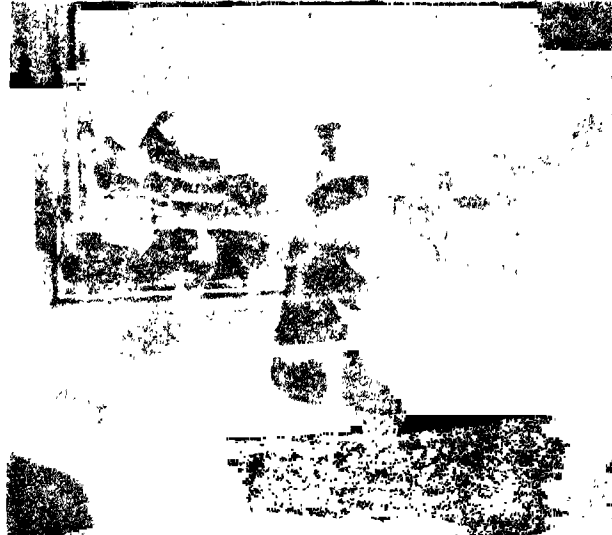
کمرے کے مریض وہ ہیں جنکے آپریشن کیا گیا ہے۔ اب یہ آرام
ہے ہیں۔ ان بستروں میں مرد بھی ہوئے ہیں اور عورتیں بھی۔

هسپتال کی سیر

سرطان کے اس مریض کا علاج ان شعاعوں سے کیا
جا رہا ہے جنکو « شاول » کہتے ہیں۔

اس عورت کے سرطان کا علاج « ایکسرے » کے
ذریعہ کیا جا رہا ہے۔
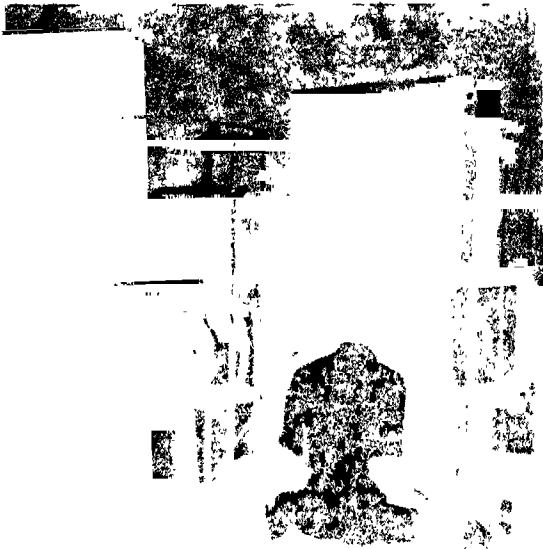
یہ مریض رنگین چشمے لگا کر اپنے جسم کو صحت
بخش شعاعوں سے سینک رہے ہیں۔

اک ، ' کے شعبہ میں ، ' اس مریض کا فوٹو اتارا

آگاہ ہیں، جنید گوکجر اور ارتغرل الکیں جنہوں نے کھیل دلاھولئیا
کے پہلے ایک میں کام کیا۔

ترکی میں اداکاری کا سرکاری اسکول

انقرہ میں حکومت کی طرف سے ایک ایسا اسکول کھولا گیا ہے جہ
طلبا کو اداکاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں ڈرامہ اور آپیرا دونو
کا کام سکھایا جاتا ہے۔ طلبا خوش قسمت ہیں کہ انکو کارل ایبر
ایسا ڈائرکٹر مل گیا ہے۔ اس اسکول کے طلبا جو ڈرامے کھیلتے ہ
وہ اس پایہ کے ہوتے ہیں جیسے یورپ میں کھیلے جاتے ہیں۔حال ہی م
شیکسپئیر کا ڈرامہ «کامیڈی آف ایررز» کھیلا اور بہت پسند کیا گ

...پئیر کے ڈرامہ «جولیس سیزر» کا ایک منظر۔
اسکے ہدایت کار ڈاکٹر ایبرٹ تھے۔

نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ

10

ملاقات کا کمرہ اور اسکا بہترین فرنیچر

نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ کا دروازہ

دیوان خاص جہاں کابینہ کی نشست ہوتی ہے۔

نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ لندن کا وہ خاص مکان ہے جو برطانیہ کے وزیر اعظم کے رہنے کیواسطے سرکاری طور پر مخصوص ہے۔ اسکو انگلستان کے چند سیاست کا دماغ کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہاں انگلستان کے اراکین کابینہ جمع ہوتے اور بڑے بڑے اہم اندرونی اور بیرونی معاملات کو طے کرتے ہیں۔

زندانی

ہزاروں سال سے زنداں میں پابند سلاسل ہوں
مرے پیش نظر مضبوط فولادی سلاخیں ہیں
یہ فرسودہ عمارت ہے
در و دیوار بوسیدہ
چھتیں سر پہ سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ؟
معاذ اللہ یہ جالے در و دیوار پر خنداں !
یہاں پر سیکڑوں زہریلے کیڑوں کا بسیرا ہے
اور اکثر ان کی آوازیں بھی آتی ہیں
ہمیشہ کانپ کانپ اٹھتا ہوں میں ان کے تصور سے ؟
یہاں دن کو بھی شب معلوم ہوتی ہے
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
اجالے کا یہاں پر ذکر ہی کیا ہے !
میں اکثر سوچتا رہتا ہوں تنہائی کے عالم میں
یہ زنداں ہے ؟
یہ بوسیدہ عمارت ہے ؟
یہ لوہے کی سلاخیں ہیں ؟
یہ دیواروں پہ جالے ہیں ؟
یہ زنجیروں کی جھنکار دنکی درد آگیں صدائیں ہیں ؟
مسلسل جو مرے کانوں میں آتی ہیں ؟
یہ آخر کیا ہے ؟ —— اور کیوں ہے ؟
بھلا اس سے مجھے مطلب !
میں اک بیچارہ زندانی !
دماغ و دل پہ حس کے سخت پہرے ہے !
مگر دیوار پر رقصاں ہیں یہ پرچھائیاں کیسی ؟
جو گاتی ہیں بجاتی ہیں

اور اکثر ایسی ہی محفل جماتی ہیں
صدائیں ان کی بل کھاتی ہوئی کانوں میں آتی ہیں
جو زنداں کے سیہ خانے کو اکثر جگمگاتی ہیں ؟
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ ان کی زرفشاں ، ضوریز محفل میں
ہزاروں ساغر و مینا کھنکتے ہیں
شراب تند کے ساغر چھلکتے ہیں
مچلتے ہیں
کچھ ایسے دور چلتے ہیں
کہ مست و بیخود و سرشار ہو جاتی ہے کل دنیا ؟
یہ منظر دیکھ کر میں بھی مچلنے لگتا ہوں بالآخر ،
مرے دل پر
عجب اک سرخوشی کی کیفیت ہو جاتی ہے طاری ،
لبوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے ، جانے کیوں ؟
اور اس عالم میں اکثر یوں بھی ہوتا ہے
کہ زنداں کی سلاخیں ٹوٹ جاتی ہیں ،
مجھے محسوس یوں ہوتا ہے میں زنداں کے باہر ہوں
تصور کے فسوں پر دو عجز برسے ہیں
فلک پر جگمگا کر جو ستارے مسکراتے ہیں
میں ان کو توڑ لاتا ہوں

اور اک دنیا بناتی ہے
حسیں دنیا !
یہ لیکن زلزلہ کیسا ؟
افق پر آندھیاں چنگھاڑتی کیوں ہیں ؟
یہ کیسا خون کا سیلاب ہے جو امڈا آتا ہے
ہزاروں سیکڑوں فرسودہ چیزوں کو
سمیٹے اپنے دامن میں !
فضا سہمی ہوئی کیوں ہے ؟
میں حیراں ہوں پریشاں ہوں
کھڑا ہوں زندگانی کے سمندر کے فسوں انگیز ساحل پر
افق پر دور تاریکی کے دامن میں
ستارے کی طرح سے روشنی کا ایک منارہ مسکراتا ہے
میں جس کو دیکھتا ہوں ٹکٹکی باندھے
مگر ہنگامہ برپا ہے !
یہ کیسی ضرب کاری آف سلاسل پر !
مرے دل پر
کہ بد نظمی سی طاری ہو گئی ہے ساری محفل پر
جھمکتی تھیں جو اب پرچھائیاں کیسی ؟
یہ آخر برہمی کیوں ہے ؟
یہی کیا وقت کے دھارے کا اک ادنیٰ کرشمہ ہے ؟
مگر اس سے مجھے مطلب
میں اک بیچارہ زندانی !
ہزاروں سال سے زنداں میں پابند سلاسل ہوں !!

عبادت بریلوی

خیام کی ایک شام

(شام کے وقت خیام کسی پرفضا مقام پر بیٹھا ہوا فرض کرلیا جائے)

دوشیزاؤں کا کورس (شاعر کے خیر مقدم کے لئے)

(ہر ساز یا نغمے کی لے کو بھی موسیقی میں ڈھالنے کی کوشش کیجائے)

تسلیم کہ اے نغمہ گر گردش ایام — انگڑائیاں لیتی ہے سر بزم افق شام

اے شاعر خیام!

تعظیم کہ اے مطرب نیاے مے و جام — یہ بربط و پیمانہ ہے یہ ساقی گلفام

اے شاعر خیام!

(ساز مدھم پڑ جاتا ہے)

خیام:— (شاعرانہ تمکنت کے ساتھ)

برخیز و بیا برائے دل ما — حل کن بجمال خویشتن مشکل ما

یک کوزۂ مے بیار تا نوش کنم — زاں پیش کہ کوزہا کنند از گل ما

(ایک نشاطیہ ساز کے ساتھ)

کورس (اب لڑکیاں اسی رباعی کا آزاد ترجمہ پیش کرتی ہیں)

اٹھ ساقی گلفام! پلا دورِ بہاراں

پھر دل ہے پریشاں

اک جام! ارے جام کہ ہیں پی لوں سر شام

پہلے نہ گزر جائے کہیں عمر گریزاں

اٹھ ساقی گلفام ———!

ساقی کا نغمہ (ایک طربیہ ساز کے ساتھ)

جام شراب پی لو — خورشید کے پیالے میں

عرق گلاب پی لو

جام شراب پی لو — ———!

سورج کی جبینِ ماہ تیرے پہ — ڈالے ہے نقاب پی لو

جام شراب پی لو ———!

دوسرا منظر

(منظر کی تبدیلی کسی نئے آرکسٹرا سے ہوتی ہے)

(دوشیزاؤں کا کورس)

یہ بزم طرب، یہ موسم گل — نغمات محبت گائے جا

سرمست صنوبر کی شاخیں — دریائے رواں کو چھوتی ہیں

پھولوں کی بہاریں ہنس ہنس کر — جذبات نہاں کو چھوتی ہیں

یہ لالۂ دلبر ہیں — یہ سنبل

پھولوں نے کہا

کچھ تو نے سنا ———؟

اے شاخ کے لاپروا بلبل! — نغمات محبت گائے جا!!

یہ بزم طرب، یہ موسم گل — نغمات محبت گائے جا —!!!

(ساز)

خیام:— در فصل بہار با بتے حور سرشت — یک کوزۂ مے اگر بود بر لب کشت

ہر چند بہ نزد عام بد باشد ایں — از سگ بترم اگر کنم یاد بہشت

کورس

موسم بہاراں میں

دامنِ گلستاں میں ——— پھول لہلہاتے ہوں

اور خوشنوا طائر جھوم جھوم گاتے ہوں

ان سہانے لمحوں میں:

جب حسینۂ رنگیں

بابہار رقصاں

پیکے ساغر رنگیں ——— کوئی اور راحت ہے

کس کا نام جنت ہے

کافر مسرت ہیں، جو نہ بھول جاتے ہوں ——?!

پھول لہلہاتے ہوں

اور خوشنوا طائر جھوم جھوم گاتے ہوں ———!!

موسم بہاراں میں

دامنِ گلستاں میں ———!! (ساز)

ساقی کا نغمہ

ساقی بہار ہوں

لالہ زار کی قسم، جانِ لالہ زار ہوں

ساقی بہار ہوں ——!

موسم بہار ہے

پھولوں پر نکھار ہے ——— آج میرے ہاتھ میں ماہ و آفتاب ہے

پی لو یہ شراب ہے

ساقی بہار ہوں۔

سلام مچھلی شہری

لالہ زار کی قسم، جانِ لالہ زار ہوں!
آخرت کی فکر کیا؟
جنتوں کا ذکر کیا ———— دورِ جام آگیا
میرا نام آگیا!

ساقی بہار ہوں
لالہ زار کی قسم، جانِ زار ہوں !!! (ساز)

تیسرا منظر

دوشیزاؤں کا کورس

حسینوں میں گالو!
پی لو - پلالو!!
مسرت یہی ہے، یہی زندگانی   یہی صاف شیشے میں کچھ سرخ پانی
زمانہ ہے فانی!!
حسینوں میں گالو ———— پی لو، پلالو!!

حسینوں میں گالو!
ستاروں نے کچھ لالہ زاروں سے پوچھا   گلستاں نے رنگیں نظاروں سے پوچھا
نظاروں نے ہنس کے کہا "بس گلابی"   گلابی - گلابی - گلابی - گلابی!!!
اسی جامِ رنگیں میں جنت کو ڈھالو!!   زمانے کو آؤ شرابی بنالو!!!
حسینوں میں گالو -
پی لو - پلالو ———— !!! (ساز)

خیام:- خیام! اگر زبادہ مستی خوش باش ◆ با لالہ رخے اگر نشستی خوش باش
چو آخرِ کار نیست خواہی بودن ◆ انگار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

کورس

ہاں شاد رہو، شاد!
پہلوئے نگاراں میں زمانے کا الم کیا؟   ہاتھوں میں رہے جام تو مرنے کا بھی غم کیا؟
جینا ہے تو ایسے میں اجل کو نہ کرو یاد ———— !
ہاں شاد رہو - شاد!!
مرنا ہے تو کیوں اپنی ہی مرضی سے نہ جی لیں ————
ساغر کو اگر ٹوٹ ہی جانا ہے تو پھر کیوں
دامن کو اگر چھوٹ ہی جانا ہے تو پھر کیوں

جی بھر کے نہ پی لیں!!؟
کیا لائے ہے اے ساقیِ رشکِ گل و شمشاد؟   ہاں شاد رہو - شاد ————!! (ساز)

من کے دیپ کی جوت جگاؤ!

مدھ میں ڈوبے نین اٹھاؤ
من کے دیپ کی جوت جگاؤ!
جیون اک سپنا ہو جائے   سکھ جاگے اور دکھ سو جائے
مدھ میں ڈوبے نین اٹھاؤ..... من کے دیپ کی جوت جگاؤ!
من کو چھیڑیں مست ہوائیں   پھول کھلیں، کلیاں مسکائیں
مدھ میں ڈوبے نین اٹھاؤ.... من کے دیپ کی جوت جگاؤ!
چنتا کا بادل چھٹ جائے   من کا بند کنول کھل جائے
مدھ میں ڈوبے نین اٹھاؤ.... من کے دیپ کی جوت جگاؤ!
چاند دکھائے صورت بھولی   تارے کھیلیں آنکھ مچولی
مدھ میں ڈوبے نین اٹھاؤ.... من کے دیپ کی جوت جگاؤ!
من کا ساگر ٹھاٹھیں مارے   نین سے برسیں پریم کو دھارے
مدھ میں ڈوبے نین اٹھاؤ
من کے دیپ کی جوت جگاؤ

پریمی

ساقی کا نغمہ

پھولوں کا پیمانہ لے کر   اک رنگیں افسانہ لے کر
جانِ گلستاں آئی ———— پھر آئی!
بزمِ طرب کے پینے والو ———— ٹھہرو - کچھ ٹھہرو.
میں لیتی دل انگڑائی!!
پھولوں کا پیمانہ لے کر   اک رنگیں افسانہ لے کر
جانِ گلستاں آئی ———— پھر آئی!
زندگی کیا ہے ———— کچھ بھی نہیں
اس چھاگل کی آواز!
موت ہے کیا ———— یہ کچھ بھی نہیں
میرا ترسم انداز!
میرے ساغر کی لہروں میں بجتی ہے شہنائی ————؟!!
جانِ گلستاں آئی ————!
پھولوں کا پیمانہ لے کر   اک رنگیں افسانہ لے کر
جانِ گلستاں آئی ———— !!! (آخری طربیہ آرکسٹرا)

روسی ادب میں روشن خیالی کی تحریک

حسن امام

جاگیرداری نظام کے زمانہ کا سماج اپنے ماضی کو سمجھنے پر مجبور تھا۔ اس دور کے ادیب صرف دیکھنا ہی نہیں جانتے تھے بلکہ سمجھنا بھی۔ سماج کی یہ تبدیلی نہایت خوشگوار تھی۔ اب اس کا دل حساس تھا اور اس حساس دل کی دھڑکنیں اس کے ادیبوں کے قلم اب بھی سنا رہے ہیں۔ اس دور کے مطالعہ سے ہم کو صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ سماجی تبدیلیوں کا خارجی اور داخلی اثر ادب پر کتنا گہرا پڑتا ہے۔ اور ان تبدیلیوں کو معرض وجود میں لانے کے لئے ادب سے کہاں تک مدد لی جا سکتی ہے۔ قبل انقلاب کے روس نے کتنے ہی پلٹے کھائے اور ساتھ ہی ساتھ ادب نے بھی کتنے ہی چولے بدلے لیکن ۱۸۶۰ء سے ۱۹۱۰ء تک کے زمانہ میں ادب کا جو رنگ رہا وہ بالکل ہی نیا رنگ تھا۔ خیالات کی زبردست تبدیلیاں اتنی سرعت پذیر ہو گئی تھیں کہ اب اس ادب کی وسعت اور رنگا رنگی پر حیرت ہوتی ہے۔ اس دور کا ادب سماج کے روشن پہلو چلتا دکھائی دیتا ہے۔ ان ادیبوں کا ادبی شباب ۱۸۶۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ لیکن ان کے مطالعہ کے لئے بعض اوقات ہمیں پیچھے مڑ کر ان روشنیوں کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے جن کی رہی سہی رمق اب بھی ہمیں تحیر حیرت کر دیتی ہے۔ پھر بھی ۱۸۶۰ء سے ۱۸۸۰ء کا دور ادبی تاریخ میں ایک نقطہ تبدیلی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس ادبی تغیہ کو سماجی روش میں تراش خراش کرنے کا بعد میں جو موقع ملا وہ کسی ادب کو کم نصیب ہوا ہوگا۔ آگے چل کر روسی ادب کے اسی روشن خیال گروہ نے ایک نئی تحریک کو جنم دیا یہ "ترقی پسند" گروہ تھا جسے "روشن خیالی کا دھڑکتا ہوا دل" کہنا چاہیئے۔

"روشن خیال" گروہ کے دو مفہوم لئے جاتے تھے۔ وسیع معنی تو یہ تھے کہ روشن خیال وہ ہوتا ہے جو کافی پڑھا لکھا ہو یا کسی پیشہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اس طرح اس گروہ میں بڑے بڑے پروفیسر یا طالب علم یا اور دوسرے لوگ جیسے وکلا، ڈاکٹر وغیرہ آ جاتے تھے۔ ان لوگوں کے لئے سیاسی خیال کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ وہ کسی خیال کے بھی ہو سکتے تھے مگر مطمح نظر ان کا انسانی فلاح و بہبودی ہوتا تھا۔ لیکن محدود معنی میں اس گروہ میں صرف وہی حلقے شامل کئے جاتے تھے جو سیاسی اور سماجی مسائل میں شدت سے دلچسپی لیتے اور انہماک دکھاتے تھے اور اس سے بھی زیادہ محدود معنی یہ تھے کہ روشن خیال صرف وہی گروہ ہو سکتا ہے جو کم و بیش انتہا پسند ہو۔ سالوفلس یعنی وہ گروہ جس کی بنیاد خومیاکوف نے ڈالی تھی اور جس کا سب سے بڑا ادیب اکساکوف تھا روشن خیال گروہ میں شامل نہیں کئے جاتے اور نہ ہی رجعت پسندوں کو اس گروہ میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ "روشن خیال طبقہ" ایک اندرونی حلقہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو ایک فرقہ خیال کیا جا سکتا ہے بلکہ قریب قریب یہ سادھوؤں کا ایک ادارہ بنجاتا ہے۔

روسی روشن خیال طبقہ اس صورت میں ۱۸۶۰ء میں نمودار ہوا اور ۱۸۷۰ء تک ایک واضح حیثیت اختیار کر گیا۔ اور اس کا یہ وجود بالشویک انقلاب تک باقی رہا۔ بالشویک گروہ انقلاب سے پہلے اسی روشن خیال طبقہ کا ایک جزو تھا لیکن اسے اکثریت کبھی حاصل نہیں رہی کہ روشن خیال گروہ میں سب کے سب بالشویک تھے یا اکثریت بالشویک تھی۔ لیکن یہ جماعت ایک مقناطیسی اثر رکھتی تھی۔ جماعت کا اثر دور رس تھا۔ اکثریت اس پر مائل ہوتی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی کے طلبا تو انتہا پسندیت کی خاص فوج کے سپاہی بن گئے تھے لیکن ان کی قیادت ادبا پریس کے ہاتھوں ہی میں رہی۔ اگر تفصیل کو پیش نظر رکھا جائے تو اس گروہ کے ماننے والوں کے خیالات میں بعد المشرقین تھا۔ تاہم ضروری عقائد میں سب ایک تھے۔ انکے اصولی عقائد حسب ذیل تھے۔ موجودہ نظام (اس وقت کے روس کا) کے خلاف جنگ۔ جمہوریت اور ترقی پر ایمان لانا۔ ۱۸۶۰ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان جو لوگ کہ "چھوٹے بھائی" کہے جاتے تھے۔ یعنی جاہل مزدور طبقہ۔ ان کی خدمت کو فرض سمجھنا۔ ریڈیکل یا انتہا پسند لوگ زیادہ تر سوشلسٹ تھے لیکن وہ ترقی یافتہ آزاد خیالوں کو بھی اپنا ہی شمار کرتے تھے۔ شرط صرف اتنی تھی کہ وہ واضح طور پر حکومت کے مخالف ہوں۔ یہ عجیب بات ہے کہ روشن خیال طبقہ کی اکثر افراد ان خیالات کی تواریخ کو روسی ادب کی تواریخ سمجھ بیٹھے لیکن اس سے یہ بھی مراد نہیں لیا جا سکتا کہ تواریخ ترقی کے خاص نہج سے انکار بھی کر سکتی ہے۔

۱۸۶۰ء اور ۱۸۸۰ء کے مابین دو خاص قسم کی ریڈیکل رائیں پائی جاتی ہیں۔ ہر رائے ایک جماعت کی شکل میں نمودار ہوئی۔ پہلی جماعت تشکیکیوں کی ہو۔ یہ لوگ اپنے کو حقیقت پسند مفکر بھی کہا کرتے تھے۔ دوسری جماعت عوام پرستوں یا ناروڈیکوں کی ہے۔

تشکیکی جماعت مادہ پرستی اور لاادریت پر زیادہ زور دیتی تھی۔ سائنس اور خصوصاً ڈاروِن کا علم طبیعیہ ان کا خاص ہتھیار تھا۔ انہیں نے جمالیات کش تحریک کو پروان چڑھایا۔ وہ سوشلسٹ تو تھے لیکن ان کا سوشلزم

گوشہ گمنامی میں تھا۔ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ عوام کو طبیعات اور علم ارتقا سے روشناس کر دیا جائے۔ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۸ء تک ان کا اثر اپنی انتہا پر تھا۔ اس وقت ان کے پاس اُن کا قابل ترین لیڈر مشہور پمفلٹ باز پیسارِوف موجود تھا۔ لیکن اس کے انتقال سے تشکیلی تحریک کی کمر ٹوٹ گئی اور یہ ۱۸۸۰ء تک زندہ نہیں رہ سکی۔

عوام پرست علانیہ طور پر سوشلسٹ تھے۔ ان کا نام ان کے مسلک یعنی "عوام پرستی" سے اخذ کیا گیا۔ عوام سے ان کی مراد مزدور طبقوں سے تھی۔ اور خاص طور پر کسانوں سے۔ ان میں زیادہ تر "ضمیر گزیدہ شرفاء" تھے یعنی خوش طبقہ کی افراد جو کہ اپنی تمام زندگی کو اس ظلم کا کفارہ سمجھتے تھے جو کھیت مزدوری دور میں "عوام" پر کئے گئے تھے۔ "ملاکی کا یہ خیال ان کے ضمیر کو چھپا رہا تھا۔ اولاً تو وہ زیادہ تر غیر سیاسی قسم کے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ سماج میں اندرونی طور پر ایک ایسا انقلاب برپا ہو جائے جو زرعی پنچایت کو نیا جنم دیدے۔ ۱۸۸۰ء سے چند ہی سال پہلے انہوں نے ایک نئی جماعت قائم کر لی جس کا نام "عوام کی مرضی" رکھا گیا۔ اس پارٹی نے انقلابی طریقے اختیار کئے اور انہیں کے ہاتھوں الگزنڈر دوم کو تابوت میں رکھا گیا۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان میں ان کے اس طرز عمل کا شدید ردِعمل ہوا جس نے کچھ دنوں کے لئے ان کی عملی انقلابیت کے قوٰی شل کر دئے۔

لیکن روشن خیالوں میں نارودنکس سب سے زیادہ با اثر اور اکثریت میں رہے۔ انہوں نے ریڈیکل روشن خیالوں کو ۱۸۹۰ء میں شروع ہونے والی مارکسی تحریک کے پہلے دور میں بھی اپنی قیادت میں رکھا۔ مگر اس کے بعد ان کا اثر نہ رہا۔ دہشت پسندوں کی شکست کے بعد ان میں سے کچھ تو بالکل ہی غیر سیاسی خیالات کے ہو گئے اور عوام پرستوں میں سے بہتیروں نے ٹالسٹائی کی پیروی میں حکومت شکنی کا انفعالی رویہ اختیار کر لیا۔ بلکہ کچھ تو ایسے تھے جو داستووسکی کی رجعت پسند اور رسالی "وفل" رنگ کے مقلد ہو گئے۔ پھر بھی ان میں سے سبھی نے روسی عوام کی حسن سیرت کے مسلک کو بھی باقی رکھا اور "سب کچھ عوام کے لئے" اپنا نصب العین بنائے رہے جو کچھ بھی ہو روس میں عوام پرستی کی تحریک روس کی تعلیمات کے زیر اثر رہی تھیں۔

۱۸۶۰ء سے ۱۸۷۰ء تک اس تحریک کی قیادت نکراسوف نامی ایک شاعر اور سالٹیکوف نامی ایک ناول نگار کے ہاتھوں میں رہی۔ نئی نسل کی اکثریت کو انہوں نے نیا لہجہ سکھایا لیکن چونکہ وہ صرف تخیئلی ادیب تھے اور انہیں نظریات دانی کی ہوا تک نہ لگی تھی اس لئے عوام پرستوں کے

"گرجا" کا سب سے بڑا پادری" ایک کمسن نوجوان نکو کونسٹنٹی نووچ میخائیلوسکی تھا۔ وہی اس کے عقائد کا تسلیم شدہ شارح تھا اور اپنی آخری عمر میں جب کہ سالٹیکوف کا انتقال ہو گیا یعنی ۱۸۸۹ء تو اس کی حیثیت روسی انتہا پسندی کے جدا مجدکی ہو گئی۔ وہ ماہر عمرانیات تھا اور اس کی کتاب "ترقی کیا ہے؟" اس کے بعد بھی عوام پرستوں کی نظروں میں بلند درجہ رکھتی تھی۔

میخائیلوسکی عمرانیات میں اپنے طرز کو "داخلی طرز" کہا کرتا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ عمرانیات کا مطالعہ طبیعات کی طرح غیر جانبدارانہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ مطالعہ کا معیار انسانی ترقی ہے۔ ترقی کا مطلب اس کے نزدیک نہ صرف زیادہ سے زیادہ لوگوں کی فلاح سے تھا بلکہ تمام انسانوں کی بڑی سے بڑی فلاح سے۔ وہ کہتا تھا کہ انسانی انفرادیت برتر اور قدر مطلق ہے اور اسے کسی طرح بھی سماج کے لئے قربان نہیں کیا جا سکتا۔ سوشلزم ہی ایک ایسا نظام تھا جو سب کی فلاح اور انفرادیت کی پوری توسیع کو روا رکھ سکتا تھا۔ ترقی حاصل کرنے کا ذریعہ یہ تھا کہ افراد کے شعوری اعمال۔ ایمان اور عوام کی طرف سے انپر عائد ہونے والے فرائض کا احساس ان کا دل گرمائے رہے۔ میخائیلوسکی کی تشریح کردہ پوپلزم مارکسی سوشلزم سے خاص طور پر دو باتوں میں اختلاف رکھتی ہے۔ اپنی اخلاقی بنیاد میں اور اپنی انفرادیت پسندی میں۔ وہ نہیں جانتا کہ طبقاتی اخلاقیات کیا ہیں اور مارکسزم کی ارتقا کے اصول کیا ہیں۔

اپنی عمرانی تصانیف کے علاوہ میخائیلوسکی نے جرنلزم میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھلائے۔ اس کی مناظرانہ تصانیف ہمیشہ جودت طبع اور حیرت انگیز نکتوں کی مظہر رہی ہیں۔ حالانکہ نزاعی تصانیف کو کبھی مساویانہ برتاؤ سے کوئی سروکار نہیں ہوا کرتا وہ جن مصنفین کی تنقید کرتا تھا ان میں ان کا پیغام تلاش کرتا اور اس پیغام میں عوام کی فلاح کا راستہ تلاش کیا کرتا تھا یہ دستور تو اس کے ہمعصر نقادوں کا بھی تھا لیکن میخائیلوسکی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ حیرت انگیز تنقیدی غائر نظری کا مالک تھا۔

معدہ بین

سلطان احمد قریشی

جہاں سائینس نے موت کا فرشتہ بن کر انسان کو انسان کے ہاتھ اس بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جس کی نظیر پرانی تاریخ ہرگز پیش نہیں کرسکتی۔ وہاں اسی سائینس نے مسیحا بن کر کبھی آدمی کو موت اور خوفناک بیماریوں کے چنگل سے نکال لیا۔ حضرتِ انسان کی ان تھک کوشش اور جستجو نے اس کو دور دراز ستاروں کے فاصلے ماپنے اور نظر نہ آنے والے جراثیم کی جسامت ماپنے کے قابل کردیا ہے۔ مگر ان سب کوششوں میں کوئی کوشش اتنی قابل قدر اور قابل تعریف نہیں جتنی کہ وہ ایجاد جس کے ذریعہ انسان خود اپنے معدے کی سیر کرسکتا ہے۔ اس عجیب و غریب طبی آلے کو جس کو گیس ٹروسکوپ یا معدہ بین کہتے ہیں۔ کے ذریعے سے معدے کے ایسے مرضوں کی تشخیص ہوسکتی ہے۔ جن کو کسی اور طریقے سے معلوم کرلینا۔ اب تک ممکن نہ تھا۔ جب مرض کی صحیح تشخیص ہو جائے۔ تو علاج زیادہ مشکل نہیں رہتا۔

فرض کیجئے۔ ایک شخص کے پیٹ میں سخت درد ہے۔ جس کی وجہ سے وہ تڑپا جا رہا ہے نبض اور ظاہری حالات سے مرض کو جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ آخر ایکس رے کے ذریعے مرض کا کھوج لگایا جاتا ہے۔ مگر ایکس رے بھی مرض کو ظاہر کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ چند سال پیشتر اس کے معالجوں کے پاس مرض کے دفعیے کی صورت صرف یہی تھی۔ کہ مریض کے پیٹ اور معدے پر عمل جراحی کرکے مرض کو کھو دیا جائے۔ مگر یہ طریق عمل خطرے اور تکلیف سے کسی طرح بھی خالی نہ تھا۔ مگر اب نشتر کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ اور معدہ بین اس مشکل کا بہترین حل ہے۔

آئیے۔ دیکھیں تو یہ آلہ ہے کیا؟ اور اس کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ ذرا اس آلے کے موجد ڈاکٹر روڈلف شنڈلر کو اس آلے کو استعمال کرتے ہوئے دیکھیں۔ ڈاکٹر صاحب اس پیٹ کے مریض کو پہلے ایک انجکشن دیتے ہیں۔ تاکہ اس کا لعاب دہن کم ہو جائے۔ اور سانس وغیرہ گھٹنے نہ پائے۔ پھر ایک سوراخدار نلی سے اس کے حلق میں ایک جراثیم کش دوا لگا دیتے ہیں تب معدے کی غذا وغیرہ ایک نلی کے ذریعے خالی کردی جاتی ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب مریض کو گیس ٹروسکوپ کا ایک سرا منہ میں دائیں کونے میں رکھ کر اس کو نگل جانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ذرا اسی مدد سے ایک ربڑ کی نلی۔ جو کہ ڈھائی فٹ لمبی اور پنسل سے کچھ ہی زیادہ موٹی ہوتی ہے آہستہ آہستہ اور آسانی سے نیچے اترتی چلی جاتی ہے۔ اور اس کا سرا جو کہ اب مریض کے معدے میں ہے۔ اس کے سرے پر ایک لچکدار ربڑ کی انگلی سی ہوتی ہے۔ جو کہ نلی کو معدے کے اندر سیدھا پہنچانے میں مدد دیتی ہے۔ یہ ربڑ کا سرا بالکل ہی نئی ایجاد ہے۔ اور اس نے معدہ بین کے استعمال کو بہت آسان اور خطرے سے خالی کردیا ہے۔ ربڑ کے اس سرے کے اوپر دھات کا ایک خول ہوتا ہے جس کے اندر ایک ننھا سا روشنی کا قمقمہ یا بلب ہوتا ہے۔ شیشے کی ایک ننھی سی آنکھ معدے کی دیوار کا عکس اپنے اوپر لیتی ہے۔ اور اس کو ۴۸ عکسی شیشوں کے ذریعے۔ جو ربڑ کی نالی میں تھوڑی تھوڑی دور پر لگے ہوتے ہیں نالی کے سرے تک پہنچاتے ہیں۔ اور جہاں سے انسانی آنکھ نہایت آسانی سے اس عکس کو دیکھ سکتی ہے۔

ڈاکٹر شنڈلر اس سوراخ میں دیکھتا رہتا ہے اور ساتھ ہی نالی کے ذریعے معدے میں ہوا بھرتا رہتا ہے تاکہ معدہ پھول جائے۔ اگر معدہ پھلایا نہ جائے تو معدے کی دیواریں معدہ بین کے ساتھ لگ جاتی ہیں۔ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن جونہی معدہ پھولتا ہے تو اس کی دیواریں صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ اور معدہ جو کہ اندر نہایت چمکدار۔ نرم اور صاف ہوتا ہے۔ اندر کی تیز روشنی اور سائے کے اثر سے ایک صاف اور روشن غار کی طرح نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس نظارے میں محو ہوکر نہیں رہ جاتے۔ وہ مرض کو ڈھونڈنے میں منہمک رہتے ہیں۔ چھوٹی اور چمکدار سرخ دھاریاں معدے سے خون جانے کی علامت ہیں سیپی کی طرح کا بڑھاؤ خطرناک علامت ہے۔ پھوڑے اور پھنسیوں کو ناہموار سفید اور سبز رنگ کا بڑھاؤ ظاہر کرتا ہے۔

معدہ بین کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ خطرناک پھوڑوں کو ان کی ابتدائی حالت ہی میں ظاہر کردیتا ہے۔ اور اس طرح ان کا علاج شروع ہی میں بہت آسانی سے ہوسکتا ہے۔ معدے میں پھوڑے وغیرہ کے بڑھ جانے کے بعد مریض کا بہت کم کامیاب علاج ہوسکتا ہے۔ اور بڑھ کر یہ پھوڑے بہت جلد مریض کا خاتمہ کردیتے ہیں۔

سب سے پہلا آدمی جس نے ایک زندہ آدمی کے معدے کو اندر سے دیکھا۔ امریکی فوج کا ایک ڈاکٹر ولیم بومون تھا۔ اس نے ۱۸۳۳ء میں ایک مریض کا جس کے معدے میں بندوق کی گولی سے زخم ہوگئے تھے علاج کیا لیکن اس کا طریقہ امتحان بھدا تھا۔ اور اس لئے خطرے سے خالی نہ تھا۔ معدے کی خلوت پر پھر ۱۸۶۸ء میں حملہ ہوا۔ اس مرتبہ ایک جرمن اڈولف کسمال نے ایک تلوار نگلنے والے کو دیکھ کر۔ ایک بھاری سی نلی اس کام کے لئے تیار کی۔ اور تلوار نگلنے والے کو اس کے نگلنے پر آمادہ کیا۔ لیکن نلی میں روشنی کا انتظام خاطر خواہ نہ ہونے کے سبب معدے میں کچھ نظر نہ آسکا۔ بہت مدت تک عمدہ اور تیز روشنی کا عدم وجود اور ناقص عکسی شیشے آلے کی مزید ترقی کی راہ میں حائل رہے۔ لیکن جب ایڈیسن نے برقی قمقمہ ایجاد کرلیا۔ تو معدے کی گہرائی کو کافی حد تک معمولی اور سخت قسم کے معدہ بین کی مدد سے دیکھا جاسکا۔ لیکن یہ آلے بسا اوقات مریض کے لئے خطرناک ثابت ہوئے۔ کیونکہ سخت نلی کی وجہ سے مریض کو صدمہ پہنچنے کا امکان رہتا تھا۔ اس تجربے میں دو ایک مریضوں کی جان تلف بھی ہوگئی۔

اور پھر اس کے موجد کو اس تجربے کو اور ترقی دینے کی ہمت نہ ہوئی - ایکس رے کی ایجاد نے معدہ بین کو اور بھی پیچھے دھکیل دیا -

پچھلی جنگ عظیم میں شفا خانوں میں معدے کے متعدد ایسے مریض آئے جن پر ایکس رے کا امتحان کیا گیا - مگر مرض کا پتہ نہ چلا - آخر سنہ ۱۹۲۰ء میں شنڈلر نے جو کہ اس وقت میونخ کے ایک شفاخانے میں بالکل نوعمر ڈاکٹر تھے - یہ محسوس کیا کہ ان کے قریباً نصف مریض معدے کی تکلیف کی شکایت کرتے ہیں - لیکن اس وقت کے مروجہ طریقے اور قاعدے مرض کو ظاہر نہ کر سکے - اتفاقاً شنڈلر کے ہاتھ ایک پرانا معدہ بین آگیا - ..ہم مریضوں کے امتحان میں ایک مریض کی جان تلف ہوگئی - آلے کی بھدی ساخت نے شنڈلر کا دل ہلا دیا انھوں نے آلے کے اصول کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا - جرمنی کے چشموں کے ایک ماہر نے جس کا نام جارج وولف تھا شنڈلر کا ہاتھ بٹایا اور دونوں کی مدد سے ایک لچک دار اور نرم نلی بنی جس میں تھوڑی تھوڑی دور پر عکسی شیشے لگائے گئے - اسی اثنا میں ڈاکٹر شنڈلر کو شکاگو کی یونیورسٹی نے پروفیسری کی پیش کش کی - جس کو انھوں نے قبول کر لیا - اور اس طرح معدہ بین کا ظہور امریکہ میں ہوا - اس وقت شنڈلر کے قریباً ..ہم شاگرد بڑے بڑے شفا خانوں میں معدہ بین کا بے دھڑک استعمال کر رہے ہیں -

ایکسرے اب بھی نہایت ضروری اور اہم چیز ہے - اور معدہ بین نے ایکسرے کی جگہ نہیں لی لیکن اکثر عمدہ سے عمدہ ایکسرے مرض کی صحیح تشخیص سے قاصر رہتا ہے - جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا ہے - معدہ بین ابتدا ہی میں پھوڑوں کو تاک لیتا ہے کہ پھوڑا معمولی ہے یا خطرناک -

ایک مرتبہ ایک بوڑھے آدمی کے معدے کا بذریعہ ایکسرے امتحان لیا گیا تو پتہ چلا کہ معدہ میں پھوڑا ہو گیا ہے - لیکن مریض کیونکہ کمزور اور ناتوان تھا اس لئے اس پر عمل جراحی کرنا بھی اس کی جان لینے سے کم نہ تھا - معدہ بین سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ پھوڑا معمولی ہے - لہٰذا خوراک اور آرام سے ہی پھوڑا درست ہوگیا -

اسی طرح ایک چالیس برس کی عورت معدے کے پھوڑے کی جراحی کے بعد ہسپتال میں مقیم تھی - اسی دوران میں اصلی شکایت پھر عود کر آئی - خیال پیدا ہوا کہ پھوڑا دوبارہ ہو گیا ہے - کیا پھر دوبارہ عمل جراحی کیا جائے - معدہ بین نے ظاہر کیا کہ پھوڑا وغیرہ نہیں ہے - لیکن صرف کچھ سوزش وغیرہ ہے - یہ حالت عام طور پر جراحی کے بعد پیدا ہو جاتی ہے -

امریکہ کے ایک متمول شخص کو معدے کی شکایت ہوئی - لیکن ڈاکٹر مرض کا کھوج نہ لگا سکے اور ان کی رائے یہ ہوئی کہ مریض کو محض وہم ہے - لیکن معدہ بین کے امتحان نے معدے کی اندرونی جھلی میں ایک خطرناک مرض کا اظہار کیا -

ان امید افزا نتائج سے ڈاکٹروں کی ہمت بہت بہت بڑھ گئی ہے - اور وہ معدے کے متعلق اپنی معلومات کو بہت آگے بڑھانے میں سرگرم ہیں - ان کوششوں میں سے ایک جرمن کی کوشش قابل تعریف ہے - انھوں نے معدہ بین کی نلی کے سرے پر ایک بہت ہی چھوٹا سا کیمرہ لگایا ہے جس کی مدد سے بیک وقت معدے کی ۲۴ مختلف تصویریں کھینچی جا سکتی ہیں لیکن ابھی یہ ایجاد عہد طفولیت ہی میں ہے - اور اس کیمرے کی تصویریں بہت صاف نہیں ہوتیں - اس لئے مرض کی تشخیص کرنے میں زیادہ مدد نہیں دے سکتیں -

آخر میں اس سے بھی عجیب چیزیں حال ہی میں معرض وجود میں آچکی ہیں - لوگ پردہ سیمیں پر معدے کے عجیب و غریب اندرونی حصوں کی رنگ برنگی تصویریں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں - ان کو معدہ ایک بہت نفیس غار کی طرح نظر آئے گا - یہ وہ ہے جو ڈاکٹر اپنی آنکھوں سے اپنے معدے میں دیکھ سکتے ہیں -

معدہ بین سے مرض کے امتحان میں اب جان کے تلف ہونے کا خطرہ بالکل باقی نہیں رہا - اور موجودہ معدہ بین کے دوران میں اب تک کوئی موت واقع نہیں ہوئی - یہ واقعہ ہے کہ سائنس کی اس قسم کی ایجادیں انسان کی ہزاروں خوفناک بیماریوں کا خاتمہ کرتی چلی جا رہی ہیں - اور شاید وہ دن دور نہیں جب کہ انسان کے خفیہ سے خفیہ مرض کا آلات کے ذریعے پتہ چلا لینا زیادہ مشکل نہ ہوگا -

غزل ——— اقبال عظیم

جب غم پیہم سے تھک کر چور ہو جاتا ہے دل
اک ذرا سی ٹھیس لگتی ہے تو بھر آتا ہے دل

یاد کر کے جانے کیا کیا پہلے گھبراتا ہے دل
اور پھر گھٹ گھٹ کے جی ہی جی میں رہ جاتا ہے دل

رقص کرتی ہیں بہاریں، جھوم جاتا ہے چمن
جب تصور کی فضا میں دل سے ٹکراتا ہے دل

پھر وہی دھڑکن ہوئی، پھر آنکھ سے ٹپکا لہو
پھر وہی بھولی کہانی آج دہراتا ہے دل

ڈوبتے تاروں کی ان مایوس راتوں کی قسم
اتنی محرومی پہ بھی تیرے ہی گن گاتا ہے دل

گھونٹ دیتی ہیں گلا جذبات کا خودداریاں
اپنے ہی ہاتھوں سے خود مجبور ہو جاتا ہے دل

ٹوٹ جاتے ہیں سہارے جب محبت کے تمام
دل کو سمجھاتا ہوں میں، اور مجھ کو سمجھاتا ہے دل

جانے کیوں اقبال کچھ بیٹھے ہی بیٹھے ان دنوں
ڈبڈبا آتی ہیں آنکھیں، اور بھر آتا ہے دل

جبرالٹر

ایس پی بی مائنس

جبرالٹر جس کو انگریزی داں طبقہ "دی روک" (چٹان) کہتا ہے چونے کے پتھر کی ایک چٹان ہے تین میل لمبی اور پون میل چوڑی۔ یہ چٹان بحیرۂ روم کے مغربی پھاٹک کی پاسبان ہے۔ جبرالٹر پر قابض ہونا دنیا کے ایک بڑے اہم ناکہ پر قابض ہونے کے برابر ہے۔

اہل روما اس کو "مانس کالپ" سے موسوم کرتے تھے۔ اور اس کو ہرکل کے مشہور ستونوں میں سے ایک ستون سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا ستون ساحل افریقہ پر کیوٹا میں تھا۔ اس کا موجودہ نام جبرالٹر "جبل الطارق" سے لیا گیا ہے۔ طارق ایک عرب سپہ سالار تھا جس نے گاتھی بادشاہ راڈرک کو ۷۱۱ء میں شکست دی تھی۔

جبرالٹر کی صورت ایک بڑے بھاری بھرکم شیر کی سی ہے جیسے وہ سمندر سے چودہ سو فٹ اونچا ایک دم ابھر آیا ہو۔ شمال کی طرف اس چٹان کا ڈھلان بالکل عمودی ہے اور اس کے نیچے ریتیلی زمین کی ایک پٹی ہے جس پر گھڑ دوڑ کا میدان، انگریزی آبادی اور غیر علاقی راستہ ہے جو ہسپانوی علاقہ کو چلا جاتا ہے۔ اس ہسپانوی شہر کی آبادی ساٹھ ہزار سے زائد ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر چٹان پر کام کرتے ہیں۔ شام کو ایک توپ چھوٹتی ہے جس کے فوراً بعد مزدوروں اور کمیروں کو چٹان پر سے واپس آجانا پڑتا ہے کیونکہ رات کے وقت قلعہ کے دروازہ کو تالا لگا دیا جاتا ہے۔ کسی غیر ملکی کو بغیر خاص اجازت نامہ کے جبرالٹر میں رہنے کی اجازت نہیں ہے

موری حصار

طارق نے اس چٹان پر ایک بہت بڑا قلعہ تعمیر کیا جس کا کھنڈر اب بھی باقی ہے۔ اس کی تعمیر میں تیس سال صرف ہوئے تھے۔ اس قلعہ کو "موری حصار" کہتے ہیں۔ اس قلعہ کے نیچے شہر اور بندرگاہ واقع ہے۔

یہ شہر جو بندرگاہ اور چٹان کے بیچ میں واقع ہے دنیا کے سب سے زیادہ گھنی آبادی کے شہروں میں سے ہے فی میل مربع میں دس ہزار آدمیوں کی آبادی ہے۔ یہاں کی آبادی کے بیس ہزار شہری زیادہ تر یہاں کے قدیم باشندوں کی نسل سے ہیں۔ یہ لوگ ہسپانوی زبان بولتے ہیں اور انگریزی بطور غیر ملکی زبان کے سیکھتے ہیں۔ تعلیم لازمی نہیں ہے۔

جبرالٹر دراصل ایک قلعہ اور بحری اڈہ ہے۔ یہاں تقریباً تین ہزار فوجیوں کے علاوہ بحریہ کے تقریباً پانچ سو آدمی مامور رہتے ہیں جن کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

شہر سے بارہ سو چھ فٹ کی اونچائی پر سگنل اسٹیشن ہے جہاں سے گزرنے والے جہازوں کے نام اور پیغامات دنیا کے ہر حصہ کو بذریعہ تار بھیجے جاتے ہیں۔ سگنل اسٹیشن کے جنوب میں کوئی پون میل کے فاصلہ پر "جنرل او ہارا کا مینار" واقع ہے جس کی اونچائی چودہ سو آٹھ فٹ ہے اور یہ جبرالٹر کی سب سے اونچی جگہ ہے۔ یہاں سے زمین "وِنڈمل ہِل" کی طرف ڈھلنی شروع ہو جاتی ہے۔ "وِنڈمل ہِل" ایک خاصا ہموار حصہ ہے جس کا رقبہ تقریباً ½ مربع میل ہے اور سطح سمندر سے چار سو سے تین سو فٹ کی اونچائی تک ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ اس کا ڈھلان ایک عمودی چٹان پر ایک دم ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چٹان تقریباً دو سو فٹ اونچی ہے اور اس کے تلے "یوروپا فلیٹس" ہیں جن کا ڈھلان جنوب کی طرف ہے۔ "یوروپا پوائنٹ" پر اونچائی پچاس فٹ ہے۔ لائٹ ہاؤس اسی نقطہ پر واقع ہے اور چٹان کا سلسلہ یہیں آکر ختم ہوتا ہے۔

چٹانوں کا قدرتی حصار

مشرقی جانب یعنی بحیرۂ روم کی طرف جبرالٹر اسی قدر ناقابل گذر ہے جس قدر شمال کی طرف۔ خلیج کٹالن پر ماہی گیروں کا ایک قصبہ ہے لیکن اس جگہ یا تو شمال کی طرف سے جا سکتے ہیں یا اس سرنگ میں سے گزر کر جو بندرگاہ سے پوری چٹان کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ مغربی سمت میں چٹان کا ڈھلان اتنا سیدھا نہیں ہے اور باغات، بارکیں، بندرگاہ اور شہر سب اسی طرف ہیں۔

جبرالٹر میں خودرو کھیوں، درختوں اور جھاڑیوں کی بڑی بہتات ہے۔ زیتون، سیاہ مرچ، لیمو، سنگترہ، انار، انجیر، بادام، کیکر، گوند، کھجور اور آلو کے درخت خاص ہیں۔ جانوروں میں بربری بن مانس مشہور ہیں۔ یورپ میں یہ جنگلی بندر یہیں پائے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ایک خفیہ زمین دوز راستہ سے افریقہ سے آئے تھے۔ اب یہ جبرالٹر کے صرف بالائی حصہ پر پائے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد اب بہت کم ہو گئی ہے۔ جبرالٹر میں جنگلی جانوروں کی تعداد بہت کم ہے۔ صرف تھوڑے سے کبوتر، تیتر، لومڑیاں اور خرگوش پائے جاتے ہیں۔

یہاں کی آب و ہوا بہت خوشگوار ہے۔ دھوپ خوب کھل کر نکلتی ہے لیکن اس میں تپش کبھی نہیں ہوتی۔ بارش بہت کم ہوتی ہے۔ ہوتی بھی ہے تو موسم خزاں میں۔ اس کا سالانہ اوسط صرف ۴ ر ۳۲ انچ ہے۔ استعمال کا پانی چونکہ بارش کے پانی سے لیا جاتا ہے اس وجہ سے یہ پانی زمین دوز تالابوں میں جمع کر لیا جاتا ہے۔ تالاب ٹھوس چٹان کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں اور ان کا کل رقبہ سولہ ایکڑ ہے۔

جبرالٹر کی خاص چیز بندرگاہ ہے جو چار سو چالیس ایکڑ جگہ گھیرے ہوئے ہے اور بحیرۂ روم کے تمام برطانوی بیڑہ کو پناہ دیتی ہے۔ زمانۂ امن کا خاص کاروبار آنے جانے والے جہازوں کو کوئلہ دینا ہے۔ جنگ چھڑنے سے پہلے والے سال میں چار ہزار ساٹھ باون جہاز بندرگاہ میں داخل ہوئے۔ بندرگاہ ۱۷۰۶ء سے عام ہے اور اس میں داخلہ پر کوئی پابندی نہیں ہے سوائے ان جہازوں کے

جن میں شراب اور تمباکو ہوتا ہے۔

بندرگاہ کی بندش جنوب کی طرف "نیو مول" (اونچائی چودہ سوفٹ) سے جنوب مغرب کی طرف "نیو مول ایکسٹینشن" (ستائیس سو فٹ) سے اور شمال کی جانب "کمرشیل مول" سے ہورہی ہے۔ "نیو مول" کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی تعمیر ہسپانیوں نے ۱۶۰۲ء میں کی تھی۔ اس کی لمبائی بندرگاہ کی جانب ساڑھے تین سو فٹ ہے۔ "ڈی تحجڈ مول" ایک عمودی دیوار ہے مضبوط سالہ کی بنی ہوئی اور "کمرشیل مول" جو تباہ کن جہازوں کے گھاٹ کے طور پر استعمال ہوتا ہے کنکر سے بنایا گیا ہے۔ اس کے مغربی جانب اختتام کے قریب اس کا بازو سولہ سو فٹ لمبا ہے اور اس کا رخ جنوب کی طرف ہے۔ مغربی بازو میں پانچ پل ہیں جن میں کوئلہ کے بہت بڑے بڑے ذخیرے ہیں۔

زبردست محاصرہ

پرانی بندرگاہ ("اولڈ مول") کی توسیع کو "شیطان کی زبان" کہتے ہیں۔ اس کی تعمیر ۸۳-۱۷۷۹ء کے زبردست ہسپانوی محاصرہ کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ لڑائی میں لارڈ ہاؤ کی فتح ہوئی اور ہسپانیوں کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔ انگریزوں نے دشمن کا مقابلہ اس قدر ڈٹ کر کیا کہ اب ان کے یورپی دشمن پھر اس قسم کا حملہ کرنے میں ذرا ہچکچاتے ہیں۔

جنگ نپولین کے دوران میں نیلسن نے جبرالٹر سے بحیثیت ایک بندرگاہ بڑا فائدہ اٹھایا۔ مراکش پر حملہ کرنے کے واسطے نپولین جبرالٹر پر قابض ہونا چاہتا تھا لیکن ڈیوک آف ولنگٹن نے اس کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ اس وقت سے آج تک جبرالٹر کے حصار کی تاریخ کے اوراق بالکل سادہ ہیں۔

تمام دنیا جانتی ہے کہ یورپی جنگ کے ساڑھے پانچ سال کے عرصہ میں جبرالٹر نے بحیرۂ روم میں خبر رسانی کے برطانوی ذرائع کو برقرار رکھنے میں بڑی مدد دی اور مالٹا کو بھی جس پر دشمن نے آگ کی بارش کر رکھی تھی کمک رسانی یہیں سے ہوتی رہی۔ ابھی ایسی اور بہت سی صورتوں کا انکشاف ہونے والا ہے جن میں جبرالٹر کی بندرگاہ اس لڑائی میں مفید ثابت ہوئی۔

اطالوی گیت

ماں

عبدالرزاق کلیانپوری

ماں! میں کسقدر مسرور ہوں
کیونکہ میں لوٹ کے تیرے پاس آئی ہوں۔
میرا گیت تجھے کہہ رہا ہے
کہ یہ میرے لئے حسین ترین دن ہے۔
ماں! میں کسقدر مسرور ہوں
دُور کا جینا ہی کیا ہے!
ماں! میرے گیت کی پرواز صرف تیرے لئے ہے۔
ماں! تو میرے ساتھ رہے گی بس اب اور تنہائی نہیں
میں تجھے کتنا چاہتی ہوں
یہ الفاظِ محبت
کہ میرا دل تیرے کانوں میں کہہ رہا ہے
شاید پھر دہرائے نہ جا سکیں۔
ماں! لیکن تو میرا حسین تر نغمہ ہے
تو میری زندگی ہے
اور تادمِ زندگی میں تجھے کبھی نہ چھوڑونگی۔
میں محسوس کرتی ہوں کہ تیرا تھکا ماندہ ہاتھ
میری سونے کی چوڑیوں کو ٹٹول رہا ہے۔
میں محسوس کرتی ہوں کہ تیری آواز معدوم ہو چکی
تھی اُن دقتوں کی لوریاں!
آج تیرا سر سفید ہے۔ یہ سوچتی ہوں اور میں دل تھام کے رہجاتی ہوں
ماں! میرے گیت کی پرواز صرف تیرے لئے ہے۔

فریب

افسانہ

"ناصر"

محبت[1] انسان کی ذہنی قوتوں کو مفلوج کر دیتی ہے اور اسکا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے دیہ حقیقت صادق پر اسوقت واضح ہوئی جب قمر کا حسن اس کے دل پر مسحور کن جال بچھا چکا تھا۔ اسکا دماغ ہمیشہ ایک نہ حل ہونے والے معمّہ کو حل کیا کرتا تھا۔ عقل محبت کی دشمن اسکو قمر کی محبت سے آزاد رہنے کی ترغیب دلاتی وہ اکثر سوچتا "بھلا قمر کا اور میرا کیا جوڑ۔ وہ لکھ پتی اور میں ایک معمولی حیثیت کا انسان وہ حسن میں یکتا اور میں ...... نہ جیسے سینکڑوں دل مارے مارے پھرتے ہیں۔ اسکے علاوہ میں کوئی ایسا عالی دماغ بھی نہیں جو کسی کو میرا دماغی حسن مرعوب کر سکے ...... بھلا وہ مجھکو کیا پسند کرے گی" لیکن دل فوراً محبت کی حمایت پر آجاتا ہے۔ محبت ان تمام باتوں سے بالاتر ہے۔ وہ غربت اور امارت کی دیواروں کو ختم زدن میں ڈھا دیتی ہے حقیقی محبت کو حسن ظاہری کے بجائے حسن باطنی پر مبنی ہونا چاہئے" یہ دلیل ایسی تھی جو عقل کی پیشکش کی صداقت کو پانی کی طرح بہا دیتی تھی۔ اکثر اس ذہنی کشمکش میں عقل غالب آتی نظر آتی لیکن قمر کی ایک سحر آمیز نظر اور ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے تمام اُٹل ارادوں پر پانی پھیر دیتی۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب قمر کو صادق کی دلی کیفیات کا پتہ چل گیا۔ صادق اپنی قسمت کے فیصلہ کا انتظار بے چینی سے کرنے لگا۔ اس کی حیرت اور خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا جس روز اس کی محبت کا جواب محبت سے ملا۔ وہ اپنے پر نازاں تھا جیسے اسکو دنیا کی بادشاہت مل گئی ہو لیکن دنیا کی بادشاہت بھی اس مسرت کے سامنے ہیچ ہے جو کہ ایک محبت کے بھوکے کو محبت کے جواب سے ملتی ہے۔

محبت کو صرف اظہار کی ضرورت ہے پھر تو ہوا کے تیور دیکھ کے ارتقائی منازل پر وہ آپ ہی گامزن ہو جاتی ہے۔ قمر کی محبت نے صادق کو دنیا و مافیہا سے بےخبر کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت قمر کے حسین تصور میں مستغرق رہتا۔ عالم تصور میں وہ تخیل کو بے لگام کر دیتا اور گھنٹوں قمر سے ہمکلام رہتا۔ وہ اب پہلے جیسا صادق نہیں تھا محنتی اور ذہین طالب علم۔ کورس کی کتابوں سے اس کو نفرت سی ہو گئی تھی لیکن تعلیم صرف اس لئے جاری رکھے ہوئے تھا کہ یہی اس کا جوہر تھی۔ بادی النظر میں کیرکٹر کے سوا اگر کوئی دوسری خوبی تھی تو وہ یہ کہ وہ تعلیمی منازل اپنی عمر کے لحاظ سے بہت سرعت سے طے کر رہا تھا۔ خیالات سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ ہاں یہ ضرور رہا کہ اس کا افسانہ نگاری کا شوق جو کہ ختم ہو چلا تھا محبت کے ساتھ پھر عود کر آیا۔ وہ افسانے لکھتا اور خوب لکھتا جو کہ پڑھنے والوں کو مسحور کئے بغیر نہ رہتے ...... لیکن ...... ایک دن آیا جبکہ اس کی مسرتوں کی دنیا میں خزاں آگئی۔ وہ عالیشان عمارت جو وہ ایک عرصہ سے بنا رہا تھا انتہائی بیرحمی سے ڈھا دی گئی۔ قمر کی شادی ایک بڑے رئیس سے طے ہو گئی اور صادق کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ دنیا والے کیرکٹر اور قابلیت کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنی کہ چمکتے ہوئے سکوں کو۔ صادق میں تمام خوبیاں تھیں لیکن دولت نہیں تھی۔ اسلئے ساری خوبیاں عیب بن گئیں۔ روپیہ بڑی طاقت ہے اس کی موجودگی ذلیل اور جاہل شخص کو شریف اور لائق بنا دیتی ہے۔ اس کی غیر موجودگی شریف اور لائق کو کمینہ، بے اعتبار، بد دیانت، جاہل اور نہ معلوم کیا کیا بنا دیتی ہے۔

اس واقعہ نے صادق کا دماغ معطل کر دیا۔ اس کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ کبھی تو وہ غصہ کی حالت میں اس خود غرض دنیا کو مسمار کر دینا چاہتا اور کبھی اپنی قسمت کا شکوہ کرنے لگتا۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات اس کے لئے یہ خیال تھا کہ اس نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی برباد کی وہ اکثر سوچتا "قمر کی زندگی کی تباہی کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے ہی اس کی مسرتوں کی دنیا اجاڑی ہے۔ جب میں جانتا تھا کہ میری شادی قمر سے نہیں ہو سکتی تو کیوں میں نے اظہار محبت کیا۔ کیوں میں نے اس قصہ کو طول دیا۔ خود غرضی ...... محض خود غرضی اور نفس پرستی اُف! میں نے اسکو زندہ درگور کر دیا۔ اس کے ہونٹ شاید اب مسکراہٹ کیلئے ترسا کرینگے۔ اس کی آنکھوں سے اب کبھی مسرت کے آنسو نہ بہیں گے ...... ہندوستانی لڑکی کسقدر بےزبان ہوتی ہے۔ اپنی موت و زیست کے سوال تک پر رائے زنی نہیں کر سکتی"۔ شادی سے چند دن پہلے ایک صبح کو صادق نے جنونی کیفیت میں اپنے وطن کو خیرباد کہا اور لاہور جانیوالی ٹرین پر سوار ہو گیا۔ دماغی انتشار نے دوران سفر میں اسکو اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ وہ کبھی سوچتا کہ اس نے کئی وقت سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے نکل کے وہ غیر ارادی طور پر ایک سمت روانہ ہو گیا۔ اسکو اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر نہ تھی۔ قمر کی زندگی کی تباہی کا سوال اس کیلئے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ اس کا دل قمر کی حرماں نصیبی پر بیٹھا جاتا تھا۔ اس کا دماغ قمر کی بیچارگی کے نقشے کھینچتا۔ اس کی آنکھیں قمر کی غمزدہ شکلیں دیکھتیں اور اس کے سوا کچھ نہ دکھائی دیتا۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا چلا جا رہا تھا جیسے کہ اسے کوئی خاص کام انجام دینا ہو۔ شام ہو چکی تھی۔ لاہور کی سرحد سے وہ کافی دور نکل چکا تھا۔ چاروں طرف ہرے بھرے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ اس کا دماغ چکرا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں نقاہت سے بند ہو گئیں اور وہ ایک بیجان شے کی طرح سرد زمین سے ہم آغوش ہو گیا۔

جب صادق پھر ہوش و حواس کی دنیا میں آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک خستہ حال جھونپڑے میں پایا۔ اول تو تھکاوٹ اور نقاہت نے اس کو

---

[1] لکھنؤ یونیورسٹی کے زیر اہتمام افسانوں کا ایک انعامی مقابلہ ہوا تھا۔ یہ افسانہ اس مقابلے میں اول قرار پایا تھا۔

بستر سے اٹھنے پر رضامند نہ کیا لیکن پھر بھی نئے اصول کو سمجھنے کے لئے وہ بیداری سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس غربت کدہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اسکو اٹھتا ہوا دیکھکر چند پنجابی دیہاتی انتہائی مسرت آمیز مسکراہٹ کیساتھ اس کی طرف بڑھے ان میں جو سن رسیدہ تھا سب میں پیش پیش تھا۔ اس نے نازاں نام لیکر کسی کو پکارا اور پنجابی زبان میں دودھ لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں ایک دیہاتی نوجوان دوشیزہ گھر کی اکلوتی ، پیالی میں دودھ لے آئی۔ اس نے بغیر کسی تفتیش کے خاموشی سے دودھ کی پیالی ہاتھ میں لے لی اور اپنی قسمت کے پھیر پر غور کرتا ہوا دودھ پینے لگا۔ چند ہی لمحوں بعد اسپر ساری حقیقت منکشف ہو گئی محمد بخش ، اس کا محسن ، اس گاؤں کا کھاتا پیتا اہیر تھا۔ اپنے مویشیوں کو واپس لاتے ہوئے اس روز اس نے صادق کو درخت کے نیچے بیہوش پڑا پایا۔ وہ اپنے ساتھ جھونپڑے میں اٹھا لایا۔ نازاں اس کی بھتیجی تھی جو کہ یتیم ہو جانے کے بعد سے محمد بخش کیساتھ رہ رہی تھی کیونکہ محمد بخش نے کوئی شادی نہیں کی تھی اسلئے اس نے نازاں ہی کو اپنی لڑکی بنا لیا تھا۔

چند ہی دنوں میں صادق کی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی اور اس نے اپنے محسن ، محمد بخش سے جانے کی اجازت چاہی۔ لیکن محمد بخش نے ان دنوں میں کچھ دوسرے ہی خواب دیکھ ڈالے تھے۔ یہ پہلا اتفاق تھا جو اس کے جھونپڑے میں ایک گریجویٹ اتنے عرصہ تک رہا اور رہا ہی نہیں بلکہ اس کے یہاں کا روکھا سوکھا کھانا بھی نہایت شوق سے کھایا۔ جب سے صادق محمد بخش کے گھر میں آگیا تھا اس کی عزت گاؤں والوں کی نظر میں بڑھ گئی۔ گاؤں والے جب آپس میں مل کے بیٹھتے تو سرگوشی کے انداز میں محمد بخش اور نازاں کی قسمت پر رشک کرتے۔ ان کے خیال میں صادق اور نازاں کا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جانا ایک یقینی امر تھا۔ ان کو اڑوس پڑوس میں کوئی ایسی مثال نظر نہیں آتی تھی جہاں ایک دیہاتی لڑکی کی شادی کسی پڑھے لکھے شہری جوان سے ہوئی ہو۔ وہ اکثر سوچا کرتے تھے کہ صادق ضرور پھنس جائے گا۔ محمد بخش ایک کائیاں آدمی ہے۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی چال چلے گا اور پھر اس نے صادق کے ساتھ احسان بھی تو کیا ہے۔ اگر وہ اسکو جنگل میں پڑا چھوڑ دیتا تو حضرت گیدڑوں کا لقمہ بنجاتے۔ گھر لاکر تیمارداری کی ، کھلایا پلایا۔ صادق پڑھا لکھا ہے احسان فراموشی نہیں کر سکتا اور نازاں بھی تو ہزاروں میں ایک ہے۔ اس کا جادو ضرور چل جائے گا

...... جب محمد بخش نے صادق کی اجازت طلبی کے جواب میں پوچھا کہ "کہاں جاؤ گے" تو صادق قطعی فیصلہ نہ کر سکا کہ کہاں کا پتہ دے۔ اس نے خود ابتک نہیں سوچا تھا کہ گھر چھوڑنے کے بعد وہ کہاں جائے گا اور کیا کرے گا۔ اس نے اپنے مستقبل پر غور کرتے ہوئے کہا "شہر جاؤں گا کسی نوکری کی تلاش میں۔ اب کبتک کسی کے یہاں یوں پڑے پڑے زندگی گذاروں"۔ لیکن محمد بخش مدبرانہ انداز میں اس کو زمانہ کی اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے اس کے وہیں ٹھہرنے پر مصر ہوا۔ اس نے صادق کو سمجھایا کہ اگر وہ اسکے سرمایہ سے وہیں گاؤں میں کھیتی باڑی کرلے تو وہ بہت کچھ کما سکتا ہے۔ صادق کے سامنے خود کوئی روشن مستقبل نہ تھا اس لئے کچھ سوچ کے وہ وہیں ٹھہرنے پر رضامند ہو گیا۔ لیکن دوسرے روز جب محمد بخش نے اس سے کھیتی کرنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا اور محمد بخش کو یقین دلاتے ہوئے کہا "مجھکو کھیتی باڑی سے دلچسپی نہیں اور نہ مجھسے یہ کام بنے گا۔ ہاں میں بیٹھے بیٹھے روپیہ کمانے کی ضرور کوئی ترکیب کرونگا"۔ محمد بخش کی دیہاتی سمجھ میں اس عقدہ کا حل نہ آیا کہ بیٹھے بیٹھے کیونکر روپیہ کمایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس نے اس کی تشریح کی ضرورت نہ سمجھی اور خاموش ہو گیا۔

صادق کا اب روز کا معمول ہو گیا کہ روز صبح اٹھ کے ایک کاپی و پنسل لیکر کسی کھیت کے کنارے درخت کے سایہ میں بیٹھ جاتا اور دنیا و مافیہا سے بےخبر کچھ لکھتا رہتا۔ محمد بخش نے اس کا یہ دستور کئی روز تک دیکھا لیکن کچھ سوچ کے

تجلیاتِ رعنا

نگاہِ شوق سے رسوا کیا نہیں جاتا
بہ ایں وجہ کبھی جلوہ رکا نہیں جاتا

ہزار شکر کہ رونے پہ مجھکو قابو ہے — ہزار چاہیں وہ ہنسنا ہنسا نہیں جاتا
کچھ ایسا اذنِ تمنا نگہ سے ملتا ہے — کبھی کبھی جو زباں سے کہا نہیں جاتا
کچھ اس ادا سے توجہ وہ آپ کرتے ہیں — نگاہِ شوق سے اکثر اٹھا نہیں جاتا
ترے خیال سے تسکین اب نہیں ہوتی — ترے خیال میں بہروں رہا نہیں جاتا
شبِ فراق میں ایسی بھی منزلیں آئیں — جہاں پہ عرضِ تمنا کیا نہیں جاتا

نصیب کیا ہے وہ انسان کیا ہے اے رعنا
کہ جس سے زخمِ محبت سیا نہیں جاتا

صفیہ سلطان رعنا

خاموش ہوگیا۔ وہ روز صبح حسب دستور اپنے مویشی لیکے چرانے نکل جاتا اور نازاں سے کہہ جاتا کہ ان بابوجی کا خیال رکھنا لیکن صادق کو کسی کے خیال کی پرواہ نہ تھی۔ وہ اپنے غم کی داستان میں کھویا۔ اپنے خیالات میں خود سر جھکائے لکھتا رہتا اس کو خبر تک نہ تھی کہ اس کی اس محویت کے عالم کو کوئی بیٹھا تاکا کرتا ہے۔ نازاں جب اس سے آ کے کہتی "کھانا کب کھائیے گا" تب اس کو خیال آتا کہ ابھی کھانا بھی کھانا ہے۔ وہ چونک کے کہتا "ابھی سے کیا بجا ہے" نازاں بغیر آنکھ ملائے کہتی "تین بجنے والا ہوگا" وہ گھبرا کے پوچھتا "ارے تین بج گئے! تم نے کھا لیا؟" "جی، ابھی نہیں" وہ مسکرا کر کہتی۔ وہ شکایت آمیز لہجہ میں کہتا "بھئی! تم میرا انتظار مت کیا کرو۔ میرا کچھ ٹھیک نہیں۔ مجھکو کچھ یاد نہیں رہتا۔ اچھا چلو اس کام سے بھی فرصت کرلیجائے" تقریباً اسی قسم کی گفتگو روزانہ ان میں ہوتی اور ان چند جملوں کے سوا وہ کوئی دوسری بات نہیں کہتے۔ اس گفتگو کے بعد وہ اٹھ کے کھانا کھانے چلے جاتے اور کھانے کے درمیان میں صادق، نازاں سے یہ کہنا بھی بھول جاتا کہ آؤ تم بھی بیٹھ جاؤ۔

اسی طرح دن گذرتے گئے اور صادق کی کاپی میں لکھے ہوئے صفحات کی ضخامت بڑھتی گئی۔ وہ روزانہ کھیت کے کنارے بیٹھ کے صفحے سیاہ کرتا اور نازاں اس سے کچھ فاصلہ پر بیٹھی ہوئی اس کے چہرے کے تغیرات کا مطالعہ کرتی رہتی۔ کبھی اس کے چہرے سے محبت کے اظہار کے اثرات نمایاں ہوتے اور نظریں پیام محبت پہونچاتی نظر آتیں کبھی اس کا چہرہ شرم آلود ہو جاتا اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگتی اور کبھی اس کا چہرہ کسی خاص عقدہ کو حل کرتا نظر آتا لیکن اس روز صبح کو جو وہ لکھنے بیٹھا تو نازاں نے پہلی والی کیفیات اس کے چہرے پر نہ پائیں۔ آج اس کے چہرے سے ذہنی کشمکش اور جذبات کی آزردگی کے اثرات زیادہ نمایاں تھے۔ کبھی وہ لکھتے لکھتے رک جاتا اور آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ گو کہ اسکے الفاظ بے معنی ہوتے لیکن اس کے دلی تنفر کا انکشاف کرتے پھر وہ کچھ سوچ کے لکھنے لگتا اور اس کی آنکھوں سے انتہائی غیظ و غضب جھلکنے لگتا جیسے کہ وہ کسی کے قتل پر آمادہ ہو۔ نازاں صادق کی یہ حالت دیکھکر گھبرا گئی اور شاید وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس نے پھر اس کے چہرے پر نمایاں فرق دیکھا۔ اب اس کا چہرہ انتہائی آلام اور حرماں نصیبی کا آئینہ دار تھا۔ اس کی آنکھوں سے یاس و ناامیدی ٹپکنے لگی اور اس کے ہونٹ فرط غم سے کانپ رہے تھے۔ یکایک اس نے لکھتے لکھتے پنسل پھینک دی اور کاپی بند کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس نے منہ سے ہاتھ ہٹا کے چاروں طرف دیکھا اور نازاں کو اپنے قریب بیٹھا دیکھ کر کچھ شرمندہ ہوگیا۔ اس کا تمام چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نازاں نے اس کی یہ حالت دیکھ کر بیتابی سے پوچھا "ارے آپ رو رہے ہیں؟" صادق نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں نازاں، یہ کہانی ہی اس قسم کی ہے جو انسان کو خراج اشک دینے پر مجبور کر دیتی ہے"۔ نازاں کی آنکھوں میں ہمدردی کے آنسو لرزنے لگے۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا "آپ لاکھ چھپائیں لیکن آپ غمزدہ معلوم ہوتے ہیں"۔ صادق نے اس سے نظریں چار کرتے ہوئے کہا "ہاں میں بہت بدبخت ہوں، یہ کہانی میری زندگی کی کہانی ہے لیکن تم ..... تم کیوں میری وجہ سے اس قدر پریشان ہوگئیں" نازاں نے شرم سے سر جھکاتے ہوئے کہا "مجھ سے آپ کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی" صادق اپنے اس نئے ہمدرد کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ آج تک اس کے تفکرات نے اسکو موقع تک نہ دیا تھا کہ وہ کبھی نازاں پر غور کرتا۔ اس نے آج پہلی مرتبہ نازاں کے چہرہ پر غائر نظر ڈالی۔ اس کا بھولا چہرہ، نرگسی آنکھیں خوبصورت، اور بڑی پلکیں اور گداز جسم صادق پر بغیر اثر کئے نہیں رہ سکا۔ لیکن نازاں کے چہرے کو دیکھتے دیکھتے اس کا خیال نہ معلوم کہاں پہونچ گیا اور پھر اداسی کی تاریک گھٹاؤں نے اسکو گھیر لیا۔ وہ بیچینی کے انداز میں کھڑا ہوگیا اور اپنی کاپی اٹھاتے ہوئے نازاں سے کہا "کل مجھکو شہر جانا ہے"۔ صادق کے اس اچانک ارادہ نے نازاں کو خوف زدہ کر دیا۔ اس نے اسکو اس ارادہ کا اس کے چہرے سے جائزہ لیتے ہوئے کہا "کیوں؟" "اس کتاب کو چھپوانا ہے" صادق نے جھونپڑے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ نازاں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا "کیا نام ہے اس کتاب کا؟" "دکھڑا" صادق نے جیسے بیچین ہوتے ہوئے کہا۔ "کون چھاپے گا" نازاں نے تعجب سے پوچھا۔ "کتاب چھاپنے والے چھاپیں گے۔ فی الحال تو میرا ارادہ ہے کہ اس کو کسی فلم کمپنی میں بھیجدوں" صادق نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ لیکن نازاں کے لئے اتنی معلومات کافی تھی اور اس نے فلم کمپنی اور اس کا اس کتاب کے لینے کے مقصد کی تشریح ضروری نہ سمجھی۔ اس نے اس لئے وہ سوال کیا جو اس کے لئے خاص اہمیت رکھتا تھا "اور واپس کب آئیں گے" اس نے مخصوص معصومانہ انداز میں پوچھا۔ "یہی دو ایک روز میں" مختصر سا جواب تھا۔

شام کو جب محمد بخش مویشی چرا کر واپس لوٹا تو صادق نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ محمد بخش کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس کتاب کو چھپوانے یا کسی فلم کمپنی کو دیدینے سے اس کو کیا حاصل ہوگا اور اس کو روپیہ کیونکر ملجائے گا۔ پھر بھی وہ صادق کا مصمم ارادہ دیکھ کر خاموش ہو رہا لیکن جب صادق نے اس سے کچھ روپیہ بطور قرض مانگا تو وہ ذرا چونکتا ہوا اسکو فوراً اس کے ایک دوست کی رائے جو کہ اس نے صادق کے متعلق دی تھی اس کو یاد آئی۔ اس کے دوست نے کہا تھا "یہ لونڈا کوئی بڑا چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ ہتھیا کے چلتا بنے" محمد بخش اس اندیشہ سے فوراً باخبر ہوگیا لیکن صاف جواب بھی نہیں دے سکتا تھا اسلئے بات بناتے ہوئے کہا "اتفاق سے میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں ہے۔ کل ہی دو بیل کھیتی کرنے کے ارادہ سے خریدے ہیں۔ دیکھو جگو چودھری کے پاس جاتا ہوں شاید کچھ مل جائے"۔ یہ کہکے وہ جگو چودھری کے ہاں جانے اٹھ کر کہیں چلدیا۔ نازاں اپنے چچا کی چال سمجھ گئی۔ اس نے صادق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ کو کتنے روپیہ کی ضرورت ہے؟" صادق نے کہا "یہی آٹھ دس روپے راستہ وغیرہ کے خرچ کیلئے چاہیئے ہیں شہر سے واپسی پر لوٹا دونگا"۔ نازاں بغیر کوئی جواب دئے اندر گئی اور پندرہ روپے کے نوٹ لاکر اس کے سامنے رکھدیئے۔ صادق نے حیرت سے نازاں کو دیکھتے ہوئے کہا "یہ کیا؟ نہیں میں یہ تم سے نہ لوں گا"۔ نازاں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

ہم غریب آدمی، ہمارے پاس ہے ہی کیا جو کسی کو دے سکیں۔ جو کچھ تھا وہ لاکر آپ کو دیدیا۔ اگر آپ کا اس سے کام نکل جائے تو یہ میری خوش قسمتی ہے دیکھئے جلدی سے جیب میں رکھ لیجئے کہیں چچا نہ آجائیں "۔ صادق سے کچھ جواب دیتے بن نہ پڑا۔ اس نے نوٹ اٹھاکے خاموشی سے جیب میں رکھ لئے۔ تھوڑی دیر میں محمد بخش باہر سے آیا اور نہایت تفکرانہ لہجہ میں کہا "کیا بتاؤں کچھ انتظام نہ ہوسکا۔ جگو چودہری پڑوس کے گاؤں چلے گئے ورنہ ان سے مل جاتے۔ میرے خیال میں دو ایک دن میں انتظام ہوسکتا ہے "۔ صادق نے مسکراکر نازاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "نہیں میرا ویسے بھی کام نکل جائے گا"۔ لیکن محمد بخش اس پہیلی کو نہ سمجھ سکا۔

لاہور پہونچتے ہی اس نے اپنا ڈرامہ ایک فلم کمپنی میں جاکے دیا۔ خوش قسمتی سے ڈائرکٹر فلم کمپنی معقول آدمی تھے اور انہوں نے صادق کو ضرورت مند سمجھ کے اسکا ڈرامہ پڑھنے کے لئے لیا ورنہ ہر کسی کی تو پہونچ بھی نہیں ہوتی۔ ڈائرکٹر فلم کمپنی نے اسکے ڈرامہ کی قیمت دس ہزار روپیہ لگائی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اسقدر کامیاب اسٹوری لکھ سکے گا۔ وہ بغیر کسی پس وپیش کے فوراً تیار ہوگیا۔ ڈائرکٹر نے اسکو دس ہزار کا چک حوالہ کیا اور رسید لے لی۔ اس نے اسی وقت جاکر چک بھنا یا اور فوراً گاؤں روانہ ہوگیا۔

صادق کے لاہور کے غیر معمولی قیام نے محمد بخش کو کیا بلکہ سارے گاؤں کو یقین دلادیا تھا کہ صادق ضرور کوئی مطلب پرست تھا اور وہ محمد بخش کو دہوکا دیکے چلتا بنا۔ گاؤں والے آپس میں بیٹھ کے محمد بخش کا مضحکہ اڑاتے تھے لیکن نازاں کو کامل یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی دن ضرور آئے گا۔ وہ ہرگز دہوکہ باز نہیں ہوسکتا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ آٹھویں روز کی شام کو صادق گاؤں پہونچ گیا۔ محمد بخش اور نازاں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اب گاؤں والے کسی طرح اسکو احمق نہیں بنا سکتے تھے اور جب صادق نے دس ہزار روپے کی گڈی جیب سے نکال کر محمد بخش کے سامنے رکھدی تو اسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہگئیں۔ اس نے انتہائی تعجب سے پوچھا "یہ کیسے"۔ ..... "میری مزدوری کی قیمت" صادق کا مسکراہٹ آمیز جواب تھا "لیکن اتنے بہت سے!" دیہاتی عقل اسکو سمجھنے سے قاصر تھی۔ صادق نے طنزاً کہا "جی جناب دس ہزار۔ اس روز تم مجھکو ایک پیسہ تک دینے سے گریز کر رہے تھے تم کو شبہ تھا کہ میں ضرور لیکر چلتا بنوں گا اور پھر کبھی صورت نہ دکھاؤنگا۔ خیر میں تم کو الزام نہیں دیتا۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ باپ بیٹے کا اعتبار نہیں کرسکتا لیکن نازاں کی میں دل سے قدر کرتا ہوں اور احسانمند ہوں۔ اسنے مجھپر اعتبار کیا اور چلتے وقت پندرہ روپے دیئے۔ اگر نازاں نے میری مدد نہ کی ہوتی تو شاید میں لاہور میں فاقہ سے مرجاتا قبل اس کے یہ دس ہزار روپے ملتے۔ میں نازاں کی اس ہمدردی کے صلہ میں نازاں کو نو ہزار نو سو روپے دیتا ہوں۔ مجھکو صرف سو روپے اپنے مصارف کے لئے چاہئیں۔ یہی کھنے کھانے کے خرچ کے لئے مجھکو اب روپیہ کی خواہش نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا جبکہ میں بھی عام انسانوں کی طرح دولت کا

۴ خواہشمند تھا لیکن میں جس وقت دولت سے محبت کرتا تھا دولت مجھ سے نفرت کرتی تھی اور آج جبکہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں وہ میری طرف راغب ہے۔ میری زندگی کی سب سے قیمتی شے، میری سب سے بڑی دولت صرف اسی کی غیر موجودگی کیوجہ سے چھین لی گئی ...... اف میں بعض اوقات اپنے خیالات میں ایسا بہا چلا جاتا ہوں کہ مجھکو خیال نہیں کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں میرا مطلب کچھ اور ہے تم اس کو نہیں سمجھ سکتے "۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے نوٹوں میں سے ایک سو کا نوٹ نکالا اور باقی زبردستی نازاں کے ہاتھ میں تھمادیئے۔ محمد بخش خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ اس کو صادق کے روپ میں کوئی ولی اللہ نظر آرہا تھا۔

دوسرے ہی دن سارے گاؤں میں یہ خبر بجلی کی سی سرعت کیساتھ پھیل گئی گھر گھر صادق کی واپسی اور دس ہزار روپوں کا چرچہ تھا۔ جو لوگ محمد بخش کا مذاق اڑایا کرتے تھے وہ آج عجیب کھسیانی ہنسی ہنس رہے تھے۔ سادہ لوح گاؤں والوں کی سمجھ سے یہ بات بالاتر تھی کہ صرف ایک کہانی کیسے دس ہزار میں بک سکتی ہے اور خریدنے والے کو اس میں ایسی کیا کشش نظر آئی۔ انکے خیال میں یہ روپیہ چوری کا تھا لیکن ساتھ ہی ان کے دماغ میں یہ بات بھی آگئی تھی کہ اگر اسنے چوری کی تھی تو اس نے وہ روپیہ نازاں کو کیوں دیا۔ شاید اسکو نازاں سے محبت ہے۔ لیکن پھر وہ شادی کیوں نہیں کرلیتا۔ محمد بخش اور نازاں دونوں دل وجان سے یہی چاہتے ہیں ہر چند کہ یہ ڈھکوسلے تھے جو کہ انکی دیہاتی عقلیں سمجھنے سے معذور تھیں لیکن یہ تو ضرور تھا کہ ہر گاؤں والا نازاں کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔

(باقی آئندہ)

روایاتی شاعر سے

زندگی خواب نہیں بادۂ سرجوش نہیں
رفعت بام ثریا صرف نگاہوں کا فریب
کہکشاں جادۂ تخئیل گذرگاہ خیال
ذوق پروانہ — المناک حقائق سے گریز
یہ تصوّف کے مسائل یہ سریلے قوال
راہ میں کوہ بھی تھے باغ بھی تھے راغ بھی تھے
تو بھٹکتا ہی رہا نجد کے صحراؤں میں
تیرا موضوع سخن ابروئے رخسار حبیب
زندگی کاٹ دی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں
پھر وہ فولاد کی جھنکار فضائیں گونجی
تیرے ہونٹوں پہ ہے عشرت کا ترانہ اب تک
پھول جلتے ہیں گلستاں سے دھواں اٹھتا ہے
تو نہ بھولا گل و بلبل کا فسانہ اب تک
زیست اک تلخ حقیقت ہے تجھے کیا معلوم
یہی دوزخ یہی جنت ہے تجھے کیا معلوم

پریم پال

رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری جس میں سینکڑوں انگریزی کے حروف کاڑھنے کے لئے فلور باسکٹ چیر بیک (کرسی کی گدیاں) میزپوش کا حسین مرکز۔ میزپوش کے کئی دلپسند ڈیزائن۔ سینٹر میزپوش پر ناشپاتی رس بھری، خوبانیاں۔ آلو، مختلف دلکش مرکز۔ میزپوش کے کونے۔ ٹی ٹیبل۔ چادروں کی بیلیں حسین و دلفریب کونے۔ شلوار کی بہترین حسین بیلیں جو فرانسیسی طرز کی ہیں۔ کرتوں کی دلکش بیلیں انگریزی بورڈر، جمپر کی خوبصورت بیلیں۔ گلاب کی بیلیں۔ دوپٹہ کی بیلیں۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت پتیاں اور بیلیں۔ گریبان کی حسین و جمیل بیلیں قمیص کے بورڈر۔ انگور کے پتوں کی بیلیں مختلف بوٹے۔ جمپر کے حسین گلے۔ کرتے کے خوبصورت گلے بچوں کے حسین بب۔ کروشیا کا کام۔ کروشیے کی بیلیں۔ کروشیا میزپوش اور مونوگرام۔ تولیہ پر کروشیا۔ گلدان پر کروشیا۔ گلدستہ کروشیا۔ خوشہ انگور کروشیے میں۔ کروشیے کی نفیس بیلیں۔ دوسوتی کا کام طغرے۔ انگریزی طغرے۔ عید مبارک۔ خوش آمدید۔ مزاج شریف۔ شب بخیر۔ موتیوں کا کام۔ کٹائی کا کام۔ سلمہ ستارہ کا کام۔ تارکشی کا کام۔ بکرمی کا کام۔ فریٹ ورک تکیوں کے اشعار۔ غرضیکہ رضیہ سلطان چمن دہلوی کی سینکڑوں قسم کی حسین و جمیل چیزیں رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری میں آپ کو ملیں گی۔ آپ اپنی لڑکیوں، بیبیوں بہنوں کو تحفہ دیکر اپنے گھر کو گلزار بنائیں تاکہ آپکا دل گھر بھی بنیگا۔ نئی شادی شدہ لڑکیوں کا بہترین مشغلہ ہے۔ سائز بڑا قیمت مجلد دو روپے بارہ آنہ (۲/۱۲) محصولڈاک ۸ر دو جلدوں پر محصول ۱ر لگتا ہے۔

اس کے علاوہ رضیہ کا شاہی دسترخوان ۲/۸/۔ رضیہ کے خطوط ۱/۸/۔ تازیانہ ۱/۸/۔ فاطمہ کا لال ۱/۱۲/۔ باپ کا خط بیٹی کے نام ۔/۱۲/۔ لعل و گوہر ۔/۱۲/۔ امت کی مائیں ۲/۸/۔ یہ کتابیں تحفہ دینے کیلئے ضرور منگا لیجئے۔ تمام کتابیں منگوانے پر محصول ڈاک معاف۔

ینا کتاب گھر۔ اردو بازار (ای۔ سی) دہلی سے طلب کریں

میرحسن اور مثنوی

قمر امداد لکھنوی

۱۷۲۷ء غلام حسن کی پیدائش پر ناز کرتی ہے۔ آبائی رہنے والے ہرات کے تھے۔ چنانچہ ان کے جد اعلیٰ میر امامی ہرات ہی سے آکر پرانی دلی میں رہنے لگے۔ غلام حسن جنکو ہم آگے چل کر حسن کے نام سے موسوم کریں گے دلی کے محلہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے۔ اوائل سن شعور سے شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ اول اول باپ میر ضاحک کی اصلاح کو بہت کچھ جانا لیکن آخر میں میر درد، میر تقی میر، مرزا سودا اور میر ضیا کے رنگ میں اپنی غزلیات کو رنگتے رہے۔ اصل چیز جس نے عوام کی نگاہ میں حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں وہ ان کی مثنویاں ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ حسن کی شہرت جتنی مثنوی کے میدان میں آکر ہوئی اتنی نہ تو انکو غزلیات میں میسر ہوئی اور نہ مرثیہ گوئی میں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ مرثیہ کی صنف حق تعالےٰ نے ان کے پوتوں انیس انیس اور مونس کیلئے محفوظ رکھی تھی۔ میر حسن اور مثنوی ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ یوں تو حسن نے کئی مثنویاں نظم کیں لیکن ان سب میں مثنوی سحرالبیان بلند پایہ رکھتی ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ میر حسن کی زبان سادہ صاف شستہ، عام فہم اور سلجھی ہوئی ہے۔ جہاں تک روانی اور خیالات کا تعلق ہے عبارت پانی کا ایک صاف شفاف دریا ہے۔ جو اپنی سبک روی میں یکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ سحرالبیان پر صدہا کتابیں اور مضامین لکھے جاچکے ہیں جنہیں مختلف نظریوں کے ماتحت بحث و مباحثہ ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی ایسا مان لینا کہ میر حسن نے سحرالبیان میں کوئی غلطی نہیں کی یا وہ غلطی کرنے کے عادی نہیں تھے کسی حد تک بعید از قیاس ہے۔ مجھے حسن کی یہی مثنوی دیکھنے کا اتفاق ہوا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ حسن نے بہت سی لفظی، واقعاتی اور معنوی غلطیوں کے علاوہ بعض بعض جگہ پر اشعار کو ان کے حسنِ شعر گوئی سے بھی گرا دیا ہے اور قافیوں کی پابندی کو زیادہ دھیان نہیں دیا۔ جگہ جگہ پر اشعار میں شتر گربگی پیدا ہوگئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ تمام باتیں میر حسن کے دامن کو ایک بدنما دھبہ سے کسی طرح نہیں بچا سکتیں۔

یہ ضرور ہے کہ دو تین سو سال قبل انہوں نے جو زبان نظم کی وہ آج بھی رائج ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ انہوں نے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ میں میر حسن کی قابلیت اور مکمل شاعر ہونے میں بالکل شک نہیں کرتی لیکن جہانتک ان کے گندے خیالات کا تعلق ہے میں کبھی بھی ان کی ہم آواز نہیں بن سکتی۔

اب میں حسن کی وہ فاش غلطیاں جن سے سحرالبیان کے دوران مطالعہ میں چشم پوشی کرنا گویا ضمیر کشی کرنا ہے ذیل میں درج کرتی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دریافت کرتی ہوں کہ سحرالبیان کس حد تک اپنانے کے قابل ہے۔

۱۔ شتر گربہ:- بہت ممکن ہے کہ بعض ناظرین اس اونٹ نما بلی سے ناواقف ہوں۔ لہذا اس کی بابت تحریر کر دینا ضروری ہے۔ شعر میں اونٹ نما بلی کا گزر اسی وقت ہوتا ہے جب شاعر متکلم کے لئے دو ضمیر جمع استعمال کرے۔ جیسے پہلے اسکو آپ کہکر مخاطب کرے اور پھر اسی شخص کو "تم" یا "تو" کہے۔ ایسی حالت میں شعر حسن کے معیار سے گر جاتا ہے اور کانوں کو گراں معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:- ایک جگہ نجم النسا، جوگن کے روپ میں شاہ جنات کے یہاں جاتی ہے اور بین بجاکر اس کو محظوظ کرتی ہے۔ نوشاہ جنات یوں مخاطب کرتا ہے ؎

اسی طرح ہر شب کرم کیجئے   میری بزم رشک ارم کیجئے

لیکن آگے چلکر لفظ "کیجئے" کو میر حسن بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ اور سحرالبیان کی روانی انکو اتنا تیز بہاتی ہے کہ ان کو اس بات کا احساس مطلقاً نہیں ہوتا کہ شعر میں اونٹ نما بلی داخل ہوگئی۔ ایسے مقام پر لغیر اعتراض کئے نہیں رہا جاتا وہی شاہ جنات اسی جوگن سے یوں کلام کرتا ہے ؎

مقدم ہمارا رکھا نا کرو   ہمیں اپنا مشتاق جانا کرو
یہ گھر بار ہے آپ ہی کا تمام   ہوئے آج سے ہم تمہارے غلام
تکلف کو موقوف کر دیجئے   جو کچھ تم کو درکار ہے لیجئے

اسی سلسلہ میں آگے پھر نظم کرتے ہیں ؎

کہا جوگی جی یہ کیا بات ہے   کرم آپ کا ہم پہ دن رات ہے
جو مرضی ہو تو تم کو تکلیف دیں   نہیں جس میں راضی ہو تم سو کریں

گو مثنوی بہت صاف شستہ اور منجھے ہوئے الفاظ سے مرتب کی گئی ہے لیکن یہ وہ مقامات ہیں جہاں پر فنی اعتبار سے فن کی پامالی اور اہل نقاد کو انگشت نمائی کا موقعہ ملتا ہے۔ اور ایسی موٹی موٹی چیزیں حسن کی ذات کو گراں ہیں۔

تمام مثنوی اگر سرسری نگاہ سے بھی دیکھی جائے تو ایک ان پڑھ بھی ٹوک دیگا اس لئے انہوں نے بہت سے ایسے الفاظ ہم قافیہ قرار دیئے ہیں جو بالکل نادرست ہیں اور ان کی بے تکی موجد طبیعت کا اظہار کرتے۔ ذرا غور کیجئے ؎

زبس تھا وہ لڑکا تو سہماں بھی کچھ   ہوا کچھ دلیرا و رحیراں بھی کچھ

"سہماں" تحریر میں بھدا معلوم ہوتا ہے۔ اصل لفظ "سہما" ہے لیکن حسن کو چونکہ "حیراں" کا ہم قافیہ لانے کی ہوس دامن گیر تھی اور ساتھ ساتھ اس کے خوفزدہ ہونیکو بھی اظہار کرنا تھا۔ انہوں نے فوراً دب کے اوپر ڈاکہ ڈالا اور لفظ "سہما" کو "سہماں" کر دیا۔ یا یہ شعر ؎

لئے ہاتھ میں بیچے مالنیں   چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں

دیکھ لیا آپ نے اردو زبان کی پامالی کا یہ حسین طریقہ۔ اگر ایسی اصطلاحات کو قدرے بھی سراہا گیا تو دو تین سو سال بعد اردو کا نام دنیا سے مٹ جائیگا۔

یہ تو کسی حد تک نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن آجکل کا اہل علم طبقہ تو اردو کے گلے کو جہالت کی لمبی چھری سے اس طرح ہانک رہا ہے جس سے فی الوقت یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ گلے کو کسی خندق یا کنویں میں دھکیل ہی کر رہے گا اور اردو کی جگہ ایک نئی زبان بنے گی جسکا شاید نام ہوگا "کھڑ دُڈ"

ہاں تو میر حسن نے ایسی غلطی ایک نہیں کئی جگہ کی ہے سنئے ؎

قضا را کھلی آنکھ اس گل کی جو | نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بو
زبس ہاتھ آنا تھا اسکا کٹھن | کہ ہے درحقیقت وہ گلک کا من

"جو" کا ہم قافیہ "بو" اور "کٹھن" کا ہم قافیہ "من" نظم کیا ہے جو بالکل کانوں کو برا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب میر، درد، سودا، ضیا، ایسے اساتذہ تھے اور لوگوں کا خیال ہے کہ ان حضرات کے کلام میں بھی ایسی تراکیب موجود ہیں۔ پھر بھی غلطی خواہ وہ اساتذہ کی خود مختار طبیعت کا پرتو ہو خواہ شاگردوں کی جدت طرازی کا نتیجہ۔ غلطی ہی ہے۔ اور میں اساتذہ کی ایسی غلطیوں کو پیش کر کے کسی شاعر کو اس امر سے سبکدوش نہیں کر سکتی۔

غور تو کیجئے اتنا ہی ہنسی کے اوپر قابو پانا مشکل نظر آتا ہے۔ ایک جگہ حسن اپنی طبیعت کا یوں اظہار کرتے ہیں ؎

نہیں ہے وہ شہ کو لب بام پر | دیکھا یا کہ سویا تھا یاں سیمبر

میر حسن کو سیمبر کا قافیہ تلاش کرنا تھا۔ پھر کیا تھا غواص طبیعت نے اس درجہ غوطہ لگائے کہ آخر اردو کو ڈبا ہی دیا۔ اور "لب بام کے آگے" "پر" بھی لگا دیا۔ اور اب لب بام مائل پرواز ہو گئی۔ یہ لسانی غلطی کتنی اہم ہے۔

یہ ترکیب صرف ایک ہی جگہ نہیں بلکہ متعدد جگہ نظم میں لائی گئی ہے۔ نظم کرتے ہیں ؎

لب بام پر جب وہ سوئی صنم | کریں سورۂ نور کو اسپہ دم
لب جو پہ آئینہ میں دیکھ قد | اکڑتا کھڑے سرو کا جدنہ تد

یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ حسن "لب بام" کے معنے کوٹھے کے اوپر نہیں لیتے ہیں؟ بلکہ وہ "پر" لگا کر اسکو اپنے مطلب کا کرتے ہیں۔ یہ سوال اسیوقت صحیح مانا جا سکتا ہے جبکہ حسن نے خود "لب بام" کو استعمال نہ کیا ہو۔ فرماتے ہیں ؎

لب بام کثرت جو یکسر ہوئی | تلے کی زمیں ساری اوپر ہوئی

دراصل یہ حسن کی لاپرواہی کا پرتو ہے۔ اس کے علاوہ بھی حسن نے اور بہت سی لسانی غلطیاں کی ہیں جو پڑھنے سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں۔ اب میں معنوی غلطیوں کی طرف رجوع ہوتی ہوں۔

جب بادشاہ اولاد سے بالکل مایوس ہو گیا اور عزم فقیری کا کیا۔ وزرائے حکومت کو تشویش ہوئی۔ سب بادشاہ کے روبرو حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ پروردگار کی رحمت ضرور نازل ہوگی۔ آپ اس کی ذات سے مایوس نہ ہوں پھر بھی اگر آپ کا دل پورا نہ ہو تو آپ نجومیوں سے زائچہ کھنچوالیں نجومی بلوائے گئے اور انہوں نے ڈھارس بندھائی اور کہا کہ تیرے یہاں ضرور لڑکا ہوگا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی ہدایت کی ؎

یہ لڑکا تو ہوگا دلے کیا کہیں | خطر ہے اسے بارہویں سال میں
نہ آئے یہ خورشید بالائے بام | بلندی سے خطرہ ہے اسکو مدام
نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مہ | رہے برج میں یہ مہ چاردہ

اس پیشنگوئی کے نو ماہ بعد بادشاہ کے یہاں لڑکا پیدا ہوا لڑکے کو ایسی جگہ بند رکھا گیا جہاں چاندکی روشنی نہ پہنچ سکے۔ لیکن پھر بھی تاریخ پیدائش کا خیال نہ رکھتے ہوئے شہزادے کو چاندنی رات میں کوٹھے پر سونے کی اجازت دیدی گئی۔ پرستان کی ایک پری کا اس طرف سے گذر ہوا اور وہ شہزادے کے اوپر ہزار جان سے عاشق ہو گئی اور اسکو وہاں سے لے اڑی۔

یہ معنوی غلطی کبھی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ کو شہزادے کی طرف سے بہت فکر تھی۔ کیونکہ جسکی بابت پنڈت اس طرح کا حکم لگائیں اس کا باپ عین چودھویں رات میں کوٹھے کے اوپر سونے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔ یہ امر بالکل غیر فطری ہے۔ چونکہ اہل مشرق ذرا توہم پرست ہوتے ہیں میرا خیال ہے کہ جس لڑکے کے لئے یوں پابندی لگائیں۔ اس کا باپ میعاد پوری ہونے کے دو چار دن بعد تک ڈر کی وجہ سے اس کو باہر نکلنے میں مانع ہوتا۔ مگر یہاں پر قصہ ہی دوسرا تھا حسن کو قصہ کو طول دینا تھا۔ اگر اس غلطی سے چشم پوشی نہ کرتے۔ تو یہ کیسے ظاہر ہوتا کہ حسن جسطرح ایک اچھے شاعر ہیں اسی طرح منچلے۔

یہ واضح رہے کہ جب پری شہزادے کو اڑا لیجاتی ہے اسوقت وہ بارہ برس کا یا اس سے کچھ کم رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ "عورت" کے صحیح معنوں سے ناواقف ہوگا لیکن میر حسن یوں ذکر کرتے ہیں ؎

شراب و کباب و بہار و نگار | جوانی و مستی و بوس و کنار

اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماہ رخ پری سے جنسی تعلقات رکھتا تھا جو اس وقت علاوہ حسن کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ شہزادہ بے نظیر کو پری کے یہاں رہتے ہوئے کئی سال ہو گئے۔ لیکن ماں باپ کے خیال سے وہ ہر وقت اداس رہتا تھا پری بھی اس کے مضمحل رہنے سے بہت فکرمند ہوئی اور ایک کلدار گھوڑا فلک سیر نامی اسکو دیا تاکہ وہ اپنا دل بہلائے۔ ایک دن وہ پرواز کرتے کرتے ایک بہت حسین باغ کی طرف جا نکلا۔ جو شہزادی بدر منیر کا تھا۔ شہزادہ کو وہاں کے منظر نے لبھا لیا اور وہ اتر کر درختوں کی آڑ آڑ چلنے لگا اور پھر ایک درخت کی آڑ لیکر کھڑا ہو گیا۔ مثنوی کو غور سے پڑھتے جائیے۔ آپکو گھوڑے کا ذکر پھر نہ ملے گا کہ اس نے گھوڑا کیا کیا۔ آیا کسی کھیت میں پھینک آیا یا بدر منیر کے حمام خانہ میں رکھ آیا۔ میر حسن کو اس مقام پر گھوڑے کا ذکر کرنا

لازم تھا کہ اس نے کیا کیا یا کہاں چھپایا۔ یہ ضرور ہے کہ بات بالکل معمولی ہے لیکن مثنوی کے اتنے بڑے عالم کو اس معمولی بات کا دھیان ضروری تھا یہی وجہ ہے کہ میر حسن کی یہ چھوٹی چھوٹی مگر روشن غلطیاں سورج بن کر چمک رہی ہیں۔

ان تمام غلطیوں کے علاوہ حسن کی سب سے بڑی غلطی جو مثنوی میں ملتی ہے وہ غالباً ان کے جذبات پر منحصر ہے۔ اور جس سے حسن کے کیریکٹر، طرزِ معاشرت طبیعت اور علم کا پتہ چلتا ہے حسن نے جہاں کہیں بھی عورت اور مرد کی خلوت کا ذکر کیا ہے کل واقعات من و عن سامنے رکھ دیئے ہیں۔ عورت اور مرد کی خلوت کا ذکر یوں بھی برا معلوم ہوتا ہے تاکہ خلوت کی تمام باتوں کو بھی منظرِ عام پر لانا میر حسن نے بدر منیر اور بے نظیر کی ملاقات اس طرح نظم کی ہے کہ دوران مطالعہ میں نہ جانے حسن کے لئے کتنی دعائیں نکلیں۔ اور یہی وجہ ہے جس نے مجھے اتنا بے شرم بنا دیا کہ میں نے مثنوی کے تمام اشعار کو اپنے دماغ میں جگہ دے کر کاغذ کے ذریعہ اپنی جماعت صنف کو بطور ہدایت مطلع کر رہی ہوں ملاحظہ ہو۔ بدر منیر جب بے نظیر کے پاس آتی ہے ؎

زبس حوصلہ نے جو تنگی سی کی حیا عشق نے خانہ جنگی سی کی
پکڑ ہاتھ مسند پہ کھینچا اسے محبت کے رشتہ میں اینچا اسے

بدر منیر اس پر نالاں ہوتی اور ؎

لگی کہنے ہے ہے مرا چھوڑ ہاتھ یہ گرمی ہے جس سو لیے اسکو ساتھ

اس پہ بے نظیر نے کہا ؎

کہا ہائے پیاری جلایا مجھے رکھائی نے تیری ستایا مجھے
اری ظالم ایک دم تو بیٹھ جا ذرا میرے پہلو سے تکیہ لگا
تڑپتا ہے کب سے پڑا میرا دل ذرا کھول آغوش اور مجھ سو مل

اس کے بعد حسن یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں ؎

غرض آخرش بعد ناز و نیاز وہ مسند پہ بیٹھی بصد امتیاز
ہوا پھر تو صہبائے گلگوں کا دور ہوئے اور ہی اور کچھ واں کے طور
ہوئے جبکہ بدمست وہ ماہرو لگی ہونے ان میں عجب گفتگو
کہ دستے جو نرگس کے تھے واں ہزار لگے ڈھانپنے آنکھ بے اختیار
خواصیں جو تھیں روبرو ہٹ گئیں بہانے سے ہر کام کے بٹ گئیں
لیا کھینچ انہوں نے جو پردہ شتاب چھپے ایک جا دو مہ و آفتاب
لگی ہونے بے پردہ جو چھیڑ چھاڑ در حسن کے کھل گئے دو کواڑ
لگے پینے باہم شرابِ وصال ہوئے نخل امید سے وہ نہال
لبوں سے ملے لب دہن سے دہن دلوں سے ملے دل بدن سے بدن
لگی آنکھ سے آنکھ خوشحال ہو گئیں حسرتیں دل کی پامال ہو

لگی جا کے چھاتی جو چھاتی کے ساتھ چلے ناز و غمزہ کے آپس میں ہاتھ
کسی کی گئی چولی آگے سے چل کسی کی گئی چین ساری نکل
غم و درد دامن کشیدہ ہوئے وہ گل نارسیدہ رسیدہ ہوئے
اٹھے پی کے باہم شراب امید کوئی سرخ رو اور کوئی رو سپید

میر حسن نے تو کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک صنف لطیف کے قلم سے لکھے ہوئے یہ الفاظ قطعی طور پر خیالات کو میلا کر دینگے مجھے کسی کی صفائی کی ضرورت نہیں بلکہ مجھے صرف وہ باتیں جنکہ حسن کی شہرت کا وسیع دامن اپنے میں چھپائے ہوئے ہے منظرِ عام پر لانا ہے۔ ہاں اگر یہ الفاظ ایک عورت کے قلم سے نکلے ہوتے تو ضرور معیوب تھے۔ مجھے حسن کی ذات سے کوئی ہمدردی نہیں۔ فنی اعتبار سے وہ شاعر تھے اور میں مانتی ہوں۔ لیکن خیالات ان کے نہایت گندے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ محدود تھے۔ کیا حسن اس عریاں منظر کو اشارہ کنایہ اور تشبیہات کے ذریعہ نہیں ادا کر سکتے تھے؟ میرا خیال ہے کہ مثنوی پر قدرت رکھنے والا قطعی اس بیان کو ایک شستہ اور مہذب طریقہ سے کہہ سکتا تھا۔ لیکن یہاں حسن نفس کشی کیسے کرتے۔

میں نے ایک عورت ہونے کی حیثیت سے بہت کچھ لکھا اور اتنا لکھا کہ جو ایک عورت کبھی نہیں لکھ سکتی۔ آگے ہیں ایسے مضامین سے احتراز کروں گی حسن نے ایسی ہی صدہا غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً مستورات کی پوشاک کا بیان۔ ان کی جسمانی عضو کی صحیح ترجمانی۔ ان کے جذبات سے واقفیت۔ حسن نے اپنے منچلے ہونے کا مکمل ثبوت دیا ہے اور انہیں سے ان کی سیرت کا پتہ چلتا ہے۔

ایک جگہ نجم النساء بے نظیر کی تلاش میں سادھوؤں کا سا لباس پہن کر اور ایک بین اپنے کندھے پر سنبھال کر صحرا نوردی اختیار کرتی ہے حسن تحریر کرتے ہیں ؎

زمرد کی سمرن کو ہاتھوں میں ڈال اور ایک بین کاندھے پر اپنے سنبھال

یہ ملحوظ خاطر رہے کہ علاوہ بین کے جوگن کے پاس ساز کی قسم میں سے کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ مثنوی پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بین بجانے میں کافی ملکہ رکھتی تھی۔ لیکن چاندنی رات میں وہی جوگن ایک جگہ بیٹھ کر یوں بجاتی ہے ؎

کدارا بجانے لگی شوق میں لگی دست ملنے مارے ذوق میں
کدارا جو بجنے لگا اس کے ہاتھ کہ مہ نے کیا دائرہ لے کے ساتھ
کدارے کا عالم تھا اس گھڑی کہ تھی چاندنی ہر طرف غش پڑی

نجم النساء جب چلی ہے اسوقت وہ بین لیکر چلی لیکن یہ کدارا کہاں سے آ گیا؟ اور پھر اتنا عبور حاصل تھا کہ جس وقت بجانے بیٹھی تو کیا حیوان، کیا اشجار، سب محو ہو گئے۔ اگر جوگن اپنے ساتھ کدارا لیکر چلی تھی۔ تو بین کے ساتھ اس کا بھی ذکر ضروری تھا۔ اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ حسن نظم کرتے وقت واقعات کے پابند نہ تھے بلکہ قلم اور دماغ کے۔ جو دماغ میں آیا لکھ مارا۔ چاہے تیر ٹیڑھے یا ٹکا۔ یہ کہنا کہ

میر حسن بین اور کدارے میں کوئی فرق ہی نہیں سمجھتے تھے۔ قابل قیاس نہیں۔ کیونکہ بین اور کدارے میں کافی فرق ہے۔ پھر یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ وہ کدارے کہاں سے لے آئی۔ آگے چلکر وہ پھر بین کا ذکر کرتے ہیں۔ جب فیروز شاہ کو پہنچوایا گیا ہے۔ اس وقت ؎

بکا یک سنی بین کی جو صدا وہاں تخت لا اس نے اپنا رکھا

نجم النساء جوگن کا بھیس بدلے سب پرستان میں بیٹھ کر گانا گاتی ہے تو حسن اسوقت کی یوں منظر کشی کرتے ہیں ؎

رواں و دواں کر دیا جان کو رلا یا ہر اک جن وانسان کو

حسن "بیان" کا ہم قافیہ "انسان" تو لے آئے لیکن جو نقص پیدا ہو گیا وہ نہ دیکھ پائے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ پرستان کا ذکر ہے۔ آخر وہاں انسان کہاں سے آ ٹپکا۔ اگر حسن نے اس کو محاورہ کے طور سے نظم کیا ہو تو بھی غلط ہے۔ اس لئے محاورہ "جن وانسان" آج تک نظر سے نہیں گذرا۔ "جن وانس" محاورہ ہے۔ اور خود انہوں نے اسی محاورہ کو ایک جگہ نظم کیا ہے جس سے اس بات کا بھی شک رفع ہو گیا کہ ممکن ہے میر حسن اس محاورہ کی بابت زیادہ نہ جانتے ہوں عرض کرتے ہیں ؎

کہاں صورت جن کہاں شکل انس غرض قہر ہے صحبت غیر جنس

نجم النساء جوگن کے بھیس میں بے نظیر کو تلاش کرنے نکلتی ہے۔ کہیں تو وہ بطور مذکر پیش کیجاتی ہے اور کہیں مؤنث فرماتے ہیں ؎

یہ تحفہ بناوٹ کا کچھ بھیس ہے لگا کہنے جوگی جی آ دیس ہے
کدھر سے تم آئے کدھر جاؤ گے دیا اپنی تم پر بھی فرماؤ گے
کہا ہنس کے جوگن زہر لوں پر جہاں سے تو آیا چلا جا ادھر
کہا تب پری زاد نے واہ جی بہت گرم ہیں آپ اللہ جی
۔۔۔ روٹھی ہوا اتنی چلا جاؤ نگا ذرا بین سنکر چلا جاؤں گا

شروع میں تو فیروز شاہ جوگی سمجھ کر گفتگو کرتے ہیں۔ اور آخر میں "نہ روٹھی ۔۔۔ اتنی" کا جملہ یہ بتاتا ہے کہ تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا ہے اور پھر جب اس کو اپنے باپ کے سامنے پیش کیا تو جوگی بنا دیا کہتے ہیں ؎

یہ جوگی جو ہیں ایک صاحب کمال ذرا بین سنئے اور ان کے خیال
۔۔۔ آپ نے اٹھائینگے حظ بہت بین سے ان کی پائینگے حظ
کہا اس نے بابا بہت خوب ہے ہمیشہ سے راگ اپنا مرغوب ہے
۔۔۔ جوگی جی بیٹھو ادھر کرو روشن اپنے قدم سے یہ گھر

ان اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فیروز شاہ جوگن کو دل دے چکا تھا اور باپ کے ۔۔۔ وجہ سے بحیثیت جوگی تعارف کرایا یہ امر قابل قیاس ہے لیکن آگے چلکر حسن خود بیچ کو اپنے ہاتھوں باندھ لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

پری زادے سارے ہوئے محو تماشا کہ دیکھیں تو جوگن کا چلکر سماں

اب کوئی حیلہ نہیں ملتا جو اس غلطی کو چھپا لے۔ لیکن ہاں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پری زاد اس امر سے واقف ہو گئے ہوں کہ اصل میں یہ جوگن ہے۔ اسلئے جنوں میں غیب کے اسرار معلوم کرنے کی صلاحیت عموماً کرآتی ہے۔ لیکن پھر یہاں پر سمجھ چکرا تی ہے اسلئے شاہ جنات اس کو آخیر وقت تک جوگی ہی تصور کئے رہا۔ کیا اس میں غیب کے حالات معلوم کرنے کی صلاحیت نہ تھی؟ ضرور رکھتی بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ حسن نظم کرتے وقت کہیں اور رہے ہونگے جوان کو اس تمام الٹ پھیر کا پتہ نہ چلا۔ شاہ جنات ایک جگہ پر جوگن کو مخاطب کرتا ہے ؎

کہا جوگی جی یہ کیا بات ہے کرم آپ کا ہم پہ دن رات ہے

لیکن پھر دوسری جگہ پر پری زاد ایک جا ہو کر یوں بات چیت کرتے ہیں ؎

ہوئیں تم نہ واقف مرے حال سے فدا میں رہا جان اور مال سے
تم اپنا سا مجھ کو سمجھتے رہے بھلا تم کو اب ہاں کوئی کیا کہے
تم ایسی ہی بے رحم و بیدرد ہو غرض اپنے عالم میں تم فرد ہو

یہ ہو سکتا ہے کہ گذشتہ مثالیں کسی وجہ سے نظر انداز کر دی جائیں لیکن یہ تین اشعار کبھی نہیں چھوڑے جا سکتے۔ حسن نے مثنوی کو ایک عجیب گھروندہ بنا دیا ہے جس میں نہ تو واقعات کی پابندی ہے نہ قافیہ اور ردیف کی اور نہ شعر کے حسن سے غرض بلکہ جو دل میں آیا بلا روک ٹوک کہتے چلے گئے۔

بے نظیر ایک مرتبہ پری کے حکم سے ایک کنوئیں میں قید کر دیا گیا تھا اور پھر جب پری کے حکم سے اسکو کنوئیں سے نکالا گیا اسوقت کی اس کی کیفیت یوں لکھتے ہیں ؎

اندھیرے سے اس چاہ کے اسکا تن نظر یوں پڑے جیسے کالے کا من

لیکن کچھ دور چلکر پھر خود ہی یوں ارشاد کرتے ہیں جو ایک دوسرے واقعے کے بالکل متضاد ہو جاتا ہے۔ بے نظیر کی کمزوری اور لاغری کو اس طرح تحریر فرمایا ہے ؎

جمی خاک تن پر بہ رنگ زمیں گڑا جیسے نکلا ہو مردہ کہیں
فقط پوست باقی تھا اور استخواں نہ تھا خون کا رنگ بھی درمیاں
بدن سوز گوں کی تھی اٹھی صب نمود کہ الجھی ہو جوں ریسمان کبود

اب غور طلب بات یہ ہے کہ جسوقت وہ کنوئیں سے نکالا جا رہا ہے اسوقت اس کی آب و تاب۔ چمک اور خوبصورتی کالے سانپ کے من سے مشابہ کی گئی ہے لیکن بعد میں اس کی کمزوری اور لاغری کی بھی حد کر دی۔ ظاہر ہے جس شخص کے جسم پر لا انتہا گرد جمی ہو اور پھر جس کے جسم میں خون نام کو بھی نہ ہو اس میں اتنی چمک دمک کہاں سے آئی۔ نہ جانے میر حسن ایسی بھونڈی غلطیاں کیسے کرتے رہے۔ اور ان غلطیوں سے ان کا کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ ادب ہی سسکیاں لینے لگا۔

تعلیم بالغان

لندن کی خاص سڑکوں کے شور و غل سے دور گارڈن اسکوئر کی خاموش فضا میں جس کی سڑکوں پر درختوں کی قطاریں ہیں، بلومزبری کا ادارہ واقع ہے۔ یہ دنیا کے لاکھوں بالغ آدمیوں کی زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔ اگر آپ اس کا چھوٹا سا سائن بورڈ دیکھیں اور زینہ کے ذریعہ اس کے صدر دفتر میں جائیں تو آپ کو یہ اندازہ ہونا مشکل ہے کہ یہ واقعی اتنا اہم ہو سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ لندن کی "تعلیم بالغان کی بین الاقوامی انجمن" کے دنیا کے بیشتر ملکوں سے تعلقات ہیں جن میں مصر، ترکی اور فلسطین بھی شامل ہیں۔

اس ادارہ کے نام سے ظاہر ہے کہ اس کا معمولی تعلیم سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا ان لوگوں کی تعلیم سے جو بچپن میں لکھ پڑھ نہ سکے۔ عرصہ ہوا برطانیہ میں تعلیم بالغان کا خیال پیدا ہوا تھا جس سے اب دنیا کے بہت سے مرد اور عورتیں جن کے پڑھنے لکھنے کی عمر گزرے مدت ہو چکی اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اس کا سہرا صرف ایک ہستی یعنی ڈاکٹر البرٹ مینسبرج کے سر ہے۔ یوں تو بہت سے انگریز زندگی بھر مزدوروں کو پڑھاتے لکھاتے رہے لیکن ڈاکٹر مینسبرج سب سے زیادہ کامیاب ہے۔

ڈاکٹر مینسبرج شہر گلوسٹر کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے اور چودہ برس کی عمر میں ایک دفتر میں چپراسی ہو گئے۔ ہر روز صبح کے پونے آٹھ بجے گھر سے چلتے اور شام کے سوا سات بجے سے پہلے نہ لوٹتے۔ بیٹرسی سے (جو لندن کی مضافات میں ہے) پانچ میل کی دوری پر پیدل دفتر جاتے اور شام کو پڑھنے کے لئے واپس آتے۔ اس طرح انہیں ذاتی تجربے سے معلوم ہو گیا کہ عورت اور مرد بڑے ہو کر بھی لکھنا پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔

اکیس برس کی عمر میں وہ وائٹ چیپل کے ایک دفتر میں کلرک ہو گئے۔ وہ اپنے چاروں طرف ایسے آدمی دیکھتے تھے جو سخت تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ کند ذہن تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ان پڑھ تھے۔ اس وقت سے ان کے ذہن میں یہ خیال آنا شروع ہوا کہ اگر ان عورتوں اور مردوں کو جو بچپن میں نہیں پڑھ سکے اب پڑھایا جائے تو غالباً وہ نئے امکانات کی دنیا میں اپنی حالت سدھار سکیں۔

یہ اچھا خیال تھا لیکن اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے بہت سی مشکلات کا حل کرنا ضروری تھا۔ جب مصمم ارادے کی وجہ سے پہلی دشواریاں بھی دور ہو گئیں اور یونیورسٹیاں اس اسکیم میں دلچسپی لینے لگیں تو ایک بڑی مشکل یہ رہ گئی کہ مزدور پڑھنے لکھنے کے لئے آمادہ بھی کئے جا سکیں گے یا نہیں۔ مینسبرج نے اس خیال کو عملی صورت دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انھوں نے ایسی ہی محنت، حکمت عملی اور خلوص سے کام کیا جیسا کہ تعلیم کے پرچار کرنے والے سچے پیغمبروں نے کیا تھا۔

ونسینٹ بروم

ایک روز سنہ ۱۹۰۳ء میں تعلیمی دنیا میں ایک بڑا اہم واقعہ پیش آیا یعنی "ورکرز ایجوکیشنل ایسوسی ایشن" وجود میں آئی اور اس کے پہلے سکرٹری البرٹ مینسبرج منتخب ہوئے۔ آج اٹھارہ سے اسی برس تک کے ہزاروں مرد اور عورتیں اس ادارے کے اسکولوں میں پڑھنے جاتی اور بچپن میں تعلیم نہ حاصل کرنے کی کمی کو پورا کرتی ہیں۔ ان سے کسی قدر زیادہ پڑھے لکھے طالب علم طبیعیات، کیمیا، سیاسی اقتصادیات اور فلسفے پڑھتے، ڈگریاں حاصل کرتے، زبانیں سیکھتے اور اچھے شہری بنتے ہیں۔ مگر البرٹ مینسبرج کی کوششیں یہیں تک نہیں رہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ اگر خود برطانیہ میں بیسیوں بالغ اس عمر میں علم حاصل کرنے کا شوق رکھتے ہیں تو دنیا میں تو یہ خواہش رکھنے والے ہزاروں لوگ ہوں گے۔ اس لئے انھوں نے اپنا دائرہ عمل وسیع کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ برطانیہ سے آسٹریلیا، نیوزیلینڈ اور کینیڈا گئے۔ جہاں کہیں بھی وہ گئے انھوں نے اپنے ملک کی طرح تعلیم بالغان کا بیج بویا جو آئندہ بار آور درختوں کی صورت میں رونما ہوا۔

اب یہ خیال خود پھیلتا جا رہا تھا۔ ہندوستان کے مردوں اور عورتوں نے بالغوں کو پڑھانے کا کام شروع کیا اور رفتہ رفتہ یہ لہر آدھی دنیا میں دوڑ گئی۔

شروع شروع میں اس میں بہت مشکلات پیش آئیں۔ ہندوستان میں ایک انگریز ایچ۔ بی۔ رچرڈسن کو ایک علاقہ میں جہاں چھ مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں پڑھنا لکھنا سکھانے اور تاریخ پڑھانے کا مسئلہ بڑا پیچیدہ معلوم ہوا۔ پہلے مختلف مذاہب کے لوگوں کے مشترک اعتقادات معلوم کئے گئے۔ اس میں ہر مذہب کے لوگوں کو رواداری برتنے کی ضرورت تھی اور خود رچرڈسن کو بھی ہوشیاری سے کام شروع کرنا لازمی تھا۔ صرف اس صورت میں تعلیم قومیت اور مذہب سے بلند رہ کر بین الاقوامی مفاہمت میں مدد دے سکتی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ ان ملکوں میں تعلیم بالغان کی بہت سی تحریکیں خود بخود بھی رونما ہوئیں لیکن اس تحریک کے پیشرو ہونے کی حیثیت سے ڈاکٹر البرٹ مینسبرج سب سے زیادہ اہم ہیں۔ آخر کار لندن ہی میں اس قسم کے سارے ادارے آپس میں مل گئے اور ڈاکٹر مینسبرج نے "تعلیم بالغان کی بین الاقوامی انجمن" قائم کی۔ اس انجمن کی سب سے پہلی نشست سنہ ۱۹۲۹ء میں کیمبرج میں ہوئی جس میں تیرہ سے زیادہ ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے اور انھوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ عالمگیر تعلیم بالغان کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔

اب یہ تحریک اور زور پکڑ رہی ہے۔ چین کے کچھ لوگ تعلیم بالغان کے لئے انتھک کوشش کر رہے ہیں۔ امریکہ، بلغاریہ، حبشہ اور افریقہ کے لوگ بھی اس کوشش میں ہیں۔ پولینڈ اور سیام میں بھی، جو جنگ میں تباہ و برباد ہو چکے ہیں، پھر سے کام جاری ہو گیا ہے۔

ہندوستان کا بہترین سفیر

ڈی۔ ایف کراکا

ہندوستانی سپاہی کی بہادری کا لوہا تو ساری دنیا مان چکی ہے۔ اس مضمون سے آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ صرف مرد میدان ہی نہیں بلکہ لڑائی ختم ہو جانے پر دشمن کے چھینے ہوئے علاقوں کو دوبارہ حاصل کر لینے کے بعد وہ وہاں کے آدمیوں کے دلوں کو بھی اپنی خوش مزاجی اور خوش خلقی سے موہ سکتا ہے۔

بات تو کچھ زیادہ عرصہ کی نہیں ہے لیکن اب تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ بہت دن بیت گئے ہیں ایک روز میں شمالی اٹلی میں ایک جیپ میں بیٹھا ادھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ جاڑا بڑے کڑاکے کا پڑ رہا تھا کیونکہ کئی دن سے برف پڑ رہی تھی۔ اُن لمبی لمبی سڑکوں کے بارے میں بات چیت کرنے کا کسی کو بھی دھیان نہ تھا۔ مجھ کو پچھلے چھ سال سے یورپ جانے کا موقع نہیں ہوا تھا۔ میں ہر چیز کو ایسی خاموشی کے ساتھ نگاہوں میں کھپاتا چلا جا رہا تھا جیسے بڑھیا قسم کی برانڈی کے گھونٹ لے رہا ہوں۔ اٹلی کی چھوٹی چھوٹی بستیاں آ آ کر گزرتی جا رہی تھیں۔ ان کی سڑکیں پیوند لگی ہوئی تھیں اور دوکانیں چھوٹی چھوٹی سی جو زیادہ تر مال سے خالی تھیں اور جنگ کے اثرات ان کی شکستہ حالی سے عیاں تھے۔ کہیں کہیں گھناؤنے نشیب بھی تھے جو اتحادی بمباری کا پتہ دے رہے تھے۔ پانچ سال تک لڑائی کے رہتے ہوئے یورپ کا یہ حال ہو جانا بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

جب مجھ کو یہ مناظر نظر آئے تو ہندوستان کی یاد میرے دماغ سے محو ہو گئی۔ جب ہم ایک چھوٹی سی بستی کے پاس پہنچے تو ایک دم گانے بجانے کی آواز کانوں میں آئی وہاں کی تنگ گلیاں کچھ جانی پہچانی آوازوں سے گونج رہی تھیں۔ آوازیں اور بانسری کی تھی۔ لیکن گانا یورپی نہیں تھا بلکہ اس سے تو مشرقیت ٹپکی پڑ رہی تھی۔ ہم اس چھوٹے سے پیازا (چوک) میں پہنچے (یہاں کے اکثر چوکوں کے نام "پیازا گریبالڈی" تھے بالکل اسی طرح جیسے انگلستان کے ہر چھوٹے موٹے شہر میں کئی کئی "ہائی اسٹریٹ" اور امریکہ کے ہر شہر میں کئی کئی "مین اسٹریٹ" ہوتی ہیں۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ دو ہندوستانی چلے جا رہے ہیں۔ ان کے بعد دو اور نظر آئے یہاں تک کہ ہم اس چوک میں داخل ہو گئے اور ہم نے دیکھا کہ وہاں ہمارے ہم وطن ہندوستانی بہت سے ہیں تو آور پٹھان بھی تھے اور پنجابی، ڈوگرے اور سکھ بھی۔ اگر قوموں اور فرقوں کا خیال کرو تو وہاں ہر فرقہ کے آدمی موجود تھے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ سب ہندوستانی تھے اور بس۔

گانا کیا تھا طبلہ اور بانسری بجائی جا رہی تھی گانا بالکل اُسی گھٹیا قسم کا تھا جیسا ہندوستان میں سپیرے گاتے پھرتے ہیں۔ چوک میں اطالوی باشندے بھی آکر جمع ہو گئے تھے اور ہمارے تین اور طاقتور اور بہادر ہندوستانی سپاہی طبلہ کی تھاپ اور بانسری کی آواز میں آواز ملا کر اپنے جنگلی گیت گاتے اور ہتھیلیوں سے تال دیتے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دیہاتی وضع کے ناچ بھی ناچ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے صافے آتارے ہوئے تھے اور شلواریں پہنے ہوئے تھے جو ہوا بھر جانے سے بالکل غبارے سے معلوم ہوتی تھیں قمیص خاکی رنگ کے تھے اور اندر کی طرف اُڑسے ہوئے نہیں تھے۔ ناچتے وقت ان کے گہرے لال رنگ کے رومال اِدھر اُدھر اڑتے جاتے تھے۔

سپاہی ہندوستانی فوج کے بہترین دستہ کے تھے۔ خاص محاذ پر یہ لوگ پورے اٹھارہ مہینہ تک رہ چکے تھے۔ دوبارہ اپنے ٹھکانوں پر جانے سے پہلے اس زمانہ میں وہ کچھ دنوں کے لئے سستانے کے واسطے وہاں آئے ہوئے تھے۔ تاریخ کی تعمیر میں ان کا بڑا حصہ تھا — ان کا ہر قدم تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ لیکن وہ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور اہم تر کام کر رہے تھے — گو خود ان کو اس کی خبر نہیں تھی۔ وہ دوستی کی نئی راہیں نکال رہے تھے۔ میدان جنگ میں بہادری کے جوہر دکھا کر وہ اپنی اور اپنے ملک کی تعریف کرا چکے تھے۔ اگر کوئی جنرل ان ہندوستانی سپاہیوں کی تعریف کرے جو اس کی کمان میں رہ کر لڑے ہوں تو ہو سکتا ہے کہ اس کا مقصد اس سے کچھ کا کچھ ہو لیکن اگر دوسری قوموں کے معمولی اور ادنیٰ سپاہی ان کی تعریف میں اس قدر رطب اللسان ہوں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یقیناً اس بات میں واقعیت ضرور ہے۔

جن چھوٹے اطالوی شہروں اور گاؤوں میں وہ سپاہی ٹھیرے ہوئے تھے وہاں کے باشندوں سے یہ سپاہی ملے اور ان کے ساتھ مل جل کر رہے۔ یہ لوگ قومیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے لیکن پھر بھی یہ ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ ایک جوان کے گھٹنوں پر جو ناچ دیکھ رہا تھا دو چھوٹے چھوٹے اطالوی بچے بیٹھے تھے جن میں ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی بچوں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ ناچنے والوں نے ان پر جادو کر دیا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ ہندوستانی جوان جاڑے میں سکڑتے ہوئے اور بھوک سے اَدھ مرے بچوں کو اپنے ہفتہ بھر کے راشن میں سے تھوڑی تھوڑی چاکلیٹ کھلاتا جا رہا تھا۔ وہ اٹلی میں ایک جنگجو فاتح ہی کی حیثیت نہیں رکھتا تھا اور اگرچہ شروع شروع میں اس کی موجودگی اطالویوں کے واسطے ڈراؤنی ہی تھی۔ لیکن پھر وہ لوگ اس سے اس قدر مانوس ہو گئے جیسے وہ انہی میں سے تھا۔

کا غذپر اس قسم کی باتیں جذباتی معلوم ہوسکتی ہیں لیکن اطالویوں کے نزدیک ان میں جذباتیت کا شائبہ بھی نہ تھا جب ہندوستانی سپاہی اس گاؤں سے روانہ ہونے لگے تو گاؤں کے مرد اور عورتیں اپنے اپنے گھروں سے نکل کر باہر آ کھڑی ہوئیں اور جاتے ہوئے سپاہیوں کو تکتی رہ گئیں۔ ان میں سے بعض کی آنکھوں میں آنسو بھی بھر آئے تھے۔ یہ مظاہرہ میرے خیال میں بہترین نذرِ عقیدت ہے۔

فلورنیس میں ایک دفعہ مجھ کو ایک اطالوی کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ یہ وہ شخص تھا جس کا نام اسپورٹس کی دنیا میں ایک زمانہ میں بہت بالا رہ چکا تھا۔ اس کو جنگ کا تجربہ بہت قریب کا تھا۔ خاص اس کے گھر کے آگے جرمن توپیں نصب رہ چکی تھیں اور تین ہفتہ تک وہ اپنے گھر سے باہر نہ نکل سکا تھا۔ اس نے مجھ سے بیان کیا کہ ہندوستانی سب سے پہلے فلورنیس میں داخل ہوئے۔ میں نے قدرتی طور پر اس سے یہ سوال کیا "ہندوستانیوں کا برتاؤ آپ لوگوں کے ساتھ کیسا رہا؟" اطالوی نے جواب دیا "ایسا برتاؤ جس سے ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک سخت معرکہ کے بعد ہمارے شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے اور ہم ان سے کسی قدر سہمے ہوئے تھے۔ مگر ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ وہ آئے تو ہنستے کھیلتے آئے اور ایسے عجز و انکسار کے ساتھ جیسے وہ ہمارے معاملات میں دخل دینا ہی نہیں چاہتے"۔

اس اطالوی نے یہ بھی بیان کیا کہ ہندوستانی سپاہی کس طرح شہر کے بازاروں میں گھومتا پھرتا تھا اور اگر کسی دوکان میں کوئی چیز اپنی پسند یا ضرورت کی دیکھتا تو اس کو اٹھاتا اور نہایت ملائمت کے ساتھ اس کی قیمت پوچھتا۔ اگر اپنے لئے اس کو ان داموں میں نامناسب پاتا تو چیز کو اسی جگہ رکھ دیتا اور حد درجہ انکسار کے ساتھ معافی چاہتا کہ فضول دوکاندار کو تکلیف دی۔ اطالوی نے کہا "ظاہر ہے کہ اس مزاج و اخلاق کے آدمی کو پسند نہ کرنا مشکل ہی ہے۔ ہندوستانی سپاہی بڑے خلیق، شائستہ، مہذب اور خاموش طبع تھے اور کبھی خود نمائی سے کام نہیں لیتے تھے"۔

ایک روز ایک اور واقعہ پیش آیا۔ اٹلی کے ایک مرکزی مقام میں میں نے ایک شامی اور ایک ہندوستانی سپاہی کو بڑی گرم گرم گفتگو کرتے دیکھا۔ وہ بیچ سڑک پر کھڑے تھے جب میں ان کے قریب سے گزرا تو مجھ کو بڑا تعجب ہوا یہ دیکھ کر کہ وہ دونوں آپس میں اطالوی زبان میں بات چیت کر رہے تھے۔ یہی ایک ایسی زبان تھی جو وہ دونوں جانتے تھے۔ یہ دونوں سپاہی جو ایک عرصہ سے ہمدوش رہ کر اطالویوں سے لڑ چکے تھے، کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اطالویوں ہی کی زبان میں بات کر رہے تھے۔ گویا یہ سپاہی کسی ثقافتی وفد سے بھی بڑھ کر بڑا کام انجام دے رہے تھے۔ اور یہ ایک ایسے فرض کی انجام

دہی تھی جس سے ملک کے بڑے سے بڑے نمائندے بھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔

ایک واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب اور دلچسپ ظہور پذیر ہوا۔ ٹیپیوولی روم کا گلی کوچوں کا علاقہ ہے۔ ایک روز میں ادھر ٹہلنے کے لئے گیا اور میں نے دو اطالوی عورتیں اپنی راہنمائی کے واسطے ساتھ لے لیں۔ ان میں سے جو کسی مدرسہ میں ماسٹرنی تھی اس نے ترجمانی کا کام کیا (اس عورت کو میں نے امریکی صلیب احمر سے لیا تھا) اور دوسری عورت ایک پولستانی راہبہ تھی جو ان گلی کوچوں کے راستوں سے واقف تھی۔ ہماری موٹر کا ڈرائیور ایک پنجابی شخص تھا۔ جب ہم اس علاقہ میں پہنچے تو راہبہ اطالوی زبان میں بولتی اور میری ترجمان مجھ کو سمجھانے کے لئے اس کو انگریزی میں کہتی اور پھر میں اس بات کو ڈرائیور سے اردو میں کہہ دیتا تھا۔ تمام راستے یہی عمل ہوتا رہا۔ یہ کام بہت مشکل اور بے لطف تھا۔ ڈرائیور منہ سے کچھ نہیں بولا اور بالکل خاموش رہا صرف سر ہلا دیتا تھا۔ اگلے دن میں کسی اور طرف گیا تب بھی وہی پچھلے روز والا ڈرائیور میرے ساتھ تھا۔ راستہ مجھ کو ٹھیک طرح معلوم نہیں تھا لیکن ڈرائیور نے کہا کہ وہ معلوم کرے گا۔ ایک جگہ اس نے موٹر روک دی اور ایک آدمی کو "امیکو" کہہ کر پکارا۔ وہ اطالوی یہ لفظ سن کر رک گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرا ڈرائیور اور وہ اطالوی بڑی روانی سے اطالوی زبان میں بات کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہم منزل مقصود پر بہ آسانی پہنچ گئے۔

میں نے ڈرائیور سے پوچھا "کل تم نے آخر یہ بات کیوں چھپائی کہ تم اطالوی زبان جانتے ہو؟ آخر تم نے ہمیں ترجمہ کی اتنی زحمت کیوں اٹھانے دی؟" ڈرائیور مسکرایا اور بولا "چونکہ آپ اطالوی زبان نہیں بولتے اس لئے میرا یہ زبان جاننا آپ کو برا لگتا ہے۔ اصل میں ہم ہندوستانیوں میں سے اکثر اطالوی زبان بخوبی جانتے ہیں"۔

ایک منٹ میں فوٹو اتار لو

جو لوگ کیمرے کا بٹن دبانا بھی نہیں جانتے وہ بھی ان سے آسانی سے چلتے پھرتے مرد عورت، بچہ، گھوڑ دوڑ، باغ، باغیچہ ہر قسم کے سین سبزہ زار، دریا، پہاڑ، سمندری نظارے اور بڑی بڑی عمارات وغیرہ کے خوبصورت اور شاندار فوٹو اتار کر اپنی شہرت اور قسمت چمکا سکتے ہیں، یہ کیمرے مضبوط باڈی خوبصورت اور تیز طاقتور لینز بٹن سے آراستہ ہیں۔ قیمتیں بہت ہی کم رکھی گئی ہیں۔

کس کیمرہ پانچ روپے بارہ آنے 5/12/-
سپیشل کوالٹی فولڈنگ کیمرہ پندرہ روپے 15/-
موصوف قسم سات روپے چار آنے 7/4/-
محصول ڈاک و پیکنگ وغیرہ ہر ایک کا ایک روپیہ

نوٹ

ہر ایک کیمرے کے ساتھ فوٹو اتارنے والے کاغذ فلمیں دھونے کے مکمل مصالحہ جات وغیرہ اور تصویر ترکیب استعمال مفت روانہ ہوگی جلدی منگا لیں ورنہ ختم ہونے پر ایسا مال اس قیمت پر نہ ملے گا اس لئے آج ہی وی پی منگا لیں۔ آرڈر دیتے وقت اخبار یا رسالہ کا حوالہ ضرور دیں اور اپنا نام و پتہ خوشخط لکھیں سامان ناپسند ہونے پر قیمت واپس ہوگی۔ ملنے کا پتہ

نقد و نظر

ممی خانہ

مصنفہ :- محترمہ حجاب امتیاز علی۔ ناشر :- پبلشرز یونائیٹڈ۔ چوک انار کلی۔ لاہور۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۵۰ صفحات۔ مجلد قیمت ؏۔ محترمہ حجاب امتیاز علی گذشتہ پندرہ سولہ سال سے دنیائے ادب میں جلوہ گر ہیں اور شروع ہی سے خصوصاً افسانوں کی نگری میں، اپنے لئے ایک ایسی جگہ بنا چکی ہیں جس پر رشک سب کرتے ہیں لیکن ان حدود میں پہنچنے کی ہمت و صلاحیت کسی میں پیدا نہیں ہوئی۔ چونکہ ان کا تخیل اچھوتا اور انداز بیان بہت ہی نرالا ہے، اس لئے ان کی نقالی اگر ناممکن نہیں تو حد درجہ مشکل ضرور ہے۔ کونن ڈائل کے مشہور سراغرساں شرلاک ہومز کی طرح موصوفہ کے افسانوں میں بھی فرضی کردار اپنی خاص انفرادیت قائم کر چکے ہیں۔ ان میں سے چند "ممی خانے" میں بھی جلوہ گر ہیں۔ مثلاً زوناش، ہارلی اور چچا الیاس وغیرہ۔ "ممی خانہ" ایک طویل اور چھ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان سب کو ہیبتناک نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بعض افسانوں میں صرف ذہن کا کرشمہ ہے اور انہیں پڑھنے کے بعد طبیعت پر خوف و دہشت طاری ہونے کی بجائے انسان صرف اس غور و فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کیا یہ واقعہ ہو سکتا ہے؟ اور اگر ہے تو ممکن کس طرح ہوا؟ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مصنفہ موضوع کے لحاظ سے ہر جگہ مناسب ماحول تخلیق کرنے میں بڑی کامیاب رہی ہیں اور اسی لئے بعض دفعہ اصل افسانے کی بجائے صرف ماحول کی کیفیات پڑھنے والے کے بدن میں کپکپی پیدا کر دیتی ہیں۔ آخری سب سے زیادہ طویل افسانہ "کیا بوت کے آسیب زدہ جنگل" ڈائری کی صورت میں ہے اور چونکہ ایسے افسانوں میں تحریر کی بیباکی اصل انداز پر چلا کرنے لگتی ہے اس لئے یہ افسانہ نسبتاً سب سے اچھا ہے۔ تعجب ہے کہ "ممی خانے میں ایک رات" جسکی رعایت سے کتاب کا نام بھی رکھا گیا ہے، اتنا زیادہ ہیبتناک اور کامیاب نہیں ہے جتنا کہ ہونا چاہیئے تھا۔

قد بڑھانے کی ورزشیں

مصنف :- آغا سکندر بخت۔ ناشر :- راہنما بک ڈپو، گجرات (پنجاب) ۲۰×۲۶/۱۶ کے ۱۱۲ صفحات۔ مجلد قیمت ؏۔ اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ایسی ورزشوں کے طریقے قلمبند کئے گئے ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان کا قد ایک خاص حد تک بڑھ سکتا ہے۔ یہ کتاب جس خلوص و انہماک کے ساتھ لکھی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمی اعتبار سے یقیناً بہت مفید ہے قطعی رائے صرف اسی وقت قائم کی جا سکتی ہے جب ان اصول اور طریقوں پر عمل بھی کیا جائے جو قد بڑھانے کے سلسلے میں درج کئے گئے ہیں۔ فاضل مصنف نے شروع صفحات میں ان طبعی، جسمانی، قدرتی اور بہت سے دوسرے خارجی اثرات پر روشنی ڈالی ہے جو قامت انسانی کی نشو و نما میں خلل انداز ہوتے ہیں پھر ورزشوں کے طریقے، اور دوسرے مشورے اسقدر رہین فطرت ہیں کہ انکی صحت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا اسلئے جو شخص اپنا قد بڑھانے کی فکر میں ہو، اس کتاب کا مطالعہ کر کے مندرجہ اصولوں پر کاربند ہونے کی کوشش کرے۔ آغا صاحب کے وہ خیالات قابل غور ہیں جو انہوں نے چھوٹے قد کے نقصانات اور لمبے قد کے فوائد کے سلسلے میں ظاہر کئے ہیں۔ آخر میں دیباچہ نگار صاحب بھی جو مصنف کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنے قد کو بقدر ڈھائی انچ بڑھا کر ۵ فٹ ۱۱½ انچ طویل انسان بن چکے ہیں اور ابھی زیادہ بڑھنے کی فکر میں ہیں، یہ محسوس کرتے رہے تھے کہ "قد کا لمبا ہونا بھی انسانی صفات میں ایک اعلیٰ درجے کی صفت ہے"۔ غالباً ان دونوں بزرگوں نے "کل طویل احمق" جیسا مشہور قول اپنے کسی پڑوسی کی زبان سے بھی کبھی نہیں سنا جو اسقدر شد و مد کے ساتھ قد بڑھانے کی فکر میں ہیں۔

نئے اشارے

مصنف :- جناب مظلوم کیتھلوی۔ ناشر :- ادبی مندر۔ لائل پور ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۲۶ صفحات۔ مجلد قیمت ؏۔ یہ آٹھ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جن پر ضیا فتح آبادی نے اپنی رائے کا اظہار دیباچے کی صورت میں کیا ہے اور افسانوں کے مصنف جناب مظلوم کیتھلوی کو دنیائے ادب میں گمنام تسلیم کرتے ہوئے پریم چند اور سدرشن کے ہم پایہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خود مظلوم صاحب نے دنیائے ادب میں گمنام رہنا پسند نہیں کیا ہوگا، اسلئے اگر ان کو کوئی درجۂ قبول حاصل نہ ہو سکا تو صرف اس لئے کہ ان کے افسانوں میں بذات خود اتنی جان نہیں ہے کہ وہ اپنے خالق کو کسی قسم کی زندگی بخش سکتے۔ ضیا صاحب کا یہ فرمانا کہ مظلوم صاحب کے افسانے حقیقت سے بہت قریب ہیں، سراسر بے بنیاد ہے۔ افراد افسانہ کے کردار کی صحیح عکاسی تو خیر بڑی چیز ہے۔ وہ معمولی مناظر قدرت بھی پوری صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس شروع رات میں جبکہ پورا چاند آسمان پر جلوہ گر ہوتا ہے، انکا تخیل تاروں کی چھاؤں تخلیق کرتا ہے اور گرمی کے موسم میں وہ ایسے پھول کھلاتا ہے جنکی بہار موسم سرما کے بغیر ممکن نہیں ہوتی! افسانے کے افراد بھی اپنے قول و فعل کا لحاظ نہیں رکھتے۔ اسلئے نہیں کہ یہ انکی فطرت کی کمزوری ہے بلکہ اس لئے کہ ایسا کئے بغیر مظلوم صاحب اپنے افسانوں کو آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔ پھر موضوع کے لحاظ سے اچھوتے پن کی بجائے وہی فرسودگی اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے جو نام نہاد ترقی پسندی کی دوڑ میں بھاگنے والوں کے لئے طرۂ امتیاز ہو تو ہو ادب کی دنیا میں اسے کوئی بلند درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

جوتوں کی دنیا

مصنف :- جناب عبدالمالک۔ ناشر :- اردو بک سٹال لاہور۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۲۸ صفحات۔ مجلد قیمت ؏۔ لاہور کے انار کلی بازار میں جوتوں کی ایک مشہور دکان ہے "کرنال شاپ" جس کے جوتے

ف۔ ح

"باٹا" کے جوتوں کی طرح پنجاب بھر میں مشہور ہیں۔ اسی دوکان کے مالک و مہتمم جناب عبدالمالک نے یہ دلچسپ کتاب تصنیف کی ہے۔ پہلے باب میں جوتے کی قدیم تاریخ پر معقول روشنی ڈالی ہے پھر علمی اعتبار سے پاؤں کی بناوٹ پر بحث کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں کی موزونیت کو برقرار رکھنے میں جوتے کی اور جوتے کی وضع قطع برقرار رکھنے میں خود پاؤں کو کس درجہ دخل حاصل ہے۔ اسکے بعد جوتا بنانے اور اسے فروخت کرنے کے سلسلے میں فنی اور تجارتی اعتبار سے مفید مشورے درج کئے گئے ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ایسے فنون پر کتابوں کا بالکل فقدان ہے، یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور اس لئے زیادہ لائق تعریف ہے۔ کتاب میں جوتوں کے چند خاکوں، ڈیزائنوں کے علاوہ ایسی سادہ و رنگین تصاویر بھی ہیں جن کو "کرنال شاپ" کا تجارتی اشتہار کہا جا سکتا ہے۔

مجلہ کلیۂ گلبرگہ — یہ سہ ماہی رسالہ جو گلبرگہ کے ایک درسی ادارے سے متعلق ہے، گذشتہ تین سال سے شائع ہو رہا ہے، اس میں ایسے علمی، ادبی، سیاسی اور دوسرے معلوماتی مضامین شامل ہوتے ہیں جو خصوصاً طلباء کے لئے مفید ثابت ہو سکیں۔ منظومات میں بھی اسی امر کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اسکا مطالعہ دوسرے مدرسوں اور کالجوں کے طالب علموں کے لئے بھی کارآمد ہو سکتا ہے کیونکہ ان چند صفحات کے علاوہ جو خاص ادارے سے متعلق ہوتے ہیں، عام مضامین کی ترتیب میں وسیع النظری اور بلند ذوقی سے کام لیا جاتا ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی اور کاغذ نفیس ہے۔ زیر نظر اشاعت کے ۹۴ صفحے ہیں۔ دفتر مجلہ کلیۂ عثمانیہ گلبرگہ شریف دکن سے طلب کیجئے۔ سالانہ چندہ غالباً ایک روپیہ ہے۔

بچوں کی بہار — مصنف:- خواجہ نفیس صاحب لودھیانوی۔ ناشر:- ریاض بک ڈپو۔ شکور سٹریٹ۔ لودھیانہ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۴۴ صفحات بلا جلد۔ قیمت چار آنے۔ اس کتابچے میں بچوں کے لئے پندرہ عدد علمی اور اصلاحی نظمیں ہیں۔ ان میں سے بعض جن کی زبان سادہ و سلیس ہے، واقعی اچھی ہیں۔ اور بچوں کو پڑھانے کے علاوہ زبانی یاد کرائی جا سکتی ہیں۔ لیکن دو تین طویل بحریں اور صوتی اعتبار سے ان کے لئے غیر موزوں ہیں۔ بچوں کے ماحول اور ان کے گرد و پیش کا لحاظ رکھتے ہوئے نظموں کے مختلف موضوع اختیار کئے گئے ہیں۔ آخری صفحے پر چند مشکل الفاظ کے معنی درج کئے گئے ہیں۔ پھر بھی بہت سے الفاظ، تشبیہیں اور استعارے ایسے رہ گئے ہیں جن کے مفہوم کو سمجھنا بچوں کے لئے آسان نہیں ہے۔ ان سے دامن بچاتے ہوئے نظمیں کہی جاتیں تو زیادہ اچھا ہوتا۔

> **نوٹ:-** تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں، ورنہ کتاب پر ان کالموں میں اظہار خیال نہ ہو سکیگا ——— (ادارہ)

کوک کوئلیا کوک ——— خاطر غزنوی

کوک کوئلیا کوک

گھل مل جاتی ہیں تیری آہوں سے میری آہیں
نوچ کے پر رہ جاتی ہے تو، میں پھیلا کے باہیں
تیری چیخ پکارسے اٹھے — من میں رہ رہ ہوک
کوک کوئلیا کوک

الٹی اور نرالی ہیں اس پریم کی رسمیں ریتیں
آنسو پی پی اور غم کھا کھا جیون کے دن بیتیں
بھول چکی ہوں یاد ہیں اتنی — اپنی پیاس اور بھوک
کوک کوئلیا کوک

مجھ دکھیا کو برہا میں تڑپا کر وہ کیا پائے
سوچ رہی ہوں اشکوں میں یہ جیون بہہ نہ جائے
آخر کب بھولے گا ساجن — میری بھول اور چوک
کوک کوئلیا کوک

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ روشنیاں .... حضرت ثاقب لکھنوی ......
۲۔ سلام .... نواب نصاحت جنگ جلیل ......
۳۔ وحشت کلکتوی (مع تصویر) ... جناب نثار شہدی ......
۴۔ ریاست کے ... فرمانروا ..... جناب محمد کوثر سجاد العسلومی ...
۵۔ ہندوستانی ادب کا ... معاملہ ... جناب راج نرائن گپتہ ......
۶۔ ... نگاری ...... پروفیسر احتشام اور نوی ......
۷۔ ... ... جناب کوثر حامد پوری ......
۸۔ ... سنسکرت سازی ...... ڈاکٹر ... .
۹۔ ... بہار کی شان بدولت .. جناب محمد عمر (دہلی) ......
۱۰۔ بھولوں کی سرزمین ...... مسز ڈبلیو پی ج ادمین ......
۱۱۔ ڈی ہائیڈریشن .... جناب بی ارشاد نقوی ......
۱۲۔ زندگی .... ڈاکٹر رام پرتاب بہادر ......
۱۳۔ ... (افسانہ) .... جناب مسلم ضیائی ......
۱۴۔ قصر السین .... جناب عبدالجلیل ... .
۱۵۔ میری زندگی کے چند نئے پہلو ... پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ......

جبرالٹر

مارار کے اس منظر میں ہسپانوی نسل کے صرف چار شہری
باشندے ہیں ۔ باقی سفید وردی میں فوجی سپاہی اور
افسران اعلیٰ ہیں ۔ اس لباس میں یہ زیادہ جوان اور
جوشیلے نظر آتے ہیں ۔

جبرالٹر یعنی جبل الطارق کا ایک دیدہ زیب فضائی نظارہ
جسکی تصویر ہوائی جہاز سے لی گئی ہے ۔

ل الطارق کے زیر سایہ بحیرۂ قلزم میں برطانیہ کا ایک
ڑا بحری جہاز دو تباہ کن جہازوں کی معیت میں
مشق کر رہا ہے ۔
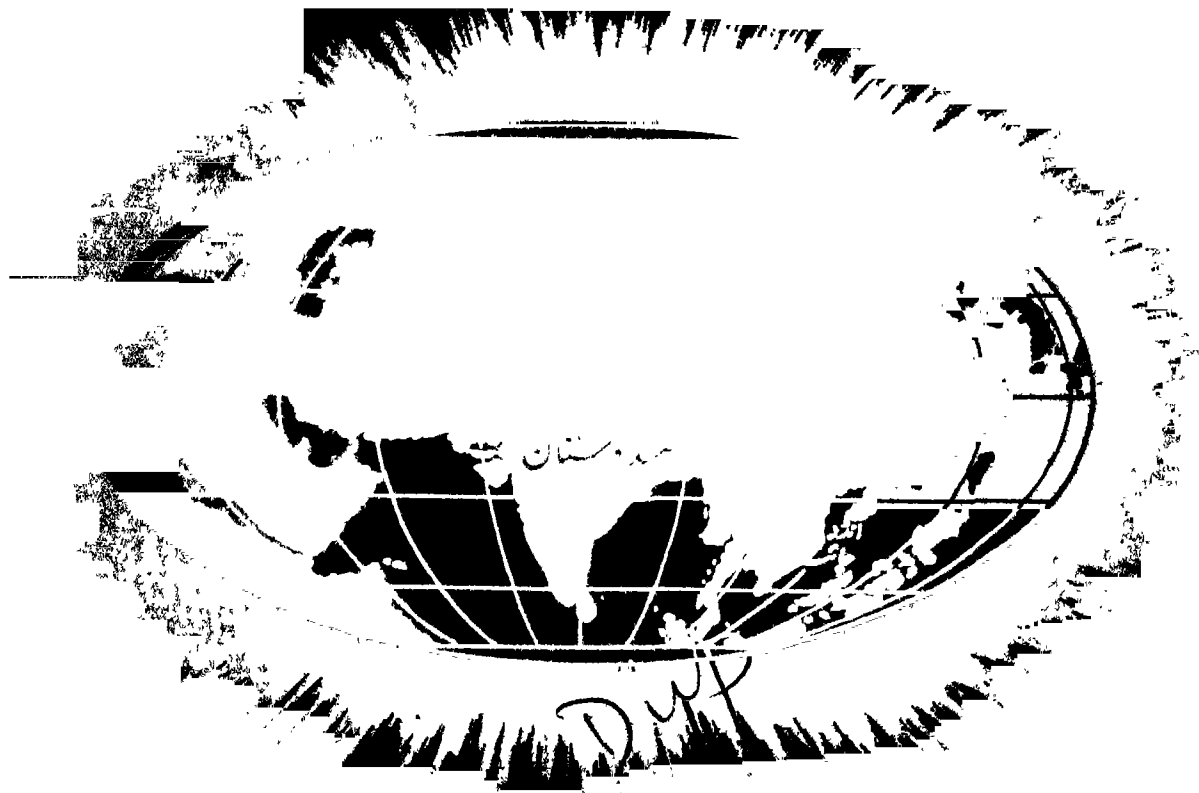
غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا

صفی لکھنوی

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا
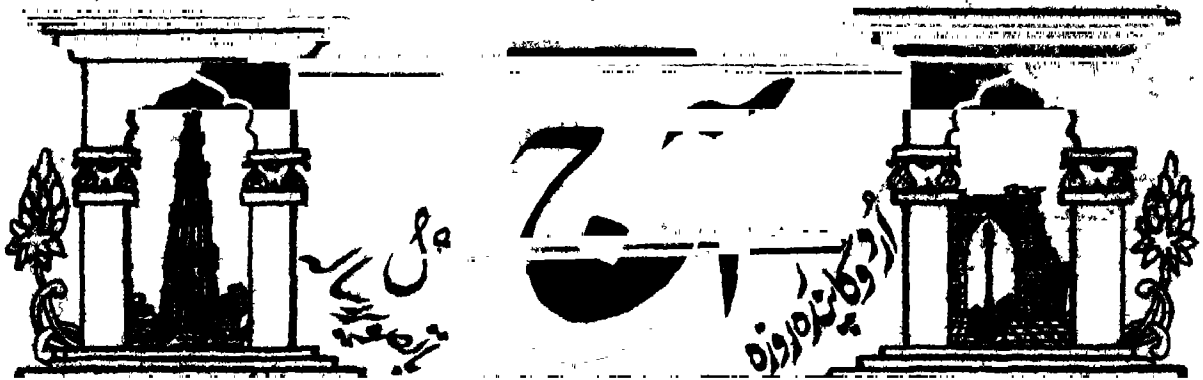
چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۴ نمبر ۱۸ | فہرست | ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	رفتارِ زمانہ	ادارہ	۲
۲	دو غزلیں	لسان القوم حضرت صفی لکھنوی	۵
۳	صفی لکھنوی کا شعر (مع تصویر)	پروفیسر سید آغا اشہر لکھنوی	۶
۴	غزل	جناب ولی الرحمٰن ولی	۱۰
۵	خاکستر (لبنانی افسانہ)	حکیم حبیب احمد خاں اشعر دہلوی	۱۱
۶	چھایا ناٹک	جناب جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی	۱۷
۷	غزل	جناب عامر عثمانی	۱۹
۸	قطعات	جناب میر کاظم علی برق موسوی	۱۹
۹	ہند و عرب کے ثقافتی تعلقات	ڈاکٹر اے ہاکے	۲۰
۱۰	آشا (گیت)	جناب منصور معجز	۲۱
۱۱	بسنت (نظم)	جناب فرید جاوید	۲۳
۱۲	رخصتی کے آنسو (افسانہ)	محترمہ ع۔ق۔ بیگم	۲۴
۱۳	دیا سلائی کی بپتا	مشیر احمد	۲۵
۱۴	رباعیات	شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی	۳۵
۱۵	[illegible]	مسٹر گسٹس موئیر	۳۷
۱۶	انجم سے (نظم)	جناب مظفر حسین ساز	۳۸
۱۷	ایک ماشہ پورے نیم (افسانہ)	جناب ظفر عمر	۳۹
۱۸	سوزِ فطرت (غزل)	جناب ادیب مالیگانوی	۴۲
۱۹	مدورا	مسٹر ایل۔ این گپل	۴۳
۲۰	تاریکیاں	جناب مینا فیض آبادی	۴۴
۲۱	غزل	جناب عبد النعیم خاں نعیم فتح آبادی	۴۴
۲۲	غزل	جناب روشن نگینوی	۴۴
۲۳	علامہ اقبال کے متضاد نظریے (۲)	جناب مکین اکبرآبادی	۴۵
۲۴	امید کی کرن (نظم)	جناب احمد ندیم قاسمی	۴۹
۲۵	ہندستانی فوج میں لڑکوں کے دستے	جناب پی گنگولی	۵۱
۲۶	کلیاں (نظم)	جناب محمد قاسم ذاکر فتحپوری	۵۲
۲۷	سندیسہ (گیت)	جناب کوی لال ترلحن	۵۲
۲۸	جدید اردو شاعری	پروفیسر ادریس احمد ادیب	۵۲
۲۹	نقد و نظر	"ف۔ ح"	۵۷
۳۰	تبصرہ	جناب جمیل احمد	۵۸

مدیر اعلیٰ [illegible]
نائب مدیر راجیندر ناتھ شیدا ایم۔اے
مدیر فضل حق قریشی دہلوی
مشیر احمد ایم۔اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۹۲ دہلی

رفتارِ زمانہ

چین میں قیامِ امن کی شرطیں

چین میں کومنتانگ کی سرکاری اور کمیونسٹوں کی جماعتوں کے مابین جو خانہ جنگی چھڑی ہوئی تھی باہمی مفاہمتوں کے ماتحت ختم ہوگئی۔ چین میں آئندہ مستقل طور پر قیامِ امن کے لئے سیاسی مجلسِ مشاورت میں کمیونسٹوں کے نمائندہ اعلیٰ نے پانچ نکات پر مشتمل ایک شرائط نامہ پیش کیا جسکی منظوری کے بعد سارے چین میں اتحاد قائم ہوسکتا ہے۔ وہ نکات حسب ذیل ہیں :۔

(۱) تمام سیاسی مباحث فوجی قوتوں کی بجائے باہمی گفت وشنید کے ذریعہ طے پائیں۔

(۲) فوجی تحقیقاتی جماعتیں قائم ہوں۔

(۳) چین میں جاپانی دستوں سے ہتھیار لینے کی مدت مقرر کردی جائے۔

(۴) کٹ پتلی دستوں کو فوجی خدمات سے الگ کرتے ہوئے ان تمام متفقی لوگوں کو سخت سزائیں دی جائیں جنھوں نے چین کی خانہ جنگی میں حصہ لیا۔

(۵) سیاسی مجلسِ مشاورت کے زیرِ اہتمام چینی فوج کو نئے سرے سے بحیثیت مجموعی منظم کیا جائے۔

یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث رہا کہ کمیونسٹ فوج کا مستقبل کیا رہے۔ چین کی سرکاری حکومت کے نمائندے نے تجویز کیا کہ اس معاملہ کو طے کرنے کے لئے ایک ملٹری سب کمیٹی بنادی جائے کمیونسٹوں کے نمائندے نے اسکی مخالفت کی تاہم کہا جاتا ہے کہ کمیونسٹ اپنے ان میں دستوں کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جنکی منظوری مرکزی حکومت نے دیدی تھی۔

جاپانی توپ کی پیشکش

پچھلے مہینے جنوب مشرقی ایشیا کے اعلیٰ اتحادی کمانڈر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے کمانڈر انچیف جنرل سر کلاڈ آکنلک کو ۱۰۵ ملی میٹر دہانے کی ایک جاپانی توپ پانچسو سے زیادہ لوگوں کے مجمع کے سامنے پیش کی۔ یہ توپ چودھویں فوج نے برما میں جاپانیوں کے ہاتھ سے چھینی تھی۔ اعلیٰ کمانڈر نے کہا کہ جنرل آکنلک اور ہندوستانی فوج نے اس توپ کو حاصل کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی تھی۔ یہ جذبۂ تشکر واعتراف کی نشانی کے طور پر واپس کی جاتی ہے۔ اس پیشکش کے موقع اتحادی قوموں کی تمام سروسوں کے اعلیٰ عہدہ دار اور ہندوستان آنے والے پارلیمانی وفد کے ارکین موجود تھے۔ جلسے میں تمام اتحادیوں کے جھنڈے لہرا رہے تھے موقیا رنگ کی وردیاں اور شوخ رنگ ساڑھیاں ملی جلی حالت میں عجب بہار دکھا رہی تھیں اور سیلاب مسرت وانبساط سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زمانۂ جنگ سے پہلے کی کوئی دلکش تقریب ہے۔ مختلف فوجی دستے انگریزی بینڈ بجا رہے تھے بگل بجانے والوں کی نغمہ نوازی کے ساتھ توپ کی نقاب کشائی ہوئی۔ یہ تحفہ پیش کرتے وقت ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ جنوب مشرقی ایشیا کمان کو جو کامیابیاں نصیب ہوئیں، وہ اس امداد کے بغیر کسی طرح بھی ممکن نہ ہوسکتی تھیں جا ہندوستانی منصوبے تیار کرنے اور انھیں دائرہ عمل میں لانے کے لئے ہندوستان کے جنرل ہیڈ کوارٹر نے دی۔ تحفہ کو قبول کرتے ہوئے جنرل آکنلک نے کہا کہ اسکو ہندوستانی قوم کی جنگی یادگاروں میں عزت کی جگہ دی جائے گی۔ موصوف نے بھی ان مردوں اور عورتوں کو خراجِ تحسین پیش کیا جنھوں نے کسی نہ کسی طرح اس جنگ میں مدد دی اور شیرازۂ نظام کو قائم رکھنے میں دستِ تعاون دراز کیا۔ آپ نے اس فوجی تقریب کی بابت کہا کہ یہ رسم ان مردوں اور عورتوں کی فتح ونصرت کا درخشاں نشان ہے جو تمام دولت مشترک کی نمائندہ ہیں اور ایک ہی مقصد کے لئے ہم آہنگی سے کام کر رہی ہیں۔

سمندری لہروں کے رحم وکرم پر

اس دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں سینکڑوں ایسے واقعات سننے میں آئے جو بیک وقت ہوشربا اور دلچسپ ہیں۔ اس ضمن میں ان دو ہندوستانی ملاحوں کی سرگذشت بیان کی جاسکتی ہے جو اپنے جہاز کی تباہی کے بعد ۱۲۳ دن تک سمندری لہروں کے رحم وکرم پر ہچکولے کھاتے رہے۔ ہوا یہ کہ جب ایک جرمن آبدوز کشتی نے ان کے جہاز کو فنا کر دیا تو وہ اور پانچ دوسرے ملاح ایک ٹوٹی پھوٹی سی معمولی کشتی پر جو بانسوں اور لکڑی کے ڈنڈوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی سوار ہوگئے۔ یہ واقعہ ستمبر ۱۹۴۳ء کا ہے۔ ان سات آدمیوں کے پاس کھانے کی مقدار بہت تھی

صرف دو دن کے لئے کافی ہو سکتی تھی۔ چند روز کے بعد ہی پانچ آدمی ان ناگہانی مصیبتوں اور پریشانیوں سے تنگ آکر دل برداشتہ ہو گئے اور بمشکل زندگی بسر کرتے رہے حتیٰ کہ پچیسویں دن مر گئے اور صرف دو باقی رہ گئے۔ ان دو میں سے ایک کا نام محمد آفتاب ہے جو ضلع سلہٹ (آسام) کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس کی عمر ۴۳ سال ہے۔ دوسرا بھی اسی علاقے کے ایک اور گاؤں کا رہنے والا ہے اس کی عمر ۴۵ سال اور نام شاکر ہے۔ اپنے ساتھیوں کے مر جانے کے بعد مزید ۱۰۸ دن تک وہ دونوں اسی کشتی پر بیٹھے بحرِ ہند کی لہروں کا گھٹنا بڑھنا دیکھتے رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے تین ہزار میل سے زیادہ سفر کر لیا۔ بارش کا پانی جو کشتی میں جمع ہو جاتا ان کی تشنگی کو بجھاتا اور سمندر کی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں آسودگیٔ شکم کا باعث بنتیں۔ آخر کار وہ سنگاپور کے قریب خشکی پر پہنچ گئے۔ انھوں نے فوراً جنگل میں چھپ جانا مناسب سمجھا لیکن لوگوں نے انکو دیکھ لیا اور پکڑ کر جاپانیوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد وہ اٹھارہ ماہ تک جاپانیوں کی قید و بند میں سخت سزائیں بھگتتے رہے۔ خدا خدا کر کے یہ آفت بھی ختم ہوئی جب برطانوی فوجوں نے سنگاپور کو دشمنوں کے چنگل سے آزاد کرایا اور ان دونوں کو سنگاپور سے انگلستان بھیجا گیا کیونکہ انھوں نے اپنی تنخواہوں اور الاؤنسوں کے مطالبے پیش کئے تھے۔ فی الحال اسپتال میں ان کی صحت و تندرستی کا لحاظ رکھا جا رہا ہے اور ساتھ ہی پنشن کا معاملہ زیر غور ہے۔ مزید سفر کرنے کے لائق ہو جانے پر انہیں ہندوستان بھیجدیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان کے زندہ ہونے کی خبر انکے رشتہ داروں کو ملی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے کیونکہ وہ ان کو مردہ تصور کر چکے تھے۔

ڈاک و تار کے محکمے کی ترقی

جنگ کے دوران میں ڈاک اور تار کے محکمے کا سب سے بڑا کارنامہ ٹیلی کمیونیکیشنز کو ترقی دینے والی اسکیم کی تیاری ہے جسے حکومت کی جنگی اور جنگ کے سلسلے میں انتظامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شروع کیا گیا تھا۔ اس اسکیم کی وسعت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ چھڑنے سے آٹھ سال پہلے ڈاک اور تار کے محکمے کا اوسط خرچ تیس لاکھ روپے سالانہ تھا لیکن جنگ کے آخری دو سالوں میں بارہ کروڑ روپے صرف ہوئے۔ اب ٹیلی کمیونیکیشنز اسکیم پر لاگت کی رقم تقریباً دوگنی ہو جائے گی۔ یہ اسکیم اس وقت تک تین چوتھائی کے قریب مکمل ہو چکی ہے۔ بالکل مکمل ہو جانے پر یہ اسکیم ہندوستان کے بعد جنگ کے تار اور ٹیلیفون کے وسیع نظام کی بنیاد ثابت ہوگی۔ اس سے یہ بھی ممکن ہو گیا ہے کہ آواز کی لہروں سے کام کرنے والے ٹیلیگرافی کے آلات کے ذریعے آمد و رفت کے بڑے بڑے مرکزوں کو ملا دیا جائے۔ امید ہے کہ اس نئے طریقے کے رائج ہونے پر کام کی موجودہ زیادتی میں کمی ہو جائیگی اور اصلاح پیغام بھیجنے میں جو تاخیر واقع ہو جاتی ہے وہ آئندہ نہیں ہوگی۔ تجویز یہ ہے کہ پانچ ہزار کی آبادی والے ہر قصبے میں ایک تار گھر کھول دیا جائے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ موجودہ ۴۰۰ ۲ تار گھروں میں ۱۵۰۰ کا اضافہ ہو جائیگا۔ زیادہ اہم مرکزوں میں جو تار گھر قائم ہیں انہیں نئے ساز و سامان سے آراستہ کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ تار وصول کرنے اور بھیجنے کے اصلاح شدہ طریقے بھی رائج کئے جائیں گے۔

شاہ ابن سعود مصر میں

مقدس سرزمین عرب کے شاہ ابن سعود پچھلے مہینے مصر تشریف لے گئے جبکی خاک کے ذرّے عہد عتیق کی حسین ساحرہ قلوپطرہ کی تجلیات سے ابھی درخشاں ہیں۔ جدّہ سے قاہرہ تک کا طویل سفر جس میں سات سو میل کا بحری فاصلہ بھی شامل ہے موٹر کاڑی سے طے پایا لیکن مصر کے پایۂ تخت میں پہنچنے پر شاہ موصوف کا استقبال اسقدر تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ ہر چند شاہ موصوف ظاہری شان و شوکت اور آن بان کے دلدادہ نہیں تھے لیکن بلند مرتبہ میزبان نے تقریب خیر مقدم کو پُر تکلف بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ شریک جشن ہونے والوں کی رائے ہے کہ گذشتہ صدی میں اسقدر شان و شوکت کا مظاہرہ مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک میں نہیں ہوا۔ درانحالیکہ لہو و لعب کا کوئی بھی فعل انہار نگ نہیں جا سکا کیونکہ شاہ موصوف صدر جہ متقی پرہیزگار اور پابند شرع متین ہیں۔ شراب نوشی تو کجا وہ سگریٹ وغیرہ سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ ان کے تین ہفتے کے دوران قیام میں کوئی ایسی محفل منعقد نہیں ہوئی جہاں رقص و سرود کو روا رکھا گیا ہو۔ شاہ موصوف کی ذاتی محافظت کے لئے قاہرہ کی پولیس کے افسر اعلیٰ سر طامس رسل پاشا نے اپنے خاص دستے کے ذریعہ انتظامات کرائے۔ مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک سے آئے ہوئے زائرین پر نگاہ رکھی گئی اور شہر کے ان فتنہ پرداز لوگوں کی نقل و حرکت کا بھی احتیاط کے ساتھ معائنہ کیا گیا جن کے چال چلن اور خیالات مشکوک تھے۔ پولیس کو ہر دم اس امر کا اندیشہ لگا رہا کہ کوئی سرپھرا سیاست زدہ شخص ان پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ شاہ موصوف کے لئے سرزمین مصر پر قدم رکھنے کا یہ پہلا موقع تھا انھوں نے وہاں ماحول اور فضا کو بہت ہی پسند کیا۔ ایک غیر ملک میں ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے روزمرہ کے معمولات کو ترک نہیں کیا چنانچہ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ بلا ناغہ اپنے قاری سے قرآن پاک سنتے رہے۔

افغانستان کا ثقافتی وفد

عجائب خانہ کابل کے ناظم اعلیٰ اور تاریخی مجلہ "آریانا" کے بانی آقائی احمد علی کہزادکی سرکردگی میں افغانستان کا ثقافتی وفد حال ہی میں کلکتہ پہنچا اور اس نے اس دوسرے صد سالہ جشن میں حصہ لیا جو بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے بانی اور پہلے صدر سر ولیم جونس کی ولادت کی یاد تازہ کرنے کے سلسلے میں منایا گیا۔ سر ولیم جونس لندن میں ۱۷۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے ۱۷۸۳ء میں وہ کلکتہ کی عدالتِ عالیہ کے منصف مقرر کئے گئے۔ ایک ہی سال بعد یعنی ۱۷۸۴ء میں انھوں نے بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جو آج تک قائم ہے۔ موصوف دنیا کی تیرہ زبانوں پر اچھی طرح حاوی تھے اور دوسری اٹھائیس زبانوں کی بھی خاص استعداد

رکھے تھے۔ آقائی کہزاد نے سوسائٹی کے اجلاس میں ایک پُر مغز تقریر کرتے ہوئے ہندوستان اور افغانستان کے ثقافتی تعلقات پر روشنی ڈالی۔ وہ عجائب خانۂ کابل سے بہت سے تاریخی اور ثقافتی نوادر کا ذخیرہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان میں عہد تیمور کے قدیم نوشتے، عہد غزنوی کی کانسی کی چیزیں اور افغانستان کے قدیم ترین پلیۂ تعمت کپاسی کی مورتیں شامل تھیں۔ سوسائٹی کا یہ تاریخی جشن اس کے یوم تاسیس یعنی ۱۵ر جنوری تک جاری رہا۔ ملکی اور غیر ملکی ادبی مجالس کے بہت سے نمائندوں نے اس میں حصہ لیا اور تقریریں کیں۔

جوہری بم کی دریافت میں چوہوں اور مکھیوں کا حصہ

روچسٹر یونیورسٹی سے حال ہی میں جو رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جوہری بم ایسی مہلک اور خطرناک چیز کی تیاری کے سلسلہ میں لیبوریٹری میں کام کرنے والے ہزاروں آدمیوں سے کسی کو بھی کسی قسم کا کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ حیرت انگیز بات صرف اس وجہ سے ممکن ہو سکی کہ روچسٹر یونیورسٹی اور چند اور یونیورسٹیوں نے کروڑوں روپیہ طبی دیکھ بھال پر صرف کیا۔ اس رپورٹ سے یہ دلچسپ بات بھی دریافت ہوئی کہ اس سلسلہ میں مکھیوں، جھینگوں اور چوہوں وغیرہ نے بھی بڑی مدد دی۔ اس کی تفصیل یہ ہے :۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ بم اپنی تیاری کے مختلف درجوں میں جانداروں پر کس کس قسم کا اثر ڈالتا ہے اور اسکا تدارک کس طرح کیا جا سکتا ہے پانچ کروڑ مکھیوں، دو لاکھ ستر ہزار چوہوں اور پچیس ہزار گھونسوں پر تجربے کئے گئے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ریڈیو ایکٹو اشیا انسان کی انگلیوں پر کیا اثر ڈالتی ہیں بہت سے ہمدردوں کی انگلیوں پر تجربہ کیا گیا۔ چوہوں کو وہ مرکبات کھلائے گئے جو بم کے اندر استعمال ہوئے ہیں تاکہ پہلے ہی سے اندازہ ہو جائے کہ ان کی رگوں اور نسلوں پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ مکھیوں پر یہ تجربہ کیا گیا کہ قوت تولید پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ریڈیائی شعاعیں ان پر بالکل اسی طرح ڈالی گئیں جس طرح لیبوریٹری کے اندر کام کرنے والوں پر پڑ سکتی تھیں۔

طبی دریافت کے عملے کے نگراں ڈاکٹر اینڈرو ڈاوڈی نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ جوہری بم کی دریافت نے سرطان کے علاج کی دریافت کے کام کو دس سال آگے بڑھا دیا ہے۔

روس اور انگریزی زبان

انیسوں صدی عیسوی میں روس میں روسی زبان کے علاوہ فرانسیسی زیادہ مقبول تھی۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہونے اور دوسری شروع ہونے کے درمیان جرمن زبان کا سکہ رواں رہا لیکن اب انگریزی زبان کی طرف توجہ مبذول ہوتی جاتی ہے۔ روسی مدارس کے نصاب میں اسے باقاعدہ شامل کر لیا گیا ہے۔ اس صورت حالات کے پیش نظر یہ امید قائم کی جا سکتی ہے کہ روسیوں اور انگریزی داں لوگوں کے مابین ایک دلی تعلق قائم ہو جائے گا۔ بالکل اسی جوش و خروش کے ساتھ انگریزی زبان بولنے والے بچے روسی سیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اسی غرض سے روسی بچوں سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے ظاہر ہے کہ یہ رسم و راہ زمانۂ مستقبل کے لئے نہایت خوشگوار ثابت ہوگی۔

فصلی کیڑوں کا استیصال

عنقریب بغداد میں ماہرین زراعت کی ایک کانفرنس منعقد ہونے والی ہے جس میں ترکی، شام اور عراق کے نمائندے شامل ہوں گے۔ اس کانفرنس میں ان کیڑوں کے استیصال کے مسئلہ پر غور و فکر کیا جائے گا جو کھیتوں میں پیدا ہو کر فصلوں کو تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں۔ اعداد و شمار سے پتہ چلا ہے کہ ان کے بے پناہ حملوں سے ہر سال لاکھوں روپے کا اناج ضائع ہو جاتا ہے ان کیڑوں کا ظہور عراق اور ترکی میں باری باری ہوتا ہے۔ لیکن شام میں ان کی مصیبت مستقل بنی رہتی ہے۔ ماہرین کے باہمی مشورے کے بعد جب کوئی کیمیاوی طریقہ ان کے استیصال کا معلوم ہو جائے گا تو اسے ہر ملک میں آزمانے کی کوشش کی جائے گی۔

جامعۂ ازہر کے نئے امیر

شاہ فاروق نے حال ہی میں مصطفےٰ عبدالرزاق پاشا کو جامعۂ ازہر کا امیر مقرر کر دیا ہے۔ جو دنیا میں مسلمانوں کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے۔ اسے فاطمی خلفاء کی فوج کے سالار اعظم جوہر نے ۹۷۶ء میں قائم کیا تھا۔ پاشا موصوف مصر کے زبردست راہنما، مصلح، مفکر اور سیاست داں سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی تعلیمی استعداد کا لوہا مانا جا چکا ہے۔ اس جامعہ سے تقریباً گیارہ ہزار طلبا ہر سال فارغ التحصیل ہو کر قومی خدمت کے لئے مصروف عمل ہو جاتے ہیں۔ یہاں کے علماء دوسرے اسلامی ممالک میں بھی بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے اور درس و تدریس کے لئے مدعو کئے جاتے ہیں۔ کچھ عرصے سے اس جامعہ کے نصاب تعلیم میں جغرافیہ، تاریخ اور ریاضی کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہاں کے طلبا میں ترکی، مراقش، افغانستان، فلسطین، شام، ایران، ہندوستان، بورنیو، جاوا، حجاز، سوڈان، حبش، شمالی لیبیا، چین اور دوسرے ملکوں کے باشندے شامل رہتے ہیں۔ طلبا سے نہ صرف یہ کہ کوئی فیس نہیں لی جاتی ان کو معمولی اخراجات کے لئے وظائف بھی ملتے ہیں۔

دو غزلیں

صفی لکھنوی

یارب دلِ ہشیار کو دیوانہ بنا دے
پیمانہ کشِ نرگسِ مستانہ بنا دے

نیسانِ کرم جوہریٔ اشکِ ندامت
آنسو کو ہمارے دُرِ یکدانہ بنا دے

ڈر ہے مجھے اے عشق ترا حُسنِ تکلم
افسونِ محبت کو نہ افسانہ بنا دے

واعظ کو جو ہے کثرتِ حضّار ہی مطلوب
میخانے کو مسجد کا جلوخانہ بنا دے

اسلام میں کیا ہے جو نہ تھا کفر میں یارب
کعبے کو بدستور صنم خانہ بنا دے

اے کاش! کہ مٹّی مری ہو جائے سُوارت
یارب اسے خاکِ درِ جانانہ بنا دے

وہ طرزِ تمدن ہے صفیؔ موجبِ صد ننگ
دنیا کو جو بازیچۂ طفلانہ بنا دے

وہ دست کش جفا سے نہ ہوں گے وفا سے ہم
پھر کیوں کریں بتوں کی شکایت خدا سے ہم

کیوں جی چرائیں حلقۂ زلفِ دوتا سے ہم
ہوں گے اسیرِ دام کسی کی بلا سے ہم

محفوظ ہیں کشاکشِ حرص و ہوا سے ہم
مانوس کیوں نہ ہوں دلِ بے مدعا سے ہم

اعجازِ حُسن ہے کہ مسیحا کے ہجر میں
زندہ ہیں اپنے ہی نفسِ جانگزا سے ہم

موجِ خرامِ ناز کا اندازِ دل فریب
کر لیتے ہیں شناخت اُسی نقشِ پا سے ہم

سائل سمجھ کے بات کوئی پوچھتا نہیں
بیٹھے ہیں شاہراہِ بتاں پر گدا سے ہم

ہے چیونٹیوں کے پر نکل آنا دلیلِ مرگ
باتیں غضب کی کرنے لگے ہیں ہوا سے ہم

اک مشتِ خاک اور پھر اس پر یہ حوصلہ
کرنے لگے ہیں اب تو بغاوت خدا سے ہم

اے انقلاب جلد بدل دے نظامِ دہر
تنگ آ گئے ہیں اب ستمِ ناروا سے ہم

پھر کیا علاج اس مرضِ لاعلاج کا
شاکی طبیب سے متنفر دوا سے ہم

دامن پہ راہِ عشق میں آنے دیا نہ داغ
محتاط انتہا کے رہے ابتدا سے ہم

دشتِ جنوں کا عقدۂ مشکل کریں گے وا
یہ کام لیں گے ناخنِ انگشتِ پا سے ہم

کس فتنہ گر کو خواب میں دیکھا کہ چونک اٹھے
ڈر کر شکستِ شیشۂ دل کی صدا سے ہم

تا نغمۂ الست ہو پھر سامعہ نواز
لہریں صدا کی چھانٹ رہے ہیں فضا سے ہم

مانندِ کاہِ خشک بہر سو رواں دواں
محروم ہیں صفیؔ کششِ کہربا سے ہم

صفی لکھنوی کا شعر

مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی کا دور شاعری اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ہندوستان میں فلک شعر کے تین روشن ستارے اپنی آخری جھلکیاں دے رہے تھے یعنی داغ، امیر، جلال اپنی مدت اور بہ قریب قریب ختم کر چکے تھے۔ دہلی سے بحث نہیں کیونکہ زمانے نے میر و سودا ایسے باکمالوں کا مرکز لکھنؤ ہی بنا دیا تھا۔ بلکہ حوادث زمانہ سے مجروح ہوکے مغلوں کی علمی و تمدنی دنیا لکھنؤ کے نوابی دائرے میں پناہ گزین ہوکے مطمئن ہو چکی تھی۔ رہے آتش و ناسخ و امیر یہ لوگ بیشک لکھنوی ماحول کی پیداوار ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ دہلی کے تمام باکمال لکھنؤ میں آ بسے تھے لیکن لکھنؤ کا شعر ہمیشہ ناسخ و آتش ہی کے زیر اثر رہا اور ہونا بھی چاہیئے تھا اس لئے کہ لکھنؤ کا خیال رقابت و تقابل دہلی کے تخیل کی پرچھائیں سے گریز کرتا تھا۔ چہ جائیکہ اس کو متاثر ہونا۔ اس دور لکھنؤ سے تعلق رکھنے والا کوئی شاعر اگر دعوی کرے کہ وہ غالب کا رنگ کہتا ہے تو اس کے کلام کو غور سے دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ اس میں غالبیت ہے یا ناسخیت غالب۔ اسی طرح اگر کوئی ادعا کرے کہ وہ میر تقی کا رنگ کامیابی سے کہتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اسکا تخیل میر و آتش دونوں سے متاثر ہے۔ اور اسی کے برعکس لکھنؤ کے ارتقائی دور شاعری میں دہلی کے شعرا کا حال سمجھ لیجئے۔ لاکھ شاہ نصیر چلائیں کہ اُن کا شعر آتش کی طرح تصوف ریز ہے تو یقین مانئے کہ وہ ذوقیت سے متاثر نکلیگا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ لکھنؤ اور دہلی کے باکمالوں کے ختم ہو جانے کے بعد تخیل شعر میں ایک ارتقائی انقلاب پیدا ہو گیا جس نے دونوں مقاموں کے رنگ کلام کو ایک اعتدالی راستے پر لا اتارا۔ اور ایک بین بین حالت طاری کر دی۔ نہ تو شعرائے دہلی اپنے تخیل قدیم کے پابند رہے نہ شعرائے لکھنؤ اپنے رنگ کہن کے اور یہ انقلاب صرف غزل سے زیادہ متعلق رہا۔ دوسرے اصناف شعر اپنے چند خصوصیات ہی کے ساتھ قائم رہے اور رہیں گے خصوصاً لکھنؤ میں اس تغیر نے نرم غزل کو معنی خیز غزل کی اصطلاحات کے علاوہ زوردار غزل کا راستہ پیدا کر دیا۔

مختصر یہ کہ صفی کا دور شعر علی میاں کامل، بے صاحب مشتاق اور ضامن علی جلال لکھنوی کے سلسلے سے شروع ہوتا ہے۔ جو اساتذۂ وقت تھے خاصکر نواب اصغر حسین خاں مرحوم کے معرکہ آرا و شعرا انداز مشاعروں سے جنکی او لوالعزمیاں اس صنف کمال کے سلسلے میں آج تک لکھنؤ میں زبان زد ہیں۔

جناب صفی ابتدا سے ذکی و ذہین تو تھے ہی، مزید بر آں اپنے والد ماجد مولانا سید فضل حسین صاحب مرحوم کی بدولت ان کو لکھنؤ کے شاہی ماحول سے متمتع ہونیکا موقع بھی مل گیا تھا یعنی ان کے والد مرحوم شہزادہ سلیمان قدر بہادر مغفور (برادر شاہ اودھ) کے مصاحبین میں سے تھے۔ جناب صفی اکثر شہزادہ مغفور کی شعری صحبتوں میں انکے ہمراہ شریک ہوتے تھے اور طبقہ اعلی کے خیالات و محسوسات کے گہرے نقوش اپنے دماغ میں محفوظ کرتے چلے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اسی محفل کے ایک ممتاز فرد نے جناب صفی سے خواہش کی کہ ؎

حشر کا روز ہوا پردۂ اسرار اٹھے

پر مصرع لگا دیں۔ انھوں نے ذرا سی فکر کے بعد دوسرا مصرع کہہ دیا ؎

آنکھیں ملتے ہوئے سب طالب دیدار اٹھے

تخیل شعر کو جسقدر لطیف ماحول ملتا ہے اسی کے اعتبار سے شاعر کا ذہن رسا کار فرما ہوتا ہے تشبیہات و استعارات پست تمدن کے معمولات سے ہٹ کے بلند سطح اختیار کر لیتے ہیں۔ زبان اور طرز ادا میں رکاکت کا شائبہ باقی نہیں رہتا۔ جبھی کہ یہی امتیاز وہ منزل پر پہنچ کے شاعر کو اپنے معاصرین میں ممتاز کر دیتا ہے۔

یہ خصوصیات تھیں جن کے زیر اثر صفی کے تخیل شعر نے نشو و نما پائی۔ ادھر لکھنؤ میں کاملیت و مشاقیت ایک طرف اور دوسری طرف جلالیت کا دور دورہ تھا لہذا صفی کی طبیعت نے رنگ زمانہ دیکھتے ہوئے (صبا اوپر ذکر ہوا) ایک معتدل راستہ اختیار کیا جسکی زمانے کو ضرورت تھی۔ اور چونکہ اہل لکھنؤ کا خاصہ ہے کہ جوہر قابل دیکھ کے معراج شہرت پر پہنچا دیتے ہیں لہذا صفی استحقاقاً بہت جلد نمایاں ہو گئے۔ چنانچہ انکا پہلا شعر جو ۱۸۸۰ء میں زبان زد عالم ہوا وہ یہ تھا ؎

نکلے میں تین نام مرے طفل اشک کے | نور نگاہ لخت جگر یادگار دل

پہلا مصرع تخیل کہن سے متاثر معلوم ہوتا ہے اور دوسرا بتاتا ہے کہ طبیعت جادۂ نو پر قدم بڑھا رہی ہے۔ علاوہ ازیں بعد کا کلام تو شاہد ہے کہ تخیل کہن کا رنگ بالکل نکل گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس صدی کی ابتدا تک صاحب استعداد شعرائے اردو۔ چاہے وہ دہلی کے ہوں یا لکھنؤ کے۔ کلکتہ کے ہوں یا مدراس و حیدرآباد کے براہ راست یا توسل تخیل بلند میں عرفی کے متتبع اور صوفیت میں نظیری کا اتباع کرتے تھے۔ رہے حافظ و سعدی سو ان کے رنگ مجاز میں شراب حقیقت کی چاشنی والی ایسی رچ گئی تھی کہ اس کو اختیار کرنے کے لئے کچھ ریاض روحانی اور عشق سوز و گداز بھی درکار تھی۔ وہ یہاں کہاں؟ فقط کوری باتیں! لہذا یہ تو یوں چھوٹے۔ مگر ان کے اتباع میں کسی نے مبادرت کی بھی تو نتیجہ معلوم۔

اردو میں ہمارے غالب کا تخیل بلند صرف عرفی کا اثر غالب ہے ان کے بیشتر اشعار سے نمایاں ہے۔ مثلاً

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا | جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

صفی کا شعر بھی اسی نظریہ کا پابند نظر آتا ہے ؎

حق کی گرمی نے آتش سنگ سے ایجاد کی
ہر شرر رنگ بند ہے خون سر فرہاد کی

—آغا شہر لکھنوی

تخیل کا یہ رخ ہے جو "زوردار شعر" کی اصطلاح کا ذمہ دار ہے اور ملاحظہ ہو:-

یونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں   دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

غالب کے تخیل نے کثرتِ گریہ کی تباہ کاریوں پر نظر رکھتے ہوئے بستیوں کی ویرانگی کی پیشین گوئی کی۔ صفی کا تخیل دوسرے رخ سے ویران شدہ بستیوں کے نشانات دکھاتا ہے اور غالب کی پیشین گوئی کی تکمیل کر رہا ہے۔

داغ دل میں رہ گئے ایسے پریشاں ہو گئیں   یہ نشاں ان بستیوں کے ہیں جو ویراں ہو گئیں

ذیل کے مطلع میں جس تخیل سے کام لیا ہے وہ بزمِ تصورات کا جوہردار آئینہ ہے۔

کیسی کیسی صورتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں   سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہو گئیں

لیکن مذاقِ سلیم کے نزدیک چونکہ اصنافِ سخن میں غزل رفعتِ خیال و انسجام کی متحمل نہیں۔ لہٰذا اس کے تخیلات کو سہولت و شیرینیت سے گہرا تعلق ہے۔ اسی بنا پر غزل گو شعراء نے بلند تخیل کو بالائے طاق رکھ کے سیدھا سادہ راستہ اختیار کیا۔ مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اسکی اصطلاحی "زوردار" غزل میریت سے کوسوں دور ہے مگر غنیمت اس وجہ سے کہ برخلاف موجودہ ترکیب بازیوں کے اس زوردار شعر میں خصوصیت غزل کے کچھ اجزا پائے جاتے ہیں یعنی بجائے آہستہ بولنے کی لجاجت کے غلام ادب کا پیرا تخیلِ شاعر کے آرام نظم کو پراگندہ نہیں ہونے دیتا۔

صفی کا زوردار شعر

پیشِ نظر ہے پردۂ ابرِ سیاہ میں   تصویر ناتمام دلِ بے قرار کی

غیر محسوس اسباب سے بجلی کی طرح دل پر اثر کرتا ہے۔

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے   آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

اللہ ری بیکسی و ناچاری۔ اگر یہ مضمون کسی دوسرے پہلو سے کہا جاتا تو غالباً اس سے زیادہ اثر پیدا نہ کر سکتا۔ صفی نے اپنے تخیل کو ایک عجمی شاعر کے بے پناہ تخیل سے ٹکرا دیا ہے کہتا ہے ؎

عدو دامن کشاں یار من بے دست و پا   آہ از دستم نمی آید کہ دامن گیرمش

عالم پیری میں جسم کی جھرّیوں کے متعلق میر تقی اور میر انیس علیہما الرحمۃ نے بھی لطیف استعاروں سے کام لیا ہے لیکن صفی نے اس مضمون کو جس حسنِ تعلیل سے بیان کرنے کا جادہ اختیار کیا ہے وہ اربابِ نظر کے غائر ملاحظہ کے قابل ہے۔

کل ہم آئینے میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے   کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

پھوٹے خیشۂ دل بچا اہلِ نظر شیں رہ   رکھئے قدم ذرا دمِ رفتار دیکھ کر

اللہ رے بےخودی احساس حسن   پیمانۂ نگاہ کو سرشار دیکھ کر

فلک تک پہنچنا آہوں کو تو مشکل ہے جائیگی   مگر فرصت کہاں ہیں تم کہ بیٹھے سر اٹھائیگی

پڑھنے والے کی نظر بتاتی ہے کہ صفی کا رنگ کلام ان کے لئے مخصوص ہے۔ اشعار کا سلسلہ پرواز منہ کا لہجے کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے دل سے کہتا ہے الفاظ کے گلدستوں سے نہیں کھیلتا وہ بخوبی واقف ہے کہ انسانی شعبۂ حیات میں شعر کا ایک مقصد ہے جو اور اک احساس کا ایک نمایاں جوہر ہے۔ خود کہتا ہے:-

شاعری کیا ہے؟ دلی جذبات کا اظہار ہے   دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

صفی کی نظر میں شعر دنیائے جذبات کا آفتاب ہے جس کے بغیر انسانی کائنات کے ذرّے دھندلے ہو کے رہ جاتے ہیں:

دنیا کا ورق پیشِ اربابِ نظر ہیں   اک تماشا کا پتہ ہے کہ جو شعبدہ گر ہیں

دیکھیں تو آئینہ ہے دلِ حق نما صفی   توڑیں تو اک طلسم ہے گرد و غبار کا

طلسمِ دیدۂ دل کا تماشا دیکھتے جاؤ   یہ دریا دیکھتے جاؤ وہ صحرا دیکھتے جاؤ

جب دل نہ پریشاں ہو جمعیتِ ساماں ہو   ہر غنچۂ نورس کی مٹھی میں گلستاں ہے

افسانۂ یوسف میں تصویر کے دو رخ ہیں   اک دستِ بریدہ ہے اک سرِ گریباں ہے

پیرہنِ عاشقِ گریاں کا اضطراب نہ تھا   وگرنہ تشنۂ شبنم کچھ آفتاب نہ تھا

زندگی مجھ پر شکستہ کی اسیرِ دام کی   یوں تو میری چیز ہے لیکن مرے کس کام کی

مجھ کو کیفِ زندگی رکھتا ہے محوِ بیخودی   خون کے قطرے نہیں ہیں گردشیں ہیں جام کی

زندگی کا حاصل کیا ہے تباہ دل ہیں صفی؟   انتظار اسکا ابھی تک جو بلا آئی نہیں

ان زوردار اشعار کے سلسلے میں چند "اثردار" اشعار بھی منسلک ہو گئے ہیں اگر ان کو تخیلِ گرم کے پہلو میں جگہ دی جاتی ہے تو اجنبیت مقام دیکھ کے دائرے کو کترا جاتے ہیں اور مخصوص دعوتِ گوش و نظر کے طالب رہتے ہیں۔

اس معاملے میں صفی کا شعر شگفتگی و اثر دونوں پہلوؤں کو اس شان کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ ان میں بیگانگت خیال پیدا نہیں ہونے پاتی۔ الغرض حقیقی نقطۂ نظر سے فنِ شعر کی آن بان۔ ترتیب و تخیل کی بے تکلفی و ندرت۔ الفاظ و ترکیب کی روانی و پختگی۔ ان کی نظم پر قدرت اور سب سے زیادہ انتخاب لفظ و مقام کی جو خوبیاں آج صفی کے شعر میں پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں کسی دوسرے کے کلام میں مشکل سے ملیں گی۔ الفاظ و خیال کے تعلق کی یہ حالت ہے کہ میدانِ شعر میں صفی کا سمندِ فکر شاہین سے آگے نکل جاتا ہے الفاظ کی ٹھوکریں کھاتا ہوا نہیں چلتا۔

صفی کا اثر انگیز شعر

کیسا ہی بلند فکر شاعر کیوں نہ ہو اس کے تخیل کے لئے ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جبکہ اس کو مجبوراً اپنے رنگ سے ہٹ کے سہولت الفاظ و مضامین کی طرف لامحالہ متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ اس کلیہ سے سودا ہوں یا ذوق۔ غالب ہوں یا مومن کوئی مستثنیٰ نہیں سبھوں نے فلسفہ و منطق کے معروضات حسن و عشق کے کیفیات معاشرت و تمدن کے معمولات کو صفائی و روانی کا جامہ پہنایا ہے اور بعض اوقات اس مشاقی سے کہ ان کے ایسے اشعار میں دوسری خصوصیات فطری کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا جو اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ صفی بھی اس مجموعے کے آخری فرد ہیں ان کے کلام میں بھی جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جو کیف و اثر کے حامل ہیں جیسے

چلے ہو دل جو تڑپا کر تڑپنا دیکھتے جاؤ   نہ یوں دیکھو کن انکھیوں ہی سے اچھا دیکھتے جاؤ

کس بیکسی کا وہ عالم کہ الٰہی توبہ ۔۔۔ دم بھی نکلے تو نہیں پوچھنے والا کوئی
مآلِ زندگی یہ تھا کہ سنکر واقعہ میرا ۔۔۔ رہا کچھ دیر سناٹا سا ایوانِ ستمگر میں
صفی لوٹی ہوئی ہر قبر پر یہ بیکسی کہتی ہے ۔۔۔ کہ رہنا ہے قیامت تک اسی لٹتے ہوئے گھر میں

تخیل کی رَو میں حسن و عشق کے چونچلوں کی طرف بھی رجحان ہوگیا ہے، اور نہایت لطافت کے ساتھ۔

دل بتوں پر فدا کیا میں نے ۔۔۔ بار الٰہا یہ کیا کیا میں نے؟
میکدے سے چلا گیا مسجد ۔۔۔ ارے توبہ! یہ کیا کیا میں نے؟

دیکھئے کیوں کوئی تربت ہوگی ۔۔۔ دیکھکر اور ندامت ہوگی
زنگ آلودہ اک آئینہ سہی ۔۔۔ دل کی آخر کوئی قیمت ہوگی؟

جو قسمت میں جلنا ہی تھا شمع ہوتے ۔۔۔ کہیں بجھے تو جاتے کسی انجمن میں

بزمِ ساقی میں ذرا ہشیار بیٹھیں آج مست ۔۔۔ کل یہیں پہلو سے میرے شیشۂ دل اٹھ گیا

ذیل کے تین شعروں کو اس مقالے میں صفی کی غزل کا مقطع سمجھئے جو انکی مسلم الثبوت استادی اور مشق سخن کے نمونے ہیں۔ آتے تو زوردار اشعار کی صنف کم ہیں لیکن طرزِ ادا ایسی ہے کہ سننے والے کا دل جوش میں آکے اثر پذیر ہوتا ہے اور بجائے رسمی تحسین کے بے اختیارانہ داد دینے کو اسکا جی چاہتا ہے۔ جس وقت یہ اشعار رسالۂ معیار میں شائع ہوئے تو مکرمی جناب وحشت کلکتوی نے صفی صاحب کو لکھا "مطلع کا جواب نہیں ہوسکتا۔ اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہیگا" اور بغیر رد و رعایت ہے بھی ایسا ہی۔ کہتے ہیں:-

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ۔۔۔ ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

شعر کے چار حصے ہیں۔ پہلا ٹکڑا اچانک ایک ایسا حسین منظر پیش کر دیتا ہے جسکا اضطراری اثر قبول کرنے والے کے دل کو مجلی بن کے سازِ عشرت کی طلب میں ہاتھ کو متحرک کر دیتا ہے لیکن چونکہ بے وقت کی بھیرویں نہیں، وقت کا سہاگ ہے لہٰذا محفلِ زندگی کے بے چین دور (جوانی) کو خروش آگیں جذبے سے آواز دلواتا ہے۔ اگر یہ سامان مہیا ہو جائے تو یہیں فردوسِ گوش و نظر موجود۔

نہ خاموش رہنا مرے ہم صفیرو ۔۔۔ جب آواز دوں تم بھی آواز دینا
قفس لے اڑوں میں ہوا اب جو سنکے ۔۔۔ مدد اتنی اے بالِ پرواز دینا

صحتِ خیال کے ساتھ صفی فارسی مفردات و مرکبات کو اسی جانچ پڑتال کے بعد صرف کرتے ہیں اور ان کے خوش آیند پہلو پر اس قدر نظر رکھتے ہیں کہ بجائے تخیل شعر کو تقویت دینے کے خود ان میں محل صرف کا زور پیدا ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ جب قالبِ شعر کو حقیقت کی روح مچلتی ہوئی ملے گی تو اسکے اثر کا کیا پوچھنا۔

صفی کی نظم

غزل کا دائرۂ عمل تنگ ہے اور شاعر مجبور۔ نظم اور مرثیہ کا وسیع اور ناظم آزاد۔ ہر صنفِ سخن پر قدرتِ نظم دوسری چیز ہے مگر اس سے عہدہ برآ ہونا امر دیگر۔ بیشتر شعرائے متقدمین نے (رباعی و مرثیہ سے قطع نظر کرتے ہوئے) تقریباً تمام دوسرے اصنافِ سخن میں مشقِ کلام کی ہے لیکن ہر فرد سے مخصوص وہی شعبۂ نظم رہا جسے فطرت امتیازِ خاص کے ساتھ اس کی طبیعت میں ودیعت کر چکی تھی۔

میر حسن دہلوی بڑے غزل گو لیکن مثنوی نگار مشہور۔ میر تقی نے قصیدہ مرثیہ۔ قطعہ۔ سب کچھ کہا ہے مگر ہے غزل گو۔ سودا، ذوق، غالب نے غزلوں کے دیوان چھوڑے اور ہیں سرآمدِ قصیدہ گویاں = یا قصیدہ نما غزل کہنے والے۔ انیس مرحوم کا اچھا خاصہ دیوان غزلیات موجود ہے جو ان کے مخدوم زادے جناب عارف مرحوم نے مجھے دکھایا تھا۔ وغیرہا۔

صفی سب کچھ ہیں اور ہر صنفِ سخن میں بہت کچھ۔ مگر جب اصنافِ سخن میں نظمیات کا سوال آجاتا ہے تو ان کے سینے پر نظم ہی کا تمغہ نمایاں نظر آتا ہے۔

نظم میں صفی کا مدمقابل صرف اقبال ہے جسکی ذات آزاد مرحوم کے خوابِ تخیل کی تعبیر تھی۔ اول تو اقبال موجودہ مغربی سیاست کے لگاؤ سے سیاستِ اسلامیہ کا ترجمان تھا۔ دوسرے شعر کے دیوتا نے اسے ایک ایسی سرزمین میں پیدا کیا تھا جو اپنے کاملین پر قربان ہونے کو تیار ہے۔ تیسرے امتیازِ علم فلسفہ۔ اعزازِ حکومت۔ اور سب سے بالاتر سوزِ قومی۔ ان سب نے مل کے اسکی شہرت و مقبولیت کے لئے ایسے اسباب فراہم کر دیئے تھے کہ تمام چھپے ہوئے جوہر ابھر آئے۔

برخلاف اسکے صفی کو ایک ایسے فرقے سے تعلق ہے جس نے صرف ایک کانفرنس کا قیام قومی زندگی کے لئے کیا تھا لیکن اس کی کیفیت بھی معلوم۔ اس کانفرنس کے اجلاسوں میں سال بسال جو نظمیں صفی نے پڑھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اثرِ نظم نے کیسے کیسے کام دیئے ہیں۔ اکثر اوقات تو ان کی تنہا نظم نے کانفرنس کی موت و حیات کا سوال حل کیا ہے۔ یا مسلم لیگ کے ایک جلسے کی وہ نظم جس نے حاضرین کو تڑپا دیا تھا بہت مشہور ہے۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے ۔۔۔ اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دینگے
دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہے ۔۔۔ بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دینگے

اس کانفرنس میں پڑھی ہوئی نظموں میں ایسی بھی ہیں جن میں ہندوستان کے بعض بڑے شہروں کی مجمل تاریخ ہے اور وہاں کے تمدن پر کافی روشنی۔ ایسے مظاہروں کے موقع پر اس قسم کی نظم کے موجد صرف صفی ہیں۔ یہ نظم کیا ہوتی ہے گویا صدرِ استقبالیہ کا خطبہ ہوتا ہے۔ ان نظموں میں بمبئی، الہ آباد، اور جونپور کی نظمیں خاص طور سے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد نظمیں ہیں جن میں بجا طور سے نظم وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ہونے چاہئیں۔ انکی ایک خصوصیتِ نظم یہ بھی ہے کہ اسے طویل کرنے کے لئے حشو و زوائد استعمال نہیں کرتے چنانچہ گذشتہ نمائش لکھنؤ کے متعلق کہتے ہیں:-

اک نمائش گاہ ہے یہ عالم ایجاد بھی   سب طرح کے دل یہاں ہیں خانہ بھی ناشاد بھی
حضرت انسان ہیں ہستی پہ اپنی ناز ہے   سبّی مخلوقات کے شاگرد بھی استاد بھی
دیتے رہتے ہیں نئی ترکیب مصنوعات کو   پاتے رہتے ہیں صلے بھی محنتوں کی داد بھی
ہر نمائش میں نہاں ملکی ترقی کا ہے راز   جسکے حامی متفق کل اقوام بھی افراد بھی
دستکاری کیلئے دنیا ہے میدان وسیع   تختۂ مشق اہل حرفت سنگ بھی فولاد بھی

اسی سلسلے میں فن شعر کی کساد بازاری کی نمائش اسطرح کرتے ہیں :۔

سائنس کے عہد حکومت میں فن شعر و سخن   سعی لاحاصل بھی ہے اک محنت برباد بھی
قدر تھی جب شاعری کی وہ زمانہ لد گیا   شاعروں کی بے مقدار زائد نہ تھی تعداد بھی
اب صفیؔ بزم سخن میں فن موسیقی کی طرح   خوش نوائی پر ہے قائم شعر کی بنیاد بھی

مناظر فلکی میں صرف چاند اور تارے شایان جمالی کے آیات ہیں ۔ ہر شاعر اپنی رسائی طبع کے مطابق آسمان تخیل سے تارے توڑ لاتا ہے اور گوناگوں پہلوؤں سے ۔ کسی نے شب وصل ان کی دھیمی روشنی سے کام لیا ہے کسی نے رنگ ہجر سے ان کی جھلملاہٹ میں اضطراب انگیز اثر پیدا کر دکھایا ہے ۔ غرضکہ کیا کچھ نہیں کہا ہے ۔ صفیؔ بھی "تاروں بھری رات" کے تحت میں رقمطراز ہیں :۔

نظر کے سامنے ہے اک طلسمات   تری کیا بات اے تاروں بھری رات
لبوں پر ہے تحیّر کا ترانہ   کہ کیسا ہے یہ دہر آئینہ خانہ
کسی کی سیج پر بکھرے ادھر پھول   تڑپ اٹھا ادھر دل حسب معمول
لبالب صحن پر تارے بچھے ہیں   کہ خاکستر پہ انگارے بچھے ہیں

شاعرانہ دل ونظر رکھنے والے ملاحظہ فرمائیں کہ تیسرے شعر میں تاروں اور پھولوں میں کسقدر نازک تعلق پیدا کر دیا ہے ۔ آسمان کے تاروں میں پھولوں کی مہک دوڑا دی ۔ اور زمین کے پھولوں میں تاروں کا نور کھینچ لیا ۔ اور حسب معمول "تو کرۂ عالم کو نظر تخیل کے سامنے کردروں حسین پلٹے دیکے رکھے دیتا ہے ۔

باوجود ان شاعرانہ نزاکتوں کے اہل ملک کے "اتفاق و اتحاد" کا پہلو بھی انکی نظموں کا ایک چمکتا ہوا جوہر ہے ۔ ایک مرتبہ جنم اشٹمی اور شب قدر کے مظاہرے کے جلسے میں نظم پڑھی :۔

مندروں میں چڑھتے ہیں ہار   مسجدوں میں نماز پہ ہے نماز
توڑ کر قید سبحہ و زنار   ہم بھی لیں راہ گلشن بے خار
مختلف پھول ہر چمن میں ہیں   کیوں مندر میں شیخ و برہمن ہیں
مدعی اختلاف مذہب کے   سب ہیں بندے ہیں ایک ہی رب کے
ایک گلشن ہے آشیاں ان کا   اک زمیں ایک آسماں ان کا
صوت ناقوس و نعرۂ تکبیر   دونوں یکساں یہاں رواج پذیر
کعبہ و قشقے کی روشن پہ نگاہ   نقش ہے لا الٰہ الا اللہ
ہے اک نیرنگی پیچ کاوان سے جدا کرنا   وہ سودائی ہے جسکا ہاتھ الجھتا ہو گریباں سے

تخمیس

استاد وقت مولوی علی میاں کامل مغفور کے مشہور قطعہ "سر گور غریبان" پر صفیؔ صاحب نے بھی زور طبع سے کام لیا ہے اور تخمیس کی ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز تخیل بیگانہ سے بیگانہ ذی حیات کو تھوڑی دیر کے لئے متذبذب عدم میں ڈال کے جھنجھوڑ دیتا ہے ۔ آسان نہیں تھا کہ کامل کے ایک مکمل شعر پر اضافہ کرکے وہی مقصد برقرار رکھی جاتی مگر انھوں نے بھی انتہائے فکر صرف کرکے توضیح خیال کر دی ہے ۔

تم تو ہمدرد صفیؔ ہو کیا نہیں تم کو خبر   غمزدوں کی عمر میں کسطرح ہوتی ہے بسر
شمع بالیں پر جلانے ۔ خاک بر سر نوحہ گر   شب کو جا نکلا تھا میں کامل مزار دوست پر
اس بیت سوز غم ایک تکیس مری خونبار ہیں

کامل :۔ قبر پر الحمد پڑھ کے دوست سے میں نے کہا   ہم گریباں چاک ماتم میں ترے اے یار ہیں
صفیؔ :۔ دل تری فرقت میں ہے جیسے گرفتار محن   تیرہ و تاریک جہاں ہے مثل زندان کہن
بے ترے عشرت کدہ اپنا تو ہے بیت الحزن   شاد ہے کچھ تو بھی زیر خاک اے نازک بدن
شمع روشن ہے گلوں کے قبر پر انبار ہیں !
نا موافق یا موافق ہے ترے آب و ہوا   تو فرو کش ہے جہاں کیا اس جگہ کا ہے پتا
ہے بتا کس نام سے مشہور وہ مہماں سرا   جس محل میں جا کے تو اترا ہے اے رنگیں ادا
کس طرح کا قصر ہے کیسے در و دیوار ہیں

اس استفسار کے بعد کہ وہاں کے مناظر کیسے ہیں اور لوگ کس عقیدے کے ہیں

سابقہ کا نشۂ اسلام سے یا کفر سے ہو ساز باز   دم کش ناقوس یا پابند آداب نماز
چشم بت خانہ کہ ابرو مسجد اہل نیاز   گفتگو کی ہیں ادائیں یا نہیں تسبیحیں ناز
ہیکلیں سینے پہ یا طوق کمر زنار ہیں

اسی طرح کے متعدد استفسارات کے بعد "غائب دوست" کی آواز آتی اور سب کا یہ مختصر جواب ۔

بے نشانوں سے مستفسر ہو کچھ اے ناجو   کیا کہیں تجھ سے کہ حالت ہے یہاں کی گو مگو
آپ ہی اندازہ کرلے ۔ دیکھ لے اس قبر کو   وہ ہمارا پیکر نازک جو تجھکو یاد ہو
آج خاک قبر سے اوپر منوں کے بار ہیں

صفیؔ کے ہر صنف سخن کے دو تین شعر پڑھتے پڑھتے محسوس ہونے لگتا ہے کہ نظریں کسی قادر الکلام کے افکار سے دوچار ہیں ۔ کلام عجم پر صحیح و وسیع نظر رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ وہ ذوق عجم پر بھی نظر رکھتے ہیں اور یہ بات اس دور میں قریب قریب مفقود ہے ۔ فارسی الفاظ و ترکیبات کی بہتات جبکہ وہ اپنی غرض محل سے بیگانہ ہوں ۔ لفظ بازوں کے نزدیک کوئی وزن نہیں رکھتی ۔

خلاصہ یہ کہ صفیؔ کے کارناموں پر ہمیشہ ادب اردو کو ناز رہیگا ۔ باوجود اس پیرانہ سالی و ناقدری اہل کمال کے انھوں نے اپنے قلم و فکر کو خدمت ادب سے روکا نہیں ۔ حال ہی میں "یادگار حامد" محسن ادب نواب حامد علیخاں بیرسٹر مرحوم کا

کریں، تیرے خداؤں کو پرانی شراب اور خوشبودار تیلوں سے بھریں، تیرے ہیکل کے آستانے پر گلاب اور چنبیلی کا فرش بچھائیں اور تیری مورتی کے سامنے عود و لوبان جیسی پاک خوشبوئیں سلگائیں۔

اے معجزات کی دیوی! اس روگ سے نجات دلا اور موت پر محبت کو غالب آنے دے! کیونکہ تو موت اور محبت کی دیوی ہے"

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا جس میں اس کا غم آنسوؤں کی شکل میں بہ رہا تھا اور آہوں کی شکل میں آسمان پر چڑھ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا:۔

"آہ! اے مقدس عشتر وت! میرے خیالات کی دنیا مسمار ہو گئی اور میری روح، میرے جسم میں پگھل گئی، میرا دل، میرے سینہ میں خاموش ہو گیا اور میرے آنسو میری آنکھوں میں آتشناک بن گئے۔ تجھے اپنی رافت و شفقت کا واسطہ! مجھے پھر سے زندگی عطا فرما اور میری محبوبہ کو میرے لئے زندہ رہنے دے!!"

اس وقت تاتان کا ایک غلام آیا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ کر اس کے کان میں کہا۔

"آقا! بیگم نے آنکھیں کھول کر بستر کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور آپ کو نہ پاکر کئی آوازیں دیں۔ یہ دیکھ کر میں آپ کے پاس دوڑا آیا ہوں کہ آپ کو اپنے ہمراہ لے چلوں!"

تاتان اٹھا اور تیزی سے روانہ ہو گیا، غلام اس کے پیچھے پیچھے تھا، اپنی شاندار حویلی میں پہنچ کر وہ بیمار کے کمرہ میں داخل ہوا، اس کا ناتواں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے بستر پر جھک گیا اور اس کے ہونٹوں کو بار بار چومنے لگا گویا اس کے بیمار جسم میں، اپنی زندگی میں سے ایک نئی زندگی کی رو دوڑا رہا ہے۔ بیمار نے اپنا منہ اس طرف کیا، جو ریشمیں تکیوں میں چھپا ہوا تھا اور کچھ کچھ آنکھیں کھولیں، اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا —— وہ تبسم جو اس کے نرم و نازک جسم میں زندگی کی آخری رمق تھا، وہ تبسم جو موت کی تاریکیوں میں گم ہونے والی روح کی آخری شعاع تھا اور وہ تبسم جو عدم کے تیز رو مسافر کے دل کی صدائے بازگشت تھا اس کے بعد اس نے کہا، اس طرح کہ اس کی آواز ایک بے یار و مددگار بیوہ کے بھوکے بچے کے سانس سے مشابہ تھی۔

"میرے من کے دولہا! دیوتاؤں نے مجھے اپنے حضور طلب کیا ہے اور موت مجھے تجھ سے جدا کرنے کے لئے آگئی ہے، غمگین نہ ہو! میرے سرتاج! دیوتاؤں کی مرضی مبارک ہے اور موت کا مقصد عدل و انصاف پر مبنی۔ اب میں جا رہی ہوں اس حالت میں کہ محبت اور جوانی کے دو لبریز پیالے ہمارے ہاتھوں میں ہیں اور خوشگوار زندگی کے راستے ہمارے سامنے کھلے ہوئے۔ میرے پیارے! اب میں روحوں کی نزہت گاہ میں جا رہی ہوں اور ایک دن پھر اسی دنیا میں آؤں گی، اس لئے کہ مقدس عشتر وت ان چاہنے والوں کی روحوں کو دوبارہ اس دنیا میں بھیجے گی جو محبت کی لذتوں اور جوانی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوئے بغیر یہاں سے چلے جاتے ہیں[1]

تاتان! ہم ایک بار پھر ملیں گے، نرگس کے پیالوں میں صبح کی شبنم پئیں گے اور سبزہ زار کی چڑیوں کے ساتھ سورج کی شعاعوں سے فرحت اندوز ہوں گے۔ اچھا رخصت! میرے پیارے!"

اس کی آواز پست ہو گئی اور خشک ہونٹ کانپنے لگے، جیسے نسیم سحر کے سامنے بابونہ کا بکسا ہوا پھول۔ اس نے اپنے محبوب شوہر کو چمٹا لیا اور اس کی گردن آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ لیکن جب تاتان نے اپنے لب اس کے لبوں کے قریب کئے تو انہیں برف کی طرح سرد پایا۔ اس کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور مرنے والی کے بے حس و حرکت جسم پر گر پڑا، اس عالم میں کہ اس کی دردناک روح زندگی کی گہرائیوں اور موت کے گڑھوں کے درمیان ڈگمگا رہی تھی۔

اس رات کی خاموشی میں، سونے والوں کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں، محلہ کی عورتیں روتے پیٹنے لگیں اور بچوں کی روحیں دہل گئیں۔ تاریکی نے ان تمام درد انگیز نوحوں تلخ آہوں اور الم ناک چیخوں کو اپنی تہوں میں چھپا لیا، جو عشتر وت کے پجاری کے محل سے اٹھ رہی تھیں۔ صبح ہوئی تو لوگ تاتان کے پاس تعزیت اور اس کی مصیبت پر اظہار ہمدردی کے لئے آئے، لیکن تاتان وہاں نہ تھا، کچھ دنوں کے بعد مشرق سے ایک قافلہ آیا اور اس کے سرداروں نے بیان کیا کہ اس نے تاتان کو دور دراز جنگلوں میں، ہرنوں کی قطار کے ساتھ ادھر ادھر دوڑتے دیکھا ہے۔

زمانہ اپنے مخفی قدموں سے ماضی کے تمام نقوش کو پامال کرتا ہوا گذر گیا۔ ملک میں دیوتاؤں کا خاتمہ ہو گیا اور ان کی جگہ ان اہرمنی قوتوں نے لے لی، جو تخریب و تباہی سے مسرور و لذت اندوز ہوتے ہیں، چنانچہ "آفتاب نگر" کا وہ عالی شان ہیکل مسمار ہو گیا، خوبصورت محل زمین پر آ رہے، ہرے بھرے باغ خشک و ویران ہو گئے، سرسبز و شاداب کھیت چٹیل میدان بن گئے اور وہاں سوائے ان کھنڈروں کے اور کچھ نہ رہا، جو ماضی کو ماضی کی پرچھائیں

[1] پیغمبر اسلام نے فرمایا "تم غنیمت تھے، اس نے تمہیں بہت، کہا، اب وہ تمہیں ...کر پھر جلائے گا اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے" اور جیسا ... کا قول ہے "تمام ہم اس دنیا میں تھے، آج بھی ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے، یہاں تک کہ ... کی طرح درجۂ کمال کو پہنچ جائیں گے"

عہ اس آیت کو مسئلہ تناسخ کی تائید میں پیش کرنا اسلامی اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے۔ (مترجم)

سے المناک اور دل کو عظمت رفتہ کے ترانوں کی صدائے بازگشت نے غمگین کرتے ہیں۔ لیکن زمانہ جو اپنی رفتار سے انسان کی صناعیوں کو پامال کر دیتا ہے، اسکے تصورات کو فنا اور اس کے جذبات کو بے جان نہیں کر سکتا اس لئے کہ تصورات وجذبات اس ازلی اور ابدی روح کے ساتھ قائم و باقی رہتے ہیں اور باری باری اسی طرح چھپتے اور آرام کرتے ہیں، جیسے آمد شب پر سورج اور آمد سحر پر چاند۔

(۲)

(بہار، ۱۸۹۰ء)

دن چھپ گیا، روشنی پھیکی پڑ گئی اور سورج نے اپنی شعاعیں بعلبک کے میدانوں سے سمیٹ لیں۔ علی حسینی[1] اپنی بھیڑوں کے ریوڑ کو لئے ہیکل کے کھنڈرو کی طرف لوٹا، اور ان ستونوں پر بیٹھ گیا، جو زمین پر اس طرح پڑے تھے، گویا کسی بے یار و مددگار سپاہی کی پسلیاں ہیں، جنہیں جنگ نے تتر بتر اور عناصر نے گوشت اور کھال سے محروم کر دیا ہے۔ چاروں طرف بھیڑیں، اس کے نغمہ ہائے شباب کے سائے میں، بیٹھ گئیں۔

رات بھیگی اور اس کی تاریکیوں میں، فطرت نے "تخم فردا" ڈال دیئے علی کی پلکیں بیداری کی پرچھائیوں سے بوجھل ہو گئیں اور اس کا دماغ ان سایوں کے ہجوم سے تھک گیا، جو خوفناک خاموشی کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر سے گزر رہے تھے۔ وہ اپنے بازوؤں کے سہارے لیٹ گیا اور غنودگی اس کے حواس کو اپنی نقاب کے سروں سے اس طرح مس کرنے لگی، جیسے لطیف بادل سطح سمندر کو۔ وہ اپنے وجود ظاہری کو بھول کر، اپنے وجود معنوی میں گم ہو گیا، جو عام نگاہوں سے پوشیدہ اور انسانی قوانین و عقائد سے بالا و برتر تصورات کی جولان گاہ تھا۔ خوابوں کے دائرے اس کی آنکھوں کے سامنے وسیع اور اسرار کی باریکیاں اس کے ذہن پر منکشف ہو گئیں۔ اس کی روح زمانہ کے جلوس سے الگ ہو کر، جو نہایت تیزی سے عدم کی طرف جا رہا تھا مسلسل افکار اور پیش رو تصورات کے سامنے، تنہا کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ سمجھا، یا کہہ لیجئے، اس میں سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی کہ اس روحانی گرسنگی کے اسباب کیا ہیں؟ جو اس کی جوانی سے بری طرح چمٹی ہوئی ہے۔ وہ گرسنگی، جو زندگی کی شیرینی اور تلخی میں یگانگت پیدا کرتی ہے۔ وہ تشنگی، جو شوق و طلب کی آہ و زاری اور راحت و عافیت کے سکون و اطمینان کو ایک جگہ جمع کرتی ہے اور وہ فریفتگی، جسے مادّی قوت و عظمت زائل کر سکتی ہے۔ نہ عمر کی رفتار اس کا رخ پھیر سکتی ہے۔ اپنی عمر میں پہلی مرتبہ علی حسینی نے ایک عجیب و غریب جذبہ محسوس کیا، جسے عبادت گاہوں کی ویرانیوں نے بیدار کیا تھا۔ ایک نرم و نازک جذبہ، جس کا یادوں سے وہی تعلق تھا، جو آتشدانوں سے عود و لوبان کا ہوتا ہے۔ ایک طلسمی جذبہ جو اس کے حواس سے اس طرح لپٹا ہوا تھا، جیسے مغنی کی انگلیاں ساز کے تاروں سے۔ ایک نیا جذبہ، جو فنائے محض، یا پھر ہستی کے ہر پہلو سے نمودار ہو کر تبدریج اتنا بڑھ گیا کہ اس کے سارے وجود معنوی پر چھا گیا اور اس کے دل کو ایک ایسے شغف سے بھر گیا، جس کی لطافتیں ہلاکت آفریں تھیں، ایک ایسے درد سے لبریز کر گیا، جس کی تلخی خوشگوار اور بے رحمی، پسند خاطر تھی۔ ایک جذبہ جو ایک لطیف غنودگی آمیز لمحہ کی خلاؤں سے پیدا ہوا تھا۔ ایک ہی لمحہ سے صدیوں کے نقوش پیدا ہوتے ہیں، جس طرح مادّۂ حیات کے ایک قطرہ سے قومیں وجود میں آتی ہیں۔

علی نے منہدم ہیکل کی طرف دیکھا، اس کی غنودگی ایک روحانی بیداری سے بدل گئی اور اس نے قربان گاہ کے کھنڈر، زمین پر گرے ہوئے ستونوں اور ٹوٹی پھوٹی دیواروں کی بنیادوں کی طرف نگاہ کی۔ اس کی آنکھیں جمی کی جمی رہ گئیں اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس اندھے کی طرح، جسے دفعتہً بینائی مل گئی ہو، وہ دیکھتا اور سوچتا رہا ——— دیکھتا اور سوچتا رہا، یہاں تک کہ فکر و تامل نے اس کے ذہن پر کسی بھولی ہوئی یاد کی پرچھائیاں مرتسم کر دیں اور وہ کچھ یاد کرنے لگا۔ ان ستونوں کو یاد کرنے لگا، جو فخر و عظمت کے ساتھ کھڑے تھے، ان نقرئی چراغوں اور آتشدانوں کو یاد کرنے لگا، جو دیوی کی پر جلال مورتی کو گھیرے ہوئے تھے، ان باوقار کاہنوں کو یاد کرنے لگا، جو سونے اور ہاتھی دانت سے مرصع قربان پر بھینٹ چڑھاتے تھے اور ان نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو یاد کرنے لگا، جو دف بجا بجا کر حسن و محبت کی دیوی کی تعریفوں کے گیت گاتے تھے۔ یہ سب کچھ اس نے یاد کیا۔ یہ تمام مناظر اس کی کہرائی بصیرت کے سامنے واضح ہو گئے، اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ مناظر اور ان کے اسرار کی تاثیر اس کے ذہنی سکون میں اک حرکت پیدا کر رہی ہے۔ لیکن حافظہ تو صرف انہیں اجسام کی پرچھائیوں سے ہمیں دو چار کر سکتا ہے، جو گزری ہوئی زندگی میں ہماری نظر سے گزر رہے ہوں تو پھر اس طلسم کار یاد اور اس نوجوان کی زندگی کے بیتے ہوئے دنوں میں باہمی طور پر کیا ربط و علاقہ ہے؟ جس نے خیموں میں جنم لیا اور اپنی عمر کا بہترین حصہ بھیڑ بکریاں چرانے میں بسر کر دیا!

علی اٹھا اور اینٹوں پتھروں سے ناہموار راہ طے کرنے لگا، ایک پرانی یاد اس کے حافظہ سے نسیان کے پردے اٹھا رہی تھی، جیسے کوئی نوخیز حسینہ اپنے آئینہ رخ سے باریک ترین نقاب اٹھائے۔ جب وہ ہیکل کے وسط میں پہنچا تو کھڑا ہو گیا، گویا زمین میں ایک مقناطیسی قوت تھی، جس نے اس کے قدم روک لئے۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو خود کو دیوی کی شکستہ مورتی کے سامنے پایا جسے زمانہ کی گردشوں نے زمین سے ملا دیا تھا، بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ اس کے

[1] حسینیوں کا قبیلہ، عرب کا ایک قدیم قبیلہ ہے، جو آج بھی بعلبک کے میدانوں میں خیمے لگا کر زندگی بسر کرتا ہے۔

سامنے جھک گیا۔ اس کے سینہ سے جذبات کا دھارا بہنے لگا جس طرح گہرے زخموں سے خون کا فوارہ چھوٹتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھنے اور گھٹنے لگیں جس طرح سمندر کی موجیں چڑھتی اور اترتی ہیں۔ اس کی نگاہیں جھک گئیں اور وہ ایک تیخ آہ بھر کر دردناک آواز میں رونے لگا۔ اسے جراحت کا، تنہائی اور ہجران کیا دردی محسوس ہوئی، جب نے اس کی اور اس حسینہ کی روح کو ایک دوسرے سے الگ کر رکھا تھا، جو اس زندگی سے پہلے اس کے آغوش کی زینت تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا جوہر نفس، اس بھڑکتے ہوئے شعلہ کا ایک جزو ہے، جسے اللہ نے، آفرینش کے عالم سے پہلے، اپنی ذات سے جدا کیا تھا محسوس کیا کہ اس کی جلتی ہوئی پسلیوں، اور تھکے ہوئے دماغ کے گرد لطیف بازو پھڑپھڑا رہے ہیں۔ محسوس کیا کہ ناقابل تسخیر محبت نے اس کے دل اور نفس کی آمد و شد پر قابو پا لیا ہے —— وہ محبت، جو روح پر اس کے اسرار منکشف کر کے اپنے اصول ارکان کے ذریعہ عقل اور مادہ میں تمیز کرتی ہے، وہ محبت جسے ہم بولتے سنتے ہیں، جب زندگی کی زبانوں پر قفل چڑھ جاتے ہیں، اور روشن منارہ کی طرح نصب دیکھتے ہیں، جب تاریکی ہر چیز کو ہماری نگاہوں سے چھپا دیتی ہے۔ وہ محبت، وہ غیر معمولی قوت اس پُرسکون ساعت میں علی حسینی کے دل پر نازل ہوئی اور اس میں تلخ و شیریں جذبات بیدار کر دیئے، جس طرح آفتاب کانٹوں کے پہلو میں پھول پیدا کرتا ہے۔

لیکن یہ محبت کیا ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ اور اس نوجوان سے کیا چاہتی ہے؟ جو اپنی بھیڑوں کے ساتھ ویران ہیکلوں میں بیٹھا ہے! یہ اُن قلب و جگر میں بہنے والی شراب کیا ہے؟ جو کبھی نو بہاران شباب کے عمزہ و ادا سے متاثر نہیں ہوئے! یہ ایک بدو کے ان کانوں میں گونجنے والا ساوی نغمہ کیا ہے؟ جو آج تک حسین و خوش گلو عورتوں کے گیتوں سے طرب اندوز نہیں ہوئے!

یہ محبت کیا ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ اور علی سے کیا چاہتی ہے؟ جو دنیا سے بے نیاز، اپنی جوانی اور نغموں کی نیرنگیوں میں گم ہے! کیا وہ ایک تخم ہے؟ جسے بدوی محاسن نے اس کے دل صد پارہ کی تہوں میں ڈال دیا! یا ایک شعاع ہے؟ جو پہلے کہر میں چھپی ہوئی تھی اور اب اس کی فضائے روح کو روشن کرنے کے لئے ظاہر ہو گئی! کیا وہ ایک خواب ہے؟ جو رات کی خاموشیوں میں اس کے جذبات کا مذاق اُڑانے کے لئے تیزی سے گزر رہا ہے، یا ایک حقیقت ہے، جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی!

علی نے اپنی اشک آلود آنکھیں بند کر لیں اور رحم طلب فقیر کی طرح ہاتھ پھیلا دیا، اس کی روح جسم میں لرز اٹھی اور اس کی پیہم لرزشوں سے لوٹتی ہوئی آہیں نکلنے لگیں، جو سوزش محبت اور عجز غم کی جامع تھیں۔ ایسی آواز میں، جسے الفاظ کا ضعیف آہنگ ٹھنڈے سانس ہو جتا رہا تھا وہ چلایا:-

"اے میرے دل سے قریب اور میری نگاہوں سے دور رہنے والی! اے مجھ کو خود سے بیگانہ بنانے والی اور اے میرے حال کو بھولے ہوئے قدیم زمانے سے رشتہ پیدا کرنے والی! تو کون ہے؟ کیا تو کسی حور کا سایہ ہے، جو عالم ابد سے اس لئے آتی ہے کہ مجھ پر زندگی کے فریب اور انسان کی کمزوریاں ظاہر کرے! یا جنوں کی ملکہ کی روح ہے؟ جو زمین سے اس لئے نمودار ہوتی ہے کہ مجھے عقل و ہوش سے بیگانہ کر کے، قبیلے کے نوجوانوں میں میرا مذاق اُڑوائے! تو کون ہے؟ اور یہ مہلک و جاں نواز ابتلاء کیا ہے؟ جو میرے دل پر چھائی ہوئی ہے! ہاں یہ احساسات کیا ہیں؟ جو میرے بازؤں کو نور و نار سے گراں بار کر رہے ہیں! میں کون ہوں؟ اور یہ ہستی "تو" کیا ہے جسے میں "انا" کہتا ہوں، حالانکہ وہ میرے لئے بالکل اجنبی ہے۔ کیا میں فضائی ذرات کے ساتھ زندگی کی شراب پی کر فرشتہ ہو گیا ہوں کہ اسرار کی باریکیوں کو دیکھ اور سن رہا ہوں، یا یہ وسوسوں کی شراب ہے جس کے زیر اثر میں ذہنی حقائق سے جان بوجھ کر اندھا بن گیا ہوں"۔

وہ ایک منٹ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کے جذبات میں بالیدگی اور روح میں بلندی پیدا ہوئی اس نے کہا:-

"اے روح کو سنوارنے اور مجھے قریب کرنے والی! اے رات کی ظلمتوں کو چھپانے اور دور کرنے والی! —— اے میرے خوابوں کی فضا میں اڑنے والی حسین روح! تو نے میرے باطن میں ان جذبات کو بیدار کر دیا جو برف کی تہوں میں چھپے ہوئے پھولوں کے بیج کی طرح سو رہے تھے۔ تو نے خوشبو سے بسی ہوئی موج نسیم کی طرح، میرے پاس سے گزرتے ہوئے میرے حواس کو مس کیا اور وہ درخت کے پتوں کی طرح حرکت میں آ گئے۔ اگر تو مادی لباس میں ملبوس ہے تو خدارا! مجھے اپنا جلوہ دیکھنے دے اور اگر عناصر کی قید سے آزاد ہے تو نیند کو حکم دے کہ وہ میری آنکھوں میں سما جائے تاکہ میں خواب ہی میں تیرے دیدار کا فیض یاب ہو جاؤں۔ مجھے توفیق دے کہ میں تجھے چھو سکوں، تیری آواز سن سکوں! اس پردے کو چاک کر دے، جو میرے اور میری ذات کے درمیان حائل ہے! اس دیوار کو ڈھا دے، جو میری الوہیت کو مجھ سے چھپا رہی ہے، اگر تو عالم بالا کے سبزہ زاروں کی رہنے والی ہے تو مجھے بازو عطا کر تاکہ میں تیرے پیچھے پیچھے اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں اور اگر کوئی پری ہے تو اپنا طلسمی ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ تاکہ میں تیرے ساتھ جنوں کی بستی میں جا پہنچوں، اگر میں تیری محبت کے قابل ہوں تو اپنا مخفی ہاتھ میرے دل پر رکھ اور اسے اپنا لے!"

علی ان کلمات کو جو اس کے سینہ کی گہرائیوں میں مچلتے ہوئے نغموں کی صدائے بازگشت تھے، تاریکی کے کانوں میں بہ انداز سرگوشی دہرا رہا تھا، رات کی پرچھائیاں اس کی نگاہوں کے سامنے اس طرح جنبش کر رہی تھیں، گویا اس کی گرم گرم آنکھوں

سے نکلے ہوئے بخارات ہیں، جو محل کی دیواروں پر پہنچ کر، قوس قزح کے رنگ کی طلسمی تصویریں بن جاتے ہیں۔

ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا کہ علی اپنے آنسوؤں سے مسرور تھا اور اپنے غم سے خوشدل۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنیں سن رہا تھا اور اس کی آنکھیں ان مناظر کے ماوراء کچھ دیکھ رہی تھیں۔ گویا اس زندگی کے نقوش اس کی نگاہوں کے سامنے فنا ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ ایک ایسا خواب لے رہا ہے، جو اپنی خوبیوں کی بنا پر پالو کھا اور اپنے وسوسوں کی بنا پر ہولناک ہے وہ اس پیغمبر کی طرح، جو نزول وحی کے انتظار میں ستاروں پر نگاہیں جمائے کھڑا ہو، وقت کے انجام کا انتظار کرنے لگا۔ تیز تیز آہیں اس کے نرم و نازک سانسوں کو منقطع کر رہی تھیں اس کی روح جسم سے الگ ہو کر فضا میں منڈلاتی اور پھر جسم میں واپس چلی جاتی تھی، گویا ان ویرانوں میں کسی گمشدہ متاع عزیز کو تلاش کر رہی ہے۔

صبح کاذب نمودار ہوئی اور ہوا کی نرم و نازک موجوں سے خاموشی کا شیرازہ بکھر گیا اک نیفشئی نور نے سارے عالم کو منور کر دیا اور فضا، اس سونے والے کی طرح مسکرانے لگی، جو خواب میں اپنے محبوب کا جلوہ دیکھے شکستہ دیواروں کے موکھوں سے چڑیاں نکلیں اور اپنی چہکار سے آمد سحر کا مژدہ سناتے ہوئے ان ستونوں پر منڈلانے لگیں علی اپنی گرم پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اٹھا جامد نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور آدم کی طرح، جب اللہ نے اس کے جسم میں روح پھونک کر اس کی آنکھیں کھولی تھیں ہر چیز کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ آخرکار وہ بھیڑوں کے ریوڑ کی طرف چلا اور انہیں پکارا، بھیڑیں اٹھیں اور اس کے پیچھے پیچھے، خاموشی کے ساتھ، سرسبز و شاداب چراگاہوں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ علی اپنی بھیڑوں کے ریوڑ کو لئے جا رہا تھا، اس کی بڑی بڑی آنکھیں صاف و شفاف فضا، پہچی ہوتی تھیں اور اس کے جذبات، جو ادراک و احساس کی حدود سے نکل چکے تھے، اس ہستی کے راز اور باریکیاں منکشف کر رہے تھے۔ وہ ایک ہی لمحہ میں اسے زمانہ کے مٹے ہوئے اور بچے کچے نقوش بھی دکھا رہے تھے اور اسی لمحہ ان سب کو بھلا کر اس کے دل میں شوق و تمنا کی آگ بھی بھڑکا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ اس کی ذات اپنی روحانی عشرتوں سے محروم ہے جس طرح آنکھ نور بصارت کے مشاہدہ سے عاجز ہوتی ہے۔ وہ ٹھنڈے سانس بھرنے لگا ہر ٹھنڈے سانس پر اس کے قلب سوزاں میں ایک شعلہ سا لپک جاتا تھا۔

نہر کے کنارے پہنچ کر جس کی روانی کا ترنم سبزہ زاروں کے راز فاش کر رہا تھا، وہ بید مشک کے درختوں کے سائے میں بیٹھ گیا جن کی شاخیں نہر پر اس طرح جھکی ہوئی تھیں، گویا پانی کی ساری شیرینی چوس لینے کے لئے بیقرار ہیں۔ بھیڑیں گردن جھکا کر گھاس چرنے لگیں، اُن کے سفید سفید بالوں پر شبنم کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ ایک منٹ نہ گزرا تھا کہ علی نے محسوس کیا اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں اور روح کی لہروں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سونے والے کی طرح، جسے سورج کی شعاعوں نے بیدار کر دیا ہو، اس نے جنبش کی اور ادھر ادھر دیکھا۔ ایک دوشیزہ، کندھوں پر گاگر رکھے۔ درختوں میں سے آہستہ آہستہ نہر کی طرف آتی نظر آئی۔ شبنم نے اس کے ننگے پاؤں کو تر کر دیا تھا۔ نہر کے کنارے پہنچ کر، جب وہ پانی بھرنے کے لئے جھکی تو اس کی نگاہ سامنے والے کنارے پر پڑی اور اس کی نظریں علی کی نظروں سے ملیں۔ وہ ایک دم چونک پڑی، گاگر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ دو چار قدم پیچھے ہٹ کر اُسے غور سے دیکھنے لگی، جیسے کوئی گم کردہ راہ اپنے کسی آشنا کو دیکھتا ہے —— ایک منٹ اسی طرح گزر گیا جس کا ہر لمحہ ایک چراغ تھا، جو دو دلوں کو مرکز اتصال کی راہ دکھا رہا تھا اور خاموشی کے سینہ سے نت نئے نغمے پیدا کر کے ان کو حافظہ میں مبہم یاد کے نقوش ابھار رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو ایک ایسی جگہ پا رہے تھے جو اس نہر اور ان درختوں سے دور تصویروں اور پرچھائیوں سے گھری ہوئی تھی۔ محبت کی نگاہیں آپس میں مل رہی تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کو نہایت غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک، دوسرے کے چہرہ میں کچھ تلاش کر رہا تھا، گو خفی جذبات سے اس کی آہیں سن رہا تھا اور زبان روح سے اسے پکار رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب دونوں دلوں میں محبت کا جذبہ اچھی طرح بیدار ہو گیا اور ان دونوں کی روحیں آپس میں گھل مل گئیں، تو علی کسی پوشیدہ قوت کے زیر اثر، نہر پار کر کے دوسرے کنارے پر پہنچا اور دوشیزہ سے بغل گیر ہو کر، اس کی گردن، ہونٹوں آنکھوں کو مسلسل بوسے دینے لگا، دوشیزہ بےحس و حرکت کھڑی رہی گویا ہمآغوشی کی لذت نے اس کے ارادہ کو سلب کر لیا ہے اور دو گورے بازوؤں کے ملنے کی لطیف کیفیت نے اس کی ساری قوتیں چھین لی ہیں۔ اس نے خود کو علی کے سپرد کر دیا جس طرح چنبیلی کا پھول اپنی خوشبو کو ہوا کی موجوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ تھکے ماندے مسافر کی طرح، جسے راحت میسر آ جائے اس نے اپنا سر علی کے سینہ پر رکھ دیا اور ٹھنڈے سانس بھرنے لگی، جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے دل کی تنگ فضا میں وسعت پیدا ہو گئی ہے اور اس کے بازو جو اس سے پہلے آہنی تاروں سے جکڑے ہوئے تھے، آزاد ہو کر پھڑپھڑا رہے ہیں۔ بالآخر اس نے اپنا سر اٹھایا اور علی کی آنکھوں کی طرف نگاہ کی وہ نگاہ جو خاموشی —— روح کی زبان —— کے مقابلہ میں عام گفتگو کو ہیچ سمجھتی ہے۔ ہاں! وہ نگاہ جو نہیں چاہتی کہ محبت الفاظ کا جامہ پہنے۔

وہ دونوں بید مشک کے درختوں میں چلے گئے اور ان کی تنہائی ایک زبان تھی جو ان کے یک جان و دو قالب ہونے کا افسانہ سنا رہی تھی، ایک کان تھی، جو محبت کی وحی پر لگا ہوا تھا اور ایک آنکھ تھی جو کامیابی و کامرانی کی عظمتوں

کو دیکھ رہی تھی ان کے پیچھے بھیڑیں تھیں، جو گھاس چرتی جا رہی تھیں اور ننھے چوزے اور چڑیاں، جو ملکیسی نغمے گاتی ادھر ادھر سے نکل کر آ رہی تھیں۔

جب وہ وادی کے کنارے پہنچے تو سورج طلوع ہو چکا تھا اور اس نے اپنی زرّیں چادر ٹیلوں پر بچھا دی تھی۔ ایک چٹان کے پاس پہنچکر جس کے سائے میں بنفشہ پھولی ہوئی تھی، وہ دونوں بیٹھ گئے۔ ہوا کے نرم و لطیف جھونکے دوشیزہ کے بالوں سے اس طرح کھیل رہے تھے، گویا مخفی لب ہیں، جو اسے چومنے کے لئے بے قرار ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دوشیزہ نے علّی کی سیاہ آنکھوں کی طرف دیکھا اسے ایسا محسوس ہوا کہ سحر کار انگلیاں اس کی زبان اور ہونٹوں سے چہل کر رہی ہیں۔ اس نے کہا اس طرح کہ اس کی آواز میں ایک جراحت کار شیرینی تھی:۔

"میرے پیارے! عشترووت نے ہمیں پھر اس دنیا میں بھیجا ہے تاکہ ہم محبت کی لذتوں اور جوانی کی عظمتوں کا احترام کریں"

علّی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، دوشیزہ کے الفاظ کی موسیقی نے اس خواب کے نقوش اس کے ذہن میں تازہ کر دئے، جو وہ نیند کے عالم میں مدتوں دیکھتا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ غیر مرئی بازوؤں نے اسے وہاں سے اٹھا کر ایک عجیب وضع کے حجرہ میں ایک پلنگ کے پاس کھڑا کر دیا ہے۔ اس پلنگ پر ایک حسین عورت پڑی ہے جس کا حسن اور ہونٹوں کی حرارت موت نے سلب کر لی ہے۔ منظر کی ہیبت ناکی سے خوف زدہ ہو کر وہ دردناک آواز میں چلایا اور آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دیکھا کہ حسینہ اس کے پہلو میں ہے اس کے ہونٹوں پر محبت کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں زندگی کی شعاعیں مچل رہی ہیں۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا، روح میں گرمی پیدا ہوئی اور اس کے خواب کی پرچھائیاں روشن ہو گئیں —— علّی اب اپنے ماضی، اور اس کی اندوہناکیوں کو بھول چکا تھا دو چاہنے والے آپس میں گلے مل گئے اور بوسوں کی شراب اس قدر پی کہ بیخودی طاری ہو گئی، وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر سو گئے، یہاں تک کہ سائے طویل ہو گئے اور سورج کی گرمی نے انہیں بیدار کر دیا۔

خریدار صاحبان دفتر آجکل سے خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں تاکہ جواب دینے میں دقت نہ ہو۔

قلمی معاونین مضامین نثر و نظم بھیجتے وقت اس امر کا لحاظ رکھا کریں کہ مسودے صاف، خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف ہوں تاکہ کتابت میں آسانی ہو اور غلطی کا امکان نہ رہے۔

ناشر صاحبان نقد و نظر کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں روانہ کیا کریں ورنہ صفحات آجکل میں ان پر کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا جائے گا —— (ادارہ)

چھایا ناٹک

بیتاب بریلوی

ناٹک کا جو مفہوم آج ہندی اور اردو میں ہے اس کے لحاظ سے یہ لفظ ہندی زبان کا ہے ہم جسے ناٹک کہتے ہیں سنسکرت میں اسے درشیہ کاویہ اور روپک کہتے ہیں۔ اصل کے لحاظ سے ناٹک سنسکرت دھاتو (مادہ) نٹ سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ناچنے کے ہیں۔ دنیا کی مختلف اقوام کے ناٹکوں کی قدیم تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ناٹک کی ابتدا رقص یا ناچ ہی سے ہوئی ہے سنگیت یا موسیقی کا نمبر دوسرا ہے۔ مارے خوشی کے ناچ اٹھنا ایک ضرب المثل ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اظہار مسرت کا پرانے لوگوں کے نزدیک ناچ ہی بہترین ذریعہ تھا۔ اسی لئے ہوتے ہوتے یہ ایک عام کہاوت ہو گئی۔ علاوہ اس کے پرانی کتابوں کا ضخیم ذخیرہ اس امر کا شاہد ہے کہ ہر خاص خاص تقریب اور موقعوں پر رقص و سرود کی محفلیں گرم ہونا معمولی بات تھی۔ چنانچہ پاربتی کے سامنے نٹ راج شیو کا اور برج کی گوپیوں کے ساتھ کرشن کا ناچنا بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ اس قسم کے ناچوں کا تذکرہ چین و جاپان وغیرہ ممالک کے ادب قدیم میں بھی ملتا ہے۔

ایک اور بات ہے اور وہ یہ کہ ہندی ناچ گانے کا فن اس درجہ مکمل ہے کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی "ہندو نرتیہ کلا" یا ناچنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اور آنکھوں کے اشارے ہاتھ پاؤں کی حرکت اور مخصوص ادا و انداز سے کسی جذبہ کی ہو بہو تصویر کھینچ دینے میں انھیں ایک مدت سے کمال حاصل ہے۔ نقالی روز ازل ہی سے انسان کے خمیر میں پڑی ہے بچہ چھٹ پن ہی سے اپنے بڑوں کی نقل و حرکت دیکھ کر ان کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کی بے زبانی اور اظہار خیال کا فطری جذبہ اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہو۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ زبان اور الفاظ کے علاوہ عرض مدعا کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں۔

بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ ابتدائے عالم کی اولین ساعتوں میں جب انسان کسی زبان کے استعمال سے قاصر تھا اس وقت بھی اسے اپنے ذہنی اور قلبی محسوسات و واردات کے اظہار کی قدرت حاصل تھی اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنا مطلب دوسروں پر واضح کر دیتا تھا۔ چنانچہ خدا کی گونگی مخلوق اس خصوصیت کی حامل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک لب بستہ پیغام موثر سے موثر انداز تکلم سے زیادہ پر تاثیر ہوتا ہے۔ زبان کے استعمال سے دل کی بات میں کچھ نہ کچھ بناوٹ آ ہی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نہایت پر درد اور منتخب الفاظ میں اپنی داستان غم لوگوں کو سنانا چاہتا ہے مگر اس خوف سے کہ اس کی بات بناوٹ نہ سمجھی جائے اس کے لب و لہجہ میں فرق آ سکتا ہے لیکن ایک مصیبت زدہ آدمی کے آنسوؤں کے دو بوند اس کی چپ کی داد حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتے فطری حرکات و سکنات میں نہ معلوم وہ کون سی غیر معمولی قدرت پوشیدہ ہے جو ہماری زبانوں کے الفاظ کے بڑے بڑے ذخیرے کو بھی میسر نہیں۔

فلسفہ کا قول ہے کہ حظ روح یا حقیقی مسرت کا حصول ہی ہمارا مقصود حیات ہے اور اسی سے انسانی زندگی کی تکمیل ہوتی ہے چنانچہ انسان پیدائش ہی کی گھڑی سے بقدر ذوق تلاش راحت میں مصروف رہتا ہے۔ اس تگ و دو میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب اس کی نارسائی ایک لغزش مستانہ بن کر عارضی اور جھوٹی خوشی کی ان گنت گتھیوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے خوشی کے اظہار کے اسی مقدس جذبہ کے زیر اثر نرتیہ کلا یا فن رقص کا آغاز ہوا جس نے بتدریج ناٹک کی صورت اختیار کر لی۔

کسی زبان کے رائج ہونے سے پہلے ناٹک کی جو کیفیت ہو گی وہ محتاج بیان نہیں۔ لوگ طرح طرح کے ناچوں سے اپنے دل کا جوش نکالتے تھے۔ اور بعض متعینہ حرکات و سکنات سے بھی کام لیا کرتے تھے۔ اس قسم کے مظاہرے گونگا سوانگ کہے جا سکتے ہیں۔ جب تحریر و تقریر کا غوغا ہوا تو باقاعدہ سوانگ اور ناٹکوں کی شروعات ہو گئی۔ اور بولتی ہوئی پتلیاں بھی بنائی جانے لگیں۔

جب گونگے سوانگ رفتہ رفتہ عام ہو گئے تو یہ کوششیں پھیکی اور خشک ہوتی گئیں حتیٰ کہ عوام کے لئے ان میں کوئی دلکشی اور دلچسپی کا سامان باقی نہ رہا۔ یہ کمی بہت جلد محسوس کر لی گئی اور پرانے طریق کار میں ایک نئی تبدیلی کی گئی۔ اور وہ یہ کہ ناٹک دکھانے کا مقصد پورا کرنے کے لئے کٹھ پتلیاں گھڑی گئیں۔ جو سنسکرت زبان میں پتریکا، پتلیکا اور پتلی وغیرہ مشہور ہیں۔ بعض پتلیاں لکڑی کی ہوتی تھیں اور کچھ کپڑے اون سیپ سینگ اور ہاتھی دانت سے بنائی جاتی تھیں پتلیوں کے رواج کی قدامت اس مشہور کہاوت سے ظاہر ہوتی ہے۔ کہ پاربتی نے ایک پتلی بنائی تھی جو انھیں اس قدر عزیز تھی کہ انھوں نے اسے شوجی کی نظر سے پوشیدہ رکھنے کے لئے ملے پربت پرے جا کر رکھا تھا۔ اور روزانہ اس کا سنگار کرنے کے لئے چھپ چھپ کر وہاں جایا کرتی تھیں۔ ایک دن شوجی نے انھیں جاتے دیکھ لیا اور خود بھی چپکے سے ان کے پیچھے ہو لئے۔ پاربتی کی پتلی دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اس میں جان ڈال دی۔

مہا بھارت میں بھی اکثر ان پتلیوں کا ذکر آیا ہے جب ارجن کورووں سے لڑنے جا رہا تھا تو اُترا نے اس سے کچھ پتلیاں لانے کی فرمائش کی تھی۔ کتھا سرت ساگر میں لکھا ہے کہ اسُر مے کی لڑکی سوم پربھا نے اپنے باپ کی بنائی ہوئی بہت سی پتلیاں رانی کلنگ سینا کی نذر کی تھیں۔ ان میں سے ایک پتلی تو ایسی عجیب ساخت کی تھی کہ کھونٹی دباتے ہی ہوا میں ناچنے لگتی تھی اور کچھ دور پر

رکھی ہوئی چھوٹی موٹی چیزیں اٹھالاتی تھی۔ کوئی کوئی پتلی پانی بھرتی تھی علاوہ کوئی ناچنے گانے کے علاوہ بات چیت بھی کرتی تھی۔ کتھا سرت ساگر کے مصنف نے بیان روایت گنتر ادھیہ کی مشہور تصنیف برھت کتھا سے اخذ کی ہے جو قدیم زمانہ میں پشاچی زبان میں لکھی گئی تھی۔

کتھا کوش میں لکھا ہے کہ راجہ سندر نے اپنے لڑکے امر چند کی شادی کے موقع پر کاٹھ پتلیوں کا ناچ کرایا تھا۔ دسویں صدی عیسوی کی معروف تصنیف بال رامائن ناٹک مصنفہ راج شیکھر کے پانچویں باب میں مرقوم ہے کہ استر فے کے وشارد نامی شاگرد نے دو پتلیاں بنائی تھیں جن میں سے ایک سیتا دوسری سندور یکا کی ہم شکل تھی۔ یہ دونوں سنسکرت اور پراکرت زبانوں میں بخوبی بات چیت کرتی تھیں۔ ان کی صورت اتنی موہنی اور گفتگو ایسی پیاری تھی کہ خود راون جیسا پنڈت بھی اصل و نقل کا امتیاز کرنے میں چکرا گیا تھا۔

غالباً یہ کہنا بے سود ہوگا کہ پتلی کا ناچ چھایا ناٹک یا خاموش فلموں کا دوسرا رخ ہے۔ اصل میں چھایا ناٹک کی یہیں سے ابتدا ہوتی ہے۔ ان ناچوں اور ناٹک میں بھی کچھ بہت دور کا واسطہ نہیں ہے۔ اس کا ثبوت اس ایک بات سے بھی ملتا ہے کہ چین میں آج تک ناٹک شروع ہونے سے پہلے پتلیوں کا ناچ دکھایا جاتا ہے نیز یہ کہ موجودہ سینما مغرب کے پرانے اسٹیج کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

آگے چل کر پتلیوں کے تماشوں میں ایک اہم تبدیلی ہوئی چھایا ناٹک اپنی پہلی صورت میں رونما ہونے لگے۔ عہد حال کے سینما اور چھایا ناٹکوں میں بہت کچھ مشابہت ہے۔ اس مقصد کے لئے چمڑے کی پتلیاں بنائی جاتی تھیں اور ایک قسم کی تیز روشنی کے سامنے کچھ اس طور سے ان کی نقل و حرکت جاری رکھی جاتی تھی کہ ان کا سایہ سامنے لگے ہوئے پردے پر پڑتا تھا۔ اس طرح تماشائیوں کو متحرک تصاویر نظر آتی تھیں۔ یہ پتلیاں بہت چھوٹی ہوتی تھیں لیکن ان کا عکس اتنا بڑا ہوتا تھا کہ متحرک کردار قامت میں آدم قد جیسے معلوم ہوتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی ہندوستان کے لوگ مناظر و مرایا کے اصول سے بخوبی واقف تھے۔ اور پرچھائیوں کی جسامت بڑھانے کے لئے کسی ایسی چیز کا استعمال کرتے تھے جو آجکل کے لینس سے ملتی جلتی تھی۔

چھایا ناٹک عام ناٹکوں سے بہت مختلف ہوتے تھے۔ اور ان کا پلاٹ بالعموم مہابھارت اور رامائن سے ماخوذ ہوتا تھا۔ قدیم چھایا ناٹکوں میں سے دو تانگد مصنفہ سُبھٹ، مہاویر چرتر مصنفہ بھوبھوتی، بال رامائن مصنفہ راج شیکھر اور پرتن راگھو مصنفہ جے دیو یہ چار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان کے جنوبی اضلاع میں چھایا ناٹک سولھویں اور سترھویں صدی تک مروج تھے۔ اہل جاوا بھی جو نسل و اصل کے اعتبار سے ہندوستانی ہی ہیں اس میں ہندوستانیوں کی تقلید کرتے رہے ہیں چھایا ناٹک ہندوستان سے نکل کر سرزمین یوروپ تک جا پہنچے تھے ترکی میں اب بھی ان کی نمائش ہوا کرتی ہے۔ ڈاکٹر پشل کی رائے ہے کہ وسط یوروپ میں پتلیوں کے ناچ کی ابتدا

انھیں چھایا ناٹکوں کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ اطالوی زبان میں پیوپا یا پیوپلا وغیرہ الفاظ مستعمل ہیں جو پتلی کے مرادف ہیں۔

ظاہر ہے کہ ناٹکوں کے آغاز سے بہت پہلے پتلیوں کا ظہور ہو چکا تھا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ناٹک سے قبل چھایا ناٹک وجود میں آئے ہوں۔ اور اگر ان سے پہلے نہیں تو کم از کم ان کے پہلو بہ پہلو بولنے والی پتلیوں کی ایجاد ہوئی ہوگی۔ ہرچند کہ چھایا ناٹکوں کے آغاز کا زمانہ معین کرنا محال ہے لیکن اگر ڈرامے یا ناٹک کی ابتدائی تاریخ کا ٹھیک ٹھیک حال معلوم ہو جائے تو یہ مشکل ایک حد تک آسان ہو سکتی ہے اور چھایا ناٹک کی قدامت کا کچھ نہ کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندی ناٹکوں کی ابتدا بھرت منی کے زمانہ سے بتائی جاتی ہے لیکن انھوں نے جو ناٹیہ شاستر لکھا ہے وہ مختلف تصانیف کے اخذ و اقتباس کا حاصل ہے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ اس تصنیف سے پہلے اچھے ناٹکوں کی ایک معقول تعداد وجود میں آ چکی تھی۔ اور ان کا مطالعہ غائر نظر سے کیا جا چکا تھا۔ بھرت منی کے ذی علم مبصر ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ کالیداس جیسے چوٹی کے مصنف نے انھیں "آچاریہ" سے خطاب کیا ہے۔ بھرت منی کا زمانہ عیسیٰؑ سے کم از کم تین چار سو سال پیشتر کا مانا جاتا ہے۔ چانکیہ کے ارتھ شاستر میں بھی ناٹکوں کا ذکر آیا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ تقریباً تیسری صدی ق۔م۔ میں ہندوستان میں عام ناٹکوں کا رواج تھا۔

بھرت منی کے سوتر بدھ گرنتھ سے اس امر کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ ویدوں کے زمانہ میں ناٹک کھیلے جانا تفریح و تفنن کا باعث بن گیا تھا۔ اس لحاظ سے چھایا ناٹک اور بھی پہلے کی چیز قرار پاتی ہے۔ اس کے برخلاف مغرب میں سینما کی ابتدا عہد جدید ہی کے انکشافات کی رہین ہے۔ انسائکلوپیڈیا برٹینیکا" میں اس کے آغاز کی مکمل داستان مذکور ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں سینی میٹوگراف ایجاد ہوا۔ ڈبلو۔ جی۔ ہورنر نے پہلے پہل ۱۸۳۳ء میں اس کا خیال دلایا تو دنیا کے تمام سائنسدان اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ۱۸۷۲ء میں ای۔ مے برج نے متعدد کیمروں کی مدد سے ایک بھاگتے ہوئے گھوڑے کی مختلف حالتوں میں تصویر لے کر اس مبہم خیال کو ممکنات کے پہلو لا کھڑا کیا۔ ۱۸۸۲ء میں پیرس کے مشہور کیمرا مین ای۔ جے۔ مرے نے باقاعدہ تجربات شروع کر کے بالآخر ۱۸۹۰ء میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ۱۹۲۶ء میں ایم۔ اے۔ جانسٹن نے اس ایجاد میں ایک اور اضافہ کی اور بولتی ہوئی تصویروں کے لئے ایک وسیع میدان تیار کر دیا۔

اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ مغرب سینما کی جانب اس وقت متوجہ ہوا جبکہ وہاں ناٹکوں کی ترقی اپنے عروج کا نقطہ تکمیل پہنچ چکی تھی۔ لیکن قدیم ہند میں ناٹک سے پہلے چھایا ناٹک کی بنیاد پڑی۔ جہاں تک اداکاری کا تعلق ہے سینما کا کام ناٹک سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اس لئے اغلب ہے کہ جب ہند قدیم میں اس نوع تفریح کی مانگ بڑھی ہوگی تو لوگ چھایا ناٹکوں

کی مشکلات سے گھبرا کر دوبارہ کمانے کی دھن میں ناٹک کی جانب متوجہ ہو گئے ہوں گے۔ بھرت وا ہوک کی تحریریں جن کا ذکر پیشتر ہو چکا ہے اس عام بدمذاقی کا ثبوت ہیں جو اس زمانہ کے ناٹکوں میں پائی جاتی تھی۔ اور جس کی وجہ فن کی محرومیت اور روز افزوں مانگ کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟

چھایا ناٹک کے لئے ایسے قصّے کی ضرورت ہے جس میں صرف عمل ہی عمل کا دخل ہو۔ البتہ بولتی ہوئی فلمیں ایک حیثیت سے ناٹک ہی کی نقل ہیں۔ اس لئے ان پر یہ پابندی بڑی حد تک عائد نہیں ہوتی۔ یہی باعث ہے کہ چھایا ناٹکوں کے مصنفوں کو راماین اور مہا بھارت میں دلکشی کا خاص سامان نظر آیا اور چونکہ ناٹک ان کے جانشین تھے اس لئے عام خوش اعتقادی کی بدولت ان کے پیروں میں بھی پابندیٔ مذہب کی زنجیریں پڑ گئیں جنھیں ملنکار شاستر نے اور بھی کڑا کر دیا۔

اداکاری کے اعتبار سے چھایا ناٹک یا خاموش فلم کو عام ناٹکوں پر فوقیت حاصل ہے۔ ناٹک کا ایکٹر اظہار خیال و جذبات کے لئے الفاظ سے کام لیتا ہے جس سے اس کے لب و لہجہ میں نقالی اور تصنع پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اداکاری کے ضروری عنصر یعنی حرکات و سکنات کی جانب سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے۔ لیکن خاموش تصویروں یا سایوں کا اداکار ایک بالکل بے زبان مخلوق ہے۔ اسے جذبات اپنی نقل و حرکت ہی سے نمایاں کرنا پڑتی ہے۔ ناٹک کے ماحول و مناظر سے خواہ مخواہ بناوٹ اور نقالی ترشح ہوتی ہے۔ لیکن چھایا ناٹکوں کے تمام و کمال واقعات بشرطیکہ وہ مافوق الفطرت اور بعید از فہم نہ ہوں واقعیت کے گہرے رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور جب اداکار کا کام انتہائے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہم ایک قدرتی جوش سے اچھل پڑتے ہیں۔ ناٹک کے اسٹیج پر کبھی ایسا منظر رونما نہیں ہوتا۔

غزل

تیرے حق میں اے عطائے دوست یہ کیا ہو گیا
تو نے جس کو درد سمجھا تھا دوا ہو گیا

فتنہ ساماں کس قدر ذوقِ تماشا ہو گیا
بارہا خود اپنے اوپر تیرا دھوکا ہو گیا

عشق جب بھی مائلِ ترکِ تمنا ہو گیا
بارگاہِ ناز میں اک حشر برپا ہو گیا

روحِ الفت بن گیا جانِ تمنا ہو گیا
ہائے وہ لمحہ کہ صرفِ شکر و شکوا ہو گیا

بارِ تسلیم و رضا جب سے گوارا ہو گیا
اُن کا احساسِ غم و راحت ہمارا ہو گیا

تم وہ ظالم دل میں رہ کر بھی نہ میرے ہو سکے
دل وہ کافر مجھ میں رہ کر بھی تمھارا ہو گیا

عمر بھر کے اشتیاقِ دید کا حاصل نہ پوچھ
جب کوئی پردہ اٹھا کچھ اور پردا ہو گیا

زندگی میں آئے ہیں ایسے بھی کچھ لمحاتِ شوق
سر جھکانے بھی نہ پائے اور سجدا ہو گیا

ایک ساعت کیلئے چمکی تھی برقِ حسنِ دوست
کون جانے ایک ہی ساعت میں کیا کیا ہو گیا

میں یہ سمجھوں گا کہ تم نے دیئے دونوں جہاں
صرف یہ کہدے کہ تیرا درد تیرا ہو گیا

اس طرح لوٹے کسی کے آئینہ خانے سے ہم
ہر نظر سے ایک جلوہ آشکارا ہو گیا

چشمِ ساقی تیرے در پردہ تصرف کے نثار
ہر نفس منجملۂ امواجِ صہبا ہو گیا

نے ہی ڈوبا تھا ہمیں طوفانِ بحرِ زندگی
خیر یہ گذری کہ تیرا غم سہارا ہو گیا

ہر حجابِ حسن تھا اس درجہ غرقِ رنگ و بو
عشق یہ سمجھا کہ راز حسن افشا ہو گیا

وہ گراتے ہی رہے عامرؔ نقابوں پر نقاب
دل نے جب چاہا جہاں چاہا نظارا ہو گیا

عامر عثمانی

جزائر ولندیز کے ثقافتی حالات

جزائر ولندیز ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، لیکن ان میں ایک بات مشترک ہے، وہ یہ کہ وہ سب ایک قدیم اور اعلیٰ تمدن کے حامل ہیں اور اب آگے چل کر ان کو ثقافتی اور اقتصادی دنیا میں ایک بڑا اہم کام انجام دینا ہے۔

عام طور پر لوگ اِن بڑے جزیروں کے سائز کے متعلق بہت مبہم قیاسات رکھتے ہیں۔ ان کا رقبہ تقریباً سات لاکھ ۵۰ ہزار مربع میل ہے اور انکی چوڑائی مشرق سے مغرب تک تقریباً تین ہزار میل۔ ان میں سے اکثر جزیرے آتش فشاں ہیں۔ صرف جاوا ہی میں کم ازکم ۳۰ زندہ آتش فشاں پہاڑ ہوں گے۔ ان جزیروں کی غیر معمولی زرخیزی کا موجب ایک یہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ خوش قسمتی سے خطِ استوا کے قریب ہونے کی وجہ سے ان کی آب و ہوا مرطوب ہے اور آب پاشی کے لئے پانی کی کوئی قلت نہیں ہے اور تمام سال یہاں کے آدمی زمین کی انتہائی زرخیزی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایک دفعہ برو بدور (مشہور بدھی خانقاہ) کی سیر کرتے ہوئے میں نے جوگیا کرتا کے قریب چاول کی فصل کو ایک ہی قطعہ پر (جو زیادہ سے زیادہ نصف مربع میل تھا) بڑھوتری کے مختلف درجوں پر دیکھا۔ جہاں ایک طرف فصل کاٹی جارہی تھی دوسری طرف بیج بوئے جارہے تھے اور بیچ کے پودے بھی چھوٹے بڑے مختلف سائز کے تھے۔ فصل کی یہ حیرت انگیز حالت اسی قدرتی وجہ سے ہے کہ سال کے مختلف حصوں میں درجہ حرارت بہت کم بدلتا ہے۔

یہ جزیرے ان قدیم ارضیاتی تغیرات کی بنا پر عالم وجود میں آئے ہیں جنکی وجہ سے کسی براعظم کے نشیبی علاقے پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ قطع نظر ان ساحلی میدانوں سے جو حال ہی میں (علم ارضیات کے نقطۂ نظر سے) متعدد دریاؤں کے خشک ہوجانے سے نمودار ہوئے ہیں، موجودہ جزیروں کی بیچ کی پٹی پچھلے براعظم کے کوہستانی سلسلے اور جزائر نکوبار، انڈمان اور جزیرہ نما ملایا ہی کی ایک کڑی ہے۔ تو گویا ولندیزی مجمع الجزائر کا مغربی حصہ کم ازکم جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان اور براعظم ایشیا کے مشرقی حصہ ہی کا ایک جزو ہے اور یہ انقطاع اگرچہ تنگ لیکن بہت گہرے سمندر کے ٹکڑوں کی وجہ سے واقع ہوا ہے اور اسی کی وجہ سے براعظم آسٹریلیا الگ ہوگیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے ولندیزی مجمع الجزائر ایشیا اور آسٹریلیا کے درمیان ایک پل ہے اور آئندہ زمانہ میں اس کی اہمیت کے بڑھنے کی امید بھی اسی بنا پر ہے۔

مغربی جزیروں کے حیوانات ایشیائی حیوانات سے بہت مشابہ ہیں مثلاً سماترا کے ہاتھی، چیتے اور گینڈے اور جاوا کے چیتے۔ مشرقی جزیروں کے حیوانات آسٹریلیائی حیوانات سے ملتے جلتے ہیں۔ ان میں وہ جانور بھی شامل ہیں جو ایک پرانے ارضیاتی عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی نسل کرۂ ارض کے دوسرے حصوں میں اب مفقود ہے۔

"انسانیات" کی رو سے بھی اس مجمع الجزائر میں دو خاص عنصر ہیں۔ ایک طرف تو نیوگنی اور اس کے اردگرد کے جزیروں کے باشندے آسٹریلیا کے باشندوں سے قطعی طور پر مشابہ ہیں اور دوسری طرف مغربی سمت میں ایک بڑی نسل کی مختلف شاخوں کے آدمی پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ملایا، جاوا، اور بالی کے باشندے زیادہ نمایاں ہیں۔ یہ لوگ براعظم ایشیا کے قبائل بالخصوص اس مجمع الجزائر کے قبیلۂ کھمیر سے زیادہ مشابہ ہیں اور ان کی بابت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان سے آئے ہوئے ہیں۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ملایائی قبائل کے موجودہ افراد دراصل وہ لوگ ہیں جو اپنی اصل سرزمین سے جدا ہوکر ان جزیروں میں آبسے ہیں۔ اصل باشندوں کا نام ونشان اب بہت کم باقی ہے کہیں کہیں اگر ان کا کچھ پتہ لگتا ہے تو لنکا کے قبیلۂ ودّا کے آدمیوں سے لگتا ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے تو یہ باتیں دلچسپ ہیں ہی لیکن ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ صدیوں میں اس مجمع الجزائر نے کس ڈھنگ پر ترقی کی ہے۔ ہمیشہ یہی اندازہ ہوتا ہے کہ نئی قومیں مغرب سے آتی رہیں اور رفتہ رفتہ مشرق کی طرف بڑھتی گئیں۔

اس مجمع الجزائر کا ذکر پہلے پہل سنہ عیسوی کے ابتدائی دور میں ملتا ہے۔ بطلیموس نے جزیرۂ جباڈیو کا ذکر کیا ہے جو سنسکرت کے جواڈویپا کی پراکرتی شکل معلوم ہوتی ہے۔ سنسکرت اور پالی کی کتابوں میں زیادہ تر جاوادیپا اور سُوَرنادویپا ہی کا ذکر آتا ہے۔ سُورنادویپا کو موجودہ سماترا سمجھا گیا ہے حالانکہ یہ جزیرہ اب سونے سے بالکل خالی ہے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں ہندوستان نوآبادیاں قائم کرنے میں بڑے زوروں کے ساتھ منہمک تھا۔ اسکی تجارت سمندر پار مقامات میں بڑی شد ومد کے ساتھ جاری تھی اور ہندوستانی تجارت کے اہم مرکزوں سے ہندوستانی ثقافت اور تمدن کا دُور دُور تک پرچار ہوا۔ ظاہر ہے کہ بے شمار لوگ ہندوستان سے جاکر ان جزائر میں آباد ہوگئے ہوں گے اور یہ سلسلہ کئی سو سال شاید ایک ہزار سال تک جاری رہا ہوگا۔

جن ہندوستانیوں نے ان جزیروں میں پہلے پہل اپنی حکومتیں قائم کیں انکے حالات خود مغربی جاوا اور بورنیو کے کتبوں سے دریافت ہوتے ہیں وہ چوتھی اور پانچویں صدی کے ہیں ان ہندوستانی حکمرانوں میں دو خاص ہیں:—
پورنا ورمن اور مولا ورمن

اے۔ اے باکے

ان میں سے پہلا تو اتفاقی طور پر ہندو تھا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ اس نے ایک بڑی مہم سر کرنے کے بعد ایک ہزار گائیں برہمنوں کو دان کیں۔ مشہور چینی سیاح فاہیان ۴۱۴ء میں اپنے ملک واپس جاتے ہوئے مغربی جاوا میں ٹھیرا۔ اس نے برہمنوں اور کافروں کا تو ذکر کیا ہے لیکن بدھوں کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان جزیروں میں بدھ مت کا پرچار سب سے پہلے مذہبی مبلغ گُنا ورمن کشمیری نے کیا۔ سنہ [illegible]ء میں اس کی توجہ کا خاص مرکز سماترا بنا رہا۔ چنانچہ دو سو سال بعد سماترا میں ایک عظیم مہایانا مذہب سلطنت قائم ہوگئی۔ یہ سلطنت (شری وجے) ان جزیروں کی تاریخ میں ایک اہم کام انجام دینے والی تھی۔

جاوا میں شیو اور وشنو دونوں کی پوجا ہوتی تھی۔ ڈینگ کے سطح مرتفع پر جو جاوا کے وسط میں واقع ہے جو سب سے پرانے مندر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے قریب قریب ہر ایک شیو کا مندر ہے۔ پرمبانن کے تمام شاندار مندر بھی جو وسطی جاوا ہی میں واقع ہیں شیو مندر ہی کے اردگرد ہیں اور وہاں شیو کا سجا رنندی بھی دروازہ پر موجود ہے۔ چونکہ اکثر دیواروں پر رامائن کے قصوں کی منبت کاری ہو رہی ہے اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں وہاں وشنو رام کی بھی پوجا ہوتی ہوگی۔ اگلی چند صدیوں میں ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ جاوا میں بدھی تمدن بڑی ترقی پر تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ جزیرہ شری وجے کے حکمرانوں نے فتح کر لیا تھا۔ اس خاندان نے ساتویں سے تیرھویں صدی تک گویا چھ سو سال تک شمال میں جزیرہ نما ملایا، سیام اور انڈو چائنا اور کمبوڈیا کے بعض حصوں پر اور مشرق میں جاوا پر حکومت کی اور مغرب میں لنکا کے راجاؤں سے لڑتے رہے اور دو دفعہ اس پر حملہ بھی کیا۔ لیکن شری وجے کی شہرت صرف دنیوی کامگاری ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ سلطنت تمدن اور علم و ادب کا بھی مرکز تھی۔ چینی زائرین سمندر کی راہ سے ہندوستان جاتے ہوئے راستہ میں سماترا بھی ٹھیرا کرتے تھے اور سماترا کی بدھی درسگاہوں میں فلسفہ اور الٰہیات کا درس لیتے تھے۔ شری وجے کے حکمران ہندوستان [illegible]۔ بہار کے قریب مشہور نالندہ یونیورسٹی کی کھدائی سے ثابت ہوا ہے کہ سماترا کے بعض دیہات کی مالگذاری کا کچھ حصہ اس یونیورسٹی کے "شری وجے منزل" کی دیکھ بھال پر صرف کیا جاتا تھا کیونکہ اس سلطنت نے بدھ مت کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشہور مذہبی مبلغ اتیشہ نے تعلیم سماترا میں حاصل کی تھی اور تبلیغ کا کام تبت سے شروع کیا تھا۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ طلباء، مدرس اور فنکار بڑی تعداد میں ہندوستان سے جاتے رہتے ہوں گے۔

بوروبدر کی تحریرات جو جاوا کے بدھی آثار قدیمہ میں خاص چیز گنی جاتی ہیں اور جو عہد شلیندرا میں لکھی گئی تھیں مہاتما بدھ کی مشہور سوانح حیات "للت وستر" کی ہو بہو نقل ہیں۔ بوروبدر کے تمام نقوش بدھ ہی کی زندگی سے متعلق ہیں۔ ان سب کی لمبائی تقریباً تین میل ہے۔ بوروبدر میں جاتک کتھائیں بھی تصویروں کے ذریعہ پیش کی گئی ہیں۔ ان تصویروں اور پتھر کے تختوں سے بھی یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ ان نقوش کے بنانے وقت کونسی ہندوستانی کتابوں کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔

سنہ ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ زمانہ میں ہندوستان اور ہندوستانیوں کی نوآبادیات کے درمیان میل جول کا سلسلہ ذرا کم ہونے لگا۔ جاوا کے بعد کے حکمرانوں کے زمانہ میں بالخصوص مشرقی جاوا کے خاندان مدیاپہت کے عہد حکومت میں (تقریباً سنہ ۱۲۹۴ — ۱۵۰۰ء) ہم دیکھتے ہیں کہ خالص جاوی عنصر اصلی ہندوستانی کتابوں اور روایتوں کے اثرات کو ہٹا کر آگے بڑھنے لگا۔ مندروں کے نقوش کا موضوع جاوی رہا البتہ طریقہ بھی جاوی ہو گیا۔ زبان اور ادب میں بھی ہم کو جاوی عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ قدیم سنسکرتی بحروں کے ساتھ ساتھ نظم میں جاوی بحریں بھی ابھرنے لگیں۔ اگرچہ سنسکرت کے بہت سے الفاظ باقی رہے لیکن ان میں سے اکثر کے یا تو معنی بدل گئے یا وہ لفظ بے معنی ہو کر رہ گئے۔

دینیات میں ہندوستانی فلسفہ کے مختلف دبستانوں کا فرق ختم ہوتا جا رہا ہے اور اب سب مل کر ایک نئے متحد مرکب بنانے جا رہے ہیں جس میں جزائر کے اصلی باشندوں کے خیالات اور عقائد زیادہ نمایاں ہیں۔ درباری

آشا

اپنے بھی پھر ہونگے دن تو کبھی، اپنی بھی کبھی راتیں ہونگی
اگلی پچھلی بھولی بسری، دل سے دل کی باتیں ہونگی

پیاسا جیون، بھیگے نینیاں، ترسا جوبن روٹھے ارماں
بیتے دنوں کے شکوے ہونگے، دو دو پی سے باتیں ہونگی

ہجر کے دونوں ہونگے مارے، بہتی ندی کے چنچل دھارے
پل پل نینن ہونگے اشارے، سانجھ سکارے گھاتیں ہونگی

دل میں مچیگی تازہ ہلچل، کلیاں کھلینگی کومل کومل
پریم بھرے چھائیں گے بادل، مدھ کی بھری برساتیں ہونگی

نئے ہلارے مچیں گے تن میں، نئی امنگیں اٹھینگی من میں
نئے نظارے ہونگے گلشن میں، پریت کی پی سے باتیں ہونگی

چنچل بالم بہانہ جانیں، آنے دو ہم بھی نہ مانیں
داؤں پہ اب کے تجیں گی جانیں، کسکی جیتیں ماتیں ہونگی؟

منصور معجز

ماحول کے اندر ہندو تمدن نے ہمیشہ اونچی جگہ پائی۔ لیکن عوام نے ہندو تمدن کے علم نظریوں کو اپنا لیا اور ان میں اپنے ڈھب کے تغیرات کر لئے۔ اس عمل کا انتہائی عروج جزیرۂ بالی میں ہوا جہاں بشنو، وشنو اور بدھ کے ساتھ ساتھ بلکہ کیاں طور پر جانوروں اور بزرگوں کی ارواح کی پرستش کی جاتی ہے۔

یہ طے ہے کہ بالی میں ہندوؤں کی نوآبادی بہت ہی قدیم زمانہ میں شروع ہوگئی تھی۔ لیکن اسکی اہمیت کا دور اسوقت سے شروع ہوتا ہے جب مدیاپہت کو زوال ہوا اور پندرہویں صدی کے نصف آخر میں وہاں مسلمانوں کا تسلط ہوگیا۔ جاوا میں مذہبی جوش نے (جو ہر مذہب کے ابتدائی دور میں ہوا ہی کرتا ہے) قدیم روایات کو بہت کچھ مٹا دیا۔ بلکہ بہت سی تو بالکل ہی ناپید ہوگئیں۔ کرن جیسے فیض عالموں نے البتہ قدیم جاوی زبان اور ادب کا ازسرِنو کھوج لگایا اور وہاں اس متاعِ از دست رفتہ کے جو خریدار تھے اس کو ان کے ہاتھوں میں پہنچایا۔ بالی میں جاوا سے گئے ہوؤں کو بڑے اطمینان کی زندگی نصیب ہوگئی۔ یہاں انھوں نے ان روایات کو بالکل اسی طرح تازہ کیا جسطرح کئی سو سال پہلے وہ خود ان کے وطن میں تھیں۔ بالی میں اسلامی رنگ بہت کچھ پھیکا رہا۔ اسوقت بھی اس جزیرہ میں کوئی اکا دکا ہی مسلمان نظر آتا ہوگا۔

اس مجمع الجزائر میں مختلف بیرونجاتی اثرات کو ترقی جس یکسانیت کے ساتھ ہوئی اسکا مطالعہ کافی دلچسپ ہے۔ ہندوستان سے جو لوگ یہاں آکر آباد ہوتے وہ تجارت کی غرض سے آتے تھے لیکن یہاں رہتے رہتے آخر میں حکمرانوں کی حیثیت حاصل کرلی اور یہاں کے اصل باشندوں میں اپنے مذہب کی تعلیم و تلقین کی۔ گویا جاوا اور سماترا کے ان حصوں میں ان کا نیا مذہب پھیل گیا جہاں کے باشندے تمدن کے مفہوم سے واقف تھے اور نئے نئے خیالات سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دوسرے حصوں میں جہاں کے باشندے بالکل جنگلی تھے وہاں کوئی مستقل اثر پیدا نہیں ہوسکا۔ اس اثر اندازی کا رُخ مختلف زبانوں میں کیا رہا اسکا اندازہ موجودہ زمانہ کی تاریخی دریافتوں سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ جاوا میں ہندو مت نے اسلام کے اثرات کا سب سے زیادہ ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہاں ہندو تمدن کے مختلف شعبوں نے قدیم تہذیب کے ساتھ مل جل کر اپنا ایسا پکا رنگ جمایا کہ بیرونجاتی اثرات بالکل ہی مٹ گئے۔ جاوا کی اسوقت کل آبادی مسلمان ہے لیکن وہاں بھی مہابھارت کا ہیرو ارجن شجاعت و مردانگی کا ماڈل مانا جاتا ہے جس سے "شتری" طبقہ کا تخیل باقی ہے۔ جاوا کے عام دیہاتیوں کا عقیدہ ہے کہ پانڈو جاوا میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ نوے فیصدی کھیل تماشوں یا چھایا ناٹکوں کے موضوع رامائن یا مہابھارت پر مبنی ہوتے ہیں جا بجا ویلا کے اکثر نام سنسکرت اصل کے ہوتے ہیں اور جاوی رقص تو ہندوستانی رقص و مہابھارت ناٹیا ہی کا مکمل چربہ ہے۔ جاوا میں رقص اب تک شہزادوں، شہزادیوں اور امیروں کے طبقہ کی ایک چیز ہے۔ شاہی درباروں اور محلوں میں جب ناچ ہوتا ہے تو قریب کے دیہاتی وہاں آکر جمع ہوجاتے ہیں اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ناچنے والے کی ایک ایک حرکت کو دیکھتے ہیں۔ ناچ کا مطالعہ بغور کرتے ہیں۔ اچھے کی تعریف کرتے ہیں اور غلطیوں کی گرفت۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ قدیم قصوں پر اپنے اخلاقیات کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارجن کے ایسے کردار کی وہاں بڑی قدر ہے۔

اسلامی تمدن کا اثر تصوف کی ترقی کی صورت میں ظاہر ہوا جسطرح ہندوستان میں اسلامی تصوف میں ہندوؤں کے قدیم عقائد جاگزیں ہوگئے ہیں اسی طرح جاوا میں بھی تصوف اسلام نے قدیم جاوی اثرات اپنے اندر جذب کرلئے ہیں۔ سلسلۂ نسب میں بھی اس نئے مذہب کے اثرات کارگر نظر آتے ہیں مثلاً وسطی جاوا کے حکمرانوں میں سے ایک سے ہم کو ملاقات کا موقع ملا تو اس نے اپنا سلسلۂ نسب آدم اور حوّا سے شروع کیا اور اپنی واقفیت کے مطابق تمام تاریخ اسلامی کو دُہرا گیا۔ اس سلسلہ میں سکندر ذوالقرنین کو بھی شمار کیا گیا کیونکہ اسلامی تاریخ میں اسکا ذکر فتوحات کے سلسلہ میں بڑی عظمت کا حامل ہے۔ شجرۂ نسب کا طول دس سے پندرہ گز تک ہے۔ یہ دیکھکر کہ اس کے اندر تمام ہندو مسلمان یونانی اور خود ولندیزی ہیرو شمار میں آجاتے ہیں بڑی ہنسی آتی ہے لیکن مختلف اقوام اور قبائل کا امتزاج ہی جاوی تمدن کی خاص شان ہے۔ جاوی قوم کے خصائص کو اپنے اندر مناسب طور پر سمو لیا ہے۔ غیر ملکی اثرات جاوا میں کچھ اس طرح جذب ہوئے ہیں کہ جاوی قوم خود اس سے بے خبر ہے کہ اسمیں کوئی غیر ملکی عنصر موجود ہے۔ تمدن میں بیرونی تاثر کے بارے میں ٹیگور نے کہا ہے صرف کمزور آدمی ہی مستعار لیتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ خود اپنے سکوں میں اسکی ادائگی نہ کرسکیں گے۔ اس قول کی صداقت اور زندہ ثبوت جاوا میں ملتا ہے۔

عہدِ عتیق کی تاریخ کو چھوڑ کر ہم ولندیزی تاریخ کو سرسری طور پر تین ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ان میں سے دو کا تذکرہ مجملاً اوپر ہو چکا ہے۔ پہلا دور وہ ہے جس میں ہندوستانیوں نے نوآبادیاں قائم کیں اور جاوا اور سماترا میں ہندو سلطنتیں ظہور میں آئیں۔ یہ زمانہ ابتدائے سنہ مسیح سے لیکر چودھویں یا پندرہویں صدی تک رہا۔ دوسرا دور ہندو حکومت کے زوال اور اسلامی اقتدار سے شروع ہوتا ہے۔ دراصل اسلامی اثر چودھویں صدی سے بہت پہلے سے شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دور کسی حد تک ایک دوسرے میں گڈمڈ ہیں مسلمانوں کے قدیم ترین کتبے (مقبروں کے اوپر) ۱۱۰۲ء کے ہیں۔ مغرب سے مشرق کی طرف اسلام کی توسیع گو ۱۵۲۰ء (مدیاپہت کے زوال) سے شروع ہوتی ہے لیکن اس سے دو سو سال پہلے ہی شمالی سماترا کا ایک پورا [illegible]

مسلمان ہوگیا تھا۔ اسی وقت سے شمالی سماٹرا میں مذہبی جوش و خروش مشرقی سماٹرا کی بہ نسبت زیادہ چلا جارہا ہے۔ سماٹرا ایک زمانہ میں سلطنت شری وجے کا مضبوط ترین مرکز تھا لیکن آج وہاں ہندوؤں کا نام تک نہیں سنائی دیتا۔ بجو کشمو اور سیدا سمو ایسے نام ہر قدم پر سنائی دیتے ہیں۔ ہر غیر ملکی سیاح ذرا سی دیر میں اندازہ لگا لیتا ہے کہ جاوا کے لوگ اپنے تئیں سچا مسلمان سمجھتے ہیں۔ تیسرا دور بھی جو یورپی نوآبادیات کا دور رہے دوسرے دور سے ملا ہوا ہے کیونکہ سب سے پہلے پرتگالی سوداگر ۱۵۰۹ء میں گویا مدیاپیت کے زوال کے ۴۰ سال بعد ہی آگئے تھے۔

اور اس وقت تمام جاوا میں چھوٹی چھوٹی ہندو سلطنتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ مدیاپیت کا سب سے بڑا مرکز مغربی جاوا میں تھا اور اس کا زوال ۱۵۲۰ء سے پہلے نہیں ہوا۔ اس سے ۱۰ سال پہلے ہی پرتگالیوں نے جزائر ملکا میں اپنا تجارتی اڈہ قائم کرلیا تھا اور اس سے سو سال پہلے مدیاپیت کا زوال ہو چکا تھا۔

ولندیزوں میں پرتگالیوں کے جم جانے کے سو سال بعد ڈچ آئے اور انہوں نے ۱۵۹۶ء میں جاوا کے ایک راستے سے صلح کی۔ پرتگالیوں اور ڈچوں کی کشمکش ۱۶۰۹ء سے شروع ہوئی اور عرصہ تک جاری رہی۔ جیت آخر میں ڈچوں کی ہوئی۔ ان کے علاوہ جیپانی بھی براہ امریکہ یہاں پہنچے لیکن یہ جزائر فلپائن سے آگے نہ بڑھ سکے۔

پرتگالیوں اور انگریزوں کے درمیان جو صلح نامہ ۱۶۱۹ء میں ہوا تھا اسیر طرفین قائم رہے۔ جو چینی یہاں آکر آباد ہوگئے تھے ان کے ساتھ بھی تعلقات خوشگوار اور ہموار رہے۔ ولندیزوں میں ڈچ اقتدار اور ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کے قیام میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ ولندیزوں میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے طرز حکومت میں وہ تمام نقائص اور کمزوریاں موجود تھیں جو اس طریق حکومت میں ہوتی ہی ہیں جس میں ایک ایسے شخص (گورنر جنرل) کی حکومت ہوتی ہے جو خود ایک ایسی طاقت کا تابع فرمان ہو جو خود بھی ایک تجارت پیشہ شخص ہو اور اس پر جس کونسل کی نگرانی ہو وہ ملک سے بہت دور اور صرف تجارت پیشہ لوگوں کی جماعت ہو۔

ڈچ اقتدار کے قیام کے ابتدائی زمانہ ہی سے بہت سی ڈچ لوگ یہاں آکر آباد ہوگئے۔ ان لوگوں کی دو قسمیں تھیں۔ اول وہ جو ایک مقررہ مدت کے لئے وہاں آئے تھے۔ دوسرے وہ جو مستقل قیام کے واسطے آگئے تھے۔ اس سے ملک کے تمدن پر خاص اثر پڑا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر برن ہارڈ کی ایک بہت عمدہ اور تازہ تصنیف سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے (صفحہ ۴۲)۔ اپر وہ لکھتا ہے: "کمپنی نے غریبوں اور غلاموں کی تعلیم کے لئے مدرسے قائم کئے۔ یہ اقدام سترہویں صدی کے لئے بہت ہی عجوبہ اور قابل تعریف تھا۔ امیر لوگ اپنے بچوں کو پرائیوٹ مدرسوں میں بھیجتے رہے جن کی حالت اس زمانہ کے یورپی مدرسوں سے زیادہ بری نہ تھی۔ ہالینڈ میں مقیم ڈائرکٹروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے سفارش کی کہ وہ اور زیادہ مدرسے کھولیں خاص طور پر ایسے جن میں لاطینی پڑھائی جائے۔ ڈائرکٹروں کے دلائل بہت ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا۔ مدرسے دولت مشترکہ کے نرسری باغات ہوتے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہ بات ۱۶۷۲ء میں لکھی گئی تھی۔ بہت سے آدمی اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے جو اگر اچھے ہند سے ہالینڈ بھیجتے ہیں۔ یہ بات کمپنی کے مفاد کے منافی ہے۔ کیونکہ یہ عمل درآمد ان عناصر کو ضائع کر دیتا ہے جو مشرقی ماحول میں پیدا ہونے کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔"

لڑائی شروع ہونے کے وقت تک اندرون ملک بچوں کی تعلیم کا خاص خیال رکھا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپانی حملے کے وقت مدرسوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان مدرسوں میں ڈچ، دیسی اور چینی غرض ہر قوم اور نسل کے بچوں کی انٹرنس تک تعلیم کا انتظام تھا۔ اس کے بعد بہت سے کالج انجینیری کے تھے۔ ایک یونیورسٹی صرف قانون کے لئے قائم ہوئی تھی مگر

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

بسنت

نسیم خلد سے پیغام جانفزا لائی
لئے جلو میں جواں گل کدے بہار آئی

کلی کلی نکھر آئی شراب سے دھل کر
ادائے خاص سے لیتے ہوئے اک انگڑائی

بکھر بکھر گئے ہر سمت کیف و نور و سرور
بسنت رُت لے شراب حیات چھلکائی

خوشا یہ جلوۂ صد رنگ و بوئے حسن تمام
رہے یہ بزم گلستاں یہ نقش آرائی

گلوں کے روپ میں دوشیزگی جھلکتی ہے!
چٹک ہی غنچوں کی مدھم سی نغمہ پیرائی

یہ زیر و بم میں صبا کے تراوش نغمات
یہ مست مست فضا کی نشاط افزائی

سبک خرام ہوائیں لطیف تر جھونکے
لچکتی شاخ سے بجتی ہوئی سی شہنائی

یہ رقص لالہ و گل دلنواز تانوں پر!
یہ جھومتے ہوئے ارض و سما یہ رعنائی

تصورات پہ احساس کمتری چھایا
دم نظارہ نظر دیر تک جو بھٹرائی

میں ان حسین نظاروں سے کھیل سکتا تھا
غریب دل کی دبی چوٹ پھر ابھر آئی

وہ خوشگوار مناظر کو دیکھکر جاوید
گدا کے دل میں مچلتا ہے ذوق دارائی

فرید جاوید

رخصتی کے آنسو

افسانہ

ع۔ ق بیگم

انسان اگر کسی واقعہ کے زیرِ اثر اپنے جذبات کی ترجمانی کرے تو یہ حقیقت ہے کہ دوسرے انسان پر اس کا اثر عین اسی طرح ہوتا ہے جس طرح واقعہ گذارنے والے پر ہوتا ہے۔ ذیل کے الفاظ میرے وہی کلمات ہیں جو میری بڑی بہن کی رخصتی کے وقت میری زبان سے بے ساختہ نکلے۔

شہنائیوں کی گونج باجوں کی گرج میں رخصت ہونے والی! کچھ تجھے میرے دل کی بھی خبر ہے۔ جس نے زندگی کی چودہ بہاریں تیری صحبت میں یوں گذار دیں جیسے بلبل گل کی ہمسری میں گذار دے اور اسے خزاں کا ہوش بھی نہ ہو — خود آنسو بہا کر میری چشم پرنم کو دعوت گریہ نہ دے۔ آج تجھے ہی نہیں میرا عضو عضو، میرا رونگٹا رونگٹا..... نہیں نہیں.... بلکہ وہ راحت کدہ جس کو تو نے اپنے حسن انتظام حسن اخلاق سے مسحور کر لیا تھا اشک ریز ہے — ہر وہ چیز ہر وہ انسان جس کا تھوڑا سا بھی وقت تیری ہمسری میں گذرا آج آمادہ طوفان اشک ہے.... بس....

اے میری حیات زلیست کی بہار! بس کر.... اب نہ رو — کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرے اشک وفا ہمیں اشک قیامت کا بند توڑنے پر مجبور کر دیں... اے محبوب زندگی! میری حیات کا مدار تیرے دم سے — میری زندگی کی مسرتیں تیرے وجود سے — آج تک تیرے وجود نے مجھے ابواب زندگی کے باب فراق و جدائی کا تصور بھی نہ کرنے دیا تھا لیکن آج اس حقیقت کو کہ ع

دل کے دو حرف ہیں وہ بھی ہیں جدا ایک سے ایک

خود تو نے آشکارا کر دیا۔ آج میری دل کی دنیا دوسرے کے حوالے ہو رہی ہے۔ بتا کیونکر نہ روؤں؟ — اس میں شک نہیں کہ تیری حیات کا دوسرا رونا ہے۔ جس وقت تو نے قصر حیات میں قدم رکھا تو اس وقت بھی تو روتی ہوئی آئی اور اب اسی سلک کی دوسری کڑی ہے.... تیرا رونا بجا — لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آنسو تیری حیات کے باب عیش و راحت کو وا کر دیں — جانتی ہوں کہ زندگی کا یہ دور تیرے لئے کوئی وجہ تشویش ثابت نہ ہوگا کیونکہ تیری زندگی اس ساحل کی مانند ہے جس سے سرکش موجوں کا طوفان ہر وقت ٹکرا تا رہتا ہے — تو وہ نہیں جو شادی کے نام سے مثل کلی خندہ ریز ہو جاؤ۔ دراصل وہ زندگی کی پرپیچ راہوں کو نہیں سمجھتے کہ شادی کے اس حسین سراب میں حقیقت کا دریا پوشیدہ ہے — ہر ایک ایسا نہیں سمجھتا — میری نظر میں شادی زندگی کا حسین تصادم ہے جس میں بہت کم ہی کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہ آدم کے بیٹے بڑے طمطراق سے حوا کی بیٹیوں پر حکومت کرنے اٹھتے ہیں لیکن زندگی کے میدان میں اپنی اس نادانی اور ناسمجھی سے شکست کھاتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ان کو غلام بنانے والے کا کیا حکم ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ غلام پر حکومت کرنے والا کون حاکم بنا ہے — جس کو مذہب۔ سوسائٹی۔ تہذیب و اخلاق زندگی کا شریک خاص کہہ چکی جس کے لئے مساوات کا حکم صادر ہو چکا جس کو کلام اللہ مرد کی زینت بنا چکا — وہ شریک حیات کا لقب پانے والی کیونکر غلام اور محکوم بنائے جانے کی مستحق ہو سکتی ہے؟ — وہ نہیں سمجھتے کہ حوا کی بیٹیاں محبت کی بھوکی — محبت کی بھکاری — محبت کی ماری محبت کی محکوم ہیں۔ اگر آدم کے بیٹے یہ سمجھ لیں تو یقیناً وہ زندگی کی اس سخت مہم میں کامیاب اور فاتح کہلائے جا سکتے ہیں اور یہی وہ رازِ زندگی ہے جس کو کوئی سمجھتا ہے اور کوئی نہیں —

اے گلچیں! یہ بھی کبھی تم نے محسوس کیا کہ گل کو شاخ گل سے جدا کرتے وقت کتنا دکھ ہوتا ہے — چمن کی جدائی وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا — لیکن قدرت کے بنائے ہوئے قانون کے باعث "وہ" صرف ایک انسان کے لئے سب کچھ قربان کر دیتا ہے — اور تمہاری صنف قوی اس کو اس کا کیا صلہ دیتی ہے — زمانہ شاہد ہے — بہت کم ہیں جنہوں نے گل کو گل سمجھا اور اس کی قدر کی — اے گلچیں یاد رکھ اگر تو نے گل کے نازک احساسات کو محسوس کرتے ہوئے اس کو محبت کی شبنم سے تر رکھا تو یقیناً تو اپنی زندگی میں کامیاب ثابت ہوگا۔

اے تربیت گاہ مادر کی رونق! ہر نو بہار زلیست بزرگوں کے پند و نصائح کی منت کش رہی ہے لیکن یہ تریاق وہیں پر کارآمد ثابت ہوا ہے جہاں تربیت مادر کا رنگ پھیکا ہو۔ اے محبوب جان! وہ مادر مشفقہ جو فرشتوں جیسی عظمت اور بزرگی رکھتی ہے — مگر نہیں وہ اس سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے — وہ ہستی جس نے تجھے فاروقی درس عمل اور سنت رسول کی متاہلانہ زندگی کے اسباق دئے یقیناً لائق صد ستائش ہے۔ اس درس سے تربیت کا باب صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ یہ تربیت صحیح کی نیو بانغ شمیم کے لئے نسلاً بعد نسلاً تربیت مادر کی شمع جاوید چمکے گی۔ یہ شاید تم نامی کی کشش تھی جو تمہارے گلچیں کے کاسۂ تہی میں تیری حیات کے در بے بہا بخش دیا ورنہ ہزاروں نے جبیں سائی کی اور کسی کو فخر قبولیت عطا نہ ہوا۔

اے میری روح حیات! آج تجھے فخر ہے کہ تیرے ساتھ بزرگوں کی دعاؤں کا سارٹیفکٹ موجود ہے۔ یہ اثر کا تحفہ انشاء اللہ تجھے ہمیشہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے گا۔

نوٹ:۔ ۵ ارجنوری [illegible] کے "آجکل" میں ڈاکٹر رام پرتاب بہادر کا افسانہ "زندگی" آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کی اجازت سے شائع ہوا تھا۔ قارئین کرام نوٹ فرمالیں۔ (ادارہ)

دیاسلائی کی ایجاد

مشیر احمد

آگ جلانے کی خواہش انسان میں اُس زمانے سے موجود ہے جب تہذیب انسانی عالم شیر خوارگی میں تھی اس زمانہ میں بھی جب انسان نیم مہذب حالت میں تھا آگ جلانے کی صلاحیت اس کے اور حیوانات کے درمیان مابہ الامتیاز تھی۔ جانور انسان کی ہر حرکت کی نقل کرسکتے ہیں لیکن وہ آگ جلانے پر قادر نہیں۔ آگ کو پہلے زمانہ میں ایک آسمانی راز سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے وقتوں میں آگ کی پوجا بھی کیجاتی تھی۔ آگ کے وجود اور اس کی تخلیق کے متعلق بہت سے قصے بھی مشہور ہیں۔ یونانی دیومالا کا ایک قصہ یہ ہے کہ مشتری نے انسان کو آگ سے محروم کردیا تھا۔ دیوتا پرومی تھیس کو انسان کی اس محرومی پر بڑا ترس آیا یہ آسمانوں پر اڑ کر گیا اور سورج دیوتا کی رتھ میں سے تھوڑی سی آگ چرا کر دنیا میں لے آیا۔ موجودہ آگ کا منبع بھی پرومی تھیس کی چرائی ہوئی آگ ہے۔

یہ تو تھا ایک صنمیاتی قصہ۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ انسان بہت ہی قدیم زمانہ سے آگ جلانے پر قدرت رکھتا ہے۔ لیکن مختلف زمانوں میں جو مختلف طریقے اختیار کئے گئے وہ سب صبر طلب اور بھونڈے ہوتے تھے مثلاً آگ جلانے کا سب سے پرانا طریقہ یہ تھا کہ سوکھی ہوئی لکڑی کے دو ٹکڑیوں کو ایک دوسرے سے خوب رگڑتے تھے یہاں تک کہ ان میں سے ایک آدھ چنگاری نکل آتی تھی اس چنگاری سے سوکھی ہوئی گھاس یا سوکھے ہوئے پتوں یا سوکھی ہوئی کائی کو جلالیا جاتا تھا۔ پھر یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ پتھر کے ٹکڑے کو لوہے پر زور سے مارتے تھے اور اس طرح چنگاری پیدا کرلیتے تھے۔ اس کے بعد آتشی شیشے سے کام لینے لگے وہ اس طرح کہ اس شیشہ کو سورج کے سامنے اتنی دیر تک رکھا رہنے دیتے تھے کہ یہ اس قدر گرم ہوجاتا تھا کہ اگر کوئی خشک چیز اس سے لگادی جاتی تو وہ جل اٹھتی تھی۔ چقماق اور سوختے سے تو کئی سو سال تک آگ جلانے کا کام باقاعدہ لیا جاتا رہا۔

نویں صدی عیسوی میں ایک عرب کیمیا دان نے فاسفورس دریافت کیا لیکن اس اہم دریافت سے تقریباً آٹھ سو سال تک کوئی خاص کام نہیں لیا گیا۔ بلکہ یہ بند طاق نسیاں ہوگئی۔ ۱۶۶۹ء میں گویا یہ دوبارہ دریافت ہوئی وہ اس طرح کہ ایک المانی کیمیا دان کو کیمیا بناتے ہوئے اتفاق ہاتھ لگ گئی۔ اسی زمانہ کے لگ بھگ یعنی ۱۶۸۰ء میں انگریز سائنسدان جیو فری ہاکوٹز نے دریافت کیا کہ فاسفورس اور سلفر (گندھک) کی رگڑ سے آگ پیدا کیجا سکتی ہے۔

اس اہم انکشاف سے فائدہ اٹھانے کے بہت سے طریقے اختیار کئے گئے مثلاً یہ کہ کسی شیشی یا بوتل کے اندر فاسفورس کی تہہ چڑھا دیتے تھے اور ضرورت کے وقت اس میں لکڑی کا ٹکڑا جس کے سرے پر سلفر لگی ہوئی تھی گھسا دیتے تھے۔ اس کی رگڑ سے آگ نکل آتی تھی۔ یا یہ کہ فاسفورس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑیوں کو پہلے کاغذ کے درمیان رگڑتے تھے اور اس سے چنگاری پیدا ہوجاتی تھی لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب طریقے بہت خطرناک تھے۔ اس انکشاف سے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد اصل دیاسلائی کی ایجاد ہوئی۔

دیاسلائی کا موجد ایک انگریز تھا جان واکر۔ یہ ڈرہم کا رہنے والا تھا۔ اس کی پیدائش ۱۷۸۱ء میں ہوئی۔ اس کے باپ کی پنساری کی دوکان تھی۔ جس میں اسپرٹ بھی بکتی تھی۔ جان واکر نے کچھ عرصہ تک ایک مقامی ڈاکٹر کی دوکان پر ڈاکٹری کا کام بھی سیکھا۔ کام کی مدت ختم ہوجانے پر یہ ایک بڑے ڈرگسٹ کے کارخانہ میں ملازم ہوگیا۔ اور مفرد دواؤں کی آمیزش کے طریقوں اور ان کی خاصیتوں کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ آخر میں اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ وہ ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرے یا ڈرگسٹ ہوجائے۔ بڑے سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کو اپنے وطن ہی میں "ڈرگسٹ" کی دوکان کھول لینی چاہئے۔

جان واکر بڑا خلیق اور خوش مزاج آدمی تھا لیکن اس نے تمام عمر شادی نہیں کی کیونکہ علوم نباتات و معدنیات اور کیمیا کا اس کو اس قدر شوق تھا کہ دنیا کے دوسرے کاموں کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ یا تو وہ اپنی دوکان پر ملتا تھا یا پھر جنگلوں میں گھومتا پھرتا تھا اس تلاش میں کہ کوئی ایسی چیز ہاتھ لگ جائے جس کا وہ سائنسی تجربہ کرسکے اور کسی اہم نتیجہ پر پہونچ سکے۔ گاؤں والے اس کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ واکر کے کسی نہ کسی دن کیمیا ہاتھ لگ جائیگی اور وہ دنیا بھر کے تانبے کو سونے میں بدل دے گا۔ ان بیچاروں کی سمجھ اس سے زیادہ دور جا ہی کیسے سکتی تھی۔ اس کی دوکان کے طرح طرح کے عرقوں اور ٹکیوں کو دیکھتے اور حیران ہوتے۔ اس کے دوستوں کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ کا تو یہ خیال تھا کہ جان واکر جلد ہی سونا بنانے لگے گا اور دوسرے گروہ کا خیال یہ تھا کہ واکر کسی ایسی چیز کی تلاش میں ہے جس کی ایک چٹکی ہزاروں دشمنوں کو جلا کر خاک کر دے گی۔ نہیں معلوم کہ جان واکر فی الواقع کس چیز کی تلاش میں تھا لیکن دراصل جو چیز اس کے

سلیمانیہ کے قریب ایک
پر فضا باغ۔

کردستان کے مناظر

کردستان کے باشندے بہت پرانی آریائی نسل سے ہیں۔ یہ علاقہ ایران کے شمال مغرب، ترکی کے مشرق اور عراق کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ اسکا زیادہ حصہ پہاڑی یا محدب ہے۔ جگہ جگہ خانہ بدوشوں کے ڈیرے کھڑے نظر آتے ہیں۔ پہاڑونکی وادیوں میں چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی ہیں جنکی زمین بہت زرخیز ہے۔ چونکہ یہ لوگ جم کر ایک جگہ رہنا

بھیڑ بکریاں چر رہی ہیں۔ گڈریئے انکی چوکیداری کر رہے ہیں۔ یہ جگہ موصل سے زیادہ دور نہیں ہے۔

پسند نہیں کرتے۔ اس لئے زراعت کو زیادہ ترقی نہیں ہوسکی۔ یہاں کے قدرتی مناظر بہت خوب ہیں دریا، چشمے، ہرے بھرے درخت پہاڑونکی وادیاں اور برف سے ڈھکی چوٹیاں بہت ہی جاذب نظر ہیں۔

کردستان کا ایک قدرتی منظر۔ یہ ا[illegible] سلیمانیہ کے قریب کے ایک مقام کی

چیکرس

یہ کمرہ بھی پرانے زمانہ کی یادگاروں
سے بھرا ہوا ہے۔

' چیکرس ' جنوبی حصہ جس سے اس مکان
خوبصورتی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ مکان
چلٹرن پہاڑ کی وادی میں واقع ہے اور کئی
صدیوں کا بوجھ سہہ چکا ہے۔

یہ کمرہ خاص تاریخی دلچسپی کا حامل ہے
اسکے آرائشی تختے اور ہسپانوی شاہ بلوط
میز سترھویں صدی کی یادگار ہیں
آتش دان کا تختہ سولھویں صدی کا
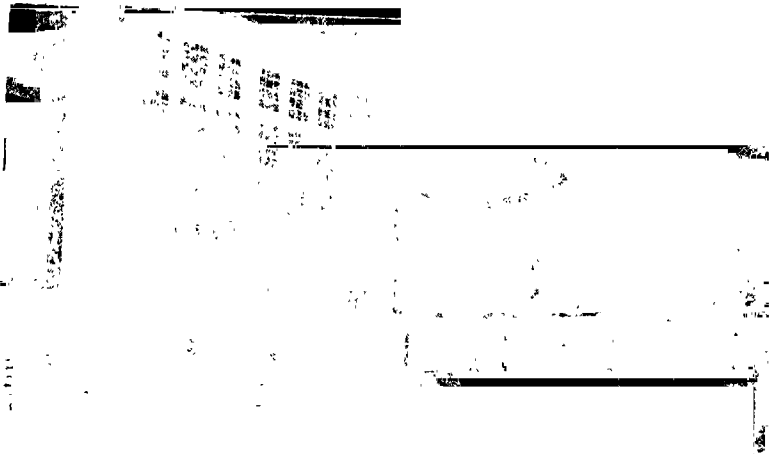
کپڑے کی تہیں بھی سانچہ میں ڈالنے سے پہلے خوب جانچ لی جاتی ہیں۔

هندوستان میں ٹائر بنانے کی صنعت

ملایا میں ربڑ کی بڑی بہتات ہے. هندوستان چونکہ ملایا کے قریب ہی ہے اسلئے اگر موٹروں کے ٹائر بنانے کی صنعت کو یہاں ترقی ہونے لگی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ڈنلپ اور گڈائیر دنیا میں ٹایرونکی سب سے بڑی کمپنیاں ہیں جب یہ هندوستان میں قائم ہوئیں تو گھر گھران

مختلف اجزا کو ملانے سے پہلے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ناپا اور تولا جاتا ہے

کپڑے کی تہ جماکر سانچہ کو بھاپ میں گھسا دیتے ہیں اور پھر اسکی حالت کا بغور معائنہ کیا جاتا ہے۔

ٹائر بنانے میں ہاتھ کا کام زیادہ نہیں ہوتا۔ مشین کے ذریعہ یہ خود بخود ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔

بہرچا [illegible] شروع شروع میں تو ان کمپنیوں
صرف بائسکلوں کے ٹائر ہی بنائے لیکن جلد [illegible] ہر طرح
ٹائر بننے لگے اور ملک کی تمام ضرورتیں ان [illegible] کمپنیوں
پوری ہونے لگیں۔ لڑائی کے زمانے میں ٹائروں کی مانگ
ی ہوگئی تھی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان
د اپنی 'برما' مشرق وسطے اور مشرق بعید کی تمام ضروریات
پورا کرتا رہا۔

اب ہندوستان میں بھی موٹریں بننے لگیں گی تو ظاہر ہے
ٹائروں کی مانگ اور بڑھے گی۔ اسکے ساتھ ہندوستان کی
ر کی صنعت کو بھی خوب ترقی ہوگی اور یہ ترقی ہندوستان
عام ترقی کا ایک خاص جزو ہوگی۔
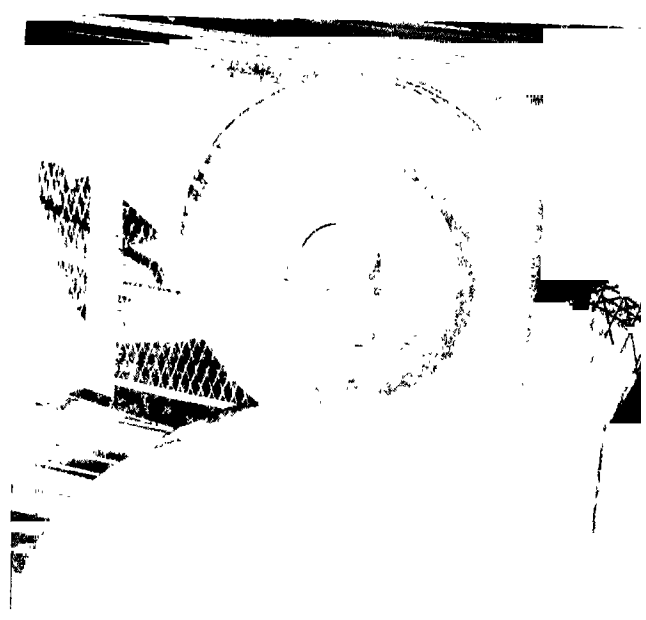
ٹائر کو ایک مشین پر چڑھا کر خوب گھماتے ہیں۔ اسطرح
ٹائر میں اگر کوئی عیب رہ جاتا ہے تو وہ معلوم ہو جاتا ہے

ٹائر کو آخر میں اس ڈھول جیسے بیلن پر چڑھا دیتے
ہیں تاکہ ربڑ کی آخری تہ چڑھ جائے۔

ٹائر بنانے کیلئے ربڑ اور دوسرے اجزا کو بڑی احتیاط
کے ساتھ آپس میں ملایا جاتا ہے

ربڑ اور دوسرے اجزا کو پگھلانے سے پہلے خوردبین سے
بغور دیکھ لیا جاتا ہے

پرمیلا ——— ایک حسین فلمی ستارہ۔

برطانوی وزیراعظم کا دیہاتی مکان

آسٹن موئر

برطانوی وزیراعظم کا دیہاتی مکان "چیکرس" کہلاتا ہے۔ یہ مکان ۱۹۲۱ء میں لارڈ اور لیڈی لی نے قوم کی نذر کیا تھا۔ اسی وقت سے یہ مکان تاریخ انگلستان میں بڑی اہمیت کا حامل چلا آتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے مالک کسی زمانہ میں وہ لوگ تھے جن کے خاندان میں "ایکسچیکر" کی کلرکی وراثتاً چلی آتی تھی۔

یہ مکان لندن کے شمال مغرب میں کوئی تیس میل کے فاصلہ پر چلٹرن پہاڑ پہ واقع ہے۔ اس کے اردگرد کی جاگیر ڈیڑھ ہزار ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں باغات ہیں، کھیت ہیں، اور سبزہ زار ہیں۔ یہ مکان جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے لارڈ لی اور اُن کی بیوی کی پیش کش ہے۔ اس کی یاد مندرجہ ذیل عبارت سے تازہ ہوتی ہے جو ایک کھڑکی کے شیشے پر تحریر ہے۔

"یہ مکان جس کو جائے امن کہنا چاہئے اور جس کی آغوش میں قدیم روایات اور یادگاریں ابتک کروٹیں لے رہی ہیں انگریز قوم کو ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ میں فتح یابی کے موقع پر پیش کیا گیا تاکہ برطانوی وزیراعظم یہاں آرام کیا کرے۔"

لارڈ لی خود سیاسیات کا تجربہ رکھتے تھے۔ اس لئے ان سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا کہ برطانوی وزیراعظم سے زیادہ کام کا بوجھ کسی پر پڑ سکتا ہے۔ لارڈ لی نے صاف طور پر کہہ دیا کہ یہ مکان اس قدر آرام دہ ہے کہ برطانوی وزیراعظم اس کی کشش سے کھنچ کر ہفتہ میں دو دن ضرور یہاں بسر کیا کرے گا۔ ۱۹۲۱ء میں لارڈ لی نے آخری دفعہ مالکانہ حیثیت سے اس کی دہلیز پر قدم رکھا۔ اس کے بعد ۱۱ اکتوبر کو لائڈ جارج نے اس مکان میں اپنی مشہور ضیافت دی۔ اس دن سے آج تک شاہ انگلستان کا وزیراعظم اپنے زبردست ذمہ داری کے فرائض کی انجام دہی کے بعد یہیں آکر سستاتا اور آرام کا سانس لیتا ہے۔

یہ مکان غیر معمولی دلچسپیوں کا حامل ہے۔ یہ لال اینٹوں کا بنا ہوا ہے لیکن صدیوں کے طوفانوں اور سردی کے شدید اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس کی تعمیر اس زمانہ میں ہوئی تھی جب انگریزوں کا شوق قلعہ نما گڑھیوں سے ہٹ کر دیہاتی مکانات کی طرف مائل ہوا تھا۔ اس وقت کے بنے ہوئے اس قسم کے مکانات میں "چیکرس" بہترین تھا۔ اس کا محل وقوع سطح سمندر سے چھ سو فٹ کی اونچائی پر ہے۔ اس کے باغ میں کھڑے ہو کر جنوبی انگلستان کا پورا پورا نظارہ ہو سکتا ہے بلکہ ویلز کے پہاڑ بھی نظر آ جاتے ہیں۔ اس کے باغات جنت نظیر اور گہوارۂ امن ہیں۔

یہ عمارت صدیوں پرانی ہے۔ اس کی قدامت کا صحیح اندازہ ابتک نہیں ہو سکا ہے۔ ڈومسڈے بک میں پہلی مرتبہ برطانوی دیہات کا سروے ہوا تھا۔ اس کتاب میں بھی اس عمارت کا ذکر ہوا ہے۔ گویا ۱۰۸۶ء میں یہ موجود تھی۔ اس کے مختلف مالک اس کو اپنے اپنے مذاقِ تعمیر اور اپنی اپنی مالی حالت کے مطابق بنواتے رہے۔ سب سے زیادہ اہم اضافے اس میں سولہویں صدی (عہد ایلزبتھ) میں ہوئے۔ اس زمانہ میں اکثر لوگ اس کے خواہشمند تھے کہ اپنے کنبہ والوں کو دیہات میں عمدہ عمدہ مکانات کے اندر مستقل طور پر آباد کر دیں۔ عورتیں اپنے مکانات کو سجانے کے لئے خوب خوب پھول بوٹے کاڑھتی تھیں اور مرد جہاں کہیں بیرون ملک جاتے وہاں سے آرائش کے سامان ان کی زیبائش کے لئے لاتے تھے۔

یہ ایک عجیب اور دلچسپ اتفاق ہے کہ یہ مکان صدیوں سے برطانوی حکومت سے براہ راست تعلق رکھتا چلا آ رہا ہے۔ اس کا نام جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس لئے "چیکرس" پڑا کیونکہ عرصہ تک اس کے مالک نسلاً بعد نسلٍ ایکسچیکر کے کلرک رہے۔ خود ایکسچیکر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں حساب کتاب "چیک بورڈ" پر کیا جاتا تھا۔ برطانیہ کا بڑا وزیر مالیات ابتک چانسلر آف دی ایکسچیکر کہلاتا ہے۔ اس مکان کے مالک بڑے عرصہ تک سرکاری ملازمت کرتے رہے۔ آج بھی جو لوگ اس کی سیر کرنے جاتے ہیں ان کی نظروں کے سامنے انگلستان کی قدیم تاریخ کے بہت سے باب وا ہو جاتے ہیں۔ سر جان ہکروک عہد ایلزبتھ میں دارالعوام کا صدر تھا۔ اس کی تقریروں کے مسودے اب تک یہاں موجود ہیں۔ یہاں کے ایک گھنٹہ اور دوسری چیزوں کو دیکھ کر جو اولیور کرام ویل کے ذاتی استعمال میں رہتی تھیں دیکھنے والے کی آنکھوں کے آگے کرام ویل کا بھاری بھرکم مجسمہ گھوم جاتا ہے۔ ۱۶۸۵ء میں تخت نشین ہونے سے پہلے شاہ جیمز دوئم انگلستان کا لارڈ ہائی ایڈمرل تھا۔ چیکرس کے بڑے ہال میں چمڑے سے مڑھا ہوا ایک صندوق رکھا ہے جس میں یہ بادشاہ اپنے سرکاری کاغذات رکھتا تھا۔ ایک دوسرے کمرے میں شاہ چارلس اول اور اس کی ملکہ ہنریٹا ماریا کی تصویر آویزاں ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے اشخاص کی تصویریں یہاں کی دیواروں پر لٹک رہی ہیں جنہوں نے تاریخ انگلستان کے اسٹیج پر اہم پارٹ کئے ہیں۔

لارڈلی کے اس مکان کو برطانوی وزیراعظم کے لئے پیش کرنے سے پہلے بھی اور اس کے بعد سے "چکرس" کا انگلستان کی جدید تاریخ بنانے میں بڑا ہاتھ ہے۔ ۱۹۱۴ء–۱۸ء کی لڑائی کے دوران میں بھی لارڈلی کو حکومت میں بڑا دخل تھا۔ اس لڑائی کے سلسلہ کا ایک بہت ہی اہم مسئلہ اس مکان میں طے ہوا تھا وہ یہ کہ برطانوی اور فرانسیسی وزرائے اعظم نے یہاں اس بات پر اتفاق رائے کیا تھا کہ جرمنی کو ہرانے کے لئے متحدہ فوجی کمان لازمی ہے۔ یہ اسی اہم فیصلہ کا نتیجہ تھا کہ اس لڑائی کے آخر میں برطانوی اور فرانسیسی فوجیں متحد ہو کر لڑیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک نہ معلوم کتنے اور ایسے ہی اہم فیصلے اس مکان میں ہو چکے ہوں گے۔ اس کا صحیح اندازہ لگانا اس وقت مشکل ہے۔

لارڈلی نے صرف اس مکان ہی کی پیشکش نہیں کی بلکہ اس کی دیکھ بھال اور برقراری کے واسطے جاگیر بھی وقف کر دی تھی۔ چونکہ اس بات کا بھی امکان تھا کہ انگلستان کا وزیراعظم مالی حالت کے اعتبار سے بہت ہی معمولی آدمی ہو اور بہت چھوٹے سے درجہ سے اس بڑے عہدے پر پہونچ جائے اس وجہ سے لارڈلی نے اس بات کا بھی انتظام کر دیا کہ ایسی صورت میں برطانوی وزیراعظم کو اپنی جیب سے کچھ خرچ کرنا نہ پڑے۔ لارڈلی کو قوی امید تھی کہ وزیراعظم کا سیاسی مسلک کچھ ہی ہو لیکن وہ اس مکان کی فضا میں سانس لے کر مجبور ہوگا کہ برطانوی طرز حیات اور قدیم روایات کو ضرور قائم رکھے گا۔ اس مکان کے دریچہ کے شیشے پر جو الفاظ تحریر ہیں وہ بالکل صحیح ہیں! "یہ مکان جائے امن ہے اور قدیم روایات کا گہوارہ"، یہ برطانوی روح کے نچوڑ سے اسقدر پر ہے کہ اس کے لئے اس سے اور بہتر الفاظ نہیں ملتے کہ یہ "برطانوی وزیراعظم کے آرام لینے کی جگہ" ہے ۔

جزائر ولندیز کے ثقافتی حالات :

بقیہ صفحہ ۲۳

بعد میں جنگ سے کچھ ہی پہلے اس میں ڈاکٹری اور آرٹس کا بھی انتظام کر دیا گیا تھا۔

تیسرا دور بہرحال ختم ہوگیا ہے۔ اسوقت نہ ارادہ ہے نہ اسکا امکان ہے کہ قبل از جنگ کے حالات کو دوبارہ بحال کر دیا جائے۔ اب ہم کوئی بالکل نئی چیز نہ دیکھیں گے لیکن جو کچھ بھی رونما ہونے والا ہے وہ ان حالات کی ترقی یافتہ صورت ہوگی جو ۱۹۱۶ء میں "پیپلس کونسل" کے قیام کے وقت تھے۔ اول اول اسمیں ڈچ لوگوں کی اکثریت تھی لیکن ۱۹۲۷ء میں ولندیزیوں کی اکثریت تسلیم کی گئی ۱۹۲۲ء کے ڈچ دستور کے مطابق "نوآبادیات" کا لفظ اڑا دیا گیا۔

ان تمام اقدامات کے پس منظر میں صرف یہ امر کارفرما تھا کہ ولندیز کو رفتہ رفتہ ڈچ کامن ویلتھ کا برابر کا حصہ دار بنا دیا جائے۔ ۱۹۴۲ء میں جاپان کے حملہ کے وقت ملکۂ ہالینڈ نے اپنی ریڈیائی تقریر میں بتایا تھا کہ جاپان کی شکست کے بعد وہ ولندیز میں کس پالیسی پر عمل کریں گی۔ اس پالیسی کا لب لباب یہ تھا کہ وہ ولندیز کو بالکل اپنا ہمسر بنانا چاہتی ہیں۔ یہ کہ ملکہ کا فی الواقع ارادہ وہی تھا جسکا انھوں نے اعلان کیا تھا اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈچ حکومت کے لندن میں قائم ہوتے ہی انھوں نے جاوا کے ایک بہت بڑے سیاست دان کو لندن مدعو کیا اور اس کو اپنی کابینہ میں پورے اختیارات کے ساتھ وزیر بنا دیا۔

ولندیز کے ثقافتی درجہ اور حیثیت کا موضوع بہت وسیع ہے لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے اس مختصر سے مقالہ میں اس موضوع کی اہمیت کو کسی حد تک واضح ضرور کر دیا ہے۔ آپ اسکی قدیم تاریخ پر نظر ڈالکر خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آئندہ چل کر اس کی صورت حال کس قدر خوش آیند اور امید افزا ہوگی۔ ("سوویٹ یونین نیوز" سے ماخوذ)

افسانہ

ایک ماشہ یورے نیم

ظفر عمر

دنیا کی تاریخ میں کوئی واقعہ ایسا نہیں پایا جاتا جسے حالات زمانہ پر ایسا گہرا اور دور رس اثر ڈالا ہو جیسا کہ جاپان کے ایک شہر پر ایٹم بم کے پڑنے سے ہوا۔ جاپان جیسی مغرور اور جنگجو قوم جس کی فوجوں نے منچوریا سے لیکر برما تک آندھی مینہ کی طرح بڑے بڑے ممالک فتح کر لئے تھے یکایک شکست ماننے اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی اور مشرق اقصیٰ کی جنگ جو ابھی کتنی سال جاری رہتی یکایک ختم ہو گئی۔ جاپانی قوم جو تمام ایشیا پر حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی، چند چھوٹے جزیروں میں محصور ہو کر رہ گئی۔ وہ ملک جس پر تین ہزار برس سے کسی اجنبی قوم نے فاتح کی حیثیت سے قدم نہ رکھا تھا آج یورپ اور امریکہ کی فتحمند قوموں کے قدموں سے پامال ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ ایک امریکن طیارہ نے ہیروشیما شہر پر ایک بم گرا یا جسکے پھٹنے سے قیامت صغریٰ برپا ہو گئی۔ شہر کی عمارتیں یا تو پاش پاش ہو گئیں یا زمین میں دھنس گئیں۔ لوہے کے گرڈر اور شہتیر پانی کی طرح بہ گئے۔ مرد، عورت، بچے اور مویشی جھلس کر مر گئے۔ اس حادثہ کی خبر پاکر دنیا حیرت زدہ ہو گئی۔ اخباروں میں ہزارہا مضامین ہر نقطۂ نظر سے لکھے گئے۔ کسی نے کہا کہ یہ شیطانی آلہ دنیا کی متمدن زندگی کو برباد کرکے رہیگا۔ آئندہ جنگ میں لڑنے والے ایک دوسرے کے ممالک پر ایٹم بم پھینک کر تباہ و برباد کر دینگے۔ دوسرے نے لکھا کہ یورپ اور امریکہ کے سائنسداں جنہوں نے اس شیطانی آلہ کی ساخت میں حصہ لیا ہے قابل نفرت و ملامت ہیں۔ پادریوں نے مذمت کی، مولویوں نے قرب قیامت کی پیشنگوئی کی کہ قہر خدا اسی طرح فضاء آسمانی سے نازل ہو کر دنیا کو پاش پاش کر دے گا لیکن چرچل جیسے سخت دل سیاست دانوں نے فخر کے ساتھ کہا کہ ایٹم بم کا استعمال دشمن پر فتح پانے کے لئے حق بجانب ہے۔

ایٹم بم کی ماہیت و ساخت پر سنجیدہ مضامین لکھے گئے اور دعویٰ کیا گیا کہ یہ قوت ایٹم (ذرّہ) کو پھاڑ کر بنی نوع انسان کی بہبودی کے کاموں میں استعمال کی جائیگی۔ بھاپ، بجلی اور گیس کے بجائے جدید قوت سے کام لیا جائے گا، دور دراز کا سفر جو ریلوں اور ہوائی جہازوں سے دنوں اور گھنٹوں میں طے ہوتا ہے منٹوں میں ہوا کرے گا، جو معدنیات بڑے بڑے پہاڑوں کے نیچے دفن ہیں باسانی سطح زمین پر لائی جائیں گی اور انسان کی خوشحالی اور فارغ البالی میں اضافہ کرینگے اور زمین کا سینہ پھاڑ کر خشک ریگستانوں میں پانی کے چشمے نکالے جائینگے جنسے وہ لالہ زار بن جائینگے۔ غرضیکہ تمام دنیا اس نئی قوت کی ماہیت معلوم کرنے اور اس کے نفع و نقصان کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔ سائنس دانوں نے بیان کیا کہ قدرت نے ایٹم (ذرّہ) میں ہزاروں من ڈائنامیٹ اور لاکھوں کیلوواٹ بجلی کی قوت پنہاں رکھی ہے، لیکن ایٹم کے پھاڑنے کی ترکیب کسی کو معلوم نہ تھی۔

چند سال ہوئے ایک نیا عنصر یورے نیم دریافت ہوا جو دھاتوں میں سب سے زیادہ وزنی ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی میں ایسی صلاحیت ہے کہ ایٹم کو پھاڑنے میں اس سے مدد لی جا سکتی ہے۔ چنانچہ جرمنی، انگلستان اور امریکہ کے سائنس داں کئی سال سے اس نئے عنصر پر تجربات کر رہے تھے اور اب اس سے کام لینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی ایجاد جسکی طرف تمام دنیا کی توجہ مبذول ہو چہ روں کے کلب کی توجہ سے کب بچ سکتی تھی۔ کلب کا ایک غیر معمولی جلسہ طلب کیا گیا اور تقریباً تمام ممبروں نے شریک ہو کر اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ راجہ سعدآباد پریزیڈنٹ کلب نے جلسہ کا افتتاح کرتے وقت موقع کی اہمیت کے لحاظ سے ایک سنجیدہ اور طویل تقریر میں ممبران کلب کو ایٹم بم اور یورے نیم کی ماہیت سے آگاہ کیا اور ان مضامین کا خلاصہ پیش کیا جو دنیا کے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ ایک بے چین ممبر نے قطع کلام کرنے کی معافی چاہ کر پریزیڈنٹ سے کہا "کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایٹم بم چرا کر لایا جائے اور ممبران کلب کی تفریح طبع کے لئے ایسا خطرناک اور شیطانی آلہ پیش کیا جائے؟ اگر کسی حادثہ سے پھٹ گیا تو نہ صرف ممبران کلب بلکہ ہمارا خوبصورت اور تاریخی شہر دہلی پاش پاش ہو کر دنیا کے نقشہ سے غائب ہو جائے گا۔ دہلی کی جامع مسجد، لال قلعہ، قطب صاحب کی لاٹ، فیروز شاہ کا کوٹلا اور دوسری تاریخی عمارات جنہیں دیکھنے کے لئے سیاح آتے ہیں اور ہمارے ملک کے لئے باعث ناز ہیں، دھوئیں کی طرح اڑ جائیں گے۔ وائسرائے کا محل، اسمبلی اور سکریٹریٹ کی عمارات جس میں انتظام ملک کے کاغذات اور راشلہ محفوظ ہیں مع اعلیٰ افسران کے سب غائب ہو جائیں گے اور تمام ملک پر اس کا اثر پڑے گا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کلب جو محض تفریح طبع اور چوری کے خطرات سے لطف اٹھانے کے لئے قائم کیا گیا ہے ایسے خطرناک کام میں شریک نہ کیا جائیگا۔"

ممبران کلب نے "ہیئر ہیئر" کی آواز بلند کرکے موقع کی سنجیدگی کی طرف توجہ دلائی۔ راجہ صاحب سعدآباد نے مسکرا کے کہا:—

"معزز ممبران کلب! آپ اطمینان رکھیں، میں ممبران کلب کے سامنے ایسی خطرناک تجویز پیش نہ کروں گا۔ اول تو ایٹم بم کا چرانا ناممکنات سے ہے۔ اس کے بنانے کا کارخانہ دنیا میں صرف ایک ہے اور وہ امریکہ میں واقع ہے۔ کارخانہ کی حفاظت کیلئے فوج کا سخت پہرہ رہتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی ممبر کا امریکہ جاکر ایٹم بم کا چرانا ناممکنات سے نہیں تو سخت مشکل اور خطرہ کی بات ہے۔ میں آپ کی توجہ اخبار سرگزشت کے مضمون کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر پٹیل دس سال ہوئے انگلستان سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے گئے تھے۔ انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی میں ڈاکٹر سر رتھر فورڈ کی شاگردی اختیار کی۔ یورے نیم کچھ دن پہلے دریافت ہوئی تھی اور پروفیسر رتھر فورڈ اسپر اپنی لیبوریٹری میں تجربات کر رہے تھے۔ اس ہونہار ہندوستانی نوجوان کو طلب علم کا شائق پاکر انہوں نے مسٹر پٹیل کو یورے نیم اور ایٹم کی تفتیش میں اپنا شریک کار بنالیا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر مسٹر پٹیل ہندوستان واپس آئے اور اپنے مہربان استاد کی عنایت سے ایک ماشہ یورے نیم اپنے ساتھ لائے تاکہ جو تجربہ انہوں نے کیمبرج میں شروع کیا تھا علیگڑھ میں جاری رکھیں۔ ایٹم بم کے بنانے میں جو کامیابی ہوئی ہے اسکے متعلق پروفیسر پٹیل ہندوستانی سائنس دانوں اور طلبا یونیورسٹی کے سامنے یورے نیم کی ماہیت پر عنقریب لکچر دینے والے ہیں۔ میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ یہ ماشہ بھر یورے نیم جو پروفیسر پٹیل کے قبضہ میں ہے اور یہ عجیب وغریب عنصر جس نے دنیا کا نقشہ بدل دیا ہے ممبرانِ کلب کی تفریح کے لئے آئندہ جلسہ میں پیش کیا جائے۔"

حاضرین جلسہ نے تالیاں بجاکر اور "ضرور ضرور" کہکر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ صدر جلسہ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ کرنل بکرم سنگھ جو کلب کا ممبر ہونا چاہتے ہیں اور جنکے داخلہ کی متعدد ممبران نے تائید کی ہے، علیگڑھ سے یورے نیم چرا کر لائیں اور بطور فیس ممبری آئندہ جلسہ میں پیش کریں۔

کرنل بکرم سنگھ راجپوتانہ کی ایک مشہور ریاست کے رکن تھے۔ کرکٹ اور پولو کے نامی کھلاڑی۔ ابھی حال میں جرمنی کی جنگ ختم کرکے ہندوستان واپس آئے تھے، دہلی کی خاموش زندگی سے جلد سیر ہوگئے اور چوروں کے کلب کا حال معلوم کرکے اس میں شامل ہونے کے خواہشمند ہوئے۔ کلب کے غیر معمولی جلسہ میں شرکت کے بعد یورے نیم چرا کر اس معزز کلب کی رکنیت حاصل کرنے کی امید پر بہت مسرور ہوئے۔ کئی دن یورے نیم کی خاصیت اور ماہیت کے مطالعہ میں صرف کرکے علیگڑھ پہونچے۔

اندھیری رات تھی بارش ہورہی تھی، موقع مناسب سمجھکر پروفیسر پٹیل کی لیبوریٹری کے گرد چکر لگایا۔ دبے پاؤں برآمدہ میں پہونچا اور لیبوریٹری کے دروازہ کو کھلا پاکر بہت خوش ہوا۔ احتیاط سے کمرہ میں داخل ہوا۔ لیکن کمرے میں دو تین قدم بھی نہ گیا تھا کہ دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ جیب سے برقی ٹارچ نکال کر روشنی کی تو سوائے اس دروازہ کے نکاس کا کوئی راستہ نہ پایا۔ دروازہ کھولنے کی ہر چند کوشش کی مگر ناکامیاب رہا۔ سامنے میز پر بے شمار شیشیاں اور آلات کیمیا رکھے تھے۔ ایک خاص قسم کے ظرف کو جسپر "یورے نیم" لکھا تھا علیحدہ تپائی پر رکھا دیکھکر اپنی قسمت پر نازاں ہوا۔ احتیاط کے ساتھ دہات کو نکالکر ایک ڈبیہ میں بند کیا اور جیب میں رکھ دیا تھا کہ زور سے گھنٹی بجی۔ چونک پڑا اور ہر طرف نظر دوڑائی گھنٹی برابر بج رہی تھی۔ ایک چھوٹی میز پر ٹیلیفون کا آلہ رکھا تھا۔ ڈرتے ڈرتے آلہ ہاتھ میں لیکر کان سے لگایا۔ گھنٹی بجنا بند ہوگئی۔ کسی نے پوچھا "تم کون ہو؟ ....." بکرم سنگھ نے کچھ جواب نہیں دیا۔

"تم جواب نہ دوگے تو ابھی پولیس کو بلاکر تمہیں گرفتار کروادوں گا۔"

بکرم سنگھ کو اپنی نازک حالت کا احساس ہوا اور اپنے آپ کو چوہے کی طرح پنجرے میں بند پاکر جواب دینے پر مجبور پایا۔ پھر آواز آئی "جلد بتاؤ کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟ ورنہ ابھی پولس کو بلاتا ہوں"،

"اور تم کون ہو؟" بکرم سنگھ نے دریافت کیا۔

"میں ہوں پروفیسر پٹیل۔ تم سچ سچ نہ کہوگے تو پولس کے حوالہ کردوں گا۔"

"میں ایک فوجی افسر ہوں۔ آپ سے ملنے آیا تھا۔ ضروری کام تھا۔"

"تم فوجی افسر ہو تو غلط بیانی سے کام نہ لوگے .... میرے سوالات کا صحیح جواب دو۔"

"مجھے منظور ہے بشرطیکہ آپ پولیس کو نہ بلائیں۔"

"میں عرصے سے ایک اہم اور خطرناک تجربہ میں مصروف ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ کسی انسان پر یورے نیم کے اثرات کا حال معلوم کیا جائے۔ مجھے انتظار تھا کہ کوئی مجرم لیبوریٹری میں داخل ہو اور مجھے اس کی جان کی پرواہ کئے بغیر بعض ضروری تجربات کرنے کا موقع مل جائے۔ میں خوش ہوں کہ آج ایک مضبوط فوجی افسر تجربہ کرنے کے لئے مل گیا ہے۔ اور میرے قابو میں ہے۔"

"آپ کو تجربہ کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو میں کل کسی وقت آپ کے پاس آؤنگا۔ اس وقت مجھے اس کال کوٹھری سے نکالئے جسمیں میرا دم گھٹا جاتا ہے"

"یہ دھوکا کسی اور کو دینا۔ تم آزاد ہونا چاہتے ہو تو میری باتیں غور سے سنو اور

صحیح صحیح جواب دو۔ کتاب یادداشت اور قلم میرے سامنے ہے میں لکھنا شروع کرتا ہوں۔" بہتر ہے۔ سوال کیجئے۔ میں جواب دوں گا مگر یاد رہے کہ اپنے تجربات کے ضمن میں میری جان کو خطرے میں ڈالا تو تمہاری خیر نہیں۔"

"تجربہ خطرے سے خالی نہیں لیکن تم فوجی افسر ہو خطرہ سے ڈرنا کیا معنی! اچھا بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام سے تمہیں کیا غرض؟ تجربہ بغیر نام معلوم کئے بھی ہوسکتا ہے۔ یہ کافی ہے کہ میں ایک فوجی افسر ہوں!"

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"۳۵ برس کے لگ بھگ۔"

"تمہاری قویٰ اور جسمانی کیفیت؟"

"قویٰ مضبوط سپلوا ورہاکی کھیلتا ہوں جسم پہلوان کے ایسا سمجھو۔"

"تمہارا دل کمزور تو نہیں ہے؟"

"دل کمزور ہوگا تمہارا جو کتاب کے کیڑے ہو میں سپاہی میرا دل شیر کی طرح قوی ہے۔"

"شکریہ احتیاط سے اس طرف کا ڈھکنا ہٹاؤ جسپر یورے نیم لکھا ہے۔"

"ڈھکنا ہٹا دیا۔ پھر کیا کروں؟"

"کچھ نہیں ایک منٹ انتظار کرو۔" قدرے انتظار کے بعد "تمہاری نبض کی کیا حالت ہے؟"

"کچھ تیز چلنے لگی ہے"

"سامنے دیوار پر آئینہ ہے۔ اس میں دیکھو اور بتاؤ تمہاری آنکھیں کیسی ہیں؟"

"ارے یہ کیا ہوا! آنکھوں کی سفیدی پر سرخ ڈورے نظر آرہے ہیں۔"

"میرا خیال صحیح تھا۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارے نبض کی کیا حالت ہے؟"

"سانس تیز ہوگئی ہے۔ اچھا اپنا تجربہ ختم کرو، میری طبیعت گھبرانے لگی ہے۔" بس اتنی ہی دیر میں؟ تمہیں اپنی فوجی زندگی کا خیال کرنا چاہیئے ابھی تم نے اپنے آپکو شیردل کہا ہے۔"

"یہ بکواس ختم کرو۔ باقی تجربہ پھر کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کرو اور مجھے یہاں سے نکالو۔ میری آنکھیں سرخ ہوگئی ہیں پتلیاں پھیلتی جاتی ہیں۔"

"اور تمہارا جسم کیسا ہے۔ آستین چڑھاکر غور سے دیکھو۔"

"ہائے یہ کیا ہوا، جلد پر سیاہی مائل چتے پڑگئے ہیں، تا خون سیاہ ہوچلا ہے۔"

"اس اثر کی مجھے امید نہ تھی۔ ٹھہرو لکھ لوں،...... ہاں یہ تو بتاؤ یہ نشان کتنے بڑے ہیں؟"

"تمہیں لکھنے کی پڑی ہے میرا جسم سیاہ ہوتا جارہا ہے، دم گھٹنے لگا، زبان خشک ہے، خدا کے لئے مجھے یہاں سے نکالو۔"

"شیردل کرنل اور یہ کمزوری!"

"مزاق نہ کرو آزاد ہوکر تمہارا ٹینٹوا نہ دبایا ہو تو بات ہے۔"

"اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ تہذیب سے باتیں کرو۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ نبض کیسی ہے؟"

"بلیوں اچھل رہی ہے، تم جلد دروازہ نہ کھولوگے تو میری آنکھیں باہر نکل پڑینگی جسم پھٹا جاتا ہے، کمبخت دروازہ کھول۔"

پروفیسر نے قہقہہ لگایا، اور دریافت کیا "تمہاری بینائی کا کیا حال ہے؟"

"مجھے دھندلا دکھائی دے رہا ہے کیا بینائی جاتی رہیگی؟ ——

— ارے یہ کیا ہوا، میرے کان پھٹے جاتے ہیں سینہ میں سرسراہٹ ہے، معلوم ہوتا ہے خون پھیپھڑوں سے باہر نکلنے کی کوشش میں ہے، اور کوئی دم میں ناک اور کان سے نکلنے لگے گا........ ارے ارے......"

دھڑاکے کی آواز آئی گویا ٹیلیفون کا آلہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور کرنل زمین پر گر گیا۔ پروفیسر سخت پریشان ہوا اور جلد جلد لیبورٹری کے دروازے پر پہونچا۔ جیب سے کنجی نکال کر دروازہ کھولا مگر گھبراہٹ میں کنجی قفل میں لگی چھوڑ دی۔ کمرے میں اندھیرا پایا۔ دو قدم اندر آیا تھا کہ دروازہ بند ہوگیا۔ برقی روشنی کا سوئچ دبایا۔ کمرہ منور ہوگیا مگر یہ دیکھکر حیران ہوا کہ کرنل کمرے میں نہیں ہے۔ غصہ اور پریشانی کی انتہا نہ تھی دروازہ کنجی کے بغیر کھل نہ سکا۔ کنجی باہر چھوڑ آیا تھا کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ پروفیسر نے آلہ کان سے لگایا کسی نے کہا:-

"پروفیسر صاحب، بندگی کہئے۔ مزاج کیسا ہے؟"

"تم کون ہو اور کہاں سے بول رہے ہو؟"

"کیا آپ میری آواز نہیں پہچانتے؟ میں وہی کرنل ہوں جسپر تھوڑی دیر ہوئی آپ تجربات کررہے تھے۔"

"تم یہاں سے زندہ کیسے نکلے۔ تمہاری ناک اور کان سے خون نکلنے والا تھا اور قریب المرگ تھے۔"

"تمہاری حماقت کی وجہ سے جب تم نے گھبراکر لیبورٹری کا دروازہ کھولا، میں پٹ سے لگا کھڑا تھا۔ تم اندر داخل ہوئے قبل اس کے کہ دروازہ بند ہو میں باہر نکل گیا۔"

ظرف کا ڈھکن اٹھاکر دیکھا تو یورے نیم وہاں نہ تھا۔

"اور میرا یورے نیم کہاں رکھا ہے؟"

"ہوتا کہاں، میری جیب میں محفوظ ہے۔ میں اسکو چرانے آیا تھا۔"

"تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یورے نیم میں جب نیوٹرون شامل کر دئے جائیں تو اس میں نیم کو پھاڑنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی نامعلوم شعاعیں جسم انسانی میں داخل ہو کر مہلک اثر پیدا کرتی ہیں۔ اگر تم نے بے احتیاطی سے کام لیا تو معلوم نہیں کہ کیا حادثہ پیش آئے۔ تمہاری جان کی خیر نہیں، خبردار"

"اس تنبیہ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں بالکل صحیح ہے۔ میں یہاں آنے سے قبل اس کے متعلق تمام معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ بے شک جب یورے نیم میں نیوٹرون داخل کر دئے جائیں تو وہ خطرناک شے بن جاتی ہے۔ اس کی شعاعیں ایتھر (اثیر) کی طرح ہر شے سے گذر جاتی ہیں۔ لیکن قدرت نے ہر زہر کیلئے تریاق اور ہر خطرہ کے لئے مدافعت کا سامان پیدا کیا ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ یورے نیم کی شعاعیں لوہا فولاد ہوا پانی ہر شے سے گذر جاتی ہیں لیکن اگر یورے نیم کے ٹکڑے کو موم جیسی نرم چیز میں لپیٹ دیا جائے تو اس کی شعاعوں کے مہلک اثر سے جسم انسانی مامون و محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس خیال سے میں اپنے ساتھ موم کے موٹے استر کی ڈبیہ لایا تھا اور لیبارٹری میں داخل ہوتے ہی یورے نیم کو ڈبیا میں بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا تاکہ یہ سمجھ کے کہ تم بڑے بدمعاش اور مکار آدمی ہو!"

"پروفیسر صاحب، آپ کی گفتگو تہذیب کے معیار سے گری جاتی ہے جو آپ کی شان پروفیسری کے شایان نہیں ہے۔ ہاں یہ تو بتائیے کہ آپ کی نبض کیسی ہے؟"

"چپ بدمعاش!"

"پھر وہی بدتہذیبی۔ سامنے آئینہ میں دیکھئے اور بتائیے کہ آپکی آنکھوں کی رنگت کیسی ہے۔ جلد پر سیاہ نشان تو نہیں پڑے ہیں؟"

"اچھا سنو۔ مذاق نہ کرو۔ اگر تمہیں روپے کی ضرورت ہے تو میں معقول رقم تمہیں دے سکتا ہوں۔ بشرطیکہ یورے نیم جو تمہارے کسی کام کی نہیں ہے واپس کر دو۔ چند روز میں مجھے اس کی ماہیت اور ایٹم بم کی ساخت پر یونیورسٹی میں لکچر دینا ہے۔"

"پروفیسر صاحب معاف کیجئے مجھے روپیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں ہم چوری کے مال کو ۲۴ گھنٹے کے اندر واپس کر دیتے ہیں مجھے آج شام کو یورے نیم چوروں کے کلب میں پیش کرنا ہے"

"کلب بہت قسم کے ہوتے ہیں مگر چوروں کا کلب کیسا جو چوری کا مال واپس کر دیتے ہیں۔ تم مذاق کرتے ہو"

"جی نہیں۔ مذاق کی بات نہیں۔ ہمارا کلب عجیب جماعت ہے۔ اس کے ممبر دنیا بھر کے لہو و لعب سے سیر ہو گئے ہیں اور معمولی مشاغل میں چنداں تفریح حاصل نہیں ہوتی۔ ہمارے کلب کے ممبروں میں والیان ملک اسمبلی اور کونسل کے آنریبل ممبر، فوج اور ریل کے اعلیٰ افسر، ہر قسم کے لوگ شامل ہیں اور محض دل بہلانے اور چوری کے خطرات سے لطف اٹھانے کے لئے یہ کلب قائم کیا گیا ہے۔ چوری کا مال کلب میں پیش کرنے کے بعد واپس کر دیتے ہیں۔ آپ کو ہمارے کلب کی عجیب و غریب کارستانیاں معلوم کرنے کا شوق ہے تو ایک چھوٹی سی کتاب "چوروں کا کلب" پڑھئے جسے آپ کی یونیورسٹی کے ایک ولایت پلٹ نے تالیف کی ہے۔ آپ بہت محظوظ ہوں گے۔ اچھا اب صبح ہونے والی ہے۔ گاڑی کا وقت قریب ہے۔ میں رخصت ہوتا ہوں۔ بندگی"

سوز فطرت — ادیب مالیگانوی

جسکے سینے میں نہاں ذوقِ کلیمانہ نہیں
اسکی آنکھوں کیلئے جلوۂ جانانہ نہیں

سوز فطرت کو مرے نسبت پروانہ نہیں
ہیں نری بزم کے آداب سے بیگانہ نہیں

ایک سادہ سی حقیقت ہے مرا جذبۂ عشق
کوئی رنگین کہانی نہیں، افسانہ نہیں

جو ترے نام پہ مرنے میں سکون چین تکا
میں لوائے دولتِ دنیا" ترا دیوانہ نہیں

ٹال جاتا ہو اسے سن کے زمانہ اکثر
جس حقیقت میں کوئی شوخیٔ افسانہ نہیں

کشش حسن سہی رہتا نہیں غالب دل پر
اپنے انجام سے ورنہ کوئی بیگانہ نہیں

گھات میں اسکی ہیں فرعونِ زمانہ کتنے
زندگی جسکی زمانے میں کلیمانہ نہیں

کام آیا ہے مرا خونِ جگر میرے لئے
مجھ پہ احسان ترا، ساقی میخانہ نہیں

وسعتِ دہر کو میں چھان چکا ہوں یارو!
اور کیا؟ میرے جنوں کیلئے ویرانہ نہیں

بے خودی شرط ہے انوارِ حقیقت کیلئے
کیا وہ اس راز کو سمجھے گا جو دیوانہ نہیں

عشق برباد غم و حسن خداوند نشاط
جسکا عنوان نہ تجھ میں وہ افسانہ نہیں

پھر یہ بیتابیٔ پیہم، یہ کشاکش کیا ہے
وہ کوئی شمع نہیں، میں کوئی پروانہ نہیں

پھونک ڈالا ہمیں اک شعلۂ پنہاں نے ادیب
ورنہ بے شمع تو جلتا کوئی پروانہ نہیں

مدورا

ایل این گیبل

مدراس میں آبادی اور وسعت کے لحاظ سے مدورا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہ کئی حیثیتوں سے پیریکلز کے زمانہ کے ایتھنز اور جدید عہد کے پیرس سے مشابہ ہے۔ یونان میں جو ایتھنز کی حیثیت تھی اور جو پچھلے دنوں تک یورپ میں پیرس کی حیثیت رہی ہے وہی حیثیت جنوبی ہندوستان کے تاملوں کے لئے مدورا کی تھی۔ یہ تامل تعلیم اور علم کا مرکز تھا۔ جو کاغذات اس وقت ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں تامل کا تیسرا مشہور اور شاندار سنگم تھا۔ مدورا کے قدیم راجاؤں کی بنوائی ہوئی چند عجیب و غریب اور خوبصورت عمارتیں اب تک موجود ہیں لیکن ان سے امتداد زمانہ کے آثار نمایاں ہیں۔ مدورا کے مندر بہت مشہور ہیں اور ان میں فن تعمیر اور مجسمہ سازی کے نادر نمونے موجود ہیں۔ یہ مجسمے مدورا کے قدیم راجاؤں کے ہیں۔ اس کے علاوہ پانڈوؤں کی قدیم راجدھانی ہونے کی وجہ سے اس کی تاریخی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ محلوں اور مندروں میں اکثر جگہ قدیم لکھائی اور کھدائی ملتی ہے جو تحقیقی طالب علم اور عالم کے لئے دلچسپی کا سامان ہے۔ آجکل صنعتی ترقی کی وجہ سے بھی مدورا کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ یہاں کپڑے کے تین بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ محنت کے جدید مسئلوں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور مدورا کو اپنی صنعتی اہمیت ہی کے لحاظ سے ان مسئلوں کو حل کرنا ہوا۔ یہاں آرٹس کے دو کالج ہیں جو تعلیم اور تمدن کی قدیم روایات پر قائم ہیں۔ غرضکہ مدورا بڑا اہم شہر ہے اس لئے جو شخص بھی جنوبی ہندوستان کے متعلق اچھی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے اسے مدورا کی ضرور سیر کرنی چاہئے۔

یہ مشہور تاریخی شہر ویگائی ندی کے دونوں جانب واقع ہے۔ شہر کا زیادہ حصہ ندی کے جنوب میں ہے اور تقریباً ساری مشہور عمارتیں اسی میں ہیں۔ جدید مدورا اپنے حکام کی محنت، قابلیت اور منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے جو اس کے انتظام کے ذمہ دار ہیں۔ شہر میں چوڑی اور صاف سڑکیں ہیں جن میں سے ہر ایک عمدہ حالت میں رکھی جاتی ہے۔ منصوبہ بندی میں اس کی مثال سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اگر ہوائی جہاز سے نظر ڈالی جائے تو یہ شہر نہایت دلکش نظر آتا ہے۔ سڑکیں مٹیالے رنگ کے فیتے اور ندی، جو شہر سے پیچ و خم کھاتی ہوئی گزرتی ہے، روشنی کا دھارا سا دکھائی دیتی ہے۔

آیئے اس شہر کے نام پر غور کریں۔ ایک مستند رائے ہے کہ آریوں نے جو شمالی متھرا سے یہاں آئے تھے اس کا نام متھرا رکھا تھا مگر کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا نام کلاشیکھر پانڈیہ نے رکھا۔ اس نے شیو جی کا ایک مندر بنوایا اور اس کے گرد چھوٹی سی نو آبادی قائم کی جس کا نام مدورا رکھا گیا۔ مدورا امرت کو کہتے ہیں جو شیو جی کے رقص کے وقت بکھر گیا تھا۔ بہر حال شہر کے نام کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔

اس کی اہم عمارتوں میں ایک شاندار عمارت شہر کے وسط میں مشہور میناکشی مندر ہے جو سالوں کی منصوبہ بندی اور مستقل محنت سے وجود میں آیا۔ مندر کا حسن تعمیر ناقابل بیان ہے۔ ماہر فن کی نظر پڑتے ہی اس کا حیرت میں رہ جانا یقینی ہے کیونکہ اس کی تعمیر میں اس قدر ہوشیاری سے کام لیا گیا ہے کہ اس کا حسن بیان نہیں کیا جا سکتا بلکہ محض دیکھ کر لذت حاصل کی جا سکتی ہے۔ مندر میں ہزار ستونوں کا ہال، سنہری کمل تالاب، اور گنپتی کی مورتی ہے۔ اسی قدیم مندر میں پڈو منڈیم (نیا مندر) بھی ہے۔ اس میں مختلف چیزوں کی دکانیں ہیں۔ پڈو منڈیم کے بیچ میں ایک وسیع ہال ہے جس میں مدورا کے نائک راجاؤں کے مجسمے ہیں۔

شہر کے جنوب مشرق میں ترومالائے نائک کا بنوایا ہوا مشہور محل ہے۔ یہ محل تنجور کی راجکماری کے لئے بنوایا گیا تھا جس کی مدورا کے راجہ سے شادی ہوئی۔ اونچے اونچے ستون، موٹی موٹی دیواریں، بہت سے صحن اور ایوان اور تیرنے کے تالاب نہایت خوبصورت ہیں جنہیں ہندوستان کے ارضی فن تعمیر کے عجیب و غریب نمونے سمجھنا چاہئے۔

میناکشی مندر سے کوئی ایک میل جنوب مشرق میں مریامن تالاب ہے۔ اسے ایک چھوٹی سی جھیل سمجھنا چاہئے جس میں سال میں ایک مرتبہ کشتی کھینے کا تہوار منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کے اب تک جاری رہنے کے ذمہ دار رسم و روایت ہیں۔ کشتی کھینے کے تہواروں میں سب سے اہم مریامن تالاب والا تہوار ہوتا ہے جو اپریل کے مہینے میں پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شیو جی اور میناکشی کی ملاقات کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ تہوار اس قدر شان و شوکت سے منایا جاتا ہے اور اتنا اہم ہوتا ہے کہ ساری پریزیڈنسی سے ہزارہا آدمی دیکھنے آتے ہیں۔ ان دنوں مدورا میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ ان سے تہوار کی ہر دلعزیزی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک اور تہوار جنوری میں منایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی اہم تہوار ہے لیکن نہ یہ اتنا خوبصورت اور موثر ہوتا ہے اور نہ اس میں اتنے لوگ شریک ہوتے ہیں۔

شہر کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ مدورا پانڈیائی راج کا صدر مقام تھا جس میں رامند، ٹینی ویلی اور مدورا شامل تھے۔ تقریباً دوسری صدی تک پانڈیہ راجہ اس پر آزادی سے راج کرتے رہے۔ ان کی طاقت تیسری اور دسویں صدی کے درمیانی زمانہ میں تنزل پذیر رہی۔ آخر پالو راجاؤں نے ان پر غالب آ کر انہیں بھاری خراج ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ پالو راجاؤں کے بعد چولا پانڈیہ خاندان والوں کی حکومت قائم ہوئی جو تین سو برس تک حکمران رہے۔ اس کے بعد اس پر حملے ہوتے رہے اور مداخلتیں ہوئیں غرض یہ عموماً دوسروں ہی کے زیر فرمان رہا۔ چودھویں صدی میں اس پر ملک کافور نے حملہ کیا اور راجدھانی کو غیر محفوظ دیکھ کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کے کچھ

نوٹ:- یہ مضمون "ماڈرن ریویو" بابت ستمبر ۱۹۴۵ء سے ماخوذ ہے۔ اس کے لئے "ماڈرن ریویو" اور مضمون نگار مسٹر ایل۔ این۔ گیبل کی اجازت حاصل کر لی گئی ہے۔

لانہ ببرو جایا نگار نے مدورا سے مسلمانوں کو نکال کر سلطنت میں پانڈیا کی گورنر مقرر کردیے لیکن ۱۵۶۰ء میں ویر شیکھر چولا نے پانڈیوں کو شکست دے کر مدورا پر قبضہ کر لیا اور پانڈیا فوجیا نگر کے شہنشاہ سے پناہ کی درخواست کی شکست خوردہ پانڈیوں کی مدد کے لئے ناگما نائک کو بھیجا گیا لیکن اس نے راجہ چولا کو ہرا کر مدورا میں اپنا راج قائم کر لیا۔ وجیانگر کا راجہ اس پر بڑا آگ بگولا ہوا اس نے غدار نائک کے بیٹے کو اس کے خلاف لڑنے بھیجا۔ بیٹے نے باپ کو ہرا کر قید کر لیا لیکن باپ کو بہادری کے صلہ میں سزا نہیں دی گئی۔

نائک راجاؤں میں سب سے پہلا وشوناتھ نائک تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی کے وزیر آریہ نائک نے ہزار ستونوں والا ہال تعمیر کرایا تھا۔ اسی خاندان کے ایک اور راجہ تیرو ملائے نے آئندہ ترو ملائے محل تیار کرایا لیکن یہ نکما اور کمزور راجہ تھا جس نے اپنے مددگاروں کو ایک دوسرے کے خلاف سازش کرنے پر ابھارا اور دشمنوں کو روپیہ دے دے کر حملے سے باز رکھا۔ اس طرز عمل سے سارے راج میں دائمی نفاق کا بیج پڑ گیا اور ارکاٹ کے نواب کو مداخلت کا موقع ہاتھ آیا۔ محمد علی کو اس کے بھائی نے تخت پر بٹھا دیا اور جب وہ ارکاٹ کے تخت و تاج کا مالک ہوا تو مدورا بھی اس کے زیر فرمان آ گیا۔ انگریزوں کی خدمت کے عوض مدورا اور سلیم کمپنی کو مل گئے ۱۸۵۸ء کے انڈیا ایکٹ کے مطابق مدورا اور کمپنی کے دوسرے سارے مقبوضات برطانوی سلطنت کا حصہ سمجھے جانے لگے۔

غرض مدورا اہم شہر ہے کیونکہ یہاں قدیم تہذیب کے بہت سے آثار اور تاریخی عمارتیں موجود ہیں جس نے مدورا کی سیر نہیں کی اس نے کچھ نہیں دیکھا۔

"تاریکیاں"

تیرہ و تار ہیں گذر گاہیں
پیچ در پیچ ہیں مری راہیں
ہر طرف اہرمن کے ڈیرے ہیں
فتنہ سامانیوں کے پھیرے ہیں
رات ہی رات چھائی جاتی ہے
اک قیامت سی آئی جاتی ہے
منہ چھپائے ہیں سب مہ و انجم
راستہ میں ہو گیا ہوں گم
ہو چکی ہے نگاہ ناکارہ
تھک گیا ہے دماغ بیچارہ
نبض ہے سست ہر نفس خاموش
زندگی جیسے ہو چلی مدہوش
دل فسردہ خیال ہے مجروح
سسکیاں لے رہی ہے جسم میں روح
آنکھ میں دھندھ ہے سیاہی ہے
ہر قدم پر مرے تباہی ہے

روشنی ہو تو کچھ نشان ملے
ہم سفر کوئی شاید آن ملے

ضیاء فیض آبادی

غزل

محبت سوز بھی ہے، ساز بھی ہے
نیاز و عجز بھی ہے، ناز بھی ہے
محبت گو ہوئی رسوائے عالم
محبت کی حقیقت راز بھی ہے
نظر سے مارنا اور پھر جلانا
کرشمہ بھی ہے اور اعجاز بھی ہے
یہی آنکھیں ہیں پردہ دار ارماں
یہی اک ختم تر غماز بھی ہے
قفس نے چھوڑ مت صیاد ہم کو
ابھی تو جرأت پرواز بھی ہے
کبھی وہ سو حجابوں میں ہیں پنہاں
کبھی وہ پردہ برانداز بھی ہے
تبسم، التفات اور پھر تغافل
یہ اک دستور شان ناز بھی ہے
مصائب سے نہ گھبرانا کہ الفت
سدا موافق نہیں، ناساز بھی ہے

نہ ملنے میں یہ نیرنگ محبت
فسانہ بھی ہے اور اک راز بھی ہے

نعیم فرخ آبادی

غزل

وہ نظر موتی اگل کر رہ گئی
زندگی پہلو بدل کر رہ گئی
اس کی بھی حسرت نکل کر رہ گئی
صبح تک شمع بھی جل کر رہ گئی
کامیاب عشق جب دیکھا مجھے
ناامیدی ہاتھ مل کر رہ گئی
ناخدا جب بن گئی یاد خدا
ڈوبتی کشتی سنبھل کر رہ گئی
ہو گئی تاریک بزم آرزو
شمع ہستی پگھل کر رہ گئی
پرورش گاہ تمنا ہے یہ دل
دل کی حسرت دل میں پل کر رہ گئی
نامرادی دیکھ کر میری اجل
بارہا شہ رگ مسل کر رہ گئی
یہ جوانی چلتی پھرتی دھوپ ہے
صبح نکلی شام ڈھل کر رہ گئی
ان کی نظروں نے نہ جانے کیا کیا
کوئی شے دل میں مچل کر رہ گئی

روشن ناکام کی ہر آرزو
یاس کے سانچے میں ڈھل کر رہ گئی

روشن نگینوی

علامہ اقبال کے متضاد نظریئے

مادہ اور روح علامہ مادے اور روح کو دو مختلف حقیقتیں نہیں مانتے بلکہ ایک شے اپنی مختلف جہات کی حیثیت سے مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ خالص اسلامی نظریہ ہے۔

"اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جسکا اظہار قیدِ مکانی و زمانی میں ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ بلا کسی غور و فکر کے مانویت کے زیر اثر قبول کر لیا تھا۔" مضامین اقبال ص۱۱

"تن و جاں را دو تا گفتن کلام است
تن و جاں را دو تا گفتن حرام است"
(گلشن راز جدید)

لیکن دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

"مادیات سے گزر کر روحانیات میں قدم رکھئے۔ مادہ کثرت ہے لیکن روح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے۔" (مضامین اقبال ص۱۴۳)

وہ صرف مادیات سے گزرنے ہی پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ ویدانت اور مسیحی تصوف کی طرح یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جسم کو تکلیف دیکر اور مادے کو تیاگ کر روحانیت حاصل کرنا چاہیئے۔

با تو گویم رمزِ باریک اے پسر
تن ہمہ خاک است جاں والا گہر

جسم را از بہرِ جاں باید گداخت
پاک را از خاک می باید شناخت (جاوید نامہ)

کارِ حکمت دیدن و فرسودن است
کارِ عرفاں دیدن و افزودن است

آن بدست آورد آب و خاک را
ایں بدست آورد جانِ پاک را

(جاوید نامہ)

ترکِ عالم مادے اور روح کے مسئلے کے ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی زیر بحث آجاتا ہے کہ اگر روح و مادہ ایک ہیں تو اس مادی عالم کو ترک کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ علامہ کی رائے یہی ہے:-

"انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جسکو ایک روحانی دنیا کی خاطر جو کسی دوسری جگہ واقع ہے ترک کر دینا چاہیئے۔" (مضامین اقبال ص۱۱)

دوسری جگہ فرماتے ہیں: "یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک شریعت رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیت سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ روحانیت پر جمالی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مترتب ہوسکتا تھا جسکی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وارداتِ مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں نما اظہار ہوا ہے۔ اس سے قطعاً مختلف ہے۔" (مضامین اقبال ص۱۶۹)

اور انہی متذکرہ وجوہ کی بنا پر علامہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کے خلاف ہیں۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
(ضرب کلیم)

کمالِ ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری
(بال جبریل)

فقیرِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بہ دست

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کو
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست (ضرب کلیم)

علامہ ایسے فقر کے سخت خلاف ہیں جو خلوتِ دشت کا محتاج ہو۔

اے کہ از ترکِ جہاں گوئی مگو
ترکِ ایں دیر کہن تسخیر او

فقر کافر خلوتِ دشت و در است
فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است

آں خدا را جستن از ترکِ بدن
ایں خودی را بر فسانِ حق زدن

(پس چہ باید کرد......)

لیکن تعجب یہ ہے کہ وہ اپنی شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال بھی سمجھتے ہیں اور اسکی تبلیغ بھی فرماتے ہیں۔

تو ہم بہ ذوقِ خودی رس کہ صاحبانِ طریق
بریدہ از ہمہ عالم بہ خویش پیوستند (ارمغان حجاز)

ان کے نزدیک شکستِ عالم ہی سے مرد بنتا ہے۔

زادنِ طفل از شکستِ اشکم است
زادنِ مرد از شکستِ عالم است (جاوید نامہ)

ان کی رائے میں شہروں کا شور و غل عشق کی موت ہے اس کے لئے خلوتِ دشت و کہسار یعنی رہبانیت ضروری ہے۔

عشق فرو میرد بے پروائے شہر
شعلۂ او میرد از غوغائے شہر

خلوتے جوید بہ دشت و کوہسار
یا لبِ دریائے ناپیدا کنار (جاوید نامہ)

کہسار کی خلوت خود آگاہی کی تعلیم ہے۔

وحشت نہ سمجھ اسکو اے مردکِ میدانی
کہسار کی خلوت ہے تعلیم خود آگاہی (ضرب کلیم)

بلکہ جو انسانوں سے میل جول رکھے وہ نارسیدہ ہے۔

خودی را ہر دم آمیزی دلیلِ نارسائی ہا
تو اے دردآشنا بیگانہ شو از آشنائی ہا (زبور عجم)

اور یہ رہبانیت تصوف کی بدعت نہیں بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا کمال اور ظہورِ ملتِ اسلامیہ خلوت ہی کے سبب سے ہے۔

مصطفٰے اندر حرا خلوت گزید
مدتے جز خویشتن کس را ندید

نقشِ ما را در دلِ او ریختند
ملتے از خلوتش انگیختند

از کم آمیزی تخیل زندہ تر
زندہ تر جوئندہ تر یابندہ تر

(جاوید نامہ)

میکش۔ اکبرآبادی

حقیقتِ عالم ترکِ دنیا علامہ کے خیال میں اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ کوئی حقیقت اور واقعہ

نہیں بلکہ محض نقشِ باطل اور فریبِ نظر ہے۔

کسے کہ از دو جہاں خویش را بروں نشناخت
فریب خوردۂ ایں نقشِ باطل است ہنوز (زبورِ عجم)

اسی سے پوچھ کہ پیشِ نگاہ ہے جو کچھ — جہاں ہے یا کہ فقط رنگ و بو کی طغیانی (ضربِ کلیم)

اسی لئے وہ نظر و دل کو کائنات کی بلند سے بلند چیزوں میں بھی الجھانا نہیں چاہتے

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا — مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب (بالِ جبریل)

علامہ ظہور سے بیزار ہیں اور تجلیات کو بھی فریبِ نظر سمجھتے ہیں۔

حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور — کسے خبر کہ تجلی ہے عینِ مستوری (بالِ جبریل)

اسی لئے انہیں تمنا یا توقع ہے کہ

دل بکسے نباختہ با دو جہاں نہ ساختہ — من بہ حضورِ تو رسم روزِ شمار ایں چنیں (زبورِ عجم)

دل بکسے نباختہ زمانے کے بعد وہ یہ بھی فرماتے ہیں:—

غلام زندہ دلانم کہ عاشقِ سرہ اند — نہ خانقاہ نشیناں کہ دل بکس ندہند (زبورِ عجم)

اور وہ عالم کو خواب نہیں بلکہ واقعہ سمجھتے ہیں۔

تو چشم بستی و گفتی کہ ایں جہاں خواب است
کشادہ چشم کہ ایں خواب خوابِ بیداری است (زبورِ عجم)

ان کے خیال میں مہ و ستارہ سے دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ حقیقت کے لئے یہ چیزیں حجاب نہیں ہیں

صبح و ستارہ و شفق و ماہ و آفتاب — بے پردہ جلوہ ہا بہ نگاہے تواں خرید (زبورِ عجم)

نظرِ باطن اگر عالم کو نقشِ باطل فرض کر لیا جائے تو ضروری ہے کہ اس کو قطع نظر کر کے چشمِ باطن پر زور دینا چاہیے جیسا کہ ملا فرماتے ہیں:—

حکم دشوار است تا پیلے مجو — جز بہ قلبِ خویش قندیلے مجو
اندکے اندر جہانِ دل نگر — تا ز نورِ خود شوی روشن بصر (جاوید نامہ)

اور یہ اسلئے ضروری ہے کہ "ہست معشوقے نہاں اندر دلت" (اسرارِ خودی) اس اندروں بینی میں علامہ کو یہاں تک مبالغہ ہے کہ وہ جلوۂ دوست بھی نہیں دیکھتے۔

نظر بہ خویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست — جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست (جاوید نامہ)

شاید اس لئے کہ

جہانِ چار سو اندر برِ من — ہوائے لامکاں اندر سرِ من (ارمغانِ حجاز)

لیکن علامہ کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ

"گوش و چشم کو بند کرنا اور صرف چشمِ باطن پر زور دینا جمود و انحطاط ہے" (ملفوظات ص ۱۰۱)

تن بخویش اندر کشیدن مردن است — از جہاں در خود رمیدن مردن است (جاوید نامہ)
چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند — گر نہ بینی راہِ حق بر من بخند (اسرارِ خودی)

افلاطون علامہ اقبال نے مولانا رومؒ کے متعلق فلسفۂ عجم باب میں لکھا ہے کہ انہوں نے نو فلاطونی تصوف کو لے لیا اور علامہ کے نزدیک سازِ خودی بغیر نغمۂ رومی کے مکمل بھی نہیں ہوتا۔

گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک — کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک (ضربِ کلیم)

وہ صرف قرآن اور مثنوی رومؒ پڑھنے پر قناعت فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی اسکی تلقین فرماتے ہیں۔ (ملفوظات ص ۲۰۳ و ۲۰۴) لیکن نو فلاطونیت کے علاوہ وہ افلاطون کے بھی مخالف ہیں اور مخالفت کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس نے زندگی کا راز موت میں بتایا چونکہ وہ خود ذوقِ عمل سے محروم تھا اسلئے ہنگامۂ موجود سے انکار کر کے اعیانِ ناشہود کا نظریہ ایجاد کیا۔ وہ ظاہر سے قطع نظر کر کے نامحسوس کے جادو میں گرفتار ہو گیا اور بود کو نابود کہا۔ مادیات سے بلند ہو کر اس نے عالمِ اسباب کو افسانہ کہا۔ چنانچہ اسرارِ خودی میں فرماتے ہیں:—

راہبِ اول فلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
آنچناں افسونِ نامحسوس خورد — اعتبار از دست و چشم و گوش برد
گفت سرِ زندگی در مردن است — شمع را صد جلوہ از افسردن است
عقلِ خود را بر سرِ گردوں رساند — عالمِ اسباب را افسانہ خواند
فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت — حکمتِ او بود را نابود گفت
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است
مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است (اسرارِ خودی)

رہبانیت اور ترکِ دنیا کے متعلق ہم عرض کر چکے ہیں کہ علامہ کی رائے میں خودی کے لئے خلوت لازمی ہے۔ علامہ کی خودی اور افلاطون کے اعیان میں نامحسوس یا ناشہود ہونے کے اعتبار سے ہمیں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ عالم کو فسانہ اور نقشِ باطل علامہ بھی فرما چکے ہیں۔ البتہ موت کے متعلق علامہ کا نظریہ ابھی تک پیش نہیں کیا گیا۔

علامہ اس قسم کے تمام علوم و فنون کے مخالف ہیں جو موت کا پیام ہیں۔

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام — حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب
وائے قومے کز اجل گیرد برات — شاعرش وابوسد از ذوقِ حیات (ضربِ کلیم)

دایۂ ہستی ز جانِ تو برد — لعلِ عنابی ز رخسارت برد (اسرارِ خودی)

منجملہ اور وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی افلاطون سے ناخوشی کی ہے کہ وہ زندگی کا راز موت میں سمجھتا تھا اور منکرِ ہنگامۂ موجود تھا لیکن تعجب یہ ہے کہ علامہ اسی کو اپنے زمانہ کا امام سمجھتے ہیں جس میں یہ صفات ہوں۔

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے — حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق — جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست — زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

(ضربِ کلیم)

تقلید

علامہ اقبالؒ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"دراصل زندگی کے جس جس شعبے میں تقلید کا عنصر نمایاں ہے اس میں حرکت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ تصوف تقلید پر مبنی ہے"۔ (ملفوظات ص۱۲۲)

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب — پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے (پیامِ مشرق)

بایں ہمہ پرستارِ یزداں کے لئے وہ تقلید کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں تقلید بھی عشق ہے اور خودی کا استحکام بغیر عشق کے ممکن نہیں جیساکہ اسرارِ خودی میں صراحت کے ساتھ انھوں نے بیان کیا ہے۔

تقلید کے متعلق ان کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو :۔

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق — ہست ہم تقلید از اسمائے عشق

کاملِ بسطام در تقلید فرد — اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد

عاشقی محکم شو از تقلیدِ یار — تا کمندِ تو شود یزداں شکار (اسرارِ خودی)

اجتہادِ عوام کی مخالفت اور تقلید کی حمایت رموزِ بیخودی میں بھی ہے۔

مشائخ نقشبندیہ

علامہ نے فرمایا: "نقشبندی سلک حرکت اور روحانیت پر مبنی ہے مگر چشتی مسلک میں قنوطیت اور سکون کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے چشتیہ سلسلے کا حلقۂ ارادت زیادہ تر ہندوستان تک محدود ہے مگر ہندوستان سے باہر افغانستان، بخارا، ترکی وغیرہ میں نقشبندی مسلک کا زور ہے۔ دراصل زندگی کے جس جس شعبے میں تقلید کا عنصر نمایاں ہے اس میں حرکت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ تصوف تقلید پر مبنی ہے۔ سیاسیات، فلسفہ، شاعری، یہ بھی تقلید پر مبنی ہیں لیکن نقشبندی سلسلے کے شعراء مثلاً ناصر علی سرہندی کو دیکھئے، ناصر علی کی شاعری تقلیدی نہیں اسی لئے حرکت والی قوموں میں وہ زیادہ ہر دلعزیز ہیں" (ملفوظات ص۱۲۲)

ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ علامہ کا ارشاد ہے جو پروفیسر حمید خاں ایم اے نے لکھا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اصل کلام سے یہ تحریر کافی مختلف ہو۔ بہر حال اس ارشاد سے ہم نتائج ذیل اخذ کر سکتے ہیں :۔

تقلید سے حرکت مفقود ہو جاتی ہے۔ سیاست، فلسفہ، شاعری اور تصوف سب کی بنا تقلید پر ہے۔ اس لئے ان سب میں حرکت مفقود ہے لیکن نقشبندی مسلک میں حرکت ہے، اس لئے نقشبندی مسلک تصوف نہیں ہے یا ناصر علی کی شاعری کی طرح ایسا تصوف ہے جو تقلید پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس سلسلے کا ہر مقلد مجدد یا مجتہد ہے۔

یہ جملہ معترضہ تھا اب خود علامہ سے نقشبندیت کی مخالفت ملاحظہ فرمایئے :۔

"تاہم یہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ مابعد کے صوفیانہ فرقوں نے (جیسے نقشبندی) اس تحقق کو حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع بھی ایجاد کئے یا یوں کہو کہ ہندی ویدانتیوں سے ان کو مستعار لیا۔ کنڈالینی کے ہندی نظریہ کی تقلید میں انھوں نے تعلیم دی کہ جسمِ انسانی میں مختلف رنگوں کی روشنی کے چھ مراکز ہیں۔ صوفی کا مطمحِ نظر یہ ہوتا ہے کہ مراقبے کے چند طریقوں کے استعمال سے ان کو متحرک کرے اور اسکے ذریعے رنگوں کی ظاہری کثرت و تعدد میں بالآخر اس اساسی نور کو متحقق کرے جو بے رنگ ہے اور جسکی وجہ سے ہر شے دکھائی دیتی ہے لیکن وہ خود غیر مرئی ہے....... اس واقعہ سے کہ یہ تمام طریقے ایرانی صوفیہ کو معلوم تھے۔ خان کریمر کو ایک غلط فہمی ہوگئی جسکی بنا پر وہ تصوف ہی کے پورے واقعہ کو ویدانتی تصورات کے اثر سے منسوب کرتا ہے۔ مراقبوں کے ان طریقوں کی نوعیت بالکل غیر اسلامی ہے اور اعلیٰ درجے کے صوفیہ ان کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔

(فلسفۂ عجم ص۱۰۰-۱۰۱)

مرزا بیدلؒ

"مرزا بیدل علیہ الرحمۃ لذتِ سکون کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ ان کو جنبشِ نگاہ تک گوارا نہیں۔

نزاکت ہاست در آغوشِ مینا خانۂ حیرت

مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را" (مضامینِ اقبال ص۴۱)

"بیدل کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ حرکت پر زور ہے یہاں تک کہ اسکا معشوق بھی صاحبِ خرام ہے۔ اس کے برعکس غالب کو زیادہ تر اطمینان و سکون سے الفت ہے۔ بیدل نے ایک شعر لکھا ہے "خرام می کاشت" کی ترکیب استعمال کی ہے گویا سکون کو بھی بشکلِ حرکت دیکھا ہے"۔ (ملفوظات ص۱۲۲)

قادیانیت

علامہ کی قادیانیت سے مخالفت محتاجِ بیان نہیں ہے انکا مکتوب ختمِ نبوت مطبوعہ مضامینِ اقبال قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے مگر یہ جملہ بھی انہی کے قلم سے نکلا ہے :۔

"پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقۂ قادیانی کہتے ہیں"۔ (مضامینِ اقبال ص۹۳)

علامہ ابن تیمیہ

شیخ اکبر ابن عربیؒ اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی مخالفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"علمائے قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ اور حکماء میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ ..... ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا"۔ (مضامینِ اقبال ص۵۱)

اسکے بعد ملفوظات ص۲۳ سے ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمایئے :۔

"ایک صحبت میں میں نے علامہ ابن جوزی کی تلبیس کا ذکر کیا اس میں مصنف نے مثال جرأت اور بے کٹ لی سے ابلیس کے ہتھکنڈوں اور مقدس مذہبی جماعتوں پر اسکے اثرات کی وضاحت کی ہے۔ اس ضمن میں صوفیہ کے معائب بھی دل کھول کر بیان کئے ہیں میں نے اس حصے کا کچھ ذکر کرکے حضرت علامہ کی رائے دریافت کی۔ آپ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ میں نے کہا علامہ ابن تیمیہ کی روش بھی تصوف کے خلاف ابن جوزی سے کچھ کم نہیں۔ آپ نے اس پر بھی کچھ ایسے الفاظ فرمائے جنکا خلاصہ یہ تھا کہ بعض لوگ حقیقت سے واقف نہیں ہوتے اور لفظ بر ظاہر عیب چینی شروع کر دیتے ہیں۔"

علم و حکمت

علامہ کا یہ جملہ جب میں نے پڑھا کہ "قلم کی راہ چلنے والا بھی آخر پہنچ ہی جاتا ہے بلکہ محفوظ طریق ہے۔" (ملفوظات ص۲۶) تو مجھے ان کے کئی شعر اور بھی یاد آ گئے۔ فرماتے ہیں:۔

علم میں دولت بھی قدرت بھی ہے لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

شیخ مکتب کے طریقوں میں کشادِ دل کہاں — کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

(ضرب کلیم)

کلامِ فلسفہ از لوحِ دل فرو شستم — ضمیرِ خویش کشادم بہ نشترِ تحقیق

چکیم چہ چارہ گیرم کہ زشاخِ علم و دانش — نہ دمیدہ ہیچ خارے کہ بہ دل نشانم اورا

زبور عجم

خودی

علامہ اقبال کا سب سے زیادہ محبوب اور مہتم بالشان موضوع "خودی" ہے اور بقول ان کے:۔

مرا ذوقِ خودی چوں انگبیں است — چہ گویم واردات من ہمیں است (گلشن راز جدید)

اور یہ واردات انہیں مجاہدۂ باطن سے حاصل ہوئی ہے۔

دمے در خویشتن خلوت گزیدم — جہانے لازوالے آفریدم (گلشن راز)

انھوں نے پہلے خود آزما کر اس نظریئے کی تبلیغ کی ہے۔

نخستیں کیف او را آزمودم — اگر بر خاوراں قسمت نمودم (گلشن راز)

لیکن وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ واردات نہیں بلکہ فلسفہ ہے اور ان کے معتقدین کے دعوے کے مطابق فلسفہ بھی ان کا اختراع کیا ہوا نہیں بلکہ ماخوذ ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"میرا دعویٰ ہے کہ "اسرار" کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔" (مضامین اقبال ص۱۳۳)

جہاں تک قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ فلسفۂ خودی ان ہی ایرانی صوفیوں سے ماخوذ ہے جن کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں "نے بقول علامہ" تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔

کشتۂ انداز ملا جامیم — نظم و نثر او علاج خامیم (اسرار)

نے ہمیں اسطرف توجہ دلائی اور یہ فلسفہ ہمیں نہایت صاف اور سلجھے ہوئے مختصر الفاظ میں شرح رباعیات مصنفہ حضرت ملا جامیؒ میں ملا۔ یہاں اسکی نقل کا محل نہیں ہے لیکن اندازہ یہ ہے کہ شرح رباعیات کو پڑھے اور سمجھے بغیر علامہ اقبال کی خودی کا مفہوم سمجھنا دشوار ہے۔ کیونکہ بعض جگہ وہ خودی کی تعریف اسطرح فرماتے ہیں:۔

"اسکا مفہوم احساس نفس یا تعین ذات ہے۔" (دیباچہ اسرار خودی)

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ علامہ نے آگے چل کر نفس کے بجائے خودی کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو انہیں اس تشریح کی ضرورت پیش نہ آتی کہ

"یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا۔" (دیباچہ اسرار خودی)

اور نہ ان کے مقالہ نگار اس غلط فہمی میں پڑتے کہ علامہ جمہور صوفیہ کے خلاف خودی کی تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ جس خودی کو صوفیہ ترک کرنے کی تعلیم دیتے ہیں، اسے خود علامہ بھی ترک کراتے ہیں۔

اے کہ اندر حجرۂ دل نشیں — ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں (اسرار خودی)

تو اگر ترکِ جہاں کردہ سرِ او داری — پس نخستیں ز سرِ خویش گزر باید کرد (زبور عجم)

علامہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اسلامی تحریک کے نزدیک "انا" ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے۔" (دیباچہ اسرار خودی) لیکن وہ اس مخلوق کو پیکر خاکی نہیں مانتے بلکہ پیکرِ خاکی کو خودی کا حجاب سمجھتے ہیں۔

خودی را پیکرِ خاکی حجاب است — طلوعِ او مثالِ آفتاب است (گلشن راز)

اس لئے اکثر ترکِ عالم کی تلقین فرماتے ہیں ۔

دل ز غیر اللہ بپرداز اے جواں — ایں جہاں کہنہ در باز اے جواں

(پس چہ باید کرد)

اور باوجود اسکے کہ علامہ اکثر غیر اللہ سے قطع نظر کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ خدا کے سامنے بھی خودی کو فراموش کرنا نہیں چاہتے بلکہ مشہور صوفی حضرت منصورؒ کے انا الحق کی اسطرح تاویل فرماتے ہیں:۔

"انا الحق کے یہ معنی نہیں کہ میں خدا ہوں بلکہ اسکو یوں سمجھنا چاہیئے کہ "انا" ہی اصل چیز ہے۔ بندہ اگر خدا میں گم ہو گیا تو اس نے اپنی ہستی مٹا دی۔" (ملفوظات ص۱۱۰)

غلامِ ہمت آں خود پرستم — کہ با نورِ خودی بیند خدا را

بخود گم گزر اندر حضورش — مشو ناپید اندر بحرِ نورش (گلشن راز جدید)

چونکہ تعدد قدما عقلاً محال اور مذہباً شرک ہے اسلئے علامہ خودی کو مخلوق مانتے ہیں لیکن ایسا مخلوق مانتے ہیں جو ظہورِ عالم کا سبب ہے اور اسکے علاوہ جو کچھ ہے وہ اسی سے خلق یا ظاہر ہوا ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیر او پیداست از اثباتِ او (اسرار)

اور یہ خودی عالم کی صرف خالق ہی نہیں بلکہ خدا کی بجائے ہر آن یہ عالم خودی کا محتاج ہے: "ایں کہ اصل نظامِ عالم از خودی است و تسلسل حیاتِ تعینات وجود بر استحکام خودی انحصار دارد۔" (اسرار)

پھر جو شے کہ ظہورِ عالم کا سبب ہے وہ خود اتنی کمزور اور پادر ہوا ہے کہ بغیر آرزو کے زندہ نہیں رہ سکتی اور طرفہ یہ کہ آرزو کی وہ خود ہی خالق بھی ہے "حیاتِ خودی از تخلیق و تولیدِ مقاصد است" (اسرار)

جس طرح خودی کو حیات کے لئے مقصد کی ضرورت ہے اسی طرح استحکام کے لئے محبت کی ضرورت ہے۔

از محبت می شود پائندہ تر ‌ ‌ زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر (اسرار)

کہیں خدا اور خودی ایک ہی معلوم ہوتے ہیں۔ جدائی اور غیریت محض اعتباری نظر آتی ہے جو مصلحتاً خودی سنے اختیار کی ہے۔

سوال — مقدم و محدث از ہم چوں جدا شد ‌ ‌ کہ ایں عالم شد آں دیگر خدا شد
اگر معروف و عارف ذاتِ پاک است ‌ ‌ چہ سودا در سرایں مشتِ خاک است

جواب — خودی را زندگی ایجادِ غیر است ‌ ‌ فراقِ عارف و معروف خیر است
قدیم و محدثِ ما از شمار است ‌ ‌ شمارِ ما طلسمِ روزگار است
جدائی عشق را آئینہ دار است ‌ ‌ جدائی عاشقاں را سازگار است (گلشن رازِ جدید)

اور یہی خودی جو کہیں مخلوق اور کہیں غیر اور کہیں عین حق ہے اور جسے حاصل کرنے کی تلقین علامہ جگہ جگہ فرماتے ہیں۔ اصل فتنہ و فساد بھی ہے۔

در جہاں تخمِ خصومت کاشت است ‌ ‌ خویشتن را غیرِ خود پنداشت است (اسرار)

اور یہ خصومت انگیزی مذموم نہیں ہے کیونکہ بغیر اسکے تکمیل جمالِ معنوی ممکن نہ تھی۔

عذر ایں اسراف و ایں سنگیں دلی ‌ ‌ خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی (اسرار)

اور پھر یہی خودی جس کا انکار خدا کے انکار سے زیادہ کفر ہے۔

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است ‌ ‌ منکرِ خود نزدِ من کافر تر است (جاوید نامہ)

کہیں قابلِ ترک ہو جاتی ہے

اندکے اندر حرائے دل نشیں ‌ ‌ ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں (اسرار)

اس شعر کے ساتھ اسی کتاب میں یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

"مسئلہ نفی خودی از مخترعاتِ اقوامِ مغلوبہ بنی نوعِ انسان است" (اسرارِ خودی)

یہی خودی جو مومن کا انتہائی نقطۂ کمال ہے کہیں خواجۂ اہلِ فراق ابلیس کی تعلیم معلوم ہونے لگتی ہے کیونکہ علامہ بھی خودی کو خدا کے سامنے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

بخود محکم گذر اندر حضورش ‌ ‌ مشو ناپید اندر بحرِ نورش
چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی ‌ ‌ ترا او بیند و او را تو بینی (گلشنِ رازِ جدید)

اور اسی طرح وہ جدائی و فراق کے بھی مداح نظر آتے ہیں۔

جدائی خاک را بخشد نگاہے ‌ ‌ دہد سرمایۂ کوہے بہ کاہے (گلشنِ رازِ جدید)
ز فراق است آرزو ما سینۂ تاب ‌ ‌ تو نمانی چوں شود او بے حجاب (ابلیس چہ باید کرد)

اصل میں یہی تعلیم ابلیس کی بھی ہے۔ خود علامہ کی زبان سے سنئے اور دونوں نظریوں میں فرق سمجھئے

گفتمش بگذر ز آئینِ فراق ‌ ‌ ابغض الاشیاءِ عندی الطلاق

اُمید کی کرن

ہو گئی عیش گاہ جب سنسان ‌ ‌ نظر آنے لگا جہاں حیران
سیج پر گل پڑے تھے مسلے ہوئے ‌ ‌ جیسے ہونٹوں پہ خون کے قطرے
فرش پر ڈھیر تھا پتنگوں کا ‌ ‌ اک نشاں بجھتے سے رنگوں کا
زردیوں پڑ رہی تھی شمع کی لو ‌ ‌ حسن پر جیسے موت کا پرتو
اونچے محراب، سرد اور خموش ‌ ‌ جیسے اک زاہدِ کفن بر دوش

شمع جب ہولے ہولے بجھنے لگی
میرے احساس نے پھریری لی

کل اسی عیش گاہ کے اندر ‌ ‌ نظر آنے لگا پھر وہی منظر
رقص ہوں گے سرود کی دھن پر ‌ ‌ عشق سونگھے گا پھول چن چن کر
لوگ بے فکر گیت گائیں گے ‌ ‌ موت پر پھبتیاں اڑائیں گے
بانہیں بانہوں میں پھنس کے جھومیں گی ‌ ‌ نظریں نظروں کے تیر چومیں گی
بکھرے گی بازوؤں پہ زلفِ دراز ‌ ‌ جھوٹے پندار کے کھلیں گے راز

ریشمی پردے سرسرائیں گے
لوگ تھک تھک کے اٹھتے جائیں گے

اختلافات میں جہاں کی اساس ‌ ‌ اسکو نیرنگیاں نہیں ہیں راس
رات جس دم جمائی لیتی ہے ‌ ‌ دن کی آہٹ سنائی دیتی ہے
ٹوٹتا ہے جو کہنی کوئی ڈنٹھل ‌ ‌ پھوٹ پڑتی ہے اک نئی کونپل
میں نے تن من کسی پہ وار دیا ‌ ‌ دل سے بارِ خودی اتار دیا
کھو کے سب کچھ اسے بھی کھو بیٹھا ‌ ‌ یعنی وہ دوسروں کا ہو بیٹھا

لیکن احساس مجھ سے کہتا ہے
جھرنا رستہ بدلتا رہتا ہے

احمد ندیم قاسمی

گفت سازِ زندگی سوزِ فراق ‌ ‌ اے خوشا سرمستیِ روزِ فراق
بر لبم از وصل می ناید سخن ‌ ‌ وصل اگر خواہم نہ او ماند نہ من (جاوید نامہ)

اس مضمون سے ناظرین کو جہاں میری طالب علمانہ کم فہمی کا اندازہ ہو گا وہاں اس خواہش کا اظہار بھی ضروری ہے کہ میرا مقصد یہ بھی ہے کہ ارباب فہم و علم کی توجہ سے علامہ کا ایک صحیح مسلک سامنے آجائے اور غلط فہمیوں کا سدباب ہو جائے کیونکہ ہندوستان میں صرف علامہ اقبال ہی وہ تنہا شاعر ہیں جنکی قائم کی ہوئی بنیادوں پر جدید اسلامی ہند کی تعمیر ہونی ہے +

ہندوستانی فوج میں لڑکوں کے دستے

ہندوستان کے کمانڈر انچیف جنرل سر کلاڈ آکنلک نے پہلے ہی سے اندازہ لگا لیا تھا کہ تقریباً سولہ برس کے لڑکوں کو جو آئندہ چلکر ہندوستانی فوج کے سپاہی بنیں گے، فوجی تعلیم دینا ضروری ہے۔ کوئی تین برس ہوئے ان کی تجویز تھی کہ سپاہی اپنے دیہاتوں میں لوگوں کو بچپن میں فوجی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس کرائیں۔ پھر سولہ برس کے لڑکے انتخاب کرکے فوجی ٹریننگ کے مرکزوں پر لائے جائیں جہاں ان کے جدا دستے ہوں۔

محکمہ فوج نے اس تجویز پر عمل کیا۔ سارے ملک سے ہر قوم اور ہر مذہب کے لڑکے دستوں کے لئے نامزد کئے گئے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان سب لڑکوں کی عمریں سولہ سے ساڑھے سترہ برس تک کی ہیں جبکہ انسان تعلیم و تربیت کا اثر خوب قبول کرتا ہے۔ حالانکہ اس تجربہ کا خاص مقصد نئی نسل میں سپاہی پیدا کرنا ہے، مگر ساتھ ہی شہریت کے ایک نئے نظریئے کی بھی داغ بیل پڑتی ہے۔ ہندو مسلمان ساتھ کھیلتے، کھاتے اور کام کرتے ہیں۔ اس طرح دوستی کا ایک ایسا جذبہ بھی پیدا ہونے کی امید ہے جو آئندہ برقرار رہے گا۔ لڑکوں کے دستے بننے سے ایسے طبقوں میں جو ابتک الگ تھلگ رہتے تھے، اخوت کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔

لیکن اس کا فوری مقصد اس سے کہیں زیادہ عملی ہے یعنی ہندوستان کے نوجوان دیہاتیوں کو ٹریننگ دے کر سپاہی بنانا۔ یہ لڑکے دو طرح بھرتی کئے جاتے ہیں یا تو بھرتی کے مستقبل اداروں کے ذریعہ اور یا جب کوئی سپاہی چھٹی پر گھر جاتا ہے تو وہ انہیں انتخاب کر کے فوج میں بھرتی کرا دیتا ہے۔

شاید ایک معمولی آدمی کے لئے یہ جاننے کا کہ لڑکوں کے دستے میں کس قسم کی تعلیم اور ٹریننگ دی جاتی ہے، سب سے سیدھا طریقہ انہیں کام کرتے دیکھنا ہے۔ اب محمد اسلم اور بھرتو رام کے حالات بیان کئے جائیں گے جنہیں ان دستوں کے نمائندہ کردار سمجھنا چاہیئے۔ محمد اسلم موضع ٹنڈ والی جہرہ ضلع کیمبل پور (پنجاب) کا پنجابی مسلمان ہے اور بھرتو رام ریاست پٹیالہ کے موضع بدرائی کا جاٹ ہے۔ دونوں سترھویں سال میں ہیں۔ ان دونوں کو راجپوت بٹالین کے سپاہی چھٹی سے واپس آتے وقت چھٹے راجپوتانہ رائفلز رجمنٹل سنٹر میں لاتے ہیں۔

یہ لڑکے اپنے سادہ دیہاتی لباس میں سنٹر کے افسر اعلیٰ کے سامنے پریڈ کرتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر انہیں ڈاکٹر کے پاس بھیج دیتا ہے۔ ڈاکٹر ان کے ٹی۔ اے۔ بی وغیرہ کا ٹیکہ لگاتا ہے ماڑ کر لگنے والی بیماریوں پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ محمد اسلم اور بھرتو رام ابھی پوری طرح بالغ نہیں ہوئے۔ اس لئے یہ آہستہ آہستہ ہی ذہنی ترقی کر سکتے ہیں اس کے باوجود ان دونوں کی عام تندرستی اچھی ہے۔ عمدہ نگرانی اور تربیت باقی کمیوں کو پورا کر دیتی ہے۔ اسی دن سے راجپوتانہ رائفلز رجمنٹل سنٹر ان کے جسموں اور دماغوں کو نئے سرے سے ترقی دینے کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ ٹریننگ ختم ہونے سے پہلے ان کی اونچائی ایک انچ، سینہ دو انچ اور وزن دس پونڈ سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اوروں کے مقابلہ میں ایک پونڈ زیادہ دودھ ملنے سے یہ باتیں ممکن ہوتی ہیں۔

اس کے بعد انہیں سامان کا تھیلا مل جاتا ہے، دعوت ہوتی ہے اور اگلے دن پہلی پریڈ ہوتی ہے۔ پہلے یہ زندگی کسی قدر ڈراؤنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کچھ گھنٹے بعد دوسو سے زیادہ ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے، کودنے اور رہنے سہنے میں مزہ آنے لگتا ہے۔

وہ اپنی ٹریننگ کو کھیل تماشہ سمجھنے لگتے ہیں۔ کچھ سیدھے سادے قواعد ہوتے ہیں جو بہت جلد سمجھ میں آجاتے ہیں اور وہ تھوڑے ہی دن بعد "بوائے" محمد اسلم اور "بوائے" بھرتو رام کے نام سے پکارے جانے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

سنٹر میں ٹریننگ کے پہلے دو ہفتوں میں، جو "زیرو" (ابتدائی) ٹریننگ کا زمانہ کہلاتا ہے، لڑکوں کو پریڈ کے وقت ٹھیک کھڑا ہونا اور بالکل سادہ ورزشیں سکھائی جاتی ہیں۔ انہیں ہائی جین (حفظان صحت) وردی کی حفاظت اور بہت سی دوسری چیزوں کے متعلق باتیں بتائی جاتی ہیں۔ پہلے پہل اسکول میں پڑھے جاتے ہیں اور ورزشیں، قطاروں میں چلنا، سلامی دینا اور معمولی ہتھیار اور مصنوعی بندوقیں لے کر پریڈ کرنا اور انہیں چلانا سیکھتے ہیں۔ پھر اصلی بندوقیں چلانے کا زمانہ آتا ہے۔ لڑکے کچھ وقت کیلئے رائفلیں ملنے سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ محمد اسلم اور بھرتو رام ساتھ ساتھ چھوٹے پیمانہ پر چاندماری کے لئے جاتے ہیں۔ ان کا نشانہ قریب قریب ایک سا ہے۔

کسرتوں نے انہیں دماغی اور جسمانی لحاظ سے بہت ہوشیار اور پھرتیلا بننے میں مدد دی ہے۔ اب یہ ایک خاص ٹریننگ

کے لئے جا رہے ہیں جس میں سگنل کا سارا کام سیکھیں گے - ان کے راجپوت رائفلز رجمنٹل سنٹر کے دوسرے ساتھی ملکی مشین گن اور چھوٹی توپ کی باریکیاں سیکھ رہے ہیں - اور کچھ کو موٹریں چلانا اور توپ گاڑیاں رکھنا سکھایا جا رہا ہے -

تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی ہے - یہ لکھنا پڑھنا سیکھ رہے ہیں اور انہیں سیکنڈ کلاس انڈین آرمی سرٹیفکٹ اور تھرڈ کلاس انگلش سرٹیفکٹ ملنے کی امید ہے - آئندہ نان کمیشنڈ افسر بننے کے واسطے ان کے لئے یہ امتحان پاس کرنا ضروری ہے اور ان کے بعد یہ اور بھی بڑے امتحانوں میں شریک ہوں گے - لیکن سنٹر کی ورزشیں اسکول جیسی نہیں ہوتیں - باکسنگ اور تیرنے کا وقت سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے لڑکوں کو ان کھیلوں میں بہت مزہ آتا ہے - وہ میدان کے سب کھیلوں میں بھی شریک ہوتے ہیں اور ہار جیت کی پروا نہ کرنے کی عادت ڈالتے ہیں -

ٹریننگ کے زمانہ میں محمد اسلم اور بھرتو رام کو دس روپیہ ماہانہ ملتے ہیں - امتحان پاس کرنے پر یہ رقم بڑھ جاتی ہے - یہاں کھانا کپڑا اور مکان مفت ہونے کی وجہ سے ان کے ذمہ کوئی خرچ بھی نہیں - اس لئے ان کی موجودہ ضروریات کے لئے یہ تنخواہ بہت کافی ہے -

ابھی ان کی ٹریننگ جاری ہے - انہیں ایک دن چھٹی راجپوتانہ رائفلز کی کسی بٹالین میں شامل ہونا ہے - تب وہ اس وقت کی سیکھی ہوئی باتوں پر عمل کریں گے -

ٹریننگ ختم ہونے پر اگر وہ چاہیں تو فوج میں رہ سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو اپنے گھروں کو واپس جا سکتے ہیں - اس طرح جسمانی اور دماغی ترقی کر کے اور اپنی صلاحیتوں کو تقویت پہنچا کر یہ لڑکے دیہاتوں کے مسائل حل کر کے اپنے دیہاتی بھائیوں کو مدد دیں گے -

کلیاں —— ذاہر فتحپوری

کون کہتا ہے کہ آغوش میں مہ پارے ہیں؟
تیرے بستر پہ یہ کلیاں نہیں انگارے ہیں
دیدۂ یاس میں کھب جائینگی کانٹوں کی طرح
دولتِ حسن کو کھا جائیگی دکھ بھرے غم کی نظر
ریشمی زلفوں کی پُر سوز شعاعوں کو نہ دیکھ
اب بھی تجکو نہیں افسوس جوانی کی خبر
رہنے دے مجکو ترے پیار کی حاجت ہی نہیں
آرزو، وقت کی مضراب سے پامال نہ کر
کون کہتا ہے کہ یہ باغ کے شہ پارے ہیں؟
تیرے بستر پہ یہ کلیاں نہیں انگارے ہیں
تیری آغوشِ حسیں اور یہ پھولوں کا چلن
مسکراتے ہوئے بکھرے ہیں کہ داغوں کا چمن
حسن کے دوش پہ رقصاں ہیں سنہری کلیاں
پنکھڑی پنکھڑی اوڑھے ہوئے ہے رس کا کفن
چاہتا ہوں کہ میں چھولوں ترے رخساروں کو
روک دیتی ہے مگر ہاتھ فسوں سازِ جلن
اُترا اُترا سا ہے چہرا ابھی ترے پھولوں کا
لگ رہا ہے تری ہر موجِ تبسم کو گہن
کون کہتا ہے کہ یہ عشق کے گہوارے ہیں؟
تیرے بستر پہ یہ کلیاں نہیں انگارے ہیں

جدید اردو شاعری

از عہد انقلاب تا عہد اضطراب

اویس احمد ادیب

ہندوستان کی تاریخ عموماً تین دور میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اولین دور میں ہندو برسر اقتدار رہے۔ دور متوسط میں مسلمانوں نے حکومت کی اور دور جدید میں موجودہ حکومت کا دور دورہ ہے۔ اسی طرح اردو زبان و ادب کی تاریخ بھی تین ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس تقسیم کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ تشنہ رہ جاتی ہے۔ اول دور وہ ہے جبکہ ہندوی زبانوں اور عربی و فارسی کی آمیزش سے ہندوستان میں اردوئے معلی نہیں بلکہ اردو نما زبان پیدا ہو رہی تھی، دوسرا دور وہ ہے، جبکہ دکھنی زبان کاروباری، علمی، ادبی اور مذہبی زبان بنی تیسرا دور وہ ہے جبکہ اردوئے معلّٰی ہندوستان کے گوشہ گوشہ پر چھا گئی۔ ان تمام ادوار کی خصوصیات علیحدہ علیحدہ ہیں جو اپنے زمانے کے رجحانات اور ماحول کے اثرات کی حامل ہیں۔ ابتدائی دور میں وہ بالکل ہندوی نظر آتی ہے کیونکہ سرزمین ہند ہی میں اردو نما زبان کا خمیر تیار ہوا اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا آب و گل اور اس کا لباس خالص ہندوستانی تھا۔ دور متوسط میں یہ مسلمانوں کی زبان فارسی سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کا چولا ہی بدل گیا یعنی اس کے ظاہر و باطن دونوں میں زبردست انقلاب رونما ہوا، مگر عہد حاضر میں انگریزی اقتدار کے ساتھ ساتھ اس پر مغربی ادب کے اثرات پڑنے لگے چنانچہ اکثر اصناف ادب اس نے انگریزی سے مستعار لیں۔ اس کے آخری دور کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول عہد انقلاب اور دوسرا عہد اضطراب۔ عہد انقلاب کی شاعری میں ان شعراء کا تذکرہ بھی ضرور کیا جائے گا جو تاریخ ادب کے دور متوسط کے تیسرے حصۂ شاعری کے علمبردار تھے یعنی شعراء دور متاخرین جن کو غدر سے کچھ زمانہ قبل تک درباروں کی سرپرستی نصیب تھی اور جن کا میدان شاعری معشوق کے ظاہری خد و خال اور انگیا کرتی تک محدود تھا۔ اس دور کی شاعری دراصل شعراء متقدمین کی غزل گوئی کے تنزل کا نمونہ تھی کیونکہ وہ چند فرضی اصول اور مصنوعی قیود کی پابند ہو کر رہ گئی تھی۔ بسا اوقات اشعار میں کوئی جزو شعریت بھی باقی نہ رہ گیا تھا۔ نئے خیالات اور نئے موضوعات یکسر مفقود ہو چکے تھے۔ غرض ادبی قحط سالی تھی اور اس عہد کی شاعری صرف رسمی اور تقلیدی تھی۔

غدر ۱۸۵۷ء کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں بھی انقلاب پیدا ہوا ہے۔ مخالف ماحول اور ہمت شکن اثرات نے شعراء دور جدید کو شعری احساس بخشا اور یہ بھی بتایا کہ زندہ ادب کبھی انقلابی اثرات سے فنا نہیں ہوتا بشرطیکہ اس زبان و ادب کے شعراء احساس شعری کو فنا نہ ہونے دیں۔ اور ان جذبات کو جو انقلاب کی پیداوار ہوں گے ہیں خود نیست و نابود نہ کر دیں۔ اردو شاعری کا نصب العین بھی غدر کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوا شعراء عہد انقلاب نے اپنے اور شعراء عہد ماضی کے نصب العین میں زمین و آسمان کا فرق پایا زمانے کو بدلا ہوا دیکھا، تنزل ادبار کو ہندوستان پر مسلط پایا۔ غلامی کی زنجیریں مستحکم ہوتی نظر آئیں، اقتصادی اور سیاسی مسائل کی پیچیدگیوں سے زندگی کی کشمکش زیادہ ہوتی گئی۔ آزادیٔ خیال اور آزادیٔ تقریر پر زبردست پابندیاں بڑھنے لگیں اس وجہ سے تخیل اور اسالیب بیان میں زبردست تبدیلیاں ہوئیں اس کو یوں کہیے کہ قدیم طرز اور جدید اسلوب میں بُعد زیادہ بڑھ گیا گو اقسام نظم تقریباً وہی رہیں موضوعات شاعری میں بھی تبدیلیاں ہوئیں تبدیلیاں کیا ہوئیں انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ جو موضوعات لاشعور میں تھے اور جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ یہ کبھی شعر و شاعری کا موضوع نہیں بن سکتے، وہ شعور میں آتے گئے اور زندگی کی ہر موڑ پر ایک قوی احساس پیدا کرنے کا باعث بنے۔ ملت اور قومیت کا احساس پیدا ہونے لگا، "وطنیت" اپنا اثر دکھانے لگی، اور بیداری کے اثرات رونما ہونے لگے کیونکہ ان نئے دیوتاؤں میں سب سے زیادہ قوی، وطن تھا ہی دیوتا "آزادی" کا پیغام لایا اور اس نے وہ تنگ نظری ختم کر دی جو اپنے معشوق کے سوا کسی اور موضوع کو ایک آنکھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ دوسری طرف حقائق روزگار اور اسرار کائنات نے بھی کروٹ لی اور اردو شاعری کی تہی دامانی کو وسیع کر دیا۔ یہ تھا وہ سیلاب جو عہد انقلاب کے ساتھ آیا اور اپنے ساتھ اردو شاعری کے تمام شعراء کو بہا لے گیا۔ اس عہد کے شعراء کا کلام ہندوستان کے طرز معاشرت، طرز تمدن، عہد حکومت، اور اقتصادی حالات کا مکمل آئینہ ہے یہی وجہ ہے کہ عہد انقلاب کی تاریخی نظمیں شعریت کے حامل ہونے کے باوجود مکمل تاریخ ہیں۔ شعراء متقدمین نے اخلاق و موعظت کو اپنی شاعری کا ایک ضروری اور لازمی جزو بنا لیا تھا اور بیشتر اشعار اس موضوع پر رہے تھے مگر دور متاخرین میں اس کا مکمل جنازہ نکل چکا تھا۔ خال خال ہی ایسے اشعار نظر آتے تھے۔ عہد حاضر میں شعراء نے اسی پامال اور فرسودہ مضمون کو نئے انداز نئے ڈھنگ سے اپنے اشعار کا موضوع قرار دیا۔ رجائی مستقبل کو انھوں نے اپنے شعر و شاعری سے بہت کچھ کم کر دیا کیونکہ قدما، اور متاخرین کے یہاں حزن و ملال ان کے اشعار کا مستقل موضوع تھا۔ اور یہ ان افراد قوم کے لئے، زہر ہلاہل سے زیادہ مضرت رساں تھا جن کو میدان عمل میں گامزن ہو کر قوم کی زندگی کا ثبوت دینا تھا۔ حزن و ملال، انسانی استقلال میں رخنہ پیدا کر دیتا ہے اور ایک قوی ہیکل جوان کو ایک ضعیف اور کمزور انسان بنا ڈالتا ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس کو شعراء عہد انقلاب نے چھوڑنے کی کوشش کی اور اس کی جگہ امید و بیم اور خوشگوار احساسات اور جذبات کو دی، اور اپنی قوم کو یہ سبق پڑھایا کہ جد و جہد اور مستقل مزاجی کامرانی سے ہم کنار کر دیتی ہے۔

اس عہد انقلاب میں ایسے شعرا بھی ہم کو نظر آتے ہیں جو شعرا متقدمین تا شعرا متاخرین کو اپنا سہارا بنائے رہے، یعنی جنہوں نے غزل گوئی ہی کو اپنا موضوع بنائے رکھا۔ فانی۔ حسرت۔ اصغر اور جگر وہ مایۂ ناز غزل گو شعراء ہیں جنہوں نے قدیم پابندیوں کو جائز سمجھا، ردیف، قافیہ اور وزن کو شعر کا ضروری جزو سمجھا۔ حسرت اور جگر ابھی حیات ہیں۔ مگر ان کی شاعری غزل گوئی کی حدود سے نہیں نکلی۔ جگر کا طرز پہلے سے بہت پھیکا پڑ چکا ہے۔ ان کے کلام میں انسانی خامکاریوں کے لئے جو فضر ہیں ہوا کرتی تھیں وہ اب کم ہوگئی ہیں پھر بھی اتنا ضرور کہنا پڑے گا کہ عہد انقلاب کے انقلابی ماثرات سے جگر نے اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر کہیں کہیں اگر دانستہ طور پر نہیں تو نادانستہ طور پر وہ آزاد خیال ہو کر ایطائے شعری کی پرواہ نہیں کرتے۔ حسرت میں تغیرات ہو رہے ہیں اور بہت زیادہ نمایاں۔ وہ انہی قیود کو پسند کرتے ہوئے، جدید موضوعات کو اپنی غزل گوئی میں جگہ دے رہے ہیں۔ حسرت کی شاعری اب شباب پر ہے، کسی شعر میں کمونیزم کا تذکرہ ہے تو کہیں اقتصادی مسائل سلجھائے ہیں غزل مسلسل جس کو مولانا حسرت کبھی کبھی نظم کہہ گذرتے ہیں، ان کو زیادہ مرغوب نظر آتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ عہد اضطراب کی اس ادبی پیداوار کو بھی مولانا حسرت سراہتے ہیں جس کو نہ صرف ہندوستان کے نقاد "عریاں اور فحش" کہہ کر قابل نفرت ٹھیراتے ہیں بلکہ حقیقت پسند نقاد بھی فحش نگاری کو برا کہتے ہیں۔ مولانا حسرت نے ایک بار فرمایا کہ ان کی بہترین غزلیں یا ان کا بہترین کلام یا تو عاشقانہ ہے یا فاسقانہ۔ اور یہ دونوں انسانی زندگی سے زیادہ نزدیک ہیں۔ عاشقانہ جذبات انسان کی رگ رگ میں موجود ہیں۔ ان کا اظہار تہذیب اور شائستگی کے دائرہ میں جائز اور قابل قبول ہے۔ فاسقانہ اشعار اگر زبان کے پردے میں پیش کئے جائیں تب بھی ان کے اثرات ہمارے نوجوانوں پر مضرت رساں ہوں گے۔ "فاسقانہ" اشعار کا جہاں تک تعلق ہے، مجھے مولانا سے اختلاف ہے۔ اور وہ یوں کہ فاسق سے زیادہ زندگی سے نزدیک کوئی دوسرا نہیں ہوتا مگر تہذیب کا ایک معیار ہونا ضروری ہے اور ادب میں فاسقانہ اشعار کی بہتات کے معنی اس قوم کے گرتے ہوئے اخلاق کے ہیں۔

اقبال، چکبست اور صفی ان نظم گو شعرا میں سے ہیں جن کے دلوں میں قومی، ملی اور وطنی تڑپ تھی، جو وطن کے نوجوانوں کے سینہ میں دل اور دل میں جوش دیکھنے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے مایۂ ناز سپوتوں کو پیغام عمل سنایا اور میدان عمل میں لا کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ مگر اسی دور کے چند اور شعرا حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، ساغر نظامی اور احسان دانش وغیرہ صرف چند قیود سے آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ کوئی فارسی بحروں کے بجائے ہندی بحریں پیش کر کے ترنم پیدا کرنا چاہتا ہے،

کوئی محاورات اور الفاظ کی بندشوں سے آزاد رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر بنظر غائر ان تمام شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ان کے کلام کی تہ میں انتشار اور اضطراب موجود ہے۔ جو شعرا عہد اضطراب کی شاعری میں اور زیادہ اجاگر ہو گیا ہے۔ ان شعرا نے ترنم اور نغمہ کو اپنی شاعری کا عطر سمجھا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ خوش الحانی کے ساتھ اشعار کو سامعین کے روبرو پیش کریں گے تو ان کے اشعار زیادہ مقبول ہوں گے۔ مجھے خوش گلو اور خوش الحان شعرا معاف فرمائیں اگر میں یہاں اپنے ایک محبوب دوست کے قول کو نقل کر دوں "وہ خوش آواز اور ترنم کے ساتھ کلام پیش کرنے والے شعرا کو "پیشہ ور قوال" کہتے ہیں اور ان کی شاعری کو قوالی۔ میں خود اس حد تک تو نہیں کہہ سکتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس وقت جو عوام میں پست مذاقی پھیلی ہوئی ہے وہ انہی شعرا کی بدولت ہے۔ "مشاعرے" جن کو میں اردو کی اشاعت کا بہترین ذریعہ تصور کیا کرتا تھا، اب گلے بازی کا مرکز ہوگئے ہیں۔ وہی شاعر اپنا کلام پیش کر سکے گا اور اسی کا کلام عوام سننا پسند کریں گے جو خوش آوازی کے ساتھ خوش آیند لہجہ میں پڑھ سکے۔ جگر، ساغر، حفیظ اور احسان کے کلام کو صرف خواص ہی نہیں بلکہ عوام بھی خاموشی کے ساتھ سنتے ہیں مگر تحت اللفظ پڑھنے والے شاعر کو عوام و خواص دونوں سننا گوارا نہیں کرتے حالانکہ شعری خوبیوں کا اظہار اسی وقت ہوتا ہے جبکہ شاعر شعر کو اسی جذبہ کے تحت میں پڑھتا ہے جو کہ اس کے وجود کا باعث بنا ہے مگر ہر شعر کو ایک ہی انداز میں گا کر ادا کر دینا شعری اثرات کو سامعین تک نہیں پہنچنے دیتا۔

اس عہد میں "شبابیات" کا ایک طوفان عظیم نظر آتا ہے جو قریب قریب ہر شاعر کو اپنے ہمراہ بہا کر لے گیا۔ اس سے زیادہ ہمکناری کا موقع جوش کو ملا۔ جوش کا صوفیانہ مسلک باغی ہو گیا ہے۔ اور وہ آج سب سے زیادہ شباب پر نظر آتا ہے۔ اس کے یہاں جذبات کی فراوانی اور شباب کی چھپی ہوئی چنگاریاں جگہ جگہ موجود ہیں۔ اس کو یوں ادا کیا جائے تو شاید بہتر ہو کہ شاعری میں گویا فنا فی الشباب کی واردات ہیں ہیں ؎

واقعات اپنے بیاں کیجئے کیا کیا اے جوش
ایسے ٹکڑے ہیں بہت سے مرے افسانے میں

حفیظ نے بھی جوش کے شباب کو دیکھا، ان میں بھی جوانی پیدا ہوئی اور انھوں نے بھی شبابیات کو پیش کرنا شروع کیا مگر حفیظ نے اتنا کرم کیا کہ مشرقیت کو نہیں چھوڑا اور شرم و حیا کے پردوں کو چاک نہیں کیا۔ ساغر نے "پجاری" پجارن" ہی کو دیکھا تو اس کے حسن پر فریفتہ ہو گئے۔ اور آہ پجارن اور واہ پجارن کہنے لگے۔ احسان دانش نے مزدور لڑکی کے شباب پر ترس کھایا۔ اور اگر غور کیا جائے تو دور جدید کا کونسا شاعر ہے جس نے تحسین دوشیزہ کے شباب پر طبع آزمائی نہیں کی۔

ٹیگور کی مخصوص ادبیات سے کون واقف نہیں۔ نوجوان شاعروں پر ٹیگور کا انتہائی اثر ہے۔ ان میں سب سے زیادہ متاثر اختر شیرانی ہیں، جن کے یہاں لفظی خوش آہنگی اور واضح معنویت دونوں موجود ہیں۔ ان کے ساتھ روش صدیقی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ان کے پڑھنے کا طرز تو کوئی خاص ترنم پیدا نہیں کرتا بلکہ ان کی آواز کی سختی کسی قدر سامعین پر گراں ہی گذرتی ہے مگر ان کے اشعار میں رنگینیٔ تخیل، موسیقیت اور نزاکت ہر سمجھدار سامع کو ان کے اشعار کی طرف رجوع کر دیتی ہے۔

عہد انقلاب کے بعد عہد اضطراب کے شعراء کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ بعض ناظرین کا یہ خیال ہے کہ اس دور کے شعراء حسنِ صورت اور ظاہری خط و خال پر زیادہ زور صرف کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں وہی خد و خال زیادہ ابھر گئے ہیں جو عہد انقلاب کے شعراء، دور دوم میں کسی قدر بیباکی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ حسن مظلوم کو اس دور کا ہر شاعر، عریاں پیش کرتا ہے اور وہ اس وجہ سے نہیں کہ نوجوانوں کی آنکھوں کو غذا بہم پہنچائی جائے بلکہ ان کے حساس دلوں پر چوٹ لگا کر ان کو بے چین اور بیتاب کیا جائے کس لئے؟ یہ نہیں کہا جا سکتا اور نہ شاید کسی کو معلوم ہے۔

ہمارا عہد اضطراب کشمکش حیات کا آئینہ دار ہے۔ سیاسی کشمکش، معاشی اور معاشرتی نزاعی مسئلہ نے انسان کے دل و دماغ کو بہت زیادہ پریشان کر رکھا ہے۔ زندگی کے کسی شعبہ میں سکون میسر نہیں آتا۔ زندگی کی ہر موڑ پر ایک نہ ایک ہنگامہ ضرور موجود ہے۔ مذہب۔ سیاست۔ ادب اور دیگر فنون لطیفہ بھی اسی ہنگامہ کی وجہ سے پست جذبات کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ مغرب کی ہر نئی چیز ایک نئے آرٹ اور فن کی حیثیت سے ہماری نظروں کے سامنے آتی ہے۔ مغرب کی ہر وہ چیز خواہ وہ بھلی ہو یا بری ایک نہ ایک فتنی پہلو اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہے اور ہمارا ہر مغرب زدہ نوجوان اس کو حاصل کرنے کی کوششیں کرتا ہے۔ یہ کوششیں اپنے تہذیب و تمدن کو ادنیٰ، حقیر اور ذلیل تصور کرنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ مشرق کی ہر چیز بری اور مغرب کی ہر چیز بھلی۔ ہماری وطنیت بھی وطنیت نہیں۔ مذہب ولا کا تعصب بھی ان کے لئے اور ان کی نظروں میں وطنیت کے مترادف ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کی چیزوں کو ہندوستانی کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اس مغربی عینک سے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی چیز کا مطالعہ کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں عہد اضطراب کی شاعری مغربیت کا خاص طور پر شکار رہی ہے۔ مجھے اس سے قطعی انکار نہیں کہ ہمارا جدید ادب ایک بہت بڑی حد تک مغرب کا ممنون احسان ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ شرمندۂ احسان ہو کر مغرب کی ہر بری اور اچھی چیز کی تقلید کرنے لگیں۔ جو چیز بہتر ہو، اُسے حاصل کرنا، اپنانا اور پھر اسے اپنے رنگ میں پیش کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ مگر مخرب اخلاق اور بری چیزوں کو اپنا کر ذلیل، رکیک اور غلیظ انداز میں پیش کرنا میرے نزدیک دانائی نہیں نادانی ہے۔ دور جدید کے اضطرابی دور میں، ن۔ م۔ راشد، فیض احمد فیض۔ ڈاکٹر تاثیر، میرا جی۔ مجید ملک، جالندھری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سمجھے کیا ہر خارجی ادب کو نظم معرّیٰ اور نظم آزاد کے رواج پانے پر خوشی ہوگی کیونکہ اردو کی اقسام نظم اب تک دو تین تک محدود تھیں مگر اب وہ ایک درجن ہو گئی ہیں۔ اس سے اردو کی تہی داماں دور ہوئی اور ہوتی جا رہی ہے اور کوئی بعید نہیں کہ جدت طبع اس کو اور زیادہ وسیع کر دے۔ اس اعتراض کو بھی میں غلط تصور کرتا ہوں کہ وہ مغرب کی چیز ہے اور وہیں زیادہ کامیاب ہو سکتی ہے میرے نزدیک بکھرے ہوئے اور بے ترتیب خیالات کے ادا کرنے کا بہترین ذریعہ حاصل ہو گیا ہے۔ ہمارے وہ جذبات اور وہ احساسات، قیود شاعری پر عبور نہ ہونے کی وجہ سے پامال ہو جاتے تھے۔ اب کسی نہ کسی انداز میں ہمارے ادب میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ نظم معرّیٰ اور نظم آزاد میں تخیل کو پیش کرتے وقت ردیف اور قافیہ کی الجھنوں میں بھی وقت برباد نہیں ہوتا۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود نظم معرّیٰ اور نظم آزاد جو ہمارے ملک میں بدنام ہوئیں اور ہوتی جا رہی ہیں وہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ اصناف ناقص ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان میں جو کچھ پیش کیا گیا وہ معیار سے گرا ہوا تھا۔ اس سے اخلاق کو ٹھیس لگی اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ میرا مطلب "آزادیٔ خیال" سے ہے۔ اس کو قدما تخیل کی بے اعتدالی کہتے تھے۔ شعرائے لکھنؤ ابتذال اور تخیل کی بے اعتدالی کی وجہ سے بدنام ہوئے۔ اگر تخیل کی بے اعتدالی کو نظر انداز کر دیا جائے تو نظم معرّیٰ اور نظم آزاد اس عہد کی بہترین پیداوار ہیں۔ تخیل کی بے اعتدالی سے مراد میں "عریانی" کو لے رہا ہوں۔ میرا مقصد کسی خاص شاعر کو مطعون کرنا نہیں بلکہ عام طور پر یہ بتانا ہے کہ اس طرز کی شاعری کے علمبردار اگر اس امر کی کوشش کریں تو کوئی بعید نہیں جنس لطیف سے متعلق ہر شعر آرٹ نہیں بنے گا اور اس کا عریاں سینہ میووں کا خوان نظر نہ آئے گا۔

ہم زندگی کی دوڑ میں قدما سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ ہم ان سے زیادہ مہذب، ان سے زیادہ تعلیم یافتہ، ان سے زیادہ اقتصادیات کے ماہر، ان سے زیادہ ذہین اور ہر دور کی الجھنوں سے واقف ہیں۔ ہم میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ان میں نہ تھیں۔ مگر بنظر غائر مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ترقی پسند ہونے کے بجائے اور زیادہ رجعت پسند اور قدامت پرست ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ہمارے اعلیٰ طبقہ کے لوگ مغربی تہذیب اور تمدن کی مدح سرائی میں مشغول ہیں اور اس کے زہریلے اثرات ان میں سرایت کرتے جا رہے ہیں۔ متوسط طبقہ کے لوگ ایسی کشمکش میں مبتلا ہیں کہ انہیں اپنی زندگی اجیرن معلوم ہونے لگی ہے۔ ہمارا ادنیٰ طبقہ انتشار اور تذبذب کے عالم میں پھنسا ہوا ہے۔ ایسے عالم میں ہمارے شعراء کو اپنے اشعار کے ذریعے اس قسم کی چیزیں پیش کرنا چاہئے کہ وہ ان میں پستی نہ پیدا ہونے دیں تاکہ وہ ہر نزاع کا مردانگی کے ساتھ مقابلہ کریں۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عوام سے

پہلے خود ہمارے روشن دماغ شعرا اس پستی کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں اس کی مزید وضاحت کر دوں کہ میرا مقصد نخش نگاری اور عریانی سے ہے جس کی متحمل مشرقی تہذیب نہیں ہو سکتی۔

میں خود جان رسکن (　　) کے الفاظ میں یہ کہتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ وہ ادب دراصل بیکار ہے جس کا انسانی زندگی سے کوئی علاقہ نہ ہو، میں بیمار اور بیکار ادب کا قائل نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ آسکر وائلڈ (　　) کے مقولہ کے صرف ایک حصہ کو صحیح سمجھتا ہوں کہ ادب کو ہماری زندگی کے گفتہ بہ اور ناگفتہ بہ دونوں شعبوں کا ماتحت نہ بنا دینا چاہیئے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ ادب میں رومانیت نہ ہو بلکہ وہ پند و نصائح کا ایک گنجینہ ہو کر رہ جائے۔ نہیں۔ ادب کا کوئی مقصد ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ افسانہ نویسی ہو یا ناول نگاری، شاعری ہو یا ڈراما نگاری۔ لامقصدیت اور لامرکزیت ادب اور شعر میں نہ ہونا چاہیئے۔ ہر شاعر یا مصنف کا مقصد ہونا ضروری ہے۔ عہد اضطراب کی شاعری کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ محض تجرباتی ہے۔ مگر تجرباتی دور میں بھی کوئی مقصد پیش نظر رکھ کر تجربہ کیا جاتا ہے۔ اس دور کی شاعری میرے نزدیک زندگی سے زیادہ قریب آگئی ہے اور یہ محض اس وجہ سے کہ اس عہد کا شاعر ادب برائے زندگی کا قائل ہے۔

اب سے چند سال قبل تک اسی ادب کو ترقی پسند ادب کہا جاتا تھا مگر عوام و خواص کی ناپسندیدگی دیکھ کر ہمارے چند نوجوان اب اپنی ڈفلیا الگ بجانے لگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ترقی پسند ادب اور شاعری میں ہم ان چیزوں کو شامل کرتے ہیں جو ہمارے اخلاقی معیار سے نہیں گرتیں۔ اس کے علمبردار ڈاکٹر علیم، سجاد ظہیر اور احتشام حسین ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ پستی دراصل شکست خوردہ ذہنیت اور بے شعوری کا نتیجہ تھی۔ تجرباتی دور میں ہر نوجوان شاعر کسی مقصد کو اپنی شعر و شاعری کا مرکز بنانا چاہتا تھا اس وجہ سے کبھی تو وہ جنسیات سے لطف اندوز ہو کر اپنے کلام میں شیرینی یا جاذبیت پیدا کرنا چاہتا تھا اور کبھی تاریخی مطالعہ کے بعد مغرب کی دوشیزہ سے برادران وطن کے انتقام کی کوششیں کرتا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہمارا ہر نوجوان شاعر نظم معرّٰی اور نظم آزاد کو اپنے ذہنی اور مادی انقلابات سے مالا مال کر دے تاکہ اس میں جو چند خامیاں ہیں وہ بھی دور ہو جائیں۔ ہر نئے ادب میں کچھ نہ کچھ کمی رہتی ہے۔ اگر ہمارے نئے ادب میں کچھ کمی ہے تو وہ ہمارے شعرائے عہد اضطراب کے تجربہ کے ساتھ ساتھ پوری ہوتی جائے گی۔

نقد و نظر

سالنامے اور خاص نمبر

ہندوستان میں صحافت کی صحیح نشو و نما پچھلی عالمگیر جنگ کے بعد ہوئی اس سے قبل شائع ہونے والے رسائل و اخبارات کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ یہ نشو و نما ابھی پوری طرح پنپنے بھی نہ پائی تھی کہ مغرب سے نازی فتنے نے سر اٹھا کر دنیا بھر میں امن و عافیت کی فضا مکدر کردی نتیجہ یہ کہ اس دوسری جنگ عظیم کے ہاتھوں جہاں زندگی کے اور شیرازے بکھر گئے، ادب و صحافت کا نظام بھی درہم برہم ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کاغذ کی کمیابی نے یا صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ نایابی نے جرائد و اخبارات کے حلقے تنگ کر دیئے۔ بعض کے تن و توش کے ساتھ قد و قامت بھی گھٹتا گیا اور بعض مریض عشق کی طرح کچھ عرصہ مسلسل سوکھتے رہنے کے بعد بالکل ہی داغ مفارقت دے گئے۔ اور ان سب سے زیادہ "حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"۔ کاغذ کے قحط پر کتابت و طباعت کی دشواریاں مستزاد رہیں اور وہ بھی ظاہر ہے کہ اسی لڑائی کی بنا پر۔ لیکن خیر یہ ایک عارضی دور تھا جو "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کے مصداق بڑی حد تک گذر گیا اور حاملان ادب کے جوش و ولولے نئے سرے سے اپنے رنگ جمانے لگے۔ ہرچند کاغذ کی پابندیاں پوری طرح دور نہیں ہوئی ہیں تاہم "حصہ رسد" میں اس درجہ لچک پیدا کردی گئی ہے کہ اب آسانی سے کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے چنانچہ محاذ جنگ پر چھٹنے والے گولوں کو پس پشت ڈال کر بہت سے سالنامے اور خاص نمبر نئے طمطراق کے ساتھ دندناتے ہوئے میدانِ صحافت میں پھٹ پڑے اور تھکے ہوئے دماغوں کو اپنی ادبی لطافت و رعنائی سے آسودگی بخشنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ادبی رسالے لڑائی کے دوران میں بھی خاص اشاعتوں سے اپنا رنگ جماتے رہے لیکن محض برائے نام۔ انتہائی کوششوں کے باوجود صورت پیدا نہ ہوسکی جو اب میسر آئی ہے۔ ان میں سے بعض رسائل کے خاص نمبروں کا ذکر فرداً فرداً کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ساقی - دہلی

ساقی کے سالنامے نے اپنی تمام پچھلی کسر پوری کرکے رکھ دی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت کچھ پیشگی ادا کر دیا گیا ہے سو دو سو یا پورے سوا تین سو صفحات پر محیط یہ ضخیم سالنامہ جب نظر کے سامنے آیا تو حیرت و استعجاب کے ساتھ ساتھ دل میں یہ شک پیدا ہوئی کہ دیکھیں ایسے کون کون سے لکھنے والے جمع کرلئے ہیں۔ "تبرعات" پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد تعجب میں اضافہ ہوتا رہا کیونکہ اس میں بعض ایسی ہستیوں کے اسمائے گرامی نظر آئے جنہوں نے ادبی خدمات سے منہ موڑ رکھا ہے اور اسی لئے ان کے رشحات قلم کسی اور جگہ دکھائی نہیں دیتے۔ "ساقی" نے انہیں ایک خواب گراں سے بیدار کیا اور وہ ایک بار پھر میدانِ ادب میں اتر آئے۔ ان بزرگوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والے بھی برابر کے شریک ہیں۔ خواتین بھی مردوں کے دوش بدوش نظر آرہی ہیں۔ ۶۰ عنوانات کے تحت علمی و ادبی اور تنقیدی مقالوں، دلپذیر افسانوں اور ڈراموں، بصیرت افروز نظموں اور غزلوں کا ایک دفتر ہے جو شروع ہونے کے بعد قارئین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کئے رہتا ہے۔ ہر شخص کے ذوق کی چیز ان صفحات میں مل سکتی ہے۔ کیونکہ نئے اور پرانے دونوں قسم کے اسالیب بیان کا لحاظ رکھا گیا ہے قیمت تین روپے۔ سالانہ چندہ چھ روپے۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ ساقی دہلی۔

کہکشاں - دہلی

سالنامے کے سرورق پر نظر پڑی تو اس کی دلکشی اور دیدہ زیبی نے دل موہ لیا۔ ایک حسین عروس نو کو سہیلیوں کے جھرمٹ میں بٹھا کر سید کاظم علی صاحب نے ہیجانِ جذبات کا وہ عالم پیدا کر دیا ہے جب اپنے ہاتھ میں نہ رہ سکنے کے باعث ساغر کو دوسروں کے سپرد کر دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اندر کی بہت سی سادہ و رنگین تصویریں بھی خراج تحسین کی حقدار ہیں۔ ان ظاہری خوبیوں سے قطع نظر معنوی اعتبار سے بھی رسالے کا معیار کافی اچھا ہے۔ بہت سے لطیف افسانے، ڈرامے اور غزلیں زینت اوراق ہیں۔ عوام کے مذاق کا لحاظ رکھتے ہوئے عمیق غور و فکر کی ان چیزوں سے احتراز کیا گیا ہے جو دماغ تھکا دیتی ہیں۔ کتابت و طباعت اور عام تیاری لائق تعریف ہے۔ ضخامت تقریباً دو سو صفحات قیمت دو روپے۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "کہکشاں" کوچہ پنڈت۔ دہلی۔

شاعر - آگرہ

اکتوبر اور نومبر ۱۹۴۶ء کے پرچوں کو ملا کر ایک افسانہ نمبر جنوری کے پہلے ہفتہ میں شائع کیا گیا ہے۔ کتابت و طباعت کی دشواریوں کو غیر معمولی تاخیر کا سبب بتایا گیا ہے جو ہمارے مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں قابل قبول ہے۔ اس خاص اشاعت میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ صرف خواتین کے افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ کل افسانوں کی تعداد انتیس ہے جن میں سے سات منظوم ہیں۔ اکثر خواتین کے خود اپنے قلم سے لکھے ہوئے حالاتِ زندگی زینت اوراق ہیں۔ مدیر "شاعر" اعجاز صدیقی صاحب نے تمام افسانوں پر الگ الگ اپنی رائے لکھنے کے علاوہ خواتین کی افسانہ نگاری پر ایک سیر حاصل مقالہ سپرد قلم کیا ہے جو بجائے خود ایک معیاری چیز ہے۔ اس شمارے کی خواتین افسانہ نگاری میں خاص شہرت حاصل کرچکی ہیں اور ان میں سے اکثر کئی کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں بطور خاص حجاب امتیاز علی اور محترمہ طاہرہ دیوی شیرازی کے افسانے جنہیں طبعزاد کہہ کر پیش کیا گیا ہے حقیقتاً طبعزاد نہیں ہیں کل ضخامت ۲۰۷ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ سالانہ چندہ مقرر نہیں حسب توفیق چھ روپے سے سوا سو روپے تک۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "شاعر" نائی منڈی۔ آگرہ۔

نظارہ - لکھنؤ

ماہ محرم کا شمارہ "ابو الفضل العباس نمبر" کے نام سے شائع ہوا ہے اور یقیناً مذہبی اعتبار سے نہایت مقدس اور لائق احترام ہے۔ حضرت عباس علیہ السلام کی برگزیدہ ہستی سے متعلق مضامین نثر و نظم شامل اوراق ہیں۔ آپ کے علاوہ دیگر شہدائے کربلا کی ارواح پاک پر بھی عقیدت کے پھول نثار کئے گئے ہیں تقریباً سبھی مضامین میں ایسے موثر انداز بیان کی جھلک پائی جاتی ہے کہ چند سطریں پڑھ کر ہی دل بے قابو ہو جاتے ہیں۔ سلام اور نوحے بھی جگر خراش اور دل سوز ہیں۔ اس خاص نمبر کا مطالعہ

(باقی صفحہ ۴۷۰ پر)

اکثر اسی راہ سے جاتے ہیں۔ بابل، نینوا، کش، اُر اور آشوریہ کے کھنڈر تاریخ دانوں اور آثار قدیمہ کے ماہروں کی توجہ مبذول کرتے رہتے ہیں ۔۱۹۴۴ء کے دوران میں تقریباً ستر ہزار سیاح بصرہ کی بندرگاہ سے اس مقصد سے گذرے۔

مارگیل (بصرہ) اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس جگہ بغداد کی وہ ریل ختم ہوجاتی ہے جس نے عراق کو ترکی کو چک سے ملا رکھا ہے اور اس طرح اس کے ٹائمنے حلب اور استنبول سے ملجاتے ہیں۔ اور چونکہ استنبول ریل کے ذریعہ یورپ کے دوسرے ملکوں سے ملا ہوا ہے اس لئے بصرہ سے ریل پر سوار ہوکر پیرس یا کیلے تک جا پہنچنا ممکن ہوجاتا ہے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۴۰ء کو پہلی دھرا دھر ٹرین بصرہ سے انقرہ گئی۔

ایک مفید بحری بندرگاہ اور یورپ کے سفر کے لئے ریلوے ٹرمینس ہونے کے علاوہ بصرہ اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ لاسلکی اور ہوائی جہازوں کا مستقر ہونے کے باعث برطانوی دولت مشترک اور بین الاقوامی ذرائع رسل و رسائل کی ایک کڑی بنا ہوا ہے۔ اس دوسری جنگ عظیم میں اس کی حالت بہت سدھر گئی کیونکہ فرانس کے زوال کے بعد اتحادیوں کے لئے مشرق وسطیٰ میں اپنی سیاسی حکمت عملی کو برقرار رکھنا بصرہ کے بغیر دشوار تھا۔ بصرہ کا فضائی مرکز ۱۹۳۵ء میں بنا تھا۔ وہاں نت نئے ہوائی جہاز اور اڑن کشتیاں موجود ہیں۔ وہاں اترنے والے مسافروں کو ہر قسم کی آسائش میسر آسکتی ہے۔ مثلاً عارضی قیام گاہوں، ہوٹلوں، شراب خانوں، کتب خانوں کے علاوہ ڈاک اور تار گھر بھی ہیں۔ اس لڑائی کے دوران میں فضائی مرکز نے نہایت مفید فوجی خدمات انجام دیں۔ جنگ کے بادل چھٹ جانے کے بعد جب فضائی آمدورفت کا نیا سلسلہ قائم ہونے لگا تو قدرتی طور پر اسے کافی اہمیت دی گئی چنانچہ بصرہ کی فضائی بندرگاہ کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ خصوصاً اس اعتبار سے کہ وہ بیک وقت بحری اور فضائی جہازوں کا مرکز بن گیا ہے۔

مختصر یہ کہ بصرہ اپنی اہمیت قائم کرنے کے لائق ہوگیا ہے اور اس کے ایک لاکھ اسی ہزار باشندے مستقبل قریب میں خوشحالی اور عیش و نشاط کی فضا میں سانس لے سکیں گے۔

قوی امید ہے کہ بصرہ کے تیل کے ذخیرے بھی جنہیں بصرہ پٹرولیم کمپنی بہتر بنانے کی صورت پیدا کر رہی ہے، اس شہر کی آئندہ فلاح و بہبود میں برابر کے حصہ دار ثابت ہوں گے۔

ضروری

دفتر رسالہ آجکل میں مضامین نثر و نظم اس قدر زیادہ تعداد میں وصول ہوتے ہیں کہ جلدی ہی انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے قلمی معاونین اپنے رشحات قلم بھیج کر ان کی فوری اشاعت کے لئے مصر نہ ہوا کریں۔ (ادارہ)

نقد و نظر — بقیہ صفحہ

غیر مسلم حضرات کے لئے بھی یہ معلوم کرنے کے واسطے مفید ہو سکتا ہے کہ مسلمانان سلف نے حق و صداقت پر قائم رہنے کی خاطر کیسی کیسی قربانیاں پیش کی ہیں۔ موضوع سے متعلق چند قدیم عمارات کی تصاویر اور اہل قلم حضرات کے فوٹو شامل ہیں۔ ضخامت تقریباً سو صفحات قیمت ایک روپیہ سالانہ چندہ چھ روپے ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "نظارہ" وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ۔

نگار لکھنؤ حسب دستور علامہ نیاز فتحپوری نے نگار کا سالنامہ ایک ہی موضوع کے لئے مخصوص کرکے "انتقاد نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ جنوری کا یہ پرچہ حصہ اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ فروری اور مارچ کا مشترکہ نمبر حصہ دوم کے طور پر شائع ہوگا۔ موجودہ شمارے میں صرف نو مقالے درج ہیں لیکن سب کے سب علمی، ادبی اور تنقیدی اعتبار سے نہایت بلند ہیں۔ ان مضامین میں مغرب و مشرق کے ادب و شعر پر عمیق نظریں ڈالتے ہوئے جملہ پروفیسر صاحبان نے اپنے غیر جانبدارانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا مقالہ "اردو افسانوں کا تاریخی و تنقیدی مطالعہ" خاص اہمیت رکھتا اور دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ باقی مقالات میں فن تنقید یا مقاصد ادب و شعر پر بحثیں کی گئی ہیں۔ اندازہ ہے کہ اگلا نمبر بھی جس کی مختصر فہرست اسی شمارے میں درج ہے، اس اشاعت خاص کا ہم پلہ ہوگا۔ دونوں پرچوں کو ایک ساتھ رکھ کر مطالعہ کیا جائے تو مفصل رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ ضخامت ۱۳۲ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ نگار۔ لکھنؤ۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ غزل .... حضرت جگر مرادآبادی ....
۲۔ ہندی اردو۔ ہندوستانی ..... پروفیسر سید احمد شاہ بخاری ....
۳۔ دکنی مثنویوں کے موضوع ...... جناب نصیر الدین ہاشمی ......
۴۔ اکبر الہ آبادی کابل میں .... مجلہ "کابل" سے ماخوذ ....
۵۔ پارلیمنٹ کی چوبیس عورتیں ...... محترمہ میرین سلیسٹر ....
۶۔ ایک ہنگامہ (مزاحیہ) ...... حضرت ناظرہ حیدرآبادی ....
۷۔ پھیلتی ہوئی کائنات ...... پروفیسر علی مہدی نقوی ....
۸۔ رشک اور غالب .... جناب نصیر احمد ناصر .....
۹۔ ہندوستانی فلم ایکٹریں ایرانی کی نظر میں .... آقائی م۔ ن۔ ہیمی ....
۱۰۔ عیادت (افسانہ) .... محترمہ شیریں ....
۱۱۔ ہمارا جدید افسانوی ادب ...... پروفیسر اکبر الدین صدیقی ......
۱۲۔ آخری شکست (ڈرامہ) ...... جناب نادان قریشی ......
۱۳۔ ییگ سار (نظم) .... منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی ...
۱۴۔ پروان (افسانہ) .... جناب موہن لال بادر ......

افریقائی ناچ

افریقہ کے قدیم باشندوں کا ناچ بھی اپنے اندر ایک جاذبیت رکھتا ہے۔ مختلف فرقوں کے ناچوں کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ ان ناچوں کا ایک خاص مظاہرہ حال ہی میں فری ٹاؤن میں ہوا۔ یہ نمائش جنگی امداد کے سلسلہ میں ہوئی تھی۔ اس نوآبادی کے کمشنر اور "فری ٹاؤن برٹش کونسل" کے ممبران اس کے انتظام میں پیش پیش تھے۔

← یہ ایک قسم کا ستار ہے جسکو یہ لوگ "کبولولی" کہتے ہیں۔

ناچ کے ساتھ اس آرکسٹرا نے باجا بجایا۔

شیطانی ناچ ـ ناچنے والی عورت کا پورا جسم کپڑوں اور پتوں وغیرہ سے ڈھکا رہتا ہے۔

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ ترجمان

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۴ - نمبر ۲۱ | یکم اپریل ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	رفتار زمانہ	ادارہ	۴
۲	دو غزلیں	جناب پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی	۷
۳	شری مہاتما ہنس راج جی (مع تصویر)	پرخیسر جگن ناتھ	۸
۴	خاندانی مرض (افسانہ)	جناب ایم اسلم	۱۱
۵	احساسات	محترمہ زہرہ جمال لکھنوی	۱۳
۶	سوبجاتی انتخاب	جناب پی گنگولی	۱۶
۷	اقبال میں تضاد نہیں	ڈاکٹر محمد دین تاثیر ایم اے پی ایچ ڈی	۱۸
۸	غزل	جناب آرزو شاہجہاں پوری	۲۰
۹	فرقہ صابیہ	جناب سید رشید احمد ارشد	۲۲
۱۰	ردعمل (ڈرامہ)	جناب آئی - اے چودھری	۲۳
۱۱	غزل	جناب حیران خیرآبادی	۲۴
۱۲	موت (نظم)	جناب عبدالمجید بھٹی	۲۵
۱۳	غزل	جناب شفیع منصور	۲۵
۱۴	قاضی نذرالاسلام	جناب محمد فخ فرخ سیوہاروی	۲۶
۱۵	ڈوبتا ہوا سورج (نظم)	جناب اختر القادری بدایونی	۲۸
۱۶	شکست (آزاد نظم)	جناب سید ابن حسن برنی	۲۷
۱۷	مشاہدات (قطعات)	جناب شمس نوید	۳۷
۱۸	تحفظ آثار قدیمہ	محترمہ کوشلیا دیوی	۳۸
۱۹	رائل جیوگرافیکل سوسائٹی	مسٹر جے آر کرون	۴۰
۲۰	لیموں کا درخت (روسی افسانہ)	محترمہ انا اسینوا	۴۲
۲۱	غزل	جناب محمد یٰسین تسکین	۴۴
۲۲	ہندی کے مسلمان شاعر	جناب پنڈت بالمکند عرش ملسیانی	۴۷
۲۳	مسئلہ خوراک	جناب راج نرائن کھنہ	۵۲
۲۴	عورت	جناب صادق حسین خستہ لکھنوی	۵۳
۲۵	ہندوستانی ثقافت پر ایرانی اثرات	جناب معظم علی	۵۴
۲۶	الفاظ کی حکومت	جناب حامد الانصاری غازی	۵۵
۲۷	رجعت (نظم)	محترمہ نکہت نسیم	۵۶
۲۸	ملایا اور سنگاپور	جناب ایس سی بھٹاچاریہ	۵۷
۲۹	مشاہدات (غزل)	جناب سائل انبیٹھوی	۶۰
۳۰	نقد و نظر	ف - ح	۶۳

نوٹ:- آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین کی فہرست آخری صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے (علیگ) ایل ایل بی

نائب مدیران
راجیندر ناتھ شیدا — ایم اے
فضل حق قریشی — دہلوی
مشیر احمد — ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ
پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ دہلی

ہندوستان اور اناج کا مسئلہ

حال کے اندازے سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں تقریباً ساٹھ لاکھ ٹن اناج کی کمی ہے جسے فوراً کہیں نہ کہیں سے حاصل کرنا لازمی ہے چونکہ جنوبی ہند میں مسلسل جھکڑ چلتے رہے، اس لئے فصل خریف خراب ہوجانے کے باعث تیس لاکھ ٹن کی کمی پیدا ہوئی پھر اس جاڑے کے موسم میں شمال مغربی ہندوستان کی زمین بارش سے محروم رہی جس سے فصل ربیع پر بہت بُرا اثر پڑا گیہوں، چنے اور جو کے کھیت خراب ہوگئے۔ اس طرح چالیس لاکھ ٹن اناج کی کمی ہوئی۔ اس مقدار میں سے تیس لاکھ ٹن اس سال اور باقی اگلے سال کام آتے۔ ان اعداد و شمار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درآمد کرنے والے کمانڈ فوڈ بورڈ سے کہا گیا ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ بہت جلد پیش کیا جائے۔ اگر اتنی مقدار میں اناج دستیاب ہوسکا تو اسے اپنے ملک تک منگانے کی صورت یہ رہے گی کہ کسی نہ کسی طرح بیس لاکھ ٹن سال کے وسط میں پہنچ جائے۔ لہٰذا معاملہ بہت نازک ہے تاہم سرکاری حلقوں میں یہ رائے قائم کی جارہی ہے کہ اگر اس قومی ضرورت کے موقع پر سب کا تعاون حاصل رہا تو پریشانی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوگی۔ فی الحال بمبئی کے پانچ، ریاست میسور کے چار، اور مدراس کے دو ضلعوں میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لیکن ان علاقوں میں چارہ سازی کا سلسلہ بھی شروع کردیا گیا ہے نتیجہ یہ کہ فاقے سے کوئی موت ابھی تک واقع نہیں ہوئی ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ سیام میں فالتو چاول بہت ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار ہندوستان کے لئے حاصل کی جاسکتی ہے لیکن باربرداری کا سوال مشکلات پیدا کررہا ہے تاہم کوشش کی جائے گی کہ اس دقت کا مداوا ہوسکے۔ حکومت ہند نے صرف باہر ہی سے مل سکنے والے اناج پر بھروسہ نہیں کیا ہے بلکہ اندرونِ ملک میں بھی ایسی تدابیر اختیار کی جارہی ہیں کہ قحط کے امکانات پیدا نہ ہوں۔ چنانچہ سب سے پہلے راشن کی مقدار میں کمی پیدا کرکے لوگوں کو آمادہ کیا گیا ہے کہ وہ اناج کے علاوہ اور چیزوں سے بھی پیٹ بھر لیا کریں۔ اس وقت تک ۷۰۰ بڑے شہروں میں راشن کا سلسلہ ہے اور باقی مقامات پر بھی شروع کرنے کی تیاریاں ہورہی ہیں تاکہ اناج کی موجودہ مقدار سب میں برابر تقسیم ہوتی رہے۔ اس امر پر بھی زور دیا جارہا ہے کہ آئندہ کاشتکاری کے جدید ترین طریقے اختیار کئے جائیں تاکہ اناج کی مقدار ضروریاتِ ملک کو اچھی طرح پورا کرنے کے لئے بڑھ سکے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندوستان سے اناج کی برآمد پر سختی کے ساتھ پھر احتساب لگادی گئی ہے حتیٰ کہ ان غیر ملکی فوجیوں کو بھی جو یہاں سے اپنے ہم وطنوں کو اشیائے خوراک کے پارسل بھیجتے رہا کرتے تھے، منع کردیا گیا ہے کہ وہ آئندہ کے لئے اس سلسلے کو بالکل بند کردیں۔ اب چھوٹا بڑا کسی قسم کا کوئی پارسل باہر نہیں جاسکے گا۔

ہیروشیما میں سائے

جاپان کے مشہور شہر ہیروشیما پر جوہری بم کو گرے ہوئے کئی ماہ گذر چکے ہیں لیکن فضا میں اس کی شعاعوں کے اثرات ابھی تک باقی ہیں۔ آئے دن سننے میں آتا ہے کہ اس کی ہلاکت آفرینی سے لوگ اندھے، مفلوج اور زخم زدہ ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن حال ہی میں ایک عجیب و غریب افواہ گرم ہوئی اور "نیوز اوف دی ورلڈ" کے نامہ نگار متعینہ ٹوکیو نے چشم دید واقعات کی بنا پر اس کی تصدیق کردی۔ کہا جاتا ہے کہ دیہاتیوں کو، دورِ روشن میں عجیب و غریب ہیولے اور تاریک سائے نظر آنے شروع ہوئے جن سے وہ حد درجہ پریشان اور سراسیمہ ہوکر دور بھاگنے لگے۔ جب دوسرے لوگوں نے ان سے تفصیل پوچھنی چاہی تو وہ مارے خوف کے کچھ بھی بیان نہ کرسکے۔ ان کے دماغ بری طرح ماؤف ہوچکے تھے۔ ایک جگہ سڑک کے آرپار منہدم پل کا سایہ نظر آیا اور کافی دیر تک قائم رہا۔ دوسری جگہ ایسا معلوم ہوا کہ ایک شخص ٹھیلے کے ساتھ بیل ہنکاتا لئے جارہا ہے۔ یہ نظارہ اتنا واضح اور صاف تھا کہ اسے فریبِ نظر سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک اور مقام پر تقریباً بارہ سال کی لڑکی اس طرح دکھائی دی جیسے وہ اپنی کتابیں بغل میں دبائے لئے جارہی ہو۔ کوشش کے باوجود اس امر کی صحیح حقیقت ابھی معلوم نہیں ہوسکی ہے تاہم اندازہ یہی لگایا گیا کہ یہ ایٹم بم کا کرشمہ ہے۔

مسئلہ فلسطین اور تحقیقاتی کمیشن

فلسطین کی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے جو برطانوی امریکی تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا تھا، اسکی عملی سرگرمیاں شروع ہو گئی ہیں۔ چند دن ہوئے اس کے ایک اجلاس میں عرب لیگ کے سیکریٹری جنرل ایم اعظم بے نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ عرب ممالک نے مسئلہ فلسطین کے سلسلے میں کس طور پر ایک متحدہ محاذ بنا لیا ہے اور اگر ضرورت ہو تو وہ اپنے نصب العین کے لئے مل کر لڑینگے۔ انھوں نے فرمایا "آج سے پہلے بھی ہم فلسطین کے سلسلے میں لڑ چکے ہیں۔ ہم ایک بار پھر لڑنے کے لئے تیار ہیں تاکہ یہودی اس ملک میں اپنا جال نہ پھیلا سکیں۔ فلسطین کو ہر حال میں ایک عرب ملک کی حیثیت دینی ہوگی۔ ایسی کوئی کارروائی ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہوگی جس سے فلسطین میں عربوں کی اکثریت قائم نہ رہ سکے"۔

اہل عرب نے ہمیشہ صبر و تحمل اور رواداری کا ثبوت دیا ہے۔ عرب کی کوئی سرزمین آجتک یہودیوں کے خون سے سرخ ہونے نہیں پائی۔ اعظم بے نے اپنی تحریری یادداشت میں بیان کیا کہ عرب لیگ ان تمام کارروائیوں کو دائرۂ عمل میں لانے کا مصمم ارادہ کر چکی ہے جن کے ذریعے صہیونی تحریک کو کامیاب ہونے سے روکا جا سکے۔ صہیونی صاف لفظوں میں کہہ چکے ہیں کہ فلسطین میں یہودی ہجرت کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہاں یہودیوں کی اکثریت ہو اور اس طرح ایک یہودی ریاست کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔ اس یادداشت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر فلسطین پر یہودیوں کا تسلط ہو گیا تو سارا ملک باہمی فسادات، بین الاقوامی نزاع اور مذہبی جہاد کا مرکز بن جائے گا۔

ہندوستانی فوجیوں کیلئے تفریحی کلب

بحری، بری اور ہوائی فوجوں کے ہندوستانی افسران عرصۂ دراز سے مصر تھے کہ انکی تفریحات کے لئے کوئی مناسب کلب قائم کیا جائے۔ حال ہی میں ہندوستان کے کمانڈر انچیف جنرل سر کلاڈ آکنلک نے اس مطالبے کی پرزور الفاظ میں تائید کی اور فیصلہ کیا کہ بہت جلد "فائٹنگ سروسیز کلب" قائم کیا جائے جو برطانوی سروسیز کلب کے نمونے پر ہو۔ چنانچہ تینوں جنگجو جماعتوں کے ہندوستانی افسران کی ایک انتظامی کمیٹی اس کلب کا دستور العمل مرتب کرنے کے لئے مصروف ہو گئی ہے۔ ابتدائی طور پر وہ کلب "مردوں کے لئے" ہوگا۔ اور اسکا صرف ایک حصہ عورتوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ اس کلب کی عمارت نئی دہلی میں ہوگی اور تیرنے کے تالاب کے علاوہ ٹینس کی قسم کے کھیل وغیرہ بھی شامل ہونگے۔ بعد ازاں اس کلب کی شاخیں لاہور، بمبئی اور کراچی جیسے مقامات پر کھلینگی۔ بحری، بری اور ہوائی فوجوں کے ہندوستانی افسران کلبوں کے ممبر بن سکیں گے ان کے علاوہ وہ کمیشنڈ افسران جو ان تینوں میں سے کسی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہوں، نیز ہندوستانی ریاستوں سے نامزد اور عہدہ داران جنگو ہندوستان کی کسی جمعیت میں کمیشن حاصل ہو، رکنیت کے مستحق ہو سکیں گے۔

لینن کی حنوط شدہ نعش

۱۹۲۴ء میں جب سویت حکومت کے بانی ولادیمیر لینن کا انتقال ہوا تو اسے روس کی سب سے بڑی شخصیت سمجھتے ہوئے چند کیمیاوی ادویات کے ذریعہ معری ممیوں کے نمونے پر محفوظ کر لیا گیا۔ یہ نعش ماسکو کے ریڈ اسکوائر نامی مقبرے میں رکھی رہی۔ لڑائی چھڑ جانے پر اسے دوسرے نوادر کے ساتھ سائبیریا کے پُرسکون علاقے میں منتقل کر دیا گیا۔ اب امن و عافیت کی فضا قائم ہو جانے کے بعد وہ تمام چیزیں واپس منگالی گئی ہیں۔ لینن کی نعش شیشے کے ایک بہت بڑے تابوت میں اس طرح بند ہے کہ اسے کھولے بغیر آسانی سے اس کی زیارت کی جا سکتی ہے۔ پروفیسر بورس زبارسکی نے جو اب تک حنوط شدہ نعش کی نگہداشت کرتے رہے تھے، ایک تحریری بیان میں بتایا کہ میں نے نعش کو محفوظ رکھنے کا راز اپنے دو شاگردوں کو بتا دیا ہے اور آئندہ وہ اس کی دیکھ بھال کرینگے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نعش ابد تک محفوظ رہ سکیگی۔ موصوف نے اچھی طرح تشخیص کرنے کے بعد یہ بھی بیان کیا کہ جنگ کے دوران میں نعش کو ماسکو سے سائبیریا منتقل کیا گیا تو اس پر کسی قسم کا کوئی ناگوار اثر نہیں پڑا۔

مشرقی افریقہ میں بعد جنگ کے منصوبے

مشرقی افریقہ کا جزیرہ زنجبار ۱۸۹۰ء سے برطانیہ کے زیر حمایت ہے۔ حال ہی میں اسکی بعد جنگ کی ترقیوں کا ایک خاکہ تیار ہوا ہے۔ برطانیہ کے ان قوانین کے زیر اثر جو نوآبادیات کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے رائج ہے۔ زنجبار کو ایک لاکھ چودہ ہزار پونڈ کا عطیہ مل چکا ہے۔ یہ رقم مکانوں کی تعمیر، تعلیم کی ترقی، حفظان صحت، آب رسانی اور دوسرے مفید کاموں پر صرف کی جائے گی۔ دس سال کی مدت میں جو رقم خرچ ہوگی اسکا اندازہ ساڑھے سات لاکھ پونڈ ہے جو ابھی سے منظور کر دی گئی ہے۔ بہت سی سڑکیں پہلے ہی بن چکی ہیں۔ آب رسانی کے سلسلے کو بڑھایا گیا ہے۔ دستکاروں کی تربیت کے لئے ایک عمدہ تربیت گاہ کھولی ہے نیز مویشیوں کے گلے رکھنے اور دودھ، پنیر کے کام کو ترقی دینے کے لئے امدادی رقوم عطا کی گئی ہیں۔ بجٹ میں اس امر کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ فوج سے علیحدہ کئے ہوئے سپاہیوں کو عارضی طور پر ملازم رکھ لیا جائے۔ یہ لوگ بھی ان تربیت گاہوں میں حسب منشا کوئی ہنر سیکھ سکیں گے۔ اسکے ساتھ ساتھ سائنسی تحقیقات کا سلسلہ بھی جاری رہیگا۔ کچھ عرصہ پہلے لونگ کے درختوں کو کسی ناگہانی بیماری کے حملے سے سخت نقصان پہنچا ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ آئندہ یہ صورت پیدا نہ ہو۔ لونگ کی کاشت زنجبار کی اقتصادی بہتری کے لئے ایک بڑی نعمت ہے یہ شکایات دور ہو گئیں تو تجارت پر خوشگوار اثر پڑے گا۔

محکمہ ڈاک و تار کی چند کارگذاریاں

محکمہ ڈاک و تار کی سالانہ رپورٹ بابت ۴۵-۱۹۴۴ء کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ ملازموں کے لئے زمانۂ جنگ کی امداد کی رقم پہلے سال کی نسبت دگنی ہوگئی تھی۔ ٹریفک اور آمدنی کے اعداد و شمار میں زبردست اضافہ ہوا۔ نیز ٹیلی کمیونیکیشن کے نظام کی اسکیم کے ایک بڑے حصہ پر عمل درآمد ہوا۔ رپورٹ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ملازموں کی امداد پر تقریباً پونے چار کروڑ روپیہ صرف کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں پچھلے سال ایک کروڑ اسی لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ اس اضافے میں حسب ذیل مدیں شامل ہیں:— جنگی الاؤنس، مہنگائی کا الاؤنس، اچھے چلن کی تنخواہ میں اضافہ، اشیائے خوراک رعایتی قیمتوں پر مہیا کرنے کا خرچ، زائد کام کا الاؤنس اور مہنگائی۔ ضرورت کے علاقوں میں ملازموں کو بونس۔ عملہ کی تنخواہوں کا بل۔ آٹھ کروڑ چھیاسٹھ لاکھ روپے کا ہوا۔ گویا امدادی رقم بل کے چالیس فیصدی کے برابر تھی۔ بمبئی اور اس کے نواح میں پوسٹ ماسٹر جنرل بمبئی نے رعایتی قیمتوں پر خوراک مہیا کرنے کی ایک اسکیم نافذ کی۔ اس قسم کی اسکیمیں بنگال، آسام، دہلی اور شملے میں پہلے سے نافذ ہیں۔ صوبہ متحدہ میں اشیائے خوراک کی امداد باہمی کی انجمنیں بند ہوگئیں مگر مدراس، احمد آباد، پونا اور ناگپور میں یہ انجمنیں بدستور چل رہی ہیں۔

جاپان کے قریب نئے آتش فشاں جزیرے

پچھلے دنوں ساحل جاپان سے تقریباً دو سو میل دور لیکن دوسرے چھوٹے چھوٹے جزیروں کے آس پاس سمندر کی تہ میں ایک آتش فشاں مادہ ابھرا اور سطح پر خشکی کے دو ٹکڑے ابھر آئے۔ کرۂ ارض کے اس حصے کے لئے یہ کوئی نئی یا تعجب انگیز بات نہیں ہے کیونکہ ایسے خطرناک جزیرے وہاں پہلے سے موجود ہیں۔ بلکہ آتش فشاں جزائر کا سلسلہ ہے جو خلیج ٹوکیو سے اوگیشی ماتک پھیلا ہوا ہے۔ اس سات میل لمبے سلسلے کو مجموعی طور پر "ازو" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ نئے جزیرے جن کی بلندی سطح سمندر سے تقریباً ... فٹ ہے وسعت اور وضع کے لحاظ سے یکساں ہیں۔ ان کے درمیان پچاس فٹ کا فاصلہ ہے لیکن اندرونی حرارت سے اس آتش فشانی کا پانی برابر کھول رہا ہے۔ آتش فشاں ملبے کے سرد ہونے میں بھی ابھی دن لگیں گے۔ فی الحال بخارات اور دھوئیں کے بادلوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ جاپانی سائنسدانوں نے اتحادیوں سے اجازت مانگی ہے کہ ہمیں ان جزیروں کی حقیقت و کیفیت کا عمیق مطالعہ کرنے دیا جائے۔

ترکی اور عراق کے تعلقات

گذشتہ ماہ ترکی اور عراق کے نمائندوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس انقرہ میں منعقد ہوئی جس کے نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے عام خیال یہ ہے کہ تمام مشرق وسطیٰ کی سیاست پر خوشگوار اثر پڑیگا۔ عراقی وفد کے لیڈر نوری سعید پاشا نے ایک بیان میں فرمایا "ہم اس مفاہمت کو جو ہمارے ملکوں کے درمیان عرصۂ دراز سے قائم ہے، زیادہ سے زیادہ استوار کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے مشرق وسطیٰ کے دوسرے ملکوں میں جاکر عام احساسات کا مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ سب باہمی اتحاد کے خواہاں ہیں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ عراق کے بعد عرب کے دوسرے ملک بھی متحد العمل ہونے کے لئے ترکی کی جانب اپنا قدم بڑھائیں گے۔" بغداد کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ اس کانفرنس میں دجلہ و فرات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے امکانات پر غور و خوض کرنے کے علاوہ تجارتی، اقتصادی اور ثقافتی پہلوؤں پر نظر ڈالی اور یہ بھی سوچا گیا کہ خطرناک افراد سے باہمی طور پر محفوظ رہنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

سائنسدانوں کی کانفرنس

ماہ جون کے تیسرے ہفتہ میں سائنسدانوں کی کانفرنس لندن میں منعقد ہوگی جس میں برطانیہ، کینیڈا، ہندوستان اور دوسری نو آبادیات کے مشہور سائنسدان شریک ہوں گے۔ اس کانفرنس کا مقصد مسائل سائنس پر غور و خوض کرنے کے علاوہ یہ ہے کہ عملی طور پر ایسی صورتیں پیدا کی جائیں کہ دولت مشترکہ کے مختلف حصوں کے سائنسدانوں میں باہمی ربط و ضبط اور ایک دوسرے سے مفاہمت ہو سکے۔ اس کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لئے کمیٹی نے رائل سوسائٹی کے ... [illegible]

انتقال پُر ملال

نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر سنی گئی کہ ۱۶ فروری کی رات کو پروفیسر حافظ محمود صاحب شیرانی ریاست ٹونک میں کچھ عرصہ علیل رہ کر اس دار فانی سے انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادارہ آجکل کو ان کے صاحبزادے حضرت اختر شیرانی سے دلی ہمدردی ہے۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ انہیں صبر جمیل عطا کرے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ مرحوم بلند پایہ محقق اور قدیم نوادر و مخطوطات کے جامع ہونے کے علاوہ علوم شرقی کے زبردست فاضل تھے۔ عرصۂ دراز تک آپ اسلامیہ کالج لاہور اور اورینٹل کالج لاہور میں بیچ طلبا کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ تنقید شعر العجم، پنجاب میں اردو، فردوسی پر چار مقالے، پرتھوی راج راسا اور دوسری کئی کتابیں مشہور ہیں جو ہمارے ادب میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ آپ قرآن مجید کے علاوہ شاہنامے کے بھی حافظ تھے۔ آپ کے اخلاق حمیدہ اور اطوار پسندیدہ کے نقوش ہر خاص و عام کے دلوں پر ثبت تھے اسی لئے آپ کے انتقال پر ملال سے ہر شخص کو دلی صدمہ پہنچا۔

دو غزلیں

جوش ملسیانی

لا اور بھی اک جام کہ آئی ہیں گھٹائیں
اے ساقیِ میخانہ تری دور بلائیں

پی لوگے تو اے شیخ ذرا گرم رہوگے
ٹھنڈا ہی نہ کردیں کہیں جنّت کی ہوائیں

دو چار جگہ خطِ جلی میں جو لکھی ہیں
وہ دفترِ عصیاں میں ہیں میری ہی خطائیں

قمری کی ہو فریاد کہ بلبل کا ہو نغمہ
دونوں ہیں مرے سازِ محبت کی صدائیں

پُرسش ہے بشر کی سرِ محشر تو انھیں سے
حق یہ ہے کہ اعمال کی زینت ہیں خطائیں

کرتی ہے ادب برقِ سرِ طور بھی ان کا
گرمائیں جن کو ترے کوچے کی ہوائیں

نادک انھیں درکار نہ خنجر کی ضرورت
قاتل سے بھی کچھ بڑھ کے ہیں قاتل کی ادائیں

اے جوشؔ جفاؤں کا تو شکوہ نہیں مجھ کو
دشمن ہیں مری جان کی بیسری ہی وفائیں

مے کشو جام اٹھا لو کہ گھٹائیں آئیں
وا اثر تو کہتی ہوئی سرد ہوائیں آئیں

عشق الفت کی سزا مل گئی آخر مجھ کو
میرے آگے مری معصوم خطائیں آئیں

اب توجہ تو مرے حال پہ ہو جاتی ہے
شکر کرتا ہوں کہ اس بت کو جفائیں آئیں

وہی مرنے کی تمنا وہی جینے کی ہوس
نہ جفائیں تمہیں آئیں نہ وفائیں آئیں

خندہ زن داغِ معاصی پہ ہوئی جاتی ہے
لو مری شرمِ گنہ کو بھی ادائیں آئین

پھر وہ آمادہ ہوئے مجھ پہ برسنے کے لئے
پھر مرے سر پہ مصیبت کی گھٹائیں آئیں

اس قدر جورِ حسیناں سے رہا خوف زدہ
حوریں آئیں تو میں سمجھا کہ بلائیں آئیں

ڈوبنے والی ہے کیا کشتیِ امید اے جوشؔ
موج تڑپی لبِ ساحل پہ دعائیں آئیں

شری مہاتما ہنس راج جی

جگن ناتھ

پچھلے پچاس برس میں ہندوستان نے چند ایسی مایۂ ناز ہستیاں پیدا کی ہیں جنہوں نے ملک کی سیاسی، تمدنی اور سماجی شکل کو بالکل ہی بدل دیا ہے۔ مادر وطن کے ان جاں نثار اور قابل فخر سپوتوں میں سے ایک شری مہاتما ہنسراج جی تھے جنہوں نے اپنے خلوص اور ایثار سے ہندوستان کے سامنے ایک ایسی قابل تقلید مثال قائم کی جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں نے بڑے بڑے لاثانی عالم اور میدان سیاسیات کے عظیم الشان شہسوار پیدا کئے ہیں۔ لیکن یہ فخر پنجاب ہی کو حاصل ہے کہ اس کے ایک سپوت نے اپنی قوت عمل سے دنیا کو ثابت کر دکھایا کہ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں ہندوستانی خود اپنے گھر کا انتظام اغیار کی سرپرستی یا امداد کے بغیر زیادہ اچھی طرح پر کر سکتے ہیں۔ مہاتما جی کی پیدائش سے پہلے گو پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا۔ پھر بھی یہ صوبہ ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے بہت پیچھے تھا۔ لیکن جب آپ کی مرتیو ہوئی تو پنجاب کسی بھی صوبہ سے سیاسی اور سماجی طور پر پیچھے نہ تھا۔ بلکہ قومی تعلیم اور ساماجک سدھار میں تو یہاں کے لوگ دیگر صوبوں کے لوگوں سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ جہاں ۱۸۸۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے صرف بیس نوجوانوں نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی وہاں ۱۹۳۰ء یعنی تقریباً پچاس سال بعد ہم کیا دیکھتے ہیں کہ صوبہ میں ہر طرف سکولوں اور کالجوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے تقریباً ۶۰ کالج اور ۳۳۴ ہائی سکول صوبہ کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرتے ہیں لیکن ان میں سے صرف ۱۹ کالج اور ۸۳ ہائی سکول ایسے ہیں جن کا انتظام براہ راست سرکار کے ہاتھ میں ہے۔ باقی اداروں کا انتظام صوبہ کی مختلف پبلک سوسائٹیوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان سب اداروں کا معرض وجود میں آنا دیانند کالج کی کامیابی کا مرہون منت ہے۔ اور دیانند کالج کی کامیابی کا سہرا مہاتما ہنسراج جی کے سر پر ہے جنہوں نے پچیس سال تک بغیر تنخواہ لئے محض حب الوطنی کے جذبہ سے متاثر ہو کر کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے شاندار خدمات سرانجام دیں اور اس کے بعد کالج کمیٹی کے پریذیڈنٹ بن کر ایسے وقت میں اس کی رہنمائی کی جبکہ اس کی ہستی تک خطرہ میں تھی۔ اس لحاظ سے اگر ہم مہاتما ہنسراج کو موجودہ پنجاب کا جنم داتا کہہ دیں تو مبالغہ آمیزی میں شامل نہ ہوگا۔

مہاتما جی کا جنم ۱۹ اپریل ۱۸۶۴ء میں ضلع جالندھر کے ایک چھوٹے سے قصبہ بجواڑہ میں ہوا۔ کمسنی ہی میں پتا جی کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے آپ کو ابتدائی تعلیم حاصل کرنے میں بہت سی رکاوٹیں پیش آئیں۔ خانگی مشکلات اور مالی حالات تنگ ہونے کی وجہ سے گو آپ سکول میں داخل نہ ہو سکے لیکن تعلیم حاصل کرنے کا شوق از حد تھا اس لئے پرائمری تعلیم آپ نے گھر پر ہی اپنی کوششوں سے حاصل کر لی۔ بعد ازاں بڑے بھائی کے مجبور کرنے پر آپ گورنمنٹ ہائی سکول ہوشیار پور میں داخل ہو گئے۔ ۱۸۸۰ء میں مہاتما جی کے بڑے بھائی لالہ ملکھراج جی انٹرنس پاس کرنے کے بعد لاہور چلے آئے تاکہ اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکیں لیکن بعض وجوہات کی بنا پر آپ نے تعلیم چھوڑ کر پوسٹ آفس میں ملازمت اختیار کر لی۔ اور سارا خاندان لاہور چلا آیا۔ اس وقت مہاتما جی مشن سکول کی آٹھویں جماعت میں داخل ہوئے۔

مہاتما ہنسراج جی کے لاہور آجانے سے ان میں ایک نمایاں تبدیلی آگئی۔ ہونہار پہلے ہی تھے۔ یہاں آکر ان کو ایسے دوست اور ایسی اچھی فضا ملی جس کا ان کی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد جب آپ کالج میں داخل ہوئے تو راجہ نریندر ناتھ۔ لالہ لاجپت رائے اور گورودت ودیارتھی ان کے محبوب ترین ساتھیوں میں سے تھے۔ اس وقت تک لاہور میں ایک خاص تبدیلی آ چکی تھی۔ ۱۸۷۵ء میں شری سوامی دیانند جی مہاراج نے بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے آریہ سماج کے اصول عوام کے سامنے رکھے اور جب سوامی جی ۱۸۷۷ء میں لاہور تشریف لائے تو چاروں طرف جوش و خروش کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ پنجاب کے ہندوؤں میں کافی بیداری آگئی اور جب لاہور میں آریہ سماج کی بنیاد رکھی گئی تو تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک بہت بڑا حصہ اس تحریک میں پورے دل سے شامل ہو گیا۔ رشی دیانند کے پرچار سے لوگوں کی آنکھوں میں ایک نئی روشنی آگئی اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۷۷ء پنجاب میں ایک زبردست مذہبی اور سماجی انقلاب کا سال تھا۔ مہاتما ہنسراج اور ان کے ساتھیوں کے دل و دماغ قدرتی طور پر اس انقلاب سے بہت اثر پذیر ہوئے۔

مہاتما جی زمانۂ طالب علمی ہی میں آریہ سماج کے کام میں کافی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اور جب انہوں نے بی۔ اے پاس کیا تو ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ کون سا پیشہ اختیار کیا جائے جس سے سماج کی اصلاح کا کام کرنے کے لئے بھی کافی وقت مل سکے۔ خوش قسمتی سے ایسے حالات پیدا ہو گئے جس سے اس مشکل کا حل بہت آسانی سے ہو گیا۔ اکتوبر ۱۸۸۳ء میں شری سوامی دیانند کی مرتیو ہو گئی جس سے سارے ہندوستان کو

عموماً اور پنجاب کو خصوصاً ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ آریہ سماجیوں کے دلوں پر تو گویا غم کی بجلی گر پڑی۔ آخر ہر طرف سے آوازا ٹھنے لگی۔ کہ رشی کی یاد میں ایک ایسا ٹھوس کام شروع کیا جائے جس سے آئندہ نسلیں فائدہ اٹھاتی رہیں۔ آخر بہت غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ دیانند اینگلو ویدک کالج کی بنیاد رکھی جائے جس میں سنسکرت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ موجودہ زمانہ کی سائنس کی تعلیم بھی دی جائے۔

اب سوال یہ تھا کہ اس ساری تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے روپیہ کہاں سے حاصل ہو لیکن مہاتما ہنس راج جی کی قربانی اور ان کے بھائی لالہ ملکھ راج جی کی ہمت اور محنت نے آریہ سماجیوں کی سب الجھنوں کو سلجھا دیا۔ مہاتما جی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ساری عمر بغیر تنخواہ ڈی۔ اے۔ وی کالج کی خدمت کریں گے۔ اور لالہ ملکھ راج جی اس بات پر رضامند ہوئے کہ وہ اپنی تنخواہ کا نصف حصہ مہاتما جی کو دے دیا کریں گے۔ پنجاب ان دونو بھائیوں کی قربانی کا ہمیشہ شکر گزار رہے گا۔ کیونکہ انہی کی بلند ہمتی اور ان تھک محنتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ آج پنجاب کے لوگ زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج بہت جلد ایک عظیم الشان ادارہ بن گیا۔ اور آج یہ ہندوستان کے بڑے بڑے کالجوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۳۸-۱۹۳۷ء میں اس کالج کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ اس موقع پر کالج کمیٹی کی طرف سے جو رپورٹ شائع کی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس سال میں ۹۵۸۲ گریجوئیٹوں نے اس کالج کے ذریعہ ڈگریاں حاصل کیں۔ علاوہ ازیں ڈی۔ اے۔ وی کالج جالندھر اور ڈی۔ اے۔ وی کالج کانپور بھی ۱۰۹۳ نوجوانوں کو بی۔ اے کی ڈگریاں دلا چکے ہیں۔ پچھلے تیس برس میں ڈی۔ اے۔ وی ہائی سکول لاہور کے ذریعہ ۴۸۰۹ طالب علموں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور تقریباً چالیس دوسرے ڈی۔ اے۔ وی ہائی سکول پندرہ ہزار طالب علموں کو میٹرک کا امتحان پاس کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ دیانند آیور ویدک کالج سے تقریباً ۵۰۰ نوجوان ویدک کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں دیانند براہم مہا ودیالیہ اور دیانند انڈسٹریل سکول بھی صوبہ کی قابل قدر خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ یہ اعداد و شمار ۳۷-۱۹۳۶ء تک کے ہیں جب کہ شری مہاتما ہنس راج جی کی مرتبہ ہوئی۔ اسی سال ڈی۔ اے۔ وی کالج اور اس کے ماتحت دوسرے اداروں کا سالانہ خرچ ۰۰۰،۴۵۰ روپے تھا۔ اور کالج کی عمارت کی قیمت اور کل سرمایہ کا اندازہ ایک کروڑ روپیہ سے زائد تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دیانند کالج کمیٹی کی خدمات سے طبقہ نسواں بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہنس راج مہلا مہا ودیالیہ ایک عظیم الشان ادارہ ہے۔

جس کا انتظام براہ راست دیانند کالج کمیٹی کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں لڑکیوں کے لئے بی۔ اے تک کی تعلیم کا نہایت معقول انتظام ہے۔

یہ سارا کام مہاتما جی کی محنت اور قربانی کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ چاہتے تو اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح گورنمنٹ میں کسی اونچے عہدہ پر فائز ہو سکتے تھے مگر خدمت وطن کی خاطر انھوں نے غربت کو امارت پر ترجیح دی۔ ان کی عظیم الشان قربانی کا خاطر خواہ اثر نہ صرف ہندوں پر بلکہ دوسرے طبقوں پر بھی پڑا اور آج ملک کے گوشے گوشے میں ایسے قومی سکول اور کالج دکھائی دیتے ہیں جن کا سارا انتظام خود ہندوستانی کرتے ہیں خود پنجاب میں کئی سناتن دھرم، خالصہ اور مسلم سکول اور کالج کام کر رہے ہیں۔ ان سب کا بیج اس وقت بویا گیا تھا جب مہاتما ہنس راج نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی ساری زندگی قوم اور وطن کی خدمت میں گذار دیں گے۔ مسلمان سوشل ریفارمر مہاتما جی کی مثال عموماً اپنے لوگوں کے سامنے رکھتے تھے۔ اور کئی دفعہ پنجاب کے مسلمان لیڈروں کی زبانی یہ سنا گیا کہ انکی زندگی پر مہاتما جی کی قربانی نے نمایاں اثر کیا ہے۔

جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے مہاتما جی نہ صرف تعلیم کے میدان ہی میں ان کے قائد اعظم تھے بلکہ وہ ان دھارمک اور سماجک لیڈر بھی تھے۔ آریہ پرادیشک پرتی ندھی سبھا پنجاب، سندھ، بلوچستان کے کام کا سارا بوجھ آپ ہی کے مضبوط کندھوں پر تھا اور اس سلسلہ میں آپ سارے پنجاب کا دورہ کرتے اور لیکچر دیتے رہتے تھے۔ جب کبھی ملک کے کسی حصہ میں عوام کو کوئی تکلیف ہوتی تو آپ آریہ سماجی کارکنوں کے ساتھ فوراً امداد کے لئے وہاں پہنچ جاتے۔ جموں اور گڑھوال کے قحط میں۔ کانگڑہ، بہار اور کوئٹہ کے زلزلوں میں غرضکہ جہاں کہیں لوگوں کو کسی قسم کی مصیبت کا سامنا پیش آجاتا مہاتما ہنس راج امداد کے لئے پہونچنے والوں میں سب سے اولین ہوتے تھے اور ان کے ساتھی عوام کی بے غرض خدمت کے لئے دن رات ایک کر دیتے تھے۔

مہاتما جی کی زندگی معاشرتی نقائص کے خلاف جد و جہد کی ایک لمبی کہانی ہے۔ ان کا یقین تھا کہ جب تک ہندو اپنی سماجی کمزوریوں کو دور نہ کر لیں وہ کسی طرح سے بھی ترقی نہیں کر سکتے۔ آپ شروع سے ہی ذات پات کی بے جا تمیز کے خلاف تھے اور بچپن کی شادی کو قوم کے لئے سخت نقصان دہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے آپ نے یہ قاعدہ بنوا دیا تھا کہ نہ صرف ڈی۔ اے۔ وی ہائی سکول میں ہی بلکہ ڈی۔ اے۔ وی کالج کی ایف۔ اے کی جماعتوں میں بھی کوئی شادی شدہ طالب علم داخل نہ کیا جا سکے گا۔ آپ بیوہ عورتوں کی شادی کے حق میں بھی تھے۔ اور اس سلسلہ میں آپ نے مرحوم سر گنگا رام کی خوب امداد کی۔ سماج کی کمزوری دور کرنے کے لئے آپ کی جد و جہد نے پنجاب کی فضا پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں منعقد ہونے والی مشغل

سوشل کانفرنس کے آپ صدر چنے گئے اور اس سلسلہ میں جو تقریر آپ نے کی اس کو پڑھ کر اب بھی سماج سدھارک بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مہاتما ہنسراج سب سے محبت کرتے تھے۔ مگر ظلم کو برداشت کرنا ایک گراوٹ تصور کرتے تھے۔

مہاتما جی سادہ زندگی اور اونچے وچاروں کی زندہ مثال تھے۔ جب انھوں نے دیانند کالج کی خدمات بلا تنخواہ سرانجام دینے کا ارادہ کیا تو اس وقت ان کے بھائی کی تنخواہ اسی روپے ماہوار تھی۔ اس کا نصف یعنی چالیس روپے ماہوار مہاتما جی کو مل جاتے تھے اور اس قلیل رقم میں وہ اپنا اور اپنے سارے کنبے کا گذارہ کیا کرتے تھے۔ لاہور شہر کے اندر وہ ایک معمولی سے مکان میں رہائش رکھتے تھے۔ عزت اور افلاس کی یہ زندگی بسر کرتے ہوئے وہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے اور نہ ہی انھوں نے کبھی اپنے دوستوں سے انکے سخت مجبور کرنے پر بھی کسی قسم کی امداد لینا گوارا کیا۔ پھر کفایت شعاری کا یہ عالم کہ ان حالات میں بھی اپنے غریب دوستوں کی امداد کے لئے کچھ نہ کچھ روپیہ بچا ہی لیتے تھے اور ملنساری کا یہ حال کہ راجاؤں مہاراجاؤں سے لے کر غریب سے غریب انسان تک ملنے کے لئے آتے سب ایک ہی طرح خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ان کی حب الوطنی، عالی دماغی، پاکیزہ زندگی اور ایثار ہر کسی پر اپنا اثر چھوڑتی تھیں اور کوئی بھی ان کا مداح ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

مہاتما ہنسراج قوم اور وطن کے خاموش خدمت گذار تھے۔ آپ شروع سے ہی سودیشی کپڑے پہنتے تھے۔ جب کبھی سفر پر جاتے سارے سامان کا انتظام خود اپنے ہاتھوں کرتے اور تھرڈ کلاس ہی میں بیٹھتے تھے فضول شان اور دکھاوے کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور کبھی یہ خیال دل میں نہ لاتے کہ وہ ایک بڑے کالج کے پرنسپل ہونے کی حیثیت سے ملک کی ممتاز ترین ہستیوں میں سے ہیں۔ طرہ یہ کہ انھوں نے کبھی دل میں نہ سمجھا کہ وہ کوئی خاص قربانی یا ایثار کر رہے ہیں۔

۱۶ نومبر ۱۹۳۸ء کو مہاتما جی سورگباش ہو گئے۔ جسمانی طور پر وہ ہمارے اندر موجود نہیں لیکن آریہ سماج اور ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج میں انہی کی روح کام کر رہی ہے۔ دیانند کالج ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے جو ان کے خیالات اور جذبات کی روشنی کو ملک میں چاروں طرف پھیلاتا رہے گا۔ آنے والی نسلیں مہاتما جی کا نام ہمیشہ عزت سے لیا کریں گی اور ان کے نقش قدم پر چل کر قوم اور ملک کی خدمت کرنا اپنے لئے قابل فخر سمجھیں گی۔

خاندانی مرض

افسانہ

ایم اسلم

مرزا صاحب یوں تو بڑی خوبیوں کے آدمی تھے لیکن ضرورت سے زیادہ تلون مزاج اور زود رنج بھی تھے اگر بدقسمتی سے مزاج کا مقیاس الحرارت کہیں چڑھ جاتا تو پھر تو وہی بات ہوتی کہ ع
میں جو سیدھی بھی بات کرتا ہوں الٹیاں وہ مجھے سناتا ہے!

جلال کی حالت میں اول تو کسی کی سننی ہی گوارا نہ ہوتی اور جو کوئی متنفس بھی ہوتا تو سمجھ لیجئے کہ اس کمبخت کی اور بھی شامت آجاتی۔ لیکن ایک مصیبت اور بھی تھی۔ بیگم صاحبہ بھی خیر سے بڑی غصیلی طبیعت کی واقع ہوئی تھیں۔ اور جو کبھی دونوں ہی بدقسمتی سے جلال میں آجاتے تو پھر گھر کے لوگ تو رہے درکنار، اڑوس پڑوس والے بھی محفوظ نہ رہتے۔ یعنی گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا۔

مصیبت یہ تھی کہ مرزا جی کو یہ پرانا مرض تھا کہ گھر میں ان کا حکم چلے۔ کیونکہ ایک تو وہ اپنے کو خاندان کا بزرگ کہتے تھے۔ دوسرے وہ بیگم صاحبہ کو بیاہ کر لائے تھے اور بقول انکے بیگم انہیں بیاہ کر نہیں لائی تھیں۔ پھر وہ خیر سے مرد تھے اور بیگم محض ایک عورت اور وہ بھی فرمودۂ خدا کے مطابق مردسے کم عقل۔ اور مرزا جی بزعم خود اپنے کو صرف لقمان ثانی ہی نہیں بلکہ بالکل ہی لقمان کا جانشین سمجھتے تھے۔ ادھر بیگم تھیں جنہیں یہ دعویٰ تھا کہ حضرت حوا کی وراثت صرف انہیں کے حصے میں آئی ہے۔ حضرت حوا کا وارث ہونے کی بحث میں تو ہم پڑنا نہیں چاہتے۔ ہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ باوجود مرزا جی کے ناک بھوں چڑھانے کے اگر گھر میں ملہ تھا تو بیگم صاحبہ کا ہی تھا۔ اور کسی کی مجال نہ تھی کہ سرتابی کرے۔ لیکن انکے ساتھ ہم آپکو یہ بھی بتائے دیتے ہیں کہ چونکہ مرزا جی کو بیگم صاحبہ سے بقول ان کے عشق تھا اسلئے ہار بھی ہمیشہ انہی کو ماننی پڑتی۔

لیکن یہ حکومت کا مسئلہ عموماً بحث کا موضوع بن جاتا اور اس بحث سے لڑائی جھگڑے کا راستہ خود بخود صاف ہو جاتا۔ اور آناً فاناً محلے میں یہ خبر پھیل جاتی کہ آج مرزا جی اور محترمہ میں ٹھن گئی۔ اور ہوتا یہ کہ بیگم صاحبہ فوراً اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتیں اور ماما کو حکم ہوتا کہ سمیٹو ہمارا اسباب ہم میکے جا نکلیں۔ بھاڑ میں جائے یہ گھر اور ساتھ گھر والے بھی۔

لیکن میکے کا نام سنتے ہی مرزا جی کے اوسان گم ہونے لگتے۔ کیونکہ ساس کی شکل تو رہی ایک طرف، اس کے نام سے بھی آپ کو نفرت تھی۔ مرزا جی کی ساس تھی تو ایک عورت ہی لیکن غضب کی عورت۔ ایک مصیبت آفت اور خود مرزا صاحب کے الفاظ میں "خدا کا جیتا جاگتا قہر"۔ تو ادھر بیگم صاحبہ نے میکے جانے کی دھمکی دی، ادھر مرزا صاحب کا غصہ یا جلال سب رفو چکر ہونے لگا۔ اور آپ فوراً مصالحت کا رویہ اختیار کر لیتے اور جیسے بھی بن پڑتا اس مصیبت سے بچنے کی کوشش کرتے۔

مرزا صاحب کے اپنی ساس سے اسقدر خائف رہنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ شادی سے پہلے آپ کی مالی حالت کچھ ایسی اچھی نہ تھی۔ لیکن حسب ونسب کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے۔ اسی لئے بیگم کے والدین نے مرزا جی سے شادی کر دی تھی اور اسی رو سے مرزا صاحب کو جائز یا ناجائز تمام سسرال والوں کی برداشت کرنی پڑتی۔ اور اگر اس جھاڑ جھپاڑ کے موقع پر مرزا صاحب کے کوئی ملنے والے آجاتے اور اس کھٹ پٹ کا اگر وہ کچھ اشارتاً ذکر کرتے تو آپ مسکرا کر صرف اتنا ہی فرمایا کرتے کہ ؎

رکھنے لگا لئے تھے کہ اگر حسب ونسب کے
لڑکی کو پھر ہمارے حوالے ہی کیوں کیا

اور اس کے ساتھ ہی کہتے "بھئی! خانگی معاملات مت پوچھا کرو ہم سے"۔ گو دس پانچ منٹ میں ساری کتھا خود ہی سنا دیا کرتے۔

آپ کی ساس برملا کہا کرتی کہ ہم نے زر دے کر داماد خریدا ہے۔ مجال نہیں کہ نمک حرام (ساس کی بارگاہ سے مرزا جی کو نمک حرام کا خطاب عطا ہوا تھا) ہمارے اشارے سے بھی انحراف کرے۔ لیکن کچھ عیال دار ہو جانے کے بعد مرزا صاحب نے کچھ انحراف کرنا شروع کر ہی دیا اور آپ بھی کبھی گرج کر فرما دیا کرتے کہ ہم داماد ہیں، غلام نہیں۔ ہماری خاندانی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانا کسی روز تم لوگوں کو مہنگا پڑے گا۔

ایک روز بیگم صاحبہ سے کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی کہ حضرت ساس علیہم البلا کہیں سے نازل ہو گئیں۔ پہلے تو کچھ دیر چکی بیٹھی دونوں جانب کی بک بک جھک جھک سنتی رہیں لیکن تابکے۔ آخر ماں تھی۔ بیٹی کی حمایت کرتے ہوئے داماد پر صلواتیں سنانی شروع کر دی۔ اس پر مرزا صاحب کو بھی تاؤ آگیا اور آپ نے پورے جلال میں آکر کہا "میں داماد ہوں غلام نہیں۔ میری خاندانی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانا تم لوگوں کو مہنگا پڑے گا کسی روز"

بس اب کیا تھا۔ ساس سے بھی ٹھن گئی۔ اور لگی آپس میں تو تو میں میں ہونے۔ مرزا جی جو ذرا جلال میں آگئے تو اس اللہ کی بندی نے جوتا اتار کر مرزا جی کے منہ پر دے مارا اور دس پانچ نفیس نفیس صلواتیں بھی سنا گیا اور سات پشت تک کا شجرۂ نسب کچھ ایسے استادانہ رنگ میں گن دیا کہ سودا مرحوم بھی اگر زندہ ہوتے تو شاید وہ بھی حشر تک داد دیتے رہتے۔ تو جناب اس روز کی عزت افزائی سے مرزا صاحب کچھ ایسے مرعوب ہوئے کہ اب جو کبھی بیگم صاحبہ میکے جانے کی دھمکی دیتیں تو آپ فوراً ہتھیار ڈال دیتے۔ اور

ایک شوہر کی طرح اپنے حقوق منوانے کی بجائے بیگم صاحبہ کے دامن میں پناہ لینے میں ہی سلامتی نظر آتی۔

ایک روز حسب معمول دونوں میاں بیوی میں کچھ تکرار ہو رہی تھی۔ بیگم صاحبہ فرما رہی تھیں۔ "میرے ماں باوا کا دم نہ ہوتا تو آج اس گھر میں جوتی جھنتیاں نظر آتیں۔ اماں غریب کے منہ سے اگر کوئی بات نکل جائے تو اس کی گردن مارنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ اگر کسی وقت محبت سے بھی کچھ کہہ دے تو اس کے سر ہونے کو لپکتے ہیں۔"

"جی ہاں!" مرزا صاحب بولے۔ "بات بات پر ہمیں نمک حرام کہنا بھی تو محبت ہی کا بول ہے۔ جہنم میں جائے ایسی شادی۔ توبہ ہے ہمارے باپ دادا کی بھی جو ہم شادی بیاہ کا نام بھی لیں تو۔ غضب خدا کا دنیا تو ہمیں داماد سمجھتی ہے اور یہاں ایک غلام برابر بھی ہماری عزت نہیں۔ آخ تھو ایسی عزت پر جو محض ایک بیوی کی خاطر اتنا ذلیل کروائے۔ جب تک دنیا ہے بیویوں کی بھی کمی نہیں" یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔ ماما باورچی خانے میں بیٹھی ہنس رہی تھی کہ اچانک مرزا صاحب ادھر ہی کو آ گئے اور ماما کو ہنستے ہوئے دیکھ کر غصے سے بولے "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ہم میں تکرار ہو رہی ہے اور تم تماشہ سمجھ رہی ہو۔ اس مصیبت میں تمہیں ہنسی سوجھ رہی ہے۔ یہ کام کرنے کا وقت ہے یا ہنسنے کا؟"

ماما ذرا خوش شکل تھی اور مرزا صاحب کی کچھ عرصہ سے اس پر خاص نظرِ عنایت بھی تھی، اور جو کبھی موقع ملتا تو مرزا جی دل لگی بھی کر لیا کرتے۔ اس لئے وہ بھی اپنے کو مرزا صاحب کا "ہم راز" سمجھا کرتی تھی اور چوری چھپے کی بات چیت میں آقا اور خادم کا امتیاز بھی نہ رہتا۔ ماما نے فوراً مرزا صاحب کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا "سرکار! کام کرتے ہوئے ہنسنا کہیں منع تو نہیں"

"بس خاموش رہو" مرزا صاحب نے آقائی رعب جماتے ہوئے کہا۔ "بہت بڑھ چلیں اب تم بھی۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے"

"توبہ ہے میرے اللہ!" ماما نے پھر مسکرا کر کہا "آپ تو سیدھی بات بھی الٹی ہی سمجھتے ہیں"۔

"چپ رہو جی تم!" مرزا صاحب نے غصہ سے کہا۔ "ہماری تضحیک تمہارے لئے ہنسی بن رہی ہے گویا یہ کیا سمجھ رکھا ہے تم نے ہمیں"

"اے سرکار!" ماما نے کہا "بھول ہو گئی معاف کر دیجئے۔ لونڈی سے ایسی جرأت ہو سکتی ہے بھلا۔ میں تو نمک خوار ہوں۔ حضور کے سامنے بیٹھی دن کاٹ رہی ہوں"

"اس وقت نمک خوار ہونے کا سوال نہیں" مرزا صاحب نے کہا۔ مرزا صاحب کو جب کبھی اکیلے میں بات کرنے کا موقع ملتا تو یہی کہا کرتے۔

ماما نے کہا "لیکن بندی تو یہ کبھی بھول نہیں سکتی کہ آپ آقا ہیں اور میں لونڈی" ماما بھی تخلیہ میں یہی جواب دیا کرتی تھی۔ مرزا صاحب کو خوف ہونے لگا کہ کہیں بیگم صاحبہ سر نہ ہو جائیں اس لئے گرج کر بولے۔

"لیکن تم ہنس کیوں رہی تھیں۔ کہیں بھانڈوں کا تماشا ہو رہا تھا کیا؟"

ماما نے پھر ذرا مسکرا کر کہا "بھانڈوں کا تماشا تو کہیں نہیں ہو رہا تھا لیکن سرکار نے بات ہی کچھ ایسی کہی کہ بندی کو بے اختیار ہنسی آ گئی" "کیا کہہ رہے تھے ہم؟" مرزا نے رعب دار آواز سے پوچھا۔

ماما نے پھر مسکرا کر ہولے سے کہا "وہی جو آپ ہمیشہ کہا کرتے ہیں۔ اور اگر کسی روز بیگم صاحبہ کو بھی کچھ بھنک پڑ گئی تو بس میری خیر نہیں" "ماما"! آپ نے ذرا ڈانٹ کر کہا "گویا تم ہماری کسی وقت کی کمزوری کا اس وقت فائدہ اٹھانا چاہتی ہو۔ خبردار! کہیں اس بھلاوے میں مت رہنا"

"تو بس"! ماما نے بھی بگڑ کر کہا "آج سے آپ نے بھی اگر مجھ کو کوئی ایسی ویسی بات کہی تو بیگم صاحبہ سے کہہ دوں گی جا کر فوراً" "بس بس" "ارے خدا کے لئے ذرا ہولے تو بولو تم" مرزا صاحب نے خوشامد سے کہا۔ "کیا غضب کر رہی ہو وہ کمرے میں ہی تو بیٹھی ہیں"

"تو تشریف لے جائیے آپ بھی" ماما نے روٹھے انداز سے کہا۔ "جائیے! کام کرنے دیجئے"

"ارے ہو!" مرزا صاحب نے ذرا مسکرا کر کہا "تم بھی روٹھنے لگیں کیا؟"

لیکن ماما اب ذرا بلند آواز سے بولی۔ "اے سرکار! مجھے کام کرنے دیجئے۔ کھانے میں دیر ہو گئی تو بیگم صاحبہ ناراض ہوں گی اور آپ کو دل لگی سوجھ رہی ہے" اور مرزا جی کھسیانے ہو کر باہر آ گئے۔

تو خیر! اس قسم کے ڈرامے تو گھر میں ہوا ہی کرتے تھے۔ اور اہلِ خانہ کے علاوہ آس پاس والے بھی ان سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ لیکن میاں بیوی کی لڑائی عموماً دو برتنوں کا ٹھکرانا ہی ہوا کرتی۔ ابھی دونوں طرف سے مورچہ لگ رہا ہے۔ آتشیں الفاظ منہ سے مشین گن کی گولیوں کی طرح نکل رہے ہیں۔ پھر بلا وجہ ہی صلح کا سپید جھنڈا! جو ننانوے فیصدی مرزا جی کی طرف سے دکھایا جاتا، اور اس کے بعد

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر!

اب آپ ایک مزے کی بات سنئے۔ ایک روز مرزا جی کہیں باہر سے آئے تو حسب معمول آتے ہی ٹوپی اتار کر پلنگ پر پھینک دی اور ابھی شیروانی اتار رہے تھے کہ باہر سے نوکر نے اطلاع دی کہ کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔ مکان کے دروازے

کے سامنے گھاس کا ایک چھوٹا سا قطعہ تھا۔ اسی جگہ مرزا صاحب کرسیاں ڈال کر بیٹھا کرتے تھے۔ آپ گھر سے نکل کر ٹہلنے والے کے پاس جا بیٹھے۔ کچھ دیر بعد پھر اندر آئے تو جانے ماما کی کشش تھی جو باورچی خانے میں جا گھسے۔ لیکن ماما تو موجود نہ تھی۔ مگر ایک ٹوپی میں مٹر پڑے ہوئے تھے۔ بس یہ دیکھتے ہی مرزا جی کا پارہ چڑھ گیا اور آپ نے وہیں سے بیگم صاحبہ کو آواز دی "ذرا ادھر آئیے گا" لیکن بیگم نے کچھ جواب نہ دیا۔ آپ نے پھر آواز دی۔ "اجی! ہم بلا رہے ہیں۔ ہم!"

"کیا ہے!" بیگم نے دوسرے کمرے میں سے پوچھا۔

"تم آؤ تو بتائیں بھی" مرزا جی نے جواب دیا۔

"معلوم ہے مجھے!" بیگم نے جواب دیا۔ "آج گوشت دیر سے آیا تھا۔ اس لئے کھانے میں دیر ہو گئی۔ ہو جائے گا تیار ابھی"

"ہم کھانے کا نہیں کہہ رہے" مرزا صاحب نے جواب دیا۔

"تو اور کیا!" بیگم نے کہا۔

"ہم پوچھتے ہیں راستے میں دریا تو نہیں پڑتا" مرزا صاحب بولے۔ "جو کشتی منگوا دیں"

"او ہو!" بیگم نے جواب دیا "مزاج درست بھی ہو گا کبھی"

"کوئی درست رہنے بھی دے"! مرزا جی نے جواب دیا۔

"کون تھا نگوڑا جو اس وقت آ دھمکا یہاں؟" بیگم نے پوچھا "کم بخت نہ دن دیکھتے ہیں نہ رات، بس منہ اٹھائے چلے آ رہے ہیں"

"موت تھی!" مرزا صاحب غصے سے بولے "سن لیا؟"

اور بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔ "نگوڑی جب آتی ہے خالی ہی جاتی ہے"

"تو کیا ہمیں لے جائے؟" مرزا جی نے بگڑ کر کہا۔ "درگاہ پر جا کر منت مانو"

"مجھے کیا پڑی جو منت مانوں" بیگم نے کہا "منت وہ مانیں جو مجھ سے بیزار رہتے ہیں۔ کیا مجال جو ایک منٹ بھی یہاں آرام سے بیٹھ سکے کوئی"

اور مرزا جی نے زور سے تھوک کر کہا۔ "اس گھر میں تو جینا قیامت نکل آیا ہے ہمیں۔ جانے کس منحوس گھڑی ہم نے جنم لیا تھا۔ کیا مجال ہے کوئی چیز ٹھکانے سے کہیں مل سکتی ہو نہیں یہاں۔ آج تف اس زندگی پر! کوئی احمق ہی ہو گا جو ہمیں انسان سمجھتا ہو۔ حالت دیکھو تو ڈھور ڈنگر سے بدتر۔ خدا کی قسم! یہ چنوں کمہار کے گدھے ہی ہم سے اچھے ہیں۔ مالک کسی وقت ان سے غافل تو نہیں ہوتا"

ممکن تھا کہ یہ تقریر کچھ عرصہ جاری رہتی لیکن بیگم صاحبہ نے کمرے سے نکل کر پوچھا۔ "کیوں اتنے برہم ہو رہے ہیں آپ؟"

"جی ہاں!" مرزا صاحب نے جواب دیا۔ "ایک ہم ہی تو ہیں جو برہم ہوتے ہیں لیکن اپنے ارگنوں کی بھی خبر! جس میں نت نئے راگ نکلتے ہیں"

"آخر ہوا کیا؟" بیگم نے پوچھا۔ "جو اتنی چیخ پکار ہو رہی تھی"

"آنکھیں تو تمہیں بھی خدا نے دی ہیں" مرزا جی بولے۔ "دیکھ لو!"

"کیا دیکھوں" بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔ "مجھے تو کہیں بھتنے ناچتے نظر آتے نہیں"

"جی ہاں!" مرزا صاحب بولے۔ "بھتنے ناچتے تو تب نظر آئیں جو کوئی دیکھنے کی چیز تمہاری بھی یوں برباد ہو جائے"

"کیا ہوا برباد آپ کا" بیگم بولیں۔ "کچھ کہئے گا بھی اب؟"

"یہ کیا ہے؟" مرزا جی نے ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"ٹوپی ہی تو ہے!" بیگم نے جواب دیا۔ "کیا ہوا اسے؟"

"سبحان اللہ!" آپ نے ذرا طنزاً مسکرا کر کہا۔ "آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی ہم سے پوچھتی ہو؟"

"یہ آپ میری آنکھوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے آج؟" بیگم نے جھنجھلا کر کہا۔

"ذرا اپنی ماما کے کرتوت تو دیکھو" مرزا صاحب بولے۔ "مٹر ڈالنے کو ہماری ہی ٹوپی رہ گئی تھی کیا؟"

"آپ کی ٹوپی؟" بیگم بولیں۔ "لیکن ......"

"لیکن کیا؟" مرزا جی نے بات کاٹ کر کہا۔ "یہی تو ہے جو ہم گھر میں پہنا کرتے ہیں۔ کناروں پر چیکٹ نہیں لگ رہی کیا؟"

"لگ تو رہی ہے" بیگم بولیں۔ "لیکن میں کہتی ہوں ......"

مرزا جی نے بات کاٹ کر کہا۔ "تم یہی کہو گی نا کہ ماما سے غلطی ہو گئی۔ اور یہی بات ہم سننے کو تیار نہیں ہیں"

"لیکن میں کب ماما کی غلطی کہہ رہی ہوں" بیگم نے جواب دیا۔ "ماما تو ......"

احساسات

اپنے ہر تارِ نظر میں گو انہیں پاتی ہوں میں
پھر بھی دل کی الجھنوں میں اپنے کھو جاتی ہوں میں

لذتِ غم میری راحت، سوزِ دل میرا سکون
تلخئ ناکامیابی میں مزا پاتی ہوں میں!!

وقتِ رخصت ان کی نظروں نے جو سونپی تھی کبھی
آج تک وہ یاد سینے میں نہاں پاتی ہوں میں

اک طرف ان کی امیدیں اک طرف ماتم سیاں
زندگی کی رہگذر سے یوں گذرتی جاتی ہوں میں

ان سے یوں ملتی ہوں اپنے دل کی خلوت گاہ میں
جیسے کوئی گمشدہ سی چیز پا آئی ہوں میں

چاند کو تاروں کو، گل کو، چھائے باغ کو
دیکھتی ہوں اور پھر مایوس ہو جاتی ہوں میں

درد کی لذت میں اتنا لطف اب آنے لگا
زندگی کی عشرتوں کو بھولتی جاتی ہوں میں

انکی نظروں نے نہ جانے چپکے چپکے کیا کیا
دل بہلتا ہی نہیں گو لاکھ بہلاتی ہوں میں

لوٹ لی دنیا تری شاید نگاہِ ناز نے
آج کچھ کھوئی ہوئی زہرہ تجھے پاتی ہوں میں

زہرہ جمال

"جی ہاں!" مرزا جی نے پھر بات کاٹ کر کہا۔ "ماما تو فرشتہ ہے تمہاری، تم ماما کی وکالت نہ کرو تو کون کرے؟"

"مجھے کیا پڑی جو میں ماما کی وکالت کروں؟" بیگم بولیں۔ "وکالت تو وہ کریں جو سو سو حیلے بہانے سے باورچی خانے کا طواف کرتے ہیں۔"

لیکن مرزا جی نے بیگم کی چوٹ نظر انداز کر کے کہا۔ "ہم پوچھتے ہیں کب تک یوں ہوا کرے گا۔ آخر ہم بھی تو اسی گھر میں رہتے ہیں؟"

"میں نے کب کہا" بیگم بولیں۔ "کہ یہ میرا گھر ہے؟"

"لیکن!" مرزا جی بولے۔ "مٹر ڈالنے کو ہماری ہی ٹوپی تھی کیا؟"

"لیکن آپ کی ٹوپی تو ...."

"جی ہاں!" مرزا جی بولے۔ "تم یہی کہو گی کہ ہماری ٹوپی تو بے کار ہو چکی تھی۔"

"ہرگز نہیں!" بیگم بولیں۔ "مجھے اس سے کیا کہ خراب ہو یا نہ ہو۔ میں تو صرف ...."

"جی ہاں!" مرزا جی نے اس 'جی ہاں' کو لمبا کر کے کہا۔ "یہ معلوم ہے جو کچھ تم کہو گی۔ یہی نا کہ انسان سے بھول ہو ہی جاتی ہے اور بھول میں صرف ہماری ہی چیزوں کا ستیاناس کیا جاتا ہے۔"

"لیکن میں تو بھول کا نام بھی نہیں لے رہی۔" بیگم نے کہا۔ "ماما تو ...."

اور مرزا صاحب نے پھر بات کاٹ کر کہا۔ "جی ہاں! ماما تو تمہاری فرشتہ ہے۔ ایک گنہگار تو ہم خاکسار ہی ہیں اس گھر میں۔"

"لیکن میں نے کب کہا کہ آپ فرشتہ ہیں اور وہ گنہگار ہے؟" بیگم نے جواب دیا۔ "میں تو کہہ رہی ہوں کہ ذرا ...."

مگر مرزا جی نے پھر ٹوک کر کہا۔ "ذرا آجاتے تو سرزنش کرو گی۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا؟"

بیگم نے اب ذرا غصے سے کہا۔

"مجھے کیا پڑی کہ میں کسی کو سرزنش کروں۔ آپ لڑائیے چوری چھپے آنکھیں۔"

"عجب واہیات ہو تم۔" مرزا صاحب گرج کر بولے۔ "تمہاری ان فضول باتوں سے ہمارے نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ کیا بیہودگی ہے اور کتنی بدتمیزی ہے کہ ہماری ٹوپی میں مٹر ڈال دیئے جائیں۔ اور جو ہم اعتراض کریں تو دو کوڑی کی ماما کی خاطر ہمیں ہی جھٹلایا جائے۔ چلو اگر یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ اب نہ مٹر پکیں گے آج اور نہ ہم یہ ٹوپی پہنیں گے کبھی۔"

یہ کہنے کے ساتھ ہی آپ نے ٹوپی اٹھا کر بازار کی طرف پھینک دی۔ مٹر تو سب ادھر ادھر بکھر گئے۔ ٹوپی ایک کتا لے بھاگا۔ سامنے سے گدھے والا گدھے لئے آتا تھا۔ اس نے کتے سے ٹوپی چھین کر خود پہن لی۔ اور ادھر ہماری گلی آتا۔ اچھا جی! کی تانیں اڑاتا اپنی راہ ہو لیا۔ اتنے میں باہر سے نوکر نے آواز دی۔

"ماما! مستری کی ٹوپی دے جائیو!"

مرزا صاحب نے ذرا خوفزدہ نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"مستری کون؟"

"بجلی ٹھیک کرنے والا۔" بیگم نے جواب دیا۔ "بلوایا جو تھا اسے۔"

"آہو!" مرزا صاحب نے ذرا مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہم بالکل ہی بھول گئے۔ تو ہو گئی بجلی ٹھیک؟"

باہر سے پھر آواز آئی۔ "ماما! ٹوپی لاؤ۔ مستری کھڑا انتظار کر رہا ہے۔"

مرزا جی نے بیگم کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تو یہ ٹوپی مستری کی تھی کیا؟"

"جی ہاں!" بیگم نے جواب دیا۔ "مستری کی۔"

"بھلا کھاؤ تو ہمارے سر کی قسم!" مرزا جی بولے۔ "یا محض ہمارے چڑانے کو کہہ رہی ہو تم؟"

"خیر جو کچھ آپ سمجھیں۔" بیگم نے جواب دیا۔ "اب ٹوپی دیجئے اسے۔ باہر کھڑا انتظار کر رہا ہے۔"

"لیکن وہ یہاں رکھ کیوں گیا؟" مرزا جی نے غصے سے کہا۔ "بہت بدتمیز ہے جو ہمارے باورچی خانہ میں ٹوپی رکھ دی لا کر۔"

"باورچی خانے کی بجلی درست کرتا ہوگا۔ ٹوپی بھی یہیں رکھ دی ہوگی۔" بیگم نے جواب دیا۔

"عجیب تماشہ ہے۔" مرزا صاحب بولے۔ "ہم اپنی ٹوپی کیسے نہ پہچان سکے۔"

"یہ آپ جانیں۔" بیگم نے کہا۔ "آپ کی ٹوپی کی طرح کی دنیا میں اور تو کوئی پہن ہی نہیں سکتا گویا۔ اب دیجئے اسے واپس یا اپنی نئی ٹوپی دے دیجئے۔"

"ابھی صبر کرو تم۔" مرزا جی نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "تمہیں ٹوپی کی پڑ رہی ہے اور ہمیں اور فکر ہو رہی ہے۔ جانے کیا لکھا ہے قسمت میں ہماری۔"

"فکر کیسی؟" بیگم بولیں۔ "ٹوپی دو کی نہ ہوگی تین کی ہوگی۔ دیجئے روپیہ! یہاں قسمت کی بات کیا آ پڑی۔"

"استغفر اللہ!" مرزا صاحب نے طنزاً مسکرا کر کہا۔ "یہاں جان کے لالے پڑ رہے ہیں اور تمہیں دو ایک روپے کا فکر ہو رہا ہے۔ جانے کس احمق نے بیوی کو محرم راز کہدیا۔ اور خاص کر ہمارا۔"

"مجھے کیوں فکر ہونے لگا۔" بیگم نے جواب دیا۔ "میری گرہ سے تو روپے نہیں جا رہے۔"

"لیکن ہم پوچھتے ہیں۔" مرزا جی نے بیگم کی طرف دیکھ کر کہا۔ "پہلے بھی کبھی بھولا ہوا؟ تمہیں یاد ہو تو بتاؤ ہمیں۔"

"کیا؟" بیگم نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی نسیان کا دورہ!" مرزا جی نے جواب دیا۔ "شاید تمہیں معلوم نہ ہو۔ یہ مرض تو ہمیں ورثہ میں ملا ہے۔" دادا جان کو بھی آخری دم تک نسیان کی شکایت ہی رہی اور قبلہ والد صاحب بھی اکثر اس میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ اور آج ہماری بھی وہی حالت ہو رہی ہے۔ خدا رحم کرے۔ بہت موذی مرض ہے ہم اپنی ٹوپی تک نہ پہچان سکے۔ دیکھو جی! کچھ فکر کرو ہمارا۔ آج اپنی ٹوپی بھول گئے۔ کل فلاں کو بھول کر کسی اور کے گھر میں نہ گھس جائیں کہیں۔ تم کیا جانو! اس مرض والا بڑی بڑی عجیب باتیں کرتا ہے۔ تم کہو تو ذرا حکیم جی کو نبض جا کر دکھا دیں۔" ادھر نوکر برابر آوازیں دیئے جا رہا تھا کہ ماسٹر کی ٹوپی لاؤ۔ بیگم صاحبہ بولیں۔ "نسیان کا علاج تو پھر بھی ہو جائیگا لیکن پہلے اس غریب کو ٹوپی کی قیمت تو دلوا دیجئے۔ کب تک کھڑا انتظار کرے گا؟" بس یہ سنتے ہی مرزا جی کا پارہ چڑھ گیا اور آپ گرج کر بولے "جہنم میں جائے ٹوپی اور ٹوپی والا۔ ہمیں اپنی جان کا فکر ہو رہا ہے۔ اور تمہیں ٹوپی والے کو پانچ سات آنے دینے دو بھر ہو رہے ہیں۔ کیا پیر جی کی پھٹکار ہے کہ اپنوں کا بھی خون سرد ہو گیا ہے اس زمانے میں۔ شاید یہ بھی ایٹم بم کا ہی اثر ہو گا۔"

اتنا کہہ کر آپ باورچی خانے سے تشریف لے گئے اور بیگم صاحبہ نے ٹوپی والے کے دام بھر دیئے۔ اور اس طرح یہ قصہ ختم ہوا۔

صوبجاتی انتخابات

اگر آپ ہندوستان کے سیاسی نقشہ پر نظر ڈالیں تو سب سے پہلے جو چیز آپ کو نظر آئے گی وہ اس کے بے شمار رنگ ہوں گے آپ دیکھیں گے کہ اس میں بہت سی جگہ سرخ رنگ بھرا ہوا ہوگا، کہیں ہلکا کہیں گہرا۔ پیلا رنگ سب سے زیادہ آپ کو نظر آئے گا۔ لال رنگ مٹیالے رنگ کے ٹکڑوں میں جھلکتا ہوگا اور اودے رنگ کو بھی کہیں کہیں ضرور جگہ ملی ہوئی ہوگی۔ انہی رنگوں کے ذریعہ ہندوستان کا نقشہ نویس ملک کے مختلف صوبوں اور ریاستوں کو، جو مل جل کر اسے بجائے خود ایک برّ اعظم بنائے ہوئے ہیں، ظاہر کرتا ہے۔ اس مضمون میں ہمیں ہندوستان کے کل رقبہ میں سے صرف آٹھ لاکھ بیس ہزار مربع میل جگہ سے بحث کرنا ہے۔ کیونکہ اسی علاقہ کو برطانوی ہندوستان کہتے ہیں۔ باقی کا علاقہ جو غالباً سات لاکھ مربع میل کا ہے متفرق دیسی ریاستوں میں بٹا ہوا ہے۔ صرف اول الذکر علاقہ ہی میں صحیح معنوں میں ایسی مجالس قانون ساز قائم ہیں جو ہر صوبہ کی حکومت کو چلاتی ہیں اور پبلک میں امن و امان قائم رکھنے کی خدمت اور فرض کو انجام دیتی ہیں۔

صوبوں کا یہ انتظام شروع ہی سے اس طرح نہیں چلا آتا ہے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہر صوبہ کی پبلک کو خود اختیاری حکومت قائم کرنے کا استحقاق ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے ملا ہے۔ اس سے پہلے صوبہ کے باشندوں کو سرکاری کاروبار میں کم دخل تھا۔ لیکن یہ تصور کر لینا بھی غلط ہوگا کہ ۱۹۳۷ء سے پہلے (مذکورۂ صدر قانون کا نفاذ اسی سال میں ہوا تھا) حکومت پبلک سے بالکل ہی رائے نہ لیتی تھی۔ رائے ضرور لی جاتی تھی۔ لیکن جن سے مشورہ کیا جاتا تھا وہ صوبہ کی عام آبادی کے ایک بہت ہی قلیل اور محدود حصہ کے نمائندے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اس طریقۂ حکومت میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض بہت ہی اہم امور پر رائے عامہ بالکل ہی ٹال دی جاتی تھی۔ ۱۹۳۵ء کے قانون کی رو سے یہ سب باتیں جاتی رہیں۔

پی۔ گنگولی

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے، آجکل تمام ہندوستان میں جوش و خروش بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کے مختلف حلقوں سے لے کر دور افتادہ گاؤں تک، غرض ہر جگہ تقریروں کا سلسلہ جاری ہے۔ ملک کے سیاسی رہنما ہر روز اس حلقہ سے اس حلقہ میں جاتے رہتے ہیں۔ اس تمام گہما گہمی کے پس منظر میں صرف ایک چیز کار فرما ہے اور وہ ہیں "انتخابات"۔

خود یہ لفظ اور اس کی نوعیت ایک شہری کی زندگی میں اس قدر اہم کام انجام دے رہی ہے کہ جو لمحہ اس کے صحیح معنوں کو ذہن نشین کرنے کے لئے صرف ہوگا وہ ضائع نہ جائے گا۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ لفظ "انتخاب" کے معنی ہیں وہ طریقہ کار جس کے ذریعہ کوئی شہری مرد یا عورت (بشرطیکہ اسے اس کا استحقاق ہو) اپنے صوبہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتا یا کرتی ہے کہ وہاں کی حکومت کس طرز کی ہو۔ یہ بات ناممکن ہے کہ پورے صوبہ کے تمام باشندوں کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے واسطے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو چن لیا جاتا ہے۔

چونکہ جمہوریت کے معنی ہیں وہ طریقۂ حکومت جو زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی فلاح کو مدنظر رکھے، اس لئے جو لوگ آبادی کے بڑے حصہ کے نمائندہ ہوتے ہیں انہی کو منتخب شدہ سمجھا جاتا ہے۔ اور یہی لوگ طریقۂ حکومت کو طے کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ہندوستان کے لئے مناسب سمجھا گیا ہے کہ یہاں کی تمام جماعتوں کی نمائندگی الگ الگ کرائی جائے۔ اسی لئے یہاں کی نشستیں "مخصوص" ہیں جس قانون کی رو سے نشستوں کی تخصیص کی گئی ہے اس کو "کمیونل اوارڈ" (فرقہ وارانہ تخصیص کا قانون) کہتے ہیں۔ اس کی رو سے ہندوستان کے مختلف فرقوں کے حقوق کا تحفظ ہو گیا ہے اور کوئی ایک طاقتور فرقہ اپنے سے کمزور فرقہ کے حقوق کو غصب نہیں کر سکتا۔

آیئے اب بعض خاص خاص اعداد و شمار کا جائزہ لیں۔ ہندوستان میں ایسے صوبے گیارہ ہیں جہاں گورنر رہتے ہیں۔ انتخابات انہی گیارہ صوبوں میں ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا یہ گیارہ صوبے یہ ہیں:- مدراس، بنگال، بمبئی، صوبہ جات متحدہ، پنجاب، بہار، سی۔ پی اور برار، آسام، صوبہ سرحد، اڑیسہ اور سندھ۔

ان میں سے ہر ایک صوبہ میں حکومت خود اختیاری یکساں نہیں ہے۔ بعض صوبوں میں انتخابات دو مجالس قانون ساز کے لئے ہوتے ہیں اور بعض میں مجلس قانون ساز صرف ایک ہی ہے۔ ایک مجلس کو لیجسلیٹو اسمبلی کہتے ہیں اور دوسری کو لیجسلیٹو کونسل۔ اسمبلی تو ہر صوبہ میں ہے لیکن مدراس، بنگال، بمبئی، صوبہ جات متحدہ، بہار اور آسام میں کونسلیں بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسمبلی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ کونسل کے ممبر آبادی کے بہت تھوڑے حصہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور اسمبلی میں قریب قریب کل آبادی کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس کی تشریح ان اعداد سے بھی ہو سکتی ہے کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں اسمبلیوں کے رائے دہندگان کی کل تعداد تین کروڑ، ایک لاکھ سینتیس ہزار نو سو چودہ تھی اور کونسلوں کے رائے دہندوں کی نواسی ہزار پانچ سو اکتیس۔

رائے دہندگی کے بارے میں ہم بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔ اس کا مفہوم مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ رائے کے معنی یہ ہیں کہ رائے دینے والا اپنی خواہش ظاہر کرتا ہے کہ اس کی نمائندگی فلاں شخص کرے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی خواہش ظاہر کرنے والا یا رائے دینے والا کون شخص ہو سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب دینا آسان بات نہیں ہے۔ ہر صوبہ میں استحقاق رائے دہندگی کے قواعد مختلف ہیں۔ لیکن ہر صورت میں جائداد کی ملکیت مع ادائے مالگذاری یا کرایہ مکان، یا انکم ٹیکس ضرور شامل ہوتی ہے۔ بعض کو تعلیم کی بنا پر بھی حق رائے دہندگی حاصل ہوتا ہے۔ عورتوں کے لئے قانون علیحدہ ہو رہے۔ ایک خاص اور اہم چیز عمر کی قید بھی ہے۔ رائے دہندہ کی عمر اکیس سال ضرور ہونا چاہئے۔ اور ہوش و حواس قائم و درست ہوں۔ کسی خاص حلقہ کی سکونت بھی لازمی ہے۔ ہر قانون کے تحت میں یہی خیال کارفرما ہے کہ ہر صوبہ میں رائے دہندے قریب قریب ایک ہی درجہ کے ہوں۔

انتخابات کے موقع پر ایک بڑا مشکل کام رائیوں کا صحیح طور پر جمع کرنا ہے وہ بھی پورے صوبے ایسی بڑی جگہ میں۔ اس مشکل کا حل اس طرح کیا گیا ہے کہ پورے صوبے کو مختلف حلقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ انہی حلقوں سے لوگ منتخب ہو کر اسمبلیوں کی نشستیں حاصل کرتے ہیں۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ قانوناً مختلف اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کر دیا گیا ہے۔ یعنی مسلمانوں، سکھوں، ہندوستانی عیسائیوں اور اچھوتوں وغیرہ کے لئے نشستیں مخصوص کر دی گئی ہیں۔ یہ نشستیں منتخب شدہ اشخاص سے پر ہوتی ہیں۔

دیکھنے کے لئے پورے صوبے میں سے کل کتنے آدمی رائے دہندگی کے قابل ہیں، ایک گوشوارہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس گوشوارہ میں ہر قوم اور فرقہ کے آدمیوں کے نام درج ہوتے ہیں جونہی یہ گوشوارے تیار ہو جاتے ہیں اور مختلف سیاسی جماعتیں اپنے اپنے امیدواروں کا چناؤ کر لیتی ہیں۔ پورے صوبے میں بڑا جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام تمام دن لاؤڈ اسپیکر گونجتے رہتے ہیں، جلوس نکالے جاتے ہیں اور امیدوار مع اپنے حمایتیوں کے گشت لگاتا لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا اور اپنی جیت اور مخالف کی ہار کے سامان پیدا کرتا ہے۔ یہ سب باتیں انتخابات کے خاص دن کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ ان دنوں عجیب چہل پہل اور گہما گہمی رہتی ہے۔ اس زمانہ میں غریب سے غریب کسان اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ہاں امیدوار اور بڑے بڑے آدمیوں کا گزر ہوتا ہے۔ کیونکہ صرف ایک رائے بھی ہار کو جیت میں تبدیل کر سکتی ہے۔ سب سے زیادہ جوش و خروش رائے ڈالنے کے دنوں میں ہوتا ہے۔ ہر حلقہ میں کم از کم ایک، ورنہ ایک سے زیادہ انتخاب گاہیں ہوتی ہیں ان کے ارد گرد ہر امیدوار کا خیمہ ہوتا ہے۔ خیموں کے پاس سیلوں کی سی بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ بڑے بڑے تختوں پر نعرے لکھے رہتے ہیں۔ بعض دفعہ رائے دہندوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے ڈھول اور نقارے بھی بجائے جاتے ہیں۔ غرض رائے دہندوں کو اپنے ڈھب پر لانے کی وقت کے وقت تک ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ چونکہ ہر طرف جوش و خروش بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے اس لئے پولیس کا بھی انتظام ضرور کیا جاتا ہے۔

رائے ڈال دینے سے پہلے رائے دہندہ کو ایک اور ضابطہ کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ وہ یہ کہ پولنگ افسر کو اس بات کا اطمینان دلانا ہوتا ہے کہ رائے دہندہ کا نام رائے دہندوں کے گوشوارہ میں موجود ہے اور یہ کہ شناخت کی پرچی جو اس کے پاس ہے وہ جھوٹی اور مصنوعی نہیں ہے۔ اس مرحلے کے طے ہو جانے کے بعد رائے دہندہ کو رائے کی پرچی دے دی جاتی ہے۔ چونکہ رائے دہندگی بالکل خفیہ اور پوشیدہ ہوتی ہے اس لئے رائے کی پرچی پر کوئی نشان ایسا نہیں ہوتا جس سے رائے دہندہ کا کوئی اتہ پتہ لگ سکے۔

اس خیال سے کہ رائے دہندہ کی رائے صرف اسی شخص کو ملے جس کو وہ اپنی رائے دینا چاہتا ہے رائے ڈالنے کے کمرہ میں ہر امیدوار کا ایک علیحدہ صندوق رکھ دیا جاتا ہے۔ عام طور پر ہر صندوق کا رنگ مختلف ہوتا ہے۔ صندوق کے اندر رائے کی پرچی کا ڈال دینا ہی رائے کا ڈال دینا ہے۔

ہر صوبے میں انتخابات کے متعلقہ قوانین کسی قدر مختلف ہوئے ہیں لیکن اس مضمون میں جو طریقہ اور لائحہ عمل بیان ہوا ہے وہ ہر صوبہ میں بنیادی طور پر یکساں ہی ہوتا ہے۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اچھوتوں کی مخصوص نشستوں کے انتخاب کے مخصوص طریقہ کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ اس کو دہرا انتخاب کہہ سکتے ہیں تفصیل اس کی یوں ہے۔ اچھوتوں کو اول اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرقہ میں سے چار آدمیوں کو چن لیں۔ اس کے بعد صرف یہی چار آدمی اصل انتخاب میں کھڑے ہونے کے مستحق ہوتے ہیں۔ اصلی اور آخری انتخاب اچھوتوں اور اونچی جاتی کے ہندوؤں کی رائے سے عمل میں آتا ہے۔

یہ ہے وہ طریقہ جس کی رو سے ہر صوبہ کی اسمبلیوں کے ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ کونسلوں کے ممبروں کا انتخاب بھی اسی طریقہ پر ہوتا ہے۔

قلمی معاونین

مضامین نثر و نظم بھیجتے وقت اس امر کا لحاظ رکھا کریں کہ مسودے صاف، خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف ہوں تاکہ کتابت میں آسانی ہو اور غلطی کا امکان نہ رہے۔ (ادارہ)

اقبال میں تضاد نہیں

ڈاکٹر دتہ تابش

"آجکل" مورخہ یکم فروری ۱۹۷۶ء میں میکش اکبرآبادی" علامہ اقبال کے متضاد نظریئے کے زیرعنوان لکھتے ہیں کہ (۱) اقبال کا کلام متضاد نظریوں کا مجموعہ ہے۔ (ب) یہ تضاد نامحمود ہے۔ (ج) اقبال کی تصانیف ان کی زندگی میں بار بار شائع ہوئیں۔ یہ تضاد بآسانی مٹایا جاسکتا تھا مگر نہیں مٹایا گیا۔ (د) اقبال کے مضامین نثر بعد از وفات اقبال یکجا شائع ہونے سے وہ "ہمارے سامنے پورے طور سے آگئے ہیں" اور اس کمل تصویر میں جا بجا تضاد کے ناپسندیدہ داغ نظر آتے ہیں۔ پندرہ فروری کی اشاعت میں یکم فروری والا مضمون مکمل ہوتا ہے۔

صریح تضاد بیانی کے ثبوت میں مندرجہ ذیل موضوعات پر بحث کی گئی ہے: (۱) وحدت الوجود (۲) مادہ اور روح (۳) ترک عالم (۴) حقیقت عالم (۵) نظر باطن (۶) افلاطون (۷) تعلید (۸) مشائخ نقشبندیہ (۹) مرزا بیدل (۱۰) قادیانیت (۱۱) ابن تیمیہ (۱۲) علم و حکمت (۱۳) خودی۔ ان کے علاوہ کچھ غیر صریح تضاد بھی گنوائے گئے ہیں۔

مثلاً یہ کہ اقبال رومی کے مرید ہیں مگر ابن عربی کے مخالف حالانکہ رومی شاگرد ہے قونوی کا اور قونوی شاگرد ہے ابن عربی کا۔ اور رومی اور ابن عربی ہمہ اوست کے مبلغ ہیں جس کے اقبال "مخالف" ہیں۔ نیز یہ کہ وہ بایزید کے بھی مداح ہیں اور ان کے مخالف ابن تیمیہ کے بھی، امام ابوحنیفہ کے بھی اور عبدالوہاب نجدی کے بھی! [میکش صاحب یہاں اقبال کو ہمہ اوست کا مخالف قرار دیتے ہیں اور بعد ازاں موافق بھی اور مخالف بھی! کیا یہ تضاد نہیں]

شاید یہ غیر صریح تضاد جسکا ذکر ضمنی طور پر کیا گیا ہے۔ حضرت میکش کی مشکلات حل کرنے میں صریح تضاد کی بحث سے زیادہ مفید ثابت ہو۔ اقبال کے نقاد عموماً چند مفروضات وضع کرکے اقبال کے کلام میں سے انکی تائید کی تلاش کرتے ہیں۔ حضرت میکش نے غالباً یہ فرض کرلیا ہے کہ اقبال کسی خاص گروہ، فرقے یا مسلک کے پابند ہوں گے اور اس خاص حلقے سے باہر قدم رکھنا ان کے لئے ممنوع ہونا چاہیئے ورنہ کفر نہیں تو تضاد کا فتویٰ لازم آتا ہے۔ یہ رومی، قونوی، ابن عربی، بایزید، ابن تیمیہ، ابوحنیفہ، عبدالوہاب (رحمتہ اللہ علیہم) سب قرآن و حدیث کے پیرو تھے۔ اہل اسلام تھے۔ اگر ان کے درمیان بنیادی تضاد تھا تو کیا اسکا یہ مطلب ہوا کہ اسلام تضاد کا منبع ہے یا یہ کہ صداقت کی روشنی بلور میں سے چھن کر کئی رنگ دکھاتی ہے، اور اقبال جہاں، جہاں اپنا رنگ دیکھتا ہے صداقت کی گواہی دیتا ہے اور بکھری ہوئی کرنوں کو سمیٹ کر ایک نیا آفتاب بناتا ہے۔ مگر یہ ہرگز شاعری

اور ہمارا مدعا ہے خالص علمی بحث۔

بنیادی بحث سے پہلے چند فروعی معاملات کا تصفیہ کرلیا جائے تو بعد میں آسانی رہے گی۔ مثلاً یہ کہ اردو میں اقبال کے مضامین نثر ابھی تک یکجا نہیں ہوئے اور چونکہ میکش صاحب نے اس بحث میں غالباً فقط اردو کے مضامین کو پیش نظر رکھا ہے اس لئے "پورے اقبال" کی قطعیت محل نظر ہے جب تک تمبر نوشتہ والے مضامین پوری طرح اور صحیح طور پر ترجمہ نہ ہوں گے۔ ملا اقبال کی مکمل تصویر اردو میں نہ آسکے گی (گو میری رائے یہ ہے کہ اقبال کے فرمودات نثر کو محض ان کے کلام کی تشریح کے لئے استعمال کرنا چاہیئے اور اقبال کے کلام کو ان کے دیگر فرمودات پر ترجیح دینی چاہیئے) چنانچہ اقبال کے فرمودات پر پوری نظر نہ رکھنے کے باعث اور پورے اقبال پر حصر کرنے کے مغالطے سے میکش صاحب کو موضوع دہم ("قادیانیت") کے بیان میں غیرضروری الجھن کا سامنا کرنا پڑا۔ قادیانیت کی تعریف میں جو بیان نقل کیا گیا ہے وہ غالباً اقبال کے ایک انگریزی لیکچر کے ترجمے سے لیا گیا ہے جو ۱۹۱۱ء میں یا اس سے پہلے دیا گیا۔ اور جبکہ مولانا ظفر علی خاں نے اردو میں ترجمہ کیا تھا دہلی اخبار (Sunrise) نے اقبال کے مضمون ختم نبوت پر اعتراضات کے سلسلے میں انہی دنوں سکا حوالہ دیا تھا اور اقبال نے اسکا جواب بھی شائع کردیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ "پچیس سال پہلے مجھے قادیانی تحریک سے نیک نتائج کی توقع تھی۔ مجھ سے پہلے مولوی چراغ علی نے بانی تحریک قادیان کو براہین احمدیہ کی تصنیف میں مدد دی۔ مگر کسی تحریک کے صحیح اثرات اور رجحانات چند دنوں میں پوری طرح ظاہر نہیں ہوتے۔ خود اس تحریک کے اندر دو فرقے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشائخ قادیان خود ان اثرات سے کما حقہ آگاہ نہ تھے۔ مجھے اس تحریک کے خطرات سے رفتہ رفتہ آگاہی ہوئی اور جب میں نے دیکھا کہ یہ لوگ رسول اکرم کا ذکر گستاخی سے کرتے ہیں تو مجھے سخت طیش آیا۔ درخت جڑ سے نہیں بلکہ پھل سے پہچانا جاتا ہے اور اگر تم یہ کہتے ہو کہ میرا موجودہ رویہ پہلے رویے کے نقیض ہے تو ہوتا رہے۔ ایک موسیجی کہتے ہیں، زندہ انسان کے خیالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہیں بدلتا تو پتھر نہیں بدلتا"۔

ایک طرح سے اقبال کا یہ جواب میکش صاحب کے تمام مضمون کا جواب ہے۔ اگر میکش صاحب کے مفروضات کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو پھر میکش صاحب نے جس طرح قادیانیت کے سلسلے میں اقبال کے شائع شدہ بیانات پر پوری طرح غور نہیں کیا اور جہاں تناقض مٹایا گیا ہے اسے بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اسی طرح اور موضوعات کے سلسلے میں پوری توجہ سے

کام نہیں لیا۔ ورنہ اسقدر مشکلات لاحق نہ ہوتیں۔

میں ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ تضاد اگر ہے تو اس کارگاہِ عالم میں ہے۔ انسانی زندگی کے عام مظاہر میں ہے اور یہ اضداد ہی کی کارفرائی ہے جس سے حقیقت ہر آن نئی شان سے جلوہ گر ہوتی رہتی ہے۔ نوعِ انسانی کا ارتقا، تہذیب و تمدن کی ترقی، آزادی کی جنگ اور فتح، سب اسی تضاد قوائے عالم کا ظہور ہے۔ غلامی کی انتہائی ذلت (غلامی کی رات) آزادی کی بلند مقامی (آزادی کی صبح) کا موجب بنتی ہے۔ خیر کے ساتھ شر کا وجود وابستہ ہے۔ خدا رحیم بھی ہے قہار بھی ہے! تو پھر تضادِ بیان پر کیا اعتراض ہے۔ جب مظاہرِ عالم کی بنیاد تضاد پر ہے۔ اگر تضاد ایک حقیقت ہے تو پھر ترجمانِ حقیقت؟ اقبال ان اضداد کے بیان کی وجہ سے کیوں "نامحمود" گردانا جائے۔ ان ضدوں کو جمع کرنے کا ہنر ہی تو فلسفہ ہے۔ ان کو مان کر ان کے رجحانات کا اندازہ کرنا اور پھر ایک خاص دور میں زندگی کی قوتوں کا صحیح رخ متعین کرنا ایک دانشمند رہنما کا کام ہے۔ ایک ہی چیز کی نفی اور اثبات بذاتِ خود ناروا نہیں جیسا کہا گیا ہے ؎

نفیِ آں یک چیز و اثباتش رواست — چوں جہت شد مختلف نسبت دوتاست

اقبال میں تضادِ بیان نہیں بلکہ اجتماع و تطبیق اضداد ہے۔ اسکا بیان متضاد بالذات نہیں بلکہ جامع اضداد ہے! — بعینہ جبطرح جبر و اختیار کے مسئلہ میں قرآن کا رویہ ہے۔

اور پھر اقبال کا فلسفہ محض نظریاتی نہیں وہ ایک خاص دور میں ایک خاص ماحول میں پیدا ہوئے اور ان کا مقصد اس ماحول اور اس دور کی قوتوں میں ایک مخصوص انقلاب پیدا کرنا ہے۔ سماج کو اور اس کے افراد کو ایک معروف انداز میں ڈھالنا ہے۔ ایک واضح رخ پر چلانا ہے ؎

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

اس لئے وہ چند حقیقتوں پر زیادہ زور دیتے ہیں چند نکات کو بار بار پیش کرتے ہیں۔ اقتضائے حالات کے مطابق۔ لیکن جن امور پر وہ زیادہ زور نہیں دیتے انکو نظر انداز کر دینا ناروا ہے۔

ان معروضات کے پیشِ نظر میکش صاحب کے پیش کردہ موضوعات پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنے میں آسانی ہوگی۔

۱- وحدت الوجود۔ میکش صاحب اقبال کے کلام سے وحدتِ وجود ثابت کرسکتے ہیں اور ان کے اقوالِ نثر سے اس کی مخالفت۔ مجھے نثر و نظم کا یہ مقابلہ ناپسند ہے ایک خبر بھی تو مخالفت میں نہیں ملتا تو پھر تضاد نمائی کرنے الجھن چاہیئے۔ اسلیئے کہ اقبال کی نظم اگر اس تضاد سے مطلقاً بری ہے تو شاید نثر کا مفہوم کچھ اور ہو۔ اور وہ مفہوم دیباچہ اسرارِ خودی کے اس فقرے سے ظاہر ہے کہ ایرانی شعرا نے وحدت الوجود کے مسئلہ کی تفسیر خطرناک طریقے سے کی ہے خطرناک طرح کی تفسیری جمودی تصوف ہے۔ اس سے نفیٔ خودی ہوتی ہے، اور اقبال وحدت الوجود سے اثباتِ خودی کرتا ہے۔ اور اقبال کے معیارِ خیر و شر کے مطابق جس سے نفیٔ خودی ہو وہ شر ہے اور جس سے اثباتِ خودی ہو وہ خیر ہے۔ "جمودی" تصوف میں خدا کو سب کچھ مان کر انسان کو ہیچ، عمل کو بے سود، ایمان کو لایعنی قرار دیا گیا۔ شریعت کا تمسخر اڑایا گیا۔ رہبانیت کو سراہا گیا۔ مگر "متحرک" تصوف میں خدا کو سب کچھ مان کر، انسان خدائی کے قریب کیا گیا۔ بقولِ اقبال تخلقوا باخلاق اللہ کا یہی مفہوم ہے۔ یہانتک کہ ؎

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ دو نتائج ہیں دو تفسیری رجحانات ہیں، دو مختلف راہیں ہیں۔ منبع دونوں کا وحدت الوجود کا نظریہ ہے۔ اقبال ایک کو مذموم اور دوسرے کو "محمود" قرار دیتا ہے۔ اسمیں تضاد کا کوئی شائبہ نہیں۔ سیدھی سادھی بات ہے۔ وہی شعر جس سے تضاد نکالا گیا ہے اس تضاد کے وہم کو دور کرتا ہے۔ اقبال کہتا ہے (منقولہ شعر کا آزاد ترجمہ کرتا ہوں) کہ اگر سالک آزاد ہو تو وہ "انا الحق" تک کو صحت مند زندگی بخش روحانی مقام بنا لیتا ہے اور اگر اسکی طبیعت میں غلامی اور انحطاطِ روحانی ہے تو یہی مسئلہ زوال پسندی اور علیل دماغی کا موجب بن جاتا ہے۔ جبھی رومی کہتا ہے کہ ؎

ہرچہ گیرد علتی علت شود — ہرچہ گیرد کاملے ملت شود!

اقبال کے لفظوں پر دوبارہ غور فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں کہ وحدت الوجود کا مسئلہ مذہبی نہیں۔ اس پر بحث اسلامیت کے لئے ضروری نہیں۔ یہ فلسفیانہ مسئلہ ہے اس کی غلط توجیہات سے، اسکی خطرناک تفسیر سے لوگوں کے دل مجروح ہوئے عوام جو فلسفیانہ بحث سے ناآشنا تھے ان توجیہات میں ایسے الجھے کہ عمل سے بے بہرہ ہوگئے۔ اور اس زوالی میلان کا مقابلہ ابن تیمیہ، اور واحد محمود نے کیا۔ وحدت الوجود سے نہیں بلکہ اسکی غلط تفسیر سے قوم کو نقصان پہنچا، وگرنہ اس مسئلہ پر بحث نہ کی جاتی تو اسلام نامکمل رہ جاتا۔

میں نے اقبال کے اقوال کو علاحدہ یکجا کر دیا ہے۔ ان میں تضاد کا خاتمہ تک نہیں میکش صاحب نے وحدت الوجود کی فلسفیانہ صداقت اور وحدت الوجود مذموم تفسیر (دو مختلف شقوں) کو ایک سمجھکر مغالطہ کھایا ہے [میکش صاحب اس بحث میں اقبال کو وحدت الوجود کا منکر قرار دیتے ہوئے کسی شعر کا حوالہ نہیں دیا]

۲- "مادہ اور روح"۔ یہ بحث پرانی اور طویل ہے اسے چند لفظوں میں نپٹانا مشکل ہے۔ اقبال اگر وحدتِ وجود کے قائل ہیں تو مادہ اور روح کی ثنویت کے مخالف ہیں۔ وہ وضاحت سے کہتے ہیں کہ مادہ کوئی الگ حقیقت نہیں بلکہ روح ہی کی ایک جہت، ایک شکل کا نام ہے۔ میکش صاحب اقبال کے اس عقیدے کو واضح کرتے ہیں مگر نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ "علامہ مادے اور روح کو دو حقیقتیں

ت۱ - خودگیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق
محکوم ہو سالک تو یہی اسکا ہمہ اوست

آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

نہیں مانتے بلکہ (یہ سمجھتے ہیں کہ؟) ایک شے اپنی مختلف جہات کی حیثیت سے مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے مثلاً اقبال روح اور مادہ کو ایک شے کے دو نام نہیں بلکہ مادہ کو روح کی ایک شکل کا نام قرار دیتے ہیں۔ یہ شکل جسے مادہ کہتے ہیں ہمارے عالم زمان و مکان میں، زمانی مکانی مخلوق کے لئے ایک واقعہ ہے اقبال اس واقعہ سے انکار نہیں کرتا۔ اور اس دنیا میں اس مادہ کے جو لوازم ہیں ان کی پابندی سے گریزاں نہیں۔ مادہ کی ایک صورت جسم انسانی ہے، ایک اور صورت خوراک ہے۔ خوراک جسم کے لئے ضروری ہے اور اس دنیا میں روح کا اظہار اسی جسم کے ذریعے ہوتا ہے اسلئے جسم کو قتل کرنے کا اقبال مخالف ہے۔ مگر وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم اس مادہ کی غیر مستقل حیثیت سے آگاہ رہیں اور اسکی کوتاہیوں سے خبردار ہو کر مادی علائق کو ان کی اپنی حد تک ضروری سمجھیں اور اصل مطاع حیثیت روح کو قرار دیں۔ یہ بھی سیدھی سی بات ہے۔

باقی رہا روح کی خاطر جسم کو گزاشت کرنا سو یہ بھی کوئی انوکھا "ویدانتی" ڈھکوسلا نہیں۔ روزہ، نماز ورزش، قواعد، یہ سب جسم کو تکلیف دیتے ہیں اور ہم سب ان میں سے کسی ایک کو ضرور اچھا سمجھتے ہیں۔ انہیں میں سے یہ تصوف "یا تضاد" یا "ویدانت" کی کونسی بات ہے!

۲۔ ترک عالم: یہ بھی ادب کی بحث کی ایک شق ہے۔ اقبال رہبانیت کا مخالف ہے درست۔ اقبال دنیا کو چھوڑ کر دشت میں خلوت گزینی کے خلاف ہے۔ درست! لیکن اسکا مطلب یہ کس طرح ہوا کہ اقبال بدن پروری کا قائل ہے یا یہ کہ اقبال سمندر کے کنارے، یا پہاڑ کے دامن میں یا اپنے گھر میں کسی وقت اکیلا بیٹھ کر سوچنے کے خلاف ہے۔ یا یہ کہ وہ ہر وقت سوتے جاگتے آدمیوں کے ہجوم میں زندگی بسر کرنے پر اصرار کرتا ہو۔ اقبال کا شعور کو بیدار طلب دریا سے خلوت طلب ہے وہ خودی کی طلب میں خود اپنے آپ سے انجمن آرائی کرتا ہے۔ انسانوں کا خیر خواہ ہے لیکن کم آمیز ہے وہ کہتا ہے کہ جس طرح رسول نے بکمال خلوت غار حرا میں خود آگاہ ہوئے تم بھی خود آگاہ ہو اور جس طرح انھوں نے اس خود آگہی اور اس خلوت گزینی سے دنیا کو فائدہ پہنچایا تم بھی اپنے تکر اول کی صورت میں کر ملت کو فائدہ پہنچاؤ۔ اس میں سے تضاد کس طرح نکلتا ہے۔ اقبال جب ہر اک سے رشتہ توڑنے کو کہتا ہے تو یہ اس کے عقیدۂ توحید اور عقیدۂ خودی کی تفسیر ہے۔ ہر اک سے توڑ کر اپنے سے رشتہ جوڑ۔ اور شکست عالم سے یہ مراد نہیں کہ دنیا کو توڑ پھوڑ دو بلکہ یہ کہ ماسوا سے منہ موڑ لو۔ بات بھر "شکست عالم" کے صحیح مفہوم سمجھنے کی ہے۔ "فوائد الفواد" میں محبوب الٰہی کا مقولہ ہے: "ترک دنیا آں نیست کہ کسے خود را برہنہ کند۔ مثلاً لنگوٹہ بہ بندد و بنشیند۔ ترک دنیا آں ست کہ لباس بپوشد و طعام بخورد اما آنچہ میرسد روا بدارد و بہ جمع او میل نکند و خاطر را متعلق چیزے ندارد۔ این ترک دنیا ست۔" مختصراً یہ کہ ترک دنیا یہ نہیں کہ لنگوٹہ باندھ کر بیٹھ جاؤ۔ بلکہ لباس پہنو کھانا کھاؤ مگر دل کو کسی چیز میں اٹکائے نہ رکھو! یہ ہے ترک دنیا۔

اور اقبال کی کم آمیزی، کم خوری، کم خوابی اور کم گوئی کی بیان کردہ منافع بھی تزکیہ نفس اور خود آگاہی کے ذرائع ہیں جنھیں محبوب الٰہی نے "قلۃ الطعام و قلۃ الکلام و قلۃ المنام و قلۃ الصحبۃ مع الانام" کہا ہے۔ یہ نفس کشی نہیں نفس افروزی ہے آپ ان مقدمات سے غلط نتائج بھی مرتب کر سکتے ہیں اور صحیح نتائج بھی۔ کم بولنا فراست کی نشانی بھی ہو سکتی ہے اور حماقت کی بھی۔ کم آمیزی غرور کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے اور عدیم الفرصتی، کثرت کار اور انکسار کی وجہ سے بھی۔ اقبال شکست عالم سے فتح عالم اور استقلال عالم کا کام لیتا ہے آپ اس سے تخریب عالم بھی کر سکتے ہیں اضداد عالم کا بیان اور چیز ہے اور تضاد بیانی اور چیز ہے۔

۳۔ حقیقت عالم: کے سلسلہ میں بھی بیکش صاحب کو یہی مغالطہ ہوا ہے جو روح اور مادہ کے موضوع پر ہوا تھا۔ اقبال اس دنیا کو ایک زمان و مکان کا عالم سمجھتے ہیں مگر زمان و مکان محض جیسا کہ بیکش صاحب [illegible] وجود نہیں ہاں یہ دنیا جو ہمارے لئے ایک واقعہ ہے، اور اسی طرح اور دنیائیں بھی ہو سکتی ہیں

غزل

ازل شاہجہانپوری

کیا فریب شکستہ پائی ہے
آہ منزل کے لب تک آئی ہے

عشق کو مرگ سے تعلق کیا
زندگی مستعار پائی ہے

تھی وہ راحت فضا ہوائے مرگ
ہم کو سولی پہ نیند آئی ہے

فطرت عشق آفریں تجھ کو
حسن خود بیں پہ فتح پائی ہے

سب کے سب رہ گئے نہ جل جل کر
آبلوں میں بڑی رسائی ہے

آہ پر اکتفا کریں کیونکر
تیر ہے اور پھر ہوائی ہے

بچ کے نکلا تھا اس نگاہ کا تیر
دل نے خود بڑھ کے چوٹ کھائی ہے

کیوں چھپاؤں نہ دل میں چھالوں کو
عمر بھر کی یہی کمائی ہے

حسن رندی پہ ہے عبث الزام
زہد نے خود شکست کھائی ہے

آبلے نفس رہے ہیں رس رس کر
انتہائے برہنہ پائی ہے

کھل گئے گل چمن ہوا بیدار
کیا خزاں نے شکست کھائی ہے

کوئی ان میں پکارے مجھ کو
کفر و اسلام کی دہائی ہے

کیا یقین متاع زیست ازل
ابھی اپنی ابھی پرائی ہے

اپنے لئے واقعات ہیں۔ یہ ہم محدود نظر، محدود فکر لوگوں کے لئے ٹھوس حقیقتیں ہیں مگر دراصل خدائے لامحدود جو ہماری فکر سے بالا ہے اور اصل وجود ہے اس کی نسبت سے یہ محدود اور لامحدود فضائیں محض اضافی ہیں۔ یہ دنیا خواب نہیں۔ مگر یہ دنیا حقیقتِ اصلی بھی نہیں۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ہماری محدود نظر کا عمل ہے مگر عمل ضرور ہے، واقعہ ضرور ہے۔ نہ یہ فریب نظر ہے نہ اصل حقیقت[1] نہ ویدانت نہ زوالی تصوف۔

اصل حقیقت گویا سورج کی ایک کرن ہے جو بلوریں حیثیت سے چھن کر ہمیں کئی رنگ کی کرنیں نظر آتی ہیں یہ سبھی رنگ دھوکا نہیں مگر حقیقت بھی نہیں! — اقبال ان اضداد عالم کو کثرت اور حقیقت کی ظاہری اور معنوی صورتوں کو نمایاں کرتا ہے۔ تضاد بیانی نہیں کرتا۔"

۵۔ "نظر باطن" کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اقبال دروں بیں بھی ہے اور بروں بیں بھی ہے۔ حواس کا منکر نہیں۔ عقل و ادراک سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن فقط ان کو سالکِ راہ نہیں بناتا۔ باطن کی نظر اور ظاہر کی نظر دونوں کو استعمال کرتا۔ فقط دروں بینی رہبانیت ہے فقط بروں بینی مادیت ہے۔ اسلام کی طرح اقبال کا راستہ اعتدال کا ہے اور اعتدال تضاد نہیں۔

۶۔ "علم و حکمت" کی بحث بھی یہی ہے۔ فقط علم کسی کام کا نہیں۔ اگر علم منزل پر پہنچا بھی دے تو ہیچ و بیکار اور فقط عشق بھی کافی نہیں۔

۷۔ "افلاطون" کی بحث بھی وہی عشق و عقل کی بحث ہے۔ اقبال دو اضداد کو جوڑ دیتا ہے اور تطبیق اضداد ہی رہنما کا کام ہے۔

۸۔ "تقلید" کے متعلق بھی زیادہ بحث غیر ضروری ہے۔ اس لئے کہ اقبال نے رموز بے خودی میں صراحت سے اپنا مسلک بیان کر دیا ہے۔ اس پر ایک مستقل بحث ہے جس کا عنوان ہے کہ "انحطاط کے زمانے میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے" اور وضاحت سے کہا ہے کہ "کم نظر عالموں کے اجتہاد سے اقتدائے رفتگاں محفوظ تر ہے" مگر یہ تقلید پسندی ایک مجبوری امر، ایک "محفوظ" طریقہ ہے۔ اختلاف اور پریشانی سے بچنے کے لئے۔ مگر اجتہاد کے یہ معنی نہیں کہ ہر پرانی روش کو چھوڑ دیا جائے۔ اقبال حدیث نبوی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ حضور نے خالد بن ولید سے فرمایا کہ اگر قرآن سے کوئی مسئلہ حل نہ ہو تو کیا کرو گے تو انہوں نے کہا سنت نبوی سے اور فرمایا کہ سنت نبوی سے نظر نہ آئے تو کیا کرو؟ اپنی سوجھ سے! — تو اقبال تقلید اور اجتہاد دونوں کے لئے مناسب مقام اور محل تجویز کرتا ہے اور اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔ اگر آپ متن عبارت سے کوئی شعر الگ کریں اور اس کے اصل مفہوم کو غلط سمجھیں تو اس سے اقبال کے یہاں کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا۔

۹۔ "مشائخ نقشبندیہ" کے متعلق جو لکھا ہے وہ ان روایتوں پر مبنی ہے جو اقبال سے منقول ہیں مجھے اس وقت فقط اقبال کے فرمودات سے بحث ہے منقولہ روایات سے نہیں۔

۱۰۔ "مرزا بیدل" کما ماقبل۔ یہ بھی روایت ہے۔

۱۱۔ "قادیانیت"۔ جواب دیا جا چکا ہے۔

۱۲۔ ابن تیمیہ کے متعلق جواب دیا جا چکا ہے۔ انہوں نے ایک غلط رجحان کی تردید کی تھی اور وہ رجحان ایک فلسفیانہ بحث سے پیدا ہو کر ملت کے زوال کا باعث بن رہا تھا۔ اس لئے اقبال نے ان کی تعریف کی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اقبال فرقہ بند نہ تھے۔ ان اختلافات کو جو رحمتِ امت ہو سکتے ہیں وجہ خصومت نہ بنانے دیتے تھے اور اگر انہوں نے جھوٹے صوفیوں اور اچھے صوفیوں میں فرق کیا ہے تو اس سے تضاد کیسے ثابت ہوا؟

۱۳۔ خودی کے معاملے میں وہی تضاد کا مغالطہ ہوتا ہے جو روح اور مادے کے سلسلے میں ہوا ہے۔ بقول اقبال حقیقتِ اصلی وحدت ہے اور اس حقیقت اصلی کا اندرونی محرک خودی ہے۔ خالق اور مخلوق (کہ یہ اعتباری نام ہیں) خودی ہی سے ہیں اور خودی کوئی باہر کی قوت نہیں بلکہ یہ نام ہے تخلیقی تحریک کا۔ اب اگر آپ وحدتِ وجود کو مانتے ہیں تو پھر خودی کی اس ہمہ گیری سے تضاد کا شائبہ کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ اگر خالق اور مخلوق میں وحدت ہے تو پھر اس صفتِ محرکہ یعنی خودی کی مختلف اللون حقیقت سے کیوں انکار ہے؟ البتہ اگر آپ وحدتِ وجود کے قائل نہیں تو پھر "خودی" کیا اور کئی یگانگتوں پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ خودی زندگی کی طرح مجموعۂ اضداد ہے اور ان اضداد کی کشمکش سے زندگی اور خودی کی پرورش ہوتی ہے۔ اقبال نے اس اضداد کی کشاکش کے اظہار کے لئے خودی کے مختلف مظاہر سے بحث کی ہے اسے خصومت کا اور محبت کا موجب قرار دیا ہے۔ خالق اور مخلوق کی صفت واحد قرار دیا ہے۔ پھر وہی بات۔ تضاد بیانی نہیں کی بلکہ تضاد میں تطبیق کی ہے۔ حقیقت کی ترجمانی کی ہے — فلسفیانہ مباحث سے قطع نظر۔ آپ ایک "ضد" کی طرف توجہ فرمائیے۔ آپ فرماتے ہیں: "خودی کو محبت کی ضرورت ہے ..... اور وہی خودی خصومت انگیز ہے۔" مگر کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ محبت اور عداوت ایک دوسرے سے اسقدر دور نہیں جسقدر سمجھے جاتے ہیں۔ دونوں ایک ہی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ محبت ہو تو خصومت نہ ہو۔ یہ سب خودی کے مسئلہ کے گرداب ہیں! — حقیقت کے مختلف رنگ حقیقت کے رنگ کو باطل نہیں کرتے۔ خدا کا رحم اور قہر تضاد نہیں!

مگر آنکہ میری ذاتی دلچسپی محض ادب سے ہے، منطق فلسفے سے کم کم، تصوف سے کمتر مجھے "قطعیت" کا دعویٰ نہیں۔ نہ مجھے اقبال کے جملہ عقائد سے اتفاق ہے۔ بحث محض تضاد بیانی کی ہے۔ اقبال غلط ہو، یا صحیح، اس کے نظریات میں بنیادی تضاد نہیں! — مجھے فقط یہی کہنا تھا۔

(۲)

---

[1] یہ تشبیہ محلِ نظر ہے۔ اقبال حقیقت کو کرن نہیں بلکہ ہمہ آفتاب سمجھتا ہے — تاثیر

فرقہ صابیہ

رشید احمد ارشد

یہ امر نہایت تعجب خیز ہے کہ قدیم زمانے کا فرقہ صابیہ عراق عرب میں ابھی تک موجود ہے۔ گو امتداد زمانہ سے یہودیت عیسائیت اور اسلام کے اثر سے یہ مذہب کسی قدر ان مذاہب کے مخلوط عقائد کا مجموعہ بن گیا ہے۔ لیکن معاشرت و تہذیب اور دیگر امور میں یہ ان سے بالکل الگ ہے۔

ان لوگوں کا اصلی نام "مانڈین" ہے۔ اور ان کی زبان نہایت پرانی ہے جو قدیم سریانی زبان سے کسی قدر مشابہ ہے۔ مختلف عالموں نے اس زبان کو سیکھنے اور ان لوگوں کے مذہب و لٹریچر پر عبور حاصل کرنے کی بہت کوشش کی، مگر زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ ان کا لٹریچر طبع شدہ نہیں ہے۔ بلکہ نایاب قلمی نسخوں کی صورت میں پایا جاتا ہے اور ہر شخص ان کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

جرمنی کے مشہور مستشرق پیٹرمین نے ان کے لٹریچر کو ان کے علاقہ میں دو سال رہ کر حاصل کیا تھا اور موجودہ زمانے میں "مانڈی" لٹریچر کے وہ سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں۔ گو ان کے مذہب کی کتابیں اور دیگر مذہبی لٹریچر "مانڈی" زبان میں ہے۔ لیکن ان کے روزمرہ بول چال کی زبان عربی ہے۔

سترھویں صدی میں اس فرقہ کی تعداد بیس ہزار افراد پر مشتمل تھی مگر جنگ عظیم کے بعد سے ان لوگوں کی تعداد گھٹ کر تین ہزار نفوس رہ گئی تھی اور یہ سب آبادی عراق عرب ہی میں ہے۔ بغداد میں انکی کافی تعداد آباد ہے۔ لیکن زیادہ تعداد "سوق الشیوخ" میں مقیم ہے۔ چونکہ مذہباً انھیں پانی کے قریب رہنے کا حکم ہے اس بنا پر وہ دریا سے دور دراز علاقوں میں آباد نہیں ہوتے۔ ان کی تعداد میں روز بروز کمی واقع ہونے کی سب سے بڑی وجہ خانہ جنگیاں ہیں۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ عرصہ سے انکی عورتیں مسلمانوں کے حلقہ ازدواج میں آ رہی ہیں اور بتدریج مسلمانوں میں مخلوط ہونے کی وجہ سے ان کی اصلی تعداد میں کمی ہو رہی ہے۔

معاشرت ان لوگوں نے یہ تین پیشے اختیار کر رکھے ہیں۔ چاندی کا کام، کشتی سازی، دباغت یعنی کھال رنگنا۔ یہ لوگ ایک خاص قسم کی کشتی تیار کرتے ہیں جو "مشوف" کہلاتی ہے۔ چاندی کے کام میں ان کی ہنرمندی بہت مشہور ہے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے ہر صابی مرد و زن نہایت دلکش اور حسین ہے اور ظاہری شکل سے پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ شخص صابی فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ سکھوں کی طرح یہ لوگ بھی اپنے بال نہیں ترشواتے۔ مرد مذہباً نیلا کپڑا نہیں پہن سکتا۔ اسی طرح ان کی عورتیں بھی نیلے رنگ کی کوئی چیز استعمال نہیں کر سکتیں۔

مذہب ان کا مذہب عجیب و غریب قسم کا ہے۔ یہ قدیم بابلی ستارہ پرستی یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے عقائد سے مخلوط و مرکب ہے۔ یہودیت سے انھوں نے قربانی کی رسم لی اور مسیحیت سے عشائے ربانی اور یوحنا بپٹسٹ (حضرت یحییٰ) کی تعظیم کا خیال اخذ کیا۔ اسی طرح مسلمانوں کی کئی چیزیں ان کے مذہب میں داخل ہیں۔

ان کی سب سے بڑی کتاب "سدرہ ربا" ہے اس میں ان کے مذہب کے اصول مختلف صورتوں میں موجود ہیں۔ جا بجا مختلف متضاد باتیں بھی نظر آتی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وقتاً فوقتاً مختلف مصنفین نے اس پر طبع آزمائی کی تھی۔ یہ بہت نادر اور نایاب کتاب ہے۔ مختلف مستشرقین اور دیگر فضلاء نے اسکی نقل حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس نسخے کی ایک نقل صرف برٹش میوزیم میں ایک ناقص لاطینی ترجمے کے ساتھ موجود ہے۔

دوسری کتاب "الارواح" ہے جس کے دو تہائی حصے میں زندوں کے لئے دعائیں ہیں اور ایک تہائی حصے میں مُردوں کے لئے۔ اس کتاب میں حضرت آدمؑ کی موت کا واقعہ بھی درج ہے۔ حضرت آدمؑ کو یہ لوگ بڑا پیغمبر مانتے ہیں۔ تیسری ایک اور کتاب ہے جس میں پجاریوں کے لئے ہدایتیں ہیں۔ علاوہ ازیں چند رسالے بھی ہیں جن میں سے کچھ رسائل علم نجوم سے متعلق ہیں اور چند رسالوں میں شادی نکاح کی رسومات مندرج ہیں۔ ایک رسالہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔

عبادت گاہیں انکے عبادت خانے مختصر سے ہوتے ہیں کہ ان میں صرف دو یا تین پجاریوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ان معابد کے بیچوں بیچ چھوٹی نہریں یا نالیاں جاری رہتی ہیں۔ ان ندیوں کے پاس دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ ان عبادت گاہوں میں صرف ایک الماری ہوتی ہے جس میں مذہبی کتابیں اور ضروری سامان رکھا جاتا ہے۔ یہاں عورتیں اور مرد دونوں پوجا پاٹ کر سکتے ہیں۔ عورت کے پجاری بننے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ کسی پجاری مرد سے شادی شدہ ہو۔ یہ لوگ مختلف ستاروں کو بُرائیوں کا منبع خیال کرتے ہیں۔ مگر قطبی ستارہ کو وہ جنت کے قریب سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر وہ اسکی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ ہر اتوار کو بپتسمہ کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

گزشتہ تاریخ یہ فرقہ قدیم زمانے میں بڑی شان و شوکت رکھتا تھا۔ بغداد و عراق کے وسیع علاقوں میں اسی کی آبادی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ نمرود کی قوم اسی فرقے سے تعلق رکھتی تھی جو طوفان نوح کے بعد عالم وجود میں آئی۔ آثار و قرائن سے بھی اسکا پتہ چلتا ہے اور قرآن مجید میں بھی جا بجا یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ صابیوں کا ذکر آیا ہے جو اس بات کی قوی شہادت ہے کہ بہت عرصہ تک یہ فرقہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ خود اسلامی عہد میں اس قوم کی کئی نامور ہستیاں فلسفہ، ریاضی اور علم نجوم کی ماہر تھیں۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں حران ان کا مرکز تھا اور اسی زمانہ میں ثابت بن قرہ صابی اور سنان بن ثابت جیسے نامور سائنسدان اور فلاسفر اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور بیشتر خلفائے اسلام کی طرف سے ان پر انعام و اکرام کی بارشیں برستی تھیں۔ اسلامی خلفاء کی رواداری اور مذہبی آزادی کا نتیجہ تھا کہ آج تک اس فرقے کی قومی زندگی فنا نہیں ہوئی۔ آج کل بھی حکومت عراق نے صابیت کی [illegible]

ردِ عمل

(ڈرامہ)

آئی اے جوہری

افراد

مُلّا جی :- محلّہ کی مسجد کے مؤذن جو جھاڑ پھونک بھی کرتے ہیں
فتح علی :- مُلّا جی کے پڑوسی۔
نواب صاحب :- بستی کے ایک خاندانی رئیس
بیگم صاحبہ :- ان کی اہلیہ
قمرن :- بیگم کی منہ چڑھی ملازمہ جس سے مُلّا کی ساز باز ہے۔

ایک دن

میاں فتح علی اپنے مکان کے دروازے پر حقّے کے کش لے رہے ہیں۔ مُلّا جی برابر والے مکان کے صدر دروازے سے برآمد ہوتے ہیں۔

مُلّا جی :- میاں فتح علی تمہارے اس سفید سٹھورے کو دیکھکر تو مُنہ میں پانی بھر آتا ہے۔

فتح علی :- منہ دھو رکھئے مُلّا جی۔ یہ ہنٹر صاحب کی ولایتی مرغی کے گھر کا چراغ ہے جو ولایت سے برف کے بکس میں جھک کر آئی تھی۔ جان پر کھیل کر چوری چھپے کہیں ایک انڈا اڑا لے بھاگا تھا۔ وہ تو کہئے کسی نے دیکھا نہیں۔ ورنہ وہیں دھر لیا جاتا۔

مُلّا جی :- اچھا بھئی۔ نہ سہی۔ پورے کا پورا نہ اڑایا ہو تو میں بھی مُلّا کا ہیکا۔

کچھ دن بعد
نواب صاحب کی حویلی

بیگم :- دیکھنا تو بی قمرن یہ ہے کیا۔ صبح سے ایسے ہی تین چار چھوٹے چھوٹے لپٹے ہوئے کاغذ ہاتھ آ چکے ہیں۔ ابھی پان کھانے کو پٹاری کھولی تو ایک اوپر ہی رکھا تھا۔ منہ دھونے بیٹھی تو صابن دانی میں بالکل ایسا ہی لپٹا ہوا پرزہ پایا۔ تھوڑی دیر ہوئی جو نہی قلمدان اٹھایا بالکل ایسا ہی مُڑا تُڑا پرزہ ہاتھ کے نیچے۔ میرے تو ہوش اُڑے جاتے ہیں۔ ایسا تماشہ میں نے تو کبھی دیکھا نہیں۔

قمرن :- دیکھوں بیگم۔ بڑے اچنبھے کی بات ہے کل سے میرے ہاتھ بھی یونہی لپٹے لپٹائے دو تین کاغذ پڑ چکے ہیں مصالحے کی ہنڈیا صاف کرنے بیٹھی تو میں سمجھی زعفران کی پڑیا ہوگی۔ کھول کر دیکھا تو کچھ بھی نہیں۔ پھینک دیا طاق سے آئینہ اتارنے گئی تو غلاف پر بالکل یونہی تہہ کیا ہوا چوکنا ذرا سا کاغذ پایا تب تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ اللہ تیری پناہ۔ بیگم میں کہتی ہوں نصیب دشمناں کسی نے گنڈے تعویذ تو نہیں کروائے ہیں۔

بیگم :- کیا کہا تعویذ۔ بھلا دیکھوں تو۔ اس میں ہے کیا کہیں سچ مچ تعویذ ہی نہ ہو۔ یہ یہاں آئے کیسے (ٹٹولتے ہوئے) اسے ابھی تک کچھ بھی [illegible]

قمرن :- بیگم [illegible] آپ [illegible] میرے سر [illegible] کا گھونٹ [illegible] رہا ہے۔ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے۔ بلاؤں نواب صاحب کو۔ گھر میں تعویذ!

(دوڑ کر ڈیوڑھی میں جاتی ہے) نواب صاحب! نواب دولہا صاحب!

نواب :- (اندر آتے ہوئے) آیا۔ بی قمرن۔ آیا۔ خیر تو ہے؟

بیگم :- اندھیر ہے اندھیر۔ گھر بھر میں تعویذ بکھر رہے ہیں جدھر ہاتھ ڈالو تعویذ ہی پر ہاتھ پڑتا ہے۔ آگ لگے ایسے گھر کو نابابا، میں تو یہاں رہنے کی نہیں۔ اپنا گھر سنبھالئے۔ میں کیا جانوں یہ گنڈے تعویذ

نواب :- کچھ کہو بھی تو سنوں تو سہی۔ آخر معاملہ کیا ہے۔ پھر اگر میری ہی غلطی ٹھہرے تو جی بھر کے خفا ہو لینا۔ یہ غصہ ہے کس بات پر۔

بیگم :- میں کیا اور میرا غصہ کیا۔ بات یہ ہے کہ جس گھر میں گنڈے تعویذ چلیں میرا گذر نہیں ہو سکتا۔ برسات کی بیر بہوٹیوں کی طرح رینگتے پھرتے ہیں۔ ایک نہیں دو نہیں۔ دسیوں تعویذ صبح سے نکل چکے ہیں۔ مگر آپ کی بلا سے منہ سے نکالو تو آفت۔ اُلٹی آنکھیں مجھ ہی کو دکھائی جاتی ہیں۔

نواب :- بیگم سچ کہو۔ دسیوں تعویذ۔ میرا تو کوئی دشمن بھی نہیں میں نے کسی کا بگاڑا ہی کیا ہے پھر یہ تعویذ کیسے۔

بیگم :- اور میں تو سب کے گلوں پر چھری تیز کئے پھرتی ہوں مجھ ہی سے سب کو بیر ہوگا۔ یہ سب میری ہی کرتوت ہے۔ کفر ہی بات آئی۔

نواب :- پہیلیاں ہی بجھائیگا یا کچھ بتلائیگا بھی۔

بیگم :- دیکھ نہ لیجئے۔ یہ کیا پڑا ہے۔ ایسے تو نتھے بھی نہیں کہ کوئی ہجے کر دے۔

نواب :- تو اس میں ایسا کیا لکھا ہے۔ لائیے میں ہی پڑھوں۔ بی قمرن۔ میری تکونیا ارے لو یہ۔ میری عینک تو ذرا باہر سے لانا۔

بیگم :- اللہ تیری پناہ بی قمرن۔ یہ تو بیت پڑھ چکے۔ تم کسی مُلّا سیانے کو بلاؤ۔

نواب :- ہاں۔ ہاں۔ درست بلکہ … بالکل درست بیگم کیا کہنے ہیں آپکی فراست کے۔ جیتی رہئے۔ آپ نے تو میری دل کی بات چھین لی۔ کہنے کو تو آپ عورت ہیں مگر اسوقت مردوں کے کان کترلئے۔ اور یہ بھی درست بھائی واللہ بھلا ہم گنڈے تعویذ سے کیا سروکار۔ یہ تو کسی مُلّا سیانے ہی کا کام ہے۔ وہ کیا مثل ہے۔ یعنی کہ تنبولی کا کام تیلی کرے۔ اور۔ اور۔ آگے تو میں کچھ بھول سا رہا ہوں۔ بیگم۔ بتلا دو نا۔

بیگم :- مثل تو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھئے۔ اب کچھ کام کی بات کیجئے بھلا ان دو ہاڑے تعویذوں کا نکلنا کیا معنی۔

نواب :- یہی تو میں بھی کہتا ہوں کہ دن دہاڑے ڈنکے کی چوٹ کہ لاحول ولا قوۃ تعویذوں کا نکلنا نہایت خطرناک ہے۔ میرے تو طوطے یعنی کہ ہاتھوں کے طوطے اُڑے جاتے ہیں۔

گو یہ شکل ہو گرنہ گو یم مشکل والا معاملہ ہے۔ پیسہ سے لاچار ہوں۔

نواب :- (اطمینان کی سانس لیتے ہوئے) شکریہ۔ شکریہ یا حضرت کچھ اور پیسہ میرا۔

مُلّا :- خرچ کچھ ایسا زیادہ نہیں۔ سوا تین گز کورا لٹھا۔ ایک مرغ تندرست و توانا مگر سفید بے داغ اور وہ بھی پسے تیرہ آنے کی خوشبویات وغیرہ رہونگی۔ دو گھڑی شب گزرنے پر سرد پانی سے غسل کرکے اور کورے لٹھے سے ملبوس ہوکر فقیر کو خب باطنی کرنا ہوگی۔ حجرہ کو خوشبویات سے معطر کرکے اندر سے مقفل کرنا لازمی ہے کیونکہ ردّ عمل کے وقت اس کا خدشہ ہے اکثر ہاتھا پائی کی وزشتم کشتا تک نوبت پہنچتی ہے۔ اگر دروازہ کھلا رہا تو اندیشہ ہے کہ بندۂ درگاہ عاجز اگر کہیں راہ فرار نہ کر لے۔ تین پہر رات گذرنے پر عمل ختم ہوگا۔ ادھر عمل سے فراغت پائی اُدھر بشرط کامیابی اللہ اکبر کہہ کر مرغ پر چھری پھیر دی۔ تازے تازے گرم خون سے تعویذ لکھا اور تاروں کے دُھندلکے میں اندھیرے ہی اندھیرے گر گر کر لاکھ ود مرغ کو معہ بال و پر دفنا دیا۔ مگر یہ سب باتیں سلامتی سے گذر گیا تو انشا اللہ فتح ہی فتح ہے پھر دیکھوں گا کہ کیا دیو جن آپ کے گھر پر سایہ ہو کیا لگا رہتا ہے۔ مگر پیچ نہ اُٹھے تو یہی بس صبح تک کے لئے تو آپ کے گھر کو کیل دیا ہے۔ احتیاطاً پانی بھی پڑھے دیتا ہوں گھر کے چاروں کونوں میں چھڑکوا دیجئے۔

نواب :- جزاک اللہ کیا کہنے ہیں اس ہمت کے۔ مرحبا۔ مرحبا۔

بیگم۔ بی قمرن۔ عامل صاحب کو پان تو دینا۔

نواب :- بھئی اور تو سب ٹھیک ہے مگر سفید بے داغ مرغ کا انتظام تو کرنا ہی ہے ہوگا۔

بیگم :- اے ہے میں کہتی ہوں اسکے لئے بھی کہیں جانا ہے سنا نہیں تجھے میاں فتح علی والا۔ دن بھر تو ہانڈیوں میں پھکوتیاں کرتا ہے۔

قمرن :- وہ تو اسکے سارے گھر بس جانتے ہیں۔ کل ہی تجھے تانگے والے سے کہا ہے کہتے تھے بیل ہو بیل بوٹ پیٹ کا جھوار۔ بار بار دانتوں کو لیکے ہو۔ اگر مرنے پر آپ بیٹھ گئی تو گھڑی بھر کا انوکھا گھوڑی۔ محلے کی بھول میں نہ رہنا۔

مُلّا :- سبحان اللہ بس ایسا ہی چاہئیے تھا۔ تب تو جوابی تعویذ سو فیصدی کامیاب ہوگا۔

نواب :- اب تو لینا ہی پڑا اسے پکڑ کر مُلّا جی کے حوالہ کر دو۔ اور میاں فتح علی کو دام دلوا دو جلتی ہو بی قمرن۔

"دوسرے دن"

نواب صاحب کی ڈیوڑھی پر ایک ہلکی خاکستری داستانی سے لکھی ہوئی ایک تختی آویزاں تھی جس پر منقوش تھا۔ جلّ تو جلال تو وغیرہ۔ اور میاں فتح علی حقہ کے کش لگاتے ہوئے مُلّا جی سے مسکرا کر فرما رہے تھے :-

"مانتا ہوں دوست مُلّا ...."

موت

میں نے بچپن میں تجھے دیکھا ہے اے ربِّ کریم!
خالقِ ارض و سما، اور عرشِ اعظم کا مقیم
میرے فکر و فہم سے دور اور شہ رگ سے قریب!
حاضر و ناظر ہے تو، تیری رضا میرا نصیب
تو خفا ہوگا، مجھے مارے گا، ڈر ڈر کے سدا
میں رہا ہوں دور دور ——

میں نے دیکھا ہے جوانی میں تجھے، میرے خدا!
صاحب الفردوس اور دشمن شراب و شعر کا
زندگی جن کے سہارے جھومتی گاتی رہی
مضطرب دل کی تمنا رقص فرماتی رہی
ڈال دے گا تو مجھے دوزخ میں لیکن روزِ حشر
میں رہا ہوں دور دور ——

میں نے دیکھا ہے بڑھاپے میں تجھے اے مہرباں!
بے سہاروں کا سہارا، بے امانوں کی اماں
ہر گنہگار ازل کو وا تری آغوش ہے
خطرۂ دوزخ بدل، لا تقنطو در گوش ہے
ہاں مگر جب موت کو دیکھا ہے اپنے سامنے
میں رہا ہوں دور دور

عبدالمجید بھٹی

غزل

جو چاہ تھی ہم سے، وہ بھلا یاد رہیگی! — تم یاد خطوط ہو، کہا یاد رہیگی!!
پھر راہ کسی دن پہ صدا دے سنگے ہم — تا عمر ترے در کی صدا یاد رہے گی
دیکھا کئے مشتاق نگاہوں سے کسی کو — مجبوریِ الفت کی ادا یاد رہے گی
اک بھولی ہوئی زلف کی پھر یاد دلا دی — شوخی یہ تری بادِ صبا یاد رہے گی
جب انکو بھلایا غمِ دنیا نے کیا یاد! — اب یاد نہ کرنے کی سزا یاد رہے گی
کیوں مجھکو بھلاتے ہو مرے شعر بھلا کر — یہ یاد نہیں گے تو ذرا یاد رہے گی
منصور تم اُس یاد کو کیوں دل سے بھلا دو
جو یاد کہ بھولے سے ہوا یاد رہے گی

شفیع منصور

قاضی نذرالاسلام

بنگال کا حب الوطن شاعر

فرخ سیہاوی

ہر ملک کی قدر و منزلت کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ اس کرۂ زمین پر ایسے ممالک بھی ہیں جو سونا اگلتے ہیں۔ اور ایسے بنجر و غیر مزروعہ علاقے بھی ہیں جہاں سبزہ و گیاہ تو در کنار خار کا بھی گذر نہیں صحرائے اعظم دنیا میں سب سے بڑا ریگستان ہے۔ یہاں ریت کے ذروں کے سوا کچھ نہیں۔ یا باد سموم جو اکثر چلا کرتی ہے۔ یہ اس خطہ کی خاص شے ہے۔

یہ تو ہم نے ممالک کو جغرافیائی اعتبار یا اس کی پیداوار کے لحاظ سے منقسم کیا لیکن دراصل اس کے علاوہ ہر ملک ہر دور میں ادبا و شعرا پیدا کرتا رہا ہے۔ تھوڑے دنوں ہی کی بات ہے ہندوستان کی عظمت دیگر اقوام میں اس وجہ ہوئی کہ اسی خاک ہند نے اقبال اور ٹیگور جیسے سپوت پیدا کئے جو اب پیوند خاک ہو گئے۔ مگر ان کا نام ابھی باقی ہے اور باقی رہے گا۔ خود علامہ اقبال کے بقول۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ادب میں ان دونوں ہستیوں نے وہ "گل بوٹے" کھلائے کہ صدیوں تک ہماری نسلیں ان کے کلام سے استفادہ حاصل کریں گی۔ اقبال پر اگر پنجاب نازاں ہے تو بجا ہے اور ٹیگور پر اگر بنگال فخر کرے تو مناسب ہے۔ لیکن یہ نہ معلوم تھا کہ ہندوستان میں ان کے بعد یو۔پی کے ایک گاؤں ملیح آباد میں شبیر حسین جوش جنم لیں گے جن کا کلام دنیا کے چار گوشوں میں مقبول ہوگا۔ اور بنگال میں قاضی نذرالاسلام ٹیگور کے جانشیں ہوں گے۔ ابوالقاسم فردوسی کا جہاں نام آتا ہے وہاں طوس کا نام بھی آتا ہے۔ انسان کی شہرت اس کے وطن سے منسوب کی جاتی ہے۔ آیئے ذرا قاضی نذرالاسلام کی شاعری کا مطالعہ کریں۔

نذرالاسلام بنگال میں "بدروہی کاوی" کے نام سے مشہور ہیں۔ بدروہی کاوی کے معنی سیدھی سادی ہندوستانی میں "باغی شاعر" کے ہوتے ہیں۔ بدروہی سب سے پہلی نظم تھی جو شاعر نے لکھی اور اسی مناسبت سے شاعر بھی بدروہی کہلانے لگا۔ اس مشہور نظم نے اس کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔

انگلستان میں ایک نوجوان شاعر جان کیٹس تھا جو عنفوان شباب ہی میں مر گیا لیکن اس کا کلام حیاتِ جاوید ہو کر رہ گیا اس کی اور قاضی نذرالاسلام کی زندگی میں باعتبار عمر و کلام مشابہت و مماثلت ہے۔ کیٹس ایک مسیح پیدا ہوا اور اس نے اپنے آپ کو 'Looking into Homer' کہنے کے بعد ترقی کی سب سے آخری سیڑھی پر دیکھا اس کے ہم وطن انتخاب

میں تھے کہ ایک طرف تو اس نوجوان شاعر کی عمر ملاحظہ کیجئے اور دوسری طرف شاعری کے دریا کا اتار چڑھاؤ دیکھئے قاضی نذرالاسلام صاحب کے کلام میں بھی یہی عنصر موجود ہے۔ نذرالاسلام رات کے ایک پچھلے حصہ میں بیدار ہوا اور اپنے بستر سے اٹھ کر اس نے بدروہی نظم منظوم کی۔ اس نظم کا شائع ہونا تھا کہ اس کی شہرت ملک کے چار گوشوں میں پھیل گئی۔ یہ کم سن شاعر اعلیٰ و ارفع جوشیلے جذبات و شعلہ فشاں خیالات کا مجسمہ ہے۔ اس کی کیفیت اس جوالا مکھی یا آتش فشاں پہاڑ کی مانند ہے جو باعتبار عمر کم مگر لاوا دور دراز تک پھینکنے میں قدیم آتش فشاں پہاڑوں پر فوقیت رکھتا ہو یا بدیگر الفاظ کہئے کہ شاعر کا کلام برق باراں ہے۔ وہ اپنی قوم کو اپنے کلام کے ذریعہ سے خواب گراں سے اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ جمود کا قائل نہیں۔ اس کی شاعری کارل سینڈبرگ 'Karl Sandberg' سے بہت ملتی جلتی ہے۔ نذرالاسلام طبقہ پرولتاری کے حامیوں میں سے ہے۔ وہ اپنی شاعری کو اس جماعت کے پروپیگنڈا کے لئے آلۂ صوت خیال کرتا ہے۔ اس کے کلام میں بیشتر ایسے الفاظ ملتے ہیں جو حسن کاری اور نغمہ سرائی کی آخری حدود کا پتہ دیتے ہیں۔

ٹیگور نے بنگالی شاعری کو فکر اور قوت تخیل سے مزین کیا۔ لیکن نذرالاسلام نے بلا کی قوت متحرکہ اور تیز رفتاری بخشی۔ شاعر کو اپنے وطن کے ماحول کے مطابق کلام کہنا چاہیے کیونکہ کلام کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔ بنگال اس وقت بڑے پرآشوب دور سے گذر رہا تھا جب شاعر نے ایک ایسی شخصیت کا خاکہ کھینچا ہے جو کہ اپنے ارد گرد کے ماحول و انقلاب سے متاثر نظر آتا ہے۔

بدروہی نظم کی خصوصیات عام نظموں سے علیحدہ ہیں۔ وہ نوجوان کو سکھاتی ہے کہ وہ اپنی پرانی رسم اور سماج کی زندگی کو بنظر حقارت دیکھے۔ اس کے علاوہ ہر نوجوان کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ نئے خیالات قدیم خیالات کی جگہ لیں۔ قدیم خیالات فرسودہ ہو گئے ہیں۔ ہر شخص کو نئی شاہراہ پر گامزن ہونا چاہیئے ورنہ ترقی مسدود ہونے کا خطرہ ہے۔ ہر نوجوان کو جوش و خروش کا ایک مجسمہ ہونا چاہئے اور ساتھ ساتھ اس کا صرف عقیدہ ہی نہیں بلکہ جزو ایمان ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے مقدر کی باگ ڈور مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہے۔ اور گڑھے خندقوں کو عبور کرتا ہوا خندہ پیشانی کے ساتھ چلا جائے۔ اور خودداری کو کسی قیمت پر بھی فروخت نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اپنے راسخ ارادوں سے اس امر کا پتہ دینا چاہیئے کہ اس کے ارادے لوہے کی چٹانوں سے مضبوط خیالات بلند اور خودداری کا صحیح پیکر ہیں اس کا نظریہ عام نظریہ سے مختلف دنیا کے جکڑے ہوئے رسم و رواج سے آزاد ہے تمام عناصر ہیں جو بنگال کے ہر نوجوان

دور کے نوجوان کی صحیح تصویر ہیں۔

نذرالاسلام کا کلام پڑھنے کے بعد اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ اس کا کلام لاجواب بلکہ بے نظیر ہے۔ آواز میں رعد کی کڑک اور جذبات کی تلخی و گرمی کی ہم آہنگی۔ موجودہ سماج سے نفرت۔ اس کے کلام میں بربہیت کی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔ اس کا عتاب شاہانہ رعب وداب کے عنصر سے مبرا ہے۔ اس کے عتاب میں لطافت ہے۔ وہ ہمیشہ اس امر کا متلاشی رہتا ہے کہ امرا اور غربا کے درمیان جو وسیع خلیج حائل ہے اس کو جلد از جلد پاٹ دیا جائے۔ وہ اپنے جذبہ کا اظہار ایسے الفاظ میں کرتا ہے جو اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے لئے تراشے اور وضع کئے ہیں۔ دراصل بنگالی زبان اس کے کلام میں وہ لطافت و خطابت کا ملکہ پیدا کرنے میں استعداد نہیں کر سکتی۔ کیونکہ یہ زبان بھولی اور شیریں ہے۔ برخلاف وہ اپنے کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو رعد کی کڑک کی مانند پرزور اور عتاب سے پر ہوتے ہیں۔ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے بنگالی زبان جو بھولی و شیریں ہے اس میں یہ عنصر مفقود ہے۔ اس لئے شاعر نے اپنے کلام میں خطابت و لطافت پیدا کرنے کے لئے خاص طور پر الفاظ تراشے اور وضع کئے ہیں۔

بنگال کے متقدمین شعرا کا ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار کی ہے۔ لیکن نذرالاسلام نے اپنے کلام میں متقدمین کی پیروی نہیں کی۔ وہ عربی۔ فارسی اور انگریزی الفاظ بھی مناسبت کے ساتھ اپنے کلام میں استعمال کرتا ہے۔ سرزمین بنگال میں ان الفاظ کی تخم ریزی کرنا بیکار ثابت نہیں ہوئی و نیز سرزمین بنگال ان نئے نئے پھولوں کی خوشبو سے عطر بیز ہو رہی ہے۔

اب بنگال کے نوجوان شعرا، و ادبا دوسری زبانوں کے الفاظ کو اس خوبصورتی سے اپنا رہے ہیں کہ اصل کپڑے اور پیوند میں تمیز نہیں ہوتی۔ نذرالاسلام کے کلام کی چند خصوصیات یہ ہیں کہ اس کی زبان تشبیہات۔ استعارے۔ خیالات تجربے بالکل نئے ہیں اور اس کے اپنے دماغ کی اختراع ہیں۔

وہ ایک حقیقت شناس ہے لیکن اس کی حقیقت نگاری اور متقدمین شعرا کی حقیقت نگاری میں زمین و آسمان کا بل ہے۔ اس کی حقیقت نگاری داخلی ہے۔ متقدمین کا ہمیشہ یہ مسلک رہا ہے کہ حقیقت نگار ہونا شاعری کی لطافت کے بڑھانے کا دوسرا طریقہ ہے۔ لیکن نذرالاسلام اس اصول پر کاربند نظر نہیں آتے بلکہ حقیقت نگاری اس کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ایک مشہور نقاد اپنی رائے نذرالاسلام کی شاعری کی بابت ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ نذرالاسلام کو ہم ایک سچا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ وہ سطحی چیزوں پر نظر نہیں رکھتا۔ اس کے مقامات بلند ہیں۔ اس کا کلام تصنع سے مبرا ہے۔ وہ جذبات سے کھیلتا نہیں بلکہ جذبات کا صحیح اور مناسب طور پر اظہار کرتا ہے۔ اسے اپنے جذبات پر قدرت حاصل ہے۔ اور جذبات کو تصنع سے مبرا رکھنا۔ اور حقیقت نگاری پر نگاہ رکھنا اس کی شاعری کے دو نمایاں پہلو ہیں۔

نذرالاسلام نے بنگالی شاعری کی اس صنف میں کافی اضافہ کیا ہے جس کا دارومدار ہندو دیومالا یا علم الاساطیر پر مبنی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے اپنے ہموطن ہندو شعرا سے ایک الگ راہ اختیار کی ہے۔ وہ مذہب اسلام کے پیرو ہونے کی وجہ سے دیومالا کے اس عنصر کی تردید نہیں کرتا بلکہ خاموشی کے ساتھ کنارہ کش نظر آتا ہے۔ سب سے زیادہ تعلق خاطر عنصر جو اسے دیومالا سے ملا ہے وہ اس کی حسن کاری اور فلسفیانہ رنگ جو اسے دیومالا کے مختلف کرداروں سے ملتا ہے۔ ہندو دیومالا میں حسن کاری بدرجہ اتم ملتی ہے۔ اور شاعر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور اپنی شاعری کو ایک نیا روپ بخشتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی شاعری کو مسلم عینیت پسندی اور روایات کے خزانے سے مالا مال کرتا ہے جو کہ اس کی شاعری کا بڑا کمال ہے۔

نذرالاسلام سچائی۔ آزادی اور انصاف کا حامل ہے۔ اور یہ صفات اس کی رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جمہوریت پسند اور وسیع مذہبیت میں سرشار ہے لیکن تعصبیت کا عشر عشیر بھی نہیں۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کا دل میں ہر دلعزیز ہے۔ ہندوستان کے کسی مصنف اور شاعر نے انسانی آزادی حاصل کرنے کیلئے اس سچائی و دیانتداری کیساتھ قدم نہیں اٹھایا جس ایمانداری کیساتھ نذرالاسلام نے بیڑہ آزادی کا اٹھایا۔ گزشتہ جنگ میں وہ جمہوریت پسند حکومتوں کی طرف دوش بدوش لڑا تھا۔ اس کا اپنا خیال تھا کہ جمہوریت پسند حکومتیں حق بجانب ہیں اس لئے وہ اس طرف سے شریک ہوا۔ وہ انتہا پسند انقلاب کا حامی ہے اور انسانیت جس کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں وہ آزادی کا پانی دے کر انسانیت کے پیڑوں کو پھر سرسبز دیکھنا چاہتا ہے۔ کاش کہ اس کی یہ حسرت و ارمان اس کی زندگی میں پورے ہو جائیں اور آزاد نسل انسانی اپنے ملک میں آزادی کا گیت اپنی زبان سے گا سکے۔

اس وقت یہ مایۂ ناز شاعر مرض فالج میں گرفتار ہے اور زندگی و حیات میں کشمکش جاری و ساری ہے۔ خدا ان کو صحت دے۔

اختر رائے پوری پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے علمی اردو نواز ادارہ حلقوں میں نذرالاسلام صاحب کا تعارف کیا ہے۔ انھوں نے اردو میں ان کے کلام کا ترجمہ شائع کیا ہے جو زبان اور تخیل کے اعتبار سے عدیم المثال ہے۔ اس مجموعہ کا نام انھوں نے پیام شباب رکھا ہے۔

نذرالاسلام صاحب کی خاص خاص نظمیں جو ملک کے ہر گوشہ میں مقبول ہوئیں اور خراج تحسین حاصل کیا وہ یہ ہیں۔ بدروہی۔ پرلئے اُلّاس۔ دھوم کیتو۔ کمال پاشا۔ انور پاشا۔ راں تہار ج (ٹیک دل) اور قربانی۔

ڈوبتا ہوا ملاح

قاضی نذر الاسلام کا تخیل — حشر القادری بدایونی

یہ دلدل ہے یہاں دکھ درد کا پانی سمایا ہے
گھروندا تو نے دیوانے کہاں آکر بنایا ہے

اٹھا لے بوریے یاں تجھ سے بے ہول کی بجلی کے
بساطِ زیست کو اپنی قضا سے پہلے وسعت دے

اٹھا سو دیکھ پانی بادلوں سے جو برستا ہے
یہاں کی آنکھ کا آنسو نہیں ہے خون بستہ ہے

زمیں شاداب کر کے یہ جو شاخوں کو ہلاتی ہے
تجھے یادِ فشارِ قبر اے غافل دلاتی ہے

سمندر میں کشتی دشتِ عجب ہے جوشِ طوفاں ہے
ہر اک چشمہ جو ہے آبِ بقا ہے چشمِ گریاں ہے

ہوا کا دیکھ کر رخ بادباں کو کھول کشتیباں
اٹھا لنگر خدا کا نام لے مت کر غمِ طوفاں

ہے جد و جہد تیری رائیگاں ہیں کوششیں باطل
فنا کا گھاٹ تیری ناؤ کی ہے دوسری منزل

ہے سیلابِ فنا کے جزر و مد میں جھونپڑی تیری
ہے ان تنکوں پہ بھی دستِ قضا کی آج ہشیری

تری اک زود کشتی آہ لے کر حسرت بھرے دل سے
فضائے دہر کو تک تک کے ٹکراتی ہے ساحل سے

تجھے ملاح جب ساون کی کالی رات کا غم تھا
یہی بیڑا یہی ساحل ترا دیرینہ ہمدم تھا

تجھے گو خانہ ویرانی نے چنگل میں سمیٹا ہے
مگر اب تجھ پھٹی ٹوٹی چٹائی پر تو لیٹا ہے

ارے ناداں! تو قید و بند کی مضبوط زنجیریں
جھٹک کر پائے ہمت توڑ دے۔ کر نیک تدبیریں

نہ تھی تجھ کو تمنا لعل و گوہر کے خزینوں کی
نہ چاہت سیم و زر کی تھی نہ خواہش تھی دفینوں کی

تو پھر تو چاہتا کیا تھا ارے او درد کے خوگر!
چراغِ کشتہ مٹی کا سکورا۔ اک سڑا چھپر؟

یہی تھی چند روزہ کائناتِ زندگی تیری
اسی پر منحصر تھی تمکنت اور خودسری تیری

یہ تیرے بے حقیقت ساز و سامانِ طرب سارے
تجھے بھی کچھ خبر ہے لے سکوں برباد کیارے

لٹیرے رہزنوں کے ہاتھ چوری ہونے والے ہیں
اجل امراض پیری۔ چور تیرے دیکھے بھالے ہیں

تھپیڑا موت کا ناگہ "تری کشتی ڈبو دے گا
یہ طوفانِ فنا اب تو تجھے دنیا سے کھو دے گا

سنبھل ایسا نہ ہو ٹکرا کے ان سنگین ٹیلوں سے
نہا جائیں لہو میں پیر تیرے اس بڑھاپے کے

مگر تو تو عدم کا ہے مسافر تجھ کو کیا کھٹکا
بلا سے تیری کچھ بھی ہو بُرا ہو یا کہ ہو اچھا

یہ بجلی کی کڑک۔ کالی گھٹا۔ یہ سخت برساتیں
یہ موجیں یہ تلاطم یہ سمندر اور یہ راتیں

یہ گل بوٹے یہ دریا اور دنیا کی یہ آرائش
یہ ہنگامِ فنا۔ بدبخت نسلوں کی یہ افزائش

ازل سے تا ابد یوں ہی رہے گی رہتی آئی ہے
مگر تیرے لئے اے راہ رو ہر شے پرائی ہے

ارے ملاح! نہ کر پروا غم و عیشِ جہاں کی تو
یقیناً چھوٹ جائے گا یہیں ہر شے یہاں کی تو

خدارا مطمئن ہو کے تو ہم آغوشِ قضا ہو جا
زمانے کو پیامِ زیست دے کر خود فنا ہو جا

تبتی وفد

دلائی لاما ابھی کم سن ہیں اسلئے یہ لاما ان کے قائم مقام کی حیثیت سے فرائض منصبی انجام دیتے ہیں۔

کے مذہبی پیشوا "دلائی لاما" جو اس سلسلے کے چودھویں لاما ہیں۔ یہ
ئی ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ فروری ۱۹۴۰ء میں دلائی لاما کا اعزاز ملا

تبتی وفد کے چند اراکین جو "جشن فتح" میں شریک ہونے کیلئے حال ہی میں نئی دھلی پہونچے۔ اس وفد کے دو افراد اچھی انگریزی جانتے اور ترجمان کی خدمات انجام دیتے۔

چودہ سے سولہ ہزار فٹ بلند پہاڑوں کو طے کرتا گھوڑے کی پیٹھ پر ۳۱۴ میل کا سفر کرنے کے بعد تبت کا سرکاری وفد کلکتہ پہونچا اور وہاں سے ریل کے ذریعہ نئی دھلی آیا۔ شاہی مہمانوں کی حیثیت سے جملہ اراکین کو فیروزشاہ روڈ پر کوٹھی نمبر ۲۶ میں ٹھیرایا گیا۔ وہ ہزایکسلنسی وائسرائے ھند کیلئے بہت سے تبتی تحائف ساتھ لائے جو بخوشی قبول کئے گئے۔ ان لوگوں نے جشن فتح کے سلسلے میں دلائی لاما کا پیغام تہنیت بھی پیش کیا۔

[illegible] میں امام رضا کے مزار کا گنبد اور طلائی [illegible]. «مشہد» کے معنی ہیں «شہید کا مزار» اس لئے شہر کا [illegible] مشہد پڑ گیا۔

امام موسیٰ رضا کا مزار مقدس

مسلمانوں کے بارہ اماموں میں امام موسیٰ رضا آٹھویں امام ہوئے ہیں۔ آپکا مزار مقدس [illegible] میں واقع ہے اور ہر سال تقریباً ایک لاکھ زائرین اپنی عقیدت کے پھول [illegible] نچھاور کرتے ہیں۔

مزار مقدس کی [illegible] بڑی پرشکوہ اور شاندار ہے۔ اسکے مختلف حصے مختلف زمانوں میں [illegible] ہوئے۔ سب سے زیادہ توجہ جس نے اس مزار کی طرف کی وہ شاہ رخ [illegible] کی بیوی گوہرشاد [illegible]۔ اس مزار کے [illegible] جو مسجد ہے وہ اسی [illegible] باطن ملکہ کی تعمیر کرائی ہوئی ہے۔

اس مزار پر زر و گوہر کی بارش ہوئی ہے۔ اسکا محل [illegible] منظر اور دلکش ہے [illegible] عمارت بھی تعمیر کرنے والوں کی [illegible] کا ثبوت ہے۔ اسکے [illegible] ٹائل چمکتار چمکتے اور جواہرات سے [illegible] قندیل و فانوس آنکھوں کو خیرہ کردیتے ہیں۔

مشہد ایران کا ایک [illegible] شہر اور [illegible] ہے۔ یہاں آنے والے زائرین کے قیام کے واسطے بہت سی اقامت گاہیں تعمیر کرائی گئی ہیں جہاں انکو ہر طرح کا آرام پہونچتا ہے۔

مزار کا ایک اور رخ طلائی مینار کا ایک قریب کا نظارہ
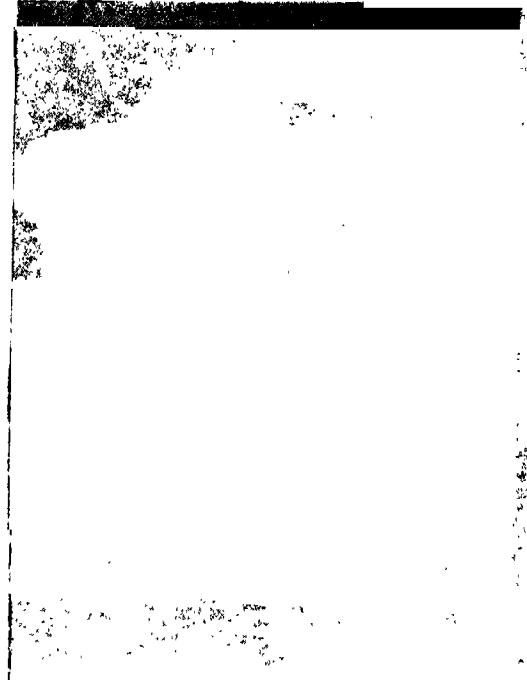
مزار کا ایک حصہ جو «سقاخانہ» کہلاتا ہے۔
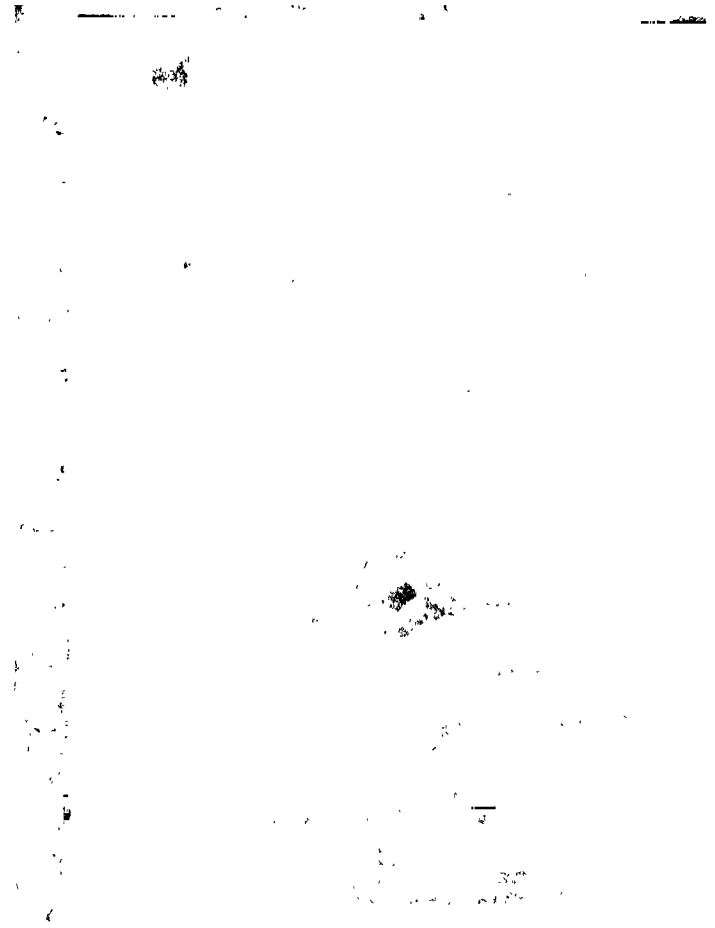
مزار کی عمارت کا ایک وسیع صحن

بے مثل قران مجید. کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن خود حضرت علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

مزار کی نئی عمارت کا منظر بداز صفر دروازہ

کشمیر کے کھنڈرات

کشمیر کو ' فردوس برروئے زمین ' کہتے ھیں اور
یہ دراصل ہے بھی صحیح۔ اس خطہ کے قدرتی مناظر
و بصورتی اور دلکشی میں بے مثل ھیں. یہاں کی صاف
شفاف جھیلیں' برف پوش کوھستانی چوٹیاں اور پھلوں
پھولوں سے لدے ہوئے درخت سیاح کیلئے اس قدر جاذب
وجہ ثابت ہوتے ھیں کہ یہاں کے پرانے کھنڈرات پس
پشت جا پڑتے ھیں۔ حال آنکہ یہ قدیم تاریخی یادگاریں
اپنی جگہ پر بہت ھی اہم ھیں۔ بہت پرانے زمانے سے
چودھویں صدی تک یہاں ھندو راجہ حکومت کرتے رہے۔
انھوں نے اپنے زمانہ میں یہاں بہت سے مندر تعمیر کرائے
جنمیں راجہ اونتی ورمن کے بنوائے ہوئے مندر 'اونتیشور'
اور 'اونتی سوامی' بہت مشہور ھیں۔ انکے کھنڈرات سے
پتہ لگتا ہے کہ نویں صدی میں کشمیری فن تعمیر
انتہائی عروج پر تھا۔

کہتے ھیں کہ پرانے زمانہ میں وادیٔ کشمیر ایک
بڑی جھیل تھی جس میں ایک دیو رھتا تھا جو ادھر
ادھر کے پہاڑوں کو خوب ستایا کرتا تھا۔ یہ دیو اپنا وار
پانی کے اندر سے کیا کرتا تھا اور خشکی پر آکر لڑنے

راجہ اونتی ورمن کے بنوائے ہوئے مندروں کے کھنڈرات۔ داھ
جانب 'اونتیشور مندر ' کے کھنڈر ھیں اور پیچھے کی طر
'اونتی سوامی مندر' کے

مندر بتھن میں ' میر دور دھن سوامی مندر ' جو تقریباً ایک ہزار سال پرانا ہے ۔

سے گریز کرتا تھا۔ مظلوم پہاڑوں کی فر
پرستی دیوی نے ایک چڑیا کا روپ دھارن
کیا اور ایک کنکری اس دیو کے اوپر پھینک
دی۔ وہ ککری ایک پہاڑ بن گئی اور اس
دیو کو پیس ڈالا۔ یہ پہاڑ ابتک دھری پربت
کے نام سے مشہور ہے۔ اس پہاڑ پر اکبرشاہ
ایک قلعہ بنوایا تھا جسکی فصیل کا قطر (
ابتک باقی ہے) تین میل ہے۔ اس میں
دروازے ھیں ایک کا نام ہے 'سنگین دروازہ'
اور دوسرے کا 'کاٹھی دروازہ'۔ کشمیر
کھنڈرات کی نگہداشت [illegible] آ
[illegible] کرتا ہے۔

جلالتہ الملک شاہ عبدالعزیز ابن سعود کی تخت نشینی کی بیسویں سالگرہ ہوئی تو اس موقع پر امیر فیصل لندن میں موجود تھے۔ اس خوشی میں عظمائے لندن اور وہاں کے ارباب سیاست نے شاہ موصوف اور انکے ہمراہ لندن جانے والے جملہ مندوبین کو شاندار ضیافت دی۔ یہ دونوں تصاویر اسی تاریخی تقریب کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

امیر فیصل برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر بیون سے مصافحہ کر رہے ہیں۔

ضیافت م
شریک ہو
کیلئے
فیصل
استقبال
جا رہا
تصویر
بائیں ط
شیخ
ر ہبہ
جو
سفیر
حیہ
لند

اسفنج کیسے بنتا ھے

بحیرۂ روم میں قبرص کے قریب غوطہ خور سانس لینے کیلئے خاص قسم کے آلے لگا کر غوطہ لگاتے اور اسفنج تلاش کرتے ھیں۔ اسفنج سب سے زیادہ تعداد میں یہیں سے دستیاب ہوتا ھے۔

نوجوان غوطہ خور سمندر میں چھلانگ مارنے ھی والا ھے۔ اسکا باپ جو خود غوطہ خور رہ چکا ھے اپنے جوان بیٹے کو اپنے نقش قدم پر چلتا دیکھکر مطمئن نظر آرہا ھے۔

جب اسفنج تازہ تازہ سمندر سے نکلتا ھے تو اس پر ایک قسم کی کالی جھلی چپکی رہتی ھے، جسکو نمک کے پانی سے چھٹایا جاتا ھے۔ اگر غوطہ خور اسے خود استعمال کرنا چاھتا ھے تو وہیں کے وہیں اسکو خشک کر لیتا ھے۔

اسفنج اپنی اصلی شکل میں آچکا ھے اور استعمال کیلئے بالکل تیار ھے۔

شکست

ابھی گراں بارِ خزاں زدہ سالوں کا بوجھ
اپنے نحیف شانوں پہ اٹھائے
آیا ہے آج!
ابتک کیوں تھا؟ ابتک کیوں رکا؟
پوچھے جاتی ہیں پیہم سر ٹکراتی لہریں
شاید اسکی تمناؤں کو دعاؤں کا سہارا تھا
ورنہ نہ کھلا اس کے چمن میں کوئی گلِ رنگیں
نسیم نے کبھی رقص نہ کیا اس کے گلزاروں میں
کہاں تھا چمن؟ کہاں تھے گلزار؟
دیکھا اس نے
ایک لق و دق صحرا ——— تنہا، خاموش، اُجاڑ!
شجر آشنائے بہار نہ ہوں جس میں
اور کھڑے ہوں اس طرح
جیسے کوئی نامراد ماں کھو کر اپنا بچہ
آغوش کھولے آکاش تکتی ہو
یا پھر زیست کا وہ دورِ طویل ———
ایک کائنات ریگ تھا
بے کنار!
ایک بھی نخلستان نہ ہو جس میں سہارے کے لئے
ترسے جو گئے رہبر منزل بے نشان بن بھی نہ سکیں
اور راہرو یونہی بے ارادہ سا بھٹکتا پھرے
پھر کیوں تھا پھر کیوں رکا تھا وہ ستاکا وہ جوش؟
جسکی جرأت کا ایک قدم
بکھیر دیتا جست و زیست کے تار و پود
شاید اس کی تمناؤں کو دعاؤں کا سہارا تھا
آج وہ شکست ہوا؟؟
کیوں نہ سہارا اس نے یہ پوچھ

دو دن اور
پھر آجاتے وہ لمحات بھی
جب تمنائیں دعاؤں کا سہارا لئے
آسودہ ہو جاتیں فرشِ خاکی میں
اور شاید بن جاتیں حسین لالہ کے پھول

مگر وہ جرأت
جسکو بہلایا تھا کھلونوں سے
یا جسکی آواز نحیف کھو گئی تھی ناقوس کی خوش آئند صداؤں میں
اٹھی ہے طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پہ لئے آج!
بہت دیکھا! بہت دیکھا!!
اور تو بھی دیکھ!!
اتنا طویل انتظار صرف ایک مسکراہٹ کے لئے!
میں ایک ہستیٔ حقیر و معذور
نقش بناؤں
جس کے ہونٹوں پر تبسم ہو جاودانی
میں نغمے تخلیق کروں
جو ہمیشہ میٹھے راگ سنائیں
اور تو آقائے دو جہاں!
بنا کے یہ شاہکار؟
جو اتنی گراں بارِ خزاں زدہ سالوں کا بوجھ
اپنے نحیف شانوں پہ اٹھائے
آیا ہے آج ———!
موجیں کیوں لرز اٹھیں
کس تصور سے ٹکرایا یہ آبی بگولہ
کس کی شکست کا اعلان ہے وہ چیخ
جو کھو گئی نمناک گہرائی میں
کون ہارا؟؟

ابن حسن برنی

مشاہدات

شمس [illegible]

"انتظار"

وعدۂ فردا کے جائے میں کسی کے واسطے
یہ امیدوں کی ضیا یہ تیرگی انتظار!
جیسے [illegible] صبحِ صادق کے قریب
[illegible] کے شانوں پہ تاریکی کا بار

"ذہنی خواب"

میرا جوشیلا دوست جذباتی فسانہ کہہ گیا!!
اپنے ذہنی خواب پر رنگِ حقیقت پھیر کر
ناصحِ کو دیکھنے والی نظر کے واسطے
چاندنی دریا بنا دیتی ہے جیسے ریت پر

"آغاز و انجام"

آہ یہ آغاز و انجام ملاقات جمیل!
ہم بعد امید بہم جیسے بے طرح یاد آتے!
جیسے نیل [illegible] خواب گاہ شرق سے
مسکرا کر چاند نکلے زرد ہو کر ڈوب جائے!

تحفظ آثار قدیمہ

کوشلیا دیوی

ہندوستان میں قدیم تہذیبوں کی تہوں پر تہیں جمی ہوئی ہیں جن کے آثار اب تک باقی ہیں۔ ان میں سے بعض بہت نیچے دب گئی ہیں اور ان کی کھدائی کی ضرورت ہے۔ محکمۂ تحفظ آثار قدیمہ ان کا کھوج لگانے اور ان کو کھود نکالنے میں بڑی مستعدی کے ساتھ مصروف ہے۔

اس نے بہت سے ایسے آثار کا پتہ لگایا ہے جن سے زمانۂ قدیم کے مختلف عہدوں کی پرانی تہذیبوں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان دریافتوں میں سب سے زیادہ دلچسپ چیز پشاور کے پاس راجہ کنشک کا محل ہے۔ ماہرین اثریات نے اس محل کے وجود کا پتہ چینی سیاح ہیون سان کی تحریرات سے لگایا تھا جن میں اس نے چین سے نالندہ تک کے اپنے سفر کا حال بیان کیا ہے۔ شہر پشاور سے باہر ملبہ کے دو بڑے انباروں کو کھودا گیا اور محل کی پوری عمارت نکل آئی۔ وہاں سے جو چیزیں ہاتھ لگیں ان میں سب سے زیادہ خاص اور اہم چیز بلوری تبرکات خانہ ہے۔ جس میں سے کانسہ کی ایک ڈبیہ نکلی اور اس میں سے ہڈی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خود مہاتما بدھ ہی کی ہڈی کا ہے۔

سب سے بڑی کھدائیاں وادیٔ سندھ میں موہنجو دارو اور ہڑپا کی ہیں۔ ان کا کچھ کچھ علم ۱۸۷۲ء میں بھی تھا لیکن ان کی اصل اہمیت کا انکشاف ۱۹۲۳ء میں ہوا جب محکمۂ تحفظ آثار قدیمہ نے ان کی کھدائی کرائی۔ اس کھدائی سے جو تہذیب روشنی میں آئی ہے وہ ویدوں کے زمانہ کی تہذیب سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ اس انکشاف نے ہندوستانی تہذیب کی مدت کے بارے میں جتنے قیاسات تھے ان سب کو بدل ڈالا ہے۔

تحفظ | قدیم آثار کا صرف انکشاف ہی کافی نہیں۔ ان کے تحفظ کا مسئلہ ہندوستان میں ایک دشوار امر ہے۔ یہاں کی تیز بارشیں بڑی تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ بعض علاقوں میں بارش کی وجہ سے گھاس پھوس اس کثرت سے اُگ آتی ہے کہ پرانی عمارتیں جلد گر پڑتی ہیں۔ بعض دریا اپنا رخ بدل دیتے ہیں جس کی وجہ سے پرانی عمارتیں پانی اور ریت میں ڈوب جاتی ہیں۔ زلزلے بھی کثرت سے آتے رہتے ہیں اور ان کا اثر بھی ان عمارتوں پر برا پڑتا ہے۔ ان قدرتی مصائب کے علاوہ انسانی حرکات بھی تباہ کن ثابت ہوتی رہی ہیں مثلاً شمالی ہندوستان کے بہت سے ہندوؤں کے اور بودھ مندر حملہ آوروں نے تباہ کر دیئے۔ ناخواندہ اور ناواقف کسانوں نے بھی بہت پرانے اینٹ پتھر اپنے مکان وغیرہ بنانے [illegible] کی جگہ سے ہٹا دیئے۔

[illegible]

پہنچ چکا ہے اور دوسرے ایشیائی ملکوں کے مقابلہ میں ہندوستان بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ تحفظ آثار قدیمہ کے قانون کے مطابق آج یہاں دو ہزار چھ سو چھیاسٹھ عمارتیں سرکاری نگرانی میں ہیں۔ ان میں تقریباً ایک ہزار کی مرمت ہر سال کی جاتی ہے۔

تحفظ کے معاملہ پر سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں غور کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں محکمہ نے ایک کیمسٹ کا تقرر کیا جس نے پرانی لکڑی، پتھر اور بنائی وغیرہ کی چیزوں کو محفوظ کرنے کے طریقے اختیار کئے۔ اس محکمہ نے اس سلسلہ میں بعض ایسی کامیابیاں حاصل کی ہیں جو بہت ہی اہم ہیں۔ مثلاً اجنتا کے غاروں کی نقاشی جن کے اب سے پچاس سال پہلے بالکل تباہ ہو جانے کا اندیشہ تھا لیکن سائنٹفک طریقوں کو بروئے کار لا کر اس کو بالکل محفوظ کر لیا گیا ہے۔

تحفظ کا یہ کام سب سے زیادہ نمایاں مسلمانوں کے زمانہ کی عمارتوں میں نظر آتا ہے۔ یہ عمارتیں نسبتاً نئی اور زیادہ اچھی حالت میں ہیں۔ دہلی، آگرہ اور لاہور میں خاص طور پر اس محکمہ کا کام زیادہ شاندار ہے۔ یہاں عمارتیں صرف محفوظ ہی نہیں کر لی گئی ہیں بلکہ خوبصورت باغات بھی ان کے پرانے ڈھب ہی کے لگائے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں کامیابی آگرہ کا تاج محل ہے۔

یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان میں تعمیر کے کام اور پچی کے کام کا اچھا نسبتاً آسان ہے۔ عمدہ کاریگری اس ملک کی پرانی روایت ہے اور ایسے صناعوں کا پتہ لگانا آسان ہے جنہوں نے اپنے اسلاف اور اجداد کے ہنر اور دستکاریاں ورثہ میں پائی ہیں۔ دلی اور آگرہ کی قدیم عمارتوں میں پرانی چیزوں کی جگہ جو نئی چیزیں لگائی گئی ہیں، ان کا فرق بہت ہی مشکل سے محسوس ہوتا ہے۔

کتبات | محکمۂ آثار قدیمہ کے کاموں میں سب سے زیادہ مشکل کام پرانے کتبوں کو پڑھنا ہے یہ تحریریں یا تو کسی دھات پر ہیں، یا پتھر پر یا کسی اور چیز پر۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ کا پتہ لگانے میں ان کتبوں سے بڑی مدد دی ہے۔ اور تاریخی واقعات کا تسلسل انہی کے ذریعہ قائم ہو سکا ہے۔ مثلاً پتھر کے کتبوں کو پڑھ کر مہاتما بدھ کی پیدائش کا صحیح سال معلوم ہو گیا ہے۔ [illegible] اس سے پہلے بدھ کی شخصیت [illegible] پرانے زمانہ کے کتبوں [illegible] مثلاً اشوک کے [illegible] اشوک کے زمانہ کی سماجی حالت [illegible] کے تعلقات [illegible]

کون کون سے غیر ملکوں سے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کتبوں میں یونانی نام بھی بکثرت آئے ہیں۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے تعلقات یورپ کے تمام قدیم ملکوں کے ساتھ تھے۔

کتبوں کی پڑھائی کا کام ابتدا میں انفرادی طور پر شروع ہوا لیکن کچھ دن بعد محکمۂ تحفظ آثار قدیمہ نے اس کام کو اپنے ذمہ لے لیا۔ ۱۸۸۸ء میں اس محکمہ نے کتبات اور ان کے ترجمے شائع کرنے کے لئے ایک مستقل رسالہ جاری کیا۔ چونکہ اسلامی عہد کے کتبات بہت زیادہ تھے اور ان کی اہمیت بھی بہت ہے اس لئے ۱۹۰۲ء میں ایک ماہر علم کتبات مقرر ہوا جس کا کام صرف اسلامی کتبات پڑھنا تھا۔

عجائب خانے

ہندوستان میں سب سے پہلا عجائب خانہ ۱۷۹۶ء میں بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی نے قائم کیا اور اپنی جمع کی ہوئی تمام قیمتی چیزیں وہاں رکھیں۔ کچھ سال بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک عجائب خانہ "انڈیا ہاؤس" (لندن) میں کھولا کیونکہ کمپنی کا صدر مقام اور مرکزی دفتر "انڈیا ہاؤس" ہی تھا۔ کمپنی کلکتہ کے عجائب خانے کو سالانہ مالی امداد بھی دینے لگی جس سے عجائب خانہ کے مہتمم کو تنخواہ دی جاتی تھی اور عجائب خانہ کا انتظام کیا جاتا تھا۔ پھر حکومت نے عجائب خانوں کو اپنی زیر نگرانی کر لیا۔ شروع شروع میں ان عجائب خانوں کی تمام نمائشی اشیا طبیعیات سے متعلق ہوتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ اثریاتی عناصر بڑھتے گئے۔ آج ہندوستان میں تقریباً سو عجائب گھر ہیں جن میں نوے براہ راست "آرکیالوجیکل سروے" کے ماتحت ہیں۔

لارڈ کرزن کو ان عجائب خانوں سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ عجائب خانے اسی جگہ قائم کئے جہاں سے اثریاتی دلچسپی کی چیزیں برآمد ہوئیں خواہ طلبا کے لئے وہاں پہنچنا کتنا ہی مشکل ہو (مثلاً ٹکسلا، نالندا اور موہنجو دارو)۔ لارڈ کرزن نے ایک بڑی خدمت ہندوستان کی اس طرح بھی کی کہ اس نے بہت سی چیزیں یہاں سے لندن نہیں جانے دیں بلکہ اس نے بعض چیزیں لندن کے عجائب خانوں سے واپس بھی منگا لیں۔

ریاستوں میں سرگرمیاں

سب سے زیادہ قیمتی اثریاتی خزانے ریاستوں ہی میں ہیں مثلاً اجنتا اور الورا کے مشہور غار حیدرآباد میں ہیں اور سانچی کے کھنڈر بھوپال میں۔ جب "آرکیالوجیکل سروے" شروع ہوا تھا تو ریاستوں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا تھا [illegible] اور محکمۂ آثار قدیمہ کے ملازمین ریاستوں [illegible]

کی طرف سے ان کی مدد بے دریغ کی جاتی تھی۔ ۱۹۰۲ء سے ریاستیں خود اپنے اپنے محکمہ جات کو ترقی دے رہی ہیں اور ان میں سے بعض نے بڑے بڑے نمایاں کام انجام دیئے ہیں۔ ریاستیں بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس کام میں منہمک ہیں اور اپنے ہاں کی یادگاروں کے تحفظ پر دل کھول کر روپیہ خرچ کرتی ہیں۔ مثلاً اجنتا اور الورا کے غاروں کی نقاشی کا تحفظ ریاست حیدرآباد کے محکمۂ اثریات ہی کا کارنامہ ہے۔ اسی کی بدولت ان غاروں تک طلبا اور فنون لطیفہ کے شیدائیوں کو پہنچ ممکن ہو سکی۔

آئندہ کے منصوبے

اگرچہ محکمۂ اثریات کے کارنامے بہت اہم ہیں اور قدیم یادگاروں کے تحفظ اور قدیم تاریخ کی ترجمانی کے سلسلہ میں اس نے قابل ستائش کام انجام دیئے ہیں لیکن پھر بھی مزید توسیع کی بڑی ضرورت ہے۔ اور زیادہ روپیہ خرچ کرنے کی اور زیادہ تجربہ کار اور لائق عملہ کی ضرورت ہے۔ کھدائی کے کام کی بھی ابھی بڑی گنجائش باقی ہے اور ضرورت ہے کہ اس کام میں زیادہ سے زیادہ لوگ مہارت پیدا کریں۔ یہ ایک اچھی علامت ہے کہ اثریات میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ یونیورسٹیاں اور علمی ادارے بھی اس میں بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔

ہندوستان میں اثریات میں دلچسپی انگریزوں کی پیدا کی ہوئی ہے لیکن ہندوستانیوں نے اس تحریک کا خیر مقدم بڑی گرمجوشی کے ساتھ کیا۔ آج حکومت ہند اور ریاستوں کے محکمہ جات اثریات کا عملہ زیادہ تر ہندوستانیوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستانیوں کا یہ جوش صاف پتہ دیتا ہے اس بات کا کہ یہ اپنے ماضی کے احیا اور قدیم یادگاروں کے تحفظ کے کام کو برابر جاری رکھیں گے۔

رائل جیوگرفیکل سوسائٹی

شاہی جغرافیائی انجمن لندن

نپولین کی جنگوں کے بعد مغربی قوموں نے گرمجوشی کے ساتھ خشکی اور سمندر کے ان حصّوں کا پتہ چلانا شروع کیا جو اب تک معلوم نہ تھے اس کام میں سپاہیوں، جہازیوں، منتظموں اور نئے بازاروں اور مال کی فراہمی کے نئے ذریعوں کو تلاش کرنے والے تاجروں نے حصّہ لیا۔ رفتہ رفتہ ان کے ساتھ سائنسداں اور نادر خبریں جمع کرنے والے بھی ہوگئے۔ غرض ساری صدی میں تلاش اور کھوج کے سلسلے میں سرگرمی دکھائی جاتی رہی۔

اس لئے اہل لندن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسی جگہ ہونی چاہئے جہاں ان مہموں اور سفروں کے متعلق معلومات جمع کی جا سکیں اور دلچسپ اور جغرافیائی معلومات کے متعلق تبادلہ خیالات کیا جا سکے ۱۸۳۰ء میں رائل جیوگرفیکل سوسائٹی کے قیام نے اس ضرورت کو پورا کر دیا اس میں مختلف دلچسپیوں کے لوگوں نے حصّہ لیا۔

ان میں سے کچھ اس سے پیشتر "ریلے ڈائننگ کلب" میں ملا کرتے تھے۔ جو ۱۸۲۷ء میں قائم ہوا تھا۔ لیکن سوسائٹی کی بنیاد اس سے بھی پہلے پڑ چکی تھی۔ کیونکہ پہلے ہی سال میں اس میں "افریقن ایسوسی ایشن" بھی شامل ہوگئی جسے سر جوزف بینکس نے ۱۷۸۸ء میں قائم کیا تھا۔

سوسائٹی کا عام مقصد "علم کی سب سے اہم اور دلچسپ شاخ یعنی جغرافیہ کی ترقی اور اشاعت" بتایا گیا۔ اس کے خاص مقاصد یہ تھے (۱) جغرافیائی معلومات جمع کر کے شائع کرنا (۲) کتب خانہ بنانا اور نقشے اکٹھا کرنا (۳) مہم پر جانے کا ارادہ رکھنے والوں کو مشورے اور ہدایات دینا (۴) برطانیہ اور دوسرے ملکوں میں اس قسم کے اداروں سے تعلقات قائم رکھنا ان میں اب تک کچھ اضافے ہو چکے ہیں۔ انہی مقاصد نے درحقیقت سوسائٹی کے کاموں کو خاص سانچوں میں ڈھالا ہے۔

قائم ہونے کے پچاس سال بعد تک یہ سوسائٹی کھوج کے کام کو ترقی دینے کی کوشش کرتی رہی۔ شاید "افریقن ایسوسی ایشن" سے متعلق ہونے کی وجہ سے یہ افریقہ کے متعلق زیادہ کام کرتی رہی۔ اس کی ترقی کا پہلا دور وہی تھا جب ڈیوڈ لیونگسٹن اپنے مشہور سفر طے کر رہا تھا۔ اس کے کچھ سفروں سے اس سوسائٹی کا بھی بہت قریبی تعلق ہے لیکن اس سوسائٹی کی دلچسپی افریقہ تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ ایشیا، آسٹریلیا، جنوبی امریکہ اور قطبی علاقوں کے اکثر کھوجیوں کو بھی اس سوسائٹی کی مدد اور منظوری حاصل ہوئی۔

اس زمانہ میں ایشیا کے سفروں کی کمی کی وجہ یہ تھی کہ یہ "سروے آف انڈیا" (پیمائش ہند) سے متعلق تھا۔ اس کام میں سوسائٹی کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جو پنڈت وسطی ایشیا کے کھوج کے لئے ملازم رکھے گئے تھے سوسائٹی نے انھیں انعامات اور تمغوں سے سرفراز کیا۔ ان میں سب سے پہلا نین سنگھ تھا جو ۱۸۶۶ء میں لہاسا پہنچا۔ ان میں سب سے اہم شاید کشن سنگھ ہے جو چینی ترکستان اور چینی سرحدی علاقوں میں گیا۔ اس سلسلہ میں ایک اور شخص سرت چندر داس تھا۔

صدی کے ختم کے قریب اس وقت کے صدر سر کلمنٹس مارکھم کے اثر سے سوسائٹی کی توجہ قطب جنوبی کے علاقہ کی طرف مبذول ہوگئی۔ سر جان فرنکلن کی آخری مہم اور اس سے متعلق کئی امدادی مہموں کے بعد برطانوی قطبی مہم میں دلچسپی گھٹ گئی تھی لیکن اب پھر برطانوی کھوجی قطب جنوبی میں دلچسپی لینے لگے اور یہ دلچسپی موجودہ زمانہ تک جاری ہے۔

قطب جنوبی کی مہم کا ایک نیا ادارہ "برٹش نیشنل انٹارکٹک ایکسپیڈیشن" حکومت اور رائل سوسائٹی کے تعاون سے ۱۹۱۰ء میں قائم ہوا۔ اس کی قیادت کیپٹن آر۔ ایف۔ اسکاٹ نے کی۔ اس سلسلہ میں بڑے اہم سائنسی ریکارڈ حاصل کئے گئے۔ یہ کام اسکاٹ کی دوسری مہم میں بھی جاری رہا جس میں قطب جنوبی سے واپسی کے وقت وہ اور اس کے ساتھی فوت ہوگئے۔ اس عہد میں ایشیا کے کھوج میں بھی سرگرمی پیدا ہوئی۔ اس ذیل میں دو نام زیادہ اہم ہیں۔ ایک سر فرانسس ینگ ہسبینڈ اور دوسرا سر اوریل اسٹائن۔ ینگ ہسبینڈ کو پیکین سے کشمیر کے ۱۸۸۷ء کے مشہور سفر کے صلہ میں سوسائٹی کا سنہری تمغہ ملا۔ اس نے ایورسٹ کی مہم کی تنظیم میں بھی بہت دلچسپی لی۔ وہ مذاہب عالم کے صدر کی حیثیت سے بھی یاد کیا جائے گا۔

وسطی ایشیا کے جغرافیہ اور آثار قدیمہ کے متعلق سر اوریل اسٹائن کی معلومات اور ان کا ہندوستانی ثقافت سے تعلق کافی مشہور ہے۔ اس کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اپنے ہندوستانی ساتھیوں کے کام کو تسلیم کرانے پر زور دیا اور ان میں سے بہتوں کو سوسائٹی کی طرف سے تمغے وغیرہ ملے۔

دونوں جنگوں کے درمیانی زمانہ میں جغرافیائی کھوج کا طریقہ کسی قدر بدل رہا تھا۔ اگرچہ ابھی دنیا کی سطح کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنا باقی ہے لیکن

جے، آر، کرون

اب نامعلوم مقامات اور علاقوں سے گزرنے پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا بلکہ سائنسداں زیادہ محدود علاقوں کی تفصیلات اور ماحول معلوم کرنے کی طرف متوجہ ہیں۔ ان مہموں میں سے اکثر نوجوان سائنسدانوں خاصکر آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں والوں کی مساعی کا نتیجہ ہیں۔ ایورسیٹ کی مہم کو جس میں لوگوں نے شاید سب سے زیادہ دلچسپی لی دونوں طرح کی مہموں کا مجموعہ سمجھنا چاہئے کیونکہ چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کے ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں نے قیمتی سائنسی معلومات بھی حاصل کیں۔ ان سب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہمیں نیپالی قلیوں نے بہت مدد پہنچائی ورنہ کچھ نہ ہوتا۔ دوسری مہموں نے گرین لینڈ میں کام کیا، قطب شمالی کے لئے ہوائی راستوں کے امکانات پر غور کیا اور اسپٹس برگن برطانوی گائنا، نیو ہیبرڈیز اور وسطی افریقہ میں کام کیا۔

اس میں سوسائٹی کا کام منتظموں کو ہدایات دینا، ان کی پلینوں پر غور کرنا اور منظور ہونے کی صورت میں قرضے دیکر مدد کرنا تھا۔ اس طرح سوسائٹی گویا ان مہموں کی براہ راست ذمہ دار نہیں تھی بلکہ اپنے تجربوں کی بنا پر مشورے اور معلومات بہم پہنچاتی تھی، مہموں کی واپسی پر وہ ان کی رپورٹوں اور نقشوں کو "جیوگرافیکل جرنل" میں شائع کر سکتی تھی اور خاص خاص کاموں کے لئے "رائل میڈل (تمغے) دے کر عزت افزائی کر سکتی تھی۔ یہ تمغے رائل سوسائٹی کی سفارش پر ملک معظم عنایت فرماتے ہیں۔ اس قسم کے اور بھی کئی انعامات ہیں جو سوسائٹی کی سفارش پر دئے جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ سوسائٹی کی دلچسپیاں کھوج کی ہمت افزائی سے آگے بڑھ گئیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جبکہ انگلستان میں جغرافیہ کی تعلیم کا معیار یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں پست تھا، سوسائٹی کی کوششوں سے اس مضمون کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں اس کا معیار بلند کیا گیا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں جغرافیہ کے اسکول کھلنا سوسائٹی ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اس سوسائٹی نے برطانیہ کے نقشوں میں بھی اصلاح کی اور اس فن کو ترقی دی۔ جو نقشے "جرنل" میں شائع ہوتے تھے ان میں جدید طریقوں سے حروف وغیرہ لکھے گئے۔ اب وقتاً فوقتاً خاص نقشے شائع ہوتے رہتے ہیں ان میں سب سے جدید یورپ اور مشرق وسطی کے نقشے ہیں جو "برٹش کونسل" کی طرف سے شائع ہوتے ہیں۔

سوسائٹی نے یہ کام "آرڈیننس سروے" کے تعاون سے انجام دیا ہے اور کئی مرتبہ نوج کے شعبہ جغرافیہ کا کام بھی کیا ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں "انسانی جغرافیہ" پر خاص توجہ صرف کی گئی ہے۔ اس سے مطلب ہے انسانی سماجوں اور قدرتی ماحول کا تعلق۔ اس کے مطابق جغرافیہ دور دراز ملکوں اور خطوں کے حالات کا نام نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کو ترقی کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہے۔

بعد جنگ کی منصوبہ بندی میں جغرافیہ کا حصہ

اس لحاظ سے بعد جنگ کی منصوبہ بندی کے لئے جغرافیہ سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں سوسائٹی نے رائل کمیشن کے سامنے صنعتی آبادی کی تقسیم کے متعلق اطلاعات پیش کیں اور اپنی مختلف نشستوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔

جب لوگ سفر کر کے واپس آتے ہیں تو اپنے کام کے متعلق سوسائٹی کی نشستوں میں تقریریں کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے مقالے "جیوگرافیکل جرنل" میں شائع ہوتے ہیں۔ یہ سوسائٹی کا خاص پرچہ ہے اور برطانیہ میں جغرافیہ سے تعلق رکھنے والے اہم جرائد میں سے ہے۔ اس میں جغرافیہ کی ترقی اور انگریزی اور دوسری زبانوں کی کتابوں پر تبصرہ بھی کیا جاتا ہے۔ "مسافروں کے لئے ہدایات" میں دنیا کے ہر حصے کے مسافروں کے عملی تجربات مختصراً درج ہیں۔ اس کا گیارھواں ایڈیشن شائع ہوا ہے اور دو جلدیں ہیں۔ پھر کچھ فنی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں اور کچھ نایاب مسودے اور پتھروں پر کھدے ہوئے نقشوں کے عکس بھی۔

سوسائٹی کو اپنا کام کرنے میں صرف اپنے اراکین سے مدد حاصل ہوتی ہے۔ اس میں بہت سے ملکوں کے مرد اور عورتیں شامل ہیں۔ ان کی دلچسپیاں اور نقطے مختلف ہیں صرف جغرافیائی معلومات کو ترقی دینے کی خواہش مشترک ہے۔ کچھ لوگ دور دراز سفر طے کرنے کے قابل اور خواہشمند ہیں اور کچھ صرف زیادہ خوش قسمت لوگوں کی مدد کر کے سوسائٹی کے کام میں مدد دینے کے لئے تیار ہیں۔ ان لوگوں کی مدد سے سوسائٹی برطانیہ کے مستند جغرافیہ دانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کرنے، جغرافیہ کا معیار بڑھانے اور اس کے متعلق اطلاعات اور تجربات بہم پہنچانے کے قابل ہے۔

شروع شروع میں سوسائٹی کی ترقی بہت سست تھی لیکن افریقہ کے کھوج کے دنوں میں اسے بڑی ترقی حاصل ہوئی اس کے بعد سے یہ برابر ترقی کرتی رہی البتہ لڑائی کے دنوں میں ترقی کی رفتار کم ہو گئی۔ ۱۹۳۹ء میں سوسائٹی کے تقریباً چھ ہزار اراکین تھے۔

سوسائٹی کیلئے بڑے مکان کی ضرورت

سوسائٹی کے مکان لندن میں تھے۔ کئی برس تک سیویل روڈ میں مکان رہا پھر بڑے مکان کی ضرورت

باقی صفحہ پر

لیمو کا درخت

افسانہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے ۔ دو بوڑھے جنکی بیویاں مر چکی تھیں گاؤں میں ایک دوسرے کے قریب رہتے تھے ۔ ان میں سے ایک کا لڑکا تھا اور دوسرے کی لڑکی ۔ ان کے مکان سے ملحق باغیچے بھی تھے لیکن ان کے درمیان کوئی باڑ لگی ہوئی نہیں تھی ۔ البتہ ایک بہت ہی پرانا لیمو کا درخت موجود تھا ۔ اور اس درخت کی بابت ایک غیر معمولی اور عجیب و غریب بات یہ تھی کہ اس میں نہ تو کبھی پھول کھلے اور نہ کبھی اس کے پتوں میں سرسراہٹ ہوئی ۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ درخت بہت پرانا ہونیکی وجہ سے پھول پھل نہیں دیتا ۔ اس کے پھولنے پھلنے کا زمانہ گذر گیا ہے ۔ اور بعض کہتے تھے کہ وہ آسیب زدہ ہے اور فنا ہونے سے پہلے صرف ایک بار اس میں پھول کھلیں گے ۔

آس پاس کے لوگ ہنسی خوشی کی زندگی بسر کرتے رہے ۔ ان کے بچے بھی جوان ہوتے رہے ۔ ایک بوڑھے کے بیٹے میکسم کے بال گھونگھریالے اور بھنویں سیاہ تھیں ۔ وہ بڑا ہوشیار اور لائق تھا ۔ اسے ہر چیز میں کامیابی نصیب ہوتی تھی ۔ دوسرے بڈھے کی لڑکی اولمپیا حسین تصویر کی طرح خوبصورت تھی ۔ وہ مغرور بھی تھی ۔ جب وہ بگڑ جاتی تو اسے بمشکل منایا جاسکتا تھا ۔

دونوں بڈھوں میں بہت اچھا میل جول تھا ۔ وہ ایک دوسرے سے خوش تھے ۔ اسلئے انہوں نے باہمی طور پر فیصلہ کیا کہ میکسم اور اولمپیا کی شادی ہو جائے ۔

"اب تمہاری شادی کا مناسب وقت آگیا ہے" میکسم کو اس کے باپ نے سمجھانا شروع کیا ۔ "تمہاری منگنی اولمپیا سے ہو جانی چاہیئے ۔ وہ بہت ہی نازک اندام اور حسین لڑکی ہے"

"میں اسے بچپن سے جانتا ہوں" میکسم نے جواب دیا ۔ "وہ بے شک حسین ہے لیکن اس کے نخرے بہت زیادہ ہیں ۔ وہ زبان دراز بھی کرتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ نہایت کاہل اور سست ہے مگر شادی کرنا میرے لئے واقعی ضروری ہے تو میں فوراً لیمو کے درخت سے بیاہ کر لونگا" اور اس نے لیمو کے پرانے درخت کی طرف اشارہ کیا ۔

اس کی زبان سے ان الفاظ کے نکلنے کے ساتھ ساتھ لیمو کے درخت نے اپنی شاخیں جھکا دیں اس کے پتوں میں فوراً سرسراہٹ پیدا ہوئی جیسے وہ بھی زبان خاموش سے کچھ کہہ رہا ہو ۔

میکسم کے باپ نے درخت پر نظر ڈالی ، وہ ہنسا اور اپنے بیٹے سے کہنے لگا ۔ "وہ دلہن تو بہت ہی بڑھیا ہے ۔ لوگوں کا بیان ہے کہ اس کی عمر ایک ہزار سال سے زیادہ ہے ۔ تم بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہوگے"

اور یہ کہکر وہ اپنے کام پر چلا گیا ۔

لیکن میکسم اسی جگہ خاموش کھڑا بہت دیر تک پتوں کے سرسرانے کی آواز سنتا رہا ۔ گویا ان کے معنی الفاظ میں کوئی پیغام چھپا ہوا تھا ۔

عین اس وقت ان کے پڑوس کی لڑکی اولمپیا بھی نزدیک ہی کھڑی رس بھریاں توڑ رہی تھی ۔ اس نے کان لگا کر یہ ساری گفتگو سن لی ۔

میکسم کو رات بھر نیند نہ آسکی ۔ وہ لیمو کے درخت کے پتوں کی سرسراہٹ سنتا رہا ۔ اس نے دل میں سوچا "آخر کیا بات ہے کہ اس سے پہلے ان پتوں میں کبھی سرسراہٹ نہیں ہوئی اور اب انہوں نے ایکدم شور مچانا شروع کر دیا؟"

صبح ہوتے اسے نیند آگئی ۔ اس کی آنکھ مشکل سے لگی ہوگی کہ یکایک اس نے خواب دیکھنا شروع کر دیا ۔ اس نے دیکھا کہ لیمو کا پرانا درخت اپنی جگہ سے غائب ہو گیا ہے اور اس کی بجائے ایک لڑکی آکھڑی ہوئی ہے جس کے خدوخال تو اچھے نہیں تھے لیکن وہ نگاہوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی ۔ اس کا لباس ظاہری زیب و زینت سے محروم ہونے کے باوجود صاف ستھرا اور اچھا تھا ۔ میکسم اس لڑکی سے ناواقف تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں ۔

"اری لڑکی ! مجھے بتا" اس نے آہستہ سے پوچھا "تیرا کیا نام ہے؟ تو کہاں رہتی ہے ؟ اور میں تجھ سے کہاں ملا ہوں ؟"

"تم مجھے لیپا کہہ سکتے ہو" لڑکی نے جواب دیا "تم نے اس سے پہلے بھی مجھے اسی جگہ دیکھا تھا ۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ ایک ہزار سال سے یہیں کھڑی ہوں"

میکسم نے اس لڑکی کو بہت پسند کیا اور اسے اس کی حالت پر ترس آنے لگا ۔ "لیکن تم اس جگہ کیوں کھڑی ہو؟" اس نے پوچھا "اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں تم کو اپنی دلہن کی حیثیت سے اپنے باپ کے پاس لے جاؤں ۔ ہماری شادی ہو جائے گی اور ہم مرتے دم تک کیلئے ایک دوسرے کے شریک حیات بن جائیں گے"

حسین دوشیزہ نے ایک ٹھنڈا سانس لیا ۔

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے" اس ۔۔۔ [illegible] کہا "بس اتنی بات ہے کہ میں اس جگہ سے جنبش نہیں کر سکتی"

"یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے" میکسم نے کہا "آؤ ۔ میں اس جگہ سے ہٹ جانے میں تمہاری مدد کروں"

انا ایسینوفا

اس نے دوشیزہ کا ہاتھ پکڑ اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا ــــــ
اور بس اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بیدار ہوگیا تو یہ معلوم کرکے سخت متعجب ہوا کہ اس کی مٹھی میں لیموں کا ایک شگوفہ موجود ہے۔ وہ فوراً کمرے میں سے نکل کر باغیچہ میں چلا گیا۔ اس کا باپ لیموں کے درخت کے نیچے کھڑا اسے آوازیں دے رہا تھا۔

"ادھر آؤ بیٹا!" اس نے کہا۔ "دیکھو۔ یہ کیسا عجیب معجزہ ہے۔ لیموں کے درخت میں پھول کھلنے لگے اور وہ اپنی جگہ سے بھی تقریباً نصف انچ کھسک گیا ہے"

میکسم کو یہ دیکھکر بہرحال خوشی حاصل ہوئی۔

"میری دلہن اٹھ بیٹھی ہے" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "وہ سرخ یاقوت شگوفوں سے لد گئی ہے اور چنانچہ شادی کے لئے بالکل تیار ہے"

کچھ دیر باپ بیٹے دونوں وہیں کھڑے رہے اور درخت کو حیرت و استعجاب سے دیکھتے رہے پھر وہ اپنے اپنے کام سے لگ گئے۔ اتفاق سے ولیپیا اس وقت بھی رس بھری کی کیاری میں موجود تھی اور تمام باتیں سنتی رہی تھی۔ وہ اسقدر غمگین ہوئی کہ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی لیموں کے درخت کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ سیدھی اپنے باپ کے پاس پہنچی اور کہنے لگی۔

"اباجان! اس پرانے درخت کو کاٹ ڈالئے۔ اب میں ایک لمحے کیلئے بھی اسے دیکھنا نہیں چاہتی۔ آپ جانتے ہیں۔ اس کے گھنے پتے سورج کی کرنوں کو ہماری رس بھری کی کیاری تک پہنچنے نہیں دیتے۔ اور اب نئی بات یہ ہوئی کہ اس بڑھاپے میں اس کی شاخوں پر پھول کھلنے شروع ہوئے ہیں۔ اس کے پھولوں کی مہک اتنی تیز ہے کہ میں تو برداشت بھی نہیں کر سکتی۔ اس سے میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ اباجان! خدا کے لئے اسے کاٹ ڈالئے ورنہ یاد رکھئے۔ اس کا ناگوار اثر میرے اعصاب پر پڑے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ میں مر بھی جاؤں"

بلا شبہ بوڑھے آدمی کو اپنی بیٹی پر بڑا ترس آیا۔ اس نے ایک کلہاڑا اٹھایا اور لیموں کا درخت کاٹنے چلا گیا۔ اس کے قریب پہنچ کر اس نے زور سے کلہاڑا گھمایا اور پوری طاقت سے درخت پر مارا۔ اچانک ہر چیز پر تاریکی چھا گئی۔ اس کے کان بجنے لگے اور کلہاڑا ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ جب وہ اپنے ہوش میں آیا تو اصل واقعہ کو سمجھ بھی نہ سکا۔ کیونکہ چرانا درخت اپنی جگہ سے غائب تھا اور اس کا نشان تک باقی نہیں تھا۔ کلہاڑا زمین پر گر پڑا تھا اور چند شگوفے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ بوڑھے نے کلہاڑا اٹھایا۔ اسے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ اس کی دھار پر کچھ تازہ خون لگا ہوا ہے۔ پس وہ کلہاڑا اٹھا کر اپنے پڑوسی کے پاس لے گیا اور میکسم کے باپ کو دکھا کر کہنے لگا۔

"ارے بھئی ہمسائے! ذرا دیکھو تو۔ ضرور کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ لیموں کے پرانے درخت میں پھول کھلنے شروع ہوئے اور ان کی مہک اتنی تیز تھی کہ اس کے اثر سے میری بیٹی بیمار پڑ گئی۔ میں نے درخت کو کاٹ ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ اس جگہ سے بالکل ہی غائب ہوگیا۔ اور ہاں۔ یہ دیکھو۔ اس کلہاڑے پر خون بھی لگا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضرور کوئی اسرار ہے۔ یہ جگہ ناپاک معلوم ہوتی ہے۔ اب میں یہاں رہنا بھی نہیں چاہتا۔ میں اپنے مکان کو ڈھا دوں گا اور کسی دوسرے گاؤں میں چلا جاؤں گا۔ اس سے پہلے میری بیٹی نہ تو کبھی بیمار پڑی اور نہ اسقدر غمگین ہوئی"

اس گفتگو کے وقت میکسم جنگل میں تھا اور گھوڑے کے لئے گھاس کاٹ رہا تھا۔ اس کی درانتی لمبی لمبی گھاس پر تیزی سے چل رہی تھی۔ یکایک سے سنائی دیا جیسے کوئی تھوڑے فاصلے پر کھڑا کراہ رہی ہو۔ میکسم نے محسوس کیا کہ وہ آواز اسے اچھی طرح جانی پہچانی ہے۔ وہ آواز اس لڑکی کی ہے جسے اس نے خواب میں دیکھا تھا۔

"اس پر کوئی نہ کوئی خوفناک مصیبت نازل ہوئی ہے" اس نے دل میں خیال کیا اور وہ اس درجہ پریشان ہوا کہ اس گھاس کو چھوڑ تیزی سے گھر کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ لیموں کا درخت اپنی جگہ سے غائب ہے۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ بہت تیزی سے بیٹھنے لگا۔

اس کے باپ نے بتایا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ اور بس اسی روز سے میکسم غمگین وملول رہنے لگا۔ اس نے کھانا پینا ترک کر دیا۔ اسے رات رات بھر نیند بھی نہ آئی۔ وہ زرد اور کمزور ہوتا چلا گیا۔ یہانتک کہ وہ اپنے پہلے وجود کا محض سایہ نظر آنے لگا۔ اس تمام عرصے میں اسے دوشیزہ لڑکی کی آواز برابر سنائی دیتی رہی۔ "اس جگہ سے تین میل دور جا کر مجھے تلاش کرو"

اس کے باپ نے محسوس کیا کہ میکسم اپنے آپے میں نہیں ہے۔

"آخر بات کیا ہے میرے بیٹے؟" اس نے پوچھا "تم کس سبب سے غمگین، مایوس اور اداس رہنے لگے ہو؟ کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"جی نہیں" میکسم نے جواب دیا۔ "میں بالکل اچھی طرح ہوں۔ مگر میرا دل بیمار ہے۔ اصل بات یہ ہے اباجان! مجھے لیموں کی جدائی بہت شاق گذر رہی ہے۔ اس کے جدا ہونے کے وقت سے ابتک میری حالت دگرگوں ہے اور اسی لئے کسی عنوان چین نصیب نہیں ہوتا" بوڑھے باپ نے خیال کیا کہ میکسم ولیپیا کی بابت کہہ رہا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

"تم کچھ عرصے کے لئے یہاں سے کہیں اور جا کر اپنا کام کاج شروع کر دو۔ تم کو بڑھئی کا کام بھی خوب آتا ہے۔ جب دوسرے لوگوں کے ساتھ اٹھ بیٹھ کر تم نئے کام میں لگ جاؤگے تو تمہارا دل بہل جائیگا اور تم ایک بار پھر خوش و خرم نظر آنے لگوگے"

پس میکستم نے اپنے اوزاروں کا تھیلا کمر پر لاد کر روانہ ہو گیا۔ اس نے ایک کلہاڑی بھی اپنی پیٹی میں لگالی۔ اس نے باپ کو رخصتی سلام کیا اور اس نئی جگہ کی تلاش میں روانہ ہو گیا جو تیس میل دور تھا۔

تیس میل دور! لیکن کس سمت میں؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ اگر سوچا جائے تو ہر سمت میں تیس میل چلنے سے وہ مسافت بہت طویل ہو سکتی تھی۔ لیکن میکستم عزم و ارادے کا پکا تھا۔ وہ چلتا رہا۔ برابر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ خزاں کا موسم آگیا۔ درختوں کے پتے زرد ہو ہو کر زمین پر گرنے لگے، مگر میکستم چلتا ہی رہا۔

ایک دن جبکہ وہ ایک جنگل میں سے گذر رہا تھا، اسے نسیم سحر کے جھونکوں کے ساتھ کچھ فاصلے پر آدمیوں کے بولنے اور کلہاڑیوں کے چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ اسی سمت میں روانہ ہو گیا اور جلدی ہی ایک کھلی جگہ پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ چالیس پچاس لکڑہارے کام پر لگے ہوئے ہیں۔ وہ ان کے پاس گیا اور ان سے باتیں کرنے اور حقہ پینے کے لیے بیٹھ گیا۔ لکڑہاروں نے اس سے پوچھا۔

"کیوں میاں صاحبزادے! تم اوزاروں کا تھیلا اٹھائے اس جنگل میں کیا کرتے پھرتے ہو؟ تم کام کی تلاش میں ہو یا اس سے گھبرا کر بھاگنا چاہتے ہو؟"

"میں لیموں کے ایک درخت کی تلاش میں ہوں" میکستم نے جواب دیا۔ "میرے باپ نے مجھے حکم دیا کہ میں لینا سے شادی کر لوں لیکن وہ لینا مجھے پسند نہیں۔ میں نے کہا میں ایک اور لینا (لیموں کے درخت) کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑا ہوا کیونکہ وہ مجھے پسند ہے۔"

لکڑہاروں نے محسوس کیا کہ میکستم حد درجہ غمگین اور افسردہ ہونے کے علاوہ سنجیدہ بھی ہے۔ پھر بھی وہ اس کی باتوں پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"تم کس قدر اداس ہو!" انہوں نے کہا۔ "کیا تم جنگل کے کسی کونے میں رہنے والے بھوت پریت سے ڈر رہے ہو؟ آخر تمہاری ماں نے اس قدر لاپرواہی کے ساتھ تمہیں گھر سے باہر نکل جانے کیوں دیا؟"

لیکن انہی لکڑہاروں میں ایک بڈھا آدمی ایسا بھی تھا جو میکستم کو ایک طرف لے گیا اور علیحدگی میں کہنے لگا۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئے ہو کیونکہ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر میں نے ایک عجیب کرشمہ دیکھا۔ ایک بہت بڑا تناور لیموں کا درخت۔ جس میں پھول کھل رہے تھے حالانکہ موسم خزاں کی زردی سارے جنگل پر اپنا نقش جمائے ہوئے ہے۔ اس کا سیدھا تنا زخمی تھا، کسی کلہاڑی سے کٹا ہوا تھا اور اس شگاف سے جیتا جیتا سرخ خون بہہ رہا تھا۔ میں اس کرشمے کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا اور ایک دم اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ ضرور کسی زندہ انسان پر کوئی مصیبت گذری ہے۔ میں نے دوسرے لوگوں سے اس کی بابت کچھ بھی نہیں کہا لیکن اس کا خیال میرے دل و دماغ سے نکلے نہ نکل سکا۔"

اضطراب اور بے چینی کے باعث میکستم کا سانس گھٹنے لگا۔ وہ بے قابو ہو کر بولا۔

"ہاں۔ ہاں۔ میرا مطلب اسی سے ہے۔ بتاؤ بڈھے میاں! جلدی بتاؤ۔ میں کس سمت میں جا کر اسے تلاش کروں؟"

"اس کھلے میدان کے آخری سرے پر جاؤ" بوڑھے آدمی نے جواب دیا۔ "اور وہاں سے کچھ فاصلے پر وہ درخت تم کو نظر آ جائے گا۔"

چنانچہ جب میکستم اس میدان کے آخری سرے پر پہنچا تو اسے لیموں کا ایک درخت نظر آیا۔ اس کے بالکل نزدیک جا کر اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور سر جھکا کر کہا۔

"سلامت رہو، میری پیاری لینا! [illegible] بہت لمبا چوڑا سفر کیا لیکن انجام کار تمہیں پا لیا۔"

لیموں کے درخت سے [illegible] اور ہوا سے [illegible] میکستم! تم کتنی [illegible] اس نے [illegible] تم نے خالی کر دیا۔ [illegible] یہاں تک [illegible]

غزل

خونِ دل جب تک نہ ہو یارب سکونِ دل نہ ہو
عشق ناقص ہے اگر بربادی کامل نہ ہو

بیخودی ہو اور آتی ہو کہ ہوشِ دل نہ ہو
ڈوبنا ٹھہرا، تو پھر ساحل گیا ساحل نہ ہو

بیدلی اور اضطرابِ شوق۔ یہ کیا چارہ گر؟
یہ تو ہوتا ہے کہ دل ہو اور سکونِ دل نہ ہو

یہ نشانِ قربِ منزل ہے طریقِ عشق میں
اتنے کھو جائیں کہ ہوشِ دوریٔ منزل نہ ہو

ہم پہ کچھ بیجا نہیں الزامِ سرمستی، مگر
ہم نہ ہوں ساقی! تو لطفِ گرمیٔ محفل نہ ہو

انتہائے یاس ہیں، شانِ خودداری لیے
ڈوبتے ہوں اور لب پہ حسرتِ ساحل نہ ہو

دل کی راہیں دور ہیں اے طالبِ بیدار دوست
جذبۂ صادق ہی ہو تو حاجتِ رہِ منزل نہ ہو

کس سے اے تسکین دادِ بے گناہی لیجیے
سب اسی کوشش میں ہیں رسوائی قاتل نہ ہو

محمد یٰسین تسکین۔

"میں نے اس امر کا بالکل خیال نہیں رکھا۔" میکستم نے کہا۔ "لیکن خیر گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ بھلا پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو یہ بتاؤ کہ اب میں کیا کروں۔ تمہیں حاصل کرنے کے لئے کیا تدبیر اختیار کی جائے؟"

اولیمو کے درخت نے جواب دیا "شام کی تاریکی سے زیادہ صبح کے اجالے میں عقل کام کرتی ہے۔ روشنی میں بہت سی باتیں انسان کو سوجھ جاتی ہیں۔ لہذا کچھ دیر کے لئے آرام سے بیٹھ جاؤ اور مجھے اپنی دردناک کہانی بیان کرنے دو۔"

"ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ ہوا، ٹھیک اس جگہ جہاں اب تمہارا مکان بنا ہوا ہے، ایک چھوٹا سا جھونپڑا موجود تھا، اور اس چھوٹے سے جھونپڑے میں میری ماں رہتی تھی۔ نیز اس جگہ جہاں تمہارے پڑوسی کا مکان ہے ایک دولتمند بوڑھا آدمی رہتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جادوگر ہے اور ہر شخص اس سے مسحور ہو جاتا ہے۔ جب میں جوان ہوئی تو اس بوڑھے کی توجہ میری جانب مبذول ہونے لگی۔ وہ تحفے لیکر میری ماں کے پاس آیا اور مجھ سے بیاہ کرنے کی درخواست پیش کی۔ میری ماں نے وہ تحفے قبول نہیں کئے اور بوڑھے آدمی کو نفی میں صاف جواب دیدیا۔ اس نے کہا کہ میں اپنی بچی تجھ جیسے بوڑھے آدمی کے حوالے کبھی نہیں کروں گی۔ تو اس کی زندگی برباد کر دے گا۔"

"بوڑھا آدمی چلا گیا اور ماں نے مجھ سے بڑی سختی کے ساتھ کہا۔ دیکھو میری بیٹی! اس بڈھے سے ہوشیار رہنا۔ تم کوشش کرنا کہ اسے نظر بھی نہ آسکو۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ تم اس سرزمین پر قدم نہ رکھو جہاں وہ قدم رکھ چکا ہو۔"

"چنانچہ میں نے بہت احتیاط سے کام لیا لیکن ایک روز موسم بہار میں اپنے کپڑوں کو دھو کر میں جھاڑیوں پر سوکھنے کے لئے پھیلا رہی تھی کہ اچانک ہوا کے جھونکے سے ایک رومال میرے ہاتھ سے اڑا اور اس بڈھے کے باغیچے میں جا پڑا۔ میں اس کے پیچھے دوڑی اور بالکل بھول گئی کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ میں نے بھولے سے اس کی زمین پر قدم رکھ دیا۔ فوراً وہ زمین پھاڑ کر اندر سے نکل آیا اور مجھ سے کہنے لگا کیا تم مجھ سے شادی کر لو گی۔ میں نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ تب وہ بولا۔ اگر تم مجھ سے شادی کر لو تو بہت مالدار ہو جاؤ گی۔ بہت اچھے اچھے کپڑے اور زیورات پہنو گی۔ لیکن اگر تم نے [illegible] اس جگہ سے [illegible] سکو گی۔"

[illegible]

[illegible] میں [illegible] گی۔

"اسے بوڑھے [illegible]

مطلب کیا ہے۔ میں تو تمہارا دولہا ہوں۔ میں آخری بار پوچھتا ہوں کہ کیا تم مجھ سے شادی کر لو گی؟"

"اس کے بعد میں زبان ہلا کر بول بھی نہ سکی۔ میں نے سر کی جنبش سے انکار کر دیا۔ تب وہ بولا "اچھا خیر۔ نہ مانو۔ لیکن اس وقت تم جہاں ہو بس وہیں ایک گونگے درخت کی طرح بت بنی کھڑی رہو گی حتی کہ کوئی بے وقوف انسان تم سے شادی کا ارادہ کرے۔ نہ تمہارے پتوں کی سرسراہٹ سے کسی قسم کی آواز پیدا ہوگی اور نہ تمہاری ڈالیوں پر کوئی پھول کھلے گا۔ تمہیں اسوقت دولہا ملیگا جب وہ دوسرے لوگوں کے سامنے اپنی دلہن کہکر تمہیں پکارے۔ تمہارے پتوں سے کھڑکھڑ ہوگی اور ڈالیاں پھولوں سے لد جائینگی۔ تمہاری آواز بھی اس طرح نکلے گی جیسے انسانی ہستی کے بجائے کوئی روح بول رہی ہو۔ جب وہ دوسری بار تمہیں اپنی دلہن کہکر پکارے گا تو تازہ خون تمہاری رگوں میں دوڑنے لگے گا اور جب تیسری بار پکاریگا تو تمہاری آواز انسانوں جیسی ہو جائیگی۔ اس کے چوتھی بار کہنے پر تم اصلی روپ میں آجاؤ گی۔ کوئی شخص بھی تمہیں کلہاڑی سے کاٹ نہیں سکیگا۔ لیکن اگر کسی نے کاٹ ڈالنے کی کوشش کی تو ایک پوشیدہ قوت کے ذریعہ تم اس جگہ سے تیس میل پرے ہٹ جاؤ گی۔"

"پھر میں ایک درخت کی صورت میں تبدیل ہونے لگی اور آخر کار لیمو کا ایک نوخیز درخت بن گئی۔ بوڑھے نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ "بس یہیں بیٹھی رہو اور اپنے دولہا کا انتظار کرو۔ لیکن تم بے سود منتظر رہو گی کیونکہ اس تمام کرۂ ارض پر کوئی بھی ایسا بے وقوف نہیں ہوگا جو ایک عمر رسیدہ درخت سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔" یہ کہکر بڈھے نے بے تحاشہ ایک قہقہہ لگایا اور زمین کے اندر غائب ہو گیا اور میں درخت کی صورت میں جوں کی توں کھڑی رہی۔"

"میری ماں نے سارے جنگل میں مجھے تلاش کیا اور ادھر ادھر آوازیں دیں۔ آخر مایوس ہو کر روتی ہوئی گھر چلی گئی۔ بڈھے نے اسکے رونے کی آواز سنی اور کہا "کیا تم لیپا کو تلاش کر رہی ہو؟ یہ دیکھو۔ باغیچے میں لیپا موجود ہے۔ کیا یہ تمہاری بیٹی نہیں ہے؟" میری ماں نے اندازہ لگا لیا کہ بڈھے نے مجھے درخت کی صورت میں بدل دیا ہے۔ چنانچہ اس نے اسکی خوشامد شروع کی لیکن وہ صرف ہنستا رہا۔ میری ماں مایوس ہو کر چلی گئی اور آخر غم و اندوہ سے مر گئی۔ بوڑھا آدمی بہت دن جیتا رہا لیکن پھر وہ بھی مر گیا۔ جب اس کا آخری وقت آیا تو سیاہ رنگ کے دھوئیں کا ایک بادل اس کے گھر سے اٹھا اور اگرچہ شعلے نظر نہیں آئے تاہم اس کا تمام گھر جل گیا اور صرف راکھ باقی رہ گئی۔ میں گذشتہ ایک ہزار سال سے گونگے درخت کی طرح چپ چاپ کھڑی رہی اور اگر تم نہ آتے تو شاید

اب بھی کھڑی ہوتی۔ چونکہ اس طلسم کو تم نے توڑا ہے اسلئے میں مرتے دم تک تمہاری باوفا شریک حیات بن کر رہوں گی اور ہر بات میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ اب تم اپنے باپ کے پاس جاؤ میرے پیارے میکسم! اور چوتھی بار اس کے سامنے مجھے اپنی دلہن کہو۔ تم میری پروا نہ کرو۔ میں کہیں جا نہیں سکتی تم دوبارہ مجھے اسی جگہ پاؤ گے۔ جلدی جاؤ۔ رات ہونی شروع ہو گئی ہے۔

میکسم کھڑا ہو گیا۔ اس نے لیمو کے درخت کو الوداع کہا اور گھر چلا گیا۔ وہ تھکا ہارا لیکن خوش و خرم گھر پہنچا۔ اپنے باپ کے سامنے جھک گیا، پھر بولا "ابا جان! میں شادی کرنی چاہتا ہوں"

"کس سے؟" باپ نے دریافت کیا۔

"اسی لڑکی سے" میکسم نے جواب دیا "یعنی لیپا سے۔ آپ کو یاد ہوگا ایک روز میں نے اس کی بابت ذکر کیا تھا"

باپ بہت خوش ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ میرا بیٹا اولمپیا کی بات کہہ رہا ہے۔ پھر وہ بولا "تمہارا بہت بہت شکریہ، میرے بیٹے! تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ تم لیپا سے مل چکے ہو"

"جی ہاں۔ مل چکا ہوں" میکسم نے جواب دیا۔

اس نے وہ رات گھر پر گذاری اور صبح ہوتے ہی جلدی کرنے لگا۔ "ابا جان! اب ہمیں لیپا کے پاس جانا چاہیئے۔ وہ اس سے زیادہ دیر وہاں ٹھیر نہیں سکتی"

انہوں نے گھوڑے پر زین کسی اور روانہ ہو گئے۔ اب میکسم کو راستہ معلوم تھا۔ گھوڑا بھی تیز رفتار تھا۔ وہ تقریباً تین گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے میدان کے آخری سرے تک اپنا سفر جاری رکھا۔ میکسم بہت بے چین ہو رہا تھا کیونکہ اسے لیمو کا کوئی درخت نظر نہیں آیا۔ البتہ وہاں چھوٹی سی ایک جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ کس طرح جھونپڑی کے اندر چلتا چلا گیا۔ لیکن وہاں داخل ہوتے ہی اس کے دل کا بوجھ اتر گیا کیونکہ اس نے اپنی دلہن کو صورت انسانی میں بیٹھے دیکھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور باپ سے کہنے لگا "ابا جان! یہ ہے میری دلہن لیپا"

اس کا باپ ناراض ہونے لگا۔ اس نے کہا "آخر اس کا مطلب؟ تم نے یہ کیسی چال چلی ہے؟"

لیکن بہر حال بڈھے نے اس لڑکی کو پسند کیا۔ کیونکہ وہ صورت ظاہری اور انداز گفتگو دونوں اعتبار سے اچھی تھی۔ چنانچہ اس نے کسی قسم کی گڑبڑ نہیں مچائی۔

پس میکسم نے لیپا سے شادی کر لی اور دونوں خوشی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیپا نے میکسم سے کہا کہ اپنا قصہ دوسروں کے سامنے بیان نہ کرنا۔ کیونکہ وہ کسی طرح بھی ان باتوں کا یقین نہیں کرینگے بلکہ ہم پر ہنسیں گے۔ میکسم نے وعدہ کر لیا کہ میں ہرگز ہرگز یہ قصہ بیان نہیں کروں گا۔ اور اگرچہ وہ بڑا باتونی لڑکا تھا تاہم اس نے اپنے وعدے کا خیال رکھا۔

میں ایک روز ایک بوڑھے شخص سے ملنے گیا جس نے شہد کے بہت سے چھتے لگا رکھے تھے۔ ہم دونوں بیٹھے ہر قسم کے موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ لیمو کے درختوں میں شگوفے کھل رہے تھے اور تمام فضا ان کی مہک سے لبریز تھی۔ بات چیت ختم ہونے کے بعد ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ شہد کے چھتوں کا مالک پتوں کی سرسراہٹ سنتا رہا۔ پھر اس نے ٹھنڈا سانس لیا اور کہا "سنو میاں نوجوان! میں تم کو ایک حیرت انگیز کہانی سناتا ہوں" اور پھر اس نے لیمو کے درخت کی مذکورہ بالا کہانی سنائی۔

رائل جیوگرافیکل سوسائٹی

بقیہ صفحہ ۴۱

پڑی اور لارڈ کرزن کے ایما اور اعانت سے کنگسٹن گور کا موجودہ مکان خرید لیا گیا۔ اراکین کی دریا دلی کی وجہ سے ۱۹۳۰ء میں جبکہ اسے قائم ہوئے سو برس گذرے تھے اس میں بہت سے نئے اضافے کئے جا سکے۔

اب گویا پہلی مرتبہ سوسائٹی کے پاس اپنا لکچر ہال تھا جس میں نو سو آدمی آ سکتے تھے۔ اور فلمیں دکھانے کا بھی عمدہ انتظام ہو گیا تھا۔ اب کتب خانہ اور نقشہ خانہ کے لئے بھی نئی تعمیریں وجود میں آئیں۔ کتب خانہ میں تقریباً اسی ہزار کتابیں ہیں۔ ان میں نایاب ابتدائی سفرنامے، بعد کی مہموں کی سائنسی رپورٹیں، عام جغرافیہ کی کتابیں، پیمائش اور متعلقہ سائنسیں، دنیا کی جیوگرافیکل سوسائٹیوں کے جرائد (جن میں اکثر جیوگرافیکل جرنل کے تبادلہ میں آتے ہیں) وغیرہ شامل ہیں۔

لڑائی کے زمانہ میں سرکاری محکموں اور متعلقہ لوگوں نے کتب خانہ سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ کتب خانہ کی ساری نئی کتابوں کی مضمون وار فہرست رہتی ہے تاکہ پڑھنے والے فائدہ اٹھائیں۔ اراکین اور دوسرے لوگوں کی دنیا کے ہر حصے سے مانگیں آتی رہتی ہیں اور کتابیں فراہم کی جاتی ہیں۔

یہاں دنیا بھر میں شائع ہونے والے نقشے موجود ہیں جن کی تعداد دو لاکھ پچاس ہزار سے زیادہ ہے۔ ان میں بہت سی ابتدائی تصویریں نقشے، اور سلائیڈیں بھی شامل ہیں۔ عوام ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

عجائب خانہ میں مشہور کھوجیوں کے متعدد ذاتی آثار اور سوسائٹی کے سنہری تمغے حاصل کرنے والوں کی تصویریں ہیں۔

ہندی کے مسلمان شاعر

ہندی اردو کا جھگڑا آجکل ایک ایسی صورت اختیار کر گیا ہے کہ بظاہر اس کا حل ناممکن نہیں تو دشوار ضرور نظر آتا ہے۔ اس پر بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ہندوؤں نے اردو کی اور مسلمانوں نے ہندی کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ ہر دور میں بہت سے مسلمانوں نے نظم و نثر میں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے ہندی کو اپنا ذریعہ بنایا ہے۔ اردو کے شعراء ہی کو لیجئے متقدمین کے ہاں ہندی کے ٹھیٹھ الفاظ کا استعمال بے تکلفی سے موجود ہے۔

دلی۔ سینہ میں اب محشر تلک کوئین کو لہرائے وہ
جو تجھ نین کے جام سوں مے پی کے متوالا ہوا

شاہ مبارک آبرو۔ نین سے نین جب ملائے گیا
دل کے اندر مرے سمائے گیا

شاہ حاتم۔ حق میں عاشق کے تجھ لباں کا بچن
قند سے نیشکر سے شکر سے

میر تقی۔ دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہو ۞ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

سودا۔ محبت کے کروں بیچ بل کی میں تعریف کیا یارو
ستم پریت ہو تو اس کو اٹھا لیتا ہے جوں رائی

جرأت۔ ع جادو ہے نگہ، چھب ہے غضب، قہر ہے مکھڑا

متقدمین کے بعد دور حاضرہ کے اردو شعرا نے بھی ہندی کے الفاظ کو ان کی شیرینی اور حلاوت کی وجہ سے کافی استعمال کیا ہے۔ آرزو لکھنوی کا کلام اس کا شاہد ہے۔ اس ضمن میں صرف ایک مثال ہی کافی ہے۔ مرحوم آغا شاعر قزلباش فرماتے ہیں۔

جب کالی گھٹائیں گھرتی ہیں اور مینہ برکھا برسا جاتی ہے
اے چیتم پیارے کہاں ہو تم یہ برہا آ کے ستاتی ہے
جن جن کے پتی ہیں گھر اپنے وہ سکھیاں خوش خوش گاتی ہیں
ہاں مجھ کو اکیلے پن سے ہائے نیند نہیں اب آتی ہے
کیا ساون کا میں ذکر کروں یہ بھادوں بھی تو بیت چلا
تم جانے مری کس دیس گئے کیوں کوئی خبر نہیں آتی ہے

ذیل میں ان باکمال مسلمان شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے جو ہندی ادب کے ستون سمجھے جاتے ہیں اور جن کا ہندی کلام ہندی کے ہندو شعرا کے مقابلہ میں پیش کیا جانے کا بہر نوع مستحق ہے۔

امیر خسرو تاریخ ولادت ۱۲۵۵ عیسوی۔ تاریخ وفات ۱۳۲۵ء عیسوی نام یمین الدین محمد حسن۔ حضرت شیخ المشائخ نظام الدین صاحب اولیا کے فیضان صحبت سے خسرو نے صوفیائے کرام کے فلسفہ پر عبور حاصل کیا فارسی میں خسرو کی شاعری کا درجہ بہت بلند ہے۔ آپ نے ہر صنف میں داد سخن دی ہے۔ قصیدہ گو شعرا میں خاقانی، صوفیانہ شاعری میں رومی، مثنوی میں نظامی، اور فردوسی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ خسرو نے سب سے ٹکر لی ہے اور یہی ان کا کمال ہے۔ ہندی میں آپ نے پہیلیاں، دو سخنے، مکرنیاں اور انمل وغیرہ مختلف چیزیں تصنیف فرمائی ہیں۔

نیم کی نبولی

پہیلی۔ ایک نار تروَر سے اتری ماں سے جنم نہ پایو
باپ کا ناؤ جو واسو پوچھیو آدھا نام بتایو
آدھو نام بتایو خسرو کون دیس کی بولی
واکو نام جو پوچھیو میں نے اپنے نام نہ بولی

مکرنی۔ ننگے پاؤں پھرن نہیں دیت پاؤں سے مٹی لگن نہیں دیت
پاؤں کا چوما لیت نپوتا اے سکھی ساجن، نہ سکھی جوتا

دو سخنہ:۔ گوشت کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا۔ گلا نہ تھا

انمل۔ بھادوں پکی پیپلی جھڑ جھڑ پڑے کپاس
بی مہترانی دال پکاؤگی یا ننگا ہی سو رہوں

فارسی اور ہندی مخلوط۔

زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

ملک محمد جائسی۔ آپ ہندی کے ایک ممتاز مثنوی نگار ہیں۔ تاریخ ولادت اور تاریخ وفات تحقیق سے نہیں کہی جا سکتی۔ آپ جائس ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ امیٹھی کے راجہ نے ازراہ قدردانی اپنے پاس بلایا تھا اور وہیں انتقال فرمایا آپ کی مشہور عالم مثنوی پدماوت میں راجہ رتن سین اور پدماوتی کے عشق کی کہانی منظوم ہے۔ یہ مثنوی سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں تصنیف ہوئی۔ اس میں جائس کے نواح کی دیہاتی زبان کا عنصر غالب ہے مگر شدت احساس اور جذبات نگاری کے کمالات اس میں بہت ملتے ہیں۔ آپ نے یوگ اور ویدانت کی تعلیم اپنے زمانے کے سادھوؤں سے حاصل کی۔ اس کی جھلک آپ کے کلام میں بہت پائی جاتی ہے۔

عرش ملسیانی

پدماوت - راجہ رتن سین کا انتقال

کال آئے دکھلائی سانٹی — اٹھی جیا چلا چانٹ کے ماٹی
کاکہ لوگ کٹم گھر بار و — کاکر ارتھ دربیہ سنسار و
دہی گھڑی سب بھئو پرا وا — آپن سوئی جو پرسا کھاوا
رہی جے ہیتو ساتھ کے نیگی — سبھی گئے کا ڑھن تیہی بیگی
ہاتھ جھاڑ جس چلے جواری — تجا راج ہو چلا بھکاری
جب لگ جیو رتن سب کاہا — تجا بن جیو نہ کوڑی لاہا

موت جب اپنا عصا دکھاتی ہے - روح خاکی جسم کو چھوڑ کر پرواز کرجاتی ہے - اس وقت عزیز و اقارب دنیاوی جاہ وحشم اور مال منال سب بے سود ہوجاتے ہیں - جان نکلتے ہی یگانے بیگانے ہوجاتے ہیں - زندگی میں جو سامنے رکھ کر کھالیا وہی اپنا ہے اپنی غرض کے لئے جو تمام عمر رشتہ دار بنے رہے - اب مردہ جسم کو جلد از جلد باہر نکالنے کی فکر میں ہیں - راجہ راج پاٹ چھوڑ کر یوں فقیر کی طرح خالی ہاتھ جارہا ہے جس طرح ایک ہارا ہوا قمار باز ہاتھ جھاڑ کر اٹھتا ہے - جب تک روح تھی یہی جسم رتن کہلاتا تھا اب اس کے بغیر ایک کوڑی کے مول کا بھی نہیں -

راجہ رتن سین کی پہلی رانی ناگ متی اپنے شوہر کی فرقت میں یوں اظہار جذبات کرتی ہے

پی سے کہو سندیسڑا ہے بھونرا ہے کاگ
جو دہنی برہے جر موئی تیہی کا دھواں ہم لاگ

اے بھونرے اور کوّے میرا یہ پیام میرے محبوب سے جاکر کہدو کہ وہ تمہاری فرقت میں جل کر مرگئی اور اسی کے دھوئیں سے ہمارا رنگ کالا ہوگیا ہے -

رحیم - بیرم خاں کے بیٹے اور اکبر کے دربار کے مشہور رتن نواب عبدالرحیم خانخانان سے کون واقف نہیں - فارسی کے بے مثل شاعر ہونے کے علاوہ آپ ہندی کے ایک سربرآوردہ شاعر ہوئے ہیں - ۱۶۱۰ بکرمی میں پیدا ہوئے ۱۶۸۲ بکرمی میں وفات پائی - آپ کے متعلق سخاوت اور سخن پروری کے بہت سے قصے مشہور ہیں - مشہور فارسی غزل گو نظیری اور ہندی کے کوی گنگ آپ کے حلقہ پرورش میں شامل تھے - آپکی ہندی شاعری اخلاقیات اور علمی مذاق کی آئینہ دار ہے - آپ نے چھوٹے چھوٹے دوہوں میں وسیع مضامین اداکرکے خوش بیانی کا حق ادا کیا ہے - آپکی متعدد تصنیفات ہیں - رحیم ست سئی - بروے نائکا بھید - راس پنچا دھیائی - شرنگار سورٹھ

مدناشٹک اس کے علاوہ دیوان فارسی اور واقعات بابری کا فارسی ترجمہ - ہندی مندر پریاگ نے ایک کتاب موسومہ بہ رحیم آپ کے جملہ ہندی کلام کا مجموعہ شائع کی ہے - نمونہ کلام -

تر در پھل نہیں کھات ہیں - سرور پیَں نہ پان
کہ رحیم پرکاج ہت سمپتی سنچہیں سجان

درخت خود پھل نہیں کھاتے اور تالاب اپنا پانی آپ نہیں پیتے - اے رحیم نیک بندے اپنا زر ومال دوسروں پر صرف کرتے ہیں -

رحمن انسواینن ڈھل - جیا دکھ پرکٹ کریہہ
جاہی نکالو گریہہ تے - کس نہ بھید کہ دیہہ

اے رحیم آنکھ سے ڈھل کر آنسو دل کا دکھ ظاہر کردیتے ہیں - جسے گھر سے نکال دوگے وہ تمہارے بھیدوں کو دنیا پر کیوں نہ ظاہر کرے گا -

رحمن نیچن سنگ بس — لگت کلنک نہ کاہی
دودھ کلارن ہاتھ لکھ — مد سمجھیں سب تاہی

اے رحیم بروں کی صحبت میں رہ کر کبھو نکر کلنک نہ لگے - کلال کے ہاتھ میں دودھ بھی ہو تو سب اسے شراب کہیں گے -

پریتم چھب نینن بسی — پر چھب کہاں سمائے
بھری سرائے رحیم لکھ — آپ پتھک پھر جائے

محبوب کا جمال آنکھوں میں بس چکا ہے - کسی اور کا حسن وہاں کس طرح سما سکتا ہے سرائے کو بھری ہوئی دیکھ کر مسافر خود واپس چلا جاتا ہے -

عثمان - تاریخ ولادت اور تاریخ وفات تحقیق سے نہیں کہی جاسکتی - وطن غازی پور - والد کا نام شیخ حسن - جہانگیر کے زمانے میں ہوئے ہیں - کاشی ناگری پرچارنی سبھا نے آپ کی ایک مثنوی شائع کی ہے جس کا نام چترا ولی ہے - اس کا سن تصنیف ۱۶۱۳ء ہے - "کنور ڈھونڈن کھنڈ" میں آپ نے مختلف دیشوں کا ذکر کیا ہے جس سے آپ کی جغرافیائی معلومات کا پتہ چلتا ہے - کلام کا نمونہ ذیل کے دوہوں میں دیکھئے -

لوبن چاہی کٹا چھ سر - مار پران ہر لین
ادھر بچن تت کھن دو - امی سینچ جیو دین

محبوب کی نگاہیں وزدیدہ نگاہی کے تیر دل سے رشتۂ حیات توڑ دیتی ہیں لیکن لب لعلیں کی مسیحا نفس باتیں امرت پلا کر دوبارہ زندگی بخش دیتی ہیں -

کون بھروسا دیہہ کا — جھاڑ ہتو جتن اپائے
کاگد کی جس پوتری — پانی پرسے گھل جائے

جسم فانی کا اعتبار ہی کیا - اس کے بچاؤ کی تدبیریں سوچنا بےسود ہے

اس کی مثال تو کاغذ کی پتلی سے ملتی ہے جو پانی میں پڑتے ہی فوراً گھل کر نیست و نابود ہو جاتی ہے۔

مبارک ۔ سید مبارک علی بلگرامی ۱۵۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخ وفات معلوم نہیں۔ عربی۔ فارسی اور سنسکرت تینوں زبانوں پر پورا عبور تھا۔ آپکی تصنیف سے 'الک شتک' اور 'تل شتک' شائع ہو چکے ہیں۔ 'الک شتک' میں زلف کے متعلق سو دوہے اور 'تل شتک' میں 'خال' کے متعلق سو دوہے ہیں۔ ان دوہوں میں ایسی ایسی نادر تشبیہات اور مضمون آفرینی کے ایسے ایسے لاجواب نمونے موجود ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ انتخاب از الک شتک

اَلک مبارک تیا بدن   لٹک پری یوں صاف
خوشنویس منشی مدن   لکھیو کانچ پر قاف

معشوق کے رخ پر زلف اس طرح صاف لٹک رہی ہے جیسے طرح کامدیو (کیوپڈ) ایک خوش نویس منشی کی طرح کانچ پر حرف قاف (ق) لکھ دے۔

چگی مبارک تیا بدن   الک اوپ اتی ہوئی
منو چند کی گود میں   رہی نشا سی سوئی

رخ زیبا کے اجالے کے ساتھ ساتھ زلف سیاہ کا اندھیرا اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے چاند کی گود میں کالی رات محو خواب ہو۔ یہاں جوش ملیح آبادی کی ایک رباعی درج کی جاتی ہے۔ امید ہے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

بادل میں یہ روئے ماہ تاباں کیسا   ظلمات میں یہ نور شبستاں کیسا
حلقے میں لئے ہوئے ہے رخ کو کاکل   یہ کفر کے زیر سایہ قرآں کیسا

انتخاب از تل شتک

گوری کے مکھ ایک تل   سو موہیں کھرو سہائے
مانہو پنکج کی کلی   بھونر بلمبیہ جائے

محبوب کے رخ زیبا کا خال مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ جانو کہ بھونرا کھلتے ہوئے کنول کی بلائیں لے رہا ہے۔

چبک سروپ سمندر میں   من جا نیو تل ناؤ
ترن گئیو بوڑ یو تہاں   روپ تہر دریاؤ

چاہِ ذقن کے دلفریب سمندر میں دل نے خال کو ایک کشتی سمجھ کر تیرنے کا عزم کیا مگر غرق ہو گیا۔ حسن ایک طوفانی دریا ہے۔

رس کھان ۔ دلی کے پٹھان تھے۔ ۱۶۱۴ بکرمی میں پیدا ہوئے۔ سری کرشن کے پرستار تھے اور گوسائیں وٹھل ناتھ کے ۲۵۲ ممتاز شاگردوں میں سے ایک تھے۔ ان وشنوؤں کے ذکر میں آپکے حالات بھی ملتے ہیں۔ آپ کی تصنیف سے دو کتابیں سجان رس کھان اور پریم باٹکا مشہور ہیں۔ اول الذکر میں ۱۲۹ چھند اور آخر الذکر میں ۵۲ دوہے ہیں۔ سجان رس کھان کے چھند ہندی شاعری کا انمول سرمایہ ہیں۔ بھگتی اور خلوص کا اظہار جیسا ان میں ہے اور کہیں کم ملے گا۔ مثالیں دیکھئے۔

مانس ہوں تو وہی رس کھان بسو برج گوکل گاؤں کے گوارن
جو پشو ہوں تو کہا بس میرو چروں نت نند کی دھینو مجھارن
پاہن ہوں تو وہی گری کو جو دھرلو کر چھتر پرندر دھارن
جو کھگ ہوں تو بسیرو کروں مل کالندی کول کدمب کی ڈارن

اے رس کھان اگر تو انسان ہے تو برج اور گوکل کے گوالوں میں جاکر زندگی بسر کر۔ اگر تو حیوان ہے تو نند کی گایوں میں جاکر چر۔ اگر تو پتھر ہے تو اس پہاڑ پر جا جس کو کرشن نے اپنے ہاتھ کے اوپر اٹھا لیا تھا۔ اگر تو پرندہ ہے تو جمنا کے کنارے کے کدمب درختوں پر اپنا آشیانہ بنا۔

سیس گنیس مہیس دنیس سر و سیہو جاہی نرنتر گاویں
جاہی انادی انت اکھنڈ اچھید ابھید سوید بتاویں
جاہی ہئے لکھ آنند ہو جڑ مورھ ہئے رس کھان کہاویں
تاہی اہیر کی چھوہریاں چھچھیاں بھر چھاچھ پہ ناچ نچاویں

شیش ناگ۔ گنیش۔ مہادیو۔ سورج اور اندر لگاتار جس کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ جس کو ویدوں میں ازلی ابدی۔ لا تجزی، لافانی اور اسرار کل لکھا ہے۔ جسے دل میں جلوہ فگن دیکھو تو آنند ملتا ہے اور میرے جیسے جاہل بھی کیفیت کا خزانہ بن جاتے ہیں۔ کتنا تعجب ہے کہ اہیروں کی چھوکریاں اسے چلو بھر چھاچھ پر ناچ نچاتی ہیں۔ (برج بیلا کا اس سے پر لطف بیان اور کس انداز سے ہو سکے گا)

عالم اور شیخ ۔ عالم مرد کا نام ہے اور شیخ عورت کا۔ عالم ۱۷۱۲ بکرمی میں پیدا ہوئے۔ اورنگ زیب کے لڑکے شہزادہ معظم کے دامنِ فیض سے وابستہ تھے۔ عالم پہلے برہمن تھے مگر شیخ نامی ایک رنگریزن شاعرہ کے عشق میں مسلمان ہو گئے تھے۔ کلام میں عالم کا تخلص استعمال ہوتا ہے لیکن فکر شعر میں شیخ بھی ساتھ شامل تھیں۔ نمونہ کلام

پریم رنگ پگے جگمگے جاگے جامنی کے جوبن کی جوتی جگی جور اُمگت ہیں
مد کے چھکے سے تپا سے گھومت ہیں جھومت ہیں جھک جھک جھپ جھپا گھرت ہیں
عالم سو نوکی نکائی ان نینن کی پا کھری پدم پہ بھنور تھرکت ہیں
چاہت ہیں اڑبے کو دیکھت مینک مکھ جانت ہیں رین تاتے تاہی میں رہت ہیں

پریم رنگ میں رنگے ہوئے خوبصورت محبوب کے شباب کا جمال تاباں دیکھ کر آنکھیں کیف اور مستی سے لبریز ہو کر گھومتی اور جھومتی ہیں کبھی جھکتی ہیں اور کبھی پھر کھل جاتی ہیں۔ (محبوب کی اپنی آنکھیں) اے عالم یہ خوبصورت آنکھیں کنول کی پتی پر بھنورے کی طرح منڈلا رہی ہیں۔ چاہتی ہیں کہ اڑ کر چاند جیسا چہرا دیکھیں

لیکن رات سمجھ کر اسی کنول میں بیٹھی رہا۔ (بھونرا رات کو کنول ہی میں رہتا ہے اور آنکھیں بھی محبوب کے چہرے ہی میں رہتی ہیں۔)

چند کو چکور دیکھے نس دن کو نہ نیکھے چند بن بن چھبی لاگت اندھیاری ہے
عالم کہت آلی آلی پھول بہت چلے کانٹے سی کٹیلی بیلی ایسی پرنتی پیاری ہے
کارو کا ہن کہت گنواری ایسی لاگتی ہے موہے واکی سیامتائی لاگت اجیاری ہے
سن کی اٹک تہاں روپ کو دچار کہاں رجھیو دکی پنتیاں تہاں بوجھی بچاری ہے

چکور چاند کے عشق میں دن رات محو رہتا ہے۔ اسے چاند کے بغیر دن کی روشنی بھی اندھیرا معلوم ہوتی ہے۔ عالم کا قول ہے کہ بھونرا پھول کے عشق میں خار دار بیلوں کی مصیبت بھی جھیل لیتا ہے۔ محبت کچھ ایسی ہی پیاری چیز ہے۔ اے گنوار عورت تو کاہن کو کالا کیوں کہتی ہے۔ مجھے اس کے حسن سیہ فام میں بھی اجالا نظر آتا ہے جب دل ہی آجائے تو رنگ روپ کون دیکھتا ہے۔ راہ اشتیاق کی کیفیتیں نہایت عجیب ہیں۔

رس لین ۔ سید غلام نبی بلگرامی ۱۷۴۳ء بکرمی کے قریب پیدا ہوئے۔ انگ درپن (سراپا) اور رس پربودھ (گنجینہ تجانیس) آپ کی تصنیف ہے۔ برج بھاشا کے اچھے شاعروں میں آپ کا شمار ہے۔ نمونۂ کلام۔

مکھ سسی نرکھ چکور ارو ۔۔۔ تن پانپ لکھ مین
پد پنکج دیکھت بھنور ۔۔۔ ہوت نینن رس لین

محبوب کا چہرہ چاند ہے مری آنکھ چکور۔ محبوب کا جسم پانی (شفاف) ہے مری آنکھ مچھلی۔ محبوب کے پاؤں کنول ہیں مری آنکھ بھونرا۔ اس طرح مری آنکھ ہمیشہ کیف میں ڈوبی رہتی ہے۔

یوں تیا نینن لاج جیون لست کام کے بھائے
ملیو سُبل میں بنہہ جیوں اُوپر ہی درسائے

کامنی عورت کی آنکھ میں حیا کی جھپک محض ظاہری حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح پانی میں تیل مل جائے تو اوپر کی سطح پر ہی نظر آتا ہے۔

ظفر ۔ ابوظفر محمد سراج الدین، سلسلۂ تیموریہ اور خاندانِ مغلیہ کا آخری تاجدار۔ اردو میں ظفر تخلص اختیار کیا اور ایک ضخیم کلیات یادگار ہے۔ نئی نئی زمینیں پیدا کیں اور ہر زمین میں تخیل کی آسمان پروازیاں دکھائیں۔ تذکرہ نگاروں نے اس بادشاہ کو جسے قلعہ معلےٰ کے باہر دو گز زمین پر بھی اقتدار حاصل نہ تھا زمینوں کا بادشاہ لکھا ہے۔ ہندی میں ظفر کے علاوہ شوق رنگ تخلص فرماتے تھے۔ پنجابی کے لفظ بھی کہیں کہیں استعمال کئے ہیں۔ نمونۂ کلام

پریم نگر کی ریت نرالی اور نرالے طور ۔۔۔ ہے تو وہ اس جگ میں لیکن ہے وہ جگ ہی اور
واں زمیں ہی اور ہے واں آسماں ہی اور ہے
ہم نہ جانیں کیسی مسجد کیسا ٹھاکر دوارہ ۔۔۔ ہم تو ادھر جھکاویں سر جدھر ہے اپنا پیارا
اپنے سجدے کے لئے اک آستاں ہی اور ہے

پریم اگن نت موہے جرا دے یا کا بھید کہوں کا سے
پی ہو پاس تو جی ہو ٹھنڈا اپنی بپتا کہوں وا سے
رتیاں گجاروں روت روت دن کو گجاروں آہاں کھینچ
میرے من کی موسوں نہ پوچھو پوچھو مری بپتا سے
نین کھلے کچھ اور ہی دیکھو موندوں تو کچھ اور ہی اور
کوئی واکو ساکھ نہ جانے دیکھی بات کہوں جا سے
من کے اندر رہا قلندر تیرے ظفر وہ آن بسا
کام پڑے جب واسو تہار و کام رہا کیا دنیا سے

کون نگر سے آئے ہم اور کون نگر کے باسے ہیں
جائیں گے ہم کون نگر کو ہوتے من میں ہراسے ہیں
دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا
کون آنند کرے ہے واں اور رہتے کون اداسے ہیں
کیا کیا پہلو دیکھے ہم نے پہلے اس پھلواری میں
اب جو چلے اس میں پھل ہیں کچھ اور یہاں ان ہی سے ہیں
دنیا ہے اک رین بسیرا بیت گئی رہی تھوڑی سی
ان کو کہ دیں سو نہ جائیں نیند میں جو بندا سے ہیں

سید امیر علی میر ۔ ۱۸۶۳ء میں صوبجات متوسط کے قصبہ ساگر نامی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر کرامت علی تھا۔ جبلپور اسلامیہ ہائی سکول میں کچھ عرصہ ملازم رہے۔ پھر ریاست اودے پور میں مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ بارہ تیرہ سال ملازم رہنے کے بعد دیوری میں واپس آگئے۔ آپ ہندی کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ ہندی ساہتیہ کی بہت سی انجمنوں، والیان ریاست اور اکابرین قوم نے آپ کی ادبی خدمات کو سراہا ہے۔ کچھ انجمنوں کی طرف سے ساہتیہ رتن اور کاویہ رسال کے خطابات بھی ملے ہیں۔ آپ گئو رکھشا کے حامی ہیں۔ دسہرہ اور دیگر ہندو تہواروں پر آپ نے دلکش نظمیں لکھی ہیں۔ نمونۂ کلام

ہندوستانی طلبا سے خطاب

اہو بھوبھ جن پد کے مستکر ۔۔۔ بھارت کے جیون آدھار
پُورو پُرش گورو کے وردھک ۔۔۔ شاستر دہت گن کے بھنڈار
اُچیہ منورتھ بنکے رو ی ۔۔۔ پرتبھا گیدن کے راکیش
آشا بھرے نین سے تم کو ۔۔۔ دیکھو رہا ہے بھارت دیش
اے ملک و قوم کی بھلائی چاہنے والے، بھارت کی زندگی کے سہارے

اسلاف کی موت تو قیر بڑھانے والے، شاستروں میں بیان کئے گئے اوصاف کے خزانے، بلند ارادوں کے کنول کے سورج، روشنی اور تابانی کے نیلوفر کے چاند، بھارت ورش تیرا چہرہ امید بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

قیدی ہونے سے پُرتم تھا آنی بسیر تو منتر — اسے پون نے چھل لیا کہ موہن منتر
کرکے موہن منتر سا پھر کچھ کرکے — نے گئی نے کھینچ پاس میں گھیرے سر کے
ہوپریم میں آچل وہاں لکڑی کا بھیدی — تھا جو کول کنول بنایا اس نے قیدی

اے تیر قیدی بننے سے پہلا بھونرا آزاد تھا۔ ہوا نے اس پر جادو کیا اور فریب میں لے آئی اس جادو کردہ اسے گھر سے تالاب کے نزدیک کھینچ لے گئی۔ لکڑی میں سوراخ کر دینے والا بھونرا محبت میں جتاب ہوگیا اور نازک کنول نے اسے قیدی بنا لیا۔ ایک ٹوٹا لورد یکھئے

جانی بن چپل دیو جو داتا ہوں اُدار — کرم دیکھوں تو تار یو تو کیسے کرتار

سخی وہی فراخ دل ہے جو بغیر جانچے بغیر امتحان کے بخشش کرے۔ اعمال کو دیکھ کر جو خدا بخشش کرتا ہے وہ کیسا خدا ہے ایسی ہی طنز نواب مرزا داغ مرحوم کے ہاں بھی موجود ہے ؎

بخشدے پرسش اعمال سے پہلے یارب — پوچھ کر کوئی اگر دے تو سخاوت کیسی

مضمون طویل ہو رہا ہے ہمیں افسوس ہے بہت سے شعرا کا ذکر نہیں ہو سکا۔ مولانا حسرت موہانی جعفر علی خاں اثر، آنند نرائن ملا، بینالدین وارثی، جناب مقبول احمد پوری اور بہت سے گیت لکھنے والے شعرا کا ذکر ابھی باقی ہے +

مسئلہ خوراک

راج نرائن کھنّہ

کچھ عرصے سے یہ غلط فہمی تیزی کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے کہ گذشتہ چند سال کے دوران میں ہمارے ملک کو جو زبردست قحط کا مقابلہ کرنا پڑا اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں کا اناج دوسرے ملکوں کو برابر بھیجا جاتا رہا ہے۔ اپنے ملک کی غذائی دشواریوں کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے اس غلط فہمی کو دور کیا جائے اور عام لوگوں کو بتایا جائے کہ صحیح صورت حالات کیا ہے۔

ہندوستان زمانۂ قدیم سے زراعتی ملک ہے۔ کل آبادی کے تقریباً ۷۰ فیصدی افراد بالواسطہ یا بلاواسطہ کاشتکاری کو اپنا پیشہ بنا کر گزارہ کرتے ہیں۔ زرعی رقبے کے لحاظ سے دنیا کا کوئی ملک ہندوستان کا مقابلہ نہیں کرسکتا کیونکہ یہاں تقریباً اکیس کروڑ نوے لاکھ ایکڑ زمین زیرکاشت رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود گذشتہ بیس بائیس سال میں ہمارے ملک کی اوسط پیداوار فی ایکڑ اتنی قلیل رہی ہے کہ وہ ساری آبادی کے لئے کسی طرح بھی پوری نہ ہوسکی۔ سوائے دو چار سال کے جب فصل غیر معمولی طور پر زیادہ اچھی رہی۔ نتیجہ یہ کہ درآمد و برآمد کا حساب پھیلایا جائے تو آسانی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ درآمد ہمیشہ بڑھی رہی۔ اور اس ملک کو ہمیشہ برما، آسٹریلیا اور دوسرے ملکوں سے چاول اور گیہوں منگانے پڑے۔ ۱۹۳۶ء سے پہلے برما ہندوستان ہی کا حصہ تھا۔ اس لئے سینتیس لاکھ ٹن کے قریب برما کا چاول جو برما سے بھیجا جاتا وہ ہندوستان ہی سے بھیجا ہوا سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اگر ہم برما کے چاول کی اس برآمدی مقدار کو ۱۹۳۶ء سے قبل محسوب کی ہوئی ہندوستان کے اناج کی کل برآمد کی مقدار میں سے منہا کر دیں تو فوراً معلوم ہو جائے کہ ہندوستان باہر بھیجنے کی بجائے اناج زیادہ تر منگاتا ہی رہا۔ اس میں شک نہیں کہ غیر معمولی تبدیلی کہ ہندوستان برآمدی ملک سے درآمدی ملک بن گیا گذشتہ جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد عمل میں آئی اور وہ اس لئے کہ ہندوستان کی آبادی میں بڑی تیزی کیساتھ اضافہ ہوتا رہا جس کی اوسط پچاس لاکھ نفوس سالانہ رہی۔ ایسی حالت میں ضروری تھا کہ آبادی کے ساتھ ساتھ زراعتی پیداوار میں بھی تقریباً پانچ لاکھ ٹن اضافہ ہوتا اور فالتو آبادی اس سے اپنا پیٹ بھر سکتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ کہ عام حالتوں میں ہندوستان کو پندرہ لاکھ ٹن کی حد تک اناج ہر سال باہر سے منگانا پڑا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان سے اناج کی برآمد کو ۱۹۴۲ء کے بعد کیوں نہیں روکا گیا جبکہ برما پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ۱۹۴۲ء میں برما پہ دشمنوں کا قبضہ اس وقت ہوا جبکہ ہندوستان سے اناج کی عام برآمد کا سلسلہ پڑوسی ملکوں کے لئے شروع ہو چکا تھا اس توقع کے ساتھ کہ اس کی بجائے برما کا چاول حسب دستور ہمارے ملک میں آجائے گا۔ پڑوسی ملکوں میں لنکا اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کو خصوصیت حاصل رہی کیونکہ ان کے لئے کوئی دوسرا وسیلہ نہیں تھا اور یوں بھی وہ اتحادیوں کے دائرۂ مفاہمت میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی امداد ضروری تھی۔ تاہم جلدی ہی یعنی ۱۹۴۳ء کے شروع میں حکومت ہند نے اس ملک سے ہر قسم کے اناج کی برآمد کو پورے طور سے ممنوع قرار دیدیا۔ اس کے بعد تین سال کے دوران میں بہت ہی محدود مقدار میں جو برآمد لنکا اور مشرق وسطیٰ کے لئے ہوئی وہ اس واضح مفاہمت کی بنا پر تھی کہ جب بھی ہمیں ضرورت ہوئی ملک معظم کی حکومت اس کا بدل ہمارے لئے فراہم کرا دے گی۔ چنانچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ۱۹۴۵ء میں جتنا اناج یہاں سے باہر گیا، اتنا ہی باہر سے یہاں منگا لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی حکومت نے پوری کوشش کی کہ ہندوستان کے لئے اناج کی درآمد کو زیادہ سے زیادہ بڑھا لیا جائے۔

۱۹۴۳ء سے جس قدر اناج ہندوستان میں آیا اس کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں جن کو مدنظر رکھنے سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔

۱۹۴۳	(اکتوبر تا دسمبر) ——	۱,۹۷,۷۰۰	ٹن
۱۹۴۴	(جنوری تا دسمبر) ——	۶,۵۳,۵۰۰	ٹن
۱۹۴۵	(جنوری تا دسمبر) ——	۸,۴۲,۳۰۰	ٹن
۱۹۴۶	(۲۱ جنوری تک) ——	۶۲,۷۰۰	ٹن

اس وقت سیام میں پندرہ لاکھ ٹن کے قریب چاول زائد از ضرورت ہے۔ امید کی گئی ہے کہ اس میں سے سب سے زیادہ حصہ ہندوستان کو مل جائیگا۔ اس کے علاوہ وہ اختلاف والے کیا نتائج برآمد ہوں گے فی الحال سال کے نصف اول میں ہندوستان کو چار لاکھ ٹن گیہوں بھیجنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ چاول کی مقدار مقرر کرنے کا سوال بھی اس کے پیش نظر ہے ہندوستان کا غذائی وفد جو حال ہی میں امریکہ پہنچا ہے وہ کوشش کر رہا ہے کہ ہندوستان کے لئے زیادہ سے زیادہ مقدار میں اناج مخصوص کر لے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ۱۹۴۳ء میں ملک سے اناج باہر بھیجنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی لیکن اپریل سے اکتوبر ۱۹۴۳ء تک بھی برآمد کے

کماتے میں کچھ اعداد و شمار موجود ہیں جن کا سبب آسانی سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ وہ اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:۔

لنکا	۴۲۲،۳۰۲	ٹن
عرب	۴۶۸	ٹن
برطانیہ	۲۳	ٹن
جزائر بحرین	۵	ٹن
دوسرے ممالک	۶۲	ٹن
میزان	۴۲۲،۸۶۰	ٹن

اس میں سب سے بڑی مقدار لنکا کے لئے ہے۔ یہ امر ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ برازیل اور مصر سے لنکا کے لئے چاول لانے کا جو بحری نظام قائم کیا گیا تھا وہ وقتاً فوقتاً درہم برہم ہوتا رہا۔ لہٰذا ملک معظم کی حکومت کی استدعا پر ہمارے ملک کو ہر وقت لنکا کی مدد کرنی پڑی۔ حکومت نے وعدہ کیا کہ حسب ضرورت اتنی ہی مقدار میں اناج واپس کر دیا جائیگا چنانچہ گزشتہ ماہ مئی اور اگست میں یہ اناج وہاں بھیجدیا گیا۔ اسوقت تک اپنے وعدہ کے مطابق لنکا کی حکومت نے اتنی مقدار واپس کر دی ہے۔

عرب کے مقابل جو مقدار دکھائی گئی ہے وہ سرخ اور جوشی سندھ چاول کی ہے جسے بارشوں نے خراب کر دیا تھا۔ شروع میں اسے اپنے ملک کے ان تمام علاقوں میں پیش کیا جہاں اناج کی کمی محسوس کی جا رہی تھی لیکن لوگوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر یہ چاول اس طرح ٹھکانے نہ لگایا جاتا تو ظاہر ہے کہ سو فیصدی نقصان رہتا اور اس کے عوض ایک دمڑی بھی نہ مل سکتی۔ برطانیہ کے مقابل جو مقدار دکھائی گئی ہے وہ تحائف کے ان چھوٹے چھوٹے پارسلوں کی ہے جن میں سے کسی کا بھی وزن آٹھ پونڈ سے زیادہ نہیں تھا۔ یہ پارسل فوجیوں نے اپنے عزیز و اقارب کو بھیجے تھے۔ اگرچہ یہ مقدار بہت ہی قلیل اور برائے نام ہے تاہم اس طریقۂ عمل کو بند کرنے کیلئے بھی احکام صادر ہو چکے ہیں۔ جزائر بحرین یا دیگر ملکوں کے مقابل جو تھوڑی سی مقدار (یعنی ۶۷ ٹن) دکھائی گئی ہے وہ ان ہندوستانی سپاہیوں کیلئے بھیجی گئی تھی جو ہوائی فوج کے سلسلہ میں ان علاقوں میں موجود تھے۔ اب بھی حکومت کا منشا یہی ہے کہ اناج کی برآمد پر جو ممانعت قائم کی گئی تھی اسے دور کر دیا جائے۔ اس کے برعکس وہ تمام ترکیبیں عمل میں لائی جا رہی ہیں اور لائی جاتی رہیں گی جو ملک سے اناج یا دوسری اشیائے خوراک کے نکاس کو روک سکیں۔

چاول کی پیداوار کے سلسلہ میں جو اعداد و شمار اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں وہ بھی غلط فہمیوں پر مبنی ہیں۔ جنگ سے پہلے کے مقابلے میں جنگ کے دوران میں پیدا ہونے والے چاول کی مقدار بہت کم رہی۔ اس کا سبب زیادہ وہ طوفان اور آندھیاں ہیں جن سے مدراس وغیرہ کے علاقے میں نقصان پہنچا ہے۔ بہرحال ۴۶-۱۹۴۵ء کی فصل کے متعلق اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ زمانہ قبل از جنگ کے مقابلہ میں بقدر دس لاکھ ٹن کم رہے گی۔

عورت

عورت ترے وجود سے روشن ہے کائنات — تاباں ہے تیری ذات سے ہر منزلِ حیات
تیرا خیال زینتِ بزمِ تصورات — تو قید بندِ غم کے لئے مژدۂ حیات
تو شمع انبساط ہے محفل کے واسطے — تو عشق کا گداز ہے ہر دل کے واسطے
شاعر کا اک بدیع تخیل کہیں ہے تجھے — یا گلشن سرور کا اک گل کہیں ہے تجھے
یا روح کیفِ نغمۂ بلبل کہیں تجھے — یا پیکرِ غرور و تغافل کہیں تجھے
تو جلوۂ بہار ہے یا خود بہار ہے — ہو کچھ بھی ہے حقیقت پروردگار ہے
عورت کہ تو ہے مریم و حوا کی آرزو — عورت کہ تو شباب زلیخا کی آرزو
تیری نظر صراحی و صہبا کی آرزو — تیرے قدم سے لپٹی ہے دنیا کی آرزو
تو امر کبریا ہے نزاکت پناہ ہے — حد ہو گئی کہ تجھ پہ خدا کی نگاہ ہے
تو ہے جہانِ قدس کا افسانۂ حسین — تو خاتمِ حیات کا ترشا ہوا نگیں
جھکتی ہے تیرے در پہ جہانگیری جبیں — زاہد شکار، توبہ شکن، عشق آفریں
تیری تجلیوں میں ازل کے جمال ہیں — گیسو ترے ابد کا درخشاں خیال ہیں
تو ہے شبابِ شعر کا اک پیکر جمیل — حیراں ہے تیرے سامنے شاعر کی بھی تخیل
نغموں کی موج میں جو بہاتی ہے سلسبیل — تیرا وجود زمزمۂ کن کی ہے دلیل
مقصود ہے تو، مراد ہے تو، مدعا ہے تو — پھر بھی بشر ابھی نہیں سمجھا کہ کیا ہے تو
تو مرکز حیات ہے تو راز زندگی — تو سوز کائنات ہے تو ساز زندگی
تو پیکر نیاز ہے تو ناز زندگی — ہنگام حزن ہمدم و دمساز زندگی
حسن بہار مادر فطرت کہیں تجھے — رنگ تجلیات محبت کہیں تجھے
ہے چہرۂ حیات کا غازہ ترا وجود — ممنون ہے کرم کا ترے بحر ہست و بود
انسانیت کی فکر سے بالا ترے حدود — جنت کی دلربائی میں شامل تری نمود
تو بارگاہ قدس میں خلوت مآب ہے — تیرا حجاب حسن ازل کی نقاب ہے
تیرا مذاق خاص ہے اک شہرت دوام — گیسوئے مشکبو میں ترے دہر کا نظام
باقی ہیں تیری گود سے قومیں فرازبام — تیرے ہی دم قدم سے ہے باقی حیا کا نام
تجھ سے حیات و مرگ ہیں ہم شانِ زندگی — تو نے بلند کر دیا عنوان زندگی
تیری نگاہ مہر ہے سرچشمۂ جمال — اہل وفا کے واسطے فردوس کا خیال
دل ہے ترا کہ شعلہ و شبنم کا اتصال — قدموں سے تیرے گردش ایام پائمال
تو حسن کی حدود میں زلیخا کا خواب ہے
تیری نگاہ مرکز صد انقلاب ہے

خنداں لکھنوی

ہندوستانی ثقافت پر ایرانی اثرات

ایران ہندوستان کا شمال مغربی ہمسایہ ہے۔ ہندوستان کے تمدن کی ترقی میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ پانچ سو سال تک مغل شہنشاہوں کے ہاتھ میں اس کی باگ دوڑ رہی ہے۔ یہ سب ایرانی دل و دماغ کے تھے۔ ان ایرانی اثرات کے باقیات اب تک یہاں کی زبان، ادب، طور طریق، رسم و رواج، مذہب اور فنون میں جلوہ گر ہیں۔

ہندوستان اور ایران کے باہمی تعلقات کا سلسلہ چھٹی صدی سے شروع ہوا۔ اس وقت انوشیروان شاہ ایران نے ایرانی فاضلوں کو ہندوؤں کی کتاب پنچ تنتر (فلسفہ کے پانچ اصول) کو اپنی زبان میں نقل کرانے کے لئے ہندوستان بھیجا تھا۔ اس کے کچھ سو سال بعد ان دونوں ملکوں کے تعلقات اور زیادہ قریب کے ہونے لگے وہ اس طرح کہ محمود غزنوی نے پے در پے ہندوستان پر حملے شروع کر دیئے۔ محمود ہر اس چیز کو جس کا تعلق ایران سے تھا عزیز رکھتا تھا اور اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ محمود کے بعد محمد غوری آیا۔ یہ ایک اولوالعزم سپاہی تھا اور حدود سلطنت کی توسیع اس کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ ہندوستان نے محمود کی طرح اس کی توجہ کو بھی اپنی طرف کھینچا۔ یہ ملک بہ آسانی اس کی فتوحات کے ذیل میں آگیا جن کا سلسلہ بارھویں صدی کے ربع آخر میں شروع ہوا۔ اٹھارہ سال میں محمد غوری نے تمام شمالی ہندوستان پر اپنا پرچم لہرا دیا۔ اس کی حکومت نے ایرانی اثرات کو ہندوستانی معاشرت، ضابطہ اور آداب میں داخل کر دیا۔ فارسی سرکاری زبان بن گئی اور فارسی ادب کو اس ملک میں ایران کا محتاج رہے بغیر پورا نشو و نما ملنے لگا۔ یہ عہد ہندوستانی تمدن پر ایرانی تمدن کی اثر اندازی کا سب سے نمایاں زمانہ ہے۔

خاندانِ غور کے بعد کے مسلمان حملہ آور بھی ایران ہی کا تتبع کرتے رہے۔ عدالتی زبان فارسی رہی اور ادبیات ایران کے مطالعہ کا عام چلن ہو گیا۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے فارسی کا تعلق وہی ہو گیا جو آج انگریزی کا ہے۔

ہندوستان کی سرزمین سے ایسے بہت سے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے اظہار خیال کا ذریعہ فارسی کو بنایا مثلاً امیر خسرو، ابوالفضل وغیرہ۔ دہلی کے پٹھان سلاطین میں سے اکثر خود بڑے عالم اور فاضل تھے اور انھوں نے ادبی شوق کو بڑھانے کے لئے بہت سے مدرسے اور دارالعلوم قائم کئے اور طرح طرح سے علماء کی مدد کی۔

ہندوستانیوں اور ایرانیوں کے میل جول ہی سے اردو زبان کی تخلیق ہوئی۔ آج یہی زبان تمام ملک میں سب سے زیادہ رائج ہے۔ اردو کے معنی ہیں لشکری زبان۔ اس کے حروف بھی فارسی ہیں اور فارسی رسم الخط کی طرح یہ بھی داہنے سے بائیں کو لکھی جاتی ہے۔ انگریزی اثرات کا بھی اضافہ ہو چکا ہے چنانچہ ہندوستان کے تمام فوجی اسکولوں میں اردو زبان رومن رسم الخط میں لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ آج ہندوستانی سپاہیوں کو ایسے بیسیوں رسالے اور کتابیں مہیا کی جاتی ہیں جو رومن اردو میں لکھی ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے اخبارات اور رسالے اردو میں چھپتے ہیں لیکن ان کی اشاعت زیادہ تر شمالی ہندوستان اور ریاست حیدرآباد میں ہوتی ہے۔

اردو پر ایرانی اثرات کا اندازہ کرنے کے لئے اردو کے زیادہ وسیع مطالعہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اردو کے قریب قریب ہر شاعر کو فارسی ضرور پڑھنا پڑتی ہے۔ میر نے کوشش کی تھی کہ فارسی سے مدد نہ لیں لیکن اس کو اپنے بس کی بات نہ پایا۔

اردو کے چمنستان میں بہت سے ایسے پھل، پھول اور پرندے پائے جاتے ہیں جو صرف سرزمین ایران ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ ہندوستان میں ان کا پتہ بھی نہیں۔ تعمیرات میں ایرانی اثر سب سے زیادہ گنبدوں میں جلوہ گر ہے۔ شمالی ہندوستان میں سرو اور فواروں سے مزین جو باغات نظر آتے ہیں وہ بھی ایرانی یادگار ہیں۔

اگرچہ ہندوستانی رسوم پر ایرانی اثرات کافی گہرے ہیں لیکن ہندوستان کی ذات پات کی تفریق پر ایران کوئی اثر نہ ڈال سکا۔ ہندو بدستور چار ذاتوں میں منقسم چلے آتے ہیں، برہمن، کشتری، ویش اور اچھوت۔ ایرانی حسب نسب کے بڑے قائل تھے۔ اس لئے ذات پات کی تمیز اٹھ جانے کے بجائے ایرانی اثرات کے تحت یہ تفریق اور بھی پکی ہو گئی۔

ہندو ویدانت پر بھی ایرانی اثر صاف طور پر واضح ہے اور یہ اثر ہندومت اور اسلام دونوں پر مساوی طور پر پڑا۔ ایران کے مسلمان عارفین کا جو صوفی کہلائے ایک علیحدہ طبقہ بنا۔ یہ لوگ اس دنیا کے آدمی نہ تھے۔ انھوں نے ترک دنیا کر کے رضا اور تسلیم کی خو ڈالی اور ہر چہ از دوست می رسد نیکوست پر عمل کیا۔

شاہانِ مغل کے عہد حکومت میں طبیعیات کے مطالعہ کا چرچا تھا۔ یہ بھی ایرانی فضلا کی توجہ کا منت کش تھا۔ جو ایران سے علم نباتات کی نمائندگی کے واسطے ہندوستان آ گئے تھے۔ مغل شہنشاہوں کی علم پروری اور دولت نے بہت سے ایرانیوں کو یہاں کھینچ بلایا۔ انہی کی بدولت آج تک بہت سے ہندوستانی گھرانوں کی مادری زبان فارسی چلی آتی ہے اور لباس و طعام، ناموں اور طریقہ ماند و بود میں ایرانی اثرات اب تک جاری و ساری ہیں۔

پارسیوں کا فرقہ جو ہندوستان میں تجارت کے لئے مشہور ہے ایران ہی سے آیا ہوا ہے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی مذہبی کتب بھی لائے۔ آج یہ لوگ ایک علیحدہ فرقہ ہیں۔ اگرچہ مغربیت سے بہت کچھ متاثر ہو گئے ہیں لیکن اب تک اپنے قدیم مذہب کے پابند ہیں۔

معظم علی

الفاظ کی حکومت

دزماکی کے والد ہیں کولماربی فلیمنگ نے اپنے لڑکے سے کہا تھا:—

"بہت کم خیالات ایسے ہیں جو درست ہوں اور کوئی تحقیق سے نہیں کہہ سکتا کہ کون سے خیالات درست ہیں۔ لیکن ہم لوگوں پر الفاظ ہی کے ذریعے حکومت کر رہے ہیں"

آجکل دنیا میں الفاظ کی حکومت ہے اور ہمارے زمانہ کے اخبار الفاظ کی تراش خراش میں سب سے زیادہ ماہر اور موثر ہیں۔ اگلے زمانہ میں بادشاہ کے بعد فوج کا درجہ تھا۔ اس کے بعد قوم کا۔ اس زمانہ میں جرنلزم کو سلطنت کا چوتھا ستون سمجھا جاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمارے زمانہ کے اخبار اقتدار اعلیٰ کے مالک ہیں اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اب حکمران کے بعد اخباروں کا درجہ ہے کیونکہ قوم اور فوج دونوں اخبارات سے متاثر ہوتی ہیں اور اخبار نویس کو اپنا لیڈر تسلیم کرتی ہیں۔

لارڈ برائس نے صحیح کہا ہے کہ "پہلے تبادلہ خیال اور بحث و مباحثہ کا ذریعہ صرف وا دکتی جو سیت محدود تھی۔ اب اخبارات ہیں۔ سو برس کی ترقی کے بعد یہ ممکن ہو گیا ہے کہ خبریں بڑے پیمانے پر اپنا سکہ چلائیں اور یہی وجہ ہے کہ اخبارات کی آزادی کو جمہوریت کا اصول اعظم قرار دیا گیا"

ایک اچھی حکومت کے لئے محض اچھا ہونا ہی کافی نہیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ رائے عامہ بھی اس کو اچھا سمجھے۔ رائے عامہ اگتی ہوئی گھاس، برستی ہوئی بارش اور بہتے ہوئے دریا میں خود بخود پیدا نہیں ہوتی بلکہ اخباروں کی کثرت اور ان کی اشاعت کے ترقی یافتہ طریقوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ان طریقوں کو اجاگر کرنا جمہوریت کا کام ہے جمہوری حکومت کے نقطۂ نگاہ سے اخبارات کی آزادی میں کوئی قباحت نہیں۔ ایک حقیر سے حقیر جمہوریت بڑی سے بڑی ڈکٹیٹر شپ کے مقابلہ میں اخباروں کی زیادہ قدر کرتی ہے اور اخباروں کے وجود کو فوجوں کے وجود سے زیادہ ضروری خیال کرتی ہے۔

اب سے کچھ پہلے بعض بادشاہ اخباروں کو بڑی بڑی نظر سے دیکھتے تھے۔ اصل میں یہ ان کے سیاسی تدبر کا قصور تھا۔ وہ اخبار کی طاقت سے ڈرنا جانتے تھے، اس سے کام لینے کے فن سے بیگانہ تھے۔ روس کے آخری زار نے کہا تھا "قلم نہایت ہی خوبصورت ہے مگر میری سلطنت میں شیطان سے بھی بدتر ہے" اسی طرح اسپین کی ایک ملکہ نے حقارت کے بھرپور جذبہ کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "اخبار نویسوں کی حیثیت حشرات الارض۔ زمین کے کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں" سلطان عبدالحمید خاں کو بھی زندگی بھر یہ حسرت رہی کہ اگر میں شاہی محل میں واپس جا سکوں تو عثمانی قلمرو کے تمام اخبار نویسوں کو ایک تہہ خانہ میں بند کر دوں"

ڈکٹیٹر اور وہ بادشاہ جو جمہور کی مرضی عامہ کے دشمن ہیں نکتہ چینی سے گھبراتے ہیں مگر جمہوریت کہتی ہے نکتہ چیں ہمارے دشمن نہیں دوست ہیں۔ اگر حکومت رائے عامہ کی آزادی اور مخالفت کو برداشت نہیں کر سکتی تو اسے زندہ رہنے اور عوام پر حکم چلانے کا کوئی حق نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک فوج کا تمام ہتھیاروں سے لیس کرکے بنانا آسان ہے اور ایک قوم کا بنانا مشکل ہے اور اخباروں کو آزادی دیکر ان سے ٹھیک ٹھیک کام لینا اور بھی مشکل ہے، مگر جمہوریت کا کمال یہ ہے وہ اس مشکل کو اپنے لئے آسان کر لیتی ہے۔ البتہ ایک بات ضروری ہے اور وہ یہ کہ اخباروں کی آزادی قانون کے ماتحت ہو قانون سے بالاتر نہیں۔

"اگر ایک خلاف قانون کام کے لئے قانونی جواز پیدا ہو جائے تو نکتہ چینوں کو جواب دینا بہت آسان ہو جاتا ہے" یہ ہے آجکل کی ذہنیت۔ اس سے قطع نظر ہر حکومت کے لئے قانون کا ہونا اچھا ہے اور جب حکومت اپنے سر پر قانون کا سایہ رکھتی ہے تو وہ اخباروں کو اس سایہ سے محروم رکھنا پسند نہیں کر سکتی۔ اس سلسلہ میں ایک نظریہ تو وہ ہے جسے مشہور جرمن فلسفی لیتا لوزی نے پیش کیا ہے "حکومت کی اصل قوت ہے اور وہ کبھی اس اصل سے جدا نہیں ہو سکتی" یہ خیال جمہوریت کی بنیاد نہیں بن سکتا اگر اسے مان لیا جائے تو ایک طرف پارلیمنٹ کے دشمن بادشاہ برسر اقتدار آجائیں گے اور دوسری طرف ڈکٹیٹر۔ اور دونوں آزاد اخبار نویسی کا خاتمہ کر دینگے۔

دوسرا نظریہ وہ ہے جسے مصر کے مشہور جمہوری لیڈر سعد زاغلول پاشا نے اپنی سیاسی زندگی کا اصول بنایا تھا: "الحق فوق القوۃ والامۃ فوق الحکومت" "جمہور کا حق ہر قوت پر فائق ہے اور قوم ہر حیثیت سے حکومت پر فوقیت رکھتی ہے" یہ جملہ سعد پاشا کے اخبار "البلاغ" کی پیشانی پر پچیس سال سے لکھا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وفد پارٹی نے حکومت برطانیہ سے معاہدہ کرکے پہلی مرتبہ حکومت بنائی تو پارٹی کا اخبار البلاغ اپنی حکومت پر نکتہ چینی کرنے میں سب سے آگے تھا لیکن سعد پاشا کے قول کا یہ مطلب کبھی نہیں سمجھا گیا کہ حکومت اور قوم اور جمہوری اخبار قومی قانون کی پابندی کر آزاد ہیں۔ کیونکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو لبرل پارٹی کے اخبار السیاست سے قانون کی پابندی کا مطالبہ نہ کیا جاتا۔

درحقیقت جمہوریت یہ چاہتی ہے کہ اخبار جمہور کی رائے پیش کرنے میں آزاد ہیں۔ مگر یہ آزادی اس قانون کے احترام پر مبنی ہے جسے جمہور نے بنایا ہے۔ ہر اڈیٹر کا یہ حق ہے کہ وہ الفاظ سے اپنی کاغذی حکومت کا

حامد الانصاری

سکے جائے لیکن اسکا ایک فرض ہے اور ایک ذمہ داری ؟ ڈاکٹر سی پی اسکاٹ ایڈیٹر "مانچسٹر گارجین" جنہوں نے اخبار نویسی کی روایات قائم کرکے نام پیدا کیا تھا کہتے ہیں: "جمہور کی خدمت جمہوری دور کی اخبار نویسی کا نصب العین ہے تا جمہوری حکومت اس نصب العین کو اپنا سمجھتی ہے کیونکہ وہ اور جمہور دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

"پاونیر" کے فاضل ایڈیٹر مسٹر ینگ نے ۱۹۴۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک اہم جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا "بعض اخبار یہ فرض کر لیتے ہیں کہ حکومتوں کا کام ہی غلطی کرنا ہے اور بعض یہ طے کر لیتے ہیں کہ حکومتیں فرشتوں کی طرح معصوم ہیں یہ دونوں باتیں اصول سے دور ہیں۔ جمہوری ملکوں میں اول درجہ کے اخبار ان دونوں باتوں کے درمیان اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔

ہمارے ملک کی مشہور ادیبہ مسز سروجنی نائیڈو نے مارچ ۱۹۴۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ میں اخبار نویسوں کے بھرے مجمع میں کہا تھا: "ایک سلطنت کا وزیر اعظم جو اپنے ملک کی پالیسی بناتا ہے جتنی اہمیت رکھتا ہے میرے نزدیک اخبار نویس بھی اتنا ہی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس میں جس چیز کا ہونا ضروری ہے وہ ذمہ داری کا احساس ہے۔ اسکی تین ذمہ داریاں ہیں:-

(۱) امن کے زمانہ میں رہنمائی (۲) جنگ یا غیر جانبداری کے زمانہ میں راستہ صاف کرنا (۳) سوسائٹی کے تمام طبقوں اور حکومتوں کو امن و اتحاد کا پیغام دینا"

ہم نے ہندوستان میں امریکن اخبار نویسوں کے مشن کو اپریل میں خوش آمدید کہا تھا۔ اس مشن کے دو لیڈروں مسٹر فاریسٹ اسسٹنٹ ایڈیٹر نیویارک ہیرلڈ، ٹریبیون اور مسٹر رالف میک گل ایڈیٹر اٹلانٹا کانسٹی ٹیوشن نے یہ ظاہر کیا تھا کہ انگلستان، فرانس، روس، چین، ترکی، اٹلی، یونان اور مصر کی جمہوری حکومتوں نے انھیں یہ یقین دلا دیا ہے کہ جنگ کے بعد اخباروں کو پوری آزادی ہوگی۔ حکومتیں ان کو آلۂ کار نہیں بنائیں گی اور اخباروں کو یہ موقع ملے گا کہ وہ تمام دنیا کی آزادانہ خدمت کریں۔

انھوں نے آخر میں جو بات کہی وہ بہت اہم تھی: "ان کا یہ دعویٰ نہیں کہ امریکہ میں وہ سب کچھ حاصل ہے جو ہمیں مطلوب ہے۔ ایسی آزادی نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اخبار نویسوں میں ایسے بھی ہیں جنھیں اپنی جرأت کا احساس تو ہے مگر ذمہ داری کا احساس نہیں۔ حالانکہ آزادی کے ساتھ ذمہ داری بہت ضروری ہے۔"

درحقیقت یہ وہی رائے ہے جو اس سے پہلے مسز سروجنی نائیڈو نے پیش کی تھی۔ جمہوری حکومتوں کا کام یہ ہے کہ وہ اخباروں کی آزادی تسلیم کریں اور اخبارات کا کام یہ ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو محسوس کریں جس کا ہونا آزادی کے ساتھ ضروری ہے ✦

"رجعت" === نکہت نسیم

میں حسین کلیوں سے آغوش سجالوں تو کیا
اپنے غم خانہ میں اک شمع جلالوں تو کیا
مسکرالوں بھی تو کیا ساز بجالوں تو کیا
وقت کی تلخیٔ گفتار تو مٹنے سے رہی

خواب سے اپنے زلیخا بھی ہو بیدار تو پھر
ہو بھی جائے کوئی یوسف کا خریدار تو پھر
ایک عالم ہے حقیقت سے خبردار تو پھر
وقت کی تلخیٔ گفتار تو مٹنے سے رہی

یہ روش اور یہ حالات بدل بھی جائیں
یہ تصور یہ خیالات بدل بھی جائیں
یہ شعور اور یہ جذبات بدل بھی جائیں
وقت کی تلخیٔ گفتار تو مٹنے سے رہی

چوم لوں چاند کے شفاف کنارے بھی اگر
توڑ لوں اڑ کے یہ رنگین ستارے بھی اگر
موڑ دوں زیست کے بہتے ہوئے دھارے بھی اگر
وقت کی تلخیٔ گفتار تو مٹنے سے رہی

پی بھی لوں مست نگاہوں کے اشاروں پہ اگر
تلخیٔ زیست مٹا بھی دوں اٹھا کر ساغر
منظرِ غم کو بنالوں بھی جو فردوس نظر
وقت کی تلخیٔ گفتار تو مٹنے سے رہی

گھٹ کے رہ جائیگی اک دن یہ سسکتی آواز
منتشر ٹوٹ کے ہو جائیگا شیرازۂ راز
جلوۂ ناز سے بھر جائیگی آغوش نیاز
وقت کی تلخیٔ گفتار تو مٹنے سے رہی

ملایا اور سنگاپور

ایس سی بھٹا چاریہ

پھر الکاہل کی لڑائی ختم ہو جانے کے بعد سے جو مسائل برطانوی حکومت کو درپیش ہیں ان میں سے ایک جزیرہ نمائے ملایا اور اس کے ارد گرد کے ان علاقوں اور جزیروں کا مستقبل بھی ہے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ برطانیہ کے زیر حکومت رہے ہیں۔ اگرچہ حکومت برطانیہ کی توجہ پہلے ہی سے اور معاملات میں بٹی ہوئی ہے تاہم اس نے اس بارے میں ایک مستقل پالیسی بنانے میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۴۶ء کو نوآبادیات کے سکریٹری مسٹر جارج ہال نے پارلیمنٹ کے سامنے ایک قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) پیش کیا جس میں انھوں نے اپنی اس پالیسی کی وضاحت کی جس کا اعلان گزشتہ اکتوبر میں کیا تھا۔ پچھلے دنوں جو نئے تجربات ہوئے ہیں ان کی روشنی میں ایک ایسی پالیسی اختیار کی گئی ہے جو حالات کو آسان تر بنا دے۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھ لینا چاہئے کہ برطانوی پالیسی کا لب لباب یہ ہے کہ ملایا کو ذمہ دار حکومت کی طرف زیادہ سے زیادہ پھرتی کے ساتھ گامزن کر دیا جائے وہ اس طرح کہ خود وہاں کے باشندوں میں ایسی روح پیدا کر دی جائے کہ وہ اپنے مسائل میں دلچسپی لینے لگیں۔ اس نئی تحریک کے بنیادی اصولوں کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ملایا اور ملایا کی اقتصادیات کا مکمل طور پر جائزہ لے لیا جائے۔

گزشتہ سو سال سے ملایا برابر برطانیہ سے وابستہ چلا آرہا ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں آس پاس کے جزیروں اور ساحلی علاقوں پر برطانیہ نے رفتہ رفتہ ڈچوں کی جگہ لے لی۔ ان علاقوں کے حاکم ہندوستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں سے جوابدہ ہوتے تھے۔ ۱۸۲۴ء کی دوستانہ صلح پر ڈچوں نے ملکا چھوڑ دیا اور ملایا میں اپنے حقوق سے دست برداری دے دی اس کے بدلہ میں انگریزوں نے بنکولن اور سماترا میں اپنے تمام اختیارات اور حقوق سے دست برداری کر لی۔ اسٹریٹس سٹلمنٹ کے چاروں علاقوں میں سے ملکا آخری علاقہ تھا جو برطانوی قبضہ و اقتدار میں آگیا۔ پینانگ، صوبہ ویلزلی اور سنگاپور اس سے پہلے ہی انگریزوں کو مل چکے تھے۔ سنگاپور سر اسٹیمفورڈ ریفلز کی کوششوں سے ۱۸۱۹ء میں ایک صلح نامہ کی رو سے سلطان جوہور نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا تھا۔ تیرھویں صدی میں سنگاپور "شیروں کا شہر" کہلاتا تھا لیکن یہی علاقہ ریفلز کے ہاتھوں اتنی ترقی کر گیا کہ شروع ہی سے ایک آزاد بندرگاہ بن گیا۔

اسٹریٹس سٹلمنٹ کے علاقے سلطنت ہند ہی کے ایک جزو تھے اور ۱۸۵۸ء تک ان پر ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی حکومت تھی۔ ۱۸۵۸ء میں جب کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی تو بھی سلطنت ہند ہی میں شامل رہے اور نو سال تک ان پر "انڈیا آفس" سے حکومت ہوتی رہی۔ ۱۸۶۷ء میں اس جزیرہ نما کے ساحلی علاقے جن پر بنگال سے حکومت ہوتی تھی محکمہ نوآبادیات کے ماتحت آگئے اور شاہی نوآبادیات میں شامل ہو گئے۔

اس وقت جب کہ یہ علاقے برطانوی اثر کے اندر آئے یہاں چھوٹے موٹے کوئی ایک درجن حکومتیں قائم تھیں۔ کچھ عرصہ تک انگریزوں نے ان کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دیا لیکن صدی کے نصف تک ان کو پورے طور پر اندازہ ہو گیا کہ بڑھتی ہوئی دنیا میں یہ بادشاہ اپنی جگہ کو قائم رکھ سکنے کے قابل نہیں ہیں۔ ہر طرف بدنظمی، خانہ جنگی اور دوسرے جھگڑوں نے انگریزوں کو مجبور کر دیا کہ وہ ان معاملات میں دخل دیں۔ چنانچہ انہی کی بدولت اکثر جھگڑے چکتے اور کسی نہ کسی طرح تھوڑا بہت امن قائم ہو سکتا تھا۔ اسی بدنظمی کی وجہ سے چینی اور یورپی سوداگر بھی بدل ہو کر وہاں سے چلتے بنے۔ یہ تھے وہ حالات جن میں انگریزوں نے وہاں جدید وضع کی سلطنت قائم کرنے کی ذمہ داری کا بار اپنے ذمہ لیا۔ انھوں نے زبردستی دیسی حکومتوں کو نہیں مٹایا بلکہ رفتہ رفتہ انھوں نے جو کچھ بھی کیا وہ ایسا تھا جس میں خود ان حکمرانوں کا بھی مفاد تھا اور صورت حال کا تقاضا بھی تھا۔ جو کچھ کیا گیا بڑی سمجھ بوجھ اور سوچ بچار کے بعد کیا گیا۔ ۱۸۷۴ء اور ۱۸۸۸ء کے درمیان مختلف صلح ناموں کی رو سے بہت سی ریاستیں انگریزوں کے زیر عاطفت آگئیں اور ۱۸۹۵ء کے بعد ان کا نام "فیڈریٹیڈ ملایا اسٹیٹس" پڑ گیا۔ کوالالمپور ان کا صدر مقام طے ہوا۔ ان صلح ناموں کی رو سے وہاں کے سلاطین بدستور اپنی رعایا پر حکومت کرتے رہے لیکن مذہب اور رسم و رواج کے علاوہ ہر معاملہ میں ان کو برطانوی ریزیڈنٹوں کے مشورہ پر چلنا پڑتا تھا۔

۱۹۰۹ء میں سیام کے ساتھ ایک صلح نامہ ہوا جس کی رو سے شمال کی چار ریاستیں پرلس، کدہ، کیلنٹن اور ترنگانو برطانوی حمایت میں آگئیں اور اب تک خود مختاری کے عناصر کو ترقی دیتی رہی ہیں۔ جوہور کا تعلق سنگاپور کے ساتھ بہت قریب کا رہا ہے۔ اس نے بھی آخر ۱۹۱۴ء میں ایک برطانوی مشیر اپنے ہاں رکھنے پر رضامندی دیدی۔ چنانچہ پانچوں ریاستوں میں ایک ایک برطانوی مشیر رہتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیاسی نقطۂ نظر سے ملایا کا انتظام یوں ہے کہ (۱) "اسٹریٹس سٹلمنٹ" کی ایک شاہی نوآبادی ہے جس میں سنگاپور مع جزائر

کرسس، کوکس یا کیلنگ) ملکا اور (بورنیو کے بہت) لبوآن شامل ہیں اور نو ریاستوں پر مشتمل ہے۔ یہ نو ریاستیں یہ ہیں: پرلس، کدہ، کیلانتان، ترنگانو، پراک، سیلانگور، پہانگ، نیگری سیمبلان اور جوہور۔ یہ تو جزیرہ نما پر واقع ہیں اور برونی بورنیو میں ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک علیحدہ بادشاہ ہے۔ ان میں سے آخر الذکر چار پراک، سیلانگور، نیگری سیمبلان اور پہانگ فیڈریٹڈ ملایا اسٹیٹس کہلاتی ہیں۔ باقی ماندہ ریاستیں اَن فیڈریٹڈ اسٹیٹس کہلاتی ہیں۔

جاپانی حملہ سے قبل برطانوی ملایا میں ان تینوں علاقوں میں طرز حکومت اس طرح تھا۔

(۱) "اسٹریٹس اسٹیلمنٹ" میں براہ راست برطانوی حکومت تھی جیسا کہ نوآبادیات میں ہوتی ہے۔

(۲) "فیڈریٹڈ ملایا اسٹیٹس" میں حکومت کا کام زیادہ تر برطانوی حکام کرتے تھے حالانکہ دراصل منشا یہی تھا کہ وہاں اصلی حکومت خود ملایائیوں ہی کی ہو۔ ان ریاستوں میں برطانوی اقتدار کا دارومدار اس صلح نامہ پر تھا جس کی رو سے ہر ریاست کے حاکم کی حکومت برقرار رکھی گئی تھی لیکن ہر ایک کے لئے لازمی تھا کہ وہ مذہب، اور رسم و رواج کے علاوہ ہر معاملہ میں برطانوی مشیر کے مشورہ پر عمل کرے۔

(۳) "ان فیڈریٹڈ ملایا" میں ملایائی سلاطین کی حکومت تھی۔ برطانوی مشیر ان کا صرف مددگار ہوتا تھا۔

"اسٹریٹس اسٹیلمنٹ" کا گورنر ہی "ہائی کمشنر" بھی ہوتا تھا۔ وہ ان تینوں طرز کی حکومتوں میں ایک قسم کی یگانگت قائم کئے رہتا تھا۔ اس گورنر کو ایک ایگزکٹو کونسل اور ایک لیجسلیٹو کونسل مشورہ دیتی تھی۔ ان مجالس کے ممبروں میں نامزد شدہ، منتخب شدہ لوگ بھی ہوتے تھے اور سرکاری حکام بھی۔ لیکن دونوں مجلسوں میں سرکاری ممبروں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی طرز حکومت بالعموم معمولی نوآبادی کے طرز حکومت کا ایسا ہوتا تھا۔ یہاں کے قوانین پارلیمنٹ کے وضع کردہ، مجلس آئین ساز کے پاس کردہ اور بادشاہ کے اجرا کردہ ہوا کرتے تھے۔ شاہی فرمان کونسل کی اتفاق رائے سے جاری ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ گورنر کو آخری فیصلہ کن رائے (کاسٹنگ ووٹ) کا استحقاق حاصل تھا لیکن یہ رائے بہت شاذ و نادر ہی ڈالی جاتی ہوگی کیونکہ آپس کے میل ملاپ سے کام نکال لینے کی خواہش عام تھی اور عام طور پر کوئی اہم قانون وضع نہیں کیا جاتا تھا جب تک کہ مختلف فرقوں کے نمائندوں کا استصواب رائے نہ کر لیا جاتا تھا۔

ملایا کی ہر ریاست میں ایک قسم کی "شاہی مجلس" (اسٹیٹ کونسل) ضرور ہوتی تھی اور اس کا صدر عام طور پر سلطان خود ہوتا تھا اور اس کے ممبر سلطان کے نامزد کئے ہوئے ہوتے تھے مگر ہائی کمشنر کی اجازت اور رضامندی کی [illegible]

ملایا کے ایسے مختصر سے علاقے کو گیارہ مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت اور اس کا جواز کچھ بھی ہو، اس کا احساس ضرور کیا گیا ہے کہ لڑائی کے بعد سے جو نئی چیزیں کارفرمائی کر رہی ہیں ان کے پیش نظر نئے حل اور نئی تدابیر کی شدید ضرورت ہے۔ اس ذمہ داری، اعتماد، اصول بندی اور نئی روح کے احساس کے ماتحت جن کا اظہار "اعلان اقوام متحدہ" میں کیا گیا ہے یعنی یہ کہ نوآبادیوں میں حکومت خود اختیاری کو زیادہ سے زیادہ پروان چڑھایا جائے، حکومت برطانیہ نے قرطاس ابیض میں ایسی پالیسی اور منصوبہ بندی کا اعلان کیا ہے جس پر عمل درآمد کرنے سے ملایا اس قابل ہو جائے کہ ذمہ دار حکومت قائم کرے۔

ملایا کی آبادی اور اقتصادیات کے خاص مسائل کے سبب یہ کام مشکل ہو جاتا ہے جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ پچھلے ستر برس میں ملایا کی آبادی تین لاکھ سے بڑھ کر پچپن لاکھ ہو گئی ہے، خارجی نسلیں مقامی لوگوں سے بہت بڑھ گئی ہیں، ملایا کے چینی اب تعداد اور مالی حالت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لئے ان کے حقوق اور ترقی کے امکانات نسبتاً زیادہ ہیں اور یہ کہ اگرچہ ہندوستانی تعداد میں چینیوں سے کم ہیں پھر بھی ملک کی ترقی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ تو جن لوگوں کے سامنے ملایا کے اقتصادی اور سیاسی مستقبل کو خاص سانچوں میں ڈھالنا ہے۔ ان کا کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں سنگاپور اور ملایا کی نسلی اور قومی تقسیم کا سمجھنا بہت دلچسپ ہے۔ یہ اعداد ۱۹۴۱ء کے اندازہ کے مطابق ہیں۔ کل پچپن لاکھ آبادی میں سے ۲،۳۷۹،۲۱۱ یعنی ۴۳ فیصدی چینی ہیں، ۲،۲۷۸،۵۰۰ یا ۴۱ فیصدی ملایا والے ہیں۔ ساڑھے سات لاکھ یا ۱۴ فیصدی ہندوستانی ہیں۔ انیس ہزار یا ۰.۳۴ فی صدی یورپی ہیں۔ تیس ہزار یا ۰.۵۴ فیصدی یوریشین ہیں اور ایک فیصدی متفرق۔ لڑائی سے پہلے جاپانیوں کی تعداد آٹھ ہزار سے کم تھی۔ پچھلی دہ سالہ مردم شماری کے وقت سنگاپور کی آبادی چھ لاکھ سے زیادہ تھی جن میں چینی ستر فیصدی تھے۔

ملایا کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ماضی میں اس کی خوشحالی کا انحصار ربڑ اور ٹین کی عالمگیر مانگ پر رہا ہے۔ یہ چیزیں یہاں انگلستان اور چین کے سرمائے اور چین اور ہندوستان کے مزدوروں کی وجہ سے پیدا کی جا سکیں۔ اب ملایا کے نئے دستور العمل بنانے میں دوران جنگ اور بعد جنگ کے سیاسی اور اقتصادی تعلقات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔ پچھلی خوشحالی واپس لانے اور قائم رکھنے کے لئے ضروری حالات پر غور کرنا ہوگا تاکہ صحیح سمت میں کامیاب قدم اٹھایا جا سکے۔ اس پر نہ صرف ملایا کی مختلف النوع آبادی کی اقتصادی خوشحالی

کا بلکہ قرطاس ابیض میں شائع ہونے والی ان تجویزوں کی کامیابی کا انحصار
ہوگا جو دستور العمل سے متعلق ہیں۔ رہا قرطاس ابیض کا "بین الاقوامی
تعلقات اور سلطنت برطانیہ کے حفاظتی اور دوسرے مفاد کا تقاضہ ہے
کہ ملایا کو متحد اور ترقی یافتہ ملک کی حیثیت سے اپنی اقتصادی اور فوجی
اہمیت کے مطابق با اثر ہونا چاہیئے۔" ملایا اس قابل ہے اور اسے بہت
جلد اس کے قابل بنایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے" اس کی صلاحیت
میں اضافہ کیا جائے گا تاکہ وہ حکومت خود اختیاری حاصل کر سکے۔" جیسا کہ
برطانوی حکمت عملی سے ظاہر ہے اور منصوبہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس
منصوبہ کے مطابق منتشر علاقوں کو منسلک کرنا ہوگا تاکہ دو حکومتیں وجود میں
آ سکیں یعنی سنگاپور کی نو آبادی اور ملایائی یونین۔ ان میں سے ہر ایک میں
گورنر رہے گا اور قانون ساز کونسل اور مجلس عاملہ ہوگی۔ برطانوی علاقہ اور
ملایائی حکومت میں سے ہر ایک اپنے مقامی ادارے قائم رکھیں گے اور گورنر
جنرل (اس منصوبے کے مطابق ایک نیا عہدہ) سارے ملایا کی حکمت عملی میں
مطابقت پیدا کرے گا۔ ایک رضاکارانہ راضی نامہ کے مطابق ملایا کے
فرمانرواؤں نے ان اصلاحات کو قبول کر کے اپنے حق حکومت کو ملک معظم
کے حق میں ترک کرنا منظور کر لیا ہے (مذہبی اور سماجی رسوم کو چھوڑ کر) یہ بھی
ذکر ہے کہ "حکومت برطانیہ کے ذمہ ملایا کی قومیتوں کو منسلک کرنا اور ان کے
مشترکہ مفاد اور اداروں کو ترقی دینا بھی ہے۔" نئی حکمت عملی کے لئے یہ
بھی ضروری ہے کہ ملایا کی ریاستیں ملک معظم جارج ششم کے زیر اثر ہوں
تاکہ وہ ان سب کے لئے قانون بنا سکیں۔ نئے عہدنامہ کے مطابق انہیں
ہر ریاست میں اس قسم کے حقوق حاصل ہو گئے ہیں۔

پینانگ اور ملاکا کے برطانوی بندوبست اور ملایا کی ریاستوں کا
انتظام ان قوانین کے مطابق ہوگا جو آجکل پارلیمنٹ کے زیر غور ہیں۔

حکومت برطانیہ کا خیال ہے کہ کم از کم فی الحال سنگاپور کا انتظام
مختلف طریقہ پر ہونا چاہیئے۔ اس لئے سنگاپور، جزیرہ کرسمس اور جزائر کوکوس
کیلنگ، جو سماترا کے جنوب میں واقع ہیں، ملکر ایک نو آبادی بن جائے۔
سنگاپور تجارت کا بڑا مرکز ہے اس لئے اس کے اقتصادی اور سماجی
مفاد باقی ملایا سے مختلف ہیں مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اس کے ملایا
سے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ "اگر ضروری
سمجھا گیا تو یہ پھر بھی مل سکتے ہیں کیونکہ حکومت کا مقصد سنگاپور اور ملایا
کے ملنے میں رکاوٹ ڈالنا نہیں ہے۔" ایسی صورت میں "ایک بڑی یونین"
بن سکتی ہے۔ "بڑی یونین" کی ترکیب قابل توجہ ہے کیونکہ اس میں اوپر کے
دو مذکورہ علاقے ہی نہیں بلکہ لیبوان، بورنیو، سراوک اور برطانوی شمالی بورنیو
بھی شامل ہونگے جہاں پر کہ اس قسم کا انتظام ہے۔ ان میں سے ہر ایک ایک
گورنر یا حاکم عامل کے زیر فرمان ہوگا۔ قرطاس ابیض کے منصوبے کے مطابق
گورنر جنرل کا کام براہ راست انتظامی نہیں ہوگا بلکہ اسے صرف "صلاح اور
رہنمائی" کے حقوق حاصل ہونگے۔ یہ خبر کہ سراوک کے راجہ نے اپنے خاص
حکام اور با اثر لوگوں کی رضامندی سے قانون سازی کے اختیارات ملک معظم
کو سونپ دیئے ہیں، تاکہ بڑی یونین کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔ اس وقت
بہت اہم ہے۔

ان علاقوں کے عدالتی نظام کو بھی اسی اصول کے مطابق بنانا ہوگا۔
ملایائی یونین کی ایک عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) ہوگی اور ایک سنگاپور کی۔
ان دونوں میں ایک ایک چیف جسٹس ہوگا۔ ایک پریوی کونسل ہوگی جس میں
دونوں عدالتوں کی اپیل کی جا سکے گی۔ عام مفاد کی باتیں مثلاً اعلیٰ تعلیم، باہر
والوں کا ملک میں آکر آباد ہونا، سکہ، آمدنی کا ٹیکس، شہری اڑان، ٹکٹ اور
تار اور جہازرانی وغیرہ ملایائی یونین اور سنگاپور کی مشترکہ حکمت عملی پر مبنی
ہونگے لیکن ان تبدیلیوں کے وقت ہر ریاست کی ارضی حکمت عملی کے اصول کا
خیال رکھا جائے گا۔ خصوصاً ملایا کی "لینڈ ریزرویشن پالیسی" کو برقرار رکھا جائیگا۔

ایک اہم تجویز جس میں ملایا کے ہندوستانیوں کو خاص دلچسپی ہے، ملایا
کے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو وسیع شہری حقوق دینا ہے۔ برطانوی حکمت عملی
یہ ہے کہ "نسل و قوم کا خیال رکھے بغیر ہر اس شخص کو جو پیدائش یا کافی زمانہ
تک رہائش سے ثابت کر سکے کہ وہ یہاں کا باشندہ ہے "شہری" کے حقوق
حاصل ہوں اس لئے یہ تجویز ہے کہ "ملایائی یونین کی شہریت" کا آغاز ہو۔
شہری ہونے کے لئے پندرہ برس کی رہائش میں شہری بننے سے دس برس
پہلے ملایا میں رہنا ضروری ہوگا۔ ان پندرہ سالوں میں جاپانی قبضہ کا زمانہ
شمار نہیں ہوگا۔ پانچ برس کی رہائش کے بعد بھی شہریت کے حقوق حاصل
ہو سکیں گے۔ برطانوی رعایا کے لوگ یہاں کے شہری بننے پر اپنی قومیت سے
دست بردار نہیں ہونگے۔ سرکاری ملازمتیں (نئی اور وسعت پذیر ملایائی
یونین کی شہریت میں) صرف ملایا کے شہریوں کو حاصل ہو سکیں گی۔
شہری بننے والوں کو یونین سے وفاداری کا عہد کرنا ہوگا۔

دستور العمل کی اس نئی تجویز کا ملایائی ہندوستانیوں کو خاص طور پر
سواگت کرنا چاہیئے جنھیں ماضی میں بہت سی رکاوٹوں اور مشکلوں کی
شکایت تھی اور جو "برابر شہری اور سیاسی درجہ" اور حقوق کا مطالبہ
کر رہے تھے۔ اب شہریت کی وسعت اور دستور العمل کے بہتر ہونے کی وجہ
سے یہ ممکن ہو سکا ہے۔ امید ہے کہ یہ تجاویز ملایا کے ہندوستانیوں کو بہت
پسند آئیں گی اور وہ ملایائی یونین شہریت کے وسیع ہونے سے جو سہولتیں

حاصل ہوئی ہیں انہیں غنیمت سمجھکر بڑا فائدہ اٹھائیں گے۔

برطانیہ کی نئی حکمت عملی اور منصوبہ ملایا اور اسکی ملحقہ ریاستوں کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کرتا ہے اور مختلف قومیتوں اور نسلوں کو ان کے خاص مقاصد حاصل کرنے میں مدد دیتاہے تاکہ وہ ریاستوں کا ایک عمدہ مجموعہ بن جائیں۔ برطانوی حکمت عملی کا عام مقصد یہ رہا ہے کہ نو آبادیات جتنی جلد ممکن ہوسکے حکومت خود اختیاری حاصل کرلیں۔ دونوں عالمگیر جنگوں نے خصوصاً دوسری دنیا کی ساری قوموں کے حالات میں زبردست تبدیلیاں پیدا کردی ہیں اور نئی قومیتیں اور نئے نظریے پیدا کئے ہیں۔ اقوام متحدہ کا جو چارٹر سان فرانسسکو میں بنا تھا اسی نئے نقطۂ نظر اور اسپرٹ کو ظاہر کرتاہے۔ برطانیہ کی ملایا کو ترقی دینے کی خواہش اور ادارہ اقوام متحدہ کے اسی پہلو کو عملی صورت دینے کی کوشش کی ہے اس سے ملایا خود اختیاری حکومت حاصل کرنے کی راہ میں استقلال کے ساتھ گامزن ہوسکیگا۔ اس تحریک کو کامیاب بنانیکی ایک ضروری شرط اہل ملایا چینیوں، ہندوستانیوں اور یوریپیوں کا تعاون ہے یہی لوگ اس فیڈرل یونین کے زیادہ اہم باشندے ہیں۔ اس منصوبہ کی کامیابی سے ملایا میں عہد خوشحالی اور اقتصادی ترقی کی تجدید ہی نہیں ہوگی بلکہ وہ اپنی جغرافیائی اہمیت کی وجہسے جنوب مشرقی ایشیا کی سیاسی اقتصادیات میں ایک خاص جگہ حاصل کریگا۔

مشاہدات

سفینہ آرزو کا بحرِ غم میں ڈوبتے دیکھا — جو برسوں میں بنا تھا اسکو دم میں ڈوبتے دیکھا

وہ مضطر ہوں کہ اسکے حال پر غمخوار یہ بولا — جسے گرداب پیمانۂ الم میں ڈوبتے دیکھا

کنارے سے کبھی کو کلزم ہستی کے دیکھا ہے! — کسی کو ورطۂ بحرِ عدم میں ڈوبتے دیکھا

جو تھو غواص ہر دریا کی تہ سے کھیلنے والے — خدا شاہد انہی کو لجۂ یم میں ڈوبتے دیکھا

ہمیں بھی اک صنم اور اسکے کوچے کا خیال آیا — جو زاہد کو غمِ حور و ارم میں ڈوبتے دیکھا

کسی کی یاد جب ملی آگئی دو و اشک بہہ نکلو — خوشی کو میں نے اکثر بحرِ غم میں ڈوبتے دیکھا

حیا سے پانی پانی ہوگیا میدانِ محشر میں — جب اپنا ہر گنہ بحرِ کرم میں ڈوبتے دیکھا

میرے دامن پہ گر کر جانتے کیا اعجاز دکھلاتا — وہ آنسو آہ جسکو چشمِ نم میں ڈوبتے دیکھا

تعجب ہے وہ سائل آج مصروفِ وضو کیوں ہے
جسے سَو بار ہم نے جامِ جم میں ڈوبتے دیکھا

سائل انبہٹوی

اور اس نے
لائف بوائے کی
عادت سیکھی ہے!
وہ اس وقت بہت کچھ سیکھ رہا ہے لیکن زندگی میں لائف بوائے صابن کے روزانہ استعمال کی عادت سے زیادہ کوئی چیز کام نہیں آئے گی۔ اس کی ماں خوش قسمت ہے، اور اسے فخر ہے کہ اس نے گرد و غبار کے اس خطرہ کے متعلق سبق دیا ہے جو ہر گھڑی تمام آدمیوں پر حملہ کرنے کیلئے تیار ہے
لائف بوائے ایک اچھا صابن ہی نہیں بلکہ
ایک اچھی عادت ہے
LIFEBUOY

نقد و نظر

جناب کوثر چاندپوری اچھے حکیم اور ڈاکٹر ہونے کے علاوہ ایک مشہور اور مستند ادیب بھی ہیں۔ گذشتہ بیس بائیس سال کے دوران میں وہ طبابت کے ساتھ ساتھ خدمت ادب بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ انھوں نے طبی تالیفات و تراجم کے علاوہ بے شمار ادبی، تاریخی، علمی اور مزاحیہ مضامین اور لاتعداد افسانے قلمبند کئے ہیں۔ نہایت آسان زبان میں دس بارہ کتابیں بچوں کے لئے بھی لکھی ہیں۔ چنانچہ اسقدر مختلف النوع اور کثیر التصانیف ہونے کے اعتبار سے ان کے ہم پلہ شاید ہی کوئی دوسری ہستی ہمارے ملک میں موجود ہو۔ حال ہی میں ان کی چار کتابیں مطبع انوار احمدی سے شائع ہوئی ہیں جو اس وقت پیش نظر ہیں۔

لیل و نہار

یورپ کی زبانوں میں پرانے قصوں کو نئے انداز میں لکھنے کا دستور عام ہے۔ وہاں ایسی کوششیں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ چونکہ ہمارا ادب ابھی ابتدائی دور سے گذر رہا ہے اس لئے پرانے اور نئے کا سوال پیدا ہونے نہیں پاتا۔ تاہم کوثر صاحب کی جدت پسندی لائق تحسین ہے کہ انھوں نے اس ضمن میں پہل کی اور "طرح نو" کا سہرا اپنے سر بندھوا لیا۔ انھوں نے مرزا رجب علی بیگ سرور کی غیر فانی تصنیف "فسانۂ عجائب" کو جدید افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے اور اس کا نام "لیل و نہار" رکھا ہے جو غیر مناسب نہیں ہے۔ اصل کتاب اردو ادب عالیہ میں شامل ہے اور محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس لئے اس کی بابت کچھ کہنا فضول ہے۔ کوثر صاحب نے اسے اس قدر سلاست و سادگی کے ساتھ نئے سانچے میں ڈھالا ہے کہ کتاب بالکل عام فہم اور اس لئے زیادہ قابل قبول ہو گئی ہے۔

داستانیں

مذکورہ بالا کتاب کی طرح پرانے قصوں کو نئے انداز میں پیش کرنے کے دستور کے مطابق یہ کتاب بھی مرتب کی گئی ہے۔ یہ میر امن دہلوی کے مشہور قصہ چہار درویش کا نیا خاکہ ہے۔ اس کا نام "باغ بہار" ہی رکھا جاتا جو قصۂ چہار درویش کا اصل نام ہے تو زیادہ مناسب رہتا۔ "لیل و نہار" کی طرح یہ کتاب بھی سیدھی سادی اور عام فہم زبان میں ہے۔ کہیں کہیں معمولی قسم کے اضافوں کو روا رکھا ہے جو اپنی جگہ بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اصل کتابوں کے ساتھ ہمارے ادب میں زندہ رہیں گی۔ آئندہ سرور اور میر امن کے ساتھ کوثر صاحب کو بھی یاد کیا جایا کرے گا۔ کتاب کے شروع میں ایک طویل تحقیقی دیباچہ بھی شامل ہے۔

گل و لالہ

یہ موصوف کے تیرہ طبع زاد افسانوں کا مجموعہ ہے جو زیادہ تر حزنیہ ہیں۔ خصوصاً "چھوٹا سے سب سے سنار" سب سے زیادہ دلگداز اور موثر ہے۔ بعض افسانوں کے پلاٹ فنی اعتبار سے قابل غور ہو سکتے ہیں مگر انداز بیان کی شگفتگی ان پر حاوی ہو کر اپنا نقش جما لیتی ہے۔ محبت کے لطیف جذبات ہر افسانے میں کارفرما ہیں لیکن ان کو محض داستان حسن و عشق نہیں کہا جا سکتا۔ اصلاحی مقصد پورے خلوص کے ساتھ ان سب میں موجود ہے جس کے باعث یہ افسانے صرف دلچسپ ہی نہیں کارآمد اور مفید بھی کہے جا سکتے ہیں۔

خندۂ دل

اسے بھی کوثر صاحب کے افسانوں کا مجموعہ کہا گیا ہے لیکن درحقیقت ان کی نوعیت نیم مزاحیہ خاکوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ موضوع کے لحاظ سے گرد و پیش کی باتیں بیان کی گئی ہیں جن میں اکثر جگہ آپ بیتی کا رنگ اپنی جھلک دکھاتا محسوس ہوتا ہے۔ مطالعہ سے فوراً اندازہ ہو سکتا ہے کہ لکھنے والا حکیم یا ڈاکٹر ہے۔ ورنہ حکمت یا طبابت سے کسی قدر شغف ضرور رکھتا ہے۔ انداز بیان میں مزاح لطیف کے ساتھ طنز بھی موجود ہے۔ ان دونوں مجموعوں کی کتابت میں کنجوسی سے کام لیا گیا ہے۔ اگر ہر افسانے یا مضمون کو نئے صفحے سے شروع کرایا جاتا تو اچھا ہوتا۔

یہ چاروں کتابیں $\frac{20\times30}{16}$ کی تقطیع پر چھپی ہیں۔ اور علی الترتیب ان کی ضخامت ۱۰۰، ۲۲۲، ۲۳۷ اور ۲۰۴ صفحات اور قیمت ایک روپیہ، تین روپے، ڈھائی روپے اور دو روپے ہے۔ "لیل و نہار" کے علاوہ باقی سب مجلد اور رنگین گرد پوش سے مزین ہیں۔ ان کے ملنے کا پتہ: مطبع انوار احمدی۔ الہ آباد۔

اس میں نور تھا

مصنف:۔ بریگیڈیر ایف ایل برین۔ سی ایس آئی، سی آئی ای، ایم سی۔ مترجم:۔ کپتان نورجہاں مسیحی۔ ناشر:۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی۔ $\frac{20\times30}{16}$ کے ۱۴۰ صفحات۔ بلا جلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ یہ بریگیڈیر صاحب کی انگریزی کتاب "ان ہم واز لائٹ" کا عام فہم اردو ترجمہ ہے جس میں خود مصنف "بزرگ مسافر" کی حیثیت سے موجود ہیں۔ تمام کتاب دلچسپ مکالموں کی صورت میں ۱۹ ابواب پر منقسم ہے تقریباً ہر باب کو انجیل کی ایک دو سورتوں کی تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ کتاب مقدس کی روشنی میں دیہات سدھار کے مختلف موضوعات پر بحث کی گئی ہے جن میں زراعتی اور صنعتی ترقیوں، حفظان صحت کے اصولوں، قرضے سے بچنے کی تدبیروں اور پرسکون گھریلو زندگی بسر کرنے کی عام ممکن صورتوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسے پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف برین صاحب نے دیہاتیوں کی روزمرہ کی زندگی کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور دوسری طرف وہ اپنے مذہب کی اصل روح سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ یہ کتاب دراصل دیہاتی مسیحیوں کے لئے لکھی گئی ہے لیکن اس کا مطالعہ عام نصرانیوں کے لئے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ حسب ضرورت تصویری خاکے شامل اوراق کر کے کتاب کو زیادہ دیدہ زیب بنا دیا گیا ہے۔

ف ح

تجارتی مرغی خانہ باتصویر

مصنف:۔ خواجہ عبدالسلام فروغی۔ ناشر:۔ کتب خانہ دارالبلاغ محمد نگر۔

نیلا روڈ۔ لاہور۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۴۴ صفحات۔ جلد معمولی قیمت تین روپے۔
"کامیاب مرغی خانہ" کی طرح یہ کتاب بھی "دارالبلاغ" کی خاص مطبوعات میں سے ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مرغیوں کی پرورش کے تجارتی پہلو پر اس کتاب میں مفید مشورے دئے گئے ہیں۔ نسلی اعتبار سے مرغیوں کی بہت سی قسموں پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد بتایا ہے کہ تجارت کے لئے ان کا رکھاؤ کس طرح کیا جائے تاکہ خود ان کی تعداد تیزی کے ساتھ بڑھے اور اچھی قسم کے زیادہ سے زیادہ انڈے دیکر وہ اپنے مالک کے لئے نفع بخش ثابت ہوں۔ مرغی خانے سے لے کر کھاد ملی ہوئی اس مٹی تک جس میں لوٹ کر مرغیاں اپنی صحت و تندرستی قائم رکھ سکتی ہیں، ہر پہلو پر عمیق نظر ڈالی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ان حضرات کے لئے یکساں طور پر مفید رہ سکتا ہے جو ذاتی یا تجارتی مقصد کے لئے مرغیاں پالنی چاہتے ہوں۔

"افکار" بھوپال

ایک نیا ادبی ماہنامہ ہے جس کا اجراء گزشتہ ماہ ریاست بھوپال سے ہوا ہے۔ عملۂ ادارت میں کوثر صاحب چاندپوری کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ پہلے ہی شمارے میں بلند پایہ قلمی معاونین شریک ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب میں کافی سرگرمی سے کام لیا گیا ہے۔ یہی صورت رہی تو بہت جلد اسے اردو کے معیاری رسائل کی صف میں رکھا جا سکیگا۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ یہ پرچہ سفید چکنے کاغذ پر شائع ہوا ہے جو آجکل دنیائے صحافت میں بالکل عنقا ہے۔ چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے۔ ششماہی تین روپے سنگل پرچہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ "افکار" بھوپال۔

معاشیات

ایک نیا ماہنامہ ہے جو طفیل احمد خاں صاحب ایم اے کی ادارت میں دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) دریا گنج دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس رسالے میں ملکی اور غیر ملکی معاشی مسائل اور اقتصادی حالات حاضرہ پر عالمانہ انداز میں بحث ہوا کرے گی۔ جنوری اور فروری کے پرچے پیش نظر ہیں جن میں ماہرین معاشیات کے بلند پایہ مقالے شامل ہیں۔ اس رسالے کی علمی اور ادبی شان انجمن مذکور کے دو مشہور رسائل "اردو" اور "سائنس" کی طرح معیاری ہے۔ کیونکہ اس کے نگراں ڈاکٹر مولوی عبد الحق ہیں جن کی ادب نوازی اور علم پروری ہماری زبان میں مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ چندہ سالانہ پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ اوپر درج ہے۔

خاص نمبر "عالمگیر"

عالمگیر بابت ماہ جنوری و فروری ۱۹۴۶ء کو مشترکہ طور پر خاص نمبر کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ کاغذ کے اس قحط زدہ زمانے میں یہ مشترکہ اشاعت بھی قابل تحسین ہے۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ سرزمین پنجاب کا یہ واحد علمی ادبی معیاری رسالہ اپنے علیحدہ شائع ہونے والے سالناموں اور خاص نمبروں کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس خاص نمبر میں دس علمی مقالوں اور چودہ افسانوں کے علاوہ بیالیس غزلیں اور نظمیں شریک اشاعت ہیں۔ عالمگیر کے علمی ادبی معیار کو قائم رکھنے میں اس کے مدیر جناب شبلی بی کام کو خاص اہمیت حاصل ہے جو اپنے وسیع تعلقات کی بنا پر اپنی برادری کے اچھے لکھنے والوں کو ہمیشہ جمع کر لیتے ہیں۔ سالانہ چندہ سوا چھ روپے۔ قیمت خاص نمبر دو روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ عالمگیر۔ لاہور۔

سالنامہ "قوم"

جناب انوار الحق حقی کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ علمی ادبی رسالہ دہلی کی تجارت پیشہ قوم پنجابیان کا واحد نمائندہ ہے اور ہر ماہ بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ زیر نظر پرچہ سالنامہ ہے جس میں اردو کے نئے اور پرانے لکھنے والے موجود ہیں۔ جو بیس افسانوں اور دس علمی ادبی مقالوں کے علاوہ بے شمار نظمیں اور غزلیں شریک اشاعت ہیں۔ جن میں جگر مرادآبادی، نوح ناروی، سیماب اکبرآبادی اور بیخود دہلوی کے اسمائے گرامی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ حسب دستور ایک حصہ "نونہال کلب" کے عنوان سے بچوں کے لئے مخصوص ہے۔ قلمی معاونین کی [illegible] تصویروں کے علاوہ قائد اعظم مسٹر جناح کے دو نئے فوٹو زینت اوراق ہیں۔ چندہ سالانہ تین روپے۔ قیمت سالنامہ ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ "قوم" دہلی۔

خاص نمبر آئینہ

عروس البلاد بمبئی سے یہ ہفتہ وار فلمی رسالہ کئی سال سے شائع ہو رہا ہے۔ زیر نظر اشاعت خاص نمبر ہے جس کا علمی ادبی معیار قابل ذکر ہے۔ فلمی ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویروں کے علاوہ جناب عادل رشید کے تین کمسن بچوں کے فوٹوں زینت اوراق ہیں جن کی وجہ اشاعت شاید فلمی صحافت کے بہت سے رازوں کی طرح ایک راز ہے۔ اس خاص نمبر کی قیمت آٹھ آنے ہے۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ "آئینہ" محمد علی بلڈنگ بمبئی۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

مضمون	مصنف
۱۔ صبح جمال (نظم)	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری
۲۔ اصغر گونڈوی (مع تصویر)	جناب عبد الشکور
۳۔ رموز (مثلث)	جناب مخمور اکبرآبادی
۴۔ پنجاب میں پنچایتوں کا رواج	جناب بلدیو راج
۵۔ غزل کا مستقبل میری نظر میں	جناب عطاء اللہ پالوی
۶۔ ڈاکٹر سر جارج گریرسن (مع تصویر)	جناب آغا محمد اشرف دہلوی
۷۔ اپنا گاؤں (مصری افسانہ)	جناب صلاح الدین قریشی
۸۔ ترکی میں تعلیم کا ارتقا	مسٹر اے آر میکسویل ہسلپ
۹۔ نشیب و فراز (افسانہ)	نواب زادی نسیم سلیم چھتاری
۱۰۔ زمین کی موت	پروفیسر محمد رشید فریدی
۱۱۔ فرض اور عشق (افسانہ)	جناب مظفر حسین ظہر دہلوی
۱۲۔ مسئلۂ خوراک	جناب بالکرشن [illegible]
۱۳۔ [illegible]	جناب [illegible] لدھیانوی

ہندوستان کے پردۂ سیمیں کا ایک درخشندہ ستارہ

بنارس کا ایک نیپالی مندر [illegible] لکڑی کا کام خاص طور پر قابل دید
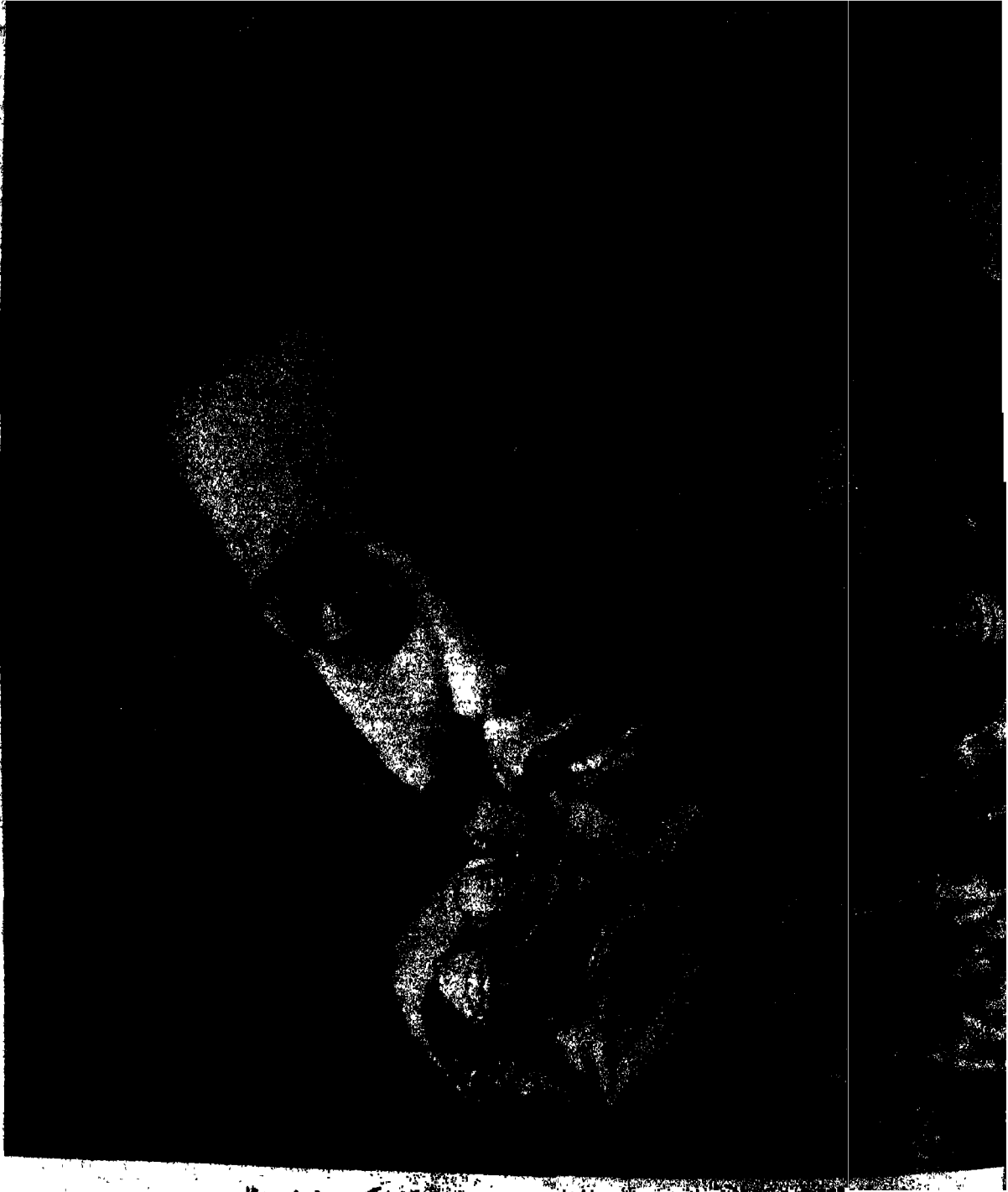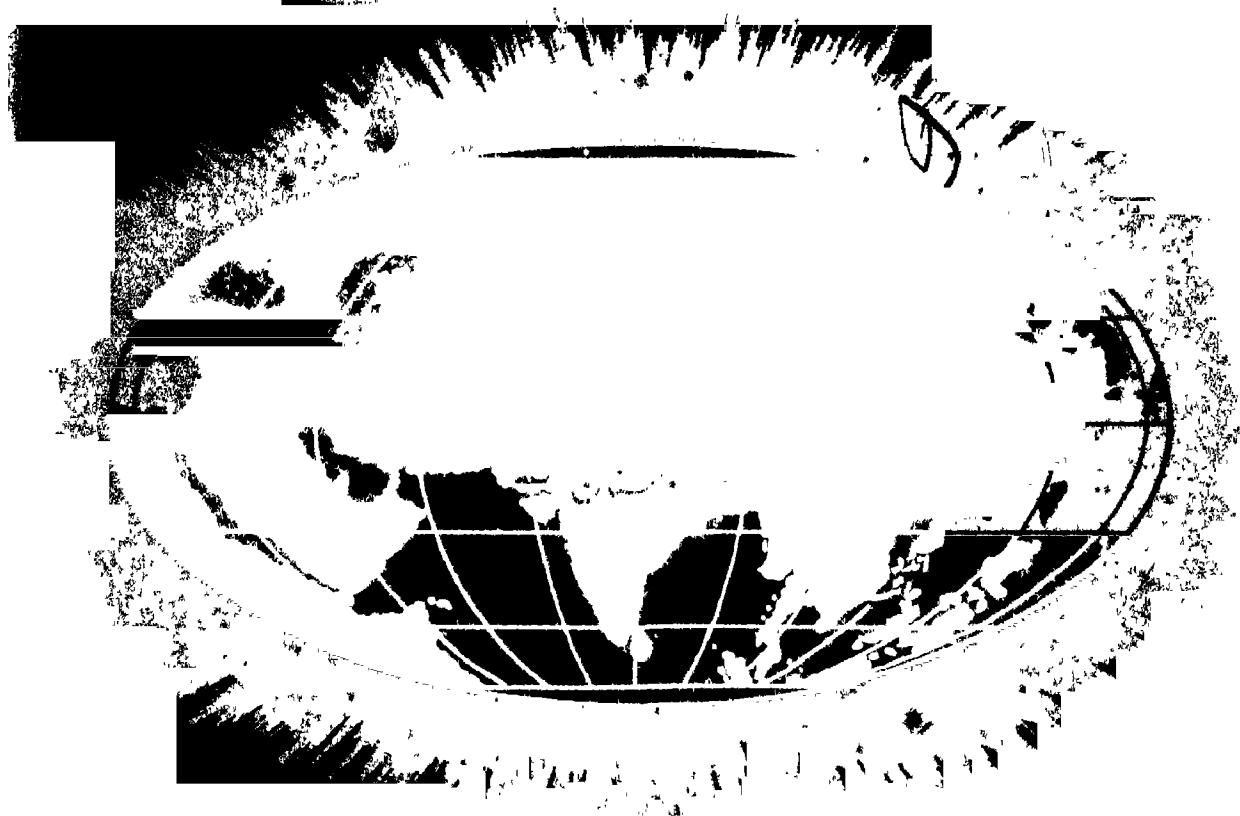
سلطان زنجبار

سلطان زنجبار سید خلیفه بن حرب بن نوینی مسقط و عمان کے شاہی خاندان سے ہیں ۔ آپ ایک ہردلعزیز حکمراں ہیں ۔ ۱۹۱۱ ع میں تخت نشین ہوئے اور اب آپکی عمر چھیاسٹھ سال کی ہے ۔ حکومت کے معاملات میں آپ اپنے صاحبزادہ سید عبداللہ سے بھی مدد لیتے ہیں جو ایک روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہیں اور انگریزی بھی جانتے ہیں ۔ زنجبار میں لونگوں کی پیداوار بڑی کثرت سے ہوتی ہے ۔ حکومت کو لونگوں سے پانچ لاکھ پونڈ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے ۔

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۴ - نمبر ۲۲ | فہرست | ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	رفتارِ زمانہ	ادارہ	۲
۲	صبح جمال (نظم)	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری	۵
۳	اصغر گونڈوی (مع تصویر)	جناب محمد عبد الشکور ایم اے	۶
۴	رموز (مثلث)	جناب مخمور اکبرآبادی	۸
۵	پنجاب میں پنچایتوں کا رواج	جناب بلدیو راج	۹
۶	غزل؛ مستقبل میری نظر میں	جناب عطاء اللہ پالوی	۱۱
۷	صورتیں	محترمہ زیب عثمانیہ لودیانوی	۱۴
۸	آخری وصیت	جناب علی احمد	۱۴
۹	ڈاکٹر سر جارج گریرسن (مع تصویر)	جناب آغا محمد اشرف دہلوی	۱۵
۱۰	اپنا گاؤں (مصری افسانہ)	جناب صلاح الدین قریشی دہلوی	۲۱
۱۱	دو نظمیں	جناب قاضی سلیم (علیگ)	۲۳
۱۲	کیفیاتِ شباب	جناب خیاب بدایونی	۲۶
۱۳	من ملا	جناب سوامی مارہروی	۲۶
۱۴	انجام	جناب پرویز لدھیانوی	۲۶
۱۵	ترکی میں تعلیم کا ارتقاء	میسرز کے آر اور اے آر میکویل ہیلیب	۲۵
۱۶	نشیب و فراز (افسانہ) (۲)	نواب زادی تسنیم سلیم چھتاری	۳۹
۱۷	زمین کی موت	پروفیسر محمد رشید فریدی	۴۶
۱۸	حیرت بداماں	جناب اختر انصاری اکبرآبادی	۴۷
۱۹	قطعات	جناب حکیم راغب	۴۹
۲۰	آہٹ	جناب ضمیر مخلص	۴۹
۲۱	فرض اور عشق (افسانہ)	جناب مظفر حسین اطہر دہلوی	۵۰
۲۲	نقد و نظر	"ف - ح"	۵۵
۲۳	غزل	جناب علی اشرف	۵۶
۲۴	مسئلہ خوراک	جناب ٹی ڈی راگھون	۵۸
۲۵	جاگتے ہیں	پروفیسر آغا اشہر لکھنوی	۵۹
۲۶	ساجن سے (گیت)	جناب ابراہیم خاطر	۵۹

مدیر اعلیٰ — نائب مدیران

آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے (علیگ) ایل ایل بی

راجیندر ناتھ شیدا
ایم اے

فضل حق قریشی
دہلوی

مشیر احمد
ایم اے

ادارہ مطبوعات سلسلہ ۳ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

غلے میں اضافہ کرنے کی تدابیر

لندن کے مشہور اخبار "مانچسٹر گارڈین" نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے خود مختار ہونے سے پہلے اگر کوئی ایسی تجویز پیش کی جائے جس کے طفیل ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے قحط کا خاتمہ ہو سکے تو اس سے بڑھکر انگریزی راج کی یادگار اور کیا ہوگی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بین الاقوامی معاملات کے شاہی ادارے نے "ہندوستان کے لئے خوراک کا ایک منصوبہ" تیار کیا ہے۔ اس کے مطابق غلے میں اضافہ کرنے کی تدابیر میں کھاد کا استعمال، آبپاشی کی تجاویز اور بہتر قسم کے بیج شامل ہیں۔ اس تجویز کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کے دیہاتوں میں کیمیاوی کھاد اور زراعت کے ترقی یافتہ طریقوں کو رواج دیا جائے۔ نیز یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ تمام دیہاتوں کو بیس یا تیس ہزار گروہوں میں بانٹ دیا جائے، ہر گروہ کے ماتحت تقریباً پانچہزار کی آبادی والا علاقہ ہو اور ہر گروہ کے لئے کھاد کا اپنا ذخیرہ اور تجرباتی مرکز ہو۔ اُمید ہے کہ عملی طور پر یہ تجویز ساتویں سال میں پوری طرح کام شروع کر دے گی اور اسوقت کثیر مقدار میں غلہ حاصل ہونے لگیگا۔ یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان کی آبادی میں اس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ آٹھ سال کے عرصہ میں پانچ کروڑ نفوس اور بڑھ جائینگے اس لئے جب تک ایک کروڑ چالیس لاکھ ٹن فی سال کے حساب موجودہ ساٹھ کروڑ ٹن سے زیادہ اناج پیدا نہ ہو، اس مزید آبادی کا پیٹ بھرنا مشکل ہو جائیگا۔

روسی فوجیں ایران میں

سیاسی نظام عالم ابھی مرض عافیت کی فضا میں پوری طرح سانس لینے بھی نہیں پایا تھا کہ تیسری جنگ عظیم کے اندیشے لاحق ہونے لگے اور یہ فکر دامنگیر ہو گئی کہ کہیں وہ صلح و آشتی جسے بڑی انتھک کوششوں کے بعد اتحادیوں نے حاصل کیا تھا کروٹ بدل کر پھر جنگ و پیکار کی صورت اختیار نہ کرے۔ آذربائیجان کا قضیہ ہی سوہان روح بنا ہوا تھا کہ اچانک یہ خبر سننے میں آئی کہ روسی آہن بستہ گاڑیاں، ٹینک اور فوجی دستے بڑی تیزی کے ساتھ طہران کی جانب بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی نقل و حرکت سے اندازہ ہوا کہ ان کی یلغار ترکی و ایران کے مابین قائم ہونے والی سرحد کی طرف ہے۔ بقول رائٹر سیاسی حلقوں میں ان اقدامات کے تین مطلب لئے جا رہے ہیں (۱) ہو سکتا ہے کہ سرزمین ایران پر زبردستی سویٹ حکومت کا پرچم لہرانا مقصود ہو (۲) ہو سکتا ہے کہ روس اپنی قوت کا ضرورت سے زیادہ رعب ترکی پر ڈال کر تو سیع حدود سے متعلق وہ مراعات حاصل کرنا چاہتا ہو جنکا مطالبہ پہلے ہی پیش کیا جا چکا ہے۔ (۳) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تیل کے ان میدانوں کو جو موصل میں واقع ہیں، ہڑپ کرنے کے منصوبے گانٹھ رہا ہو۔ اس موقعہ پر چند پچھلے واقعات پر نظر ڈالنی ضروری ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پیشتر ایران کے وزیر اعظم قوام السلطنت چند سیاسی معاملات پر گفتگو کرنے کے لئے روس تشریف لے گئے تھے۔ اسوقت دو امور خاص طور پر زیر بحث تھے۔ (۱) سرزمین ایران سے روسی فوجوں کی مراجعت (۲) آذربائیجان کا مرحلہ۔ ان کا بیان ہے کہ ایران خالی کرنے کے پرزور مطالبے کو منظور کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر روس کا صحیح منشا معلوم کرنا آسان ہے۔ ہر چند امریکہ کے استفسار پر سویٹ حکومت نے طہران کی جانب روسی فوجوں کے بڑھنے کی خبر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تاہم اگر یہ محض سیاسی حکمت عملی کے ماتحت کیا گیا ہے اور افواہیں بر بنائے اصلیت ہیں تو اقدامات کے ساتھ ساتھ اس غلط بیانی کو بھی قابل افسوس سمجھا جائے گا۔

بچوں کیلئے دودھ کا سفوف

بنگال کے قحط نے ارباب حل و عقد کے سامنے غور و خوض کی بہت سی راہیں کھولیں اور اسی سلسلے میں یہ سبق بھی سکھایا کہ بچوں کی حفاظت کے لئے دودھ کا بہت سا سفوف بنا کر پہلے سے رکھ لیا جائے۔ چنانچہ کمیٹی خوراک کے موجودہ مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت نے دودھ کا دس ہزار ٹن سفوف فراہم کرنے کا انتظام کر لیا ہے۔ اس مقدار کا بیشتر حصہ نیوزی لینڈ آسٹریلیا اور امریکہ سے پہنچیگا کیونکہ وہاں ایسے سفوف کی تیاری بہت بڑے [illegible] معلوم ہوتی ہے لیکن اگر

اس حقیقت کو ملحوظ رکھا جائے کہ سفوف پانی میں گھل کر سولہ گنا ہو جاتا ہے۔ تب اسے استعمال کرتے ہیں تو ایک لاکھ ساٹھ ہزار ٹن دودھ کی مقدار کچھ کم نہیں کہی جاسکتی۔ اور ہنگامی ضرورتوں کو بڑی حد تک پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے تیار کیا ہوا دودھ غذائی اعتبار سے اصل دودھ کے مقابلے میں گھٹیا نہیں ہوتا اور اس سے بچوں کی پرورش بآسانی ہو سکتی ہے۔

سن یات سین کی سالگرہ

پچھلے مہینے چین کی جمہوریت کے بانی ڈاکٹر سن یات سین کی وفات کی اکیسویں سالگرہ چنکنگ میں منائی گئی۔ اس موقعہ پر سوویت نظام کے خلاف بڑا زبردست مظاہرہ ہوا۔ تاہم کوئی بدمزگی ہونے نہیں پائی۔ کیونکہ بروقت جنرلسیمو چیانگ کائی شیک نے کومنتانگ کو تنبیہ کر دی کہ گھریلو جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کے لئے خانہ جنگی کی صورت پیدا نہ کی جائے۔ کیونکہ پرامن تعمیر نو کے سلسلے میں ایسے ہنگامے سن یات سین کے اصولوں کے خلاف ہیں۔

پھلوں سے بنی ہوئی اشیا

ہندوستان کی مرکزی حکومت نے گذشتہ ماہ دسمبر میں صوبجاتی حکومتوں اور پھلوں کو محفوظ کرنے والوں کی انجمنوں سے مشورہ کرنے کے بعد ایک کنٹرول آرڈر جاری کیا تھا جو پھلوں سے بنی ہوئی خاص اشیاء پر یکم مارچ ۱۹۴۶ء سے نافذ ہونا تھا۔ لیکن اس قسم کے بہت سے تاجروں نے صدائے احتجاج بلند کی تو حکومت نے میعاد کو آگے بڑھا دیا۔ اب اسکا نفاذ یکم مئی ۱۹۴۶ء سے ہوگا۔ اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ پھلوں اور ترکاریوں کو صحت و صفائی کے اصولوں اور عمدگی کے مقررہ معیاروں کے مطابق محفوظ کیا جائے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام کی جانب سے پوری طرح تعاون کیا جائے تاکہ فلاح و بہبود کا مقصد خاطر خواہ پورا ہو۔

جنوبی افریقہ اور ہندوستانی

جنوبی افریقہ کی حکومت نے حال ہی میں ایک ایسا مسودۂ قانون منظور کیا ہے جو وہاں رہنے والے ہندوستانیوں کے حق میں بہت ہی مضر ہے کیونکہ اس کی رو سے وہ دوسری بہت سی پابندیاں عائد ہونے کے علاوہ اراضیات کی خرید و فروخت میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اس قانون کی خبر ملتے ہی حکومت ہند نے وہاں مقرر کئے ہوئے ہندوستانی کمشنر کے ذریعہ وزیر اعظم کو کہلوایا کہ وہ اپنی یونین کے اجلاس میں اس قانون کو نظر ثانی کی غرض سے پیش کریں مگر وزیر اعظم نے اس مطالبہ کو خود ہی رد کر دیا۔ چنانچہ اس قانون کے خلاف اظہار ناراضگی کرنے کے طور پر حکومت ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ جنوبی افریقہ سے ہر قسم کے تجارتی تعلقات منقطع کر لئے جائیں۔ اس امر کی اطلاع زبانی بھی ہندوستانی ہائی کمشنر نے یونین مذکور تک پہنچا دیا ہے۔ ہندوستان سے جنوبی افریقہ کے تجارتی تعلقات بہت دیرینہ ہیں اور وہاں کے لوگوں کو روزمرہ کے استعمال کی بہت سی چیزیں اس ملک سے منگانی پڑتی ہیں۔ یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو ظاہر ہے کہ انہیں کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ وہاں سے ہندوستانیوں کا ایک وفد صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے یہاں آیا ہے۔ قیاس ہے کہ حکومت ہند کی مزید کوشش صورت حالات کو سدھار سکیں گی۔ جنوبی افریقہ کی یہ بدعنوانی کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ نسلی امتیازات کا رنگ وہاں رہنے والوں کی ذہنیت میں ہمیشہ اپنی جھلک دکھاتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ خود افریقہ کے اصل باشندوں کے خلاف نفرت و حقارت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۹ء کی کانفرنس کے فیصلے کے مطابق برطانوی رعایا کے تمام افراد کو وہاں جانے اور بود و باش اختیار کرنے کا حق حاصل ہے لیکن ولندیزیوں کو پہلے سے عروج حاصل ہے اس لئے وہ ہمیشہ چھائے رہتے ہیں۔

سائنسی ترقی کیلئے ہولناک تجربہ

برطانیہ کے مشہور سائنسدان پروفیسر ایڈگر ڈگلس ایڈرین نے جن کو سائنسی تحقیقات کے سلسلے میں نوبل پرائز بھی مل چکا ہے جان بوجھ کر اپنی آنکھیں خراب کر لیں محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ان کی ایک نئی دریافت کردہ گیس کا بصارت انسانی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ گیس اتنی تیز اور جادو اثر ہے کہ اگر اسکا ایک حصہ ہوا کے دس لاکھ حصوں میں ملا کر فضا میں چھوڑ دیا جائے تو بصارت کئی دن کے لئے زائل ہو سکتی ہے۔ اور اگر اسکا تناسب زیادہ مقدار میں ہو تو بینائی ہمیشہ کے لئے جا سکتی ہے۔ اس گیس کے اثر سے آنکھ کی پتلی سکڑ کر سوئی کے نوک کے برابر رہ جاتی ہے اور انسان دیکھنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ دوسری گیسوں کے ساتھ یہ گیس بھی جرمنوں نے دوران جنگ میں استعمال کی تھی۔ موصوف اس کوشش میں مصروف ہیں کہ اس تجربہ کے ذریعہ صحیح اثرات معلوم کرنے کے بعد ایسی دوا دریافت کریں جو اس گیس کی تباہ کاریوں کو بالکل ختم کر دے۔ نیز یہ کہ اگر وہ گیس ہوا میں چھوڑ دی گئی ہو تو وقتی طور پر اس سے کیونکر محفوظ رہا جائے۔ گمان غالب ہے کہ اگر آئندہ لڑائی ہوئی تو گیسوں کے استعمال کے اعتبار سے وہ بہت ہی ہولناک ہوگی۔ اس لئے ان کا تدارک کرنے کے لئے علمی کوششوں کے میدان میں یہ پہلا قدم اٹھایا گیا ہے۔

ہندوستان کے لئے اناج

کمبائنڈ فوڈ بورڈ نے چاول اور گیہوں کی ابھی کوئی خاص تقسیم نہیں کی ہے تاہم آثار بتا رہے ہیں کہ اس سال کی پہلی ششماہی میں پندرہ لاکھ ٹن چاول سے بھرے ہوئے جہاز ساحل ہندوستان تک پہنچ جائینگے۔ چاول کی یہ مقدار ان چھ ہزار ٹن کے علاوہ ہے جو پہلے ہی ہندوستان آچکے ہیں۔ فی الحال ہندوستان کے لئے کم سے کم بیس لاکھ ٹن اناج باہر سے فراہم

ہونا ضروری ہے اور اس طرح مذکورہ بالا مقدار سے کسی طرح بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ تاہم نا سے یہاں بہتر ہے اور اس وقت اسی کو غنیمت سمجھا جا سکتا ہے۔ کمبائنڈ فوڈ بورڈ کے سامنے پورا مطالبہ پیش ہو چکا ہے۔ حکومت ہند زور دیتی رہیگی کہ جتنی بھی مقدار ملنی ہے جلد ملے اور اس کے حمل و نقل کا انتظام خاطر خواہ ہو۔ ہندوستان کا خوراکی وفد واشنگٹن سے روانہ ہو گیا ہے۔ آئندہ ہندوستان کے ایجنٹ جنرل وفد مذکور کی نمائندگی کرتے رہیں گے۔

آثار قدیمہ کا تحفظ

حکومت ہند کے آثار قدیمہ نے شہرۂ آفاق پرانی عمارتوں کے تحفظ کے لئے ایک خاکہ مرتب کیا ہے۔ دہلی اور فتحپور سیکری کی بہت سی عمارتوں کے لئے ایک لاکھ روپے کی منظوری ہوئی ہے۔ اس خاکہ میں بمبئی کے قریب بنا ہوا مشہور پرتگالی قلعۂ بسین بھی شامل ہے جو ہندوستان میں ایک غیر قوم کے تسلط کی نادر و بے مثال یادگار ہے۔ بیجاپور کے گول گنبد کی حفاظت بھی ہوگی۔ یہ گنبد ہندوستان میں سب سے بڑا اور دنیا میں دوسرے درجہ کا ہے۔ اس پر تقریباً ڈھائی لاکھ روپے خرچ ہونگے آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر مونر وھیلر نے کلکتے کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ضلع ایسا ہو جس میں کسی قدیم عمارت کے آثار نہ پائے جائیں اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہاں معدنی اشیا اس افراط سے ہیں کہ شاید ایشیا بھر میں اس کی مثال نہیں مل سکتی مگر افسوس ہے کہ اس عظمت و شان کے ہوتے ہوئے صرف ایک سرکاری محکمہ ہے جو تمام عمارتوں کے قیام و بقا کا انتظام کرتا ہے۔ عام لوگ ان کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں تحقیقات کا سلسلہ جاری کیا جائے اور طلبا ہندوستان کے اس ثقافتی ورثے کو سمجھنے اور سمجھانے میں دلچسپی سے حصہ لیں۔

فنانس بل کے خوشگوار پہلو

مرکزی اسمبلی میں فنانس بل کی منظوری کے وقت تقریر کرتے ہوئے فنانس ممبر نے کہا کہ آئندہ پوسٹ کارڈوں اور دیا سلائی کے بکسوں کی قیمتوں میں ایک ایک پیسے کی کمی کر دی جائے گی۔ اسی طرح مٹی کے تیل پر تین پیسے فی گیلن اور چھالیہ پر ایک آنہ فی پونڈ کے حساب محصول گھٹا دیا جائے گا۔ یہ کٹوتی بظاہر بہت قلیل معلوم ہوتی ہے لیکن حساب لگایا جائے تو مجموعی رقم لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ ان مراعات کے باعث پوسٹ کارڈوں پر ایک کروڑ ستر لاکھ، دیا سلائی کے بکسوں پر ڈیڑھ کروڑ، مٹی کے تیل پر ایک کروڑ تینتیس لاکھ اور چھالیہ پر پچپن لاکھ کا خسارہ حکومت کو اٹھانا پڑے گا۔ یہ صورت ایسی حالت میں پیدا ہوئی ہے جبکہ آئندہ سال کے بجٹ میں تقریباً چالیس کروڑ کی کمی پہلے سے دکھائی گئی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مرکزی اسمبلی میں فنانس بل پر بحث و تمحیص ہونے کے دوران میں مسلم لیگ کے ڈپٹی لیڈر نوابزادہ لیاقت علی خاں اور فنانس ممبر سر آرکیبالڈ رولینڈ کے مابین نجی طور پر یہ مفاہمت ہو گئی تھی کہ اگر غریب لوگوں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتے ہوئے عام ضروریات کی بعض چیزوں کے محصولوں اور قیمتوں میں کمی کر دی جائے تو مسلم لیگ پارٹی کے تمام اراکین بل کی منظوری میں مدد دے سکتے ہیں۔ چنانچہ رائے دہندگی کے وقت مسلم لیگ پارٹی کے تعاون سے بل منظور ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا اشیا کا استعمال ہر طبقے میں عام ہے مگر اس کا زیادہ خوشگوار اثر غریب لوگوں پر ہی پڑے گا۔ خصوصاً پوسٹ کارڈ کے سلسلے میں ایک پیسے کی کمی غربا کے لئے ایک نعمت ثابت ہوگی۔

وزارتی وفد ہندوستان میں

برطانوی وزارتی وفد جس کے صدر لارڈ پیتھک لارنس، وزیر ہند ہیں، نئی دہلی پہنچ چکا ہے اور حکومت ہند کے ارباب حل و عقد کے ساتھ ساتھ ملک کی مختلف قوموں اور جماعتوں کے رہنماؤں سے گفتگو ہو رہی ہے۔ وفد میں سر اسٹیفرڈ کرپس اور مسٹر اے وی الیگزنڈر بھی شامل ہیں۔ ان کے آنے سے قبل بیان کیا گیا تھا کہ ان کی آمد کے تین بڑے مقصد ہیں (۱) وائسرائے ہند کے ذریعہ اس امر کی تصدیق کرانا کہ اس اعلان نامے کی تجاویز جو سر اسٹیفرڈ کرپس ۱۹۴۲ء میں اپنے ساتھ لائے تھے قابل قبول ہیں یا ہندوستانی نمائندے کسی دوسرے یا ترمیم شدہ خاکے کو ترجیح دیں گے (۲) ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ مل کر ایک ایسی آئین ساز جماعت کے قیام کی صورت نکالنا جو ہندوستان کے لئے نیا دستور العمل اور قانون مرتب کر سکے (۳) سیاسی [illegible] وائسرائے کی مجلس مشاورت کو نئے سرے سے ترتیب دینے کی کوشش کرنا۔ اب تک کی گفتگو سے حالات خوشگوار نظر آ رہے ہیں اور قوی امید ہے کہ وفد کو اپنے منصوبوں میں خاطر خواہ کامیابی رہے گی۔ فی الحال انتظامی طور پر کوئی رائے زنی نہیں کی جا سکتی مستقبل کی روشنی صحیح نقوش کو اجاگر کرے گی۔

جنگی ملزموں کے مقدمات کی سماعت

جاپان کے جنگی ملزموں کی پہلی ہستی رنگون کارپوریشن کے ہال میں فوجی عدالت کے روبرو ہوئی۔ ملزمین میں کل چودہ جاپانی ہیں جن میں سے آٹھ فوجی افسر اور چھ جاپانی خفیہ پولس کے اراکین ہیں۔ ان پر یہ الزام عائد ہوا ہے کہ کالاگون کے ۶۳۲ مرد، عورت اور بچوں پر انھوں نے خوب دل کھول کر ستم ڈھائے تھے اور ان میں سے بہت سے باشندوں کو قتل بھی کر ڈالا۔ اس مقدمہ کا سلسلہ بہت دن جاری رہے گا۔

صبح جمال

فراق گورکھپوری

صبح ہے صبح تو اس عالم انوار کی صبح
آئینے میں وہ ترے پرتو رخسار کی صبح

ہم تو کہتے ہیں اسے عالم اسرار کی صبح
تیری آواز کا تڑکا ترے دیدار کی صبح

خلوت راز میں یوں دونوں سے ملتے ہیں
شام گیسوئے رسا جسم طرحدار کی صبح

جیسے آتی ہو ادھر جنبش دامن کی نسیم
جیسے ہوتی ہو ادھر آمد دلدار کی صبح

منہ اندھیرے مرے پہلو سے وہ جانا تیرا
تاروں کی چھاؤں میں وہ نرمی رفتار کی صبح

ظلمت و نور کو ہم سمجھے تو اتنا سمجھے
ترے انکار کی شام اور ترے اقرار کی صبح

صاف ہنستی ہوئی پیشانی سے پو پھٹتی ہے
نرم و دوشیزہ شعاع نگہ یار کی صبح

رنگ اور نور کا وہ رقص وہ خاموش کھنک
لہلہے روپ کے اس ساز کی جھنکار کی صبح

چادر نازمیں وہ زلف سیہ تاب کی شام
صاف گھونگھٹ میں دمکتے ہوئے رخسار کی صبح

بھیرویں چھیڑ دی تاروں نے فضا جام بکف
پچھلے کو کھلتی ہوئی نرگس سرشار کی صبح

زلف مشکیں کی لپٹ جلوہ وہ شام نثار
صبح جنت سے سوا چہرۂ گلنار کی صبح

لطف تو جب ہے محبت کے شبستانوں میں
کوندے لپکائے ترے خندۂ پرکار کی صبح

کالی متوالی ترے گیسوئے خمدار کی شام
رنگ چھلکاتی ہوئی سینے کے کہسار کی صبح

مسکراہٹ میں لیے شعلہ و شبنم کی جھلک
اچپلاہٹ میں لپکتے ہوئے گلزار کی صبح

رشک گلزار ارم لہلہے جوبن کی بہار
چھلکے چھلکے قدح روشن و سرشار کی صبح

نازک و تازہ فضاؤں میں ہے اک نرم دمک
ہائے رے ہائے تری نرمی گفتار کی صبح

رنگ اچھالے گا ابھی دست نگاریں کیا کیا
خیرہ کر دے گی نظر شوخی طرار کی صبح

مسکرانے دے ذرا ہونٹوں کی پنکھڑیوں کو
بند ہے غنچۂ نورستہ میں گلزار کی صبح

نازنیں جسم سرتابقدم رنگا رنگ
لہلہاتی ہوئی شاخ تر و گلبار کی صبح

دل ہی دل ہے زجبیں تا کف پا جسم صبیح
ہے سجل روپ ترا آئے ہوئے پیار کی صبح

ٹھنڈے پڑتے چلے تاروں کے بھی ہوتی! جاگ
میرے پہلو کو بنا مطلع انوار کی صبح

یہ اداسی، یہ سیاہی کا دبے پاؤں نزول
دیکھیں کب ہوتی ہے شام غم دلدار کی صبح

بھری دنیا غم فرقت میں لٹی دنیا ہے
جیسے بے رنگ کسی شاہد بازار کی صبح

ذرے ذرے کو جگاتی ہے ترے پاؤں کی چاپ
یونہی ہو جاتی ہے سوتے ہوئے سنسار کی صبح

بن گئی رنگ اڑاتی ہوئی آواز فراقؔ
جگمگاتے ہوئے لو مارتے اشعار کی صبح

اصغر گونڈوی

وطن گورکھپور تھا لیکن اصغر کی بود و باش زیادہ تر گونڈہ میں رہی، اسی لئے وہ اصغر گونڈوی کہلائے، خود اپنے احباب سے فرمایا کرتے تھے کہ میری زندگی میں کوئی واقعہ قابلِ ذکر نہیں بجز اس واقعہ کے کہ میں حضرت پیر و مرشد جناب سید عبدالغنی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان کے دربار سے فیض یاب ہوا۔ انکی تعلیم بھی باقاعدہ نہ ہوسکی، نہ کسی دارالعلوم میں انہوں نے زندگی کے چار پانچ سال گذارے۔ نہ کسی یونورسٹی میں درس و تدریس حاصل کی اردو فارسی خوب جانتے تھے اگرچہ عالم نہ تھے، اور انگریزی بھی پڑھ اور سمجھ لیتے تھے، مگر انہوں نے جو کچھ حاصل کیا خود اپنی محنت سے حاصل کیا، کسی درسگاہ کے ممنون احسان نہ ہوئے۔ ان کے علم کا مبلغ کچھ زیادہ نہ تھا، لیکن ان کے صحیح ذوق اور نکتہ رس نگاہ نے انکی معلومات میں جلا کر دی تھی، اس پر ان کے پیر و مرشد کا فیض اور زیادہ مفید ثابت ہوا۔

"حضرت قاضی عبدالغنی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے زمرۂ مریدین میں شامل ہونے سے قبل شاید انکو اپنی صلاحیتوں کا احساس بھی نہ تھا۔ یہ قاضی صاحب رحمتہ اللہ علیہ ہی کی کرامت تھی جس نے اس عینک بیچنے والے گمنام اور تعلیم و تدریس سے ناآشنا شخص کو تھوڑی سی مدت میں ایک قادرِ کلام شاعر ایک نکتہ سنج مفکر اور ایک رنگین ادا ادیب بنادیا۔۔۔۔۔"

اصغر بچپن ہی سے فکرِ سخن کرتے تھے لیکن ان کا ابتدائی کلام سب تلف ہوگیا اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جب اصغر دنیائے شاعری میں روشناس ہوئے تو عمرِ عزیز کے چالیس سال گمنامی میں بسر کرچکے تھے۔ دنیا نے ان کو ایک مشاق اور پختہ مشق شاعر کی حیثیت سے دیکھا اور غالباً ان کے ذہنی ارتقاء کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کا سلسلۂ تلمذ مختلف واسطوں سے مومن تک پہونچتا ہے، اصغر کے معاملہ میں یہ استادی شاگردی کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہوئی، ان کے کلام کا انداز، اور انکی شاعری کا طرز انفرادی تھا۔ تقلید کے وہ کبھی قائل نہ ہوئے، اگرچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ میرے کلام میں مومن کی سی رنگین بیانی اور غالب کا سا اونچا تخیل موجود ہے، اور ایک ناقد کا بیان ہے کہ ان کے کلام میں جا بجا غالب کا سا نامکمل فلسفہ اور کہیں کہیں اقبال کی سی قطعیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن ان تمام اثرات کے باوجود اصغر کے کلام میں انکا انفرادی رنگ بدرجۂ اتم موجود ہے، ان کے تقریباً ہر شعر پر ان کے مخصوص انداز کی مہر ثبت ہے۔ اور پھر یہ کہ انکی شخصیت اور ان کے کلام میں جسقدر ہم آہنگی اور ربط موجود ہے وہ اسقدر شدت کے ساتھ شاید ہی کسی شاعر کا طرۂ امتیاز ہو چنانچہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بہت خوب کہا ہے:۔

"مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آجاتا ہے جب ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب کھنچتے جاتے، مسکراتے سامنے آموجود ہوتے ہیں، ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجئے تو اصغر صاحب، اور اصغر صاحب کو الفاظ اور عبارت میں تحویل کیجئے تو ان کا کلام۔۔۔۔۔"

اصغر کی زندگی کے آخری دس بارہ سال الہ آباد میں بسر ہوئے، جہاں وہ پہلے انڈین پریس میں ملازم رہے، اور بعدہٗ ہندوستانی اکاڈمی کے رسالے کے اڈیٹر ہوگئے۔ یہاں انکی زندگی بڑی آن بان سے گذرتی تھی۔ مکان صاف ستھرا، فرنیچر بیش قیمت اور عمدہ، لباس اور خوراک بہتر سے بہتر، انداز میں شرافت اور سنجیدگی، چہرے مہرے سے وقار اور امتیاز ٹپکتا ہوا، دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت خوددار، اور ممتاز انسان ہیں، سر پر پٹے، داڑھی فرنچ کٹ، آنکھوں پر نصف دائرے والی عینک، اس پر لطف یہ کہ بڑے جامہ زیب اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ مگر یہاں یہ نکتہ لائق غور ہے کہ انکی شخصیت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ذرا غور و فکر کی ضرورت تھی۔ انکی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی لیکن اس چمک کے ساتھ انکی پاکیزہ روح کی طفلانہ معصومی جھلکتی تھی، اور ان کے احباب پر سحر کرتی رہتی تھی۔ چنانچہ یہ سنجیدگی متانت اور ساحری کے نمایاں اثرات ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ احمد فاروقی صاحب فرماتے ہیں:۔

"یہی رکھ رکھاؤ اصغر کی شاعری میں بھی ہے، جس طرح انکی گفتگو وضع، لباس، معاشرت میں ذوق اور سلیقہ کارفرما ہے ایسے ہی انکا آرٹ بھی بہت رچا ہوا، اور بڑی ریاضت کا نتیجہ ہے۔ بقول شخصے ڈھاکہ کی ململ اور لکھنؤ کی جامدانی کی طرح بڑا شریف آرٹ ہے۔۔۔۔۔ اصغر کی شاعری ان کی زندگی کا آئینہ ہے، اور جس طرح انکی زندگی اعلیٰ معیار کی تھی، ایسے ہی ان کے کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جو معیارِ تہذیب سے گرا ہوا ہو۔"

اصغر شاعر ہیں، اور حقیقی معنوں میں شاعر لیکن موجودہ معیار کے لحاظ سے وہ یک فنی ہیں ان کے کلام کا کل متاع صرف غزلیات پر مشتمل ہے۔ دو چار مرتبہ خلفائے راشدین کی منقبت میں قصیدہ کہنے کی کوشش کی لیکن دس پانچ اشعار سے زیادہ کبھی نہ کہہ سکے، اور ہر مرتبہ ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ ان کے "نشاط روح" اور "سرودِ زندگی" میں غزلیات ہی پائی جاتی ہیں۔ کہنے کو یہ دو دیوان ہیں لیکن دونوں بہت مختصر ہیں دونوں کو اگر یکجا شائع کیا جائے تب بھی وہ ایک معیاری دیوان نہیں بن سکتے، یہ مختصر سا کلام اصغر کے

عبدالشکور

زرخیز دماغ کی بہترین شاعرانہ پیداوار ہے، اور ان ہی پر بحیثیت شاعر کے ان کی شہرت کا دار و مدار ہے۔ ان کے دیوان مختصر اور لطف یہ کہ انکی غزلیں اور بھی زیادہ مختصر ہیں، دواوین کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کم گو ہیں، جو کچھ کہتے ہیں سوچ سمجھکر اور غور و فکر کے بعد کہتے ہیں۔ ان کے کلام کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ انکے ہاں بھرتی کے اشعار بہت کم ہیں، پھس پھسے اشعار کا فقدان ہے، جو کچھ ہے صاف، ستھرا، نکھرا ہوا، سجا سجایا ہوا، وہ ایسے فن کار ہیں جو سادگی سے زیادہ رنگینی اور نقش و نگار کا قائل ہو۔ وہ اس سادگی کا بھی نسبتاً کم قائل ہے جو پرکاری بن جاتی ہے، وہ اس حسن کا شیدائی ہے جو رنگ، بیل، بوٹوں اور نقوش سے پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ دیبائے شجر کا دیوانہ ہے اُسے وہ ریشم پسند نہیں جو گراں قیمت ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ اور بے رنگ ہو۔

یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے جسپر غور کرنا اصغر کو سمجھنے کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ ان کو اپنے پیر و مرشد سے والہانہ عشق تھا۔ اپنے احباب سے بار بار ان کا ذکر بڑے ادب احترام سے کرتے تھے، اکثر یہ فرماتے تھے کہ مجھے جو کچھ ملا اسی دربار سے ملا، پیر و مرشد کی صحبت میں اصغر کی ساری دنیا جاگ اٹھتی تھی اور انکی معمولی سی حرکت میں ایک انداز صد دلربائی، ان کے ادنیٰ سے اشارہ میں ایک پُر بہار رنگینی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس موقعہ پر اس لئے یہ سوال کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس روحانی فیض سے ان کی شاعری کا کیا تعلق تھا؟ پہلے وہ مرید تھے یا پہلے شاعر تھے؟ ہمارا یہ خیال ہے کہ پہلے وہ مرید تھے، اور بعدہٗ شاعر، یہ روحانی فیض جو ان کو اپنے پیر و مرشد سے حاصل ہوا انکی شاعری پر جاری و ساری ہے، اس روحانیت کی چاشنی سے اصغر کی شاعری کا قوام تیار ہوا، اور یہ روحانیت وہ صفحۂ قرطاس ہے جسپر اصغر نے گلہائے مضامین کھلائے، چنانچہ اپنے اشعار میں بھی اصغر اس روحانی فیض کی جانب اشارہ کرتے ہیں ؎

اب وہ زماں، نہ وہ مکاں، اب وہ زمیں نہ آسماں
تم نے جہاں بدل دیا آکے مری نگاہ میں

عالم سے بے خبر بھی ہوں، عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

اے پیکر محبوبی! میں کس سے تجھے دیکھوں؟
جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدۂ حیراں ہے

مے دافعِ آلام ہے، تریاق ہے لیکن ✦ کچھ اور ہی ہوجاتی ہے ساقی کی نظر سے

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر اصغر کو یہ روحانی فیض حاصل نہ ہوتا، تو غالباً وہ شاعر نہ بن سکتے، اور اگر اشعار کہتے بھی تو ان کے کلام میں یہ بانکپن، یہ حسن، یہ کشش اور یہ روحانی فضا پیدا نہ ہوتی جس نے اردو کے شعراء کی صف اول میں اصغر کو ایک ممتاز جگہ مرحمت کی۔

اصغر کے کلام میں روحانی عنصر کافی سے زیادہ موجود ہے، لیکن تصوف اور قوالی کا عرف عام میں جو رنگ مخصوص و محدود ہو گیا ہے وہ رنگ اصغر کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ ان کا جذبۂ عشق ہمت شکن، خواب آور اور عمل سوز نہیں ہے، ان کے جاناں کا تصور ان کو تعطل اور بے عملی، سکون و جمود کی طرف مائل نہیں کرتا بلکہ ان کو تگ و تاز کی دعوت دیتا ہے، اور ان کی دوا دوش کرنیوالی صلاحیتوں کے لئے تازیانہ ثابت ہوتا ہے۔ ان کے عشق میں ایسی گرمی، ایسا سوز، اور ایسا اضطرار موجود ہے جو عاشق کو رواں دواں، اُفتاں و خیزاں منزل مقصود کی جانب لئے جاتا ہے، وہ مایوس بھی ہوتے ہیں اور نا اُمید بھی دلگرفتہ بھی ہوتے ہیں اور غمگین بھی، لیکن ان کی نا اُمیدی، ان کا ہر جذبۂ غم کشاں کشاں آگے لئے جاتا ہے۔ وہ اتنے نا اُمید کبھی نہیں ہوتے کہ بے عمل ہو جائیں اور ان کے جذبۂ عمل پر جمود طاری ہو جائے۔ ان کے ہاں "عشق کی شان ارتقا" اور "نگاہِ لطف کا آسرا" ہمیشہ باقی رہتا ہے جس سے ان کے خون کی روانی اور رگوں کا ارتعاش کبھی مضمحل نہیں ہوتا اور وہ کہہ اُٹھتے ہیں ؎

"عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے"

اور

مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے ✦ کچھ ابتدا کی ہے نہ خبر انتہا کی ہے

اور

؎ چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے

اصغر نے اپنی ابتدائی زندگی میں حسن کی دلربا کرشمہ سازیاں خوب دیکھیں رنگین صحبتیں اٹھائیں لیکن ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عشق مجازی سے بہت جلد گزر کر عشق حقیقی کی طرف مائل ہو گئے، ابتدائی کلام میں ان کے ہاں دستِ ناز، برقِ نگاہ، برقِ جمال، لغزشِ پا سب کچھ موجود ہیں لیکن ان کے آخری کلام میں ان کا محبوب سراپا نور بن جاتا ہے، اور وہ کہہ اُٹھتے ہیں ؎

اس رخ پہ جو چھا جائے مرکیف نظر بھی	ہو نور پہ کچھ اور ہی اک نور کا عالم
دیدکیا ہے کچھ تلاطم میں ہجوم نور ہے	نور آنکھوں میں اسی کا جلوہ خود نور محیط

شاید اسی وجہ سے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اصغر کے کلام میں حیات کی گرمی، عشق کی لپٹ اور زندگی کی تھرتھری کم ہے، ان کے اشعار میں خنکی، سرد مہری، اور برفانی فضا پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں نہری نور، اور لطافت ہی لطافت ملتی ہے، ایسا نور، اور ایسی لطافت جو کشمکش حیات سے بلند فضائے ایتھر میں موجود ہو، بادی النظر میں یہ اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن جس شاعر نے یہ شعر کہے ہوں ؎

ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے	جلوہ ترا اجتک ہے نہاں چشم بشر سے
پھر دیکھئے اک بار محبت کی نظر سے	جانبازوں کے سینوں میں ابھی اور بھی کچھ ہے

عاشق بھی معذور ہے مجبور ہوں میں بھی
کچھ فتنے اٹھے حسن سے کچھ حسن نظر سے

طلب کیسی؟ کہاں کا سود و حاصل کیف مستی میں
دعا تک بھول جاتے مدعا اتنا حسین ہوتا

ترے قربان ساقی! اب یہ کیا عالم ہے مستوں کی
کبھی عالم تو ہوتا ہے کبھی عالم نہیں ہوتا

کچھ ایسا دیکھ کے چپ ہوں بہار عالم امکاں
کوئی ایک جام پی کر جس طرح سرشار ہو جائے

ان اشعار میں سرد مہری کے بجائے گرمی اور حدت موجود ہے، ممکن ہے اصغر کی عرفانی فضا کچھ اس وجہ سے پیدا ہوئی ہو کہ وہ عالم امکان کی بہار کچھ اس طرح دیکھ چکے تھے جس طرح ہم میں سے بہت سے لوگ نہیں دیکھ سکتے۔ بہرحال وہ چپ ضرور ہیں، بہت کم کہتے ہیں اور جب کہتے بھی ہیں تو اشاروں اور کنایوں کے ذریعہ اپنا مدعا بیان کرتے ہیں، بے محابا اور برملا کہنا ان کے سنجیدہ مسلک کے خلاف، دریدہ دہنی اور صاف گوئی ان کے متین رویہ کی شان کے منافی، اسی لئے کہا ہے ؎

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

اصغر سے ملنا ہو تو ان کا کلام پڑھنا چاہیئے جہاں گریۂ خونیں میں روداد گلستاں موجود ہے، جہاں ان کے اشعار میں بارغ معنی سے اک موج نسیم اس طرح آتی ہے کہ رگ جان میں رقص پیدا ہونے لگتا ہے، جہاں عشق اس طرح آمادۂ فریاد ہوتا ہے کہ عارض جاناں تمتمانے لگتے ہیں، جہاں گلہائے مضامین کو چھیڑ کر اصغر اک سدا بہار گلستاں بنا دیتے ہیں اور اس طرح نغمۂ رنگین شروع کرتے ہیں کہ شاخ آشیاں جھومنے لگتی ہے۔

"اصغر کی شاعری کی نمایاں خصوصیت خیالات کی پاکیزگی اور انداز بیان کی لطافت ہے۔ اسی دل آویز پیرایہ کی وجہ سے ان کے معمولی سے معمولی خیالات بھی دلکش بن جاتے ہیں۔ اصغر نے اپنے احساسات کو آب رنگ شاعری میں اس طرح سمو کر پیش کیا ہے کہ دل و نظر ان میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں اور بعض وقت سخن آرائی خود طرز ادا کی ندرت پیدا کرنے لگتی ہے ....."

رموز

دل افسردہ کو گرما رہا ہوں — تری الفت کی لے میں گا رہا ہوں
غم ہستی سے جی بہلا رہا ہوں

بہت دشوار ہے دل کی کہانی — نہیں ہوگی بیاں غم کی زبانی
میں اہل ہوش کو بہکا رہا ہوں

دل ناداں کو سمجھانے چلا ہوں — حقیقت کی خبر لانے چلا ہوں
ازل کی گتھیاں سلجھا رہا ہوں

مجھے ایسا نہ بھولے جاؤ یارو — ذرا دھیرے چلو اے کامگارو
کہ میں بھی پیچھے پیچھے آ رہا ہوں

امیدوں کے خوشاوہ قصر اولیں! — فریب اہلی اے تجھ پہ قرباں!
سمجھ کر کس قدر پچھتا رہا ہوں

حیات روح پرور میں فنا کیا — مرے مرنے پہ یہ آہ و بکا کیا
کہ میں اک دو گھڑی ستا رہا ہوں

یہ جلوے اور یہ یاور رکابی — نہ چھیڑا اے دعوت موج شرابی
خوشی کے نام سے اکتا رہا ہوں

محیط بیکراں کے اس کنارے — کھڑا ہوں وہم باطل کے سہارے
شفا کے زعم میں بل کھا رہا ہوں

مرے ٹوٹے ہوئے دل کو نہ توڑو — مجھے اپنی زبوں حالی میں چھوڑو
کرم کے خوف سے تھرا رہا ہوں

کبھی عرش علیٰ کی وادیوں میں — کبھی تحت الثریٰ کی گھاٹیوں میں
عقیدت کے جھکولے کھا رہا ہوں

فریب لذت الیقاں نہ کھاتا — مری باتوں کے دھوکے میں نہ آتا
میں کیا سمجھا ہوں کیا سمجھا رہا ہوں

قیامت ہی تجھے دیکھا ہی جب سے — مرے ایمان کو بٹا لگا ہے
خدائی سے خدا منوا رہا ہوں

مخمور اکبرآبادی

پنجاب میں پنچایتوں کا رواج

بلدیو راج

صوبہ جاتی حکومتوں نے گرام سدھار کی جو تجویزیں سوچی ہیں ان میں پنچایتوں کی تجدید کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ گاؤں والوں میں اپنے معاملات خود طے کرنے اور اپنے گاؤں کا انتظام اپنے آپ کرنے کا سلیقہ پیدا کرنے کے لئے پنچایت بڑی مفید چیز ہے۔ پنچایت ایکٹ سنہ ۱۹۲۲ء میں نافذ ہوا تھا۔ اسی وقت سے پنجاب کی حکومت دیہاتی علاقوں میں پنچایتیں قائم کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے۔ سات ہزار سے زیادہ پنچایتیں اب تک قائم ہو چکی ہیں لیکن پنجاب کی حکومت اس تعداد کو تگنا کرنا چاہتی ہے کیونکہ وہ چاہتی ہے کہ ہزار آدمیوں کے لئے ایک پنچایت ضرور ہونی چاہئے۔

پنچایت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود گاؤں، اور گاؤں آریاؤں [illegible] پنجاب میں آتے ہی قائم ہو گئے تھے۔ یہ بات اب سے چار ہزار سال پہلے کی ہے۔ آریاؤں کی قدیم زندگی اور طریقہ ماند و بود کا حال قدیم رزمیہ نظموں، آئین و قوانین کی کتابوں، سیاسی رسالوں اور مذہبی یادداشتوں سے لگ سکتا ہے۔ اس زمانہ میں گاؤں کا نقشہ یہ تھا کہ کسی معقول جگہ چند گھر برابر برابر ہوتے تھے۔ لوگوں میں بھائی چارہ تھا اور خاص بات یہ تھی کہ ہر گاؤں اپنا تمام انتظام خود کرتا تھا جس کی باگ ڈور ایک ایسی مجلس کے ہاتھ میں ہوتی تھی جس کے ممبر گاؤں کے تمام بالغ آدمی ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس مجلس کے ممبروں کی تعداد گھٹتی گئی اور اس مختصر مجلس کا نام "پنچایت" رکھا گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ گاؤں کے ہر آدمی کے پاس نہ اتنا وقت تھا اور نہ ہر ایک کو یہ شوق تھا کہ وہ مجلس کے اجلاس میں شریک ہو۔ اس لئے لوگوں نے بخوشی اپنے کاموں کے تصفیہ کا اختیار چند بڑے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔

پرانے زمانہ کی پنچایت کے کوئی قواعد و ضوابط مقرر نہیں تھے۔ جب بھی ضرورت آ پڑتی اس کا اجلاس ہو جاتا۔ فیصلے رایوں کے شمار پر نہیں ہوتے تھے بلکہ عام رضامندی پر ہوتے تھے۔ پنچایت کے اختیارات وسیع تھے اور ذمہ داریاں بہت۔ یہ سارے گاؤں والوں کی بھلائی کے کام کرتی تھی مثلاً سڑکیں، مندر اور تالاب بنوانا اور ان کی مرمت کرانا، ہر کنبہ پر کام تقسیم کرنا اور ہر ایک سے چندہ کی رقم وصول کرنا۔ پنچائت خیرات کے واسطے روپیہ جمع کرتی اور اس کو خرچ کرتی تھی، تہواروں کا انتظام کرتی تھی، کھیل کود کا خیال رکھتی تھی اور تعلیم، صفائی اور دوسرے کاموں کی ذمہ دار تھی۔ عام امن و امان قائم رکھنا بھی اس کا فرض تھا۔ ان کاموں کے علاوہ پنچائت کے اختیارات منصفانہ بھی تھے۔ اراضیات اور روپیہ پیسہ کے تمام تنازعات بھی پنچائت ہی سے فیصل ہوتے تھے۔ بلکہ معمولی جرائم کی سزا بھی پنچائت ہی دیدیتی تھی۔ اس کے فیصلوں کی خلاف ورزی شاذ و نادر ہوتی تھی کیونکہ حکم عدولی کرنے والے پر سب لعنت بھیجتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ کی پنچایتوں کے اختیارات بہت وسیع تھے وہ گاؤں کی زندگی کے ہر رخ پر حاوی ہوتی تھیں۔ سلطنتیں قائم ہوئیں اور تباہ ہو گئیں، فاتح آئے اور چلے گئے لیکن دیہاتی زندگی میں کبھی کوئی انتشار پیدا نہ ہوتا تھا۔ اسلامی طریق حکومت بہت ہی مرکزی تھا لیکن اس نے بھی پنچایتوں کے اختیارات کو بحال رکھا اور گاؤں کی زندگی میں بہت کم دخل دیا۔ پنچایتوں کے زوال کا زمانہ انگریزی حکومت کے ساتھ شروع ہوا۔ لیکن باقاعدہ ارادی طور پر ایسا نہیں ہوا بلکہ شروع شروع میں تو انگریزی حکام نے پنچایتوں کے کام کو بڑا پسند کیا اور ان کو قائم رکھنا چاہا لیکن ان کا قیام اور برقراری بدلے ہوئے حالات میں ناممکن ہو گئی۔ انگریزی طریق حکومت بہت ہی مرکزی تھا اور اس کے مطابق گاؤں کے معاملات میں بھی ہاتھ ڈالنا ضروری ہو گیا۔ حکومت نے خود اپنے حکام اس لئے مقرر کئے کہ وہ مقدمات کی سماعت کریں اور خود اپنے فیصلے صادر کریں۔ پنچایتوں کو اب یہ اختیار نہیں رہا۔ گاؤں کی مال گذاری میں سے جو رقم پنچایتوں کو دی جاتی تھی وہ بند کر دی گئی اور جب گاؤں والوں نے دیکھا کہ خود حکومت وہ تمام کام کر رہی ہے جو پہلے پنچایت کرتی تھی تو انہوں نے بھی پنچایتوں کو چندہ دینا بند کر دیا۔ اس صورت میں پنچایتوں کا شیرازہ بکھر جانا ایک لازمی امر تھا۔ لیکن دو اور باتیں ایسی پیدا ہو گئیں جنھوں نے پنچایتوں کے زوال کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ اقتصادی حالات کی تبدیلی نے گاؤں کے ہوشیار اور ہنرمند آدمیوں کو شہر میں چلے جانے پر مجبور کر دیا جس کی وجہ سے پنچایت کا کام کرنے کے قابل آدمیوں کی روز بروز کمی ہوتی چلی گئی۔ دوسرے یہ کہ مغربی ہوا نے لوگوں میں انفرادیت کا مادہ پیدا کر دیا جس نے گاؤں کی اس فضا کو ہی باقی نہ چھوڑا جو پنچایت کی برقراری کے لئے ضروری تھی۔

انیسویں صدی کے آخر تک پنجاب میں پنچایتیں اپنا پورا زور ختم کر چکی تھیں۔ جنوب مشرقی حصہ میں یہ ضرور کسی حد تک باقی رہیں لیکن ان کی اہمیت محض مخصوص علاقوں اور بعض بعض ذاتوں تک ہی محدود رہ گئی۔ لیکن ان کے اختیارات صرف سماجی اور رسمی رہ گئے اور وہ بھی افراد کی ذاتی مرضی پر منحصر تھے۔ پنچایتوں کے ختم ہو جانے سے گاؤں والوں کی زندگی میں ایک طرح کا جمود پیدا ہو گیا۔ دیہاتیوں نے اپنے معاملات میں دلچسپی لینا بند کر دیا اور وہ مقدمات میں اپنا وقت اور روپیہ ضائع کرنے لگے۔ اس خرابی کو دور کرنے کے واسطے سنہ ۱۹۰۹ء کے "شاہی کمیشن" نے سفارش کی کہ مقامی معاملات کو سلجھانے اور فیصل کرنے کے لئے پنچایتوں کو از سر نو زندہ کرنا چاہئے۔ اس مشورہ پر عمل کرتے ہوئے مرکزی حکومت نے تمام صوبہ جاتی حکومتوں کو ہدایت کی کہ جہاں جہاں ممکن ہو دیہات والوں کی مدد سے

پنچایتوں کے کام کی ایک عملی آزمائش کی جائے۔ اس نئی تجویز پر عمل درآمد کرنے کے لئے حکومت پنجاب نے ۱۹۲۱ء میں پنچایت ایکٹ پاس کیا۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۶ء کے دوران میں تقریباً گیارہ سو پنچایتیں باقاعدہ طور پر قائم کی گئیں۔ پنچایت ایکٹ کی رُو سے پنچایتوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ پچاس روپیہ تک کی رقم کے مقدمات کو فیصل کر دیا کریں۔ فوجداری کے وہ مقدمات پنچایتوں سے فیصل ہو سکتے تھے جو معمولی چوری، معمولی مارپیٹ، معمولی قبضہ مخالفانہ اور ڈھور ڈنگروں سے متعلق ہوں۔ پنچایتیں نہ تو سزا دے سکتی تھیں اور پچیس روپیہ سے زیادہ جرمانہ کر سکتی تھیں جرمانے فی الواقع بہت ہی کم کئے جاتے تھے کیونکہ پنچایتیں اہل معاملہ کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ صفائی کا کام پنچایتیں زیادہ حد تک نہیں کر سکیں۔ پنچایتوں کی ناکامی کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے زیر اثر ہنرمند اور مستعد کارکن نہیں تھے۔

۱۹۳۱ء کے پنچایت ایکٹ کے نقائص دور کرنے کے واسطے ۱۹۳۹ء میں ترمیم شدہ پنچایت ایکٹ نافذ ہوا۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۴ء کے درمیان پنچایتوں کی تعداد گیارہ سو سے سات ہزار ہو گئی۔ ہمدرد اور قابل امداد پنچایت افسران اور نائب افسران کی مدد سے پنچایتوں نے عام انتظامی، قانونی اور منصفی کے کام کامیابی کے ساتھ انجام دیئے۔ تعلیم اور صفائی کو ترقی ہوئی دیہاتی معمولی معمولی باتوں پر مقدمہ بازی سے بچ گئے اور ان کا بہت سا روپیہ جو ناحق مقدمہ بازی میں صرف ہوتا تھا ضائع ہونے سے بچ گیا مال اور فوجداری کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے مقدمات پنچایتوں میں فیصل ہونے لگے ٹیکس لگائے گئے اور فلاح عام کے کام سوچے اور کئے گئے۔

پنچایتوں کا کام اس قدر کامیاب رہا ہے کہ حکومت پنجاب صوبہ کے تمام دیہات میں ایسی ہی پنچایتوں کا ایک بڑا جال پھیلا دینا چاہتی ہے۔ حکومت کا اندازہ ہے کہ بیس ہزار چھ سو پنچایتوں کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے لئے زیادہ ہوشیار آدمی (پنچایت افسران اور گاؤں کے مکھیا) درکار ہوں گے۔ مکھیا وہ لوگ ہوں گے جو مفید تجویزوں اور کاموں کی تدبیر کریں گے۔ تجویز یہ ہے کہ تیرہ سو نوے گاؤں کے مکھیا اور تین سو اڑتالیس پنچایت افسر مقرر کئے جائیں۔

یہ بات عام طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ پنجاب کے دیہاتیوں کو سب سے زیادہ ضرورت ایسے کلبوں کی ہے جہاں وہ دن بھر کی محنت کے بعد جا بیٹھا کریں، اخبار پڑھیں آپس کی دلچسپی کی باتوں پر بحث کریں اور کچھ کھیل وغیرہ کا بھی انتظام ہو۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے گورنمنٹ کا ارادہ تین ہزار پنچایت گھر بنانے کا ہے اندازہ ہے کہ فی پنچایت گھر دو ہزار روپیہ لاگت آئے گی۔ اس عمارت میں اور چیزوں کے علاوہ یہ چیزیں بھی ہوں گی (۱) ایک عام کمرہ جس میں اخبارات ہوں اور جہاں جہاں ممکن ہوگا ریڈیو سٹ بھی (۲) ایک اور بڑا کمرہ جہاں لوگ جمع ہو سکیں۔ (۳) کھیل کا میدان مع ایک زنانہ باغ اور ایک دنگل کے میدان کے پنچایت گھر کی تعمیر پر جو لاگت آئے گی اس کا نصف حصہ گورنمنٹ برداشت کرے گی عمارت گاؤں کی پنچایت کے زیر نگرانی رہے گی اور پنچایت کو گاؤں کا مکھیا یا نمبردار مدد دے گا۔ خاص خاص جگہ تیرہ پنچایت گھر اب تک تعمیر ہو چکے ہیں ۱۹۴۵-۴۶ء میں اٹھائیس اور پنچایت گھر بننے ہیں اور ان کے لیے چھپن ہزار روپیہ کی منظوری ہو چکا۔

انتظامی امور میں پنچایت کی دلچسپی بڑھانے کے واسطے کچھ زر امدادی دینا طے ہوا ہے اس غرض کے لئے گورنمنٹ ہر سال ایک بڑی رقم علیحدہ رکھ دیا کرے گی۔ اس رقم میں سے اتنا روپیہ گاؤں کی پنچایت کو دیا جایا کرے گا جتنا وہ پنچایت ٹیکس وغیرہ سے خود اکٹھا کیا کرے گی لیکن رقم کی مقدار کسی صورت میں بھی ایک ہزار روپیہ سے زیادہ نہ ہوا کرے گی خیال ہے کہ اس رقم کے ہوتے ہوئے پنچایتیں فلاح عام کے کام کاج مثلاً سڑکوں کے بنانے اور ان کی مرمت کرانے میں دلچسپی لیا کریں گی۔ اس کے علاوہ وہ باغات لگایا کریں گی، کتب خانے قائم کریں گی اور "فرسٹ ایڈ" کے مرکز کھولیں گی۔

پنچایتوں کی کثرت پنجاب کے گرام سدھار کے لئے ایک فال نیک ہے پنچایتیں کوشش کر رہی ہیں کہ گاؤں والوں میں شہریت کے جذبات، امداد باہمی کا مادہ اور خود اعتمادی کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور گرام سدھار کا کام بہ آسانی انجام پا جائے پنچایتیں لوگوں کو جمہوریت اور خود مختاری کی بھی ٹریننگ دے رہی ہیں جو کام اس وقت اور زیادہ کام آئے گا جب ہندوستان کو مکمل آزادی مل جائے گی

غزل کا مستقبل

میری نظر کے فوکس

عطاءاللہ پالوی

بقول علامہ نیاز فتحپوری "غزل" نام ہے دو جوان "عورت" اور "مرد" کی اس گفتگو کا جو محبت کے سلسلے میں ہو اور بقول ڈاکٹر عندلیب شادانی اس طرح کی جنسی محبت "صرف اسی وقت صحیح معنوں میں محبت" کے لفظ سے تعبیر کی جاسکتی ہے جبکہ وہ عاشق و معشوق دونوں طرف یکساں شرربار ہو اس لئے وہ محبت جس میں فریق ثانی کا جذبۂ پذیرائی شامل نہ ہو جنون ہے، محبت نہیں۔ اور پھر بقول میر ناصر علی اس دو طرفہ محبت کا بھی اصلی مزہ صرف اسی وقت آتا اور آسکتا ہے جبکہ اسکا آغاز "عورت" کی جانب سے ہوا ہو۔ اس لئے کہ اگر وہ ملنا چاہے گی تو سو بہانے نکالے گی، ورنہ نتیجہ معلوم۔ چنانچہ ہندی تغزلانہ شاعری کو دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری میں محمود و ممتاز درجہ ملنے کی محض وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے جذب و اثر میں ساری دنیا کی شاعری سے یگانہ اور منفرد تھی۔ اور اس جذباتی یگانگت و اشتراکی انفرادیت کا سبب صرف یہ تھا کہ اس میں جذبات محبت "عورت" کی طرف سے اور "عورت" کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ اور اس میں مخاطب معشوق "مرد" بلکہ "شوہر" ہوا کرتا تھا جس وجہ سے وہ "محبت" ایک طرف تو فطری تسلیم کی جاتی تھی اور دوسری جانب یکطرفہ ہونے کے الزام سے بھی بری تھی۔

بلاشبہ جذباتی حیثیت سے ہندی کے یہ اشعار حد درجہ چوٹیلے، البیلے اور رسیلے ہوتے تھے اور اسی وجہ سے ان کو جو درجہ دنیائے شاعری میں ملا وہ اس کے مستحق تھے۔ مگر واقعاتی اعتبار سے ان میں بھی ایک نقص باقی رہتا تھا وہ یہ کہ گو انہیں سب کچھ "عورت" ہی کی طرف سے ہوتا تھا مگر اس کو بیان کرنے والے عبدالرحیم، تلسی داس، پدماکر، سورداس، ستیس اور بہاری لال وغیرہ تھے جو "مرد" تھے حقیقتاً کوئی "عورت" نہ تھی اور اس صورت سے یہ گویا ایک قسم کا جھوٹ بولا جاتا تھا اس لئے کہ ایک "مرد" نسوانی جذبات کو تمام تر سمجھنے اور بیان کرنے سے قدرتاً مجبور ہے اور شاید اسی وجہ سے ایسی شاعری کو زیادہ فروغ نہ حاصل ہوسکا۔

ہندستان میں فارسی زبان کا زور ٹوٹنے اور ہندی شاعری کا مذاق ختم ہونے کے بعد اردو زبان کا بول بالا ہوا تو "اردو غزل" کی بنیاد "ہندی شاعری" کے بجائے "فارسی غزل" کے نمونہ پر رکھی گئی اور اسے غیر معمولی عروج حاصل ہوا چاہے جس وجہ سے ہو۔

"غزل" طرز خطاب کے اعتبار سے تین حصوں میں بٹی ہوئی ہے کچھ اشعار ایسے ہیں جن سے کسی حد تک معشوق کی نسوانیت ظاہر ہوتی ہے مگر ان کی تعداد اسقدر کم ہے کہ وہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور اسی لئے وہ کسی شمار میں نہیں آتے اور ان کا عدم و وجود برابر ہوکے رہ گیا ہے کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں جنسیت مبہم ہے اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس میں مخاطب "مرد" ہے یا "عورت" سب سے زیادہ تعداد ایسے اشعار کی ہے جن میں معشوق صاف صریح "مرد" نظر آتا ہے۔ "مرد" معشوق تو ہندی شاعری کا بھی تھا مگر چونکہ اس میں جذبات نگار کی نسوانیت کھلم کھلا ظاہر ہوتی تھی اور معشوق کی مردانہ جنسیت اردو غزل کی طرح معنویاتی اعتبار سے نہیں بلکہ صفاتی حیثیت سے اپنی جھلک دکھاتی تھی لہذا اس میں بے کیفی پیدا نہ ہوئی بلکہ اسی سبب سے اسکا جذب و اثر بڑھ گیا۔ برخلاف اس کے "اردو غزل" میں غزل گو کی مردانہ حیثیت ہر جگہ ظاہر اور آشکارا رہی لہذا اشعار سے جذبۂ امرد پرستی کا عنصر ظاہر ہونے لگا اور چونکہ مرد سے مرد کی محبت کوئی معنی نہیں رکھتی ہے اور اردو "غزل" میں سارے جذبات مردانہ ہی ہوتے ہیں۔ نیز اس میں اسکا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ عشق دو طرفہ ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معشوق اپنے عاشق سے غائت ناز اور حد درجہ محترز ہے۔ لہذا رفتہ رفتہ "غزل" کا کیف و کم اور جذب و اثر مائل بہ انحطاط ہوتا چلا گیا یہانتک کہ اب نہ صرف یہ کہا جارہا ہے کہ "غزل" کا مستقبل تاریک ہے بلکہ یہ بھی دعویٰ کیا جارہا ہے کہ اردو زبان میں "غزل" کا دور ختم ہو چکا ہے اور اسکی زندگی اب چند روز سے زیادہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بیانیہ اسباب جن کی بنا پر یہ حکم لگایا گیا درست ہیں اور "اردو غزل" میں جو کمی و کوتاہی محسوس کی گئی وہ غلط نہیں مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانے نے جو نئی کروٹ لی ہے اس کے پیش نظر اب اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اردو زبان کی حیات میں "غزل" کو موت آجائے۔

"محبت" تو "عورت" کا لازمۂ حیات ہے۔ لہذا جب تک "عورت" کا وجود ہے جذبات محبت اس کے دل میں برابر کروٹیں لیا کرینگے اور فطری اکساہٹ ہمیشہ اس کو تڑپایا کرے گی۔ چونکہ اب سے کچھ پہلے تک مشرقی تمکنت نے اس کو کامل آزادی نہ دی تھی۔ لہذا اس کے جذبات محبت اور احساسات قلب زبان قلم سے "غزل" میں ظاہر نہ ہوتے تھے جس وجہ سے "اردو غزل" میں اب تک وہ تڑپ وہ کسک اور وہ بے چینی پیدا نہ ہوسکی تھی جو "ہندی شاعری" میں کارفرما تھی مگر اب نئی زمانہ کوئی پابندی اور رکاوٹ نہیں رہی ہے اب "عورت" کو کامل آزادی مل گئی ہے کہ وہ اپنے ذہنی تاثرات اور قلبی جذبات جس طرح چاہے کاغذ پر ظاہر کرے اور چونکہ اس کے لئے "غزل" ہی سب سے زیادہ موزوں، باکیف، رسیلی اور گداز کے شایاں

"عورت" ہی کی طرح نرم، نازک، البیلی اور اُس کے مزاج کے مطابق لچکیلی صنف ہے۔ لہٰذا "جذباتِ محبت" کے اظہار میں "عورت" نے "غزل" کہنا شروع کر دیا ہے۔ اور اس صورت سے "اردو غزل" کی یہ کمی کہ اُس میں جذباتِ محبت "عورت" کی زبان سے ادا نہیں ہوتے ہیں، اب اپنی پوری لطافت ونزہت اور نزاکت و لطافت کے ساتھ پوری ہو گئی ہے۔

رہا یکطرفہ محبت کا مسئلہ سو اسکا یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! اسلئے کہ یہ تو برابر دیکھا گیا ہے کہ ایک "مرد" نے کسی "عورت" کو پیغامِ محبت دیا اور اس نے ٹھکرا دیا۔ بلکہ بعض اوقات وہ پیغام اس عورت کے کانوں تک پہنچا بھی نہیں۔ اس لئے کہ "مرد" اپنا پیغامِ محبت "عورت" کے کانوں تک پہنچانے کے معقول وسائل تلاش کرنے کی فطری صلاحیت سے محروم ہے لیکن یہ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ ایک عورت "عجب، جہاں جس "مرد" کو بھی چمنستانِ محبت میں خوش آمدید کہنی ہے یا کہنا چاہتی ہے تو اپنی رسیلی آواز "مرد" کے کانوں تک پہنچا دینے کی کوئی نہ کوئی مناسب سبیل بھی ضرور ڈھونڈھ لیتی ہے اور اپنا پیغام اس تک پہنچا کے رہتی ہے اور پھر اس آواز کے پہنچ جانے کے بعد "مرد" اپنی فطری کمزوری کے سبب ہر طرح کے خدشات و خطرات کے پیش نظر ہوتے ہوئے بھی اسکی پذیرائی سے جرأت انکار اور جسارتِ گریز نہیں کرتا۔ لہٰذا "عورت" کی مکی ہوئی محبت کبھی بھی یکطرفہ نہیں ہوتی اور نہیں ہوسکتی ہے اور اسو جہ سے، اب ان حالات کے پیش نظر، یہ کہا جاسکتا ہے کہ "عورت" کی غزل گوئی سے "غزل" کی دونوں داخلی اور خارجی کوتاہیاں دور ہو گئی ہیں اور اگر یہ سلسلہ بدستور قائم رہا اور "عورت" اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ غزل گوئی میں حصہ لیتی رہی تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جب تک اردو زبان کا وجود ہے "غزل" اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ باقی نہ رہے بلکہ یوں کہئے کہ اگر صحیح معنی "غزل" نام ہے اُس پُر محبت گفتگو کا جو "عورت" اور "مرد" کے درمیان ہو اور حقیقتاً "محبت" نام ہے اُس آگ کا جو "عورت" کے آنچل یا دوپٹہ سے سُلگ کر "مرد" کے دامن میں لگے، تو کہنا چاہئے کہ "غزل" کی سچی داغ بیل اب پڑی ہے اور اسکا اصلی دور اب شروع ہوا ہے جبکہ "عورت" نے "غزل" کہنا شروع کیا ہے اور اس صورت سے "غزل" کا مستقبل تابناک ہونا کیا معنی، پہلے سے بھی زیادہ تابناک ہے۔

"عورت" کو عام طور سے "غزل" کہنے کا شوق دلانے کی ابتدا غالباً سب سے پہلی ۱۰ فروری ۱۹۲۹ء کو پڑی تھی جبکہ محترمہ کنیز فاطمہ حیا نے عورتوں کا سب سے پہلا مشاعرہ سلیم پور ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ میں منعقد کیا تھا اور جسکو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے ریلے بھی کیا تھا۔ اسی انعقادِ مشاعرہ کے بعد سے عورتوں میں غزل گوئی کا عام مذاق پیدا ہوا ہے اور روز بروز ترقی پا رہا ہے۔

چونکہ قدامت پسندی کے خلاف باحوصلہ عورتوں کی یہ پہلی ذہنی بغاوت تھی۔ لہٰذا اس مشاعرہ کے خلاف سختی سے صدائے احتجاج بھی بلند ہوئی تھی اور پھر اسکا جواب ترکی بہ ترکی بھی نسوانی ہی قلم سے دیا گیا تھا۔ محترمہ مہر سلطانہ افسر لکھنوی کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ اس مشاعرہ میں زیادہ تعداد ایسی عورتوں کی تھی جو اپنی غزلیں بھی بحروں میں موزوں نہیں پڑھ سکتی تھیں اور تلفظ کی غلطیاں غمازی کر رہی تھیں کہ وہ غزل خود ان کی کہی ہوئی نہیں تھی۔ اس اعتراض کا محترمہ حیا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اصولاً بیشک ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا اور کبھی نہ ہونا چاہیئے مگر کیا کیا جائے کہ جب دو سو برس کے مسلسل ذوق غزل گوئی کے بعد بھی اس وقت کے مردانہ مشاعروں میں نوجوان مرد، دوسروں سے لکھوا لکھوا کر غزلیں پڑھتے اور اپنا ذوقِ شعر گوئی اور شوقِ خودنمائی پورا کرتے ہیں تو نئی نویلی لڑکیوں کو کیا بُرا کہا جاسکتا ہے۔ ابھی تو عورتوں نے "غزل" کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ ابھی مشاق خواتین تعداد میں ہیں ہی کتنی جو صرف اپنی غزلیں کہہ کر ایک مشاعرہ کو کامیاب بنا سکیں۔ لہٰذا ایک طرف تو لڑکیوں کو شوق دلانے کے لئے اور دوسری جانب مشاعرہ کی زینت کے لئے ایسا لامحالہ کرنا ہی پڑیگا۔ اور اس لئے اگر ایسا ہوا تو اُس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ یا آئندہ ہو تو اسکو قابلِ ملامت فعل نہیں قرار دیا جاسکتا۔

محترمہ افسر کا دوسرا قدامت پسندانہ اعتراض نسوانی غزلوں پر یہ تھا کہ عورتوں کو اپنی غزلوں میں گُل رخسار، مارِ زلف اور تیرِ نظر وغیرہ کہہ کے بیباکانہ شوخ احساسات اور برملا عاشقانہ جذبات کا اظہار زیب نہیں دیتا۔ اسلئے کہ یہ جذبات حیا سے معرّا ہیں۔ محترمہ حیا نے اسکا معقول جواب دیا تھا کہ اب تک عورتیں یہ نہیں جانتی تھیں کہ رومانی شاعری صرف مردوں کے لئے مخصوص ہے اور ناقص العقل عورتوں کے لئے یہ شعور خفی کسی طرح سے شجرِ ممنوعہ ہوگا۔ خود مدیرہ "حیا" بھی بدقسمتی سے یہ سمجھے ہوئے تھی کہ شاعری کے لطیف جذبات کی بنیاد استعاروں اور تشبیہوں پر قائم ہے اور اسکے اظہار کے لئے رومانیت کا عنصر لازمی ہے۔ اسی سلسلے میں محترمہ حیا نے بجا طور پر محترمہ افسر سے یہ سوال کیا تھا کہ اگر خواتین کی شاعری سے رومانیت کا عنصر علیحدہ کرنے کی لاحاصل کوشش کی بھی جاتی تو کیا یہ ممکن تھا؟

محترمہ افسر کا تیسرا اعتراض کنواری لڑکیوں کی غزلوں کے مخاطب پر تھا اور کہا گیا تھا کہ لڑکیوں کو اس سے روکنا چاہیئے تھا۔ محترمہ حیا نے اس کا نہایت مسکت جواب دیا تھا کہ موجودہ زمانے میں جبکہ چار چار آنے والے بازاری عصمت شکار ناول اور پردہ سیمیں پر عشق و محبت کی بیباک اور حیاسوز تمثیلیں کنواری لڑکیوں کے مطالعے اور مشاہدے میں برابر آتی رہتی ہیں اور باوجودیکہ ہمارے قدامت پسندانہ احساسات کو اس سے ٹھیس لگتی ہے تب بھی ہم اسکا انسداد نہیں کرتے

انہیں کر سکتے تو پھر پردہ ماٹوی غزل گوئی کا اجتناب کس کے بس کی بات تھی اور ہے؟ اس سلسلے میں محترمہ حیا کا دلچسپ جواب یہ تھا کہ وہ "مشاعرہ" تھا۔ اس لئے یہ مشکل تھا کہ وہاں جذبۂ محبت کا کوئی اظہار نہ ہوتا۔

آخر میں عورتوں کی غزل گوئی سے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے محترمہ اختر کا زرین مشورہ یہ تھا کہ اگر عورتوں کو مشاعروں کا شوق ہی ہے تو ان کے مشاعرہ کی نوعیت "نعتیہ" ہونی چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ محترمہ اختر کا مشورہ دلچسپ تھا مگر محترمہ حیا کا جواب اس سے بھی زیادہ دلچسپ تھا کہ کیا اس انوکھی ذہنیت کا علاج ممکن ہے کہ عورتیں روزانہ صبح و شام صرف اقبال کے ترانے گایا کریں؟

غالباً اس سوال و جواب کے بعد نسوانی دنیا سے عورتوں کی غزل گوئی کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوئی بلکہ مذاق روز بروز ترقی پذیر ہے اور ملک کی تمام پڑھی لکھی خواتین جو فطرت کی طرف سے "شاعرانہ طبعیت" کے ساتھ ساتھ صلاحیت بھی لے کر آئی ہیں۔ غزل گوئی میں بطور خاص حصہ لے رہی ہیں اور ان کی غزلوں کا مرتبہ کسی طرح غیر حوصلہ افزا نہیں۔

آیئے ذیل میں بطور نمونہ دس مشہور و غیر مشہور غزل گو خواتین کی دس غزلیں (بقید پانچ شعر) ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ "غزل" کا مستقبل جیسا کہ اردو قیاس ہے "تاریک نظر آتا ہے یا جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں "روشن" معلوم ہوتا ہے۔

(۱) محترمہ صفیہ شمیم :-

چمن میں جشن عروسِ بہار رہنے آجا
عروسِ نغمہ سر آبشار ہے آجا

ہر ایک جنبشِ گل میں ہزار نغمے ہیں
ہر اک نسیم کا جھونکا بہار ہے آجا

سرور بخش گھٹاؤں کے مست سائے میں
جمالِ لالہ و گل تابدار ہے آجا

روش روش پہ چھڑی ہے حدیث لالہ و گل
کلی کلی کو ترا انتظار ہے آجا

تجھے خبر بھی ہے اس موسمِ بہار میں بھی
شمیم ناوکِ غم کا شکار ہے آجا

(۲) محترمہ انیس بانو :-

آپکی نظروں کے پھرتے ہی یہ ساماں ہو گیا
منقلب دنیا ہوئی سارا عالم پریشاں ہو گیا

اللہ اللہ کہ نسیم صبح کی اٹکھیلیاں
غنچۂ دل کھلتے ہی خود گلستاں ہو گیا

اپنی وحشت کی کہاں تک حد گزر گئی جنوں
ہاتھ کو جنبش ہوئی اور چاک داماں ہو گیا

آپ کہنے ہی کو کہتی ہوں فسانہ ہجر کا
پھر نہ کہئے گا کہ میرا دل پریشاں ہو گیا

بدنصیبی کی حدیں کیا پوچھتی ہو اے انیس
جس چمن میں دو گھڑی بیٹھی بیاباں ہو گیا

(۳) محترمہ عظمت سلیح :-

جستجوئے راہ باقی ہے نہ منزل کی تلاش
مجھکو خود ہے اب بکھرے ہوئے دل کی تلاش

روک اے ہمدم نہ میری اشک افشانی کو تو
محفل ہستی کو ہے اک شمع محفل کی تلاش

اسلئے کہ جہاں اپنے سوا کوئی نہ ہو
دل کو راہ شوق میں ہے ایسی منزل کی تلاش

شوق میں بھٹکے پھریں کیوں کسی جستجو ہوئے دشت
ہر طرف ہے ہر نظر کو اپنے محمل کی تلاش

دیدۂ ظاہر سے کب تک دیکھئے انداز دوست
کیجئے اب شمع آب دیدۂ دل کی تلاش

(۴) محترمہ رابعہ پنہاں :-

پھر نئے اپنے زمین و آسماں پیدا کریں
ماورائے لامکاں اپنا جہاں پیدا کریں

پھونک ڈالیں جو حوادث کے خس و خاشاک کو
آتشیں ہوں جو ایسی بجلیاں پیدا کریں

کائنات حسن میں آ جائے جس سے زلزلہ
قعر دل سے وہ نالۂ خونفشاں پیدا کریں

کھیلتے ہو اس شکستہ ساز کے تاروں سے کیا
دل کے ٹکڑے کیا نالۂ دلستاں پیدا کریں

کارگر ہو جائیگا پنہاں کبھی جذب جنوں
نالۂ شبگیر و سوز جاوداں پیدا کریں

(۵) محترمہ کنیز فاطمہ کاش :-

تمہاری یاد سے دل کو سجا کے آئی ہوں
میں در خانۂ الفت بنا کے آئی ہوں

تخیلات کی وادی میں چھپ کے عالم سے
کسی کی گود کو اکثر سجا کے آئی ہوں

وہ لغزش خیزی الفت وہ زندگی کا شباب
حسین ہونٹوں سے اکثر پلا کے آئی ہوں

رخوں پہ آج بھی اک عرق مندمت ہے
گلوں کا رنگ چمن سے اڑا کے آئی ہوں

تو کاش مجھ سے نہ پوچھے شباب کی تفسیر
مرے حبیب میں سب کچھ لٹا کے آئی ہوں

(۶) محترمہ سیدہ اختر :-

کسی کی یاد میں آنسو بہا رہی ہوں میں
حدیث درد محبت سنا رہی ہوں میں

سنبھل زمانۂ حاضر کہ تجھ سے کچھ پہلے
قریب منزل مقصود جا رہی ہوں میں

سنی ہے جب سے خبر ان کی آمد آمد کی
حریم دیدۂ دل کو سجا رہی ہوں میں

ابھی زمانہ نہیں ان کے آزمانے کا
ابھی تو اپنے کو خود آزما رہی ہوں میں

نفس نفس ہے مرا ساز غیب اے اختر
جو سن رہی ہوں جہاں کو سنا رہی ہوں میں

(۷) محترمہ صفیہ رعنا :-

حجابِ محبت اٹھائے گئے ہیں
بڑی شان سے ہم بلائے گئے ہیں

جنہیں ماہ و انجم نہ اپنا سکے تھے
وہ اکثر مرے دل میں پائے گئے ہیں

جوانی کی رت میں نگہ کی زبانی
محبت کے قصے سنائے گئے ہیں

وہ خود ہی علاج محبت کرینگے
جو اک درد دل میں اٹھائے گئے ہیں

رہی اشک سے حاصل عشق رعنا
تری یادیں جو بہلائے گئے ہیں

(۸) محترمہ شافعی بجود :-

پھر داستان دل کو رقم کر رہی ہوں میں
قطرے کو موج بحر میں ضم کر رہی ہوں میں

اچھا ہوا کہ آپ مرے دل میں بس گئے
گھر بیٹھے اب طواف حرم کر رہی ہوں میں

زاہد یہ کیا ہوا مرے ذوق نیاز کو
سجدے جو آج پیش صنم کر رہی ہوں میں

وقت نزع بھی آن سے تصور ہیں بار بار
کیوں عرض التفات کرم کر رہی ہوں میں

آسانیوں کے شوق میں ہے تجو دیوں اسعدؔ
دشواریوں کو اپنے بہم کر رہی ہوں میں

(۹) محترمہ سحاب آغا شاعر :-

ہزار باتیں ہیں دل میں ابھی بتانے کو
مگر زباں نہیں ملتی ہمیں سنانے کو

ہم اہلِ ظرف ابھی کم ہیں، ایک جنسِ لطیف — جنہیں کھُل کے یاد دیا نئے آزمانے کو
وہ آنکھیں آج ستارے تراشتے دیکھیں — جنہوں نے رنگِ تبسم دیا زمانے کو
ہمارے پھول ہمارا چمن، ہماری بہار — ہمیں کو جا نہیں ملتی ہے آشیانے کو
سحاب اتنے تغیر نواز ہیں ہم بھی — کہ اپنے نغموں سے چونکا دیا زمانے کو

(۱۰) **محترمہ ناز:-**

حسن کو عشق راز کیا جانے — سادگیٔ نیاز کیا جانے
ہائے ری سادگی محبت کی — یہ نشیب و فراز کیا جانے
چوٹ سی دل پہ لگ گئی کیسی — نگہہٴ نیم باز کیا جانے
کوچۂ عشق کی کٹھن راہیں — حضرتِ پاکباز کیا جانے

نازؔ کے دل پہ کیا گزرتی ہے
تجھ سا ظالم یہ راز کیا جانے

غزلیں سیکڑوں ہیں، در پیشکش کی دسترس کے اندر ہیں مگر جب کسوٹی پر ذرا سا گھس کر محض ایک زعفرانی لکیر سے اہلِ نظر سونے کے کھرا کھوٹا ہونے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو کیا یہ دس غزلیں اور غزل کے یہ پچاس شعر دیکھکر بھی یہ نہیں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جسکا اٹھان یہ ہے اُس کی جوانی کیا ہوگی؟

پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں ان غزلوں پر اجمالی حیثیت سے اور بعض اشعار پر انفرادی طور سے اپنے مختصر خیالات بھی پیش کردوں گا اس لئے کہ تقریباً کل غزلیں معیاری ہیں اور اس کے بعض بعض شعر قیامت کے ہیں مگر اب میں نے اس سے گریز کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

اظہارِ رائے سے ہر حیثیت سے اس کے ارتقائی پہلو پر بُرا اور ناگوار اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا ان غزلوں سے اکتسابِ لطف کے لئے میں نے قارئین کے مختلف الیسفد مذاقِ ادب کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اب آپ انکو دیکھکر فیصلہ کریں کہ "غزل" کا مستقبل "تاریک" ہے یا "روشن"۔ اور "غزل" کا دور ختم ہو چکا یا اب شروع ہوا ہے ✽

صورتیں! — زیب عثمانیہ

انساں جو بد ہیں انکی بُری صورتیں نہیں
معیارِ سیرتوں کا کبھی صورتیں نہیں

خود حُسنِ روئے دوست ہے اک طلعتِ خیال
کرتی دلوں میں جلوہ گری صورتیں نہیں

موت و حیات سے ہوا مانوس جذبِ شوق
ملنے کی تجھ سے ورنہ یہی صورتیں نہیں

اے اہلِ حُسن! خوبیٔ سیرت کا بھی خیال
اب منتہائے دید تری صورتیں نہیں

مُنہ میری سمت بزم میں کر کر کے لاکھ بیٹھ
پُر کرسکیں ہیں دل کی کمی صورتیں نہیں

سیرت کی اور بات ہے لیکن یہ بہرِ ماہ
مانوں میں کس طرح کہ تری صورتیں نہیں

اہلِ نگاہ یہ ہے کہ پیشِ نگاہ زیبؔ
سب صورتیں ہیں اور کوئی صورتیں نہیں

آخری وصیت — علی احمد

(ماترلنک کے ایک گیت کا منظوم ترجمہ)

ایک برہا کی ماری سہاگن اپنے پردیسی پی کا انتظار کرتے کرتے جدائی کی تاب نہ لاکر دم توڑ رہی ہے ایسے وقت میں اسکے سرہانے بیٹھی ہوئی سہیلی اس سے چند سوال کرتی ہے جسکا وہ جواب دیتی ہے

اگر وہ لوٹ آئیں تو سہیلی! ان سے کیا بولوں؟
"— یہ کہنا عمر بھر کرتی رہی میں انتظار ان کا"

اگر پوچھا انھوں نے اور پھر مجھکو نہ پہچانا؟
"— تو بہنوں کی طرح نرمی سے کہنا ایک دکھیا ہوں"

اگر پوچھا تمہارا نام ہے کہ ہے کہاں؟ کس جا؟
"— تو خاموشی سے دیدینا انگوٹھی ان کو یہ میری"

اگر پوچھا انھوں نے کیوں مکاں میں ہے یہ ویرانی؟
"— تو جل جل کر بجھی یہ شمع تو ان کو دکھا دینا"

اگر پوچھا سہیلی کو تمہاری کیسے نیند آئی؟
"— تو کہدینا خوشی سے مسکرا کر جان دی اپنی"

ڈاکٹر سر جارج گریرسن

آغا محمد اشرف

۷ مارچ ۱۹۴۱ء کو انگلستان میں ایک ایسے زبردست فاضل اور عالم کا انتقال ہوا کہ جسے شاید ہندوستان میں تو بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن تمام دنیا کے علمی اور ادبی حلقوں میں ہر جگہ اس بزرگ کا نام سنکر لوگ ادب سے سر جھکا لیتے ہیں۔ اس فاضل کا نام سر جارج گریرسن تھا۔ کہ جسنے نصف صدی تک گمنامی کے گوشے میں بیٹھ کر ہندوستانی زبانوں اور بولیوں کی تحقیق کی۔ اور ادبی چھان بین کا ایسا حق ادا کیا کہ آج تک دنیا میں ایک شخص نے تنہا اور بغیر کسی سرکاری امداد کے اتنا زبردست علمی اور ادبی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔

جارج گریرسن ۱۸۵۱ء میں آئرلینڈ کے پایۂ تخت ڈبلن میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں انہوں نے ابتدائی تعلیم پائی اور ڈبلن یونیورسٹی سے سنسکرت اور ہندوستانی زبانوں کی سند لیکر انڈین سول سروس کے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔ یہ آج سے کوئی ستر بہتر سال پہلے کی بات ہے۔ گریرسن کو حکومت نے صوبہ بہار میں تعینات کیا اور قاعدے کے مطابق جائنٹ مجسٹریٹی اور بندوبست کے ضابطے انہیں بہار کے دیہات اور گاؤں میں لے گئے۔ سنسکرت انہوں نے ایک شفیق استاد سے پڑھی تھی اور فاضل استاد نے اس زبان کا انہیں ایسا چسکا لگا دیا تھا کہ فرائض منصبی کی ذمہ داریوں کے باوجود گریرسن کی دلچسپی ہندوستانی زبان اور بہار کی بولیوں سے کم نہیں ہوئی۔ ۱۸۹۶ء میں یہ پٹنہ کے ایڈیشنل کمشنر مقرر ہوکر آئے۔ افسوس کہ اس دور کے بزرگوں میں سے اب کوئی ایسا شخص باقی نہیں کہ جس کی زبانی جوان سال گریرسن کی ان ادبی دلچسپیوں کا حال معلوم ہو سکتا کہ جو پٹنہ کے دورانِ قیام میں ان کی آئندہ علمی زندگی کیلئے بنیادیں قائم کر رہی تھیں۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے کہ عظیم آباد کی علمی فضا نے گریرسن کے توسنِ شوق پہ تازیانے کا کام کیا۔ اور عظیم آباد ہی کی سرزمین پر رہ کر گریرسن کے دل میں اس ادبی کام کو شروع کرنے کی امنگ پیدا ہوئی کہ جو آئندہ نصف صدی تک ان کی زندگی پر اس طرح حاوی رہا کہ صرف موت ہی نے انہیں اس سے چھڑایا۔

ایک لحاظ سے یہ بھی ممکن ہے کہ زبانوں اور بولیوں کی چھان بین اور تحقیق کا شوق گریرسن کو ابتدا ہی سے تھا۔ کیونکہ پٹنہ کی تعیناتی سے دو سال پہلے یعنی ۱۸۹۴ء میں مستشرقین کی ایک بین الاقوامی کانگریس ہوئی۔ اس کانگریس کے سامنے یہ سوال درپیش تھا کہ جن جن ملکوں میں مردم شماری کی جاتی ہے وہاں کے رہنے والوں کی زبانوں اور بولیوں کی ایک فہرست بھی مرتب کی جائے۔ اور اس کانگریس میں گریرسن حکومت ہند کی نمائندگی کرتے گئے تھے۔ اس کانگریس نے گریرسن کو ایسا راستہ سجھا دیا کہ جس پر اب تک بہت کم لوگ چلے تھے اور انہوں نے ۱۸۹۴ء میں اس لکیر کو ایسا پکڑا کہ ۱۹۴۱ء میں مرنے کے بعد اسے چھوڑا۔

۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے گریرسن کو ہندوستانی بولیوں اور زبانوں کی ایک فہرست تیار کرنے کے کام پر مقرر کیا۔ اور گریرسن نے بیس کلرکوں کا عملہ لیکر شملے کے ایک دفتر میں اس زبردست مہم کو شروع کیا۔ لیکن ایک تو پہاڑ کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی، دوسرے گورنمنٹ آف انڈیا کی دفتری فضا علمی اور ادبی کاموں کے موافق نہیں۔ اس لئے ۱۹۰۳ء میں گریرسن پنشن لیکر ولایت چلے گئے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے اپنے کام سے ہاتھ کھینچ لیا۔ لندن جاکر گریرسن نے اس کام کو پھر سے شروع کیا کہ جو یہ شملے میں کر رہے تھے۔ گورنمنٹ نے ایک دفعہ پھر ان کی مالی امداد کرنی چاہی۔ مگر گریرسن کو ایک دفعہ تجربہ ہو چکا تھا کہ اس کام میں سرکاری سرپرستی یا امداد سدِ راہ ثابت ہوگی۔ اس لئے انہوں نے گورنمنٹ کی گراں قدر اعانت اور امداد کو ٹھکرا دیا اور صرف اپنی قلیل پنشن کے سہارے اس عظیم الشان مرحلے کو انجام دینا شروع کیا۔

کچھ عرصے تک ایک اور محقق بھی ان کے مددگار رہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ جو عمارت گریرسن کھڑی کرنی چاہتے تھے اس میں ساجھے کا کام نہیں تھا۔ اس وقت زبانوں کی چھان بین اور بال کی کھال نکالنا بالکل ایک نیا فن تھا۔ اور اس فن کو ایک وقت میں صرف ایک ہی فن کار انجام دے سکتا تھا۔ چنانچہ یہ بندۂ خدا تیس سال تک تن تنہا دن رات اس مہم پر لگا رہا۔ لندن سے تقریباً تیس میل پرے کیمبرلے کی بستی میں ان کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اور اسی گھر میں گریرسن نے بیٹھ کر ہندوستان کی زبانوں اور بولیوں کی مکمل فہرست تیار کی۔

گریرسن نے ایک ایسا کام شروع کیا تھا کہ جس کا نام ہندوستان میں ہم نے بہت کم سنا ہے۔ ہندوستان کی زبانوں اور بولیوں کی فہرست بنانا، علاقے علاقے کے رہنے والوں کا تلفظ معلوم کرنا، پرانے لفظوں کا اتہ پتہ ڈھونڈنا، لفظوں کا گوشت پوست اتار کر بال کی کھال نکالنا، ضلع ضلع اور گاؤں گاؤں کی بولیوں کا آپس میں رشتہ ناتہ معلوم کرکے ان کے لفظوں کا توڑ جوڑ معلوم کرنا، زبانوں کا خاندان

اور قبیلوں میں تقسیم کرنا اور بولیوں کو ٹولیوں اور گروہوں میں بانٹنا۔ مردم شماری کرنے والے انسان کی نسل، ذات پات اور مذہب کا حال پوچھ پوچھ کر کے معلوم کرتے ہیں۔ گریرسن کی مردم شماری عجیب و غریب تھی۔ اس کا تعلق انسانوں سے اتنا زیادہ نہ تھا جتنا کہ انسانوں کی زبان اور زبان کے لفظوں سے تھا۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ بولنے والا ہندو ہے یا مسلمان۔ گریرسن تو یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ جو بات یہ کہہ رہا ہے اس کے لفظ زبان کے کس گھرانے سے ناتہ جوڑتے ہیں۔ اور پھر ان لفظوں کو گرامر کے کس دستور کے مطابق ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔ گریرسن خود لکھتے ہیں کہ زبان اور بولی میں جو فرق ہے اس کا بتانا بہت مشکل ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جو فرق پہاڑ اور ٹیلے میں ہے وہی فرق زبان اور بولی میں ہے۔ مگر بہت سے پہاڑ ایسے ہیں کہ جنہیں آپ بہت بڑا ٹیلہ کہتے ہیں، اور بہت سے ایسے بڑے بڑے ٹیلے ہیں کہ جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سمجھے جاتے ہیں۔

ایک عام سننے والے کے نزدیک جھانسی اور گورکھپور کے کسانوں کی بولی میں کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں ہوگا کیونکہ جھانسی اور گورکھپور کے کسان ایک ہی قسم کے لفظ بولتے ہیں۔ مگر گریرسن کی باریک بین نظر لفظوں کی اس ہم آہنگی سے دھوکا نہیں کھا سکتی۔ انہیں اس گرامر کی تلاش تھی کہ جو گورکھپور کے کسانوں کے جملے جھانسی کے دیہاتیوں کے فقروں سے الگ کرتی ہے۔ اور اسی گرامر کے اصول آگے چل کر زبان کو بولیوں کے کنبوں اور گھرانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

اس عجیب و غریب کام کی وسعت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ گریرسن نے ہندوستان کے شمال میں پامیر کے پہاڑی علاقے سے لیکر جنوب میں گوا کی حد تک تمام ملک کی کوئی بولی اور کوئی زبان ایسی نہیں چھوڑی کہ جو کوئی زندہ انسان بولتا ہو۔ اور آپ اس بولی کا نام ان کی فہرست میں نہ پائیں۔ اسی طرح ہندوستان کے مشرق میں آسام کے جنگلوں سے لیکر شمال مغرب میں ایران۔ افغانستان اور بلوچستان کی سرحد تک ہر علاقے کی بولیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر گریرسن نے ان کی فہرست بنائی۔ ان بولیوں اور زبانوں کی گرامر کے قاعدے دریافت کئے۔ ان بولیوں کا آپس میں رشتہ ناتہ معلوم کیا۔ بولنے والوں کی گنتی گنی۔ ان کا تلفظ پوچھ پوچھ کر لکھا۔ اور حد یہ ہے کہ جس بولی کو تمام ہندوستان میں صرف گنتی کے لوگ بولتے ہیں اسے بھی اپنی فہرست میں شامل کر کے زندہ کر لیا۔

گریرسن کی اس تمام تحقیق کا نتیجہ (Linguistic Survey of India) کے نام سے ۱۸ جلدوں میں چھپ چکا ہے اور شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس گریرسن کی تحقیق کے مطابق ۱۷۹ زبانیں اور ۵۴۴ بولیاں ہندوستان میں بولی جاتی ہیں۔ انہوں نے ان کی فہرست ہی نہیں بنائی بلکہ ان میں سے ہر ایک زبان اور ہر ایک بولی کا شروع سے کھوج لگا کر اس کی پوری تاریخ لکھی۔ سینکڑوں بولیوں کے بولنے والوں کے گراموفون ریکارڈ تیار کئے۔ اور ۳۰ سال کی محنت کے بعد ۱۸ جلدیں چھاپ دیں۔ ہر جلد میں تقریباً ۴۰۰ صفحے ہیں۔ ایک ایک صفحہ معمولی کتاب کے سائز سے تگنا بڑا ہے۔ اور ہر جلد میں بہت سے نقشے، جدولیں اور خاکے بھی شامل ہیں۔

گریرسن کی تحقیق کے مطابق شروع سے ہندوستان کا ملک قوموں اور مختلف قبیلوں کے آنے جانے اور رہنے سہنے کا مرکز بنا رہا ہے: تاریخی اسناد سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ہندوستان میں کوئی ایسی نسل بھی آباد تھی کہ جو نظریۂ ارتقاء کے مطابق تدریجی طور پر ترقی کی منزلیں طے کر کے انسان کہلائی۔ سب سے پہلے ہندوستان میں افریقہ کی ایک حبشی قوم آکر آباد ہوئی۔ لیکن اس قوم کے سب افراد ہندوستان میں اب بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ اور یہاں ان کی یادگار کوئی باقی نہیں۔ البتہ جزائر انڈمان میں ان کی نسل اب تک باقی ہے۔ مگر ان کی گنتی مشکل سے ایک ہزار ہوگی۔ اس کے بعد فلسطین سے ایک قوم ہندوستان آئی۔ ان کے سر لمبے تھے، رنگ کالا تھا۔ اور ناکیں چپٹی ہوئی تھیں اس وقت ہندوستان میں جو نیچ قومیں کہلاتی ہیں یہ اسی قوم کی یادگار ہیں۔ یہ قوم ہندوستان سے لنکا پہنچی۔ اور کچھ اس کے قبیلے برما اور ملایا ہوتے ہوئے آسٹریلیا تک جا پہنچے۔ اس قوم کی قدیم زبان کا ہندوستان میں کوئی نشان نہیں ملتا۔

اس کے بعد گریرسن نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ جو آسٹرک (Austric) بولیاں بولتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر شمالی ہند میں آباد تھے۔ اور تھوڑا بہت ان قبیلوں سے مل جل گئے تھے کہ جو فلسطین سے آکر ہندوستان میں آباد ہوئے تھے۔ آسٹرک بولی بولنے والوں کے بارے میں زیادہ تفصیل سے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ جنوب مشرقی چین سے ہندوستان آئے اور بعض محققوں کا بیان ہے کہ زمانہ قدیم میں یہ قبیلے بحیرۂ روم سے میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق) کے راستے ہندوستان میں آکر آباد ہو گئے۔ مگر یہ سب زمانہ تاریخ سے پہلے کا ذکر ہے۔ یہ قبیلے ہندوستان سے برما میں گئے اور وہاں سے [illegible] اور [illegible] کے آس پاس کے ٹاپوؤں [illegible] ہندوستان میں [illegible] چھوڑ دیا ہے اور [illegible] نہیں بولتی چلی آتی ہیں۔ [illegible] ہیں اس بہان کی

قدیم آسٹرک بولیوں کا اثر ضرور باقی ہے۔ اس کے علاوہ بعد میں جب یہ ڈراوڑی قوموں سے مل جلے تو شمالی ہندوستان میں رہ کر ان کی بولی نے ایک اور رنگ اختیار کر لیا۔ گریرسن لکھتے ہیں کہ اس وقت بھی وسطی ہندوستان اور شمال مشرقی ہندوستان کے جنگلوں اور دور دراز پہاڑی علاقوں میں کہیں کہیں آسٹرک بولی بولنے والے لوگ ملتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد تمام ہندوستان کی آبادی کے مقابلے میں مشکل سے ایک فیصدی کے قریب ہے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کو ایک نہ ایک اور آریائی زبان یا بولی سیکھنی پڑتی ہے۔ چنانچہ ان میں سے اکثر ہندوستانی بنگالی یا پہاڑی زبانیں خوب جانتے ہیں، اور روز مرہ کی زندگی میں یہی زبانیں بول کر کام چلاتے ہیں۔

آسٹرک بولیوں کے بعد ۳۵۰۰ ق۔م میں ڈراوڑی زبانوں کا سراغ ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈراوڑی دو قوموں میں بٹ کر ہندوستان آئے تھے مگر یہ دونوں قومیں بولی ایک ہی بولتی تھیں۔ ان میں سے ایک قوم کا سر چھوٹا تھا اور یہ ایشیائے کوچک سے ہندوستان آئی تھی۔ دوسری ڈراوڑی قوم کا سر لمبوترا تھا اور تہذیب کے اعتبار سے یہ محض درندے نہیں تھے۔ یہ قوم بحیرۂ روم کے ٹاپوؤں سے آئی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی قوم کے دوسرے قبیلے قبل از تاریخ کے زمانے میں یونان جا کر بس گئے تھے۔

ہندوستان پہنچ کر اس قوم نے سندھ اور جنوبی پنجاب میں زمانہ ۳۲۵۰ تا ۲۷۵۰ ق۔م) موہن جوڈارو اور ہڑپا کی تہذیبیں قائم کیں۔ کہ جنکے کھنڈر آج بھی ان کے اعلیٰ تمدن کی سند میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ قوم گنگا کی وادی میں پہنچی اور یہاں آسٹرک بولیاں بولنے والے قبیلوں سے ان کی پہلی دفعہ مٹھ بھیڑ ہوئی اسی قوم کی تہذیب پر ہندو مذہب اور ہندو تمدن کی بنیادیں قایم ہیں۔ بعد میں جب ایرین ہندوستان آئے تو ان ڈراوڑی قوموں نے ایرین قوم کا مذہب اور ان کی زبان قبول کر لی۔ اور اس کے بعد آسٹرک، ڈراوڑی اور ایرین تینوں قومیں شمالی ہندوستان میں ہندو دھرم کے لباس میں نمودار ہوئیں۔

اس وقت شمالی ہندوستان کے رہنے والے طرح طرح کی بولیاں بولتے تھے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ایرین قوم نے اپنی زبان کا رواج عام کر دیا۔ البتہ جنوب میں ایرین قوم کو اس بات میں کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہاں صرف ایک ڈراوڑی قوم آباد تھی۔ چنانچہ آج بھی صرف جنوبی ہندوستان ہی میں ڈراوڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور شمالی اور وسطی ہندوستان میں ان زبانوں کے بولنے والے بہت کم ملتے ہیں۔ آبادی کے تناسب سے اس وقت تمام ہندوستان میں ڈراوڑی زبانیں بولنے والے بیس فیصدی کے قریب ہیں۔

زمانۂ تاریخ کے اعتبار سے اس کے بعد ایرین قوم کا ذکر آنا چاہئے۔ مگر گریرسن نے لسانی تسلسل قائم رکھنے کے لئے پہلے منگولی نسلوں کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ منگولی قبیلے ایرین قوم کے بعد ہندوستان آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قبیلے ایک ہزار سال ق۔م میں شمال مغربی چین سے ہندوستان آئے۔ اور بعد میں کوہ ہمالیہ کو عبور کر کے آسام کے راستے ہندوستان کے کوہستانی علاقوں میں پھیل گئے۔ تہذیب اور تمدن کی دوڑ میں منگولی قبیلے بہت پیچھے تھے۔ اسی لئے ہندوستان کی تہذیب پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ حد یہ ہے کہ جب تک تبتی اور برمی زبانیں ایرین زبانوں سے نہ مل گئیں۔ اس وقت تک انہیں علم و ادب کی ٹکسال میں جگہ نہیں مل سکی۔ چنانچہ نیپال کی آریائی نیپالی زبان اب آہستہ آہستہ قدیم زبان کو ہٹا کر اس کی جگہ لے رہی ہے۔ اور ان منگولی بولیوں کے بولنے والوں کی نسبت تمام ہندوستان کی آبادی کے مقابلے میں ایک فیصدی سے بھی بہت کم ہے۔

سب سے آخر میں گریرسن نے ایرین زبانوں سے بحث کی ہے۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ تین ہزار سال ق۔م میں کچھ انڈو یورپین قبیلوں نے وسطی ایشیا میں کوہ یورال کے دامن میں پناہ لی۔ اور اس علاقے میں آباد ہونے کے بعد تمدن اور تہذیب کے کچھ نشان قائم کئے۔ انہی قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ۲۵۰۰ سال ق۔م میں شمالی میسوپوٹیمیا سے ہوتا ہوا ایران کے راستے ہندوستان آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈراوڑی قوم کی طرح انڈو یورپین بھی دو الگ الگ قبیلوں میں ہندوستان آئے تھے۔ ہندوستان کے مغربی علاقے سے یہ ملک میں گھسے اور طوفان کی طرح پنجاب کے میدانوں اور گنگا کی وادی پر چھا گئے۔ آسٹرک اور ڈراوڑی زبانیں فتحیابوں کی تلوار کے سامنے ماند پڑ گئیں۔ اور آہستہ آہستہ تمام شمالی ہندوستان میں آسام تک اور جنوب میں موجودہ دکن کے شمالی علاقے تک ان کے تصرف میں آ گئے۔ اگر ایرین زبان کا قدیم ترین نمونہ دیکھنا چاہو تو رگ وید میں ملے گا۔ جو غالباً دسویں صدی ق۔م میں مرتب ہوئی۔ اور شاید اس کے کچھ حصے اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ اسی ایرین زبان نے پانسو صدی ق۔م میں سنسکرت کا لباس پہنا اور مذہب کے بازوؤں نے اسے اتنا اڑایا کہ ایک وقت میں تمام ہندوستان۔ برما، ہند چینی۔ ملایا۔ انڈونیشیا اور سنٹرل ایشیا تک پر اس کا قبضہ تھا۔ اس عروج کی معراج یہ تھی کہ تبت، چین، کوریا اور جاپان تک میں لوگ سنسکرت زبان کا مطالعہ فخر سمجھتے تھے۔ اب ڈھائی ہزار سال سے سنسکرت زبان دوسری تمام ہندوستانی زبانوں کے لئے الفاظ کا ذخیرہ مہیا کر رہی ہے۔ اور گریرسن کا قول یہ ہے کہ تمام ہندوستان

جس ایرین زبانوں کا خاندان سب سے بڑا لسانی خاندان ہے ۔ اور اسوقت ۲۵ کرور ۷۰ لاکھ ہندوستانی کوئی نہ کوئی ایسی بولی ضرور بولتے ہیں کہ جسکا سرچشمہ ایرین لسانی خاندان سے نکلتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں ۷۳ فیصدی ہندوستانیوں کی زبان کا تعلق ایرین لسانی شجرے سے ہے ۔

گریرسن نے اس شجرے کو بہت پھیلا کر وضاحت سے دکھایا ہے ۔ مگر میں دلچسپی کے لئے صرف اس کا خاکہ پیش کرتا ہوں ۔ اس خاکے سے گریرسن کے کام کا کچھ اندازہ ہوجائے گا ۔

ا ۔ شمال مغربی گروپ ۔ (۱) ہندکی یا مغربی پنجابی (۸۵ لاکھ بولنے والے)
(۲) سندھی اور کچھی (۴۰ لاکھ)

ب ۔ جنوبی گروپ ۔ (۳) مرہٹی (۲۱ لاکھ)

ج ۔ مشرقی گروپ (۴) اڑیا (۱۱ لاکھ)
(۵) بنگالی (۵ کرور ۳۵ لاکھ)
(۶) آسامی (۲۰ لاکھ)
(۷) بہاری بولیاں (ان میں متھیلی ۔ مگھی اور بھوج پوری شامل ہیں (۳ کرور ۷۰ لاکھ)

د ۔ مشرقی مرکزی گروپ (۸) کوسلی یا مشرقی ہندی (اودھی ۔ بگھیلی اور چھتیس گڑھی) (۲ کرور ۵۴ لاکھ)

ہ ۔ مرکزی گروپ (۹) ہندوستانی (اونچی ہندی ۔ اردو ۔ بانگڑو ۔ برج بھاشا ۔ قنوجی اور بندیلی) (۴ کرور ۱۰ لاکھ)
(۱۰) پنجابی یا مشرقی پنجابی (۱ کرور ۵۵ لاکھ)
(۱۱) راجستھانی گجراتی (ماڑواڑی ۔ مالوائی ۔ جے پوری میواتی) (۱ کرور ۴۴ لاکھ)
بھیلی ۔ (۳۲ لاکھ)
(خمرشا سنری جنوبی ہند میں اور گوجری پنجاب و کشمیر میں اس کے علاوہ ہیں)

و ۔ شمالی یا پہاڑی گروپ (۱۲) مشرقی پہاڑی یا نیپالی (۶۰ لاکھ)
(۱۳) وسطی پہاڑی (گڑھوالی اور کماؤں کی زبانیں) (۱۰ لاکھ)
(۱۴) مغربی پہاڑی بولیاں (چمبہ ۔ کلو ۔ منڈی اور سرمور کی بولیاں) (۱۰ لاکھ)

ز ۔ ہندوستان سے باہر کی زبانیں ۔ لنکا سنہالی اور مالدیپ کے جزیروں کی بولیاں ۔

ح ۔ مشرقی ایشیا اور یورپ کے خانہ بدوشوں کی زبانیں ۔

اس کے علاوہ ایرین گروپ کی ایک اور شاخ علاقۂ درد کی زبان ہے ۔ اس زبان کے خاندان میں شمال مغربی صوبۂ سرحد کے بعید ترین علاقوں کی زبانیں بھی شامل ہیں ۔ مثلاً کاشمیری (۱۵ لاکھ) شینا (۶۸ ہزار) اور چترالی زبانیں ۔

گریرسن نے ایرین گروپ کی دو اور زبانوں کو بھی ہندوستان کی زبانوں میں شامل کیا ہے ۔ ایک تو پشتو کہ جسے صوبۂ سرحد میں ۱۵ لاکھ سے زیادہ آدمی بولتے ہیں ۔ دوسرے بلوچی ۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد گریرسن نے ۷ لاکھ ۲۸ ہزار لکھی ہے ۔

کشمیر کے شمال میں ہنزہ اور گلگت کے علاقے میں نگر ایک مقام ہے کہ جہاں ۲۶ ہزار آدمی ایک عجیب و غریب بولی بولتے ہیں ۔ مگر اب تک کوئی شخص اس بولی کے بارے میں تحقیق نہیں کرسکا ۔ اور نہ آجتک کسی کو اس زبان کی قواعد کے اصول معلوم ہوئے ہیں ۔ اس عجیب و غریب بولی کا نام بورو شسکی ہے ۔

یہاں یہ لکھ دینا بہت ضروری ہے کہ مندرجہ بالا بیان میں بولنے والوں کی تعداد گریرسن نے ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار پر قائم کی تھی ۔ اسلئے ان اعداد و شمار کو اب قطعی تسلیم نہیں کیا جاسکتا ۔

گریرسن نے (Linguistic Survey of India) کی پہلی جلد کے ساتھ زبانوں کی تحقیق و تلاش کے بارے میں ایک دلچسپ مقدمہ بھی لکھا ہے ۔ اس مقدمے میں یہ لکھتے ہیں کہ زبانوں کی تحقیق کا کام سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے شروع کیا تھا ۔ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان کے وزیر جناب آصف اپنے آقا کے حکم کے مطابق تمام دنیا کی زبانوں کی فہرست بنانے پر مقرر ہوئے ۔ ایک عرصے کی تگ و دو کے بعد جب انہوں نے اپنا فرض ادا کرلیا تو حضرت سلیمان کی جناب میں حاضر ہوئے ۔ اور ایک ایک کر کے جناب آصف نے سب زبانوں کی تاریخ اور ان کا تلفظ حضرت سلیمان کو سنانا شروع کیا ۔ مگر جب پشتو زبان کی باری آئی تو جناب آصف نے عرض کی کہ اس زبان کا تلفظ ادا کرنے سے یہ غلام قاصر ہے ۔ البتہ اس کی نقل پیش کرسکتا ہوں ۔ یہ کہکر انہوں نے ایک ہنڈیا میں کچھ کنکر بھر کر اسے بجانا شروع کردیا ۔ اور کہا کہ پشتو کا تلفظ بالکل ان کنکروں کی آواز جیسا ہے ۔

گریرسن نے اسی مقدمے میں بہت سے لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ جنہوں نے ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں تحقیق کی تھی ۔ مگر ان میں سے اکثر غیر ملکی سیاح تھے اور ان کی تحقیق سائنس کے اصول کے مطابق نہیں تھی ۔ دوسرے یہ سیاح ہندوستانی زبانوں سے پوری طرح سے واقف نہیں تھے ۔ اسلئے بار بار انہوں نے دھوکا کھایا ۔ مثلاً ۱۶۵۵ء میں ایڈورڈ ٹیری نام ایک شخص نے (Voyage to the East Indies) چھاپی تھی ۔ اس کتاب میں ٹیری نے لکھا ہے کہ ہندوستان کی زبان میں بے حد روانی پائی جاتی ہے ۔ اور جو بات ہم انگریزی میں دس منٹ میں کہتے ہیں ۔ وہی بات ہندوستان کے رہنے والے چند لفظوں میں ادا کردیتے ہیں ۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک جج کے سامنے قتل کا مقدمہ پیش ہوا ۔ فاضل جج نے مقدمے کی سماعت کے بعد ملزم کو پھانسی کی سزا دی اور سزا کا حکم سنانے سے پہلے ایک نہایت فاضلانہ

اور طول طویل فیصلہ پڑھ کر سنایا۔ اس فیصلے میں قتل اور خونریزی کے اخلاقی پہلوؤں سے بحث تھی۔ بدقسمت ملزم کے بوڑھے والدین کے غم و اندوہ کا ذکر تھا۔ قانون شکنی کے بُرے نتائج دکھا کر استدلال کیا گیا تھا کہ قتل و غارت تہذیب و ترقی کے منافی ہے۔ یہ تمام فیصلہ انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا۔ جسے فاضل جج نے ایک گھنٹے میں پڑھ کر سنایا۔ اور فیصلہ سنانے کے بعد انگریز جج نے اپنے ہندوستانی اہلمد سے کہا کہ اس کا ترجمہ ملزم کو سنا دیا جائے۔ اہلمد نے ملزم سے کہا۔ "جا بدذات تجھے پھانسی کا حکم ہوا"۔

گریرسن ہندوستان کی ہر زبان اور ہر بولی کو خود سمجھتے تھے۔ اور جب تک انہوں نے ہر ایک بات تحقیق کی حد تک معلوم نہ کر لی اسے اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا۔ اس زبردست محنت کا نتیجہ تمام دنیا کے علمی اور ادبی اداروں نے اپنی نہایت فراخدلی سے دیا۔ دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں ان کے قدموں پر نثار کیں۔ ادبی انجمنوں نے ان کی سرپرستی کے لئے دامن پھیلائے۔ برطانی سلطنت میں سب سے بڑا انعام اور اعزاز آرڈر آف میرٹ سمجھا جاتا ہے کہ جسے صرف ۲۴ آدمیوں کو دیا جاتا ہے۔ اور جب تک ان ۲۴ میں سے کوئی مر نہ جائے اسوقت تک یہ اعزاز کسی اور کو نہیں مل سکتا۔ جارج گریرسن کو ۱۹۲۸ء میں آرڈر آف میرٹ کا اعزاز بھی مل گیا۔ ۱۹۰۹ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے گولڈ میڈل ان کی خدمت میں پیش کیا اور ایک مدت تک یہ اس انجمن کے نائب صدر بھی رہے۔ ۱۹۳۶ء میں گریرسن کی ۸۵ ویں سالگرہ کے موقعے پر تمام دنیا کے مشہور مستشرقوں نے ان کے متعلق مضامین لکھے اور ان مضامین کا مجموعہ کتاب کی شکل میں ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس مجموعے کی ترتیب اور تدوین میں مختلف ملکوں اور قوموں کے باون ادیبوں نے حصہ لیا تھا۔ جو دنیائے ادب کی تاریخ میں اپنی قسم کی پہلی مثال ہے۔

لندن اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کے موجودہ ڈائرکٹر پروفیسر ٹرنر جو سنسکرت زبان کے بہت بڑے فاضل ہیں اور ایک عرصے تک گریرسن کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کیمبرج میں بیان کیا کہ گریرسن کی ۸۵ ویں سالگرہ کے ان باون ادیبوں کی طرف سے یہ ہدیہ لیکر میں ان کے مکان پر گیا۔ تاکہ سالگرہ کی مبارکباد دوں اور اپنے ہاتھ سے یہ تحفہ پیش کروں۔ پروفیسر ٹرنر کا بیان ہے کہ رات کے وقت میں نے گریرسن کے مکان پر دستک دی۔ ملازمہ نے دروازہ کھولا اور میرے آنے کی اطلاع گریرسن کو دی۔ انہوں نے مجھے اپنے مطالعے کے کمرے میں بلا لیا۔ پچاسی سالہ گریرسن ایک میز کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چاروں طرف کتابوں کے انبار تھے۔ میز پر بہت سے مسودے پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں مبارکباد دی۔ مگر انہیں یہ بھی یاد نہیں تھا کہ آج ان کی سالگرہ ہے۔ کتاب کو دیکھکر مسکرائے۔ اور بولے مجھے معاف کیجئے اپنے کام سے مجھے اتنی فرصت کہاں کہ سالگرہ مناؤں۔

زبانوں کی تحقیق کے علاوہ گریرسن نے ہندوستان کے مذہبوں۔ چھتوں اور رسم و رواج کے متعلق بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ بچوں کی لوریوں۔ دیہات کے گیتوں اور جنوں پریوں کے قصوں کو بھی جمع کیا ہے۔ غرض حیرت ہوتی ہے کہ اس مختصر زندگی میں اس شخص نے کتنا زبردست کام کیا ہے۔ سروے کی پہلی جلد کے دیباچہ میں گریرسن لکھتے ہیں۔

"آج تیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا کہ یہ کام میں نے شروع کیا تھا۔ اب دیباچہ لکھنے کے بعد میرا قلم شکر کرے گا کہ اس کام کو انجام تک پہنچانے کی اسے مہلت مل گئی۔ بغیر کسی ایسے انکسار کے کہ جس کی بنیاد تصنع یا بناوٹ پر قائم ہوتی ہے۔ مجھے اپنی کوتاہیوں کا پورا پورا اعتراف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بغیر کسی تعلّی کے میں یہ بھی کہتا ہوں کہ جو کام اس وقت میں نے ہندوستان کے لئے کیا ہے ایسا کام آجتک دنیا میں کسی اور ملک کیلئے کبھی نہیں ہوا۔ برا بھلا جیسا بھی ہو سکا میں نے اسے انجام دیا۔ اب میں اس کام سے رخصت ہوتا ہوں۔ البتہ اتنا مجھے یقین ہے کہ ہندوستان سے محبت کرنے والے اور وہ لوگ کہ جنہیں اچھے اور برے کے پرکھنے کی تمیز ہے۔ میری غلطیوں کو ہمدردی کی نظر سے دیکھیں گے۔ اور جہاں کہیں کوئی اچھی بات انہیں نظر آئے گی اس کی داد دیں گے"۔ (۱۹۲۷ء)

ڈاکٹر سر جارج گریرسن نے زبانوں کی تحقیق کا کام آج سے پچاس سال پہلے اسوقت شروع کیا تھا جبکہ کوئی اس راستے سے واقف بھی نہیں تھا۔ مگر اللہ کا یہ بندہ تن تنہا ایسا زبردست کام کر گیا کہ آج بڑے بڑے ادارے مل کر بھی یہ کام نہیں کر سکتے۔ اور واقعی اس شخص نے ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں ایسا کام کیا کہ دنیا کے کسی اور ملک میں اس قسم کی مثال نہیں ملتی۔ گریرسن کے کام سے سب سے بڑا فائدہ ہمارے ملک کو یہ ہوا کہ زبان کی تحقیق کا راستہ صاف ہو گیا۔ اس راستے کی منزلیں قائم ہو گئیں۔ اب اس راستہ پر چلنے والوں کو کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

اپنا گاؤں

مصنفہ
محمود تیمور

مترجمہ
صلاح الدین قریشی

(افسانہ)

سید آفندی کتاب شیاخات کے گاؤں کا چودھری تھا۔ وہ یہیں ایک کسان باپ کے گھر پیدا ہوا اور اسی گاؤں کے کھیتوں میں پلا بڑھا سوائے کھیتی باڑی کے اسے دنیا کی کسی چیز کی خبر نہیں تھی۔ اس کی زندگی ایک نمبردار کی حیثیت سے شروع ہوئی اور جو کچھ کام اس کے سپرد کیا گیا۔ اس میں اس نے بڑی ہوشیاری اور دلچسپی کا ثبوت دیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ترقی کر کے پٹواری، اور گاؤں کا چودھری بن گیا۔ ایک معمولی کے لئے یہ ایک معراج تھی۔ کہنے کو وہ ان پڑھ تھا، لیکن بڑا زیرک اور عقلمند، قدرت کی طرف سے اسے غیرمعمولی حافظہ عطا ہوا تھا اور وہ زمینوں کی دیکھ بھال اور انتظام ایک تعلیم یافتہ ماہر کی طرح کیا کرتا تھا۔ بچپن سے ہی اس کی ساری زندگی ایک سچے کسان کی طرح گزری تھی۔ اگر کبھی اس کی پاٹ دار آواز کی گرج پر کان لگائے جاتے اور روشن آنکھوں کی گہرائی میں جھانکا جاتا تو دیہات کا پورا منظر آنکھوں میں پھر جاتا: دور تک پھیلے ہوئے گاؤں اپنے چمکتے ہوئے سورج اور گھنے سایوں کے ساتھ یا اپنی تپتی ہوئی لوؤں اور ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ یا اپنے پرسکوں تالابوں اور کشادہ گھاٹوں کے ساتھ یا مویشیوں کی آوازوں اور دیہاتی گیتوں کے ساتھ اس کی آنکھوں کے پردے پر صاف ابھرتے نظر آتے تھے ......!

گاؤں میں اس کا ایک چھوٹا سا گھر تھا جو دوسرے کسانوں کے گھر سے زیادہ کشادہ یا شاندار نہیں تھا۔ اس کے باپ کی زندگی اسی مکان میں گزری، وہ خود یہیں پلا بڑھا اور یہیں اس کی اولاد بھی پروان چڑھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسے کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور اس میں اس طرح رہتا تھا گویا وہ کوئی بہت بڑا محل ہے۔

اس کی تنخواہ بہت زیادہ نہیں تھی، پھر بھی اس کے لئے بہت کچھ تھی۔ آخر وہ اپنی آمدنی کو کس طرح خرچ کرتا؟ اس کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ اس کی بھینس دن بھر آرام سے جنگلوں میں چرتی پھرتی تھی اور کچھ خرچ نہ ہوتا تھا۔ مختلف پرندوں سے اس کا گھر بھرا پڑا تھا۔ اور اس کا باغیچہ جو نہر کے قریب تھا اس میں ہر قسم کی عمدہ اور تازی ترکاریاں اگتی تھیں۔

اب تک اس کے کئی بچے مر چکے تھے اور بیوی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اس پر بھی اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی اور نہ اس کی ہمت ٹوٹنے پائی تھی۔ وہ ایک خوش باش مخلص انسان تھا۔ ہر طرف دور تک پھیلی ہوئی زمین وہ اس طرح نظر ڈالتا تھا جیسے کہ وہ ساری اسی کے قبضہ میں ہے۔ دنیا بھر کے مویشی جو راتوں کو اپنے باڑوں میں بند رہتے ہیں اور دن میں جنگلوں میں پھیل جاتے ہیں

یہ سب اسے اپنے ہی معلوم ہوتے تھے ــــ اور ان سب سے وہ ایک مہربان باپ کی طرح محبت کرتا تھا! وہ سارے دن کھیتوں میں چکر لگاتا پھرتا تھا کسان ہل چلاتے اور بیج ڈالتے رہتے تھے اور وہ ان کو دیکھتا رہتا تھا کبھی وہ کسی کے ہاتھ سے ہل لے کر چلانے لگتا تھا، اس وقت اس کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں اور سانس زور زور سے چلنے لگتا تھا۔ اور کبھی وہ درانتی اٹھا کر پوری قوت اور جوش کے ساتھ زمین پر مارنے لگتا تھا اور پھر نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا اور کہتا تھا "بیٹا! دیکھتے کیا ہو؟ زمین سخت ہے لیکن آج اسے اپنے سے بھی زیادہ سخت انسان سے واسطہ پڑا ہے ......!"

پھر وہ کسانوں سے ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرنے لگتا تھا اور دیر تک معصوم بچوں کی طرح قہقہے لگاتا رہتا تھا۔ اگر کسی کو سستی سے کام کرتے ہوئے دیکھتا تھا تو اچانک اس کے تیور بدل جاتے تھے، آنکھوں سے شرارے نکلنے لگتے تھے! لوگوں کے دل کانپ اٹھتے تھے۔ وہ بھلا کسی کو کام میں سستی کرتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ کام ہی اس کا سب سے بڑا سہارا تھا اور کام ہی سے وہ زندگی حاصل کرتا تھا۔

جب کھانے کا وقت آتا تو اس کے لئے موٹی موٹی روٹیاں، پیاز کی گٹھیاں اور مسکا معمولی کسانوں کی طرح آجاتا اور وہ ان سب کے ساتھ ایک ہی حلقے میں بیٹھ کر اور گھل مل کر کھاتا اور باتیں کرتا جاتا تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہی وہ ایک دم اٹھ بیٹھتا تھا اور اونچی سخت آواز میں پکارنے لگتا تھا:

"اچھا بھائی! اب کام شروع کرو۔"

اس کے بعد ہی لوگ اپنا کام شروع کر دیتے تھے۔ وہ سب پوری محنت سے اپنا کام کرتے رہتے تھے اور بوڑھے کی آواز ہر طرف گونجتی رہتی تھی۔

سورج چھپتے کتاب آفندی گاؤں کو لوٹتا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ خوشی اور اطمینان سے دمکتا نظر آتا تھا اور وہ اپنی ڈھیلی ڈھالی آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھتا جاتا تھا سب سے پہلے وہ مویشیوں کی طرف رخ کرتا تھا اور سب کو اپنی اپنی جگہ بندھا ہوا اور سر جھکائے آرام سے کھاتا ہوا پاتا تھا۔ اس وقت تھوڑے تھوڑے وقفے سے ادھر ادھر ان مویشیوں کے سنسنانے یا اونچی آواز میں سانس لینے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ جب وہ ان کے احاطے میں آتا تو سب کی گردنیں اٹھ جاتی تھیں اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے وہ اس کا خیر مقدم کرنے لگتے تھے۔ کچی کچی گھاس ان کے منہ میں ہوتی تھی اور وہ اسے برابر چباتے رہتے تھے، ساتھ ہی لمبی لمبی

زبانوں سے اپنی چمکتی ہوئی ناک کو چاٹتے جاتے تھے جس سے ان کی چمک اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے کسی کی آواز گونج اٹھتی، کان کھڑے ہو جاتے اور وہ تیز تیز نظروں سے بوڑھے کی طرف گھورنے لگتا اور پھر ایک ایک کر کے ان بھولے بھالے پاکدل مویشیوں کی آوازیں ہر طرف پھیل جاتیں۔ ہر مویشی نرم و نازک آواز میں منمنانے لگتا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے ساتھیوں سے بڑھ جائے اور بوڑھے آقا کا محبت بھرا ہاتھ سب سے پہلے اس کی کمر کو تھپکتا نظر آئے۔

اور اسی وقت بوڑھا اونچی آواز میں ڈانٹنے لگتا:

"ارے! یہ کیا اودھم مچا رکھی ہے تم نے؟"

فوراً سب خاموش ہو جاتے تھے، لیکن گدھا برابر ڈینگتا رہتا تھا اور بوڑھا اسے گھورتے ہوئے کراہتا تھا:

"واقعی تو بالکل گدھا ہی ہے"

یہ سن کر وہ فوراً کھانے کے لئے گردن جھکا دیتا تھا اور آہستہ آہستہ ڈکرانا شروع کر دیتا تھا۔ بوڑھا ایک ایک جانور کے قریب آتا تھا اور کسی کی کمر کو تھپکتا، کسی کے سر پہ ہاتھ پھیرتا جاتا تھا۔ بعض جانوروں پر وہ دلچسپ فقرے بھی کستا جاتا تھا، جنہیں بس وہ یا اس کے حلقے کے آدمی ہی سمجھ سکتے تھے ......

وہ ان سب کو ایک نظر سے دیکھتا تھا۔ جب اچانک اسے محسوس ہوتا تھا کہ کسی کے ساتھ زیادہ محبت کا اظہار ہو گیا ہے تو وہ جلدی سے دوسرے مویشیوں سے نظریں چراتا نکل جاتا تھا۔ شاید وہ ڈرتا تھا کہ کسی کے دل میں اس کی طرف سے شکایت پیدا نہ ہو جائے۔

گھر میں آتا تو چور ہو کر اپنی جگہ پہ آگرتا تھا، لیکن مسکراہٹ برابر اسکے لبوں پر کھیلتی رہتی تھی۔ آخر اس کی اور اس کے بچوں کی انّا، بوڑھی خادمہ اُم آلعنا، اس کے لئے کھانا لاتی اور وہ مزے لے لے کر اسے دن بھر کی کارگزاری سناتا اور کسانوں کے معاملات میں اس سے مشورہ لیتا جاتا تھا۔ جو کچھ وہ کہتی تھی بڑی محبت سے کان لگائے سنتا جاتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ چولھے کی طرف آتا اور اس کے قریب ہی گرم گرم زمین پہ پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتا تھا۔ لیٹے لیٹے چند لمحوں کے لئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا تھا اور سامنے اسے اپنی گذشتہ زندگی کے مختلف مناظر ابھرتے نظر آنے لگتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اسے اپنا گھر بچوں سے بھرا ہوا نظر آنے لگتا تھا اور ان کے شور و غل سے اس کا دماغ گونج اٹھتا تھا۔ پھر ایک دم سے ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ وہ سب بڑے ہو گئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں دلہن بنتی دکھائی دیتیں اور پھر ایک ایک کر کے شادی اور ان کی سسرال کے مناظر اس کی آنکھوں میں پھر جاتے۔ اچانک منظر بدل جاتا اور وہ دیکھنے لگتا کہ کس طرح اس کا اکلوتا لڑکا عبدی

بڑا نامی ڈاکٹر بن گیا ہے اور قاہرہ میں اپنی شاندار کوٹھی میں کیسی ٹھاٹ کی زندگی گزار رہا ہے اور اب وہ اور اُم آلعنا اتنے بڑے گھر میں کیسے اکیلے رہ گئے ہیں۔

بوڑھی انّا اس کے پاس ہی زمین پر بیٹھی رہتی تھی اور وہ برابر اسکی باتیں سنتا رہتا تھا۔ کبھی وہ اس سے اپنے بچپن کے قصّے سنانے کو کہتا تھا اور بڑھیا بیٹھی دیر تک اسے پرانی باتیں سناتی رہتی تھی اور وہ بڑے غور سے سنتا رہتا تھا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ کھیلتی رہتی تھی اور وہ بچپن کے میٹھے میٹھے خوابوں میں ڈوب کر رہ جاتا تھا۔

اچانک کتاب آفندی کی دنیا بدل گئی۔ وہ بہت بری طرح بیمار پڑا اور اس کا لڑکا اسے اپنے ساتھ قاہرہ لے گیا۔ وہاں اس نے اس کا باقاعدہ علاج معالجہ کیا اور آہستہ آہستہ اسے افاقہ ہوتا گیا۔ اب وہ بڑی شان اور آرام کے ساتھ اپنے لڑکے کے پاس رہنے لگا لیکن اس کی وضعداری میں ذرا فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی وہی سچا دیہاتی تھا، ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنے، اور چادر اوڑھے ہوئے! قاہرہ بھر میں اسے سوائے چند مسجدوں اور اہل بیت کی قبروں کے کچھ معلوم نہیں تھا۔ یا پھر وہ اپنے گھر کے قریب حاجی ابراہیم کے قہوہ خانے میں جا بیٹھتا تھا اور وہاں دیر تک حقہ پیتا اور پرسکون خواب دیکھتا رہتا تھا۔

کتاب ایک دن قہوہ خانے میں آیا۔ اس وقت اس نے ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لئے اپنا پرانا چغہ اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ وہ اپنی پرانی جگہ کی طرف لپکا اور قہوہ خانے کے لڑکے نے اسے دیکھ لیا۔ وہ قہوہ اور حقہ لا کر اس کے سامنے رکھ گیا۔ کتاب آفندی نے حقہ پینا شروع کر دیا اور اس کی نظریں اِدھر اُدھر بکھر کر رہ گئیں۔ دور سے اسے حاجی ابراہیم کی آواز سنائی دی۔ اس وقت وہ دل ہی دل میں کچھ باتیں کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس کا سفید سر اور گھنی ڈاڑھی ابھرتی نظر آئی اور وہ چمکدار نم آلود نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جونہی اس کی نظر بوڑھے دیہاتی پر پڑی ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ ایک گوشے سے نکل کر وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چکنی زمین پر چل رہا ہے اور پھسل جانے کا ڈر ہے۔ بوڑھے کے پاس آ کر اس نے محبت بھرے لہجے میں سلام کیا۔ کتاب نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا اور وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ کھانستا رہا اور پھر فوراً گلا صاف کر کے بوڑھے پر نظریں جماتے ہوئے کہنے لگا:

"خدا خیر کرے کیا بات ہے؟"

کتاب آفندی نے نظر اٹھائی اور پھر حقے کا ایک لمبا کش لیکر اس نے بے پروائی سے دھواں اِدھر اُدھر پھیلا دیا اور کہنے لگا:

"میں تو اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں"

"کیوں؟ آخر کیا بات ہے؟"

"بس یونہی"

پھر اس نے ایک اور لمبا کش لیا اور ہاتھوں کو سختی سے ملتے ہوئے کہنے لگا:

"آج چار راتیں گذر چکی ہیں —— بن ہادی مجھے برابر خواب میں نظر آ رہا ہے۔"

حاجی ابراہیم بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا:

"بن ہادی؟"

"ہاں! ہاں! ابن ہادی میں جب آیا ہوں تو بچہ ہی تھا اور اس کے تازہ تازہ پیدائشی بال اس کی پیٹھ پر چپکے ہوئے تھے۔ میری تمنا تھی کہ وہ میری ہی گود میں پلے بڑھے۔"

یہ کہہ کر بوڑھے نے سر جھکا لیا اور چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگیا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خود اپنے ہی سے باتیں کر رہا ہے:۔

"ہاں! بن ہادی، بڑا پیارا بچھڑا ہے اس کی پیدائش کے وقت میں خود موجود تھا شاید کسی کو یقین نہ آئے میں گھنٹوں باڑے میں کھڑا اس کی ماں کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اس دن ذرا خنکی تھی اور بارش بھی ہو رہی تھی۔ پیدا ہونے کے بعد میں نے اس کو اپنے ہاتھوں پہلے لیا۔ وہ سرخ گوشت کا ایک لوتھڑا تھا اور ریشم کی طرح نرم و نازک! میں نے اس کو دیکھا تو وہ اپنی ہیرے جیسی چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا . . . . . یہ بن ہادی جس کو میں اپنے سامنے دودھ پلواتا تھا خود اس کے سونے کا انتظام کرتا تھا اور اسے صحن میں قلانچیں مارتا دیکھ کر پھولا نہیں سماتا تھا۔

وہ پھر خاموش ہوگیا اور تھوڑی دیر کے بعد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا:

میں اپنے گاؤں میں بڑے مزے سے تھا۔ آخر یہ لوگ مجھے یہاں کیوں لے آئے؟ اکثر میرا لڑکا گاؤں آیا تھا اور مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں کھیتی باڑی چھوڑ دوں اور مصر میں اس کے ساتھ سکون و اطمینان کی زندگی بسر کروں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس نے کب مجھے محنت یا کام سے جی چراتے یا اس زندگی کی شکایت کرتے سنا تھا۔ ہمیشہ وہ میرے لئے اس پیشہ کو باعثِ شرم سمجھتا رہا اور ہر طرح اس میں کیڑے ڈالتا رہا۔ وہ اسے برا سمجھتا تھا کہ میں ہر مہینے اس حقیر سی رقم کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا کروں جسے وہ شاید اپنے موٹر ڈرائیور کو بھی دینا پسند نہ کرے سبحان اللہ! کیسی ناشکری ہے۔ وہ شاید یہ بھول گیا کہ اسی معمولی سی آمدنی سے آج میں نے اسے اس درجے پر پہنچا دیا ہے کہ لوگ اس پر رشک کرتے ہیں!"

کتاب آفندی نے سر جھکا لیا اور غم آلود نگاہوں سے زمین کو تکنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر کہنے لگا:

"لیکن بیماری! ہائے! اس بیماری نے تو مجھے بے بس کر دیا ہے۔ ہمیشہ کے لئے اس نے میری کمر توڑ دی ہے اور کسی کام کا نہیں رکھا۔ خدا کی شان ہے! زندگی بھر میں کبھی اس طرح بیمار نہیں ہوا۔ پورے ستر سال تک میں نے بیماری کو کچھ نہیں گردانا، یہاں تک کہ اچانک مجھے معلوم ہوا کہ اس نے ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔ اس موذی مرض سے جان چھڑانے کے لئے میں نے مقدور بھر کوشش کی، لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں برابر محسوس کر رہا تھا کہ میرے گوشت پوست کو گھن لگ گیا ہے اور یہ بیماری آہستہ آہستہ جونک کی طرح میرا خون پیئے جا رہی ہے۔ آخر مجھ میں بالکل طاقت نہیں رہی اور میں نے یقین کر لیا کہ اب موت قریب ہے۔

میرا لڑکا آیا تو میں زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ اس نے مجھے مصر لانے کا فیصلہ کر لیا، اور میں نے کچھ نہ کہا۔ اس وقت میری حالت بالکل ایک بے اختیار بچے کی سی تھی۔ سب مجھے لاد کر اسٹیشن پر لے گئے۔ اس وقت لوگ مجھے الوداع کہنے کی غرض سے اِدھر اُدھر جمع ہوگئے تھے اور میرے لئے صحت کی دعا کر رہے تھے . . . . . میں دکھ بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور سامنے کھیتوں کا نظارہ میری آنکھوں میں سمایا جا رہا تھا . . . . . اس وقت دور سے مجھے ایک بچھڑے کی آواز آئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دھاردار خنجر میرے کلیجے میں اترا جا رہا ہے۔ میں سوچتا رہ گیا کہ بن ہادی مجھے پکار رہا ہے؟ اور یہ سوچتے سوچتے میری

دو نظمیں

آشا:

میری سسکتی امیدوں پر حسرت چھائی جاتی ہے
جیسے بجھتے انگاروں پر راکھ کی تہہ جم جاتی ہے
پھر بھی بھولی آشائیں انجان ہنسی یوں ہنستی ہیں
جیسے بھاگ کی تاریکی پر دھوا بھی مسکاتی ہے

نراشا:

کالی گھٹا کو چمکا کے بجلی خود جل جاتی ہے
پل بھر کی ہنسی پر جیسے کلی جیون بھینٹ چڑھاتی ہے
سارا جیون آس کی لو میں ایسے بیتا جاتا ہے
جیسے دیپے میں تیل نہ ہو تو بتی جلتی جاتی ہے

قاضی سلیم (علیگ)

ہاتھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے۔

پھر جو ایک دن میں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے کو ایک شاندار کمرے میں نرم و گداز بستر پر پڑا پایا۔ میرے سرہانے ایک عورت بیٹھی تھی جس کا لباس بالکل سفید تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دن گذرتے گئے اور آہستہ آہستہ میں اس قابل ہوگیا کہ اٹھ بیٹھ سکوں۔ میرا لڑکا مجھے مبارک باد دینے آیا اور فرطِ محبت سے میرے ہاتھ چومنے لگا"

کئی دن تک میں اس شاندار کمرے میں مقید رہا ۔ ۔ ۔ ۔ اے خدا! آخر یہ سب کچھ کس لئے؟ کئی کئی نوکر، آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی، اور سارے کمرے کو گرما دینے والے ہیٹر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ میں ایک اجنبی کی طرح گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتا تھا۔ ٹھنڈے سانس لیتا جاتا تھا۔ پھر میں سوچنے لگتا تھا "میرا دیہاتی مکان کیا ہوا؟ وہ چولھے کے قریب کی گرم گرم زمین کیا ہوگئی؟ اور میری دیکھ بھال کرنے والی اُم البنا کہاں چلی گئی؟

آخر میں اس قابل ہوگیا کہ اپنے کمرے سے نکل کر باغیچے میں ٹہل سکوں۔ یہ ایک کشادہ اور خوبصورت باغیچہ تھا۔ لیکن آہ! میرا کھیت! باغیچہ کی دیکھ بھال کرنے والا مالی اور میں دونوں کا عجب حال تھا ہم کسی ایک نقطے پر کبھی ہم خیال نہ ہوسکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں بالکل اجنبی ہیں اور ایک دوسرے کی زبان تک نہیں سمجھ سکتے۔ وہ جب مجھے نظر آتا تھا میں اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے دور دور رہنے لگا۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ سلام دعا بھی بند ہوگئی۔

دن گزرتے رہے اور میں بے کاری کی زندگی گزارتا رہا بعض وقت میں دروازے کے سامنے بیٹھے بیٹھے سارا دن گزار دیا کرتا تھا اور سوچتا رہتا تھا کہ وقت کی رفتار کتنی دھیمی ہے! مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج کا دن بھی ختم نہ ہوگا اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے صدیاں گذر جائیں گی۔ اکثر لوگ میرے پاس آتے تھے اور سوالات کی بوچھار کر دیتے تھے۔ جب انہیں کوئی جواب نہیں ملتا تھا تو وہ چپکے چپکے ایک دوسرے سے کہتے سنائی دیتے تھے "کیا بھونڈ ہے یہ دربان، کچھ سمجھتا ہی نہیں۔

اتنے بڑے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی اس کے باوجود میں کچھ کھویا سا رہتا تھا اور اسی وجہ سے بالکل خاموشی سے سارا دن گزار دیتا تھا تاکہ کچھ سکون مل سکے"

کساب آفندی تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگیا اور پھر حاجی ابراہیم کے قریب جھک کر نیم باز آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہنے لگا:

"کل رات عجیب واقعہ پیش آیا میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بھی سنا دوں شاید تم اس کا کچھ مطلب بتا سکو۔ رات کو کھانا کھا کر میں اپنے کمرے میں آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میں کچھ تھکا ہوا تھا۔ ذرا استانے کے خیال سے میں نے کرسی کے سہارے جھپکا دیا لیکن آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہاں! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں اس وقت میں بالکل جاگ رہا تھا۔ ایک نامعلوم مدت تک میں اپنے خیال کی آنکھوں سے ماضی اور حال کے مختلف مناظر دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے دور سے مجھے کچھ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کوئی قدیم دیہاتی گیت گا رہا تھا۔ یہ وہی گیت تھے جو میں کبھی اپنی جوانی میں گایا کرتا تھا تھوڑی دیر کے لئے میں سراپا گوش ہوگیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ گزری ہوئی جوانی کا نورانی فوارہ میرے دل میں ابل پڑا ہے۔

گانے والے کی آواز آہستہ آہستہ بلند اور قریب ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن یہ آواز کس طرف سے آ رہی تھی؟ کون گا رہا تھا؟ ایک ہی آدمی گا رہا تھا یا بہت سے لوگ مل کر گا رہے تھے؟ تھوڑی دیر بعد سارا کمرہ گونجنے لگا اور مجھے ایک خاص قسم کی خوشی محسوس ہونے لگی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کچھ سائے میری نگاہوں کے سامنے چل پھر رہے ہیں۔ اب میں نے ذرا اور نظریں جما کر دیکھنا شروع کیا۔ یہ میرے گاؤں کے کسان اور ان کی عورتیں تھیں ہر شخص عید کا نیا لباس پہنے ہوئے تھا اور خوش خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ سب سرمئی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ایک ایک کرکے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہونے لگے گویا کمرے کی دیواریں ان سب کو اپنے میں سموئے لے رہی تھیں۔ گانے کی آوازیں بھی دھیرے دھیرے کم ہوتی جا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ بالکل دھیمی پڑ گئیں اور میرے کان کچھ نہیں سن سکتے تھے۔ سارے کمرے میں خاموشی سی پھیل گئی اور میں کرسی سے ان سب کو آوازیں دیتا ہوا اٹھ بیٹھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرے دل کے ٹکڑے اڑے جا رہے ہیں۔ اور دماغ میں کوئی بھٹی سلگ رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آوازیں سن کر میرا لڑکا دوڑا ہوا آیا اور میری دیکھ بھال کرنے لگا۔ اس نے مجھے مسہری پر سلا دیا اور کوئی ایسی دوا پلائی کہ تھوڑی دیر بعد سارے جسم پر بے حسی چھا گئی اور مجھے نیند سی آنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

دوسرے دن شام کو نگا کر کے مکان سے ایک شخص چھپتا چھپاتا نکلا اور بڑی احتیاط سے ادھر اُدھر دیکھتا [illegible] بڑھا یہ شخص بالکل دیہاتی لباس پہنے ہوئے تھا اور اس کے چہرے پر ایک بڑا سا اونی رومال لپٹا ہوا تھا۔ وہ [illegible] لیکن پہنچ کر [illegible]

کے لئے تھرڈ کلاس کا ایک ٹکٹ لیا اور گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ برابر خوفزدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھے جا رہا تھا۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور آہستہ آہستہ خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ انجن سر جھکائے اندھیرے کو چیرتا ہوا بڑھا چلا جا رہا تھا اور رہ رہ کر ٹھنڈے سانس بھرتا جاتا تھا۔ اس وقت ریل اور سارے مسافر بڑی طرح تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور ہر طرف سستی چھائی ہوئی تھی ـــــ لیکن بوڑھے دیہاتی کا چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا۔ وہ برابر جاگ رہا تھا ایک جگہ نچلا نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ گاڑی کی سست رفتاری پر اسے رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح ہوا کی سی تیزی کے ساتھ اُڑنے لگے ـ جب گاڑی کسی اسٹیشن پر رکتی وہ جھٹ کھڑکی سے گردن نکال کر جھانکنے لگتا تھا اور تیز تیز نظروں سے اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈنا چاہتا تھا پھر وہ اپنی جگہ آ بیٹھتا تھا اور آہستہ آہستہ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا جاتا تھا۔ آخر دور سے شیا خانت کی آبادی اندھیرے کی چادر میں لپٹی ہوئی نظر آئی۔ اس وقت ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بوڑھا دیہاتی بغیر دیکھے سمجھ گیا ـــــ جیسے کوئی جانور سونگھ کر اپنے ٹھکانے کو پہچان لیتا ہے۔ ایک دم جھرجھری سی اس کے جسم میں آئی اور اس نے کھڑکی سے گردن نکال دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی تیز تیز نظروں سے رات کے سیاہ پردوں کو چاک کر دینا چاہتا ہے۔ گاؤں کے قریب اس نے اونچے اونچے برج دیکھے بستی کی پرانی اور بوسیدہ جامع مسجد دیکھی۔ آگے بڑھ کر اسے شہتوت کے اونچے اونچے درخت نظر آنے لگے۔ یہ وہی درخت تھے جن کے گھنے سائے میں وہ اکثر سستانے بیٹھ جاتا تھا اور بیٹھے بیٹھے شہتوت توڑ توڑ کر کھاتا رہتا تھا .... پھر بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے جن میں ایک خاص قسم کی خوشبو بسی ہوئی تھی ـــــ یہ وہی ہوا تھی جو زندگی کے ہر دور میں اس کی دمساز رہی اور اس کے جھونکوں کو وہ خوب پہچانتا تھا ......"

گاڑی اسٹیشن پر ٹھہری اور وہ بچوں کی طرح دروازے سے کود پڑا جلدی جلدی ہر چیز کو پھلانگتا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ آگے بڑھا۔ راستہ بالکل سنسان تھا صرف چند چوکیدار ایک جھونپڑے کے آگے پڑے سو رہے تھے اور ان کے آگے الاؤ کے کچھ انگارے رہ گئے تھے جن سے وہ تاپتے تاپتے سو گئے تھے۔ ان میں سے وہ ایک شخص کو پہچان گیا اور تھوڑی دیر کے لئے ان کو ذرا غور سے دیکھنے کے خیال سے ٹھٹک گیا۔ اس طرح انہیں سوتا دیکھ کر اسے کچھ غصہ سا آنے لگا اور چاہتا تھا کہ حسب معمول ان لوگوں کو ذرا لتاڑے لیکن اچانک اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی چمک پیدا ہوئی اور وہ تیزی سے اپنے گھر کی طرف چل نکلا۔ گھر پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور بڑے اطمینان سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ اس وقت فضا میں ایک قسم کی لذت آمیز نشیلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ پاؤں کے نیچے چولھے کی نرم نرم حرارت محسوس ہو رہی تھی اور روٹیوں کی خوشبو دماغ کو معطر کئے دے رہی تھی۔ دور سے اسے اپنا لبادہ لٹکا نظر آیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی اپنے آقا کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ ام آلہنا، چولھے کے پاس ہی پڑی سو رہی تھی اور آہستہ آہستہ خراٹے لیتی جا رہی تھی۔ گھر کی کوئی چیز بھی بدلنے نہ پائی تھی اور سب اس کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ لبادہ اسی طرح لٹکا ہوا تھا، چولھا گرم تھا اور مزیدار بڑی بڑی روٹیاں حسب معمول چنگیر میں بھری رکھی تھیں۔ گویا ام آلہنا ٹھیک سے اس کے آنے کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی۔ کیا واقعی وہ اتنے دنوں قاہرہ میں رہا؟ کیا حقیقتاً اس نے مسلسل چھ مہینے اپنے وطن سے دور گزارے؟

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ام آلہنا نے کروٹ لی اور پھر آنکھیں کھول دیں۔ اسے دیکھ کر وہ ڈر گئی اور جلدی سے اٹھ بیٹھی پھر بیٹھی ہوئی آواز میں وہ بڑبڑانے لگی۔

"کون ہے؟ کون ہے؟"

اس کی چیخ نکلنے ہی والی تھی۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "کیا مجھے بھول گئیں ام آلہنا؟"

اس کی آواز سن کر وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ مارے دہشت کے اس کی پتلیاں جلدی جلدی پھر رہی تھیں۔ اچانک وہ اس کی طرف جھپٹی اور جلدی جلدی اس کے ہاتھ چومنے لگی۔ گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے اور وہ رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی: "مالک! مالک!!"

وہ ذرا دیر ٹھٹک گیا اور بڑھیا اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی: "آپ نے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"مجھے خود اس طرح آجانے کی امید نہیں تھی!"

پھر وہ کھیتی باڑی کے متعلق کچھ باتیں کرنے لگا: بن ہادی اور اس کے ساتھیوں کا حال معلوم کیا، فصل اور پیداوار کے متعلق کچھ باتیں پوچھیں اور پھر کسانوں کے کام کاج اور ان کی محنت کے متعلق کچھ سوال کرنے لگا ....

وہ کان لگائے بڑھیا کی باتیں سن رہا تھا اور بیچ بیچ میں کچھ پوچھتا جاتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اسے برابر جمائیاں اور انگڑائیاں آتی رہیں، یہاں تک کہ آخرکار وہ اونگھنے لگا۔

ام آلہنا، چپکے سے گھر سے نکل گئی۔ وہ بھلا اتنے بڑے راز کو کس طرح اپنے دل میں چھپا سکتی تھی۔ وہ اپنی پڑوسن کے پاس پہنچی اور چپکے سے اسے یہ خوشخبری سنا ڈالی۔

تھوڑی دیر بعد کتاب آفندی کو کچھ شور وغل کی آوازیں سنائی دیں۔ ان آوازوں میں عورتوں کے دیہاتی گیت بھی ملے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

کیفیاتِ شباب

فریادِ جفا ہے ننگِ وفا یوں اُلفت کی تحقیر نہ کر
یا ہاتھ اُٹھالے جینے سے یا دل کو تمنّا گیر نہ کر
رکھ میشِ رہائی پر نہ یقیں بڑھتا ہے جنونِ شوق کہیں
گردن سے علیحدہ طوق نہ کر پانوں سے جدا زنجیر نہ کر
باطل ہیں ترے سب وہم و گماں بیکار ہیں عقل و ہوش یہاں
اس عشق کی اُلٹی دنیا میں تقدیر ہو یہ تدبیر نہ کر
آساں ہے انا العاشق کہنا مشکل ہے غمِ الفت سہنا
اے بے خبرِ تسلیم و رضا اُف منہ سے دمِ تعذیر نہ کر
اک وہ بھی زمانہ آتا ہے جب ہر ظالم پچھتاتا ہے
انجامِ ستم کو سامنے رکھ دل گیر نہ ہو دل گیر نہ کر
ہے مست فریبِ نازِ وفا ہر حال میں رہ راضی بہ رضا
خوش ہے بنائے بوالہوسی اُلفت سے اُسے تعبیر نہ کر
ہر پرسشِ غم پر رو دینا ہے آبروئے غم کھو دینا
یا دعوئ عشق سے باز آ جا یا عشق کی یوں تحقیر نہ کر
ہر لحظہ شاہِ محبت کے بن بن کے بگڑتے ہیں نقشے
اُمید کی خام بناؤں پر ایوانِ وفا تعمیر نہ کر
محشر میں ستمگر سے شکوہ اے دل ہے خلافِ پاسِ وفا
جو ہاتھ اُٹھے ہوں بہرِ دعا اب اُن کو گریباں گیر نہ کر
پُرغم ہیں بہت یہ افسانے کیوں ہوتے ہیں اپنے بیگانے
بس کچھ نہ شباب اس باب میں کچھ منہ بند ہی رکھ تقریر نہ کر

شباب بدایونی

من مالا

من دھرم آتم، من پرم آتم، من ہی سیتا من ہی رام
من ہی مورت، من ہی پجاری، من ہی رادھا من ہی شیام
من ہی بوند اور من ہی ساگر، من ہی اپلا، من ہی موج
من ہی نیا، من ہی کھونیا، اُبھرے ڈوبے، من کی موج
من ہی پھنسیا، من ہی پنچھی، من ہی دانہ، من ہی جال
من ہی بجھائے، من ہی پھنسائے، سب نیاری من کی چال
من ہی جیتا، من ہی جیتا، من ہی سے اندھیارا ہوئے
من کا چھالا پھوٹ بہے تو سگرے جگ اُجیارا ہوئے
امرت کا بھرپور کھجانا بس کا ہے یہ رد کھ پُرانا
یہ بھی من ہے، وہ بھی من ہے، ایک امر اور ایک دِوانا
من ہی میں ہیں رام جھروکے، من ہی میں ہیں ٹھاکر دوارے
من کے بھیتر جوت اُجیتے، من کے ٹولے گھپ اندھیارے
من کی پہیلی من ہی بوجھے اور نہ بوجھے دُوجا کوئے
.... من مورکھ ہی سیس نوائے من چاہے تو پوجا ہوئے
بالی رُت کا بھولا پن بھی، نئی جوانی تیکھا پن بھی
اُٹھتے جوبن چنچل پن بھی، ڈھلتے سورج دھندلا پن بھی
من کی ہیں جیت چور نگاہیں، میٹھی سی رسمور نگاہیں
ڈھیٹھ، چتُر، منہ چور نگاہیں، ات چتورن اُت بان چلائیں
من پوتھی ناسوامی بانچے، من کے روگ نہ بَیدا جانے
من کی دھیر دھرے نا کوئی، اب کیا ہوگا پرماتما جانے

سوامی۔ مارہروی

غزل

برطانوی وفد

دارالعوام میں لیبر جماعت کے لیڈر لارڈ پیتھک لارنس

برطانوی بورڈ آف ٹریڈ کے صدر سر اسٹیمورڈ کرپس

برطانوی وزیر بحر رائٹ آنریبل اے وی۔ الگزنڈر↓

ہندوستان کی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے اور نئے آئین کے واسطے راستہ صاف کرنے کیلئے ۲۰ مارچ کو برطانیہ کا وزارتی وفد انگلستان سے روانہ ہوا۔ یہ وفد لارڈ پیتھک لارنس (وزیر ہند) سر اسٹیمورڈ کرپس (صدر بورڈ آف ٹریڈ) اور مسٹر البرٹ الگزنڈر (وزیر بحر) پر مشتمل تھا۔ وفد نے مقررہ پروگرام کے مطابق ہندوستان کے خاص خاص سر برآوردہ سیاسی رہنماؤں سے گفتگو کی جسکا سلسلہ یکم اپریل سے شروع ہوا۔ سیاسی لیڈروں کے علاوہ اراکین وفد نے صوبہ جاتی وزیروں والیان ریاست کے نمائندوں اور کونسل آف اسٹیٹ کی جماعتوں کے رہنماؤں سے بھی ملاقات کی۔ اسکے علاوہ اراکین وفد نے ملک کے صحافتی نمائندوں سے بھی تبادلۂ خیالات کیا۔

حافظ کے مقبرہ کی نئی عمارت۔ سامنے پہاڑ کے دامن میں شہر شیراز نظر آ رہا ہے۔

شیراز صوبۂ فارس کا صدر مقام ہے۔ اسکی شہرت ادبی دنیا میں اس لئیے خاص طور پر ہے کہ سعدی اور حافظ اسی خطۂ مردم خیز سے پیدا ہوئے۔ یہاں کی آب و ہوا بڑی خوشگوار اور صحت بخش ہے۔ قدرتی مناظر بہت دلکش اور روح افزا ہیں۔ یہاں کے پہاڑوں میں انگور اور درختوں میں سرو زیادہ مشہور ہیں۔ قدیم عمارتیں بھی یہاں بکثرت ہیں۔ ان میں مسجد جامع، مسجد نو، مسجد وکیل، سعدی اور حافظ کے مقبرہ اور بابا کوہی کا مزار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسجد نو اتابک سعد بن زنگی سلغری کی بنوائی ہوئی ہے۔ اور پرانی جامع مسجد عمرو بن لیث کی۔

مسجد نو کے [illegible] چراغ کے گنبد کا کا نظارہ۔

عجیب و غریب جانور

یہ عجیب و غریب جانور آسٹریلیا میں پایا جاتا لیکن بہت کم نظر
آتا ہے۔ پکڑے جانے کے بعد اسنے صرف دو دفعہ بچے دئیے۔

"بونگو"۔ بارہ سنگے کی قسم کا ایک جانور۔ دھاریوں
کی وجہ سے یہ بہت خوبصورت نظر آتا ہے۔ نر اور
مادہ دونوں کے سینگ ہوتے ہیں۔

یہ جانور زرافہ کی قسم میں سے ہے۔ تمام جسم سرخ رنگ
کا ہوتا ہے اور کلے بھورے رنگ کے۔ سب سے پہلی دفعہ
۱۹۰۰ء میں سرایس جانسن نے اسکو پکڑا تھا۔
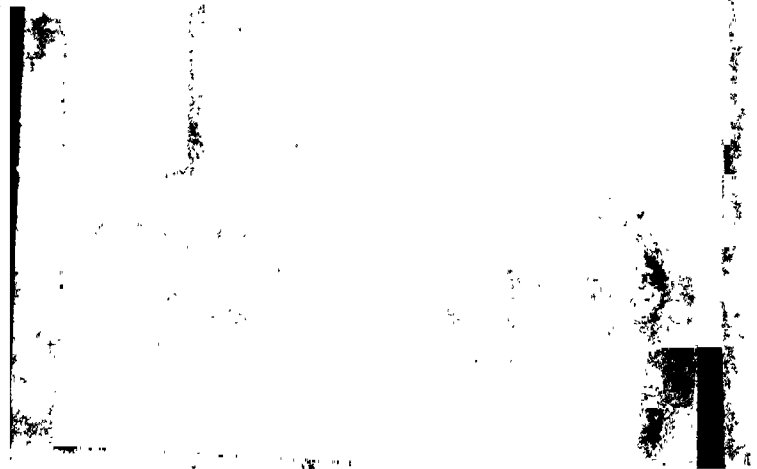
برازیل اور جنوبی امریکہ کا یہ جانور زمین کے
رہتا ہے۔ دم کے علاوہ اسکی لمبائی ایک کر ہوتی
یہ جانور [illegible] لی دفعہ [illegible]

جہانگیری محل۔ یہ م

آگرہ کا شاہی قلعہ

مغل بادشاہوں کا پایہ تخت دہلی سے پہلے آگرہ رہا ہے۔ اس لئے یہاں شاہی زمانہ کی بہت سی تاریخی عمارتیں موجود ہیں۔ فن تعمیر کے شائقین اور تاریخی محققین کیلئے یہاں کا چپہ چپہ دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور دور سے سیاح یہاں آتے اور اپنے اپنے مذاق کو آسودہ کرتے ہیں۔ تاریخی عمارتوں میں جہانگیر کا محل خاص طور پر قابل دید ہے۔ یہ محل سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے اور سنگتراشی اور نقاشی کا ایک بہت ہی عمدہ نمونہ ہے۔ محل کی خاص خاص چیزوں کی چند تصویریں اس صفحہ پر دی گئی ہیں جو ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

جہانگیر

نگینہ مسجد یہ بھی جہا

میں ہے۔ یہ مسجد صرف

حرم شاہی کی خواتین

ہوا تھ
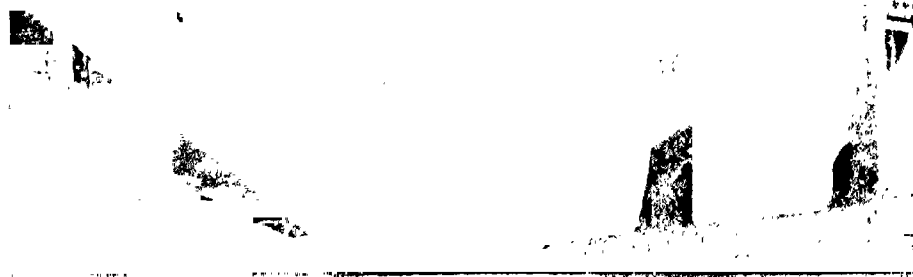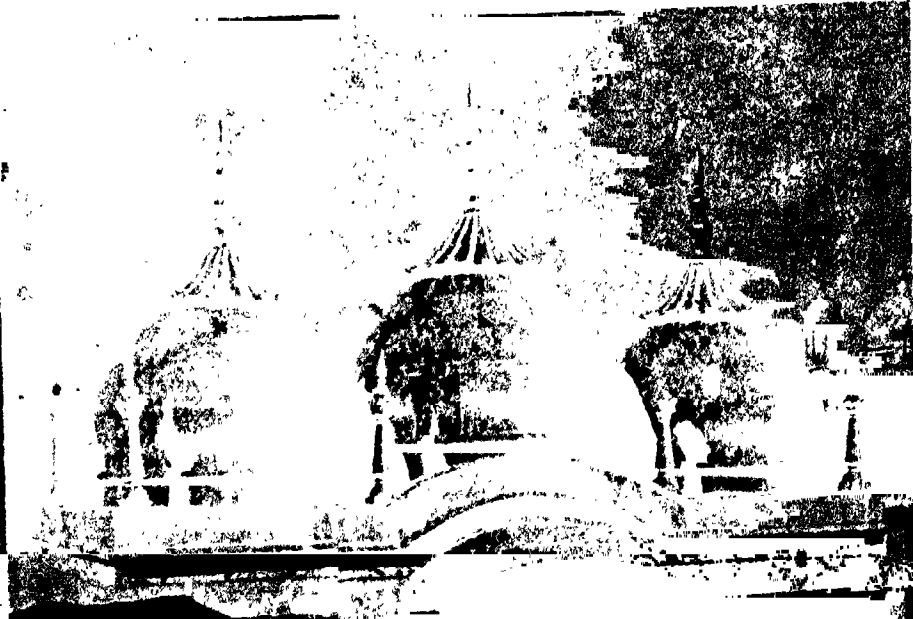
نا ہوا ہے اور اس میں نقش و
ہیں۔
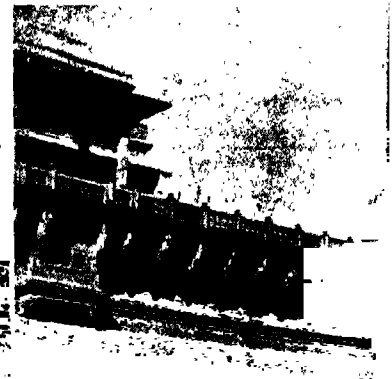
امرسنگھ دروازہ۔ جہانگیری محل کے چار دروازوں میں سے ایک۔ اسکا نام راجہ امرسنگھ
کے نام پر رکھا گیا تھا۔
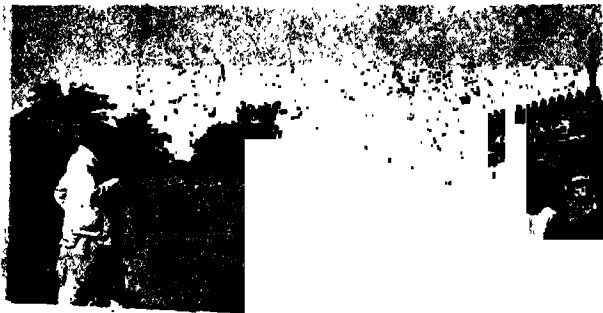
ن کا ایک گوشہ

یہ پیالہ جہانگیر کے مقبرہ
کے سامنے رکھا ہوا ہے۔یہ
پتھر کے صرف ایک ٹکڑے
سے بنایا گیا ہے۔ کہتے ہیں
کہ عطر گلاب پہلے پہل

ہندوستان میں چینی لوگ

...وں کے مدرسہ میں چینی بچے سبق پڑھ رہے ہیں

ایک چینی دوکاندار اپنی دوکان میں بیٹھا ایک چینی اخبار پڑھ رہا ہے۔

...ک چینی لڑکی ایک
...وباری دفتر میں اپنے
...عدات دیکھ رہی ہے۔

...یوار پر ایک چینی
...خبار چسپاں ہے اور
...ہ چینی اسے بڑے
...غور اور شوق سے پڑھ
رہے ہیں۔

ترکی میں تعلیم کا ارتقاء

ترکی میں جدید تعلیم کی ترقی کے مقاصد کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے عثمانی تعلیم کے خاص اصولوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی جاننے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اٹھارہویں صدی سے تعلیم کی ترقی پر مغربیت کس قدر اثر ڈالتی رہی ہے۔

اسلام نے نہ صرف خدا اور انسانوں کے لئے فرد کے فرائض متعین کئے بلکہ ایسے اصول بھی بتائے جن پر انصاف اور تعلیم کے ادارے قائم ہو کر ترقی کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے "قدرت کی نظر میں عالم کی روشنائی اور شہید دل کا خون برابر ہے"۔ اور "والد کا اپنے بیٹے کے لئے سب سے بڑا عطیہ عمدہ تعلیم ہے"۔ اسی لئے سلطان محمد الفاتح نے آٹھ مذہبی مدرسے قائم کئے۔ یہ مدرسے قسطنطنیہ کی ایک مسجد کے اردگرد تھے جسکا نام اسی سلطان کے نام پر ہے۔ اس طرح یہ نیا دار السلطنت تعلیم و تمدن کا مرکز ہوگیا۔ پھر بھی سلیمان باشکوہ (۱۵۲۰ - ۶۶) ہی کے عہد کو عثمانی تعلیم کا سب سے زیادہ شاندار زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ اس سنہری عہد میں اصلاح شدہ مدرسوں کے ذریعہ طب، ریاضیات (جسے قانون کی بنیاد تصور کیا جاتا تھا) سائنس، عربی ادب اور فقہ کی تعلیم خوب ترقی کر رہی تھی، اور ابتدائی تعلیم کے مدرسے قائم ہوئے۔ یہ سلطان عوامی تعلیم کی تنظیم، توسیع اور علوم و فنون کی دور اندیشانہ سرپرستی اور دریادلی کے لئے مشہور ہے۔ اسکی وفات کے بعد یہ مدرسے ملایانہ وعظوں اور سوفسطائیت کے مرکز بن گئے۔ لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ ترکی میں تعلیم کی اسپرٹ قرآن اور یونانی فلسفہ پر مبنی تھی جو عربی کے مسلمان عالموں کے ذریعہ ترکی میں پہنچے تھے۔ ساتھ ہی علماء پر ارسطو کا (جیسا کہ مسلمان فلسفیوں نے اسے سمجھا تھا) اثر باقی تھا جو سلیمان کی یورپ میں وسیع سلطنت کے اثرات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ لوگ اپنے خیالات اور اظہار کو مشرقیت اور روایاتی تعلیم تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ وہ نئے تجربوں کے مخالف تھے اسلئے سولہویں صدی کے آخر اور سترھویں صدی میں جبکہ یورپ میں علم بے انتہا ترقی کر رہا تھا، ترکی اس سے محروم رہا اور یہاں جلد زوال کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

مغربیت کی تحریک کی ابتدا سلطان احمد سوئم (۱۷۰۳ - ۱۷۳۰ء) کے عہد میں ہوئی دوسرے ملکوں میں مصیبتوں اور تباہیوں سے متاثر ہو کر ترقی پسند ترک یہ محسوس کرنے لگے کہ یورپی تہذیب میں کچھ ایسی خوبیاں موجود ہیں جن سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس لئے اصلاحات کا کمزور مگر مستقل مطالبہ کیا جانے لگا۔ عقلمند وزیر اعظم داماد ابراہیم پاشا کی سرپرستی میں، جو بے مغز ترکی تعلیم کے خلاف یورپی تمدن پھیلانے کا خواہشمند تھا، یہاں ادب، سائنس اور فنون ترقی کرنے لگے۔ ہنگری کے نومسلم ابراہیم آغا نے ترکی میں چھاپہ خانہ رائج کر کے اس ترقی کی رفتار میں اور اضافہ کر دیا۔ ترکی کی ترقی فوجی امور پر اور زیادہ اثر انداز ہوئی۔ ایک فرانسیسی امیر کی کوششوں سے جو سلطان کے یہاں ملازم ہوگیا تھا ۱۷۳۴ء میں سکوتری کے مقام پر بحری اسلحہ جات کا ایک سکول قائم ہوا۔

سلطان سلیم سوم حکومت اور تعلیم کی ہر شاخ میں نمایاں اصلاحات کرنے کا متمنی تھا۔ اس لئے اس نے ان اصلاحی کوششوں کو زیادہ عملی صورت دی۔ اس کے عہد کی ابتدا فرانسیسی انقلاب کے سال سے ہوتی ہے۔ اس نے اپنی ساری رعایا کے ہر طبقہ میں تعلیم کا معیار اونچا اٹھانے اور یورپ کی اکثر سائنسی کتابوں کا ترکی میں ترجمے کرانے میں مدد دی۔ وہ یورپ کی ہر قوم کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور میدان جنگ میں ان کی کامیابی کی وجوہات معلوم کرنے کا متمنی رہتا تھا۔ جوانی میں اس نے فرانس کے بادشاہ سے خفیہ ذرائع سے سیاسی ہدایات تک حاصل کیں۔ اس سے کچھ کاموں کی محرک مروجہ دور اندیشی اور رواداری تھی۔ مثلاً جب یونان کے نئے اسکولوں میں یونان کی انقلابی تحریک، نے ترکی کے خلاف جذبات برانگیختہ کرانے کی کوشش کی تو سلیم نے انھیں بند کرنے کے بجائے ایک نیا اور زیادہ عقلمندانہ طریقہ اختیار کیا۔ اس نے یونانی پادریوں کو ملازم رکھ کر ترکی حکومت کے موافق مقالے لکھوائے اور قسطنطنیہ میں یونانی زبان کا پریس قائم کیا۔ اس کے عہد حکومت کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس نے مستقل سفارت خانوں کے ساتھ کام کرنے کے لئے ترکی مشن بھیجے۔ سلطان کی خواہش تھی کہ یورپ کے خاص دار الخلافوں میں ترکی کے سفارت خانے قائم ہوں تاکہ کچھ ترک لندن، پیرس، وائنا اور برلن میں کام کرنے سے ترکی کے مقابلہ میں بہتر سیاسی تعلیم حاصل کر سکیں۔ وہ ہمعصر عام ترکوں کے خیالات سے زیادہ ترقی پسند تھا۔ ترکی کے یورپ سے فاصلہ پر ہونے سے وہاں ان اصلاحات کی قدر نہیں کی گئی بلکہ رجعت پسند "جان نثاروں" نے سلطان سلیم ہی کو قتل کر دیا۔

اس کے جانشین محمود دوم مصلح (۱۸۰۹ - ۳۹) کے عہد میں جبکہ ترکی سلطنت کے بہت سے حصوں میں بلوے ہو رہے تھے اور خود ترکی میں مالی مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ مغربیت کی تحریک کو قوت حاصل ہوئی۔ جان نثاروں کو ختم کر دیا گیا اور ۱۸۲۴ء میں روپیہ کی کمی کے باوجود سلطان نے سب کے لئے لازمی تعلیم کا اعلان کر دیا۔ مخالفت کے باوجود سب سے پہلی مرتبہ ثانوی اسکول اور ایک طبی سکول قائم ہوا۔ سلطان محمود کی ڈیڑھ سو لڑکوں کو یورپ میں تعلیم حاصل کرانے کی پہلی کوشش ناکامیاب رہی لیکن آخر اسلحہ جات کے اسکول کے کچھ افسران اور دوسرے لوگ جن میں ماہر کیمیا درویش پاشا بھی شامل ہیں۔ انگلستان جا سکے۔ سلطان محمود کی بہت سی قومی خدمات میں اپنے جانشین عبدالمجید کی تعلیم بھی

کے آر او اے آر میکسویل سلیپ

قابل ذکر ہے سلطان مذکور کے والد نے ہدایت کی تھی کہ اصلاحات جاری رہنی چاہیں اس لئے نئے سلطان نے والد کی ہدایات پر عمل کیا۔

وہ تاریخی عہد جو عام طور پر "تنظیمات" کہلاتا ہے ۱۸۳۹ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ اس تحریک کو شاہی فرمان میں منظوری دی گئی۔ یہ فرانسیسی فرمان سے مشابہ تھا اس میں ہر شہری کو برابر حقوق دیئے گئے تھے خواہ وہ مسلمان ہو یا نہ ہو ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا گیا۔ ۱۸۴۵ء میں ایک دوسرا اہم حکم صادر ہوا جس کی رو سے ابتدائی اسکول کی تعلیم کو مفت اور ثانوی اسکولوں کی تعلیم جو ابھی تقریباً ناپید تھی، لازمی قرار دی گئی۔ ساری سلطنت کے لئے نئے تعلیمی پروگرام کا اعلان کیا گیا۔ طبی اور فوجی اسکولوں میں اصلاحات ظہور میں آئیں اور نئے ابتدائی اور ثانوی اسکول اور ایک عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس حکمت عملی کو عمل میں لانے اور اس کی نگرانی کے لئے ایک تعلیمی کونسل مقرر ہوئی۔ اگرچہ پرانے مدرسے بدستور رہے لیکن نئے ابتدائی اسکول "علما" کی اجارہ داری سے بے نیاز رکھے گئے۔ ان پر سب سے بڑی مذہبی شخصیت شیخ الاسلام کا بھی اثر نہ تھا۔ ابھی تک تعلیم کو مذہبی اثرات سے بچانے کی کوشش بالواسطہ تھی لیکن ۱۸۶۰ء میں ترقی پسند ماہرین تعلیم نے "عثمانیہ سائنسی سوسائٹی" قائم کرکے ارضی تعلیم کی ابتدا کی۔ اس مقصد کے پیش نظر کچھ معلموں کو یورپ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا تاکہ واپس آکر ترکی کی یونیورسٹی میں پڑھائیں اس کے علاوہ ۱۸۵۹ء میں لڑکوں کا نارمل اسکول اور سیاسی اسکول قائم ہوئے۔ سیاسی اسکول کے قائم کرنے کی غرض یہ تھی کہ شہری خدمات اور نئی اصلاحات کو عمل میں لانے کے لئے لوگوں کو تیار کیا جائے۔

سلطان عبدالمجید کے عہد میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے نسبتی اثرات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ انگریزی اثر جسکا خاص تعلق سر فورڈ کینگ سے ہے، شاید زیادہ سیدھا تھا بلکہ یہ سیاسی میدان تک محدود تھا۔ اس کے خلاف فرانسیسی اثر زیادہ بالواسطہ تھا لیکن ادب اور سیاسی نظریوں پر پڑ رہا تھا۔ اگرچہ سیاسیات اور تعلیم میں مغربی رجحانات کے علمبردار رہنما روسو اور والٹیر کے ساتھ ہی ساتھ مل اور اسپنسر کے اثرات کے بھی معترف تھے۔ پھر بھی نئی تحریک پر جس کے پیشرو شناسی آفندی اور نامق کمال تھے فرانسیسی خیالات و اظہار بیان کے اثرات زیادہ گہرے تھے۔ ضیا پاشا نے روسو کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور جدید فرانسیسی شاعری کا خود شناسی نے جس نے کہ بعد میں ترکی کا پہلا اخبار جاری کیا۔ عبدالعزیز (۱۸۶۰-۱۸۷۶م) کے عہد میں فرانسیسی تعلیمی معاملات میں بہت حصہ لینے لگے۔ فرانسیسی سفیر کی مدد سے ۱۸۶۸ء میں ایک ادارہ قائم ہوا جس میں جدید مضامین فرانسیسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔ اگلے سال تعلیم کے عام قاعدے جو فرانسیسی نمونے کے تھے اور استنبول یونیورسٹی قائم ہوئی۔ کتب خانہ کے لئے کتابیں اور لیبوریٹریوں کا سامان یورپ سے لایا گیا۔ نئے قواعد اور قوانین کی ذریعے تعلیم کے مختلف مدارج یورپی نمونے پر ڈھالے گئے۔ اسکول دو قسموں کے ہوگئے۔ سرکاری اور پرائیوٹ اور تعلیمی نصاب کے تین حصے ہوئے (۱) پرائمری اسکول (۲) ثانوی اسکول اور لیسی (۳) یونیورسٹی کی یا اعلیٰ تعلیم۔ لیکن بدقسمتی سے اصلاحی تحریک جو کہ اتنی تیزی سے بڑھی تھی اس کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی بلکہ اسے کچھ دھکا پہنچا۔ ۱۸۷۱ء میں یونیورسٹی بند ہوگئی اور اس کے لکچر "گلاتا سرائے لیسی" میں ہونے لگے۔

۱۸۵۷ء میں جبکہ تعلیم کی وزارت قائم ہوئی۔ نوجوان ترکوں نے عبدالعزیز کو تخت سے اتار دیا۔ لیکن اسکا فوری اصلاحات کی رفتار کو تیز کرنا نہیں تھا کیونکہ نئے سلطان عبدالحمید نے فوراً لبرل لیڈروں کو ملک سے نکال دیا جو فرانس چلے گئے۔ سلطان عبدالحمید کے مظالم کے باوجود فرانسیسی ارضیت کے اثرات باقی رہے اور ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد آہستہ آہستہ پھر ترقی ہونی شروع ہوئی۔ ایک لڑکیوں کا نارمل اسکول کھولا گیا اور ایک اسکول مسلمان لڑکوں کے لئے وجود میں آیا۔ اسے قومی اسمبلی کے صدر محمود ضیائی نے قائم کیا تھا۔ اس عہد کے شورشوں اور بے اطمینانیوں کے باوجود ۱۹۰۸ء سے جمہوریت قائم ہونے کے وقت یعنی ۱۹۲۳ء تک مذہبی رہنما تعلیمی ترقی میں برابر رکاوٹ ڈالتے رہے۔ اسکی ایک وجہ مدرسوں کا قائم رہنا بھی تھا جن کی بنیاد مذہبی تعلیمات پر تھی اور جنکا بڑا اثر پڑتا تھا۔ اس لئے اس عہد کے سارے تعلیمی اداروں میں حکمت عملی کی کمی اور جھجک کا پتہ چلتا ہے۔ مختلف اسکولوں میں اتحاد نہیں تھا اور ارضی اور مذہبی نظریوں اور تعلیمی طریقوں کے درمیان کشمکش جاری تھی جس پر استنبول میں یونیورسٹی کا قیام اور یورپی ادب کے ترجمے زیادہ اثر نہیں ڈال سکتے تھے کچھ ادارے مثلاً طبی اسکول، یورپی طریقے پر چلتے تھے۔ اس عہد کے تعلیم یافتہ طبقہ پر استنبول کے عمرانیات کے پروفیسر ضیا گوک آلپ اور تعلیمات کی قومی سوسائٹی کے بانی پروفیسر اسماعیل حقی کا بہت اثر تھا۔ انھیں آئندہ اصلاحات کا راستہ صاف کرنے والوں میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

یہاں کمال پاشا کے ابتدائی انقلابی عہد کی تاریخ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خاص تعلیمی ترقیوں کا ذکر کافی ہوگا۔ مذکورہ حالات یعنی ۱۹۲۴ء میں امریکی پروفیسر جان ڈیوی کو ترکی آنے کی دعوت دی گئی تاکہ وہ تعلیم کے متعلق نئی حکومت کو رپورٹ پیش کرے۔ ترکی میں تعلیم کے ادارے کے مقاصد اور نوعیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کے مشورے پر کس حد تک عمل کیا گیا۔ جمہوریت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ جو اب تک حل نہیں ہو پایا تھا ہر شخص کو تعلیم دینے کا تھا جس پر اس مرتبہ پوری توجہ صرف کی گئی۔ دوسرے ملکوں کے ماہرین تعلیم سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لئے وزیر تعلیم نے کچھ ماہرین کے

ساتھ زیکوسلوکیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی اور انگلستان کا دورہ کیا اور بہت سی رپورٹیں شائع کیں۔ ان میں یورپ کے تجرباتی اسکولوں کے متعلق پروفیسر اسماعیل حقی کی رپورٹ بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ ڈنمارک کے عوامی ہائی اسکول، زیکوسلوکیہ کے سوکول اور انگلستان کے تجارتی اور فنی اسکولوں کے متعلق بھی رپورٹیں تھیں۔ سوئزرلینڈ سے بھی مدد مانگی گئی، اور ۱۹۳۲ء میں جنیوا یونیورسٹی کے پروفیسر مالچے سے استنبول یونیورسٹی کی تنظیم کے لئے مشورہ طلب کیا گیا۔ یہ بیرونی تعلقات ابھی جاری ہیں۔ ترکی کے ماہرین تعلیم کا ایک وفد تھوڑا ہی عرصہ ہوا کچھ ہی پہلے اس ملک میں آیا اور کچھ زمانہ سے پروفیسر ایس جے ڈوویز برٹش کونسل کی زیر نگرانی ترکی کی فنی تعلیم کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں حکومت نے ۵۰۰ سے زیادہ طالب علم باہر بھیجے ہوئے تھے اور ان کے مصارف برداشت کر رہی تھی۔

اگرچہ نئی جمہوریت بیرونی مشورہ اور مدد حاصل کر رہی تھی لیکن اتاترک کی حکومت کچھ ایسے پیچیدہ مسائل حل کرنے میں لگی ہوئی تھی جو ترکی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس سے جمہوریت کے مطمح نظر اور مقاصد کا اظہار ہوتا ہے۔ ناخواندگی کو ختم کرنے کے لئے لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا۔ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ ترکی کی وزارت تعلیم نے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں کس قدر ترقی کی ہے۔ یہ اعداد جو ابھی شائع ہوئے ہیں اندازہ پر مبنی ہیں۔

تعلیمی سال	ابتدائی اسکول	استاد	شاگرد
۳۱-۱۹۳۰	۶،۰۰۰	۱۶،۰۰۰	۵۰۰،۰۰۰
۴۱-۱۹۴۰	۱۰،۰۰۰	۱۹،۰۰۰	۹۵۰،۰۰۰
	ثانوی اسکول اور لیسی		
۳۱-۱۹۳۰	۹۰	۱،۵۰۰	۳۰،۰۰۰
۴۱-۱۹۴۰	۲۲۵	۴،۸۰۰	۱۲۲،۰۰۰
	فنی اسکول		
۳۱-۱۹۳۰	-	-	-
۴۱-۱۹۴۰	۶۰	۸۵۰	۱۱،۰۰۰
	یونیورسٹیاں اور کالج وغیرہ		
۳۱-۱۹۳۰	۱۰	۵۰۰	۴،۵۰۰
۴۱-۱۹۴۰	۱۸	۸۰۰	۱۴،۰۰۰

ان اعداد سے صاف ظاہر ہے کہ پچھلے دس برس میں کس قدر ترقی ہوئی اور یہ ترقی ابھی جاری ہے۔ جیسی کہ امید تھی۔ شاگردوں اور استادوں میں پہلی سی نسبت باقی نہ رہ سکی لیکن اس پر زیادہ توجہ صرف نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ بہت سے دیہاتوں میں (۴۰،۰۰۰ سے زیادہ آبادی کے ۴۰،۰۰۰ دیہات ہیں) ایک خاص قسم کے ابتدائی اسکول ہوتے ہیں جو "معتمن" اسکول کہلاتے ہیں۔ اس قسم کے ۵،۰۰۰ سے زیادہ اسکول ہیں جن میں ۱۵۰،۰۰۰ طالب علم پڑھتے ہیں اور ان میں استاد بھی دیہاتی ہی ہیں جو فوجی تعلیم پانے کے بعد یا فوجی تعلیم پانے کی جگہ یا دیہات کے کسی اسکول میں ایک سال ٹریننگ حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پڑھانے کے لئے دیہات میں واپس آتے ہیں۔ اس کے بعد جنگ کی انگریزی ٹریننگ کی اسکیم سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ فروعی باتوں میں اختلافات ہیں لیکن بنیادی باتیں ایک ہی ہیں یعنی تعلیمی اصلاح کے لئے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلم تیار کرنا۔ فروعی باتوں میں البتہ اختلاف ہے۔ اسی طرح پس منظر اور وقت میں اختلاف ہے۔ پھر بھی یہ بات دلچسپ ہے کہ ہر دو حالات میں ٹریننگ کے لئے کم سے کم ایک برس رکھا گیا ہے۔ یہ بات وقت بتائیگا کہ انگلستان اور ترکی میں یہ اندازہ برابر کامیاب ثابت ہو سکا ہے یا نہیں۔

ترکی کے دیہاتی اسکولوں کی تعلیم کی مخصوص اسپرٹ زرعی اور خانگی مضامین پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ اس میں تعلیم اور زراعت کی وزارتیں مل جل کر کام کرتی ہیں اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کی حکمت عملی میں کاشت کو ترقی دیکر دیہات میں معیار حیات کو بلند کرنا شامل ہے۔ جن دیہاتی تعلیمی اداروں کا ذکر کیا گیا ہے اور جن کی ترقی کی کوشش ابھی جاری ہے بڑی حد تک انگلستان کے دیہاتی سینیئر اور ماڈرن اسکولوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ان میں بارہ سے سترہ برس تک کے بچے داخل ہوتے ہیں اور "معتمن" کی ٹریننگ کے ساتھ ہی ساتھ ان میں زرعی اور خانگی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس بات میں وہ انگلستان کے اسکولوں سے مزید مختلف ہیں۔

اگرچہ ترکی کے ماہرین تعلیم کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ہر بچہ اور بالغ کو ابتدائی تعلیم دینا ہے جس میں عام اور عملی تعلیم دونوں شامل ہوں لیکن ثانوی اور فنی تعلیم کو بھی کافی ترقی دی جا رہی ہے۔ ثانوی تعلیم میں مخلوط تعلیم کی طرف زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔ بیرونی ملکوں کی زبانوں، کھیلوں اور کسرتوں پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تین برس تک (بارہ سے پندرہ) مڈل اسکولوں اور اس کے بعد تین برس تک (پندرہ سے اٹھارہ) لیسی میں عام تعلیم دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی مڈل اسکول اور لیسی ایک ہی عمارت میں ہوتے ہیں۔ صنعت کو ترقی دینے کی غرض سے، ترکی میں فنی اور خصوصاً انجینئری کی تعلیم کو خاص اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ وزیر تعلیم ایک انڈر سکریٹری کی مدد سے فنی تعلیم کے عام مسائل پر غور کرتا ہے۔ فنی اسکول تین قسم کے ہیں جن میں تعلیم کے تین مدارج ہوتے ہیں۔ پہلے قسم کے اسکولوں میں لڑکے انجینئری کی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں دوسرے قسم کے اسکولوں میں دوسرے درجے کے انجینئر بنتے ہیں اور تیسرے قسم کے اسکولوں میں تعمیر اور دوسری صنعتوں اور دستکاریوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لڑکے تعمیر اور بڑھئی کے کام میں خاص تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایک قسم کے اسکولوں سے دوسرے قسم کے اسکول میں جانا ممکن ہے اور تعلیم کے ہر درجے سے صنعت میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ایک عجیب اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ

فنی اسکولوں کے لڑکے ایسی چیزیں بنانا سیکھتے ہیں جو تعلیم اور دوسرے اسکولوں اور کالجوں کے کام آتی ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم میں گھریلو کاموں اور پرورش بچگان پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ انقرہ میں لڑکیوں کے گھریلو سائنس کے اسکول کے دو شعبے ہیں۔ اسمیں اس وقت ایکہزار لڑکیاں پڑھتی ہیں جن میں سے تین سو گھریلو سائنس پڑھانے کی ٹرننگ حاصل کر رہی ہیں۔ پہلے شعبے میں گیارہ سے سترہ برس تک کی لڑکیاں ابتدائی اسکولوں سے آکر عام تعلیم کے ساتھ ہر طرح کی گھریلو سائنس بھی سیکھتی ہیں ان کے علاوہ کچھ زیادہ عمر کی لڑکیاں لیڈیوں میں سے آکر گھریلو سائنس پڑھتی ہیں۔ اسکول کے دوسرے حصے میں ترکی بھر کی لڑکیاں جن کی عمر سترہ برس کی ہوتی ہے تین برس میں استانی بننے کی ٹرننگ حاصل کرتی ہیں۔ اسکول کے مختلف شعبوں میں کھانا پکانا، کپڑے دھونا اور سینا (زیادہ تر کام باہر کے لوگوں کا ہوتا ہے) اور بچوں کی پرورش شامل ہیں۔

تجارتی اور فنی تعلیم کے ہر شعبے کی کلاسیں شام کے وقت بھی ہوتی ہیں۔ اس اسکیم میں دور دراز دیہاتوں کے لوگ بھی حصے لے سکتے ہیں۔ دورہ کرنے والے خاص استاد لوہار، بڑھئی کے کاموں اور دوسرے گھریلو مضامین کی عملی تعلیم دیتے ہیں۔

استنبول اور انقرہ یونیورسیٹیوں میں جدید یونیورسٹی کے سارے مفید شعبے ہیں تعلیم کی اس منزل پر زرعی، تجارتی انجنیری کے اسکول، فنون لطیفہ کی سرکاری اکیڈیمی اور موسیقی اور ڈرامے کا اسکول بھی ہے، غازی انسٹیٹوٹ ثانوی اسکولوں کے استادوں کو ٹرننگ بھی دیتا ہے اور بعض تعلیم کے خاص ڈپلومے کے لئے تیار کرتا ہے۔ ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کے دوسرے استاد تین سال تک ٹرننگ حاصل کرتے ہیں جس میں کم سے کم تین مہینے تک پڑھانے کی مشق کی جاتی ہے۔

اس مقالہ میں صرف ترکی میں تعلیم کے تاریخی ارتقا کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسکے مقاصد اور نوعیت کے زیادہ مستند حالات موجودہ وزیر حسن علی یوسل کی مختلف تقریروں میں ملیں گے۔ اس نے کہا ہے کہ "ترکی تعلیم کی ایک بڑی خصوصیت ارضیت ہے۔ ذاتی اعتقادات کا تعلق ضمیر سے ہے اس لئے افراد کے ضمیر پر اثر ڈالنا حکومت کا مقصد نہیں ہے۔ افراد کے ضمیر کی زندگی کے تخلیقی ارتقا کے میدان میں آزاد چھوڑ دینا چاہیئے ...... تعلیم کو ایسا مشورہ اور اثر کیا جا سکتا ہے جو ساری قوم کی خدمت کرنے کے لئے مردوں اور عورتوں کی ذہنی پرورش کرتا ہے۔ یہ اصول عمل اخلاقیات اور مثالیت کا ذریعہ ہونا چاہیئے...... ترکی کی تعلیم کے پس منظر میں قوم پرستی کے جذبات ضرور موجود ہیں۔ ہمارے خیال میں قومیت کا مقصد یہ ہے کہ قوم کی تاریخ اور عروج و زوال سے آئندہ نسلیں متاثر ہوں اور ایسا محسوس کریں گویا یہ سب کچھ ان کی نظروں کے سامنے ہو رہا ہے اور ساتھ ہی ان میں دوسروں سے نفرت کے بغیر اپنی قوم سے محبت کرنے اور قومی خدمت کے جذبات پیدا ہو جائیں .... ہماری سماجی تعلیم کا بنیادی مقصد قوم کی محبت اور اس کے لئے قربانی کے جذبات پیدا کرانا ہے تاکہ ایک شخص دوسروں سے محبت کر سکے۔ ہمارے یہاں انسانیت کا ایک عجیب نظریہ ہے جو ترکی کے سماجی تجزیہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے انسانیت کا نظریہ یونان اور روما کے نظریوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ان سے بہت آگے جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ساری مخلوقات کو تہذیب کے مختلف شعبوں میں انسانی بھلائی کے لئے اپنی تخلیقی قوت کو صرف کرنا چاہیئے۔ اس نظریہ کی وجہ سے ہمارے لیسی اداروں میں یونانی اور لاطینی زبانیں پڑھائی جانے لگیں اور ہم نے اپنی یونیورسٹیوں میں حِتّی، سیمری، مصری اور سنسکرت جیسی زبانوں کے خاص نصاب شامل کئے۔ کھدائی کے وقت ہم حِتّی، یونانی اور رومی تہذیبوں کے آثار قدیمہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے متعلق تاریخ کی تعلیم کو بھی اہم سمجھتے ہیں۔

ترکی میں عجائب خانے صیغۂ تعلیم کا اہم حصہ سمجھے جاتے ہیں اور وزیر تعلیمات کے ماتحت ہیں۔ پچھلے دنوں میں زیادہ عجائب خانے قائم کرنے اور عجائب خانوں کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں نئے معلوم ہونیوالے آثار بھی رکھے جا سکتے ہیں اور یہ بچوں اور بالغوں کو حِتّی تہذیب کے عہد سے بعد تک کی تہذیبوں کے حالات سمجھانے کے بھی کام آ سکتے ہیں۔ ترکی کے حصہ میں حِتّی تہذیب کے بہت سے آثار اور شہر ملتے ہیں۔ اس عمدہ حکمت عملی سے دوسرے ملکوں کے بھی بہت سے طالبعلموں نے فائدہ اٹھایا ہے تعلیم کے اس صیغہ میں اتاترک نے جو دلچسپی لی اسکی وجہ کر "ترکی کی تاریخی سوسائٹی" قائم ہوئی۔ اسکی نگرانی میں ۱۹۳۷ء میں استنبول کے مقام پر آثار قدیمہ کی ایک بین الاقوامی کانگریس منعقد ہوئی۔ آجکل استنبول میں ترکی کے آثار قدیمہ کی انسٹی ٹیوٹ، بزنطینی آرٹ اور آثار کے شعبہ کے صدر (پروفیسر آر بل آفین رنسمین) اور آثار قدیمہ کے مطالعہ کے لئے انقرہ میں جو سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں وہ شاندار مستقبل کا پتہ دیتی ہیں۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ کو وزیر تعلیمات کے ایک اقتباس پر ختم کیا جائے: "ہماری جمہوریت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ قوم کو مغربی تہذیب سکھانا ہے جس نے خصوصاً انیسویں صدی میں سائنس، اقتصادیات، صنعت اور فنون میں اسقدر ترقی کی ہے۔ ہمارے لئے یہ مسئلہ نیا نہیں ہے کیونکہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اور سیاست داں ایک عرصے سے مغربی تہذیب سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود اس زمانہ میں جو لوگ مغربی تمدن کی تحریک کو پھیلا رہے تھے وہ اتاترک کی جمہوریت والی کے برابر مغرب شناس نہیں تھے اور نہ ہی وہ ترکوں کی روحانی صلاحیتوں کو اتنی اچھی طرح سمجھتے تھے ..... جمہوریت کی اسپرٹ نے نظریاتی اور تخلیقی اعتبار سے تاریخ میں ایک نیا رجحان پیدا کیا ہے ...... اب ہم صاف صاف کہہ سکتے ہیں کہ ہماری راہ میں کوئی مشکل حائل نہیں ہے۔ نہ سماجی، اور نہ سیاسی اور اقتصادی جس سے ترک قوم جدید تہذیب میں مناسب مقام

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

نشیب و فراز

افسانہ

تسنیم سلیم چھتاری

پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں اور عمیق غار! کہیں انگڑائیاں لیتی ہوئی چڑھائی اور کہیں شرماتے ہوئے اتار! سب سے زیادہ دلچسپ چیز تو وہ گنگناتا ہوا تال تھا جو پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایسا دھرا تھا جیسے گلاب کی پنکھڑیوں کے درمیان زیرہ ہوتا ہے۔ پھر اس میں رینگتی ہوئی وہ بادبانی کشتیاں جو دور سے ایسی دلکش لگتیں کہ مجھے بے اختیار نیند سی آنے لگتی!

جب رات کے اندھیرے میں ستار کی آواز ماحول کو سحر آلود کر دیتی اور چیڑھ کے درختوں میں سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا کے ساتھ انجم کے راگ بھی فضا میں گونجتے تو میں چپ چاپ اپنا فرکوٹ اٹھا کر باہر نکل آتی اور ایک سرو کے درخت کا سہارا لے کر خود کو الف لیلہ کی کہانیوں والی پری محسوس کرتی۔ آسمان پر تارے بڑی لاپرواہی سے بکھرے ہوئے پلک جھپکا کر مجھے گھورتے اور چاروں طرف کی کوٹھیوں کا برقی عکس پانی میں اس طرح تیرتا جیسے میں کسی اس دنیائے بے رنگ و بو میں نہیں اور نہ کہیں ستاروں سے آگے والے جہان میں! بلکہ ٹھیک ستاروں کی سرزمین میں واقع ہوا ہے جہاں بس تارے ہی تارے ہیں جو آسمان پر چھا رہے ہیں، گرد و پیش چمک رہے ہیں اور تال کے پانی میں لرز رہے ہیں! تارے ہی تارے...... چمکتے مسکراتے لڑکھڑاتے اور اتراتے ہوئے تارے!

انجم کوئی درد بھرا گیت شروع کر دیتی۔ ستار کے تار بھی دکھی دل کی طرح ہنسنے کی کوشش میں آنسو بہانے لگتے۔ مجھ پر غنودگی تاری ہوتی جیسے ؂

اڑا جاتا ہوں سپنوں کی فضا میں
خموشی کے سروں میں گا رہا ہوں

اور ٹھیک ایسے ہی کسی مدہوش لہجے میں.......

"خوب! گویا کہ زہر پی رہی ہو"

"کیسا زہر؟" میرا دل چاہتا کہ آصف کے منہ پر دو عدد تھپڑ جڑ دوں۔

"یہی کہ اس شدت کی سردی میں بے چاری رومان کی ماری ناہید ٹھٹھر رہی ہے۔"

"تمیز سے بات کرو جی" میں وہاں سے بھناتی ہوئی چل دیتی اور وہ اتنے بڑے بڑے قہقہے لگاتا کہ جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی تو چچی جان آتشدان کے پاس بیٹھے بیٹھے سوال کرتیں "ناہید آصف کو کیا ہوا۔ تو بہ کس بری طرح ٹھٹھے مار رہا ہے۔"

"مجھے کیا پتہ؟" اور میں اپنا غصہ اتارنے کے لئے جھٹ کسی بچہ سے مخاطب ہو جاتی۔

"صفو چلو اپنے بستر میں... دس بج گئے۔ ابھی تک جاگ رہی ہو۔"

چچی اکتاتے ہوئے لہجے میں کہتیں: "ہاں بیٹی لے جا خدا کے لئے! اسے اور رضو دونوں کو لے جا..... اور دیکھ ذکی اور رفی دونوں برآمدے میں نکل گئے ہیں ان کو پلنگ میں لٹا دے..."

چچا اخبار کو ایک طرف رکھ کر کہتے "سارا کام ناہید کے سر پڑ گیا ہے انجم تو خیر کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے رہی مگر عارف کو تو چاہیے کہ ذرا بہن بھائیوں کا خیال رکھے۔"

"اور آصف کو نہیں کہتے! وہ جو ہر وقت بچوں سے بڑھ کر شرارتیں کرتا ہے" اس سے قبل کہ چچا عارف یا آصف دونوں میں سے کسی ایک کو بھی کچھ کہیں! رفیق صاحب اپنی خدمات پیش کر دیتے مجھ سے کہتے: "کیا حکم ہے؟" "کچھ نہیں میاں" چچی خوش ہو کر کہتیں "بچوں سے ناطقہ بند ہے اب دیکھو اتنی رات ہو گئی مگر ایک بھی نہیں سویا...... رفی اور ذکی تو باہر گھوم رہے ہیں صفو اور رضو میری جان پر آفت ڈھا رہی ہیں۔"

"میں ابھی پکڑ کر لاتا ہوں" رفیق صاحب اٹھ کر رفی اور ذکی کی تلاش میں چل دیتے اور میں بصد مشکل صفو، رضو کو سلاتی۔ رفیق صاحب دونوں لڑکوں کو زبردستی بستر میں لٹاتے اور گیارہ بجے سے پیشتر یہ جھگڑا ختم نہ ہوتا۔ عارف بھی اسی کمرے میں سوتا تھا۔ اس اچھے خاصے پندرہ سولہ سال کے دودھ پیتے بچے کو ڈانٹ کھائے بغیر پلنگ میں لیٹنے کی عادت نہ تھی۔ رہا آصف تو اللہ بچائے اس قیامت سے۔ وہ خود تو کسی کے بس کا بھوت نہ تھا۔ بیکی ضرور کرتا کہ اچھے خاصے کھیلتے بچوں کو رلا دیتا اور سوتوں کو جگا دیتا۔ اس کا اپنا کمرہ علیحدہ تھا مگر دن رات اسی کمرے میں راج کرتا جس میں چچی جان کے پانچ عدد بچوں کے علاوہ میں بھی پڑی ہوئی تھی!

یوں تو میرے اپنے بھی کئی بہن بھائی تھے اور جب نانی اماں کے ساتھ چلی جاتی تو ان گنت بچے ماموؤں کے گھر میں طوفان اٹھائے رکھتے! مگر اللہ توبہ چچا کے بچوں جیسے بچے تو نہ دیکھے نہ سنے۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک سب یکساں! ہمہ خانہ آفتاب!

انجم سب سے بڑی تھیں، مجھ سے بھی دو سال بڑی! مگر لڑنے کے لئے وہ تین سال کی بہن صفو کو بھی نہ چھوڑتیں۔ سارے بہن بھائیوں سے دن رات تو تو میں میں رہتی! گھر سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ ستار بجانے

اور دامن پر گاتی رہتی تھیں۔ محبت کیا تو یہ کہ سب کے ساتھ کسی کھیل میں حصہ نہ لیا۔

آصف مجھ سے سال بھر چھوٹا تھا مگر اسے بچوں میں شمار کرنا زیادتی ہے۔ ننھی ننھی مونچھیں اور لمبے چوڑے ہاتھ پیر! مگر عادتیں ایسی منحوس کہ ناقابل بیان! وہ بچوں سے مٹھائی چھین کر کھانے سے بھی نہ چوکتا اور بات بات پر چھوٹے بہن بھائیوں کو تھپڑ جڑ دیتا! دنیا کی تمام شرارتوں پر اس کو عبور حاصل تھا اور شیطان کی ساری ہدایات از بر تھیں! سخت بدتمیز، لڑاکا، منہ پھٹ اور بے ڈھنگا!

اس سے چھوٹا عارف جو اگر دیکھا جائے تو سب سے بہتر تھا۔ آصف کے ساتھ مل کر تو نت نئی حرکتیں کر لیتا مگر اکیلا ہوتا تو شریف بنا رہتا۔ میرا تھوڑا بہت ادب کرتا تھا اور کوئی بات کہتی تو مان بھی لیتا۔

رضو کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی مگر اس کو ایک ہی کام آتا تھا اور وہ انجم کی نقل اتارنا! ایسے چلتی ہیں، ایسے بولتی ہیں، ایسے گاتی ہیں اور ایسے اتراتی ہیں صبح سے شام تک وہ باقاعدہ انجم کی حرکات کا مطالعہ کرتی اور پھر رات کو سب بچوں میں بیٹھ کر "انجم آپا" بنتی! آواز بنا کر گاتی اور مٹک مٹک کر چلتی! اگر انجم نے دیکھ لیا تو قیامت آگئی۔ وہ فضیحتہ ہوتا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ مار پٹائی اور گالی کوسنوں تک نوبت آجاتی۔ آخرکار انجم کو کوئی بند کرتا تو وہ رفیق صاحب کا لحاظ اور رضو کو کوئی روکتا تو چچی جان کی جوتیاں ورنہ دونوں اس نیک کام میں ماہر تھیں!

اب رہے رفی، ذکی اور صفو یہ درحقیقت بچے ہی تھے اور ان کی شرارتیں تعجب خیز نہ تھیں! المختصر چچا کے گھر رہ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر روز روزِ قیامت ہے جہاں سب کو نفسی نفسی پڑ رہی ہو!

چچی جان کو مجھ سے تو کچھ ایسا عشق نہ تھا کہ اپنے درجنوں بچوں میں شامل کر کے تعداد بڑھاتیں مگر نینی تال آتے وقت مجبور ہو کر ساتھ لائیں ان کو خیر سے آٹھواں بچہ تولد ہونے والا تھا۔ لہٰذا گھر سنبھالنا دشوار! انجم سے امورِ خانہ داری سے واسطہ ہی کیا! پھر قیامت یہ کہ رفیق صاحب جو انجم سے رشتے کے طلبگار تھے وہ بھی کچھ اپنی عادت، اطوار دکھانے اور کچھ ہونے والی بیوی کے طور طریق ملاحظہ کرنے نینی تال پر ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔

چچی جان کو خوب معلوم تھا کہ اگر رفیق صاحب نے انجم کو منتظمہ کی حیثیت سے سلیقہ بکھیرتے دیکھ لیا تو پھر ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ اسی لئے انجم کو مکمل آزادی دیدی گئی تھی کہ گاتی بجاتی رہیں اور بڑا اچھا ہو کہ بہن بھائیوں سے رفیق صاحب کی موجودگی میں نہ الجھا کریں۔ مگر یہ بات کسی کے بس کی نہ تھی!

رفیق صاحب کو انجم بہت پسند آئی تھیں اور وہ شادی کرنے کے لئے مستعد ہو گئے تھے! انجم بھی اپنی بے نیاز طبیعت کے باوجود رفیق صاحب سے متاثر تھیں اور اس رشتے پر معترض نہیں لگتی تھیں۔ ہم سب کا خیال تھا کہ نینی تال کی واپسی پہلی انجم کو "مسز رفیق" یعنی کہ رفیق صاحب کی رفیقِ حیات بنا دیا جائے گا۔

رفیق صاحب بے چارے ایک نوکر کا کام تو کر ہی لیتے تھے اور ہونے والے ساس سسر کی خوشنودی حاصل کرنے کو دن بھر مصروف نظر آتے۔ بچوں کو سبق دینے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں اور چچا جان کو اخبار پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہم لوگ باہر گھومنے جاتے تو چچی جان کو سہارا بھی رفیق صاحب کے بازو کا لینا پڑتا تھا۔

رفیق صاحب میرا بطور خاص خیال رکھتے تھے اور صبح شام کے سلام مقرر تھے اور ہاں میں ہاں ملاتے رہتے! مجھے اس میں بڑا لطف آتا تھا۔ اکثر کوئی خواہ مخواہ کی بات کہہ دیتی اور رفیق صاحب تائید کرتے تو آصف دخل دینے سے باز نہ آتا۔

"بھئی رفیق صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں جو کچھ ناہید یا انجم آپا کہہ دیں وہ آمنّا صدقنا ..... کچھ اپنے ذہن سے بھی تو سوچا کیجئے"۔

رفیق صاحب حواس باختہ ہو جاتے "آصف مجھے تمہاری طرح ہر ایک سے لڑنا تو مقصود نہیں ہے۔ اگر کوئی صحیح بات کہتا ہے تو کس طرح اعتراض کر دوں"۔

"ارے بس جانتا ہوں! آپ لڑکیوں سے ڈرتے ہیں"۔

میں آصف کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتی اور رفیق صاحب جھینپ کر ہنسنے لگتے۔ آصف میں جہاں اور بہت سی پریشان کن عادتیں تھیں وہاں ایک یہ بھی کہ مجھ سے ہر وقت غیر ضروری قسم کا اظہار عشق کرتا رہتا۔ میں جانتی تھی کہ اسے جہاں بیوقوف بنانے اور ستانے میں مزا آتا ہے وہیں یہ بھی ایک غلیظ مذاق نکالا ہے اور جب اس کا احساس ہوتا کہ کمبخت بیوقوف بناتا ہے تو بے حد جھنجھل آتی کچھ اس لئے بھی برا لگتا کہ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا اور میری خواہش تھی کہ وہ میرا بڑی بہن کی طرح ادب کرے مگر سال بھر بڑی تایا زاد بہن کا وہ کیا خاک ادب کرے گا جو تین سال بڑی سگی بہن کو انگلیوں پر نچاتا تھا۔

ایک مہینہ اسی طرح گذر گیا۔ کبھی کبھی تو اس چیخ پکار کے ماحول سے میرا جی الٹتا اور کبھی اس ہمہ وقت کے ہنگامے سے دل لگ جاتا تھا۔ رفیق صاحب نے بتایا کہ ان کے ایک عزیز دوست انور یہاں آنے والے ہیں اور ہمارے ساتھ ہی ٹھہریں گے! آصف بہت خوش ہوا۔

"بھلا کیسے ہیں وہ آپ کے دوست؟"
"اچھے ہیں"
"شکل؟"
"شکل بھی اور طبیعت بھی"
"خوب کھلواتے ہیں؟"
"ہاں کافی شرارتیں کرتا ہے"
"کیسے لگتے ہیں؟"
"بہت اچھے۔"
"تو ان کے آنے کی یہ نسبت؟"
"یہی کوئی دو چار دن میں پہنچیں گے"
"میرا خیال ہے کہ اُن کو جلد سے جلد آ جانا چاہیے۔"
آصف کا خیال تھا کہ ان کو جلد سے جلد آ جانا چاہیے اور انجم اس خبر سے چڑ سی گئی۔
"بھئی یہ نئی مصیبت کب آنے والی ہے؟"
"کون دوست ہیں رفیق صاحب کے!" میں نے جواب دیا۔
"یہاں ٹھہرنے کو تو نہیں آئیں کہاں ٹھہریں گے؟"
"میں سمجھتی ہوں کہ رفیق صاحب کو اپنے کمرے میں ٹھہرانا پڑے گا۔ اس لئے کہ یہاں تو ایک بھی کمرہ خالی نہیں ہے۔
"مجھے تو کوفت ہو رہی ہے اللہ جانے کس ٹائپ کے ہوں گے۔"
میں نے سوچا کہ یہاں اچھا ٹائپ کس کا ہے اور وہ بھی اسی قرینے کے نکلے تو نور علیٰ نور، ایک بدتمیز کے بڑھنے سے کیا اثر پڑتا ہے۔
ایک شام کو ہم سب خرید و فروخت کے خیال سے چلے۔ انجم اپنا قیمتی پرس ہلاتی ہوئی آگے نکل گئیں اور ان کے پیچھے چچی جان رفیق صاحب کے شانے پر ہاتھ رکھے بڑی آہستہ قدمی سے چل رہی تھیں۔ پھر چچا حسب معمول پائپ کا دھواں اڑاتے ہوئے اور کچھ سوچتے ہوئے۔ چچا کے بعد ان کے بقیہ چھ عدد صاحبزادے صاحبزادیاں بے ڈھنگے پن سے پیر پٹختے اودھم کرتے ہوئے۔ سب سے پیچھے میں تاکہ ہر دو چار منٹ بعد بچوں کو گم ہو جانے کے خیال سے شمار کرتی رہوں۔
آصف رک کر میرے برابر آ گیا۔
"ناہید آج تمہاری ناک کیوں چڑھ رہی ہے؟"
"واہ! خوامخواہ" میں نے سچ مچ ناک چڑھا کر کہا۔
"جھوٹ نہیں کہتا آئینہ دیکھو، اوّل تو خیر تم ہمیشہ کی روتی صورت ہو مگر آج خصوصیت کے ساتھ رونے اور بارہ بج رہے ہیں۔"

"آصف لاکھ مرتبہ کہا ہے کہ تمیز سے بات کیا کرو۔"
"لو میں نے کیا بدتمیزی کی؟"
"اوّل تو مجھے سخت ناگوار ہوتا ہے کہ تم میرا نام کیوں لیتے ہو!"
"پھر کیا کہوں؟"
"آپا یا باجی ... یا ..."
"کلیجہ ... گردہ ... دل ... کیوں؟"
"بیہودہ۔"
"بیہودہ ہوگی تم ... ناہید تم اتنا بگڑتی کیوں ہو؟"
"میں صاف کہے دیتی ہوں آصف! کم از کم میں تو گستاخی برداشت نہیں کر سکتی ... جب دیکھو تم ...."
شرارت سے مسکرایا "ابھی تو گستاخی کی نوبت تو نہیں آئی مگر دل میں یہ ارمان ضرور ہے کہ تمہیں تو سے مخاطب کیا کروں۔"
"دیکھنا میں نے بھی جوتیاں نہ لگائی ہوں تو ..."
گا کر بولا "ہر ستم ہر ظلم گوارا ہے۔"
میں جھنجھلا کر بچوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ رنو عارفہ سے کہہ رہی تھی!
"کاش ہمارے پاس بھی کوئی قیمتی پرس ہوتا تو انجم آپا کی طرح آگے آگے شان سے چلتے ... ذرا دیکھنا کیا ادائیں ہیں۔"
میں نے کہا: "رنو بری بات ہے۔ ہر وقت بڑی بہن کا مذاق نہیں اڑایا کرتے۔"
"اور ہر وقت اپنے جان نثاروں کو نہیں ستایا کرتے" آصف نے میرے کان کے پاس اپنا منہ رکھ کر کہا۔
"پھر تم نے مجھے چھیڑا؟" مجھے غصہ آ گیا۔
"آپ اس طرح بچ کر چلیں گی تو ہم ضرور کچھ نہ کچھ کہیں گے۔"
اس کو تینے کے موڈ میں دیکھ کر میں اس کے ساتھ ہو لی ... اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا میں نے سوچا چلو خیر اسی طرح یہ آدمی بنا رہے۔
"اس طرح تو میں زندگی بھر چل کے گزار سکتا ہوں۔" آصف اور خاموش رہے۔
"کس طرح؟"
"ایسے ہی تمہارا سہارا لے کر ... اچھا ہمسفر ہو تو زندگی کے دشوار گزار راستے میں بھی ذرا پریشانی نہیں ہوتی۔"
"آصف تمہارے منہ سے یہ باتیں ذرا اچھی نہیں لگتیں!"
"کیوں ناہید؟" اس نے میرا چہرہ تکا۔
"ابھی تم بچے ہو آخر ..." میں اس کی دکھتی رگ جانتی تھی۔

بوندوں کو فضاؤں میں جگمگاتے ہوئے برقی قمقمے اور ان سب کا پانی میں تیرتا ہوا عکس . . . . . "

میری شعریت کا جواب دینے کے بجائے انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"کیوں؟ کیوں؟ کیا آپ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ کہنے لگے: "جسے دن رات انجم اور ناہید سے واسطہ پڑتا ہو اس کے لئے ان خاموش تاروں میں کیا رکھا ہے؟"

میں نے کہا: "مگر اس کو کسی سے کیا جو خود ہی مجسم نور ہو"

کوئی چبھتی ہوئی بات کہہ دے تو انور صاحب پھڑک اٹھتے تھے! بے اختیار میرا ہاتھ داب کر کہا: "آپ نے کیا پیاری بات کہی ہے"

اس داد نے مجھے متوحش کر دیا اور میں پلٹ کر بجائے دامن سے جائے زلفن کو آسان دیکھ کر وہاں سے کھسکی۔ برآمدے میں سے گزری تو سنا کہ انجم اب اس نظم کو ختم کر کے جذبی کی ایک غزل الاپ رہی تھیں!

"کیا ماتم ان امیدوں کا جو آتے ہی دل میں خاک ہوئیں
کیا روئے فلک ان تاروں پر دم بھر جو چمک کر ٹوٹ گئے"

اور بھی دل زور سے دھڑکا! اور جب ڈرائنگ روم میں جا کر میں ایک کرسی پر دھم سے بیٹھ گئی تو آصف نے آہستہ سے کہا:

"ناہید تمہارے گال کیسے سرخ ہو رہے ہیں!"

دوسری اور وقت ایسی بات کہتا تو میں اہمیت نہ دیتی مگر اب سچ مچ گھبرا گئی۔ مڑ کر دیکھا تو انور صاحب اطمینان سے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کمرے میں داخل ہو رہے تھے . . . میں نے سٹپٹا کر صفو کو گھسیٹا "بس چلو سونے کو بہت اودھم مچ لیا" اور سب بچوں کو گھیر کر لے گئی!

صبح کو انور صاحب سے ملاقات ہوئی تو رات کی بات کا اثر باقی نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ مچولی شروع ہو گئی جس میں ہم لڑکیوں کی شامت تھی، ہم تو نیچے کھڑے رہ جاتے اور یہ چاروں مزے سے پہاڑ پر چڑھ کر پہاڑ ڈھاتے!

پھر وہ ہنسی ایسی خوفناک ہوتی کہ کانوں کے پردے پھٹنے پر آمادہ نظر آتے۔ ایک تو تیز بھاگنے کا مقابلہ تھا اور دوسرا شاید زور سے ہنسنے کا! میرا خیال ہے کہ اس میں انور صاحب، رفیق صاحب، آصف اور عارف میں سے کسی کو بھی مختلف نمبر نہیں دے جا سکتے تھے اور سب کو حق تھا کہ ایک دوسرے پر فوقیت جتائیں۔

شام کو آصف نے کہا: "چینا پیک چلنا چاہئے"

"ہاتھ ملاؤ جلدی! کیا مزے کی بات کہی ہے۔" انور صاحب خوش ہو گئے۔

"نہیں بھئی کسی کی چڑھائی بڑی ہے" انجم نے کہا۔

"تو کیا حرج ہے لطف رہے گا"

"ہاں کوئی حرج نہیں لطف رہے گا" رفیق صاحب نے میری تائید کر دی۔

"انجم صاحبہ سے گزارش ہے کہ وہ اپنا ستار لے چلیں"

"رفیق سے گزارش ہے کہ اپنی دوربین نہ بھولیں"

"ناہید صاحبہ سے استدعا ہے کہ اپنا کیمرہ ساتھ رکھیں۔"

"آصف سے فرمائش ہے کہ وہ اپنے ننھوں کو نہ بھول یہاں چھوڑ دیں"

"عارف کو حکم ہے کہ وہ میرا سگرٹ کا ٹین اٹھا کر چلیں"

سب کو احکام بانٹ کر انور صاحب نے کہا: "میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی ذات اقدس کو آپ کا راہبر بناؤں گا"

سرتابی کی کسے مجال تھی۔ سب راضی ہو گئے۔ انجم بولیں "تو کیا آپ نے بیک وقت سب کی راہبری کا تہیہ کر لیا ہے؟"

انور صاحب نے جواب دیا "جی ہاں فی الحال تو . . . مگر منزل تک اسی کا ساتھ دوں گا جو اچھا راہرو ہوگا"

"آپ کو راستوں سے واقفیت ہے؟" انجم نے پوچھا۔

"واقفیت؟ نہیں میں واقف تو نہیں۔ مگر سوچتا ہوں کہ بے نیاز ہوش ہو کر بھی اپنے ساتھی سمیت منزل مقصود پا لوں گا"

دوسرے دن گیارہ بجے ہم لوگ چینا کی چوٹی کا عزم کر کے چلے۔ چچی جان ذرا کیا چلتیں۔ چچا نے بھی معذرت کر دی۔ چھوٹے تین بچوں سے بمشکل جان چھڑائی جو ساتھ چلنے پر مصر تھے: رضو کو اپنی غرض سے ساتھ رکھا اور انکو پانی کا تھرماس پکڑا دیا۔ چھوٹی بڑی مختلف الاشکال چیزوں سے لدا پھندا ہم سات آدمیوں کا قافلہ راہیٔ چینا پیک ہوا۔

شروع میں تو خاصی تفریح رہی۔ ہم سڑک چھوڑ کر جھاڑیوں کو پھلانگتے اور پانی کی ٹنکیوں سے کان لگا لگا کر نغمات سنتے آگے بڑھتے گئے۔ کوئی موڑ پر جا کے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور کوئی بے ڈھنگے سروں میں زور زور سے گاتا! مگر تھکن! وہ منہ دکھا کے رہی۔ سب سے پہلے انجم نے کہا "بھئی ہماری تو ٹانگیں دکھ گئیں"

آصف نے منہ بنایا: "واہ انجم آپا، ابھی تو آدھا راستہ بھی نہیں ہوا"

"ہم سے نہیں چلا جاتا" انجم نے صاف جواب دے دیا۔

"آپ میرے بازو کا سہارا لیجئے" رفیق صاحب نے موقع مناسب سمجھا اور انجم کو خدا معلوم بخوشی یا با دل ناخواستہ بہر حال رفیق صاحب کا سہارا لینا پڑا۔

عارف پر کی تھکن سے چہرے کی بے حد لدی ہوئی تھیں اور آصف اطمینان سے ... چپلکا چل رہا تھا۔ رضو نے تھکن اتارنے کو اس کی گردن تھپکی۔ آصف نے منہ بنایا "کھینی رضو تم کو کھینٹنا میرے بس کا روگ نہیں ہے"۔ انور صاحب کہنے لگے۔ "یوں تو سب سے آصف چھوٹی سی لڑکی تک سی ہے۔ اس میں اتنا بوجھ تو نہیں"

آصف نے جب رضو کو برداشت کریں۔

اب میں باقی تھی تو میں نے سوچا مجھے کسی کو اپنے سر منڈھنے کی ضرورت نہیں۔ میں تنہا بھی جاؤں گی۔ مگر انور صاحب نے قریب آکر کہا: "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو" اور اپنے شانے کی طرف اشارہ کیا۔ سینے میں جھجکی مگر منع کرنا بدتہذیبی تھی۔ آہستہ سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور دل میں آپ سے آپ جلتر نگ بجنے لگے! نظر بچی کے اتنی صورت تکی مگر نگاہوں کا زبردست تصادم ہوگیا اور میں نے بلا وجہ سر دکے پیڑ شمار کرنا شروع کر دئے!

انور صاحب آہستہ قدم اٹھا رہے تھے لہٰذا ہم دونوں اور روں سے کافی پیچھے رہ گئے۔

"یہ کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟"

"یہ پہاڑ، یہ پیڑ، یہ وادیاں، یہ آبشار"

"دیکھو کہ اس وقت چودہ طبق روشن ہیں"

میں جھینپ گئی۔ وہ ہنسنے لگے۔

"ادھر دیکھئے نا! ادھر بھی تو یہی سب ہے یہ پہاڑ یہ پیڑ یہ وادیاں یہ آبشار! یہ شرم، یہ مسکراہٹ، یہ جادو، یہ خمار!"

میں نے گھبرا کر ان کے شانہ سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا: "میں تنہا بھی چل سکتی ہوں"

"کیوں؟"

"آپ تھک جائیے گا"

"جی نہیں" انھوں نے میرا ہاتھ بڑے سلیقے سے اپنے شانے پر جماتے ہوئے کہا "کمال کر دیا آپ نے! میں بھلا آپ سے تھک سکتا ہوں"

"ہاں میں بہت وزنی ہوں نا!"

"مگر ناامید میں سمجھتا ہوں ... نہیں میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر آپ تاحیات میرے سہارے چلنے کا وعدہ کریں تو میں اپنی ساری زندگی انہی نشیب و فراز کو خوشی سے طے کرنے میں گزار دوں"

اب شاید میں نے پریشان ہوکر زمین کے کنکروں کا شمار شروع کر دیا تھا۔

"ادھر دیکھئے ... دیکھئے ادھر!" حکماً کہا۔

میں نے دیکھا ... کیا دیکھا، یہ تو معلوم نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ وہاں سے راہ فرار اختیار کی اور لپک کر آصف کے برابر پہنچی۔ اس نے جھٹ سے اپنا دوسرا بازو میری طرف بڑھایا اور میں نے فوراً قبول کر لیا۔

آصف نے ایسی باتیں لا کہ مرتبہ کبھی تھیں اور ہزار مرتبہ میری طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تھا! مگر انور صاحب کی باتیں، ان کی آنکھیں! کچھ بھی ہوں۔ اسے مذاق نہ سمجھ سکی!

دو چار منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ انور صاحب میرے برابر آگئے۔ میں نے غیر ارادی طور پر ان کی طرف دیکھا تو وہ ہونٹ نکال کر منہ لسورنے لگے۔ مجھے ہنسی آگئی۔

پھر دیکھا تو انھوں نے بڑی ملتجیانہ صورت بنائی۔ میں نظر انداز کر کے رضو کی باتیں سننے لگی وہ آصف سے کہہ رہی تھی: "بھائی جان ذرا دیکھنا انجم آپا رفیق صاحب کے سہارے کے بجائے کیسی اچک اچک کر چل رہی ہیں"

"ہش بدتمیز!" میں نے اسے ڈانٹا اور آصف نے قہقہہ لگایا۔ ایک اچٹتی سی نظر انور صاحب کی طرف دوڑائی تو اب کے انھوں نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا اور بے اختیار میرا ہاتھ آصف کے شانے سے پھسل گیا! میں جھک کر جوتوں میں سے بجری نکالنے لگی۔ رضو آصف کو آگے گھسیٹ کر لے گئی تھی اور انور صاحب میرے برابر کھڑے تھے۔ میں سیدھی کھڑی ہوئی تو انھوں نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام کر کہا:

"دست بر دوش غیر نہاد از سر کرم
مارا چو دید لغزش پا را بہانہ ساخت"

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا ... سارے راستے ہم دونوں بالکل خاموش رہے۔ یہ اور بات ہے کہ

"اُن کی خاموشی بھی اک پیغام ہے میرے لئے"

چوٹی پر پہنچ کر دیکھا کہ سہارا لینے والے ہی نہیں۔ سہارا دینے والے بھی درماندہ و خستہ نظر آئے ... میرا خیال تھا کہ میں ایسے راستے دن میں پچاس مرتبہ طے کر سکتی ہوں ... اونہہ یہ ہے نینی تال کی سب سے اونچی چوٹی ... اونچائی تو یقینی بہت محسوس ہو رہی ہے مگر تھکن نہیں! اور راستہ تو بہت ہی مختصر نکلا۔ یہاں پہنچ کر سب نے الم غلم کھانا شروع کیا

رفیق صاحب نے انجم سے کہا: "گانا سنائیے"

انجم گاتی رہی نہ جانے کیا! میں سوچتی رہی نہ جانے کیا ......

بہت دیر بعد انور صاحب نے کہا: "اب تصویر کشی ہونی چاہئے"

میں نے چونک کر کیمرہ سنبھالا! انور صاحب گنگنا رہے تھے۔

"مجھ سے مت پوچھ ترے عشق میں کیا رکھا ہے

سوز کو ساز کے پردے میں چھپا رکھا ہے!"

پھر مجھ سے پوچھنے لگے: "انجم نے مجاز کی یہ چیز بہت اچھی گائی ہے نا؟"

میں نے سوال کیا: "تو کیا انجم ہی گا رہی تھیں؟"

وہ ہنستے ہوئے آگے کی طرف چل دئے اور میں نے تصاویر لینی شروع کیں۔ آصف نے کہا: "ایک تصویر میری اس پتھر پر!"

عارف نے کہا: "ایک تصویر میری یہاں پیڑ کے نیچے"۔

انجم نے کہا: "ایک تصویر میری مع ستار کے"۔

انور صاحب میرے قریب سے گزرتے ہوئے بولے: "ایک تصویر میری بھی۔"

"کہاں؟" میں نے سر اٹھا کر کہا۔

"دل میں"، وہ آصف سے باتیں کرنے لگے اور میں نے سوچا کہ میں تو شاید حکم سے قبل ہی تعمیل کر چکی ہوں ۔ ۔ ۔

اس وقت میں فلم کا نمبر بدل رہی تھی۔ ہاتھ اس طرح کانپے کہ نو کے بعد دس کے بجائے گیارہ لگا گئی ۔ ۔ ۔ اور اپنی بدحواسی پر غور کرتی رہی۔

پھر دوربین کے ذریعے آس پاس کی سیر شروع ہوئی۔

ایک طرف کھڑے ہو کر انور صاحب نے کہا: "آہا کیا پُر لطف نظارہ ہے۔"

"کہاں کہاں؟" میں نے ان سے دوربین چھین کر اپنی آنکھوں پر جما لی۔

"دیکھا؟" انور صاحب نے پوچھا۔

"کہیں بھی تو نہیں ۔ ۔ ۔ ہمیں تو کوئی خاص چیز نہیں نظر آتی"۔

"اپنا قد بھی تو دیکھئے ۔ ۔ ۔ ظاہر ہے کہ میں زیادہ دور دور کی چیزیں دیکھ سکتا ہوں ۔ ۔ ۔ آپ کا بالقول شخصے بوٹا سا قد!"

"واہ"، میں شیخی کے مارے ایک پتھر پر چڑھ گئی جو ذرا سہارے سے ٹکا تھا اور بری طرح ڈگمگایا ۔ ۔ ۔ میں نے کہا اب گئے آسمان سے زمین پر اور گرنے سے پہلے چیخ ماری تھی جو انور صاحب نے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا ۔ ۔ ۔ میں تقریباً ان کے اوپر آ پڑی اور وہ ذرا کنارے کی طرف کھڑے ہوتے تو میں کہہ سکتی تھی کہ میں نے زندگی نہ سہی موت میں ضرور آپ کا ساتھ دیا۔

انھوں نے کہا: "خدا نے خیر ہی کر دی ورنہ آپ تو ۔ ۔ ۔"

میں شرمندگی سے انگلیاں چٹخانے لگی۔

وہ پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگے: "چوک ہو گئی۔ اچھا تھا اگر میں گرتا اور آپ کو ساتھ لے کر گرتا ۔ ۔ ۔ ۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہ جانے کتنی الجھنیں ہیں ناہید"

"مجبوری تو نہیں ہے" میں نے شان استغنا کے ساتھ کہا۔

"آپ نہیں جانتیں۔ کتنا مجبور ہو چکا ہوں"۔

"ٹوٹے ہیں کچھ ایسے کہ نکلتے نہیں پر اب"

اس سے قبل کہ میں کچھ کہوں، آصف نے کان کے پاس چیخ کر کہا:

"واپسی کا ارادہ ہے یا نہیں؟ پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی"۔

واپس ہوئے تو شروع سے ہی آصف نے میرا ہاتھ پکڑ لیا میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی رہی۔ انور صاحب کسی گہری سوچ میں غرق تھے اور میں بھی کسی انجان فکر میں مبتلا۔

ایک شام کو جب چچی معمول سے بھی زیادہ مضطرب نظر آ رہی تھیں تو چچا نے ہم سب سے کہا کہ اگر تم لوگ سنیما جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ ایسے نیک کام کو کون منع کرتا۔ ہم لوگوں نے ایک عمدہ سی فلم دیکھی اور جب ٹھنڈ میں سکڑتے ہوئے واپس آئے تو چچا برآمدے میں کھڑے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

ہم کو پہلے ہی خیال تھا کہ واپسی پر کوئی عمدہ خبر ملے گی۔ اب سوال کی ہمت نہ پاتے ہوئے بھی چچا کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"لڑکا"۔ انھوں نے غالباً رفیق صاحب کے خیال سے ذرا شرماتے ہوئے کہا۔

"خوب"، ہم سب مع انور صاحب اور رفیق صاحب کے چچی جان کے کمرے کی طرف لپکے مگر دروازے پر روک دئے گئے۔

آپس میں دیر تک مبارک باد کہنے کے بعد اندر جانے کی اجازت ملی اور چچی جان اپنے ہونے والے داماد کو دیکھ کر بہت شرمائیں۔

(باقی آئندہ)

ترکی میں تعلیم کا ارتقاء: ۔۔۔۔۔ بقیہ صفحہ ۳۹

کرنے سے رہ جائے۔ اس نئی فضا میں، جبکہ نقل کی جگہ تخلیق نے لی ہے، ہمارا تعلیمی نظام دوسرے شعبوں کی طرح ترکی کی انقلابی اسپرٹ کا پتہ دیتا ہے"۔

ان اقتباسات میں جن نظریوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق اہل انگلستان کی رائے کچھ بھی قائم ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ان سے شدید قومی اسپرٹ کا اظہار ہوتا ہے جن کا اچھا اثر نہ صرف ترکی پر بلکہ دوسرے ملکوں پر بھی پڑنا چاہیئے۔

زمین کی موت

محمد رشید فریدی

اس عالم کی نیرنگی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یہاں کی کسی چیز کو قرار نہیں۔ کل جیسے حالات آج نہیں۔ آج جیسے کل نہ ہونگے۔ کل جنکے نام سے بڑے بڑے پہادر لرزتے تھے آج وہ ہزاروں من مٹی کے نیچے پڑے ہیں۔ کل جہاں سربفلک محلات تھے اور ان میں عیش و عشرت، چہل پہل کا دور دورہ تھا آج وہاں خس و خاشاک کے ڈھیر ملتے ہیں۔ جو کل تک تاج و تخت کے مالک تھے آج انہیں بھیک بھی نہیں ملتی۔ اگر انسان اپنی زندگی پر غور کرے تو اسے اپنے عیش و عشرت، منصب و حکومت، اور جاہ و قدرت کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ لیکن انسان غفلت کا مجسمہ ہے۔ اسے اپنے وقتی مشاغل سے اتنی فرصت کہاں کہ اپنے انجام پر نظر کرے۔ جب انسان اس زندگی کی انتہا پر غور کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتا جسکی حد صرف چند سال پر ختم ہو جاتی ہے تو بھلا وہ زمین کے انجام پر غور کرنے پر کیسے مائل ہو سکتا ہے۔ وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ زمین و آسمان، چاند سورج ہمیشہ آج کی حالت پر قائم رہینگے۔ حالانکہ (کل من علیہا فان) ہر مادی اور حادث شے ایک دن فنا ہو جایگی۔

ہر ذی روح کی زندگی کا مدار طاقت پر ہے۔ طاقت گرمی سے پیدا ہوتی ہے۔ گرمی کم ہونے سے جب طاقت نہیں رہتی تو زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ جب کوئی حیوان پیدا ہوتا ہے تو اس میں گرمی کی فراوانی ہوتی ہے جس سے وہ جلد جلد بڑھتا ہے۔ عمر کے ساتھ اس کے جسم کی گرمی اور ساتھ طاقت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ بڑھاپے میں یہ دونوں چیزیں کم ہو جاتی ہیں یہانتک کہ گرمی کی عدم موجودگی سے ایک دن موت کی ٹھنڈک اسپر غالب آ جاتی ہے۔ یہ ایک فرد زندگی کی ابتدا اور انتہا ہے۔

زمین پر نسل حیوانی کی پیدائش زمین کے ساتھ نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں سال بعد ہوئی جبکہ کرہ ارض کی آب و ہوا اول نباتات، پھر حیوان اور اس کے بعد انسان کے مزاج کے لائق معتدل نہ ہوگئی۔ جیسے جیسے حالات بہتر ہوتے گئے حیوانی نسل ترقی کرتی گئی۔ اگر وہ حالات جن پر نوع حیوان کا انحصار ہے تبدیل ہو جائیں تو حیوان کی زندگی بھی تبدیل ہو جائے گی۔ اور اگر بالکل ناموافق ہو جائیں تو نسل حیوانی سطح زمین سے نابود ہو جائے گی۔ یعنی جن حالات کے موافق ہونے پر بقول ڈارون انسانی نسل کا ارتقا ہوا انہیں حالات کے غیر موافق ہونے پر نسل انسانی رفتہ رفتہ فنا ہو جائے گی۔ نسل انسانی کے فنا ہونے کیساتھ یہ ضروری نہیں کہ زمین بھی وجود میں نہ رہے۔ البتہ زمین کے فنا ہونے کیساتھ حیوانی نسل کا مٹ جانا لازمی ہے۔ ممکن ہے جس طرح زمین کی پیدائش کے کروڑوں سال بعد نسل حیوانی زمین پر وجود میں آئی اسی طرح حیوانی نسل کے مٹ جانے کے لاکھوں سال بعد تک زمین بھی مریخ سیارے کی مانند ایک مردہ جسم کی صورت سے آفتاب کے گرد گھومتی رہے۔

زمانہ قدیم سے ہر قوم میں یہ خیال ایک دن زمین کو بھی موت سے دوچار ہونا ہے کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا۔ زمانہ حال میں بھی کوئی سائنسداں، کوئی مذہب اور کوئی قوم ایسی نہیں جسکا یہ عقیدہ نہ ہو کہ ایک دن یہ دنیا اور نسل حیوانی فنا ہو گی۔

موت کی اقسام

ہر ذی روح یا تو اپنی زندگی کے مختلف درجات طے کر کے آہستہ آہستہ کمزور ہو کر مرتا ہے یا اچھا خاصا اچانک کسی حادثہ میں گرفتار ہو کر جان دیتا ہے۔ طبعی عمر پوری کر کے مرنے کو قدرتی موت کہتے ہیں اور کسی ناگہانی حادثہ کے صدمے سے جان دینے کو حادثانہ موت کہتے ہیں۔ نسل حیوانی کے متعلق بھی علماء کا یہی خیال ہے کہ یا تو یہ طبعی موت سے فنا ہو گی یا حادثہ میں مبتلا ہو کر یکلخت صفحہ ہستی سے مٹ جائیگی۔

(۱) طبعی موت

(الف) انسان اور حیوان کی نشو و نما اور صحت کی بقا آفتاب کی گرمی پر ہے۔ اس کے علاوہ انسان و حیوان کی خوراک نباتات ہے جسکا کلیتہً مدار آفتاب کی گرمی پر ہے۔ اس طرح نسل حیوانی کا انحصار بالواسطہ اور بلاواسطہ آفتاب کی حرارت پر ہے۔ جسقدر حرارت زمین کو آفتاب سے ملتی ہے اگر اس میں کچھ کمی ہو جائے تو نباتات پیدا نہ ہو۔ خوراک نہ ملنے سے نسل حیوانی کی زندگی محال ہو جائے۔

آفتاب نظام شمسی کے وسط میں واقع ہے۔ اس کی گرمی اور روشنی چاروں طرف پھیلتی ہے۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ آفتاب سے ہر منٹ یا ہر گھنٹہ حرارت کے دو ارب حصے خارج ہوتے ہیں تو ان میں سے صرف ایک حصہ زمین کو ملتا ہے۔ باقی حرارت دوسرے سیاروں کو روشنی اور گرمی پہونچانے میں صرف ہوتی ہے یا فضائے بسیط میں ضائع ہو جاتی ہے۔ جب اس ایک حصہ سے ہزاروں میل لمبی چوڑی زمین پر نباتات حیوان اور انسان کی زندگی برقرار ہے تو اس تمام حرارت کا اندازہ کیجئے جو ہر لمحہ، ہر منٹ اور ہر گھنٹہ آفتاب سے خارج ہو رہی ہے اور آج نہیں کروڑوں سال سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو آفتاب کی گرمی رفتہ رفتہ کم ہونی چاہئے۔ جب انسان مہذب ہوا تھا اس وقت زمین کو آفتاب سے جسقدر گرمی ملتی تھی اس میں اس وقت تک تو کسی کمی کا احساس ہوا نہیں۔ لیکن اس سے ہمکو یہ یقین

نہ کرلینا چاہیئے کہ آفتاب کی گرمی ہرگز کم نہیں ہوتی۔ اسواسطے کہ انسان کو مہذب ہوئے کچھ ایسا زیادہ زمانہ ہی نہیں گذرا۔ ممکن ہے کہ آج سے دس پانچ لاکھ سال پیشتر زمین کو آجکل سے زیادہ حرارت ملتی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کے ابتدائی دور میں زمین کو آفتاب سے قدرے زیادہ حرارت ملتی ہو اور اسوقت سے اسوقت تک حرارت میں جو کمی ہوئی ہو وہ اسقدر کم ہو کہ ہم صحیح اندازہ نہ کرسکے ہوں۔ ایک جرمنی عالم ہیم ہولز (Helm Holtz) کا یہ خیال تھا کہ حرارت خارج کرکے آفتاب جسقدر ٹھنڈا ہوتا ہے اسی قدر سکڑتا ہے اور سکڑنے سے کم و بیش اتنی ہی حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہیم ہولز کے قیاس کے بموجب بھی آفتاب کی حرارت میں خفیف کمی ہوتی ضرور ہے جس کی مقدار ایک لاکھ سال میں صرف ۵ درجہ ہے۔ دوسرے علماء کا یہ خیال ہے کہ آفتاب کی حرارت بقدر ۵ درجہ کم ہونے میں اس سے بھی زیادہ مدت لگتی ہے بہرحال ایک لاکھ سال میں ۵ درجہ حرارت کم ہو یا پانچ لاکھ سال میں ایک درجہ کم ہو اس بات پر سب متفق ہیں کہ آفتاب کی حرارت آج جیسی ہمیشہ نہ رہیگی اور رفتہ رفتہ آفتاب ٹھنڈا پڑتا جارہا ہے۔ دوربین کے ذریعہ آسمان پر ایک ایسا ستارہ دیکھا گیا ہے جو کروروں سال حرارت اور روشنی خارج کرکے ٹھنڈا اور تاریک ہوگیا اور اب وہ مردہ حالت میں فضائے بسیط میں گھومتا پھرتا ہے۔ بعض علمائے ہیئت یہ کہتے ہیں کہ آفتاب اپنی زندگی کی جوانی پر پہونچ چکا ہے اور اب اس کے ٹھنڈا اور تاریک ہونے میں صرف تیس کرور سال باقی رہ گئے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ آفتاب کی حرارت اور روشنی میں تدریجی زوال ہوگا۔ آفتاب کی حرارت میں تہوڑی بہت کمی کو انسان اپنے تجربہ عقل اور سائنس کی امداد سے برداشت کرلیگا لیکن جب کرہ ارض کی آب و ہوا بہت ہی سرد ہو جائے گی تو قطبی خطوں کے خانہ بدوش لوگ اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہکر جنوبی گرم علاقوں میں پناہ لیں گے۔ آفتاب کی حرارت میں جیسے جیسے کمی ہوگی ٹنڈرا کا برف جنوب کی سمت پھیلیگا اور انسان و حیوان کو اپنے آگے آگے دھکیلتا لائے گا۔ اسی طرح قطب جنوبی کا برف سمندروں کو جماتا ہوا شمال کی طرف بڑھیگا۔ حرارت کی کمی سے ایک طرف نباتات کی نشوونما میں کمی ہوگی، دوسری طرف ہوا کو بخارات نہ ملنے سے بارش میں عام طریقہ سے کمی ہو جائے گی۔ خصوصاً سمندری ساحلوں سے دور، ملکوں کے اندرونی حصوں میں بارش کی کمی کے باعث کنوؤں اور تالابوں کا پانی غائب ہو جائیگا۔ دریا اور نہریں خشک ہو جائینگی۔ اس طرح گرم ملکوں کے اندرونی حصوں میں بھی نہ کھانے کی کوئی چیز پیدا ہوسکیگی نہ پینے کو پانی مل سکیگا۔ جو تھوڑے بہت بخارات ہوا کو حاصل ہوسکیں گے انسے صرف ساحلی علاقوں پر تھوڑی بارش ہو جایا کریگی۔ اسلئے شاید ملکوں کے اندرونی حصوں سے بھی بھاگ بھاگ کر ساحلی علاقوں میں آجائینگے پانی اور نباتات کی کمی سے جانور مرجائینگے۔ جو بچیں گے ان کو انسان کھاکر ختم کردینگے آجکل کے ۲۰ یا ۲۵ دن کے برابر دن اور رات ہوا کرینگے۔ ۲۰ دن تک جب آفتاب افق کے نیچے رہیگا تو سردی اور زیادہ ستائیگی۔ بھوک پیاس جدا ناتواں کردیگی۔ حالانکہ کروروں انسان موسم کی شدت اور بھوک پیاس سے مرچکیں گے پھر بھی جو بچیں گے ان میں سے بھی کسی کو پیٹ بھر کر کھانیکو نہ مل سکیگا۔ سردی اور زیادہ بڑھے پر ساحلی علاقوں میں بھی تھوڑے بچے ہوئے آدمیوں کے لئے عرصہ حیات تنگ ہو جائے گا اور وہ مجبور ہوکر سردی سے بچنے اور قوت لایموت حاصل کرنے کی غرض سے خط استوے پر جمع ہو جائینگے۔ کچھ اور زمانہ گذرنے پر زمین کی محوری حرکت اور زیادہ سست ہو جائے گی یا بقول بعض علماء کے بالکل نہ رہیگی تو تاریک نصف کرہ کے بچے کھچے آدمی بھی گرمی حاصل کرنے کے لئے اسی نصف کرہ کے خط استوے پر بھاگ آئینگے جس پر آفتاب ٹمٹماتا ہوگا۔ اس طرح تمام کرہ کے باقی ماندہ آدمی خط استوے کے چھوٹے سے حصے پر جمع ہو جائینگے۔ یہاں تہوڑی نباتات موجود ہوگی اسلئے اول اول گھاس اور درختوں کے پتوں سے لوگ پیٹ بھرینگے۔ جب نباتات

حیرت بداماں

اختر انصاری اکبرآبادی

یہ کس انداز سے ظالم ترا جلوہ نمایاں ہے
کہ ہر ذرہ جہانِ عشق کا حیرت بداماں ہے

ہجوم نامرادی میں بھی غم گہوارہ جنباں ہے
بلا سے کچھ بھی ہو پر یہ مری ہستی کا ساماں ہے

بقا کیسی سرائے دہر میں ہر ایک مہماں ہے!
فنا کے راز سے واقف جو ہو جائے وہ انساں ہے

حقیقت میں جو مٹ جائے وہ عمر جاوداں پائے
فنا کے راز میں بیشک بقا کا راز پنہاں ہے!

یہ دنیا ہے یہاں ہر چیز نیرنگی پہ مائل ہے!
کوئی غمگین ہے کوئی مسرور شاداں ہے!

نیاز و ناز میں ہیں شاہد و مشہود ہم رتبہ
زلیخا کی پریشانی سے یوسف بھی پریشاں ہے

مکدر ہے فضائے شام غم آغاز ہجراں سے
پیام موت شاید دل کے داغوں کا چراغاں ہے

یہ مانا عشق گل میں بلبلیں ہیں نوحہ گر لیکن!
نہ جانے ان گلوں کا کس کے غم میں چاک داماں ہے

مقدر سے یہ دور آیا ہے بزم نامرادی میں
جو تھا کل تک مخالف آج وہ اختر پشیماں ہے

بھی باقی نہ رہیگی تو بھوک، پیاس، بیماری، وبا جنگ و جدل سے اس تھوڑی آبادی کا بھی زیادہ حصہ ختم ہو جائے گا۔ جو بچینگے ان کے لئے بھی کھانے کو کچھ دل سکے گا۔ اب یہاں بھی سردی بڑھیگی اور آفتاب کی بڑھتی ہوئی تاریکی سے اندھیرا رہنے لگے گا۔ اس بھیانک وقت میں شاید انسان مردم خواری پہ اتر آئے۔ ممکن ہے مردہ لاشوں کو بھی کھانے سے دریغ نہ کرے۔ یا اپنے گھر کے کمزور افراد بیمار اور بچوں سے پیٹ بھرنے لگے۔ یہ وقت نسل حیوانی کی زندگی کے آخری لمحات ہونگے۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہوگی۔ بھیانک خاموشی چھائی ہوگی ممکن ہے انسانی زندگی کی آخری ضروری ضروری چیز ہوا بھی معدوم ہو جائے۔ اس وقت اس عالم میں سوائے ذات خدا کے کوئی چیز زندہ نہ ہوگی۔

(ب) زمین کی پیدائش کے متعلق بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ گھومتے ہوئے آفتابی سحاب سے چند ٹکڑے جدا ہوئے۔ یہ ٹکڑے آفتاب کی قوت دافعہ عن المرکز (Centrifugal Force) کے باعث اسوقت بھی آفتاب سے بتدریج دور ہوتے جا رہے ہیں۔ زمین بھی انہیں ٹکڑوں میں سے ایک ہے اور آہستہ آہستہ آفتاب سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ جب ان سیارات پر پھینکنے کی قوت کا اثر نہ رہیگا تو وہ آفتاب کی قوت جاذبہ کے باعث آہستہ آہستہ مراجعت کرینگے۔ جب اس طرح زمین بھی آفتاب سے بہت قریب آجائیگی تو سخت گرمی سے نباتات حیوان اور انسان جھلس کر فنا ہو جائینگے۔ بہت قریب آجانے پر آفتاب اپنی قوت جاذبہ سے زمین کو کھینچ لیگا اور ایک آن واحد میں زمین اور اس کی تمام چیزیں بخارات میں تبدیل ہو جائینگی۔

(ج) تمام اجرام فلکی اپنی اپنی قوت جاذبہ سے ایک دوسرے کی محوری حرکت میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ جس طرح ایک گھومتے ہوئے لوہے کے پہیئے کو مقناطیس بہت جلد ساکن کر دیتا ہے اسی طرح ہر سیارہ اپنی قوت جاذبہ سے دوسرے سیاروں کی محوری حرکت کو آہستہ آہستہ کم کر رہا ہے اور خود اس کی محوری حرکت پر دوسرے سیاروں کی قوت جاذبہ کا اثر ہو رہا ہے۔ اس باہمی رکاوٹ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بڑے بڑے اجرام کی قوت جاذبہ سے چھوٹے اجرام کی محوری حرکت گھٹتے گھٹتے اس قدر کم رہ جاتی ہے کہ ہمیشہ ان کا ایک ہی رخ بڑے جسم کی طرف رہتا ہے۔ جیسے عطارد اور زہرہ آفتاب کی طرف اور قمر زمین کی طرف ہمیشہ ایک ہی رخ رکھتے ہیں۔ اس اصول کے ماتحت بعض علماء یہ خیال کرتے ہیں کہ آفتاب کی قوت جاذبہ سے زمین کی محوری حرکت بہت آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ ممکن ہے زمانہ دراز کے بعد ایک وقت ایسا آجائے جبکہ زمین کا ایک ہی پہلو آفتاب کی طرف رہنے لگے جس سے نصف کرہ میں مسلسل رات اور نصف کرہ میں مسلسل دن رہنے لگے۔ جس حصہ پر مسلسل رات رہیگی وہاں سردی کیوجہ سے اور جس حصہ پر مسلسل دن رہیگا وہاں گرمی کے باعث رفتہ رفتہ تمام نباتات حیوان اور انسان فنا ہو جائینگے۔

(۲) حادثانہ موت

زمین کے فنا ہونے کی دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کوئی ایسا حادثہ جس سے اس دنیا کی آبادی فنا ہو جائے زمین کو پیش آسکتا ہے یا آفتاب کو۔ حادثانہ موت کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) علمائے ہیئت بتاتے ہیں کہ سورج اپنے متعلقہ سیاروں کو ہمراہ لے ۱۲ ½ میل فی سیکنڈ یا ۴۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ایک بہت بڑے ستارے شلیاق (Lyra) کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ ستارہ آفتاب سے اسقدر دور ہے کہ آفتاب کو اس تک پہنچنے میں کروڑوں سال لگ جائینگے۔ جب آفتاب اس ستارے کے قریب پہونچے گا تو وہ اپنی قوت جاذبہ سے آفتاب کو اپنے جسم میں جذب کرلیگا۔ اول تو وہ ستارہ خود ہی آفتاب سے بہت بڑا ہے پھر آفتاب کو جذب کرلینے کے بعد تو اس کی جسامت اور بڑھ جائیگی اور زمین پر اسقدر گرمی پہونچے گی کہ یکلخت زمین کے تمام انسان، حیوان اور نباتات جل بھنکر خاک سیاہ ہو جائینگے اور ممکن ہے وہ ستارہ زمین کو بھی جذب کر کے بخارات میں تبدیل کردے۔

(ب) دوسرا حادثہ زمین کو یہ پیش آسکتا ہے کہ کسی دمدار تارے سے تصادم ہو جائے۔ پچھلی صدی میں یہ پیشین گوئی ہوئی تھی کہ ۱۸۶۲ء میں زمین بیلا (Bella) کے کومٹ یعنی دمدار تارے سے ٹکرائیگی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ صرف چند روز رات کیوقت بے شمار تارے ٹوٹتے دکھائی دئے۔ بات یہ ہوئی کہ زمین اس تارے کے سر سے ٹکرانے کے بجائے اس کی دم میں سے گذر گئی۔ یہ موقعہ تو بخیر بیت گذر گیا۔ لیکن اگر پھر کبھی ایسی نوبت آئی اور زمین پھر کومٹ کی دم ہی میں سے گذر گئی تو شاید یہ ۱۸۶۲ء کی مانند پھر زمین کو کوئی صدمہ نہ پہونچے لیکن کسی کے سر ہی سے ٹکر ہوگئی تو یہ ممکن ہے کہ تمام زمین ہی پاش پاش ہو جائے۔ ہوسکتا ہے کہ زمین کا صرف وہی حصہ تباہ و غارت ہو جائے جہاں کومٹ کی ٹکر ہو اور باقی زمین پر زبردست زلزلہ ہی آکر رہ جائے۔ اور بعض علماء کے اس خیال کے پیش نظر کہ کومٹ ٹھوس مادے کے نہیں ہوتے بلکہ گیس ہوتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ زمین کی ہوا کے اکثر اور ضروری اجزا جل جائیں اور ہوا کی کمی کیوجہ سے انسان اور حیوان سسک سسک کر جان دیں۔

(ج) حادثانہ موت کی تیسری صورت یہ ممکن ہے کہ ساری زمین کسی بجھے ہوئے تاریک ستارے سے ٹکرا جائے۔ تاریک ہونے کی وجہ سے وہ ستارہ زمین والوں کو اسوقت تک نظر نہ آئے گا جب تک وہ قریب آکر سورج کی روشنی سے چمکنے نہ لگیگا۔ تصادم سے ۱۲ یا ۱۵ سال پیشتر وہ ستارہ دوربینوں سے نظر آسکے گا۔ اسوقت یہ سمجھا جائیگا کہ نیا ستارہ دریافت ہوا ہے۔ ۷ یا ۸ سال بعد وہ ستارہ خالی آنکھ سے دکھائی دینے لگیگا۔ ٹکر سے ایک آدھ سال قبل وہ قمر کے برابر نظر آئیگا۔ اسوقت نجومی پیشین گوئی کر دینگے کہ فلاں تاریخ کو زمین نئے ستارے سے ٹکرائے گی۔ اس تصادم سے زمین اور اس کی ہر چیز بخارات میں تبدیل ہو جائے گی۔

(د) زمانہ قدیم سے لوگ دیکھتے چلے آئے ہیں کہ کوئی ستارہ کئی کئی سوگنا پھول کر بڑا ہوا۔ بڑا ہونے سے اس کی روشنی بہت تیز ہو گئی اور پھر وہ ستارہ یا تو ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا یا بھسم ہو کر ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔ ابرخس، ٹائیکو براہے اور دوسرے علمائے ہیئت نے بہت سے ستاروں کی یہ بتاہی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ موجودہ صدی میں ۱۹۰۱ء میں، ۱۹۲۵ء میں، ۱۹۲۷ء میں اور ۱۹۳۴ء میں بعض بدقسمت ستاروں کا یہ انجام دیکھا گیا ہے۔ آفتاب بھی ایک ستارہ ہے۔ خدا نکردہ اگر کسی وقت اس کو بھی یہ صورت پیش آگئی تو زمین کی تباہی لازمی ہے۔ اگر آفتاب اپنی موجودہ جسامت سے دو سوگنا بھی بڑھا تو اس کا جسم پھیلکر زہرہ سیارہ تک آجائے گا۔ اسوقت زمین آفتاب سے اسقدر قریب ہو جائے گی کہ آفتاب کی سطح سے جو مہیب شعلے اور آگ کی لپٹیں اٹھتی ہیں وہ زمین تک پہونچکر ایک لمحہ میں زمین کو جلا کر خاک بنا دینگی۔ اگر آفتاب اتنا نہ پھولا کہ زمین کو جلا ڈالے تو چند دن بعد آفتاب کے جل بجھنے پر ہماری زمین تاریک اور ٹھنڈی ہو جائے گی اور تمام ذی روح مرجائینگے۔ واللہ اعلم

رباعیات — حکیم راغب

آہٹ — ضمیر مخلص

کون ہے؟ کوئی نہیں، کوئی نہیں کوئی نہیں!
وہی غمناک خموشی، وہی تنہائی ہے۔
اڑ گئی پھر مجھے رنگین تخیل کی اڑان
کھل گئی روح تمناؤں کے دل ڈول گئے
میری محبوب کے لب پر جو کبھی ناچے تھے
وہی نغمات مرے کان میں رس گھول گئے
یہ گلستاں، یہ طرب زار، یہ رقص و نغمہ
یہ مئے سرخ چھلکتی ہوئی پیمانوں میں
میں نے سمجھا کہ مری عمر یونہی بیتے گی
اپنی محبوب کے ہمراہ شبستانوں میں
ترے قدموں کی ہے آہٹ کہ ہوا کا جھونکا!

کون ہے؟ کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں
وہی غمناک خموشی، وہی تنہائی ہے۔
جب کبھی شدت احساس بڑھے حد سے سوا
سوچتا ہوں کہ ترے پیار کا حاصل کیا ہے
تیرے رنگین خیالات کی مضبوط گرفت
جانتا ہوں کہ یہ اک وہم ہے یا دھوکا ہے
وقت آنے پہ ترا پیار بھی مر جائے گا
نغمہ و رقص گراں بار طبیعت ہوں گے
ختم ہوں گی نہ کبھی زیست کی بوجھل گھڑیاں
حوصلے اکتائے ہوئے وجہ اذیت ہوں گے
میں نے مانا کہ حقیقت ہے حقیقت لیکن
جانتا ہوں کہ ابھی تیری ضرورت ہے مجھے
تیری یادوں کی مئے ناب نشاط آگیں ہے
میری محبوب! ترا پیار غنیمت ہے مجھے
ہمہ تن گوش یہاں، تا بہ قیامت بیٹھا
میں سنوں گا ترے قدموں کی لطیف آہٹ کو

فرض اور عشق

افسانہ

مظفر حسین اظہر دہلوی

(۱)

بادو باراں بھری رات تھی اور طوفانی ہوا تیز تھی کہ ایک بمبار طیارہ دن کے دو بجے مشرقی بنگال کے پہاڑی جنگل میں اُترتا ہوا پایا گیا جس کی رفتار نہایت تیز تھی۔ وہ علاقہ بالکل غیر آباد تھا۔ چنانچہ وہاں انسانی شکل کوسوں تک نظر نہیں آتی تھی۔ تاہم وہ بمبار خراب ناموافق اور ناسازگار حالات کے باوجود اس ویرانے میں اُترنے پر مجبور ہوا۔

بات یہ تھی کہ اب بمبار پٹرول کا ذخیرہ اور دیگر ضروریات ختم ہوجانے کی وجہ سے اڑ کر آگے نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا طیارے کا اعلیٰ افسر وہی آخری تدبیر عمل میں لایا جو ایسے نازک مواقع پر بالعموم اختیار کی جایا کرتی ہے کیوں کہ بمبار سوار انسانوں کی قیمتی جانیں اور کسی بھی طریق سے بچائی نہیں جا سکتی تھیں۔

اس بمبار پرتین تندرست انسانوں کے سوا دو مجروح ہوا باز بھی سوار تھے جن میں ایک خاتون بھی تھی اور وہ سب زندہ رہے۔ غذا کے علاوہ دوا کے بھی ضرورتمند تھے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی نئے طیارے پر نہ تھی۔ پس اگر طیارہ یہاں نہ اُترتا تو طیارہ سواروں کو یقیناً مصائب کا سامنا کرنا پڑتا۔ بمبار میں عام خوراک کی ذخیرہ بھی ضرورت سے کم تھا۔ پھر وہ آگے جا بھی کیسے سکتا تھا جب پٹرول ہی ختم ہوچکی تھی۔

طیارے کا ایک اعلیٰ افسر اپنے ایک ماتحت سے ہمکلام ہوا۔

افسر۔ جاوید! کیا ہمیں اب یہیں اُترنا پڑے گا؟

ج۔ جی جناب! اس کے سوا اور چارہ کار ہی کیا ہے حضور والا!

ا۔ تو طیارے کی رفتار کم کردو۔

ج۔ جو حکم جناب!

بمبار کی رفتار رفتہ رفتہ کم کردی گئی یہاں تک کہ وہ کچھ آگے جاکر ٹھہر گیا۔ اور اس کے سواروں نے زمین پر قدم رکھے اب اس طیارے اور اس کے آدمیوں کی سلامتی کے لئے بیرونی مدد کی ضرورت تھی کہ اس کے بغیر گویا جانیں معرض خطر میں تھیں خصوصاً زخمی اور بیمار ہوا بازوں کی جانیں۔ مگر مشکل یہی تھی کہ اس ویران جنگل میں نہ تو تار برقی سلسلہ تھا۔ نہ ٹیلی فون کا اور نہ لاسلکی آلات ہی کا کہ قریب کے کسی اڈے سے مدد مانگی جاسکے۔ تاہم مدد کی سخت ضرورت تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس وقت اس طیارے اور اس کے آدمیوں کا تعلق گویا آباد دنیا سے منقطع ہوچکا تھا لہٰذا افسر اعلیٰ نے پیغام رسانی کے آخری ذریعے سے کام لینے کا عزم کرکے طیارے کے ایک خاص اور مخفی خانے میں سے ایک کبوتر نکالا جس کا رنگ خاکستری سیاہ تھا سفید نہیں تھا اور وہ قاصد کبوتر تھا یعنی نامہ بر کبوتر۔ جب پیغام رسانی کے سائنٹفک وسائل و ذرائع تار برقی ٹیلی فون وغیرہ پیغام رسانی نہ کرسکیں تو نامہ بر کبوتر ایسے نازک حالات میں بھی یہ اہم خدمت انجام دیتا ہے

قاصد کبوتر قدیم زمانے ہی سے نامہ بری کرتا آیا ہے اس نے مشرق و مغرب میں محیر العقول کارنامے دکھائے ہیں۔ چنانچہ اس کا ذکر مختلف ممالک کی ادبیات میں موجود ہے۔ ایشیائی شعراء (خصوصاً ایرانی و ہندوستانی) نے بھی اپنے اشعار میں بھی قاصد کبوتروں کا ذکر کیا ہے۔ اور عجیب و غریب مضامین پیدا کئے ہیں۔ اردو میں بھی ایسے اشعار کی تعداد کم نہیں ہے۔ اس سلسلے میں رشیب و حریف پر بھی خوب خوب آوازے کسے گئے اور ان کی خبر اچھی طرح سے لی گئی ہے۔ اگرچہ قاصد کبوتر نامہ بری زمانہ قدیم سے کر رہا ہے تاہم اس صدی میں اس سے اہم کام لئے گئے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں بھی اس سے میدان جنگ میں خدمات لی گئیں!۔ مگر موجودہ عظیم ترین جنگ میں ان سے بہت ہی زیادہ کام لئے جارہے ہیں۔ دیگر ممالک کے علاوہ تمام سلطنت برطانیہ اور عزیز وطن ہندوستان میں بھی کبوتروں کی خدمت حاصل کی گئیں اسی لئے ہندوستان میں اس سلسلے میں دفاع ہند کے ماتحت سرکاری جنگی نامہ بر کبوتروں کی حفاظت کے واسطے ایک سے زیادہ آرڈی نینس دفعی قانون) نافذ کئے گئے۔ چنانچہ ۲۷ مارچ ۱۹۴۲ء کو ممانعت کی گئی کہ کوئی شخص کسی تیز پرواز یا گردان کبوتروں کے ذریعے نہ خود خط بھیجے اور نہ اُس کی نگرانی میں ایسا فعل ہو ورنہ سزا دی جائے گی۔ پھر ۴۳ء کے وسط میں قانون میں ترمیم کرکے حکم دیا گیا کہ سرکاری نامہ بر کبوتروں کو خبردار کوئی شکار نہ کرے ورنہ ایک سال قید کی سزا پائیگا۔

اچھا تو جب مذکورہ طیارے کے افسر اعلیٰ نے خانے سے کبوتر نکالا تو اس کے فوراً بعد اُس نے اپنی جیب سے ایک سفید باریک چمکیلا جھلی کے مانند چکنا کاغذ نکالا۔ اور اُس پر انڈی پنسل سے کچھ لکھا مگر نہایت مختصر اور مخفی طرز تحریر میں یعنی امداد طلب پیغام۔ اور اس جنگل کا مفصل پتہ نشان کم سے کم الفاظ میں لکھ کر کاغذ کی کئی تہیں بنائیں۔ اور وہ تہ شدہ کاغذ نامہ بر کبوتر کی بائیں ٹانگ پر نیچے سے اوپر لپیٹ کر اوپر مضبوط ریشمی دھاگا باندھ دیا۔ اور پھر کبوتر کو کچھ گندم کھلا اور پانی پلایا۔ اور بعد ازاں افسر قاصد کبوتر کو پیار کرکے اور خدا حافظ کہہ کر اڑا دیا تو وہ اُڑتا اُڑتا نظروں سے غائب ہوگیا اور اس وقت افسر جاوید سے مخاطب ہو

افسر۔ اگر اس بے زبان قاصد کو راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا اور وہ زندہ سلامت منزل مقصود تک جا پہنچا تو امداد ہمیں یقیناً وقت پر پہنچ جائیگی اور قیمتی جانیں بچ جائیں گی۔

جاوید۔ مدد خدا کے فضل سے جلد آجائے گی۔

ا۔ آمین!

احقر کی اس کارروائی نے بم بار کے تمام آدمیوں کے دل پر اُمید کردیئے۔ مجروح اور مریضوں کے چہروں پر بھی مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ خاتون کے دل کو بھی اطمینان ہوگیا اور وہ سب لوگ مدد کا انتظار اضطراب کے ساتھ کرنے لگے۔ اُس کبوتر کو خط دے کر اسی فوجی مستقر کے لئے اُڑایا گیا تھا جہاں سے بم بار روانہ ہوا تھا۔ لہذا تربیت یافتہ، راہ آشنا اور مشتاق مگر بے زبان پرند کا منزل مقصود تک پہنچنا یقینی تھا۔ بشرطیکہ اسے راہ میں (خدانخواستہ) کوئی حادثہ پیش نہ آجائے۔

—(۲)—

دو انسان اسی دن کے چار بجے شام کے وقت بم بار مذکور سے بہت دور کے جنگل میں آسمان کی طرف منہ اٹھائے مغرب کی سمت سے آرہے تھے ۔۔ ایک نوجوان خوش اندام متناسب الاعضا لڑکی اور دوسرا نوجوان مرد جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ غالباً بھری ہوئی ۔ مرد اپنے چہرے مہرے اور لباس سے برہمنی معلوم ہوتا تھا مگر لڑکی بنگالن تھی۔ جس کا نام سیتا تھا، اور مرد کا نام مکرجی سیتا اُس سے محبت کرتی تھی اس کی منگیتر تھی۔ اور ان کی شادی عنقریب ہونے والی تھی۔ سیتا کے والدین مکرجی کو پسند نہیں کرتے تھے مگر تریا ہٹ کے مقابلے میں ان کی ایک بھی پیش نہ گئی۔

سیتا اور مکرجی باہم باتیں کرنے لگے۔

سیتا۔ یہ شکار۔ یہ تھیار ہمیں تو پسند نہیں! بھلا کسی کی جان لینا کہاں کی انسانیت ہے۔

مکرجی۔ پھر وہی وہم اور بزدلی کی باتیں کرنے لگیں نا! استری ہونا! اور پھر بھارت کی استری!

سیتا۔ ہاں میں استری ہوں اور مجھے بھارتی استری ہونے پر کم فخر نہیں اور نہ تم ہوں کہ میں سنگ دل مرد نہیں۔

مکرجی۔ اچھا اوہو رنگ لائی گلہری! (ہنستا ہے)

سیتا۔ میں دھرم کی بات کہتی ہوں! آہ ان ننھی منھی چڑیوں۔ یا کبوتر فاختہ وغیرہ چھوٹے چھوٹے پرندوں کو مارنا تو پاپ ہی پاپ ہے! مکرجی ان میں مٹھی بھر ہڈیوں کے سوا گوشت کہاں! ہاں اگر تم شیر یا چیتا مارو تو کچھ بہادری بھی ہے۔

مکرجی۔ اچھا چھوڑو بھی ایسی باتیں! تو ذرا ادھر کی طرف تو دیکھو وہ کیسا خوبصورت کبوتر اڑا جارہا ہے! سیتا! اب میں کیوں نہ اسی کو نشانہ بناؤں! پھر ایسا شکار کہاں ملے گا!

سیتا۔ نہیں نہیں! ایسا پاپ ہرگز نہ کرنا! تم ایشور کے لئے ذرا ٹھہرو تو! اور میری ایک بات ذرا غور سے سنو!

مکرجی۔ تو جلد کہو! کیا کہتی ہو؟

سیتا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ کبوتر قاصد اور نامہ بر ہو اور سرکار کا کوئی ضروری پیغام لے جارہا ہو۔ پس اگر ایسی بات ہوئی تو تم شکار کرکے مصیبت میں پھنس جاؤ گے! اس لئے اس بے چارے بے زبان پرند کو نہ مارو۔

مکرجی۔ پھر وہی بہکی بہکی باتیں! سیتا یہ کبوتر جنگلی ہے۔ پس میں اسے ضرور شکار کروں گا۔

سیتا۔ بچوں کی سی ضد نہ کرو۔ کبوتر کو نہ ستاؤ۔ اور بے چارے کو اپنی راہ جانے دو۔

مکرجی۔ ہشت پگلی کہیں کی!

سیتا۔ اچھا! ذرا ٹھہرو! تمہیں میری قسم!

سیتا یہ کہہ کر اوپر کی طرف دیکھتی اور پھر مکرجی سے مخاطب ہوتی ہے۔

سیتا۔ یہ ضرور نامہ بر کبوتر ہے۔

مکرجی۔ بھلا تمہیں یہ کیسے معلوم ہوگیا۔ سیتا سنو تو۔ جوتشن!

سیتا۔ دیکھتے نہیں ہو کہ سیدھا مشرق کی طرف اڑا چلا جارہا ہے! گویا اس کی منزل مقصود اسی طرف ہے! دیکھو جنگلی یا عام شہری کبوتر ایک ہی سمت نہیں اڑا کرتے!

مکرجی۔ پھر!

سیتا۔ یہ ضرور جنگی نامہ بر کبوتر ہے۔ اس لئے تم اسے شکار کرکے خطرے میں مت پڑو میرا کہنا مانو مکرجی مہاراج!

مکرجی۔ باتونی سیتا! لے اب ذرا منہ بند کرلے شکار نکلا جارہا ہے۔

مکرجی نے آگے بڑھ کر بندوق داغ دی اور وہ بے زبان ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر آ پڑا اس کا داہنا بازو سخت مجروح ہوا تھا۔ گرنے سے پہلے کچھ جان باقی تھی۔ زمین پر گرنے کے صدمے سے اس کا دم نکل گیا۔ جس کا سیتا کو بڑا غم ہوا۔ اس کی آنکھیں بھر گئیں! مگر مکرجی پھولا نہ سمایا۔ تاہم اس کی خوشی گریز پا تھی۔

سیتا نے کبوتر کو اٹھایا اور الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس کے بائیں پاؤں سے کاغذ بندھا پایا۔ اب تو اس کا شک یقین سے بدل گیا۔ وہ سمجھی کہ یہ ضرور سرکاری جنگی نامہ بر کبوتر ہے اور مکرجی نے واقعی سنگین جرم کیا ہے!

کبوتر بے شبہ وہی تھا جسے بنگال کے جنگل میں اترے ہوئے بم بار کے

افسر نے امداد طلبی کے لئے اسے سند لوار ٹر کو بھیجا تھا! مگر افسوس کہ وہ رستے ہی میں مکرجی کی بندوق کا نشانہ بنا ——— سینا اخبارات میں پڑھ چکی تھی کہ قاصد کبوتر بہ خطِ مستقیم ایک ہی سمت کو اڑتا ہے۔ کیونکہ خاص منزل مقصود کو جاتا ہے ——— اور سینا نے یہ باتیں مکرجی کو شکار سے پہلے ہی بتا دی تھیں۔ مگر وہ نادان سنگدل شرارت اور بے رحمی سے باز نہیں آیا۔ رحم دل سینا کو یہ بھی معلوم تھا کہ قاصد کبوتر اڑتے وقت اپنے پنکھ نسبتاً جلد جلد ہلاتا ہے۔ اور وہ عام طور پر زمین سے دو ڈیڑھ سو فٹ اونچا ہوا میں اڑا کرتا ہے۔ چنانچہ سینا نے اس کبوتر کو کوئی ڈیڑھ سو فٹ بلندی پر دیکھ کر اسے نامہ بر کبوتر سمجھ لیا تھا اور یہ سچ تھا۔

سینا یہ بھی جانتی تھی کہ نامہ بر کبوتروں کے رنگ سفید یا بادامی یا سرخی مائل ہوا کرتے ہیں۔ یعنی وہ ہر رنگ کے ہو سکتے ہیں! اور ان کا کوئی خاص رنگ نہیں ہے! اس لئے ان کی شناخت میں مدد رنگ سے نہیں مل سکتی! سینا کو یہ بھی چیز معلوم تھی کہ عام دیہاتی جنگلی کبوتر عموماً سفید رنگ سے نیلاہٹ لئے ہوتے ہیں اور قاصد کبوتروں سے بڑے قد کے۔ بلکہ سینا اور فاختہ سے بھی کچھ بڑے ہوتے ہیں۔ اور ان کے پر نامہ بر کبوتروں کے پنکھوں سے کچھ سست چلتے ہیں اور یہی حال اس کر بک شہری کبوتروں کا بھی ہے! جو نسبتاً چھوٹے بھی ہوتے ہیں! اور وہ دونوں یعنی شہری اور جنگلی ایک سمت میں بہت تھوڑا اڑتے ہیں۔

نیک دل سینا تعلیم یافتہ اخبار بین اور انسانی و قانونی ذمہ داری اور فرض سے باخبر تھی۔ پس وہ اسی وقت کبوتر کو ظالم مکرجی سے چھین کر بھاگی۔ وہ سنگدل بھی چیختا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔ مگر سینا کو پکڑ نہ سکا! سینا کوئی تین میل کا سفر پیدل طے کر کے تھانے میں جا پہنچی۔ کیونکہ اسے قانون اور نئے آرڈیننس کا علم تھا پھر وہ چپ کیسے بیٹھ سکتی تھی۔ اس نے اس مکرجی کی بھی رعایت نہیں کی جسے وہ دل دے بیٹھی تھی۔ گویا فرض نے عشق کو بھی شکست فاش دیدی ——— مکرجی نے اپنی سی بہت کی نرمی بھی دکھائی اور گرمی بھی مگر اس کی چلی ایک بھی نہیں۔ سینا نے اس کی ایک نہ سنی

دلیر دوشیزہ نے رپورٹ لکھائی جس کے بعد پولیس نے مکرجی کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔ مکرجی کی طفلانہ حماقت اور شرارت کے باعث مذکورہ آر۔ اے۔ ایف بم بار کے راکبوں کو غیر معمولی نقصان پہنچا اور ناقابل برداشت تکلیف بھی ہوئی۔ خصوصاً بیمار اور زخمی ہوا بازوں کو۔ ان بیچاروں نے تو حسب قاعدہ آخری احتیاطی تدابیر بھی اختیار کی تھیں لیکن کم بخت مکرجی نے ان لوگوں کی مصیبت بڑھا دی۔ چنانچہ وہ تکلیف سے نجات بہت دیر کے بعد پا سکے۔ خصوصاً زخمی اور بیمار ہوا بازوں کو خوراک اور دوا کے بغیر غیر معمولی تکلیف کئی روز تک برداشت کرنا پڑی۔

مجسٹریٹ کی عدالت میں مکرجی پر مقدمہ چلا۔ پہلی پیشی کے بعد دوسری پیشی ہوئی۔ مکرجی ملزم کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔ اور سینا دیوی شہادت دینے آئی ——— پولیس افسر اور سرکاری وکیل بھی عدالت میں آئے۔ مکرجی کا وکیل بھی آیا جسے سرکار نے اپنے خرچ پر مقرر کیا تھا تاکہ ملزم کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے پائے۔

مجسٹریٹ نے اس مقدمے کے کاغذات غور سے دیکھے اور اس کے بعد فریقین کے وکیلوں نے تقریریں اور بحثیں کیں۔

سرکاری وکیل: عالی جاہا! استغاثے کی تفصیلات شامل مثل ہیں۔ مسماۃ سینا دیوی کی شہادت اور پولیس کی تحقیقات سے جرم ثابت ہے۔ ملزم مکرجی نے جنگی نامہ بر کبوتر کو بندوق کی گولی سے مار ڈالا۔ خود ملزم کو ارتکاب جرم سے انکار کی جرأت نہیں ہوئی۔ شہادت پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جرم سنگین ہے جس کی حد بغاوت سے ملتی ہے۔ مجرم نے شہنشاہ معظم کے خلاف جرم کیا ہے اس لئے مکرجی کو انتہائی سزا دینا قرین انصاف ہے۔ اس جرم سے جانیں ضائع ہو سکتی تھیں! اور مجرم اتفاقیہ نہیں بلکہ عمداً کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مجسٹریٹ نے فیصلہ لکھا پھر سنایا اور ملزم کو انتہائی سزا دی یعنی ایک سال کی قید۔

مجسٹریٹ: جرم ثابت ہے۔ صفائی کا ڈیفنس۔ عذر لنگ ہے۔ مسماۃ سینا کی گواہی غیر مشتبہ اور یقینی ہے۔ کیونکہ سینا ملزم کی دشمن نہیں۔ بلکہ اس کی منگیتر اور شیدا ہے۔ سینا کا طرز عمل قابل تعریف ہے۔ کہ اس نے تعلقات عشق نظر انداز کر کے اپنا فرض ادا کیا۔ اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ پیش کردہ صفائی بے نتیجہ ہے۔ ہاں! اگر وکیل ملزم یہ ثابت کر سکتا کہ شکار شدہ پرند، قاصد کبوتر نہیں تھا تو لاکلام صفائی ہو جاتی۔ مگر واقعات اس کی تردید کرتے ہیں ——— عام کبوتروں اور قاصد کبوتروں میں فرق ہے۔ تاہم میں شکاریوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ ان کے لئے بہترین طرز عمل یہی ہے کہ وہ کسی اکیلے اڑتے ہوئے کبوتر کو ہرگز نہ ماریں۔ کیونکہ وہ یقیناً سرکاری نامہ بر ہو سکتا ہے! ——— میں اس علاقے کے ہر شخص کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ سمجھے کہ اس جنگی زمانے میں اس کا فرض کیا ہے۔ جب کسی مرد اور عورت کو اتفاقاً کہیں بھی کوئی کبوتر مل جائے۔ تو وہ قانوناً مجبور ہے کہ اس کبوتر کو فوراً قریب کی پولیس چوکی پر پہنچا دے اور خط ہو تو وہ بھی پہنچائے۔ کبوتر خواہ تندرست ہو یا زخمی خواہ مردہ۔ اس کام میں غفلت ہرگز نہ روا رکھی جائے! ورنہ مستحق سزا ہوگا۔ اور کبوتر کو ایذا دینے والا اور مارنے والا

بھی سزا پائے گا۔

— ۳ —

مکرجی جب قید کاٹ کر واپس آیا تو اس نے سینا کو بالکل بدلا ہوا پایا۔ اب وہ مکرجی سے شادی کی تمنائی نہیں بلکہ اس سے بیزار تھی۔ اسکے والدین خوش ہو کر اچھا بر تلاش کر رہے تھے۔ وہ مکرجی کو پہلے بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر مکرجی کو یہ امر سخت ناگوار ہوا۔ اس نے روٹھی سینا کو منانے کی ہزار کوشش کی لیکن وہ عورت کے عزم و استقلال کو مغلوب نہ کر سکا۔ لہٰذا مکرجی سینا کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اور اسے ٹھکانے لگانے کے مواقع تلاش کرنے لگا۔ مگر چند روز کے بعد گاؤں سے کہیں باہر چلا گیا۔

مکرجی کے چلے جانے کے سوا مہینے بعد کا واقعہ ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ گاؤں پر تاریکی اور خاموشی کی حکومت تھی — سینا کے مکان کے سامنے کھلے میدان میں تین چارپائیوں پر تین کس سو رہے تھے۔ کہ وہاں ناگہاں ایک شخص بلی کی مانند دبے پاؤں آ پہنچا۔ آہٹ ذرا بھی نہیں ہوئی۔ جب اس نے اپنی تسلی کر لی کہ تینوں آدمی بے خبر سو رہے ہیں تو پھر یہ معلوم کیا کہ کون کون ہے۔ وہ سینا کے ماں باپ تھے! اور تیسری چارپائی پر دوپٹے سے منہ ڈھانکے ایک جوان عورت سو رہی تھی۔ آنے والے نے رائے قائم کی کہ وہ سینا کے سوا اور کوئی نہیں!۔

چند منٹ کے بعد وہ عورت کچھ ایسی دردناک آواز سے چیخی گویا اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہے آنے والا اجنبی واقعی عورت کے سرہانے بیٹھا ہوا اس کا گلا اپنی پوری قوت سے دبا رہا تھا۔ چیخوں کی آواز نے سینا کے والدین کو جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے پہلے تو سمجھا کہ لڑکی کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر ڈر گئی اور چیخ رہی ہے۔ لیکن انہیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ بے چاری تو دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ بس وہ دونوں بھی خوب ہی چیخے۔ چلائے۔

مرد۔ ہائے شیلا! یتیم شیلا۔

عورت۔ ہائے شیلا تجھے ہتھیارے پاپی نے عین جوانی میں مار ڈالا۔ ہائے ہائے؟

پھر وہ دونوں رونے اور چلانے لگے۔ انہوں نے کسی کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اور اسے ہی قاتل سمجھا۔ شور سن کر آس پاس کے آدمی بھی جاگ اٹھے۔ اور کافی کشمکش کے بعد انہوں نے قاتل کو پکڑ لیا اور نہ چھوڑا۔ اور پھر پہچان بھی لیا۔

وہ کون تھا؟ مکرجی تھا جو سینا کو قتل کرنے آیا تھا۔ مگر اس نے جان لی شیلا کی۔ یعنی اپنی حقیقی بہن کی اور سینا تو بچ گئی

واقعہ یہ ہوا کہ سینا اپنے ماموں کے ہاں دوسرے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ اور اس کی چارپائی پر شیلا سو رہی تھی۔ وہ سینا کی سہیلی تھی۔ اور سینا کی ماں بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ بے چاری شیلا، ان کے اچانک چلے جانے سے گھر میں اکیلی رہ گئی۔ لہٰذا وہ سینا کے گھر آ رہی تھی۔ وہ بڑی نیک دل تھی مگر آہ ظالم بھائی کے ظالم ہاتھوں سے شہید ہوئی۔ دنیا سے نامراد اٹھ گئی — اور اس طرح سینا کی جان اتفاقاً موت کے منہ میں جاتے جاتے بچ گئی۔

گاؤں کا چوکیدار مکرجی کو پکڑ کر تھانے لے گیا۔ اسے حوالات میں بند کیا گیا۔ پھر مقدمہ چلا۔ اور چند مہینوں کے بعد علاقے کے مجسٹریٹ نے شیلا کے قتل کے جرم میں مکرجی کے لئے پھانسی کی سزا تجویز کی۔ اور آخر کار مکرجی پھانسی پر جھولا۔ اور گاؤں کے سب لوگ اس کے اس انجام سے کانپ اٹھے۔

مگر بعض خوش بھی ہوئے کہ انہوں نے مکرجی ایسے نام نہاد انسان کے شر سے نجات پائی۔

اس گاؤں میں آج تک مشہور ہے کہ اس نامہ بر کبوتر کے جسم میں مہاتما بدھ مہاراج کی آتما تھی۔ اور اسی نے مکرجی کی ہنسا کا بدلا اس سے اس شکل میں لیا کہ اس کے ہاتھ سے اسکی حقیقی بہن شیلا کو قتل کرایا۔ اور سینا کی جان بچالی۔ کیونکہ اس نے اہنسا دھرم پر عمل کرتے ہوئے ایک جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ اور — مکرجی کو بھی پھانسی سے پہلے اس بات کا یقین ہو گیا تھا۔

اپنا گاؤں —— بقیہ صفحہ ۲۵

دالوار کے سہارے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ان آوازوں سے اس کی آنکھ کھل گئی اور مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلنے لگی۔

لوگوں نے باہر سے ہی پکار پکار کر گاؤں کے چودھری کو سلام کرنا شروع کر دیا۔ وہ ان سب سے ملنے کے لئے باہر نکل آیا اور ان کی طرف ہاتھ پھیلا دئے۔ بار بار وہ سب کو گلے لگا رہا تھا اور لوگ اسے لپٹے جا رہے تھے اور جوش محبت میں ایک دوسرے کو چومنے جا رہے تھے۔ اس نے اچانک ام آلطفا کو آواز دی اور کہنے لگا:

"لاؤ، لاؤ، مہمانوں کے لئے قہوہ لاؤ جلدی!"

اس کے بعد وہ سب زمین پر بیٹھ گئے۔ کتاب بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور خوب گھل گھل کر محبت کی باتیں ہونے لگیں۔

باتیں کرتے کرتے کتاب آفندی کو کچھ تھکن سی محسوس ہونے لگی اور نیند نے رفتہ رفتہ اس کو نڈھال کر دیا.......... اونگھتے اونگھتے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اس نے جھک کر اپنے برابر والے کے کندھے پر سر ٹیکا دیا.......... اس وقت اس کو صرف اتنا محسوس ہوا کہ لوگ اسے اٹھا کر لٹا رہے ہیں —— اور پھر وہ خوابوں کی دنیا میں گم ہو گیا!

نقد و نظر

ہندوستانی پبلشرز۔ دلّی۔

دلی میں نگارستان آجکل اور ادارہ ہندوستانی پبلشرز۔ ایک ہی ادبی ادارے کے دو نام ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہاں سے تقریباً سبھی کتابیں باعتبارِ نفسِ مضمون اعلیٰ اور معیاری اور بلحاظ طباعت و ترتیب نفیس اور دیدہ زیب ہوتی ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ ادارہ تجارتی اصول پر نہیں چل رہا، خلافِ حقیقت ہوگا لیکن یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ خدمتِ ادب کا احساس اس کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ اس ادارے کے منتظم و نگراں آغا سرخوش صاحب ہیں جن کو ادبی ذوق اپنے والدِ مرحوم حضرت آغا شاعر قزلباش سے ورثے میں ملا ہے۔ وہ اپنے خاندان کی شانِ ادب نوازی کو برقرار رکھنے میں بڑی سعادت مندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اس وقت انکے ادارے کی چار نئی مطبوعات سامنے ہیں جن پر اظہارِ خیال کرنا مقصود ہے۔

معائنۂ ہند و برطانیہ | مصنف:۔ سر سید سلطان احمد، کے سی ایس آئی $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ کے ۱۵۰ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

سیّد صاحب نے یہ کتاب انگریزی زبان میں اس وقت مرتب کی تھی جب وہ مرکزی حکومت کی مجلسِ انتظامیہ میں اطلاعات و نشریات کے رکن تھے۔ لیکن مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب سرکاری نہیں بلکہ موصوف کی ذاتی رائے کا آئینہ ہے۔ کیونکہ اس میں جگہ جگہ سرکاری نصب العین اور طریقۂ کار پر انھوں نے پوری آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ گذشتہ پچیس تیس سال کے دوران میں ہندوستان کی پوری یا ادھوری آزادی کے سلسلے میں جتنی بھی کوششیں ہوتی رہی ہیں، ان پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے اس کتاب میں آئندہ کے امکانات پیش کئے گئے ہیں۔ "کرپس تجاویز" کا خاص طور پر جائزہ لے کر بتایا گیا ہے کہ ان میں کن اہم امور کو نظر انداز کر دیا گیا تھا چنانچہ ان امور کی صراحت قابلِ فہم انداز میں کی ہے ہندوستان کی سرحدوں سے ملی ہوئی اور کچھ پرے کی ریاستوں اور حکومتوں کو موضوعِ بحث بنایا ہے تاکہ اس ملک کی سیاست کو بین الاقوامی طور پر سمجھا جاسکے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بہت ہی زیادہ مفید ہو جاتی ہے برسبیلِ تذکرہ نظریۂ پاکستان پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔

مجھے خرید لو | مصنف:۔ جناب شوکت تھانوی۔ $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ کے ۱۲۸ صفحات مجلد۔ قیمت پونے دو روپے۔ یہ شوکت صاحب کے دس

ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ڈرامے اس زمانے میں لکھے گئے تھے جب وہ کسی تھیٹریکل کمپنی کے منشی کی طرح لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے مستقل طور پر اس طرح وابستہ تھے کہ وہاں کے اربابِ حل و عقد جب چاہیں اور جو کچھ چاہیں اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لکھوالیں۔ اسی لئے ان ڈراموں میں وہ ندرت بالکل نہیں ہے جو ان کے دوسرے ڈراموں یا افسانوں میں اپنی جھلک دکھاتی ہے بلکہ تین چار ڈرامے تو حقیقتاً اردو کو اردو میں ترجمہ کرکے پیش کئے گئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مانگ کو مالی منفعت کے خیال سے پورا کرنے کے لئے اسکے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا لیکن ایک اچھے اور نامور ادیب کے لئے ایسی کوشش کبھی قابلِ تعریف نہیں بن سکتی۔ ان میں کہیں کہیں طنز اور بہ حیثیت مجموعی ظرافت کا رنگ نمایاں ہے لیکن وہ ظرافت جو لوگوں کو زبردستی ہنسانے کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔

ایک حمام میں؟ | مصنف:۔ خواجہ محمد شفیع دہلوی۔ $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ کے ۱۴۴ صفحات۔ قیمت دو روپے۔ یہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ناول ہے جسے دلّی کی اس صاف ستھری، بامحاورہ، ٹکسالی زبان میں لکھا ہے جو صرف ادبِ عالیہ میں برقرار ہے ورنہ موجودہ دور کی نگارشات میں اسکا وجود تلاش و تجسس کے بعد ہی نظر آتا ہے۔ خواجہ صاحب کو زبان و بیان کی یہ قدرت خاندانی ورثے میں ملی ہے اور اسی لئے ان کو ہمارے ادب میں ایک درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ اس ناول کے کرداروں میں ایک طرف اگلے وقتوں کے وہ بزرگ لوگ ہیں جنھیں کچھ نہ کہنے کا مشورہ غالب نے دیا ہے۔ وہ رسم و رواج کے پابند لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ دوسری طرف نئے زمانے کے ایسے نوجوان ہیں جن کی بے راہ روی پر اکبر الہ آبادی نے حرف زنی کی ہے "زمینِ زندگی" پر ہمیشہ ایک "نیا آسمان" بناتے نظر آتے ہیں۔ اس رنگِ تضاد نے ناول میں بہت سے لطیف پہلو پیدا کر دیئے ہیں۔ پورے ناول میں ایک دلچسپ افسانہ اس خوبی سے سمویا ہے کہ وہ ایک علیحدہ چیز ہونے کے باوجود اصل کا ایک ضروری جزو معلوم ہوتا ہے۔ حسبِ ضرورت مناسب اشعار کے استعمال سے عبارت میں بیساختگی پیدا کر دینی ان کے طرزِ تحریر کی ایک بڑی خوبی ہے۔

شب تاب | مصنف:۔ جناب اسرار الحق مجاز لکھنوی $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ کے ۱۴۴ صفحات مجلد قیمت سوا دو روپے۔ مجاز اس دور کے ان شاعروں میں سے ہیں جو ترقی پسندی کا طرۂ امتیاز سر پر لگانے اور تعمیرِ نو کا علم ہاتھ میں اٹھانے کے باوجود اسی حسن و عشق اور جذب و کیف کی دنیا میں سانس لیتے نظر آتے ہیں جسے غلطی سے فرسودہ اور بے رنگ سمجھا جانے لگا ہے۔ نقاد کی رائے خواہ کچھ بھی ہو، ان کے قدم اس روش سے الگ ہٹ کر نہیں اٹھے ہیں جو حقیقتاً شاعری کی جان ہے۔ مجاز کا سارا کلام حسن کی رنگینیوں اور عشق کی سرمستیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کا ہر شعر جذباتِ قلب کی دھڑکنوں کا حامل ہے۔ ان کے ہر مصرعے میں وہ کیفیات امنڈ رہی ہیں جو سرمستیٔ شباب کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ پھر الفاظ کا ترنم ان سب پر حاوی ہے جس سے ان کی شاعری میں رقص و غنا کی شان پیدا ہو گئی ہے جس سے ان کے کلام کا مرتبہ بھی بہت بلند ہو گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک چھوڑ دو دو دیباچے موجود ہیں مگر ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ بھی مجاز کے کلام پر صحیح روشنی نہیں پڑتی۔

یہ چاروں کتابیں ہندوستانی پبلشرز، اردو بازار جامع مسجد دہلی سے مل سکتی ہیں۔

نور و ظلمات مصنف:۔ جناب صلاح الدین قریشی دہلوی۔ ناشر:۔ ساقی بکڈپو۔ کھاری باؤلی۔ دہلی۔
$\frac{20}{26}$ کے ۱۱۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سوا روپیہ۔ یہ ملک شام کی مشہور مصنفہ آنسہ مَیٔ کے چودہ رومان پرور مضامین کا براہ راست عربی سے ترجمہ ہے۔ ان کا مطالعہ کرتے وقت انسان الفاظ کی رنگینیوں اور خیالات کی گہرائیوں میں کھو جاتا ہے اور کبھی خدر چہ محو ہو کر اپنے آپ کو اس کرۂ ارض کی عام سطح سے ابھرا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہر دل میں آرزو پیدا ہونے لگتی ہے کہ کاش ہم اس نغمہ ریز دنیا میں پہنچ جائیں جس کا عکس جمیل آنسہ مَیٔ کے مضامین میں موجود ہے — وہ دنیا جہاں رہنے والوں کے دل کی دھڑکنیں ایک کلیم بلیغ بن کر مصنفہ کو سنائی دیتی ہیں اور پھر وہ ان سرگوشیوں کو اپنے الفاظ میں ایک پیغام روح بنا کر پیش کرتی ہے۔ وہ پیغام جو سکون قلب سے سننے والوں کے لئے سرمایۂ حیات بن سکتا ہے۔ آنسہ مَیٔ کی تحریر میں قدیم عربی ادب کی لطافت جھلک دکھاتی ہے اس روح کو صلاح الدین نے خوب سمجھا اور بڑی محنت و جانفشانی اور خلوص کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔

چھایا مصنف:۔ جناب دینا ناتھ گوسائیں ٹپالوی۔ ناشر:۔ بھارت لینگ ھنڈار۔ کٹرہ آہلو والیہ۔ امرتسر $\frac{20}{26}$ کے ۱۵۲ صفحات۔ مجلد قیمت پونے دو روپے۔ یہ ایک ڈرامے اور چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں سماجی زندگی کے ان تاریک پہلوؤں کی ترجمانی کی گئی ہے جو اس دور کے بہت کم ادیبوں کے پیش نظر ہیں۔ گوسائیں صاحب افسانہ مکمل کر لینے کے بعد اگر اس اعتبار سے اس پر نظر ثانی ڈال لیا کریں کہ اس میں کتنی باتیں خلاف فطرت اور ناممکن العمل ہیں اور ان کمزوریوں کو دور بھی کر دیا کریں تو یقیناً ان کے افسانے معیاری درجہ حاصل کر لیں۔ یہ نقص "غلطی کس کی" میں سب سے زیادہ موجود ہے۔ افسانے کے تینوں افراد اس دنیا کے رہنے والے معلوم نہیں ہوتے۔ "الاؤ" اچھا افسانہ ہے لیکن "دوسرا راستہ" ایک ایسا ڈرامہ ہے جس کا نفس مضمون سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسی الجھنیں ان کی تحریر میں اور جگہ بھی موجود ہیں۔ بعض افسانوں میں کچھ حصے ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کو حذف کر دیا جائے تو افسانے پر کوئی خاص اثر نہ پڑے۔

جنگل کانفرنس مصنف:۔ علامہ حیرت بدایونی۔ ناشر:۔ دکن اردو اکاڈمی۔ ادارۂ شرقیہ۔ حیدرآباد دکن $\frac{20}{26}$ کے ۸۴ صفحات۔ بلا جلد قیمت ۱۰ آنے۔ یہ مکالموں اور تقریروں کی صورت میں جنگل کے جانوروں کی ایک دلچسپ کہانی ہے جو بچوں کیلئے لکھی گئی ہے۔ شیر کی خود مختار حکومت سے تنگ آ کر جنگل کے بہت سے جانور اس کے مظالم کا خاتمہ کرتے ہیں پہلی کانفرنس ہاتھیوں کی ہوتی ہے پھر ریچھ کی۔ صدارت میں دوسرے جانور جلسہ کرتے ہیں جو اونچا تقریروں کے بعد بہت سی تجویزیں منظور کی جاتی ہیں۔ غدار لومڑی پل پل کی خبر شیر کو پہنچا دیتی ہے جس سے وہ خوب چوکنا اور مقابلے کیلئے تیار رہتا ہے۔ ریچھ کی نظم جو بھرے جلسے میں سنائی جاتی ہے دلچسپ ہونے کے علاوہ اس جدید شاعری پر طنز ہے جسے ردیف، قافیہ اور بحر و عروض سے بے نیاز رکھا جاتا ہے۔

غزل

اپنے دل کے راز چھپا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
وضعِ شکستِ عشق نبھا کر تم بھی پشیماں، ہم بھی پشیماں
قصۂ ماضی یاد دلا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
سوئے ہوئے فتنہ کو جگا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
درد کی لے کو اور بڑھا کر تم بھی پشیماں، ہم بھی پشیماں
درد کا یارا دل میں نہ پا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
عقل و خرد کے دام بچھا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
اپنی ضدوں سے باز نہ آ کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
اسرارِ دل بیتاب ہی تھے، افشا جو نہ ہوتے کیا ہوتے
جو چھپ نہ سکے وہ بات چھپا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
اس دردِ محبت کے صدقے دونوں کی روش اک ساتھ رہی
الفت کو تقدیر بنا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
حسن وفا دشمن ہے کہاں اور عشق ستم پیشہ کیا ہے
مفت میں اک تکرار بڑھا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
بڑھتا ہی گیا احساسِ الم، تسکینِ دلِ جاں ہو نہ سکی
فرقت کی روداد سنا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
جب یہ نئی دنیا ہی نہ تھی، جب فکرِ جنوں ساماں بھی نہ تھی
آج نئی دنیا کو بسا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
پروانے تھے شمعِ الفت کے، ہاں شمع پہ گر کے جل جاتے
شعلوں سے گر دامن کو بچا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں
ہم نے نکالی تھی اشرف تدبیر تمہیں بہلانے کی
عشق کے قصہ کو دہرا کر تم بھی پشیماں ہم بھی پشیماں

علی اشرف

فلم اسٹاروں کی طرح اپنی جلد کی حفاظت کیجئے !

مسئلۂ خوراک

ڈی راگھون

بیماری اور قحط کی وبائیں لڑائیوں کے بعد ہمیشہ اپنے رنگ جماتی ہیں۔ اس وقت دنیا بھر میں غلے کی کمی سے نازک صورتِ حالات پیدا ہو گئی ہے۔ یورپ جو بین الاقوامی جنگ کی تباہکاریوں سے جان بچا کر ابھی پوری طرح پنپنے بھی نہیں پایا تھا، اناج کی کمی بلکہ ایک حد تک قحط کی مشکلات کا سامنا کر رہا ہے۔ شمالی افریقہ، ارجنٹائن اور ہند چینی میں اناج کی فصلیں خراب ہو گئی ہیں۔ سیام کے سوا سارے مشرق بعید میں خوراک کا مسئلہ خطرناک مستقبل کا پتہ دے رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی دونوں موسموں کی بارش کی قلت نے مسئلہ خوراک کو اس درجہ نازک بنا دیا ہے کہ قحط زدہ علاقوں کی حالت سدھارنے کیلئے بڑی احتیاط سے کام لیا جا رہا ہے اور اسکے ساتھ ہی ساتھ دنیا بھر میں رونما ہونے والے واقعات کا مطالعہ توجہ و خلوص کیساتھ کرنا پڑ رہا ہے۔

چین کی طرح ہندوستان بھی قدیم زمانے سے زراعتی ملک ہے۔ اس کی آبادی کے بہتر فی صدی سے زیادہ افراد کاشتکاری کو بالواسطہ یا بلاواسطہ ذریعۂ معاش بنا کر اپنا گذارہ کرتے ہیں۔ ہندوستان میں مزروعہ زمین کا رقبہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ لیکن اوسطاً ایک ایکڑ کی پیداوار کا اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہو کہ وہ اس قدر قلیل ہے کہ گذشتہ بیس سال کے عرصے میں ہمارا ملک غذائی ضروریات کے سلسلے میں کبھی بیرونی ضروریات سے بے نیاز نہیں ہوا۔ یہاں تقریباً ۶۳۶ پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد سے ہندوستان کی حالت ایسی خراب ہوتی کہ وہ اناج باہر بھیجنے کی بجائے ہمیشہ باہر سے منگانے لگا۔ اب جبکہ ملک کی آبادی پچاس لاکھ نفوس فی سال کے حساب سے برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے، اشیائے خوراک کی پیداوار میں اس کے متوازی کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔

آج دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان کو بھی اناج کی کمی سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اور صورتِ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں ۱۹۴۳ء کے قحط بنگال کی المناک داستان دوہرائی نہ پڑ جائے۔ تاہم اس دفعہ ہندوستان کے لوگ اور اربابِ حکومت تہیہ کر چکے ہیں کہ ۱۹۴۳ء میں بلند ہونے والی صدائے دلخراش کی بازگشت عمل میں نہ آئے۔ موجودہ صورتِ حالات کے خوشگوار پہلو یہ ہیں کہ ہندوستان زمانۂ جنگ کی اقتصادی بدحالی سے بڑی تیزی کے ساتھ نجات پا رہا ہے اور یہ کہ حمل و نقل کے سلسلے میں اب کسی دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑ رہا۔ نیز یہ کہ حکومت نے راشننگ اور کنٹرول کے محکموں کے عملے کو زیادہ وسیع اور منظم کر دیا ہے تاکہ ناسازگار حالت پر اچھی طرح قابو پایا جا سکے۔ ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے مرد عورت نے متحدہ کوششوں کے ساتھ اس بھوک اور قحط کے ہولناک نتائج کا سدباب کرنے کے لئے زبردست محاذ قائم کیا جسے کوئی بھی متمدن ملک برداشت نہیں کر سکتا۔

عام حالات کے تحت ہندوستان میں ہر سال چھ کروڑ ٹن اناج پیدا ہوتا ہے۔ اس میں سے وہ مقدار جو بیجوں کے لئے محفوظ رکھی جاتی ہے اور وہ جو بعض صورتوں میں خراب ہو جاتی ہے، منہا کرنے کے بعد صرف پانچ کروڑ ٹن اناج بچ رہتا ہے۔ کل پیداوار میں سے دو کروڑ نوے لاکھ ٹن چاول، ایک کروڑ گیہوں، تئیس لاکھ ٹن جو، ایک کروڑ چورانوے لاکھ ٹن جوار باجرہ وغیرہ ہوتا ہے۔ ان اناجوں کے علاوہ دالوں کی مقدار تقریباً تراسی لاکھ ٹن سمجھی جاتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کمی کس لحاظ سے ہے۔ حال کے اندازے کے مطابق ساٹھ لاکھ ٹن کی کمی پوری کرنی ہے۔ اس میں نصف مقدار اس نقصان کو ظاہر کرتی ہے جو جنوبی ہند میں رونما ہونیوالی آندھیوں اور طوفانوں کے باعث اٹھانا پڑا۔ باقی کمی اسلئے ہے کہ سارے شمال مغربی ہندوستان میں سرمائی بارشوں کا فقدان رہا۔

اس میں شک نہیں کہ اس تصویر کا یہ منظر نہایت بھیانک ہے۔ لیکن حکومتِ ہند نے مشکلات پر قابو پانے کے لئے فوری تدابیر اختیار کر لی ہیں۔ حضور وائسرائے ہند نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مدراس اور میسور کے قحط زدہ علاقوں کا دورہ کیا تاکہ ملک کے مسئلہ خوراک کا ذاتی طور پر جائزہ لے سکیں۔ لندن اور نیویارک میں ان کی استدعا جو ہندوستان کی مدد کرنے کے سلسلے میں تھی بڑی ہمدردی کے ساتھ سنی گئی۔ کیونکہ ہندوستانیوں نے اتحادیوں کی فتح کے سلسلے میں نہایت تن دہی سے حصہ لیا تھا اور اسی لئے یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اب ضرورت کے وقت لازمی ہے کہ اسے دنیا بھر سے مدد ملے۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ انگلستان اور امریکہ میں یکساں طور پر ہندوستان کے خوراکی وفد کا مطالبہ پورے غور و خوض کے ساتھ سنا گیا۔ توقع ہے کہ کمبائنڈ فوڈ بورڈ بڑی فیاضی سے کام لیتے ہوئے ہندوستان کو ملنے والے حصہ کا فیصلہ کرے گا۔ جہاں تک گیہوں کی فراہمی کا تعلق ہے آسٹریلیا نے بھی خاطر خواہ امداد کا وعدہ کر لیا ہے۔

لیکن ان مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے ہندوستان کو صرف درآمد ہی پر بھروسہ کرنا نہیں چاہئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

"جانتے ہیں"

ستم کا تصرف جو کم جانتے ہیں — وہ پھر کس ستم کو ستم جانتے ہیں
تمہاری نظر پر ہیں جنکی نگاہیں — خوشی کو خوشی غم کو غم جانتے ہیں
محبت کے معنی جوانی سے پوچھو — نہ تم جانتے ہو۔ نہ ہم جانتے ہیں
ذرا غور سے او ستم کرنیوالے — یہ بندے کرم ہی کرم جانتے ہیں

کہا میں نے اشہرؔ کو تم جانتے ہو؟
تو بولے خدا کی قسم جانتے ہیں!

آغا اشہر لکھنوی

ساجن سے

ابراہیم خاطر

کوئی آج سنا دے
ساجن
گیتوں بھری کہانی

ہو جائیں بیدار امنگیں — اور مچلنے لگیں ترنگیں
ناچ اٹھے بدمست جوانی
ساجن
گیتوں بھری کہانی

تارے وجد میں آ جائیں — لہریں بے خود ہو جائیں
تھم تھم جائے بہتا پانی
ساجن
گیتوں بھری کہانی

مست پون بھی جھومنے لاگے — نس نس پریم مدھر تا جاگے
سن سن کر یہ پریم کی بانی
ساجن!
گیتوں بھری کہانی

...مت کا تعاون لیتے ہوئے اپنی ملکی پیداوار کی مقدار کو زیادہ سے زیادہ ...جائے اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں اسے مساوی طور پر تقسیم کر دے خصوصاً ان حصوں میں جہاں غلے کی سخت کمی ہے۔ اصل بات ...یہ ہے کہ چالیس کروڑ نفوس کے پیٹ بھرنے کا سوال بڑا ٹیڑھا ہے۔ فی الحال ...۵ شہروں میں راشننگ کا سلسلہ رائج ہے اور اس طرح پانچ کروڑ تیس لاکھ افراد کو اناج کی مقدار مساوی طور پر مل رہی ہے۔ ہندوستان کے ہر حصہ میں راشننگ کے طریقہ کو لوگوں نے پسند کیا اور اسے اپنے لئے مفید سمجھا ہے۔ محکمۂ خوراک جو راشننگ کا کام اور اس سے متعلقہ کام انجام دے رہا ہے حکومت ہند کا تیسرا سب سے بڑا محکمہ ہے۔ اس کے مختلف شعبے منصوبہ بندی، تحقیق، اور تشخیص غذائیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان شعبوں میں سبھی قسم کے لوگ شامل ہیں، سائنسداں، ماہرین فن، ماہرین اقتصادیات، اور محرروں کی ایک بہت بڑی جماعت۔ یہ سب مل کر اس ...اعظم کے خوراک کی مسائل طے کرتے ہیں۔ ہر صوبے اور ریاست میں خوراک کا اپنا عملہ موجود ہے جسکے افراد محنتی، لائق اور صحیح معنوں میں مخلص ہیں۔

حال ہی میں راشننگ کی مقدار گھٹا کر بالغان کے لئے چھ چھٹانک یومیہ کر دی گئی تو ہندوستان بھر کے لوگوں نے اسے ٹھنڈے دل کے ساتھ قبول کر لیا کیونکہ وہ سب اس بات کے لئے تلے ہوئے ہیں کہ ان علاقوں میں جہاں اناج کی غیر معمولی کمی ہے، قحط کی ناگوار صورت پیدا ہونے نہ پائے۔ سرمائی بارشوں کے فقدان کے باوجود پنجاب ہر طرح آمادہ ہے کہ اپنے ہمسایہ صوبوں کی حسب دستور مدد کرے۔ بمبئی اور مدراس کو پنجاب کا چاول ...سب مقدار میں فراہم کرنے کا یقین دلایا جا چکا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ کوشش کی گئی کہ غلے کا ذخیرہ محفوظ رکھا جائے اور اشیائے خوراک خوامخواہ ضائع ہونے سے بچی رہیں۔ ان کوششوں کے ...خاطر خواہ برآمد ہوئے۔ نیز "زیادہ خوراک پیدا کرو" کا معرکہ بھی کامیاب ...۔ نہ صرف عوام کی توجہ اس اشد ضرورت کی طرف مبذول ہوئی بلکہ ...گورنر ہاؤس کے باغات میں بھی ہل چلوا دیا گیا تاکہ زیادہ ترکاریاں ...ئی جا سکیں۔ ہندوستان کے لوگوں کو اپنے اوپر اور اپنے رہنماؤں پر ...ل اعتماد ہے اور انہیں یقین ہے کہ بڑی بہادری اور جانفشانی کے ...کمئ خوراک کا نازک مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو جائے گا۔

ضروری — نقد تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں دفتر رسالہ آجکل میں موصول ہونی ضروری ہیں۔ ورنہ ان پر کسی قسم کا اظہار نہیں کیا جائیگا۔ ناشر صاحبان اس امر کا لحاظ رکھیں۔ (ادارہ)

سالنامہ آجکل کے چند متوقع مضامین

۱۔ جوش ملیح آبادی (مع تصویر) — جناب فیض احمد فیض
۲۔ بہادر شاہ کا حقہ — شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی
۳۔ سلطان سلیم کی فارسی شاعری — ڈاکٹر تاثیر
۴۔ دور دیس کا رہنے والا (افسانہ) — نوابزادی تسنیم سلیم چھتاری
۵۔ ترکی صحافت کی تاریخ — جناب جمیل احمد
۶۔ مہاجرین (افسانہ) — جناب راجندر سنگھ بیدی
۷۔ چین میں سائنس کی ترقی — جناب چانگ چین ہو آئی
۸۔ آکسفورڈ یونیورسٹی — جناب س۔ و۔ چاری
۹۔ چنہو دارو — جناب یوگ راج مشرا
۱۰۔ خلط بحث — علامہ سیماب اکبرآبادی
۱۱۔ اندھے کی لاٹھی (افسانہ) — جناب سلطان حیدر جوش
۱۲۔ اردو کی افسانہ نگار خواتین — جناب منظر ممتاز سحر صہبائی
۱۳۔ عالمگیر مسئلہ خوراک — جناب ڈی راگھون
۱۴۔ تلوک چند محروم (مع تصویر) — جناب ہر بھگوان شاد
۱۵۔ مستانی کا ٹیلا (افسانہ) — جناب ایم اسلم
۱۶۔ مؤرخ کی دوربین — پروفیسر علی حیدر نقوی
۱۷۔ منزلِ عشق (ڈرامہ) — جناب بادشاہ حسین حیدرآبادی
۱۸۔ سائنسوں میں قدیم عرب ہند کا اشتراک — جناب اے ایے عابدی
۱۹۔ سیلاب (افسانہ) — ڈاکٹر رام پرتاب بہادر
۲۰۔ پڑوں کے احسانات اردو ادب پر — پروفیسر حامد اللہ افسر
۲۱۔ واسوخت (ڈرامہ) — جناب محمد عمر (نور الہٰی)
۲۲۔ مسور کی دال (افسانہ) — جناب ناکارہ حیدرآبادی
۲۳۔ زہرہ جبیں (افسانہ) — نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی

منظومات:۔ حضرت جوش ملیح آبادی۔ نوح ناروی، بیخود دہلوی ثاقب لکھنوی، آرزو لکھنوی، مخمور۔ اکبرآبادی۔ سرشانتی سروپ بھٹناگر، ساغر نظامی، تلوک چند محروم۔ امجد حیدرآبادی، ادیب مالیگانوی، موہن سنگھ دیوانہ صفی لکھنوی، سلام مچھلی شہری۔ عبادت بریلوی، کنور مہندر سنگھ بیدی، عبدالمجید سالک، مکیش اکبرآبادی۔ عبدالمجید بھٹی وغیرہ۔ مکمل فہرست آئندہ پیش کی جائیگی

حجم (مع تصاویر) ۱۲۰ صفحات۔ قیمت سالنامہ ۱۲ مستقل خریداران آجکل کو مفت

ادارہ مطبوعات متحدہ۔ پوسٹ بکس ۱۹۶ دہلی

ہندی "آجکل" کا

سالانہ نمبر

یکم مئی ۱۹۴۶ء کو بڑی سج دھج کے ساتھ شائع ہو رہا ہے:

ہندی کے بہترین شعراء۔ مضامین نگار اور افسانہ نویسوں کے بلند پایہ مضامین نظم و نثر کا ایک قابل یادگار تحفہ ہوگا

ہندی کے شائقین اپنی کاپی ابھی سے ریزرو کرالیں۔

اشتہار دہندگان کے لئے نادر موقع ہے۔

ضخامت سو صفحے مع تصاویر ——— قیمت فی کاپی ۱۱

تفصیلات کے لئے لکھئے:۔

مینجر رسالہ آجکل (ہندی) پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ دو غزلیں — جناب نہال سیوہاروی
۲۔ نہال سیوہاروی (مع تصویر) — جناب فرید جاوید
۳۔ برق دہلوی منظر نگاری (مع تصویر) — جناب اجیندر ناتھ شیدا
۴۔ جوہری بم کے اصول — ڈاکٹر رضی الدین صدیقی
۵۔ ولی اللہ (مصری افسانہ) — جناب صلاح الدین قریشی
۶۔ ایرانی صحافت — جناب مشتاق حسین مبارک
۷۔ گوتم بدھ (نظم) — جناب نظیر لدھیانوی
۸۔ جہاں آرا — جناب ضیاء الدین برنی
۹۔ شرقِ اردن — جناب رام پرشاد بیری
۱۰۔ اقبال کی وحدت فکر — جناب غلام محمد بٹ
۱۱۔ شمع سوزاں (افسانہ) — محترمہ ضیاء القمر امام
۱۲۔ علیگڈھ کے نکسوے — سعید محمد اعتقاد الدین صاحب
۱۳۔ سوویٹ یونین کا چوتھا پنجسالہ خاکہ
۱۴۔ محسن (افسانہ) — جناب ... آر یودھی